aazzamm@yahoo.com
اندھیر نگری
محی الدین نواب
AZAM

aazzamm@yahoo.com
قلم کے نواب محی الدین نواب کا ایک طویل ناول
ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا۔
سیاست کے سانپ اور ان کی زہریلی سازشوں کا حال۔
پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے ''خفیہ ہاتھ'' کی سازشوں کا حال۔
چند سرپھروں کی ولولہ انگیز داستان، جو خفیہ ہاتھ سے ٹکرا گئے تھے۔
بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان۔
انڈر ورلڈ کے گاڈ فادروں کا خوفناک ٹکراؤ، موت کو بھی پسینہ آ گیا۔
پاکستان کو گدھوں کی طرح نوچنے والے سیاستدانوں کی شرمناک داستان۔
سندھ کے وڈیروں کی ''خدائی'' کی ناقابل یقین داستانیں۔
AZAM

ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا۔

اندھیر نگری

اول

محی الدین نوابؔ

چوک میو ہسپتال، نسبت روڈ، لاہور۔

اوّل ــــــــــــ ۲۰۰۲ء
بع ــــــــ یوانیڈی پرنٹرز، لاہور
پوزنگ ــــــ صوبا کمپوزنگ سنٹر، لاہور
ت ــــــــــ ۱۵۰ روپے

پیش لفظ

مملکتِ خداداد پاکستان کو وجود میں آئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ یہ ایک درد ناک اور شرمناک حقیقت ہے کہ پاکستان کے قیام سے اب تک اس پر ایک ہی گروہ نے حکمرانی کی ہے۔ یہ گروہ مختلف نام بدل بدل کر عوام کے سینے پر سوار رہا ہے۔ اس گروہ کا واحد کام اپنے ذاتی مفادات کا تحفظ اور ملکی وسائل کی لوٹ مار رہا ہے۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ پاکستان کو ان گدھوں سے نجات دلا سکے جو بڑی بے دردی سے عوام کا گوشت نوچ رہے ہیں۔

یہ گروہ حرام کی کمائی اور کالی دولت کی پیداوار ہے اور اس نے پاکستان کے وجود پر کینسر کے پھوڑے کی طرح اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں۔ یہاں "اندھیر نگری چوپٹ راج" والا معاملہ ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر ہر محبِ وطن پاکستانی کا دل دُکھتا ہو گا لیکن ایک حساس قلمکار کا دل اس المیے پر پھٹ کر رہ جاتا ہے اور وہ اپنے خونِ دل میں قلم ڈبو کر اپنے اندر کے احساسات کو صفحۂ قرطاس پر نقش کر دیتا ہے۔

محی الدین نواب ایک محبِ وطن اور درد مند پاکستانی ہیں۔ وہ ادبی دنیا کی قدر آور شخصیت ہیں۔ وہ ایک طویل عرصے سے اپنے قلم کے نشتر سے معاشرے کے رستے ناسوروں کی جراحی کر رہے ہیں۔ اس فن میں انہیں کمال حاصل ہے اور وہ بڑی خوبی سے اپنا فرض سرانجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے ہر طرح کی مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر ہمیشہ قلم کی حرمت کا پاس رکھا اور جرأت و بے باکی سے حق کی آواز بلند کی۔

"اندھیر نگری" اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے سر پر کفن باندھ کر قوم کا لہو چوسنے والی مکروہ جونکوں اور ملکی وسائل ہڑپ کرنے والے گدھوں کو بے نقاب کیا ہے۔ اس "اندھیر نگری" میں جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے والی زبان کو ہمیشہ کے

لئے خاموش کر دیا جاتا ہے اور "سرکشی" دکھانے والے قلم کو توڑ دیا جاتا ہے۔

نواب صاحب نے نڈر ہو کر امریکہ اور "خفیہ ہاتھ" کی ان سازشوں کو بھی طشت از بام کیا ہے جو وہ عالم اسلام اور خصوصاً پاکستان کے خلاف کر رہا ہے۔ انہوں نے حکمران گروہ کی مخالفت مول لے لی مگر قلم پر آنچ نہ آنے دی۔ اللہ تعالیٰ ان کا یہ قلمی جہاد قبول فرمائے اور ان کے زورِ قلم میں اضافہ فرمائے (آمین)

محی الدین نواب نے زندگی کا طویل حصہ معراج رسول صاحب کے ساتھ کام کرتے ہوئے گزار دیا ہے۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ محی الدین نواب اور معراج رسول صاحب ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ معراج رسول صاحب ادبی دنیا کی ایک قدآور شخصیت ہیں۔ وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

محی الدین نواب کی کتابوں اور کہانیوں کی فہرست طویل ترین ہے ہماری کوشش ہے کہ ان بکھری ہوئی تحریروں کو اکٹھا کر کے کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے۔ تاکہ محی الدین نواب کا یہ قیمتی سرمایہ کتابوں میں محفوظ ہو جائے۔

زیرِ نگاہ ناول "اندھیر نگری" ایک محبِ وطن جاں باز کی جدوجہد کی داستان ہے جو وطن فروشوں کے خلاف کر رہا ہے۔ وہ ہر چھوٹی بڑی برائی سے ملک کو پاک کرنا چاہتا ہے۔ اسے قوم کے ان مکروہ اور بدنما کرداروں سے نفرت ہے۔ جو ملک کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہے ہیں۔

یہ ملک ہم سب کا ہے اور اس کی حفاظت ہم سب کا فرض ہے۔ ملک سلامت رہے گا تو ہم بھی سلامت رہیں گے۔ آیئے! ملک کی سلامتی و بقا کے لئے محی الدین نواب کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلیں۔

عارف محمود

وہ ایک قد آور جوان تھا۔ جسمانی اور ذہنی طور پر صحت مند تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی کشش تھی۔ اسے ایک بار دیکھنے والے بار بار دیکھتے رہ جاتے تھے۔ وہ کہیں بھی جاتا تو لاکھوں افراد کی بھیڑ میں نمایاں نظر آتا تھا۔ اس کے پاس ایک بڑے سائز کی بھاری بھرکم موٹر سائیکل تھی۔ اس موٹر سائیکل کے پہیئے اور فولادی پارٹس اس کے حوصلوں کی طرح مضبوط اور ناقابلِ شکست تھے۔ اس پر اور اس کی گاڑی پر کسی موسم کا اور کسی رکاوٹ کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ تمام رکاوٹوں کو توڑ کر گزر جاتا تھا۔

کسی بھی ملک کے سرحدی اور ساحلی علاقے بڑے اہم ہوتے ہیں۔ دشمن انہی راستوں سے ملک کے اندر چوری چھپے گھس آتے ہیں۔ ایسے علاقوں میں کوئی اجنبی یا مشکوک شخص نظر آئے تو اسے فوراً گرفتار کر کے اس کی اصلیت معلوم کی جاتی ہے۔ اصلیت معلوم ہونے پر وہ سزا کا مستحق ہوتا ہے یا پھر رشوت لے کر آنکھیں بند کرلی جاتی ہیں تاکہ یہ نہ دیکھ سکیں کہ وہ ملک کے اندر کہاں تخریبی سرگرمیوں کے لئے گیا ہے۔

وہ کراچی میں رہتا تھا اور اپنی موٹر سائیکل پر وہاں سے ایک سو بیس کلومیٹر دور ایک ساحلی علاقہ رافوٹو گوٹھ جایا کرتا تھا۔ اس گوٹھ میں پہلے ستر یا اسی ماہی گیروں کی جھگیاں تھیں پھر وہاں گوری نسل کے لوگ آنے لگے۔ جھگیوں کے مقابلے میں خوبصورت ڈیزائن کے کاٹیج بننے لگے۔ پھر وہاں امریکی کمپنی ہوپ ویل ہولڈنگ لمیٹڈ (Hop Wel Holding LTD) کا ایک ذیلی دفتر قائم ہوگیا۔

اس مذکورہ کمپنی کے ذیلی ادارے کا نام سیپا (CEPA) تھا۔ سیپا کا مکمل نام کنسولیڈ شیڈ الیکٹرک پاور ایشیا تھا۔ یعنی پورے ایشیا میں پاکستان کے اس ساحلی علاقے رافوٹو گوٹھ کی کتنی سیاسی اور فوجی اہمیت ہوگی' اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا تھا۔ ساری دنیا پر حکومت کرنے کا عزم رکھنے والا امریکا بھی وہاں براہِ راست نہیں آیا تھا۔ اس نے برطانیہ کی عمل داری میں رہنے والے ادارے سیپا کو وہاں پہنچایا تھا۔

سیپا کی وسیع و عریض دفتری عمارت کے احاطے میں چاروں طرف اونچائی تک تار کانٹے لگائے گئے تھے۔ ان تار کانٹوں سے گزر کر احاطے کے اندر پہنچنا دشوار تھا۔ پھر وہاں سے دفتری عمارت میں داخل ہونا اور زیادہ دشوار تھا کیونکہ گزرنے کے ہر دروازے پر خود

کار الارم لگے ہوئے تھے۔ کسی بھی دروازے کی چوکھٹ سے گزرتے ہی خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔

وہ اپنی موٹرسائیکل پر اُدھر سے گزرنے لگا تو پولیس کی گاڑی نے اس کا راستہ روک لیا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

انسپکٹر نے کہا۔ "بات تھانے میں ہوگی۔ ہماری گاڑی کے ساتھ چلے آؤ۔"

وہ تیز رفتاری سے موٹرسائیکل ڈرائیو کرتا ہوا ان سے بہت آگے نکلتا چلا گیا۔ انسپکٹر نے چیخ کر کہا۔ "رک جاؤ تم فرار نہیں ہوسکتے۔ پکڑے جاؤ گے۔"

انسپکٹر چیختا رہ گیا۔ وہ آگے جاکر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ انسپکٹر نے جھنجھلا کر سپاہی ڈرائیور سے کہا۔ "یہ ہماری پٹرولنگ وین ہے اور تم اسے بیل گاڑی کی طرح چلا رہے ہو۔ وہ فرار ہوگیا ہے۔"

سپاہی ڈرائیور نے کہا۔ "جناب عالی! پتا نہیں اس کی موٹر سائیکل میں کتنے ہارس پاور کا انجن لگا ہوا ہے۔ ہم نے پرسوں بھی دیکھا تھا' وہ طوفانی رفتار سے موٹر سائیکل چلاتا ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں ہماری وین کتنے پرانے ماڈل کی ہے۔"

"اوئے زیادہ بکواس نہ کر' تھانے چل۔"

جب وہ تھانے پہنچے تو برآمدے کے سامنے موٹرسائیکل کھڑی ہوئی تھی اور وہ اندر میز کے ایک طرف کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ انسپکٹر نے اسے غصے سے دیکھ کر کہا۔ "ہم نے تم سے کہا تھا' ہماری گاڑی کے ساتھ تھانے چلو۔"

"یہ ضروری نہیں ہے کہ میں تمہاری گاڑی کے ساتھ چلتا۔ مجھے تھانے پہنچنا تھا' پہنچ گیا ہوں۔"

"تم کون ہو؟ اور یہاں کیوں آئے ہو؟"

"تم نے یہاں بلایا ہے۔"

"میں تھانے کی نہیں' اس علاقے کی بات کر رہا ہوں۔ تم پرسوں بھی اس علاقے میں دیکھے گئے ہو اور سنا ہے' اس سے پہلے بھی یہاں آئے تھے۔"

"میں آتا رہتا ہوں۔ یہ پاکستانی علاقہ ہے اور میں پاکستانی ہوں۔ کسی اجازت نامے کے بغیر آسکتا ہوں۔"

"مگر کیوں آتے ہو؟"

"اس لئے کہ یہاں کہیں بھی "علاقہ ممنوعہ" کا بورڈ نہیں لگا ہوا ہے۔"

"مگر ہم پولیس والے ہیں۔ تمہیں یہاں آنے سے روک سکتے ہیں۔"

"میں قانون کی کتابیں پڑھ چکا ہوں اور تمہیں پڑھا سکتا ہوں کہ مجھے روکنے کے لئے اپنے اوپر والوں سے اجازت نامہ حاصل کرنا ہوگا اور روکنے کی معقول وجوہات پیش کرنی ہوں گی۔"

"یہ تم نے کیا تم تم لگا رکھی ہے؟ میں یہاں کا افسر ہوں۔ خبردار! مجھے آپ سے مخاطب کرکے اخلاقی تقاضا پورا کرو۔"

"میں پاکستان کا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ معزز شہری ہوں۔ پہلے تم مجھے آپ سے مخاطب کرکے اخلاقی تقاضا پورا کرو۔"

وہ اسے گھور کر دیکھنے اور سوچنے لگا۔ یہ جس طرح کڑک کر بول رہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے' کسی بڑے عہدیدار کا بیٹا یا کوئی رشتے دار ہے۔

وہ ذرا نرم پڑ کر بولا۔ "تمہارا نام۔ میرا مطلب ہے آپ کا نام کیا ہے؟ کہاں سے آئے ہیں؟ اور کیا کرتے ہیں؟"

اس نے اپنا شناختی کارڈ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

"اس میں میرا نام پتا اور تاریخ پیدائش لکھی ہوئی ہے۔"

انسپکٹر نے شناختی کارڈ پڑھ کر حیرانی سے پوچھا۔ "یہ کیسا نام ہے؟ یہاں نام کی جگہ وہاب ہمایوں عرف "وہ" لکھا ہوا ہے۔"

"وہ" میرا نام نہیں عرفیت ہے۔"

انسپکٹر نے گھور کر کہا۔ "تم بکواس کر رہے ہو۔"

"تم نہیں' آپ۔ ورنہ میں بھی جواباً تم کہوں گا۔"

اس نے غصے سے اسے دیکھا پھر کہا۔ "آپ مجھے سچ بتائیں' اس علاقے میں کیوں آتے ہیں؟"

"کراچی کے ساحل سمندر پر مسلمان عورتیں پورے لباس میں تفریح کے لئے آتی ہیں۔ یہاں ساحل پر گوری گوری انگریز عورتیں مختصر ترین لباس میں جلوے دکھاتی ہیں۔ خوردبین سے دیکھنا پڑتا ہے کہ ان کے بدن پر لباس ہے بھی یا نہیں؟"

انسپکٹر جبراً مسکرایا۔ سمجھ گیا کہ وہ دھونس میں نہیں آئے گا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ بڑے زندہ دل ہیں۔ مجھے اپنا دوست سمجھیں لیکن ملازمت ایسی ہے کہ ضابطے کی کارروائی کرنی پڑتی ہے۔ پلیز اب سنجیدگی سے بتائیں کہ آپ کیا کرتے ہیں؟"

"دیکھیں آپ نے دوست کہا ہے تو پھر آپ میرے دوست بن کر رہیں گے اور میرا راز کسی کو نہیں بتائیں گے۔"

انسپکٹر اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر بولا۔ "بالکل اپنا سمجھ کر بولیں۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو میں سنبھال لوں گا۔"

وہ بولا۔ "دراصل میں اس گوٹھ میں گھنٹے یا دو گھنٹے رہتا ہوں۔ اس کے بعد یہاں سے آگے سات کلومیٹر پر کیٹی بندر ہے۔ وہ چھوٹا سا شہر پہلے بڑا ویران تھا۔ اب انگریزوں کے ساتھ ان کی حسین عورتیں بھی آگئی ہیں اور اس کے آنے سے تو شہر میں بڑی رونق آگئی ہے۔"

"کس کے آنے سے؟"

"ماریہ جان کے آنے سے دل میں گدگدی ہونے لگی ہے۔"

"ماریہ جان؟ یعنی کہ سر ہیراللہ جان کی بیٹی کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں۔ بہت خوبصورت ہے۔ سیدھی دل میں اتر گئی ہے۔"

"کیا دماغ چل گیا ہے؟ پتا ہے سر ہیراللہ جان کتنی بڑی برٹش کمپنی کے ڈائریکٹر جنرل ہیں۔ ہمارے ملک کی بڑی بڑی شخصیات ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی رہتی ہیں۔"

"نہ مجھے اس کے سامنے جانا ہے اور نہ ہاتھ باندھ کر سر جھکانا ہے۔ مجھے تو اس کی بیٹی سے دل لگا کر یہ ثابت کرنا ہے کہ میں ہیر کا وارث شاہ ثانی ہوں۔"

"خواہ مخواہ وقت ضائع نہ کرو۔ تم یہاں آنے کے سلسلے میں کوئی راز کی بات کہنے والے تھے۔"

"تم نہیں' آپ۔"

وہ میز پر ہاتھ مار کر بولا۔ "جہنم میں گیا تم اور آپ۔ وہ راز کیا ہے؟"

"یہی تو راز ہے کہ کس طرح آسمانوں پر جوڑے بنتے ہیں۔ مجھ سے جوڑ بنانے کے لئے ماریہ سات سمندر پار سے یہاں آئی ہے۔"

اس نے غصے سے دونوں مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ "یُوشٹ اپ۔ تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟ وہ تمہارے آگے گھاس بھی نہیں ڈالے گی۔"

"اسے پتا ہے کہ میں گھاس نہیں کھاتا۔"

"اس کے سیکورٹی گارڈز تمہیں گولی مار دیں گے۔"

"میں ابھی وہاں جانے والا ہوں۔ تم ساتھ چل کر دیکھ لو۔ مجھے کوئی گولی نہیں مارے گا۔"

"میں ضرور چلوں گا۔ یہ سمجھ لو کہ آج تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔ وہاں سے واپس نہیں آسکو گے۔ تمہاری لاش کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔"

"قانون کے محافظ ہو کر کہہ رہے ہو' میرے ملک کی زمین پر غیر ملکی آکر مجھے گولی مار دیں گے۔ میری لاش کہیں پھینک دیں گے اور تم تماشہ دیکھتے رہو گے۔"

اس نے کرسی سے اٹھ کر کہا۔ "زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ ابھی میرے ساتھ کیٹی بندر چلو۔ تمہاری موٹر سائیکل تھانے میں رہے گی۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ یہاں حفاظت سے رہے گی۔ پہلے میں اسے ایک جھگی والے کے پاس چھوڑ کر ہوڑا (کشتی) کے ذریعے کیٹی بندر جایا کرتا تھا۔"

اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس کے ساتھ چلیں۔ وہ سب پھر وین میں آکر بیٹھ گئے۔ رافوتو گوٹھ اور کیٹی بندر کے درمیان سمندر کی کھاڑی تھی۔ گہرا پانی تھا' کشتی کے ذریعے سفر کیا جاتا تھا۔ وہاں بڑے سائز کی کشتی کو ہوڑا کہا جاتا تھا۔

سفر کے دوران میں انسپکٹر خاموش رہا اور یہ پلاننگ کرتا رہا کہ کیٹی بندر پہنچ کر اس پُراسرار نوجوان کو سر ہیراللہ جان کے بنگلے میں لے جائے گا اور اسے بتائے گا کہ یہ پاکستانی جوان یہاں جاسوسی کرنے آیا ہے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے صاحب بہادر کی بیٹی ماریہ پر ڈورے ڈال رہا ہے۔

وہ کشتی کے کنارے خاموش کھڑا تھا۔ اب سے پہلے تین بار کیٹی بندر جا چکا تھا۔ دو بار ساحل پر ماریہ سے سامنا ہوا تھا۔ اگرچہ وہ حسین تھی' جوان تھی لیکن وہ عورتوں سے دور رہنے کا عادی تھا۔ ویسے خود اس کی شخصیت اتنی پُرکشش تھی کہ ماریہ اسے دیکھتے ہی اس پر مرمٹی تھی۔ اس نے پہلے دن ماریہ کو نظرانداز کیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ سیپا یعنی کنسولیڈ شیڈ الیکٹرک پاور ایشیا لمیٹڈ کے ڈائریکٹر جنرل سر ہیراللہ جان کی بیٹی ماریہ ہے۔ اس کے ذریعے وہ سیپا کے اندرونی خفیہ معاملات تک پہنچ سکتا ہے۔

ایک مرتبہ اسے ماریہ کی مدد کرنے کا موقع بھی مل چکا تھا' نہ معلوم کس طرح وہ پانی میں گر گئی تھی تو اس نے ماریہ کو پانی سے نکالا تھا۔

وہ تیسری بار کیٹی بندر گیا تو ماریہ نے خود اسے مخاطب کیا اور دوستی کی ابتدا کرنے کے لئے ساحلی ریستوران میں اس کے ساتھ ٹھنڈا مشروب پیا اور اس سے باتیں کرتے رہنے کے بہانے دیر تک اس کے ساتھ رہی پھر اس سے رخصت ہوتے وقت پوچھا۔ "کل ملو گے؟"

"میں کراچی جا رہا ہوں۔ پرسوں آؤں گا۔"

"تم اتنی دور سے آتے ہو۔ کیا یہاں کوئی کاروبار ہے؟"

"میں تفریح کے لئے آتا ہوں۔ سوچا تھا آئندہ نہیں آؤں گا لیکن تم سے مل کر

ارادہ بدل گیا ہے۔ میں پرسوں آؤں گا۔"

اس نے مسکرا کر پوچھا۔ "کیا میری خاطر آؤ گے؟"

"ہاں۔ تم سے مل کر یہ ساحل' یہ سمندر اور یہ آسمان سب کچھ بدل گیا ہے۔ یہ دنیا ایسی رنگین نظر آرہی ہے جیسے پہلے میں بلیک اینڈ وائٹ دنیا میں رہا کرتا تھا۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "تم بہت اچھی باتیں کرتے ہو۔ میں نے تمہیں اب تک یہ نہیں بتایا ہے کہ میں کتنے بڑے باپ کی بیٹی ہوں؟ تم پہلے مقامی جوان ہو' جس سے قریب ہو کر باتیں کر رہی ہوں۔"

"تعجب ہے تم پاکستان میں ہو اور یہاں کے مقامی لوگوں سے دور رہتی ہو۔"

"یہاں کے مقامی لوگ غیرملکیوں کو اور خاص طور پر ہم گوروں کو پسند نہیں کرتے۔"

"ظاہر ہے کسی کی زمین پر جاکر گھر اور دفتر بناکر رہا جائے تو وہ کسی بھی اجنبی کو پسند نہیں کریں گے۔ اگر ہم تمہارے ملک میں جاکر ایسا کریں تو تمہارے لوگ بھی ہمیں کبھی برداشت نہیں کریں گے۔"

"ہاں۔ یہ قدرتی بات ہے۔ ویسے یہاں کے مقامی باشندے ہمیں ناپسند کرنے کے باوجود ہمارے تابعدار ہیں۔ اس ملک کے قانون کے محافظ ہمارے محافظ بن کر رہتے ہیں۔"

"ہاں۔ اگر پولیس اور انتظامیہ کو خرید لیا جائے تو آدھا ملک اپنے قبضے میں آجاتا ہے۔"

"تمہارے لہجے میں طنز ہے۔ کیا ہماری موجودگی تمہیں بھی پسند نہیں ہے؟"

"یہاں کے مقامی لوگ تعلیم سے محروم ہیں اور باہر کی دنیاوی سیاست کو نہیں سمجھتے ہیں۔ مگر ہم تعلیم یافتہ لوگ غیرملکیوں کو اپنی زمین پر زیادہ تعداد میں دیکھ کر تجسس میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اپنا ملک چھوڑ کر یہاں آنے والے کیوں آئے ہیں؟ اور وہ بھی ساحلی سرحدی علاقہ میں۔"

"میں سمجھ گئی' تم جاسوسی کرنے آئے ہو۔"

"میں جاسوس تو نہیں ہوں لیکن ہر محب وطن کو ایک جاسوس کی طرح اپنی آنکھیں کھلی رکھنا چاہئیں۔"

"فار گاڈ سیک۔ ڈیڈی کے سامنے ایسی باتیں نہ کرنا۔ ان کے شکاری کتے تمہارے گوشت پوست کو نوچ ڈالیں گے۔ تم صرف ہڈیوں کا ڈھانچا رہ جاؤ گے۔"

"یعنی ایسی کوئی بات ہے کہ تمہارے ڈیڈی مجھ سے خطرہ محسوس کریں گے۔ جبکہ تم محسوس نہیں کر رہی ہو۔"

"پتا نہیں میرے اندر کیا ہو رہا ہے۔ میرا دل اور دماغ بے اختیار تمہاری طرف کھنچا جارہا ہے۔ میں تمہیں زندہ سلامت دیکھنا چاہتی ہوں اس لئے تمہیں خطرے کا احساس دلا رہی ہوں۔ پلیز یہاں کسی جاسوس کے انداز میں نہ بولو۔ نہ کوئی ایسی حرکت کرو کہ ڈیڈی کے گارڈز تمہیں گولی ماردیں یا تمہارے ہی ملک کی پولیس یہاں تمہارا داخلہ ممنوع کردے۔"

"تعجب ہے۔ آج پہلی تفصیلی ملاقات میں تم اپنے ڈیڈی کی پالیسی کے خلاف میری سلامتی کی باتیں کر رہی ہو۔"

"یہ تمہارے لئے پہلی ملاقات ہے مگر میری تیسری ملاقات ہے۔ پہلے دن میں نے تمہیں دور ہی دور سے دیکھا۔ تم سے متاثر ہوتی رہی اور دل کو سمجھاتی رہی کہ مجھے اس ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں سے دور رہنا چاہئے۔ میں دور تو رہی مگر دوسری بار تمہیں دیکھنے کے لئے بے چین رہی۔ تم تین دنوں کے بعد دکھائی دیئے۔ ان تین دنوں میں پوری نیند نہ سو سکی۔ ہر صبح ایسا لگتا رہا جیسے جاگتی رہی ہوں اور تمہیں سوچتی رہی ہوں۔ میں دوسری بار تمہارے سامنے سے کئی بار گزری۔ انجان بن کر تمہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوششیں کرتی رہی لیکن تمہارے رویے سے اندازہ ہوا کہ تم حسن پرست اور ہوس پرست نہیں ہو۔ تمہارے کردار کی اس خوبی نے میرا دل جیت لیا۔ ہماری جیسی مغربی عورتیں بھی یہ چاہتی ہیں کہ جو ہمارے جسم و جان کا مالک ہو' وہ صرف ہمارا ہی رہے۔ لہٰذا میں نے پانی میں گر کر تمہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔"

"تم نے میرے بارے میں بہت دور تک سوچ لیا اس لئے......... مجھ سے دوستی کرلی۔ ابھی تو میں جارہا ہوں۔ پرسوں آؤں گا تب تک اپنے دل اور دماغ سے پوچھتی رہو کہ ساری عمر دوستی نباہ سکو گی؟ ہمارا ملک' ہماری قوم' ہمارا مذہب اور ہماری تہذیب ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں اور سب سے تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ تمہارے ڈیڈی کو میری حب الوطنی زہر لگے گی۔"

"ہم ڈیڈی کو خبر نہیں ہونے دیں گے اور ملتے رہیں گے۔"

"سوری ماریہ! ہماری تہذیب میں اور ہمارے دین میں گرل فرینڈز اور بوائے فرینڈز بن کر رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر تم شادی کے بعد میری بیوی بن کر رہو گی تب ہی تمہیں ہاتھ لگاؤں گا ورنہ دور سے تمہیں دیکھتا رہوں گا۔"

"تمام مسلمان ایسے نہیں ہوتے۔ تم انتہا پسند مسلمانوں میں سے ہو۔ تم تعلیم یافتہ ہو، تمہیں اپنے اصولوں میں لچک پیدا کرنی چاہئے۔"

"ہم جس عورت کو اپنے گھر کی عزت بنالیتے ہیں اسے لچک دار نہیں بناتے۔ میرا خیال ہے، ہم باتیں کرتے رہیں گے تو بات بڑھتی رہے گی پھر مجھے بھی واپسی میں دیر ہورہی ہے۔ میں جارہا ہوں۔ پرسوں آؤں گا۔"

وہ اسے سوچتا ہوا چھوڑ کر چلا آیا تھا اور اب ایک دن کے وقفے کے بعد جارہا تھا لیکن اس بار وہ پولیس انسپکٹر اس کے ساتھ تھا اور ماریہ سے ملاقات ہونے والی بات اس کے باپ ہیرالڈ جان تک پہنچنے والی تھی۔

اس نے پلٹ کر انسپکٹر کو دیکھا۔ کشتی گھاٹ سے لگ رہی تھی۔ انسپکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "یہاں کی کشتیاں ہماری اجازت کے بغیر ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ نہیں جاتی ہیں۔ تم ہماری مرضی کے خلاف یہاں سے واپس نہیں جاسکو گے۔ فی الحال تم پولیس کی حراست میں ہو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بغیر کسی جرم کے کیوں مجھ سے ایسا سلوک کرنا چاہتے ہو۔ یہاں کیٹی بندر میں ایسی کون سی عدالت ہے، جہاں مجھے لے جا کر تم میرا کوئی جرم ثابت کرنا اور مجھے سزا دلانا چاہتے ہو؟"

"میں تمہیں سر ہیرالڈ جان کی عدالت میں لے جارہا ہوں۔ تم نے میرے پوچھنے پر نہیں بتایا۔ اس عدالت میں بتانا ہوگا ان علاقوں میں کیوں آتے ہو؟"

وہ سپاہیوں کے نرغے میں کشتی سے اتر کر کنارے پر آیا۔ اس کے آگے انسپکٹر تھا۔ اسی وقت ایک خوبصورت سی مہنگی کار آکر رکی۔ ماریہ دروازہ کھول کر باہر آئی۔ انسپکٹر اور سپاہیوں نے اسے دیکھتے ہی ایسے سیلوٹ کیا جیسے وہ ان کی افسر ہو۔ اس نے انہیں نظر انداز کیا۔ آگے بڑھتے ہوئے "وہ" سے کہا۔ "میں صحیح وقت پر پہنچی ہوں۔ ادھر کشتی گھاٹ سے لگی اور میں آگئی۔ آؤ ہم چلیں۔"

انسپکٹر نے پریشان ہو کر کہا۔ "مس صاحبہ! یہ قیدی ہے۔ ہم اسے آپ کے ڈیڈی کے پاس لے جارہے ہیں۔"

ماریہ نے کہا۔ "اسے قیدی نہ کہو۔ یہ میرا مہمان ہے۔ اسے میں لے جارہی ہوں۔"

وہ ماریہ کے ساتھ چلتے ہوئے رک کر انسپکٹر سے بولا۔ "حسرت ان غنچوں پہ جو بن کھلے مرجھا گئے۔"

انسپکٹر نے اسے غصے سے دیکھا۔ وہ مسکراتا ہوا ماریہ کے ساتھ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ماریہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہاں سے جانے لگی۔ اس نے پوچھا۔ "تم مجھے قیدی بنا کر کہاں لے جارہی ہو؟"

"اچھا تو تم خود کو میرا قیدی سمجھ رہے ہو؟"

"پچھلی ملاقات میں تم نے کچھ اس طرح ٹوٹ کر اپنی محبت کا اظہار کیا تھا کہ میں پہلی بار محبت کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتا رہا اور محسوس کرتا رہا کہ تم بڑے پیار سے مجھے زنجیریں پہنا رہی ہو۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "میں یہ سن کر خوش ہورہی ہوں کہ میں تمہارے دل میں جگہ بنانے لگی ہوں۔ ویسے ایک خوشی کی بات یہ ہے کہ میں تمہیں اپنے ڈیڈی سے ملانے جارہی ہوں۔"

"او گاڈ! تم نے اتنی جلدی اپنے ڈیڈی کو اپنے اور میرے متعلق بتادیا ہے؟"

"میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں بتایا ہے۔ دراصل میں تنہا تفریح کے لئے اس علاقے میں جہاں بھی جاتی ہوں، ڈیڈی کے جاسوس چھپ چھپ کر میری نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے ہماری پچھلی ملاقات کے سلسلے میں ڈیڈی کو بتادیا ہے۔"

"پھر تو تمہارے ڈیڈی نے میرے بارے میں بہت کچھ تم سے پوچھا ہوگا؟"

"انہوں نے معمولی سا اعتراض کیا۔ پاکستان لانے سے پہلے انہوں نے مجھے اچھی طرح سمجھایا تھا کہ میں یہاں کسی بھی مقامی مرد یا عورت سے دوستی نہیں کروں گی۔ میں نے ڈیڈی سے وعدہ کیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہیں دیکھ کر میں پاگل ہوجاؤں گی۔"

"تم نے میرے بارے میں کیا بتایا ہے؟"

"صرف اتنا کہا ہے کہ تم ایک تعلیم یافتہ اور مہذب شخص ہو۔ میرے دل نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ وقت گزاروں اس لئے پرسوں تمہارے ساتھ ساحل پر تھی۔"

"تمہارے ڈیڈی نے کچھ تو پوچھا ہوگا کہ میں کون ہوں اور کیا کرتا ہوں۔ کراچی جیسے بڑے شہر سے ان ویران علاقوں میں کیوں آتا ہوں؟"

"نہیں۔ انہوں نے مجھ سے ایسا کوئی سوال نہیں کیا ہے۔ صرف اتنا کہا ہے کہ آئندہ ملاقات ہو تو میں تمہیں اپنے ساتھ بنگلے میں لے آؤں۔ وہ تمہارے ساتھ چائے پینا چاہتے ہیں۔"

وہ دل میں کہنے لگا۔ "بڑے لوگوں کے ساتھ جو چائے پی جاتی ہے، اس میں زہریلی مٹھاس ہوتی ہے۔ ایسی چائے پلانے والے بظاہر میٹھے ہوتے ہیں لیکن پس پردہ زہریلے

اقدامات کرتے ہیں۔ ماریہ کا باپ یقیناً میرے متعلق رازداری سے معلومات حاصل کررہا ہوگا اور کچھ مجھ سے مل کر میری باتوں سے بہت کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا۔"

ماریہ کی کار ایک بڑے سے بنگلے کے احاطے میں پہنچ کر رک گئی۔ وہ اس کے ساتھ کار سے اتر کر دیکھنے لگا۔ مسلح گارڈز کئی جگہ نظر آرہے تھے۔ اس بنگلے کے آس پاس سے کسی مقامی باشندے کو گزرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ پہلا پاکستانی جوان تھا' جو ماریہ کے ساتھ اس بنگلے کے اندر آیا تھا۔ ماریہ نے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر کہا۔ "یہاں بیٹھو۔ میں ابھی ڈیڈی کو بلا کر لاتی ہوں۔"

وہ ڈرائنگ روم سے چلی گئی۔ ایک سیکورٹی افسر نے آکر کہا۔ "سر! آپ مس صاحبہ کے ساتھ آئے ہیں اس لئے باہر آپ کی تلاشی نہیں لی۔"

وہ صوفے سے اٹھ کر بولا۔ "بے شک تمہیں اپنی ڈیوٹی کرنی چاہئے۔" اس سیکورٹی افسر نے ڈیٹکٹو آلے سے اسے سر تاپا چیک کیا۔ پھر مطمئن ہوکر چلا گیا۔

پھر دو گن مین آکر اس کے سامنے ذرا دور جاکر کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے کلاشنکوف کو اس طرح پکڑا تھا جیسے اسے نشانے پر رکھا ہو۔ تھوڑی دیر بعد ایک صحت مند بوڑھا انگریز ماریہ کے ساتھ آیا۔ ماریہ نے کہا۔ "یہ میرے ڈیڈی ہیں اور یہ وہی ہیں۔ ان کا نام عجیب سا ہے۔ مسٹرہی۔ یعنی وہ۔"

ہیرالڈ جان نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔ میں بہت مصروف رہتا ہوں۔ کسی سے ملاقات نہیں کرتا لیکن اپنی بیٹی کی خوشی کے لئے تمہارے ساتھ چائے پینے تک گفتگو کروں گا۔"

وہ دونوں کچھ فاصلے پر آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ اس نے بیٹی سے کہا۔

"ڈارلنگ بے بی! تم جاؤ اور چائے بھیج دو۔"

ماریہ مسکراتے ہوئے چلی گئی۔ ہیرالڈ جان نے پوچھا۔ "تم نے میری بیٹی سے کب اور کیسے ملاقات کی تھی؟"

"میں نے نہیں' آپ کی صاحبزادی نے پرسوں.......... مجھ سے ملاقات کی تھی۔"

"میری بیٹی بہت بھولی ہے۔ ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھ لیتی ہے۔ بائی دا وے تم کرتے کیا ہو؟"

"کراچی میں مڈل کلاس والوں کے لئے ایک ریسٹوران ہے۔ میں اس کا مالک ہوں۔ میرے ملازم دیانت داری سے کام کرتے ہیں۔ میں بے فکری سے گھومتا پھرتا رہتا ہوں۔ میرے والدین وفات پاچکے ہیں۔ رشتے داروں سے کوئی خاص تعلق نہیں رہتا

کتنی بڑی کمپنی ہے اور ایک ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے مجھ پر کتنی بڑی بڑی اہم ذمے داریاں ہیں۔ ایک ذرا سی کوتاہی ہوجائے تو میں نیچے سے اوپر تک تمام عہدیداروں سے جواب طلب کرتا ہوں۔ اگر تمہاری ضد کے باعث کوئی گڑ بڑ ہوجائے گی اور مجھ سے جواب طلب کیا جائے گا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا اور میرے تمام سروس ریکارڈ پر کالک پھر جائے گی۔ لہٰذا بے جا ضد نہ کرو اور یہاں سے جاؤ۔ مسٹروہ میں چائے پی چکا ہوں۔ تم بھی پیالی خالی کرو۔"

وہ بولا۔ "اوہ میں باتوں میں چائے پینا بھول گیا تھا اور اب تو یہ ٹھنڈی ہوچکی ہے۔ کوئی بات نہیں' چائے پینا اتنا ضروری نہیں ہے۔"

ماریہ........ گہری نظروں سے باپ کو دیکھ رہی تھی۔ باپ نے پوچھا۔ "اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟"

"سوچ رہی ہوں کہ ممی کے انتقال کے بعد آپ نے دوسری شادی نہیں کی۔ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ مجھے دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں۔ بے شک میری ہر خواہش پوری کرتے ہیں لیکن آج آپ میرا دل توڑ رہے ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے۔ میں اپنے فرائض سے مجبور ہوں۔ تمہاری خاطر اتنی رعایت کرتا ہوں کہ تم مسٹروہ کے ساتھ شام تک اس شہر میں گھوم سکتی ہو اور گھاٹ تک جاکر انہیں الوداع کہہ سکتی ہو۔ اس کے بعد پھر مسٹروہ یہاں کبھی نہیں آئیں گے۔"

"ڈیڈی! دو دن سے میرے آپ کے درمیان بحث ہورہی ہے اور آپ میری خاطر اپنے اصولوں میں کوئی لچک پیدا نہیں کررہے ہیں لیکن میں بھی آپ کی بیٹی ہوں۔ میں نے بھی کچھ سوچ رکھا ہے۔"

"کیا سوچ رکھا ہے؟"

وہ بولی۔ "آپ نے یہاں کی حکومت سے جو معاہدہ کیا ہے' اس میں یہ شرط رکھی ہے کہ مسٹروہ جیسے پاکستانیوں کو کیٹی بندر آنے کی اجازت نہیں دی جائے گی لیکن معاہدے میں یہ کہیں لکھا ہوا نہیں ہوگا کہ آپ کی بیٹی کیٹی بندر سے باہر جاکر اپنے کسی فرینڈ سے نہیں ملے گی۔ لہٰذا مسٹروہ پر پابندی عائد کی جائے گی تو میں یہاں سے دوسرے علاقوں میں جاکر اپنے فرینڈ سے ملتی رہوں گی۔"

ہیرالڈ جان نے پریشان ہوکر کہا۔ "تمہارا دماغ چل گیا ہے؟ کیٹی بندر سے باہر اگرچہ پاکستانی پولیس ہمیں تحفظ دیتی ہے لیکن ہمارے اپنے سیکورٹی گارڈز اتنے زیادہ نہیں ہیں کہ وہ دوسرے علاقوں میں تمہاری نگرانی کرتے رہیں۔"

"آپ کو یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ جب میں کیٹی بندر کے باہر جاؤں گی تو مسٹروہ کے ساتھ کراچی اور دوسرے شہروں میں بھی جاسکوں گی۔ واقعی آپ کے اتنے سیکورٹی گارڈز نہیں ہیں کہ پورے پاکستان میں ہمارا پیچھا کرسکیں۔"

وہ غصے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر بولا۔ "تم بہت سر چڑھ گئی ہو لیکن میں اپنے فرائض کی خاطر کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ میں تمام گارڈز کو حکم دوں گا کہ وہ تمہیں اس بنگلے سے باہر نہ جانے دیں پھر تم کیٹی بندر سے باہر کیسے جاسکو گی؟"

"اگر مجھے یہاں کی چاردیواری میں قید کیا گیا تو میں بھوکی پیاسی مرجاؤں گی۔ آپ آزمالیں کہ میں کتنی ضدی ہوں۔ اس لمحے سے ایک دانہ بھی منہ میں نہیں رکھوں گی اور ایک قطرہ پانی بھی نہیں پیؤں گی۔ آپ اور آپ کے گارڈز مجھے مرنے سے نہیں روکیں گے۔"

وہ بے بسی سے بیٹی کو دیکھنے لگا......... پھر بولا۔ "تم میرے لئے پرابلم پیدا کررہی ہو۔"

"کوئی پرابلم نہیں ہے۔ مسٹروہ کی ضمانت میں لیتی ہوں۔ یہ تنہا آتے ہیں۔ آپ کے جاسوس جب میری نگرانی کرتے ہیں تو میرے فرینڈ کی بھی نگرانی کرسکتے ہیں۔"

ہیراللہ جان نے وہ کو ناگواری سے دیکھتے ہوئے سوچا پھر بیٹی سے کہا۔ "تم باپ کی کمزوری کو خوب سمجھتی ہو کہ میں تمہاری آنکھ میں کبھی آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ تم بھوکی رہوگی تو میرے حلق سے لقمہ نہیں اترے گا۔ میں تمہاری طرف سے پریشان رہ کر اپنے فرائض صحیح طرح انجام نہیں دے سکوں گا۔"

اس نے ایک گہری سانس لی پھر سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ "آل رائٹ تمہارے فرینڈ پر پابندی نہیں لگائی جائے گی۔ تم اس کے ساتھ جاؤ لیکن کیٹی بندر سے باہر کبھی نہ جانا۔ ورنہ تمہارے فرینڈ کو اسی لمحے گولی ماردی جائے گی۔ بس اب جاؤ اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔"

وہ خوش ہوکر وہ کے ساتھ جانے لگی۔ ہیراللہ جان نے ایک گارڈ سے کہا۔ "باہر انسپکٹر کھڑا ہوا ہے۔ اسے بلاکر لاؤ۔"

ماریہ اپنے محبوب کے ساتھ باہر چلی گئی۔ انسپکٹر نے اندر آکر ہیراللہ جان......... کو دیکھ کر سلیوٹ کیا پھر کہا۔ "لیس سر! کیا حکم ہے؟"

اسے ایک پولیس افسر کی وردی پہن کر کسی غیر ملکی کمپنی کے عہدیدار کو سلیوٹ نہیں کرنا چاہئے تھا لیکن وہاں کی پولیس اور انتظامیہ سیپا کے ڈائریکٹر جنرل کی تابع دار

تھی۔ انسپکٹر سلیوٹ کرنے کے بعد اٹینشن کھڑا اپنے غیر ملکی مائی باپ کے حکم کا منتظر تھا۔

ہیراللہ جان نے باہر کار کے اسٹارٹ ہونے اور دور جانے کی آواز سنی۔ اسے یقین ہوگیا کہ بیٹی اپنے فرینڈ کے ساتھ جاچکی ہے۔ اس نے انسپکٹر سے کہا۔ "اس جوان کی شخصیت ایسی بھی پرکشش نہیں ہے کہ اس کی خاطر ایک بیٹی اپنے باپ سے بغاوت کرنے لگے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس نے بے بی پر جادو کیا ہے۔"

"لیس سر! اس نے جادو کیا ہوگا۔"

"نان سینس! میں جادو ٹونے پر یقین نہیں کرتا لیکن حیران ہوں کہ اس میں آخر کیا ہے؟ بے بی اس کے لئے پاگل ہورہی ہے۔"

"مس صاحبہ ابھی بچی ہیں۔ نادان ہیں۔ آپ حکم دیں تو اس جوان کو گولی مار کر سمندر میں پھینک دیں۔"

ہیراللہ جان نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھاکر نمبر ڈائل کئے۔ رابطہ قائم ہونے پر کہا۔

"ہیلو.........! میں سیپا کا ڈائریکٹر جنرل بول رہا ہوں۔ کراچی میں ایک نوجوان ہے۔ اس کے شناختی کارڈ میں نام کی جگہ مسٹروہ لکھا ہوا ہے۔ وہ ایک بی کلاس ریسٹوران کا مالک ہے۔ وہ منع کرنے کے باوجود یہاں آتا ہے۔ میں ایک پولیس انسپکٹر کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ وہ اس جوان کی نشاندہی کرے گا۔"

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ "سر! آپ کیا چاہتے ہیں؟ اسے گرفتار کرکے سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جائے؟"

"نہیں۔ گرفتار کرنے سے وہ اپنے ذرائع سے رہا ہوسکتا ہے۔ اسے اس طرح ٹھکانے لگانا ہے جیسے دہشت گردوں نے اسے گولی ماری ہو۔"

"سر! آپ جیسا چاہتے ہیں' ویسا ہوگا اور کوئی حکم؟"

"دیٹس آل۔"

اس نے ریسیور رکھ کر انسپکٹر سے کہا۔ "آج وہ جوان واپس جائے تو تم بھی اس کے ساتھ کسی سرکاری کام کے بہانے جاؤ اور دیکھو کہ اس کی رہائش گاہ اور ریسٹوران کراچی میں کہاں ہے۔ اس کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرو پھر......... ملاقات کرو۔"

"سمجھ گیا سر! میں تمام احکامات کی تعمیل کروں گا۔"

وہ سلیوٹ کرکے چلا گیا۔ اس نے پھر فون کے ذریعے رابطہ کیا اور پوچھا۔ "وہ دونوں کہاں ہیں؟"

دوسری طرف سے جواب ملا۔ "سر! مس صاحبہ کار ڈرائیو کررہی ہیں اور وہ ساتھ

ں سیٹ پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ مارکیٹ کی طرف جا رہے ہیں۔"

"ان پر نظر رکھو اور ہر آدھے گھنٹے بعد میرے سیکرٹری کو رپورٹ دیتے رہو۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر سنجیدگی سے کچھ سوچنے
۔

ماریہ سست رفتاری سے کار ڈرائیو کر رہی تھی اور بڑی دیر سے خاموش رہ کر کچھ چ رہی تھی۔ وہ بولا۔ "خاموش کیوں ہو؟"

ماریہ چونک کر بولی۔ "آں؟ ہاں تم بھی تو خاموش ہو۔ کیا سوچ رہے ہو؟"

"میرا خیال ہے' ہم دونوں ایک ہی بات سوچ رہے ہیں۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ ایسی رکاوٹیں رہیں گی تو ہم ہمیشہ کے لئے کیسے ایک ہو پائیں گے؟"

وہ حیرانی سے بولی۔ "کمال ہے۔ کیا تم دماغ میں گھس کر خیالات پڑھ لیتے ہو؟ میں سوچ رہی تھی کہ ڈیڈی سختی سے تمہاری مخالفت کیوں کر رہے ہیں۔"

"آج مجھے تمہارے بارے میں دو اہم باتیں معلوم ہوئیں۔"

"ایک تو یہ کہ تم مجھے دل و جان سے چاہتی ہو۔ آج میرے لئے اپنے ڈیڈی سے رہی تھیں۔ آئندہ میری خاطر ساری دنیا سے لڑ سکتی ہو۔"

"ایسا وقت آئے گا تو میں تمہارے یقین پر پوری اتروں گی۔"

"آج دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ تمہارے ڈیڈی تم سے بے انتہا پیار کرتے ں۔ سخت مزاج اور اصول پسند ہونے کے باوجود وہ تمہاری ضد کے آگے ہار گئے۔ بہت ھ دار ہیں۔ انہوں نے تمہیں باغی بن جانے کا موقع نہیں دیا۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "اس میں شبہ نہیں کہ وہ مجھے بہت زیادہ چاہتے ہیں۔ میری ہر ضد ری کرتے ہیں۔"

"حالات بتا رہے ہیں کہ تم جلد ہی ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہو گی۔ جب یہ فیصلہ ن کر پاؤ گی کہ اپنے ڈیڈی کو زیادہ چاہتی ہو یا مجھے؟"

"میں دونوں کو دل و جان سے زیادہ چاہتی ہوں۔"

"اگر بچھڑنے کا وقت آئے کہ تمہیں مجھ سے جدا ہونا ہو گا یا ڈیڈی کو چھوڑ کر رے ساتھ بھاگنا ہو گا تو کیا کرو گی؟"

وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر بولی۔ "ننانوے فیصد لڑکیاں اپنے باپ سے محبت رتی ہیں لیکن ایک دن اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔"

"وہ باپ کی رضامندی سے جاتی ہیں۔ مگر تمہارا معاملہ مختلف ہے۔ تمہیں باپ کی رضامندی حاصل نہیں ہو گی۔ میرے ساتھ زندگی گزارنے کی خاطر تمہیں ہمیشہ کے لئے باپ کو چھوڑنا ہو گا۔ پھر یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ تمام عمر دوست بن کر رہو گی یا شریکِ حیات؟ پھر یہ کہ شریکِ حیات بن کر رہنے کے لئے تم کسی دباؤ کے بغیر اپنی مرضی سے اسلام قبول کرو گی۔"

وہ مارکیٹ روڈ سے گزر رہے تھے۔ جیسا کہ ہیرالڈ جان کے ایک جاسوس نے اطلاع دی تھی لیکن وہ کچھ خریدنے کے لئے مارکیٹ میں نہیں رکے۔ آگے بڑھتے ہوئے سمندر کے ساحل کی طرف جانے لگے۔ ماریہ نے کہا۔ "ہاں تمہیں پانے کے لئے مجھے بڑی آزمائشوں سے گزرنا ہو گا۔ اگر تم چاہو تو صرف بوائے فرینڈ رہ کر مجھے تمام آزمائشوں سے بچا سکتے ہو۔"

"ماریہ! سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم دوست بن کر ایک دوسرے کے قریب رہیں گے تو جذبات بھڑکیں گے اور ہم بے قابو ہو کر گناہ کے راستے پر چل پڑیں گے۔"

"تم اسے گناہ کیوں کہتے ہو؟ یہ تو انسانی فطرت اور عمر کے تقاضے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں لڑکے لڑکیاں آزادی سے ایک دوسرے کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ اس طرح ملکوں' قوموں اور مذہبوں کا فرق مٹا کر فراخدلی سے صرف انسانی رشتے قائم رکھتے ہیں۔"

"انسانی نہیں' حیوانی رشتے قائم کرتے ہیں۔ ہمارے دین میں قرآنی احکامات کے مطابق رشتے قائم کئے جاتے ہیں۔"

"کیا کروڑوں مسلمان گناہ نہیں کرتے ہیں؟"

"اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باقی مسلمان بھی گناہ کرتے رہیں۔ کیا تم راستہ چلتے وقت گندگی اور کیچڑ سے بچ کر نہیں چلتی ہو؟ یہ عام سی سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ جراثیم سے پاک رہنے کے لئے ہم غسل کرتے اور صاف ستھرے رہتے ہیں اور یہ عمل ہمیں سمجھاتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں ہمیں اپنے جسم کو اور اپنے ذہن کو پاک رکھنا چاہئے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ پاکیزگی اور صفائی نصف ایمان ہے۔"

"میں مذہب کے مسائل پر تم سے بحث نہیں کر سکوں گی۔ پہلی بار جب تم نے مجھے گرل فرینڈ بنانے اور خود بوائے فرینڈ بننے پر نکتہ چینی کی تو یہ سوچ کر مایوسی ہوئی کہ تم بڑے ہی فرسودہ اور پسماندہ رہنے والے خیالات کے حامل ہو۔ میں نے بعد میں غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ باقاعدہ شادی کے بعد عورت کو یہ تحفظ حاصل ہوتا ہے کہ اس کا آئیڈیل

ائے فرینڈ تاحیات اسی کا ہو کر رہتا ہے اور یہ کہ تم میری بہتری چاہتے ہو۔ ایک بازاری
رت کی طرح مجھے دوسرے، تیسرے کی گرل فرینڈ بننے والی بے حیائی سے محفوظ رکھنا
اہتے ہو۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تمہاری تہذیب اور مزاج کے خلاف میں نے جو بہتری کی باتیں
یں، تم نے اس پر غور کیا اور انہیں درست تسلیم کیا ہے۔ اب مجھے یقین ہے کہ میں
اور اپنے ملک کی بہتری کے لئے جو بات کہوں گا، اس پر بھی تم سنجیدگی سے غور کرو گی
میری بات کو درست تسلیم کرو گی۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کسی بھی ملک کے ساحلی سرحدی علاقوں میں غیر ملکی افراد سینکڑوں اور ہزاروں کی
اد میں آ کر آباد ہونے لگیں تو شبہ ہوتا ہے کہ اپنا ملک بیچنے والے مفاد پرستوں نے ان
باد غیر ملکیوں سے کوئی ایسا سودا کیا ہے جس سے ہمارے ملک کو اور ہماری قوم کو نقصان
نے والا ہے۔"

"میں سمجھ گئی۔ تمہارا خیال ہے کہ میرے ڈیڈی نے سیپا کے ڈائریکٹر جنرل کی
بت سے جو معاہدہ تمہاری حکومت سے کیا ہے، وہ مشکوک ہے۔ سیپا کمپنی یہاں بجلی گھر
نے کی آڑ میں کچھ اور کرنے آئی ہے۔"

"ہاں۔ تم بولو۔ کیا ایک محبِ وطن کی حیثیت سے ہمیں شبہ کرنے اور حقیقت
م کرنے کا حق نہیں ہے؟"

"بے شک تمہیں حق حاصل ہے۔ ڈیڈی جس انداز سے تمہاری مخالفت کر رہے ہے
اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تمہیں دشمن سمجھ رہے ہیں۔ جبکہ وہ تمہارے ہی ملک
یں۔ تمہیں دشمن سمجھنے کی کوئی وجہ ہو گی۔"

"تم ذرا غور کرو۔ اگر صرف یہاں بجلی گھر بنایا جائے گا تو اس میں اس قدر محتاط رہنا
ضروری ہے کہ ہماری یہاں آمد پر پابندیاں عائد کی جائیں اور یہاں آنے والے
نیوں کو خواہ مخواہ دہشت گرد سمجھا جائے؟"

"سیدھی سی بات ہے، تمہیں اپنا شبہ دور کرنا چاہئے۔ کیا تم نے سوچا ہے کہ شبہ
طرح دور کیا جاسکتا ہے؟"

"وہ اصل معاہدہ جو ہماری حکومت اور سیپا کے درمیان ہوا ہے، میں اسے پڑھ کر
ن ہو سکتا ہوں۔"

"یہاں ڈیڈی کے دفتر میں سخت سیکورٹی کے انتظامات ہیں۔ ان کے خاص دفتری

کمرے میں ان کی اجازت کے بغیر چپراسی بھی قدم نہیں رکھ سکتا ہے۔ جہاں وہ ریوالونگ
چیئر پر بیٹھتے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک بڑا سا آہنی سیف ہے جس میں اہم دستاویزات رکھی
رہتی ہیں۔"

"وہ دستاویزات مختلف فائلوں میں ہوں گی۔ کیا تم نے کبھی توجہ سے انہیں دیکھا
ہے؟"

"بہت زیادہ توجہ سے نہیں دیکھا پھر بھی یاد ہے کہ ایک فائل پر کیٹی بندر پاور ہاؤس
بجلی گھر لکھا ہوا تھا۔"

"کیا اس فائل پر سرخ فیتہ لگا ہوا تھا۔"

وہ سوچنے لگی۔ اس نے سمندر کی ساحلی سڑک کے کنارے گاڑی روک دی۔
پیشانی کو ایک انگلی سے سہلاتے ہوئے بولی۔ "میں ذرا الجھ گئی ہوں۔ میں نے سرخ فیتے
والی فائل دیکھی تو ہے لیکن شاید اس پر کیٹی بندر پاور ہاؤس نہیں لکھا ہوا تھا۔ مجھے یاد
نہیں آ رہا ہے۔ اس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔"

وہ سمجھ گیا کہ سرخ فیتے والی فائل پر "ٹاپ سیکرٹ" لکھا ہو گا۔ وہ انجان بن کر
بولا۔ "تم تنہائی میں یاد کرو گی تو شاید یاد آ جائے۔ ویسے وہ معاہدہ کیٹی بندر پاور ہاؤس والے
فائل میں ہو گا۔ وہ معاہدہ کسی طرح پڑھنے کو مل جائے تو میں مطمئن ہو جاؤں گا۔"

"مشکل ہے۔ ڈیڈی راضی نہیں ہوں گے کہ سیپا سے کیا ہوا کاروباری معاہدہ کوئی
غیر متعلق شخص پڑھے۔ وہ اصولوں کے سخت پابند ہیں۔"

"یہ تو واقعی اصولی بات ہے کہ بڑے پیمانے پر کئے جانے والے معاہدوں کو دوسروں
سے چھپایا جاتا ہے لیکن میں اسے ہر حال میں پڑھنا چاہوں گا۔"

وہ دونوں تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر سوچتے رہے پھر وہ بولی۔ "بہتر ہے، پہلے ہم
اپنے بارے میں یہ طے کریں کہ ہمیں تاحیات ازدواجی زندگی گزارنے کے لئے کیا کرنا
ہے؟ اس کے بعد ہم اس معاہدے کی بات کریں گے۔"

وہ بولا۔ "یہ فیصلہ میں نے تم پر چھوڑا ہے کہ میرے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے
کے لئے تم کیا کر سکتی ہو؟"

"میں تین دن سے سوچ رہی ہوں کہ تمہیں اپنا بنانے کے لئے مجھے اپنا مذہب چھوڑ
کر اسلام قبول کرنا چاہئے یا نہیں؟ دل و دماغ میں یہی ایک بات نقش رہی کہ میں
تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔ اگر میں نے خود پر جبر کیا اور تم سے دور رہی تو ایب نارمل
زندگی گزاروں گی۔"

وہ نفسیاتی پہلو سے درست کہہ رہی تھی۔ انسان کو جو چیز حاصل نہ ہو' اس کے حصول کے لئے وہ ساری زندگی بے چین رہتا ہے۔ اگر کچھ قربانیاں دے کر اسے حاصل کرسکتا تھا تو پھر کیوں حاصل نہیں کیا۔ بعد میں وہ پچھتاتا رہتا ہے۔

اس نے پوچھا۔ "تم ابھی کشمکش میں ہو؟ یا کسی نتیجے پر پہنچ رہی ہو؟"

"میں کہہ چکی ہوں' تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں تمہارا دین اسلام قبول کروں گی۔ ڈیڈی کو بھی چھوڑ کر تمہارے ساتھ جاؤں گی لیکن.........."

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا پھر بے چینی سے پہلو بدل کر اس کی طرف گھوم کر کہا۔ "لیکن میں تمہارے لئے مصیبت بن جاؤں گی۔"

"مصیبت کیسے بنوگی؟ ایسی کیا بات ہے؟"

"تم نہیں جانتے۔ میرے ڈیڈی یہاں سے یوکے اور امریکا تک وسیع ذرائع کے مالک ہیں۔ میں تمہارے ساتھ کہیں بھی جاؤں گی تو ان کے جاسوس اور آلۂ کار تمہارا پیچھا کریں گے۔ شاید وہ مجھے نقصان نہ پہنچائیں لیکن تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "تم میری فکر ایسے کر رہی ہو جیسے مجھے کبھی موت نہیں آئے گی۔ کاتب تقدیر نے میری موت کا جو وقت مقرر کیا ہے' اس سے پہلے تمہارے ڈیڈی کے آلۂ کار مجھے مار نہیں سکیں گے۔"

"میں سمجھتی ہوں' تم بہت بہادر ہو.......... یہاں جان ہتھیلی پر لے کر آتے ہو لیکن تمہیں کچھ ہوجائے گا تو میں بالکل تنہا.......... رہ جاؤں گی۔ ڈیڈی مجھے زبردستی واپس لے جائیں گے تو تمہارے بغیر جی نہیں سکوں گی۔"

"مجھ سے صرف محبت نہ کرو۔ مجھ پر اعتماد بھی کرو۔ میں تمہاری خاطر موت سے لڑتا رہوں گا۔"

"میں سچ کہتی ہوں۔ زندگی میں پہلی بار اپنے ڈیڈی سے زیادہ تم پر بھروسا کرنے لگی ہوں۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے کہ تم جہاں جاؤگے' وہاں جاؤں گی۔"

"تمہاری محبت میرا حوصلہ اور بڑھا رہی ہے۔ میں اس معاہدے کو پڑھ کر مطمئن ہو کر اسی دن تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"اب سوال یہ ہے کہ تم وہ معاہدہ کس طرح پڑھ سکوگے؟ یا ہم کس طرح اسے چرا کر لے جاسکیں گے؟"

وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ "کیا میں ڈیڈی سے ضد کروں کہ وہ تمہیں معاہدہ پڑھنے کو دیں؟"

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ کر بولا۔

"تمہارے ڈیڈی نادان نہیں ہیں۔ وہ میرے یہاں آنے کا مقصد سمجھ رہے ہوں گے۔ اگر معاہدہ.......... سیدھا اور صاف کاروباری ہوگا تو وہ تمہاری ضد مان کر مجھے پڑھنے کے لئے پیش کرسکتے ہیں.......... اگر اس معاہدہ میں ہمارے ملک کو کسی طرح نقصان پہنچانے والی بات ہوگی تو وہ تمہاری ضد کے آگے کبھی نہیں جھکیں گے۔ وہ میرے اور زیادہ دشمن ہوجائیں گے۔"

"ابھی وہ میرے ڈیڈی ہیں۔ میں بیٹی ہوں' اپنی بات منواؤں گی۔ جب وہ تمہارے جانی دشمن بن جائیں گے تو تم پلاننگ کرو کہ ہم کس طرح اس معاہدے کو چرا کر یہاں سے لے جاسکتے ہیں؟"

"ٹھیک ہے۔ تم ایک بیٹی کی حیثیت سے کوشش کرو۔ ناکام ہوجاؤگی تو میں تمہیں بتاؤں گا کہ کس طرح اسے چرایا جاسکے گا۔"

"ڈیڈی کو قائل کرنے کے لئے مجھے کچھ وقت چاہیئے۔ شاید کل تک کامیابی حاصل کرسکوں۔ تم پرسوں آؤ۔ پھر ہمیں جو کرنا ہے' وہ کر گزریں گے۔"

"آئی لو یو ماریہ! تم واقعی مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میری خوشی کو اپنی خوشی اور میری ضرورت کو اپنی ضرورت سمجھ رہی ہو۔"

ماریہ نے آگے کو جھک کر اس کی گردن میں بانہیں ڈالیں اور کہا۔ "میں تمہارے لئے پتا نہیں اور کتنی حدوں سے گزر سکتی ہوں۔ تم کم از کم ایک حد پار کرو۔ ایک بار مجھے سینے سے لگالو۔"

وہ بولا۔ "پلیز ماریہ! سمجھنے کی کوشش کرو۔ گناہ کی ابتدا اسی طرح ہوتی ہے۔ پہلے چھونے کو جی چاہتا ہے' پھر پکڑنے کو اور پھر جکڑ لینے کو جی کرتا ہے۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں' اپنی اس چھوٹی سی خواہش سے آگے نہیں بڑھوں گی۔ شادی ہونے تک اسی حد میں رہوں گی۔"

وہ اس کی توقع سے زیادہ تعاون کر رہی تھی۔ اس لئے وہ اسے مایوس یا ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے خواہش پوری کردی۔ دو دل ایک ساتھ مل کر دھڑکنے لگے۔

☆======☆======☆

وہ تینوں اندھا دھند دوڑتی جارہی تھیں۔ جبکہ ریت پر دوڑنا تو کیا چلنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ ریت میں پاؤں دھنستے جاتے ہیں لیکن ان تینوں نے پیدا ہونے کے بعد جب سے چلنا سیکھا تھا تب سے تھر کے ریگستانی علاقوں میں ننگے پاؤں چلتی رہی تھیں۔ وہ ریت کی اونچی

ی زمین' ریت کے پہاڑ اور ریت کے جان لیوا گڑھے دیکھتی آئی تھیں۔

وہ ایک جگہ رک کر ہانپنے لگیں۔ وحشت زدہ ہرنیوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ بہت دور سے گھنٹیوں کی دھیمی سی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ گھنٹیاں اونٹوں کی گردنوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ وہ ان اونٹوں پر شکاری ہتھیار لئے بیٹھے تھے۔ ان کے لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ غیر ملکی ہیں۔ شکار کھیلنے کے شوقین ہیں۔ جانوروں سے لے کر انسانوں تک جو بھی ان کا مطلوب و مرغوب ہو' اسے دوڑا دوڑا کر شکار کرتے ہیں۔

اس وقت تینوں لڑکیاں ان کی مطلوب تھیں اس لئے وہ بڑے اطمینان سے مزے لے لے کر انہیں دوڑا رہے تھے لیکن یہ اطمینان تھا کہ وہ ہاتھ آ جائیں گی۔ بھاگتے بھاگتے بے دم ہو کر گر پڑیں گی۔ گھنٹوں دوڑتے رہنے کے باعث پیاس سے نڈھال ہو کر اٹھنے بیٹھنے کے بھی قابل نہیں رہیں گی۔

شکاری ایک غیر ملکی رئیس اعظم تھا۔ دھوپ کی تپش سے محفوظ رہنے کے لئے محمل والے اونٹ پر سوار تھا۔ اس کے خاص حواری چھ اونٹوں پر تھے۔ باقی آٹھ اونٹوں پر خیمے لگانے اور کھانے پینے کا سامان تھا۔ وہاں کے مقامی ملازم ان پندرہ اونٹوں کے ساتھ دوڑتے جا رہے تھے۔ اس شان و شوکت کے ساتھ وہ رئیس اعظم شکاری عیش و آرام کا تمام سامان لئے ایک قافلے کی صورت میں جا رہا تھا۔

ان پندرہ اونٹوں کی گردنوں میں جان بوجھ کر گھنٹیاں باندھی گئی تھیں تاکہ شکار ہونے والی لڑکیاں گھنٹیوں کی آواز سن کر خوفزدہ ہوتی رہیں اور یہ سمجھتی رہیں کہ شکاری آ رہے ہیں اور وہ پیچھا چھوڑنے والے نہیں ہیں۔

ان میں سے ایک کا نام کلثوم تھا۔ اسے کلسی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ دوسری کا نام تارا اور تیسری کا نام رانی تھا۔ کلسی بارہ برس کی تھی۔ ابھی جوانی اس سے دور تھی۔ اسے جوانی کی طرح چمکانے کی کوشش کی جاتی تو وہ ٹوٹ جاتی لیکن مرغی کھانے والے چوزے کا بھی سوپ پیتے ہیں۔ کسی کے ٹوٹنے پر رحم نہیں آتا۔ تارا تیرہ برس کی تھی۔ اس کی عمر بھی نہ تین میں تھی' نہ تیرہ میں تھی۔ اس نے باپ اور بھائی کے سوا کسی تیسرے مرد کے سائے کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ رانی چودہ برس کی تھی مگر چودھویں کے چاند کی طرح ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ اگر شکار ہو گئی تو وہ چاند بدقسمتی کے بادلوں میں بجھ کر رہ جائے گا۔

وہ تینوں سہیلیاں تھیں۔ وہ ماں باپ' بھائی بہنوں کے ساتھ بڑی معصومانہ........ زندگی گزار رہی تھیں۔ اس بستی میں راہو دادا کبھی کبھی آیا کرتا تھا اس کے ساتھ دو چار

ملازم ہوا کرتے تھے۔ وہ شہر سے ہار سنگار کی چیزیں لا کر وہاں کی عورتوں اور چھوٹی بچیوں کو دیا کرتا تھا۔ مردوں کے لئے کپڑے' سگریٹ اور بیڑیاں لا کر مفت تقسیم کیا کرتا تھا۔ بستی والے اس کی بڑی عزت کرتے تھے کیونکہ وہ کئی شہری لڑکوں کے رشتے بستی کی لڑکیوں کے لئے لا چکا تھا۔ وہ لڑکیاں بیاہ کر گئی تھیں پھر واپس نہیں آئی تھیں۔

بستی والے پوچھتے تھے کہ لڑکیاں کبھی اپنے میکے کیوں نہیں آتی ہیں؟ راہو دادا کہتا تھا۔ انہیں شہر کی ہوا لگ گئی ہے یا کہتا تھا۔ جن لڑکوں سے شادیاں ہوئی ہیں وہ لڑکے روزگار کے لئے بیویوں کے ساتھ کراچی جیسے بڑے شہروں کی طرف چلے گئے ہیں۔

رفتہ رفتہ بستی والے محتاط ہو گئے۔ راہو دادا سے کترانے لگے۔ اس کی لائی ہوئی چیزوں کو قبول کرنے سے پہلے انکار کرنے لگے۔ ان میں جو لالچی تھے اپنی بیٹیوں کو بوجھ سمجھتے تھے' وہ سب اسے جھک کر سلام کرتے تھے۔ اپنی لڑکیوں کو ان لڑکوں کے حوالے کر دیتے تھے' جنہیں راہو دادا دولہا بنا کر لایا کرتا تھا۔

اس طرح اس بستی کے لوگ دو مختلف گروہ میں بٹ گئے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ راہو دادا کا حمایتی تھا اور دوسرا گروہ اس کی مخالفت میں کہتا تھا کہ تم سب بے غیرت ہو گئے ہو۔ تمہارے دل اندر سے کہتے ہیں کہ اپنی لڑکیوں سے ناانصافی کر رہے ہو لیکن ڈھٹائی سے کہتے ہو کہ یہ بے غیرتی نہیں ہے کیونکہ تم انہیں دلہن بنا کر ان کا نکاح پڑھوا کر رخصت کرتے ہو۔

وہ تینوں سہیلیاں کم سن تھیں لیکن گھر کی بڑی عورتوں کی سرگوشیاں سنتی تھیں کہ وہاں سے بیاہ کر جانے والی لڑکیوں کے ساتھ کیا ہوتا ہوگا؟

وہ واضح طور پر سمجھ نہیں پاتی تھیں کہ لڑکیوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا ہے؟ لیکن ان کے دلوں پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ وہ تینوں ایک دوسرے سے کہتی تھیں' جو بھی ہوتا ہو' ہمیں اپنی بستی سے باہر کبھی نہیں جانا چاہیے۔

غریب لڑکیوں کے ارادہ کرنے سے اور انکار کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کے والدین بھی مجبور اور محتاج ہوتے ہیں۔ راہو دادا نے ان تینوں سہیلیوں کے والدین سے کہا۔ "میں نے رقم بڑھا دی ہے۔ اب ایک لڑکی کے ماں باپ کو سات ہزار دوں گا۔ منظور ہے تو پیشگی کے طور پر یہ دو دو ہزار روپے پکڑو۔ کل تین دولہا لے کر آؤں گا تو رخصتی سے پہلے پانچ پانچ ہزار ادا کر دوں گا۔"

تینوں کے والدین اور سرپرستوں نے پیشگی دو ہزار روپے لے لئے۔ وہ تینوں رونے لگیں۔ شادی سے انکار کرنے لگیں۔ انکار کے نتیجے میں خوب پٹائی کی گئی۔ ان تینوں کو

ایک جھگی میں بند کرکے کہا گیا کہ کل صبح انہیں دلہن بنانے کے لئے دروازہ کھولا جائے گا۔

رات ہوگئی۔ وہ تینوں بھوکی پیاسی سہمی ہوئی سی بیٹھی رہیں۔ بارہ برس کی کلسی نے کہا۔ ”مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔“

تیرہ برس کی تارا نے کہا۔ ”میری چاچی اور چاچا مجھ سے کتنی محبت کرتے تھے مگر آج انہوں نے مجھے بہت مارا ہے۔ کیا میں ان پر بوجھ بن گئی ہوں؟“

رانی نے کہا۔ ”میں تم دونوں سے بڑی ہوں۔ تم دونوں سے زیادہ سمجھتی ہوں۔ مارا انکار کوئی نہیں سنے گا۔ میں جو کہتی ہوں‘ وہ کرو.......... گی تو شاید ہمارے ساتھ وہ نہ و‘ جو دوسری لڑکیوں کے ساتھ ہوچکا ہے۔“

تارا نے کہا۔ ”تم جو کہوگی‘ ہم وہی کریں گے مگر یہ شادی نہیں کریں گے۔“

”تو پھر میری بات مانو۔ یہاں سے بھاگ چلو۔“

کلسی اور تارا نے اسے چونک کر دیکھا۔ تارا نے پوچھا۔ ”ہم بھاگ کر کہاں جائیں گے۔ اوپر آسمان ہے اور نیچے ریگستان۔ پتا نہیں کتنی دور کوئی بستی ہوگی اور پتا نہیں اس ستی کے لوگ بھی ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں گے یا نہیں؟“

رانی نے کہا۔ ”کوئی ہمیں پناہ نہیں دے گا تو یہ ہمارے مقدر کی خرابی ہوگی مگر میں ایسی جگہ دلہن بن کر نہیں جاؤں گی‘ جہاں سے کوئی واپس نہیں آتی ہے۔ تم دونوں ری بات نہیں مانو گی تو میں اکیلی یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

”ہم ہمیشہ دکھ سکھ میں ساتھ رہتے آئے ہیں۔ آج بھی ساتھ رہیں گے۔ کیوں لسی! تُو بول‘ ساتھ چلے گی یا اپنی تقدیر یہاں چھوڑے گی۔“

کلسی نے کہا۔ ”تم دونوں جاؤ گی تو میں یہاں اکیلی نہیں رہوں گی۔“

وہ تینوں ایک دوسرے سے گلے لگ کر رونے لگیں۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی ں تھا کہ گھر سے بھاگنا ہوگا اور اتنی بڑی دنیا میں جانا ہوگا‘ جسے پہلے کبھی دیکھا نہیں ہے۔ ں.......... حدِ نظر تک صرف ریگستان ہی دیکھا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھیں کہ سب ے قریبی بستی دس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ وہ کلومیٹر کا حساب بھی نہیں جانتی تھیں۔

رات گزرتی جارہی تھی۔ پتا نہیں کیا وقت ہوا ہوگا۔ پہلے وہاں کسی کے پاس گھڑی ں تھی۔ انہوں نے آپس میں چندہ جمع کرکے ایک گھڑی خریدی۔ وہ گھڑی اس جھگی میں کرتی تھی‘ جہاں چند نمازی باجماعت نمازیں پڑھا کرتے تھے پھر راہو دادا انہیں کلائیوں ، باندھنے کے لئے سستی گھڑیاں لاکر دینے لگا تھا۔ ان لڑکیوں کے پاس گھڑیاں نہیں

تھیں۔ وہ انگریزی گنتی نہیں جانتی تھیں۔ اگر گھڑی ہوتی تو اس کے دو کانٹے دیکھ سکتی تھیں۔ مگر کیا وقت ہوا ہے‘ یہ نہیں بتاسکتی تھیں۔ اس وقت وہ گھپ اندھیرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ گھڑی کیا نظر آتی جبکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائی بھی نہیں دے رہی تھیں۔

کلسی نے پوچھا۔ ”ہم یہاں سے کیسے نکل سکیں گے؟“

رانی نے کہا۔ ”ابھی خاموش رہو۔ سب کو گہری نیند سو جانے دو۔“

اس وقت گہرا سناٹا تھا۔ دور تک کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہاں تمام جھگیاں سرکنڈے کی ملائم اور پتلی لکڑیوں سے بنائی گئی تھیں۔ ان پتلی قمچیوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر دیواریں بنائی گئی تھیں۔ وہ رانی کی ہدایت کے مطابق اپنی انگلیوں سے ان قمچیوں کو الگ کرکے توڑنے لگیں۔ ایک قمچی کے ٹوٹنے سے ہلکی سی آواز پیدا ہوتی تھی۔ وہ آواز رات کے سناٹے میں گونجتی ہوئی سی لگتی تھی۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر انہیں توڑ رہی تھیں۔

بڑی دیر بعد اس دیوار کا اتنا حصہ ٹوٹ گیا جہاں سے وہ گزر کر باہر نکل سکتی تھیں۔ ایک سہیلی نے دوسری سہیلی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے سینے پر رکھا۔ اس کا دل خوف کے مارے بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ صرف اسی کا نہیں‘ تینوں کے دل خوف سے دھڑک رہے تھے۔ باہر پچھلے پہر کا چاند نکل آیا تھا۔ کوئی بھی انہیں دیکھ سکتا تھا۔

رانی نے ان دونوں سے سر جوڑ کر سرگوشی میں کہا۔ ”پہلے میں نکلتی ہوں‘ تم دونوں میرے پیچھے چلی آؤ۔“

وہ دونوں سے الگ ہو کر اس ٹوٹے ہوئے حصے کی طرف آئی لیکن باہر نکلنے سے پہلے ہی پیچھے ہٹ گئی۔ کسی بوڑھے کے کھانسنے کی آواز سنائی دی تھی۔ انہیں ایسا لگا جیسے جھگی کی ٹوٹی ہوئی دیوار کو کسی نے دیکھ لیا ہے اور وہ کھانستا ہوا آرہا ہے۔ وہ تینوں بڑی دیر تک سہمی رہیں پھر انہیں یقین ہوا کہ کوئی نہیں آرہا ہے۔ کسی جھگی میں سونے والا بوڑھا کھانس رہا تھا۔

وہ تینوں اللہ کا نام لے کر چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتی ہوئی جھگی سے باہر نکل آئیں۔ ایک دوسرے کے ہاتھوں کو تھام کر آس پاس دور تک دیکھا پھر دبے قدموں وہاں سے جانے لگیں۔ ریت پر چلنے سے آواز نہیں ابھرتی لیکن اس علاقے میں رہنے والوں کی قوتِ سماعت اتنی تیز تھی کہ وہ جھگی کے اندر بیٹھ کر دیکھے بغیر بتا دیتے تھے کہ کہیں قریب سے آدمی گزر رہا ہے یا کوئی جانور؟ اس وقت سبھی گہری نیند میں تھے اس لئے ریت پر ان کے قدموں کی آواز کسی نے نہیں سنی۔

بستی سے دور نکلتے ہی وہ دوڑنے لگیں۔ وہ اسی طرح زیادہ سے زیادہ دور جاسکتی تھیں۔ دوڑنے کے دوران میں انہوں نے اذان کی آواز سنی۔ یہ آواز ان کی بستی سے آرہی تھی۔ دور نکل آنے کے باوجود اس لئے سنائی دے رہی تھی کہ صحرا میں.......... آواز دور تک گونجتی چلی جاتی ہے۔ تارا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "صبح کی اذان ہے۔ تھوڑی دیر بعد دن نکل آئے گا۔ ہم کسی سے چھپ نہیں سکیں گے۔"

رانی نے کہا۔ "ہمیں یہاں سے کسی سے نہیں چھپنا ہے۔ ہمیں کسی بستی میں یا کسی پولیس چوکی میں پناہ مل جائے گی۔"

وہ بڑے اعتماد سے.......... دوڑتی رہیں اور کبھی سانسیں درست کرنے کے لئے تیز تیز.......... چلتی رہیں۔ سورج نکل آیا۔ اس کا اجالا حدِ نظر تک پھیل گیا۔ وہ ذرا رک کر چاروں طرف دیکھنے لگیں، جہاں تک نظر جارہی تھی، آسمان اور ریگستان کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ کسی سمت کا تعین نہیں کرسکتی تھیں کہ کس طرف جانے سے کوئی بستی یا پولیس چوکی ملے گی مگر کہیں تو جانا ہی تھا اس لئے وہ پھر ایک سمت دوڑنے لگیں۔

وہ زندگی میں پہلی بار اپنی بستی سے باہر کئی کلومیٹر دور چلی آئی تھیں لیکن اس راستے سے بھٹک گئی تھیں جہاں سب سے قریبی بستی دس کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ وہ کسی دوسری سمت جارہی تھیں۔ سورج اب اپنی حرارت سے انہیں جھلسانے لگا تھا۔ دھوپ تیز ہورہی تھی۔ جب وہ سر پر پہنچا تو پتا چلا کہ آدھا دن گزر چکا ہے۔

وہ پچھلی تمام رات جاگتی رہی تھیں اور آدھے دن تک دوڑتی رہی تھیں۔ تھکن کے باعث ان کے قدم لڑکھڑانے لگے تھے۔ وہ بے دم ہوکر گرنے والی تھیں۔ ایسے ہی وقت ریت کے ایک ٹیلے پر سے دور ایک بستی دکھائی دی۔ اسے دیکھ کر ان میں جان آگئی۔ وہ پھر ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے چلنے لگیں۔ اس بستی میں تقریباً پچاس جھگیاں تھیں۔ ان میں سے کچھ مٹی اور گارے کے کچے مکانات بھی تھے۔ بستی کے پہلے مکان کے سامنے پہنچتے ہی وہ تینوں گر پڑیں۔

کچھ لوگ دوڑتے ہوئے آئے۔ انہیں سہارا دے کر مکان کے اندر پہنچایا۔ عورتیں انہیں پنکھا جھلنے اور ان کے سروں پر پانی ڈالنے لگیں۔ ایک عورت ٹھنڈی میٹھی لسی کے گلاس لے آئی۔ انہیں سمجھایا۔ "ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک گھونٹ پیئو۔ جلدی جلدی پینے سے پھندا بھی لگے گا اور سر بھی چکرائے گا۔"

بستی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک خبر پہنچ گئی کہ تین لڑکیاں کہیں سے بہت بری حالت میں آئی ہیں۔ بستی والے انہیں دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ وہاں

مسلمانوں اور ہندوؤں کی ملی جلی آبادی تھی۔ ایک ہندو بنئے کی بڑی سی دکان تھی جہاں سے کھانے پینے کا تمام سامان خریدا جاتا تھا۔ دوسرے ہندو نے مردوں اور عورتوں کے کپڑوں، چوڑیوں اور نقلی زیورات کی دکان کی ہوئی تھی۔ ایک مسلمان ٹینکر کے ذریعے میرپور خاص سے پینے کے لئے پانی منگواتا تھا اور تھوڑے سے منافع کے عوض پانی بیچتا تھا۔ وہ سب.......... لوگ.......... بھی ان لڑکیوں کے پاس آئے اور ان کی رُوداد سننے لگے۔

ان کی رُوداد میں سب سے اہم کردار راہو دادا کا تھا۔ وہ پورے تھر کے علاقے میں شیطان کی طرح مشہور تھا۔ اس کا نام سن کر بہت سی عورتیں اور مرد وہاں سے چلے گئے۔ اپنے گھروں کی طرف جاتے ہوئے ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یہ راہو دادا سے بچ نہیں پائیں گی۔ وہ ان لڑکیوں کی تلاش میں نکل پڑا ہوگا۔ وہ یا اس کے حواری اس بستی میں بھی ضرور آئیں گے۔ ہمیں اس معاملے سے دور ہی رہنا چاہئے۔

جو مسلمان وہاں پانی فروخت کرتا تھا، اس نے تینوں سے کہا۔ "تم میری بیٹیوں جیسی ہو، میرے گھر چلو اور آرام سے کھاپی کر سوجاؤ۔ رات کو سفر کرنا مناسب نہیں ہے۔ سہ پہر کو چلوگی تو آدھی رات کو میرپور پہنچوگی۔ اس لئے کل صبح یہاں سے جاؤ۔"

وہاں کچھ عورتیں اور مرد راہو دادا کو گالیاں دے رہے تھے اور اپنی بے بسی بھی ظاہر کررہے تھے کہ وہ پورے علاقے میں پولیس والوں سے بناکر رکھتا ہے۔ باہر کے ملکوں سے شکار کھیلنے والے امیر کبیر شکاریوں کا دلال ہے۔ وہ بڑے مضبوط ذرائع کا مالک ہے اور خوب دولت کماتا رہتا ہے۔

وہ تینوں پیٹ بھر کر کھانے کے بعد اس مسلمان کے گھر میں سوگئیں۔ وہ اس بستی سے میرپور خاص تک عثمان پانی والا کہلاتا تھا۔ شام کو ایک ہندو جوان دھرم داس ایک اونٹ پر بیٹھ کر آیا۔ وہ ہفتے دو ہفتے میں ایک بار وہاں آتا تھا۔ اس بستی کی عورتیں جن کپڑوں پر کڑھائی کرتی تھیں اور مختلف قسم کے کھلونے بناتی تھیں، وہ سب ان سے خرید کر شہر لے جاتا تھا۔ غیر ممالک سے اور پاکستان کے مختلف شہروں سے آنے والے ایسی دستکاریوں کو پسند کرتے تھے اور اچھے داموں خرید کر لے جاتے تھے۔

دھرم داس تمام سامان خرید کر دوسری صبح شہر واپس جانے والا تھا۔ عثمان پانی والا نے اسے تین مظلوم لڑکیوں کی رُوداد سنائی پھر کہا۔ "بیٹے! تم صبح انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ اور میرپور خاص کے تھانے میں انہیں پہنچادو۔ یہ اپنا بیان وہاں لکھوا کر قانون کی پناہ حاصل کرلیں گی۔"

دھرم داس نے کہا۔ "چاچا! ان بے چاریوں کے کام آنا میرا دھرم ہے۔ میں انہیں حفاظت سے لے جاؤں گا۔ آپ انہیں سمجھادیں کہ وہ کسی غیر کے ساتھ نہیں' اپنے بھائی کے ساتھ جائیں گی۔"

اسی شام راہو دادا کا ایک حواری اس بستی میں پہنچ گیا۔ اسے بستی والے نہیں پہچانتے تھے لیکن ہندو بنئے سے اس کی جان پہچان تھی۔ بنئے نے کہا۔

"آؤ بیٹھو۔ جل پان کرو۔" پھر سرگوشی میں بولا۔ "تین چھوکریوں کے لئے آئے ہو؟"

"ہاں۔ یہی پوچھنے والا تھا۔ کیا وہ تینوں یہاں ہیں؟"

"ہیں مگر تم کسی اور سے ان کے بارے میں نہ پوچھنا۔ راہو دادا سے کہنا' یہاں نہ آئے۔ بستی والے اس کے خلاف ہیں۔ کوئی راہو دادا کا کچھ بگاڑ تو نہیں سکے گا مگر یہاں کچھ مسلمان ایسے ہیں جو مارنے مرنے پر تیار ہو جائیں گے۔"

اس حواری نے کہا۔ "گردھاری بھائی! تم تو جانتے ہو راہو دادا اپنے شکار کو چھوڑتا نہیں ہے۔ وہ پورے ہتھیار والوں کے ساتھ آئے گا تو یہاں سب ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔"

"جب لڑکیاں آسانی سے مل جائیں گی تو راہو دادا کو آنے کی ضرورت کیا ہے؟"

"وہ کس طرح آسانی سے ملیں گی؟"

"دستکاری کا سامان خریدنے والا دھرم داس آیا ہوا ہے۔ میں نے معلوم کیا ہے۔ وہ کل صبح ان تینوں کو یہاں سے میرپور خاص لے جائے گا۔"

"کیا پکی بات ہے؟"

"بالکل پکی۔ جھوٹ کہوں تو دادا آکر گولی مار دے۔ میں ایک چٹھی لکھ دیتا ہوں۔ راہو دادا اسے پڑھ کر سمجھ لے گا اور خوش ہو کر مجھے تھوڑا بہت کمیشن ضرور دے گا۔"

حواری اس کی لکھی ہوئی چٹھی لے کر چلا گیا۔ وہ تینوں بری طرح تھکی ہوئی تھیں۔ سہ پہر سے رات گئے تک سوتی رہیں۔ انہیں کھانے کے لئے جگایا گیا مگر وہ بے سدھ پڑی رہیں۔ صبح پانچ بجے بیدار ہوئیں۔ عثمان پانی والا کی بیوی نے بتایا کہ انہیں شہر پولیس والوں کی پناہ میں پہنچانے کا انتظام ہو چکا ہے۔ وہ اچھی طرح کھاپی کر چلی جائیں۔"

رانی نے کہا۔ "ہم یہاں محفوظ ہیں۔ آرام سے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو ہمیں گھر کی نوکرانی بنا کر رکھ لیں۔"

عثمان پانی والا نے کہا۔ "میں تم تینوں کو بیٹیاں بنا کر رکھ سکتا ہوں لیکن راہو دادا کی

پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ وہ ہم سب کو مجبور اور بے بس بنا کر تمہیں یہاں سے لے جائے گا۔ میرے ہاں پانی کی کمی نہیں ہے۔ جاؤ غسل کرو اور خوب کھاپی کر دھرم داس کے ساتھ چلی جاؤ۔"

تھر کے علاقوں میں پانی نایاب ہوتا ہے۔ وہاں رہنے والے کئی مہینوں میں ایک بار غسل کرتے ہیں۔ جب کبھی بارش ہوتی ہے تو پینے کے لئے پانی بھی جمع کرتے ہیں اور کھلے آسمان کے نیچے خوب بھیگتے ہیں۔ ان تینوں کو بھی کئی ماہ بعد نہانا نصیب ہوا۔ بستی کے کچھ گھروں سے ان کے ناپ کے مطابق لباس لا کر دیئے گئے۔ وہ انہیں پہن کر پیٹ بھر کر کھانے کے بعد گھر سے باہر آئیں۔

دھرم داس کے اونٹ پر خریدا ہوا سامان اور پانی کا مشکیزہ تھا۔ جیسے تیسے............ ان تینوں کو اونٹ پر بٹھایا گیا۔ دھرم داس نے اس کی مہار پکڑی پھر وہاں سے چل پڑا۔ بستی سے ذرا دور جا کر رانی نے کہا۔ "بھیا! یہ اچھا نہیں لگتا کہ تم پیدل چل رہے ہو اور ہم آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں۔"

وہ بولا۔ "تم تینوں چھوٹی بہنیں ہو۔ بڑے بھائی کا فرض ہے کہ تمہیں آرام سے منزل تک پہنچائے۔"

رانی سرد آہ بھر کر بولی۔ "آہ! ہماری کوئی منزل نہیں ہے۔ اتنی بڑی دنیا میں ہم تینوں کا کوئی نہیں ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ اوپر بھگوان ہے۔ نیچے بھائی ہے۔ تھانے میں رپورٹ لکھوا کر میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔ تین دن کے بعد میری شادی ہونے والی ہے۔ تمہیں شادی والے گھر میں بہت مزہ آئے گا۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ ہمارا بھیا دولہا بنے گا اور ہمارے لئے بھابی لائے گا۔"

"پتا ہے' تمہاری آنے والی بھابی بہت سندر ہے۔ اس کا نام کانتا کماری ہے۔ ہم بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ بھگوان کی کرپا سے ہماری محبت کامیاب رہی ہے۔ ہم ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں گے۔"

وہ کہتے کہتے چپ ہو کر رک گیا۔ اونٹ بھی رک گیا۔ دور سے بہت سی گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کلسی نے پوچھا۔ "یہ کیسی آوازیں ہیں؟"

دھرم داس نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کوئی قافلہ آرہا ہے۔"

وہ قافلہ ہی تھا۔ ایک رئیس....... شکاری کا قافلہ۔ دھرم داس نے اور ان تینوں نے

سر گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ان کے پیچھے اور دائیں بائیں ریت کی ڈھلان سے کئی اونٹ ابھرتے آرہے تھے۔ ایک اونٹ کی محمل میں ایک رئیس اعظم شکاری............ رائفل لئے بیٹھا ہوا تھا۔ دوسرے اونٹوں پر بیٹھنے والوں کے پاس بھی مختلف ہتھیار تھے۔ سب سے آگے والے اونٹ پر راہو دادا کو دیکھتے ہی لڑکیاں خوف سے چیخنے اور رونے لگیں۔ رانی نے کہا۔ "بھیا! یہ ہمیں پکڑ لیں گے۔ یہاں سے بھاگو۔"

دھرم داس نے کہا۔ "ہم ان کی شوٹنگ رینج میں ہیں۔ بھاگنا چاہیں گے تو وہ ہمیں گولی مار دیں گے۔ حوصلہ کرو بھگوان پر۔ اپنے خدا پر بھروسا رکھو۔ وہ تمہیں بچانے والا ہے۔"

راہو دادا اپنے اونٹ سے اتر گیا تھا اور رئیس اعظم کے اونٹ کی مہار پکڑ کر تیزی سے آرہا تھا پھر وہ ان تینوں لڑکیوں کے چاروں طرف رئیس اعظم کے اونٹ کو چلاتا ہوا کہنے لگا۔ "سر! آپ انہیں ہر زاویے سے دیکھیں اور میرے انتخاب کی داد دیں۔ آپ نے فرمایا تھا کہ آپ کو کچے انار پسند ہیں۔"

وہ تینوں بہت ہی کمسن تھیں مگر خوبصورت اور صحت مند تھیں پھر غسل کر کے اور صاف ستھرے لباس پہن کر اور زیادہ نکھر گئی تھیں۔ رئیس اعظم نے کہا۔ "بہت خوب۔ تم میری پسند کو خوب سمجھتے ہو اور مجھے خوش کر دیتے ہو۔ بے شک تم انعام کے حق دار ہو۔"

دھرم داس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "آپ بڑے لوگ ہیں۔ بھگوان آپ کو اور بڑا بنائے۔ ان بے چاریوں پر رحم کرو۔ یہ تمہاری طرح مسلمان ہیں۔ ان کی عزت رکھنا' ان کی حفاظت کرنا آپ کا فرض ہے۔ میں آپ کو آپ کے خدا کا واسطہ دے کر التجا کرتا ہوں کہ انہیں آزاد چھوڑ دو اور انہیں اپنی مرضی سے زندگی گزارنے دو۔"

دھرم داس جو کہہ رہا تھا' راہو دادا اس کا ترجمہ غیر ملکی زبان میں کر رہا تھا۔ رئیس نے سننے کے بعد کہا۔ "اس جوان کی آخری بات دل کو لگی ہے کہ انہیں آزاد چھوڑ دیا جائے۔ راہو! ان کو جانے دو۔"

راہو دادا نے کہا۔ "سر کہہ رہے ہیں تم ان تینوں کو لے جا سکتے ہو۔"

دھرم داس نے پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر شکریہ ادا کیا پھر اپنے اونٹ کو لے کر آگے بڑھنے لگا۔ شکاری کا قافلہ اسی جگہ رکا رہا۔ وہ سب ان تین لڑکیوں کو اونٹ پر بیٹھ کر جاتے دیکھتے رہے۔ راہو دادا نے کہا۔ "سر! حکم دیں۔"

رئیس اعظم نے کہا۔ "صبر کرو۔ جب تک چوہے بلی کا کھیل نہ ہو' شکار کا مزہ نہیں

آتا۔ کیا تم نے کبھی دیکھا ہے' بلی چوہے کو پکڑتی ہے' چھوڑتی ہے پھر پکڑتی ہے پھر چھوڑتی ہے مگر اسے چھپنے اور بچنے کا موقع نہیں دیتی۔ آخر اسے شکار کر لیتی ہے۔"

دھرم داس انہیں لے کر دور نکل آیا تھا۔ تب رئیس اعظم نے رائفل سیدھی کی۔ ٹارگٹ لینس سے ایک آنکھ لگا کر نشانہ لیا پھر ٹھائیں کی زور دار آواز کے ساتھ گولی چلا دی۔ دھرم داس کے حلق سے چیخ نکلی۔ وہ اچھل کر ریت پر گرا اور اپنے لہو میں بھیگتے ہوئے تڑپنے لگا۔

وہ محافظ' وہ راہ دکھانے والا تھوڑی دیر پہلے کہہ رہا تھا۔ "پتا ہے' تمہاری ہونے والی بھابی بہت سندر ہے۔ اس کا نام کانتا کماری ہے۔ ہم بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ بھگوان کی کرپا سے ہماری محبت کامیاب ہو رہی ہے۔ ہم ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں گے۔"

وہ ہمیشہ کے لئے اپنی کانتا کماری سے منہ چھپا کر سو گیا۔ وہ تینوں خوف سے چیخ رہی تھیں۔ شکاری نے اونٹ کو بھڑکانے کے لئے دوسرا فائر کیا۔ وہ گولی اونٹ کی کھال کو چھیلتی ہوئی گزر گئی۔ وہ بدک کر بھاگنے لگا۔ وہ سب مارے دہشت کے چیخ رہی تھیں۔ تیز رفتاری سے بھاگتے ہوئے اونٹ پر اِدھر سے اُدھر جھٹکے کھا رہی تھیں۔

شکاری اور اس کے قافلے کے تابعدار قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ تینوں اپنے علاقے میں کئی بار اونٹوں پر بیٹھ چکی تھیں لیکن بے ڈھنگی رفتار سے بھاگتے ہوئے اونٹ پر بیٹھنا اور سنبھلنا نہیں آتا تھا۔ وہ اس کی پیٹھ پر بار بار اچھل کر گرنے کے انداز میں بیٹھنے اور سنبھلنے کی کوششیں کر رہی تھیں اور چیخ چیخ کر کسی کو مدد کے لئے پکار رہی تھیں۔ آخر وہ ایک ایک کر کے کوہان کی بلندی سے نیچے ریت پر گرتی گئیں۔ ان قہقہے لگانے والوں کے لئے دلچسپ تماشا بنتی گئیں۔

اگر وہ ریگستان میں نہ ہوتیں اور ریت پر نہ گرتیں تو ان کی ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ جاتیں۔ انہوں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ گھر والوں سے اور شکاریوں سے بچنے اور بھاگنے کے دوران میں ایسی درگت بنے گی۔ وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے اٹھنے لگیں۔ دور بہت دور قہقہے لگانے والے اڑتی ہوئی ریت کے سبب دھندلے سے نظر آرہے تھے۔ وہ سب اتنی دور تھے کہ ان کے ہنسنے بولنے کی آوازیں انہیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔

پھر رئیس اعظم کی رائفل ان کی طرف اٹھ گئی۔ اس نے ٹریگر کو دباتے ہوئے کئی بار فائرنگ کی' کئی گولیاں ان تینوں کے آس پاس ریت کے ذرات کو اڑانے اور بکھیرنے لگیں۔ موت اتنے قریب آکر دھمکیاں دے رہی تھی۔ وہ چیخیں مارتی ہوئی وہاں سے

بھاگنے لگیں۔ ان سے پہلے اونٹ خوفزدہ ہو کر کہیں بھاگتا چلا گیا تھا۔ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس پر کھانے اور پینے کا جو سامان تھا' وہ بھی اس کے ساتھ چلا گیا تھا۔

وہ بڑی دیر تک اندھا دھند دوڑتی رہیں پھر ایک جگہ رک کر ہانپنے لگیں۔ پلٹ کر دیکھا' کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ شکاری اپنے قافلے کے ساتھ کہیں گم ہو گیا تھا۔ ریت کے اونچے نیچے ٹیلے انہیں چھپا رہے تھے۔ وہ تینوں وحشت زدہ ہرنیوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد دھیمی دھیمی سی گھنٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ جب بھی اونٹ بستی کے قریب سے گزرتے تھے تو ان کی گھنٹیوں کی آوازیں صحرا کی لوک موسیقی کی طرح دلوں میں اترتی تھیں لیکن اس وقت صورِ اسرافیل کی طرح ان کے دلوں کو دھڑکا رہی تھیں۔

وہ گھنٹیوں کی آوازوں کو سنتے ہی پھر وہاں سے بھاگنے لگیں۔ بھاگنے کا راستہ ہو اور منزل کا نام و نشان نہ ہو تو چلنے والے اور دوڑنے والے بھٹکتے ہی رہ جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی یہی المیہ تھا کہ وہ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے ریگستان میں سمت کا تعین بھی نہیں کر سکتی تھیں کہ وہ جنوب کی طرف دوڑ رہی ہیں یا مغرب کی طرف' یا شمال کی طرف' یا مشرق کی طرف' اس وقت سورج سر پر تھا۔ ورنہ اس کے جھکاؤ سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ مغرب کدھر ہے؟ ایک سمت معلوم ہونے سے باقی تین سمتیں بھی سمجھ میں آ جاتیں۔

آدھا دن گزر چکا تھا۔ شکاری اب دیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہیں کہیں انہیں پکڑ کر خیمے لگانا چاہتے تھے۔ اس لئے اب گھنٹیاں تیزی سے بج رہی تھیں۔ وہ سمجھ گئیں کہ شکاریوں کے اونٹ اب قریب....... آ رہے ہیں۔ شکاری اب انہیں ڈھیل نہیں دیں گے اور وہ تینوں اونٹوں کی رفتار سے زیادہ تیز نہیں بھاگ سکیں گی۔

پھر بھی وہ بھاگنے اور خود کو بچانے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ اب آخری سہارا دعا کا رہ گیا تھا۔ وہ دوڑنے کے دوران میں گڑگڑاتی ہوئی دعائیں مانگتی جا رہی تھیں۔ انہوں نے پھر ذرا رک کر پلٹ کر دیکھا تو ریت کے بگولے فضا میں بلند ہو رہے تھے۔ ان بگولوں کے اس پار بہت دور شکاری کا قافلہ دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ پہلے صرف گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں' اب موت کے ہرکارے بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ پھر چیخیں مارتی ہوئی بھاگنے لگیں۔

ڈھلان سے اونچائی کی طرف دوڑنا آسان نہیں ہوتا مگر وہ تھکنے اور ہانپنے کے باوجود چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتی ہوئی تیزی سے اونچائی کی طرف جا رہی تھیں۔ جب وہ اونچائی پر پہنچیں تو بہت دور ہریالی نظر آنے لگی۔ جوار اور باجرے کے کھیت بھی تھے اور

ہرے بھرے درخت بھی دکھائی دے رہے تھے۔

وہ تھر کے ویران صحرا سے نکل کر اس علاقے کو پار کر کے اس حصے میں آ گئی تھیں جہاں کارونجھر کا پہاڑی سلسلہ تھا۔ ان پہاڑوں میں گرینائٹ جیسے قیمتی پتھر' کوئلے اور دیگر معدنیات موجود ہیں۔ ان علاقوں میں اس حد تک بارش ہوتی ہے کہ باقاعدہ کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ زمین کے نیچے پانی موجود رہتا ہے۔ ہر چار مربع میل پر پانچ کنوئیں لازمی ہوتے ہیں۔ ہر دو میل کے علاقے میں ایک گوٹھ موجود ہے۔ وہ تینوں ہریالی دیکھ کر خوشی سے آپس میں لپٹ گئیں پھر خیال آیا کہ شکاری تعاقب میں ہیں۔ وہ پھر بھاگنے لگیں۔

اب اونٹوں کی رفتار بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ شکاری نہیں چاہتے تھے کہ وہ تینوں کسی آبادی میں پہنچ جائیں۔ راہو دادا نے یقین دلایا کہ اس علاقے کی پہلی بستی بہت دور ہے۔ کھیتوں کے اطراف کسانوں کی جھگیاں ہیں۔ وہ راہو دادا کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ شکار کے معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔

اب وہ جی جان سے' آخری مستحکم امیدوں کے ساتھ دوڑ رہی تھیں۔ بلی چوہے کا کھیل ختم ہو چکا تھا۔ آخری مرحلے پر شکار پر جھپٹنا تھا۔ اس لئے وہ تیزی سے تعاقب میں چلے آ رہے تھے۔ دوڑنے والیاں کھیتوں کے قریب پہنچنے والی تھیں۔ تب ہی فائرنگ ہونے لگی۔ وہ اس طرح فائر کر رہے تھے کہ نازک ہرنیاں زخمی نہ ہوں صرف دہشت بڑھ جائے کہ گولیاں ان تک پہنچ سکتی ہیں اور وہ بچ کر کہیں جا نہیں پائیں گی۔ انہیں کھیتوں میں ہی دبوچ لیا جائے گا۔

اپنے آس پاس سے گزرنے والی گولیوں سے سہم کر وہ چیخ رہی تھیں اور پھر مدد کے لئے کسی کو پکار رہی تھیں۔ ایسے ہی وقت اچانک گھنٹیوں کی آوازیں تھم گئیں۔ فائرنگ بھی بند ہو گئی شکاری رئیس اعظم اور راہو دادا وغیرہ نے دیکھا' ایک اونٹ پر بیٹھا مسلح تابعدار چیخ مار کر اونٹ سے گر پڑا تھا اور اپنے لہو میں بھیگ کر ریت پر تڑپ رہا تھا۔ کسی نے اسے گولی ماری تھی۔

وہ سب رک کر معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کس نے ایسی جرأت کی ہے۔ اسی وقت دوسرا مسلح تابعدار دوسری گولی کھا کر گرا۔ تیسری گولی رئیس اعظم کے قریب سے گزری۔ راہو دادا فوراً ہی مہار کو کھینچتا ہوا اپنے آقا کے اونٹ کو دوسری طرح موڑ کر لے جانے لگا۔ قافلے میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ وہ سب بھاگتے ہوئے منتشر ہونے لگے۔ ریت کے مختلف ٹیلوں کے پیچھے جانے لگے۔ وہ تینوں رک گئی تھیں۔ زمین پر گر پڑی تھیں۔ اگر غیبی مدد نہ پہنچتی تب بھی وہ آگے بڑھنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ انہیں تھک کر گرنا ہی

تھا، سو گر پڑیں۔

دھوپ اور گرمی کی شدت تھی۔ مسلسل دوڑتے رہنے کے باعث سانس پھول رہی تھی۔ وہ ہانپتی ہوئی ان شکاریوں کو دیکھ رہی تھیں جو پسپا ہورہے تھے اور اپنی حفاظت کے لئے ٹیلوں کے پیچھے چھپ رہے تھے۔ چھپنے کے دوران میں ان کا ایک اور مسلح تابعدار مارا گیا تھا۔ وہ سب اونٹوں سے اتر گئے تھے۔ راہو دادا نے چیخ کر پوچھا۔ "کون ہو تم؟ ہم سمجھ گئے ہیں تم اکیلے ہو۔ کیا تمہاری شامت آئی ہے؟"

کوئی جواب نہیں ملا، وہ انتظار کرنے لگے۔ دوسری طرف خاموشی انہیں متجسس اور پریشان کررہی تھی۔ راہو دادا نے پھر بلند آواز سے کہا۔ "ہم کہتے ہیں، سامنے آؤ یا بات کرو۔ بتاؤ کہ تم کون ہو؟"

وہ تینوں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں پھر انہیں دور ایک جھاڑی کے پیچھے ایک بھاری بھرکم موٹر سائیکل نظر آئی۔ اس کے قریب ایک قد آور صحت مند نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ ہاتھ کے اشارے سے انہیں کہہ رہا تھا کہ وہ سیدھی ایک طرف کھیت میں بھاگتی چلی جائیں پھر اس نے اپنی گن کی طرف اشارہ کرکے سمجھایا کہ پھر گولیاں چلنے والی ہیں۔

وہ تینوں اٹھ کر کھیتوں میں آئیں، جدھر اس جوان نے جانے کو کہا تھا، ادھر بھاگنے لگیں۔ رئیس اعظم نے کہا۔ "راہو! وہ دیکھو۔ بھاگ رہی ہیں۔ ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گی۔ انہیں قریبی آبادی تک پہنچنے سے پہلے روکو، فائر کرو۔"

اس بار سب نے بیک وقت فائرنگ کی لیکن وہ لڑکیاں شوٹنگ رینج سے دور چلی گئی تھیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے درختوں کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔

راہو دادا گالیاں دیتے ہوئے کہنے لگا۔ "کتے! تم نے ہمارے تین بندے مار دیئے۔ ہم تمہیں کتے کی موت ماریں گے۔ اس بار فائر کرو۔ معلوم تو ہو کہ کہاں چھپے ہوئے ہو۔"

ایک تابعدار نے کہا۔ "دادا! وہ اس بڑے درخت کے پیچھے ہوگا۔"

اس کی بات ختم ہوئی۔ ایک گھنی جھاڑی کے پیچھے سے تڑاتڑ فائرنگ کی آواز کے ساتھ گولیاں چلنے لگیں۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی ریت کے ذرات اس طرح فضا میں بکھرنے لگے کہ منظر دھندلا گیا۔ دھند کے اس پار درخت اور جھاڑیاں دکھائی نہیں دے رہی تھیں دوسری طرف سے آنے والی گولیاں ریت کے ٹیلوں کے آرپار ہوکر انہیں زخمی یا ہلاک کرسکتی تھیں۔ اس لئے وہ سب زمین پر لیٹ گئے تھے۔ اب ریت کی دھند چھٹنے کے بعد ہی وہ جوابی فائرنگ کرسکتے تھے لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ دھند چھٹ رہی تھی مگر اس وقت موٹر سائیکل کی آواز دور ہوتی جارہی تھی۔ وہ

راستے کا پتھر بننے والا انہیں انتقامی کارروائی کا موقع دیئے بغیر ان سے دور جاتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہوچکا تھا۔

تھر کا سب سے بڑا مسئلہ پانی ہے۔ فی الحال جو ہریالی نظر آرہی ہے، وہ بارش کی مرہون منت ہے۔ بارش نہ ہو تو قحط پڑ جاتا ہے۔ وہاں ایک "بانہہ بیلی" نام کی سماجی تنظیم ہے۔ اس تنظیم نے بڑے پیمانے پر کنویں کھدوائے ہیں اور پانی کا ذخیرہ کرنے کے لئے چھوٹے چھوٹے چھ ڈیم بھی بنوائے ہیں۔ "بانہہ بیلی" کے کارکن لاکھوں افراد کی فلاح و بہبود کے لئے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر تھر کے مسائل کو اجاگر کررہے ہیں۔ وہاں بیس ہزار مربع کلومیٹر اور تقریباً دس لاکھ کی آبادی میں صرف ایک لیڈی ڈاکٹر ہے۔ "بانہہ بیلی" کے کارکن علاج معالجے اور بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں بھی اہم فرائض انجام دے رہے ہیں۔ یہ تنظیم پورے علاقے میں مشہور ہے۔ پولیس اور انتظامیہ کے عہدیدار بھی ان سے تعاون کرتے ہیں۔

وہ ان تینوں لڑکیوں کو "بانہہ بیلی" کے صدر کے پاس لے آیا پھر اسے اپنا شناختی کارڈ دکھا کر کہا۔ "میرا نام وہ ہے۔ اگرچہ نام مختصر اور عجیب سا ہے۔ تاہم میں بہت بڑا نام نہیں، بہت بڑا کام کرنا چاہتا ہوں۔ آج کل میں کیٹی بندر میں مصروف رہتا ہوں۔ یہاں اپنے خاندان کے ایک بزرگ سے ملاقات کے لئے آیا تھا تو یہ مظلوم لڑکیاں نظر آئیں۔ یہ آپ کو بتائیں گی کہ ان پر کیا گزر رہی ہے۔"

رانی اپنی سہیلیوں کی روداد سنانے لگی۔ صدر نے کہا۔ "یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ غیر ملکی دولت مند شکاری یہاں ہرن، مور، سانبھر اور نیل گائے وغیرہ کو شکار کرنے کے شوق میں آتے ہیں۔ دن کو شکار کھیلتے ہیں اور رات کو عیاشی کرتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں اور یہاں کے دلالوں کے ذریعے ہمارے علاقوں کی عورتوں کو شکار کرتے ہیں۔ یہ اتنے دولت مند اور وسیع ذرائع کے مالک ہوتے ہیں کہ پولیس اور انتظامیہ ان کے آگے بے بس ہوجاتی ہے۔"

وہ بولا۔ "یہ کتنے شرم کی بات ہے کہ اوپر والوں کی طرف سے انہیں چھوٹ ملتی ہے اور یہ ہمارے ملک میں آکر ایسے عیاشی کرتے ہیں جیسے یہ ہمارا وطن نہیں ہے، ہیرا منڈی ہے۔ کیا ہم اتنے بے غیرت ہوگئے ہیں کہ اپنے وطن کی سرحدی زمینوں کے علاوہ اپنے وطن کی بہنوں اور بیٹیوں کو بھی فروخت کررہے ہیں؟"

"اسے قوم کی بے حسی کہا جائے یا ہمارے عوام اتنے بے خبر اور غافل رہتے ہیں کہ اپنی تباہی اور وطن کی بے عزتی کے اسباب کو سمجھ نہیں پاتے یا پھر یہ نہیں سمجھ پاتے کہ

ـ دشمن عناصر سے کس طرح نمٹنا چاہئے؟“
بانہ بیلی کے صدر نے کہا۔ ”تم نے ان لڑکیوں کو بڑی جوانمردی سے بچایا ہے۔ فکر کرو۔ اب ہماری تنظیم ان کی حفاظت کرے گی۔“

وہ بولا۔ ”میں یہی چاہتا ہوں۔ کل مجھے کیٹی بندر جانا ہے۔ میں وہاں سے فارغ ہو کر ؤں گا۔ اگر ان لڑکیوں کے سلسلے میں کوئی دشواری پیش آئے گی تو میں انہیں کراچی کے ـ فلاحی ادارے میں پہنچا دوں گا۔“

اس نے کلسی، تارا اور رانی کو اطمینان دلایا کہ وہ اس تنظیم کے سائے میں محفوظ ہیں گی اور وہ ان کی خیریت معلوم کرنے جلد ہی واپس آئے گا۔

پھر وہ وہاں سے چلا آیا۔ اس نے ماریہ سے وعدہ کیا تھا کہ کل اس سے ملنے آئے گا ں لئے وہ رات گزارنے کے لئے کراچی چلا گیا۔

☆======☆======☆

ہیراللہ جان........... اپنے دفتر میں تھا۔ اس کے سامنے میز کے دوسری طرف ماریہ ر ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر بیٹھے ہوئے تھے۔ ماریہ نے ہیراللہ جان سے کہا۔ ”آپ کا شبہ ـرست تھا۔ اس کا تعلق انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ سے ہے لیکن وہ دل و جان سے میرا عاشق ننے کے باوجود مجھ سے اپنی اصلیت چھپا رہا ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ محبِ وطن ہے اور ـ و قوم کی بہتری کے لئے وہ معاہدہ دیکھنا چاہتا ہے' جو آپ کے اور حکومتِ پاکستان کے یک اعلیٰ عہدیدار کے درمیان یہاں ایک بجلی گھر کے سلسلے میں ہوا ہے۔“

اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے سوال کیا۔ ”تم نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ معاہدہ کیسے پڑھے گا بلکہ ہیراللہ صاحب اسے چھپا کر رکھتے ہیں۔“

”معاہدے کی اس فائل کو چرانے کا کوئی منصوبہ اس کے ذہن میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بڑی چالاکی اور ہیرا پھیری سے اس فائل کو چرا سکتا ہے۔ وہ بہت ہی گہرائی تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لئے مجھ سے ایسی فائل کے بارے میں پوچھ رہا تھا' جس سرخ فیتہ لگا ہوا ہے۔“

اسسٹنٹ ڈائریکٹر یعنی اے ڈی نے کہا۔ ”اس نوجوان کے پیچھے یقیناً........ انٹیلی ـنس کے افسران ہوں گے۔ وہ ٹاپ سیکرٹ والی فائل اب یہاں نہ رکھی جائے تو بہتر ہے۔“

ڈائریکٹر جنرل یعنی ڈی جی' ہیراللہ جان نے کہا۔ ”ہم نے اس فائل کو اسی لئے اسلام آباد والے دفتر میں نہیں رکھا۔ وہاں........ انٹیلی جنس والے کسی وقت بھی چھاپا مار سکتے

تھے۔ یہ توقع نہیں تھی کہ وہ یہاں کیٹی بندر تک چلے آئیں گے۔ کل رات ماریہ نے مجھے یہ تمام باتیں بتادی تھیں۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔“

”آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟“

”میں نے کراچی میں اپنے ملک کے سفارت خانے والوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ تمہارے لئے کل کی فلائٹ سے ایک سیٹ حاصل کرلیں۔ تم آج یہ ٹاپ سیکرٹ والی فائل یہاں سے لے جاؤ اور اسے لندن آفس میں پہنچا دو۔“

ماریہ نے کہا۔ ”کل وہ آئے گا۔ میں اس سے کیا کہوں گی؟“

”یہی کہ کاروباری معاہدہ کسی دوسرے کو دکھایا نہیں جاتا لیکن تمہارے ڈیڈی تمہیں اتنا چاہتے ہیں کہ کیٹی بندر بجلی گھر کی فائل اسے پڑھنے کے لئے دے دیں گے۔ کل وہ آئے گا تو تم اسے میرے دفتر لے آؤ۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”وہ مجھے آپ کی بیٹی اور آپ کو ایسا باپ سمجھ رہا ہے جو بیٹی کی محبت اور ضد کے سامنے جھک جاتا ہے لیکن سر! وہ سرخ فیتے والی فائل کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔“

”اس کی پروا نہ کرو۔ میں اسے سرخ فیتے والی فائل بھی دکھا دوں گا۔“

ڈی جی ہیراللہ جان نے اپنی ریوالونگ چیئر سے اٹھ کر آہنی سیف کو کھولا۔ اس میں سے سرخ فیتے والی فائل نکالی جس پر ٹاپ سیکرٹ لکھا ہوا تھا پھر وہ فائل اپنے اے ڈی کو دیتے ہوئے کہا۔ ”کل دوپہر دو بجے کی فلائٹ ہے۔ اسے ابھی یہاں سے لے جاؤ۔ کل روانگی سے پہلے فون پر رابطہ کرو تاکہ مجھے اطمینان رہے۔“

اے ڈی نے فائل لے کر ماریہ سے پوچھا۔ ”کیا تم ابھی یہاں بیٹھو گی؟“

وہ بولی۔ ”ہاں۔ مجھے اس سلسلے میں کچھ اور باتیں کرنی ہیں۔“

وہ ڈی جی ہیراللہ جان کے سامنے ایک ماتحت کی حیثیت سے بیٹھی رہی جبکہ وہ بظاہر اس کی بیٹی کہلاتی تھی۔ کسی بڑے مشن میں کامیاب ہونے کے لئے ایک یا ایک سے زیادہ حسین ترین چالاک اور تربیت یافتہ دوشیزاؤں کو رکھا جاتا ہے تاکہ انہیں چارا ڈالنے اور جال پھینکنے کے لئے کام میں لایا جاسکے۔ ماریہ اس فرض کی ادائیگی میں کامیاب ہو رہی تھی۔ آئندہ بھی کامیابی حاصل کرنے کے لئے اپنے باس ہیراللہ جان سے مشورے کر رہی تھی۔

اے ڈی اس سرخ فیتے والی فائل کو ایک بڑے کاغذ کے لفافے میں رکھ کر دفتر سے باہر آیا۔ اس دفتری عمارت کے داخلی دروازے پر اور احاطے کے مین گیٹ پر غیر ملکی مسلح

گارڈز تھے۔ انہوں نے اسے دیکھ کر سلیوٹ کیا اور اس کے لئے مین گیٹ کھول دیا۔ اس نے اپنی کار میں بیٹھ کر فائل والے لفافے کو ساتھ والی سیٹ پر رکھا۔ لباس کے اندر سے ریوالور نکال کر چیک کیا۔ وہ پوری طرح لوڈ تھا۔ اس نے دوبارہ اسے لباس کے اندر رکھ کر کار کو اسٹارٹ کرتے ہوئے آگے بڑھایا پھر احاطے کے مین گیٹ سے نکل کر اپنے بنگلے کی طرف جانے لگا تاکہ اپنا ضروری سامان ایک اٹیچی میں رکھ کر کراچی کے لئے وہاں سے روانہ ہو جائے۔

وہ لوگ پچھلے برس کیٹی بندر آئے تھے اور وہاں باقاعدہ انہوں نے اپنے دفاتر قائم کئے تھے۔ رہائش بھی اختیار کی تھی۔ اس عرصے میں ان کے خلاف کسی بھی قسم کی مخالفانہ کارروائی کرنے وہاں کوئی نہیں آیا تھا۔ وہاں کے مقامی باشندے ایسے غریب اور جی حضور کہہ کر سر جھکانے والے تھے کہ ان کی طرف سے غیر ملکیوں کی آمد پر کبھی احتجاجی تحریک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کے برعکس وہ ملازموں کی حیثیت سے ان کی خدمت کرنے لگے تھے۔ وہ ان کی رہائش گاہوں اور دفاتر میں روزگار سے لگے ہوئے تھے۔

کوئی خطرہ تو کیا، کسی خطرے کا اندیشہ بھی نہیں تھا۔ اے ڈی اطمینان سے کار ڈرائیو کرتا ہوا جا رہا تھا۔ آگے راستے میں دس بارہ اونٹ اس طرح جا رہے تھے کہ اس کا راستہ رک گیا تھا۔ اس نے کار روک لی۔ سڑک کی چوڑائی اتنی کم تھی کہ وہ ان اونٹوں کو اوور ٹیک کرکے آگے نہیں جا سکتا تھا۔

اس نے کار روک کر کھڑکی کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے ایک ساربان کو ہاتھ کا اشارہ کیا کہ وہ اونٹوں کو ایک قطار میں کرے تاکہ اسے آگے جانے کا راستہ ملے۔ اسی وقت ایک شخص نے کار کی کھڑکی کے پاس آکر اس کی کنپٹی سے ریوالور کی نال لگا دی۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ ریوالور والا کوئی مقامی لگ رہا تھا۔ وہ اس طرح اچانک آیا تھا کہ اے ڈی اپنے لباس کے اندر سے اپنا ریوالور نہیں نکال سکا تھا۔

کار کے دوسرے دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے دیکھا وہاں بھی ایک مقامی شخص ریوالور لئے ہوئے کھڑا تھا اور دروازہ کھولنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ اسے دروازے کا لاک کھولنا پڑا۔ دوسرا شخص اندر آکر اس فائل والے لفافے کو اٹھا کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور ہاتھ آگے بڑھا کر پچھلے دروازے کے لاک کو کھول دیا۔ پہلا والا پچھلی سیٹ پر آکر آرام سے بیٹھ گیا اور ریوالور کی نال کھوپڑی کے پچھلے حصے سے لگا دی۔ دوسرے نے تلاشی لے کر اس کے لباس کے اندر سے ریوالور نکال لیا۔ اس وقت تک تمام اونٹ ایک قطار میں ہو گئے تھے۔ آگے والے نے کہا۔ "کم آن۔ ڈرائیو آن اے ہیرو۔"

وہ کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "تم کون ہو؟ مقامی نہیں ہو سکتے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہاں کے مقامی باشندے ناخواندہ ہیں۔ جبکہ تم انگریزی بول رہے ہو۔"

"ہم جو بھی ہیں۔ اس وقت تک تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے جب تک تم ہمارے احکامات کی تعمیل کرتے رہو گے۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟"

"فی الحال ہم جہاں کہہ رہے ہیں، وہاں گاڑی لے چلو۔"

وہ مجبور تھا۔ ان کے احکامات کی تعمیل کرنے لگا۔ اپنے بنگلے کی طرف جانے والا راستہ چھوڑ کر ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگا۔

☆======☆======☆

وہ دوسرے دن گیارہ بجے کیٹی بندر پہنچا۔ ماریہ اپنی کار لے کر گھاٹ پر آئی تھی۔ اس نے کار سے باہر نکل کر مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ قریب آکر بولی۔ "جی چاہتا ہے، گردن میں بانہیں ڈال کر سینے سے لگ جاؤں اور اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو آرام پہنچاؤں۔"

"ایسا شادی کے بعد بھی سرعام نہیں ہوگا۔ ہماری تہذیب میں میاں بیوی کے تعلقات بیڈ روم کی چار دیواری کے اندر ہوتے ہیں۔ باہر صرف پیار بھری گفتگو ہوتی ہے اور مہذب انداز میں محبت کا اظہار ہوتا ہے۔"

وہ کار میں آکر بیٹھ گئے۔ ناریہ نے اسے اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ایک بہت بڑی خوشخبری ہے۔ میں نے ڈیڈی سے ضد کرکے اپنی بات منوائی ہے۔"

"کیا وہ ہماری شادی کے لئے راضی ہو گئے ہیں؟"

"شادی کے لئے نہیں، کیٹی بندر بجلی گھر کا فائل تمہیں دکھانے اور پڑھانے کے لئے راضی ہو گئے ہیں۔"

"تعجب ہے۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی بڑی بات مان لیں گے۔"

"انہوں نے کہا ہے، وہ ایک سیدھا سادہ سا کاروباری معاہدہ ہے اور ہماری کمپنی کے تعاون سے پاکستانی قوم کو فائدہ پہنچ سکتا ہے تو وہ تمہیں مطمئن کرنے کے لئے اصول کے خلاف وہ معاہدہ پڑھنے کے لئے دے دیں گے؟"

"کب پڑھنے کے لیے دیں گے؟"

"آج اور ابھی۔ ہم ان کے دفتر جارہے ہیں۔"

وہ بولا۔ "عشق میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں لیکن تمہارے عشق نے میرا کام آسان کردیا ہے۔"

وہ مصنوعی ناراضگی سے بولی۔ "میں نے اتنا بڑا کام کیا ہے مگر تم اجنبیوں کی طرح بیٹھے ہو۔"

وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "تم نہیں جانتیں' میں تمہیں............ حاصل کرنے کے لئے کس قدر بے چین ہوں مگر صبر کر رہا ہوں اگر تم صبر کرنا نہیں چاہتیں تو آج ہی میرے ساتھ کراچی چلو۔"

"میں چلنے کے لئے تیار ہوں مگر ڈیڈی یہاں کی حکومت کے تعاون سے تمہیں گرفتار کرادیں گے اور مجھے واپس لے آئیں گے۔"

"کوئی بات نہیں' تم سہاگ رات تو مناؤ گی۔ میں اپنے انجام کی پروا نہیں کرتا۔"

کار دفتری عمارت کے احاطے میں پہنچ کر رک گئی۔ وہ کار سے اتر کر عمارت میں داخل ہوئے' ایک کوریڈور سے گزر کر دوسرے کوریڈور میں پہنچے' ماریہ نے ایک دروازے پر ہلکی سی دستک دی اسے ذرا سا کھول کر پوچھا۔ "ہائے ڈیڈ............! کیا ہم اندر آسکتے ہیں؟"

"کم آن بے بی!"

وہ دونوں اندر آئے۔ ہیرالڈ نے اٹھ کر وہ سے مصافحہ کیا پھر کہا۔ "بیٹھو۔ تم مجھے کوئی جادوگر معلوم ہوتے ہو۔ میری بیٹی پر جادو کردیا ہے۔ یہ مجھ سے ایسی باتیں منوا لیتی ہے' جو میرے اصول کے خلاف ہیں۔ بہر حال کیا پیو گے' چائے یا کافی؟"

وہ بولا۔ "چائے کافی ہوگی۔"

ہیرالڈ نے انٹر کام کے ذریعے چائے اور بسکٹ لانے کو کہا پھر ریوالونگ چیئر سے اٹھ کر پیچھے آئرن سیف کے پاس جاکر اسے کھولا۔ اندر بہت سی فائلیں نظر آرہی تھیں۔ اس نے ایک فائل اٹھا کر سیف کو بند کیا پھر ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر اس کی طرف فائل بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے اچھی طرح پڑھ لو۔ یہ تمہاری مطلوبہ فائل ہے۔"

وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے فائل لے کر اور اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ ہیرالڈ نے کہا۔ "اگر تمہاری کوئی سماجی' یا سرکاری اہمیت ہے تو میں چاہوں گا کہ ایک پریس کانفرنس میں بیان دو کہ تم نے کیٹی بندر بجلی گھر کا یہ صاف ستھرا معاہدہ پڑھا ہے۔"

وہ پڑھ رہا تھا۔ معاہدہ واقعی صاف ستھرا تھا۔ کوئی گڑ بڑ والی بات نہیں تھی۔ وہاں

ایک بڑا بجلی گھر قائم ہونے سے تھر کے علاقے میں دور دور تک بجلی کے ذریعے ریگستانی علاقوں میں پانی بھی پہنچایا جاسکتا تھا۔ جس علاقے میں بجلی اور پانی ہو پھر وہ علاقہ پسماندہ نہیں رہ سکتا۔ وہاں ترقی کی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔

اس معاہدے کے آخر میں واپڈا کے اور سیپا کے اعلیٰ عہدیداروں کے دستخط تھے۔ اس نے واپس کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے یہ فائل میرے سامنے کھول کر اپنی نیک نیتی کا ثبوت دیا ہے اور مجھے مطمئن کیا ہے لیکن............"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ہیرالڈ نے کہا۔ "ہاں ہاں بولو۔ رک کیوں گئے؟"

اس نے ماریہ کو دیکھا۔ ماریہ نے کہا۔ "ڈیڈی! یہ اس فائل کو دیکھنا چاہتے ہیں جس پر سرخ فیتہ ہے اور جس پر "ٹاپ سیکرٹ" لکھا ہوا ہے۔"

ہیرالڈ نے کہا۔ "بے بی! یہ نامناسب ہے اور مسٹروہ کو بھی سمجھنا چاہئے کہ راز آخر راز ہی ہوتا ہے پھر ٹاپ سیکرٹ کسی کے سامنے کبھی ظاہر نہیں کیا جاتا ہے۔"

ماریہ نے کہا۔ "آپ درست کہہ رہے ہیں لیکن یہ پریس کانفرنس میں پوری طرح مطمئن ہوکر بیان دیں گے۔ آپ اپنی بیٹی کی خاطر انہیں مطمئن کردیں۔"

اس نے دوبارہ اٹھ کر آئرن سیف کھولا۔ کیٹی بندر بجلی گھر والی فائل کو سیف کے اندر رکھ کر دوسری فائل اٹھائی۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔ "ٹاپ سیکرٹ" اور اس پر سرخ فیتہ نظر آرہا تھا۔ اس نے وہ کے پاس آکر فائل کھول کر کہا۔ "یہی............ ٹاپ سیکرٹ والی فائل ہے۔ ہانگ کانگ میں ایک شپنگ کمپنی سے خفیہ معاہدہ ہوا تھا۔ تمہارے ملک کا اس سے تعلق نہیں ہے اس لئے تمہارے ہاتھوں میں نہیں دے رہا ہوں۔ ایک ایک صفحہ دکھا رہا ہوں۔ اس پر سرسری نگاہ ڈال کر مطمئن ہوسکتے ہو کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

وہ اس فائل کے ہر صفحے کو سرسری نظروں سے دیکھتا گیا۔ آخر میں سیپا اور ہانگ کانگ شپنگ کمپنی کے عہدیداروں کے دستخط تھے۔ وہ مطمئن ہوکر بولا۔ "میں نے آپ کو بڑی زحمت دی اور آپ کے ذہن پر بھی گراں گزر رہا ہوگا لیکن آپ کو اس کا فائدہ پہنچے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی سیپا کمپنی کے خلاف جو غلط فہمیاں ہیں' اسے پریس والوں کے ذریعے دور کردوں گا۔"

ہیرالڈ جان نے خوش ہوکر اس کا شکریہ ادا کیا۔ ٹاپ سیکرٹ فائل کو آئرن سیف میں رکھ کر لاک کیا پھر ریوالونگ چیئر پر آکر بیٹھ گیا۔ ملازم چائے اور بسکٹ لے آیا تھا۔ وہ بسکٹ کھانے اور چائے پینے لگے۔ ماریہ نے کہا۔ "ڈیڈ............! میں مسٹروہ کے ساتھ کراچی جانا چاہتی ہوں۔ کیا جاسکتی ہوں؟"

"اب تم ایک نئی فرمائش کررہی ہو۔ میں انکار کروں گا تو تم پھر اپنی ضد منوانے کے لئے مجھے پریشان کرتی رہوگی۔"

"ڈیڈی! میں کراچی جاؤں گی تو آپ کو فائدہ پہنچے گا۔ میں مسترّوہ سے ضد کروں گی کہ یہ کل ہی پریس کانفرنس بلائیں اور اس کی باقاعدہ ویڈیو فلم تیار کریں۔"

"ہوں۔ تمہاری یہ بات دل کو لگتی ہے۔ آل رائٹ تم جاسکتی ہو۔"

وہ خوش ہوکر اپنی جگہ سے اٹھ کر ہیرالڈ جان سے لپٹ گئی۔ اسے پیار کیا پھر کہا "تھینک یو ڈیڈی! یو آر ویری نائس ٹومی۔"

پھر وہ دونوں ہیرالڈ جان........ سے رخصت ہوکر اس دفتری کمرے سے چلے گئے۔

ہیرالڈ جان........ نے آرام سے ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر اطمینان کی سانس لی۔ اس نے بڑی حکمتِ عملی سے کام لیا تھا۔ مسترّوہ کو مطمئن کرکے وہ پاکستانی پریس اور عوام.......... کا اعتماد حاصل کرنے والا تھا۔

اس نے سوچتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔

اس نے کل اپنے اے ڈی کو ٹاپ سیکرٹ والی فائل دے کر کہا تھا کہ کراچی سے لندن روانہ ہونے سے پہلے فون کے ذریعے رابطہ کرے لیکن فلائٹ کی پرواز کا وقت ہوچکا تھا اور اے ڈی نے اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

اس نے ریسیور اٹھا کر کراچی میں اپنے ملک کے سفارت خانے سے رابطہ کیا پھر وہاں کے سیکرٹری سے پوچھا۔

"اے ڈی نے مجھ سے رابطہ کیوں نہ کیا ہے؟ کیا وہ لندن کے لئے روانہ ہوچکا ہے؟"

سیکرٹری نے کہا۔ "نو سر! آپ کا اے ڈی ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔ ہمارے آدمی نے فلائٹ کی پرواز سے ایک گھنٹا پہلے اس کا ٹکٹ کینسل کرایا ہے۔"

ہیرالڈ نے پریشان ہوکر کہا۔ "اے ڈی کل ہی یہاں سے روانہ ہوچکا تھا پھر وہاں کیوں نہیں پہنچا؟"

اس نے رابطہ منقطع کرکے اے ڈی کے بنگلے کے فون نمبر ڈائل کیا۔ ریسیور کان سے لگایا۔ دوسری طرف مسلسل گھنٹی کی آواز ابھرتی رہی لیکن کسی نے فون نہیں اٹھایا' ہیرالڈ نے اپنی خفیہ ایجنسی سے رابطہ کیا۔ ایجنسی کے چیف کو اے ڈی کے بارے میں بتایا کہ وہ ایک اہم فائل لے کر کل یہاں سے گیا تھا لیکن لاپتا ہوگیا ہے۔ اسے فوراً تلاش کیا جائے۔

خفیہ ایجنسی نے اپنے جاسوس کے ذریعے یہ معلوم کیا کہ اے ڈی کیٹی بندر سے کل

باہر گیا تھا یا نہیں؟ گھاٹ کے ملاح اور وہاں کے انچارج وغیرہ اے ڈی جیسے افسران کو اچھی طرح جانتے تھے۔ سب نے بیان دیا کہ اے ڈی صاحب کل یہاں سے فیری بوٹ کے ذریعے نہیں گئے تھے۔ کیٹی بندر سے باہر جانے کا وہی ایک راستہ تھا۔ ایجنسی کے چیف نے فون کے ذریعے ہیرالڈ کو بتایا۔ "اے ڈی کیٹی بندر میں کہیں ہے۔ وہ یہاں سے باہر نہیں گیا ہے۔ ہمارے آدمی اس کی تلاش میں نکل پڑے ہیں۔"

ہیرالڈ نے کہا۔ "یہاں کی سیکورٹی کو الرٹ کردو۔ مسترّوہ ماریہ کے ساتھ ہے۔ جب تک اے ڈی کا سراغ نہ ملے' مسترّوہ کو یہاں سے باہر نہ جانے دیا جائے۔"

وہ ریسیور کو کریڈل پر پٹخ کر کھڑا ہوگیا۔ اب وہ سکون سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اسے اے ڈی کی فکر نہیں تھی۔ فکر ٹاپ سیکرٹ فائل کی تھی' اگر وہ سرخ فیتے والی فائل انٹیلی جنس........ کے سامنے کھل جاتی تو ایک بہت بڑا مشن ناکام ہوتا اور سیاپا کمپنی کے قدم اس زمین سے اکھڑ جاتے۔ اس نے پھر فون کے ذریعے ایک سیکورٹی گارڈ سے پوچھا۔

"کیا مسترّوہ' ماریہ کے ساتھ ہے؟"

"یس سر! میں ان دونوں کی نگرانی کررہا ہوں۔"

"وہ ابھی کہاں ہیں؟"

"ابھی ابھی وہ ساحلی سڑک پر آئے ہیں اور کار سے اتر کر مچھلی بازار کی طرف جارہے ہیں۔"

"اگر وہ گھاٹ کی طرف جائیں تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔"

اس نے فون بند کردیا۔ سیکورٹی گارڈ نے درست اطلاع دی تھی۔ وہ دونوں مچھلی بازار پہنچ گئے تھے۔ ماریہ نے کہا۔ "تم کبھی مچھلیاں خریدتے نہیں ہو لیکن جب بھی ساحل پر آتے ہو تو مچھلی بازار سے ضرور گزرتے ہو۔ کیا مچھلیاں بیچنے والی عورتوں میں کوئی کشش ہے؟"

اسی وقت ایک مقامی عورت نے مخاطب کیا۔ "صاحب! ایک دم تازہ مچھلی ہے۔ ایک بار لے جاکر میم صاحب کو کھلاؤ پھر روز روز آؤ گے۔"

وہ نے کہا۔ "میم صاحب ابھی یہی کہہ رہی تھیں کہ میں مچھلی نہیں خریدتا ہوں۔ چلو جو تازہ ہے' وہ ایک کلو دے دو۔"

وہ عورت ایک مچھلی تول کر اسے چھیلنے اور کاٹ کر اس کے ٹکڑے بنانے لگی۔ ماریہ اپنے محبوب کی طرف رخ کئے باتیں کررہی تھی۔ اس عورت نے چور نظروں سے ماریہ کو دیکھا پھر ایک شاپنگ بیگ لے کر اپنے نیچے ایک چٹائی سے ریوالور نکال کر شاپنگ

بیگ میں ڈالا پھر اس کے اوپر مچھلی کے بڑے بڑے ٹکڑے ڈال دیئے۔ اس کے بعد شاپنگ بیگ آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یہ لو صاحب! ساٹھ روپے دو۔"

وہ نے اسے بیس روپے دے کر اس سے شاپنگ بیگ کو لے لیا پھر کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "ہمیں یہاں سے جانا چاہئے تاکہ شام سے پہلے کراچی پہنچ سکیں۔ میں تمہیں بڑی مزیدار مچھلی پکا کر کھلاؤں گا۔"

وہ کار میں آکر بیٹھ گئے۔ اسی وقت ایک مقامی نے کار کی کھڑکی کے پاس جھک کر کاغذات کا ایک پلندا وہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "صاحب! یہ کاغذ کا پوٹلا آپ کا ہے۔ ادھر گھاٹ میں گرا پڑا تھا۔ ہم اٹھا کے آپ کو ڈھونڈا۔ آپ کیسا آدمی ہے صاحب! اپنا چیز کو بھول گیا۔"

وہ نے کاغذات کا پلندا لے کر اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے انعام کے طور پر دس روپے دیئے۔ وہ خوشی کا اظہار کرتا ہوا چلا گیا۔ ماریہ نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں کے لوگ بہت غریب ہیں۔ دس روپے لے کر خوش ہو جاتے ہیں۔ بائی دا وے یہ کیسے کاغذات ہیں۔ تم انہیں گم کر کے بھول گئے تھے؟"

وہ مسکرا کر بولا۔ "گھاٹ پر تمہیں دیکھتے ہی میں ساری دنیا کو بھول گیا تھا۔ یہ کاغذات کیا چیز ہیں؟"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "تم باتیں خوب بناتے ہو۔ یہ کاغذات یہاں کیوں لائے تھے۔ کیا اتنے اہم ہیں کہ گم ہونے کے بعد ان کی کمی محسوس نہ کرو؟"

"کاغذات تو بہت اہم ہیں۔ کراچی پہنچ کر تمہیں ان کی اہمیت بتاؤں گا۔"

"ابھی بتانے میں کیا حرج ہے؟"

"ہم کراچی پہنچنے تک صرف پیار و محبت.......... کریں گے۔"

ماریہ نے گھاٹ کے قریب کار روک دی۔ اس نے کاغذات کو جیکٹ کے اندر رکھ لیا تھا۔ وہ کار سے باہر آئے تو کشتی کے قریب چار مسلح گارڈز کھڑے ہوئے تھے۔ ایک نے ماریہ سے کہا۔ "مس صاحبہ! آپ کے ڈیڈی کا حکم ہے' ابھی آپ دونوں یہاں سے نہ جائیں۔"

اس نے کہا۔ "ماریہ! ان سے کہو۔ ہمارا ابھی جانا بہت ضروری ہے۔"

ماریہ بولی۔ "جب ڈیڈی منع کر رہے ہیں تو کوئی مصلحت ہوگی۔ پلیز رک جاؤ۔"

"سوری ماریہ! میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کروں گا۔ ان گارڈز کو راستے سے ہٹنے کے لیے کہہ دو۔"

"تم کیوں ضد کر رہے ہو؟ جب ڈیڈی ہم سے تعاون کر رہے ہیں تو ہمیں ان کی بات مان کر رک جانا چاہئے۔"

اس نے مچھلی کے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکالا۔ تھیلے کو پھینکا پھر ایک ہاتھ سے ماریہ کو دبوچ کر اسے ریوالور کے نشانے پر رکھتے ہوئے مسلح گارڈز سے کہا۔ "فوراً ہٹ جاؤ۔ کسی نے روکنے کی کوشش کی تو میں تمہاری مس صاحبہ کو گولی ماردوں گا۔"

وہ چاروں گارڈز مجبوراً ایک طرف ہٹ گئے۔ یہ راز سیپا کے چند اعلیٰ افسران جانتے تھے کہ ماریہ ڈائریکٹر جنرل ہیراللہ جان.......... کی بیٹی ہے یا محض ایک آلۂ کار ہے۔

وہ ماریہ کو کھینچتا ہوا کشتی میں آکر ملاح سے بولا۔ "فوراً انجن اسٹارٹ کرو ورنہ گولی ماردوں گا۔ جلدی کرو۔"

ملاح نے انجن.......... اسٹارٹ کیا۔ ہیراللہ جان.......... کی طرف سے جو گارڈ خفیہ طور پر ان کی نگرانی کر رہا تھا' اس نے اپنی جیب سے موبائل فون نکالا لیکن اسے آن کرنے سے پہلے ہی کہیں سے ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور اس کی کھوپڑی میں پیوست ہوگئی۔ وہ کچھ بولنے سے پہلے ہی خاموش ہوگیا۔ کشتی گھاٹ سے دور ہوتی جارہی تھی اور تیزی سے دوسرے گھاٹ کی طرف جارہی تھی۔

ماریہ نے کہا۔ "تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔ اس طرح مجھے زبردستی مت لے جاؤ۔ ڈیڈی کے آدمی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ تمہیں گولی مار دیں گے۔"

"میں نے تم سے عشق کیا ہے۔ تمہارے لئے سینے پر گولی کھاؤں گا۔ کیا تم میرے لیے جان پر کھیلنے سے ڈر رہی ہو؟"

"جان بوجھ کر موت کو دعوت دینا حماقت ہے' عشق نہیں ہے۔"

"ہم پاکستانی ایسا ہی عشق کرتے ہیں۔ دیکھتی جاؤ' یہ عشق بھی ہے اور ایڈونچر بھی۔"

ہیراللہ جان.......... بہت پریشان تھا۔ اپنے دفتری کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ خفیہ ایجنسی اب تک معلوم نہیں کرپائی تھی کہ اے ڈی اس ٹاپ سیکرٹ فائل کے ساتھ کہاں لاپتا ہوگیا ہے۔ بڑی دیر بعد ایجنسی کے چیف نے فون پر کہا۔ "کیٹی بندر میں میرا پورا اسٹاف اے ڈی کو تلاش کر رہا ہے۔ آپ کے درجنوں سیکورٹی گارڈز کیا کر رہے ہیں؟ وہ ماریہ اور مسٹر وہ کو جانے سے نہ روک سکے۔ وہ دونوں گھاٹ پار کر کے رافوٹو گوٹھ سے بھی آگے نکل گئے۔ رپورٹ کے مطابق مسٹر وہ ماریہ کو یرغمال بنا کر لے گیا ہے۔"

ہیرالڈ حیرانی و پریشانی سے سوچنے لگا۔ "مسٹروہ نے ماریہ کو یرغمال کیوں بنایا ہے؟ میرے حکم کے خلاف وہ جبراً یہاں سے کیوں گیا ہے؟ کیا وہ سیکرٹ فائل اس کے ہاتھ لگ گئی ہے؟"

اس نے ماریہ کی نگرانی کرنے والے گارڈ سے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے فون اٹینڈ نہیں کیا جارہا تھا۔ ہیرالڈ کو ابھی معلوم نہیں ہوا تھا کہ وہ گارڈ مارا جاچکا ہے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ ہیرالڈ نے کہا۔ "آجاؤ۔"

دو مسلح گارڈز نے آکر اسے سلیوٹ کیا پھر ایک نے کہا۔ "سر! ہم گھاٹ پر تھے۔ اس نے مس صاحبہ کو ریوالور کے نشانے پر رکھا تھا اور ہم کو وارننگ دی تھی کہ اس کا راستہ نہ روکا گیا تو وہ مس صاحبہ کو گولی مار دے گا۔ ایسے میں ہم اسے راستہ نہ دیتے تو وہ مس صاحبہ کو مار ڈالتا۔"

ہیرالڈ نے غصے سے کہا۔ "وہ ماریہ کو مار ڈالتا تو کیا قیامت آجاتی۔ تم لوگوں نے اسے جانے کیوں دیا؟"

دوسرے گارڈ نے کہا۔ "سر! ہم آپ کی بیٹی.......... کو قتل ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔"

ہیرالڈ کو خیال آیا کہ یہاں سب ہی ماریہ کو اس کی بیٹی سمجھتے ہیں۔ وہ خواہ مخواہ انہیں غصہ دکھا رہا ہے۔ اس نے ان سے پوچھا۔ "کیا مسٹروہ کے پاس کوئی فائل تھی۔"

"نو سر! اس کے پاس فائل نہیں تھی۔ ایک تھیلا تھا جس کے اندر مچھلی کے ٹکڑے تھے۔ اس نے تھیلے کے اندر سے ریوالور نکالا تھا۔"

"اس کے پاس فائل نہیں تھی۔ کچھ کاغذات تو ہوں گے۔"

"یس سر! وہ کار سے نکلتے وقت کچھ کاغذات کا ایک پلندا اپنی جیکٹ کے اندر رکھ رہا تھا۔"

اس نے گارڈز کو جانے کا حکم دیا پھر فون کے ذریعے ایجنسی کے چیف سے کہا۔ "مسٹروہ کاغذات کا ایک پلندا اپنی جیکٹ کے اندر رکھ کر لے گیا ہے۔ ہوسکتا ہے' اس نے فائل کو پھینک دیا ہو اور صرف اہم کاغذات لے جارہا ہو۔"

چیف نے کہا۔ "وہ رافوگوٹھ کے بعد بکھان تھانے کے قریب سے گزرے گا۔ اگر راستہ بدل بھی دے تو اسے گھارو پولیس اسٹیشن کے پاس سے ضرور گزرنا ہوگا۔ ہم نے دونوں تھانے والوں کو الرٹ کردیا ہے۔ کراچی پہنچنے کے راستوں پر ہمارے آدمی اس کی تاک میں ہیں۔"

ہیرالڈ جان.......... مطمئن نہیں تھا۔ صرف اپنی خفیہ ایجنسی کی کارکردگی پر بھروسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مسٹروہ کی پُراسراریت اور حکمتِ عملی نے سمجھا دیا تھا کہ اس کے اہم مشن کو ناکام بنانے والا مسٹروہ تنہا نہیں ہے۔ وہ باقاعدہ کسی منظم ٹیم کے ساتھ کام کر رہا ہے۔

اس نے حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار سے فون پر کہا۔ "میں نے چار دن پہلے اس شبہ کا اظہار کیا تھا کہ ایک جوان موٹر سائیکل پر رافوگوٹھ تک آتا ہے پھر فیری بوٹ کے ذریعے کیٹی بندر پہنچ کر چند گھنٹے گزار کر چلا جاتا ہے۔ ہم نے تو اسے روکنے اور ٹریپ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن آپ کی طرف سے کارروائی نہیں کی گئی۔"

اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ "ایسے کتنے ہی لوگ ساحلی علاقوں میں تفریح کے لئے جاتے رہتے ہیں۔ جب تک وہ جوان کوئی قابلِ اعتراض حرکت نہ کرتا' اس کے خلاف کوئی بڑا قدم نہیں اٹھایا جاسکتا تھا۔"

"آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ وہ ہمارے اور آپ کے درمیان ہونے والے خفیہ معاہدے کے اصل کاغذات چرا کرلے گیا ہے۔"

اعلیٰ عہدیدار نے گھبرا کر پوچھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"وہی کہہ رہا ہوں' جس کی ہم توقع بھی نہیں کرسکتے تھے۔"

"مسٹر جان..........! ہم نے مقتدر حلقوں کی لاعلمی میں وہ خفیہ معاہدہ کیا تھا۔ اگر اس معاہدے کا علم کسی بھی.......... اعلیٰ افسر.......... کو ہوگیا تو ہماری حکومت خطرے میں پڑجائے گی۔ وہ جوان کون ہے؟ اور اس وقت کہاں ہوسکتا ہے؟"

"میں پہلے بتاچکا ہوں کہ وہ جوان خود کو مسٹروہ کہتا ہے۔ اس وقت وہ.......... کاغذات چرانے کے علاوہ میری بیٹی ماریہ کو بھی اغوا کرکے لے جارہا ہے۔ وہ شاید کراچی کی طرف جارہا ہے لیکن بہت چالباز ہے۔ کسی دوسرے علاقے کی طرف جاسکتا ہے۔ ویسے وہ سندھ کے جنوب مشرقی حصے میں رہے گا۔"

اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ "اس کے خلاف بڑے اقدامات کے لئے یہ اہم نکتہ ہمیں مل گیا ہے کہ اس نے غیر ملکی سیاپا کمپنی کے ڈائریکٹر جنرل کی بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ آپ اسے غیرت کا معاملہ بناکر سفارتی سطح پر واویلا کریں اور حکومت پاکستان سے مطالبہ کریں کہ اس نے سلطنتِ برطانیہ کی ایک بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ لہٰذا اسے گرفتار کرکے حکومتِ برطانیہ کے حوالے کیا جائے۔ ہم یہاں اپنے طور پر اس کے خلاف اقدامات کررہے ہیں۔ میں ابھی سندھ کی پولیس اور انتظامیہ کو اس کے پیچھے لگاکر آپ سے رابطہ کروں گا۔ آپ کو یقین

دلاتا ہوں کہ اس معاہدے کو نہ آرمی تک پہنچنے دوں گا اور نہ ہی اسے عوامی سطح پر ظاہر ہونے دوں گا۔"

انہوں نے رابطہ ختم کردیا اور اپنے طور پر وہ کے خلاف عملی اقدامات کرنے لگے۔

وہ اس حقیقت کو سمجھتا تھا کہ جس آگ سے کھیلنے جارہا ہے' اس میں جل بھی سکتا ہے۔ یہ جانتا تھا کہ برطانیہ کی سیپا کمپنی کے پیچھے امریکی کمپنی ہوپ ڈیل ہولڈنگ لمیٹڈ ہے۔ اگر اس خفیہ معاہدہ کو چرایا جائے گا تو امریکا بہادر کی تمام خفیہ ایجنسیاں اس تنہا وہ کا جینا حرام کردیں گی۔

وہ سیپا اور امریکی اپچ اپچ تو غیر ملکی ہیں۔ پرائے ہیں' یہاں تو اپنے ہی ملکِ خدا داد کے دشمن اعلیٰ عہدیدار بھی وہ پر اپنے وطن کی زمین تنگ کردیں گے۔

اس کے باوجود وہ آتشِ نمرود میں کود پڑا تھا۔ تیز رفتاری سے اپنی موٹر سائیکل بھگا........ رہا تھا۔ پہلے اس نے ماریہ کو پیچھے بٹھایا تھا لیکن وہ چھلانگ لگا کر ایک کچی سڑک پر گر پڑی تھی۔ وہ موٹر سائیکل کو گھما کر اس کے پاس آکر بولا۔ "تم کیا چاہتی ہو؟ کیا ایسی حرکتیں کرکے فرار ہونے اور بچ نکلنے کا موقع ضائع کرنا چاہتی ہو؟"

"میں تم سے کئی بار کہہ چکی ہوں' مجھ سے........ محبت کرتے ہو تو ڈیڈی کو اپنا دشمن نہ بناؤ۔"

"تم کسے ڈیڈی کہہ رہی ہو؟ کیا مجھے نادان بچہ سمجھ رہی ہو؟ مس لومڑی! ہمارے عشق کی داستان صرف اتنی سی ہے کہ تم مجھے پھانس رہی تھیں اور میں تمہیں پھانس رہا تھا۔ ابھی تمہیں محبوبہ بنا کر نہیں یرغمال بنا کر لے جارہا تھا۔ کہیں ایسی جگہ تمہیں چھوڑنا چاہتا تھا' جہاں کوئی گاڑی مل جائے اور تم کیٹی بندر واپس جاسکو۔ بولو کیا ارادہ ہے؟ کسی بستی کے قریب پہنچا دوں........ یا اسی ویرانے میں چھوڑ کر چلا جاؤں؟"

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے اپنی کمر پکڑ کر مشکل سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ وہ بولا۔

"مجھے پوچھنا چاہئے کہ تمہیں کہاں چوٹ لگی ہے؟ لیکن تم میری گھر والی نہیں ہو۔ اس لیے........ میرا پوچھنا مناسب نہیں ہوگا۔"

وہ کراہتے ہوئے بولی۔ "تم نے مجھے لومڑی کہا ہے۔ تم خواہ مخواہ مجھے مکار سمجھ رہے ہو۔ اب میں کوئی ایسی حرکت نہیں کروں گی' جس کے باعث تم میری........ محبت پر شبہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی اور ثابت کردوں گی کہ تمہاری خاطر ساری دنیا کو چھوڑ سکتی ہوں۔"

وہ اس کے پیچھے موٹر سائیکل پر آکر بیٹھ گئی۔ اس کی کمر کو اپنی بانہوں سے جکڑ لیا

اور بدن کی شادابی کو اس کے جسم سے لگا کر پوچھا۔ "کیا تمہیں کچھ نہیں ہورہا ہے۔"

وہ موٹر سائیکل کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "تمہارے خیال میں مجھے کیا ہونا چاہیے؟"

"میری بات کو مذاق میں نہ ٹالو۔ تم پتھر نہیں ہو۔ انسان ہو۔ تمہارے اندر بھی جذبات بھڑکتے ہوں گے۔"

"تم درست کہتی ہو لیکن موت سے لڑنے والوں کو اتنا پسینہ آتا ہے کہ حسینہ عالم کی قربت سے بھی جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔"

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ جب کیٹی بندر میں تم سے ہر طرح تعاون کیا جارہا تھا۔ ٹاپ سیکرٹ فائل بھی تمہیں دکھا دی گئی تھی تو پھر تم دشمنوں کے انداز میں مجھے یرغمال بنا کر کیوں لے جارہے ہو؟"

"کیا ابھی تک صورتِ حال تمہاری سمجھ میں نہیں آئی ہے؟"

"کسی حد تک سمجھ رہی ہوں کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے ہو۔ چلو اتنا بتا دو۔ اس شخص نے تمہیں کس قسم کے کاغذات دیئے تھے؟ تم نے بڑی حفاظت سے انہیں جیکٹ کے اندر رکھا ہے۔"

"یہ بہت سے نکاح نامے ہیں۔ میں نے تمہارے جیسی کئی حسیناؤں کو پھانس کر ان سے نکاح پڑھوایا تھا۔ ان کے ذریعے اپنے کئی مقاصد پورے کئے تھے پھر انہیں اپنی زندگی سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال دیا تھا۔"

اس نے ایک جگہ موٹر سائیکل روک دی۔ اچانک اسے دھکا دیا۔ وہ چیخ مارتے ہوئے پیچھے جاکر زمین پر گر پڑی۔ وہ بولا۔ "اب تمہیں اپنی زندگی سے نکال کر پھینک رہا ہوں لیکن اتنی شرافت کے ساتھ کہ بغیر ہاتھ لگائے تمہیں ایک گوٹھ کے قریب چھوڑ رہا ہوں۔"

اس نے ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میری انگلی کی سیدھ میں' پانچ کلومیٹر چلتی رہوگی تو ایک گوٹھ میں پہنچ جاؤ گی۔ وہاں تھانے والے تمہارے بہت کام آئیں گے۔"

وہ غصے سے بولی۔ "یہ کوئی شرافت ہے؟ کیا تم گوٹھ تک نہیں پہنچا سکتے؟"

"سوری! تم جتنی دیر تک پیدل چلتی رہوگی' اتنی دیر میں' میں کہیں سے کہیں پہنچ جاؤں گا۔ اس گوٹھ کے تھانے والے تمہارے ساتھ مل کر میری گرد کو بھی نہ پہنچ سکیں گے۔"

یہ کہتے ہی اس نے موٹر سائیکل آگے بڑھائی پھر اس پر مٹی دھول اُڑاتا ہوا طوفانی رفتار سے دور ہوتا چلا گیا۔

☆======☆======☆

پولیس اور انٹیلی جنس والے حرکت میں آ گئے تھے۔ اسلام آباد سے حکم صادر کیا گیا تھا کہ مسٹروہ نامی ایک جوان جو بظاہر پاکستانی ہے' مگر غیر ملکی ایجنٹ ہے' وہ کیٹی بندر میں قائم ہونے والے ایک بہت بڑے بجلی گھر کے منصوبے کو ناکام بنانے کے لئے اس علاقے میں تخریبی کارروائیاں کرتا رہا ہے اور اب سیپا کمپنی کے ڈائریکٹر جنرل کی بیٹی ماریہ کو اغوا کرکے کہیں لے گیا ہے۔ وہ سندھ کے جنوب مشرقی علاقوں میں ہوگا۔ اس کے اطراف محاصرہ کیا جائے۔ تاکہ وہ چند مخصوص علاقوں سے باہر نہ نکل سکے اور اپنی گرفتاری پیش کرنے پر مجبور ہو جائے۔

پولیس اور انٹیلی جنس والے کراچی سے میرپور خاص تک پھر وہاں سے تھرپارکر ضلع بدین اور دادو وغیرہ تک تمام تھانوں کو اور سراغ رسانوں کو فون کے اور فیکس کے ذریعے مسٹروہ کے بارے میں خبر دے رہے تھے۔ اس کا حلیہ بیان کر رہے تھے اور اس کی یہ خاص پہچان بتا رہے تھے کہ اس کے پاس ایک بھاری بھرکم موٹر سائیکل اور ایک خوبصورت انگریز دوشیزہ ہوگی۔

وہ کراچی میں جس ریستوران کا مالک تھا' وہاں کے منیجر اور ملازمین سے پوچھ گچھ کی گئی اور اس کی تصویر طلب کی گئی۔ ان کے پاس اس کی تصویر نہیں تھی اور نہ ہی ریستوران کے ملازمین اس کے رشتے داروں کو جانتے تھے۔

یہ معلوم ہوا کہ ریستوران کی اوپری منزل میں وہ رہا کرتا تھا۔ اوپری منزل کی رہائش گاہ کا تالا توڑ کر اندر اس کے سامان کی تلاشی لی گئی۔ وہاں سے کوئی ایسی چیز یا ایسے کاغذات برآمد نہیں ہوئے' جن کے ذریعے اس کے حالاتِ زندگی اور اس کے کردار کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا۔ اس کے رہائشی سامان سے اتنا ہی اندازہ ہوا کہ وہاں ایک عام سا آدمی....... رہتا تھا۔ جس نے اب تک خلافِ قانون کوئی کام نہیں کیا تھا۔

سہ پہر کو اطلاع ملی کہ ٹھٹھہ کے ایک علاقے سونڈا میں جہاں کوئلے کے ذخائر ہیں' وہاں ایک بھاری بھرکم موٹر سائیکل پائی گئی ہے۔ سونڈا کے تمام گھروں کی تلاشی لی جارہی ہے۔ ایک عورت اور دو مردوں کا بیان تھا کہ ایک خوبرو جوان ادھر آیا تھا لیکن اس کے ساتھ کوئی انگریز لڑکی نہیں تھی۔ وہ سڑک کے کنارے موٹر سائیکل چھوڑ کر ٹھٹھہ جانے والی بس میں سوار ہو گیا تھا۔

ٹھٹھہ کے پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملی کہ وہ انگریز لڑکی ماریہ وہاں آئی ہوئی ہے۔ ماریہ کا بیان تھا کہ مسٹروہ اسے بکھان پولیس اسٹیشن سے پانچ کلو میٹر دور چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ بکھان کی پولیس نے اسے ٹھٹھہ پہنچا دیا تھا۔ ماریہ نے فون کے ذریعے ہیرالڈ جان......... اور.......... برطانوی سفارت خانے سے رابطہ کرکے انہیں اپنے حالات بتائے تھے۔ اب سفارت خانے کی طرف سے اسے لے جانے کے لئے ایک گاڑی آنے والی تھی۔

تھرپارکر کا وہ صحرا جو بھارت کے راجستھان سے ملا ہوا ہے۔ وہاں کے پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملی کہ وہاں کی ایک مشہور سماجی تنظیم "بانہہ بیلی" کے صدر نے ایک بیان دیا ہے۔ اس بیان کے مطابق پچھلے روز ایک خوبرو جوان ایک بھاری بھرکم موٹر سائیکل پر تین کم سن لڑکیوں کو لے کر آیا تھا۔ غیر ملک سے آنے والے شکاریوں کی ایک ٹیم ان لڑکیوں کو پکڑنا اور ظلم کرنا چاہتی تھی۔ وہ جوان انہیں ان ظالموں سے بچا کر لایا تھا اور بانہہ بیلی کے صدر کو ان لڑکیوں کی حفاظت کی ذمے داری سونپی تھی۔ اس نے اپنا شناختی کارڈ دکھایا تھا جس کے مطابق اس کی عرفیت مسٹروہ تھی اور وہ دوبارہ کسی دن آنے کے لئے کہہ گیا تھا۔

وہ دن گزر گیا۔ رات آ گئی۔ حکومت کے اعلیٰ عہدیدار نے سختی سے حکم دیا تھا کہ ہر علاقے میں پولیس کی کئی موبائل ٹیمیں بنائی جائیں اور وہ ٹیمیں باری باری دن رات مسٹر وہ کو تلاش کریں۔ جب تک وہ گرفتار نہ ہو' تب تک راتوں کو بھی گشت کیا جائے اسے ہر صورت میں پکڑنا ہے۔

اس بس کا پتا چل گیا جس میں وہ سونڈا سے بیٹھ کر ٹھٹھہ گیا تھا۔ اس بس کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو مسٹروہ کا حلیہ بتا کر سوالات کئے گئے۔ ڈرائیور نے کہا۔ "میں نے ایک خوبرو جوان کو بس میں دیکھا تھا۔ وہ مجھے دو باتوں کی وجہ سے یاد رہا۔ ایک بات تو یہ تھی کہ وہ قد آور باڈی بلڈر تھا۔ ایکشن سے بھرپور انگلش فلموں کے ہیرو کی طرح اس نے چست پتلون اور چمڑے کی جیکٹ پہنی تھی۔ دوسری بات یہ کہ سونڈا سے چھ کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک پجارو نے بس کو روکا تھا۔ وہ جوان اس پجارو میں بیٹھ کر چلا گیا تھا۔ پجارو بڑی تیز رفتاری سے ٹھٹھہ کی طرف گئی تھی اور بس اس سے بہت پیچھے رہ گئی تھی پھر پتا نہ چل سکا کہ وہ کہاں گیا ہے؟"

انٹیلی جنس والے اعلیٰ عہدیدار تک یہ تمام رپورٹ پہنچا رہے تھے اور اپنے تجربات کے مطابق کہہ رہے تھے کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ اس کا ایک منظم گروہ ہے۔ اس کے کام

آنے والے ہر اس جگہ موجود رہتے ہیں' جہاں مسٹروہ کو ان کی ضرورت پیش آتی ہے اوروہ بروقت اسے گاڑی' گن' موبائل فون اور ضرورت کا ہر سامان مہیا کرتے رہتے ہیں۔

انٹیلی جنس والوں نے وہ کے حق میں بھی بیان دیا تھا کہ اس نے یا اس کے کسی ساتھی نے کسی بھی پاکستانی شہری کو جانی یا مالی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ کیٹی بندر میں جو غیر ملکی سیکورٹی گارڈ کو قتل کیا گیا تھا' اس قتل کے بارے میں ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ وہ نے یا اس کے کسی ساتھی نے اسے ہلاک کیا تھا۔

مسٹروہ پر سیپا کمپنی کے ڈائریکٹر جنرل کی بیٹی ماریہ کے اغوا کا الزام تھا اور وہ ٹھٹھہ میں تھی۔ وہ بیان دے رہی تھی کہ اسے مسٹروہ نے اغوا کیا تھا لیکن یہ نہیں بتا رہی تھی کہ کیوں اغوا کیا تھا؟ اگر اس کی عزت لوٹنے کے لئے ایسا کیا تھا تو اس کا میڈیکل چیک اپ ہونا چاہئے تھا اور ماریہ نے میڈیکل چیک اپ سے انکار کیا تھا۔ اس طرح یہ ثابت ہوتا تھا کہ مسٹروہ نے ہوس پرستی کی بنا پر اسے اغوا نہیں کیا تھا۔ کوئی ایسی بات تھی' جسے بتانے سے ماریہ انکار کر رہی تھی۔ انٹیلی جنس والوں نے فیکس کے ذریعے ہیرالڈ سے بھی یہی سوال کیا تھا۔ ہیرالڈ نے جواباً فیکس کیا تھا کہ اس کی بیٹی کو اغوا کرنے کی وجہ وہ نہیں جانتا ہے۔ ویسے وجہ کچھ بھی ہو' اغوا کرنا جرم ہے۔ لہٰذا مجرم کو گرفتار کرکے برطانوی حکومت کے حوالے کیا جائے۔

پاکستان.............. کے فرض شناس افسران کو اس برطانوی.......... کا یہ مطالبہ ناگوار گزر رہا تھا کہ ایک پاکستانی کو برطانوی عدالت میں پہنچائے جانے پر زور دیا جا رہا ہے جبکہ مسٹروہ ٹھوس ثبوت کے ساتھ مجرم ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ اس سلسلے میں جب تک وہ گرفتار نہ ہوتا یا کسی ذریعے سے اپنا بیان ارسال نہ کرتا' اس وقت تک یہ کیس ایک معما بنا رہتا۔

اس ضمن میں اتنا تو ہوا کہ مسٹروہ کے معاملے میں فرض شناس افسران کے رویے میں نرمی اور لچک پیدا ہو گئی اور وہ دوسرے پہلو سے بھی اس کیس پر غور کرنے لگے کہ معاملہ کچھ اور ہے اور اسے کچھ اور رنگ دیا جا رہا ہے۔ ایک طرف حکومت کا اعلیٰ عہدیدار اور برطانیہ کی سیپا کمپنی ہے اور دوسری طرف تنہا مسٹروہ ہے۔ ان حالات میں وہ اپنی سلامتی کے لئے چھپتا پھر رہا ہے۔

وہ ایک چھوٹے سے مکان میں تھا۔ اس کا حلیہ بدل چکا تھا۔ اس نے اپنے سر سے.......... وگ اتار دی تھی۔ اب اس کے سر پر شریفانہ انداز کے چھوٹے بال تھے۔

آنکھوں سے آئی لینس نکال لئے تھے۔ اب اس کی آنکھیں نیلی نیلی نہیں سیاہ تھیں۔ دو ننھے سے اسپرنگ ناک کے نتھنوں میں تھے' جن کے باعث ناک کچھ چوڑی دکھائی دیتی تھی۔ اسپرنگ کو نتھنوں سے نکالنے کے بعد ناک ستواں ہو گئی تھی۔ عارضی پلاسٹک میک اپ کے ذریعے ہونٹ اس حد تک موٹے تھے جو دیکھنے میں برے نہیں لگتے تھے۔ اسی میک اپ کے ذریعے ٹھوڑی میں ایسی تبدیلی کی گئی تھی کہ اس ٹھوڑی میں ایک گڑھا پڑ گیا تھا۔ میک اپ اتارنے کے بعد ہونٹ پتلے اور متناسب ہو گئے تھے۔ ٹھوڑی میں اب گڑھا نہیں رہا تھا۔ اس طرح چہرہ بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔

اس مکان میں ایک بڑے میاں اور ان کی بیوی تھی۔ ان کے علاوہ ایک جوان لڑکی تھی۔ وہ مسٹروہ کی بہن اور ماں باپ بنے ہوئے تھے۔ اس کا موجودہ چہرے کے مطابق شناختی کارڈ تھا جس پر اس کا نام سید امیر حمزہ لکھا ہوا تھا۔ وہ ایک میز کے پاس بیٹھا ہوا' ٹیبل لیمپ کے سامنے جھکا ہوا کاغذات کے اس پلندے کو کھول کر پڑھ رہا تھا۔

وہ اصل معاہدہ تھا جو حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار اور سیپا کے درمیان طے پایا تھا۔ اس معاہدے کا متن یہ تھا کہ کیٹی بندر کے قریب تھر کے دو سو مربع کلو میٹر کو صرف نو کروڑ میں سیپا کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ جبکہ وہ پاکستان کا ساحلی علاقہ ہے اور وہاں کسی غیر پاکستانی کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔

ایک تو وہ گویا پاکستان میں داخل ہونے کا دروازہ تھا۔ اسے اربوں اور کھربوں ڈالر اور پاؤنڈ میں بھی نہیں دیا جا سکتا تھا جبکہ صرف نو کروڑ روپے میں دے دیا گیا تھا۔

دوسری اہم بات یہ تھی کہ وہ علاقہ کراچی سے ڈیڑھ سو کلو میٹر دور تھا اور بھارت کی سرحد سے صرف پچاس کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس طرح بھارت' برطانوی سیپا کمپنی کے کاندھے پر بیٹھ کر آسانی سے کسی طرح کی بھی خفیہ کارروائی کر سکتا تھا۔

اس معاہدے کو برطانیہ کے قانون کے تابع کیا گیا تھا اور پاکستانی قوانین کی نفی کی گئی تھی۔ اگر مستقبل میں کبھی پاکستان اور سیپا کے درمیان کوئی تنازعہ پیدا ہوتا تو پاکستان کی کسی عدالت کو اس کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہ ہوتا۔ یہ مقدمہ صرف برطانوی عدالت میں دائر کیا جاتا۔

اس معاہدے کے مطابق سیپا اس ساحلی علاقے کے مالکانہ حقوق کسی دوسری کمپنی کو منتقل کر سکتی تھی۔ اس طرح یہ حقیقت واضح ہو رہی تھی کہ سیپا کمپنی کی پشت پر امریکی کمپنی ہوپ ویل ہولڈنگ لمیٹڈ "HH" تھی۔ لہٰذا وہاں کسی بھی موقع پر امریکی فوجی اڈا قائم ہو سکتا تھا۔

اس معاہدے میں اور بہت کچھ ایسی باتیں تھیں' جو محبانِ وطن کے لئے قطعی ناقابلِ برداشت تھیں۔ یہ ایسی چوری اور وطن فروشی تھی جسے مخلصانِ وطن اور عوام سے چھپانے کے لئے یہ ظاہر کیا جارہا تھا کہ کیٹی بندر میں ۱۳۲۰ میگاواٹ کا بجلی گھر بنانے کے لئے سیپا سے معاہدہ کیا گیا ہے۔ یہی کیٹی بندر بجلی گھر والا معاہدہ مستروہ کو دکھایا گیا تھا اور اصلی معاہدے کو چھپایا جارہا تھا لیکن چھپانے سے پہلے ہی مستروہ نے اپنی حکمت عملی سے اس اصل معاہدے کو حاصل کرلیا تھا۔ وہ کو جب معلوم ہوا کہ پاکستان کے ساحلی سرحدی علاقے میں غیر ملکی آرہے ہیں اور وہاں رہائش اختیار کررہے ہیں۔ ان کی آمد اور رہائش کے سلسلے میں کہا جارہا تھا کہ سیپا کمپنی والے کیٹی بندر میں بجلی گھر قائم کرنے کے لئے آئے ہیں۔ تھر کے علاقے میں کوئلے کے جو ذخائر ہیں' ان کوئلوں کے ذریعے اس بجلی گھر کو چلایا جائے گا لیکن وہ جیسے حساس پاکستانی اس سلسلے میں مطمئن نہیں تھے۔

اس نے پہلے سوچا کہ بجلی گھر ایسے ساحلی علاقے میں کیوں قائم کیا جارہا ہے جہاں سے کوئلے کے ذخائر سینکڑوں کلومیٹر دور ہیں اور کوئلے کو کیٹی بندر تک پہنچانے کے لئے ریلوے لائن بھی نہیں بچھائی گئی ہے اور معاہدہ کئے جانے کے ڈیڑھ برس بعد بھی بجلی گھر کے قیام کا کام شروع نہیں ہوا تھا۔ ان غیر ملکی افراد کی موجودگی نے شبہات میں مبتلا کیا تو وہ نے محبانِ وطن کی ایک ٹیم بنائی۔ اس ٹیم میں سب ہی تعلیم یافتہ' ہنرمند اور کئی طرح کی صلاحیتوں سے بھرپور جاں نثار تھے۔ انہوں نے جہاد شروع کیا تو اس حد تک کامیاب ہوئے کہ وہ اصل ملک دشمن معاہدہ وہ کے ہاتھ لگ گیا۔

سچائی بہت زہریلی ہوتی ہے۔ وہ اصل خفیہ معاہدے کو پڑھ کر محسوس کررہا تھا کہ اس نے پڑھا نہیں ہے' بلکہ زہر پیا ہے۔ لاکھوں افراد نے جان و مال کی قربانیاں دے کر جس پاکستان کو حاصل کیا تھا' اس پاکستان کی زمین کو اور اس پاکستان کی بہنوں اور بیٹیوں کو کوڑیوں کے مول فروخت کیا جارہا تھا۔ زمین ماں ہوتی ہے۔ ماں کی عظمت کو بھی غیر ملکیوں کے قدموں تلے روندا جارہا تھا۔ یہ وطنِ عزیز پر ایسا حملہ تھا کہ اپنے ہی گھر کے حملہ آوروں کا مقابلہ ایٹم بم سے نہیں' صرف جذبۂ حب الوطنی کے بھرپور جہاد سے کیا جاسکتا تھا۔

وہ بڑی دیر تک ٹہلتا رہا۔ وہ ملک کی بااختیار مگر غیر ذمے دار شخصیات سے نمٹنے کے سلسلے میں پریشان نہیں تھا بلکہ شرمندہ تھا کہ اس ملک کے عوام حقائق سے بے خبر رہ کر کب تک دشمنانِ وطن کو اسمبلیوں میں پہنچاتے رہیں گے۔ دشمن تو دشمن ہی ہوتے ہیں۔ وہ دشمنی ہر حال میں کرتے ہیں لیکن اصل دشمنی عوام کی بے خبری ہے۔ بے خبر رہ کر

دشمنوں کو مواقع دینا' بہت بڑی قومی بے پروائی اور غیر ذمے داری ہے اور باخبر رہ کر دشمنوں کو نظرانداز کرنا اپنے ملک سے کھلی دشمنی ہے۔

وہ کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ میز سے موبائل فون اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ رابطہ ہونے پر بولا۔ "آپریشن کلین اپ۔ کوڈ نیم وہ۔"

دوسری طرف سے جواب ملا۔ "آپریشن کلین اپ۔ کوڈ نیم وہ ٹو۔"

وہ نے کہا۔ "مستروہ ٹو! میں نے یہ معاہدہ پڑھ لیا ہے۔ تم پڑھو گے تو اپنے ملک کی سلامتی اور بقا کے سلسلے میں پریشان ہوجاؤ گے۔ بہرحال یہاں آکر اسے لے جاؤ اور اس کی دو درجن فوٹو اسٹیٹ کاپیاں کرو پھر اصل کاپی خفیہ لاکر میں محفوظ کردو۔ انتظار کر رہا ہوں۔ آجاؤ۔"

اس نے رابطہ ختم کردیا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے........ انٹیلی جنس کے ایک افسر کے نمبر ڈائل کئے۔ رابطہ ہونے پر کہا۔ "میں........ رب نواز صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "میں ان کا سیکورٹی افسر بول رہا ہوں۔ وہ اپنے بیڈ روم میں جاچکے ہیں۔ کوئی ضروری پیغام کہنا ہو تو نوٹ کرادیں۔"

"مجھے بہت اہم گفتگو کرنا ہے۔ آپ ان سے صرف اتنا کہہ دیں کہ جس کو پورے صوبے میں تلاش کیا جارہا ہے وہ فون پر ان سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔"

"آل رائٹ۔ ہولڈ آن پلیز۔"

اس نے انتظار کیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک کرخت آواز سنائی دی۔ "میں ہوں ملک رب نواز۔ کیا تم واقعی وہی ہو جسے تلاش کیا جارہا ہے؟"

"یس سر! میں آپ کا خادم ہوں۔ یوں تو........ افسران بہت ہیں لیکن ان میں سے کتنے سچے' دیانتدار اور فرض شناس ہیں' یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔ آزمائشوں سے گزرنے کے دوران میں ان کی پہچان ہوتی ہے۔"

ملک رب نواز نے کہا۔ "کم ٹو دی پوائنٹ۔ تمہید نہ باندھو۔ میں نہیں جانتا کہ تم نے میرا یہ ذاتی فون نمبر کہاں سے حاصل کیا ہے لیکن مجھ سے رابطہ کرکے یہ تاثر دے رہے ہو کہ مجھے دیانت دار اور فرض شناس سمجھتے ہو۔"

"جی ہاں! آپ کی فرض شناسی کے سلسلے میں بہت کچھ سنا ہے۔ آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے سیپا کے ڈائریکٹر جنرل کی بیٹی کو اغوا نہیں کیا تھا۔ مجھ پر جھوٹا کیس بناکر' مجھے مجرم ثابت کرکے بظاہر گرفتار کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن حقیقتاً وہ لوگ مجھے

دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔ مجھے تھانے یا عدالت میں پہنچ کر زبان کھولنے کا موقع نہیں دیں گے۔"

"کھل کر بات کرو' کون لوگ تمہیں گولی ماریں گے اور کیوں ماریں گے؟ بہتر ہے' تم میرے پاس آجاؤ۔ مجھے اصل معاملات بتاؤ۔ میں تمہیں تحفظ دوں گا۔"

"سر! پولیس اور سیپا کمپنی کی خفیہ ایجنسی نے اس طرح ناکا بندی کی ہے کہ میں آپ جیسے کسی بھی دیانت دار افسر تک پہنچ نہیں پاؤں گا۔"

"تمہاری باتوں سے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم سیپا کے کسی ٹاپ سیکرٹ سے آگاہ ہو اور ان کے خلاف تمہارے پاس ٹھوس ثبوت ہیں۔"

"یس سر! صرف سیپا ہی نہیں ہماری حکومت کے اس اعلیٰ عہدیدار کے خلاف بھی ٹھوس دستاویزی ثبوت ہیں' جنہوں نے میری گرفتاری کے لئے احکامات جاری کئے ہیں۔"

"ہوں۔ میں اس معاملے کی اہمیت اور سنگینی کو کسی حد تک سمجھ رہا ہوں۔ کیا تم کسی کے ذریعے وہ دستاویزی ثبوت یہاں پہنچا سکتے ہو؟"

"کوشش کروں گا' کل گیارہ بجے تک اس کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی آپ تک پہنچا دوں لیکن اس سے پہلے مجھ سے ایک تعاون کریں۔"

"بولو۔ مجھے کیا کرنا ہے؟"

"مجھ پر اغوا کا جو الزام ہے' آپ اسے غلط ثابت کردیں۔"

"کیا تم نے واقعی سیپا کے ڈائریکٹر جنرل کی بیٹی کو اغوا نہیں کیا تھا؟"

"میں اپنی بے گناہی ثابت کردوں گا۔ پہلے آپ یہ تصدیق کریں کہ سیپا کے ڈائریکٹر جنرل ہیرالڈ جان نے اپنی بیٹی کے اغوا کی ایف آئی آر درج کرائی ہے یا نہیں؟ وہ ایف آئی آر ان کے جھوٹ کا تحریری ثبوت ہوگی۔ کیونکہ جس لڑکی ماریہ کو میں یرغمال بنا کر دشمنوں کے نرغے سے نکلا تھا' وہ ڈائریکٹر جنرل کی بیٹی نہیں ہے۔"

"جب وہ اسے بیٹی کہہ رہا ہے تو تم اسے کیسے جھٹلاؤ گے؟"

"آپ جھٹلائیں گے۔ اس ڈائریکٹر جنرل ہیرالڈ جان.......... سے کہا جائے کہ وہ اپنا میڈیکل چیک اپ کرائے۔ میڈیکل رپورٹ سے ثابت ہوگا کہ وہ قدرتی طور پر ان فٹ ہے۔ اس کی ہسٹری شیٹ سے پتا چلے گا کہ اس نے کبھی شادی نہیں کی۔"

"او گاڈ! میں ابھی اس سلسلے میں اپنے اعلیٰ افسر سے بات کرتا ہوں۔ تمہاری بات سچ ہوگی تو پھر تم ملزم نہیں رہو گے۔ تمہاری گرفتاری کے آرڈرز واپس لے لئے جائیں گے پھر تمہیں روپوش نہیں رہنا پڑے گا۔"

"سر! یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اول تو وہ میڈیکل چیک اپ کے لئے راضی نہیں ہوگا۔ اگر چیک اپ کروانے کے لئے قانونی اقدامات کئے جائیں گے تو ان کی خفیہ ایجنسی اور ہمارے ملک کی بیوروکریسی آپ کی راہ کی رکاوٹ بن جائے گی۔"

"میں مشکلات کو سمجھ رہا ہوں لیکن اپنے فرائض کی ادائیگی سے باز نہیں آؤں گا۔ میڈیکل چیک اپ کے لئے ہیرالڈ جان کے پیچھے پڑ جاؤں گا۔"

"اللہ تعالیٰ آپ کو اور حوصلہ دے۔ میں کل صبح سات بجے پھر فون پر رابطہ کروں گا۔ شب بخیر۔ خدا حافظ۔"

اس نے موبائل فون کو آف کردیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ ہیرالڈ جان.......... میڈیکل چیک اپ کرائے گا اور اپنی بہت بڑی کمزوری ظاہر ہونے دے گا۔ اس کے باوجود وہ چاہتا تھا کہ طبی معائنے کے ذریعے اسے مردانگی ثابت کرنے کو کہا جائے اور وہ انکار کرے۔ اس کے انکار ہی سے سمجھنے والے حقیقت سمجھ لیں گے۔

☆======☆======☆

"بانہہ بیلی" کے عہدیدار اور دیگر کارکن جو بھی فلاحی کام کرتے تھے' وہ قانون کی حد میں رہ کر کرتے تھے۔ فلاحی معاملات بھی قانون کے مطابق نمٹائے جاتے ہیں۔ اس لئے بانہہ بیلی کا صدر کلسی' تارا اور رانی کو لے کر لاکھڑا کے تھانے میں آیا پھر تھانہ انچارج کو ان تینوں کی دکھ بھری رُوداد سنائی۔ تھانہ انچارج نے صدر سے کہا۔ "آپ ظالموں کے خلاف جیسی کارروائی چاہیں گے' ہم کریں گے۔"

عثمان نے ایک کاغذ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے ان تینوں لڑکیوں کی طرف سے بیان لکھا ہے۔ اس پر تینوں کے انگوٹھوں کے نشانات ہیں۔ میرے بھی دستخط ہیں۔ آپ اسے پڑھ لیں اور ایف آئی آر درج کرلیں۔"

اس نے وہ بیان پڑھ کر کہا۔ "راہو دادا ایسے شرمناک معاملات میں شیطان کی طرح مشہور ہے۔ بیرون ممالک سے آنے والے شکاریوں کے لئے یہاں کی لڑکیوں کی دلالی کرتا ہے۔ میں راہو اور ان شکاریوں کے خلاف ایف آئی آر درج کررہا ہوں۔"

وہ ایک رجسٹر کھول کر لکھنے لگا۔ عثمان نے پوچھا۔ "راہو ایسی مجرمانہ حرکتیں کرتا رہتا ہے پھر اس کے خلاف قانونی کارروائی کیوں نہیں کی جاتی؟"

"بہت پہلے اسے ایک دوبار گرفتار کیا گیا تھا لیکن اوپر سے اس کی رہائی کے احکامات آگئے اور اسے چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد بھی کئی فرض شناس افسروں نے اس کے اور غیر ملکی شکاریوں کے خلاف قانونی کارروائی کرنی چاہی لیکن اوپر بیٹھے ہوئے اعلیٰ افسران نے

انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔"

عثمان نے پوچھا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان تینوں لڑکیوں کو بھی انصاف اور تحفظ نہیں ملے گا؟"

"آپ مایوس نہ ہوں۔ ہمیں بھی یہ سوچ کر شرم آتی ہے کہ دلالوں اور غیر ملکی شکاریوں کو تحفظ دیا جاتا ہے اور ہم وردی پہن کر محض......... نمائشی قانون کے محافظ کہلاتے ہیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ راہو میرے علاقے میں آئے گا تو میں اوپر والوں کو اطلاع دیئے بغیر اسے گرفتار کروں گا اور حوالات میں رکھ کر اس کی خوب پٹائی کروں گا۔ بعد میں اپنے اعلیٰ افسران سے معافی مانگ لوں گا۔"

عثمان نے اس کا شکریہ ادا کیا پھر ان تینوں لڑکیوں کو اپنی تنظیم کے ایک فلاحی ادارے میں لے آیا تاکہ وہ دوسری عورتوں کے ساتھ رہ کر قالین بافی اور کشیدہ کاری وغیرہ کا ہنر سیکھتی رہیں۔ وہ تینوں بہت خوش تھیں۔ وہاں انہیں وقت پر کھانا اور پہننے کو کپڑا ملتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن غسل کرنے کے لئے پانی بھی ملتا تھا پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اب کسی ظالم کی طرف سے خوف نہیں رہا تھا۔

تیسرے دن وہاں ایک پولیس کی گاڑی آئی۔ اس میں ایک پولیس افسر اور دس مسلح سپاہی تھے۔ انہوں نے کلسی، تارا اور رانی کو بلا کر کہا۔ "بیٹی! یہ قانون کے محافظ ہیں۔ مسٹروہ کے سلسلے میں انکوائری کرنے کے لئے تمہیں شہر لے جائیں گے پھر بڑے افسر کے سامنے تمہارے بیانات ریکارڈ کرانے کے بعد تمہیں یہاں واپس پہنچادیں گے۔"

وہ تینوں......... پولیس کی گاڑی میں چلی گئیں۔ اس پولیس افسر نے انہیں ٹھٹھہ کے تھانے میں لاکر کراچی کے ایک پولیس افسر کے حوالے کیا۔ وہ اپنی گاڑی میں انہیں بٹھا کر کراچی کے ایک تھانے میں لے آیا۔ وہاں دوسرے افسران بھی تھے اور ایک بڑی سی میز پر آڈیو ریکارڈنگ کے آلات رکھے ہوئے تھے۔ ایک افسر نے ان تینوں سے کہا۔ "تم یہاں مائیک کے سامنے بیٹھ کر باری باری مسٹروہ کو مخاطب کروگی۔"

رانی نے کہا۔ "وہ ہمارے سگے بھائی سے بھی بڑھ کر ہیں۔ وہ کہاں ہیں؟"

ایک افسر نے کہا۔ "تمہارا بھائی یہاں سے بہت دور ہے۔ تم تینوں اسے بلاؤ گی تو وہ خدائی فوجدار تمہاری بھلائی کے لئے ضرور آئے گا۔"

ان تینوں کو مائیک کے سامنے بٹھایا گیا۔ پہلے رانی نے کہا۔ "ہمارے پیارے بھائی جان! آپ کہاں ہیں؟ جب سے گئے ہیں، ہم سے ملنے نہیں آئے۔ میں تارا اور کلسی کے ساتھ کراچی شہر آئی ہوں۔ پولیس والے ہمیں لائے ہیں۔"

کلسی نے کہا۔ "بھائی جان! اتنا خوبصورت اور اتنا بڑا شہر ہم نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ آپ اس شہر میں رہتے ہیں۔ یہاں آکر ہمیں اپنے ساتھ لے جائیں۔"

تارا نے کہا۔ "بھائی جان! اب ہمیں کسی راہو دادا اور شکاریوں کا خوف نہیں ہے۔ پولیس والے ہماری حفاظت کررہے ہیں پھر بھی آپ جلدی آجائیں اور ہمیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ میں تارا بول رہی ہوں۔ آپ آرہے ہیں نا؟"

ریکارڈنگ بند کر دی گئی۔ افسر نے کہا۔ "فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ ان لڑکیوں کو یہاں سے لے جاؤ اور اگلی ریکارڈنگ کے لئے انہیں ٹریننگ دو۔"

ایک جونیئر افسر اور سپاہی ان تینوں کو وہاں سے لے گئے۔ ان کے جانے کے بعد دوبارہ ریکارڈنگ شروع ہوگئی۔ ایک افسر نے مائیک کے سامنے بیٹھ کر بڑی حقارت سے کہا۔ "وہ! میں تمہارے جیسے مجرم کو مسٹر نہیں کہوں گا۔ تم نے اپنی ان تینوں بہنوں کی آوازیں سن لی ہیں۔ سنا ہے خون کے رشتے سے شریفانہ زبان کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا ہے۔ تم نے زبان سے انہیں بہن کہا ہے اور جان پر کھیل کر انہیں شکاریوں سے بچا کر بانہہ بیلی کے فلاحی ادارے میں پہنچایا ہے۔ اب یہ بے چاریاں ہمارے ٹارچر سیل میں پہنچائی جائیں گی۔ ان پر ایسا تشدد کیا جائے گا جیسا غیر ملکی شکاری کرنے والے تھے۔ تم یہ باتیں سننے کے بعد بارہ گھنٹے کے اندر خود کو گرفتاری کے لئے پیش نہیں کرو گے تو ان لڑکیوں کے ساتھ اجتماعی زیادتیاں شروع کردی جائیں گی اور ان کے چیخنے تڑپنے اور فریادیں کرنے کی آوازیں بھی تمہیں فون پر سنائی جائیں گی۔ ان کی بھلائی اور تحفظ چاہتے ہو تو فوراً چلے آؤ۔ ان لڑکیوں نے پہلے کبھی شہر کے پولیس اسٹیشن کو اور پولیس والوں کو نہیں دیکھا ہے۔ ہمیں وردی میں دیکھ کر پولیس والا سمجھ رہی ہیں۔ تم اندازہ کرسکتے ہو کہ ہم کون ہیں؟ تم خود کو ہمارے حوالے کرنے کے لئے کسی وقت بھی قائداعظم کے مزار کے سامنے آجاؤ۔ ہم دن رات تمہارے منتظر رہیں گے۔"

اس نے مائیک کو آف کردیا۔ ریکارڈنگ بند ہوگئی۔ وارننگ سے بھرپور ایک آڈیو کیسٹ تیار ہوگئی۔

☆======☆======☆

انٹر کام سے آواز ابھری۔ "سر! مسٹروہ از آن دی لائن۔"

ملک رب نواز نے انٹر کام کا بٹن دبا کر اسے آف کیا پھر ایک فون کا ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہاں میں ہوں ملک رب نواز۔"

وہ نے کہا۔ "سر! آپ نے سیپا کے ڈائریکٹر جنرل کے سلسلے میں اپنے اعلیٰ افسران

سے بات کی ہو گی۔ میں چاہتا ہوں' اس کی بیٹی کے اغوا کا الزام مجھ پر نہ رہے۔"

"ہمارے ایک اعلیٰ افسر نے حکومت کے اعلیٰ عہدیدار سے گفتگو کی ہے۔ اعلیٰ عہدیدار نے کہا ہے کہ کسی غیر ملکی بڑی شخصیت سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اپنا میڈیکل چیک اپ کرائے۔ اول تو یہ احمقانہ مطالبہ ہو گا۔ دوم یہ کہ وہ اگر راضی ہو گا تو اپنے ملک کے ڈاکٹر کی میڈیکل رپورٹ پیش کرے گا جو اس کے حق میں ہو گی۔"

"یعنی ثابت کر دے گا کہ وہ شادی کے قابل ہے۔ اس نے شادی کی تھی اور ماریہ اس کی اپنی بیٹی ہے۔"

"ہاں۔ یہ ثابت کرنا اس کے لئے آسان ہو گا۔ ویسے ماریہ اس کی بیٹی نہ بھی ہو تو ایک غیر ملکی لڑکی کو اغوا کرنا جرم ہے۔ یہ الزام تم پر رہے گا۔"

"سر! میں نے اپنے بچاؤ کے لئے اسے یرغمال بنایا تھا پھر اسے عزت و آبرو کے ساتھ واپس جانے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔"

"تم سیپا کے خلاف وہ خفیہ دستاویزات پیش کرو گے تو ہم تمہیں پوری طرح سیکورٹی دیں گے۔ ہمارے اعلیٰ افسر نے کہا ہے کہ جب تک ہم وہ دستاویزات پڑھ نہ لیں' اس وقت تک تم پریس والوں کے سامنے زبان نہیں کھولو گے اور نہ اپوزیشن سے اور نہ کسی سیاسی پارٹی سے کوئی رابطہ کرو گے۔"

"میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔ ویسے آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں نے اب تک اپنی زبان بند رکھی ہے۔"

"یہ تمہاری دانش مندی ہے۔ کیا دستاویزات کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بھیج رہے ہو؟"

"جی ہاں۔ وہ کاپی آج کسی وقت آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔"

"ہمارے اعلیٰ افسر نے ایک فون نمبر دیا ہے۔ تم سے کہا گیا کہ اس نمبر پر کسی سے بہت اہم گفتگو کر سکو گے۔"

اس نے فون نمبر بتایا۔ وہ نے اس نمبر کو نوٹ کرنے کے بعد کہا۔ "سر! میں دیکھوں گا کہ مجھ سے کون اہم گفتگو کرنے والا ہے۔ اس کے بعد میں پھر آپ سے رابطہ کروں گا۔"

"میں یہی چاہتا ہوں۔ تم مجھے ہر بات سے باخبر رکھو۔ تب ہی تمہاری صحیح راہنمائی کر سکوں گا۔"

اس نے رابطہ ختم کیا پھر نوٹ کئے ہوئے فون نمبر ڈائل کئے۔ ریسیور کان سے لگا کر سنا' دوسری طرف سے فون کی گھنٹی بجتی رہی پھر کسی کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو کون؟"

"میں وہ بول رہا ہوں۔ مجھے یہ نمبر دیا گیا ہے۔ کیا آپ بات کریں گے؟"

"ہاں۔ بات کروں گا۔ پہلے ایک آڈیو کیسٹ سنا رہا ہوں۔ اسے سن لو پھر ہماری باتیں ہوں گی۔"

چند لمحات تک خاموشی رہی پھر وہ رانی کی آواز سن کر چونک گیا۔ اس کے بعد کلسی اور تارا بھی بول رہی تھیں۔ آخر میں کسی نے بھاری بھرکم آواز میں اسے نفرت سے مخاطب کرتے ہوئے دھمکیاں دیں کہ اگر وہ بارہ گھنٹے کے اندر خود کو گرفتاری کے لئے پیش نہیں کرے گا تو ان کم سن لڑکیوں کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی جائے گی۔

ایسی باتیں سن کر اسے غصہ آ رہا تھا لیکن وہ برداشت کر رہا تھا اور کر بھی کیا سکتا تھا؟

کیسٹ ختم ہونے کے بعد دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ "کیا تم نے سن لیا؟"

وہ بولا۔ "تم لوگ کتنے بے شرم ہو' معصوم بچیوں کو یرغمال بنا کر بلیک میل کر رہے ہو۔ کیا تمہاری اپنی بیٹیاں اور بہنیں نہیں ہیں؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "اس ملک میں جو طاقت اور اختیارات کے ذریعے اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو تحفظ دیتا ہے' وہی..........معزز..........فرد کہلاتا ہے۔ باقی عوام کہلانے والے کروڑوں افراد کیڑے مکوڑوں کی طرح ہمارے رحم و کرم پر رہتے ہیں۔ ہم جب چاہتے ہیں' ان پر ڈی ڈی ٹی اسپرے کر کے ان کے مرنے کا تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔"

"تم لوگوں سے انسانیت کی توقع رکھنا حماقت ہے۔ جب سے پاکستان وجود میں آیا ہے' ہم تمہاری بے حسی اور بے غیرتی کو دیکھتے آ رہے ہیں۔"

"اور آئندہ بھی دیکھتے رہو گے۔ کام کی بات کرو اور بتاؤ کہ تمہاری ان چھوٹی چھوٹی بہنوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے یا خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر رہے ہو۔"

"اس وقت آٹھ بجے ہیں اور مجھے بارہ گھنٹے کا وقت دیا گیا ہے۔ میں ابھی سوچوں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔"

"اگر اس معاہدے کے سلسلے میں سودا کرو گے تو گرفتاری کے لئے پیش ہونے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تمہیں تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ پاکستان میں یا باہر کسی بھی ملک میں لین دین کر سکتے ہو۔ تمہارے لیے فارن بینک اکاؤنٹ میں منہ مانگی رقم جمع کر دی جائے گی اور تمہیں اس ملک کی شہریت بھی دلائی جائے گی۔"

"ہوں۔ ان معصوم اور مظلوم لڑکیوں کے علاوہ یہ دوسری ڈیلنگ کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں کسی ایک ڈیلنگ پر رہنا چاہئے۔"

"فی الحال لڑکیوں کو بھول جاؤ۔ بارہ گھنٹے والی مہلت ختم سمجھو۔ اپنی پسند کے کسی

بھی ملک میں جاؤ اور ہم سے رابطہ کرو۔ ہم تمہارے تمام مطالبات پورے کریں گے۔ تم وہ معاہدہ ہمارے حوالے کر دو گے' اس کے بعد ہم ان تینوں لڑکیوں کو عزت و آبرو سے یہاں کے فلاحی ادارے میں پہنچا دیں گے۔"

"بارہ گھنٹے کی مہلت ختم نہ کرو۔ میں رات کے آٹھ بجے تمہاری بہت بڑی آفر کا جواب دوں گا۔ شرط یہ ہے کہ ان تینوں لڑکیوں کو آج شام سے پہلے فلاحی ادارے میں پہنچا دو۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ تھوڑی دیر تک ناگواری سے سوچا پھر ملک رب نواز سے رابطہ کر کے کہا۔ "سر! وہی ہو رہا ہے جس کی مجھے توقع تھی۔ یہ تو ہمیشہ کرپٹ عہدیداروں کا معمول رہا ہے کہ ان کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی جائے۔ ان کے جرائم کے ٹھوس ثبوت حاصل کر لئے جائیں تو وہ ہر طرح کا سمجھوتا اور سودا کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔"

"تم سے کیا سودا کر رہے ہیں؟"

"اگر میں ان کی عزت رکھ لوں اور صرف ان کی جان نہ مانگوں تو وہ میرے سامنے سونے کا پہاڑ کھڑا کر دیں گے۔ مجھے پاکستان میں اپنی جان کا خطرہ رہے گا۔ وہ مجھے دوسرے کسی بھی ملک کی شہریت دلائیں گے اور منہ مانگی رقم میرے بینک اکاؤنٹ میں پہنچا دیں گے اور کوئی مطالبہ کروں گا تو اسے بھی پورا کریں گے۔"

وہ ان تین لڑکیوں کے متعلق بھی بتانے لگا جنہیں یرغمال بنا کر اسے مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ بارہ گھنٹے کے اندر خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دے جبکہ پولیس اسے گرفتار نہیں کرے گی۔ یہ کھیل پولیس کی آڑ میں کھیلا جا رہا تھا۔

ملک رب نواز نے کہا۔ "یہ تو واضح طور سے سمجھ میں آ رہا ہے کہ وہ اعلیٰ عہدیدار پس پردہ ہے۔ اس کے ایجنٹ اور سیپا کمپنی کی خفیہ ایجنسی والے تمہارے اطراف جال بچھا رہے ہیں۔ جس نے تم سے فون پر بات کی ہے اور جو تم سے سودے بازی کر رہا ہے' وہ ایک فرنٹ مین ہے۔ ہر دور میں کرپٹ عہدیدار ایسے فرنٹ مین کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ یہ فرنٹ مین تمہارے لئے کمبل بن جائے گا۔ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔"

"سر! اس معاہدے کی ایک کاپی آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔ آپ اسے پڑھ لیں گے' اس کے بعد میں آپ سے رابطہ کروں گا۔"

اس نے فون بند کر دیا اور زیر لب بڑبڑانے لگا۔ "سودا۔ واہ! خوب سودے بازی ہوتی رہتی ہے۔ پہلے سیپا کمپنی کو دو سو کلومیٹر زمین بیچنے کا سودا ہوا پھر مجھے خریدنے کے

لئے سودا ہو رہا ہے۔ اس ملک کو ایک منڈی بنا دیا گیا ہے۔ نیچے سے اوپر والوں تک اس طرح خریدے اور بیچے جا رہے ہیں کہ پورا ملک فروخت ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔"

پھر وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ وہ تینوں لڑکیاں فرنٹ مین کے ہاتھ کیسے لگ گئیں؟ بانہہ بیلی کے فرض شناس عہدیدار اور کارکنان نے ان بے چاریوں کو فرنٹ مین کے حوالے کیوں کر دیا؟ بے شک فرنٹ مین اپنے تمام تر اختیارات کے ساتھ گیا ہو گا اور بانہہ بیلی کی تنظیم کو مجبور اور بے بس بنا کر ان لڑکیوں کو لے آیا ہو گا۔

اس نے فون کے ذریعے وہ ٹو سے رابطہ کیا۔ اسے بتایا کہ وہ تینوں لڑکیاں ایک فرنٹ مین کی گرفت میں ہیں۔ وہ ٹو کو بانہہ بیلی کے عہدیدار کے پاس جا کر معلوم کرنا چاہئے کہ وہ لڑکیاں اس ادارے سے نکل کر کراچی کیسے پہنچائی گئی ہیں؟

پھر اس نے اپنے ایک اور ساتھی کو فون پر کہا۔ "بیدار بخت! ساتھیوں کو خبر کر دو' میں کراچی آ رہا ہوں۔ اس فلاحی ادارے پر شام تک نظر رکھو' جہاں بے سہارا لڑکیوں کو پناہ دی جاتی ہے۔ تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ کلثی' تارا اور رانی نام کی تین کم سن لڑکیاں اس ادارے میں پہنچائی گئی ہیں یا نہیں؟ اگر ان لڑکیوں کو پہنچانے والا تمہاری نظروں میں آئے تو اس کا پیچھا کرو۔ اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرو۔"

وہ موبائل فون اس کمرے میں چھوڑ کر دوسرے کمرے میں آیا۔ وہاں اس کی ایک فرضی بہن اور ماں باپ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے پوچھا۔ "آپ چلنے کے لیے تیار ہیں؟"

بڑے میاں نے کہا۔ "ہاں بیٹے! ہم تو تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

وہ سب وہاں سے مکان کے باہر آئے۔ باہر ایک پرانی سی.......... کار کھڑی ہوئی تھی۔ بڑے میاں نے گھر کے دروازے پر تالا لگایا پھر وہ سب کار میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہ اسٹیئرنگ سیٹ پر آ گیا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی۔ اسے ڈرائیو کرتا ہوا کئی گلیوں سے گزر کر.......... نیشنل ہائی وے پر آ گیا پھر کراچی کی سمت گاڑی تیز رفتاری سے جانے لگی۔

☆=======☆=======☆

ساحلی علاقے میں ایک شاندار محل نما کوٹھی کے شاندار ڈرائنگ روم میں کاشف اکبر اپنی بیگم دردانہ کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے والے صوفے پر ان کا ایک راز دار مشیر بیٹھا' انہیں بتا رہا تھا۔ "فرنٹ مین نے مسٹر وہ کو جو آفر دی ہے' اس سے مسٹر وہ نے انکار نہیں کیا ہے۔ آج رات آٹھ بجے جواب دے گا کہ اسے یہ آفر منظور ہے یا نہیں؟ اور اس نے کہا ہے کہ شام سے پہلے ان تینوں لڑکیوں کو فلاحی ادارے میں پہنچا دیا جائے۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "ان لڑکیوں کو تھر واپس جانا چاہئے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ وہ شکاری میرے غیر ملکی دولت مند دوستوں میں سے ہے۔ ایک شکاری کی سب سے بڑی توہین یہ ہے کہ شکار اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ وہ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس سے فون پر میری بات ہوئی تھی۔ وہ ضد کر رہا تھا کہ وہ تینوں لڑکیاں ملنی چاہئیں اور یہ کوئی زیادہ پرابلم والی بات تو نہیں ہے۔"

مشیر نے کہا۔ "پرابلم یہ ہے کہ آپ کے شکاری دوست اور ان لڑکیوں کے درمیان مسٹروہ ہے۔ آپ کا سب سے بڑا اہم مسئلہ یہ ہے کہ سیپا کمپنی کے معاہدے کو کسی طرح مسٹروہ سے حاصل کرنا ہے۔ جب تک معاہدہ حاصل نہیں ہو گا' تب تک آپ کی کرسی کے پائے ہلتے رہیں گے۔"

دردانہ بیگم نے کہا۔ "ان حالات میں ہماری نیند اڑ گئی ہے فرنٹ مین مکار ڈپلومیٹ ہے۔ مسٹروہ کو شیشے میں اتار لے گا۔ اس کی کوششوں سے اتنا تو ہوا ہے کہ مسٹروہ نے معاہدے کے سلسلے میں اپنی زبان بند رکھی ہے۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "میرے شکاری دوست کی ضد پوری کرنی ہو گی۔ آپ جانتے ہیں کہ اس دوست کے ملک سے ہمیں اچھی خاصی مالی امداد ملتی ہے۔ کئی معاملات میں ہمیں اس ملک کی حمایت حاصل ہے۔"

"آپ کے شکاری دوست کو ناراض نہیں کیا جائے گا لیکن ایک دو روز صبر کرنے کے لئے کہا جائے۔ مسٹروہ ہماری آفر قبول کر کے ہم سے لین دین کے لئے کسی دوسرے ملک جائے گا۔ اس کے جاتے ہی لڑکیوں کو تھر واپس بھیج دیا جائے گا۔"

پھر مشیر نے کچھ سوچ کر کہا۔ "ویسے ان لڑکیوں کو فلاحی ادارے میں بھیجنا مناسب نہیں ہو گا۔ اس شہر میں بے سہارا عورتوں کے لئے ایک ہی فلاحی ادارہ ہے اور وہ اپوزیشن کے ایک رکن کی مالی امداد سے قائم کیا گیا ہے۔ اپوزیشن والوں کو ان لڑکیوں کے بارے میں کچھ معلوم ہو گا تو انہیں ہم پر کیچڑ اچھالنے کا موقع مل جائے گا۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "ہمیں دشمنوں کو کوئی ایسا موقع نہیں دینا چاہئے۔ آپ فرنٹ مین کو تاکید کریں کہ وہ لڑکیوں کو اس فلاحی ادارے میں نہ پہنچائے۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ مشیر نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف کی بات سنی پھر کہا۔ "پلیز ہولڈ آن۔"

اس نے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "سیپا کے ڈائریکٹر جنرل ہیں۔"

کاشف اکبر نے کارڈلیس فون کو آن کر کے اپنے کان سے لگایا پھر کہا۔ "ہیلو مسٹر

ہیرالڈ جان! میں کاشف اکبر بول رہا ہوں۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا وہ گرفتار ہو گیا؟"

"نہیں۔ ہم نے طریقہ کار بدل دیا ہے۔ مسٹروہ سے سمجھوتا کر رہے ہیں کیونکہ اس کی گرفتاری تک یہ اندیشہ ہے کہ وہ ہمارے معاہدے کی کاپیاں پریس والوں اور مقتدر حلقوں تک پہنچا دے گا۔ ہم نے اس کی زبان بند رکھنے اور اس معاہدے کو حاصل کرنے کے لئے اسے بہت بڑی آفر دی ہے۔ وہ آج رات آٹھ بجے ہماری آفر کا جواب دے گا۔"

"پلیز! آپ کسی بھی طرح اس کمبخت کو قابو میں کریں۔ وہ معاہدہ واپس نہ ملا تو مجھے امریکی ایچ ایچ کمپنی کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ وہ دو سو کلو میٹرز زمین ہاتھ سے نکل گئی تو میری شامت آجائے گی۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ ہم نے بڑے بڑے ایمان والوں کو خرید لیا ہے.......... مسٹروہ کیا چیز ہے۔ ہم آج رات نو یا دس بجے آپ کو خوشخبری سنائیں گے۔"

اس نے کارڈلیس فون کو آف کر کے ناگواری سے کہا۔ "وہ بہت پریشان ہے۔ صرف اپنی پریشانی کی باتیں کر رہا ہے۔ یہ احساس نہیں ہے کہ اس کی غلطی سے ہم کس قدر پریشان ہیں۔ ہمارا کھانا پینا اور سونا حرام ہو گیا ہے۔"

دردانہ بیگم نے کہا۔ "مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے پولیس اور انٹیلی جنس کے.......... کچھ افسران مسٹروہ کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اسی لئے وہ گرفتار نہیں ہو رہا ہے۔"

"ہر شعبے میں بکنے والے ہوتے ہیں اور ناقابلِ فروخت بھی ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کچھ افسران اس کی پشت پناہی کر رہے ہوں۔ انہی باتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں نے ایک مشیر کی حیثیت سے مشورہ دیا ہے کہ مسٹروہ سے دشمنی نہیں دوستی کی جائے۔ امید ہے' ہماری توقع کے مطابق وہ آفر قبول کر لے گا۔"

دردانہ بیگم نے صوفے پر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "یہ کمبخت وقت بھی نہیں گزر رہا ہے۔ پتا نہیں کب رات کے آٹھ بجیں گے۔"

اس نے غور سے وال کلاک کو دیکھا۔ اس کا سیکنڈ والا کانٹا ساکت تھا۔ متحرک نہیں تھا۔ گھڑی کے دونوں کانٹے بارہ پر تھے۔ اس نے غصے سے محل کے منتظم کو آواز دی۔ وہ دوڑتا ہوا آیا۔ "جی بیگم صاحبہ!"

وہ غصے سے بولی۔ "تم سب نمک حرام ہو۔ گھڑی بند رہتی ہے اور تمہیں خبر نہیں ہوتی۔ نان سینس۔ اتنی دیر سے سوچ رہی ہوں کہ وقت کیوں نہیں گزر رہا ہے۔ دونوں

سوئیاں بارہ پر اٹک گئی ہیں۔"
مشیر اور کاشف اکبر نے بھی گھڑی کی طرف دیکھا۔ وہ رکا ہوا وقت کہہ رہا تھا کہ ان سب کے بارہ بج رہے ہیں۔

☆======☆======☆

ملک رب نواز کو اس معاہدے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی مل گئی تھی۔ اس نے اسے پڑھا تھا اور پڑھ کر غصے سے تلملا کر رہ گیا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔ "یہ ہمارے ملک میں کیا ہو رہا ہے یہاں جسے اقتدار اور اختیارات ملتے ہیں' وہ پاکستان کو صرف اپنے باپ کا مال سمجھ کر اس کی زمین بیچ دیتا ہے۔ خزانہ خالی کر دیتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے وطن کی آبرو لٹاتا رہتا ہے۔"

اب وہ اپنے افسرِ اعلیٰ کی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔
اس نے اپنے اعلیٰ افسر کے بنگلے میں پہنچ کر کہا۔ "سر! آپ نے حکم دیا تھا کہ معاہدے کی کاپی ملتے ہی اسے آپ کے پاس پہنچا دیا جائے۔ یہ اس لفافے میں وہی معاہدہ ہے۔"

اعلیٰ افسر نے اس سے ایک بڑا لفافہ لے کر پوچھا۔ "تم نے اسے پڑھا ہے؟"
"یس سر!"
"ہوں۔ بیٹھ جاؤ۔ میں بھی ذرا پڑھ لوں۔"
وہ پڑھنے لگا۔ ملازم نے چائے کی ٹرالی لا کر رکھی۔ ملک رب نواز چائے پینے لگا۔
اعلیٰ افسر نے اسے پڑھنے کے بعد پوچھا۔ "تم نے مسٹروہ کو اپنے اعتماد میں نہیں لیا؟"
"سر! وہ مجھ پر اعتماد کرتا ہے۔ اسی لئے معاہدے کی یہ نقل بھیجی ہے اور میری ہدایت کے مطابق اس نے اب تک اس سلسلے میں کسی کے سامنے زبان نہیں کھولی ہے۔"

"اسے اور زیادہ اعتماد میں لو۔ اس سے کہو' ہمارے پاس آئے۔ ہم اسے پوری سیکورٹی دیں گے۔ وہ اصل معاہدہ لے کر آئے گا تو اس اعلیٰ عہدیدار کاشف اکبر اور سیپا کمپنی کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔"
"وہ آج کسی وقت مجھ سے رابطہ کرے گا۔ میں اسے سمجھاؤں گا کہ پاکستان کا ساحلی علاقہ فروخت کرنے اور خریدنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کے لئے لازمی ہے کہ وہ ہماری پناہ میں آئے اور اصل معاہدہ ہمارے حوالے کرے۔"
وہ اعلیٰ افسر سے رخصت ہو کر اپنے بنگلے میں آیا۔ معاہدے کو پڑھنے کے بعد وہ

کاشف اکبر پر جھنجلا رہا تھا۔ مجبور تھا کہ براہِ راست اس کا گریبان نہیں پکڑ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ اعلیٰ عہدیدار تھا۔ اس کا گریبان اعلیٰ افسران پکڑ سکتے تھے اور ایسا اسی وقت ممکن ہو سکتا تھا' جب وہ اصل معاہدے کے ساتھ ان کی پناہ میں آ جاتا۔
شام کو سات بجے مسٹروہ نے فون پر مخاطب کیا......... اور پوچھا۔ "سر! آپ نے وہ معاہدہ پڑھ لیا ہو گا؟"
"ہاں۔ پڑھ چکا ہوں اور میرے سینئر نے بھی اسے پڑھا ہے۔ کاشف اکبر اور سیپا کمپنی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کے لئے لازمی ہے کہ تم اصل معاہدہ لے کر ہمارے پاس آ جاؤ۔ تم مجرم نہیں ہو۔ تم نے اپنے وطن کی سلامتی اور بقا کے لئے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ہم پوری طرح تمہاری حفاظت کریں گے۔"
"سر! آپ معقول مشورہ دے رہے ہیں لیکن ہمیشہ یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ جو بااختیار شخصیات ملک کو لوٹنے کھسوٹنے کے جتنے جرائم کرتی ہیں' ان کے خلاف زبردست کارروائیاں کرنے کے دعوے کئے جاتے ہیں۔ اخبارات اور دوسرے میڈیا کے ذریعے عوام کو یقین دلایا جاتا ہے کہ ان کا احتساب ہونے والا ہے مگر نہیں ہوتا۔ وہ بچ نکلتے ہیں اور دوسرے ملکوں میں جا کر لوٹی ہوئی دولت سے عیش کرتے ہیں اور مجھ جیسے لوگ' جو ان کے جرائم کے ثبوت مہیا کرتے ہیں' ان کا پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں گم ہو گئے ہیں یا گم کر دیئے گئے ہیں۔"
"بے شک ایسا ہوتا ہے مگر تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہو گا۔ تمہیں مجھ پر بھروسا کرنا چاہئے۔"
"سر! میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ آنکھیں بند کر کے آپ پر بھروسا کرتا ہوں لیکن آپ مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ آپ جیسے دیانت دار افسران کا تبادلہ کرا دیا جاتا ہے یا انہیں ملازمت سے سبکدوش کر دیا جاتا ہے۔ خدا نہ کرے' آپ کے ساتھ بھی یہی ہوا تو میرے ساتھ بھی وہی ہو گا جو جرائم کی نشاندہی کرنے والے محبانِ وطن کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔"
ملک رب نواز نے سنجیدگی سے اس کی باتیں سنیں۔ کچھ سوچا پھر کہا۔ "تمہیں وہی غلطی نہیں کرنی چاہئے کہ جو دوسرے کر چکے ہیں اور برے نتائج بھگت چکے ہیں لیکن ان کے خلاف کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔"
"میں نے اسی لئے معاہدے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی دی ہے کہ اس کے ذریعے محاسبہ شروع کیا جائے۔ جب یہ معاملہ عدالت تک پہنچے گا تو میں اصل معاہدہ عدالت تک پہنچا

دوں گا........ اس معاہدے کی روشنی میں مجرموں کو جب تک سزا نہیں ملے گی' تب تک میں منظرِ عام پر نہیں آؤں گا۔"

"یہ طریقۂ کار مناسب رہے گا۔ میں تمہارے خدشات اعلیٰ افسران تک پہنچا کر کہوں گا کہ معاہدے کی اس کاپی کے ذریعے کاشف اکبر کا محاسبہ کیا جائے۔"

"اس معاملے کو اب مختلف میڈیا کے ذریعے عوام تک پہنچانا چاہئے۔ آپ محاسبے کا آغاز کرائیں۔ میں آئندہ حالات کے مطابق آپ سے مشورے لیتا رہوں گا۔"

"تم اس فرنٹ مین کو اپنا فیصلہ سنانے والے ہو۔ میرا مشورہ ہے' جب تک سرکاری طور پر محاسبہ شروع نہ کیا جائے اور کاشف اکبر پر ملک سے باہر جانے کی پابندی عائد نہ کی جائے' تم انہیں یہی تاثر دیتے رہو کہ اصل معاہدہ ان کے حوالے کرنے والے ہو۔"

"آپ نے دانش مندانہ مشورہ دیا ہے۔ میں اس پر عمل کروں گا۔"

اس نے رابطہ ختم کر کے بیدار بخت سے ملاقات کی۔ بیدار بخت نے کہا۔ "میں صبح سے اب تک فلاحی ادارے کے سامنے ہوں۔ یہاں ان تین لڑکیوں کو نہیں لایا گیا........"

اس نے فون کے ذریعے فرنٹ مین کو مخاطب کیا۔ "ہیلو۔ میں وہ بول رہا ہوں۔"

"ہیلو مسٹروہ! تم وقت کے اور زبان کے پابند ہو۔ بولو کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"تمہاری آفر میں بہت کشش ہے۔ میں نے اپنی مستقل رہائش کے لئے ایک ملک کا انتخاب کیا ہے۔ ایک ہفتے کے اندر وہاں پہنچ کر تم سے رابطہ کروں گا۔"

"بے شک تم دانش مندی سے کام لے رہے ہو۔ تمہیں اس ملک کی شہریت دلائی جائے گی۔ تم وہاں کا بینک اکاؤنٹ نمبر دو گے۔ ہم اس اکاؤنٹ میں تمہاری مطلوبہ رقم جمع کرا دیں گے۔"

"کاشف اکبر نے نو کروڑ میں یہاں کا ساحلی علاقہ فروخت کیا ہے۔ میرے اکاؤنٹ میں بھی روپے کے حساب سے نو کروڑ جمع کئے جائیں۔"

"یہ رقم تمہیں دی جائے گی اور کوئی مطالبہ ہے؟"

"مطالبہ نہیں' یہ شرط ہے کہ وہ تینوں لڑکیاں میرے حوالے کی جائیں گی تو اس کے بعد میں یہ ملک چھوڑ کر دوسرے ملک میں جاؤں گا۔"

"تم نے کہا تھا کہ ان لڑکیوں کو یہاں کے فلاحی ادارے میں پہنچایا جائے۔"

"مگر تم نے نہیں پہنچایا۔ مجھے اناڑی نہ سمجھو فرنٹ مین!"

"تم نے میری پوری بات نہیں سنی۔ اصل بات یہ ہے کہ بانہہ بیلی کی تنظیم کے دو

عہدیدار آئے تھے۔ چونکہ لڑکیوں کو ان کے ہی ادارے سے لایا گیا تھا اس لئے ہم نے انہیں ان عہدیداروں کے حوالے کر دیا۔ وہ انہیں بانہہ بیلی کے فلاحی ادارے میں لے گئے ہیں۔"

"تمہاری اس بات میں کتنی صداقت ہے؟"

"جو سچ ہے' وہی کہہ رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اپنے ذرائع سے معلوم کروں گا۔ اگر وہ تینوں بانہہ بیلی کے فلاحی ادارے میں پہنچ چکی ہوں گی تو پھر میں تم سے رابطہ کروں گا۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ فرنٹ مین سوچنے لگا۔ "یہ تو گڑبڑ ہونے والی ہے۔ وہ تینوں لڑکیاں اسے بانہہ بیلی کے ادارے میں نہیں ملیں گی تو وہ سمجھوتا کرنے سے انکار کر دے گا۔"

اس نے کاشف اکبر کے مشیر خاص سے فون پر کہا۔ "جناب! میں نے پہلے ہی کہا تھا ان لڑکیوں کو یہاں کے فلاحی ادارے میں داخل نہ کیا گیا تو بننے والی بات بگڑ جائے گی۔"

"کیا اس نے ہماری آفر منظور نہیں کی؟"

"اس نے راضی خوشی سمجھوتا کیا تھا۔ نو کروڑ روپے اور ایک ملک کی شہریت پر راضی ہو گیا تھا لیکن شرط یہ رکھی ہے کہ پہلے ان لڑکیوں کو اس کے حوالے کیا جائے۔"

"تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے اس سے جھوٹ کہا ہے کہ بانہہ بیلی کے دو عہدیدار آئے تھے۔ وہ لڑکیوں کو واپس اپنے ادارے میں لے گئے ہیں۔"

"پھر تو وہ یقیناً تمہاری اس بات کی تصدیق کرنے تھر کے اس علاقے میں جائے گا۔ ہماری خفیہ ایجنسی کے مسلح افراد وہاں کی پولیس کے تعاون سے اسے گھیر کر گرفتار کر سکتے ہیں۔ ایک بار وہ ہاتھ میں آجائے تو اس کے ساتھ معاہدہ بھی ہمارے ہاتھ لگ جائے گا۔"

"اسے اس طرح ٹریپ کیا جائے کہ وہ مجھ سے بدظن ہونے نہ پائے۔ ورنہ وہ سمجھوتا کرنے سے انکار کر دے گا۔ خفیہ ایجنسی اور پولیس والوں سے بچ کر وہ فرار ہو گا تو پھر ہمارے خلاف ہنگامہ برپا کر دے گا۔"

"میری پلاننگ کے مطابق وہ یہی سمجھے گا کہ غیر ملکی شکاری اور اس کے تین گارڈز اسے انتقاماً نقصان پہنچا رہے ہیں۔"

مشیر خاص نے رابطہ ختم کر دیا۔ پھر کاشف اکبر کو ساری باتیں بتائیں۔ اسے اپنا منصوبہ بھی سمجھانے لگا کہ کس طرح مسٹروہ کو تھر کے علاقے میں ٹریپ کیا جائے گا۔

☆======☆======☆

کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ سونے کے لئے بستر پر لیٹ رہا ہے تو آنکھ لگنے کے بعد ابدی نیند سوتا رہے گا۔ اگر وہ صوفے پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے تو دوسرے ہی لمحے زندگی گزر جائے گی اور وہ بیٹھا ہی رہ جائے گا۔ اگر وہ اپنے گھر جا رہا ہے تو جاتے جاتے موت کے گھر میں پہنچ جائے گا۔ کلسی' تارا اور رانی دو سپاہیوں کے ساتھ اپنے تھر کی زمین پر واپس جا رہی تھیں۔ پولیس کی گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھی وہ تینوں خوش ہو کر سوچ رہی تھیں کہ بانہہ بیلی کے فلاحی ادارے میں تھر کی عورتوں کے ساتھ رہ کر قالین بافی اور کشیدہ کاری کے ہنر سیکھیں گی لیکن جب وہ گاڑی رکی اور پچھلا دروازہ کھولا گیا تو مارے خوف کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔

سامنے راہو دادا کھڑا ہوا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ سامنے کئی خیموں میں جنریٹر کی روشنی تھی۔ باہر بھی کئی بلب روشن تھے۔ جبکہ الاؤ پر تیتر' بٹیر اور سالم ہرن بھونے جا رہے تھے۔ رباب اور دف جیسے سازوں کے ساتھ صحرائی گیت کی آواز اُبھر رہی تھی۔ رئیس اعظم اور اس کے ساتھی شکاری آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے کئی عورتیں اور مرد مقامی رقص پیش کر رہے تھے۔

وہ تینوں لڑکیاں راہو دادا کو دیکھ کر خوف سے چیخنے اور رونے لگیں.......... انہیں پکڑ کر گاڑی کے پچھلے حصے سے اتارا جا رہا تھا۔ وہ بھاگنا چاہتی تھیں اور انہیں بھاگنے کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ مگر چاروں طرف مسلح گارڈز تھے۔ وہ بھاگ کر جدھر جاتی تھیں' ادھر سے گارڈز انہیں اٹھا کر شکاریوں کے سامنے پھینک دیتے تھے۔ تمام شکاری قہقہے لگا رہے تھے۔ ریت پر گرنے سے جسم پر چوٹ نہیں لگ رہی تھی لیکن وہ تینوں دماغی طور پر گھائل ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ جس شکاری کے پاس آ کر گرتی تھیں' وہ پنجے مار کر ان کے لباس کے اس حصے کو نوچ کر پھاڑ دیتا۔ اس طرح وہ رفتہ رفتہ لباس سے محروم ہوتی جا رہی تھیں۔

ہر شکاری کے دائیں بائیں طرف میز پر شراب کے جام اور بھنے ہوئے گوشت سے بھری ہوئی ٹرے رکھی ہوئی تھی۔ وہ پی رہے تھے۔ کھا رہے تھے اور ان لڑکیوں کی بے بسی سے کھیل رہے تھے۔ پھر رئیس اعظم اپنی جگہ سے اٹھا اور سب سے کمسن کلسی کو اٹھا کر بغل میں دبا کر اپنے خیمے میں لے گیا۔

تارا اور رانی نے اپنی سہیلی کلسی کو شکاری کی گرفت میں روتے چیختے اور پھڑپھڑاتے دیکھا۔ پھر خیمے کے دروازے کا پردہ گر گیا۔ سہیلی نظروں سے اوجھل ہو گئی لیکن اس کی چیخیں سنائی دے رہی تھی۔ پھر خیمے کے اندر ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ زندگی چیخنا تو کیا ایک سرد آہ بھرنا بھی بھول گئی تھی۔

مستروہ ایک جیپ میں بانہہ بیلی کے صدر سے ملنے آیا۔ وہ فلاحی ادارے سے نکل کر اپنے مکان میں سونے کے لئے جا رہا تھا اس نے مستروہ کو دیکھ کر نہیں پہچانا کیونکہ اس کا چہرہ اور حلیہ بدل گیا تھا۔ اس نے صدر سے کہا۔ "میں وہی ہوں' جو کلسی تارا اور رانی کو آپ کے پاس چھوڑ گیا تھا۔"

صدر نے کہا۔ "میرے پاس جو نوجوان لڑکیوں کو لے کر آیا تھا' وہ کوئی اور تھا اور اس کا نام مستروہ تھا۔"

"چلئے میں مستروہ نہیں ہوں۔ آپ صرف اتنا یقین دلا دیں کہ جو لڑکیاں امانت کے طور پر یہاں پہنچائی گئی تھیں' وہ محفوظ ہیں۔"

صدر نے کہا۔ "وہ محفوظ ہوں گی۔ کیونکہ پولیس کی حفاظت میں تھیں۔ وہ پولیس والے انہیں یہاں سے کراچی لے گئے تھے۔"

مستروہ نے کہا۔ "ان لڑکیوں کو کراچی لے جانے والی بات پرانی ہو چکی ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ بانہہ بیلی کے دو عہدیدار کراچی گئے تھے پھر وہاں سے ان لڑکیوں کو یہاں کے فلاحی ادارے میں لے آئے ہیں۔"

"کسی نے آپ سے غلط کہا ہے۔ ان تینوں کو جب سے شہر لے جایا گیا ہے' تب سے وہ ادھر واپس نہیں آئی ہیں اور نہ ہی ہمارا کوئی عہدیدار ان سے ملنے شہر گیا ہے۔ ہم مطمئن ہیں کہ وہ لڑکیاں قانون کے محافظوں کے سائے میں ہیں۔"

"آپ لوگوں کو دھوکا دیا گیا ہے اور مجھ سے جھوٹ کہا گیا ہے کہ آپ کی تنظیم کے دو عہدیدار انہیں یہاں لے آئے ہیں۔ اوہ خدایا! کیا ان معصوم بچیوں کو پھر شکاریوں کے آگے ڈالا جا رہا ہے؟"

رات اندھیری تھی۔ بانہہ بیلی کے صدر کے مکان سے اور آس پاس کے دوسرے مکانات سے دھیمی دھیمی روشنی جھلک رہی تھی۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر گھنی جھاڑیوں اور درختوں کے پیچھے خفیہ ایجنسی کے مسلح افراد اور چند زر خرید پولیس والے چھپے ہوئے تھے۔ ایجنسی کے مسلح لیڈر نے سرگوشی میں انسپکٹر سے کہا۔ "وہ آ چکا ہے۔ بانہہ بیلی کے صدر کے مکان کے سامنے ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "میں نے بھی ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ فلاحی ادارے کے صدر کے مکان کی طرف باتیں کرتا ہوا گیا تھا۔"

"یہ بہترین موقع ہے۔ ہم محاصرہ تنگ کرتے ہوئے اسے چاروں طرف سے گھیر کر گرفتار کر سکتے ہیں۔"

"اس سلسلے میں دو مشکلات ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسے زندہ گرفتار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ تاریکی ہے۔ ہم سے ذرا بھی غلطی ہو گئی تو اسے بچ نکلنے کا موقع مل جائے گا۔"

"جو حکم دیا گیا ہے' اس کی تعمیل کرنی ہو گی۔ ہم فائرنگ کر کے اسے صرف زخمی کر سکتے ہیں' ہلاک نہیں کر سکتے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم اپنے آدمیوں کو سگنل دو۔ میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ آگے بڑھتا ہوں۔"

وہ سب حرکت میں آ گئے۔ دبے قدموں چلتے ہوئے اور زمین پر رینگتے ہوئے قریب آنے اور گھیرا تنگ کرنے لگے۔ پھر انسپکٹر نے میگا فون کے ذریعے کہا۔ "مسٹروہ! تم چاروں طرف سے گھیر لیے گئے ہو۔ جہاں سے بھی فرار ہونا چاہو گے' وہیں گولیوں سے چھلنی کر دیئے جاؤ گے۔ فائرنگ سے بستی والوں کو جانی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ ہتھیار پھینک کر خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دو۔"

یہ باتیں سنتے ہی مسٹروہ نے صدر کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "مکان کے اندر جاؤ۔"

پھر وہ تڑاتڑ فائرنگ کرتا ہوا چھلانگ لگا کر تاریکی میں چلا گیا۔ چاروں طرف سے جوابی فائرنگ ہونے لگی۔ بستی کے کتنے ہی گھروں کی عورتیں اور بچے خوفزدہ ہو کر رونے اور چیخنے لگے۔ میگا فون پر چیخ چیخ کر کہا جا رہا تھا۔ "تم غلطی کر رہے ہو۔ فرار ہونے کی کوشش کر کے دیکھ لو۔ زندہ نہیں جا سکو گے۔"

اسی وقت ایک بھاری بھرکم موٹر سائیکل کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ یہ آواز صدر کے مکان کے پیچھے سے آئی تھی۔ ان کی فائرنگ کا رخ ادھر ہو گیا۔ وہ موٹر سائیکل آندھی کی رفتار سے جا رہی تھی۔ آواز سے پتا چل رہا تھا کہ مسٹروہ سمتیں بدل کر جا رہا ہے۔ پھر وہ آواز بستی کے باہر سنائی دی۔ خفیہ ایجنسی اور پولیس والے دوڑتے ہوئے اپنی گاڑیوں کے پاس آئے۔ چھلانگیں لگا کر جیپ وغیرہ میں سوار ہوئے۔ پھر وہ گاڑیاں اس موٹر سائیکل کے تعاقب میں پوری رفتار سے دوڑنے لگیں۔

وہ رات کے دو بجے بانہہ بیلی کے صدر کے پاس آیا تھا۔ اس کے بعد ہی فائرنگ شروع ہوئی تھی۔ ان کے لئے وہ رات بہت اہم تھی۔ وہ کسی قیمت پر وہ کو فرار ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے تعاقب جاری رکھا۔ دو چار گاڑیوں والے سمتیں بدل کر دوسرے راستوں سے اسے گھیرنے اور پکڑنے کی کوشش کرنے لگے۔

اس کی موٹر سائیکل قیامت کی رفتار سے جا رہی تھی۔ وہ شوٹنگ رینج سے دور نکل

گیا تھا۔ یوں بھی اندھیرے میں صحیح نشانہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ وہ لوگ آواز کی سمت فائرنگ کر رہے تھے۔ پھر وہ آواز کہیں گم ہو گئی شاید اس نے کہیں چھپ کر موٹر سائیکل بند کر دی تھی۔ یا پھر تعاقب کرنے والوں سے اتنا آگے نکل چکا تھا کہ آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

یوں آگے پیچھے دوڑتے دوڑتے صبح ہونے لگی۔ وہ تنہا موٹر سائیکل پر جا رہا تھا۔ تعاقب کرنے والوں کو ڈاج دے کر ایسی جگہ پہنچ گیا تھا' جہاں شکاری خیمہ زن تھے اور پچھلی رات عیش و طرب میں گزارتے رہے تھے۔

وہاں پہنچتے ہی اس نے موٹر سائیکل روک دی۔ اب وہاں خیمے نہیں تھے۔ کوئی شکاری یا ان کا کوئی دلال نہیں تھا۔ بجھے ہوئے الاؤ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس دھوئیں میں کلسی' تارا اور رانی کی لاشیں زمین پر پڑی ہوئی نظر آئیں۔ وہ ایک دم سے تڑپ گیا۔ موٹر سائیکل سے اتر کر دوڑتا ہوا ان کے قریب آیا۔ ان تینوں کو دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ ان پر کس طرح اجتماعی زیادتی کی گئی ہے اور کس طرح کتوں کی مانند انہیں بھنبھوڑا گیا ہے۔

وہ اپنی جیکٹ اور شرٹ وغیرہ اتار کر بے لباس لاشوں کو ڈھانپنے لگا۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ تعاقب کرنے والی بہت سی گاڑیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنے لئے نہیں' ان تینوں معصوم اور مظلوم بچیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیا ان کی موت کا عوامی سطح پر کوئی اثر ہو گا؟ کیا بااثر ظالموں سے ان کی موت کا حساب لیا جائے گا؟

وہ تینوں کم سن لاوارث لاشیں کہہ رہی تھیں۔

"اے میرے وطن کے لوگو! کیا غریبوں کی لڑکیاں اسی لیے جوان ہوتی ہیں؟"

آبدیدہ تھے سبھی قتل پہ میرے لیکن!
کوئی بھی پرسشِ احوال نہ قاتل سے ہوئی

☆=====☆=====☆

وہ گرفتار ہو گیا۔ یہ خبر آواز کی رفتار کے ساتھ کراچی کے فرنٹ مین کے پاس پہنچی۔ فرنٹ مین نے اعلیٰ عہدیدار کاشف اکبر اور بیگم دردانہ کو یہ خوش خبری سنائی۔ کاشف اکبر نے بڑے فخر سے یہ خوش خبری سیپا کمپنی کے ڈائریکٹر جنرل کو سنائی۔ اس طرح یہ خبر اسلام آباد میں برطانوی اور امریکی سفارت خانوں تک پہنچ گئی۔

ایک خفیہ ایجنسی کے افسر نے فون کے ذریعے فرنٹ مین کو بتایا کہ صبح سویرے تھر کے ریگستانی علاقے میں کئی جگہ الاؤ سے دھواں اٹھ رہا تھا اور دھوئیں کے درمیان تین.......... کمسن لڑکیوں کی بے بس لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ انہیں کئی انسانی درندوں نے بری طرح نوچ کھسوٹ کر لہولہان کر دیا تھا۔ مستروہ اپنی موٹر سائیکل سے اتر کر اپنی جیکٹ اور قمیض وغیرہ اتار کر ان لاشوں کو ڈھانپ رہا تھا۔ اسی وقت مقامی سپاہیوں اور خفیہ ایجنسیوں کے مسلح افراد نے مستروہ کو چاروں طرف سے گھیر کر گرفتار کر لیا تھا۔

کاشف اکبر نے فرنٹ مین سے کہا۔ "اپنی ایجنسی کے افسر سے کہو' اس کے لباس کی تلاشی لے۔ ہو سکتا ہے' کیٹی بندر کے معاہدے کے کاغذات اس کی جیب میں رکھے ہوں۔ کاغذات نہ ہوں تو اسے میرے ٹارچر سیل میں پہنچا دیا جائے۔"

سیپا کمپنی کے ڈائریکٹر جنرل ہیرالڈ جان نے کاشف اکبر سے کہا۔ "وہ ہمارا مجرم ہے۔ اس نے ہمارے سیف سے اس خفیہ معاہدے کو چرایا تھا اور میری بیٹی ماریہ کو اغوا کیا تھا اسے ہیلی کاپٹر میں فوراً کیٹی بندر پہنچایا جائے۔ ہم اس سے وہ معاہدہ وصول کریں گے اور اسے ایسی سزا دیں گے کہ اس دنیا سے اس کا نام و نشان مٹ جائے گا۔"

اس خفیہ معاہدے کی ایک شق میں درج تھا کہ کوئی بھی معاملہ متنازعہ ہو یا کسی کے خلاف کوئی کارروائی کرنی ہو تو برطانوی قوانین کے مطابق برطانیہ کی عدالت میں ہو گی۔ لہٰذا معاہدے کے مطابق خفیہ ایجنسی کے افسر سے کہا گیا کہ قیدی وہ کو کیٹی بندر' ہیلی کاپٹر کے ذریعے پہنچایا جائے۔

خفیہ ایجنسی والوں نے بتایا کہ اس کے لباس اور موٹر سائیکل کی تلاشی لی گئی تھی۔ معاہدے کے کاغذت اس کے پاس نہیں تھے۔ کاشف اکبر نے کہا۔ "میں بھی کیٹی بندر پہنچ رہا ہوں۔ اس دوران میں قیدی سے کسی طرح اگلوانے کی کوشش کرتے رہو کہ اس نے

وہ معاہدہ کہاں رکھا ہے؟"

فرنٹ مین نے.......... ملک رب نواز کو بتایا کہ جس نے ہمارا کھانا' پینا اور سونا حرام کر دیا تھا' وہ گرفتار ہو چکا ہے۔

ملک رب نواز کو دکھ پہنچا۔ اس نے اپنے سینئر افسر کو اطلاع دی۔ پھر کہا۔ "سر! وہ محبِ وطن ہے۔ اگر ہم اسے اپنی کسٹڈی میں رکھ کر انکوائری کریں تو کاشف اکبر اس پر ظلم نہیں کر سکے گا۔ ہم مستروہ سے وہ معاہدہ حاصل کر لیں گے۔"

سینئر افسر نے کہا۔ "ہمیں اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہیے۔ جب بات بڑھے گی تو دیکھا جائے گا۔"

"لیکن سر! پہلے تو آپ اس معاملے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ آپ نے کہا تھا کہ وہ اس خفیہ معاہدے کے ساتھ ہمارے پاس آئے گا تو اسے تحفظ دیا جائے گا۔"

"ہاں.......... مگر وہ معاہدے کی اصل کاپی کے ساتھ ہمارے پاس نہیں آیا۔ اب کاشف اکبر اسے منظرِ عام پر آنے نہیں دے گا۔ اس کی لاش کہیں چھپا دے گا تو ہمارے پاس اس کے کسی جرم کا ثبوت نہیں ہو گا۔"

فون بند ہو گیا۔ ملک رب نواز پریشانی سے سوچنے لگا اس کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ ورنہ وہ حقیقتاً اس بے چارے کو قتل کر ڈالیں گے۔ اس نے پولیس کے انسپکٹر جنرل سے فون پر پوچھا۔ "آپ جانتے ہوں گے کہ مستروہ گرفتار کر لیا گیا ہے؟ اسے گرفتار کر کے تھر سے شاید کراچی لایا جا رہا ہے۔"

انسپکٹر جنرل نے کہا۔ "مجھے ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی ہے۔ ویسے مستروہ کا معاملہ بڑا سنگین تھا۔ ہو سکتا ہے' خفیہ ایجنسی والوں نے اسے گرفتار کر لیا ہو۔"

"آپ ان سے کہہ سکتے ہیں کہ قیدی ہماری پولیس کے حوالے کر دیں۔"

"میں کسی خفیہ ایجنسی والے کو نہیں جانتا پھر کس سے کہوں کہ وہ قیدی کو ہماری پولیس کے حوالے کر دیں۔"

ملک رب نواز نے خفیہ ایجنسی کے ایک اعلیٰ افسر سے وہ کے بارے میں بات کی۔ اس نے بھی یہی کہا۔ "ہمارا کوئی جاسوس اسے گرفتار کرتا تو ہمیں اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا۔ سوری ابھی ہم اس معاملے سے بے خبر ہیں۔"

ملک رب نواز نے کہا۔ "یہ کتنی حیرانی اور بے یقینی کی بات ہے کہ جس شخص کو کیٹی بندر سے لے کر تھر کے علاقوں تک دن رات تلاش کیا جا رہا تھا۔ پولیس اور آپ کے ڈیپارٹمنٹ والے ہر طرف اس کی بُو سونگھتے پھر رہے تھے' اب اس کی گرفتاری سے

آپ حضرات بے خبر ہو گئے ہیں۔ کیا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس بے چارے کو کسی خفیہ ایجنسی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے؟"

"سر! آپ اپنے طور پر ہمارے بارے میں کوئی بھی رائے قائم کر سکتے ہیں۔ میں تو وہی کہہ رہا ہوں' جو سچ ہے۔ ہمیں اب تک اس کی گرفتاری کی کوئی اطلاع نہیں ملی ہے۔"

ملک رب نواز نے کاشف اکبر سے فون پر رابطہ کیا۔ اس کے سیکرٹری نے کہا۔

"سر! وہ موجود نہیں ہیں۔ کہیں گئے ہوئے ہیں۔"

"تمہیں بتایا ہو گا کہ کہاں گئے ہیں؟"

"نو سر! وہ جلدی میں تھے۔ انہوں نے مجھے بتانا ضروری نہیں سمجھا۔"

آخر ملک رب نواز نے فرنٹ مین سے رابطہ کیا پھر کہا۔

"تم نے مسترو سے سمجھوتا کیا تھا۔ تمہاری آپس میں بات بننے والی تھی پھر اسے گرفتار کیوں کیا گیا ہے؟" کچھ توقف کے بعد اس نے کہا۔ "تم نے سمجھوتا کرنے کی بات کی اور اسے دھوکا دیا۔ وہ گرفتار ہونے کے بعد بھی معاہدہ ہیرالڈ جان کے حوالے نہیں کرے گا تو کیا تمہارے آقا مشکلات میں نہیں پڑیں گے؟"

"جب ٹارچر سیل میں جسمانی اور ذہنی اذیتیں دی جاتی ہیں۔ جسم کے تمام جوڑوں میں ڈرل مشین سے سوراخ کیے جاتے ہیں۔ تھرڈ ڈگری کے ظالمانہ طریقے استعمال کیے جاتے ہیں تو بڑے سے بڑے قوتِ ارادی رکھنے والے شہ زور چیخیں مار مار کر اپنے اندر کے سارے راز اگل دیتے ہیں۔ آپ شام تک انتظار کریں۔ مسترو کہلانے والا قدموں میں گر کر وہ معاہدہ ہمارے آقا کے حوالے کرے گا۔"

فرنٹ مین نے فون بند کر دیا۔ ملک رب نواز نے شکست خوردہ انداز میں ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔ اگر وہ فرنٹ مین سے پوچھتا تو وہ کبھی نہ بتاتا کہ قیدی کو کس ٹارچر سیل میں پہنچایا گیا ہے؟

کیٹی بندر میں ہیرالڈ جان کے مسلح گارڈز ایک میدان میں کھڑے ہوئے تھے۔ مسٹر وہ کو ہیلی کاپٹر میں لایا گیا تھا۔ اسے ہتھکڑیاں پہنائی گئی تھیں۔ خفیہ ایجنسی کے چھ مسلح شخص اسے لے کر آئے تھے۔ وہ ہیلی کاپٹر سے اترنے کے بعد اس کے آگے پیچھے' دائیں بائیں چلتے ہوئے اسے گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے ایک بڑی سی وین میں آ کر بیٹھ گئے۔ وین کے آگے پیچھے بھی ہیرالڈ جان کے مسلح گارڈز گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ گاڑیاں وہاں سے چلتی ہوئی مختلف مقامات سے گزرتی ہوئی ان کوارٹرز کے پاس پہنچیں جو وہاں کے

انگریز ملازمین کے لیے بنائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک کوارٹر کو فوری طور پر قید خانہ اور ٹارچر سیل بنایا گیا تھا۔ اسے اس قید خانے میں لے جا کر کھڑکیوں اور دروازوں کو باہر سے بند کر دیا گیا۔ کوارٹر کے چاروں طرف مسلح پہرے دار کھڑے ہو گئے۔ ان سب کو بتایا گیا کہ قیدی بہت خطرناک ہے۔ اس قیدی کے چند آلۂ کار کیٹی بندر میں موجود ہیں۔ ایسے ہی دو آلۂ کار نے سیپا کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل کو اغوا کر کے خفیہ معاہدے کی فائل اس سے چھین لی تھی۔

ایجنسی کے دو افسران کوارٹر کے باہر کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیرالڈ جان کا انتظار کر رہے تھے۔ فون کے ذریعے پتا چلا کہ ایک اور ہیلی کاپٹر آیا ہے جس میں اعلیٰ عہدیدار کاشف اکبر اپنی بیگم دردانہ کے ساتھ آئے ہیں۔ ایک مشیر اور فرنٹ مین بھی ان کے ساتھ ہیں۔

ایک گھنٹے بعد چار گاڑیاں اس کوارٹر کے سامنے آ رکیں۔ ان گاڑیوں میں ہیرالڈ جان' کاشف اکبر اور بیگم دردانہ اپنے حواریوں کے ساتھ تھے۔ افسران نے اٹھ کر انہیں سلیوٹ کیا۔ ہیرالڈ جان نے پوچھا۔ "وہ مجرم اور ٹیرورسٹ کہاں ہے؟"

"سر! اسے اس کوارٹر کے ایک کمرے میں بند رکھا گیا ہے۔"

"وہ کوئی نام نہیں ہوتا۔ کیا اس کی اصلیت اس سے اگلوائی گئی؟"

"وہ انکار کر رہا ہے کہ وہ نہیں ہے اور اس نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ ہمیں اس کی جیب سے یہ شناختی کارڈ ملا ہے۔"

ہیرالڈ جان نے وہ کارڈ لے کر پڑھا پھر اسے کاشف اکبر کو دیا۔ اس کارڈ پر بابر علی لکھا ہوا تھا۔ بیگم دردانہ نے اس پر ایک نظر ڈال کر کہا۔ "ہونہہ' ایسے درجنوں جعلی کارڈ بنوائے جا سکتے ہیں۔"

جان نے کہا۔ "ہاں۔ پہلے جو شناختی کارڈ تھا' اس پر اس کی عرفیت وہ لکھی ہوئی تھی۔ میں نام اور حلیہ بدلنے والوں کو اچھی طرح پہچان لیا کرتا ہوں۔ ایسے بہروپیے مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔"

کاشف اکبر نے پوچھا۔ "وہ معاہدے کے کاغذات کے متعلق کیا کہتا ہے؟"

"وہ کہتا ہے' نہ اس کے پاس خفیہ دستاویزات ہیں اور نہ ہی وہ ان کے متعلق کچھ جانتا ہے۔"

"ہم اس کا پیٹ پھاڑ کر دستاویزات نکال لیں گے۔ دروازہ کھولو۔"

اسی وقت فرنٹ مین کے موبائل فون سے بزر کی آواز ابھری۔ اس نے فون کو آن

کر کے اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ "ہیلو کون؟"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "دروازہ کھولنے اور قیدی سے ملنے سے پہلے میری بات سن لو۔ سنو گے تو کاشف اکبر اور اس کے بال بچوں کا بھلا ہو گا۔"

"تم کون ہو اور کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اس کی بات سن کر ہیراللہ جان اور کاشف اکبر رک گئے۔ فرنٹ مین نے انہیں ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔ "فرنٹ مین! تم میری آواز سن کر اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ اپنے آقاؤں کو بتا دو کہ میں کون ہوں؟"

وہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کاشف اکبر سے بولا۔ "سر! فون پر مسٹر وہ کی آواز سنائی دے رہی ہے۔"

"کیا؟ فون پر وہ بول رہا ہے؟ پھر یہاں لایا جانے والا قیدی کون ہے؟"

جان نے پوچھا۔ "کیا وہ اپنا نام بتا رہا ہے؟"

فرنٹ مین نے فون پر پوچھا۔ "میں آواز سے پہچان رہا ہوں مگر تم تصدیق کرو۔"

"تم نے بڑی آفر دی تھی۔ مجھ سے سمجھوتا کر رہے تھے اور ان تین معصوم بچیوں کو میرے حوالے کرنے والے تھے مگر ان بچیوں پر شرمناک درندگی کی انتہا کر دی گئی اور مجھے گرفتار کر کے اس کوارٹر میں قید کر دیا گیا ہے۔ کیا مجھ پر ظلم کی انتہا کر کے وہ خفیہ معاہدہ حاصل کر سکو گے؟"

فرنٹ مین نے خفیہ ایجنسی کے ایک افسر سے پوچھا۔ "کیا اس کوارٹر میں جسے قید کیا گیا ہے' اسے فون کرنے کی سہولت دی گئی ہے؟"

افسر نے کہا۔ "نہیں اس کے پاس ٹیلی فون نہیں ہے۔ اس کے لباس کے اندر ایک تنکا بھی نہیں رہنے دیا ہے۔ جس کمرے میں اسے بند کیا گیا ہے' وہ بالکل خالی ہے۔ آپ ابھی چل کر دیکھ لیں۔"

کوارٹر کا بیرونی دروازہ کھل چکا تھا۔ وہ سب اندر آئے پھر ایک کمرے کے دروازے کو کھولا گیا۔ وہ کمرا سامان سے خالی تھا۔ فرش پر قیدی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ سر اٹھا کر انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ آنے والے اسے خالی ہاتھ دیکھ رہے تھے۔ اس کے پاس فون نہیں تھا مگر فون سے آواز آ رہی تھی۔ "فرنٹ مین! شاید تم اس بدنصیب کے پاس پہنچ گئے ہو' جسے اپنا شکار سمجھ کر پکڑ لائے ہو لیکن' جسے پکڑنا تھا' وہ فون پر بول رہا ہے۔"

فرنٹ مین نے پوچھا۔ "یہ۔ یہ کون ہے' جسے ہم نے قیدی بنا لیا ہے؟"

"میں کیا جانوں' کون ہے؟ جس نے اسے پکڑا ہے' اس سے پوچھو یا پھر وہ قیدی بتا سکے گا اور وہ جو کچھ بتائے' اس پر یقین نہ آئے تو اسے گولی مار دو۔ مجھے اتنا بتاؤ' اسے کتنی دیر میں گولی مارو گے تاکہ اس کے بعد میں تم سے رابطہ کروں۔"

دوسری طرف سے رابطہ ختم کر دیا گیا۔ ہیراللہ جان نے کہا۔ "یہ وہ نہیں ہے۔ میں اس سے دو بار ملاقات کر چکا ہوں۔ یہ کوئی دوسرا ہے۔"

کاشف کے مشیر نے کہا۔ "یہ وہی ہو سکتا ہے۔ اس نے میک اپ اور گیٹ اپ بدل لیا ہو گا۔"

"بہروپیے چہرہ بدل سکتے ہیں' جسم تبدیل نہیں کر سکتے۔ وہ قد آور اور باڈی بلڈر تھا۔ یہ قیدی قد آور نہیں ہے اور اس کی طرح صحت مند بھی نہیں ہے۔"

خفیہ ایجنسی کے افسر نے کہا۔ "یہ چمڑے کا جیکٹ پہنے ہوئے تھا اور موٹر سائیکل پر تھا۔ ہمیں وہ کی یہی نشانیاں بتائی گئی تھیں پھر یہ رات دو بجے بانہ بیلی کے صدر سے ملنے گیا تھا۔"

قیدی نے کہا۔ "یہ جھوٹ ہے۔ میں نے آج تک کبھی بانہ بیلی کے صدر سے ملاقات نہیں کی۔ میں ان افسروں سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میں وہ نہیں ہوں۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کوئی نام نہیں ہے۔ میرا نام بابر علی ہے۔ میں کراچی کے کمشنر صاحب کے دفتر میں اکاؤنٹنٹ ہوں۔ دفتر سے چھٹی لے کر پہلے ٹھٹھہ اپنے ماموں کے پاس آیا پھر رات تین بجے اپنی موٹر سائیکل پر میرپور خاص کے لیے نکلا۔ وہاں میرے والدین اور بہن بھائی رہتے ہیں۔"

افسر نے پوچھا۔ "تم وہاں ان تین لاشوں کے پاس کیا کر رہے تھے؟"

"میں نے وہاں سے گزرتے ہوئے وہ لاشیں دیکھی تھیں۔ مجھ سے ان کی بے لباسی دیکھی نہیں گئی۔ میں اپنے کپڑے اتار کر ان کے جسم ڈھانپ رہا تھا۔ اتنے میں آپ لوگوں نے آ کر گرفتار کر لیا۔ تب سے میں چیخ رہا ہوں کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے لیکن یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ میں کمشنر صاحب کے دفتر میں ملازم ہوں۔"

فرنٹ مین نے اس سے کمشنر کا فون نمبر لے کر رابطہ کیا۔ کمشنر کے سیکرٹری نے پوچھا "فرمائیے؟ آپ کون ہیں؟"

"اپنے کمشنر صاحب سے کہو' محترم جناب کاشف اکبر صاحب بات کریں گے۔"

فرنٹ مین نے موبائل کاشف اکبر کو دیا۔ تھوڑی دیر بعد کمشنر کی آواز سنائی دی۔ کاشف اکبر نے پوچھا۔ "کیا آپ کے دفتر میں کوئی بابر علی اکاؤنٹنٹ ہے؟ اور کیا وہ کل

چھٹی لے کر میرپور خاص گیا ہے؟"

"جی ہاں۔ بابر علی میرے دفتر میں اکاؤنٹنٹ ہے اور وہ کل چھٹی لے کر میرپور خاص گیا ہے۔ بائی دا وے بات کیا ہے؟"

"ایک شخص کو مجرم ہونے کے شبہے میں گرفتار کیا گیا ہے۔ آپ اس سے گفتگو کر کے تصدیق کریں کہ وہ آپ کا ملازم بابر علی ہے۔"

کاشف اکبر نے بابر علی کو فون دیا۔ وہ تھوڑی دیر تک کمشنر صاحب سے باتیں کرتا رہا اور اپنا دکھڑا سناتا رہا پھر اس نے موبائل واپس دے دیا۔ کاشف اکبر نے اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ "کیا یہی آپ کا ملازم ہے؟"

"جی ہاں' یہ میرا ملازم ہے۔ بے چارے کو مجرم سمجھ کر گرفتار کیا گیا ہے۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ اسے رہا کر دیا جائے۔"

کاشف اکبر نے ناگواری سے قیدی بابر علی کو دیکھا پھر ہیرالڈ جان سے کہا۔ "کمشنر نے تصدیق کی ہے۔ یہ اس کا ملازم ہے۔ آپ درست فرما رہے تھے۔ یہ وہ نہیں ہے۔ اسے جانے دیا جائے۔"

بابر علی کو جانے کی اجازت دے دی گئی۔ فرنٹ مین نے کہا۔ "کھیل بگڑ گیا ہے۔ وہ اب ہمارے قابو میں نہیں آئے گا۔ ہم سے دھوکا کھانے کے بعد دشمنی پر اتر آئے گا۔"

"فرنٹ مین وہ ہوتا ہے' جو بڑے سے بڑے جن کو بوتل میں بند کر لیتا ہے۔ اگر تم اسے شیشے میں نہ اتار سکے تو ہم کسی دوسرے فرنٹ مین کی خدمات حاصل کر لیں گے۔"

"میری پوری کوشش ہوگی کہ اسے پہلے سے بڑی آفر دے کر وہ معاہدہ حاصل کر لوں۔ وہ ابھی فون پر رابطہ کرنے والا ہے۔"

جان نے کہا۔ "پتا نہیں وہ کب فون کرے گا۔ مسٹر کاشف اکبر! آپ میرے بنگلے میں چلیں۔ لنچ ٹائم ہے۔ کچھ کھائیں گے اور اس کم بخت کے فون کا انتظار کریں گے۔"

وہ اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر جان کے بنگلے میں آئے۔ فرنٹ مین اور مشیر کو باہر ایک کمرے میں بیٹھنے کا حکم دے کر کہا گیا کہ وہ فون پر رابطہ کرے تو انہیں اطلاع دی جائے۔ کاشف اکبر' بیگم دردانہ اور ہیرالڈ جان بنگلے کے اندر آ گئے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر گفتگو کرتے رہے اور تشویش میں مبتلا رہے کہ وہ معاہدہ واپس نہ ملا تو کیا ہوگا؟ جب ایک جرم سامنے آتا ہے تو اس کی انکوائری کی تفصیلات سے دوسرے جرائم کا بھی انکشاف ہونے لگتا ہے۔ کاشف اکبر کے کھاتے میں کرپشن کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ سلسلے وار داستان عوام کے سامنے آئے۔

وہ لنچ کے دوران میں بھی اسی سلسلے میں گفتگو کرتے رہے اور پریشان ہوتے رہے۔ دو گھنٹے گزر گئے تھے اور وہ فون پر رابطہ نہیں کر رہا تھا۔ لنچ کے بعد انہوں نے چائے پی۔ انتظار کرتے کرتے شام کے پانچ بج گئے۔ جان نے کہا۔ "ہم اس کے محتاج ہیں اس لیے انتظار کر رہے ہیں۔ ان تین لڑکیوں کے ساتھ زیادتی ہونے کی وجہ سے وہ غصے میں ہوگا۔ پتا نہیں جوش اور جنون میں کیا کر گزرے؟"

بیگم دردانہ نے شوہر سے کہا۔ "میں نے سمجھایا تھا کہ اپنے غیر ملکی مہمانوں کو لڑکیوں کے معاملے میں ٹال دیں۔ انہیں سمجھادیں کہ ابھی شکار کھیلنے کے لیے فضا سازگار نہیں ہے لیکن آپ نے مہمانوں کو خوش کیا اور ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر دی۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ان.......... لڑکیوں کی اوقات ہی کیا ہے؟ تین مر گئیں تو قیامت نہیں آ گئی ہے۔ وہ تینوں اس وہ کی سگی نہیں تھیں۔ وہ جذباتی ہو کر ذرا غصہ دکھائے گا لیکن ہم اتنی بڑی آفر دیں گے کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ وہ پھر ہم سے سمجھوتا کر لے گا۔"

فرنٹ مین نے کاشف اکبر کو اطلاع دی۔ "وہ نے رابطہ کیا تھا لیکن اس نے ہمارے مطلب کی بات نہیں کی۔ صرف اتنا کہا کہ ہم سے کل صبح رابطہ کرے گا۔"

"کل صبح کیوں؟ تم نے پوچھا نہیں کہ وہ ابھی معاملات کیوں نہیں طے کر رہا ہے؟"

"سر! میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے فون بند کر دیا تھا۔"

کاشف اکبر' دردانہ بیگم اور ہیرالڈ جان بری طرح جھنجلا گئے۔ کل صبح کا مطلب یہ تھا کہ وہ آج رات کی بھی نیند اُڑا رہا تھا۔ انہیں تجسس اور ذہنی انتشار میں مبتلا رکھنا چاہتا تھا۔

☆======☆======☆

وہ بہت مصروف تھا۔ اس نے معاہدے کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں محتسب اعلیٰ کے' وکلا کی انجمن کے اور تمام اخبارات کے دفاتر میں بھیج دی تھیں۔ انٹیلی جنس کے افسر کو پہلے ہی ایک کاپی دے چکا تھا۔ اس نے فون کے ذریعے ملک رب نواز سے رابطہ کیا۔ رب نواز نے پوچھا۔ "تم خیریت سے ہو؟ انہوں نے تمہیں کہاں قید کیا ہے؟"

"انہوں نے میرے دھوکے میں کسی اور کو قید کیا تھا۔ میں آزاد تھا اور آزاد ہوں۔"

"تم نے صبح رابطہ کیوں نہیں کیا؟"

"میں دیکھنا چاہتا تھا کہ میری گرفتاری کی خبر سن کر یہاں کے ذمے دار ادارے کیا

کرتے ہیں؟ لیکن قانوناً پولیس اور انٹیلی جنس کی کسٹڈی میں اس قیدی کو نہیں رکھا گیا تھا۔ اسے غیر قانونی طور پر کسی ٹارچر سیل میں لے جایا گیا تھا۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے فرض کرلیں کہ وہ قیدی میں ہی تھا۔ کیا آپ نے مجھ جیسے قیدی کو انصاف دلانے کے لیے کچھ کیا تھا؟"

"تم درست کہتے ہو۔ چونکہ وہ صاحبِ اقتدار کاشف اکبر کا قیدی تھا۔ اس لیے تمام ذمے دار ادارے خاموش رہے اور اس واقعے سے انجان بنے رہے۔ میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ خدا گواہ ہے' اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ تمہیں قیدی بنا کر کہاں لے گئے ہیں تو میں ذاتی طور پر تمہاری حفاظت کے لیے وہاں پہنچ جاتا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم محفوظ ہو۔ تمہاری جگہ اس دوسرے قیدی کی شامت آرہی ہوگی۔"

"نہیں۔ وہ کمشنر صاحب کے دفتر کا ایک اکاؤنٹنٹ تھا۔ انہوں نے اسے رہا کردیا ہے۔ اب تک جو کچھ ہوتا رہا' اس کا شرمناک پہلو یہ ہے کہ ان تین کمسن لڑکیوں کے ساتھ اجتماعی زیادتی کرکے انہیں ہلاک کیا گیا ہے۔"

"سوسیڈ۔ میں ایک صاحبِ اختیار افسر ہو کر اکثر شرمندگی سے سوچتا ہوں۔ ہمارے ملک میں ننگے تماشے ہوتے ہیں اور ہم گناہ گاروں کا گریبان پکڑنے کی کوششیں کرتے کرتے ان کی سیاسی چالبازیوں کے نتیجے میں ناکام ہوجاتے ہیں۔"

"سر! میں حوصلہ نہ ہارنے کے لئے میدانِ عمل میں آیا ہوں۔ یہ عہد کرچکا ہوں کہ پہلے ایسے مجرموں کو عدالت سے سزا دلاؤں۔ اگر وہ سیاسی اور قانونی ہتھکنڈوں سے بچ جائیں گے تو پھر میں انہیں سزا دوں گا۔ موت کی سزا۔"

"تم تنہا کتنے فرعونوں سے لڑو گے؟"

"آج میں تنہا لگتا ہوں لیکن جلد ہی آپ رفتہ رفتہ اس ملک کے عوام کو میرے ساتھ دیکھیں گے۔ میں نے کیٹی بندر کا خفیہ معاہدہ اور ان تین لڑکیوں کا کیس بار ایسوسی ایشن اور تمام اخبارات تک پہنچا دیا ہے اور اب نتائج کا انتظار کر رہا ہوں۔"

دوسری صبح کیٹی بندر کے سلسلے میں کئی اخبارات نے خبریں شائع کیں۔ وہ اخبارات جن کا تعلق اپوزیشن سے تھا یا وہ اخبارات جو غیر جانبدار تھے اور ہر حکومت کے دور میں سچی اور کھری باتیں لکھتے تھے' انہوں نے کیٹی بندر کے خفیہ معاہدے کی عکسی تحریر کے ساتھ خبریں شائع کی تھیں۔ ان مظلوم لڑکیوں کے سلسلے میں تھرکی پولیس اور انتظامیہ کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔

پھر ہر روز ایسوسی ایشن کے وکلا اور اپوزیشن پارٹی کے لیڈروں کے تلخ و تند بیانات

شائع ہونے لگے۔ اپنے مخالفین کے جو ڈھکے چھپے کرتوت تھے' انہیں منظرِ عام پر لانے لگے اور مطالبہ کرنے لگے' اعتماد کا ووٹ لیا جائے یا نئے انتخابات کرائے جائیں۔

جب لوٹ کھسوٹ اور بے حیائی انتہا کو پہنچتی ہے تو ملک میں سیاسی تبدیلی لازمی ہوجاتی ہے۔ یہ تبدیلی اپوزیشن کے مطالبات اور مرضی سے نہیں ہوتی اور نہ ہی عوام کے احتجاج سے ہوتی ہے کیونکہ عوام کا اپنا مضبوط اتحاد نہیں ہوتا۔ یہاں سیاسی تبدیلی اسی وقت عمل میں آتی ہے جب کوئی خفیہ ہاتھ چاہتا ہے۔ حکومت تبدیل کرنے کے لیے پاکستان کے پہلے وزیرِاعظم لیاقت علی خان کے قتل سے لے کر جنرل ضیاء الحق کے حادثے تک خفیہ ہاتھ کی کارفرمائی رہی ہے۔ دنیا والے ازل سے جانتے ہیں کہ خفیہ ہاتھ کس قدر مستحکم ہوتا ہے کہ پچاس برس گزرنے کے بعد بھی پاکستانی حکمرانوں کے قتل ہونے' پھانسی چڑھنے اور حادثاتی موت مرنے کے اصل راز سے نہ کبھی پردہ اٹھتا ہے اور نہ کسی کو پردہ اٹھانے کا موقع دیا جاتا ہے۔

خفیہ ہاتھ نے اپنی ایک انگلی کے اشارے سے کاشف اکبر کو طلب کیا۔ پردے کے پیچھے دھند ہی دھند تھی کبھی کوئی خدا کا نیک بندہ آئے گا تو وہ دھند چھٹے گی۔ فی الحال کوئی سمجھ نہیں سکتا تھا کہ پردے کے پیچھے کیا ہوتا رہتا ہے۔

اشاروں کی زبان کو بین الاقوامی زبان کہا جاتا ہے اور یہ زبان دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے ذریعے اپنا مدعا بیان کرتی ہے۔ خفیہ ہاتھ نے کہا۔ "کاشف اکبر! چالاک مجرم اپنے پیچھے قدموں کے نشانات نہیں چھوڑتے مگر تم اپنی بے پروائی سے ایسے نشانات چھوڑتے آئے ہو کہ ہم تمہیں تحفظ نہیں دیں گے تو اس ملک کی اپوزیشن' قانون داں اور دانشور تمہارا محاسبہ کریں گے۔ تم سے کیٹی بندر' تھرمل پاور اور اسٹیل ملز میں ہونے والے گھپلوں کا حساب لیں گے۔ تم نے اپنے لیے اور اپنے چمچوں کے لیے قومی خزانے سے اربوں کے جو قرضے لیے ہیں' ان کی واپسی کا مطالبہ کریں گے۔ تمہارے سیاسی حمایتی اس لیے وہ قرضے واپس نہیں کریں گے کہ تم نے اسمبلی میں اپنی تعداد بڑھائے رکھنے کے لیے رشوت کے طور پر وہ قرضے انہیں قومی خزانے سے دلائے تھے۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "کامیاب سیاست کے لیے لازمی ہے کہ ہم اپنی کرپشن کو چھپائے رکھیں۔ میں نے بھی یہی کوشش کی تھی لیکن ہیرالڈ جان کی غلطی سے وہ اہم خفیہ معاہدہ منظرِ عام پر آگیا ہے۔"

"ہم نے سنا ہے کہ کوئی پُراسرار شخص خود کو وہ کہتا ہے' اسی نے وہ معاہدہ چرایا تھا۔ تمہاری پولیس' انتظامیہ' انٹیلی جنس والے اور خفیہ ایجنسی والے اس پُراسرار شخص کو

گرفتار کرنے میں ابھی تک ناکام رہے ہیں۔ اگر وہ گرفتار ہوجاتا تو آج ہم تمہیں طلب نہ کرتے۔ اپنی طلبی کا مطلب سمجھتے ہو؟"

"جی ہاں۔ اقتدار سے محرومی' لیکن ایک التجا ہے۔ اگر مجھے نقصانات پورے کرنے کی مہلت دی جائے تو میں مہنگائی اور ٹیکس بڑھا کر ورلڈ بینک کا قرضہ قسطوں میں ادا کرتا رہوں گا۔"

"بات صرف قرضے کی ادائیگی کی نہیں ہے۔ کیٹی بندر کا خفیہ معاہدہ' منظر عام پر آنے کے باعث ایران' افغانستان' وسطی ایشیا کے اسلامی ممالک یہ خطرہ محسوس کر رہے ہیں کہ پاکستان کی ساحلی زمین پر امریکی فوجی اڈا قائم ہوسکتا ہے تاکہ امریکا اس ساحلی اڈے سے افغانستان اور ازبکستان کے راستے چین کے مدمقابل آجائے اور ایران اس سے چند سو کلو میٹر کے فاصلے پر رہے۔ تم لوگوں کی کوتاہی سے ہمارے منصوبے خاک میں مل رہے ہیں۔ للہٰذا فی الحال تمہاری چھٹی کی جا رہی ہے۔"

کاشف اکبر سر جھکائے اپنی سزا سنتا رہا۔ اس سے کہا گیا۔ "ہم تمہیں اپنی طرف سے مہلت نہیں دیں گے لیکن نئی حکومت کے قیام کے لیے تم انتخابات لڑ سکتے ہو۔ ہمارا دستِ شفقت دوسرے سیاست داں کے سر پر رہے گا۔ وہی حکومت بنائے گا لیکن سیاسی منظر میں رہنے کی خاطر اقتدار کے لیے لڑو گے۔ اب جاؤ۔"

وہ چلا گیا۔ خفیہ ہاتھ نے دوسرے سیاست داں مرزا نیک بخت کو طلب کیا۔ نیک بخت نے حاضر ہو کر کہا۔ "خداوند سیاست کا اقبال بلند ہو۔ آپ ہمیشہ سپر پاور رہیں۔ بندہ حاضر ہے۔"

"کیا معاہدہ مکمل کر کے لائے ہو؟"

"آپ کنگ میکر ہیں۔ آپ کا اشارہ ہی کافی ہے۔ یہ معاہدہ حاضر ہے۔"

"پڑھ کر سناؤ۔"

وہ کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر معاہدے کی فائل کھول کر پڑھنے لگا۔ اس معاہدے کا متن کچھ یوں تھا۔

"میں پورے ہوش و حواس میں رہ کر یہ لکھ رہا ہوں کہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد خفیہ ہاتھ کی پالیسیوں پر عمل کرتا رہوں گا۔ میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کو خفیہ ہاتھ سے متصادم نہیں ہونے دوں گا۔ سابقہ حکمران کی غلطیوں کی تلافی کروں گا اور کیٹی بندر کے خفیہ معاہدے کو سرد خانے میں ڈال دوں گا پھر خارجہ پالیسی کو ایک نئی شکل دے کر کیٹی بندر کے قریب فروخت شدہ علاقے کو امریکی فوجی اڈا بنانے کا موقع بڑی رازداری

سے فراہم کروں گا۔

ہر دورِ حکومت میں قرضے لیتے لیتے پاکستان کو گروی رکھ دیا گیا ہے۔ میں بھی یہ روایت قائم رکھتے ہوئے مزید قرضے لوں گا تاکہ قرضے ادا نہ کرنے کے باعث پاکستان ہمیشہ خفیہ ہاتھ کے دباؤ میں رہے اور اس کی مرضی کے مطابق خارجہ پالیسیوں پر عمل کرتا رہے.........."

مرزا نیک بخت وہ معاہدہ پڑھتا رہا اور خفیہ ہاتھ توجہ سے سنتا رہا۔ معاہدہ اس کی مرضی کے مطابق تھا اس لیے دونوں نے اس پر دستخط کر دیئے۔ اس معاہدے کی ایک فائل خفیہ ہاتھ نے اپنے پاس رکھی اور دوسری کاپی مرزا نیک بخت نے لے کر اس سے مصافحہ کیا۔ بڑا مشکور و ممنون ہو کر اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا عمارت سے باہر آیا۔ باہر اس کی بلیک مرسڈیز کھڑی تھی۔ اس کے آگے پیچھے مسلح گارڈز کی گاڑیاں تھیں۔ ایک گارڈ نے اس کے لیے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ اس سیٹ پر ایک حسین و جمیل لیڈی سیکریٹری انیلا بانو بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ دروازہ بند ہوگیا پھر وہ گاڑی محافظوں کے سائے میں چل پڑی۔

انیلا بانو اگرچہ ایک پرسنل سیکریٹری تھی لیکن حسن کا اپنا ایک رعب اور دبدبہ ہوتا ہے۔ وہ احکامات کی تعمیل کرنے والی سیکریٹری نہیں' بلکہ احکامات صادر کرنے والی ملکہ عالیہ دکھائی دیتی تھی۔ مرزا نیک بخت کی سیاسی شخصیت جتنی بھاری بھر کم تھی' اتنی ہی وہ شاہانہ ناز و انداز کی حامل تھی۔ وہ کم گو تھی۔ اس کی خاموشی میں اس کے بدن کا حسن بولتا رہتا تھا اور معنویت سے بھرپور ادائیں اس طرح پکارتی رہتی تھیں کہ نیک بخت بے اختیار بدبخت بن کر اس کی طرف کھنچتا چلا جاتا تھا۔

اس وقت بھی اس کی باوقار خاموشی نیک بخت کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ کامیابی کے نشے میں مست تھا اور مستی میں بہکنا چاہتا تھا لیکن ڈرائیور' سیکورٹی افسر اگلی سیٹوں پر تھے۔ وہ اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا اس لیے معاہدے کی فائل کو گود میں بٹھا کر سہلا رہا تھا۔

سفر دیر تک جاری رہا پھر وہ گاڑیاں ایک محل نما عالی شان کوٹھی کے احاطے میں پہنچ کر رک گئیں۔ وہاں اس کے مشیر اور حواری استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک مشیر اور ایک حواری نے آگے بڑھ کر پچھلی سیٹ کے دونوں دروازے کھولے۔ انیلا بانو اور مرزا نیک بخت باہر آئے۔ مشیروں نے اسے مبارک باد دی۔ ایک نے کہا۔ "آپ کی کامیابی یقینی تھی اور آپ فاتح بن کر آئے ہیں۔"

نیک بخت نے انیلا بانو کے ساتھ کوٹھی میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ "آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں نے اس ملک کو فتح کرلیا ہے' جبکہ میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا ہے۔"

"جناب! آپ دو فائلیں لے کر گئے تھے اور ایک فائل دے کر آرہے ہیں' اس کا مطلب ہے' معاہدہ منظور ہوچکا ہے اور دوسری فائل انہوں نے رکھ لی ہے۔"

مرزا نیک بخت نے مسکرا کر کہا۔ "ہاں۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ آپ چاروں نے مشیر ہونے کا حق ادا کیا ہے ایسا مکمل اور جامع سیاسی معاہدہ تیار کیا تھا کہ اس کے ایک لفظ پر اعتراض نہیں کیا گیا۔ آپ سب انعامات کے مستحق ہیں۔ میں تم لوگوں کو مالا مال کردوں گا۔"

انیلا بانو کوٹھی کے اندرونی حصے میں جاچکی تھی۔ دوسرے مشیر نے رازداری سے کہا "جناب عالی! انیلا بانو کے ماں باپ اور خاندان والے اسے تلاش کررہے ہیں۔ اس کا باپ یہاں بھی آیا تھا۔"

"آپ نے اسے کیا کہا؟"

"ہم نے سیدھا سا جواب دے دیا کہ اس نے ملازمت چھوڑ دی ہے۔ یہاں نہیں آتی ہے۔ دو دن پہلے وہ اپنے گھر والوں سے کہہ کر آئی تھی کہ استعفیٰ دینے جارہی ہے۔ اس کے باپ کو یقین آگیا کہ وہ استعفیٰ دے کر یہاں سے جاچکی ہے لیکن........."

"لیکن کیا.........؟"

"ابھی ایک گھنٹا پہلے اس کا بھائی فون پر بکواس کررہا تھا۔"

"کیا کہہ رہا تھا؟"

"یہی کہ آپ کے آدمیوں نے انیلا بانو کو اغوا کرکے کہیں چھپا دیا ہے۔"

"اسے وارننگ دو کہ آئندہ میرے خلاف ایسی بے ہودہ باتیں کرے گا تو اسے حوالات میں پہنچا دیا جائے گا۔ اب تو پولیس والے میرے تابعدار بن کر رہیں گے۔"

دوسرے مشیر نے کہا۔ "سر! اس میں شبہ نہیں ہے کہ آپ وسیع اختیارات حاصل کرنے والے ہیں لیکن اس سے پہلے ہم کاشف اکبر کی کرپشن کے خلاف ایک بہت بڑا جلسہ کرنے والے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کاشف اکبر اس کے بھائی کو اپنی امان میں لے کر آپ کا اور انیلا بانو کا اسکینڈل بنادے۔"

"شہنشاہ اکبر اعظم کے نورتن تھے۔ آپ میرے رتن ہیں۔ کاشف اکبر کے زہر اگلنے سے پہلے اس کا توڑ کریں۔"

"فی الحال اس کا توڑ یہی ہے کہ آپ انیلا بانو کو یہاں سے دور کسی پہاڑی مقام پر پرائیویٹ بنگلے میں پہنچا دیں۔"

تیسرے مشیر نے کہا۔ "سیاسی چالیں بدلنے سے بنتا ہوا مقصد بگڑ جاتا ہے پھر عورت کو بگڑتے اور منہ پھیرتے کتنی دیر لگتی ہے۔"

مرزا نیک بخت نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "وہ ایسی نہیں ہے۔ میرے ساتھ راضی خوشی رہنے آئی ہے۔ وہ میرے خلاف اسکینڈل بننے نہیں دے گی۔"

"خدا کرے آپ کا اعتماد سلامت رہے لیکن احتیاط لازم ہے۔"

مرزا نیک بخت نے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ میں آپ کے مشوروں پر غور کروں گا فی الحال آپ حضرات آرام فرمائیں۔ صبح ملاقات ہوگی۔"

وہ ان سے رخصت ہوکر ایک شاہانہ طرز کی خواب گاہ میں آیا۔ باتھ روم کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ شاور سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ اس نے مسکرا کر کچھ سوچا۔ وہ معاہدے کی فائل کو بستر پر پھینک کر ایک کیبنٹ شوکیس کے پاس آیا۔ شیشوں کے اندر امپورٹڈ شراب کی بوتلیں پکار رہی تھیں۔ اس نے کیبنٹ کو کھول کر ایک بوتل اور شیشے کا ایک نازک سا جام نکالا پھر اپنے لیے ایک پیگ بناتے ہوئے بولا۔ "جانِ من! آج بہت بڑی کامیابی حاصل کرنے کے بعد تمہاری خاموشی گراں گزر رہی ہے۔ بولنے کو جی نہ چاہے تو کچھ گنگناؤ۔ اس خواب گاہ کی جنت میں دلاسا دو کہ یہ جنت میری حور سے خالی نہیں ہے۔"

اس نے پہلا پیگ خالص پیا۔ پانی یا سوڈا نہیں ملایا۔ خالص شراب انگاروں کی طرح سلگتی ہوئی اس کے حلق سے اتری۔ ذرا تکلیف ہوئی لیکن مسرتوں کے ہجوم میں خود کو تکلیف پہنچانے کی مستی ایک مزہ دیتی ہے۔

باتھ روم سے ایک مدھر آواز ابھرنے لگی۔ ایک مترنم گنگناہٹ سنائی دینے لگی۔ اس نے مسکراتے ہوئے دوسرا پیگ بنایا۔ پھر اس پیگ کو فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا "شتاب آکہ نہیں تاب اب جدائی کی۔"

اس نے جام کو ہونٹوں سے لگایا پھر ایک گھونٹ پی کر کہا۔ "شراب ایک حسینہ کے لبوں کی طرح جلاتی ہے مگر خوب بہلاتی ہے۔ اب آ بھی جاؤ۔"

دوسرا پیگ ختم ہوگیا مگر وہ نہیں آئی۔ شاور سے پانی گرنے کی آواز کے ساتھ رس بھری گنگناہٹ سنائی دیتی رہی۔

وہ تیسرا پیگ پینے لگا۔ کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کی عادت پڑ جائے تو خالص

چیز آسانی سے ہضم نہیں ہوتی۔ ہضم ہونے کے دوران پریشان کرتی ہے۔ وہ خالص وہسکی پی رہا تھا۔ کامیابی انجوائے کرنے کے لیے خوب مستی میں آنا چاہتا تھا اور وہ معمول کے خلاف بدمست ہو رہا تھا۔ شراب کی گرمی دماغ پر چڑھ رہی تھی اور نشہ ہوش اُڑا رہا تھا۔

جب وہ باتھ روم سے نکلی تو اس کے صاف و شفاف بدن پر پانی کے قطرے شبنم کے موتیوں کی طرح لرز رہے تھے۔ بدن کی چاندنی صرف ایک تولیے میں لپٹی ہوئی تھی۔ ایسا نظارہ آنکھ والے دیکھتے ہیں۔ نیک بخت کی آنکھیں نشے کے باعث دھندلا رہی تھیں۔ وہ جھومتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک کی دو نظر آرہی تھی۔ دونوں ایک ادائے ناز سے چلتی ہوئی اس کے قریب آئیں۔ اس نے ڈگمگاتے ہوئے ایک کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ ہاتھ کو سہارا نہ ملنے کے باعث وہ گرنے والا تھا۔ انیلا نے اسے تھام لیا۔ بستر کے سرے پر بٹھا کر کہا۔ "میں تمہارے لیے پیگ بناتی ہوں۔"

وہ لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولا۔ "ابھی نہیں۔ پہلے میں تمہاری شراب پیوں گا۔ آج ہماری جشن کی رات ہے۔"

"آپ میرے ہاتھوں سے دو پیگ ضرور پیتے ہیں۔ کیا اتنی بڑی کامیابی کے موقع پر انکار کریں گے؟"

"کبھی نہیں۔ میں ضرور تمہارے ہاتھ سے پیوں گا مگر تم بہت وہ ہو۔ مجھ سے کتراتی رہتی ہو۔"

"آپ بھی کتراتے ہیں۔ آپ نے مجھے کیا دیا ہے؟ صرف ایک کوٹھی اور پانچ لاکھ روپے کا بینک بیلنس۔ کیا اس سے زندگی گزر جائے گی؟"

"میں کیا کروں؟ دوسری شادی کروں گا تو میرے بیوی بچے جاہل عوام کی نظروں میں مظلوم بن جائیں گے۔ مجھ جیسے قوم کے راہنما کو ظالم نہیں کہلانا چاہیے۔"

"میں نہیں کہتی کہ مجھ سے شادی کریں۔ میں اپنے مستقبل کی سیکورٹی چاہتی ہوں۔ آپ نے ساتھ چھوڑ دیا تو میں کہاں جاؤں گی؟ میں تعلیم یافتہ ہوں۔ اونچے خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ بازاری نہیں ہوں کہ آپ کے بعد کسی دوسرے کی داشتہ بن جاؤں گی۔"

اس نے شیشے کے جام کو اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ وہ ایک گھونٹ پی کر بولا۔ "میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا۔"

"یہ سیاست داں کا وعدہ ہے۔ کسی عاشق کا وعدہ ہوتا تو یقین کر لیتی۔"

"یقین کرو۔ میں نے تمہارے سوا آج تک کسی کو راز دار نہیں بنایا۔ میرے سیف

کالاک نمبر صرف تم جانتی ہو۔"

وہ اٹھ کر ڈگمگاتے ہوئے فائل کو اٹھاتے ہوئے بولا۔ "یہ سب سے اہم اور خفیہ معاہدہ ہے۔ کسی دشمن کے ہاتھ لگ جائے گا تو میں دو کوڑی کا ہو جاؤں گا۔ اندازہ کرو' میں تم پر کتنا بھروسا کرتا ہوں۔ یہ لو۔ اسے سیف میں رکھ دو۔"

نیک بخت نے اس کے ہاتھ سے جام لیا۔ وہ فائل لے کر سیف کے پاس آگئی۔ اسے مخصوص نمبروں کی ترتیب سے کھولنے لگی۔ وہ غٹاغٹ......... جام خالی کرنے کے بعد بولا۔ "تم بڑی وہ ہو۔ میں منع کرتا ہوں مگر تم ڈبل پیگ بنا کر دیتی ہو۔ تم کیا سمجھتی ہو' میں نشے میں آؤٹ ہو جاؤں گا؟ ہرگز نہیں' کبھی نہیں.........."

وہ قریب آکر اس کے ہاتھ سے خالی جام لے کر بولی۔ "ابھی میرے ہاتھ کا دوسرا پیگ باقی ہے۔"

وہ کھڑا ہوا تھا۔ توازن قائم نہ رکھ سکا۔ بستر پر گرتے ہوئے بولا۔ "بس کرو۔ تم۔ آ جاؤ۔"

وہ ڈبل پیگ بنا کر لے آئی پھر بولی۔ "نکاح نامہ ایک معاہدہ ہوتا ہے۔ میاں بیوی کو ایک دوسرے کا پابند بناتا ہے۔ آپ مجھ سے یہ معاہدہ نہیں کریں گے لیکن میں اپنے مستقبل کے لیے آپ سے کوئی معاہدہ ضرور کروں گی۔"

وہ دونوں ہاتھوں کے سہارے اُٹھتے ہوئے' توازن قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "یہ۔ ایسی با۔ باتوں کا ٹائم نا ہی ہے۔ میرے پا۔ پاس آؤ۔"

وہ ہاتھ بڑھا کر بولی۔ "جام آگے ہے۔ میں پیچھے ہوں۔ پہلے جام لیں پھر مجھ سے کام لیں۔"

اس نے جام کو اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ پینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر اسے جبراً پلانے لگی۔ نیک بخت نے ایک ہاتھ مارتے ہوئے جام کو ایک طرف پھینک دیا۔ پھر جام کے ساتھ ہی بستر پر گر پڑا۔ بڑبڑانے لگا۔ بڑبڑاہٹ میں اتنی لکنت تھی کہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

وہ سمجھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ ذرا دور جا کر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ پریشانی سے سوچنے لگی۔ "گھر چھوڑے ہوئے آج تیسرا دن ہے۔ بھائی اور ماں باپ پریشان ہوں گے۔ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ مجھے آج نہیں تو کل گھر والوں کو اور دنیا والوں کو جواب دینا ہوگا اور میں جواب دوں گی کہ داشتہ بن کر ہارنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ ہار کر بھی جیتنا اور نیک نام رہنا جانتی ہوں۔"

نیک بخت کے خراٹے سنائی دینے لگے۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ بستر کے قریب آکر اسے گہری نیند میں دیکھا پھر سیف کے پاس آئی۔ مخصوص نمبروں کی ترتیب سے سیف کو کھولا۔ خفیہ اہم معاہدے کی فائل اوپر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے فائل کو کھول کر اندر کے کاغذات نکالے۔ کاغذات کو سیف کے اوپر رکھا۔ خالی فائل کو سیف کے اندر رکھا پھر اسے پہلے کی طرح لاک کردیا۔ الماری کھول کر ایک لباس نکال کر اسے پہن لیا۔ سیف کے اوپر رکھے ہوئے کاغذ کو اچھی طرح تہہ کرکے اسے گریبان کے اندر چھپالیا۔ یہ سب کچھ وہ بڑے اطمینان سے اور بڑے اعتماد سے کرتی رہی۔ پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرکے سیکورٹی افسر سے بولی۔ ”ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کو کہو۔ میں ڈاکٹر کے پاس جاؤں گی۔“

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ الماری سے پرس نکال کر اس میں رقم دیکھی۔ ایک چھوٹے سے کاغذ پر دو تین دواؤں کے نام لکھے۔ پھر انہیں پرس میں رکھ کر خواب گاہ سے باہر آئی۔ کوٹھی بہت وسیع و عریض تھی۔ وہ مختلف راہداریوں سے گزرتی ہوئی باہر آئی۔ پورچ میں بلیک مرسڈیز تھی۔ ڈرائیور نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ سیکورٹی افسر نے پوچھا۔ ”صاحب آپ کے ساتھ نہیں جائیں گے؟“

”وہ تھکے ہوئے ہیں۔ آرام کر رہے ہیں۔ میں ابھی آجاؤں گی۔“

سیکورٹی افسر نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”صاحب نے کہا ہے۔ آپ کو کہیں تنہا نہ جانے دیا جائے۔“

”انہوں نے میری حفاظت کے لیے ایسا کہا ہے۔ تم ان کے خاص باڈی گارڈ ہو۔ تمہیں یہاں رہنا چاہیے۔ میرے ساتھ دوسرا گارڈ جائے گا۔“

سیکورٹی افسر نے مطمئن ہو کر ایک گارڈ کو اس کے ساتھ جانے کا حکم دیا۔ وہ گارڈ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پھر کار اسٹارٹ ہو کر وہاں سے جانے لگی۔

مرزا نیک بخت نے اپنی حفاظت کے لیے اور بھی خفیہ انتظامات کر رکھے تھے۔ چھ جاسوس تھے۔ جو باری باری دن رات کوٹھی کے باہر موجود رہتے تھے۔ مرزا نیک بخت کہیں جاتا تھا تو وہ سادہ لباس میں ایک کھلی جیپ میں اس کا تعاقب کرتے تھے تاکہ مخالفین کے ناگہانی حملوں کے وقت وہ اپنے مالک کے لیے ڈھال بن سکیں۔ نیک بخت نے انہیں انیلا بانو کے بارے میں بھی تاکید کی تھی کہ وہ تنہا کہیں جائے تو اس کا تعاقب کیا جائے۔ اگر وہ واپس نہ آئے تو اسے فرار ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔

جیپ میں تعاقب کرنے والے جاسوس نے موبائل فون کے ذریعے سیکورٹی افسر سے پوچھا۔ ”بی بی جی تنہا کہاں جارہی ہیں؟“

”ڈاکٹر کے پاس جارہی ہیں۔ وہاں سے انہیں کوٹھی میں واپس آنا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم انہیں واپس لے آئیں گے۔“

انیلا بانو کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی فرار ہونے کے منصوبے پر غور کر رہی تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اسے کار میں کتنی دور تک جانا ہے۔ وہ ایک چھوٹی سی مارکیٹ سے گزرتے وقت پرس میں سے ایک پرچی نکال کر گارڈ سے بولی۔ ”آگے دوسری گلی میں میڈیکل اسٹور ہے۔ وہاں سے یہ دوائیں لے آؤ۔“

اس نے پرچی اور روپے دیے۔ مارکیٹ کی گلیاں تنگ تھیں۔ کار نہیں جاسکتی تھی۔ وہ مین روڈ پر رک گئی۔ گارڈ کار سے نکل کر ایک گلی سے گزر کر دوسری گلی میں گیا۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ”اوہ میں بھول گئی۔ تم فوراً جاؤ اور گارڈ سے کہو۔ اسپرین کی چند گولیاں بھی لے آئے۔“

ڈرائیور حکم کی تعمیل کے لیے گیا۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی وہ دروازہ کھول کر مارکیٹ کی مخالف سمت ایک گلی میں بھاگتی چلی گئی۔ وہ دو جاسوس جیپ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے بھاگتے دیکھ کر جیپ اسٹارٹ کرکے اس کا تعاقب کرنے لگے۔ انہوں نے گلی میں داخل ہو کر دیکھا۔ وہ دوڑتی ہوئی دوسری گلی میں مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی۔

آگے گلی تنگ تھی۔ وہ دونوں جیپ سے اتر کر دوڑنے لگے۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں ایک دوسرے کو دیکھا جاسکتا تھا لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ آگے وہ گلی دو حصوں میں تقسیم ہو کر دو سمتوں میں جا رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو کر ایک ایک گلی میں دوڑتے گئے۔ دور جاکر بھی وہ نظر نہیں آئی لیکن دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

وہ آوازوں کی سمت دوڑنے لگا۔ ایک گلی کے موڑ پر پہنچ کر وہ اس سے کافی دور تھی۔ اس نے دوڑتے ہوئے ریوالور نکالتے ہوئے دھمکی دی۔ ”رک جاؤ۔ ورنہ گولی ماردوں گا۔“

اسی وقت ایک بھاری بھرکم موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ انیلا بانو گھبرا گئی۔ پیچھے سے ریوالور والا آرہا تھا۔ آگے سے ایک دشمن موٹر سائیکل پر چلا آرہا تھا۔ جاسوس اس کے ایک پیر میں گولی مار کر اسے فرار ہونے سے باز رکھ سکتا تھا۔ اس نے ایک پیر کا نشانہ

لیا۔ اسی وقت وہ ٹھوکر کھا کر گری۔ جس گولی کو پیر میں لگنا چاہیے تھا' وہ اس کے شانے میں لگی۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

اس کے ساتھ ہی رات کے سناٹے میں دوسری گولی چلنے کی آواز گونجی۔ اس بار جاسوس کے حلق سے چیخ نکلی۔ وہ اچھل کر زمین پر گرا پھر تڑپ کر ہمیشہ کے لئے ساکت ہوگیا۔ فائرنگ اور چیخوں کی آواز سن کر آس پاس کے گھروں کی لائٹس آن ہو رہی تھیں۔ پڑوسی ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ ان کی گلی میں فائرنگ ہو رہی ہے لیکن کوئی باہر نکلنے کا حوصلہ نہیں کر رہا تھا۔

وہ انیلا بانو کو دونوں بازوؤں میں اٹھا کر موٹر سائیکل پر آیا۔ اسے اپنے سامنے بٹھا کر ایک ہاتھ سے سنبھالتے ہوئے اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی پھر تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا' وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔

☆========☆========☆

تھر کے علاقوں میں جتنے بڑے اور با اثر وڈیرے تھے' ان میں وڈیرا کمال صالح تھر کے چھاچھرو ٹاؤن سے اسلام آباد تک زبردست اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ اس کے حلقہ انتخاب میں مسلمان ووٹروں کے مقابلے میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ ہندو سیاسی اعتبار سے اقلیت کہلاتے تھے۔ اس اقلیت کی نمائندگی کے لیے جو ہندو امیدوار کامیاب ہو کر اسمبلی میں جاتا تھا' اسے وہاں کے مسلمان بھی ووٹ دیتے تھے کیونکہ وہ تمام مسلمان' وڈیرا کمال صالح کے زیر اثر رہتے تھے۔ باپ دادا کے زمانے سے اس کے کھیتوں اور قالین کے کارخانوں میں مزدوری کرتے آئے تھے۔ ہندو بنیئے تھر کی تجارت اور زراعت پر چھائے ہوئے تھے۔ کمال صالح کے ذریعے مٹھی' ننگر پارکر' اسلام کوٹ اور چھاچھرو جیسے شہروں پر ان کی حکمرانی تھی۔

کمال صالح کی نگرانی میں وہ تھر سے چاول' چینی اور گندم اسمگل کرتے تھے اور بھارت کے سرحدی علاقے راجستھان سے پان اور بیڑی کے مخصوص تمباکو پتوں کے علاوہ دہشت گردوں کو اپنے گھروں میں بلا کر پناہ دیتے تھے پھر انہیں وہاں سے پاکستان کے مختلف علاقوں میں بھیج دیتے تھے۔

تھر اور راجستھان کی سرحد کے قریب ایک چھوٹی سی بستی تھی' وہاں ستر اسّی کچے پکے مکانات تھے۔ کمال صالح اور لالہ دھرم داس اکثر شام کو ایک بڑے سے مکان میں جا کر راتیں گزارتے تھے۔ تاکہ ان کی نگرانی میں سرحد پار اسمگلنگ ہو سکے۔ کبھی کبھی راز داری سے یہ خبر موصول ہوتی تھی کہ دو چار دہشت گرد پاکستان میں داخل ہونے والے

ہیں۔ ان دہشت گرد اور تخریب کاروں کو بحفاظت پاکستان کے اندرونی علاقوں میں پہنچا دیا جائے۔

ایک رات ایسے ہی دو دہشت گرد اور تخریب کار سرحد پار کر کے کمال صالح کی اوطاق میں آئے۔ لالہ دھرم داس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر انہیں نمستے کیا۔ ان میں سے ایک نے جواباً کہا۔ "لالہ! میں ہندو نہیں مسلمان ہوں۔ میرا نام مراد علی ہے۔ میں پاکستانی ہوں۔ بھارت کے تربیتی کیمپ میں ٹریننگ حاصل کرنے گیا تھا۔ ایک پاکستانی کی حیثیت سے میرے پاس شناختی کارڈ اور تعلیمی سرٹیفکیٹس موجود ہیں۔"

تھر کی پولیس اگرچہ پاکستانی سرکار سے تنخواہ لیتی ہے لیکن وہ وہاں کے وڈیروں کی ذاتی فورس کے طور پر کام کرتی ہے۔ وہاں اوطاق میں لالہ دھرم داس' کمال صالح کے علاوہ ایک پولیس افسر بھی تھا۔ انہوں نے مراد علی کو دیکھا۔ وہ قد آور اور صحت مند تھا۔ اس کے ساتھ آنے والا قد میں اس سے کچھ کم تھا۔ وہ بولا۔ "میں ہندو ہوں لیکن یہاں میرا نام فیروز تابانی رہے گا۔ شناختی کارڈ وغیرہ کے لیے یہ میری تصویریں ہیں۔"

فیروز تابانی نے جیب سے تصویریں نکال کر میز پر رکھ دیں۔ پولیس افسر نے ان تصویروں کو اٹھا کر دیکھا پھر کہا۔ "لالہ! انہیں اپنے گھر بھیج دو۔ کل دوپہر تک فیروز تابانی کا شناختی کارڈ تیار ہو جائے گا۔ ویسے مسٹر تابانی! تم کچھ کم عمر اور کچے لگتے ہو۔ تم نے کیا ٹریننگ حاصل کی ہے؟"

تابانی نے کہا۔ "میری کم عمری اور معصومیت سے سب ہی دھوکا کھائیں گے۔ تمہاری اطلاع کے لیے کہہ دوں کہ مجھے اور مراد کو ٹائم بم اور پنسل بم بنانے میں مہارت حاصل ہے اور ہم بڑے خطرناک بموں کو ناکارہ بنانے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔"

مراد نے مسکرا کر کہا۔ "یہ تابانی تبت کا رہنے والا ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں' تبت کے باشندوں کی داڑھی مونچھیں برائے نام ہوتی ہیں۔ تابانی کے چہرے پر بھی داڑھی اور مونچھوں کی جگہ ہلکے ہلکے روئیں ہیں۔ روز شیو کرنے کے باعث کہیں کہیں بال اُگ آتے ہیں اس لیے یہ کلین شیو رہتا ہے۔"

افسر نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "بھئی برا نہ ماننا۔ میں مذاق کے موڈ میں کہہ رہا ہوں۔ تم بہت ہی چکنے چھوکرے لگتے ہو اور چکنائی میری کمزوری ہے۔"

تابانی نے مسکرا کر کہا۔ "اگر تم مجھ میں کشش محسوس کر رہے ہو اور تمہارا دل پشوری ہو رہا ہے تو تم مجھے گلے لگا سکتے ہو۔ میں مرد ہوں میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔"

افسر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر پوچھا۔ "کیا سچ کہہ رہے ہو۔"

"میں ہندو ہوں۔ یہاں پاکستان میں نہ جانے کتنی مسلمان شریف زادیوں سے فیض حاصل کروں گا۔ یہاں بہت کچھ حاصل کرنے کے لیے تمہیں رشوت کے طور پر اجازت دے رہا ہوں۔"

افسر نے قریب آکر اس کے چکنے چہرے کو چھو کر دیکھا۔ اس چکناہٹ پر ایک واہیات سا شعر پڑھا۔ پھر چومنے کے لیے اسے بازوؤں کی گرفت میں لینا چاہا۔ اسی وقت پیٹ پر ایک گھونسا پڑا۔ وہ کراہتے ہوئے تکلیف سے دوہرا ہو گیا۔ تابانی نے دوسرا گھونسا اس کے منہ پر مارا' وہ گھوم کر گر پڑا۔ اس نے اپنا بھاری بھرکم بوٹ والا ایک پیر اس کی گردن پر رکھ کر کہا۔ "بھارت سرکار تمہیں لاکھوں روپے اس لیے دیتی ہے کہ تم اپنی وردی سمیت ہمارے جوتوں کے نیچے رہو۔ آئندہ کیلے کے چھلکے پر پھسلنا۔ میری چکناہٹ پر پھسلنے آؤ گے تو تمہارا ٹرانسفر کرانے کے لیے یا تمہاری نوکری کھانے کے لیے وڈیرا کمال صالح کافی ہے۔"

اس نے گردن سے پاؤں ہٹایا۔ کمال صالح نے کہا۔ "اٹھو انسپکٹر! میں کئی بار تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ اپنی حد میں رہو۔ حد سے باہر سانس لینے کے لیے آکسیجن نہیں ملے گی۔"

وہ شرمندگی سے اٹھ کر وردی سے مٹی جھاڑتے ہوئے بولا۔ "میں جا رہا ہوں۔ فیروز تابانی صاحب کے لیے شناختی کارڈ کا انتظام کروں گا۔"

وہ تابانی سے نظریں چراتا ہوا چلا گیا۔ لالہ دھرم داس وہاں سے اٹھتے ہوئے تابانی اور مراد سے بولا۔ "میرے ساتھ آؤ۔ آج رات خوب کھاؤ پیو۔ آرام سے نیند پوری کرو۔ کل شام تک تم دونوں کو کراچی پہنچا دیا جائے گا۔ وہاں سے تم لاہور جاؤ گے۔ کہاں جاؤ گے؟ یہ کل بتایا جائے گا۔"

وہ دونوں لالہ کے ساتھ چلے گئے۔ کمال صالح نے اپنے کم دار سے کہا۔ "بوتل اور گلاس نکالو اور کچھ کھانے کے لیے لے آؤ۔"

کم دار نے دوڑتے بھاگتے' تیزی سے فرماں برداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ضرورت کی تمام چیزیں سامنے لا کر رکھ دیں پھر ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "شہر سے ایک تگڑا جوان آیا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا۔ اس کا نام راجہ نواز ہے۔ بڑا خطرناک جوان ہے۔ آپ کا تابعدار بن کر رہے گا۔"

"کہاں ہے وہ؟"

"باہر بیٹھا ہے۔ حکم ہو تو حاضر کروں۔"

کمال صالح نے بوتل کھول کر گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے "ہوں" کہا۔ کم دار باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان اس کے ساتھ آیا۔ نوجوان نے چست پتلون اور بنیان پہنی ہوئی تھی۔ اس چست لباس میں اس کا پہلوانی جسم نمایاں تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے ہوئے کہا۔ "جناب سالے صاحب! السلام علیکم۔"

وہ ایک دم بھنا کر بولا۔ "سالے نہیں صالح۔ میرا نام کمال صالح ہے۔"

وہ بولا۔ "میں نے انٹر پاس کیا ہے۔ جانتا ہوں' صواد سے صالح ہوتا ہے لیکن سنتے وقت ایسا لگتا ہے جیسے سین سے سالے کہا جا رہا ہے۔"

"نام لینے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے اعلیٰ حکام اور اونچے رتبے کے مطابق مجھے مخاطب کرو۔"

"سوری۔ میں تعلیم یافتہ ہوں۔ ہاتھ جوڑ کر حضور نہیں کہوں گا لیکن آپ میرا مسئلہ حل کر دیں گے تو میں بھی آپ کا بڑے سے بڑا خطرناک کام کر گزروں گا۔"

"مجھے بتایا گیا ہے کہ تم غنڈے موالی ہو پھر تعلیم یافتہ کیسے ہو؟"

"میرے غریب ماں باپ نے مجھے زبردستی دسویں جماعت تک پڑھایا۔ میں پہلے تعلیم کے ساتھ محنت مزدوری کرتا رہا۔ پھر چوری اور ہیرا پھیری سے زیادہ رقم ملنے لگی۔ فرسٹ ایئر میں پہنچنے تک میں نے لسانی فسادات میں دو قتل کیے۔ پانچ گاڑیوں کو فروخت کر کے مال بھی کمایا ہے۔"

"اب کیا چاہتے ہو؟"

"سیاست میں آنا چاہتا ہوں۔"

"کراچی میں کہاں رہتے ہو؟"

"اجمیر نگری میں۔"

"میں اپنی سیاسی پارٹی کے لیڈر کے نام خط لکھ دوں گا۔ وہاں سیاسی ہنگاموں کے دوران تمہاری کارکردگی دیکھی جائے گی۔ اس کے بعد.........."

راجہ نواز نے ہاتھ اٹھا کر قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتا ہوں مجھے اسٹوڈنٹس یونین کی سیاست میں حصہ لینے کا موقع دیا جائے۔ یعنی میں یونیورسٹی میں داخلہ چاہتا ہوں۔"

کمال صالح اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ راجہ نواز نے کہا۔ "آپ کے پارٹی لیڈر ایک پرچی لکھ کر دیں گے تو مجھے علمی صلاحیت پر نہیں' بدمعاشی کی بنیاد پر داخلہ مل جائے گا۔"

"ہوں۔ نوجوان ہو۔ اسٹوڈنٹ لگتے ہو بلکہ اسٹوڈنٹ ہو۔ انٹر سیکنڈ ایئر میں تمہاری پوزیشن کیا تھی؟"

"تعلیم کے ساتھ دہشت گردی جاری رہے تو امتحانات کے نتیجے میں کوئی گریڈ نہیں ملتا۔ پھر بھی ممتحن حضرات نے اکثر میرے ہاتھوں میں کلاشنکوف دیکھی ہے اس لیے مجھے اے گریڈ دے کر پاس کردیا ہے۔"

"ہوں۔ نوجوان ہو مگر اتنی وارداتیں کرچکے ہو کہ پتھر لگتے ہو۔ تمہارے ہاتھوں میں ہتھیار دیکھ کر ممتحن تو کیا' یونیورسٹی کے پروفیسر اور وائس چانسلر بھی تمہارے سامنے نہیں آئیں گے۔ مخالف اسٹوڈنٹس جماعتوں کو بھی دھونس میں رکھو گے؟"

"میرے حق میں اتنا کچھ سمجھ رہے ہیں تو پھر ایسی پرچی لکھ دیں کہ آپ کے پارٹی لیڈر کو بھی میری اہمیت معلوم ہو جائے۔"

"میں پرچی دوں گا مگر یہ یاد رکھو کہ میرا بیٹا جمال صالح یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹس یونین کا لیڈر ہے۔ طلبا کے درمیان جب بھی سیاسی ہنگامے ہوں گے اور گولیاں چلیں گی تو تم میرے بیٹے اور بیٹی نازاں کے باڈی گارڈ بن کر ان کی حفاظت کیا کرو گے۔"

"میں آپ کے حکم کے مطابق نازاں اور جمال صالح کی حفاظت کیا کروں گا لیکن آپ بیٹے کو سمجھا دیں کہ وہ میرے ذاتی معاملات میں کبھی مداخلت نہ کرے۔"

"وہاں تمہارے ذاتی معاملات کیا ہوسکتے ہیں؟"

"فی الحال تو ایک ہی سنجیدہ معاملہ ہے۔ میں یونیورسٹی کی ایک طالبہ سے محبت کرتا ہوں وہ میرے اور طالبہ کے درمیان کبھی دیوار نہ بنے۔"

"وہ مجھ جیسے وڈیرے کا بیٹا ہے' اونچے معاملات میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ تمہارے جیسے چھوٹے لوگوں کے معاملات سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی پھر بھی میں اسے فون پر تمہارے بارے میں سمجھا دوں گا۔"

کمال صالح نے گلاس سے چند گھونٹ پیے۔ پھر راجہ نواز کے لیے سفارشی خط لکھنے کے دوران میں بھی گھونٹ گھونٹ پیتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ بیٹا یونیورسٹی میں رہ کر سیاست داں بنے اور ایک دن اسمبلی میں پہنچے لیکن یونیورسٹی اور کالجوں میں کتابوں سے زیادہ اسلحے کا ذخیرہ رہتا تھا۔ سیاسی ہنگاموں کے دوران میں توڑ پھوڑ ہوتی تھی اور گولیاں چلتی تھیں۔ کمال صالح کو یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نازاں اور جمال صالح کو کبھی گولی لگ سکتی ہے۔ اس اندیشے کو کم کرنے کے لیے وہ راجہ نواز کو یونیورسٹی میں داخلہ دلا رہا تھا تاکہ وہ اس کی بیٹی اور بیٹے کا باڈی گارڈ بن کر رہے۔

اس نے پارٹی لیڈر کے نام ایک تفصیلی خط لکھا۔ راجہ نواز کی بھرپور سفارش کی پھر وہ خط اسے دیا۔ اس نے خط لے کر پڑھا۔ پھر خوشی سے اسے چوم کر دل میں کہا۔ "میری جان! میری نازاں! میں آرہا ہوں۔"

☆========☆========☆

جھگی کے اندر گہری خاموشی تھی۔ انیلا بانو ایک چارپائی پر بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ سرہانے رکھی ہوئی لالٹین کی روشنی میں اس کی قمیض کا اوپری حصہ لہو سے بھیگا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ گولی شانے کے گوشت کو ذرا سا ادھیڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔ وہ تکلیف اور دہشت کے باعث بے ہوش ہو گئی تھی۔

وہ دروازہ کھول کر موٹر سائیکل اندر لے آیا۔ موٹر سائیکل کے اگلے حصے کا رخ انیلا بانو کی طرف کرکے اسے کھڑا کیا۔ پھر ہیڈ لائٹ آن کردی۔ پورا کمرا جیسے دن کی طرح روشن ہوگیا۔ وہ گاڑی کے کٹ بیگ سے فوری طبی امداد کا سامان نکال کر انیلا کے پاس آکر اسے دیکھنے اور سوچنے لگا۔ قمیض کے اوپری حصے کو پھاڑے بغیر نہ لہو صاف کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی زخم کی مرہم پٹی ہوسکتی تھی۔

اس نے ایک قینچی سے زخم کے آس پاس کے کپڑے کو کاٹ کر الگ کیا۔ زخم پر لہو جم گیا تھا۔ وہ روئی بھگو کر اس حصے کو صاف کرنے لگا۔ تنہائی ہو۔ عورت کا گورا بدن ہو اور عورت اعتراض کرنے کے لیے ہوش میں نہ ہو تو دل بھی بہکتا ہے اور مسیحا کی نیت بھی بدلتی ہے لیکن وہ اپنی کھوپڑی میں پتھر کا دماغ اور سینے میں فولاد کا دل رکھتا تھا۔ حسین ترین عورتوں کو سرسری طور پر دیکھ کر گزر جاتا تھا۔ کبھی کسی کے حسن سے اور کسی کی شخصیت سے منفی انداز میں متاثر نہیں ہوتا تھا۔

اس نے زخم سے خون صاف کرکے اچھی طرح مرہم لگا کر اوپر روئی کی تہہ رکھی پھر اس پر کراس پٹیاں چپکا دیں۔ ابتدا میں لہو کافی بہہ گیا تھا۔ شانے سے لے کر سینے کے ابھار تک لباس لہو سے بھیگا ہوا تھا۔ اس لباس کو اتارنا اور بدن کے ان حصوں سے لہو صاف کرنا ضروری تھا۔ انہیں لہو کی بُو اور آلودگی میں چھوڑ دینا مناسب نہیں تھا۔

وہ کچھ پریشان ہوگیا۔ ایک خوب صورت جوان عورت کے اوپری جسم کو بے لباس کرنے کے خیال سے ہچکچاہٹ ہورہی تھی۔ آنکھیں ایسا نظارہ دیکھنے والی تھیں جسے پہلے کبھی ان حالات میں نہیں دیکھا تھا لیکن مجبوری تھی۔ ایک نیکی کرنے کے لیے اسے بدی سے لڑنا تھا۔ اس نے حوصلہ کرکے قینچی اٹھائی لباس کو شانے اور گریبان کی طرف سے کاٹتا ہوا سینے کے اُبھار تک آیا۔ اگر وہ آنکھیں بند کرکے کاٹنا چاہتا تو وہ قینچی سے زخمی ہو سکتی

تھی۔ حالات مجبور کر رہے تھے کہ وہ آنکھوں سے دیکھتا رہے۔

تب اچانک ہی اس کا ہاتھ ٹھٹک گیا۔ قینچی رک گئی۔ بریزر کے درمیانی حصے میں چند تہہ کیے ہوئے کاغذات دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے چٹکی سے پکڑ کر انہیں اٹھایا۔ کاغذات کا کچھ حصہ لہو سے بھیگا ہوا تھا۔ اس نے انہیں کھول کر دیکھا۔ ابتدائی تحریر سے پتا چلا کہ مرزا نیک بخت اور خفیہ ہاتھ کے درمیان کوئی معاہدہ ہوا ہے۔

اس نے آخری صفحہ دیکھا۔ تحریری معاہدے کے اختتام پر مرزا نیک بخت اور خفیہ ہاتھ کے دستخط تھے۔ وہ تجسس میں مبتلا ہو کر شروع سے آخر تک اسے پڑھتا چلا گیا۔ وہ تحریر ملک خداداد کے کئی حکمرانوں کی ہوس اقتدار کی منہ بولی تصویر تھی۔ وہ تحریر ایک آئینہ تھی۔ ووٹ دینے والے عوام اس آئینے میں اپنی تصویر دیکھتے تو پتا چلتا کہ سیاست داں ووٹ لینے کے بعد کس طرح ان کے منہ پر تھوکتے رہتے ہیں۔

اس نے دانت پیستے ہوئے ان کاغذات کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ بھینچنے کا انداز ایسا تھا جیسے وطن فروش سیاست دانوں کی گردنیں دبوچ رہا ہو۔ اس کے سامنے ایک حسین عورت نیم برہنہ تھی لیکن یہ شرم کی بات نہیں تھی کیونکہ وہ نیکی اور مسیحائی کے عمل سے گزر رہا تھا۔

اس نے کاغذات کو تہہ کرکے اپنے لباس کے اندر چھپالیا۔ پھر روئی کو بھگو کر اس کے بدن سے لہو پونچھنے لگا۔ ہوس پرستی کے پہلو سے وہ جذباتی لمحات تھے۔ بدن کی شادابی دیکھنے والے کو پکار رہی تھی لیکن اس کے دماغ میں اس معاہدے کی آندھیاں چل رہی تھیں۔

وہ انیلا بانو کے بارے میں اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ پچھلے تین دنوں سے لاپتا ہے۔ اس کے والدین اور رشتے دار اسے تلاش کر رہے ہیں۔ اس کا بھائی غصے میں مرزا نیک بخت کو الزام دے رہا ہے کہ اس نے اس کی بہن کو اغوا کرکے کہیں چھپا دیا ہے یا اسے ہلاک کردیا ہے۔ وہ صبح سے مرزا نیک بخت کی تاک میں تھا پھر اس نے انیلا کو شام کے وقت نیک بخت کی بلیک مرسڈیز میں دیکھا تھا۔ وہ رات کو اس کے ساتھ کوٹھی میں واپس آئی تھی۔ پھر تقریباً دو گھنٹے بعد اس کوٹھی سے نکل کر فرار ہونے کی کوشش کرتے ہوئے زخمی ہوگئی تھی۔

وہ اسے زخمی دیکھ کر اس کے صحیح حالات معلوم کرنے کے لیے اس جھگی میں لے آیا تھا۔ یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وطن عزیز کے خلاف کیا ہوا ایک اہم خفیہ معاہدہ اس کے ہاتھ آجائے گا۔ اس نے انیلا بانو کو دیکھا۔ اس کے بدن کا تمام خون آلودہ کپڑا

کاٹ کر اس نے حیا کا تقاضا پورا کیا تھا۔ اس حصے کو ایک چادر سے ڈھانپ دیا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ انیلا بانو وہ خفیہ معاہدہ چرا کر کہاں لے جارہی تھی؟ کیا وہ مرزا نیک بخت کی مخالف پارٹی کے لیے کام کررہی ہے؟

انیلا کے ہونٹوں پر ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی پھر اس کے منہ سے دھیمی سی آہ نکلی۔ وہ ہوش میں آرہی تھی۔ اس نے موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ بجھادی۔ جھگی کے اس کمرے میں تاریکی چھاگئی۔ اگرچہ لالٹین اب تک روشن تھی لیکن تیز روشنی اچانک بجھ جائے تو لالٹین کی لو ایک زرد دھبے کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ اس نے کراہتے ہوئے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ نیم روشنی میں جھگی کی چھت نظر آرہی تھی۔ اس نے ایک طرف سر گھما کر دیکھنا چاہا تو شانے کے زخم سے ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ تکلیف کے باعث اونچی آواز میں کراہنے لگی۔ اس نے دوسری طرف سر گھمایا۔ کچھ فاصلے پر ایک صندوق کے اوپر لالٹین رکھی ہوئی تھی۔ اس کی روشنی سے سمجھ میں آیا کہ وہ کسی جھگی میں ہے۔ زخم کی ٹیسوں نے یاد دلایا کہ کسی تعاقب کرنے والے نے اس پر گولی چلائی تھی۔ وہ ایک دم چکرا گئی تھی۔ اس گلی سے اٹھ کر بھاگنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ ان لمحات میں ہوش و حواس سے .... بیگانہ ہو رہی تھی۔ اس وقت کسی نے اسے دونوں بازوؤں میں اٹھایا تھا پھر اس نے ایک موٹر سائیکل کے اسٹارٹ ہونے اور چلنے کی آواز سنی تھی۔ اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا۔ اب ہوش میں آکر خود کو ایک جھگی میں دیکھ رہی تھی۔

اس نے اپنے ہاتھ کو آہستگی سے زخم پر رکھا۔ پتا چلا' زخم کی مرہم پٹی کی گئی ہے۔ اس حصے پر لباس محسوس نہیں ہوا۔ ذرا اِدھر اُدھر ٹٹولنے سے قمیص ہاتھ میں آئی۔ وہ کٹی ہوئی تھی۔ یہ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ مرہم پٹی کرنے کے لیے بدن کے اس حصے کو بے لباس کیا گیا ہے لیکن ایسا کس نے کیا ہے؟

چاروں شانے چت لیٹنے کے باعث وہ کمرا پوری طرح نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے تکیے سے ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر ایک موٹر سائیکل کھڑی ہوئی تھی۔ اس پر ایک شخص بیٹھا ہوا نظر آرہا تھا۔ لالٹین کی دھیمی زرد روشنی میں وہ واضح طور سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہاں روشنی کم اور تاریکی زیادہ تھی۔ اس تاریکی میں جھلکنے والا اجنبی پُراسرار لگ رہا تھا۔

وہ کمزوری کے باعث تھوڑی دیر کے لیے بھی سر اٹھا کر نہ دیکھ سکی۔ اس کا سر پھر تکیے پر آگیا۔ وہ ہانپنے لگی۔ اسے اجنبی کی گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "بہت خون بہہ چکا ہے۔ کمزوری اور زخم کی تکلیف تمہیں نڈھال کررہی ہوگی۔ میں نے فرسٹ ایڈ کے طور

پر مرہم پٹی کی ہے لیکن تمہیں باقاعدہ ڈاکٹر اور دواؤں کی ضرورت ہے۔ ابھی ایک ایمبولینس آئے گی پھر تمہیں اسپتال پہنچا دیا جائے گا۔"

وہ پریشان ہو کر بڑی نقاہت سے بولی۔ "میں اسپتال نہیں جاؤں گی۔ پہلے یہ بتاؤ تم کون ہو؟ کیا نیک بخت کے آدمی ہو؟"

"میرا تعلق کسی بدبخت سے نہیں ہے۔ مرزا بدبخت کے آدمی تمہیں قتل کرنا چاہتے تھے۔ میں تمہیں یہاں لے آیا ہوں۔"

"پھر تو وہ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ میں کسی بھی اسپتال میں محفوظ نہیں رہ سکوں گی اگر یہ جگہ محفوظ ہے تو مجھے یہیں رہنے دو۔"

"جس اسپتال میں تمہیں پہنچایا جائے گا' وہاں تمہارا کوئی دشمن نہیں پہنچے گا۔ کیا تم نیک بخت کے مخالف کاشف اکبر کے لیے کام کرتی ہو؟"

"نہیں۔ میں کسی کے لیے کام نہیں کرتی ہوں۔ میں نے نیک بخت کی ملازمت بھی چھوڑ دی تھی۔"

"اگر تم سیاست کی بساط کا ایک مہرہ نہیں ہو تو وہ خفیہ معاہدہ کس کے لیے لے جا رہی تھیں؟"

"آں؟" وہ چونک گئی۔ اسے یاد آیا کہ اس نے معاہدے کے کاغذات کو تہہ کر کے اپنے گریبان کے اندر چھپایا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ بے اختیار سینے پر گیا۔ وہاں آدھا گریبان کٹا ہوا تھا۔ سینے پر بھی قمیض کا بہت بڑا ٹکڑا کاٹا گیا تھا۔ وہ سر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے بولی "میرے وہ کاغذات کہاں ہیں؟"

"آرام سے تکیے پر سر رکھ کر لیٹی رہو۔ کاغذات محفوظ ہیں۔"

وہ تکیے پر سر رکھ کر بولی۔ "پلیز مجھے دے دو۔"

"تم کیا کرو گی؟"

"یہ نہ پوچھو۔ وہ میرے لیے بہت اہم ہیں۔"

"تم سیاست میں نہیں ہو۔ کسی سیاست داں کے لیے کام نہیں کر رہی ہو پھر ان کاغذات سے کیا فائدہ اٹھانا چاہتی ہو؟"

"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ آخر تم کون ہو۔ اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

"میں ایک گمنام سا شخص ہوں۔ میرا کوئی نام نہیں ہے۔ میں اپنے ملک کے کرپٹ عناصر کو بے نقاب کرتا ہوں۔ اس ملک کے بڑے سیاست داں مجھے وہ کہتے ہیں اور وہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کون ہے؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "میں نے مرزا نیک بخت کے خفیہ اجلاس میں تمہارا ذکر سنا ہے۔ اس کے مشیر کہہ رہے تھے کہ تم نے کاشف اکبر کے ایک مجرمانہ معاہدے کو منظرِ عام پر لا کر نیک بخت کے لیے اقتدار حاصل کرنے کا راستہ ہموار کر دیا ہے اور پچھلی شام یہی ہوا ہے۔ خفیہ ہاتھ نے نیک بخت کو یقین دلایا ہے کہ اس ملک میں آئندہ وہی حکومت بنائے گا۔"

"ہاں میں نے وہ معاہدہ پڑھا ہے۔ آئندہ مرزا نیک بخت خفیہ ہاتھ کی پالیسیوں کے مطابق حکومت کرے گا اور پوری قوم کو قرضوں کی دلدل میں دھنسائے رکھے گا۔ اب تم بتاؤ کہ یہ سیاسی معاہدہ تمہارے کیا کام آئے گا۔"

"میں اسے مرزا نیک بخت کی کمزوری بنا کر اپنے ہاتھ میں رکھوں گی۔"

"کیا اس سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرو گی؟"

"میں دولت نہیں' کھوئی ہوئی عزت حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ نیک بخت مجھے داشتہ بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ جب وہ بیوی اور بچوں کے ہوتے ہوئے مجھ سے منہ کالا کر سکتا ہے تو کیا مجھے اپنی منکوحہ بنا کر عزت نہیں دے سکتا؟ لیکن وہ بہانے کرتا ہے۔ جب دل بھر جائے گا تو مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دے گا لیکن اب ایسا نہیں کر سکے گا۔ میں اس سے کہوں گی کہ مجھ سے نکاح کرے۔ میں نکاح ظاہر نہیں کروں گی۔ میرے اندر کی عورت مطمئن ہو جائے گی تو میں کسی دوسرے ملک میں رہ کر زندگی گزار دوں گی۔"

"ہوں۔ اس معاہدے کو وہ منظرِ عام پر نہیں آنے دے گا۔ مجبور ہو کر تم سے نکاح کرے گا۔ دوسرے ملک میں تمہاری رہائش کے لیے لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کرے گا۔ تم جب تک اس معاہدے کو چھپا کر رکھو گی' ایک منکوحہ کی طرح عزت و آبرو سے زندگی گزارتی رہو گی۔"

وہ بولی۔ "تم محبِ وطن ہو۔ اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتے ہو۔ میری عزت رکھنے کے لیے وہ کاغذات مجھے دے دو۔"

"مجھے صرف تمہاری نہیں' پوری قوم کی عزت کا خیال رکھنا ہے۔ قرضے لے کر خفیہ ہاتھ کی پالیسیوں کے مطابق مہنگائی اور ٹیکس بڑھانے سے ملک میں کتنی کرپشن' گناہ اور بے غیرتی بڑھتی ہے' یہ سمجھتے ہوئے بھی لوگ نہیں سمجھتے۔ میں انتخابات سے پہلے اس معاہدے کو منظرِ عام پر لا کر عوام سے پوچھوں گا' کیا وہ پھر ایسے سیاست دانوں کو ووٹ دینے جا رہے ہیں؟"

"کیا تم وہ معاہدہ اپنے پاس رکھو گے؟"

"ہاں یہ میرے پاس محفوظ رہے گا۔ مرزا نیک بخت اس وقت تک تمہیں زندہ سلامت رکھے گا' جب تک معاہدے کے تمام کاغذات اسے نہیں ملیں گے۔"

"میں تم سے بحث نہیں کروں گی۔ میرا دل کہتا ہے' تم اس معاہدے کی طرح میری بھی حفاظت کرو گے اور نیک بخت کو مجھ پر ظلم کرنے کا موقع نہ دو گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں' تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

"لیکن اب میں کہاں جاؤں گی؟ اپنے والدین اور خاندان والوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی ہوں اسی لیے پچھلے تین دنوں سے گھر نہیں گئی۔ اب تو نیک بخت کی منکوحہ بن کر ہی اپنوں اور غیروں سے نظریں ملا سکوں گی۔"

"فی الحال تم اسپتال جاؤ گی۔ اس اسپتال میں سب ہی میرے اعتماد کے لوگ ہیں۔ تم کسی کی نظروں میں نہیں آؤ گی۔"

"نیک بخت کے آدمی مجھے بڑے سے بڑے اسپتال اور چھوٹے سے چھوٹے اسپتال میں ڈھونڈتے پھریں گے۔ اسپتال ایسی جگہ ہے' جہاں چھپ کر نہیں رہ سکوں گی۔"

"میں تمہارے اطمینان کے لیے بتادوں کہ تم ایک کوٹھی میں رہو گی۔ وہ باہر سے......... ایک رہائشی کوٹھی ہے لیکن اندر سے ایک اسپتال ہے۔ پھر تمہارے صحت یاب ہونے تک میں نیک بخت کو ایسے شکنجے میں کس دوں گا کہ وہ تم سے دشمنی کرنا بھول جائے گا۔"

اس نے بڑی حد تک مطمئن ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر آیا پھر وہ چونک کر بولی۔ "کیا تم نے؟ یہ۔ یہ میرے۔ اس لباس کو کاٹا ہے؟"

"میں مجبور تھا۔ لباس کا جتنا حصہ خون آلودہ تھا' اسے کاٹ کر بدن سے لہو صاف کرنا ضروری تھا۔"

وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "کیا۔ کیا تم نے میرے بدن کی صفائی کی ہے۔ تم۔ تم نے ہاتھ لگایا ہے؟"

"میں تم سے کس زبان سے کہوں کہ اس وقت میں ایک ڈاکٹر' ایک مسیحا تھا۔"

اس نے ایک ہاتھ سے چادر کو کھینچ کر اپنے چہرے کو چھپا لیا۔ باہر ایک گاڑی کے آنے اور رکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ایمبولینس آگئی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

☆======☆======☆

یہ خبر گرم تھی کہ حکومت نہیں رہے گی۔ پانچ برس کی مدت پوری ہونے سے پہلے حکمرانوں کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ اخبارات میں خبریں شائع ہوتی تھیں اور کالم لکھے جاتے تھے کہ کاشف اکبر کی تمام سیاسی غلطیوں کے ریکارڈز عدالت میں پیش کیے جائیں اور مختلف میڈیا کے ذریعے عوام کو عدالتی کارروائیوں سے باخبر رکھا جائے۔

اس ملک میں یہ کبھی نہیں ہوتا۔ سیاسی شخصیات کے جرائم ثابت ہوتے رہیں' تب بھی ان کے خلاف کھلی عدالتی کارروائی نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی کرپٹ سیاست داں کو کبھی سزا دی جاتی ہے۔ اگر ٹھوس ثبوت اور گواہوں کی وجہ سے پھانسی کا پھندا لازمی ہو جائے تو اس سے پہلے ہی اس سیاست داں کو ملک سے فرار ہونے اور دوسرے ممالک میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کا موقع فراہم کر دیا جاتا ہے۔

بڑے بڑے اخبارات اور بار ایسوسی ایشن کے وکلا یقین دلا رہے تھے کہ کاشف اکبر کو عدالت سے سزا دلائیں گے اور اسے ملک سے فرار ہونے کا موقع نہیں دیں گے۔ ملک کے حساس ادارے کے بڑے عہدیدار بھی یہی کہہ رہے تھے۔ وہ کو بھی یقین تھا کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار آئین کی حکمرانی ہو گی اور قانون کے مطابق سختی سے کاشف اکبر کا محاسبہ کیا جائے گا۔

لیکن سیاسی چال ذرا سی بدل گئی۔ اس سے پہلے کہ کاشف اکبر کا محاسبہ کیا جاتا' اسمبلی توڑ دی گئی۔ ایک عبوری حکومت قائم کر دی گئی۔ یہ کہا گیا کہ عبوری حکومت نوے دن یعنی تین ماہ کے اندر نئے انتخابات کرائے گی۔ انتخابات کے نتیجے میں جو نئی حکومت آئے گی' وہ کاشف اکبر کے سیاسی جرائم کا محاسبہ کرے گی۔ عبوری حکومت اس لیے محاسبہ نہیں کرے گی کہ اس قلیل مدت میں صاف و شفاف انتخابات کرانے کی ذمے داریاں پوری کرنی ہیں۔

سیاسی قلابازیاں عوام کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ عوام کو یہ سمجھایا گیا کہ نئی حکومت کاشف اکبر کا بے رحمی سے محاسبہ کرے گی لیکن کاشف اکبر کو سیاسی داؤ پیچ کے ذریعے بچاؤ کرنے کے لیے تین ماہ کی مہلت دے دی گئی۔ اس بات کی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ نئی حکومت واقعی کامیاب محاسبہ کرے گی یا نہیں؟

وہ اپنی جدوجہد کو خاک میں ملتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے فون کے ذریعے بار ایسوسی ایشن کے عہدیداروں سے پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے جو ثبوت پیش کیے ہیں' ان کے پیشِ نظر کاشف اکبر کو گرفتار کرنا چاہیے تھا لیکن وہ آئندہ الیکشن لڑنے کے لیے آزاد رہے گا۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔ عبوری حکومت کے حکمران یہ یقین دلا رہے ہیں کہ جن سیاست دانوں نے قرضے لے کر ادائیگی نہیں کی ہے' انہیں انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ کاشف اکبر بھی قرض نادہندگان کی فہرست میں ہے۔ اگر محاسبہ کیا جائے گا تو وہ اربوں روپے کا مقروض ثابت ہو گا۔ لہٰذا انتخابات میں حصہ نہیں لے سکے گا۔"

"میں نے جو ٹھوس ثبوت پیش کیے ہیں' ان کے نتیجے میں کاشف اکبر کو گرفتار نہیں کیا گیا ہے۔ پھر اس کے اربوں روپے کے قرضوں کا محاسبہ کون کرے گا؟"

"ہم قانون کے رکھوالے ہیں۔ کاشف اکبر کو قانون کی گرفت میں لانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ اسے الزامات سے بچنے اور اس ملک سے فرار نہیں ہونے دیں گے۔"

"آپ حضرات کوشش کریں۔ میں حقیقت سمجھ گیا ہوں۔ خفیہ ہاتھ کے اشارے سے اسمبلی توڑی گئی ہے۔ خفیہ ہاتھ آئندہ اپنی مرضی کا حکمران لائے گا اور کاشف اکبر کو بچ نکلنے کا پورا موقع ملے گا کیونکہ کاشف اکبر آئندہ کبھی بھی کام آسکتا ہے۔"

وہ فون بند کر کے سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ اس ملک کی سب سے بڑی طاقت عوام ہیں۔ جب تک عوام اپنی طاقت کو نہیں سمجھیں گے' تب تک اخبارات' وکلا کی انجمن اور ملک کے دانشور چیختے رہیں گے اور محاسبہ کرنے کی ناکام کوششیں کرتے رہیں گے اور عوام یہ سمجھ نہیں پائیں گے کہ روز بہ روز ان کے حالات بد سے بدتر اور بدترین کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟ جس سے پوچھا جائے' وہ یہی کہے گا کہ حالات برے ہیں۔ جبکہ ہماری حالت یہ ہے کہ آنکھوں سے برائی دیکھ کر اندھے بن جاؤ۔ کانوں سے جھوٹ سن کر بہرے ہو جاؤ۔ ذہن سمجھائے کہ جو ایک بار حکمران بن کر قوم کا خون چوستا رہا' اسے دوسری بار ووٹ نہ دو تو اپنے ذہن کی بات نہ مانو۔ اس خون چوسنے والے کو ووٹ دے کر پھر اپنے اوپر مسلط کر لو اور کہتے رہو کہ اپنے حالات برے ہیں۔

موبائل فون سے بزر کی آواز ابھری۔ اس نے آن کر کے کان سے لگایا پھر "ہوں" کہا۔

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "کالنگ کوڈ نیم وہ ٹو۔"

وہ ٹو کی آواز سنائی دی۔ "سر! چھاچھرو کی ایک بستی میں راہو دادا نظر آیا ہے۔ ہم اس کی بیوی اور بچوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ کل شام اس کے بیوی بچے عمر کوٹ سے چھاچھرو آئے۔ تب ہی ہم نے سمجھ لیا کہ وہ اپنے سرپرست راہو دادا سے ملنے کے لیے

عمر کوٹ سے اتنی دور آئے ہیں۔"

"تھر پولیس اور ضلعی انتظامیہ کا اخباری بیان تھا کہ راہو دادا گرفتاری کے خوف سے فرار ہو گیا ہے۔ اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔ کیا اب وہ چھاچھرو پولیس کی نظروں میں نہیں آرہا ہے؟"

"سر! آپ تو جانتے ہیں۔ پولیس عوام کے لیے نہیں وڈیروں کے لیے کام کرتی ہے۔ راہو دادا کو وڈیرا کمال صالح اور لالہ دھرم داس کی سرپرستی حاصل ہے۔ وہ اسے تحفظ دے رہے ہیں۔ اس کے لیے کوئی خطرہ پیش......... آئے گا تو اسے سرحد پار کرا کے راجستھان پہنچا دیں گے۔"

"وہاں تمہارے پاس کتنے بندے ہیں؟"

"اس علاقے میں ہمارے سات جانباز ہیں۔ ان میں سے دو جانباز راہو دادا کی نگرانی کر رہے ہیں۔ چار جانباز کمال صالح اور لالہ دھرم داس کے گھروں اور سرحدی اوطاق کے آس پاس موجود ہیں۔ باقی ایک نے پولیس انسپکٹر کی سرگرمیوں پر نظر رکھی ہے۔"

"میں آرہا ہوں۔ میرے پہنچنے تک راہو دادا کو سرحد پار جانے کا موقع نہ دو۔ وہ پولیس' انتظامیہ اور وڈیرے کی مدد سے فرار ہونا چاہے تو اسے گولی مار کر زخمی کر دو۔ میرے آنے تک اسے کسی طرح زندہ رکھو۔"

"آل رائٹ سر! وہ آپ کی آمد تک زندہ یا نیم مردہ رہے گا۔"

تھر کے صحرا میں اور سرسبز و شاداب علاقوں میں اکثر غیر ممالک سے شکار کے شوقین امیر کبیر لوگ آتے ہیں۔ ہرن' سانبھر' نیل گائے' تیتر اور بٹیر وغیرہ کے علاوہ خوب صورت لڑکیوں کو بھی شکار کرتے ہیں۔ راہو دادا اور اس کے حواری ان دولت مند شکاریوں کے لیے لڑکیاں فراہم کرتے تھے۔ بعض شکاری کچی عمر کی لڑکیوں کا شکار کرنا پسند کرتے تھے اور ایسی کمسن لڑکیوں کے عوض راہو دادا کی جھولیاں نوٹوں سے بھر دیتے تھے۔

وہ اس علاقے میں عورتوں کا دلال کہلاتا تھا۔ اس کے باوجود وہاں کے غریب باشندے اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر سر جھکاتے تھے کیونکہ پولیس' وڈیرے اور ان کے غنڈے سب ہی اس کے باڈی گارڈز بنے رہتے تھے۔ جو دولت مند شکاری وہاں شکار کھیلنے آتے تھے' وہ عیاشی کے لیے سب ہی کو بڑی بڑی رقمیں بخشش کے طور پر دیتے تھے۔

پچھلی بار راہو دادا نے تین کم سن لڑکیوں کلسی' تارا اور رانی کو شکار کرنے کے لیے ایک امیر کبیر غیر ملکی شکاری کے سامنے پیش کیا تھا۔ وہ نے ان لڑکیوں کو بربادی سے بچانے کی کوششیں کی تھیں لیکن وہ کیٹی بندر کے معاملے میں مصروف تھا۔ اس کی عدم موجودگی

میں ان کم سن لڑکیوں کے ساتھ ایسی درندگی کے ساتھ اجتماعی زیادتیاں کی گئی تھیں کہ وہ تڑپ تڑپ کر مرگئی تھیں۔

ان کا انجام دیکھ کر وہ کا سر شرم سے جھک گیا۔ اس نے اس شرمناک معاملے کو اخباروں کی ذریعے اچھالا تھا اور مطالبہ کیا تھا کہ غیر ملکی شکاری اور راہو دادا کو گرفتار کر کے سزائیں دی جائیں۔ تمام اخبارات اور حساس اداروں کی طرف سے بھی یہی مطالبہ تھا۔ پھر اعلیٰ حکام کی طرف سے ہمیشہ کی طرح یقین دلایا گیا کہ پولیس اور انتظامیہ راہو دادا اور اس کے چند حواریوں کو تلاش کر رہی ہے لیکن متعلقہ اعلیٰ عہدیداروں کی طرف سے عوام کو یہ سمجھانے کی کوششیں کی گئیں کہ غیر ملکی شکاری جا چکے ہیں اور ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی نہیں ہو گی کیونکہ اس ملک سے پاکستان کے سفارتی تعلقات خراب ہو جائیں گے۔ لہٰذا اس معاملے کو راہو دادا کی گرفتاری تک محدود رکھا جائے گا۔

لیکن جیسا کہ ہوتا آیا ہے' راہو دادا کو بھی فرار ہونے کا موقع دے دیا گیا تھا۔ وہ ٹو کی ٹیم جانتی تھی کہ راہو دادا فرار نہیں ہوا ہے۔ تھر کے بڑوں کی سرپرستی میں کہیں روپوش ہے اور واقعی وہ چھاچھرو میں تھا۔ پچھلی رات اس کی بیوی اور بچے اس سے ملنے آئے تھے۔ اس کے بچوں میں ایک جوان بیٹا اور دو چھوٹی بیٹیاں کنول اور لاجو تھیں جوان بیٹے کا نام جیون تھا۔ جیون اور اس کی ماں شانتا کو معلوم تھا کہ راہو عورتوں کی دلالی کرتا ہے۔ چونکہ گھر میں بڑی بڑی رقمیں آتی تھیں۔ سرکاری عہدیدار اور پولیس والے ان کی عزت کرتے تھے اور اسی لیے راہو کی بیوی اور بیٹے نے باپ کی کمائی پر اعتراض کبھی نہیں کیا۔

سیدھی سی بات ہے کہ جب اپنے پاؤں میں کانٹا چبھتا ہے تب تکلیف کا پتا چلتا ہے کہ کیسی چبھن اور جلن ہوتی ہے۔ جب شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگا تو شانتا نے پریشان ہو کر راہو سے کہا۔ "کنول اور لاجو کہاں ہیں۔ وہ اندھیرے سے ڈرتی ہیں اور اندھیرا ہو رہا ہے۔ انہیں اب تک آجانا چاہیے تھا۔ جیون! ذرا جا کر دیکھو۔ وہ لالہ کے گھر میں ہوں گی۔"

جیون نے کہا۔ "لالہ گھر میں تالا لگا کر منڈی گیا ہے۔ کنول اور لاجو وہاں نہیں ہوں گی۔ پیچھے گلی میں کھیل رہی ہوں گی۔"

راہو نے کہا۔ "وہ دونوں دوپہر کو مجھ سے روپے لے کر گئی تھیں۔ کہہ رہی تھیں' برفی مٹھائی اور گولا آئس کریم کھائیں گی۔ اب اندھیرا ہو گیا ہے۔ جا پیچھے گلی میں دیکھ کر آ۔"

جیون بڑبڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔ شانتا نے راہو سے پوچھا۔ "کیوں جی! آپ کب تک چھپے رہیں گے۔ یہ معاملہ ختم ہو گا یا نہیں؟"

"معاملہ ختم ہی سمجھو۔ کسی بھی بڑی سے بڑی بات کو اخبار والے دو چار دن خوب اچھالتے ہیں پھر وہ بات اخبارات کے کالموں اور عوام کے ذہنوں سے مٹنے لگتی ہے۔ لوگ تین وقت کی روٹیاں حاصل کرنے کے لیے گدھوں سے زیادہ محنت کرتے ہیں۔ محنت مزدوری سے تھک کر دروازے پر بندھے ہوئے گدھوں کی طرح چارہ کھا کر دوسرے دن مہنگائی کے ڈنڈے کھانے کے لیے سو جاتے ہیں۔"

شانتا نے کہا۔ "ہاں۔ سب کو اپنی اپنی پڑی رہتی ہے پھر وہ کلسی' تارا اور رانی کون سے ملک کی شہزادیاں تھیں کہ ان کا مقدمہ عدالتوں تک پہنچ جاتا۔ ان کا معاملہ جھاگ کی طرح ابھر کر بیٹھ گیا ہے۔ اب آپ کو چھپنا نہیں چاہیے۔ آپ کل بڑے صاحب سے بات کریں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی دروازے پر دستک سنائی۔ شانتا نے اٹھ کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں انسپکٹر فخرالدین۔ دروازہ کھولو۔ راہو سے بات کرنا ہے۔"

راہو نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا پھر پوچھا۔ "انسپکٹر صاحب! خیریت تو ہے؟"

"میں تمہاری خیریت پوچھنے آیا ہوں۔ تمہاری دونوں بیٹیاں گھر میں ہیں؟"

"نہیں وہ یہیں کہیں محلے میں ہوں گی۔ جیون انہیں ڈھونڈنے گیا ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "انہیں بھول جاؤ۔ وہ نہیں ملیں گی۔"

شانتا کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔ راہو نے پوچھا۔ "یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"تھانے میں ایک نامعلوم شخص کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ کلسی اور تارا کے بدلے کنول اور لاجو کو اغوا کیا گیا ہے اور رانی کے بدلے کسی وقت بھی جیون کو گولی مار دی جائے گی۔ حساب برابر ہو جائے گا۔"

شانتا رونے کے انداز میں چیخ پڑی۔ "نہیں میرے بیٹے کو کوئی گولی نہیں مارے گا۔ آپ جیسے پولیس والے ہماری حفاظت کرتے ہیں۔ میں اپنے بیٹے کو وڈیرے سائیں کی حویلی میں چھپا دوں گی۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "ہم جیون پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ راہو! اپنے بیٹے کو لے کر حویلی میں آؤ۔ جس نے کنول اور لاجو کو اغوا کیا ہے' وہ ابھی حویلی میں فون پر بات کرے گا۔"

شانتا نے اپنی چھاتی پیٹ کر کہا۔ ”ہائے وہ ظالم میری معصوم بچیوں کو کہاں لے گیا ہے؟ مجھے بتاؤ۔ تمہارے سپاہی انہیں ڈھونڈ رہے ہیں یا نہیں؟“

”میں اپنی ڈیوٹی خوب جانتا ہوں۔ میں نے آس پاس کے تمام تھانوں میں فون کے ذریعے اطلاع دے دی ہے۔ لڑکیوں کو اغوا کرنے والا ہمارے علاقے سے باہر نہیں جا سکے گا۔“

اس وقت کہیں قریب سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ انسپکٹر‘ راہو کو دھکا دے کر خود اندر آیا پھر دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے بولا۔ ”باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ ہمیں بھی گولی لگ سکتی ہے۔“

شانتا نے چیخ کر کہا۔ ”میں باہر جاؤں گی۔ میرا جوان بیٹا پتا نہیں کہاں ہو گا؟“

راہو نے کہا۔ ”آج تک ہمارے علاقوں میں فائرنگ نہیں ہوئی اور نہ ہی کبھی پولیس والوں کو آپ کی طرح چھپنا پڑا۔“

شانتا نے کہا۔ ”آپ کے پاس ریوالور ہے۔ آپ باہر جا کر میرے بیٹے کو لا سکتے ہیں؟“

انسپکٹر جھنجلا کر بولا۔ ”میں بزدل نہیں ہوں لیکن دو لڑکیوں کو اغوا کرنے والا‘ ہمیں چیلنج کرنے والا اور یوں بستی میں فائرنگ کرنے والا وہ ہو سکتا ہے۔ وہ کلسی کو‘ تارا اور رانی کو راہو اور غیر ملکی شکاری سے نہ بچا سکا۔ اب انتقام لینے آیا ہے۔ وہ کون ہے؟ اور کتنی بڑی قوت کا مالک ہے‘ اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں سے وہاں تک اس کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ سے کاشف اکبر کی حکومت چلی گئی۔ خفیہ پولیس والے اسے تلاش کر رہے ہیں لیکن اس کی گرد کو بھی نہیں پا رہے ہیں‘ یہ سب کچھ دیکھتے اور سمجھتے ہوئے کیا میں ایک احمق کی طرح ایک ریوالور لے کر باہر چلا جاؤں گا؟ کیا میں پاگل کا بچہ ہوں؟“

زور زور سے دروازہ پیٹنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ساتھ ہی جیون نے خوف سے چیختے ہوئے کہا۔ ”دروازہ کھولو۔ ماں جلدی! جلدی دروازہ کھولو۔ نہیں تو میں مر جاؤں گا۔“

شانتا نے دوڑتے ہوئے جا کر دروازہ کھولا۔ جیون لڑکھڑاتا ہوا اندر آ کر گرا۔ ماں بیٹے کو اٹھانے لگی۔ انسپکٹر نے دروازے کو پھر بند کر دیا۔ اسی وقت گھر کے سامنے تڑاتڑ فائرنگ ہوئی پھر کسی نے کہا۔ ”دروازہ نہ کھولنا۔ ہماری یہ فائرنگ دھمکی تھی۔ دروازہ کھلنے کے بعد دھمکی نہیں رہے گی۔“

جیون فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”ماں جی! وہ مجھے دوڑاتے جا رہے تھے اور گولیاں چلاتے جا رہے تھے۔ ایک گولی میرے بازو کو چھو کر گزر گئی۔ ابھی تو بچ گیا ہوں مگر وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ مار ڈالیں گے۔“

ماں بیٹے کو گلے سے لگا کر رو رہی تھی اور دلاسا دے رہی تھی کہ اسے ممتا کے آنچل میں چھپا کر رکھے گی۔ ممتا کے سائے میں نہ کوئی گولی آئے گی نہ موت آئے گی۔

دروازے کے باہر وہ کھڑا سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”وہ تینوں معصوم بچیاں بھی اپنی اپنی ماؤں کے سائے میں تھیں لیکن راہو کی دلالی نے انہیں موت دے دی۔ جو جوان بیٹا ابھی تمہارے سائے میں ہے‘ وہ ضرور مرے گا۔“

ماں نے کہا۔ ”میں باہر آ کر تمہارے قدموں میں گر پڑوں گی۔ مجھے موت تک ٹھوکریں مارتے رہو مگر میرے بیٹے کو نہ مارو۔“

”وہ تین کم سن لڑکیاں‘ جو یہ نہیں جانتی تھیں کہ جوانی کیا ہوتی ہے؟ اور حرام کاری کیا ہوتی ہے؟ انہیں جبراً جوان بنانے کی درندگی کی گئی‘ وہ بھی تمہاری طرح روتی اور.......... گڑگڑاتی رہی ہوں گی۔ انہوں نے حمزہ کے نام کی‘ فا‘ کا واسطہ دیا ہو گا۔ ان بچیوں سے دور‘ ان کی ماؤں کی کوکھ جلتی رہی ہو گی.......... لیکن درندوں کو ان پر رحم نہیں آیا۔“

وہ بند دروازے کی طرف ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ”میرا بیٹا بے قصور ہے۔ جو جرم اس کے باپ نے کیا ہے‘ اس کی سزا بیٹے کو کیوں دے رہے ہو؟“

”میں چاہتا ہوں‘ ان تین لڑکیوں کی ماؤں کی طرح تمہاری کوکھ بھی جلتی رہے اور تم ایک ماں بن کر دہائی دینے والی‘ کیا تم اپنے پتی کی حرام کی کمائی نہیں کھاتی تھیں؟ تمہارے بچوں کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے‘ وہ دلالی کے پیسوں سے دوڑ رہا ہے۔“

شانتا روتے ہوئے پلٹ کر راہو سے بولی۔ ”آپ خاموشی سے سن رہے ہیں‘ کچھ بولتے کیوں نہیں؟ آپ تو کہا کرتے تھے‘ کوئی ہمارا بال بھی بیکا نہیں کرے گا۔ پولیس ہم پر آنچ نہیں آنے دے گی۔“

باہر سے وہ نے کہا۔ ”تمہارا پتی ٹھیک کہتا ہے۔ پولیس‘ انتظامیہ اور وڈیرے راہو جیسے دلالوں کو تحفظ دیتے ہیں لیکن اب میں ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ عوام کے اندر سے جب کبھی ایمانی اور طوفانی طاقت ابھرتی ہے تو اس طاقت کے سیلاب میں پولیس‘ وڈیرے اور منفی سرکاری مشینری تنکوں کی طرح بہہ جاتی ہے۔“

انسپکٹر نے کہا۔ "مسٹر وہ! میری ایک بات مان لو۔ یہاں کے وڈیرے سائیں کمال صالح کو بلانے دو۔ وہ آجائیں تو ہمارے درمیان کوئی سمجھوتا ہو جائے گا۔"

وہ بولا۔ "وڈیرا کمال صالح کو میرے دوسرے ساتھیوں نے دھمکی دی ہے کہ وہ حویلی سے باہر نکلے گا تو کل شہر کی یونیورسٹی سے اس کا بیٹا چار کاندھوں پر آئے گا۔ وہ وڈیرا سائیں صبح تک حویلی سے نہیں نکلے گا۔"

"پلیز ہم سے کوئی سمجھوتا کر لو۔"

"ہاں کر رہا ہوں۔ ابھی موبائل فون کے ذریعے ضلع کے ڈی سی سے بات کر رہا ہوں۔ تم سب یہ باتیں سنو۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ وہ موبائل فون کے ذریعے رابطہ کرتا رہا پھر بولا۔ "ہیلو۔ اپنے ڈی سی سے کہو۔ فون پر وہ بول رہا ہے وہ۔"

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ "کیا تم وہی وہ ہو یعنی کہ وہی' جس کا ذکر صاحب کرتے رہتے ہیں؟"

"ہاں میں وہی ہوں۔ دیر نہ کرو' بات کراؤ۔"

ایک منٹ کے بعد آواز سنائی دی۔ "ہیلو' کیا تم واقعی وہ بول رہے ہو؟"

"ہاں۔ تمہیں یقین کر لینا چاہیے۔ تمہیں اطلاع دی گئی ہے کہ میں اپنے جانبازوں کے ساتھ تھر پہنچا ہوا ہوں اور راہو نامی دلال کی دو بیٹیوں کو اغوا کر چکا ہوں۔ نئی اطلاع یہ ہے کہ راہو کے جوان بیٹے کو گولی مار کر زخمی کیا گیا ہے۔ ابھی میں چھاچھرو کی ایک بستی میں ہوں۔ یہاں کچھ دیر تک فائرنگ ہوتی رہی ہے۔ بستی والے کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے ہیں اور ایک گھر کے اندر میں نے یہاں کے ایک پولیس انسپکٹر کو' راہو کو اور اس کی بیوی بیٹے کو قیدی بنایا ہوا ہے۔ یہ تمام قیدی بند دروازے کے پیچھے میری یہ باتیں سن رہے ہیں۔"

"میں یقین کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے پولیس انسپکٹر کو قیدی بنایا ہے۔"

وہ ایک سلاخوں والی کھڑکی کے پاس آ کر بولا۔ "انسپکٹر! کھڑکی کھولو اور یہ فون لے کر اپنے باپ سے بات کرو۔"

کھڑکی کا ایک پٹ کھل گیا۔ وہ اندھیرے میں تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سلاخوں کے درمیان سے موبائل فون پہنچایا۔ وہ فون لے کر بولا۔ "ہیلو سر! میں چھاچھرو پولیس اسٹیشن کا انسپکٹر فخرالدین بول رہا ہوں۔"

"کیا تم قیدی بنے ہوئے ہو؟"

"کیا بتاؤں سر! اچانک فائرنگ شروع ہوئی۔ میں راہو کے گھر میں تھا۔ اس کے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔"

وہ کھڑکی کے قریب بلند آواز سے بولا۔ "انسپکٹر غلط کہہ رہا ہے۔ میرے پاس کوئی فوج نہیں ہے۔ اس مکان کو گھیرا نہیں گیا ہے۔ میں بالکل تنہا ہوں مگر تمہارے انسپکٹر نے ماں کا دودھ نہیں پیا ہے۔ وہ اس مکان سے باہر آنے کی جرأت نہیں کرے گا اگر تمہیں انسپکٹر کی بے بسی کا یقین ہو گیا ہو تو میں کچھ کام کی باتیں کروں۔"

"ہاں بولو۔ میں سن رہا ہوں۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر سلاخوں کے درمیان سے فون لیا پھر اسے کان سے لگا کر کہا "ڈی سی! تم حکومت کی مشینری کے ایک پرزے ہو۔ تم سے بھی بڑے بڑے پرزے بلکہ پوری مشینری یہ معلوم کرنے کی کوشش میں ہے کہ میں کون ہوں؟ میرا نام کیا ہے؟ اور میں سیاسی بساط کے کس خانے میں رہتا ہوں۔

آج میں تمہیں اخبارات کے لیے اور حکومت کے مختلف میڈیاز کے لیے اپنا نام بتا رہا ہوں۔ میرا نام امیر حمزہ ہے۔ کیپٹن امیر حمزہ۔ جب تم یہ نام اوپر والوں کو بتاؤ گے تو وہ انٹیلی جنس کے ریکارڈ روم میں جا کر کیپٹن حمزہ کے نام کی فائل نکالیں گے تو پھر میری پوری ہسٹری تمام سیاست دانوں' آج کے حکمرانوں اور عوام کے سامنے آجائے گی۔

اب تم میرے نام اور میری شخصیت کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا۔ بات میں کر رہا ہوں' تم سنو اور تمام سیاست دانوں کو سناؤ کہ دونوں ہاتھوں کی دس انگلیوں میں دھاگے باندھ کر عوام کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچانے کا دور گزر چکا ہے۔ آج سے اس ملک میں صرف دو بڑے سیاست داں نہیں ہوں گے۔ ایک تیسری سیاسی قوت عوام کی ہو گی۔

میں نے کیٹی بندر کے حوالے سے ایک آخری کوشش کی تھی کہ ایک کرپٹ سیاست داں کو قانون کے مطابق سزا دلاؤں لیکن یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آگئی ہے کہ قانونی چارہ جوئی کی ابتدا ہوتے ہی سیاست داں بڑی عیاری سے اپنے بچاؤ کا راستہ نکال لیتے ہیں۔ جیسا کہ کاشف اکبر نے اسمبلی ٹوٹنے کے بعد اپنے خلاف محاسبے کے تمام راستے کم از کم تین ماہ کے لیے بند کر دیئے ہیں۔ آئندہ نئی حکومت قائم ہونے کے بعد اس کا محاسبہ کامیابی سے ہو گا یا محاسبے کا ڈراما کھیلا جائے گا' یہ آنے والا وقت بتائے گا اور اس وقت میں کیا کروں گا' یہ میں اس وقت کے حالات پر چھوڑ رہا ہوں۔

فی الحال تھر کے ایک چھوٹے مجرم راہو کی بات کر رہا ہوں۔ یہ تمہارا سرکاری ایجنٹ جسے ہم اپنی زبان میں دلال کہتے ہیں۔ یہ دلال اس لیے آپ کی آنکھوں کا تارا ہے کہ یہ

غیر ممالک سے آنے والے شکاریوں کا گائیڈ بن کر دن کو جانوروں کا شکار کرتا ہے اور رات کو شراب کے علاوہ تمہاری بہنوں اور بیٹیوں کو پیش کرتا ہے۔

ہاں ابھی میں نے تمہاری بہنوں اور بیٹیوں کو کہا ہے۔ کیونکہ کلسی' تارا اور رانی میری بہنیں اور تمہاری بیٹیاں تھیں۔ تمہاری انتظامیہ نے ان کے قاتلوں کو اس لیے گرفتار نہیں کیا کہ ایسا کرنے سے ان کے ملک سے سفارتی تعلقات خراب ہو جاتے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہوا کہ ہم اتنے بے غیرت ہیں کہ اپنی پاک قوم کی عورتوں کو پیش کر کے دوسرے ممالک سے سفارتی تعلقات قائم رکھتے ہیں۔ تھو ہے' تمہاری پالیسی پر۔ آج میں یہاں کی بے غیرت انتظامیہ کو سزا دینے آیا ہوں لیکن سزا دینے سے پہلے ایک چھوٹی سی کوشش کروں گا کہ قانون کے تقاضے پورے کروں۔

میں تمہیں اڑتالیس گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں۔ تم اپنے ہاتھوں سے اپنا جرائم نامہ لکھو۔ ان تین لڑکیوں سے پہلے کتنی معصوم بچیوں کو غیر ملکی عیاشوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ ان کی تفصیلات بھی لکھو اور اس جرائم نامے کے ساتھ خود کو عدالت میں پیش کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اڑتالیسویں گھنٹے کے بعد تمہاری جوان بیٹی کو اغوا کرلیا جائے گا۔

میں پیشگی اطلاع دے رہا ہوں۔ تمہارے گھر میں جو کلسی' تارا اور رانی ہے' اس کی حفاظت کے لیے امریکا سے فوج بلالو۔ ہو گا وہی' جو میں کہہ چکا ہوں۔"

ڈی سی نے جیسے تھوک نگلتے ہوئے اٹک اٹک کر کہا۔ "مسٹر۔ حمزہ! میرا مطلب ہے' کیپٹن امیر حمزہ! پلیز میری یہ بات سمجھو' ہمارے معاملات میں یا اختلافات میں ہمارے بچوں پر کوئی ظلم نہیں ہونا چاہیے۔"

"میں تم لوگوں کی طرح ظالم اور بے غیرت نہیں ہوں۔ میں نے راہو کی بیٹیوں کو اغوا کیا ہے۔ اس کے بعد تمہاری یا کسی بھی بے غیرت عہدیدار کی بیٹی یا بہن کو اغوا کروں گا تو ان سب کو اپنی قومی غیرت بنا کر تحفظ دوں گا۔ اغوا کرنا ایک مجرمانہ عمل ہے۔ میں یہ جرم تم سب کو سبق سکھانے' تمہاری آنکھیں کھولنے اور تمہیں توبہ کرنے کا موقع دینے کے لیے کروں گا۔

اب آگے سنو۔ میں راہو اور انسپکٹر فخرالدین کو کل صبح دس بجے تک زندہ رہنے اور توبہ کرنے کی مہلت دے رہا ہوں۔ یہ ابھی یہاں سے کراچی جائیں گے اور کل صبح دس بجے تک عدالت میں پیش ہو کر اپنے جرائم کا اعتراف کریں گے۔ اگر یہ ایسا نہیں کریں گے تو کل ٹھیک گیارہ بجے راہو کے جوان بیٹے جیون کو گولی مار دی جائے گی۔ راہو کو فرار ہونے کے لیے سرحد پار بھارت جانے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ اس کی لاش پاکستان کی

مٹی میں لتھڑی جائے گی۔

اور انسپکٹر فخرالدین! ہماری پولیس میں ایماندار' غیرت مند اور فرض شناس سپاہی اور افسران بھی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ان کی وردی کی توہین ہو۔ لہٰذا ابھی کراچی جانے اور اس مکان سے نکلنے سے پہلے پولیس کی وردی اتار دو اور اگر کل صبح دس بجے تک عدالت میں نہ پہنچے تو بہت اوپر پہنچا دیئے جاؤ گے۔ تم دونوں کی اطلاع کے لیے کہہ دوں کہ میرے جانباز کل تم لوگوں سے اتنے فاصلے پر رہیں گے' جتنے فاصلے پر موت ایک ٹارگٹ بنا کر رہا کرتی ہے۔

میں اتنی دیر سے بہت بڑی بڑی باتیں کر رہا ہوں۔ بعض لوگوں کو ڈینگیں مارنے کی عادت ہوتی ہے۔ تم تینوں کل صبح دس بجے تک میرے متعلق بھی یہی رائے قائم کرسکتے ہو۔ بہرحال کل تک کے لیے تم سب کا خدا ہی حافظ ہے۔"

اس نے فون بند کر دیا پھر کہا۔ "انسپکٹر! میں جا رہا ہوں۔ میرے جانے کے بعد یہ مکان چھوڑ دو' راہو کے ساتھ کراچی جاؤ۔ اس کی بیوی اور بیٹے کو یہیں رہنے دو۔ جوان بیٹا اس مکان سے باہر جائے گا تو کل صبح سے پہلے ہی مارا جائے گا۔ کھڑکی سے دیکھو۔ میں جا رہا ہوں۔"

وہ دونوں کھڑکی کے پاس اس کا ایک پٹ کھول کر دیکھنے لگے۔ سامنے گلی میں نیم تاریکی تھی۔ جانے والا ایک سائے کی طرح نظر آرہا تھا۔ راہو نے سرگوشی میں کہا۔ "آپ کے پاس ریوالور ہے۔ وہ نہیں جانتا ہے اس لیے بڑی شان سے اکڑتا ہوا جا رہا ہے۔ وقت ضائع نہ کرو۔"

انسپکٹر بھی سمجھ رہا تھا کہ یہی موقع غنیمت ہے۔ وہ فون پر ڈی سی سے کہہ چکا تھا کہ بالکل تنہا ہے اور اب وہ تنہا ہی جا رہا تھا۔ اس نے پھرتی سے ریوالور نکال کر اس کا نشانہ لیا۔ رات کے سناٹے میں ٹھائیں کی زوردار آواز سے گولی چلی۔ انسپکٹر کی چیخ سنائی دی۔ ریوالور ہاتھ سے چھوٹ کر کھڑکی کے باہر گرا اور وہ کمرے کے اندر اچھل کر فرش پر آیا پھر چند لمحوں میں تڑپ تڑپ کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔

راہو تھر تھر کانپتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کھڑکی کے پاس کیپٹن امیر حمزہ نظر آرہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "وہ جو گلی میں جا رہا ہے' میرا ایک جانباز ہے۔ میں تو پہلے کی طرح یہیں کھڑکی کے پاس دیوار سے لگا کھڑا تھا۔"

اس نے موبائل فون جیب سے نکال کر ڈی سی سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "سنو! یہاں سچویشن بدل گئی ہے۔ یہ لوگ قانون کے تقاضے پورے کر کے اپنی طبعی عمر تک جی سکتے

تھے لیکن میں ان سے رخصت ہو کر جا رہا تھا کہ یہ اپنی بدمعاشی پر اتر آئے۔ انسپکٹر فخرالدین مجھے غافل سمجھ کر گولی چلانا چاہتا تھا لیکن نتیجہ کیا ہوا' یہ تم راہو کی زبان سے سنو۔"

اس نے سلاخوں کے درمیان ہاتھ بڑھا کر فون دیا۔ راہو نے اسے لے کر کان سے لگا کر کہا۔ "شریمان! میں آپ کا داس' راہو بول رہا ہوں۔ یہ۔ یہ ہمارے کپتان حمزہ صاحب زبان کے دھنی ہیں۔ یہ ہمیں مہلت دے کر جا رہے تھے مگر انسپکٹر کا مغز پھر گیا۔ وہ کپتان صاحب کو گولی مارنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کپتان صاحب نے اسے گولی مار دی۔ جی۔ جی ہاں۔ اچھا جی فون دے رہا ہوں۔"

اس نے سلاخوں سے باہر فون بڑھایا۔ امیر حمزہ نے اسے کان سے لگا کر کہا۔ "آپ نے چشم دید گواہ کا بیان سن لیا لیکن گواہ نے یہ نہیں بتایا کہ انسپکٹر کو گولی چلانے کا مشورہ اسی نے دیا تھا۔"

اس نے کھڑکی کے اندر فون کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ "راہو! میں جھوٹ برداشت نہیں کرتا۔ اونچی آواز میں بولو۔ تم نے گولی چلانے کا مشورہ دیا تھا۔"

وہ سہم کر بولا۔ "جی۔ جی ہاں مگر میں نے تو یونہی کہا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ سچ مچ گولی چلانے لگے گا۔"

امیر حمزہ نے اپنے کان سے فون لگا کر پوچھا۔ "ڈی سی! تم نے سنا؟"

"ہاں۔ ان دونوں نے نادانی کی ہے۔"

"تم اسے نادانی کہو گے۔ میں اسے مکاری کہتا ہوں اور جو ایک بار مکاری کرے' میں اسے دوسری بار شاطر بننے کا موقع نہیں دیتا۔ راہو یہاں سے کراچی نہیں جائے گا۔ راستے میں فرار ہو جائے گا' مکاری دکھائے گا۔"

راہو نے خوف سے لرزتے ہوئے ریوالور کو دیکھا جس کا رخ اس کی طرف تھا۔ وہ بولا "نن۔ نہیں۔ میں دھوکا نہیں دوں گا۔ تمہارے حکم پر چلوں گا۔ کل صبح عدالت.........."

ٹھائیں سے گولی چلی۔ وہ چیخ مار کر گرا۔ شانتا اور جیون روتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ اس سے لپٹ کر رونے لگے۔ امیر حمزہ نے فون پر کہا۔ "تم نے گولی چلنے کی آواز سنی؟ راہو بھی جہنم میں چلا گیا ہے۔ میں کسی کا ایک جھوٹ' ایک فریب بھی برداشت نہیں کرتا۔ یہ تمہارے لیے وارننگ ہے۔ اڑتالیس گھنٹے کے اندر اپنا اعمال نامہ خود لکھ کر عدالت میں نہیں جاؤ گے اور اپنی بیٹی کی حفاظت کرنے میں وقت ضائع کرو گے تو اڑتالیس

گھنٹے کی مہلت ختم ہو جائے گی۔ اپنے تمام ذرائع اور اختیارات استعمال کرو۔ کل کسی وقت تمہاری بیٹی میری تحویل میں ہو گی۔"

اس نے فون بند کر کے جیب میں رکھا۔ وہ ماں بیٹے راہو کی لاش سے لپٹ کر رو رہے تھے۔ اس نے ریوالور کا رخ جیون کی طرف کیا پھر گرجتے ہوئے اسے مخاطب کیا "جیون! کتا مرجائے تو دوسرے کتے اس سے لپٹ کر نہیں روتے۔ کھڑے ہو جاؤ۔"

شانتا اپنے بیٹے کو نشانے پر دیکھتے ہی چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔ بیٹے کے لیے ڈھال بن گئی۔ رونے اور گڑگڑانے لگی۔ رحم کی بھیک مانگنے لگی۔ امیر حمزہ نے کہا۔ "میری ماں نہیں ہے لیکن تمہاری آنکھوں سے اپنی ماں کے آنسو بہتے دیکھ رہا ہوں۔ ایک شرط پر تمہارے بیٹے کو زندہ چھوڑ سکتا ہوں۔"

وہ اٹھ کر دوڑتے ہوئے کھڑکی کے پاس آئی' ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "میرے بیٹے! تم جو بولو گے' وہی کروں گی۔"

"کل تک اپنے پتی کا کریا کرم کر لو پھر رات ہی کو بیٹے کے ساتھ سرحد پار چلی جاؤ۔ کریا کرم کے وقت تمہاری دونوں بیٹیوں کو تمہارے پاس پہنچا دیا جائے گا۔"

وہ رو رو کر اسے دعائیں دینے لگی۔ وہ بے نیازی سے پلٹ کر وہاں سے جانے لگا۔

☆======☆======☆

مرزا نیک بخت کے ہوش اُڑ گئے تھے۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے ساتھ راضی رہنے والی انیلا اچانک اسے چھوڑ کر چلی جائے گی۔ ایک داشتہ چلی جائے تو دوسری اس سے زیادہ حسین لڑکی مل جاتی ہے۔ کسی داشتہ کے جانے سے ہوش نہیں اُڑتے لیکن وہ جاتے جاتے خفیہ معاہدہ اُڑا کر لے گئی تھی۔ گویا اس کے پیروں تلے سے زمین نکال کر لے گئی تھی۔

اس رات اس نے بہت زیادہ پی لی تھی۔ دوسری صبح آنکھ کھلی تو اس نے اپنے پہلو میں بستر کو خالی پایا۔ اس نے آواز دی۔ "انیلا! کہاں ہو؟" اسے جواب نہیں ملا۔ تھوڑی دیر بعد انٹرکام سے بزر کی آواز ابھری۔ اس نے لیٹے ہی لیٹے ہاتھ بڑھا کر انٹرکام کے ایک بٹن کو دبایا۔ دوسری طرف سے اس کے ایک مشیر کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو سر! کیا آپ جاگ رہے ہیں؟"

"ہاں۔ ابھی آنکھ کھلی ہے۔"

"سر! کل رات میں نے مشورہ دیا تھا کہ عورت پر اعتماد نہ کریں اور یہ میں نے درست کہا تھا۔ کل رات انیلا بانو یہاں سے فرار ہو گئی ہے۔"

وہ ہڑبڑا کر بستر پر اٹھ بیٹھا پھر انٹر کام پر جھک کر بولا ...."تم کیسے جانتے ہو؟ وہ کیسے جا سکتی ہے؟ میرا مطلب ہے' سیکورٹی گارڈز کے ساتھ کسی ضروری کام سے گئی ہو گی۔"

"وہ پچھلی رات نو بج کر چالیس منٹ پر ایک گارڈ کے ساتھ کسی ڈاکٹر کو دکھانے کے بہانے گئی تھی۔ گارڈ اور ڈرائیور کا بیان ہے کہ اس نے انہیں دوائیں لانے کے لیے ایک کیمسٹ کی دکان کی طرف بھیجا اور خود کار سے نکل کر بھاگنے لگی۔ آپ کے گارڈ نے اس کا تعاقب کیا۔ وہ انہیں گلیوں میں دوڑاتی رہی۔ اسے روکنے کے لیے ایک نے اسے گولی مار کر زخمی کیا لیکن کسی موٹر سائیکل والے نے آکر اس گارڈ کو گولی مار دی پھر دوسرا گارڈ وہاں پہنچا تو وہ وہاں نہیں تھی۔ گولی کھانے والے گارڈ نے دم توڑنے سے پہلے اپنے ساتھی کو بتایا کہ انیلا کو ایک موٹر سائیکل والا لے گیا ہے۔"

مرزا نیک بخت خلا میں تکتے ہوئے انیلا بانو کے فرار ہونے کی ایک طویل داستان سنتا رہا پھر ناگواری سے بولا۔ "ذلیل کمینی! اسے محل راس نہیں آیا۔ پچاس لاکھ کی بلیک مرسیڈیز میں اسے کانٹے چبھتے تھے۔ کسی موٹر سائیکل والے یار کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس کی اوقات یہی تھی۔"

"سر! سیکورٹی افسر نے کل رات انٹر کام کے ذریعے آپ کو جگانا چاہا۔ کوئی جواب نہیں ملا تو وہ خود آپ کے بیڈ روم میں گیا۔ آپ مدہوش تھے۔ بار بار آوازیں دینے کے باوجود نہیں جاگ رہے تھے۔ پلیز آپ اپنے کمرے کا [illegible]ری سامان اور سیف وغیرہ چیک کریں' اس کے اچانک فرار ہونے کی کوئی خاص وجہ ہو سکتی ہے۔"

"میں چیک کرتا ہوں اور ابھی آتا ہوں۔"

اس نے رابطہ ختم کر کے کمرے کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھا۔ زیادہ سے زیادہ کیش اور اہم دستاویزات سیف میں رہا کرتی تھیں۔ اس نے بستر سے اٹھ کر سیف کے پاس آکر اسے مخصوص نمبروں کی ترتیب سے کھولا۔ اندر تمام سامان جوں کا توں رکھا ہوا تھا۔ نوٹوں کی اتنی ساری گڈیاں تھیں کہ ان میں سے کچھ کم ہوئی ہوں گی تو گنتی کے بغیر کمی کا پتا نہیں چلتا اور وہ کبھی نوٹ نہیں گنتا تھا۔

وہ پچھلی رات جس اہم معاہدے کی فائل لایا تھا' وہ اوپر ہی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے اسے اٹھایا۔ اسے پکڑتے ہی وہ خالی خالی سی محسوس ہوئی۔ اس نے فوراً ہی اسے کھول کر دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ فائل کا بدن رہ گیا تھا۔ روح پرواز کر گئی تھی۔

وہ تھوڑی دیر تک گم صم سیف کو اور خالی فائل کو تکتا رہا۔ اس کے دماغ میں

آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ انیلا اقتدار کی وہ کرسی اٹھا کر لے گئی' جس پر وہ آئندہ بیٹھنے والا تھا۔

جہاں تک معاہدے کا تعلق تھا' وہ خفیہ ہاتھ سے دوبارہ ہو سکتا تھا لیکن وہ خفیہ ہاتھ پہلے معاہدے کے چرائے جانے پر اسے نااہل قرار دیتا۔ ایسے خفیہ معاہدے کی چوری کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی وقت بھی میڈیاز کے ذریعے منظرِ عام پر آسکتا ہے۔ یہ بھید کھل سکتا ہے کہ اس ملک میں خفیہ ہاتھ کے اشاروں سے حکومتیں بنتی' بگڑتی اور پھر بنتی ہیں۔

پھر خفیہ ہاتھ یہ گوارا نہیں کرے گا کہ اس ملک کی سیاسی تبدیلیوں کے سلسلے میں وہ ثبوت کے ساتھ بے نقاب ہو جائے۔ یوں تو راز داری تمام اہم شعبوں میں ضروری ہوتی ہے۔ اہم راز کھلنے کا اندیشہ ہو تو اس سیاست داں کو پُراسرار طریقے سے قتل کرا دیا جاتا ہے یا حادثاتی موت کے بہانے اسے دنیا سے رخصت کر دیا جاتا ہے۔

کمرے میں اے سی چل رہا تھا لیکن مرزا نیک بخت کو پسینہ آرہا تھا۔ اس نے وہاں سے اٹھ کر سیف کو لاک کر کے تولیے سے پسینہ پونچھا پھر انٹر کام پر کہا۔ "احمد علی صاحب کو میرے کمرے میں بھیج دو۔"

مرزا نیک بخت اپنے چار مشیروں میں سے ایک مشیر احمد علی پر زیادہ اعتماد کرتا تھا اور اپنے ذاتی معاملات میں اسے راز دار بنائے رکھتا تھا۔ احمد علی کمرے میں آیا تو نیک بخت نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا پھر بڑی گھبراہٹ اور پریشانی سے اس خفیہ معاہدے کی چوری کے بارے میں بتایا۔ اپنے اندیشے ظاہر کیے کہ اس معاہدے کے منظرِ عام پر آنے سے پہلے خفیہ ہاتھ اسے قتل کرا دے گا یا وہ خود ملک چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو جائے گا۔

احمد علی نے کہا۔ "اس چوری کے معاملے کو خفیہ ہاتھ سے نہیں چھپانا چاہیے۔"

نیک بخت نے گھبرا کر پوچھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ خفیہ ایجنسی والے مجھے زندہ نہیں رہنے دیں گے۔"

"آپ اس کا دوسرا پہلو دیکھیں۔ آپ کے سچ بولنے اور بات نہ چھپانے سے خفیہ ہاتھ فوراً ہی تمام میڈیاز کو الرٹ کر دے گا پھر کسی بھی ذریعے سے وہ معاہدہ منظرِ عام پر نہیں آئے گا۔ انیلا بانو جس میڈیا کے ذریعے اس معاہدے کی تشہیر چاہے گی' وہاں پہنچتے ہی خفیہ ایجنسیوں کی نظروں میں آجائے گی۔"

وہ اس مشورے پر غور کرنے لگا پھر بولا۔ "میں مانتا ہوں۔ خفیہ ہاتھ کو فوراً اطلاع دینے سے وہ معاہدے کے ساتھ پکڑی جائے گی۔ معاہدہ واپس مل جائے گا۔ کیا ہم اپنے ذرائع سے میڈیاز پر نظر نہیں رکھ سکتے۔ ان میں سے کتنے ہی ہمارے زر خرید ہیں' باقی کو

بھی خریدا جا سکتا ہے۔"

احمد علی نے کہا۔ "ہم اپنے ملک میں بااختیار نہیں ہیں' خفیہ ہاتھ ہم سے زیادہ بااختیار اور وسیع ذرائع کا مالک ہے۔ پھر آپ نے اس پہلو پر غور نہیں کیا ہے کہ وہ زخمی ہو کر کسی موٹر سائیکل والے کے ساتھ گئی ہے۔ آپ بھول گئے ہیں کہ وہ کہلانے والا پُراسرار شخص ہمیشہ موٹر سائیکل پر رہتا ہے۔"

"او گاڈ! میں اپنی پریشانیوں میں اس پُراسرار شخص کو واقعی بھول گیا تھا لیکن انیلا اتنی گہری تو نہیں لگتی تھی کہ وہ جیسے خطرناک شخص سے تعلقات رکھتی۔"

"آپ ابھی لاشعوری طور پر انیلا کو بھولی بھالی سمجھ رہے ہیں۔ فی الحال ہم انیلا کے کردار اور اس کی خفیہ مصروفیات پر بحث نہیں کریں گے۔ آپ کو صرف یہ سمجھنا ہے کہ مسٹروہ سے نمٹ سکیں گے؟ سیدھی سی بات ہے لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ خفیہ ہاتھ بھی مسٹر وہ سے اپنے طور پر نمٹ نہیں سکے گا۔ آپ میرے مشورے پر فوراً عمل کریں۔ خفیہ ہاتھ کو تمام حقیقت بتا دیں۔"

"تم معقول مشورہ دے رہے ہو پھر بھی ایک بار غور کر لیں۔ خفیہ ہاتھ مجھے نااہل کہے گا۔ وہ میرے لیے مصیبت بھی بن سکتا ہے اور موت بھی۔"

"سر! کاشف اکبر نے کیٹی بندر کے معاہدے کی چوری سے خفیہ ہاتھ کو بے خبر رکھا تھا۔ ہیرالڈ جان کی خفیہ ایجنسی اور اپنے ذرائع سے مسٹروہ کو ٹریپ کرنے اور اس سے معاہدہ واپس لینے کی کوششوں میں وقت ضائع کیا تھا اگر وہ یہ بات خفیہ ہاتھ کے علم میں لے آتا تو وہ کو کسی بھی میڈیا کا تعاون حاصل نہ ہوتا اور کیٹی بندر کا معاہدہ کبھی منظرِ عام پر نہ آتا۔ خفیہ ہاتھ اب کاشف اکبر کو سزا دے رہا ہے۔ اقتدار کی کرسی اس سے چھین کر آپ کو دینے والا ہے۔ آپ ہر حال میں خفیہ ہاتھ کا اعتماد حاصل کریں۔ کاشف اکبر کی غلطی نہ دہرائیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی خفیہ ہاتھ سے ملاقات کا وقت لیتا ہوں۔ تم یہ بتاؤ۔ کیا مجھے اپنے تینوں مشیروں کو معاہدے کی چوری کے بارے میں بتانا چاہیے۔"

"یہ بات کسی وقت بھی ظاہر ہو سکتی ہے اس لیے آپ تینوں کو اعتماد میں لیں پھر ہم سب مختلف ذرائع سے انیلا بانو کو تلاش کر رہے ہیں۔"

"میں خفیہ معاہدہ کرنے کے لیے اسلام آباد سے یہاں آیا تھا تاکہ مخالفین یہی سمجھتے رہیں کہ میں نشتر پارک میں ایک بہت بڑا جلسہ کرنے آیا ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اتنی بڑی آبادی والے شہر میں انیلا بانو کو تلاش کرنا پڑے گا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ وہ زخمی ہے۔ کسی اسپتال یا پرائیویٹ کلینک میں زیر علاج ہو گی۔ ہمارے آدمی مشہور و معروف ڈاکٹروں سے لے کر گمنام ڈاکٹروں کو نظروں میں رکھیں گے۔ لیڈی ڈاکٹروں سے بھی پوچھ گچھ کرتے رہیں گے۔ کراچی کے مضافاتی علاقوں میں بھی اسے تلاش کرتے رہیں گے۔ امید ہے' وہ جلد ہی ہماری گرفت میں آجائے گی۔"

مشیر احمد علی رخصت ہو کر ڈرائنگ روم میں آیا اور ان تینوں مشیروں کو خفیہ معاہدے کی چوری کے بارے میں تفصیلات بتانے لگا۔ نیک بخت کے پرائیویٹ جاسوس پچھلی رات ہی سے انیلا بانو کو تلاش کر رہے تھے۔ ان مشیروں نے بھی سیکورٹی افسر کو بلا کر حکم دیا کہ انیلا بانو کو تلاش کرنے کے لیے وہ مزید گارڈز کی خدمات حاصل کرے۔ ان سب کو انیلا بانو کی تصویر دکھا کر یہ تاکید کرے کہ اس کے علاوہ ایک بھاری بھرکم موٹر سائیکل والے جوان کو تلاش کیا جائے۔ انیلا بانو اس جوان کی پناہ میں ہو سکتی ہے۔

ان کی مصروفیات کے دوران میں فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ایک مشیر نے ریسیور اٹھا کر پوچھا۔ "ہیلو کون؟"

"میں گلشن اقبال پولیس اسٹیشن کا انچارج عبدالصمد بول رہا ہوں۔ جناب مرزا نیک بخت سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"جناب مرزا نیک بخت موجود نہیں ہیں۔ میں ان کا قائم مقام ہوں۔ مجھ سے کہو۔"

"جناب! مسماۃ انیلا بانو کا باپ اور ایک بھائی تھانے میں ہیں۔ کہتے ہیں کہ نیک بخت نے انیلا بانو کو اغوا کر کے کہیں قید کیا ہے یا پھر قتل کر دیا ہے۔"

مشیر نے کہا۔ "انیلا بانو نے چار دن پہلے ملازمت سے استعفیٰ دیا تھا۔ اس کے بعد پھر کبھی ادھر نہیں آئی۔ ہم نے اس کے باپ اور بھائی کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اس کے استعفیٰ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی انہیں دی تھی۔ کیا انہوں نے وہ کاپی آپ کو دکھائی ہے؟"

"نہیں۔ میں ابھی ان سے وہ کاپی طلب کرتا ہوں۔"

"ہم بھی آپ کو اس کی ایک کاپی بھیج رہے ہیں۔ آپ باتیں بنا کر انہیں ٹال دیں۔ ان سے کہیں انیلا نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ لٰہذا جناب مرزا نیک بخت اس کی گمشدگی کے ذمے دار نہیں ٹھہرائے جا سکتے پھر ان کا شمار ملک کے وی آئی پی میں ہوتا ہے آپ کسی ٹھوس بنیاد پر بھی ان کے خلاف ایف آئی آر درج نہیں کریں گے۔"

اس نے فون بند کر کے اسسٹنٹ سیکرٹری کو بلایا پھر حکم دیا۔ "انیلا کے استعفیٰ کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی گلشن اقبال تھانے کے انچارج کے پاس بھیج دو۔"

سیکرٹری حکم کی تعمیل کے لیے چلا گیا۔ ایک مشیر نے کہا۔ "وہ ہماری توقع سے زیا

چالاکی دکھا رہی ہے۔ وہ معاہدہ لے کر اپنے گھر نہیں گئی ہے۔"

دوسرے مشیر نے کہا۔ "وہ گھر جانے کی نادانی کیوں کرے گی جبکہ مسترد کہلانے والے سے اس کی یاری ہے۔"

دوسرے دن پولیس اسٹیشن انچارج عبدالصمد نے فون پر کہا۔ "جناب! مسماۃ انیلا بانو کے باپ اور بھائی چند اخبار والوں کے ساتھ آئے تھے۔ میں نے اس کا استعفیٰ دکھا کر صحافیوں کو سمجھایا ہے کہ جناب مرزا نیک بخت صاحب کا کوئی تعلق انیلا بانو سے نہیں ہے۔ ایک گمشدہ لڑکی کے اغوا کا الزام دینا گویا ثبوت کے بغیر ایک بڑی شخصیت پر کیچڑ اچھالنا ہے۔ میں نے صحافیوں کو بھی کسی طرح سمجھا کر رخصت کردیا ہے۔"

"تم نے بہت اچھا کیا۔ تمہارا انعام تمہارے گھر پہنچ جائے گا۔"

تیسرے دن نیک بخت نے مشیروں سے کہا۔ "انیلا بہت مکار ہے۔ وہ بظاہر کہیں روپوش رہ کر اس معاہدے کو اپنے گھر میں چھپا کر رکھ سکتی ہے۔ لگتا ہے' بہت زخمی ہے۔ اس لیے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ اس کے زخم بھرنے اور کچھ کر گزرنے سے پہلے اس کے گھر کی تلاشی لینا چاہیے۔ اپنے فرنٹ مین کو چند غنڈوں کے ساتھ وہاں بھیجنا چاہیے۔"

ایک فرنٹ مین چند غنڈوں کے ساتھ انیلا کے گھر میں جبراً گھس آیا۔ گھر میں انیلا کے ماں باپ اور بہن بھائی تھے لیکن مسلح افراد کے سامنے بے بس ہوگئے۔ انہوں نے ایک ایک کمرے اور ایک ایک سامان کی تلاشی لی۔ انیلا بانو کے کمرے سے اس کی دو ڈائریاں اور کچھ خطوط ملے۔ فرنٹ مین نے انہیں اپنی تحویل میں لے لیا۔ جس معاہدے کو تلاش کرنے آئے تھے' وہ نہیں ملا۔ وہ سب ناکام لوٹ گئے۔

اس کے باپ اور بھائی نے دوسرے دن اخبارات کے ذریعے نیک بخت کو الزام دیا کہ اس کے غنڈوں نے زبردستی گھر میں گھس کر خواتین کی بے عزتی کی اور پورے گھر کی تلاشی لیتے رہے پھر انیلا بانو کی ذاتی ڈائریاں اور خطوط لے کر چلے گئے۔

مرزا نیک بخت کو ایسے الزامات کی پروا نہیں تھی۔ اسے پھر خفیہ ہاتھ کا آشیرواد مل گیا تھا۔ اس نے نیک بخت کی اس دانائی کو پسند کیا تھا کہ اس نے کاشف اکبر کی طرح معاہدے کے چوری ہونے والی بات نہیں چھپائی تھی۔ اس نے یقین دلایا تھا کہ ریڈیو' ٹی وی اور پریس وغیرہ جیسے میڈیاز تک اس معاہدے کو پہنچنے دے گا لیکن اسے نشر و اشاعت کے مرحلوں تک پہنچنے نہیں دے گا۔ یہ ایسے مراحل ہوں گے کہ اس معاہدے کو پہنچانے والی انیلا بانو اور مسترد نظروں میں آجائیں گے یا ان سے سمجھوتے کے لیے رابطہ

ہوسکے گا۔ اسی وقت خفیہ ہاتھ نے یہ خوش خبری سنائی تھی کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اسمبلی توڑ دی جائے گی اور واقعی دوسرے دن اخبارات سے پتا چلا اسمبلی توڑ دی گئی ہے اور ایک عبوری حکومت قائم کردی گئی ہے۔ تین ماہ کے اندر نئے انتخابات ہوں گے اور انتخاب میں کامیاب ہونے والا سیاست داں نئی حکومت بنائے گا۔

اس ملک میں سیاست دانوں اور بیوروکریٹس کے درمیان ایک خفیہ سمجھوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مفادات کا تحفظ کریں گے۔ اگر ان میں سے کسی کو نقصان پہنچتا ہو تو سیاسی بازی گری دکھا کر اسے نقصان اور محاسبے سے بچائیں گے اور انہوں نے یہی کیا۔ کاشف اکبر کے سلسلے میں بیان دیا کہ عبوری حکومت اس کا محاسبہ نہیں کرے گی۔ یہ کام آنے والی حکومت کا ہے۔ گویا تین ماہ تک کاشف اکبر کو بچ نکلنے کا موقع دے دیا گیا۔

کیپٹن امیر حمزہ کو مایوسی ہوئی تھی۔ وہ سیاسی ہتھکنڈوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے کاشف اکبر کو وطن کی زمین فروخت کرنے کی سزا خود نہیں دی تھی۔ قانون کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے کیٹی بندر کے معاہدے کو اوپر والوں تک اور عوام تک پہنچایا تھا۔ اس کے بچ نکلنے کا راستہ نہیں تھا لیکن وہ کیسے بچ گیا' یہ چالبازی سمجھ میں آگئی تھی۔

ان حالات کے پیش نظر امیر حمزہ نے تھر والے کیس کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ مجرموں کو اپنے شکنجے میں کسنے کے بعد پھر قانون کی بالادستی کے لیے انہیں مہلت دی کہ وہ خود کو مجرموں کی حیثیت سے عدالت میں پیش کریں۔ اس سلسلے میں انسپکٹر اور راہو نے اسے دھوکا دے کر بچ نکلنے کی کوشش کی۔ امیر حمزہ کو مجبوراً قانون ہاتھ میں لے کر انہیں ہلاک کرنا پڑا۔ اب تھر کا ڈی سی رہ گیا تھا۔ اس کے جرائم کا فیصلہ اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں ہونے والا تھا۔

ڈی سی نے صوبائی حکومت کو ایک تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں لکھا گیا تھا کہ مسترد کہلانے والا دراصل ایک بڑا اہم شخص ہے۔ اس کا نام امیر حمزہ ہے۔ وہ پہلے کبھی انٹیلی جنس میں کیپٹن کے عہدے پر تھا۔ اب اس ادارے سے منسلک کیوں نہیں ہے۔ یہ اس کے ریکارڈ سے معلوم ہوسکے گا۔

فی الحال یہ مسئلہ ہے کہ وہ تین معصوم بچیوں کی ہلاکت کا انتقام لے رہا ہے۔ اس نے انسپکٹر فخرالدین اور دلال راہو کو قتل کردیا ہے اور ڈی سی رکن الدین کو تاکید کی ہے کہ وہ اپنے جرائم کا اعمال نامہ خود لکھ کر اڑتالیس گھنٹے کے اندر عدالت میں پیش ہوجائے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اس کی جوان بیٹی سائرہ تبسم کو اغوا کرکے لے

جائے گا۔

رکن الدین نے رپورٹ میں لکھا تھا۔ "وہ بہت خطرناک ہے۔ زبان کا دھنی ہے۔ جو کہتا ہے' کر گزرتا ہے۔ پولیس فورس وغیرہ کے حوالے سے ضلع کی انتظامیہ بہت کمزور ہے۔ یہاں کوئی مجھے اس سے بچا نہیں سکے گا۔ شاید وہ مجھے قتل نہ کرے مگر میری جوان بیٹی کو اٹھا کر لے جائے گا۔"

حکومت کی طرف سے کہا گیا۔ "ہم اسلام آباد کے حکام سے رابطہ کریں گے اور کیپٹن امیر حمزہ کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کریں گے۔ تمہیں فوری طور پر ٹرانسفر کیا جاتا ہے۔ تم سکھر جا کر ڈی سی کے عہدے کا چارج لو۔ وہاں گھر سے دفتر تک تمہاری سیکورٹی کا اتنا سخت انتظام رہے گا کہ امیر حمزہ کبھی تمہاری بیٹی تک نہیں پہنچ سکے گا۔"

"وہ تو پہلے ہی سکھر میں ہے۔ وہاں ایک کالج میں پڑھتی ہے۔ پلیز میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس کے لیے سیکورٹی کا انتظام کر دیں۔"

"انتظام ہو جائے گا۔ تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ کیٹی بندر اور تھر کے علاقے ویران ہیں۔ وہاں کی پولیس اور انتظامیہ کمزور ہے لیکن سکھر میں امیر حمزہ کی شامت آجائے گی۔ انٹیلی جنس کے ریکارڈ میں اس کی تصویر ہوگی تو وہ تصویر سکھر میں پہنچا دی جائے گی۔ سیکورٹی گارڈز کو حکم دیا جائے گا کہ اسے زخمی کر کے گرفتار کر لیا جائے۔"

صوبائی حکومت کی رپورٹ پر انٹیلی جنس میں امیر حمزہ کا ریکارڈ نکالا گیا۔ اس ریکارڈ میں ایسی اہم اور خفیہ باتیں تھیں' جنہیں منظرِ عام پر نہیں لایا جا سکتا تھا۔ ریکارڈ کے مطابق اسے ایک جانباز محبِ وطن تسلیم کیا گیا تھا۔ اس نے دشمن ممالک میں ایک سیکرٹ ایجنٹ کی حیثیت سے بہت سے کارنامے انجام دیئے تھے۔ اندرونِ ملک ایک برسرِ اقتدار کرپٹ سیاست داں کے خلاف عدالتی کارروائی کرانا چاہتا تھا۔ اس دور کی حکومت نے اسے ملازمت سے برطرف کرنا چاہا مگر نہ کر سکی۔ جس کے ریکارڈ میں ستارے ہی ستارے چمکتے ہوں' اسے ملازمت سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس کرپٹ سیاست داں کو بچانے کے لیے خفیہ ایجنسیاں امیر حمزہ کے پیچھے پڑ گئیں۔

ان دنوں افغانستان کے راستے سے دہشت گرد پاکستان میں داخل ہو رہے تھے۔ ان......... چور راستوں کو بند کرنے کے لیے امیر حمزہ اپنی ٹیم کے ساتھ افغانستان پہنچا۔ وہاں مختلف گروہ پورے ملک پر قبضہ جمانے کے لیے ایک دوسرے کو ہلاک کر رہے تھے اور خانہ جنگی کے ذریعے اپنے ہی ملک کو کھنڈر بنا رہے تھے۔ خفیہ ہاتھ نے ایک خطرناک گروہ سے امیر حمزہ کی ہلاکت کا سودا کیا۔ ایک خطیر رقم دے کر وعدہ کیا کہ امیر حمزہ کی ہلاکت کے بعد

انہیں جدید اسلحہ اور مزید دولت دی جائے گی۔

یہ ایک طویل داستان ہے کہ کس طرح پاکستان دشمن افغانی امیر حمزہ کے خون کے پیاسے ہو گئے اور اس نے کس طرح اپنی حاضر دماغی اور حکمتِ عملی سے اپنی جان بچائی۔ شاید آئندہ کبھی اس کا ذکر ہوگا۔ مختصر یہ کہ امیر حمزہ اچانک غائب ہو گیا۔ درجنوں قتل ہوتے رہے۔ جب وہ کئی دنوں تک نظر نہیں آیا تو اس گروہ کے لیڈر نے خفیہ ہاتھ کے نمائندے کو فخر سے کہا کہ انہوں نے امیر حمزہ کو گولیوں سے چھلنی کر کے پہاڑ کی بلندی سے اتنی گہری کھائی میں گرایا ہے جہاں کوئی جا نہیں سکتا اور اس میں گرنے والا کبھی واپس نہیں آسکتا۔

حقیقتاً اس گروہ کا لیڈر یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ امیر حمزہ مخالف گروہ کی گولی کا نشانہ بن گیا ہے یا وہاں سے فرار ہو گیا ہے لیکن اس گروہ کو جدید اسلحے اور بھاری رقم کی ضرورت تھی۔ اس لیے لیڈر نے خفیہ ہاتھ کے نمائندے کو امیر حمزہ کی موت کی جھوٹی خبر دی اور زبانی معاہدے کے مطابق بہت زیادہ تعداد میں اسلحہ اور مزید خطیر رقم حاصل کر لی۔

کیپٹن امیر حمزہ کے ریکارڈ میں یہ باتیں نہیں لکھی ہوئی تھیں کیونکہ یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ افغانستان میں اس کے ساتھ کیا گزری ہے۔ اس کے بارے میں یہ رائے قائم کی گئی کہ وہ افغانستان میں مختلف گروہوں کے درمیان ہونے والی جنگ کی لپیٹ میں آگیا ہے۔

اس نے خود کو رُوپوش رکھا۔ خود کو مُردہ ظاہر کرتا رہا اگر وہ انٹیلی جنس کے شعبے میں واپس جاتا تو اسے خوش آمدید کہا جاتا اور اس کی بڑی پذیرائی ہوتی لیکن خفیہ ہاتھ اور خفیہ ایجنسی والے ہمیشہ موت کی طرح اس کا پیچھا کرتے رہتے۔ قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک کتنے ہی سیاست دانوں کو قتل کیا گیا ہے' ان کے قاتل آج تک نہیں پکڑے گئے۔ امیر حمزہ بھی مارا جاتا تو اس کے پچھلے کارناموں کی تعریفیں کی جاتیں لیکن اس کے قاتل کا گریبان کبھی نہ پکڑا جاتا۔

لہٰذا اس نے فیصلہ کیا تھا کہ گمنام رہ کر ظالموں اور قاتلوں کو ان کے بُرے انجام تک پہنچائے گا پھر اپنا نام ظاہر کرنے کے بعد بھی رُوپوش رہا کرے گا۔ سیاست کی دنیا میں قدم قدم پر قاتل ایجنسیاں اور دہشت گرد ہیں۔ ان سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے جنگ جاری رکھنے کے لیے رُوپوش رہنا ضروری تھا۔ اسی لیے اس نے پہلے پُراسرار وہ کی حیثیت سے ایک بڑے سیاست داں کو عدالت تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اسے ناکامی ہوئی لیکن اس نے طے کر لیا تھا کہ تین ماہ بعد نئی حکومت کے دوران بھی اس کا ایمانداری سے محاسبہ نہ

ہوا تو وہ کاشف اکبر کو اسی انجام تک پہنچائے گا۔ جہاں انسپکٹر فخرالدین اور راہو پہنچ چکے تھے۔

☆=======☆=======☆

ایم این اے اکرام شاہ اپنی بیوی اور جوان بیٹیوں کے ساتھ لاہور ایئرپورٹ کے وی آئی پی روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی بڑی بیٹی کا نام رخشندہ اور چھوٹی کا نام فرخندہ تھا۔ فرخندہ کا بوائے فرینڈ جمشید بھی موجود تھا۔

اکرام شاہ نے اپنے رشتے داروں اور دوستوں سے کہا تھا کہ نیویارک سے اس کے دوست کے دو بیٹے مراد علی اور فیروز تابانی آرہے ہیں۔ وہ پہلے نیویارک سے کراچی آئے تھے اور اب کراچی سے لاہور آرہے ہیں۔ وہ دونوں پاکستانی لڑکیوں سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے اکرام شاہ کی فیملی میں کچھ عرصے تک رہیں گے۔ اس وقت وہ پوری فیملی انہیں ریسیو کرنے ائرپورٹ پہنچی ہوئی تھی۔ اکرام شاہ کو جمشید کی موجودگی گراں گزر رہی تھی۔ وہ جمشید کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے فرخندہ عرف فری کو سمجھایا تھا کہ وہ دوستی ختم کرے اور اس سے شادی کا خیال دل سے نکال دے۔

فری نے پوچھا۔ "جمشید میں کیا خرابی ہے۔ وہ ایک پولیس انسپکٹر کا بیٹا ہے اور سی آئی اے کے ٹریننگ سینٹر میں تربیت حاصل کر رہا ہے۔ وہ میری خاطر مستقبل کو شاندار بنانے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔"

"فری! وہ ٹریننگ سینٹر سے پاس ہونے کے بعد زیادہ سے زیادہ ایک جونیئر پولیس افسر بنے گا۔ رشوت بھی لے گا تو کتنی دولت کمالے گا؟ ہماری طرح کروڑ پتی نہیں بن سکے گا۔ ابھی عبوری حکومت ہے۔ میں سابقہ ایم این اے کہلاتا ہوں لیکن آئندہ انتخابات میں کامیابی کے بعد مجھے کسی شعبے کا وزیر بنایا جائے گا۔ جمشید اور اس کا باپ میرے سامنے ایک معمولی سرکاری ملازم رہیں گے۔ تمہیں میرے اسٹیٹس کا خیال رکھنا چاہیے۔"

اونچی سوسائٹی میں تعلیم یافتہ جوان بیٹی کو سمجھایا جاسکتا ہے' جبر نہیں کیا جاسکتا۔ پسماندہ گھرانوں میں جوان بیٹی کو لاتیں جوتے مار کر گھر کی چاردیواری میں قید رکھا جاتا ہے۔ بیگم شاہ نے بھی سمجھایا۔ "بیٹی! ہم اپنا اسٹیٹس اونچا کرتے جارہے ہیں اور تم ہمیں نیچے گرانے والی حماقت کر رہی ہو۔ بہتر یہی ہے کہ جلد سے جلد جمشید سے دوستی ترک کردو۔"

سمجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے جمشید سے ائرپورٹ پر ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ اس سے ملنے وی آئی پی ویٹنگ روم میں آگیا تھا۔ اکرام شاہ اور اس کی بیگم کو

اخلاقاً مسکراتے ہوئے جمشید کو برداشت کرنا پڑا۔ ان کی نادان بیٹی یہ نہیں جانتی تھی کہ تابانی اور مراد علی نیویارک سے نہیں' بلکہ را کے ٹریننگ سینٹر سے آرہے ہیں۔ ایسے میں پاکستانی سی آئی اے کے جمشید کی موجودگی گراں گزر رہی تھی۔ ایک اندیشہ تھا کہ تابانی اور مراد علی اپنی باتوں سے یا حرکتوں سے جمشید کو کھٹکنے لگیں گے تو ابتدا ہی میں بات بگڑ سکتی ہے۔

اگرچہ جمشید ابھی تربیت حاصل کر رہا تھا لیکن وہ اپنے سامنے والوں سے گفتگو کے دوران میں ان کے چہروں کو پڑھتا تھا۔ ان کی آواز اور لب و لہجے سے ان کے سچ اور جھوٹ کا اندازہ کیا کرتا تھا۔ ایک کامیاب جاسوس بننے کے لیے وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی اپنے ملنے جلنے والوں کو گہری نظروں سے دیکھتا' پرکھتا تھا اور انہیں سمجھنے کی کوششیں کرتا رہتا تھا۔

اکرام شاہ کا ایک خاص ملازم اپنے ہاتھوں میں ایک پلے کارڈ لیے ایگزٹ گیٹ کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ کراچی سے آنے والے مسافر اس گیٹ سے باہر آرہے تھے۔ تابانی نے اس ملازم کے پلے کارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ دیکھو مراد! اس پلے کارڈ پر ہمارے نام لکھے ہوئے ہیں۔ کم آن۔"

انہوں نے ملازم کے پاس آکر اسے اپنا اپنا نام بتایا۔ ملازم انہیں وی آئی پی ویٹنگ روم میں لے آیا۔ اکرام شاہ سے بولا۔ "صاحب جی! یہی آپ کے مہمان ہیں۔"

اکرام شاہ نے اٹھ کر ان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "بھئی تم دونوں پہچانے نہیں جاتے۔ بچپن میں تمہیں دیکھا تھا۔ تم میں سے بڑا بھائی شاید یہ ہے۔ کیوں میاں! تمہارا نام مراد علی ہے؟"

"انکل! آپ نے خوب پہچانا۔ یہ چھوٹا بھائی فیروز تابانی ہے۔"

اکرام شاہ نے ان سے اپنی فیملی کا تعارف کرایا۔ سب نے مسکرا کر ایک دوسرے کو وِش کیا۔ بیگم شاہ نے جمشید کے بارے میں انہیں بتایا کہ وہ ایک دور کا عزیز ہے۔ جمشید نے ان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ سگے بھائی نہیں لگتے ہیں۔"

مراد علی نے کہا۔ "ہم سگے نہیں ہیں۔ ڈیڈی نے تبت کے ایک لامہ کی ہمشیرہ سے شادی کی تھی۔ میری اس دوسری ماں سے یہ تابانی پیدا ہوا تھا۔"

جمشید نے قائل ہو کر کہا۔ "اسی لیے تبت کے باشندوں کی طرح مسٹر تابانی کے چہرے پر داڑھی مونچھیں نہیں ہیں۔ اگر یہ صبح و شام اپنے چہرے پر بلیڈ پھیرتے رہیں گے

تو جلد ہی بھرپور مرد دکھائی دیں گے۔"

مراد نے مسکرا کر کہا۔ "مردانگی کے لیے داڑھی اور مونچھیں لازمی نہیں ہیں۔ آپ ذرا تابانی سے دو دو ہاتھ کریں‘ یہ دن میں تارے دکھا دے گی۔ اس کے لباس کے اندر بلیک بیلٹ ہے اور بہت خطرناک فائٹر ہے۔"

جمشید نے کہا۔ "اچھا ہوا آپ نے بتادیا۔ میں ان سے دو ہاتھ دور رہا کروں گا۔ میں لڑائی جھگڑے سے بہت ڈرتا ہوں۔"

تابانی اور مراد علی ہنسنے لگے۔ ہنسنے کی بات نہیں تھی پھر بھی اکرام شاہ اور اس کی فیملی نے ہنسنے میں مہمانوں کا ساتھ دیا پھر وہ سب باتیں کرتے ہوئے پارکنگ ایریا میں آئے۔ دو ٹرالیوں میں ان کا بہت سا سامان تھا۔ جیسے وہ تمام مہنگا سامان امریکا سے لایا گیا ہو۔ ایک پجارو میں اکرام شاہ‘ بیگم شاہ‘ بڑی بیٹی رخشندہ دونوں مہمانوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ فری دوسری کار میں جمشید اور دو ملازموں کے ساتھ بیٹھ کر جانے لگی۔

اکرام شاہ نے راستے میں کہا۔ "مراد! میں نے جان بوجھ کر فری اور جمشید کو دوسری کار میں جانے دیا ہے۔ تمہیں اور تابانی کو معلوم ہونا چاہیے کہ جمشید ایک پولیس انسپکٹر کا بیٹا ہے۔ وہ چھ ماہ بعد سی آئی اے سینٹر سے ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد ایک جونیئر افسر بن سکتا ہے۔ میری بیگم اور میری بیٹی رخشندہ تم دونوں کی اصلیت سے واقف ہیں۔ ہم نے جمشید کی وجہ سے فری کو رازدار نہیں بنایا ہے۔"

بیگم شاہ نے کہا۔ "میری فری معصوم ہے۔ جمشید نے اسے اپنی محبت کے جال میں پھنسایا ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ فری کو جمشید سے دور کردیں۔"

تابانی نے کہا۔ "فری‘ جمشید سے دور نہ ہوئی تو میں جمشید کو بہت دور پہنچا دوں گی۔ میں نے محسوس کیا ہے‘ وہ ہمیں ٹٹولتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔"

مراد نے کہا۔ "تابانی! میں جانتا ہوں‘ تم جمشید کو ٹھکانے لگا سکتی ہو لیکن ابھی ایسی حرکت نہ کرنا۔ تم نے وعدہ کیا تھا‘ میری ہدایات پر عمل کرو گی۔ ابھی جمشید کو اپنے طور پر جاسوسی کرنے دو۔ جب بات بگڑے گی تو ہم اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیں گے پھر اسے پیدا کرنے والے بھی اس کی لاش کو پہچان نہیں سکیں گے۔"

جمشید دوسری کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ فری بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں ملازم پچھلی سیٹ پر تھے۔ وہ ملازموں کی موجودگی میں پیار و محبت کی باتیں نہیں کرسکتے تھے۔ اس لیے جمشید نے انگریزی میں فری سے پوچھا۔ "تمہارا منہ کیوں پھولا ہوا ہے؟ کیا ناراض ہو؟"

وہ بولی۔ "کیا ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ تم نے ٹریننگ سینٹر میں ایک ناقابلِ شکست فائٹر ہونے کی سند حاصل کی ہے لیکن تابانی کے سامنے بزدلی دکھا کر اپنا ہی مذاق اُڑا رہے تھے۔ تم تو چکنے گھڑے ہو مگر میں اپنی توہین محسوس کر رہی تھی۔ سب تم پر ہنس رہے تھے۔"

"بھئی سمجھا کرو۔ وہ تمہارے ڈیڈی کے دوست کے بیٹے شادی کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ان میں سے ایک تمہاری باجی کے لیے ہے اور دوسرا تمہارے لیے۔"

"شٹ اپ۔ میں دوسرے پر لعنت بھیجتی ہوں۔"

"کیا لعنت بھیجنے سے ان کے ارادے بدل جائیں گے۔ تمہاری ممی اور ڈیڈی تو مجھے ایک آنکھ سے بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے ہیں۔"

"شادی انہیں نہیں‘ مجھے کرنی ہے۔ میں بالغ ہوں۔ تم سے کورٹ میرج کرسکتی ہوں۔"

"مرچیں کیوں چبارہی ہو۔ اپنی شادی کی بات کرتے ہوئے مسکرانا چاہیے۔"

وہ ہنسنے لگی‘ اس نے پوچھا۔ "تمہارے ڈیڈی کے دوست نیویارک میں کہاں رہتے ہیں؟ ان کا نام کیا ہے؟"

"تم عادت سے باز نہیں آؤ گے؟ جاسوسی شروع کردی؟"

"وہ تو میں کرچکا ہوں۔ پچاس فیصد یقین سے کہتا ہوں کہ ان کا باپ امریکا میں نہیں رہتا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "واہ شرلاک ہومز! اب تم کہو گے کہ وہ دونوں امریکا سے نہیں آئے ہیں۔"

"ہاں۔ میں یہی کہنے والا تھا۔ وہ تمہاری فیملی کو تحفے دینے کے لیے بہت سا سامان لائے ہیں لیکن ان میں سے کوئی سامان امریکا سے خریدا نہیں گیا ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ میں نے سامان پر ایک نظر ڈالی تھی۔ ان میں بیوٹی بکس اور سوٹ کیس وغیرہ ایسے تھے‘ جو یہاں کی مارکیٹوں میں دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ باڑا مارکیٹوں میں بھی ایسی چیزیں نہیں ملتی ہیں۔"

"تم یہ چیزیں کراچی میں خرید سکتی ہو.......... وہاں کی آبادیوں کے خفیہ اڈوں میں امریکی اور جاپانی صنعتوں کے دو نمبر مال تیار ہوتے ہیں۔ ہم ہر طرح کی معلومات حاصل کرتے رہتے ہیں۔ ایشیا میں دو نمبر مال تیار کرنے میں کوریا کے بعد پاکستان کا نام آتا ہے۔"

"او گاڈ! تم یہ کہنا چاہتے ہو‘ انہوں نے وہ تمام سامان کراچی سے خریدا ہے۔"

"فی الحال میرا مطالعہ یہی ہے۔ اگر تم مجھ سے تعاون کرو گی تو میرے اندازوں کی تصدیق ہوسکے گی؟"

"میں کس طرح تعاون کروں؟"

"پہلی بات یہ سمجھاتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے' اس کے پیشِ نظر انہیں کبھی شبے کی نظروں سے نہ دیکھو۔ ان میں سے کسی ایک کا پاسپورٹ چرا کر لے آؤ لیکن اس کام میں جلدی نہ کرو۔ ورنہ گڑ بڑ ہو جائے گی۔ میں ایسی پلاننگ کروں گا کہ کسی کو تم پر شبہ نہیں ہوگا۔"

"میرا بس چلے تو میں انہیں اس طرح لوٹ لوں کہ وہ کنگال ہو کر یہاں سے بھاگ جائیں۔"

"پھر تم کہو گی' بڑے بے آبرو ہو کر میرے کوچے سے وہ نکلے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے کوٹھی کے احاطے میں پہنچ گئیں۔ جمشید نے کار سے اتر کر فری سے کہا۔ "مجھے جانا چاہیے۔ یہاں کے ماحول میں میرے لیے اپنائیت نہیں ہے۔"

"میں تو تمہاری اپنی ہوں۔"

"تم تو ہر مقام پر ہر ماحول میں میری رہتی ہو۔ ہم شام کو اپنی مخصوص جگہ پر ملیں گے۔"

اکرام شاہ دور سے فری کو جمشید کے ساتھ رازدارانہ انداز میں باتیں کرتے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے آواز دے کر بلانا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی جمشید چلا گیا۔ وہ مسکراتی اور گنگناتی ہوئی ان سب کے قریب آئی۔ ملازم گاڑی سے سامان نکال کر اندر کوٹھی میں لے جارہے تھے۔ اکرام شاہ اپنے دونوں مہمانوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے حقارت سے کہا۔ "فری! وہاٹ اے شیم فار یو۔ تم ایسے لڑکے کو سر چڑھا رہی ہو جس کے پاس ایک پرانے ماڈل کی کار بھی نہیں ہے۔"

"ڈیڈی! آپ مہمانوں کے سامنے جمشید کی توہین کر رہے ہیں تو میرا بھی جواب سن لیں۔ جمشید کے ابو پچیس برس کی ملازمت میں ایک پولیس انسپکٹر ہیں۔ ان کی کبھی ترقی نہیں ہوئی کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی میں کسی سے رشوت نہیں لی اور نہ کبھی سیاست دانوں کے دباؤ میں آکر خلافِ قانون کام کیا ہے۔ جمشید بھی اسی طرح اپنا کیریئر بنائے گا۔ اس کے پاس حرام کے پیسوں سے خریدی ہوئی کار نہیں ہوگی۔"

وہ اپنی بات ختم کر کے کوئی جواب سنے بغیر کوٹھی کے اندر چلی گئی۔

مراد نے کہا۔ "یہ بہت تیز ہے انکل! آپ کا بھی لحاظ نہیں کرتی ہے۔"

تابانی نے کہا۔ "سیدھی سی بات کہو کہ باغی ہے۔ انکل اور آنٹی کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ ہمارے لیے پرابلم بن سکتی ہے۔"

اکرام شاہ نے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ اس کے امتحانات ہو چکے ہیں۔ شاید ایک پیپر رہ گیا ہے۔ میں اسے اسلام آباد اس کے ننھیال بھیج دوں گا۔"

وہ اندر ڈرائنگ روم میں آئے۔ اکرام شاہ نے کہا۔ "بیگم! ہم اسٹڈی روم میں جا رہے ہیں۔ وہاں کوئی ملازم بھی نہ آنے پائے۔ تم خود ہمارے لیے چائے بنا کر لے آؤ۔"

وہ تابانی اور مراد کے ساتھ کوٹھی کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا اسٹڈی روم میں آیا۔ دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے بولا۔ "آرام سے بیٹھو۔ بھوک لگے تو کہہ دینا۔ ابھی ایک ایک پیالی چائے پر بات ہو جائے تو بہتر ہے۔"

اس نے موبائل فون نکال کر نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے سینئر سے رابطہ کر رہا ہوں۔ اس سے باتیں کرو۔"

اس نے امرناتھ چھاگلا سے رابطہ کیا۔ وہ اسلام آباد میں "را" کا زونل افسر تھا۔ چھاگلا کے پہلے تین حروف یعنی سی ایچ ایچ کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔ اس نے موبائل کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو سی ایچ ایچ میں شاہ بول رہا ہوں۔ دونوں میرے پاس پہنچ گئے ہیں۔ ان سے بات کرو۔"

اس نے موبائل مراد کو دیا۔ "ہیلو سی ایچ ایچ میں تابانی کے ساتھ شاہ انکل کی کوٹھی میں ہوں۔ ہم بالکل محفوظ اور مطمئن ہیں۔ کیا ہمیں گائیڈ لائن حاصل کرنے کے لیے اسلام آباد آنا ہوگا۔"

چھاگلا نے کہا۔ "یہاں آنا ضروری نہیں ہے۔ میں نے تم دونوں کے لائن آف ایکشن کا چارٹ بنا کر شاہ کو دے دیا ہے۔ اس چارٹ میں لاہور کے جن مقامات کا ذکر ہے' پہلے ان مقامات کو اچھی طرح دیکھ لو پھر کام شروع کرو۔"

"آل رائٹ۔ یہاں آپ کے چارٹ کے مطابق کام ہوگا۔"

اکرام شاہ موبائل فون اس سے لے کر بولا۔ "ہیلو سی ایچ ایچ! یہاں تمہارے آدمیوں کو ضرورت کا تمام سامان ملتا رہے گا۔ تم میری ضرورت کی بات کرو۔ میں نے اپنی پارٹی کے دورِ اقتدار میں قومی خزانے سے پانچ کروڑ روپے قرض لیے تھے۔ اب عبوری حکومت کی طرف سے یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ قرض نادہندگان کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ میرے پاس تو ایک کروڑ بھی نہیں ہیں۔"

"مسٹر شاہ! ہم سے پانچ کروڑ کی توقع نہ کرو۔ ہمارے درمیان یہ طے پایا تھا کہ تمہیں صرف الیکشن لڑنے کے لیے ڈیڑھ کروڑ روپے دیئے جائیں گے۔ تمہیں انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت ملے یا نہ ملے۔ ہم ڈیڑھ کروڑ روپے ضرور ادا کریں گے۔"

"مسٹر سی ایچ ایچ! تمہیں یہاں کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات کو سمجھنا چاہیے۔ پانچ کروڑ نہ سہی، تین کروڑ دے دو۔"

"میں زونل افسر ہوں۔ میرے پاس اتنے اختیارات نہیں ہیں کہ میں مقررہ رقم سے زیادہ دے سکوں۔ میں تمہارا مطالبہ ہیڈ آفس تک پہنچادوں گا۔ وہ مقررہ رقم سے کچھ نہ کچھ زیادہ دے سکیں گے مگر تین کروڑ بہت ہیں۔ بہرحال میں ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ سے بات کروں گا۔"

اکرام شاہ نے فون بند کردیا۔ مراد نے پوچھا۔ "بات ہوگئی؟ آپ مطمئن تو ہیں؟"

وہ مسکرا کر بولا۔ "بے اطمینانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اپنا مطالبہ منوالوں گا۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ اکرام شاہ نے دروازہ کھولا۔ بیگم ایک ٹرے میں خود ہی چائے کی پیالیاں لائی تھیں۔ تابانی نے پوچھا۔ "انکل! وہ سی ایچ ایچ ہمارے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے؟"

"ہاں کہہ رہے تھے کہ تابانی ہندو ہے۔ گائے کا گوشت نہیں کھاتا ہے، اس کے کھانے کا خیال رکھا جائے۔"

وہ بولا۔ "بچپن سے یہ بات دماغ میں سمائی ہے کہ یہ ہماری گاؤ ماتا ہے۔ اس کا گوشت نہیں کھانا چاہیے لیکن "را" کے ٹریننگ سینٹر میں ہر طرح کی تربیت دینے کے ساتھ ہمیں کبھی کبھی گائے کا گوشت کھلایا جاتا ہے تاکہ ہم اسلامی ممالک میں جاکر اس سے پرہیز نہ کریں۔ پرہیز کرنے سے ہم پر شبہ کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں بسم اللہ۔ سبحان اللہ۔ الحمدللہ اور ماشاء اللہ جیسے الفاظ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ انہیں کن مواقع پر ادا کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ ہماری ختنہ بھی کرائی جاتی ہے تاکہ کبھی کسی اسلامی ملک میں گرفتاری ہوں تو ہمارے مسلمان ہونے کی تصدیق ہو جایا کرے۔"

اکرام شاہ نے پوچھا۔ "یہاں کتنے عرصے تک قیام کرنے کا ارادہ ہے؟"

مراد نے کہا۔ "اگر ہماری کارکردگی اچھی رہی تو ہمیں یہاں باقاعدہ شادی کرکے مستقل رہنے کی اجازت مل جائے گی۔"

بیگم شاہ نے کہا۔ "ہم ایک بات ابھی سے سمجھا دیتے ہیں، ہماری دونوں بیٹیوں پر نظر نہ رکھنا اور نہ ہی کبھی ان سے کھیل کر بھاگ جانے کی کوشش کرنا۔ ہم خاندانی لوگ

ہیں۔ ہماری رشتے داریاں خاندان والوں میں ہی ہوا کرتی ہیں۔"

اکرام شاہ نے کہا۔ "جب کسی ملک میں کچھ عرصے رہنا ہوتا ہے تو رہنے والا صرف پیٹ کی ہی نہیں، ہوس کی بھی بھوک مٹاتا ہے۔ جب کبھی بھوک لگے تو مجھ سے کہنا۔ تمہاری اس بھوک کو مٹانے کا بندوبست ہو جائے گا۔"

مراد نے کہا۔ "ویسے تو ہم ان سب معاملات میں بہت محتاط رہتے ہیں لیکن کسی پر دل آجائے تو یہ ایک الگ بات ہے اور یہ جو دل ہے، یہ کبھی کسی بازاری چیز پر نہیں آتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ جب ہم قومی خزانے سے عوام کی دولت لوٹ لیتے ہیں تو عوام کی بیٹیوں اور بہنوں کو بھی چارے کے طور پر تم جیسوں کے آگے ڈال سکتے ہیں۔"

مراد کپ اٹھا کر چائے کی ایک چسکی لیتے ہوئے تصور میں رخشندہ کو دیکھنے لگا اور سوچنے لگا۔ جب دسترخوان گھر میں بچھا ہوا ہو تو دوسروں کے گھروں میں جھانکنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

☆=========☆=========☆

نصیرالدین شریف اپنے نام کی طرح شریف اور نہایت ہی ذہین طالب علم تھا۔ اس نے بورڈ کے امتحانات میں صوبے بھر میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ انٹر فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر میں بھی اول آتا رہا۔ اس کی ذہانت کے پیشِ نظر اسے یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا تھا۔ ہر جگہ کا ماحول اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔ انسان اپنی ذہانت سے اور حسنِ سلوک سے ماحول کو بہتر بنا سکتا ہے پھر یونیورسٹی کے ماحول میں تو علم کی روشنی اور پاکیزگی ہوتی ہے۔ وہاں طلباء و طالبات اگر حصول علم میں ذرا کمزور ہوں تو ان کی کمزوریاں دور کرنے کی تحریک پیدا کی جاسکتی ہے لیکن یونیورسٹی میں داخل ہونے کے دوسرے دن اسے پتا چلا کہ علوم حاصل کرنے کے اس بڑے مرکز میں بھی سیاست آگئی ہے۔

تین بدتمیز قسم کے طلبا نے اس سے پوچھا۔ "اے شریف زادے! تو کس پارٹی میں ہے۔"

شریف نے پوچھا۔ "پارٹی؟ کیسی پارٹی؟"

"ابے ہم سیاسی پارٹیوں کی بات کررہے ہیں۔ آج دو بجے کینٹین میں ہماری میٹنگ ہے۔ وہاں آجانا، ہم تجھے پارٹی کا ممبر بنالیں گے۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "یہ آداب اور بہترین طور طریقے سیکھنے کی جگہ ہے اور آپ لوگ مجھے اے اور ابے کہہ کر مخاطب کررہے ہیں پھر یہ کہ میں یہاں تعلیم حاصل کرنے

آیا ہوں۔ میں نہ تو پہلے کسی سیاسی پارٹی میں تھا اور نہ اب رہنا چاہتا ہوں۔"

ایک نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "سچ کیوں نہیں بولتا۔ تیرے پاس فیس جمع کرنے کے پیسے نہیں تھے۔ دوسری پارٹی والوں نے تیری فیس بھر دی ہے۔ اب کتنی رقم چاہئے بول؟ ہم ہر مہینے تیری فیس بھر دیا کریں گے۔"

"میں کہہ چکا ہوں۔ میرا کسی سیاسی پارٹی سے تعلق نہیں ہے۔ میں نے فیس جمع کرنے کے لئے کسی سے رقم نہیں لی ہے۔ میں غریب ہوں لیکن ایک جگہ پارٹ ٹائم جاب کرتا ہوں۔ ٹیوشن بھی پڑھاتا ہوں پھر ہر سال اول آنے کی وجہ سے مجھے وظیفہ بھی ملتا ہے۔ میں کسی سیاسی پارٹی کا محتاج نہیں ہوں۔ مجھے جانے دو۔"

"جاؤ لیکن تم مخالف پارٹی میں دیکھے گئے تو یہ دونوں ہاتھ کتابیں اٹھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

وہ ان سے کترا کر کلاس اٹینڈ کرنے آیا۔ اس کے پاس بیٹھنے والے اسٹوڈنٹ نے کہا۔ "میں دور سے دیکھ رہا تھا۔وہ تم سے زبردستی کررہے تھے مگر ہماری پارٹی کسی پر جبر نہیں کرتی ہے۔"

شریف نے پوچھا۔ "تمہاری بھی پارٹی ہے؟ مگر کیوں ہے؟ یہاں تو ہمیں صرف تعلیم پر توجہ دینی چاہئے۔"

"اگر ہم اپنی پارٹی نہ بناتے تو کمال صالح کی پارٹی تمہارے جیسے شریف اسٹوڈنٹس کا یہاں پڑھنا لکھنا محال کردیتی۔ ہم یہاں کے تعلیمی ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے ان کے مقابلے پر آئے ہیں۔"

"ہمارے ملک میں بھی تمام سیاسی پارٹیاں یہی کہتی ہیں کہ وہ ملک سے کرپشن مٹانا اور اسلامی آئین کے مطابق جمہوری نظام قائم کرنا چاہتی ہیں۔ اس لئے کرپٹ سیاست دانوں کے مقابلے پر آئی ہیں۔ یہاں پارٹیاں نہ بناؤ۔ اپنے علم اور ذہانت سے تعلیمی ماحول کو سیاست سے پاک رکھو۔"

اس طالب علم نے کہا۔ "تمہارے خیالات اچھے ہیں۔ میں بھی تعلیم کی جگہ سیاست بازی پسند نہیں کرتا لیکن مجبوراً دوسری پارٹی کا ممبر بن گیا ہوں۔ تم سے دوستی رہے گی تو میں ان پارٹیوں سے دور رہا کروں گا۔ میرا نام ضمیراحمد ہے اور تم تو یہاں آتے ہی مشہور ہوگئے ہو۔ سب ہی لیکچرار تمہاری ذہانت کی تعریفیں کرتے ہیں۔"

دونوں میں دوستی ہوگئی۔ دوسرے دن ضمیراحمد کے انگوٹھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ نصیرالدین شریف نے پوچھا۔ "تم زخمی کیسے ہوگئے؟"

اس نے کہاں۔ "کل امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے کھانا تیار کرنے میں ان کی مدد کی تھی۔ سبزیاں کاٹتے وقت انگوٹھا زخمی ہوگیا ہے۔"

"تم بہت اچھے ہو۔ اپنی امی کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہو۔ آج تم کلاس میں کچھ لکھ نہیں سکو گے۔ فکر نہ کرو۔ تمہارے نوٹس میں لکھوں گا۔"

"نوٹس آج نہیں تو کل بھی لکھے جاسکتے ہیں لیکن ایک دوست کو خط لکھنا ضروری ہے۔ آج رات وہ لاہور جا رہا ہے۔ مجھ سے ناراض ہے۔ میں اسے منانا چاہتا ہوں۔ تمہاری انگلش بہت اچھی ہے۔ اسے میری طرف سے انگریزی میں خط لکھ دو۔"

"اسے کیا لکھوانا چاہتے ہو؟"

"کچھ اس طرح لکھو کہ ڈیئر ناز! ایسی بھی کیا بے رخی ہے؟ اگر ناراضگی ہے تو منہ سے نہ بولو لیکن کبھی نظریں اٹھا کر دیکھ لیا کرو۔ میں چاہتا ہوں ایک بار شام کو ملو میں تمام گلے شکوے دور کردوں گا۔ میری اس مختصری تحریر کو بہت سمجھو اور مجھ سے ضرور ملو۔"

نصیرالدین شریف نے وہ خط لکھ دیا۔ ضمیراحمد نے کہا۔ "خط کے نیچے نام نہ لکھو کیونکہ میں نام کی جگہ اپنی چھوٹی سی تصویر چپکا کر بھیجوں گا۔"

شریف نے کہا۔ "یہ اچھا طریقہ ہے۔ اس طرح روٹھے ہوئے دوست کے پاس تمہاری تصویر پہنچ جائے گی۔ تمہاری صورت دیکھ کر ناراضگی دور ہو جائے گی۔"

ضمیراحمد اس سے وہ خط لے کر کلاس سے باہر چلا گیا۔ شریف ایک گھنٹے بعد ایک ضروری کتاب پڑھنے کے لئے لائبریری کی طرف جانے لگا۔ لائبریری کے سامنے ایک حسین لڑکی نے کہا۔ "تم میرا نام جانتے ہو۔ تمہیں یہ بھی جاننا چاہئے تھا کہ میں کتنے بڑے باپ کی بیٹی ہوں۔ تمہارے جیسے کتوں کو گولی مار دوں تب بھی پولیس مجھے گرفتار نہیں کرے گی۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "مس! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے اور یہ کتنی غلط بات ہے کہ آپ مجھے گالی دے رہی ہیں۔"

اس کے ساتھ کھڑے ہوئے جوان نے کہا۔ "یونیورسٹی میں قدم رکھتے ہی تم نے جمال صالح کا نام سنا ہوگا۔ وہ میں ہوں اور یہ میری بہن نازاں ہے۔ کیا تم نے اسے یہ خط نہیں لکھا ہے؟"

اس نے ایک کاغذ کھول کر اسے دکھایا۔ اس نے خط کو پڑھا پھر کہا۔ "ہاں ابھی کلاس میں، میں نے ضمیراحمد نام کے دوست کو یہ خط لکھ کر دیا تھا۔"

جمال صالح نے اس کے منہ پر ایک گھونسا مارا.......... وہ لڑکھڑا کر ذرا پیچھے گیا۔ دو

جوانوں نے اس کے بازوؤں کو دونوں طرف سے جکڑ لیا۔ جمال صالح نے خط دکھا کر کہا ”خط لکھنے والے کا نام نصیرالدین شریف ہے اور تم اعتراف کرتے ہو کہ یہ تمہاری تحریر ہے۔ میری بہن نازاں کو ڈیئر ناز لکھنے کی جرأت کیسے ہوئی پھر تم نے کس کے ذریعے اس خط کو میری بہن کی کاپی میں پہنچایا ہے؟“

وہ اسے لات اور گھونسے مارنے لگا۔ وہ دونوں طرف سے جکڑا ہوا مار کھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”میں نے تمہاری بہن کو ابھی دیکھا ہے۔ اسے جانتا بھی نہیں تھا۔ ضمیراحمد نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کے دوست کا نام ناز ہے۔ میں نے اس خط کے نیچے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔“

اسے جکڑنے والے بھی اس کی پٹائی کرنے لگے۔ وہ زمین پر گر پڑا تھا۔ دوسرے اسٹوڈنٹس دوڑتے ہوئے آ رہے تھے لیکن ان سب پر جمال صالح کی ایسی دھاک جمی ہوئی تھی کہ کوئی شریف کو بچانے کے لئے اس کی حمایت میں بولتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ ایک پروفیسر نے آ کر کہا۔ ”جمال! رک جاؤ۔ کیوں اس بے چارے پر ظلم کر رہے ہو؟“

”سر! یہ بے چارہ نہیں‘ بدمعاش ہے۔ یہ دیکھیں اس نے نازاں کو یہ خط لکھا ہے۔“

پروفیسر نے وہ خط پڑھ کر شریف کو دیکھا۔ اس کی ناک اور باچھوں سے خون رس رہا تھا۔ چہرے پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ وہ روتے ہوئے بولا ”سر! ضمیراحمد کا انگوٹھا زخمی تھا۔ اس نے اپنے دوست کے نام یہ خط مجھ سے لکھوایا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہاں کسی طالبہ کا نام نازاں ہے اور اسے ناز بھی کہتے ہیں۔“

طلبا اور طالبات کی بھیڑ میں ضمیراحمد کھڑا ہوا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”اے! تم تو نام کے شریف ہو‘ میرے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلا رہے ہو۔ میں نے کب تم سے خط لکھوایا تھا اور کیا میرا انگوٹھا زخمی ہے؟ یہ دیکھو۔“

اس نے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے دکھائے۔ کسی پر بھی پٹی بندھی ہوئی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی انگوٹھا زخمی تھا۔ شریف تمام چوٹوں کی تکلیف بھول کر حیرانی سے ضمیراحمد کو دیکھنے لگا۔ پروفیسر نے کہا۔ ”شریف! ہم نے تمہارا تعلیمی ریکارڈ دیکھا ہے۔ تم غیر معمولی ذہانت کے حامل ہو اور ایسی حرکتیں کرتے ہو؟“

وہ روتے ہوئے بولا۔ ”سر! میں جو کچھ بھی کہوں گا‘ اس پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے ساتھ اتنا سنگین مذاق کیا جائے گا۔ آپ میری حالت دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے کس بری طرح مارا ہے پھر بھی یہ کم ہے۔ سر! آپ بھی

مجھے سزا دیں اور میں آپ سب سے کہتا ہوں۔ آپ بھی مجھے ماریں۔ میں اس ماحول میں رہنے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے مار مار کر یہاں سے نکال دیں۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پروفیسر نے کہا۔ ”جمال! یہ نیا اسٹوڈنٹ ہے۔ اسے معاف کر دو۔“

”نو سر! وڈیرے سائیں کمال صالح کی بیٹی کی طرف دیکھنے والوں کی آنکھیں نکال لی جاتی ہیں۔ اس نے جس ہاتھ سے خط لکھا ہے‘ وہ ہاتھ میں توڑنے والا تھا۔ آپ سفارش کر رہے ہیں تو اسی صورت میں اسے معاف کیا جا سکتا ہے کہ یہ اسی ہاتھ سے میری بہن کے پاؤں چھو کر معافی مانگے۔“

مخالف پارٹی کے لیڈر نے کہا۔ ”تم وڈیرے کی اولاد ہو گے اپنے علاقے میں۔ یہ یونیورسٹی تمہارے باپ کی نہیں ہے اور یہ نصیرالدین شریف تمہارے باپ کے کھیتوں کا ہاری مزدور نہیں ہے۔ یہ تمہاری بہن کے سامنے نہیں جھکے گا۔“

مخالف لیڈر کی باتیں سنتے ہی دونوں پارٹیوں کے اسٹوڈنٹس دوڑتے ہوئے ایسی جگہ جانے لگے جہاں انہوں نے ہاکیاں اور ڈنڈے چھپا رکھے تھے۔ ان کے لیڈروں نے اپنے اپنے لباس کے اندر سے ٹی ٹی نکال لی۔ پروفیسر نے جمال صالح کے سامنے ڈھال بن کر کہا۔ ”تم اپنا ہتھیار پھینک دو۔ میں تم پر گولی نہیں چلنے دوں گا۔“

شریف نے مخالف لیڈر سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”خدا کے لئے یہ ہتھیار پھینک دو۔ کتابیں اٹھا لو۔ میرے معاملے کو اتنا نہ بڑھاؤ۔ یہ جھگڑا ابھی ختم ہو جائے گا۔ میں اسے ختم کروں گا۔“

ہاکیوں اور ڈنڈے والے ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر رکے ہوئے تھے۔ شریف نے کہا۔ ”میں یہاں پہلی بار آیا ہوں۔ کسی کو نہیں جانتا ہوں۔ میں جمال صالح کو کسی وڈیرے کے رشتے سے نہیں‘ ایک بھائی کے رشتے سے سمجھ رہا ہوں۔ یہ غیرت مند بھائی ہے۔ اگر میرے اس ہاتھ نے اس کی بہن کو خط لکھا ہے تو میری یہ سزا کم ہے کہ میں اس کی بہن کے پیروں کو ہاتھ لگاؤں۔ میں ہاتھ لگاؤں گا‘ میرے ہاتھ لگانے سے کسی کی ناک نہیں کٹے گی۔ کسی کا سر نہیں جھکے گا لیکن آپ مجھے اس لیے روک رہے ہیں کہ یہ جھگڑا سیاسی رنگ اختیار کر لے اور تعلیم حاصل کرنے کی یہ جگہ میدانِ جنگ بن جائے۔ یہ علوم کی عبادت گاہ ہے۔ میں یہاں سر جھکا کر اس جھگڑے کو ختم کر رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ نازاں کے سامنے آیا پھر جھک کر دونوں ہاتھوں سے اس کے پیروں کو چھو کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ نازاں پیچھے ہٹ کر وہاں سے پلٹ کر اپنے بھائی اور اس

کے اسٹوڈنٹ یونین والوں کے ساتھ جانے لگی۔ دوسری پارٹی کے لیڈر اور اس کے ساتھی بھی جانے لگے۔ وہاں صرف وہی طلبا اور طالبات رہ گئے تھے جو صرف تعلیم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اور پروفیسر کے سر جھکے ہوئے تھے پھر ایک لڑکے اور دو لڑکیوں نے آ کر شریف کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اسے زمین پر سے اٹھایا۔ ایک لڑکی اپنے دوپٹے کے آنچل سے اس کے چہرے سے مٹی اور لہو پونچھنے لگی پھر وہ سب اسے واش روم کی طرف لے گئے۔

دوسرے دن وائس چانسلر' تمام پروفیسروں اور یونیورسٹی کے ذمے دار اراکین کی میٹنگ ہوئی۔ نصیرالدین شریف کے سلسلے میں کہا گیا کہ ضمیر احمد نے اسے یقیناً بے وقوف بنایا ہو گا۔ کیونکہ وہ دوسری پارٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے اپنی سیاسی پارٹی کی طرف سے سگنل ملا ہو گا کہ تین ماہ میں انتخابات ہونے والے ہیں۔ لہٰذا سٹوڈنٹس کے حلقوں میں اپنے مخالفین کو کچل کر اپنی برتری ثابت کرنے کا سلسلہ الیکشن تک جاری رکھا جائے۔

دوسری طرف جمال صالح کی پارٹی بھی تیار تھی۔ چونکہ ابتدا تھی اس لیے ہاکیاں اور ڈنڈے نکالے گئے تھے۔ انہوں نے خطرناک قسم کے ہتھیار بھی کہیں چھپا رکھے ہوں گے۔ ویسے نصرالدین شریف کی شرافت اور ذہانت کے باعث ایک بہت بڑے فساد کی ابتدا ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔

انہوں نے نصیرالدین شریف اور دوسرے طلبا و طالبات کو بڑے ہال میں بلا کر ان سب کے سامنے اعتراف کیا کہ شریف کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود اس نے یونیورسٹی کی عزت باقی رکھی ہے اور تعلیمی ماحول کو دنگے فساد سے پاک رکھا ہے۔ آنے والے دنوں میں سیاسی ہنگامے متوقع تھے۔ اس لیے تمام طلبا و طالبات کو نصیحت کی گئی کہ وہ تعلیم کی طرف زیادہ سے زیادہ دھیان دیں۔ جن ہاتھوں کو قلم پکڑنا چاہیے' انہیں ہتھیار پکڑنے سے گریز کرنا چاہیے۔

لیکن نصیحتیں بہت کم لوگوں پر اثر کرتی ہیں۔ جن طلبا کو سیاسی پارٹیوں سے بڑی بڑی رقمیں اور اسلحہ ملتا تھا' وہ ان رقموں سے عیاشی کرنے اور اسلحے کے ذریعے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے عادی ہو گئے تھے اور ہتھیاروں کے ذریعے طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو جنونی مسرتیں حاصل ہوتی ہیں' ان کے سامنے نصیحتیں ڈھل کر رہ جاتی ہیں۔

ایک ہفتے بعد ایک صحت مند نوجوان وائس چانسلر کے کمرے میں آیا۔ اس نے اسے ایک لفافہ دیا۔ لفافے کے اندر ایک سیاسی پارٹی کے لیڈر کا خط تھا۔ اس میں لکھا ہوا

تھا۔ "جناب وائس چانسلر! حاملِ رقعہ کا نام راجہ نواز ہے۔ بہت ذہین طالب علم ہے۔ آپ چاہیں گے تو اسے یونیورسٹی میں داخلہ مل جائے گا اور آپ ضرور چاہیں گے۔ اسلام آباد میں ہماری پارٹی کے بڑے لیڈر آپ کے فون کے منتظر ہیں۔ ان کا فون نمبر اگر آپ بھول گئے ہیں تو وہ نیچے لکھا ہوا ہے۔ پلیز فوراً رابطہ کریں۔"

وائس چانسلر نے وہ خط پڑھ کر راجہ نواز کو گھور کر دیکھا پھر کہا۔ "میں خوب سمجھتا ہوں کہ تم کتنے ذہین ہو گے۔ تمہاری ذہانت سیاسی لیڈروں کے کام آئے گی لیکن جن والدین نے خون پسینے کی کمائی سے تمہیں تعلیم دلائی ہے' کیا وہ جانتے ہیں کہ تم قلم چھوڑ کر ہتھیار پکڑنے والے ہو؟"

"سر! میں اپنے والدین کی قسم کھا کر کہتا ہوں جب تک مجھے اپنی جان خطرے میں نہیں نظر آئے گی' میں کسی ہتھیار کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

"کسی بھی اسٹوڈنٹس یونین سے تعلق رکھو گے تو دنگے فساد ہوں گے پھر تمہیں ہتھیار اٹھانا ہی پڑے گا۔"

"میرے ہاتھ میں یہ کتاب ہے۔ اس سے میں علم حاصل کرتا ہوں۔ اس کی قسم کھا کر آپ سے وعدہ کرتا ہوں کسی بھی اسٹوڈنٹس یونین سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔"

"تعجب ہے پھر ایسی سیاسی پارٹی کی طرف سے تمہارے لیے سفارش کیوں آئی ہے؟"

"انہوں نے جس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر مجھے یہاں تک پہنچایا ہے' ان کی وہ خوش فہمی بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ آپ میری قسم اور وعدے پر یقین کریں اور اسلام آباد والوں سے رابطہ کریں۔"

وائس چانسلر نے اسلام آباد کے سب سے بڑے پارٹی لیڈر سے رابطہ کیا۔ ادھر سے کہا گیا۔ "ہیلو! وہ جوان راجہ نواز آپ کے سامنے کھڑا ہو گا۔ میں تحریری طور پر کسی کی سفارش نہیں کرتا۔ ایسی تحریریں بعد میں اخبار والوں کے ہاتھ لگ جاتی ہیں۔ کیا فون پر کہنا کافی ہے کہ اسے یونیورسٹی میں داخل کر لیں۔"

چانسلر نے کہا۔ "جناب! آپ کا اتنا کہہ دینا ہی ہمارے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ یونیورسٹی بدنام نہ ہو۔ آپس میں لڑنے والے طلبا یہاں کی لائبریری اور لیبارٹری وغیرہ کو نقصان نہ پہنچائیں۔ اگر آپ تمام سیاسی لیڈران اپنے اپنے زیر اثر طلبا کو سمجھائیں گے تو وہ یونیورسٹی کے احاطے کے اندر کوئی گڑبڑ نہیں کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ انہیں سمجھا دیا جائے گا۔"

دوسری طرف سے رابطہ ختم کر دیا گیا۔ وائس چانسلر نے ریسیور رکھ کر کہا۔ "اپنے کاغذات دکھاؤ۔"

راجہ نواز نے اس کے سامنے ایک فائل پیش کر دی۔ نازاں وہاں سے گزر رہی تھی۔ اس نے راجہ نواز کو دیکھا پھر پریشان ہو کر اپنے بھائی کی کلاس کی طرف جانے لگی۔ راجہ کو اس نے پہلی بار ایک شاپنگ سینٹر میں دیکھا تھا۔ اگرچہ وہ کسی کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کرتی تھی۔ کوئی اجنبی اسے مخاطب کرے تو اسے جھڑک دیتی تھی۔ وڈیرا شاہی کے ماحول میں پرورش پائی تھی اس لیے دوسروں کو خود سے کمتر سمجھتی تھی۔ وہ لفٹ میں آکر چوتھی منزل تک جانا چاہتی تھی۔ اس لفٹ کا دروازہ بند ہونے سے پہلے راجہ نواز اندر آگیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ لفٹ اوپر جانے لگی۔ وہ اسے گھور کر دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا میرے باڈی گارڈ نے تمہیں نہیں روکا؟"

وہ بولا۔ "تمہارے گارڈ کے روکنے سے میں رک نہیں سکتا تھا۔ یہ لفٹ سب کے لیے ہے۔"

"لیکن جب میں لفٹ میں جاتی ہوں تو کوئی اجنبی میرے ساتھ نہیں ہوتا۔ میرا گارڈ اسے باہر روک دیتا ہے۔"

لفٹ دوسری منزل سے اوپر جاتے جاتے رک گئی۔ وہ بولا۔ "تعجب ہے۔ یہ لفٹ بھی تمہارے مزاج کو سمجھتی ہے۔ اس لیے رک گئی تاکہ مجھے یہاں سے بھگا سکو۔"

نازاں نے دروازہ کھولنے کا بٹن دبایا لیکن وہ نہیں کھلا۔ لفٹ کے سسٹم میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ راجہ نواز نے کہا۔ "افسوس! حالات تمہیں مجبور کر رہے ہیں کہ مجھے اپنے قریب برداشت کرو۔ بائی دا وے تم کہاں کی ملکہ عالیہ ہو کہ تمہارے گارڈز کسی اجنبی کو لفٹ میں تمہارے قریب نہیں آنے دیتے؟"

وہ غرور سے سینہ تان کر بولی۔ "میں تھر کے سب سے بڑے وڈیرے سائیں کمال صالح کی بیٹی ہوں۔ ڈیفنس میں ہماری عالی شان کوٹھی ہے۔ کاریں ہیں اور تمہارے جیسے درجنوں ملازم ہیں۔"

اس نے بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا پھر اسے دونوں بازوؤں کے حصار میں جکڑ کر بولا "تم نے چیلنج کیا ہے تو مجھے ثابت کرنا ہو گا کہ میں تمہارا ملازم نہیں ہوں۔"

اسے یوں لگا جیسے فولادی شکنجے میں کس دی گئی ہو۔ وہ غصے سے خود کو چھڑانے کے لیے ہل بھی نہیں سکتی تھی۔ جھنجلا کر بولی۔ "چھوڑو۔ چھوڑو مجھے۔"

"ملازم ہوتا تو حکم مان کر چھوڑ دیتا۔ آج کے بعد تمہیں یہ سبق یاد رکھنا چاہیے کہ تم سب سے برتر نہیں ہو۔ تمہاری زندگی میں آنے والا مرد تم سے برتر رہا کرے گا۔"

وہ بڑی مشکلوں سے سانس لیتے ہوئے بولی۔ "چھوڑو مجھے۔ میری سانس رک رہی ہے۔"

اس نے گرفت ڈھیلی کی مگر اسے نہیں چھوڑا۔ وہ گہری گہری سانس لے کر بولی "آج تک کسی مرد نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا۔ آج تم نے اپنی موت کو دعوت دی ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو' اس شاپنگ سینٹر سے زندہ جا سکو گے؟"

اس نے ریشمی زلفوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کے سر کو اٹھایا پھر اس کے چہرے پر جھک گیا۔ وہ تڑپنے اور مچلنے لگی۔ اوں اوں کہہ کر خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ لفٹ کے باہر شاپنگ سینٹر کے منتظم پریشان تھے۔ اندر یہ بے حال ہو رہی تھی۔ باہر مکینک وغیرہ لفٹ کی خرابی دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اندر وہ بگڑی ہوئی گھوڑی کو سدھا رہا تھا پھر اس نے اسے الگ کر کے دھکا دیا۔ وہ پیچھے لفٹ کی دیوار سے ٹکرا گئی۔ اسے وحشت سے دیکھتے ہوئے ہانپنے لگی۔

وہ تنبیہہ کے انداز میں انگلی دکھاتے ہوئے بولا۔ "جھک کر بولنا سیکھ لو۔ تیسری بار چیلنج کرو گی تو بدن پر یہ لباس نہیں رہے گا۔"

وہ سہم کر اپنے ہانپتے ہوئے سینے پر بازوؤں کی قینچی بنا کر ایک طرف کھسکتے ہوئے ایک گوشے میں دبک گئی' گھبرا کر بولی۔ "نن۔ نہیں۔ مجھ کو۔ مم۔ میرے لباس کو ہاتھ نہ لگانا۔"

"اور تم مجھے مجبور نہ کرنا۔ لفٹ ابھی چل پڑے گی۔ باہر نکلتے وقت میرے خلاف چیخ چیخ کر بولنا چاہو گی تو میں..........."

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر جیب سے ایک پستول نکالا پھر کہا۔ "باہر نکلتے وقت یہ میری جیب میں ہو گا اور تم نشانے پر ہو گی۔ اپنے گارڈ یا کسی بھی شناسا سے کہو گی کہ لفٹ میں بند رہنے کے باعث گھٹن محسوس کر رہی ہو اس لیے ٹھنڈا مشروب پینے کے لیے میرے ساتھ گراؤنڈ فلور کے ریستوران میں جا رہی ہو۔ وہاں کوئی تمہارے ساتھ نہ آئے۔ میری ان باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کرو گی تو بھری جوانی میں میرا بھلا کیے بغیر دنیا سے چلی جاؤ گی۔"

اس نے پستول کو جیب میں رکھا پھر کہا۔ "میں کسی کا چیلنج برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے مجبور ہو کر زندگی میں پہلی بار ایک جوان لڑکی کو ہاتھ لگایا ہے۔ غصے اور نفرت کے

دوران میں نے تمہیں اتنا قریب کر لیا کہ اب زندگی کی آخری سانس تک تمہاری ہی قربت چاہوں گا۔ تم جب بھی دلہن بنو گی میری ہی بنو گی۔"

وہ غصے سے اس کی اوقات کی بات کرنا چاہتی تھی پھر خیال آیا کہ یہ بات بھی اس کے لیے چیلنج ہو گی پھر نہ جانے وہ کیا کر بیٹھے گا۔ وہ سہم کر ایک گوشے میں کھڑی ہوئی تھی۔ اسی وقت لفٹ میں حرکت پیدا ہوئی۔ راجہ نواز نے گراؤنڈ فلور پر جانے کے لیے بٹن دبایا پھر اس نے کہا۔ "یہاں میرے پاس آ کر دوستانہ انداز میں مسکراتے رہنے کی کوشش کرتی رہو۔ تمہارے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو گی تو میں بری طرح پیش آؤں گا۔"

لفٹ کا دروازہ کھل گیا۔ وہ گراؤنڈ فلور پر پہنچ گئے۔ شاپنگ سینٹر کی انتظامیہ سے تعلق رکھنے والے چند خوش لباس حضرات کھڑے ہوئے تھے۔ نازاں کا ایک باڈی گارڈ بھی کھڑا ہوا تھا۔ انتظامیہ والے ان دونوں سے معذرت چاہتے ہوئے لفٹ کی خرابی کے بارے میں بتانا چاہتے تھے۔ راجہ نواز نے کہا۔ "جو ہو گیا' سو ہو گیا۔ پلیز ہمیں تنہا چھوڑ دیں۔"

وہ تیزی سے چلتے ہوئے ریستوران کی طرف جانے لگے۔ نازاں نے اپنے مسلح باڈی گارڈ سے کہا۔ "میں اس ریستوران میں جا رہی ہوں' تم باہر انتظار کرو۔"

وہ دونوں ریستوران کے اندر ایک چھوٹی سی میز کے اطراف بیٹھ گئے۔ راجہ نواز نے دو ٹھنڈی بوتل کا آرڈر دیا۔ ویٹر چلا گیا۔ وہ بولی۔ "میں نہیں پیوں گی۔"

"میرے ساتھ بیٹھ کر پینے سے تمہاری اوقات وہی رہے گی جو لفٹ کے اندر میری آغوش میں تھی۔ مرد کی حکمرانی میں آجانے والی کو نخرے نہیں کرنا چاہئیں۔"

وہ بے بسی سے اپنے ہونٹوں کو کاٹنے لگی' اس نے کہا۔ "تمہارے لبوں کی سرخی میرے دھوبی گھاٹ میں دھل گئی ہے۔ پرس میں آئینہ ہو گا' حلیہ درست کر لو۔"

اس نے پرس سے آئینہ نکال کر اپنا چہرہ نہیں دیکھا۔ اس کے سامنے توہین بھی محسوس کر رہی تھی اور شرم بھی۔ دوپٹے سے اپنے چہرے کو اور لبوں کو صاف کرنے لگی۔

ویٹر نے دو بوتلیں لا کر ان کے سامنے رکھ دیں۔ وہ اپنی بوتل اٹھا کر بولا۔ "چلو پیو۔"

وہ بوتل کو ہاتھ نہیں لگا رہی تھی' اس نے کہا۔ "جتنی جلدی پیو گی' اتنی ہی جلدی مجھ سے نجات ملے گی۔"

وہ فوراً ہی بوتل کو ہاتھ میں لے کر پینے لگی اور سوچنے لگی۔ اپنی توہین کا انتقام کیسے لے۔ باپ اور بھائی کو معلوم ہو گا تو وہ اس پر شکاری کتے چھوڑ دیں گے لیکن وہ کس منہ

سے بتائے گی کہ اجنبی نوجوان نے اس کے ساتھ کیسی کیسی حرکتیں کی ہیں؟

راجہ نواز نے کہا۔ "میں نے ایک ماہ پہلے تمہیں دیکھا تھا۔ تب ہی دل سے کہا کہ تم میرے لیے پیدا ہوئی ہو۔ میں تمہیں دور ہی دور سے دیکھتا رہا اور تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا۔ پھر تمہاری کوٹھی کا نمبر' کار کا نمبر اور فون نمبر اور بہت کچھ معلوم کر چکا ہوں۔ تمہارے تیس مار خان بھائی کو بھی دیکھ چکا ہوں۔"

وہ بول رہا تھا اور وہ مشروب پیتے ہوئے خاموشی سے سن رہی تھی۔ اس نے کہا "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آج میرے دل سے لگ جاؤ گی۔ میں زندگی میں پہلی بار تمہارے لیے دیوانگی محسوس کر رہا ہوں مگر میں تمہارے وڈیرے باپ کی رعایا کی طرح ہاتھ پھیلا کر تمہیں نہیں مانگوں گا۔ وہ تمہیں خوشی سے نہیں دیں گے تو چھین کر لے جاؤں گا۔"

یہ کہتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایسے سہم گئی جیسے وہ پھر اسے دریافت کرنے آ رہا ہو لیکن وہ تیزی سے چلتا ہوا واش روم کی طرف جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اسی وقت وہ وہاں سے بھاگ کر اپنے گارڈ کے پاس ریستوران کے باہر جا سکتی تھی لیکن اب بھاگنا کیا ضروری تھا؟ وہ اس کا کیا بگاڑ سکتی تھی؟ کسی کو لفٹ کی کوئی بات بتاتی تو اپنی انسلٹ ہوتی۔ چور تو تجوری کے اوپر ہی اوپر چرا کر جا چکا تھا۔

اس نے ویٹر کو بلا کر مشروب کا بل ادا کیا پھر سر جھکا کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ریستوران سے باہر چلی گئی۔ اس دن سے اس کے کچھ عجیب سے احساسات ہو گئے۔ وہ اپنی خاندانی برتری اور غرور سے باز نہیں آ سکتی تھی۔ عام حالات میں اس کے متعلق غصے اور نفرت سے سوچتی تھی لیکن راتوں کو کبھی کبھی نیند اڑ جایا کرتی تھی۔ اس کے نہ چاہنے کے باوجود لفٹ کا منظر نگاہوں کے سامنے جھلکنے لگتا تھا۔ کبھی ہونٹ سلگنے لگتے تھے۔ کبھی بدن ایسے گرم ہو جاتا تھا جیسے بخار چڑھ رہا ہو۔ وہ سمجھنا نہیں چاہتی تھی کہ ان کیفیات کے پیچھے وہ اجنبی اس کا مطلوب بن گیا ہے۔

باڈی گارڈ نے اس کے بھائی جمال صالح کو بتا دیا تھا کہ بے بی ایک اجنبی کے ساتھ لفٹ میں آدھے گھنٹے تک پھنسی رہی تھی۔ اس کے بھائی نے پوچھا۔ "نازا! کون تھا وہ اجنبی؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "پتا نہیں کون تھا۔ وہ مجھ سے میرا نام پوچھ رہا تھا۔ میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ وہ فری ہونا چاہتا تھا۔ میں نے دھمکی دی کہ میرے مسلح گارڈز گراؤنڈ فلور اور تھرڈ فلور پر ہیں۔ اس نے کوئی بدتمیزی کی تو اسے گولی مار دیں گے۔"

"لیکن گارڈ کہہ رہا تھا تم اس کے ساتھ ریستوران میں گئی تھیں' کیوں گئی تھیں؟"

وہ تھوڑی دیر تک سر جھکائے چپ رہی۔ بھائی نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "بولتی کیوں نہیں؟"

"میں۔ میں کیا بولوں؟ اس کے پاس پستول تھا۔ اس نے کوٹ کی جیب میں رکھ کر دھمکی دی تھی کہ اس کے ساتھ ریستوران نہیں جاؤں گی تو وہ مجھے گولی مار دے گا۔"

وہ غصے سے راجہ نواز کو گالیاں دینے لگا۔ نازاں سے بولا۔ "تم میرے ساتھ یونیورسٹی جاتی آتی ہو۔ وہ کہیں نظر آئے تو مجھے بتا دینا۔ میں اسی لمحے.......... اسے گولی مار دوں گا۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا اپنے بیڈ روم میں آگیا۔ وہ عزت اور شرم سے یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ وہ لفٹ کے اندر پستول دکھا کر آدھے گھنٹے تک اس سے کیا سلوک کرتا رہا۔ پوچھنا ضروری نہیں تھا۔ بات بہت دور تک سمجھ میں آرہی تھی وہ غصے اور جوش میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

نازاں بھی نادان نہیں تھی۔ وہ اپنے طور پر حقیقت چھپانے کے باوجود ایک پستول کے ذکر کے سبب یہ سمجھ رہی تھی کہ بھائی نے بہت کچھ سمجھ لیا ہے۔ اب وہ کرائے کے قاتلوں کو اس کے پیچھے لگا دے گا لیکن بھائی اس اجنبی کو صورت شکل سے نہیں پہچانتا تھا۔ نازاں ہی اس کی نشان دہی کر سکتی تھی۔

اور اب وہ دو ہفتے کے بعد اسے وائس چانسلر کے کمرے میں نظر آیا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی گھبرا گئی تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی دیوانگی میں مرنے کے لیے وہ یونیورسٹی تک چلا آئے گا۔ نازاں پہلے تو بے اختیار دوڑتی ہوئی اور تیز تیز چلتی ہوئی بھائی کی کلاس کی طرف جا رہی تھی پھر اچانک رک گئی۔ اگر اس سے رکنے کی وجہ پوچھی جاتی تو وہ اپنے لاشعور کی بات نہ سمجھ پاتی اور نہ کہہ پاتی کہ ایک دیوانہ اس کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر آیا ہے اور وہ نہیں چاہتی کہ وہاں خون خرابہ ہو۔

بظاہر اس نے یہ سوچا کہ وہ اجنبی بھی اس کے بھائی کی طرح ہتھیار چھپا کر رکھتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بھائی کے پاس جا کر اجنبی کی نشان دہی کرے بھائی اسے گولی مارنا چاہے' اس سے پہلے وہ بھائی کا کام تمام کر دے۔

وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ برآمدے میں کھڑی سوچنے لگی۔ چند طلبا اور طالبات اس کے قریب سے گزر رہے تھے۔ وہ اس سے بولتے نہیں تھے۔ جب سے اس نے اور اس کے بھائی نے ایک نیک اور ذہین طالب علم نصیر الدین شریف کو اس کے پیر چھونے پر مجبور کیا

تھا' بہت سی طالبات اس سے نفرت کرنے اور اس سے دور رہنے لگی تھیں۔ ایک طالبہ اس کی راز دار سہیلی تھی۔ اس نے قریب آکر پوچھا۔ "نازاں! تم یہاں ہو اور میں تمہیں ڈھونڈنے فزکس کی کلاس کی طرف گئی تھی۔"

نازاں نے کہا۔ "رابعہ! میرا ایک کام کرے گی۔"

"تم تو ایسے پوچھ رہی ہو جیسے کوئی خطرناک کام کرانے والی ہو۔"

"ہاں۔ اسے خطرناک ہی سمجھو۔ میں تمہارے بوائے فرینڈ کے بارے میں تمہاری راز دار ہوں۔ آج سے تم بھی میری راز دار رہو گی۔"

"ہائے نازاں! تجھے بھی کسی سے عشق ہو گیا ہے؟"

"فضول بات نہ کر۔ ایک سرپھرا یہاں آیا ہے۔ وہ مجھ سے لفٹ لینا چاہے گا تو بھائی جان اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"جب تمہیں اس سے کوئی لگاؤ نہیں ہے تو اس نادان عاشق کو سزا پانے دو۔"

"تم بات نہیں سمجھ رہی ہو۔ وہ سرپھرا بھی اپنے پاس ہتھیار رکھتا ہے۔ میرے بھائی کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

"تم اس سرپھرے کو اس کے ارادوں سے کیسے باز رکھو گی؟"

"میں اس سے تنہائی میں مل کر اسے سمجھانا چاہتی ہوں۔ اس سے باتیں کرنے کے لیے لائبریری مناسب رہے گی۔ تم اس سے کہو' میں لائبریری میں اس کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"وہ کون ہے؟ اور کہاں ہے؟"

"وائس چانسلر کے کمرے میں بہت دیر سے ہے۔ اب نکلنے والا ہو گا۔ میرے ساتھ چل کر اسے دیکھ لو۔ میں آگے لائبریری چلی جاؤں گی۔"

وہ دونوں ایک طرف کوریڈور میں آئیں پھر اپنی رفتار سست کرتی ہوئی وائس چانسلر کے کمرے کے سامنے سے گزرنے لگیں۔ اسی وقت وہ اچانک کمرے سے باہر آیا۔ ۲۱ سے سامنا ہوتے ہی وہ اپنی سہیلی رابعہ کے پیچھے آکر سرگوشی میں بولی۔ "یہ

راجہ نواز نے کہا۔ "کیا بات ہے۔ صاف چھپتے بھی نہیں سا۔ ۓ کسی بھی طالب میں ابھی تمہیں ہی ڈھونڈنے جا رہا تھا۔"

رابعہ نے کہا۔ "دیکھو مسٹر! زیادہ فری نہ ہونا۔ دوسرا، کہ کوئی میرے سامنے یہاں تم دونوں سب ہی کی نظروں میں آتے رہو گے۔ میری ے ہوئے تھے۔" ے ساتھ بیٹھنے پر اعتراض تم بھی وہاں جاؤ۔"

"میں پہلی بار یونیورسٹی آیا ہوں۔ لائبریری کہاں ہے؟"
رابعہ نے کہا۔ "نازاں! تم جاؤ۔ میں اندھے کی لاٹھی بن کر آرہی ہوں۔"
پہلے نازاں چلی گئی۔ رابعہ، راجہ کے ساتھ باتیں کرتی ہوئے سست رفتاری سے چلتے ہوئے لائبریری میں آئی۔ وہاں کئی طلبا و طالبات بڑی بڑی میزوں کے اطراف ایک دوسرے سے دور دور بیٹھے ہوئے تھے۔ کئی جگہ لڑکیاں اور لڑکے دو ہنسوں کے جوڑے کی طرح کتابیں سامنے رکھ کر دھیمی آواز میں راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے۔ نازاں دور ایک گوشے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ راجہ نواز اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔ "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"
"تم ہی نے آنے کو کہا تھا۔"
"میں لائبریری کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ یونیورسٹی کیوں آئے ہو؟"
"داخلہ لینے آیا تھا، داخلہ مل چکا ہے۔"
وہ حیرانی اور بے یقینی سے بولی۔ "تم یہاں پڑھو گے اور روزانہ آیا کرو گے؟"
"ہاں روز ملاقات کرنے کے لیے میں نے بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔ داخلے کے لیے سفارشی لیٹر لینے کی خاطر چھاچھرو گیا تھا۔ وہاں تمہارے بابا سائیں سے ایک خط لکھوا کر لایا۔ اس خط کے ذریعے میرے داخلے کے لیے اسلام آباد سے سفارش آگئی۔"
وہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہی تھی پھر بولی۔ "تم۔ تم میرے بابا سائیں سے ملنے گئے تھے؟"
"ہاں وہ سمجھ رہے تھے کہ ایک سفارشی خط لکھ رہے ہیں۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ مجھے اپنی بیٹی سے ملنے کا اجازت نامہ لکھ رہے ہیں۔ اپنی اپنی سمجھ کی بات ہوتی ہے۔"
وہ جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ راجہ نواز نے پوچھا۔ "سچ بتاؤ۔ ان دو ہفتوں میں مجھے یاد کرتی رہی ہو؟"
"فضول باتیں نہ کرو۔ کیا بابا سائیں سے مل کر بھی تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں
بظاہر ، لوگ ہیں دولت مند ہونے کے علاوہ ہم اسلام آباد تک وسیع ذرائع
ہے۔ ایسا نہ ہو
چاہیے، اس سے پہلے ور سے چھوٹے ہو۔ میرے ٹھوس اور وسیع ذرائع تو اللہ اور رسول
وہ تذبذب میں پ
قریب سے گزر رہے تھے "باتیں نہ بناؤ۔ ہم بھی مسلمان ہیں۔ ہمارے بھی وہی ذرائع
بھائی نے ایک نیک اور ذ رہنے کے لیے دولت اور سیاسی قوت حاصل کرنا لازمی ہے۔

پریکٹیکل لائف کو سمجھو۔ اونچے سے اونچا اسٹیٹس حاصل کرنے کے لیے صرف روحانی نہیں، مادی وسائل بھی لازمی ہوتے ہیں۔"
"مجنوں نے صحرائی بن کر اور رانجھا نے جوگی بن کر اعلیٰ مقام یعنی کہ سو کالڈ اونچا اسٹیٹس حاصل کیا تھا اور قیامت تک انہیں یہ اعلیٰ مقام حاصل رہے گا۔"
"لیکن انجام کار وہ بے موت مارے گئے تھے۔"
"میں بھی سر سے کفن باندھ کر آیا ہوں۔"
"اچھی طرح جینے اور خوب انجوائے کرنے کے لیے زندگی ایک ہی بار ملتی ہے اور میں وقت سے پہلے مرنا نہیں چاہتی۔"
"میں تمہیں محبت سکھاؤں گا تو تم مرنا سیکھ جاؤ گی۔"
"آخر کیوں ضد کر رہے ہو؟ خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔"
"ایک بات گرہ میں باندھ لو۔ میں جینا چھوڑ سکتا ہوں، تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ آج تمہاری خاطر یہاں تک آیا ہوں۔ کل تمہارے ساتھ موت کے گھاٹ اتر جاؤں گا"
"کیوں زبردستی کر رہے ہو۔ اپنے ساتھ میری موت کا سامان کیوں کر رہے ہو؟"
"کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہمیں موت آئے۔ ہماری موت بننے والوں کو موت آسکتی ہے۔"
رابعہ لائبریری کے باہر چند طالبات کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ اس نے جمال صالح کو دور سے آتے دیکھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ آرہا تھا جو دنگے فساد کے وقت پیش پیش رہا کرتے تھے۔
رابعہ تیزی سے چلتے ہوئے لائبریری میں آئی اور نازاں کے قریب آکر بولی "تمہارے بھائی جان آرہے ہیں۔"
وہ خوف سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ راجہ نواز سے بولی۔ "بھائی جان کی یونین والوں میں سے کسی نے ہمیں یہاں دیکھا ہو گا اور ان سے کہہ دیا ہو گا۔ تم یہاں سے جاؤ۔"
"کس لیے جاؤں؟ میں یہاں کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ تم سے، رابعہ سے یا کسی بھی طالب علم سے یہاں بیٹھ کر باتیں کر سکتا ہوں۔"
"میرا شمار عام لڑکیوں میں نہ کرو۔ یہاں کسی کی مجال نہیں ہے کہ کوئی میرے سامنے کھڑا رہنے کی جرأت کرے۔ جبکہ تم بڑی دیر سے میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔"
"ابھی بیٹھا ہوا ہوں۔ اگر تمہیں اور تمہارے بھائی کو میرے ساتھ بیٹھنے پر اعتراض

ہو گا تو میں تمہیں جبراً یہاں سے اٹھا کر لے جاؤں گا۔"

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی پھر بھائی کو دیکھ کر چپ ہو گئی۔ وہ اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ لائبریری میں داخل ہو کر تیزی سے چلتا ہوا ان کے قریب آیا۔ پہلے اس نے غصے سے راجہ نواز کو دیکھا پھر بہن سے پوچھا۔ "تم اس کے ساتھ کب سے یہاں بیٹھی ہو؟ کون ہے یہ؟"

"یہ۔ یہ نیو ایڈمیشن ہے۔"

وہ گرج کر بولا۔ "یہ نیا اسٹوڈنٹ ہے مگر تم اس کے ساتھ کیوں ہو؟"

"وہ۔ وہ بھائی جان! ہمارے بابا سائیں نے اسے یہاں بھیجا ہے۔"

"کیا؟" جمال صالح نے راجہ نواز کو چونک کر دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا تمہارا نام راجہ نواز ہے؟"

"ہاں۔ میں راجہ نواز ہوں۔ تمہارے بابا سائیں کی مہربانی سے مجھے یہاں داخلہ مل گیا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ میرے بارے میں تمہیں فون پر بتا دیں گے۔"

"ہاں بابا سائیں نے فون پر کہا تھا کہ تم میری اسٹوڈنٹس یونین میں فرنٹ لائن کے کارکن بن کر رہو گے۔"

"میں نے تمہاری یونین میں رہنے کا وعدہ نہیں کیا ہے۔ انہوں نے میری ایک شرط مانی ہے اور میں نے ان کی ایک شرط مان لی ہے۔"

جمال صالح نے اسے ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بابا سائیں نے یہ بات کیسے مان لی کہ تم میری یونین میں نہیں رہو گے؟"

"میں سیاست سے دور رہتا ہوں۔ میرا تعلق کسی بھی سیاسی پارٹی سے نہیں ہے۔ میرے اور تمہارے بابا سائیں کے درمیان دوسری شرائط طے پائی ہیں۔"

"وہ شرائط کیا ہیں؟"

"ان کی شرط یہ ہے کہ میں یہاں تمہارا اور نازاں کا باڈی گارڈ بن کر رہوں گا۔"

جمال صالح خوش ہو گیا۔ اس کا سینہ ایک شانِ بے نیازی سے تن گیا۔ راجہ نواز نے کہا۔ "اور تمہارے بابا سائیں نے میری یہ شرط مان لی ہے کہ میں یونیورسٹی میں جس لڑکی سے عشق کروں گا اس پر ان کو اور ان کے بیٹے جمال صالح کو یعنی کہ تمہیں اعتراض نہیں ہو گا۔"

نازاں کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ دل اچانک طوفانی رفتار سے دھڑکنے لگا۔ وہ گھبرا کر اسے دیکھنے لگی۔ جمال صالح نے حقارت سے کہا۔ "اونہہ' تم ایک نہیں دس لڑکیوں سے

عشق کرو۔ ہم باپ بیٹے کو اعتراض کیوں ہو گا؟"

"مجھے یقین تھا کہ تم اعتراض نہیں کرو گے۔" پھر اس نے نازاں سے کہا۔ "تم خواہ مخواہ ڈر رہی تھیں۔ تمہارے بھائی جان کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آؤ ہم کینٹین میں چلیں۔"

"یو شٹ اپ سن آف اے بچ! ذلیل کمینے!"

وہ حملہ کرنے کے لیے لپکا۔ راجہ نے بڑی پھرتی سے ایک کرسی سامنے کر دی۔ وہ کرسی سے ٹکرا کر زمین پر گر پڑا۔ اس کے ساتھی بھی حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ اس نے ایک کے منہ پر گھونسا رسید کیا۔ دوسرے کی ٹھوڑی کے نیچے کراٹے کا ہاتھ رسید کیا۔ تیسرا ساتھی بزدل تھا۔ پیچھے ہٹ کر ذرا دور چلا گیا۔ بزدل تو سب ہی تھے۔ وہ ہاکیوں' ڈنڈوں اور ہتھیاروں کے بل بوتے پر طاقت کی دھونس جماتے تھے۔ وہ دونوں مار کھا کر دور جاتے ہوئے بولے۔ "ہم ابھی ہاکیاں لے کر آتے ہیں۔"

لائبریری کے دروازے پر دوسری پارٹی کے اسٹوڈنٹس کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے لیڈر نے کہا۔ "یہ تمہاری دلیری ہے؟ ایک جوان کو مارنے کے لیے ہاکیاں لینے جا رہے ہو۔ یہاں چپ چاپ کھڑے رہو اور اپنے لیڈر جمال صالح کو اس سے نمٹنے دو۔"

جمال صالح کرسی سمیت فرش پر گرنے کے بعد اٹھ رہا تھا۔ راجہ نے اس کے منہ پر جوتے سے ٹھوکر مار دی۔ وہ اچھل کر فرش پر دوبارہ گر پڑا۔ وہ تیسری بار بھی اٹھ نہ سکا۔ راجہ نے پھر اسے یکے بعد دیگرے دو ٹھوکریں ماریں۔ نازاں چیختی ہوئی ان کے درمیان آگئی۔ اپنے نازک ہاتھوں سے راجہ نواز کو مارتے ہوئے بولی۔ "چھوڑو میرے بھائی کو۔ تم غنڈے ہو۔ بدمعاش ہو۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ آئی ہیٹ یو۔ آئی ہیٹ یو............"

وہ اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر بولا۔ "بھائی کی حمایت میں مجھ سے نفرت کرنا چاہتی ہو۔ یہ نہیں دیکھتیں' تمہارے باپ نے جو شرط مان لی ہے' یہ اس کی مخالفت کر رہا ہے۔ اس نے ابھی وعدہ کیا تھا کہ میری محبت پر اعتراض نہیں کرے گا۔ کیا تم نے نہیں سنا تھا؟"

وہ باتوں میں الجھ گیا تھا۔ جمال صالح کو فرش پر سے اٹھنے اور لباس کے اندر سے ٹی ٹی نکالنے کا موقع مل گیا۔ وہ گرج کر بولا۔ "نازاں! سامنے سے ہٹ جاؤ۔ میں اسے گولی مار دوں گا۔"

راجہ نواز نے نازاں کو جکڑ کر اپنے سامنے ڈھال بنا لیا پھر کہا۔ "تم باپ بیٹے نے

سمجھا کہ میں کسی دوسری لڑکی سے محبت کرتا ہوں اس لیے بخوشی میری شرط مان لی۔ تمہیں اس بات کی پروا نہیں تھی کہ جس سے بھی میں عشق کروں گا' وہ کسی کی بہن اور بیٹی ہو گی۔ تو پھر میں جس سے محبت کرتا ہوں' وہ تمہاری بہن کیوں نہیں ہو سکتی؟ ہو سکتی ہے اور ہے۔ یہ نازاں میری محبت ہے۔ میری زندگی ہے۔ یہ آج پوری یونیورسٹی کو معلوم ہو گا۔ کل ساری دنیا میں چرچا ہو گا۔ میری محبت اتنی سچی اور غضب ناک ہے کہ میں تم باپ بیٹے کے لہو سے نہا کر اسے اپنی دلہن بناؤں گا۔"

پھر اس نے جمال صالح کے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اے خبردار! جمال پر حملہ نہ کرنا..........."

جمال صالح نے بے اختیار سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ راجہ نے نازاں کو ایک طرف دھکا دے کر ٹی ٹی والے ہاتھ پر ایک زوردار لات ماری۔ وہ ہتھیار ہاتھ سے چھوٹ کر فضا میں اچھل کر میز پر آ گیا۔ راجہ نے دوسری لات جمال صالح کو ماری۔ وہ پیچھے کی طرف دو تین کرسیوں سے ٹکراتا ہوا فرش پر پہنچ گیا۔ اس نے ٹی ٹی کو میز پر سے اٹھا کر اس کے چیمبر سے تمام گولیاں نکال لیں پھر خالی ٹی ٹی کو اس کے پاس فرش پر پھینک کر کہا۔ "یہ لو اپنا کھوکھلا ہتھیار اور اب اپنی طاقت دکھاؤ۔ یہاں تماشا دیکھنے والوں کو یہ تو معلوم ہو کہ تم لوگ ہتھیاروں کے بغیر کچھ نہیں ہو۔ یہاں کھڑی ہوئی طالبات میں سے کوئی بھی تم پر تھوکے گی تو تم اس کمزور لڑکی کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔"

جمال صالح کے سر پر چوٹ آئی تھی۔ خون بہہ رہا تھا۔ وہ فرش پر سے اٹھ سکتا تھا مگر شرمندگی کے باعث ذرا دیر سے اٹھنا چاہتا تھا۔ نازاں روتے ہوئے بھائی کے پاس آئی۔ اپنے دوپٹے سے اس کی پیشانی کا لہو پونچھتے ہوئے راجہ سے بولی۔ "تم نے میرے بھائی پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ میں تمہارے جیسے غنڈے اور بدمعاش سے نفرت کرتی ہوں۔ یاد رکھو بابا سائیں کو معلوم ہو گا تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

وہ بولا۔ "تم نے بھائی کا تماشا دیکھا ہے۔ ایک دن باپ کو بھی لہولہان دیکھو گی۔ میں کہہ چکا ہوں' ان کے خون سے نہا کر تمہیں اپنی دلہن بناؤں گا۔"

لائبریری کے وسیع و عریض ہال میں طلبا و طالبات کی اور انتظامیہ سے تعلق رکھنے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ ان کے درمیان سے گزر کر جانے لگا تو تمام طلبا اور طالبات تالیاں بجانے لگے۔ چند پروفیسر بھی آ گئے تھے۔ راجہ نے کہا۔ "سر! میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے نہیں ہے اور یونیورسٹی میں کبھی ہتھیار نہیں اٹھاؤں گا۔ آپ دیکھ لیں میں خالی ہاتھ آیا تھا اور خالی ہاتھ جا رہا ہوں"

وہ دونوں ہاتھ اٹھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

☆======☆======☆

ڈی سی رکن الدین کا تبادلہ ہو گیا۔ وہ تھر کے علاقے سے سکھر پہنچ گیا۔ سکھر میں پہلے ہی اس کے بیوی بچے رہتے تھے۔ ایک جوان بیٹی سائرہ تبسم کالج میں پڑھتی تھی۔ رکن الدین کو اسی جوان بیٹی کی فکر تھی۔ کیپٹن امیر حمزہ نے وارننگ دی تھی کہ اگر وہ اپنے جرائم کا اعمال نامہ خود لکھ کر عدالت میں اقبال جرم کے لیے نہیں جائے گا تو سزا کے طور پر اس کی جوان بیٹی کو اغوا کر لیا جائے گا۔ اسے اقبال جرم کے لیے اڑتالیس گھنٹوں کی مہلت دی گئی تھی۔ جس میں سے بیس گھنٹے گزر چکے تھے۔

دوسرے دن رکن الدین سکھر پہنچا تو بیوی بچے اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اس نے بیوی سے پوچھا۔ "سائرہ کہاں ہے؟"

بیگم نے کہا۔ "وہ کالج گئی ہے لیکن آپ نے گھر پر مسلح پولیس کا پہرا کیوں لگایا ہے؟ آج صبح پولیس کی گاڑی سائرہ کو کالج لے گئی ہے۔ پولیس افسر نے کہا ہے کہ واپسی میں بھی پولیس کی گاڑی سائرہ کو گھر پہنچا دے گی۔"

رکن الدین نے بیگم کو کیپٹن حمزہ کی وارننگ کے متعلق تفصیل سے بتایا۔ بیگم نے پریشان ہو کر کہا۔ "سائرہ کے امتحانات ہو رہے ہیں۔ ورنہ میں اسے کالج نہ جانے دیتی۔"

"پریشانی کی بات نہیں ہے۔ امیر حمزہ کیٹی بندر اور تھر جیسے ویران علاقوں میں کامیاب ہوتا رہا ہے۔ یہاں سکھر کی پولیس اور انتظامیہ کے مقابلے پر آئے گا تو حرام موت مارا جائے گا۔"

"پرسوں سائرہ کا آخری پرچہ ہے پھر میں اسے گھر سے نکلنے نہیں دوں گی۔ یہ لڑکیاں جوان ہو کر بڑے مسائل پیدا کر دیتی ہیں۔ آپ تو گھر سے دور رہتے ہیں' ساری پریشانیاں مجھے اٹھانی پڑتی ہیں۔"

"ہمارے ہاں چور دروازوں سے بے انتہا دولت آتی ہے۔ ہم نے عزت اور شہرت بھی کمائی ہے پھر پریشانیوں کا دکھڑا کیوں روتی ہو؟"

"میں جو دکھڑا سنا رہی ہوں' آپ بھی سن کر سر پکڑ لیں گے۔ ہماری بیٹی کے پر نکل آئے ہیں۔ کسی لڑکے سے عشق فرما رہی ہیں۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو۔ میری سائرہ ایسی نہیں ہے۔"

"اپنی اولاد کو معصوم اور نادان سمجھنے والے والدین اکثر دھوکا کھاتے ہیں۔ میں اسے روکتی ٹوکتی رہتی ہوں۔ اسے فون اٹینڈ کرنے سے بھی منع کیا ہے۔ پہلے گھنٹوں فون پر

باتیں کرتی رہتی تھی۔ اس پر پابندی عائد کی ہے تو وہ آدھی رات کے بعد فون کرتی ہے۔ مجھے تو گہری نیند سونے کی عادت ہے۔ مجھے کبھی پتا نہ چلتا مگر چھوٹی ماہرہ نے مجھے بتایا ہے۔"

"وہ لڑکا کون ہے؟ تم نے اسے دیکھا ہے؟"

"ایک بار دیکھا ہے۔ وہ ہمارے برابر کا نہیں ہے۔ ہم تو کسی سی ایس پی سطح کے داماد کے خواب دیکھتے رہے اور وہ ہے کہ ڈش کی فلمیں دیکھ دیکھ کر ایک معمولی نوجوان کو ہیرو بنا رہی ہے۔"

"ہوں۔ اسے کالج سے آنے دو۔ میں پیار سے سمجھاؤں گا۔"

وہ کالج سے دو بجے دوپہر کو واپس آتی تھی۔ اس روز نہیں آئی۔ پولیس کی جو گاڑی اسے صبح لینے گئی تھی' وہ اس کے بغیر واپس آئی۔ ایک افسر نے رکن الدین کو سلام کرکے کہا۔ "سر! بری خبر ہے۔ آپ کی صاحب زادی کو کالج پہنچانے کے ایک گھنٹے بعد ہی پتا چلا کہ وہ امتحان ہال میں نہیں ہیں۔ ممتحن سے اجازت لے کر واش روم کی طرف گئی تھیں.......... پھر واپس نہیں آئیں۔ کالج کے پچھلے گیٹ پر دو مسلح سپاہی تھے۔ وہ دونوں ایک قریبی ہوٹل سے لائی جانے والی چائے پی کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ وہاں کوئی نہیں جانتا ہے کہ صاحب زادی واش روم سے پچھلے گیٹ کی طرف کیوں گئیں۔ باہر کا کوئی شخص کالج کے اندر نہیں آیا تھا۔"

رکن الدین گم صم سا ہو کر افسر کی رپورٹ سن رہا تھا پھر وہ غصے سے دہاڑتے ہوئے بولا۔ "کیا سپاہیوں کو یہی ٹریننگ دی جاتی ہے کہ وہ ڈیوٹی کے وقت چائے پیا کریں اور رشوت لے کر کسی بھی غیر ضروری شخص کو ڈیوٹی کی جگہ آنے دیں۔ وہ کہاں گئی ہے؟ اس کا کوئی سراغ کیوں نہیں ملا؟"

"میں پورے شہر کی ناکہ بندی کرانے کے بعد یہاں آیا ہوں۔ کیپٹن امیر حمزہ کی تصویریں صبح ہی تمام علاقوں کے تھانوں میں پہنچا دی گئی تھیں۔ ہر پٹرولنگ پولیس پارٹی میں ایک لیڈی کانسٹیبل ہے۔ وہ برقع پہننے والی لڑکیوں کے نقاب اٹھا کر دیکھے گی۔ آئی جی صاحب نے کہا ہے کہ امیر حمزہ آپ کی صاحب زادی کو برقع یا چادر میں چھپا کر لے جا سکتا ہے۔"

رکن الدین کا سر چکرا رہا تھا۔ بیگم نے رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ سینے پر ہاتھ مار مار کر کہہ رہی تھی۔ "ہائے وہ ظالم میری بچی کو لے گیا ہے۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہو گا۔"

رکن الدین فون کے ذریعے ڈی آئی جی پولیس اور انتظامیہ کے عہدیداروں سے رابطے کر رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کا دل کہتا تھا کہ بیٹی کا سراغ مل گیا ہو گا۔ لیکن فون کر کے پوچھنے پر مایوسی ہوتی تھی۔

اس نے شام کو ڈی آئی جی سے کہا۔ "چھ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ پتا نہیں آپ لوگوں نے کیسی ناکا بندی کرائی ہے۔ امیر حمزہ ایک تربیت یافتہ سیکرٹ ایجنٹ رہ چکا ہے۔ وہ بڑی حکمتِ عملی سے ناکا بندی کو توڑ کر میری بیٹی کو شہر سے کہیں دور لے گیا ہو گا۔"

اس نے بات ختم کر کے ریسیور رکھا تو فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ ریسیور اٹھا کر کان سے لگا کر بولا۔ "ہیلو میں ڈی سی رکن الدین بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے ایک خاتون نے پوچھا۔ "سر! کیا میرا بیٹا کاظم آپ کے گھر آیا ہے؟"

"تم کون ہو؟ اور تمہارا بیٹا کاظم ہمارے گھر کیوں آئے گا۔"

بیگم نے شوہر کے ہاتھ سے فوراً ریسیور لیتے ہوئے کہا۔ "کاظم اسی لڑکے کا نام ہے۔"

پھر وہ فون پر بولی۔ "میں سائرہ کی ماں بول رہی ہوں۔ آپ میرے شوہر سے کیا پوچھ رہی ہیں؟"

"میں اپنے بیٹے کاظم کے لیے پریشان ہوں۔ وہ صبح پانچ بجے سے گیا ہے اور اب تک واپس نہیں آیا ہے۔ میرا بیٹا کبھی اتنی دیر تک باہر نہیں رہتا ہے۔ اگر آپ کچھ خیال نہ کریں تو میں آپ کی بیٹی سائرہ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہم اپنی بیٹی کے لیے پریشان ہیں۔ وہ صبح کالج گئی تھی پھر وہاں سے لاپتا ہو گئی۔ پورے شہر میں اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔"

"او خدایا! اس کا مطلب ہے کہ وہ دونوں ہی صبح سے لاپتا ہیں؟"

بیگم نے اچانک تیور بدل کر کہا۔ "صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تمہارے بیٹے نے میری بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ میری معصوم بچی کو بہلا پھسلا کر لے گیا ہے۔"

"آپ کی بیٹی اور معصوم؟ روز آدھی رات کے بعد میرے بیٹے سے فون پر باتیں کیا کرتی تھی۔ میں اپنے بیٹے کو سمجھاتی تھی کہ ہم آپ کی طرح مالدار نہیں ہیں۔ اسے اپنے برابر کی حیثیت والی لڑکی کو پسند کرنا چاہئے مگر میری نصیحتیں اس لیے اثر نہیں کرتی تھیں کہ آپ کی بیٹی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ اسے دیوانہ بنا کر رکھ دیا تھا۔"

"بکواس مت کرو۔ ابھی میرے میاں پولیس کے ذریعے تمہارا جینا محال کر دیں

گے۔ جب بھی تمہارا بیٹا پکڑا جائے گا' اس کی ہڈیاں پسلیاں توڑ کر تمہارے پاس بھیجیں گے۔"

بیگم نے ریسیور کریڈل پر پٹخ کر کہا۔ "ہم امیر حمزہ پر شبہ کر کے غلطی کر رہے ہیں۔ ہماری بیٹی کاظم کے ساتھ گئی ہے۔ ان دونوں نے یہاں سے بھاگنے کا منصوبہ پہلے سے بنایا ہو گا اور آج موقع پا کر نکل گئے ہیں۔ ویسے وہ اتنے چالاک نہیں ہیں۔ پولیس والوں کو دھوکا دے کر شہر سے باہر نہیں جا سکیں گے۔ وہ اسی شہر میں کہیں چھپے ہوں گے۔"

رکن الدین نے ڈی آئی جی پولیس سے رابطہ کر کے اپنی بیٹی کے بارے میں یہ نئی صورتِ حال بتائی۔ اس سے کہا کہ کاظم کے گھر پر جا کر گھر کی تلاشی لی جائے اور اس کے باپ کو حراست میں رکھا جائے۔ اس شہر کے ہر گھر اور ہر گلی کوچے میں انہیں تلاش کیا جائے۔ کاظم کے خلاف ایف آئی آر درج کرائی جائے کہ وہ ہماری بیٹی کے ساتھ ہمارے گھر سے پانچ لاکھ روپے کے زیورات اور دو لاکھ روپے نقد لے گیا ہے۔

پولیس والے اس نئی صورتِ حال کے مطابق سائرہ اور کاظم کو اسی شہر میں تلاش کرنے لگے۔ بیگم نے کہا۔ "یہ آپ نے اچھا کیا' کاظم پر اغوا کے علاوہ چوری کا بھی الزام لگا دیا۔ اب تو وہ جب بھی پکڑا جائے گا' اس سے پانچ لاکھ کے زیورات اور دو لاکھ روپے نقد وصول کیے جائیں گے۔"

رکن الدین نے چونک کر کہا۔ "بیٹی اپنی مرضی سے گئی ہے۔ خالی ہاتھ تو نہیں جائے گی۔ وہ یہاں سے نقدی اور زیورات ضرور لے گئی ہو گی۔"

بیگم فوراً ہی اٹھ کر تیزی سے چلتی ہوئی بیڈ روم میں آئی پھر ایک الماری سے چابیاں نکال کر سیف کو کھولا۔ اندر زیورات نظر آ رہے تھے۔ بڑے نوٹوں کی گڈیاں بھی تھیں۔ ان میں سے کچھ گڈیاں کم تھیں لیکن جو بات پریشان کرنے والی تھی' وہ یہ تھی کہ وہاں سے چند اہم دستاویزات غائب ہو گئی تھیں۔

ان دستاویزات کے ذریعے یہ ثابت ہو سکتا تھا کہ ڈی سی رکن الدین نے کراچی' سکھر اور نواب شاہ میں مجموعی طور پر ایک کروڑ اسی لاکھ روپے کی زمین جائداد کے حساب کے علاوہ یہ لکھا ہوا تھا کہ بیگم اور رکن الدین کے کس بینک اکاؤنٹ میں کتنے لاکھ محفوظ ہیں۔

رکن الدین چکرا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ بیگم نے پاس آ کر اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

وہ سیف کو تکتے ہوئے بولا۔ "امیر حمزہ.........."

"امیر حمزہ؟" بیگم نے پوچھا۔ "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"بیٹی تمام دستاویزات اور چھوٹی ڈائریاں لے جا کر کیا کرے گی۔ وہ چیزیں کبھی اس کے کام نہیں آئیں گی۔"

"ہاں سائرہ ایسی چیزیں نہیں لے جائے گی۔ آپ امیر حمزہ کا نام لے رہے ہیں۔ کیا اس نے اس سیف سے وہ سب کچھ چرایا ہے؟"

وہ غصے سے سیف کو گھونسا مارتے ہوئے بولا۔ "ہاں۔ یہ اسی کا کام ہے۔ وہ ہمارے بینک اکاؤنٹس سیل کرا سکتا ہے ہمارا محاسبہ کرا سکتا ہے ایک ڈی سی لیول کے افسر نے صرف چار برسوں میں ایک کروڑ اسی لاکھ کی جائدادیں کیسے خریدیں؟ اور ہمارے بینک اکاؤنٹس میں تقریباً ستر لاکھ روپے کہاں سے آئے ہیں؟ وہ ہمارے خلاف ٹھوس ثبوت لے گیا ہے۔"

"لیکن وہ یہاں کب آیا ہو گا؟ کب اس نے چوری کی ہو گی۔ کل اس سیف میں سب کچھ تھا۔ کل سے آج تک میں گھر سے باہر نہیں گئی۔ وہ یہاں چوری کرنے کب آیا ہو گا؟"

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "نہیں۔ وہ نہیں آیا ہو گا۔ یہ تمام دستاویزات بیٹی کے ساتھ گئی ہیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا' گدھے کی بچی اتنی اہم چیزیں کیوں لے گئی ہے؟ کیا میں اپنا سر پھوڑ لوں؟"

چند باتیں جو سمجھ میں آ رہی تھیں' وہ یہ تھیں کہ امیر حمزہ نے اس کی بیٹی سائرہ کو اغوا کرنے کی دھمکی دی تھی لیکن اس دھمکی پر عمل ہونے سے پہلے سائرہ خود اپنے عاشق کاظم کے ساتھ چلی گئی تھی۔

گھر سے بھاگنے والی لڑکیاں نقدی اور زیورات لے کر اپنے ہی گھر کا صفایا کر جاتی ہیں لیکن سائرہ معاشی اور مالی طور پر سہارا دینے والی کوئی چیز نہیں لے گئی تھی۔

جو ڈائری اور دستاویزات چرائی گئی تھیں' وہ سائرہ کے کسی کام آنے والی نہیں تھیں۔ یہ چیزیں رکن الدین کے خلاف امیر حمزہ کے کام آ سکتی تھیں لیکن بیگم اور رکن الدین پورے یقین سے کہہ سکتے تھے کہ امیر حمزہ نے ان کے گھر آ کر چوری نہیں کی ہے۔

ان تمام حالات کے پیشِ نظر ایک ہی بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ امیر حمزہ نے وہ ڈائری اور دستاویزات حاصل کرنے کے لیے شاید کسی حکمتِ عملی سے سائرہ کو اپنا آلۂ کار بنایا ہو گا۔

☆======☆======☆

انیلا بانو بستر کے سرہانے ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔ شانے کے زخم کی تکلیف قدرے کم ہو گئی تھی۔ ایک ڈاکٹر صبح اور شام آکر اس کا علاج کرتا تھا۔ ایک ملازمہ اس کی خدمت کے لیے موجود رہتی تھی۔ وہ کوٹھی کے جس حصے میں رہتی تھی' وہاں کی کھڑکیاں اور دروازے باہر سے بند رہتے تھے۔ اسے تاکید کی گئی تھی کہ وہ جب تک وہاں رہے' تب تک باہر جانے کی بات نہ کرے اور جب اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے وہاں سے کہیں دور پہنچا دیا جائے گا تو پھر وہ اپنی مرضی سے جہاں جانا چاہے' جا سکے گی۔

امیر حمزہ نے زخم بھرنے تک اسے وہاں پناہ دی تھی۔ انیلا نے اسے ایک ہی بار دیکھا تھا۔ دوسری بار اس سے ملنے کی خواہش کی تو اس کے خاص ماتحت نے آکر پوچھا "کیپٹن صاحب سے کیوں ملنا چاہتی ہو؟ یہاں کوئی تکلیف ہے؟ یا کسی چیز کی کمی ہے؟"

"میں مرزا نیک بخت سے تعلق رکھنے والے معاہدے کے سلسلے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ وہ معاہدہ اس کی کمزوری بن کر میرے پاس نہیں رہے گا تو وہ مجھے کہیں بھی' کسی وقت بھی قتل کرا دے گا۔"

"تم اس سے کہہ سکتی ہو کہ وہ معاہدہ تمہارے پاس ہے اور تم نے اسے کیپٹن امیر حمزہ کو امانت کے طور پر رکھنے کے لئے دیا ہے۔ کیپٹن صاحب کا نام سن کر پھر وہ کبھی تمہارے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔"

"میں اپنے والدین اور بھائی کے لیے مصیبت بن گئی ہوں۔ زخم بھرنے کے بعد گھر نہیں جاؤں گی۔ سمجھ میں نہیں آتا' اپنا ٹھکانا کہاں بناؤں؟"

"تم نیک بخت سے سودا کر سکتی ہو۔ اس سے کہہ سکتی ہو کہ تم پاکستان سے اپنے کسی پسند کے ملک میں جانا پسند کرو گی۔ وہ وہاں تمہارے رہائشی اخراجات برداشت کرتا رہے گا تو تم اس معاہدے کو منظرِ عام پر نہیں لاؤ گی۔"

"وہ ملک دشمن معاہدہ ہے۔ کیا کیپٹن صاحب اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریں گے؟ کیا میرے تحفظ کی خاطر معاہدے کے ذریعے نیک بخت کا محاسبہ نہیں کریں گے؟"

"ہم نہیں جانتے کہ کیپٹن صاحب کیا کرنے والے ہیں۔ ویسے وہ جو کریں گے' اس سے تمہیں کبھی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"کیا میں نیک بخت سے فون پر بات کر سکتی ہوں۔"

"میں ابھی فون کال کا انتظام کرتا ہوں۔ یہاں باقاعدہ ٹیلی فون نہیں ہے کیونکہ ٹیلی فون کے ذریعے اس کوٹھی کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ ہم ضرورت کے وقت ٹیلی فون پول

کے تار سے کنکشن لے کر کسی سے باتیں کرتے ہیں پھر اس کنکشن کو ختم کر دیتے

امیر حمزہ کا ماتحت چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک لمبے تار کے ساتھ ایک لے آیا۔ اسے انیلا بانو کے پاس رکھ کر چلا گیا۔ اس فون کا ایک کنکشن اس کوٹھی کے ایسے کمرے میں تھا' جہاں امیر حمزہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ریسیور کو کان سے لگایا۔ انیلا آواز سنائی دی۔ وہ مرزا نیک بخت سے کہہ رہی تھی۔ "ہیلو بدبخت! مجھے تلاش آپ کی ہو؟"

مرزا نیک بخت کی آواز سنائی دی۔ "میں ہمیشہ نیک بخت رہا ہوں لیکن تم آستین کا سانپ بن کر مجھے بدبخت بنا رہی ہو۔ کیا میں تمہاری ضرورت سے بہت زیادہ رقمیں نہیں دیتا تھا؟ ان رقومات کے علاوہ تمہاری دوسری تمام ضروریات پوری نہیں کرتا تھا؟"

"تم میرے لیے بہت کرتے تھے لیکن جتنا بھی کرتے' اس کے باوجود میں داشتہ کہلاتی رہتی۔"

"میں تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ ایک سیاست داں دوسری تیسری شادیاں کر کے نیک نام نہیں رہتا پھر میں اپنی بیوی کے مزاج کو سمجھتا ہوں۔ تم سے شادی کروں گا تو وہ اپوزیشن والوں سے مل جائے گی۔ گھر کی بھیدی بن کر میری لنکا ڈھا دے گی تم شادی کی بات نہ کرو۔ کوئی دوسری بڑی سے بڑی شرط منوا لو۔"

"میں اپنے وجود سے داشتہ کا لفظ مٹانے اور تمہاری منکوحہ بننے کے لیے پاکستان چھوڑ کر دوسرے ملک میں رہ سکتی ہوں۔ ہماری شادی کا راز پاکستان میں کسی پر نہیں کھلے گا۔"

"خفیہ ایجنسیاں پاتال میں چھپے ہوئے راز معلوم کر لیتی ہیں۔ تم سے شادی کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ میں اپنا سیاسی کیریئر داؤ پر لگا دوں۔"

"تین ماہ کے اندر انتخابات ہونے والے ہیں۔ تمہارے پاس سوچنے اور حتمی فیصلہ کرنے کے لیے کافی وقت ہے۔ اگر تم نے دو ماہ کے اندر کسی بیرونی ملک میں میری رہائش کے انتظامات نہ کیے اور وہاں مجھ سے نکاح نہیں پڑھایا تو میں اس معاہدے کو منظرِ عام پر لے آؤں گی۔"

"کیا وہ معاہدہ اب بھی تمہارے پاس ہے؟"

"نہیں میں نے کیپٹن امیر حمزہ کے پاس امانت کے طور پر رکھا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے' اب میں دو طرف سے بلیک میل کیا جاؤں گا۔ تم تو کر ہی رہی ہو۔ اب امیر حمزہ بھی کرنے والا ہے۔"

"میری شرط مان لینے کے بعد امیر حمزہ صاحب تم سے ایسا سمجھوتا کر سکتے ہیں جس قدر۔ بچے میں وہ معاہدہ کبھی منظر عام پر نہیں آئے گا۔"

خدم "میں کیپٹن امیر حمزہ کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ وہ ہم سب سیاست دانوں کا دشمن اور در وہ ہمارے ہاتھوں میں ہمارے اعمال نامے پکڑا کر کہتا ہے' عدالت میں جاؤ اور اب تب سیوام سے جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے کے جتنے جرائم کیے ہیں' انہیں تسلیم کرو۔ وہ سے کہ اور خفیہ ہاتھ کے اس معاہدے کو بھی عدالت میں پہنچائے گا۔"

"نہیں پہنچائے گا۔ میں تم دونوں کے درمیان سمجھوتا کراؤں گی۔"

"میں یہاں خفیہ ہاتھ سے خفیہ طور پر سمجھوتا کرنے آیا تھا۔ کل میں اسلام آباد جاؤں گا۔ انتخابات سر پر ہیں۔ وہاں میری موجودگی ضروری ہے۔"

"میں آج رات تک کسی وقت بھی حمزہ صاحب سے تمہاری بات کراؤں گی۔"

انیلا نے رابطہ ختم کر کے ملازمہ کو آواز دی پھر اس کے آنے پر کہا۔ "یہ فون لے جاؤ۔ حمزہ صاحب کے ماتحت سے کہو میں ان سے ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔"

ملازمہ فون لے کر اس کمرے سے باہر چلی گئی۔ باہر ماتحت کھڑا ہوا تھا۔ اس نے فون کے تار الگ کر دیئے پھر اسے لے جا کر امیر حمزہ کے سامنے رکھ دیا۔ تب امیر حمزہ نے اپنے فون کا ریسیور اٹھا کر مرزا نیک بخت سے رابطہ کیا پھر اس کی آواز سن کر بولا۔ "میں ہوں کیپٹن امیر حمزہ..........."

وہ جلدی سے بولا۔ "آپ؟ جناب آپ ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں آپ سے ہمکلام ہوں۔ ابھی ابھی بانو سے' میرا مطلب ہے' انیلا بانو سے گفتگو ہوئی تھی۔ آپ کا ذکر مبارک ہوتا رہا۔ میں اس سے کہہ رہا تھا' آپ بہت ہی معاملہ فہم ہیں۔ ہم جیسے غلطیاں کرنے والوں کو سنبھلنے کا موقع دیتے ہیں مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ نے تھر کے ڈی سی کو سنبھلنے کا موقع دیا ہے۔ اسے اپنا اعمال نامہ خود عدالت میں لے جانے کا حکم دیا ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ اس طرح آپ قانون کی بالا دستی قائم رکھتے ہیں اور یہ بڑی بات ہے کہ آپ قانون اپنے ہاتھ میں نہیں لیتے۔ جب کوئی آپ کے نیک مشورے پر عمل نہ کرے تو آپ مجبور ہو کر اپنے طور پر اس کے خلاف اقدامات کرتے ہیں۔ میں آپ سے اسی سلسلے میں........... ہیلو ہیلو........... ہیلو جناب کیپٹن صاحب! ہیلو ہیلو..........."

پتا چلا کہ دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا ہے۔ نیک بخت نے ریسیور کو کریڈل پر رکھا۔ سوچنے لگا۔ "کیا بات ہوگئی؟ فون کیوں بند کیا ہوگیا؟ یا بند کر دیا گیا؟"

گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے جلدی سے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو کون؟"

"میں ہوں کیپٹن امیر حمزہ۔"

"اوہ کیپٹن صاحب! لائن اچانک کٹ گئی تھی۔"

"کٹی نہیں تھی۔ کاٹ دی تھی۔ تم بہت بول رہے تھے۔ صرف کام کی باتیں سنا کرو اور کام کی باتیں کیا کرو۔"

"جی۔ جی ہاں۔ میں پریشانی میں کچھ زیادہ بولتا رہا۔ اب نہیں بولوں گا۔ آپ کی سنوں گا' آپ حکم کریں۔"

"انیلا بانو کو جلد سے جلد پاکستان سے باہر اس کے کسی پسند کے ملک میں بھیج دو۔ وہاں اس کا ذاتی بنگلا' کار اور خاصا بینک بیلنس ہونا چاہیے۔"

"ہو جائے گا۔ لندن کے ایک مضافاتی علاقے میں میرا ایک ذاتی کاٹیج ہے۔ میں وہ کاٹیج اس کے نام کر دوں گا۔ پانچ لاکھ پاؤنڈز اس کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرا دوں گا۔"

"پانچ نہیں' دس لاکھ کیونکہ وہ تمہاری شریکِ حیات ہوگی۔ تم اس سے نکاح پڑھاؤ گے۔"

"کیپٹن صاحب! آپ میری بیوی کو نہیں جانتے ہیں دوسری شادی کا راز کھلتے ہی وہ اپوزیشن والوں سے مل کر........."

"زیادہ نہ بولو۔ پوری قوم سے فراڈ کرتے ہو' ایک بیوی سے نہیں کر سکتے؟ اگر میری شرائط تسلیم کرو گے تو اس معاہدے کے سلسلے میں شاید کوئی سمجھوتا ہو سکے گا۔"

سمجھوتے کی بات پر اس نے کہا۔ "مجھے منظور ہے۔ میں آپ کی شرائط تسلیم کرتا ہوں۔ آپ انیلا بانو کو اسلام آباد بھیج دیں۔ میں لندن میں اپنا ذاتی کاٹیج اس کے نام کرنے اور اس کے بینک اکاؤنٹ میں رقم جمع کرانے کے بعد اس سے نکاح پڑھوا کر یہاں آجاؤں گا لیکن میری ایک بات مان لیں۔"

"ماننے والی بات ہوگی تو مان لوں گا۔"

"معمولی سی بات ہے۔ میں اپنی بیوی سے اور عوام سے دوسری شادی والی بات چھپانے کے لیے ایک چال چلوں گا۔ اس کے نتیجے میں کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ صرف میرا اتنا فائدہ یہ ہے کہ میری بیوی کو کبھی میری دوسری شادی کا یقین نہیں ہوگا۔ چاہے دشمن اسے لاکھ بہکاتے رہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم جو چاہو کرو لیکن انیلا اور اس سے ہونے والے بچوں کے بہترین مستقبل کی ضمانت دے دو۔"

"میں ہر طرح سے آپ کو مطمئن کروں گا۔ اب آپ مجھے مطمئن کریں۔"

امیر حمزہ چند لمحوں تک خاموش رہا پھر بولا۔ "تم لوگ خفیہ ہاتھ کے اشاروں پر ملکی قوانین بد سے بدتر کرتے رہتے ہو لیکن آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ میری ایک پلاننگ ہے۔ جس پر عمل کرو گے تو میں تمہارے اس معاہدے کو خفیہ رکھوں گا۔ تم اپنے طور پر انتخابی مہم میں کامیاب ہو کر اپنی حکومت بناؤ پھر خفیہ ہاتھ کو جھانسا دو۔ اس کی ایسی باتیں مان لیا کرو جس سے ملک اور قوم کو نقصان نہ پہنچتا ہو۔ باقی کام ایک محبِ وطن حکمران کی طرح کرتے رہو۔ میں خفیہ ہاتھ کو بھی اس معاہدے کی وجہ سے دباؤ میں رکھوں گا۔ وہ بھی نہیں چاہے گا کہ وہ معاہدہ عالمی سطح پر سب کے سامنے آئے۔ وہ اپنی خود غرضی اور مکارانہ مقاصد کو دوسرے ممالک پر ظاہر نہیں ہونے دے گا۔ اس لیے وہ اس ملک کو بدترین بنانے والی پالیسیوں پر تم سے جبراً عمل نہیں کرائے گا۔"

"میں مانتا ہوں' وہ بھی آپ کے دباؤ میں رہے گا لیکن آپ کی زندگی کم ہو جائے گی۔ اس کی خفیہ ایجنسیوں والے آپ کو کہیں سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے پھر جس طرح ہمارے کئی بڑے سیاست دانوں کی موت کا سراغ نہیں ملا' اسی طرح آپ کی موت بھی ایک معما بن جائے گی۔"

"خفیہ ہاتھ نے اب سے پہلے بھی مجھے مار ڈالنے کی کوششیں کی تھیں۔ اب میری حیات تو اس کے لیے معما بن گئی ہے۔ تم میری فکر نہ کرو۔ معاہدے کی طرف سے مطمئن ہو جاؤ۔ انیلا بانو کا مستقبل سنوار دو۔ کل رات تک اسے اسلام آباد پہنچا دیا جائے گا۔"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ مرزا نیک بخت اپنے راز دار مشیر احمد علی کو بلا کر مشورہ کرنے لگا۔ کیا خفیہ ہاتھ کو بتا دیا جائے کہ وہ معاہدہ کیپٹن امیر حمزہ کے پاس پہنچ گیا ہے اور آئندہ وہ خفیہ ہاتھ کو بھی اپنے دباؤ میں رکھے گا۔

مشیر نے مشورہ دیا۔ "ابھی اسے حقیقت نہ بتائی جائے۔ تین ماہ گزرنے دیں۔ اقتدار حاصل کرنے کے بعد خفیہ ہاتھ کو رفتہ رفتہ حقیقت معلوم ہو گی تو اس کے اور امیر حمزہ کے درمیان ٹھن جائے گی۔ وہ معاہدے کی وجہ سے بظاہر دباؤ میں رہے گا لیکن درپردہ امیر حمزہ کو ٹھکانے لگانے کی کوششیں کرے گا اور ہم خاموشی سے ان کا تماشا دیکھتے رہیں گے۔"

"امیر حمزہ کل رات تک انیلا بانو کو اسلام آباد پہنچانے والا ہے۔ یہ لڑکی ہر وقت میرے لئے مصیبت بنی رہے گی۔ مجھے اس سے اس طرح نجات حاصل کرنی ہو گی کہ امیر حمزہ ہم پر کبھی شبہ نہ کرے اور وہ بلا مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے۔"

وہ دونوں اپنے اپنے طور پر انیلا بانو سے نجات حاصل کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔

☆======☆======☆

بیگم اور رکن الدین تمام رات سو نہ سکے۔ انہوں نے کاظم کے خلاف سائرہ کے اغوا کے علاوہ پانچ لاکھ روپے کے زیورات اور دو لاکھ روپے نقد چرا کر لے جانے کے الزامات لگائے تھے اور اس کے خلاف ایف آئی آر درج کرائی تھی۔ آدھی رات کے بعد پولیس والے کاظم کے باپ کو پکڑ کر لے گئے تھے اور اس پر طرح طرح سے ظلم کر کے یہ بیان لکھوانا چاہتے تھے کہ اس کے بیٹے نے ڈی سی رکن الدین کے گھر ڈاکا ڈالا ہے اور اس کی بیٹی کو جبراً اٹھا کر لے گیا ہے۔

اس کا بوڑھا باپ کہہ رہا تھا۔ "میرے بیٹے نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ اتنا بڑا ڈاکا نہیں ڈالے گا۔ جہاں تک سائرہ کا تعلق ہے' وہ راضی خوشی اس کے ساتھ گئی ہے۔"

وہ بے چارہ بوڑھا تھانے میں مصیبتیں اٹھا رہا تھا۔ دوسری طرف امیر حمزہ کے دو جانباز سائرہ اور کاظم کو کراچی لے آئے۔ انہیں آرام سے رہنے کے لیے ایک مکان دیا اور تاکید کی کہ جب تک حالات سازگار نہ ہوں' وہ دونوں اس مکان سے باہر نہ نکلیں۔

پھر صبح ہونے سے پہلے امیر حمزہ نے فون کے ذریعے رکن الدین سے رابطہ کیا۔ اس نے رکن الدین سے پوچھا۔ "کیا آپ جانتے ہیں کہ میں سکھر میں ہوں؟"

"آپ کو میرے گھر کا نمبر کیسے معلوم ہوا؟"

"تمہاری بیٹی سائرہ نے بتایا ہے۔"

"سائرہ نے؟ کیا میری بیٹی آپ کے پاس ہے؟"

"ہاں خیریت سے ہے اور عزت و آبرو سے ہے۔ آج شام تک کاظم سے اس کا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔"

وہ چند لمحات تک خاموش رہا پھر بولا۔ "وہ نکاح ہماری مرضی کے خلاف ہو گا لیکن یہ اطمینان ہے کہ آپ میری بیٹی کی مرضی کے مطابق شادی کر رہے ہیں۔"

"رکن الدین! ذرا سوچو۔ تم یہ جانتے تھے کہ راہو جیسے دلال اور پولیس کی ملی بھگت سے کم سن بچیوں پر اجتماعی زیادتیاں ہوتی رہیں۔ وہ بے چاریاں درندگی کا شکار ہو کر مر گئیں۔ کیا تم مطمئن ہو کہ تمہاری بیٹی سائرہ کے ساتھ اجتماعی زیادتی نہیں ہو رہی ہے؟"

"ہاں۔ یہ تمہارا احسان ہے۔ تم نے میری بیٹی اور میرے خاندان کی عزت رکھ لی ہے۔"

"تم نے ان بچیوں کی عزت اور سلامتی کے لیے انسانیت کا ثبوت کیوں نہیں دیا؟ تم اپنے علاقے کے سب سے بڑے عہدے دار تھے بلکہ حاکم تھے۔ تم ان ظالم درندوں کو گرفتار کر کے انصاف کے لیے انہیں عدالت پہنچا سکتے تھے۔"

"مجبور تھا۔ اوپر والوں کا حکم تھا کہ میں اس معاملے کو دبا دوں۔ میں اپنے بڑوں کی مرضی کے خلاف اس معاملے کو نہ دباتا تو میری ملازمت چلی جاتی۔"

"تم نے ملازمت بچالی۔ اپنی جان کیسے بچاؤ گے؟ میں نے تمہاری بیٹی کو اغوا کرنے کی دھمکی دی تھی چونکہ تمہارا محاسبہ کرنا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے ذرائع سے تمہارے گھریلو حالات معلوم کیے۔ معلومات حاصل کرنے کے دوران میں پتا چلا کہ سائرہ اور کاظم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ میرے دو جانبازوں نے ان پیار کرنے والوں سے کہا کہ وہ انہیں گھر سے بھاگنے کا موقع دیں گے اور کراچی میں آرام دہ رہائش کا انتظام کریں گے۔ شرط یہ ہے کہ سائرہ اپنے باپ کی زمین و جائیداد کے تمام کاغذات لے کر آئے۔ محبت اندھی ہوتی ہے۔ تمہاری بیٹی کاظم کی دیوانی ہے۔وہ اس دیوانگی میں تمہاری تمام اہم دستاویزات میرے پاس لے آئی ہے۔"

"او گاڈ! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری بیٹی میرے اعتماد کو دھوکا دے گی۔"

"ڈی سی کا عہدہ سنبھالنے سے پہلے کوئی سوچ نہیں سکتا تھا کہ تم ملک اور قوم کے اعتماد کو دھوکا دو گے۔ تمہاری بیٹی نے وہی کیا ہے' جو تم کرتے رہے ہو۔"

"آپ درست کہتے ہیں میں جو کرتا رہا' اس کی سزا مجھے مل چکی ہے۔"

"سزا کہاں ملی ہے؟ابھی تم آرام سے اپنے گھر میں ہو۔ میں نے تمہارے جرائم کی سزا تمہاری بیٹی کو نہیں دی۔ اس کا گھر آباد کر رہا ہوں۔ وہ بالغ ہے۔ آج نہیں تو کل تمہیں اس کی خانہ آبادی کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ تم اپنی کہو' کیا اپنا اعمال نامہ خود لکھ کر عدالت میں پیش ہونا چاہتے ہو؟"

"میں کیا کہوں۔ میرا اعمال نامہ تو آپ کے پاس پہنچ گیا ہے۔"

"ہاں۔ ہمارے ملک میں ایسے ایماندار اور فرض شناس وکلاء اور جج صاحبان ہیں جن کے پاس میں یہ دستاویزات پہنچاؤں گا اور ان کے ذریعے تمہارے بینک اکاؤنٹ سیل کراؤں گا۔"

"پلیز کیپٹن امیر حمزہ صاحب! رحم کریں۔ ایسی سزا دیں گے تو میرے بچے میرے بعد کنگال ہو جائیں گے۔"

"اپنی عیاشی کے لیے اور اپنے بچوں کا مستقبل شاندار بنائے رکھنے کے لیے

عہدیدار بے ایمانی اور رشوت خوری کے ذریعے لاکھوں کروڑوں کماتے رہتے ہیں۔ تمہیں سزا ملے گی تو تمہارے بچے رزقِ حلال کمانا سیکھیں گے۔ میں کل شام تک کی مہلت دے رہا ہوں تم خود عدالت میں حاضر ہو کر اپنے تمام جرائم کا اعتراف کرو گے تو تمہاری سزا میں نرمی ہو گی۔ میری طرف سے بار ایسوسی ایشن اور جج صاحبان سفارش کریں گے کہ تمہاری ملازمت بحال رکھ کر تمہیں ایمانداری سے فرائض ادا کرنے کے مواقع دیئے جائیں۔ سوچ لو' کل شام تک تمہیں کیا کرنا ہے۔"

امیر حمزہ نے فون بند کر دیا۔ وہ پچھلی رات مرزا نیک بخت سے کہہ چکا تھا کہ دوسرے دن تین بجے کی فلائٹ سے انیلا بانو اسلام آباد جانے والی ہے۔ وہ دن کے ایک بجے ڈیفنس کے علاقے کے قریب گزری میں Z.2 کے بس اسٹاپ پر ایک ٹیکسی میں بیٹھی ہو گی۔ اسے اپنے گارڈز کی حفاظت میں ائرپورٹ سے اسلام آباد پہنچایا جائے۔

مرزا نیک بخت نے مشیر احمد علی کے مشورے سے ایک لائن آف ایکشن طے کیا کرلیا تھا۔ اس کے مطابق ایک بوڑھا اور جوان شخص انیلا بانو کے گھر گئے۔ وہاں اس کے بھائی سے تنہائی میں راز داری سے کہا۔ "میں مرزا نیک بخت کی کوٹھی کا بوڑھا چوکی دار ہوں اور یہ میرا جوان بیٹا وہاں ایک سیکورٹی گارڈ ہے۔ ایک بار تم اور دوسری بار تمہارے والدین اس کوٹھی کے گیٹ پر آچکے ہیں۔ میں نے تمہیں دیکھا ہے۔ اس وقت میرا ضمیر سویا ہوا تھا۔ میں نے تمہیں نہیں بتایا کہ تمہاری بہن اس کوٹھی میں چھپی رہتی ہے۔"

یہ کہہ کر بوڑھا رونے لگا۔ جوان نے کہا۔ "مجھے اور بابا کو قدرت کی طرف سے سزا مل چکی ہے۔ میری جوان بہن کو کسی دشمن نے گولی مار دی ہے اور گولی مارنے سے پہلے اس کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا گیا۔"

وہ جوان رونے لگا۔ بوڑھے نے کہا۔ "ہم تمہاری بہن کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ تم حوصلہ کرو ہم تمہارا ساتھ دیں گے اور تمہاری بہن بانو کو لے کر کسی وکیل کے ذریعے عدالت میں جائیں گے۔"

انیلا کے بھائی نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تم دونوں کی بیٹی اور بہن کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ قدرت کے کھیل عجیب ہیں۔ اس طرح تمہارے ضمیر بیدار ہو گئے ہیں۔ میرے حوصلے کی بات نہ کرو۔ میں اپنی بہن کو واپس لانے کے لیے دشمنوں کے سر کچل سکتا ہوں۔"

"تو پھر ابھی ہمارے ساتھ چلو۔ وہ ایک گھنٹے کے بعد ائرپورٹ آئے گی۔ مرزا نیک بخت کا ایک سیکورٹی گارڈ اسے اسلام آباد لے جا رہا ہے۔"

انہوں نے انیلا کے بھائی کو ایک ریوالور دیا پھر وہ تینوں ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ائرپورٹ کی طرف جانے لگے۔

امیر حمزہ نے انیلا کو رخصت کرتے وقت ایک موبائل فون دیا تھا اور کہا تھا "تمہارے ساتھ کوئی گڑ بڑ ہو یا خطرہ محسوس کرو تو فوراً فون پر رابطہ کرنا میرے جانباز تمہاری سلامتی کے لیے پہنچ جائیں گے۔"

اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے کوٹھی کے باہر لایا گیا اور ایک کار میں بٹھا دیا گیا۔ وہ کار تقریباً ایک گھنٹے تک چلتی رہی۔ حالانکہ اس کوٹھی سے گزری کا بس اسٹاپ بہت قریب تھا لیکن وہ کار یونہی ایک گھنٹے تک چلتی رہی پھر اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹا دی گئی۔ کار کے ڈرائیور نے ایک ٹیکسی والے سے ائرپورٹ جانے کا کرایہ طے کر کے اسے دگنی رقم دی۔ اس سے کہا۔ "یہ بی بی جی یہاں تھوڑی دیر کسی کا انتظار کریں گی اس لیے تمہیں دگنا کرایہ دیا جا رہا ہے۔"

وہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ امیر حمزہ کا ڈرائیور کار لے کر چلا گیا۔ بیس منٹ کے بعد مرزا نیک بخت کا ایک سیکورٹی گارڈ ایک کار میں آیا۔ انیلا نے ٹیکسی والے سے کہا۔ "تم کرایہ رکھو میں اس کار میں جا رہی ہوں۔"

وہ نیک بخت کے اس سیکورٹی افسر کو پہچانتی تھی۔ پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ مرزا نیک بخت نے اپنی داشتہ سے شادی نہ کرنے اور اسے راستے سے ہٹانے کے لیے خوب چکر چلایا تھا۔ جب وہ کار مین روڈ اور جناح ٹرمینل کے درمیانی راستے پر پہنچی تو ایک دوسری کار نے اس کا راستہ روک دیا۔

انیلا بانو نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے ونڈ اسکرین کے پار دیکھا۔ اسے اپنا بڑا بھائی ایک بوڑھے اور جوان کے ساتھ نظر آیا۔ جوان کے ہاتھ میں ایک ٹی ٹی اور بھائی کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا۔ انیلا بانو نے فوراً ہی موبائل آن کر کے نمبر ڈائل کیے۔ اتنے میں وہ قریب پہنچ گئے۔ اس کا بھائی گرج کر نیک بخت کے گارڈ سے کہہ رہا تھا۔ "کتے! تو میری بہن کو یہاں سے نہیں لے جا سکے گا۔"

اس سے پہلے کہ گارڈ اپنا ہتھیار استعمال کرتا اس جوان نے ٹی ٹی سے فائر کر کے اسے زخمی کر دیا۔ انیلا بانو فون پر کہہ رہی تھی۔ "میرے بھائی مجھے لینے آئے ہیں۔ پلیز جلدی آئیں میں اپنے گھر نہیں جانا چاہتی۔ آپ بھائی کو روکیں۔"

بھائی نے کھڑکی کے اندر ہاتھ ڈال کر اس سے موبائل چھین کر کہا۔ "ذلیل! کمینی! اپنے یار کو بلا رہی ہے۔ میری غیرت کا' ماں باپ کی عزت کا خیال نہیں ہے۔ گھر

چل کر تجھ سے نمٹ لوں گا۔"

وہ موبائل ایک طرف پھینک کر دروازہ کھول کر بہن کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس جوان نے زخمی گارڈ کو کار سے کھینچ کر باہر زمین پر لٹا دیا۔ بوڑھے کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا پھر کار اسٹارٹ کر کے اسے تیز رفتاری سے بھگانے لگا۔

انیلا نے کہا۔ "بھائی جان! آپ مجھے گھر نہ لے جائیں۔ میں مرزا نیک بخت سے اپنے جائز حقوق حاصل کر کے خود آپ لوگوں کے پاس آؤں گی۔"

"بکواس مت کرو۔ وہ خود غرض تمہیں جائز حقوق نہیں دے گا۔ ہم قانونی کارروائی کر کے تمہارے حقوق تمہیں دلائیں گے۔"

وہ بہن بھائی پچھلی سیٹ پر بیٹھے بحث کر رہے تھے۔ بھائی نے غصہ دکھانے اور بحث کرنے کے دوران میں خیال نہیں کیا کہ وہ کار کہاں جا رہی ہے۔ کافی وقت گزرنے کے بعد وہ چونک گیا۔ کار ایک ویران علاقے میں رک گئی تھی۔ اس نے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ ہم کہاں آگئے ہیں۔ شاید یہ کھوکھراپار کا ویران علاقہ ہے۔"

جوان نے اگلی سیٹ سے گھوم کر مسکراتے ہوئے اس غیرت مند بھائی کو دیکھا پھر کچھ کہے سنے بغیر ٹی ٹی سے فائر کیا۔ ایک ہی گولی کافی تھی۔ وہ سینے میں پیوست ہو گئی تھی۔ انیلا چیخیں مارتے ہوئے بھائی سے لپٹ گئی۔ بہن کی آغوش میں بھائی کا جسم سرد پڑ چکا تھا۔

اس جوان نے ٹی ٹی کی نال انیلا کی کنپٹی پر رکھ کر کہا۔ "تمہاری صورت اس طرح بگاڑ دی جائے گی کہ تمہیں تحفظ دینے والا امیر حمزہ بھی تمہیں نہیں پہچان سکے گا۔ اس الجھن میں رہے گا کہ تم زندہ ہو یا مرچکی ہو؟"

بوڑھے نے بھی اپنے لباس سے ایک ٹی ٹی نکالی۔ ہتھیار نکل آئیں تو پھر کوئی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ اچانک تڑا تڑ کی آوازوں کے ساتھ دو ہتھیاروں سے دو گولیاں چلیں پھر خاموشی چھا گئی۔

دوسرے دن کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ کھوکھراپار کے ایک نالے سے ایک نوجوان عورت کی لاش ملی ہے۔ اس کا چہرہ بگڑا ہوا ہے لیکن بوڑھے ماں باپ نے لباس سے اور اس کے سفری بیگ سے ملنے والی چیزوں سے تصدیق کی ہے کہ ان کی بیٹی انیلا بانو ہے لیکن جیسا کہ ہوتا ہے' تصدیق کرنے کے باوجود ماں باپ کا دل نہیں مان رہا تھا کہ بیٹی مرچکی ہے۔ ان بوڑھوں کو دہرا صدمہ تھا۔ انہوں نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی تھی کہ ان کا جوان بیٹا چوبیس گھنٹوں سے لاپتا ہے۔ وہ مرزا نیک بخت کو الزام دے

رہے تھے کہ اس نے ان کی بیٹی کو قتل کرایا ہے اور ان کے بیٹے کو اغوا کیا ہے۔

امیر حمزہ نے فون کے ذریعے نیک بخت سے کہا۔ ”میں نے انیلا بانو کو ایک موبائل فون دیا تھا۔ اس نے موت سے پہلے فون پر اطلاع دی تھی کہ اس کا بھائی دو بدمعاشوں کے ساتھ اسے روکنے کے لیے پہنچ گیا ہے۔ وہ پوری بات نہ کہہ سکی کیونکہ اس کے بھائی نے فون چھین لیا تھا۔“

مرزا نیک بخت نے کہا۔ ”میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ آپ مجھ سے رابطہ کریں اور میں اپنی صفائی پیش کروں کہ بانو کی موت کا ذمے دار میں نہیں ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے فون کے ذریعے بانو کی باتیں سن کر حقیقت معلوم کرلی اس کا بھائی بہت جنونی قسم کا آدمی تھا۔ اس نے بہن کو گولی مار کر اس کا چہرہ بگاڑ کر ایسی حرکت کی ہے، جس کے نتیجے میں مجھ پر شبہ کیا جا رہا ہے۔“

امیر حمزہ نے کہا۔ ”شبہ کرنے سے تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا اس کا بھائی قتل کر کے فرار ہو گیا ہے۔ وہ جب بھی گرفتار ہو گا۔ حقیقت سامنے آجائے گی۔“

”حقیقت جب بھی سامنے آئے میں آپ کی غلط فہمی دور کروں گا۔ مجھے تو یہ اطمینان ہو گیا ہے کہ آپ حقیقت جان لینے کے بعد مجھے بے گناہ سمجھ رہے ہیں اور آپ آئندہ بھی مجھ پر اعتماد کرتے رہیں گے۔“

”انیلا کے ساتھ جو ہوا، اس کا مجھے افسوس ہے۔ ویسے میں معاہدے کے سلسلے میں تم سے تعاون کروں گا۔“

مرزا نیک بخت نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ امیر حمزہ نے فون بند کر دیا۔ نیک بخت اور مشیر احمد علی ٹیلی فون کے وائڈ اسپیکر سے امیر حمزہ کی باتیں سن رہے تھے۔ نیک بخت نے اطمینان کا سانس لے کر ریسیور رکھا پھر کہا۔ ”خدا کا شکر ہے، امیر حمزہ کا اعتماد مجھ پر پختہ ہو گیا ہے اب تو اس کا باپ بھی مجھ پر کبھی شبہ نہیں کرے گا۔“

”جناب! ہم اپنی پلاننگ میں کامیاب ہیں لیکن ایک بات کھٹک رہی ہے۔ وہ بوڑھا چوکی دار جو ایک کرائے کے قاتل کو اپنا بیٹا اور ہمارا سیکورٹی گارڈ بنا کر لے گیا تھا، وہ بوڑھا کہاں گیا ہے؟“

”ہاں۔ وہ کرائے کا قاتل بھی معاوضہ لینے نہیں آیا ہے۔“

”آپ نے بوڑھے کو پچیس ہزار دیئے تھے کہ وہ اتنی ہی رقم میں اس قاتل کو ٹال دے۔ ہو سکتا ہے وہ پچیس ہزار پر ہی راضی ہو کر چلا گیا۔“

”لیکن اس بوڑھے کو تو واپس آنا چاہیے تھا۔“

ایک ملازم کو بلا کر حکم دیا کہ وہ ابھی بوڑھے چوکی دار کے گھر جا کر اسے بلا کر لائے۔ ملازم حکم کی تعمیل کے لیے گیا پھر ایک گھنٹے بعد آ کر بولا۔ ”وہ گھر پر نہیں ہے۔ اس کے گھر والے پریشان ہیں۔ وہ کل سے نہیں آیا ہے۔“

نیک بخت اور احمد علی نے ایک دوسرے کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ملازم چلا گیا احمد علی نے کہا۔ ”اب تو یہ یقین کرنا ہو گا کہ صرف وہ بوڑھا ہی نہیں، وہ اجرتی قاتل بھی غائب ہے۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ انیلا بانو کا بھائی ان دونوں پر غالب آ گیا ہو۔ ان دونوں کو قتل کرنے کے بعد بہن کو بھی مار ڈالا ہو۔“

”ہم ان بہن بھائیوں کو ختم کرنا چاہتے تھے لیکن اس کے بھائی نے ہمارے آدمیوں کو مار ڈالا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انیلا کی لاش کی طرح ان دونوں کی لاشیں کیوں نہیں پائی گئیں؟“

”معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ کیا ہونا تھا؟ اور کیا ہو چکا ہے۔ یہ بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔“

بات ان کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ انیلا بانو کا بھائی مارا گیا تھا۔ کرائے کے قاتل نے اسے گولی ماری تھی۔ اس کے بعد بوڑھے نے بھی اپنے لباس سے ایک ٹی ٹی نکال لی تھی۔ دونوں کے پاس دو ٹی ٹی تھیں اور دو گولیاں چلائی گئیں تھی لیکن ایک انیلا بانو کو ہلاک کرنے کے لیے دو گولیاں چلانے کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ دو گولیاں کار کے باہر، دو جانبازوں نے چلائی تھیں۔ وہ بوڑھا اور اجرتی قاتل جہنم رسید کر دیئے گئے تھے۔

تیسرے دن انیلا بانو لندن جانے والی فلائٹ میں سفر کر رہی تھی۔ امیر حمزہ نے اس سے کہا تھا۔ ”تم لندن پہنچو، اس کے بعد نیک بخت کے چودہ طبق روشن کیے جائیں گے۔“

☆======☆======☆

فولاد [illegible] سنٹر

[illegible] بھیوال

میرا نام فرمان علی تاباں تھا۔ اب فرمان دادا ہے۔ میں جوان ہوں کسی کا دادا نہیں ہوسکتا۔ جرائم کی دنیا میں سیر پر سوا سیر بن کر رہنے والے کو دادا کہتے ہیں۔ یعنی میں مجرموں کے باپ کا باپ ہوں۔

طاقت کے ذریعے حکومت کرنے والوں کی دنیا میں یہ میری تعریف ہے کہ میں طاقت ور مجرموں پر ہمیشہ غالب آتا ہوں۔ اس لیے وہ مجبور ہوکر مجھے فرمان دادا کہتے ہیں۔

میں نے اپنے دادا سے سنا تھا کہ گوجرانوالہ میں میرے والد عرفان علی کی بہت بڑی فاؤنڈری تھی۔ اس لوہے کے کارخانے پر میری سوتیلی ماں اور اس کے قریبی رشتے داروں نے قبضہ جمالیا۔ میں ان دنوں تین برس کا تھا۔ میرے والد کا ایک حادثے میں انتقال ہوگیا تھا۔ میں نے پانچ برس کی عمر میں دادا جان سے ایک بار سنا تھا کہ حادثہ ہوا نہیں تھا' حادثہ کرایا گیا تھا۔

وہ مجھے لاہور لے آئے تھے۔ وہاں انہوں نے گھوڑوں کے نعل تیار کرنے' چاقو چھری اور تالے وغیرہ بنانے کی دکان کرلی۔ مجھے بھی لوہا گرم کرنے' اس پر ہتھوڑے مار کر گاہکوں کی ضرورت کے مطابق اس لوہے کو موڑنے اور توڑنے والا لوہار بنا دیا تھا۔

وہ مجھ سے کہتے تھے۔ "میں پرانے زمانے کا لوہار ہوں۔ میں نے آگ اور فولاد سے کھیلتے کھیلتے تمہارے باپ کو ایک ماڈرن کارخانے کا مالک بنا دیا ہے۔ تم بھی تعلیم حاصل کرو اور فارغ اوقات میں باپ دادا کی روایات کے مطابق لوہار بنتے رہو۔"

میں اپنے باپ کے فولاد کے کارخانے کا مالک نہیں رہا تھا لیکن اپنی ذات میں ایک فولاد بن گیا تھا۔ میرے پنجے فولادی تھے۔ میرے ہاتھ پاؤں' میرا جسم اور میرا کلیجا فولاد کا ہوگیا تھا۔ میں جس شہ زور کی گردن دبوچ لیتا' پھر وہ گردن چھڑا نہیں سکتا تھا۔ میرے شکنجے سے گردن کا چھوٹنا دشوار تھا' ٹوٹنا آسان تھا۔

میں نے دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اس وقت دادا جان کا انتقال ہوگیا۔ میں اتنی بڑی دنیا میں تنہا رہ گیا۔ انہوں نے اپنی وفات سے پہلے مجھے سمجھایا تھا کہ میں کبھی اپنی سوتیلی ماں سے اپنا حق مانگنے نہ جاؤں۔ میری سوتیلی ماں اور اس کے رشتے دار خطرناک ہیں۔ مجھے اپنی محنت سے ایک بڑے کارخانے کا مالک بننا چاہیے۔

لیکن میرے دور میں' میرے باپ دادا والا پاکستان نہیں رہا تھا۔ اب یہ روایت چل پڑی تھی کہ محنت مزدوری سے دولت حاصل نہیں ہوتی بلکہ کرپشن کے ذریعے چور دروازوں سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک بار میرے پاس ایک شخص لوہے کے چند ڈیزائن لے کر آیا۔ اس نے کہا۔ "اگر تم ان نقشوں کے مطابق سانچے تیار کرو گے تو میں تمہاری توقع سے زیادہ معاوضہ دوں گا۔"

میں نے وہ سانچے تیار کیے پھر ان سانچوں کے ذریعے وہ تمام مطلوبہ آلات تیار کیے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ ایسے آلات کیوں تیار کرا رہا ہے۔ اس شخص نے جب ان آلات کو ایک دوسرے سے جوڑنا شروع کیا تو میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ بظاہر ایک واکنگ اسٹک تھی۔ کسی لنگڑے کے لیے زمین پر ٹیک کر چلنے والی لوہے کی چھڑی تھی لیکن دراصل ایک رائفل تھی۔ اس چھڑی کو ایک ہاتھ کی گرفت میں لے کر چلنے کے لیے جو آلات لگائے گئے تھے' وہیں سے بلٹس کی لوڈنگ اور فائرنگ ہوتی تھی۔

وہ خوش ہوکر بولا۔ "میں نے سنا تھا' تم اچھے کاریگر ہو۔ واقعی تم نے کمال کی چیز بنائی ہے۔ میں تمہیں پانچ ہزار روپے دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "پانچ نہیں پچاس ہزار روپے۔"

اس نے مجھے چونک کر دیکھا۔ "پچاس ہزار؟ کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے؟"

"میرا دماغ چلتا ہے تب ہی ایسی نایاب چیزیں تیار کرلیتا ہوں۔ میرے پاس تمام سانچے بنے ہوئے ہیں۔ میں ایسی کئی واکنگ اسٹک گن تیار کرلوں گا۔"

"میں تمہیں دس ہزار دوں گا اور یہ تمام سانچے لے جاؤں گا۔"

میں ایسے سانچے دوبارہ تیار کرسکتا تھا۔ میں نے کہا۔ "پچاس ہزار اس گن کے اور پچاس ہزار ان سانچوں کے۔ اس کے آگے دوسری بات نہیں۔ جاؤ ایک لاکھ روپے لے آؤ اور سامان لے جاؤ۔"

وہ غرا کر بولا۔ "مسٹر لوہار! تم نہیں جانتے ہو' میں کون ہوں۔ میں تمہیں دوسری دنیا میں پہنچا کر یہ سب کچھ مفت میں لے جاسکتا ہوں۔"

"تم نے وہ کہاوت سنی ہوگی کہ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے' خود اس گڑھے میں گرتا ہے۔ تم نے یہ گن دوسروں کی ہلاکت کے لیے بنوائی۔ مگر خود اس گن سے ہلاک ہوسکتے ہو۔"

اس نے حقارت سے مجھے دیکھا پھر دکان سے باہر چلا گیا۔ گلی کے سرے پر مین روڈ کے فٹ پاتھ کے پاس اس کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے وہاں پہنچ کر میری دکان کی

طرف دیکھا پھر کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی میں نے واکنگ اسٹک گن اور تمام سانچوں کو اٹھا کر تھیلے میں ڈالا۔ دکان بند کی پھر وہاں سے اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے ایک دوست کی دکان پر رک گیا۔ اس سے کہا۔ "میرا یہ تھیلا اپنی دکان میں رکھ لو۔ میں بعد میں آکر لے لوں گا۔" میں وہ تھیلا وہاں چھوڑ کر گھر آیا۔ غسل کیا کپڑے تبدیل کر کے دوپہر کے کھانے کے لیے ایک ہوٹل میں آگیا۔ اگرچہ میں نے دس جماعتیں پاس کرنے کے بعد باقاعدہ تعلیم جاری نہیں رکھی تھی لیکن میں انگریزی بول چال کی کلاس ضرور اٹینڈ کرتا تھا۔ جرائم کے موضوعات سے مجھے دلچسپی تھی۔ روزانہ اخبارات پڑھتا تھا اور سیاست دانوں اور بیورو کریٹس کے ہتھکنڈوں کو سمجھتا رہتا تھا۔ یہ بات میرے دماغ میں نقش ہوگئی تھی کہ میں نے ہاتھ میں صرف ہتھوڑا پکڑا تو تمام عمر لوہار ہی رہوں گا۔ ان سیاست دانوں کی طرح بے انتہا امیر کبیر نہیں بن سکوں گا۔

مجھے کسی سیاسی پارٹی سے دلچسپی نہیں تھی لیکن میں ہر لیڈر کے قریب رہ کر یہ تاثر دیتا تھا کہ میں اس کی پارٹی کا وفادار ہوں۔ چونکہ میں نے کسی بھی پارٹی کے لیے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا تھا اس لیے میری حیثیت ایک کارکن کی تھی۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ کاشف اکبر اپنے ایک دہشت گرد کے ذریعے وہ واکنگ اسٹک گن تیار کروا رہا تھا۔

جب میں کھانے کے بعد دکان کھولنے پہنچا تو آس پاس کے دکان داروں نے بتایا کہ پولیس والے ایک بڑی سی گاڑی میں آئے تھے۔ شاید دوبارہ آئیں گے۔

وہ دوبارہ چار بجے آئے۔ ان کے ساتھ میرا وہی گاہک تھا' جس نے مجھ سے وہ گن بنوائی تھی اس نے دکان کے اندر آکر کہا۔ "وہ سامان نکالو یا پھر حوالات میں ڈنڈے کھانے چلو۔"

میں نے تھانے دار کو دیکھا پھر اس شخص سے کہا۔ "کس سامان کی بات کر رہے ہو۔ اگر میری دکان میں تمہاری کوئی چیز ہے تو اسے لے جاؤ۔"

وہ تمام دکان کا سامان اِدھر اُدھر پھینک کر اپنی مطلوبہ چیزیں تلاش کرنے لگا پھر بولا "انسپکٹر! اسے تھانے لے چلو۔"

انسپکٹر کے حکم سے ایک ماتحت نے میری کلائی میں ہتھکڑی پہنائی میں نے پوچھا۔ "مجھے کس جرم میں گرفتار کیا جارہا ہے؟"

میرے سوال کا جواب نہیں دیا گیا۔ دو سپاہیوں نے مجھے دھکا دے کر کہا۔ "اوئے چل' زیادہ بکواس نہ کر۔"

میں نے جھنجلا کر کہا۔ "یہ کیا حرکت ہے؟ میرے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کیوں کیا جارہا ہے؟"

انسپکٹر نے کہا۔ "اس کتے کو اٹھا کر گاڑی کے اندر پھینکو۔"

میں نے انسپکٹر سے کہا۔ "مائنڈ یور لینگوئج۔ میں گالی برداشت نہیں کرتا ہوں۔"

میری بات سن کر اس نے ماں کی گالی دی۔ میرے اندر جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا۔ میں نے گرجتے ہوئے ہتھکڑی والا ہاتھ اس کے منہ پر مارا۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ ایک ہی ہاتھ پڑنے پر اس کا چہرہ لہولہان ہوگیا تھا۔ کئی سپاہیوں نے مجھے پکڑنا چاہا۔ میں دھکے دے کر انہیں دور پھینکتا ہوا انسپکٹر کی گردن دبوچ کر بولا۔ "بول میری ماں تیری ماں ہے۔ تُو نے میری ماں کو نہیں اپنی ماں کو گالی دی ہے۔"

اس نے ہولسٹر سے ریوالور نکالنا چاہا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی اتنی مضبوطی سے پکڑی کہ وہ اپنے ہاتھ کو جنبش نہ دے سکا۔ اچھی خاصی بھیڑ جمع ہوگئی تھی۔

میری جان پہچان والے کہہ رہے تھے کہ میں انسپکٹر کو چھوڑ دوں' بات نہ بڑھاؤں۔

میں نے اچانک انسپکٹر کے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر اس کی پیشانی پر رکھتے ہوئے کہا۔ "بول کہ تُو ماں کی گالی واپس لے رہا ہے اور میری ماں کو اپنی ماں سمجھتا ہے۔"

وہ جلدی جلدی بولنے لگا۔ "میں گالی واپس لیتا ہوں اور تمہاری ماں کو اپنی ماں سمجھتا ہوں۔"

میں نے اس کے ماتحت سے کہا۔ "ہتھکڑی کھولو۔"

اس نے بے چون چرا ہتھکڑی کھول دی۔ میں نے تمام مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میرے بزرگو اور بھائیو! میں نے ہتھکڑی اس لیے کھلوائی ہے کہ میں مجرم نہیں ہوں۔ اگر یہ کسی معاملے میں مجھے تفتیش کے لیے لے جارہے ہیں تو میں قانون کا احترام کرتے ہوئے ان کے ساتھ تھانے جارہا ہوں اور ایک پُرامن شہری کی طرح یہ ریوالور واپس کررہا ہوں۔"

میں نے انسپکٹر کو ریوالور دیا۔ اس کی ایسی توہین ہوئی تھی کہ وہ کسی سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ چپ چاپ گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سپاہی مجھے گاڑی کے پچھلے حصے میں لے آئے۔ میں نے جس انداز میں خود کو قانون کے محافظوں کے حوالے کیا تھا' اس کے نتیجے میں لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ ان تالیوں کے باعث بھی پولیس والے سبکی محسوس کررہے تھے۔

تھانے پہنچ کر مجھے آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کردیا گیا۔ انسپکٹر اپنے چہرے کی مرہم

پٹی کرا رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد مسلح سپاہیوں نے مجھے گن پوائنٹ پر حوالات سے نکالا۔ پھر تھانے کے احاطے میں کھڑی ہوئی ایک گاڑی میں بٹھایا۔ اس گاڑی کا پچھلا حصہ ایک ڈبے کی طرح چاروں طرف سے بند تھا۔ وہاں سے باہر کا منظر دکھائی نہیں دیتا تھا۔

وہ گاڑی وہاں سے چل پڑی۔ مجھے اندازہ تھا کہ آسانی سے رہائی نہیں ملے گی۔ وہ انسپکٹر اپنی توہین پر خون کے گھونٹ پی رہا ہوگا۔ وہ گاڑی تقریباً تین گھنٹے تک چلتی رہی پھر رک گئی۔ پچھلا دروازہ کھلنے پر میں نے دیکھا۔ ہم سب گاڑی سمیت ایک گودام میں تھے۔ اس گودام کے ایک گوشے میں کئی کمرے لکڑیوں سے بنے ہوئے تھے۔ وہ لوگ مجھے ایک کمرے میں لے گئے' جہاں انسپکٹر ایک میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ جس نے مجھ سے گن تیار کروائی تھی' اس نے کہا۔ "اپنی زندگی چاہتے ہو تو بتا دو' وہ گن اور اس کے سانچے کہاں چھپائے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں کسی گن اور سانچوں کے بارے میں نہیں جانتا۔ تم میری دکان کی تلاشی لے چکے ہو۔"

"تم بہت ضدی ہو۔ ہم تم سے اگلوا کر رہیں گے۔ ہم تم سے زیادہ ضدی ہیں۔ اگر بات نہیں بڑھاؤ گے تو تمہیں کچھ رقم بھی دے دی جائے گی۔"

"میں کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتا ہوں اور یہ گن جیسی چیزیں بنانا قانون کے خلاف ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "تم نے مجھے زخمی کیا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے گالی نہیں دینی چاہیے تھی۔ تم نے سینکڑوں کے مجمع میں ہتھکڑی اتروا کر اور میرا ریوالور مجھے واپس کر کے خود کو بے قصور اور پر امن شہری ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ میں تمہاری قدر کرتا ہوں اور تمہیں رہا کرتا ہوں۔ اس رہائی نامے کو پڑھو اور اس پر دستخط کر دو۔"

میں نے اس رہائی نامے کو توجہ سے پڑھا پھر اس پر اپنے دستخط کر دیئے۔ انسپکٹر نے اس کاغذ کو لے کر تہہ کیا۔ اس وقت چھ غنڈے کلاشنکوف اور ٹی ٹی لے کر آئے۔ انہوں نے اپنی گنوں کا رخ میری طرف کرتے ہوئے کہا۔ "دوسرے کمرے میں چلو۔"

دوسرے کمرے میں پہنچتے ہی پتا چل گیا کہ وہ عقوبت خانہ ہے۔ وہاں قیدیوں کو اذیتیں دیتے وقت ظلم و ستم کی انتہا کر دی جاتی تھی۔ وہاں پہنچتے ہی ایک نے کلاشنکوف کے دستے سے میرے سر پر ضرب لگائی۔ دوسرے نے اپنی کلاشنکوف کا دستہ میرے پیٹ میں مارا۔ مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ میں ایک حملہ کرنا چاہتا تو تین چار غنڈے بیک وقت مجھ پر حملہ آور ہو جاتے۔ ان میں سے دو نے مجھے گولی مارنے کی دھمکی دینے کے

لیے میرے پیروں کے پاس فائرنگ کی۔ اس دھمکی کا مطلب یہ تھا کہ میں چپ چاپ مار کھاتا رہوں لیکن میں باز آنے والا نہیں تھا۔ لہولہان ہونے کے باوجود کسی نہ کسی پر حملہ کرتا رہا۔

میں زخمی شیر کی طرح گرج رہا تھا۔ میرا جسم اور میرا لباس لہو سے تر ہو رہا تھا۔ وہ لوگ مجھے اس برے حال میں لڑتے دیکھ کر کچھ پریشان ہو گئے تھے۔ اسی وقت میں نے ایک غنڈے سے کلاشنکوف چھین لی۔ اب تو سب ہی کے لیے جان کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ جبکہ میں کسی کی جان لینا نہیں چاہتا تھا لیکن ان میں سے ایک نے گولی چلا دی۔ وہ گولی میرے شانے کے نیچے گوشت میں پیوست ہو گئی۔ میں اچھل کر فرش پر گر پڑا۔ کلاشنکوف میرے ہاتھوں سے نکل گئی۔

گولی آرپار نہ ہو اور جسم کے کسی حصے میں پیوست ہو کر رہ جائے تو پورے جسم میں جیسے آگ بھر جاتی ہے۔ میں تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہونے والا تھا۔ اسی انسپکٹر نے کہا۔ "سپرمین کی اولاد! اب میں تجھے ماں کی گالیاں دے رہا ہوں۔ آ اور مجھ پر حملہ کر.........."

اس نے ماں کی گالی دی۔ اس گالی نے میرے اندر ایسا زلزلہ پیدا کیا کہ میں نیم بے ہوشی سے اچانک ہڑبڑا کر بیدار ہو گیا۔ زوردار آواز میں گرجتا ہوا فرش پر سے اٹھنے لگا اندر دھنسی ہوئی گولی میرے دل کے قریب انگارے کی طرح دہک رہی تھی لیکن جب جنون طاری ہو تو پھر آدمی ہوش و حواس سے اور تڑپا دینے والی تکالیف سے عاری اور بالکل ہی بے حس ہو جاتا ہے۔ میرے سر پر صرف ایک ہی جنون سوار تھا کہ میں ماں کی گالی دینے والے کی زبان کھینچ کر اسے کتے کی موت مار ڈالوں۔

میں نے "امی جان" کہہ کر گرجتے ہوئے انسپکٹر کی طرف چھلانگ لگائی۔ اسی وقت دائیں بائیں طرف سے کلاشنکوف کے دستوں سے مجھ پر ضربیں لگائی گئیں۔ میں اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ شانے میں گولی کی تکلیف نے اور شدت اختیار کر لی۔ اب بے ہوشی لازمی تھی۔ ایسے وقت اس شخص نے ماں کی گالی دی' جو مجھ سے گن بنوانے آیا تھا۔

میں جیسے پاگل ہو گیا تھا۔ میں نے پھر گرجتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی۔ کئی غنڈے بھی اسی طرح گالیاں دیتے ہوئے اپنی گنوں کے دستے سے میرے سر پر اور میرے جسم کے کئی حصوں پر ضربیں لگانے لگے۔ ایک انسان کے اندر جو غیر معمولی قوت برداشت ہوتی ہے' وہ قوت جواب دے گئی۔ آنکھوں کے سامنے دن کی روشنی بجھ گئی۔ تاریکی ہی تاریکی چھا گئی۔ پھر میں اس تاریکی میں اپنے پہاڑ جیسے وجود کے ساتھ جانے کہاں گم ہو گیا۔

ایسے کم سخت جان ہوتے ہیں جو موت کے شکنجے میں بھی جاکر وہاں سے زندگی کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ میں بھی زندگی کی طرف ایسے لوٹ آیا جیسے میری جان میرے جسم میں تھی ہی نہیں۔ اگر ہوتی تو وہ لوگ جسمانی طور پر مجھے ہلاک کر چکے تھے۔ میری جان میری ماں کی محبت اور عظمت میں چھپی ہوئی تھی۔ اس عظمت کو گالیاں دینے والوں کی زندگیاں جب تک میں ان سے چھین نہ لیتا' تب تک بار بار مرتے مرتے ان سے انتقام لیتا رہتا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کون ہوں اور کہاں پہنچا ہوا ہوں؟ اور اب سے پہلے میرے ساتھ کیا ہوچکا ہے؟ میں چند لمحوں تک خالی الذہن رہا پھر رفتہ رفتہ سب کچھ یاد آنے لگا۔ شانے میں تکلیف کا احساس بھی جاگ اٹھا۔ میں نے ذرا سا سر گھما کر دیکھا۔ میرے جسم پر قمیض نہیں تھی۔ زخمی شانے پر پٹیاں چپکی ہوئی تھیں۔ کسی نے آپریشن کیا تھا۔ جسم میں پیوست رہنے والی گولی نکال کر مرہم پٹی کردی تھی۔

میں ایک کمرے میں صاف ستھرے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ کے بل اٹھ کر بیٹھنے لگا۔ زخم سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں مگر اب یہ ٹیسیں اور جان لیوا درد و کرب میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔ سرہانے کی میز پر کچھ دوائیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک دوا کی بوتل کے نیچے تہہ کیا ہوا ایک کاغذ دکھائی دیا۔ میں نے اسے اٹھا کر کھول کر دیکھا۔ اس پر لکھا تھا۔

"فرمان! یہ دوائیں حسب ہدایت دودھ کے ساتھ استعمال کرو۔ فریج میں تازہ پھل اور جوس وغیرہ موجود ہیں۔ تمہیں بادام کا حلوا پسند ہے' وہ میں نے اپنے ہاتھوں سے تیار کرکے فریج کے اوپر رکھ دیا ہے۔ حلوا ٹھنڈا ہو جائے تو اسے فریج کے اندر رکھ دینا اور حسب ضرورت کھاتے رہنا۔ چاول' مرچ اور کھٹی چیزوں سے پرہیز کرو........"

میں یہاں تک پڑھ کر رک گیا۔ شاید حیرانی سے سوچنے لگا۔ یہ کون ہے' جسے میرا نام معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ مجھے بادام کا حلوا پسند ہے؟ میں نے باقی خط چھوڑ کر لکھنے والے کا نام پڑھا تو میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ خط کوئی لکھنے والا نہیں تھا بلکہ لکھنے والی تھی۔ آخر میں خط کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ فقط تمہاری ماں آمنہ عرفان........

یکبارگی میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ حیرت' شدت اور محبت سے دل اتنی زور زور سے دھڑکنے لگا کہ زخم سے ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ درد اور مسرتیں ایک ساتھ نصیب ہورہی تھیں لیکن؟ دادا جان نے تو بتایا تھا کہ بچپن میں میری والدہ کا انتقال ہوگیا تھا؟

میں دادا جان سے جھوٹ کی توقع نہیں کرسکتا تھا۔ کبھی کبھی میں پوچھتا تھا۔ "دادا

جانی! میری امی کیسی تھیں؟ ان کی کوئی تصویر بھی نہیں ہے؟"

وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے۔ "تصویر دیکھ کر کیا کرو گے؟ جیسی دوسری عورتیں ہوتی ہیں' ویسی ہی تمہاری ماں بھی تھی۔"

میں نے جوان اور باشعور ہونے کے بعد کہا تھا۔ "تمام عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں لیکن ماں ساری دنیا سے نرالی ہوتی ہے۔ میری امی سب سے الگ اس لیے ہیں کہ انہوں نے مجھے جنم دیا ہے۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں' اللہ تعالیٰ نے میری امی کو پیدا نہ کیا ہوتا تو میں بھی پیدا نہ ہوتا۔"

دادا جان نے کہا۔ "بیٹے! الٹی بات نہ سوچو۔ سیدھی بات یہ ہے کہ باپ کے بغیر تم پیدا نہ ہوتے۔"

"دادا جانی! میرا نام فرمان علی تاباں ہے۔ باپ کے لہو سے اس فرمان علی کو کوئی بھی عورت پیدا کرسکتی تھی لیکن وہ عورت آمنہ بیگم نہ ہوتی۔ مجھے اس ماں سے روحانی لگاؤ ہے جس کا نام آمنہ بیگم ہے۔ ہمارے رسول کریم حضرت محمد ﷺ کی والدہ محترمہ کا نام بھی آمنہ تھا۔ مجھے اس نام سے اور اس ہستی سے اسی لیے روحانی لگاؤ ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ روحانی لگاؤ رکھو مگر کام میں دل لگاؤ۔"

"دادا جانی! کام تو کرتا ہوں۔ ایک ہتھوڑا مارتا ہوں' لوہے کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ آپ میری امی کی کوئی خاص بات بتائیں۔"

"خاص بات کیا بتاؤں؟ ہاں بس یہ ہے کہ وہ لیڈی ڈاکٹر تھیں۔"

میں نے خوش ہوکر کہا۔ "یہ تو بہت بڑی بات ہے۔ میں ایک لیڈی ڈاکٹر کا بیٹا ہوں۔ کیا وہ کسی بڑے اسپتال میں تھیں؟"

"ہاں شادی کے بعد میں نے اور تمہارے باپ نے اسے اسپتال کی ملازمت کرنے سے منع کردیا تھا۔ تمہارے ابو بہت بڑے کارخانے کے مالک تھے۔ دولت' عزت اور شہرت اتنی تھی کہ گھر کی بہو ملازمت کرتی ہوئی اچھی نہیں لگتی تھی لیکن تمہاری ماں بیماروں کی مسیحائی کے لیے ضد کرتی رہتی تھی۔"

"ڈاکٹر تو بہت معزز ہوتے ہیں۔ دکھی انسانوں کی خدمت کرنے سے انہیں روکنا نہیں چاہیے تھا۔"

"یہی بات دوسرے ڈاکٹر کہتے تھے۔ جب بھی کسی مریض کا بہت مشکل اور پیچیدہ آپریشن کرنا ہوتا تھا تو بڑے بڑے ڈاکٹر انہیں اپنے اسپتالوں میں بلاتے تھے۔ تمہاری ماں نے کئی پیچیدہ آپریشن کرکے بڑا نام کمایا تھا۔ دیکھو بیٹے! اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی۔

اس کی باتیں نہ کرو۔ صدمہ ہوتا ہے۔ بس اپنی ماں کے لیے دعائیں کرتے رہو۔"

میں ماضی کی یادوں سے لوٹ آیا۔ میرے ہاتھوں میں میری ماں کا لکھا ہوا ایک خط نگاہوں کے سامنے تھا۔ میرا دماغ چیخ چیخ کر پوچھ رہا تھا۔ "امی جان! آپ زندہ ہیں تو آپ کا خط میرے سامنے کیوں ہے؟ آپ میرے رُوبرو کیوں نہیں ہیں؟"

میں نے خط کو جہاں تک پڑھا تھا' اس کے بعد آگے پڑھنے لگا۔ امی جان نے لکھا تھا "قدرت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ میں نے جس تاریخ کو ایک میٹرنٹی ہوم میں تمہیں جنم دیا تھا' تم اسی تاریخ کو چھانگا مانگا کے جنگل میں پڑے ہوئے ملے۔ تم یقیناً مُردہ ہو چکے تھے لیکن میں نے تمہارے جسم میں زندگی کی ہلکی سی حرارت محسوس کی۔ تم ایک پہاڑ جیسے بھاری بھرکم ہو۔ میں تمہیں کھینچ کر اپنے موبائل شفاخانے کی ایمبولینس کے اندر نہیں پہنچا سکتی تھی۔ کسی اسپتال تک نہیں لے جا سکتی تھی۔

پھر میں نے اللہ کا نام لے کر ایسا آپریشن کیا جس میں کامیابی کا چانس صرف ایک فیصد تھا۔ میری ایمبولینس میں تمام طبی آلات موجود تھے۔ میں نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں تمہارے شانے کے اندر سے دھنسی ہوئی گولی نکالی اور خون کے بہاؤ کو روک دیا۔ ویسے پہلے ہی بہت خون بہہ چکا تھا۔ تمہیں خون کی ضرورت تھی اور میں جانتی تھی کہ ہم ماں بیٹے کے خون کا ایک ہی گروپ ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ میں نے تمہارے اندر خون کی کمی کو پورا کرنے کے لیے کیسے کیسے جتن کیے ہیں۔ میں نے ایک درخت کی جھکی ہوئی شاخ سے ایک خالی بوتل کو باندھ کر اس میں اپنا خون پہنچایا۔ پھر اس بوتل سے خون کو تمہارے جسم میں منتقل کیا۔ میری ممتا کا اعتماد اتنا مستحکم تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے تمہاری سانسیں بحال ہو گئی ہیں اور تم زندگی کی طرف لوٹ آئے ہو۔

بائیس برس پہلے میں نے اسی تاریخ کو تمہیں جنم دیا تھا اور بائیس برس بعد ٹھیک اسی تاریخ کو تمہیں پھر نئی زندگی دی ہے۔ میری ممتا اور محنت کی قدر کرو اور اس کاٹیج میں زخم بھرنے تک آرام سے کھاتے پیتے رہو۔ یہاں کھانے پینے کی ہر چیز موجود ہے۔ الماری میں رقم کی کمی نہیں ہے۔

تم یہ سوچ کر اُلجھ رہے ہو گے کہ میں نے یہ خط کیوں لکھا ہے۔ تمہیں ماں کا بھرپور پیار دینے اور تمہاری تیمار داری کے لیے موجود کیوں نہیں ہوں؟ میں اسی شرط پر تمہاری اُلجھن دور کروں گی' جب تم میری تمام ہدایات پر عمل کرتے ہوئے زخم بھرنے تک اسی کاٹیج میں رہو گے اور کسی دشمن کا سامنا نہیں کرو گے۔

میں اپنے فولاد جیسے بیٹے کو بزدل نہیں بناؤں گی۔ میرے اور تمہارے کئی دشمن

ہیں۔ تم جب تک ان سے انتقام نہیں لو گے اور میرے دامن پر لگے ہوئے دھبے کو نہیں مٹاؤ گے تب تک میں تمہارے رُوبرو آ کر تمہیں اپنے کلیجے سے نہیں لگاؤں گی۔

تمہیں ابھی بہت کچھ جاننا ہے اور بہت کچھ کرنا ہے اس لیے آرام کرو۔ اپنی توانائی بحال کرو پھر میں موبائل فون کے ذریعے تم سے رابطہ کروں گی۔ فقط تمہاری ماں آمنہ عرفان......"

وہ خط میری نگاہوں کے سامنے کھلا ہوا تھا۔ میں نے اسے اتنی مضبوطی سے تھام رکھا تھا جیسے وہ میری امی کا دامن ہو۔ آج مل رہا تھا۔ کل امی ملنے والی تھیں اور انہیں پانے کے لیے ان کی ہدایات پر عمل کرنا اور اپنی کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنا لازمی تھا۔

☆======☆======☆

میں نے اپنی یہ آپ بیتی شروع کرنے سے پہلے کیپٹن امیر حمزہ' راجہ نواز اور جمشید علی تارڑ کے کچھ اہم واقعات بیان کیے ہیں۔ پہلے ان تینوں کا ذکر لازمی تھا کیونکہ یہ مجھ سے پہلے منظرِ عام پر آ چکے تھے۔

یہ تینوں دولت اور جھوٹی شان و شوکت کے پیچھے نہیں بھاگتے تھے۔ بے لوث رہ کر ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔

مجھے خدمتِ خلق سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں پاکستان سے محبت کرتا ہوں لیکن دولت کو اہمیت دیتا ہوں۔ میرے والد ایک کارخانے کے مالک تھے۔ میں ہر جائز اور ناجائز طریقے سے دس فولادی کارخانوں کا مالک بننا چاہتا ہوں۔

یہ تینوں کرپٹ سیاست دانوں کا محاسبہ کرنے اور خوابیدہ عوام کو بیدار کرنے کی جدوجہد میں خطرات سے کھیل رہے تھے۔

مجھے جاگنے والوں کو سلانے کا اور سونے والوں کو جگانے کا شوق نہیں تھا۔ میں جاگیرداروں کی زمینیں چھیننے اور سرمایہ داروں کے بینکوں کو لوٹنے کے مرحلے تک پہنچنے والا تھا۔

اس لیے کیپٹن امیر حمزہ' راجہ نواز اور جمشید علی تارڑ کی بالکل مخالف سمت دوڑ رہا تھا۔ ایسے میں میرا ان تینوں سے ٹکراؤ ہونے والا تھا۔ وہ جن کرپٹ سیاست دانوں کو مٹا دینا چاہتے تھے' میں ان سیاست دانوں کو تحفظ فراہم کر کے ان سے لاکھوں کروڑوں روپے حاصل کرنے والا تھا۔

میں ان تینوں سے اچھی طرح واقف نہیں تھا۔ کبھی کبھی سیاسی پارٹیوں میں جاتا تھا اور وہاں کے عام اور خاص ورکروں سے ان کا ذکر سنتا تھا۔ آئندہ ان تینوں کے متعلق جو

اہم اور مکمل معلومات حاصل ہوئی تھیں' انہیں اپنی آپ بیتی میں تسلسل قائم رکھنے کے لیے پیش کررہا ہوں۔

اس طرح قارئین کو یہ معلوم ہوتا رہے گا کہ وہ تینوں کن مراحل سے گزر رہے ہیں اور میں کن مراحل سے گزرتا ہوا ایسے مقام تک پہنچنے والا ہوں جہاں ان تینوں سے میری دشمنی کا ایک انوکھا باب شروع ہوگا۔

☆=====☆=====☆

ایسے ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ جو اپنے شعبوں میں اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں' وہ ان پڑھ اور جاہل افراد کی طرح اندر سے ضعیف الاعتقاد بھی ہوتے ہیں۔ یعنی وہ قرآن مجید سے استفادہ کرنے کے بجائے جاہلوں کی طرح جادو ٹونے اور پیش گوئیاں کرنے والے نجومیوں پر بھروسا کرتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ ہماری دنیا میں کامیاب پیش گوئیاں کرنے والے نجومی گزرے ہیں اور ایسے باصلاحیت نجومی اب بھی ہیں لیکن پاکستان میں اکثریت ایسے افراد کی ہے جو صرف نجومی نہیں ہوتے بلکہ خود کو عامل بابا اور کسی جادو نگری کا پروفیسر کہتے ہیں۔ یعنی وہ ہرفن مولا ہوتے ہیں۔ اس پیشے سے تعلق رکھنے والا فقیر کہلاتا ہے۔ پہنچا ہوا بزرگ مانا جاتا ہے۔ عامل اور جنات بابا ہونے کی دہشت طاری کرتا ہے اور ایک نجومی کی طرح پیش گوئی بھی کرتا ہے۔

پاکستان کی تاریخ گواہ ہے کہ اس ملک کے اکثر سیاست داں ایسے ہی عامل' فقیر جنات بابا اور نجومی جیسے ہرفن مولا شعبدہ بازوں کے عقیدت مند رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ یہ ہرفن مولا اپنے مریدوں اور بہت ہی تعلیم یافتہ ایجنٹوں کے ذریعے پریذیڈنٹ ہاؤس اور پرائم منسٹر ہاؤس تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ سیاست دانوں کو دعوے سے بتاتے ہیں کہ ان کی موجودہ حکومت پر کیسی نحوست چھانے والی ہے۔ اگرچہ آئندہ الیکشن میں انہیں کامیابی ہوگی لیکن ایک کالی بلا آڑے آرہی ہے۔

نحوست دور کرنے اور کالی بلاؤں کا توڑ کرنے کے لیے صرف کالا بکرا ذبح کرنے سے بات نہیں بنتی۔ جس ہرفن مولا عامل اور نجومی پر اندھا اعتماد ہوتا ہے' سیاست داں اسے پلاٹ الاٹ کرتے ہیں اور نذرانے کے طور پر لاکھوں روپے دیتے رہتے ہیں۔

ہسٹری آف پاکستان سے یہ حقیقت نہیں مٹائی جاسکتی کہ ایسے شعبدہ باز عاملوں اور نجومیوں کو بذریعہ طیارہ وزیراعظم ہاؤس میں بلایا گیا اور انہیں وی آئی پی ٹریٹ منٹ دیا گیا۔ انہیں حج کرایا گیا اور ان کی فیملی سمیت انہیں یورپ اور امریکا کی سیر کرنے کے لیے

بھیجا گیا۔

جس طرح اللہ صرف مصیبت کے وقت سیاست دانوں کو یاد آتا ہے۔ وہ اپنی ذہانت اور سیاسی بازی گری سے کامیابی کے مرحلے تک پہنچنے کے دوران میں اپنے اپنے عامل اور نجومی سے مسلسل رابطہ رکھتے ہیں اور الیکشن جیتنے کے لیے ان کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔

مرزا نیک بخت کو اطلاع ملی کہ کاشف اکبر اور بیگم دردانہ نے اپنے عامل بابا کو عالی شان محل نما کوٹھی کے گیسٹ ہاؤس میں مہمان بنا کر رکھا ہے اور وہ عامل بابا ان کے حق میں زبردست عمل کرتے رہتے ہیں۔

بیگم نیک بخت نے اپنے میاں سے کہا۔ "میں تو بہت خوش ہوں۔ میری سوکن بننے کا خواب دیکھنے والی انیلا بانو حرام موت مرگئی ہے لیکن آپ کی سیاسی کامیابی مشکوک ہے۔ کیپٹن امیر حمزہ نے اس معاہدے کو ننگی تلوار کی طرح آپ کے سرپر لٹکا رکھا ہے۔ ہمیں بھی اپنے عامل کامل بابا جھٹکے شاہ سے رجوع کرنا چاہیے۔"

عبوری حکومت تین ماہ کے لئے تھی۔ جس میں سے دو ہفتے گزر چکے تھے۔ آج کل میں الیکشن کی حتمی تاریخ کا اعلان کیا جانے والا تھا۔ مرزا نیک بخت نے اپنے عامل کامل کو بلانے میں دیر نہیں کی۔ اس نے بابا جھٹکے شاہ کو اپنے گیسٹ ہاؤس میں بلا کر شاہی مہمان کی طرح استقبال کیا اور یہ عرض کیا۔ "حضور شاہ صاحب! جب تک انتخابات کے نتائج کا اعلان نہیں ہوگا' آپ یہاں میرے مہمان رہیں گے اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے میری راہنمائی فرماتے رہیں گے۔"

بابا جھٹکے شاہ نے کہا۔ "آپ ایک گھنٹے بعد میرے پاس آئیں۔ میں آپ کے مستقبل کے بارے میں کچھ ضروری باتیں کروں گا۔"

نیک بخت اپنی کوٹھی میں آیا۔ بیگم نے ملازمہ سے چائے لانے کو کہا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ نیک بخت نے اسپیکر آن کرتے ہوئے پوچھا۔ "ہیلو کون؟"

"میں ہوں۔ امیر حمزہ.........."

وہ خوش دلی ظاہر کرتے ہوئے مگر ناگواری سے منہ بناتے ہوئے بولا۔ "او۔ کیپٹن صاحب! آپ نے کل سے فون پر رابطہ نہیں کیا۔ جب آپ فون نہیں کرتے ہیں تو دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔"

"تمہیں میری طرف سے نہیں' انیلا بانو کی طرف سے پریشان رہنا چاہیے۔"

"جی ہاں۔ پتا نہیں کس ظالم نے اسے بے دردی سے قتل کیا ہے اور الزام مجھ پر

آرہا ہے۔"

"لیکن یہ بات یقینی نہیں ہے کہ واقعی اسے قتل کیا گیا ہے اور اب تو میں بھی یقین کرنے پر مجبور ہوں کہ شاید وہ زندہ ہے۔"

"آپ کیسے یقین کررہے ہیں؟"

"میں نے ابھی پندرہ منٹ پہلے ٹیلی فون پر اس کی آواز سنی ہے۔"

ٹیلی فون کے لاؤڈ اسپیکر سے امیر حمزہ کی آواز ابھر رہی تھی۔ بیگم اور نیک بخت دونوں ہی اس کی بات سن کر چونک گئے۔ نیک بخت نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا واقعی وہ زندہ ہے؟ کیا آپ نے واقعی اس کی آواز سنی ہے؟ لیکن........ آپ تو کسی کو اپنا فون نمبر نہیں دیتے ہیں۔"

"وہ لندن جانے والی تھی۔ میں نے اسے ایسے موبائل فون کا نمبر دیا تھا جسے آج کے بعد میں کبھی استعمال نہیں کروں گا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ لندن پہنچ کر اپنی خیریت سے آگاہ کرے۔"

یہ کہہ کر وہ ذرا چپ ہوا۔ نیک بخت نے پوچھا۔ "آپ خاموش کیوں ہوگئے؟ کیا اس نے فون پر آپ سے رابطہ کیا تھا؟"

"ہاں وہ کہہ رہی تھی کہ بخیریت لندن پہنچ گئی ہے لیکن مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ میں انیلا بانو بول رہی ہوں۔ اگر پاکستان میں میری لاش پائی گئی ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اپنے جسم کے مردہ ہوجانے کے بعد بھی زندہ ہوں۔"

"کیپٹن صاحب! یہ کیسی بے تکی بات ہے۔ کیا آپ ایسی باتوں کا یقین کررہے ہیں؟"

"میں ابھی یقین کرنے اور نہ کرنے کی کشمکش میں ہوں۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ وہ کہانیوں' قصوں والی باتیں کررہی ہے لیکن میں اس بات پر حیران ہوں کہ مجھے انیلا بانو کی آواز سنائی دے رہی ہے۔"

"فون پر مغالطہ ہو سکتا ہے۔"

"بالکل ہو سکتا ہے۔ وہ ابھی تم سے فون پر بات کرنے والی ہے۔ تم اس کی آواز اور لہجے کو اچھی طرح پہچان سکو گے۔ میں ایک گھنٹے بعد تمہیں فون کروں گا کیونکہ میں بھی تجسس میں مبتلا ہوگیا ہوں۔"

اس نے فون بند کردیا۔ نیک بخت نے اسپیکر آف کرتے ہوئے بیگم کو دیکھا۔ بیگم

نے کہا۔ "آپ نے اور پولیس والوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اس کی لاش کے پاس ایسا سامان تھا' جیسے وہ لندن جارہی تھی۔ آپ کے گدھے آلہ کاروں نے اس کے چہرے کو ٹی ٹی کی گولیوں سے چھلنی کردیا تھا لیکن آپ تو یقین سے اسے انیلا بانو کہہ رہے تھے۔"

"بے شک۔ ایک بار اس نے میرے ساتھ ایک بوتیک میں جو لباس خریدا تھا' وہی اس کے جسم پر تھا اور اسے مجھ سے زیادہ اور کون پہچان سکتا ہے؟"

بیگم ناگواری سے "اونہہ" کہہ کر چپ ہوگئی۔ کیونکہ ملازمہ چائے کی ٹرے لے کر آرہی تھی۔ اس نے دونوں کے لیے چائے بنائی پھر ان کے سامنے پیالیاں رکھ کر چلی گئی۔ وہ پیالی اٹھا کر چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولا۔ "میں نے آواز اور لہجے کی نقل کرنے والے بڑے بڑے فنکار دیکھے ہیں۔ دشمن کوئی چال چل رہے ہوں گے۔ انیلا بانو کی نقالی کرنے والی کسی عورت کے ذریعے یہ ثابت کرنا چاہتے ہوں گے کہ انیلا بانو زندہ ہے اور اس کے ساتھ میرا اسکینڈل ختم نہیں ہوا ہے۔ مخالفین ایسے اسکینڈل کے ذریعے میری انتخابی مہم کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

اس نے ایک ملازم کو بلا کر کہا۔ "حضور شاہ صاحب سے کہو۔ ہم آدھے گھنٹے میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ اگر وہ آرام فرما رہے ہیں تو انہیں زحمت نہ دینا۔ ہم شام کو کسی وقت حاضری دیں گے۔"

ملازم چلا گیا' بیگم نے کہا۔ "حضور شاہ صاحب بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ پچھلے الیکشن میں انہوں نے سچی پیش گوئی کی تھی کہ اقتدار آپ کو حاصل ہوگا لیکن اسمبلی میں آپ کو اپنے ممبران کی تعداد بڑھانی ہوگی اور آپ کے لیے لازمی ہوگا کہ آپ کسی معتبر اور بزرگ شخص کو ناراض نہ کریں۔"

"میں نے ان کی ہدایات پر عمل کیا تھا پھر بھی کامیاب ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اب تم کہوگی کہ میں نے حضور شاہ صاحب کو ناراض کیا تھا۔"

"اور کیا؟ انہوں نے نیک کام کے لیے پچیس کنال زمین مانگی تھی اگر آپ یہ زمین حضور شاہ صاحب کے نام کردیتے تو کاشف اکبر پچھلی بار حکومت بنانے میں کامیاب نہ ہوتا۔"

"بیگم! پیروں فقیروں کو ان کی اوقات میں رکھنا چاہیے۔ کیا تم نہیں جانتیں کاشف اکبر نے اپنے عامل ملتانی قلندر بابا کو مسجد اور مدرسے کی تعمیر کے لیے زمینیں دی تھیں۔ ان قلندر بابا نے اس زمین پر بہت بڑا شاپنگ پلازا بنالیا ہے۔ ان کو ذرا سی ڈھیل دی

جائے تو یہ لندن میں اپنے لیے سرے محل خریدنے کی فرمائش کردیں گے۔"
"میں یہ نہیں کہتی کہ آپ انہیں سرپر چڑھائیں لیکن ہمارے لیے پچیس کنال زمین تو کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ اس بار حضور شاہ صاحب کی پسند کی زمین ان کے نام کرادیں۔ انہیں خوش کردیں۔ آپ مسائل میں گھرے ہوئے ہیں۔میں بھی خوش ہورہی تھی کہ اس چڑیل سے نجات مل گئی ہے مگروہ کمینی لندن میں زندہ بیٹھی ہوئی ہے۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ مرزا نیک بخت فون پر براہ راست کسی سے گفتگو نہیں کرتا تھا۔ پہلے اس کے سیکرٹری اور مشیر فون اٹینڈ کرتے تھے پھر نیک بخت کو اطلاع دیتے تھے۔ اس کے بعد وہ کسی سے گفتگو کرنا پسند کرتا تھا یا پھر گفتگو کرنے سے انکار کردیتا تھا لیکن اس وقت وہ ذاتی ٹیلی فون کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے انیلا بانو کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو۔ میں بول رہی ہوں اور میں وہ ہوں جسے تم دیکھے بغیر آواز سے پہچان لیتے ہو۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "انیلا بانو! یہ تم بول رہی ہو مگر یہاں تو تمہاری لاش پائی گئی ہے۔"

"میرے اس بے جان جسم کی کوئی اہمیت نہیں ہے' اصل روح ہوتی ہے۔ میری زندگی میں ایک داشتہ ہونے کا جو داغ لگ گیا تھا' وہ نہیں مٹ سکا۔ میری روح بے چین ہوکر لندن پہنچ گئی ہے۔"

"کیا روحیں ٹیلی فون پر باتیں کرتی ہیں؟"

"ٹیلی فون تمہارے پاس ہے' میرے پاس نہیں ہے میں روحانی قوت سے بول رہی ہوں اور میری باتیں تم اپنے فون پر سن رہے ہو۔"

"تم بے تکی باتیں کرکے میرا وقت ضائع کررہی ہو۔"

"تم اسے بے تکی باتیں کہہ رہے ہو مگر یہ روح ابھی پلک جھپکتے ہی تمہارے پاس آسکتی ہے اور آتے ہی پہلے سوکن کا یعنی تمہاری بیگم کا گلا دبائے گی۔ میں جب بھی پاکستان آؤں گی اپنے اور تمہارے درمیان کی دیوار گرادوں گی۔ کیا ابھی آجاؤں؟"

بیگم نیک بخت نے جلدی سے چیخ کر کہا۔ "نہیں۔ اس سے کہو' وہیں رہے۔ یہاں نہ آئے۔میں حضور شاہ صاحب کے پاس جارہی ہوں۔ وہی مجھے اس بلا سے نجات دلا سکتے ہیں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اتنی تیزی سے باہر گئی جیسے وہ بلا اس کا پیچھا کررہی ہو۔ نیک بخت نے کہا۔ "انیلا بانو! یہ سائنسی ترقیوں کا دور ہے۔ ہم اکیسویں صدی میں داخل ہونے

والے ہیں۔ تمہیں بے تکی باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "میں تمہاری زندگی میں گلاب کی طرح مہکتی تھی۔ تم نے مجھے اگر بتی بنا دیا ہے۔ اب میں تمہارے وجود کے زندہ مقبرے پر اگر بتی کی طرح سلگتی اور ماتمی خوشبو دیتی رہوں گی۔"

"کیا لندن جانے سے پہلے تمہارے ساتھ جو زیادتی ہوئی' اس کا الزام مجھے دے رہی ہو؟"

"تم نے اپنے بوڑھے چوکی دار اور ایک کرائے کے قاتل کو میرے بھائی کے پاس بھیجا تھا۔ وہ مجھے اور میرے بھائی کو قتل کردیتے۔ پھر میرے بھائی کی لاش کہیں چھپا دیتے۔ اس طرح یہ ظاہر ہوتا کہ غیرت مند بھائی مجھے قتل کرکے کہیں روپوش ہوگیا ہے۔ اب بھی پولیس اسی طرح سوچ رہی ہے۔ جبکہ میرے بھائی کو میری آنکھوں کے سامنے تمہارے کرائے کے قاتل نے گولی ماری تھی۔"

"تم اس بوڑھے چوکی دار کے حوالے سے سمجھ رہی ہو کہ میں نے کرائے کے قاتل کو بھیجا تھا۔ جبکہ وہ بوڑھا یہاں سے ملازمت چھوڑ چکا تھا اور اپوزیشن کے لیے کام کر رہا تھا۔ یہ اپوزیشن والے تمہیں میرے خلاف بھڑکا رہے ہیں۔"

"اب تم بے تکی باتیں کررہے ہو۔ میں تمہاری کمینگی اور خود غرضی اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ بہتر ہے صرف کام کی بات کرو۔ پچھلے برس میں تمہارے ساتھ لندن آئی تھی۔ یہاں اپنا بینک اکاؤنٹ کھولا تھا۔ وہ اکاؤنٹ نمبر تمہاری ڈائری میں لکھا ہوا ہے۔ کل دوپہر تک اس میں پچاس لاکھ روپے جمع کرادو۔"

"یہ رقم تو میں پہلے بھی جمع کرانے والا تھا مگر وہ نکاح پڑھانے والی بات ایسی ہے کہ میں........"

"میں تمہارے جیسے مکار قاتل پر تھوکتی ہوں۔ پھر نکاح کیسے پڑھاؤں گی۔ میں تو کبھی تمہارے روبرو بھی نہیں آؤں گی۔ لندن کا جو کاٹیج میرے نام کر گئے' اس سلسلے کی کارروائیوں میں میری ایک لیڈی سیکرٹری پیش پیش رہے گی۔ وہ میرے پاس کاغذات لائے گی۔ میں رجسٹرار کے سامنے دستخط کروں گی اس وقت تم مجھ سے دور رہو گے۔"

"کیا تمہیں شبہ ہے کہ میں تم پر قاتلانہ حملہ کرواؤں گا؟"

"کیلنڈر کی تاریخ اور وقت کا کانٹا اتنی تیزی سے نہیں بدلتا جتنی تیزی سے مرد کی نیت بدلتی ہے۔ ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کرلو' اگر تمہارے مخالفین مجھے قتل کریں گے یا مجھے کسی طرح حادثاتی موت دی جائے گی تو امیر حمزہ ہر حال میں تمہیں میرا قاتل

سمجھے گا۔ تمہیں سیاست کے میدان سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکے گا۔ تمہیں عوام کے........ جوتے کھلانے کے لیے سڑکوں پر لے آئے گا۔ میں فون بند کررہی ہوں۔ تین دن کے اندر یہاں آؤ اور اپنا کاٹیج میرے نام ٹرانسفر کرکے چلے جاؤ۔"

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کردیا۔ وہ ریسیور رکھ کر سوچنے لگا۔ "اچھا تو وہ زندہ ہے۔ یہاں سے لندن تک امیر حمزہ کی سخت نگرانی میں ہے۔ اسی لیے بڑے سخت لہجے میں مجھ سے گفتگو کررہی تھی۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر کوٹھی سے باہر آیا۔ پھر چند قدموں کا فاصلہ طے کرکے گیسٹ ہاؤس میں پہنچا۔ بابا جھٹکے شاہ ایک مسند پر بیٹھے ہوئے' سر جھکائے بیگم نیک بخت کی باتیں توجہ سے سن رہے تھے۔ نیک بخت نے آکر بابا سے مصافحہ کیا۔ پھر بیگم کے پاس آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ بیگم نے کہا۔ "میں نے حضور شاہ صاحب کو انیلا بانو کے بارے میں تفصیل سے بتایا ہے۔ حضور فرماتے ہیں کہ وہ کوئی روح یا بلا نہیں ہے۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔"

بابا جھٹکے شاہ نے کہا۔ "میں جب تک یہاں ہوں۔ آپ دونوں کا کوئی بھی دشمن اس کوٹھی کے احاطے میں قدم نہیں رکھ سکے گا۔"

نیک بخت نے کہا۔ "ہمارے دشمن ایسے نہیں ہیں کہ ہمارے رُوبرو یا ہماری کوٹھی میں داخل ہوکر حملہ کریں۔ وہ نہ ہاتھا پائی کرتے ہیں اور نہ ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ وہ صرف سیاسی چالیں چلتے ہیں۔"

"آپ کے نمبر ون دشمن بیگم دردانہ اور کاشف اکبر ہیں۔ ان کے علاوہ اور کون ہیں؟"

"فی الحال کیپٹن امیر حمزہ ہے۔ اس کی شہ پر انیلا بانو بہت بڑی مصیبت بن گئی ہے۔ امیر حمزہ نے وعدہ کیا ہے کہ میں حکومت بنانے کے بعد خفیہ ہاتھ کی پالیسیوں پر عمل نہیں کروں گا اور ایک محب وطن حکمران کی طرح ملک اور قوم کی بہتری اور برتری کے لیے فرائض ادا کرتا رہوں گا تو وہ خفیہ ہاتھ سے کیے ہوئے معاہدے کو کبھی منظرِ عام پر نہیں لائے گا۔"

بیگم نے کہا۔ "فی الحال اطمینان ہے کہ امیر حمزہ انتخابی مرحلے سے گزرنے اور کامیاب ہوکر نئی حکومت بنانے تک کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرے گا لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟"

نیک بخت نے کہا۔ "یہی تو پریشانی ہے وہ مجھے مجبور کرتا رہے گا کہ میں خفیہ ہاتھ کی

پالیسیوں پر عمل نہ کروں۔ اس وقت بڑے مسائل پیدا ہوں گے۔ میں اپنی حکومت کی پانچ سال کی مدت پوری نہیں کرسکوں گا۔ دو سال میں میری چھٹی ہوجائے گی۔"

بابا جھٹکے شاہ نے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ کیا آپ امیر حمزہ کی تاریخ پیدائش اور وقت پیدائش معلوم کرکے مجھے بتا سکتے ہیں؟"

"ہاں اس کے سروس ریکارڈ سے معلوم کرا سکتا ہوں۔ کیا آپ اس کا زائچہ تیار کریں گے۔"

"جی ہاں۔ ابھی اس کے ستارے عروج پر ہیں۔ زائچے سے پتا چلے گا کہ وہ کب یا کیسے گردش میں آسکتا ہے پھر یہ کہ میں اپنے پُراسرار عمل کے ذریعے بھی اسے آپ کی مخالفت سے باز رکھ سکتا ہوں۔ اس نے وہ خفیہ معاہدہ جہاں بھی چھپا کر رکھا ہوگا' وہ میری ایک پھونک سے جل کر راکھ ہو جائے گا۔"

"بس میں یہی چاہتا ہوں کہ وہ معاہدہ جل کر راکھ ہوجائے یا کسی طرح بھی ضائع ہوجائے۔ اس کے بعد میں ان دونوں سے اچھی طرح نمٹ لوں گا۔"

بیگم نے کہا۔ "آپ شاید انیلا بانو سے لندن میں نمٹ سکیں لیکن امیر حمزہ سے کیسے نمٹیں گے؟ وہ تو آج تک کسی کو نظر نہیں آیا ہے۔ پتا نہیں کتنے زبردست انتظامات کے ساتھ رُوپوش رہتا ہے۔ جہاں چاہتا ہے' واردات کرتا ہے پھر کہیں جاکر گم ہوجاتا ہے۔"

"وہ زیادہ عرصے تک رُوپوش نہیں رہ سکے گا۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے' ملکی اور غیر ملکی ایجنسیاں اسے تلاش کررہی ہیں۔ وہ اب تک شاید اس لیے رُوپوش رہنے میں کامیاب ہے کہ اس کے سروس ریکارڈ سے حاصل کی ہوئی ایک ہی تصویر کے ذریعے اسے تلاش کیا جارہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ چہرے بدل کر آزادی سے گھومتا ہو اور کوئی اسے پہچان نہ پاتا ہو۔"

خفیہ ہاتھ کی ایک خطرناک ایجنسی کے سربراہ رے ٹنارکا سے نیک بخت کی تین خفیہ ملاقاتیں ہوچکی تھیں۔ رے ٹنارکا اور دوسری تمام ایجنسیوں والے یہی کہتے تھے کہ امیر حمزہ کا کوئی ایک چہرہ اور ایک خفیہ اڈا نہیں ہے۔ وہ چہرے بھی بدلتا رہتا اور جگہ بھی تبدیل کرتا رہتا ہے۔

ایسے میں اسے ڈھونڈ نکالنا مشکل تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ کوئی بھی مجرم سدا پُراسرار کہلاتے ہوئے رُوپوش نہیں رہ سکتا۔ وہ ایک نہ ایک دن اپنی کسی غلطی کے سبب گرفت میں آجاتا ہے اور امیر حمزہ بھی کسی دن ضرور گرفت میں آئے گا۔

☆======☆======☆

بیگم دردانہ اور کاشف اکبر جس عالی شان محل میں رہتے تھے' اسے دردانہ محل کہا جاتا تھا۔ محل کے اطراف مسلح گارڈز کا پہرہ لگا رہتا تھا۔ جب سے عبوری حکومت قائم ہوئی تھی اور نئے انتخابات کا چرچا ہو رہا تھا۔ تب سے دونوں بڑے سیاستدانوں کی رہائش گاہوں کے سامنے پارٹی کارکنوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ دور دور تک چائے' پان' سگریٹ' حلیم' نہاری اور روٹیوں والوں کی عارضی دکانیں کھل گئی تھیں۔ پولیس والے انہیں بھگایا کرتے تھے۔ وہ ایک آدھ گھنٹے کے لیے دکانوں کا سامان سمیٹ کر دور چلے جاتے تھے پھر بھتا دے کر دوبارہ آکر اپنی دکانیں جمالیا کرتے تھے۔

کاشف اکبر نے دردانہ محل میں الیکشن سیل قائم کیا تھا۔ جہاں ایک ٹیلی فون ایکسچینج تھا۔ اس ایکسچینج کے ذریعے ملک کے گوشے گوشے سے ان کے حلقۂ انتخاب کی خبریں موصول ہوتی تھیں کہ پارٹی کی ہدایت کے مطابق کس حلقے میں کس طرح کام ہو رہا ہے۔ بڑے بڑے ممالک سے تعاون حاصل کرنے اور اپنی انتخابی سرگرمیوں کی رپورٹ دینے کے لیے ایک الگ ایکسچینج تھا۔

ریڈیو' ٹیلی ویژن اور سرکاری نیوز ایجنسی اور ملک کی تمام نیوز ایجنسیوں اور اخبارات سے رابطہ رکھنے کے لیے بڑے بڑے دانشور اور صحافیوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ وہ صحافی اخبارات میں کاشف اکبر کی حمایت میں کالم لکھتے تھے اور یہ دعوے کرتے تھے کہ کیٹی بندر' مل پاور اور اسٹیل ملز میں گھپلوں کے جو الزامات کاشف اکبر پر لگائے ہیں' وہ محض دشمنوں کی سیاسی سازشیں ہیں۔ پاکستان کے باشعور عوام کاشف اکبر کو ووٹ دے کر دوبارہ حکومت بنانے کا موقع دیں گے تو وہ ٹھوس ثبوت کے ساتھ تمام الزامات کو غلط ثابت کردیں گے اور اپوزیشن لیڈر نیک بخت جو نیک اور پارسا بنا رہتا ہے' اس کے خلاف یہ جرم ثابت کردیں گے کہ اس نے اپنے لیے اور اپنی پارٹی کے عہدیداروں کے لیے بینک سے اربوں روپے قرض لیے ہیں۔ وہ سب نادہندگان ہیں انہیں انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت نہ دی جائے۔

یہی الزام کاشف اکبر اور اس کی پارٹی کے بڑے عہدیداروں پر تھا کہ وہ سب قرض نادہندگان ہیں۔ وہ بھی عوام سے ووٹ لے کر حکومت بنانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں کے عہدیداروں نے قرضے لیے تھے اور ان کی ادائیگی نہیں کی تھی۔ تیسری کوئی ایسی سیاسی پارٹی نہیں تھی جو بڑی تعداد میں ووٹ حاصل کرکے اسمبلی تک پہنچ پاتی۔

اگر عوام کی ایک متحدہ مضبوط سیاسی پارٹی ہوتی تو آج پاکستان میں اسلامی آئین کے

مطابق ایک جمہوری حکومت کام کرتی اور ترقیاتی فرائض انجام دیتے ہوئے ساری دنیا میں ایک مثالی اسلامی حکومت کہلاتی لیکن پچھلے پچاس برسوں سے عوام چار صوبوں میں' چار زبانوں میں اور چار مختلف تہذیبوں اور رسم و رواج میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے اس طرح الگ ہیں کہ اگر ایک صوبہ اور ایک زبان والا دوسرے صوبے کی بیٹی یا بہن سے شرعی طور پر نکاح پڑھا لے تو دوسرے صوبے والے اسے غیرت کا مسئلہ بنا کر ایک دوسرے کے جانی دشمن بن جاتے ہیں۔

ایسا صرف اپنے صوبے کے وڈیرے اور جاگیردار اپنی اجارہ داری قائم رکھنے اور اپنے ووٹ بینک کے ذریعے اپنی سیاسی قوت بحال رکھنے کے لیے کرتے ہیں۔ عوام سے تعلق رکھنے والی اس داستان کو آگے بڑھانے سے پہلے یہ طے کرلیا جائے کہ عوام کیا ہیں؟

سیدھی سی بات ہے کہ پاکستان میں عوام نہیں ہیں بلکہ جاگیرداروں' ملکوں' سرداروں اور وڈیروں کی الگ الگ رعایا ہیں۔

پاکستان میں ایک مکمل اور جامع قوم نہیں ہے۔ پنجابی قوم ہے' پٹھان قوم' بلوچی قوم' سندھی قوم ہے اور اب مہاجر اور سرائیکی قوم کا اضافہ ہوچکا ہے۔ وہ پاکستانی قوم جو تحریر اور تقریر میں پڑھی اور سنی جاتی ہے' وہ حقیقتاً نظر نہیں آتی۔

یہ رعایا ہر صوبے کے محلوں اور حویلیوں کے آگے پارٹی کارکنوں کی حیثیت سے بھیڑ لگاتی ہے۔ انہیں پارٹی کی طرف سے ہفتہ وار اجرت ملتی ہے۔ اس طرح ان کی محتاجی اور بے روزگاری' انتخابی مہم جاری رہنے تک دور ہوجاتی ہے۔ پارٹی کی طرف سے نامزد ہونے والے امیدواروں کو اپنے اپنے علاقے میں دفاتر قائم کرنے کے لیے لاکھوں روپے دیے جاتے ہیں۔ یہ تمام امیدوار اور تمام کارکن گھر گھر' گلی گلی چیختے پھرتے ہیں کہ ان کی سیاسی پارٹی نے قومی خزانے سے اربوں روپے نہیں لیے۔ ان کے دور حکومت میں جو مہنگائی بڑھی' وہ دراصل ان سے پہلے والی حکومت نے بڑھائی تھی جو قرضے لیے وہ پہلے والی حکومت نے لیے۔ جو کرپشن بڑھی' قتل و غارت گری ہوئی اور جن بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ اجتماعی زیادتیاں ہوئیں' وہ سب پہلے والی حکومت کا شرمناک کارنامہ تھا۔

اب نئی حکومت بناتے ہی سب سے پہلے گھر گھر سستا راشن پہنچایا جائے گا۔ بچوں کو مفت تعلیم دی جائے گی۔ دہشت گردوں کا صفایا کردیا جائے گا۔ ملک میں اتنی پیداوار بڑھائی جائے گی اور اتنی صنعتیں قائم کی جائیں گی کہ قرضے لینے کے لیے ورلڈ بینک کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

آدمی ایک ہی سنہرا خواب دیکھتا رہے اور اس کی تعبیر نہ دیکھے تو وہ آئندہ جھوٹے

اور بہلاوا دینے والے خواب سے بہلنا چھوڑ دیتا ہے لیکن آفرین ہے پاکستانی عوام پر جو اسی بل میں بار بار ہاتھ ڈالتے ہیں' جہاں سے ڈسے جاتے ہیں۔ جس راستے پر سانپوں کی بہتات ہو' اس راستے پر اندھے ہو کر چلتے ہیں۔ آنکھ والے اور بیدار ذہن والے منزل تک پہنچنے کا نیا راستہ بناتے ہیں اور وہ نیا راستہ' وہ صراط مستقیم ہر مسلمان کے گھر کے طاق پر رکھی ہوئی کتاب میں موجود ہے۔ اس کتاب پر سے گرد صاف کی جائے گی تو ذہن سے بھی گرد و غبار چھٹے گا۔

کاشف اکبر اسلام آباد سے کراچی آیا۔ اسے یہ رپورٹ ملی تھی کہ کراچی کے بیشتر علاقوں میں مخالف پارٹی کی پوزیشن مضبوط ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ ابھی سے اس کا توڑ کرنے کے لیے بڑے دھماکا خیز انداز میں بڑے بڑے جلسے کرنے ہوں گے اور آزاد امیدواروں کو ابھی سے خریدنے کی کوششیں کرنی ہوں گی۔

کاشف اکبر نے ایک پارٹی میٹنگ میں کہا۔ "ہم اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کررہے ہیں لیکن اس بار خفیہ ہاتھ کی ایجنسیاں مرزا نیک بخت کے لیے کام کررہی ہیں۔ ایسے وقت ہمیں محتاط رہ کر سیاسی غلطیوں سے بچتے رہنا چاہیے۔"

پارٹی کے ایک عہدیدار نے کہا۔ "الیکشن کمپین کے دوران میں طلبا فرنٹ لائن آرمی کی طرح اہم ہوتے ہیں۔ اس بار یونیورسٹی میں ہماری طلبا یونین کمزور پڑ رہی ہے۔"

"کیوں کمزور پڑ رہی ہے؟ کیا انہیں اسلحہ اور رقم دینے میں کمی کی جارہی ہے؟"

"نہیں ہمارے ایک غلط فیصلے سے طلبا یونین کا ایک لیڈر مشکلات میں پڑ گیا ہے۔ تھر کے وڈیرے کمال صالح نے ایک نوجوان راجہ نواز کی سفارش کی تھی کہ وہ زبردست دہشت گرد ہے۔ اسے یونیورسٹی میں داخلہ دلایا جائے۔ وہاں ہماری پارٹی کی یونین بہت مضبوط ہوگی لیکن طلبا یونین کے لیڈر جمال صالح نے شکایت کی ہے کہ راجہ نواز ہماری پارٹی کا دشمن ہے بلکہ وہ کسی بھی سیاسی پارٹی میں نہیں ہے۔"

کاشف اکبر نے پوچھا۔ "پھر وہ کون ہے؟"

"ایک سرپھرا عاشق ہے۔ وہ کمال صالح کی بیٹی' جمال صالح کی بہن نازاں سے عشق کرنے یونیورسٹی میں داخل ہوا ہے اور کہتا ہے یہاں تعلیم حاصل کرو یا محبت کرو۔ جو نفرت یا خون خرابا کرے گا' اسے اسپتال پہنچا دیا جائے گا اور وہ یونیورسٹی کی دو بڑی اسٹوڈنٹس یونین کے دونوں لیڈروں کو مرہم پٹی کے لیے اسپتال جانے پر مجبور کرچکا ہے۔"

"تعجب ہے۔ ایک مجنوں قسم کا جوان ہے اور دو طلبا تنظیموں کے پاس اسلحہ اور

طاقت کی کمی نہیں ہے' اس کے باوجود ان میں سے کوئی اسے ٹھکانے نہیں لگا سکتا؟ وہ تنہا جوان کچھ تو اپنے بچاؤ کے حربے رکھتا ہوگا۔"

اس عہدیدار نے کاشف اکبر کے قریب جھک کر دھیمی آواز میں کہا۔ "اب ہمیں اس پر شبہ ہونے لگا ہے۔"

"کیسا شبہ؟"

"راجہ نواز قد اور جسامت میں بالکل امیر حمزہ کی طرح ہے۔ اسی کی طرح باڈی بلڈر ہے اور ایک بھاری بھرکم موٹر سائیکل پر یونیورسٹی آتا ہے۔"

کاشف اکبر اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے پارٹی کے عہدے دار کو دیکھا پھر پوچھا۔ "اور کوئی خاص بات؟"

"وہ بہت زبردست فائٹر ہے۔ یونیورسٹی میں آتا ہے تو اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوتا۔ اس نے دونوں یونین کے لیڈروں کی خالی ہاتھوں پٹائی کی ہے اور ایک پارٹی کے دوسرے طلبا کو بھی اپنی جسمانی قوت سے خوف زدہ کر رکھا ہے۔"

"وائس چانسلر اور پروفیسر وغیرہ اسے مارپیٹ غنڈا گردی کے الزام میں گرفتار کراسکتے تھے۔ یونیورسٹی سے نکالنے کی وارننگ دے سکتے تھے۔"

"جناب! وائس چانسلر' پروفیسر اور طلبا و طالبات کی کثیر تعداد اس کی حمایت کرتی ہے۔ سب یہی کہتے ہیں کہ یونین والے تعلیم کی جگہ پر اسلحہ نکالتے ہیں جبکہ راجہ نواز انہیں اسلحہ استعمال کرنے سے پہلے ہی ٹھنڈا کردیتا ہے اور انہیں یونیورسٹی میں امن و امان قائم رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔"

"ہوں۔ مجھے یاد آرہا ہے۔ میں نے اسلام آباد سے آپ کے کہنے پر وائس چانسلر سے اس کی سفارش کی تھی۔ وہ امیر حمزہ ہے یا نہیں ہے لیکن اس کی طرح چالاک اور سولڈ پلان میکر ہے۔ وہ ہمارے کاندھوں پر سوار ہو کر یونیورسٹی پہنچ کر ہماری انتخابی مہم کو ناکام بنا رہا ہے۔"

"ہم نے راجہ نواز کو پیغام بھیجا ہے کہ ہم سے ملاقات کرے۔ اس کی کچھ کمزوریاں' کچھ خواہشات اور مطالبات ہوسکتے ہیں۔ ہم اس کی خواہشات اور مطالبات پورے کرکے اس سے کام لے سکتے ہیں۔ ہمارے جاسوس بڑی رازداری سے معلومات حاصل کررہے ہیں کہ وہ حقیقتاً کون ہے اور کہاں سے آتا ہے؟ یونیوسٹی میں اس کا جو پتا درج ہے' وہ وہاں نہیں رہتا ہے۔ اس پتے پر رہنے والے راجہ نواز کو نہیں جانتے ہیں۔"

"ہوں۔ خطرناک بھی ہے اور پُراسرار بھی۔ اسے میرے پاس لے آؤ۔ میں اسے

پرکھنے اور سمجھنے کے بعد اس سے سودا کروں گا۔"

☆======☆======☆

یونیورسٹی میں امن اور سکون تھا۔ جب سے راجہ نواز نے جمال کی پٹائی کی تھی تب سے طلبا و طالبات کو یہ اطمینان ہوا تھا کہ انہیں وہاں دل جمعی سے پڑھنے کا موقع ملے گا اور جمال صالح کے غنڈے ساتھی' لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ نہیں کریں گے۔

جمال صالح کی ایسی توہین ہوئی تھی کہ وہ دوسرے دن یونیورسٹی نہیں آیا۔ نازاں کو بھی یہ محسوس ہو رہا تھا کہ' ان بہن بھائی کو بہت بلند مقام سے اٹھا کر پستی میں پھینک دیا گیا ہے۔ اگرچہ وہ غیر شعوری طور پر راجہ نواز سے متاثر تھی لیکن وہ اس سے کم تر ہونا نہیں چاہتی تھی اور اس نے انہیں کم تر بنانے کے لیے جو سلوک اس کے بھائی سے کیا تھا' وہ ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کے اندر نفرت اور غصے سے شعلے بھڑک رہے تھے۔ دونوں بہن بھائی نے باپ سے رابطہ کرکے اسے وہ تمام حالات بتائے تھے جن کے باعث وہ توہین محسوس کرتے ہوئے یونیورسٹی نہیں جا رہے تھے۔ انہوں نے باپ سے کہا تھا کہ جب تک راجہ نواز کی بری طرح پٹائی نہیں کی جائے گی اور یونیورسٹی کے تمام طلبا و طالبات کے سامنے وہ ان بہن بھائی کے قدموں میں گر کر معافی نہیں مانگے گا' اس وقت تک وہ یونیورسٹی بھی نہیں جائیں گے اور اپنے باپ سے ناراض رہیں گے۔

وڈیرا کمال صالح نے فون پر ان سے کہا۔ "میرے بچو! میں نے کبھی کسی کی میلی نظر تم دونوں پر نہیں پڑنے دی۔ راجہ نواز نے مجھ سے فریب کیا ہے۔ تمہاری توہین کی ہے۔ اسے ٹارچر سیل میں پہنچا کر اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا جائے گا۔ ذرا صبر کرو۔ اسلام آباد سے کاشف اکبر صاحب آنے والے ہیں۔ راجہ نواز نے ہمیں دھوکا دے کر سیاسی پارٹی کے ذریعے یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے۔ کاشف اکبر صاحب یہ دھوکا برداشت نہیں کریں گے۔ اسے کتے کی موت مارنے کا حکم دیں گے۔"

وہ دوسرے دن آنے والا تھا۔ نازاں اور جمال صالح باپ کے انتظار میں یونیورسٹی نہیں گئے۔ جمال نے اپنی اسٹوڈنٹس یونین کے حامیوں کو اپنی کوٹھی میں بلا کر کہا۔ "راجہ نواز سے ہرگز مرعوب نہ ہونا۔ میں ایک دو روز میں پوری تیاریوں کے ساتھ یونیورسٹی آؤں گا اور سب کے سامنے اس غنڈے راجہ نواز کو اپنے قدموں میں جھکاؤں گا۔"

دوسری اسٹوڈنٹس پارٹی کے لیڈر صادق گیلانی اور اس کے حامی طلبا نے راجہ نواز کے پاس آکر خوشی کا اظہار کیا اور کہا۔ "اس نے صرف جمال صالح کو نہیں بلکہ اس ملک کی بہت بڑی سیاسی پارٹی کے منہ پر ٹھوکر ماری ہے۔ اس بار ہماری سیاسی پارٹی الیکشن میں

جیتے گی۔ تم ہمارے پارٹی ممبر بن جاؤ پھر وہ جمال صالح یونیورسٹی آنا چھوڑ دے گا۔"

راجہ نے کہا۔ "پھر تو مجھے بھی یونیورسٹی چھوڑنی ہوگی کیونکہ نازاں نہیں آئے گی تو مجھے یہ جگہ ویران صحرا نظر آئے گی۔"

صادق گیلانی نے کہا۔ "تم جتنے دلیر ہو' اتنے ہی دلیر عاشق بھی ہو۔ تمام طلبا و طالبات اور پروفیسروں کے سامنے نازاں سے عشق کا ڈنکا بجا دیا۔ ویسے وہ ہے بھی غضب کی حسین اور دل نشین۔ مل بانٹ کر کھانے والی چیز ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی راجہ نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے چلا گیا۔ ایسا سخت فولادی ہاتھ پڑا تھا کہ ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "میری محبت کو گالی دے رہے ہو؟ کیا تم مل بانٹ کر کھانے والی بات اپنی بہن کے لیے کہہ سکتے ہو؟"

وہ سمجھتا تھا کہ خالی ہاتھ کوئی اس سے مقابلہ کرنے نہیں آئے گا۔ وہ سب ہاکیاں اور ڈنڈے لانے کے لیے وہاں سے بھاگتے ہوئے جائیں گے۔ البتہ لیڈر نے لباس کے اندر کوئی ہتھیار چھپا کر رکھا ہوگا۔ پھر یہی ہوا' اس کے حامی ہاکیاں اور ڈنڈے لینے کے لیے دوڑے۔ لیڈر نے لباس کے اندر سے کوئی ہتھیار نکالنے کی کوشش کی۔ راجہ نے اسے موقع نہیں دیا۔ ایک کراٹے کا ہاتھ رسید کیا۔ وہ پھر مار کھا کر پیچھے گیا۔ راجہ نے فضا میں اونچی چھلانگ لگائی پھر ایک کہنی سے اس کے سر کے درمیانی حصے پر ضرب لگائی۔ سر پر جیسے ہتھوڑا پڑا ہو۔ وہ ایک دم سے چکرا گیا۔ آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ وہ چکرا کر گر پڑا۔ راجہ نے جھک کر اس کے لباس کے اندر سے ایک ٹی ٹی نکالی۔ اسی وقت اس کے چار چھ حامی ہاکیاں اور ڈنڈے لے کر دوڑتے ہوئے آئے لیکن اس کے ہاتھ میں ٹی ٹی دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ انہوں نے اپنے لیڈر کو دیکھا' جو فرش پر پڑا کراہ رہا تھا۔

راجہ نے ان سے پوچھا۔ "پہلے کون ہاکی کھیلے گا؟"

وہ گھبرا کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ راجہ نے کہا۔ "یہ قومی کھیل ہے۔ اسے کھیلنے کے طریقے سے کھیلو۔"

اس نے ٹی ٹی کے چیمبر سے ایک گولی نکال کر ان کے درمیان پھینکتے ہوئے کہا "اسے بلٹ نہیں گیند سمجھو۔ ہاکی سے گیند کیری کرتے ہوئے اسے برآمدے کے آخری سرے پر لے جاؤ۔ کم آن۔ ہری اپ دیر کرو گے تو گولی چلا دوں گا۔"

اس نے ٹی ٹی سے ان کا نشانہ لیا۔ وہ موت کے ڈر سے فوراً کھیلنے لگے۔ فرش پر پڑی ہوئی ٹی ٹی کی گولی کو ہاکیوں کے ذریعے ایک دوسرے سے چھینتے ہوئے برآمدے میں کبھی

ادھر جانے اور کبھی ادھر آنے لگے۔

طلبا و طالبات انہیں دیکھ کر تالیاں بجا رہے تھے۔ چند طلبا نے پروفیسروں کو اس جھگڑے کے متعلق بتایا تھا۔ وہ بھی وہاں آکر تماشا دیکھنے لگے۔ صادق گیلانی تکلیف سے کراہتے ہوئے فرش پر اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

راجہ نے پروفیسروں سے کہا۔ "میں نے وعدہ کیا تھا' نہ کسی سیاسی تحریک میں حصہ لوں گا اور نہ کبھی کسی ہتھیار کو ہاتھ لگاؤں گا۔ اس ٹی ٹی کو میں نے صادق گیلانی سے چھین کر خالی کیا ہے۔"

اس نے ٹی ٹی کو صادق گیلانی کی طرف پھینک کر کہا۔ "میں نے تمہاری یہ طاقت کھوکھلی کردی ہے۔ اب تو تم سے کوئی چوہا بھی نہیں ڈرے گا۔"

اس کے حامی ہاکی کھیلتے کھیلتے رک گئے تھے اور شرمندہ ہو رہے تھے۔ صادق گیلانی خالی ٹی ٹی لے کر کھڑا ہوگیا پھر تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے وہاں سے جانے لگا۔ اس کے پیچھے اس کے تمام حامی بھی جانے لگے۔

ایک پروفیسر نے قریب آکر راجہ کے شانے کو تھپک کر کہا۔ "پہلے ہم بے بسی سے ان کی غنڈا گردی دیکھتے تھے۔ کبھی پولیس یا رینجرز والوں کو بلا لیا کرتے تھے۔ اس طرح یونیورسٹی کی بدنامی ہوتی تھی۔ اخبارات میں یہاں کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔"

دوسرے پروفیسر نے کہا۔ "امید ہے اب ایسا نہیں ہوگا۔ تم نے دونوں یونین کے لیڈروں کو اچھا سبق سکھایا ہے۔ اب شاید گھر کی بات گھر ہی میں رہا کرے گی۔ اخبارات تک نہیں پہنچا کرے گی۔"

لڑکیاں اور لڑکے اسے گھیرنے لگے۔ خوش ہو کر کہنے لگے کہ ان کے بھی حوصلے بڑھ گئے ہیں۔ آئندہ وہ یونین کے طلبا کا بائیکاٹ کریں گے۔ ان سے بات تک نہیں کریں گے۔ وہ سب مل کر ہی یونیورسٹی میں امن و امان قائم کرکے تعلیم حاصل کرسکتے ہیں۔

تمام پروفیسر وہاں سے چلے گئے۔ راجہ نے کہا۔ "ہم سب مل کر اچھا قدم اٹھا رہے ہیں مگر آہ!"

ایک طالبہ نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ منہ سے آہ کیوں نکل رہی ہے؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ "ان جھگڑوں میں میرا نقصان ہو رہا ہے۔ نازاں نہیں آرہی ہے۔"

تمام طلبا و طالبات ہنسنے لگے۔ شریف نے کہا۔ "راجہ بھائی! آپ تعلیمی ماحول کو سازگار بنا رہے ہیں لیکن اپنے لیے خطرات مول لے رہے ہیں۔ وہ بہن بھائی مغرور ہیں

اور بڑے وسیع ذرائع کے مالک ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ آپ کے خلاف کوئی بڑی کارروائی کرنے والے ہیں۔"

راجہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "شریف! میں نے سنا ہے تم بھی یہاں امن و امان قائم کرنے کی خاطر نازاں کے قدموں میں جھک گئے تھے۔ تم نے شرافت کا مظاہرہ کیا تھا لیکن وہ وڈیرے زادے سمجھتے ہیں کہ ہم سب ان کے آگے جھکنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ میرے بھائی! ہر جگہ شرافت کام نہیں آتی۔ دیکھتے جاؤ کہ میں آگے کیا کرتا ہوں؟"

لڑکیوں نے کہا۔ "راجہ! ہمارے ساتھ کینٹین چلو۔ آج ہماری طرف سے لنچ پارٹی ہے۔"

لڑکوں نے کہا۔ "ہماری طرف سے بھی پارٹی ہوگی۔"

ایک لڑکی نے کہا۔ "ہرگز نہیں۔ راجہ کو پہلے ہم نے انوائیٹ کیا ہے۔"

ایک لڑکے نے کہا۔ "ہم کب انکار کرتے ہیں۔ آج تمہاری طرف سے کل ہماری طرف سے شاندار پارٹی ہوگی۔"

راجہ نے کہا۔ "کینٹین چلنے سے پہلے ایک کام کرو۔ کہیں سے نازاں کو فون کرو۔ اس سے کہو' چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے۔"

ایک لڑکی نے کہا۔ "نازاں کا فون نمبر صرف اس کی سہیلی رابعہ جانتی ہے اور آج وہ نہیں آئی ہے۔"

راجہ نے کہا۔ "میں محبت کرتا ہوں۔ مذاق نہیں کرتا ہوں۔ اس کا نام و پتا اور فون سب ہی دل کی ڈائری میں محفوظ ہے۔"

وہ ہنستے بولتے ہوئے لائبریری میں آئے۔ راجہ نے ایک لڑکی سے کہا۔ "ریسیور کان سے لگاؤ۔ میں نمبر ڈائل کرتا ہوں۔ جمال فون اٹینڈ کرے تو اس سے کہنا تم رابعہ بول رہی ہو۔ نازاں سے بات کروگی۔"

راجہ نے نمبر ڈائل کیے رابطہ ہونے پر جمال کی آواز سنائی دی۔ لڑکی نے کہا۔ "ہیلو جمال! میں رابعہ بول رہی ہوں۔ نازاں کیا کررہی ہے؟ ذرا بات کراؤ۔"

دوسری طرف سے جمال کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "نازاں! تمہاری سہیلی رابعہ کا فون ہے۔ اٹینڈ کرلو۔"

پھر خاموشی چھاگئی۔ چند سیکنڈ کے بعد نازاں کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو رابعہ۔"

لڑکی نے کہا۔ "نازاں! ان سے بات کرو۔"

راجہ نے ریسیور لے کر کان سے لگایا۔ نازاں کہہ رہی تھی۔ ”تم رابعہ تو نہیں ہو۔ اس کی آواز میں پہچانتی ہوں۔“

راجہ نے کہا۔ ”میری بھی آواز پہچانتی ہو گی۔“

وہ ایک دم سے چونک بولی۔ ”تم ذلیل! کمینے!“

”بس بس۔ اتنا ہی بہت ہے۔ میرے ہونٹ تمہارے لبوں کو ان گالیوں کا جواب دیں گے اور آج ہی رات کو جواب دیں گے۔“

وہ نفرت سے بولی۔ ”تم اپنی موت کا سامان کر چکے ہو۔ میں قسم کھاتی ہوں‘ تمہیں ٹارچر سیل میں لے جا کر تڑپا تڑپا کر ماروں گی؟“

”میری جان! بجلی کتنی ہی کڑکتی رہے اپنے آسمان کو نہیں جلاتی تمہیں لفٹ کا تجربہ یاد ہے۔ میں چیلنج یا گالی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی تمہیں خوب صورت سزا ملے گی۔ میں آرہا ہوں۔“

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ وہ ریسیور کان سے لگائے کہہ رہی تھی۔ ”یہاں تم کیا آؤ گے؟ تمہارا باپ بھی نہیں آسکے گا۔ یہ میرے بابا سائیں کی کوٹھی ہے۔ یہاں دن کو مسلح گارڈز اور رات کو خونخوار کتے احاطے کے اندر کھلے رہتے ہیں۔ میں نے بہت عرصے سے اپنے کتوں کو انسان کا گوشت کھاتے نہیں دیکھا ہے۔ آؤ میں دیکھوں گی۔ جب تمہاری ہڈیاں رہ جائیں گی تو ان پر تھوک دوں گی۔“

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے ہیلو ہیلو کہہ کر مخاطب کیا پھر ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ پیچھے پلٹ کر دیکھا تو بھائی کھڑا تھا۔ وہ بولا۔ ”تم نے اسے خوب کھری کھری سنائی ہیں۔ میں حیران ہوں اسے ہمارا فون نمبر کیسے معلوم ہوا۔ کیا رابعہ نے اسے بتایا ہو گا؟“

”رابعہ پر مجھے پورا بھروسا ہے۔ وہ میری کوئی بات کسی کو نہیں بتائے گی۔ وہ کم بخت بہت گہرا ہے۔ جب ہمارے بابا سائیں تک پہنچ سکتا ہے تو کسی ذریعے سے یہاں کا فون نمبر بھی معلوم کر لیا ہو گا۔“

”کیا وہ یہاں آنے کی بات کر رہا تھا؟“

”ہاں فلمی ہیرو کی طرح چیلنج کر رہا تھا۔ اچھا ہے‘ یہاں آئے۔ کتے اس کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھائیں گے۔“

”میں دل سے چاہتا ہوں کہ وہ آئے۔ بابا سائیں اسے دہشت گردوں سے قتل کرائیں گے تو خواہ مخواہ پولیس انکوائری ہو گی پھر سیدھی طرح قتل ہو جانے سے ہمارے

دل کی بھڑاس نہیں نکلے گی۔ وہ چوروں کی طرح یہاں آئے گا اور کتے اسے نوچ کھسوٹ کر کھائیں گے تو ہمارے دلوں کو ٹھنڈک پہنچے گی۔“

”بھائی جان! آج سیکورٹی گارڈز سے بھی کہا جائے کہ وہ ڈبل ڈیوٹی کریں۔ رات کو بھی یہاں رہیں۔“

”نہیں۔ وہ سیکورٹی گارڈز کے باعث احاطے میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ میں نہیں چاہتا گارڈز اس کے راستے کی رکاوٹ بنیں۔ وہ آسانی سے دیوار کود کر احاطے میں آئے گا تو پھر کتے اسے واپس نہیں جانے دیں گے۔“

اس نے ریسیور اٹھا کر پولیس اسٹیشن کے انچارج سے رابطہ کیا۔ وہ باپ بیٹے پولیس والوں کو اکثر عیدی اور تحفے دیا کرتے تھے۔ اس نے انچارج کو راجہ نواز کے خلاف تفصیل سے رپورٹ درج کرنے کے لیے کہا۔ اسے بتایا کہ وہ آج رات کوٹھی میں داخل ہونا چاہے گا۔ پولیس اس معاملے میں مداخلت نہ کرے۔ جب صبح اس کی نوچی کھسوٹی ہوئی لاش ملے تو انچارج یہی بیان دے کہ مسلح سپاہی سامنے والے گیٹ پر پہرا دے رہے تھے۔ وہ پیچھے والی دیوار پھاند کر آیا ہو گا۔ اس طرح وہ کتوں کی خوراک بن گیا ہے۔

پھر اس نے کتوں کے ٹرینرز اور رکھوالے کو بلایا۔ وہ کوٹھی کے پیچھے ایک سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا۔ اس نے ڈرائنگ روم میں آکر دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”سیوک حاضر ہے۔“

جمال صالح نے پوچھا۔ ”بجو! کتوں کو کتنی بار کھانا دیتے ہو؟“

”چھوٹے سرکار! ایک بار صبح ایک بار شام کو۔“

”اگر آج شام انہیں بھوکا رکھا جائے یا آدھی خوراک دی جائے تو؟“

”آدھی خوراک ٹھیک رہے گی۔ انہیں بھوکا رکھا جائے گا تو وہ رات بھر بھونکتے اور شور مچاتے رہیں گے۔ آپ سو نہیں پائیں گے۔“

”آج ہم جاگتے رہیں گے اور ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ کتوں کے شور مچانے سے آنے والا واپس چلا جائے۔ آج رات تم بھی ہوشیار رہو گے۔ کوئی احاطے کے اندر آئے تو خاموشی سے تماشا دیکھو گے اور اسے کتوں کی خوراک بننے کے لیے یہاں آنے کا موقع دو گے۔“

”جی چھوٹے سرکار! آج تو کتوں کی بن آئے گی۔ جب یہ بڑے سرکار کے پاس چھاچھرو میں تھے تب انہوں نے انسان کا گوشت کھایا تھا۔ میں بھینس کی دو رانیں لاتا ہوں۔ آج شام ایک ہی ران لاؤں گا۔ یہ آدھا پیٹ کھا کر آپ کے دشمن کا انتظار کریں

گے۔"

کتوں کا ٹرینر چلا گیا۔ جمال صالح نے صوفے پر آرام سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "نازاں! تم نے فون پر اس سے کہا تھا کہ اس کا باپ بھی یہاں نہیں آسکے گا۔ تمہاری بات درست ہوگی۔ اس کا باپ تو کیا دادا بھی نہیں آسکے گا۔"

وہ حقارت سے بولی۔ "اور میں نے کہا تھا' جب کتے تمہاری بوٹیاں چبالیں گے اور ہڈیاں رہ جائیں گی تو میں اس پر تھوک دوں گی۔ وہ میرے چیلنج کا جواب دینے ضرور آئے گا اور میں اس کی ہڈیوں کے ڈھانچے پر ضرور تھوکوں گی۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ ڈرائنگ روم سے نکل کر اپنے بیڈ روم میں آئی۔ وہ اپنے اندر کچھ عجیب سی بے چینی محسوس کررہی تھی۔ رہ رہ کر ایک بات لاشعور کے خانے سے اچھل کر شعور کے خانے میں آتی تھی کہ وہ نہ آئے یہاں' کتوں کی خوراک نہ بنے۔ حرام موت نہ مرے۔ زندہ رہے۔ ایسے چٹانی مرد کم کم ہوتے ہیں۔ اس چٹان کو ٹوٹنا نہیں چاہیے۔

وہ اپنے بستر پر آکر گر پڑی۔ غصے اور غرور سے اپنے خیالات کو دماغ سے جھٹک کر جبراً یہ سوچنے لگی۔ "اس بدمعاش درندے کو مرنا چاہیے۔ ضرور مرنا چاہیے۔ پتا نہیں کیسے دوبارہ خوابوں میں آچکا ہے........"

وہ سوچتی رہی۔ بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ اس کے اندر کبھی ہاں اور کبھی ناں کی تکرار جاری تھی اور وہ انجانے سے اضطراب کو اپنے دل سے نوچ کر پھینک دینے کی ناکام کوششیں کرتی رہی تھی۔

شام کو بیجو ایک ہائی روف سوزوکی میں ڈرائیور کے ساتھ مارکیٹ گیا۔ وہاں جان پہچان والا قسائی تھا۔ وہی کتوں کے لیے گوشت سپلائی کرتا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ "قسائی سے گوشت لے کر گاڑی میں رکھواؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ وہاں سے ذرا فاصلے پر ایک اسنیک بار میں آیا۔ کئی جوان لڑکیاں اور لڑکے کاؤنٹر کے پاس اسٹول پر بیٹھے ہنس بول رہے تھے اور کھا پی رہے تھے۔ وہ سینڈوچز اور بنانا جوس کا آرڈر دے کر ایک چھوٹے سے کیبن میں آگیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک قد آور جوان ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے کیبن کے اندر آیا۔ ٹرے پر سینڈوچز کی ایک پلیٹ اور جوس کے دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ وہ چھوٹی سی میز کے دوسری طرف کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیجو نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے کہا۔ "اسے ویٹر لا رہا تھا۔ میں نے سوچا میں ہی لے چلوں۔ تمہارے ساتھ ٹھنڈا جوس پی کر تمہیں ٹھنڈا کردوں۔"

"آ.......... آپ کون ہیں؟"

"میں اپنا تعارف کرانے سے پہلے تم سے تمہارا تعارف کرادوں۔ تم بیجو کہلاتے ہو۔ تمہارا پورا نام بیج ناتھ ہے۔ سات ماہ پہلے راجستھان سے آئے تھے۔ "را" کے افسران تمہیں بل ڈاگ کہتے ہیں۔ تم ہر نسل کے کتوں کی پہچان رکھتے ہو۔ خونخوار کتوں کی ٹریننگ میں تمہیں مہارت حاصل ہے۔ مرزا نیک بخت کو کتے پالنے کا شوق ہے۔ جب وہ الیکشن میں کامیاب ہوجائے گا تو "را" کا زونل آفیسر اسکاٹ لینڈ کے چھ خطرناک آدم خور کتے اسے تحفے کے طور پر دے گا پھر تم اسلام آباد میں اس کے پاس کتوں کے ٹرینر کی حیثیت سے رہو گے۔"

بیجو کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ "آ......... آپ مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں؟"

"گرفتار کرنا پولیس والوں کا کام ہے۔ کیا یہ بتا دینا کافی ہے کہ میرا نام امیر حمزہ ہے۔"

اس کے چہرے سے اور آنکھوں سے خوف ظاہر ہونے لگا۔ امیر حمزہ نے کہا "ڈرتے کیوں ہو؟ میں نے چھاچھرو میں راہو دادا کو اس لیے گولی ماری تھی کہ وہ مجھے ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ اگر تم دشمنی نہیں کرو گے تو زندہ رہو گے۔"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "میں بھگوان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ کا سیوک بن کر فخر کروں گا۔"

"میرا بھروسا قائم رکھو گے تو اپنی "را" تنظیم کے بھی کام آتے رہو گے۔ تم یہ جانتے ہو کہ میں یہاں کرپٹ' سیاست دانوں کا دشمن ہوں اور تم بھی دشمن ہو۔ آئندہ حکومت بنانے والے سیاست داں کے قریب رہ کر جاسوسی کرنے اور اہم راز یہاں سے بھارت ٹرانسفر کرنے آئے ہو۔"

"بائی گاڈ! آپ کی معلومات سے یقین ہوگیا ہے کہ آپ واقعی انٹیلی جنس کے کیپٹن امیر حمزہ ہیں۔ کیا میں ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں پوچھو۔"

"اب آپ انٹیلی جنس کے لیے کام نہیں کرتے ہیں؟"

"نہیں۔ میں آزاد ہوں۔ یہاں کے کرپٹ سیاست دانوں اور را کے ایجنٹوں سے سمجھوتے اور سودے بازی کرکے مال کماتا ہوں۔"

"میں آپ کے لیے بڑی سے بڑی آمدنی کا ذریعہ بن سکتا ہوں۔ آپ ایک بار آزما کر

دیکھ لیں۔"

"تمہیں آزمانے ہی آیا ہوں۔ اگر آزمائش پر پورے اترو گے تو میں تمہارے لیے یہاں ڈھال بن کر رہوں گا۔ کبھی تم پر مصیبت نہیں آنے دوں گا۔"

"یہ میری خوش قسمتی ہے۔ میں خطرات مول لے کر بھی آپ کا اعتماد حاصل کروں گا۔"

امیر حمزہ نے جیب سے ایک شیشی نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ زہر ہے۔ اسے گوشت میں ملاؤ گے۔ وہ گوشت کتوں کی آخری خوراک ہوگی۔"

وہ شیشی اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کے ذہن میں ایک مکمل پلاننگ ہوگی۔ وہ صبح مجھ سے زہر آلود گوشت کے بارے میں سوال کریں گے' مجھے کیا جواب دینا چاہیے؟"

"جب وہ تم سے سوال کرنے سرونٹ کوارٹر میں آئیں گے تو تم انہیں ایک کرسی پر بندھے ہوئے نظر آؤ گے۔ یہ بیان دوگے کہ ایک جوان نے گن پوائنٹ پر تمہیں مجبور اور بے بس بنا دیا تھا۔"

"میں سمجھ گیا۔ آج رات آپ وہاں آئیں گے۔"

"میں نہیں۔ میرا ایک یار آئے گا۔ کم بخت مجنوں اور رانجھا کے خاندانوں میں سے ہے۔ اس کے تحفظ کی خاطر اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں۔ یہ بتاؤ کتوں کو کس وقت گوشت ڈالتے ہو؟"

"دس بجے رات کو پھر گیارہ بجے تک آئرن کیج ان لاک کر کے انہیں احاطے میں کھلا چھوڑ دیتا ہوں۔"

"ان بہن بھائی کے پاس ایک موبائل فون ہے۔ میرا یار کوٹھی کے فون کا تار کاٹ دے گا۔ تم موبائل فون کی بیٹری تبدیل کرو گے۔"

اس نے بیٹری کو جیب سے نکال کر اس کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ناکارہ ہے۔ اس موبائل سے کارآمد بیٹری نکال کر اس کی جگہ اسے رکھو گے۔"

وہ بیٹری اٹھا کر اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ "جب تک وہ نہ بلائیں' مجھے کوٹھی کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ میں یہ کام ان کی ملازمہ سے کراؤں گا۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ رازداری سے یہ کام کرے گی؟"

"جی ہاں۔ میں اسے خوش کرتا رہتا ہوں۔ وہ مجھے خوش کرتی رہتی ہے۔ آج کی رات بھی میرے ساتھ گزارنے والی ہے۔"

"تم اس سے کام لو مگر آج رات اسے ٹال دو۔ میرا یار تمہارے پاس آئے تو ملازمہ کو تمہارے کوارٹر میں نہیں ہونا چاہیے۔"

"آپ جیسا حکم دیں گے' ویسا ہوگا۔"

"سینڈوچز کھاؤ اور جوس پیو۔"

وہ دونوں کھانے پینے لگے۔ امیر حمزہ نے کہا۔ "میرے آدمی دور ہی دور سے تمہاری نگرانی کرتے رہیں گے۔ راہو کی طرح دھوکا دینا چاہو گے تو کتوں سے پہلے مرو گے۔"

وہ آخری گھونٹ پی کر اٹھ گیا پھر کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

نازاں اور جمال صالح نے راجہ کو ٹریپ کرنے کے لیے جو پلاننگ کی تھی' اس کے مطابق کوئی بھی سورما کوٹھی کے احاطے کے اندر آ کر زندہ واپس نہیں جاسکتا تھا۔ وہ بہن بھائی پوری طرح مطمئن تھے اور آج رات راجہ کو کتوں سے لڑتا اور مرتا دیکھنے والے تھے۔

رات کو ملازمہ میز پر کھانا لگانے کے بعد دونوں بیڈ روم کی بکھری ہوئی چیزیں سلیقے سے رکھنے کے لیے گئی۔ جمال کے بستر پر موبائل فون پڑا ہوا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے اسے کھول کر بیٹری تبدیل کر دی۔ کارآمد بیٹری کو اپنے لباس میں چھپا کر بیڈ روم کی صفائی کر کے چلی آئی۔

رات دس بجے کتوں کو خوراک دی جاتی تھی۔ انہیں گیارہ بجے احاطے میں کھلا چھوڑنے سے پہلے ملازمہ اور باورچی کو چھٹی دے دی جاتی تھی تاکہ وہ احاطے کے باہر اپنے گھر چلے جائیں۔ ملازمہ نے کوٹھی سے جاتے وقت بیجو کو بتا دیا کہ وہ اپنا کام کر چکی ہے اور جو بیٹری موبائل فون سے نکالی ہے' اسے دور کہیں جا کر پھینک دے گی۔

بیجو ایک تھال میں زہر آلود گوشت لے کر آئرن کیج کے پاس آیا۔ چاروں کتے اسے دیکھ کر دم ہلانے لگے کیونکہ ان کا پیٹ بھرنے والا آ گیا تھا۔ اس نے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے اٹھا کر آہنی سلاخوں کے پیچھے پھینکے۔ وہ چاروں لپک لپک کر کھانے لگے۔ وہ تمام گوشت ان کے آگے ڈالنے کے بعد اپنے کوارٹر کے پاس آیا۔ وہاں ایک قد آور جوان کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس نے کہا۔ "میں وہی ہوں' جس کا ذکر کیپٹن صاحب نے تم سے کیا تھا۔"

"اچھا آپ ہیں۔ آیئے اندر آیئے۔"

وہ دونوں کوارٹر کے اندر آئے۔ بیجو نے اپنے دونوں ہاتھ دکھا کر کہا۔ "میں نے ابھی زہریلا گوشت انہیں دیا ہے۔ مجھے اچھی طرح صابن سے ہاتھ دھونا ہوگا۔"

"زہر کی شیشی کہاں ہے؟"

"میری اوپری جیب میں ہے۔ میں ابھی ہاتھ دھو کر دیتا ہوں۔"

راجہ نواز نے اپنی جیب سے ایک پستول نکال کر کہا۔ "ہاتھ تو تم نے دھولیا ہے اپنی زندگی سے۔ چلو یہاں کرسی پر بیٹھو۔"

اس نے دھکا دے کر اسے کرسی پر بٹھایا۔ پھر اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر شیشی نکال لی۔ وہ خوف زدہ ہو کر بولا۔ "آ........ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟"

وہ شیشی کو کھول کر بولا۔ "ابھی اس میں چھ سات قطرے ہیں۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ کیپٹن صاحب کرپٹ سیاست دانوں کے دشمن ہیں تو وہ اپنے ملک کے بھی دشمن ہوں گے اور وہ یہاں "را" کے ایجنٹوں کا وجود برداشت کرلیں گے۔"

وہ تھوک نگل کر پستول کو اور زہر کی شیشی کو دیکھنے لگا۔ راجہ نے کہا۔ "تمہارے جیسے اور کئی ایجنٹ کیپٹن امیر حمزہ کی نظروں میں ہیں۔ وہ تم لوگوں سے اسی طرح کام نکال کر ایک ایک کو جہنم میں پہنچا دیتے ہیں۔"

بیجو نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ راجہ نے پستول کی نال اس کے منہ میں ٹھونس دی پھر کہا۔ "فائر کروں گا تو دور تک آواز جائے گی پھر تمہاری موت بھی یقینی ہوگی۔ زہر پلاؤں گا تو یہ چند قطرے ہیں۔ میرے جانے کے بعد شاید تم کسی طرح طبی امداد حاصل کر کے زندہ رہ سکو۔ لو اسے پیو۔ میں تمہیں بچنے کا موقع دے رہا ہوں۔"

اس نے زہر کی شیشی اس کے منہ کے اندر انڈیل دی۔ پستول کی نال بھی اندر تھی۔ اس لیے منہ بند نہ کرسکا۔ زہر قطرہ قطرہ اس کے حلق سے اتر گیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے دہکتے ہوئے انگارے حلق سے اتر رہے ہوں۔ بڑا زود اثر زہر تھا۔ وہ پھڑپھڑا رہا تھا مگر منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں۔

اس نے پستول کی نال کو اس کے منہ سے نکال کر اس کے کپڑے سے صاف کیا پھر بولا۔ "سوری۔ میرے یار نے کہا تھا کہ آخری کتے کو بھی زندہ نہ چھوڑا جائے۔"

وہ کوارٹر سے باہر چلا گیا۔ وڈیرا کمال صالح ہر رات دس بجے سونے سے پہلے فون کے ذریعے بیٹے اور بیٹی سے باتیں کرتا تھا۔ اس نے صبح فون پر کہا تھا کہ دوسرے دن کراچی آ رہا ہے۔ کاشف اکبر بھی اسلام آباد سے آنے والا ہے۔ اس کے ذریعے راجہ نواز کے خلاف زبردست کارروائی کی جائے گی۔

پھر باپ نے کہا تھا کہ وہ معمول کے مطابق رات کے دس بجے فون پر رابطہ کرے گا لیکن دس بج گئے' ان کے فون کی گھنٹی نہیں بجی موبائل فون سے بھی بزر کی آواز نہیں

ابھری۔ نازاں نے کہا۔ "بھائی جان! گیارہ بج چکے ہیں۔ بابا سائیں نے ابھی تک فون نہیں کیا۔"

"ہاں۔ ایک گھنٹا گزر چکا ہے۔ بابا سائیں وقت کے بڑے پابند ہیں۔ ہم ان کی خیریت معلوم کریں گے۔"

اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے نمبر ڈائل کرنا چاہا پھر رک گئی۔ فون بالکل خاموش تھا۔ اس نے کریڈل پر دو چار بار ہلکا سا ہاتھ مارا لیکن کوئی آواز نہیں ابھری۔ وہ بولی۔ "کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ یہ بالکل ڈیڈ ہے۔ جیسے لائن کاٹ دی گئی ہو۔"

جمال صالح نے اپنے بیڈ روم میں آکر موبائل فون کو بستر پر سے اٹھایا پھر اسے آن کرنے کے لیے بٹن دبایا۔ ہلکی سی آواز بھی نہیں ابھری۔ وہ ٹیکنیکل معاملات کو نہیں سمجھتا تھا۔ پھر بھی اندازے سے سوچا کہ بیٹری کا پاور ختم ہو چکا ہے۔ وہ نازاں کے بیڈ روم میں آکر بولا۔ "میں نے تین دن پہلے نئی بیٹری لگائی تھی۔ اتنی جلدی ناکارہ کیسے ہوگئی؟"

"تعجب ہے' دونوں فون بیک وقت بیکار ہوگئے ہیں۔ پھر تو بابا سائیں نے دس بجے کے بعد بار بار رابطہ کرنے کی کوششیں کی ہوں گی۔ ہمارے فون خراب پڑے ہیں تو رابطہ کیسے ہوگا؟"

جمال نے سوچتی ہوئی نظروں سے دونوں فون کو باری باری دیکھا۔ "کیا بات ہے بھائی جان!؟"

"کتے نظر نہیں آرہے ہیں۔ ان کے بھونکنے کی آواز وقفے وقفے سے آیا کرتی ہے۔ لیکن ابھی تک ایک بار بھی ان کی آواز سنائی نہیں دی۔ کیا تم نے آواز سنی ہے؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کیا یہ ایک اتفاق ہے کہ دونوں فون بیک وقت ناکارہ ہوگئے اور آج کتوں نے بھی بھونکنا چھوڑ دیا ہے۔ آپ بیجو کو بلا کر پوچھیں' کتے خاموش کیوں ہیں؟"

جمال نے اپنے بیڈ روم میں آکر کال بیل کے بٹن کو دبایا۔ رات کو جب کتے احاطے میں کھلے رہتے تھے تو وہ بہن بھائی کوٹھی سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ وہ دوبارہ کال بیل کے بٹن کو دبا کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ تھوڑی دیر بعد دستک سنائی دی۔ صرف بیجو ہی خونخوار کتوں کے درمیان سے گزر کر وہاں آکر دستک دے سکتا تھا۔ جمال نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک زوردار گھونسا منہ پر پڑا۔ وہ چیختا ہوا لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ ایک صوفے سے ٹکرا کر گرتے گرتے سنبھل گیا پھر اس نے سر گھما کر دیکھا۔ راجہ نواز ہاتھ میں پستول لیے کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ "پہلی بار پٹائی کی' تب بھی تمہارا ٹی لباس

کے اندر تھا۔ آج بھی مجھے اس کا چیمبر خالی کرنا ہوگا۔"

اس نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ کر اٹھایا۔ نازاں بھائی کی چیخ سن کر وہاں آئی۔ پھر راجہ کو دیکھتے ہی اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس نے جمال کے لباس سے ٹی ٹی نکال کر اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں کو چیخنے کی خاندانی عادت ہے۔ اس کے باوجود بار بار چیخنے کے لیے مجھے چیلنج کرتی ہو مگر نتیجہ کیا ہوتا ہے' تمہارے پیارے بھائی جان کو لاتیں اور جوتے پڑتے ہیں۔ ہاں تو کیا خیال ہے بھائی جان؟"

وہ سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ راجہ نے کہا۔ "تم پر تو ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہتھیار کے بغیر تم تو عورتوں سے بھی زیادہ بزدل بن جاتے ہو۔ اپنی بہن کو دیکھو' پہلے تو ڈر گئی تھی۔ اب غصے سے دیکھ رہی ہے۔"

اس نے شرٹ کا بٹن کھول کر اندر ہاتھ ڈال کر ایک ہتھکڑی نکالی۔ پھر جمال کی ایک کلائی میں اسے پہنا دیا۔ اسے کھینچتا ہوا ایک کھڑکی کے پاس لایا۔ نازاں نے غصے سے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"ابھی تو کچھ نہیں کر رہا ہوں۔ جو کرنا ہے' تمہارے ساتھ کروں گا لیکن اس سے پہلے ذرا راستہ ہموار کرلوں۔"

وہ سہم کر پیچھے ہٹ کر بولی۔ "بھائی کو چھوڑ دو۔ ورنہ میں چیخنا شروع کردوں گی۔"

اس نے ہتھکڑی کے دوسرے حصے کو کھڑکی کی آہنی جالی سے منسلک کر کے اسے لاک کر دیا پھر جمال سے کہا۔ "صبح تک کھڑکی کے ساتھ لگے رہو۔ کسی کو آواز دینا اور چیخنا چلانا چاہو گے تو یہ بہن تمہیں زندہ نہیں ملے گی۔"

وہ وہاں سے پلٹ کر نازاں کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹنے لگی۔ جمال نے کہا۔ "راجہ! رک جاؤ۔ ہم سے دوستی کرلو۔ نازاں کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ ہمیں اتنا نیچے نہ گراؤ کہ ہم کسی سے آنکھ نہ ملا سکیں۔"

راجہ نے پوچھا۔ "کیوں گڑگڑا رہے ہو جمال! مجھے بھی نصیرالدین شریف کی طرح مارو اور اپنی بہن کے قدموں میں گراؤ۔ تم لوگوں نے بچپن ہی سے دوسروں کو اپنے قدموں میں گرانا سیکھا ہے۔ گرنے والوں کو سہارا دے کر اٹھانا نہیں سیکھا۔"

جمال ہتھکڑی سے بندھے ہوئے ہاتھ کو جھٹکے دیتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں سمجھا رہا ہوں' ہمارے درمیان جو ہوچکا ہے' اسے بھول جاؤ۔ اگر آج تم نے میری بہن کو ہاتھ بھی لگایا تو ہم تمہارے ساتھ تمہارے خاندان کے ایک ایک فرد کو چن چن کر قتل کردیں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت تمہیں ہم سے نہیں بچا سکے گی۔"

"میری فکر نہ کرو۔ اپنے حالات دیکھو۔ آج تم دولت سے' طاقت سے اور سیاست سے' کسی بھی حربے سے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ اب میں آخری بار سمجھا رہا ہوں' تم نے صبح تک ایک آواز بھی منہ سے نکالی تو میں تمہاری بہن کے بیڈ روم سے آکر تمہیں گولی مار دوں گا۔"

اس نے نازاں کی ریشمی زلفوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔ وہ تکلیف سے کراہنے لگی۔ وہ اسے دھکے دیتے ہوئے بولا۔ "اپنے بیڈ روم میں چلو۔"

وہ دھکے کھاتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں آگئی پھر بولی۔ "کیا ایک کمزور لڑکی کے ساتھ ایسا سلوک کرنا مردانگی ہے؟"

"وڈیرے سائیں کمال صالح کی بیٹی اور کمزور؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں چیلنج کا جواب لفٹ میں کس طرح دے چکا ہوں' تم نے فون پر مجھے گالی دی۔ تمہارے لاشعور میں یہ بات چھپی ہے کہ میں تمہارے غرور کا اور گالیوں کا جواب دینے آیا کروں اور اپنی مردانگی کی چھاپ لگا کر چلا جایا کروں۔"

یہ کہتے ہی اس نے اچانک اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ مغرور کیا کرے؟ کیا نہ کرے؟ دل ہاں بھی کرے' ناں بھی کرے' تو اپنے اندر خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے کہ خود کو چھڑایا جائے یا حالات کے دھارے پر خود کو چھوڑ دیا جائے؟

اس نے فون پر جسے کمینہ کہا تھا' وہ اسے کما رہا تھا۔ عجیب دشمن تھا۔ دوستی کی طرح دشمنی کر رہا تھا۔ کیا خوب جواری تھا' اس کے آگے ہارتے ہوئے اسے جیتنے کا اعزاز حاصل کرتا جا رہا تھا۔

وہ حال سے بے حال ہوگئی۔ کچھ نڈھال ہوگئی۔ کچھ نہال ہوگئی۔ ان حالات میں ایک سوال ہوگئی کہ کیوں ہارتی جارہی ہے؟ ایک دن کسی سے تو ہارنا پڑتا ہے۔ شاید یہی میری زندگی کا سکندر اعظم ہے۔

جمال صالح کھڑکی کی آہنی جالیوں سے بندھا کھڑا تھا۔ بار بار اس کھلے ہوئے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں سے راجہ نازاں کو دھکے دیتا ہوا لے گیا تھا۔ اس کے بعد وہ نظر نہیں آئے۔ اس کا بیڈ روم وہاں سے کچھ دور تھا پھر بھی نازاں کے رونے اور فریاد کرنے کی آوازیں سنائی دے سکتی تھیں لیکن کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ وہ بے چینی سے سوچ رہا تھا۔ آواز کیوں نہیں آرہی تھی۔ دشمن دھکے دے کر لے گیا ہے تو دشمنی ہی کر رہا ہوگا اور دشمنی کے نتیجے میں ایک لڑکی کے رونے اور گڑگڑانے کی آواز تو آنا چاہیے؟

کوٹھی کے اندر گہری خاموشی تھی۔ جمال کے اندر اس کا غرور سر پٹخ کر کہہ رہا تھا

کہ وہ خاموشی شرمناک ہے اور اتنی معنی خیز ہے کہ خاموشی کا ہر لمحہ وضاحت سے سمجھ میں آرہا ہے۔ وہ کبھی سر جھکا رہا تھا۔ کبھی اِدھر اُدھر ایسے دیکھ رہا تھا جیسے منہ چھپانے کی جگہ ڈھونڈ رہا ہو۔

اس نے تھر کے کتنے ہی علاقوں میں کتنی ہی محنت مزدوری کرنے والی لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی کھیل کھیلا تھا۔ ان کے باپ بھائیوں نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی تھی کہ ان کی عزت سے اس طرح نہ کھیلا جائے۔ ایسی التجا کرنے اور اعتراض کرنے والوں کی بری طرح پٹائی کی جاتی تھی۔ اس وقت ہتھکڑی پہنے کھڑکی کی جالیوں سے بندھے رہنے کے بعد' اس کے اعلیٰ وڈیرے خاندان کی عزت کے ساتھ بھی اسی طرح کھیلا جارہا تھا۔ اس کے باوجود اپنی ظالمانہ عیاشیوں کو یاد کرکے شرمندہ نہیں ہورہا تھا۔ اب بھی یہ جاگیردارانہ خیال اس پر حاوی تھا کہ رعایا کی تمام لڑکیاں اپنی جاگیر ہوتی ہیں۔ غیرت' عزت اور مان مرتبہ صرف اپنی بہن کا ہے۔ اسے ہاتھ لگانے والے کے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے تھے لیکن آج وہ دولت' طاقت اور سیاست جیسے ہتھیاروں سے اس کے ہاتھ نہیں کاٹ سکتا تھا۔ ایک کمزور ہاری اور مزدور کی طرح بندھا ہوا بے بسی سے وہاں صبح تک کھڑا رہے گا۔

نازاں بستر پر ایسی بے ترتیبی سے پڑی تھی جیسے آسمان سے اٹھا کر وہاں پھینک دی گئی ہو۔ اس نے حیا کے مارے چہرے کو دوپٹے سے ڈھانپ لیا تھا۔ کمرے میں زیرو پاور کی ہلکی نیلی خواب آور روشنی تھی۔ ایسی دھیمی روشنی میں پیار کرنے والے سایہ سایہ سے نظر آتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ حقیقت نہ ہوں' خوابوں کی عجیب جادوگری ہوتی ہے' صبح سے پہلے ان کی تعبیر ملتی رہتی ہے۔

راجہ کمرے میں نہیں تھا۔ اس نے جاتے ہوئے کہا تھا۔ "میں ابھی آؤں گا' یہاں سے اٹھ کر نہ جانا۔ یہ میرا حکم ہے۔"

پھر وہ چلا گیا۔ وہ بھی اٹھ کر جاسکتی تھی اور غرور سے کہہ سکتی تھی۔ "میں تمہارے حکم کی پابند نہیں ہوں۔"

لیکن وہ بستر سے نہیں اٹھ رہی تھی۔ دل اسے پابند بنا رہا تھا۔ بار بار چیلنج کے جوابات بھگتنے کے بعد سبق سیکھ رہی تھی کہ سانسیں بحال کرنے کے لیے اس درندے کو ابھی دور ہی رکھے تو اچھا ہے۔ پھر وہ نہ جانے کب اسے فراخ دلی سے خرچ کرنے چلا آئے۔

وہ فون کی گھنٹی سن کر چونک گئی۔ فون تو خراب تھا۔ بالکل خاموش تھا پھر اچانک کیسے شور مچانے لگا۔ اس نے دوپٹے کو چہرے پر سے ہٹا کر دیکھا۔ راجہ بستر کے سرے پر

آکر وہاں بیٹھ کر بولا۔ "میں نے تار جوڑ دیا ہے۔"

اس نے ریسیور اٹھا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو میں راجہ نواز بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے ایک لڑکی نے کہا۔ "میں فرزانہ بول رہی ہوں۔ راجہ! تم تو مردِ میدان نکلے۔ تم نے کہا تھا کہ رات ایک بجے کے بعد نازاں کے کمرے میں رہ کر ہم سے باتیں کرو گے۔ یہاں میرے پاس فریحہ' جمیلہ' سلمان اور انور بیٹھے ہوئے ہیں۔"

راجہ نے نازاں کو ریسیور دیتے ہوئے کہا۔ "یہ لو۔ تمہارا فون ہے۔"

وہ شرم سے اس کے سامنے کسی سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن اس نے ریسیور دیا تھا' وہ انکار کرنے سے ڈر رہی تھی۔ دوسری طرف منہ کرکے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دھیمی آواز میں بولی۔ "ہیلو میں نازاں بول رہی ہوں۔"

پھر وہ دوسری طرف کی آوازیں سن کر پریشان ہوگئی۔ یونیورسٹی کے طلبا و طالبات بار بار بول رہے تھے۔ کبھی فریحہ اور جمیلہ اور کبھی سلمان اور انور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ خبر وہاں تک پہنچ گئی تھی کہ راجہ نواز اتنی رات کو اس کی خواب گاہ میں ہے۔ اس کے غرور کو زبردست ٹھیس پہنچی۔ وہ عارضی طور پر خوف کو بھول کر اسے غصے سے دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ "نظریں نیچی کرو۔ میں تم سے کھلونے کی طرح کھیلنے نہیں' تمہیں ساری دنیا کے سامنے اپنی عزت بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ خبر یونیورسٹی کی سیاست سے ملکی سیاست کے وسیع حلقوں تک پہنچے گی۔ ایک شریف زادی اپنی زندگی میں ایک ہی مرد کی ہوکر رہتی ہے۔ اگر تم کبھی وڈیروں کی دنیا میں کسی سے شادی کرو گی تو ایک سے دوسرے کے پاس جانے والی بازاری کہلاؤ گی۔ بہتر ہے راجہ نواز سے منسوب رہو اور عزت و فخر سے مسز نازاں نواز کہلاتی رہو۔"

وہ احتجاجاً بہت کچھ کہہ سکتی تھی لیکن زبان سے کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اس نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ راجہ نے کہا۔ "کسی جوان لڑکی کا آئیڈیل جب اس کی زندگی میں آتا ہے تو اسے دنیا جہاں کی خوشیاں مل جاتی ہیں اور وہ مستقل اسے اپنا جیون ساتھی بنانے کا عزم کرلیتی ہے لیکن مغرور لڑکیوں کا کوئی آئیڈیل نہیں ہوتا' وہ شادی کے لیے کسی غلام اور تابع دار قسم کے شوہر کو ترجیح دیتی ہیں۔ اب آنے والے دنوں میں فیصلہ ہوگا کہ میری محبت کی قدر کرو گی یا نفرت اور دشمنی کے نئے ہتھکنڈے استعمال کرو گی۔ بائی دا وے میں کسی اور کو تمہارے قریب نہیں آنے دوں گا۔ یہ بدن میری جاگیر ہے۔ کوئی دولہا بن کر بھی آنا چاہے گا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ بولا۔ "ریسیور اٹھاؤ اور نارمل رہ کر سلیقے سے گفتگو کرو۔"

وہ یہ سوچ کر ریسیور نہیں اٹھانا چاہتی تھی کہ پھر وہی یونیورسٹی کے طلباو طالبات ہوں گے۔ راجہ نے ایک درندے کی طرح غرا کر کہا۔ "اٹھاؤ۔"

وہ لرز کر رہ گئی۔ فوراً ہی ریسیور اٹھاتے ہوئے اسے کان سے لگاتے ہوئے بولی "ہیلو۔ میں نازاں بول رہی ہوں۔"

یہاں ایک بات کی وضاحت ہوجائے۔ ٹریفک سگنل لائٹس کے تین رنگ ہوتے ہیں۔ ایک سرخ رنگ جسے دیکھ کر گاڑیاں رک جاتی ہیں۔ دوسرا زرد رنگ جسے دیکھ کر گاڑیوں والے سمجھ لیتے ہیں کہ اس کے بعد سبز روشنی ہوگی اور انہیں آگے جانے کا راستہ ملے گا۔

سیاسی ٹریفک میں بھی فی الحال سرخ اور زرد رنگ کے سگنل ہیں۔ قوم آگے بڑھنے کے لیے ابھی تک سبز سگنل کا انتظار کررہی ہے۔

ان حوالوں سے سرخ پارٹی کاشف اکبر کی تھی اور زرد پارٹی کا لیڈر مرزا نیک بخت تھا۔ جب لوگ سیاسی جھوٹ کو سچ ماننا اور فریب کھانا چھوڑ دیں گے تو سبز پارٹی ضرور وجود میں آئے گی اور آگے جانے کا ضرور سگنل دے گی۔

بہر حال نازاں نے ریسیور کان سے لگا کر سرخ پارٹی کے صوبائی لیڈر کی آواز سنی۔ اس نے کہا۔ "میں رحمان چنا بول رہا ہوں۔ دو گھنٹے پہلے تمہارے بابا سائیں نے مجھ سے فون پر کہا تھا کہ تم سے اور جمال سے رابطہ نہیں ہورہا ہے۔ میں کسی طرح تمہاری خیریت معلوم کروں۔"

نازاں نے پوچھا۔ "انکل! آپ نے دو گھنٹوں سے ہماری خیریت کیوں معلوم نہیں کی؟"

"کاشف اکبر صاحب اسلام آباد سے آئے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ پارٹی میٹنگ میں کئی ایجنڈے زیرِ بحث رہے۔ ان میں ایک ایجنڈا راجہ نواز کے سلسلے میں تھا۔ وہ ہماری پارٹی کو دھوکا دے کر ہماری سفارش سے یونیورسٹی میں داخل ہوکر ہماری انتخابی مہم کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ کل تمہارے بابا سائیں یہاں آئیں گے تو ہم راجہ نواز کے خلاف سخت کارروائی کا فیصلہ کریں گے۔"

راجہ، نازاں کے سر سے سر لگائے ریسیور سے ابھرنے والی باتیں صاف سن رہا تھا۔ رحمان چنا کہہ رہا تھا۔ "یہ میٹنگ دیر تک جاری رہی اس لیے تمہاری خیریت معلوم کرنے میں دیر ہوگئی۔ جمال صالح کہاں ہے؟"

نازاں کے جواب دینے سے پہلے راجہ نے ریسیور لے لیا۔ پھر اسے کان سے لگا کر

بولا۔ "ہاں چنا صاحب! آپ ہیں۔ خادم کو پہچانا؟ میں ہوں راجہ نواز۔"

حیرانی سے پوچھا گیا۔ "تم، نازاں اور جمال کے ساتھ ہو؟"

"دونوں کے ساتھ نہیں۔ ایک کے ساتھ ہوں۔ آپ نے سمجھ لیا ہوگا، کس کے ساتھ ہوں۔"

"جمال صالح کہاں ہے؟"

"وہ سالا۔ صواد سے صالح نہیں، سین سے سالا اپنی بہن اور بہنوئی کے کمرے میں نہیں آسکتا اس لیے اپنے کمرے میں آرام کررہا ہے۔"

نازاں دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے شرم سے پانی پانی ہورہی تھی۔ وہ اسے وڈیرا زادی کی بلندی سے اپنی سطح پر لانے کی تشہیر کررہا تھا۔ اس کے غرور کو چکنا چور کررہا تھا۔ اس میں شرم سے پانی پانی ہونے کی بات نہیں تھی۔ عورت تو پانی ہی کی طرح ہوتی ہے۔ اسے جس شکل کے برتن میں ڈالا جائے، وہی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ اسی کی حیثیت اور مزاج کے مطابق زندگی گزارتی ہے اور جب اپنی بات منوانا ہوتو بڑے پیار سے منوالیتی ہے لیکن ابھی اسے پیار سے مرد پر حکومت کرنا نہیں آتا تھا۔

رحمان چنا نے کہا۔ "راجہ! سچ بتاؤ۔ کیا تم زبردستی ان کی کوٹھی میں گھس آئے ہو؟ نازاں سے بات کراؤ۔"

"یہ شرما رہی ہے۔"

"جمال سے بات کراؤ۔"

"وہ اپنے بیڈ روم میں سورہا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ اگر تم نے پانچ منٹ کے اندر جمال صالح سے بات نہ کرائی تو میں پولیس فورس کے ساتھ آکر تمہیں گرفتار کرادوں گا۔"

"پانچ منٹ بہت ہوتے ہیں۔ تم دو منٹ کے اندر یہ سن لو کہ اس کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں "را" کا ایک خطرناک ایجنٹ بیج ناتھ عرف بیجو رہتا ہے۔ وہ جب بھی "را" کے زونل افسر سے باتیں کرتا تھا، میرے آدمی ڈیکٹو آلے کے ذریعے وہ باتیں ریکارڈ کرلیتے تھے۔ ان کی باتوں سے اور بیجو کے پاس سے برآمد ہونے والے کاغذات سے یہ ثبوت ملتے ہیں کہ تمہاری سرخ سیاسی پارٹی سے "را" کے ساتھ خفیہ رابطے رہتے ہیں اور وڈیرا کمال صالح تمہارے سیاسی مقاصد کے لیے "را" کے دہشت گردوں کو راجستھان سے بلا کر یہاں پناہ دیتا ہے۔ وہ بیجو تمام ثبوت کے ساتھ میرے آدمیوں کی حراست میں ہے۔ اب بتاؤ کتنے منٹ کے اندر مجھے گرفتار کرنے آرہے ہو؟"

چند لمحوں تک خاموشی رہی پھر رحمان چنانے پوچھا۔ "راجہ! سچ بتاؤ تم کون ہو؟ تم تنہا ایسے رازوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ تمہاری کوئی باقاعدہ تنظیم ضرور ہے۔ دیکھو' یہ جو دشمنی ہے' اچانک گہری دوستی میں بدل سکتی ہے۔ میرے سامنے کھل جاؤ۔ ہماری پارٹی کو تمہارے جیسے طوفانی رفتار سے کام کرنے والے جوان کی ضرورت ہے۔"

"ہاں میری ایک خطرناک تنظیم ہے۔ تمہاری پارٹی سے سمجھوتا ہو سکتا ہے لیکن کل دن کے دس بجے۔ اگر سمجھوتا ہو جائے گا تو "را" کے ایجنٹ بیج ناتھ کو تمام ثبوت کے ساتھ تمہارے حوالے کردوں گا مگر ایک شرط ہے۔"

"ہم تمہاری ہزار شرائط تسلیم کریں گے۔ بولو کیا چاہتے ہو؟"

"اس کوٹھی کا پتا اور فون صبح تک بھول جاؤ۔ میرے رنگ میں بھنگ نہ ڈالو۔"

"سمجھ گیا۔ تم جو چاہتے ہو' وہی ہوگا۔ کل دن کے دس بجے ملاقات ہوگی۔"

فون کا رابطہ ختم ہوگیا۔ راجہ نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر نازاں کو دیکھا۔ نظریں ملتے ہی اس نے سر جھکا لیا۔ راجہ نے کہا۔ "میرے یہاں آنے سے پہلے تم بہن بھائی نے مجھے کتوں کی خوراک بنانے کی تدبیر کی تھی۔ وہ کتے موت کی نیند سو رہے ہیں۔ تم لوگوں کو کتوں پر کتنا بھروسہ تھا کہ پولیس اور کرائے کے قاتلوں کو نہیں بلایا۔"

اس نے دونوں ہتھیلیوں میں اس کے چہرے کو لے کر ذرا اٹھاتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے نظریں ملاؤ۔ میری باتیں سمجھو کہ برے وقت پر تمہارا برا نہ چاہنے والا تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے باپ کی مضبوط سیاسی پارٹی کا لیڈر مجھ سے سمجھوتا کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ وہ' اس کی زر خرید پولیس اور کرائے کے قاتل صبح تک یہاں نہیں آئیں گے تاکہ میں پوری آزادی سے تمہاری عزت کے ساتھ کھیلتا رہوں۔ تو پھر بتاؤ کہ تمہاری عزت کیا ہے؟"

وہ اپنے نازک لبوں کو بھینچنے لگی' سوچنے لگی' واقعی میری کیا عزت ہے؟

وہ بولا۔ "تمہاری عزت کا محافظ کون ہے؟ کیا وہ تمہارا بھائی جو ایک بزدل کی طرح یہ دیکھ کر بھی چپ رہا کہ میں تمہیں یہاں بیڈ روم میں لا رہا ہوں؟ کیا وہ "را" کا ایجنٹ اور خونخوار کتے تمہارے محافظ تھے؟ وہ سرخ سیاسی پارٹی کا لیڈر' اس پارٹی کا وفادار تمہارا باپ' زر خرید پولیس اور کرائے کے قاتل؟ کون ہے' اتنے بڑے ملک میں کہ مجھے یہاں تمہارے ساتھ صبح تک رہنے سے روک سکے؟"

وہ پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس نے قریب ہو کر اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

☆======☆======☆

اکرام شاہ نے تابانی اور مراد کو ایک بڑی سی وین خرید کر دی۔ انہوں نے اس وین کو ایک پرائیویٹ ایمبولینس اور موبائل دواخانہ بنایا۔ اس کے پچھلے حصے میں مریضوں یا زخمیوں کے لیے دو بیڈ اسٹریچر کی جگہ رکھی۔ باقی حصوں میں فوری طبی امداد کے لیے دواؤں کا اچھا خاصا ذخیرہ رکھا۔ اکرام شاہ نے ہلال احمر کے ادارے سے یہ اجازت نامہ حاصل کیا تھا کہ تابانی اور مراد میڈیکل فرسٹ ایڈ کی تربیت حاصل کر چکے ہیں اور یہ دونوں موبائل شفاخانے کے ذریعے عوام کو سستی دوائیں فراہم کرنے اور انہیں فوری طبی امداد پہنچانے کے مجاز ہیں۔

وہ پچھلے کئی دنوں سے لاہور کی سیر کرتے رہے اور ایسے اہم مقامات کو ذہن نشین کرتے رہے' جنہیں کبھی سیاسی ضرورت کے وقت تخریب کاری کے لیے ٹارگٹ بنایا جاسکتا تھا۔ اس دوران میں اکرام شاہ نے ان کے لیے موبائل شفاخانے اور ایمبولینس کے انتظامات کردیئے تھے۔ اس بڑی سی وین کے اطراف لکھوایا تھا۔ "تابانی مراد رعایتی دواخانہ اور ایمبولینس۔"

وہ ائر کنڈیشنڈ ایمبولینس اور دواخانہ تھا۔ اس وین کے نچلے حصے میں بھی دواؤں کا ذخیرہ رکھنے کے لیے ایک اسٹور بنایا گیا تھا۔ اس اسٹور کی بناوٹ ایسی تھی کہ اسے کھولنے پر دوائیں نظر آتی تھیں لیکن ان کے پیچھے خفیہ خانے میں ٹائم بم' ریموٹ کنٹرولنگ بم' ٹی ٹی اور کلاشنکوف وغیرہ چھپا کر رکھے جاتے تھے۔

اکرام شاہ' اس کی بیگم اور بڑی بیٹی رخشندہ یہ راز جانتے تھے کہ تابانی اور مراد "را" کے ایجنٹ ہیں لیکن چھوٹی بیٹی فرخندہ عرف فری سے یہ بات چھپائی گئی تھی۔ کیونکہ وہ ایک پولیس انسپکٹر کے بیٹے جمشید سے محبت کرتی تھی اور جمشید بھی چھ ماہ کے اندر ٹریننگ مکمل کرکے انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کا ایک افسر بننے والا تھا۔

جمشید پہلے ہی دن سے تابانی اور مراد پر شبہ کر رہا تھا۔ اس نے فری سے کہا تھا کہ ان کی اصلیت معلوم کرنے کے لیے اسے ان دونوں پر نظر رکھنا ہوگی لیکن اس طرح کہ انہیں جاسوسی کا شبہ نہ ہو۔ مگر فری اناڑی تھی۔ ان کی ٹوہ میں اس طرح رہنے لگی کہ وہ سمجھ گئے' جمشید اس سے جاسوسی کرا رہا ہے۔ اس کے والدین اور بہن رخشندہ نے اسی لیے اسے راز دار نہیں بنایا تھا کہ وہ جمشید کی دیوانی تھی۔

اکرام شاہ نے کہا۔ "فری! تمہارے امتحانات ہو چکے ہیں۔ میں کل کی فلائٹ کا ٹکٹ لے رہا ہوں۔ تم نانا نانی کے پاس اسلام آباد چلی جاؤ۔"

"ڈیڈی! آپ کیوں چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے چلی جاؤں؟"

"تم اپنے نانا نانی کی لاڈلی ہو۔ وہ ہر بار فون پر یہی کہتے ہیں کہ امتحانات ختم ہوتے ہی تمہیں ان کے پاس بھیج دیا جائے۔"

"نو ڈیڈ! میں نہیں جاؤں گی۔ میرا دل لاہور چھوڑنے کو نہیں چاہتا۔ میں نانا نانی سے کہوں گی کہ وہ یہاں میرے پاس آجائیں۔"

"کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ یہاں پہلے ہی وہ مہمان نامعلوم مدت کے لیے آئے ہیں۔ اوپر سے نانا نانی کو بلاؤ گی۔"

"نانا اور نانی کی طرح ان مہمانوں سے خون کا رشتہ نہیں ہے۔ خواہ مخواہ مہمان بلائے جان بنے ہوئے ہیں۔"

وہ ڈانٹ کر بولا۔ "شٹ اپ۔ آہستہ بولو۔ وہ سنیں گے تو کیا کہیں گے؟"

"وہ کیا کہیں گے‘ میں ہی صاف صاف کہتی ہوں۔ مجھے جھوٹے اور فراڈ لگتے ہیں۔ کہتے ہیں‘ امریکا سے آئے ہیں۔ ان کے باپ نے بھی کبھی امریکا نہیں دیکھا ہوگا۔"

سچائی اتنی کڑوی تھی کہ اکرام شاہ نے غصے سے ایک طمانچہ جڑ دیا اور گرج کر بولا۔

"گیٹ آؤٹ یو فول۔ کل صبح کی فلائٹ سے تم جارہی ہو۔ اگر نہیں جاؤ گی تو تمہاری ٹانگیں توڑ کر ہمیشہ کے لیے گھر میں بٹھا دوں گا اور وہ جمشید اس کوٹھی کے سامنے سے بھی گزرے گا تو میں اسے دنیا سے گزار دوں گا۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔ فری سکتے کی حالت میں کھڑی رہ گئی۔ باپ نے شاید بچپن میں کبھی اسے مارا ہو لیکن ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ وہ حیران تھی کہ وہ دونوں مہمان کیا اتنے اہم‘ اتنے عزیز ہیں کہ باپ ان کی خاطر ایک طمانچہ تو کیا گولی بھی مار سکتا ہے؟

باپ اگر باپ کی طرح مارتا تو دکھ نہ ہوتا۔ اسے ایسے لگ رہا تھا کہ اسے غیر سمجھ کر اپنے گھر سے اور اپنے معاملات سے دور رکھنے کے لیے اس پر ہاتھ اٹھایا گیا ہے۔ اگر وہ گھر سے نہیں جائے گی تو اس کے ساتھ اس سے بھی برا سلوک کیا جائے گا۔

وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ اس نے فون پر جمشید سے کہا۔ "میں جارہی ہوں‘ ہمیشہ کے لیے۔"

جمشید نے کہا۔ "ایک دن ہر لڑکی کو ہمیشہ کے لیے میکے سے جانا پڑتا ہے۔"

"اگر تم میری بات کو مذاق سمجھو گے تو میں فون بند کردوں گی۔"

"سمجھ گیا۔ معاملہ سنگین ہے۔ یہ بتاؤ ہمیشہ کے لیے کہاں جارہی ہو؟"

"کیا اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے جاتے ہیں۔"

"مگر تم نے تو قسم کھائی تھی‘ ہم جئیں گے ایک ساتھ مریں گے ایک ساتھ۔"

"میں نے اسی لیے فون کیا ہے۔ آج آدھی رات کے بعد کوٹھی کے سامنے میرا انتظار کرنا۔ میں چپ چاپ آؤں گی پھر ہم دونوں راوی پل پر جاکر وہاں سے چھلانگ لگا کر ڈوب مریں گے۔"

"ہاں اس طرح ایک ساتھ مرنے کی قسم پوری ہو جائے گی لیکن یہ تو خود غرضی ہوگی۔ ہم مرجائیں گے تو ہمارے بچوں کا کیا ہوگا؟"

"بچے‘ ہمارے بچے کہاں سے آگئے؟"

"وہی جو شادی کے بعد ہونے والے ہیں۔ ہم ڈوبیں گے تو ہمارے ساتھ معصوم بچے بھی پیدا ہونے سے پہلے ڈوب مریں گے۔"

"تم پھر مذاق کررہے ہو۔"

"یہ مذاق نہیں ہے۔ جواب دو میری آئندہ نسل کا کیا ہوگا؟ ہمارے دین میں اسی لیے خودکشی حرام ہے کہ ہمارے ساتھ ہماری آئندہ نسلیں بھی فنا ہوجاتی ہیں۔ حالات سے لڑنے کے لیے ہمارے ہاں خودکشی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔"

"مجھے نصیحتیں نہ کرو۔ میں غصے میں ہوں۔"

"غصے کی وجہ تو بتاؤ؟"

"آج ڈیڈی نے مجھے طمانچہ مارا ہے۔ صرف اتنی سی بات پر کہ میں اسلام آباد نہیں جانا چاہتی۔ وہ نہیں چاہتے کہ میں یہاں رہوں تو پھر ٹھیک ہے۔ میں دنیا میں ہی نہیں رہوں گی۔"

"وہ تمہیں کب اسلام آباد جانے کو کہہ رہے ہیں؟"

"کل دن کے وقت کسی بھی فلائٹ سے۔"

"کل بہت دور ہے۔ آج شام گارڈن میں ملو۔ ہم موجودہ حالات کے پیشِ نظر کوئی اہم فیصلہ کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں شام کو ملوں گی۔"

اس نے فون رکھ دیا۔ دوسرے کمرے میں اس کے والدین رخشندہ‘ تابانی اور مراد بیٹھے ہوئے تھے۔ اکرام شاہ دوسرے فون کے ذریعے بیٹی اور جمشید کی باتیں سن رہا تھا۔ پھر اس نے بھی ریسیور رکھ دیا۔ فون کے وائڈ اسپیکر سے سب ہی نے ان کی گفتگو سنی تھی۔ بیگم نے کہا۔ "کیا آپ خود پر قابو نہیں رکھ سکتے تھے۔ اسے طمانچہ مارنے کی کیا

ضرورت تھی؟"

"بیگم! جب تک اس پر دھونس اور زبردستی نہیں کی جائے گی' وہ یہاں سے نہیں جائے گی۔ اس کے ساتھ جمشید بھی ہمارے لیے خطرہ بنا رہے گا۔"

"آپ بھول گئے کہ وہ کتنی ضدی ہے۔ پانچ برس پہلے میں نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا تو اس نے چھ خواب آور گولیاں کھائی تھیں۔ فوری طبی امداد نہ دی جاتی تو مرجاتی۔ اب وہ پھر ڈوب مرنے کی بات کررہی ہے تو ضرور خودکشی کرے گی۔"

"ایسی اولاد کو مرہی جانا چاہیے۔ وہ نادان بچی نہیں ہے۔ کیا اتنا نہیں سمجھتی ہے کہ میں اتنی دولت کیسے کماتا ہوں۔ وہ "را" سے تعلقات کے بارے میں نہیں جانتی ہے۔ اتنا تو سمجھتی ہے کہ میں غیر قانونی طریقوں سے دولت حاصل کرتا ہوں اس لیے اسے جمشید جیسے قانون کے محافظوں سے دور رہنا چاہیے لیکن وہ تو رشتے داری کرکے اسے ہمارے سروں پر بٹھانا چاہتی ہے۔"

تابانی نے کہا۔ "یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ جمشید کو ٹھکانے لگا دیا جائے تو اس کے اشارے پر ہماری مخالفت کرنے والی فری ٹھنڈی ہو کر ضد اور بغاوت بھول جائے گی۔"

اکرام شاہ نے کہا۔ "ایسا ہوگا تو وہ تم دونوں کے خلاف زہر اگلنے لگے گی۔ ایسا کوئی کام نہیں ہونا چاہیے جس سے پولیس والے تم دونوں کے خلاف خفیہ انکوائری شروع کردیں۔"

رخشندہ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "وہ چھپ کر ہماری باتیں سن سکتی ہے۔ وہ ابھی جانے والی ہے۔ اس کے جانے تک ہم اپنے اپنے طور پر کوئی ایسی تدبیر سوچتے رہیں جس پر عمل کرکے جمشید سے نجات بھی حاصل کرسکیں اور فری کو ہم میں سے کسی پر شبہ بھی نہ ہو۔"

اکرام شاہ نے ناگواری سے کہا۔ "مجھے فری کا باہر جانا اور جمشید سے ملنا بالکل پسند نہیں ہے مگر مجھے مصلحتاً برداشت کرنا ہوگا۔"

مراد نے کہا۔ "اسے جانے دیں انکل! جمشید سے ملنے دیں۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم بھی اپنا موبائل شفاخانہ لے کر جارہے ہیں۔ ڈنر کے وقت سے پہلے آجائیں گے۔"

بیگم وہاں سے اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آئی۔ اس نے ایک الماری کھول کر ایک جیولری شاپ کی رسید نکالی۔ اس نے تین لاکھ روپے کے ہیرے جڑے ہوئے زیورات کا سیٹ تیار کرنے کے لیے جیولر کو آرڈر دیا تھا۔ وہ اسی سلسلے کی رسید تھی۔

اس نے فری کے کمرے میں آکر دیکھا' وہ لباس بدل کر باہر جانے کے لیے تیار

ہورہی تھی۔ اس نے ماں کو دیکھ کر منہ پھیرلیا۔ آئینے میں دیکھ کر اپنے میک اپ کا جائزہ لینے لگی۔ بیگم نے پاس آکر کہا۔ "میری بیٹی ناراض ہے؟"

وہ کچھ نہیں بولی۔ بیگم نے کہا۔ "تمہارے ڈیڈی کو تم پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ میں نے انہیں خوب باتیں سنائی ہیں اور ان سے کہہ دیا ہے کہ جب تک وہ تمہیں سوری نہیں کہیں گے۔ میں بھی ان سے بات نہیں کروں گی۔"

فری نے کہا۔ "وہ سوری کہیں یا نہ کہیں' میں اسلام آباد نہیں جاؤں گی۔ اگر یہاں سے گئی تو سمجھ لیں کہ آپ پھر کبھی میرا منہ نہیں دیکھ سکیں گی۔"

"خدا نہ کرے ایسا ہو۔ میں دن رات تمہارا منہ دیکھنے کے لیے اپنے پاس تمہیں رکھوں گی۔ اسلام آباد نہیں جانے دوں گی۔ اب تو خوش ہو؟"

وہ خوش ہوکر اپنی جگہ سے اٹھ کر ماں کے گلے لگ گئی۔ ماں نے پوچھا۔ "کہیں جارہی ہو؟"

"جناح گارڈن تک جارہی ہوں۔ آپ کی کار لے جاؤں؟"

"لے جاؤ مگر میرا ایک کام کرو۔ وہاں سے ہمارے جیولر کے پاس چلی جاؤ۔ وہ ہیروں کا سیٹ تیار ہوچکا ہوگا۔ یہ رسید دے کر وہ سیٹ لے آؤ۔"

وہ ماں سے رسید اور گاڑی کی چابی لے کر کوٹھی کے باہر پورچ میں آئی۔ وہاں احاطے کا بڑا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ تابانی اور مراد کی ایمبولینس اس گیٹ سے گزرتی ہوئی باہر جارہی تھی۔ فری نے ناگواری سے انہیں جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر اپنی کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ آہستہ آہستہ اسے ڈرائیو کرتی ہوئی کوٹھی کے احاطے کے باہر آئی۔ اس نے سروس روڈ پر آکر مین روڈ کی طرف دائیں بائیں نظریں دوڑائیں' ان کی ایمبولینس نظر نہیں آرہی تھی۔ پتا نہیں وہ اتنی جلدی کہاں چلے گئے تھے۔ وہ اپنی کار ڈرائیو کرتی ہوئی گارڈن کے پارکنگ ایریا میں آگئی۔ وہاں جمشید اس کا انتظار کررہا تھا۔

اس نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔ "میری جان کا غصہ کچھ کم ہوا ہے یا نہیں؟"

وہ مسکرا کر کار سے نکلتے ہوئے بولی۔ "میں نے اپنی بات منوالی ہے۔ ممی نے کہہ دیا کہ میں اسلام آباد نہیں جاؤں گی۔"

وہ کار کو لاک کرکے گارڈن کی طرف جانے لگے۔ "تمہارے والدین تمہیں مجھ سے جدا کرنے کے لیے اسلام آباد بھیجنا چاہتے تھے۔ پھر اچانک انہوں نے فیصلہ کیوں بدل دیا؟"

"شاید ڈیڈی کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ وہ مجھے اسلام آباد نہ بھیجنے کا فیصلہ کرکے مجھے خوش کرنا چاہتے ہیں۔"

"جب تم نے فون کیا تھا تو ابتدا میں تمہارے دو فقرے مجھے صاف سنائی دیئے تھے پھر تمہاری آواز دھیمی پڑ گئی۔ اس کا مطلب ہے' دوسرے کمرے کے فون کا ریسیور اٹھا کر ہماری گفتگو سنی جارہی تھی۔"

وہ نفرت سے بولی۔ "شاید انہی دو بدمعاشوں کی یہ حرکت ہوگی۔ ڈرائنگ روم اور میرے کمرے کے دونوں فون کا ایک ہی کنکشن ہے۔"

"دراصل تم سراغ رسانی کے معاملے میں اناڑی ہو۔ انہیں شبہ ہوگیا ہے کہ تم میرے لیے جاسوسی کررہی ہو۔ ان کے دل میں چور ہے۔ وہ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ ہیں اس لیے مجھ سے محتاط رہتے ہیں۔"

"تم نے کہا تھا کہ میں کسی طرح ان کے پاسپورٹ چرا کر لاؤں۔ مجھے افسوس ہے' میں تمہارا اتنا سا کام نہ کرسکی۔"

"کوئی بات نہیں۔ اگر میں تمہیں گائیڈ کرتا تو تم ان کے پاسپورٹ لے آتیں لیکن انہوں نے محتاط ہونے کے بعد پاسپورٹ ایسی جگہ رکھا ہوگا جہاں تم نہیں پہنچ پاؤگی۔"

"اب یہ موبائل دواخانہ لیے شہر میں نہ جانے کہاں کہاں گھومتے رہتے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے' یہاں کافی عرصے تک رہیں گے۔"

"سنا ہے' رعایتی قیمت پر دوائیں دیتے ہیں۔ زخمیوں کی مفت مرہم پٹی کرتے ہیں اور انہیں علاج کے لیے اسپتال پہنچاتے ہیں۔ گویا نیکی کرتے ہیں اور دریا میں ڈالتے ہیں۔ ان خدمات کے ذریعے منافع حاصل نہیں کرتے ہیں۔ کیا یہ حیرانی کی بات نہیں ہے کہ وہ پاکستان آکر نہ کوئی کاروبار کررہے ہیں اور نہ ہی دوسرے مختلف ذرائع سے اپنا ایک بہتر مستقبل بنانا چاہتے ہیں۔ حاتم طائی کی طرح خدائی خدمت گار بنے ہوئے ہیں۔"

"کیا مشکل ہے؟" وہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے گھاس پر بیٹھ گئی۔

جمشید نے پوچھا۔ "کس مشکل کی بات کررہی ہو؟ ان دونوں سے اتنی جلدی نجات نہیں ملے گی۔"

"تنہائی میں تو نجات ملے۔ پہلے ہم جب بھی ملتے تھے' بڑے ہی شاعرانہ اور خوب صورت انداز میں پیار بھری باتیں کرتے تھے۔ اب تو جب بھی ملتے ہیں' انہی کم بختوں کا ذکر کرتے کرتے ایک دوسرے سے رخصت ہوجاتے ہیں۔ آج بھی یہی ہوگا۔"

"نہیں ہوگا۔ ان دونوں پر لعنت بھیجو' اب ہم اپنی باتیں کریں گے۔ دیکھو کتنا خوب

صورت باغ ہے۔ جیسی ہم خوب صورت زندگی چاہتے ہیں ویسا ہی یہ سرسبز و شاداب ہے۔ اگر ہمارے پورے شہر میں اور پورے ملک میں ایسی ہی ہریالی ہو اور ہماری طرح تمام پاکستانیوں کے دلوں میں ایسے ہی پھول کھلتے ہوں تو پھر کوئی کرپٹ سیاست داں قومی خزانہ خالی کرکے پوری قوم کو ننگا نہیں کرے گا۔ ابھی تو ہم ایسی قوم ہیں جو آدم اور حوا کی طرح اپنی بے لباسی چھپانے کے لیے انجیر کے پتے ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"اگر میری ممی اور ڈیڈی کی طرح لوگ اپنی بیٹیوں کو کسی منسٹر یا منسٹر زادے سے بیاہنے کے لیے اپنی حیثیت سے زیادہ بلند مرتبہ حاصل کرنے کے لیے چور دروازوں سے دولت مند اور وی آئی پی نہ بنیں تو پھر محبت کرنے والے دو دلوں کو کوئی جدا نہیں کرے گا۔ یہاں محبت سے شادی ہوا کرے گی اور محبت کرنے والی نسلیں پیدا ہوا کریں گی۔"

"ہماری شادی تو ضرور ہوگی اور ہزاروں مخالفتوں کے باوجود ہوگی اور اگر نہ ہوئی تو میں تابانی اور مراد کو گولی مار دوں گا۔"

"پتا نہیں' وہ دو شیطان ہمارے ہی گھر کیوں آئے ہیں اور ایک موبائل شفاخانے کے ذریعے فرشتے بن کر خدمتِ خلق کیوں کر رہے ہیں۔ تم جلدی ہی ثابت کرنے کی کوشش کرو کہ وہ غلط بندے ہیں اور شاید پاکستانی نہیں ہیں۔ باہر سے امپورٹ کیے گئے ہیں۔"

"اگر ان کا پاسپورٹ مل جاتا تو........"

وہ کہتے کہتے چونک گیا اور ناگواری سے بولا۔ "یہ ہمارا رومانس ہے؟ ہم پیار و محبت کی باتیں کررہے ہیں؟ ہم تو پھر ان دونوں کے تذکرے میں الجھ گئے ہیں۔"

پھر وہ اپنا سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "واقعی بڑی مشکل ہے۔ وہ دونوں ہماری محبت اور ہمارے تمام خوب صورت جذبات پر حاوی ہورہے ہیں' چلو اٹھو۔ پہلے میں ان دونوں کو اپنی زندگی سے نوچ کر پھینک دوں گا۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ فری اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے بولی۔ "تم نے اچانک کیا سوچ لیا ہے؟ ان کے خلاف کیا کرنا چاہتے ہو؟"

وہ پارکنگ ایریا کی طرف جانے لگے۔ جمشید نے کہا۔ "میری نظر میں اغوا کرنے اور قتل کرنے والے کئی مجرم ہیں۔ کوئی ثبوت نہ ہونے کے باعث میں نے محکمے میں ان کے خلاف رپورٹ نہیں دی ہے۔ آئندہ ان سے نمٹنے کے لیے انہیں نظروں میں رکھتا ہوں۔ اب میں ان کے ذریعے تابانی کو اغوا کراؤں گا۔"

"اسے اغوا کرنے سے کیا حاصل ہوگا؟"

"میں شہر سے دور اسے ایک مکان میں قید کروں گا۔ وہاں ٹارچر کرنے کا تمام سامان لے جاؤں گا پھر تھرڈ ڈگری کی ایسی درندگی کروں گا کہ وہ نیم مردہ ہو کر اپنی اور مراد کی اصلیت اگل دے گا۔"

وہ کار میں آکر بیٹھ گئے۔ فری گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ "ہم گلبرگ چل رہے ہیں۔ وہاں ایک جیولری شاپ سے ہیروں کا ایک سیٹ لینا ہے۔"

"میں تمہیں گائیڈ کرتا ہوں۔ پہلے مجھے ایک ایسے مجرم کے پاس جانا ہے جس سے میں کام لینا چاہتا ہوں۔"

"اب ایسی بھی کیا جلدی ہے؟"

"ذرا عقب نما آئینے میں دیکھو۔ وہ موبائل شفاخانہ دکھائی دے گا۔ وہ دونوں ہمارا تعاقب کر رہے ہیں۔"

فری نے عقب نما آئینے کا رخ بدل کر دیکھا۔ واقعی وہ گاڑی ان سے دور تھی لیکن ان کے تعاقب میں تھی۔ فری نے راستہ بدل دیا۔ جمشید نے کہا۔ "ہیرا منڈی چلو۔"

"توبہ ہے۔ مجھے ایسی جگہ لے جاؤ گے؟"

"مجبوری ہے۔ میرے کام کا بندہ وہیں رہتا ہے۔"

وہ کار ادھر لے جانے لگی۔ جمشید نے کہا۔ "اس بندے کو رقم کا لالچ دینا ہوگا۔ تم جانتی ہو' بڑے لوگوں کی طرح میرا بینک بیلنس نہیں ہے۔"

"کتنی رقم کی ضرورت ہوگی؟"

"بیس یا پچیس ہزار روپے۔"

"میں کل بینک سے نکلوا دوں گی۔"

"پھر تو سمجھو کام ہوگیا۔"

تابانی اور مراد بہت فاصلہ رکھ کر ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ پھر تابانی نے کہا۔

"تعجب ہے۔ یہ ہیرا منڈی کیوں آئے ہیں؟"

مراد ایک گلی کے موڑ پر گاڑی روک کر دیکھ رہا تھا۔ فری کی کار ایک دودھ والے کی دکان کے قریب رک گئی تھی۔ جمشید کار سے نکل کر دودھ والے سے کچھ کہہ رہا تھا۔ دودھ والے نے ہاں کے انداز میں سرہلایا۔ پھر اس کا ایک ملازم لڑکا دوڑتا ہوا ایک گلی میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس لڑکے کے ساتھ ایک چھوٹے قد کا موٹا سا آدمی آکر بولا۔ "سلام باؤ جی! آپ نے بلایا ہے؟"

جمشید نے پوچھا۔ "تم شابے ہو؟"

"ہاں جی۔ نام شعبان ہے مگر سب مجھے شابے کہتے ہیں۔ حکم کریں؟"

"ایک بہت ہی خفیہ معاملہ ہے۔ تم سے کام لینا ہے۔ میں معقول معاوضہ دوں گا۔"

"اوئے باؤ جی! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ پولیس والے عاشی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں پولیس کے چکر میں پڑنے والا کام نہیں کروں گا۔"

جمشید نے پوچھا۔ "یہ عاشی کون ہے؟"

"ہماری انجمن کی ایک ممبر ہے۔ میں طوائفوں کی انجمن کا سیکرٹری ہوں۔ پولیس والے کہتے ہیں' عاشی نئی لڑکی ہے۔ باہر سے آئی ہے اور یہاں والے اس سے دھندا کرا رہے ہیں۔ جبکہ میں نے انجمن کا رجسٹر دکھایا ہے۔ دو مہینے سے اس کا نام رجسٹر میں لکھا ہوا ہے۔"

"اسے کس تھانے میں لے گئے ہیں؟"

"آپ پوچھ کر کیا کریں گے؟"

"اگر تم میرا کام کرو گے تو عاشی آدھے گھنٹے کے اندر تمہارے پاس آجائے گی۔"

"آدھے گھنٹے میں آجائے گی' مجھے تو یقین نہیں آتا۔ دراصل اس تھانے دار کا دل عاشی پر آگیا ہے۔ وہ اسے صبح سے پہلے نہیں چھوڑے گا۔"

"اگر وہ ابھی آجائے تو میرا کام کرو گے؟"

"جناب عالی! سر کے بل کروں گا اور ابھی کروں گا۔"

جمشید' فری سے موبائل فون لے کر چند قدم کے فاصلے پر ایک گلی میں گیا پھر رابطہ کرنے کے بعد بولا۔ "سر! میں جمشید تارڑ بول رہا ہوں۔ آپ سے ایک ضروری کام ہے۔"

"کیا کام ہے؟"

"میں نے آپ کو تابانی اور مراد کے بارے میں بتایا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ اگر وہ فراڈ ہیں اور ان کی حرکتیں مشکوک ہیں اور وہ اپنے خلاف کوئی ثبوت نہیں چھوڑ رہے ہیں تو میں ان میں سے کسی ایک کو ٹریپ کر کے اس سے ان کی اصلیت اگلوا سکتا ہوں۔"

"میں تمہیں ایسا کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔"

"سر! بڑے مجرم کو پکڑنے کے لیے ایک چھوٹے مجرم پر احسان کرنا اور اس سے کام لینا چاہتا ہوں۔"

اس نے بتایا کہ عاشی قانونی طور پر لائسنس یافتہ طوائف ہے لیکن بھاٹی گیٹ کا

تھانے دار غیر قانونی دھندا کرنے کے غلط الزام میں اسے محض اپنی عیاشی کے لیے لے گیا ہے۔ اگر ابھی عاشی کو رہائی مل جائے تو میں شابے کو اپنا احسان مند بنا کر بہت بڑا کام نکال سکتا ہوں۔

افسر نے کہا۔ "میں تھانے فون کر رہا ہوں۔ کسی کو بھیج دو۔ اس عورت کو رہائی مل جائے گی۔"

اس نے شکریہ ادا کرکے فون بند کیا۔ شابے کے پاس آکر بولا۔ "اپنے کسی بندے کو تھانے بھیج دو۔ وہ عاشی کو وہاں سے لے آئے گا۔ وہ بندہ صرف اتنا کہے گا کہ اسے سی آئی اے کے افسر نے بھیجا ہے۔"

وہ مرعوب ہو کر ذرا پیچھے ہٹ کر بولا۔ "باؤ جی! آپ سی آئی اے والے ہیں؟"

"اب میری بات نہ کرو۔ میرا کام کرو۔"

"میں تو آپ کا خادم ہوں' حکم کریں۔"

"ایک بندے کو اٹھانا ہے۔"

"ہو جائے گا باؤ جی! حکم کریں' کب اٹھانا ہے؟"

"ابھی اس کا پیچھا کرو گے۔ آج رات یا کل تک اسے اٹھا کر ایسی جگہ لے جاؤ جہاں سے وہ فرار نہ ہو سکے۔ پھر میں آکر اسے اپنے خفیہ اڈے پر لے جاؤں گا۔ میں اس کام کا معقول معاوضہ بھی دوں گا۔"

"او صاحب جی! معاوضے کی بات کرکے شرمندہ نہ کریں۔ میں تو آج سے آپ کی ہی خدمت کرنے کے لیے زندہ رہوں گا۔ یہ بتائیں کہ وہ بندہ کہاں ہے؟"

جمشید نے کہا۔ "میں ہاتھ کے اشارے سے نہیں بتاؤں گا۔ تم شاہی مسجد میں داخل ہونے والے بڑے دروازے کی طرف دیکھو۔ وہاں بائیں ہاتھ والی گلی میں ایک بڑی سی وین کھڑی ہے۔ اس پر تابانی مراد رعایتی موبائل شفاخانہ اور ایمبولینس لکھا ہوا ہے۔ اس میں دو جوان ہیں۔ ان میں سے ایک جوان بہت خوب صورت ہے۔ وہ دوسرے ساتھی کی طرح باڈی بلڈر نہیں ہے لیکن سنا ہے کہ بہت خطرناک فائٹر ہے۔ اسی خوب صورت جوان کا نام تابانی ہے اور اسی کو اغوا کرنا ہے۔ یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ وہ تر نوالہ نہیں ہے۔ آسانی سے ہاتھ نہیں آئے گا۔ اسے زخمی کرکے یا بے ہوش کرکے اغوا کرنا ہو گا۔"

"صاحب جی! یہ ہم پر چھوڑ دیں۔ آپ نے ٹائم دے دیا ہے ہم آج رات یا کل رات تک اسے آپ کے پاس پہنچا دیں گے۔"

"وہ دونوں ہمارا تعاقب کر رہے ہیں۔ ہم ابھی گلبرگ جا رہے ہیں۔ کیا تمہارے پاس گاڑی ہے؟"

"ہے صاحب جی! ہائی روف سوزوکی ہے۔ وہ آپ کا تعاقب کر رہے ہیں' ہم ان کا تعاقب کریں گے۔ آپ لوگوں کے پیچھے آنے کے لیے بس پندرہ منٹ کا ٹائم دیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم یہاں دودھ پینے کے بہانے رکے رہیں گے۔ پھر گلبرگ کی طرف چل پڑیں گے۔"

شابے نے دودھ والے سے کہا۔ "بی بی جی اور صاحب جی کو دو گلاس ٹھنڈا میٹھا دودھ پلاؤ۔ خبردار! پیسے نہ لینا۔"

شابے وہاں سے چلتا ہوا گلی کے ایک مکان میں آیا۔ وہاں ایک قد آور پٹھان اور دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ شابے نے سینہ تان کر کہا۔ "اوئے انور! ابھی تھانے جا اور تھانے دار سے بول' تجھے سی آئی اے کے بڑے افسر نے بھیجا ہے۔ تھانے دار یہ سنتے ہی عاشی کو رہا کر دے گا۔"

انور نے کہا۔ "شابے! ہوش میں ہے؟ تھانے جا کر سی آئی اے کے افسر کی دھونس دوں گا تو وہ مجھے بھی اندر کر دیں گے۔"

شابے نے کہا۔ "ابے جاتا ہے یا دوں ایک ہاتھ۔ کھوتے دا پتر! میں طوائفوں کی انجمن کا سیکرٹری ہوں۔ کوئی معمولی بندہ نہیں ہوں۔ سی آئی اے والے مجھ سے ملنے کاروں میں آتے ہیں۔"

انور چلا گیا۔ شابے نے دوسرے آدمی سے کہا۔ "جا اور فوراً اپنی سوزوکی لے آ پٹرول اور سیٹ کے نیچے ہتھیار چیک کر لے۔ جا اور پانچ منٹ کے اندر گاڑی لے آ۔"

پٹھان ساتھی نے کہا۔ "اوئے شابے! کیا معاملہ ہے۔ خوچہ ہم کو بھی بتاؤ۔"

"دلیر خان! ابھی تمہارا ہی کام ہے۔ ایک بہت ہی خوب صورت جوان کو اغوا کرنا ہے۔"

"جوان خوب صورت ہے اور چکنا ہے تو ہم اس کو نہیں چھوڑے گا۔ بولو کدھر ہے وہ؟"

"تم چلو۔ میں راستے میں سب سمجھا دوں گا مگر دلیر خان گڑبڑ نہ کرنا۔ تم چکنے چھوکروں کو دیکھ کر پھسل جاتے ہو۔ یہ سی آئی اے والے صاحب کا شکار ہے۔"

ہائی روف سوزوکی آ گئی۔ شابے' دلیر خان اور دو ساتھیوں کے ساتھ اسے ڈرائیو کرتا ہوا گلی کے موڑ پر آیا تو جمشید' فری کے ساتھ بیٹھا کار میں جا رہا تھا۔ موبائل شفا

خانے والی وین اس کار سے کافی فاصلہ رکھتے ہوئے ان کے تعاقب میں جا رہی تھی.......
شابے اس وین کے پیچھے چل پڑا۔

تینوں گاڑیاں آگے پیچھے چل رہی تھیں۔ فری نے جمشید سے پوچھا۔ "پتا نہیں، تم کیسے آدمی سے کام لے رہے ہو۔ تابانی اور مراد بہت ہی چالاک ہیں۔ کیا یہ لوگ ان دونوں کو قابو میں کر سکیں گے؟"

"شابے بہت چالاک بندہ ہے اور اس کا ساتھی دلیر خان فولادی پٹھان ہے۔ مجھے یقین ہے، وہ ناکام نہیں رہیں گے۔ ویسے آزمانے میں کیا حرج ہے۔ وہ ناکام ہوں گے تو پھر دونوں کو کسی اور طرح ٹریپ کیا جائے گا۔"

وہ گلبرگ کی لبرٹی مارکیٹ میں پہنچ گئے۔ سامنے جیولر کی بہت بڑی دکان تھی۔ وہ دونوں کار لاک کرکے اس دکان کے اندر گئے۔ مراد نے اپنی گاڑی ان سے دور روکی تھی، اس نے کہا۔ "تابانی! ہمارا بہت وقت برباد ہو رہا ہے۔ تم اس دکان میں جاؤ اور شوکیس میں بم رکھ دو۔ تم جیسے ہی باہر نکل کر دور جاؤ گے، میں یہاں سے ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا دوں گا۔"

تابانی نے کہا۔ "یار! فری اور جمشید مجھے دیکھ لیں گے۔"

"دیکھنے دو۔ تمہاری وہاں موجودگی کی گواہی دینے کے لیے زندہ تو نہیں رہیں گے۔ جلدی کرو۔"

وہ گاڑی سے نکل کر دکان کی طرف آیا۔ اس کی جیب میں ریموٹ کنٹرول سے بلاسٹ ہونے والا بم تھا۔ وہ سائز میں چھوٹا تھا مگر کارکردگی میں زبردست تباہی مچانے والا تھا۔ تابانی نے دکان میں آ کر دیکھا۔ وہ ایک وسیع و عریض دکان تھی۔ شیشوں کی دیواروں کے پیچھے بھی سونے چاندی اور ہیرے جواہرات نمائش کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ تابانی نے کئی آئینوں میں فری اور جمشید کو دیکھا۔ فری دور ایک کاؤنٹر پر سیلز مین سے کچھ کہہ رہی تھی۔ دوسرے کاؤنٹر کے سیلز مین نے تابانی سے پوچھا۔ "فرمائیں سر نئے ڈیزائنز ہیں۔ دکھاؤں؟"

تابانی نے کہا۔ "وہاں شوکیس میں سونے کا ایک سیٹ ہے۔ ادھر آؤ۔ میں بتاتا ہوں۔ وہی سیٹ مجھے چاہیے۔"

وہ شوکیس کے پاس آیا۔ سیلز مین نے سلائیڈنگ شیشے کے پٹ کو ایک طرف ہٹایا۔ تابانی نے ایک خوب صورت سے مخملی ڈبے میں رکھے ہوئے زیورات کے سیٹ کو اٹھاتے وقت سیلز مین کی نظریں بچا کر چھوٹے سے بم کو وہاں رکھ دیا۔ زیورات کے سیٹ اور سیلز

مین کے ساتھ کاؤنٹر پر آیا۔ پھر اس کی قیمت پوچھ کر بولا۔ "اوہ۔ میں بریف کیس کار میں چھوڑ آیا ہوں۔ رقم اسی میں ہے یہ سیٹ یہیں رہنے دو۔ میں ابھی رقم لے کر آتا ہوں۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا دکان کے باہر آیا لیکن اپنی وین کی طرف اس لیے نہیں گیا کہ بعد میں کوئی اس وین کی نشان دہی نہ کرے۔ مراد ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول لیے دیکھ رہا تھا۔ جب تابانی دکان سے دور چلا گیا تو اس نے ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا دیا۔ یکبارگی دل ہلا دینے والا دھماکا ہوا۔ دکان کے شیشوں، شوکیسوں اور دروازوں کے ساتھ دکان کے اندر موجود لوگوں کے بھی چیتھڑے اڑ گئے۔ مرد، عورتیں اور بچے چیختے چلاتے ہوئے دور بھاگنے لگے۔ تابانی دوڑتا ہوا ادھر سے گزرا جہاں شابے کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اچانک اس کے سر پر ایک آہنی ضرب پڑی۔ وہ چیختا ہوا، لڑکھڑاتا ہوا زمین پر گرا۔ دلیر خان نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا کر گاڑی کے اندر ڈال کر کہا۔ "شابے! چلو۔"

شابے نے پریشان ہو کر کہا۔ "رک جاؤ خان! تم نے دیکھا نہیں ہمارا سی آئی اے والا صاحب، بی بی جی کے ساتھ دکان میں گیا تھا۔ اوہ خدایا! رحم کر۔ ہمیں معلوم کرنا چاہیے۔ شاید وہ بچ گئے ہوں اور صرف زخمی ہوئے ہوں۔"

دلیر خان نے کہا۔ "اوے شابے! تم ادھر جا کے دیکھو۔ ہم اس کو لے جاتا ہے۔ یہ ہوش میں آئے گا تو گڑبڑ کرے گا۔"

شابے کے ساتھی اور دلیر خان بے ہوش تابانی کو سوزوکی میں لے کر چلے گئے۔ شابے تباہ ہونے والی دکان کو دیکھ رہا تھا۔ اب وہاں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ ایک گلی کی طرف دوڑتا ہوا دوسری طرف سے گھومتا ہوا اس دکان کے پچھلے حصے کی طرف آیا۔ دکان کا وہ پچھلا حصہ محفوظ تھا۔ کچھ لوگ ادھر سے جان بچا کر نکل آئے تھے۔ ان بچنے والے خوش نصیبوں میں فری اور جمشید بھی تھے۔ فری اس زبردست دھماکے کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ جمشید اسے شانے پر لاد کر وہاں سے دور دوڑتا چلا آیا تھا۔ پھر ایک کوٹھی کے سامنے پہنچ کر فری کو گھاس پر لٹا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا اور دور تک دیکھنے لگا کہ کسی گاڑی میں لفٹ...... مل جائے تو فری کو اسپتال پہنچا سکے۔

اسی...... وقت شابے نے اسے دیکھا پھر دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا۔ اس نے کار کی چابی دیتے ہوئے کہا۔ "شابے فوراً ہماری کار لے آؤ۔"

"صاحب جی! کار تو دکان کے بالکل سامنے تھی۔ وہ بھی تباہ ہو گئی ہے۔"

"دیر نہ کرو۔ جاؤ اپنی گاڑی لے آؤ۔"

"دلیر خان آپ کے مطلوبہ بندے کو ہماری گاڑی میں لے گیا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی ٹیکسی لے آتا ہوں۔"

وہ پلٹ کر جانا چاہتا تھا۔ دور سے ایک کار آرہی تھی۔ شابے........ فوراً اپنے لباس سے ریوالور نکال کر اسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیچ سڑک پر کھڑا ہوگیا۔ کار کی ونڈ سکرین کی طرف نشانہ لیتے ہوئے للکارتا ہوا بولا۔ "گاڑی روکو۔ ورنہ فائرنگ شروع کردوں گا۔"

کار رک گئی۔ وہ دوڑتا ہوا کار والے کے پاس آکر بولا۔ "ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ بس ان بی بی جی کو کسی قریبی کلینک میں پہنچا دو۔"

جمشید' فری کو اٹھا کر پچھلی سیٹ پر لے آیا۔ شابے کار والے کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار چل پڑی۔

اس دکان میں دھماکا ہونے کے بعد مراد اپنی وین سے باہر آگیا تھا۔ اس نے تابانی کو دوسری طرف دوڑ کر جاتے دیکھا تھا۔ یہ اطمینان تھا کہ وہ خوف زدہ ہوکر دوڑنے والوں کے درمیان ایک لمبا چکر لگا کر اس کے پاس آئے گا۔ اس سے پہلے کئی جوان زخمی عورتوں اور بچوں کو اٹھا کر موبائل شفا خانے کے پاس لے آئے تھے۔ مراد انہیں دوائیں دے رہا تھا۔ دوسرے جوانوں کے تعاون سے ان کے زخموں کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔

کئی ایسی زخمی لائے جارہے تھے' جنہیں اسپتال پہنچانا ضروری تھا لیکن مراد اور دوسرے جوانوں نے کہا کہ وہ زخمیوں کو فوری طبی امداد پہنچا رہے ہیں۔ اگر وہ ایمبولینس اسپتال تک جاتی آتی رہے گی تو دوسرے زخمی امداد سے محروم رہیں گے۔

مرد' عورتیں اور بوڑھے' مراد کو دعائیں دے رہے تھے کہ ایسے نازک موقع پر وہ اپنا موبائل شفا خانہ وہاں لے آیا ہے۔ وہ بے چارے نہیں جانتے تھے کہ دھماکے اور تخریب کاری کا ذمے دار وہی دعائیں کمانے والا ہے۔

وہ طبی امداد پہنچاتے ہوئے تابانی کی واپسی کا انتظار کررہا تھا لیکن وہ نہیں آیا۔ تمام زخمیوں کو امداد دی جاچکی تھی۔ آخر میں وہ بری طرح زخمی ہونے والوں کو قریبی اسپتالوں تک پہنچانے لگا۔ بار بار اس تباہ شدہ دکان کی طرف آتا رہا لیکن اسے تابانی نظر نہیں آیا۔

وہ اکرام شاہ کی کوٹھی میں آیا۔ تابانی وہاں بھی نہیں پہنچا تھا۔ اس نے بتایا کہ گلبرگ لبرٹی مارکیٹ کی ایک بہت بڑی جیولری کی دکان کو دہشت گردوں نے بم دھماکے سے تباہ کردیا ہے۔ بیگم یہ سنتے ہی اپنے سینے پر دونوں ہاتھ مار کر بولی۔ "ہائے میری بچی میری فری وہاں ہیرے کا سیٹ لینے گئی تھی۔"

اکرام شاہ نے کہا۔ "کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ دھماکے کے وقت اس دکان میں ہو پھر بھی ہمیں وہاں جاکر معلوم کرنا چاہیے۔"

وہ سب مراد کے ساتھ تباہ شدہ دکان کے پاس آئے۔ سب سے پہلے دکان کے سامنے انہیں بیگم کی ٹوٹی پھوٹی سی کار دکھائی دی۔ بیگم رونے لگی۔ فائر بریگیڈ والے آگ بجھا رہے تھے۔ ان لاشوں کے لباس جل کر راکھ ہوچکے تھے۔ ٹکڑوں سے پہچانا نہیں جاسکتا تھا کہ ان میں فری اور جمشید بھی ہیں یا نہیں۔ انسانی جسموں کے ایسے پرخچے اُڑے تھے کہ سر اور چہرے بھی سلامت نہیں رہے تھے۔

بیگم اور اکرام شاہ اپنے آنسو پونچھ رہے تھے۔ رخشندہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ مراد انہیں تسلیاں دے رہا تھا کہ کار کے تباہ ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ ہوسکتا ہے وہ کار کو وہاں چھوڑ کر دوسری کسی دکان میں گئے ہوں اور اس طرح زندہ ہوں۔

انہوں نے پوری لبرٹی مارکیٹ میں انہیں تلاش کیا پھر گھر واپس آئے۔ فری وہاں بھی واپس نہیں آئی تھی اور اب مراد تشویش میں مبتلا ہورہا تھا کہ تابانی کہاں رہ گیا ہے؟

☆======☆======☆

میں نے اسی شام زندگی میں پہلی بار اپنی امی کی آواز سنی۔ انہوں نے فون پر پوچھا "ہیلو بیٹے' کیسے ہو؟"

"السلام علیکم امی جان!"

"وعلیکم السلام۔ اللہ تعالیٰ تمہیں لمبی عمر دے۔ دوائیں باقاعدہ کھا رہے ہو؟"

"جی ہاں۔ آپ لمبی عمر کی دعائیں دے رہی ہیں لیکن یہ مجھ پر ظلم ہے کہ آپ میرے پاس نہیں آرہی ہیں۔"

"میں خط میں لکھ چکی ہوں۔ میرے دامن پر ایک بد نما داغ لگایا گیا ہے۔ جس دن تم اس داغ کو مٹاؤ گے' میں تمہیں گلے لگانے آجاؤں گی۔"

"وہ کیسا داغ ہے؟ کس کم بخت نے وہ داغ لگایا ہے' مجھے اس کا نام اور پتا بتائیں۔ میں اس کاٹیج سے نکلتے ہی اسے جہنم میں پہنچادوں گا۔"

"جب تک زخم نہیں بھرے گا' تم کاٹیج سے نہیں نکلو گے۔ میں تمہاری صحت اور جسمانی و دماغی توانائی سے مطمئن ہوجاؤں گی تو ایک نہیں کئی دشمنوں کے نام اور پتے بتاؤں گی۔"

"خدا گواہ ہے' میں نے کبھی ایک لفظ بھی آپ کے خلاف سننا گوارا نہیں کیا۔ میں آپ کے خلاف بولنے والوں کا جینا حرام کردیتا ہوں۔ یہ سن کر مجھ سے برداشت نہیں

ہو رہا ہے کہ کسی نے آپ کے دامن پر داغ لگایا ہے۔"

"دماغی صحت مندی کی پہچان یہ ہے کہ آدمی اپنی توہین اور غصہ برداشت کرتا ہے۔ پھر بڑی ذہانت اور حکمت عملی سے اپنی توہین کا انتقام لیتا ہے۔ ایک سعادت مند بیٹے کی طرح میری ہدایات پر عمل کرو اور اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھا کرو۔"

"میں آپ کی اس ہدایت پر عمل کروں گا۔"

"میں کوئی گمنام لیڈی ڈاکٹر نہیں ہوں۔ تم زخم بھرنے کے بعد لاہور آؤ گے تو آسانی سے میری رہائش گاہ کا پتا معلوم کر سکو گے۔"

"میں ایسا ضرور کروں گا۔"

"نہیں بیٹے! تم میری رہائش گاہ اور اسپتال کا معلوم کر سکتے ہو لیکن کبھی میرے روبرو نہ آنا۔ پہلے تم ایک غیرت مند بیٹے کی حیثیت سے میری پارسائی ثابت کرو گے پھر میرے سامنے آؤ گے۔ وعدہ کرو۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔ دماغ ٹھنڈا رکھوں گا اور دشمنوں کو ٹھنڈا کرنے کے بعد آپ کے سامنے آؤں گا۔"

"شاباش بیٹے! اس کالج میں مطالعہ کرنے کے لیے بہترین کتابیں اور ویڈیو فلمیں ہیں۔ تمہارا وقت اچھا گزرے گا۔"

"امی جان! یہ کس کا کالج ہے؟"

"میرا ہے۔ اب تمہارا بھی ہے۔ میں ہر ہفتے کی شام کالج میں جاتی ہوں۔ ایک رات اور اتوار کا دن بالکل تنہا گزارتی ہوں۔ اسپتال کی ایمبولینس کا ڈرائیور مجھے یہاں تک لاتا ہے اور اتوار کی شام لے جاتا ہے۔ کل شام کو میں وہاں جا رہی تھی۔ تب ہی تم مجھے نظر آ گئے۔"

"آپ مجھ سے دور رہیں، پھر مجھے کیسے پہچان لیا؟"

"جب تم بچے تھے۔ اپنے دادا کے ساتھ رہتے تھے۔ تب سے تمہیں ہر دوسرے تیسرے دن چھپ چھپ کر دیکھتی رہی ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی تھی کہ تمہارے دادا تمہیں فولاد بنا رہے ہیں اور ایک دن تم روبوٹ بن کر میرے دشمنوں کی گردنیں توڑ دو گے۔"

"خدا کی قسم میں آپ کی نیک نامی واپس لاؤں گا۔ میرا تو جی چاہتا ہے......"

"بس آگے نہ بولو۔ تم پھر برداشت نہیں کر رہے ہو اور جوش میں آ رہے ہو۔"

"سوری امی جان! میں رفتہ رفتہ غصے پر قابو پانا سیکھ جاؤں گا۔"

"شاباش! اب آرام کرو۔ میں کل صبح فون کروں گی۔"

امی نے فون بند کر دیا۔ میں نے موبائل فون کو آف کر کے وقت کے مطابق دوائیں کھائیں۔ پھر بستر سے اتر کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا فریج کے پاس آیا اور اپنی پسند کے پھل نکال کر کھانے لگا۔

میری امی نے بڑی زود اثر دواؤں کا انتخاب کیا تھا۔ دوسرے دن میں نے کافی توانائی محسوس کی۔ کالج سے باہر جا کر ٹہلنے کو جی چاہا لیکن امی نے آرام کرنے کو کہا تھا۔ اس لیے ایک کرائم اسٹوری والی فلم منتخب کی اور اسے وی سی آر میں لگا کر ٹی وی آن کر کے ریموٹ کنٹرول لے کر بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ اب فلم دیکھنے لگا۔

میرے لاشعور میں یہ بات چھپی ہوئی تھی کہ میں مجرمانہ چالبازیاں سیکھتا رہوں اسی لیے جرائم سے تعلق رکھنے والی کتابیں پڑھتا تھا اور ویڈیو فلمیں دیکھا کرتا تھا۔ امی نے تیسرے دن ایک ڈاکٹر کو بھیجا۔ اس نے میرے زخم کی مرہم پٹی کی اور ایک انجکشن لگایا۔

میں نے پوچھا۔ "ڈاکٹر! میری امی کیسی ہیں؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "اگر خیریت پوچھ رہے ہو تو وہ بخیریت ہیں۔ اگر ان کی صلاحیتوں کے بارے میں سوال کر رہے ہو تو سبھی ڈاکٹر اور مریض یہی کہیں گے کہ ان پر خدا کی رحمت ہے۔ وہ جس مریض کو اٹینڈ کرتی ہیں، وہ صحت یاب ہو کر دوڑنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کسی کو ایسی مسیحائی دیتا ہے۔"

امی کی تعریفیں سن کر میں فخر محسوس کر رہا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر کے ذریعے تازہ پھل، میوے، دودھ کے پیکٹس اور کچھ دوائیں بھیجی تھیں۔ وہ ڈاکٹر ایک ایک دن کے وقفے سے آ کر میرا علاج کرنے لگا۔ اس سے باتیں کرتے رہنے سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ میری امی کتنی باوقار اور باصلاحیت لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ وہ صاحبانِ حیثیت سے علاج اور آپریشن کی فیس لیا کرتی تھیں اور غریبوں کا مفت علاج کیا کرتی تھیں۔

یہ تعریفیں سن کر مجھے احساس نہیں ہوا کہ اپنی ماں کے برعکس دولت کمانے کے لیے ہلاکت خیز واکنگ اسٹک گن بنا سکتا ہوں اور لاکھوں کروڑوں روپے حاصل کرنے کے لیے اس سے بھی زیادہ بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ مجھ جیسے لوگوں کو شاید اس لیے احساس نہیں ہوتا کہ ہم اپنی غلطیوں کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بہت سی کچی پکی مثالیں اور دلائل یاد کر لیتے ہیں۔

تقریباً بارہ دنوں میں زخم بھر گیا۔ میں کالج کے باہر جنگل کی کھلی فضا میں دوڑنے، درختوں پر چڑھنے، چھلانگیں لگانے اور محنت و مشقت والی ورزشیں کرنے لگا۔ امی نے

فون پر بتایا۔ "ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تمہاری توانائی بحال ہوگئی ہے۔ تم نے اس کے سامنے ایک درخت کی موٹی شاخ کو اپنی گردن پر رکھ کر دونوں ہاتھوں کی مدد سے توڑ ڈالا تھا۔"

"جی ہاں امی جان! اب آپ مجھے ان دشمنوں کے نام اور پتے ٹھکانے بتائیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں غصے اور جلد بازی سے کام نہیں لوں گا۔"

"میں ابھی بتاؤں گی۔ پہلے تم بتاؤ' کن لوگوں سے تمہاری دشمنی تھی۔ دشمن کوئی ایک نہیں ہوگا۔"

"ایک ہوتا تو اپنی قبر میں پہنچ چکا ہوتا۔ وہ تعداد میں چھ تھے۔ ایک پولیس انسپکٹر دوسرا ایک گاہک تھا' جو میرے پاس ایک گن بنوانے آیا تھا اور باقی چار کلاشنکوف بردار غنڈے تھے۔"

میں نے امی کو پوری تفصیل بتائی۔ انہوں نے تمام واقعات سننے کے بعد کہا۔ "اگر تم گالیاں سن کر مشتعل نہ ہوتے۔ حالات کے مطابق برداشت کرتے تو پھر بعد میں ان سے نمٹ سکتے تھے۔ کیا تم اعتراف کرتے ہو کہ تمہارے غصے اور جوش و جنون نے تمہیں موت کے منہ میں پہنچا دیا تھا۔"

"میں مانتا ہوں۔ پہلے آپ کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرتا تھا۔ اب آپ کے سمجھانے سے عقل آگئی ہے کہ طوفان کی آمد سے قبل سمندر کی لہریں پُرسکون ہوجاتی ہیں۔ مجھے بھی طوفان بننے سے پہلے پُرسکون رہنا چاہیے۔"

"شاباش! یہ ہمیشہ یاد رکھو' جتنے سکون اور سنجیدگی سے ٹھنڈے اور خاموش رہو گے' اتنی ہی ذہانت سے کام لینے کے منصوبے ذہن میں آتے رہیں گے۔"

"میں خاموش' سنجیدہ اور پُرسکون رہا کروں گا۔ آپ مجھے ان دشمنوں کے نام اور پتے بتائیں۔"

"میں نے اپنے دشمنوں کے معاملے میں بائیس برس سے کلیجے پر پتھر رکھا ہوا ہے' ایک آدھ مہینے اور صبر کرلوں گی۔ پہلے تمہیں عملی طور پر آزماؤں گی۔ یہ دیکھوں گی کہ جنہوں نے تمہیں ماں کی گالیاں دیں اور اپنی دانست میں تمہیں ہلاک کرکے جنگل میں پھینک گئے' ان سے تم اس طرح انتقام لو کہ پولیس والوں کو تمہارے خلاف کبھی کوئی ثبوت نہ ملے۔ اس کا ایک ہی راستہ ہے۔ ٹھنڈے دماغ سے حکمت عملی اختیار کرتے رہو۔"

"آپ مجھے آزمانا چاہتی ہیں۔ میں آزمائش پر پورا اترنے کے لیے کاٹیج کو لاک کرکے جارہا ہوں۔"

"ابھی رات کو نہ جاؤ۔ کل صبح اسپتال کا ڈرائیور میری کار لائے گا' اس کے ڈیش بورڈ میں تمہارے نام کار لائسنس اور ایک ریوالور ہے۔ اس ریوالور کا لائسنس بھی تمہارے نام پر ہے۔"

"تعجب ہے امی جان! آپ نے تنہا یہ سارا کام کیسے کرالیا۔"

"بیٹے! تمہاری ماں کوئی گمنام لیڈی ڈاکٹر نہیں ہے۔ یہاں سے اسلام آباد تک بڑے بڑے سرکاری عہدیداروں کو اور ان کی فیملی ممبرز کو پیچیدہ امراض سے نجات دلاتی آئی ہوں۔ سب میرے احسان مند رہتے ہیں اور میری قدر کرتے ہیں۔"

"مجھے فخر ہے کہ میں ایک عظیم ماں کا بیٹا ہوں۔"

"ایک دن آئے گا' جب میں بھی تمہاری عظمت پر فخر کروں گی۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ میں سوچنے لگا کہ اپنے دشمنوں سے کس طرح باری باری رابطہ کیا جائے۔ میں ان چار کلاشنکوف بردار غنڈوں کے نام اور پتے نہیں جانتا تھا۔ جو شخص مجھ سے واکنگ اسٹک گن بنوانے آیا تھا' اس نے اپنا نام برکت علی بتایا تھا۔ ہوسکتا ہے یہ فرضی نام ہو۔ خطرناک کام کرانے والے اپنی اصلیت چھپایا کرتے ہیں۔

میں نے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں اس پولیس اسٹیشن کا نمبر تلاش کیا جہاں مجھے گرفتار کرکے لے جایا گیا تھا۔ وہاں کا نمبر مل گیا۔ میں نے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے کسی حوالدار نے کہا۔ "الٰہی بخش بول رہا ہوں۔ آپ بولیں کون ہیں۔ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں انسپکٹر کلیم بخاری کو ایک ضروری پیغام دینا چاہتا ہوں۔ ان سے بات کراؤ۔ پیغام بہت ضروری ہے۔"

تھوڑی دیر بعد دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ "ہیلو۔ میں انسپکٹر کلیم بخاری بول رہا ہوں۔ تم کون ہو؟ کیا پیغام دینا چاہتے ہو؟"

میں اس کم ظرف کی آواز لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ اس کی زبان سے نکلی ہوئی گالیاں اس وقت بھی مجھے بندوق کی گولیوں کی طرح چھلنی کررہی تھیں لیکن میں غصہ برداشت کررہا تھا۔ یہ میری امی کی دانش مندی تھی۔ وہ مجھے آزمائشوں سے گزرنا سکھا رہی تھیں۔

میں نے کہا۔ "جناب عالی! آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں آپ کو جانتا ہوں۔ جب آپ فرمان کو گرفتار کرکے لے جارہے تھے تو اس بھیڑ میں' میں بھی تھا۔ میں نے اس وقت نہیں بتایا کہ جو چیز اس کی دکان میں تلاش کی جارہی ہے' وہ میرے پاس ہے۔"

اس نے جلدی سے پوچھا۔ "کیا وہ گن تمہارے پاس ہے؟ تم نے یہ بات ہم سے

کیوں چھپائی؟"

"جناب عالی! فرمان نے اس گن کو امانت کے طور پر رکھنے کو دیا تھا۔ اب اتنے دن گزر گئے ہیں' وہ لوٹ کر نہیں آیا ہے۔ میں سوچتا ہوں شاید کسی نے اسے قتل کردیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس گن کی وجہ سے مجھ پر بھی مصیبت نہ آجائے۔"

"تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔ تم پر مصیبت آسکتی ہے۔ اس گن کو تھانے لے آؤ۔"

"جناب عالی! اگر فرمان مرچکا ہے تو میں اس کی آخری خواہش پوری کروں گا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ایک ہفتے تک واپس نہ آئے تو میں اس گن کو اسی گاہک کے حوالے کردوں جس نے اپنا نام برکت علی بتایا تھا۔"

"اس کا نام برکت علی نہیں' انعام ربانی ہے۔ میں اسے تھانے بلا رہا ہوں۔ تم بھی گن لے کر یہاں آجاؤ۔"

"نہیں سرجی! پہلے میں اس سے تنہائی میں ملوں گا۔ فرمان نے کہا تھا جس کی امانت ہے' اس کو دی جائے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کا نام انعام ربانی ہے مگر میں اسے چہرے سے پہچانتا ہوں۔ فرمان نے کہا تھا کہ انعام ربانی رازداری سے گن حاصل کرے گا اور اس گن کو پولیس والوں کے ہاتھ نہیں لگنے دے گا۔"

"اور یہ بات تم پولیس والے کو بتا رہے ہو اور ہم سے اس گن کو چھپانا بھی چاہتے ہو۔"

"میں مجبور ہوں۔ انعام ربانی کا پتا ٹھکانا نہیں جانتا۔ اس کا فون نمبر بھی نہیں جانتا ہوں۔ صرف آپ ہی کے ذریعے اس سے رابطہ ہوسکتا ہے۔"

"ہوں۔ تو پھر ٹھیک ہے۔ میں ابھی ربانی سے بات کرتا ہوں۔ وہ تم سے رابطہ کرے گا۔ اپنا فون نمبر بتاؤ۔"

"میں غریب آدمی ہوں۔ میرے گھر میں فون نہیں ہے۔ میں ابھی پی سی او سے بول رہا ہوں۔"

"سمجھ گیا۔ تم بہت چالاک اور محتاط ہو کوئی بات نہیں۔ آدھے گھنٹے بعد فون کرو۔ میں پہلے ربانی سے بات کروں گا۔ پھر اس کا فون نمبر بتاؤں گا۔"

میں نے فون بند کردیا۔ آدھے گھنٹے بعد پھر انسپکٹر سے رابطہ کیا۔ اس نے کہا۔ "میں نے ربانی سے بات کی تھی۔ اس نے کہا ہے کہ میں تمہیں اس کا فون نمبر بتادوں۔ تم نمبر نوٹ کرو۔"

میں نے اس کے بتائے ہوئے نمبروں کو نوٹ کیا پھر رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے

آواز آئی۔ "ہیلو' کون ہے؟"

"میں انعام ربانی بول رہا ہوں۔ کیا تم وہی ہو جس نے ابھی انسپکٹر کلیم بخاری سے بات کی تھی۔"

"ہاں میں تو وہی ہوں لیکن تم انعام ربانی نہیں ہو۔ مجھے دھوکا کیوں دے رہے ہو؟"

"یہ کیا بکواس ہے۔ جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں ربانی ہوں تو تمہیں یقین کیوں نہیں آرہا ہے؟"

"اس لیے کہ میں ربانی کو اس کے چہرے اور آواز سے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔"

دوسری طرف سے فون بند کردیا گیا۔ انسپکٹر کلیم بخاری کی چال سمجھ میں آگئی۔ وہ انعام ربانی کی لاعلمی میں اس غیر معمولی واکنگ اسٹک گن کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے پندرہ منٹ کے بعد فون پر کہا۔ "جناب انسپکٹر صاحب! اس گن کے سلسلے میں ربانی سے آپ کا لین دین ہوسکتا ہے۔ رشوت کی جو رقم طے ہوئی ہے' وہ آپ ربانی سے لیں لیکن کسی جعلی ربانی کے ذریعے مجھے دھوکا نہ دیں۔"

"تم ضرورت سے کچھ زیادہ چالاک ہو۔ میں ربانی سے اپنا حصہ وصول کرلوں گا۔ اس کا نمبر نوٹ کرو۔"

اس بار انسپکٹر نے صحیح نمبر بتایا تھا۔ رابطہ ہونے پر دوسری طرف سے ربانی کی آواز سنائی دی۔ میں نے اسے بتایا کہ فرمان دس بارہ دن سے لاپتا ہے۔ اس کی امانت میرے پاس ہے مگر وہ ایک ایسی گن ہے جسے میں نے انسپکٹر کلیم بخاری کو بھی دینے سے انکار کردیا ہے۔ ربانی کو یہ بھی بتایا کہ انسپکٹر کس طرح فراڈ کرکے وہ گن مجھ سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔

ربانی نے کہا۔ "تم واقعی امین ہو۔ میری امانت مجھے دینا چاہتے ہو۔ یہ بتاؤ' میری امانت کب دوگے اور کہاں دوگے؟"

"جناب بڑی رازداری کی چیز ہے۔ آپ کوئی محفوظ جگہ بتائیں میں اسے وہاں لے آؤں گا۔"

"یہ تو تم میرے تحفظ کی بات کررہے ہو۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ تم اجنبی ہو' میں کس طرح تم پر بھروسا کروں؟ اب تو بھروسا ہی بھروسا ہے۔ تم میری کوٹھی میں آجاؤ۔"

اس نے شادمان ٹاؤن کا پتا بتایا۔ میں نے کہا۔ "جناب! ایک عرض ہے۔ میں امانت واپس کرنے کا صلہ نہیں چاہتا مگر بہت غریب ہوں۔ اپنی بیمار بیوی کے لیے پانچ سو روپے

کی ضرورت ہے۔ اگر آپ پانچ سو روپے......"

اس نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ایک زوردار قہقہہ لگایا پھر کہا۔ "پانچ سو؟ تم میرا اتنا بڑا کام کر رہے ہو اور پانچ سو مانگ رہے ہو؟ یہ پانچ سو کیا ہوتے ہیں؟ میں تمہیں پانچ ہزار روپے دوں گا۔ بولو کب آ رہے ہو؟ میں بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔"

"رات کا وقت ہے۔ اتنا بڑا تھیلا اٹھا کر لاؤں گا تو راستے میں پولیس والے چیک کریں گے۔ میں کل دن کے گیارہ بجے اپنی بیوی کو اسپتال میں داخل کر کے ایک بجے تک آپ کے پاس آؤں گا۔"

تمام باتیں طے ہوگئیں۔ فون بند ہوگیا۔ میں نے مطمئن ہو کر سوچا۔ امی جان درست کہتی ہیں۔ میں نے دماغ کو ٹھنڈا رکھا اور نہایت سکون اور اعتماد سے باتیں کرتا رہا اور ایسی باتیں بناتا رہا کہ اب وہ مجھ پر اندھا اعتماد کرے گا۔ کسی طور بھی مجھ سے دشمنی کی توقع نہیں کرے گا۔

میں نے کاٹیج میں آنے کے بعد شیو نہیں کیا تھا۔ بارہ دنوں میں داڑھی اور مونچھیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ دوسرے دن صبح میں نے شیو نہیں کیا' داڑھی اور مونچھوں کو خوب صورتی سے تراشا۔ سر کے بال بھی شانوں تک بڑھے ہوئے تھے۔ ڈرائیور کار لے کر آگیا تھا۔ میں نے کار کا اور ریوالور کا لائسنس نکال کر چیک کیا۔ پھر ڈرائیور سے کہا ایک کمرے میں کپڑے کا بڑا سا تھیلا ہے جس میں کاٹھ کباڑ بھرا ہوا ہے۔ اسے لے آؤ اور کاٹیج کو لاک کر دو۔"

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ تھیلا لے کر کار میں آگیا۔ میں نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ اس نے پوچھا۔ "سر! اس تھیلے میں یہ کاٹھ کباڑ کہاں لے جا رہے ہیں؟"

"یہ کسی کی امانت ہے۔ اسے لوٹانے جا رہا ہوں کیا تم اسپتال میں ملازمت کرتے ہو؟"

"نہیں سر! میں آپ کی والدہ کا خاص ملازم ہوں۔ آپ مجھے ان کا باڈی گارڈ بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں تربیت یافتہ سیکورٹی گارڈ ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے' امی جان خود کو محفوظ نہیں سمجھتی ہیں۔"

"جی ہاں۔ ان کا پیشہ ہی ایسا ہے۔ بہت مشہور لیڈی سرجن ہیں۔ بعض اوقات ایسے خطرناک مجرم ان کے پاس آتے ہیں جو انہیں گن پوائنٹ پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کے کسی زخمی ساتھی کا آپریشن کریں اور اس کے جسم سے گولی نکالیں۔"

"میری امی کو مجبور کرنے والے مجرم میرے سامنے آجائیں تو میں اس طرح انہیں گولیوں سے چھلنی کر دوں گا کہ وہ آپریشن کے قابل ہی نہیں رہیں گے۔"

"سر! آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ کی والدہ موم کی بنی ہوئی ہیں۔ میں پندرہ برسوں سے ان کے ساتھ ہوں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ دشمنوں کے لیے کتنی خطرناک ہیں۔ وہ حالات سے سمجھوتا کر کے پہلے ایک کمزور سی عورت بن جاتی ہیں۔ بڑے سکون سے دشمنوں کے احکامات کی تعمیل کرتی ہیں۔ بعد میں بڑی سفاکی سے ایک ایک دشمن کو جہنم میں پہنچا دیتی ہیں۔"

میں حیرانی سے سن رہا تھا۔ میری امی کا ایک خطرناک روپ میرے سامنے آ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "تم ان کے سیکورٹی گارڈ ہو۔ ان کے لیے تم کیا کرتے ہو؟"

"میں ان کے ایک ایک اشارے کو سمجھتا ہوں۔ ان پر مصیبت آئے تو وہ خفیہ سگنل دیتی ہیں۔ سر کھجاتی ہیں یا رومال سے چہرہ پونچھتی ہیں۔ میں انہیں مصیبت میں چھوڑ کر چلا جاتا ہوں۔ بعد میں وہ مجھے گائیڈ کرتی ہیں کہ کس طرح دشمنوں سے انتقام لینا ہے اور انہیں ابدی نیند سلانا ہے۔"

"کیا امی نے میرے بارے میں تمہیں ہدایات دی ہیں؟"

"جی ہاں۔ مجھے حکم دیا ہے کہ شہر پہنچ کر کار سے اتر جاؤں۔ آپ کو تنہا چھوڑ دوں۔"

اس نے شہر پہنچ کر واقعی میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ میں نے شادمان پہنچ کر سنسان جگہ کار روک دی۔ سائلنسر لگا ہوا ریوالور کاٹھ کباڑ میں ڈال کر تھیلا لے کر باہر آگیا۔ کار کو لاک کر کے شادمان کے علاقے میں جانے لگا۔ امی نے میرے پہننے کے لیے چند جوڑے بھیجے تھے۔ ایک ہفتے پہلے اتارا ہوا ایک میلا جوڑا میرے جسم پر تھا تاکہ میں غریب نظر آؤں۔ وہ میرے بارے میں جیسا سوچ رہا ہوگا' ویسا ہی دکھائی دوں۔

کوٹھی کا بڑا آہنی گیٹ بند تھا۔ ایک ملازم نے آ کر پوچھا۔ "تم کون ہو' کس سے ملنا چاہتے ہو؟"

"ویسے تو میرا نام بندے علی ہے مگر ربانی صاحب سے بولو۔ ایک امین ان کی امانت واپس کرنے آیا ہے۔"

"آجاؤ۔ صاحب نے کہا تھا کہ کوئی بڑا سا تھیلا لے کر آئے تو اسے آنے دیا جائے۔"

اس نے گیٹ کھول دیا۔ میں سکڑا سمٹا ہوا' احساس کمتری میں مبتلا ہونے والے

غریب کی طرح چلتا ہوا احاطے سے گزر کر کوٹھی کے اندر آیا۔ کوریڈور میں ایک مسلح گارڈ کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ "تھیلا دکھاؤ مجھے چیک کرنے دو۔"

میں نے پوچھا۔ "ربانی صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ اوپر ایک کمرے میں ہیں۔ تم پہلے تھیلا دکھاؤ۔"

میں نے تھیلے کو اس کے قدموں کے پاس پھینک دیا۔ وہ جیسے ہی اسے اٹھانے کے لیے جھکا' میں نے کراٹے کا ایک ہاتھ اس کی گردن پر رسید کیا۔ اس نے رسید وصول کی اور فرش پر اوندھے منہ گر پڑا۔ میں نے اچھل کر ایک پیر موڑتے ہوئے اس کی گردن پر گھٹنے کی ضرب لگائی۔ اس کے منہ سے ایک کراہ نکلی۔ پھر وہ بالکل ساکت ہو گیا۔ میرے پاس یہ دیکھنے کے لیے وقت نہیں تھا کہ وہ بے ہوش ہو چکا ہے یا مر چکا ہے۔ میں نے اپنی تسلی کے لیے اس کے سر کو دونوں ہاتھوں کے شکنجے میں لیا اور پھر ایک زور کا جھٹکا دے کر سر کو گھمایا۔ شکنجے میں ہڈی کی کڑک سنائی دی۔ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔

وہ ان چار غنڈوں میں سے ایک تھا' جنہوں نے گالیاں دی تھیں۔ میں تھیلا اٹھا کر کوریڈور سے گزرتا ہوا ایک زینے کے پاس آیا۔ پھر دبے قدموں اوپر چڑھتا ہوا ایک بالکونی میں پہنچا۔ ایک کمرے کی کھڑکی اور دروازہ دکھائی دیا۔ میں نے کھڑکی کے قریب آکر پردے کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا' انعام ربانی ایک صوفے پر بیٹھا انگوروں کا گچھا اٹھائے ایک ایک دانہ کھا رہا تھا۔ اس کے پیچھے دو گارڈز کلاشنکوف لیے کھڑے تھے۔ وہ وہی غنڈے تھے جنہوں نے کلاشنکوف کے دستوں سے مجھ پر تابڑ توڑ حملے کیے تھے پھر ایک نے مجھے گولی ماری تھی۔

ان میں سے ایک نے کہا۔ "باس! وہ گیٹ سے اندر آگیا تھا۔ مگر ابھی تک اوپر نہیں آیا۔"

ربانی نے کہا۔ "نیچے اس کا تھیلا چیک کیا جارہا ہوگا۔ وہ کوئی غریب سا آدمی ہے' خطرناک نہیں ہے۔ پھر بھی احتیاط لازمی ہے۔"

کھڑکی کی چوکھٹ پر لوہے کی جالی تھی۔ میں نے سائلنسر لگے ہوئے ریوالور کی نال کو جالی کے اندر کیا۔ اسی وقت ایک گارڈ نے میری طرف چونک کر دیکھا۔ میں نے ٹریگر دبا دیا۔ کھٹ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ اس گارڈ کی پیشانی میں سوراخ ہو گیا۔ لہو کا ایک باریک سا فوارہ نکل پڑا۔ دوسرے گارڈ نے چونک کر اپنے ساتھی کو دیکھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کھڑکی طرف دیکھتا' میری دوسری گولی اس کے سینے کے پار ہو گئی۔ دونوں گارڈز ربانی کے دائیں اور بائیں اوندھے منہ صوفے پر گرے۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پہلے اس

نے حیرانی اور خوف سے کھڑکی کی طرف دیکھا پھر دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھل گیا۔ اس نے میرے ہاتھ میں سائلنسر لگا ہوا ریوالور دیکھ کر سہم کر پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

"میری داڑھی اور مونچھوں کو نظر انداز کرکے دیکھو اور میری آواز پہچانو۔ میں وہی مُردہ ہوں جسے تم جنگل میں پھینک آئے تھے۔"

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھا پھر خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "تم' تم زندہ ہو؟"

میں نے اسے ایک ہاتھ سے کھینچ کر ایک جھٹکے سے دوسری طرف گھما کر اس کی گردن دبوچ لی پھر اس سے پوچھا۔ "میں نے تمہارے ان تینوں گارڈز کو ختم کر دیا ہے۔ وہ گالیاں دینے والا چوتھا گارڈ کہاں ہے؟"

میں کن انکھیوں سے دائیں بائیں اور سامنے دیکھتا جارہا تھا۔ سامنے ایک آئینے میں وہ چوتھا گارڈ نظر آیا۔ میں نے اسے دیکھنے میں دیر کی۔ اب بازی اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ مجھے کلاشنکوف سے چھلنی کر چکا ہوتا لیکن اس سے پہلے اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ کلاشنکوف ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور وہ اوندھے منہ فرش پر گر پڑا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے سے لہو بہہ رہا تھا۔

اسے مارنے والا میرا دشمن نہیں ہو سکتا تھا پھر بھی میں نے پوچھا۔ "کون ہے' باہر کون ہے؟"

مجھے امی کی آواز سنائی دی۔ "سپاہی پرچم لے کر چلتا ہے۔ تمہارے ساتھ ماں کا آنچل ہے۔ اب یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ایک ہی دشمن تمہارے شکنجے میں رہ گیا ہے۔ میں جارہی ہوں۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ میرے اتنے قریب تھیں اور میں انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ان سے جو وعدہ کیا تھا' اس پر مجھے قائم رہنا تھا۔ میں نے ربانی کو گن پوائنٹ پر رکھ کر اس کی تلاشی لی۔ لباس کے اندر سے ایک ریوالور برآمد ہوا۔ میں نے اس ریوالور کے چیمبر کو نکال دیا پھر اس سے کہا۔ "گالیاں دینے والے چار گئے' دو رہ گئے ہیں۔ تم اور انسپکٹر کلیم بخاری۔ چلو اب گالیاں دو۔"

وہ گڑگڑانے لگا۔ "مجھے معاف کردو۔ مجھے زندہ رہنے دو۔"

"تم نے میری جس ماں کو گالیاں دی تھیں' اس کی آواز ابھی تم نے سنی ہے اور تم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اس نے ایک گالی دینے والے کو زندہ نہیں چھوڑا پھر میں تمہیں کیسے چھوڑ دوں؟"

"مجھے ایک بار زندہ رہنے کا موقع دو۔ میں تمہارے بہت کام آؤں گا۔ میں ایک سیاست داں کا راز دار سیکورٹی افسر ہوں۔ میں نے اسی سیاست داں کی سیکورٹی کے لیے تم سے وہ واکنگ اسٹک گن بنوائی تھی اور ایک درجن گن بنوانے کے لیے اس سے پانچ لاکھ روپے لیے تھے۔ میں وہ پانچ لاکھ بھی تمہیں دے دوں گا۔"

اس نے سیاست داں کا نام بتایا۔ میں نے پوچھا۔ "بس یہی راز ہے؟"

"اور بھی کئی راز ہیں۔ ایک مشہور طوائف کے ساتھ اس کی تصویریں ہیں۔ چھ ماہ پہلے یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ طوائف اسرائیلی تنظیم موساد کی جاسوسہ ہے۔ اس کی گرفتاری کے لیے وارنٹ جاری ہوا تھا لیکن وہ فرار ہوگئی۔ پولیس اسے گرفتار نہ کر سکی۔ شاید وہ ملک سے باہر چلی گئی ہے۔ اگر اس طوائف کے ساتھ اس سیاست داں سلیم کامران کی تصویر منظرِ عام پر آگئی تو اسے بھی موساد کا ایجنٹ سمجھا جائے گا۔ اس کی سیاست خاک میں مل جائے گی۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ تصویریں کہاں ہیں؟"

"وہ دوسرے کمرے میں میری الماری کے اندر ہیں۔"

میں اسے دھکے دیتا ہوا دوسرے کمرے میں لے آیا۔ اس نے الماری کھولتے ہوئے پوچھا۔ "تم میری جان بخش دو گے نا؟ ابھی جتنا کام آرہا ہوں' آئندہ اس سے بھی زیادہ کام آؤں گا۔"

اس نے الماری کھولی۔ الماری کے اندر ایک سیف تھا۔ اسے بھی کھولا۔ سیف کے اندر کئی بڑے لفافے تھے۔ اس نے بتایا کہ لفافے میں تصویریں اور ان کے نیگٹو ہیں۔ دوسرے لفافوں میں تین بڑے سرکاری عہدے داروں کی قابلِ اعتراض تصویریں تھیں۔ میں نے تمام لفافوں کو اور بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیوں کو اٹھا لیا۔ پھر اس سے کہا۔ "چلو اپنے ٹیلی فون کے پاس چل کر بیٹھو۔"

وہ میرے حکم کے مطابق ٹیلی فون کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا انسپکٹر کلیم بخاری کو فون کرو۔ اسے بتاؤ کہ میں زندہ ہوں اور مجھے موت کے منہ میں پہنچانے والوں کو کس طرح کتوں کی موت مار رہا ہوں۔ اسے کہنا کہ میں نے تمہیں راوی روڈ کے ایک خالی مکان میں ٹریپ کیا ہے اور میں اس مکان سے نکل کر سیدھا اس کے پاس پہنچنے والا ہوں۔"

وہ نمبر ڈائل کرنے لگا۔ میں نے فون کا وائڈ اسپیکر آن کردیا۔ رابطہ ہوتے ہی انسپکٹر کلیم بخاری کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو' میں انسپکٹر بخاری بول رہا ہوں۔"

"میں ربانی ہوں۔ بخاری صاحب بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ وہ فرمان علی جسے ہم مُردہ سمجھ کر جنگل میں پھینک آئے تھے۔ وہ زندہ ہوگیا ہے۔"

"کیسی بات کررہے ہو۔ اسے تو کلاشنکوف کے دستوں سے اتنا مارا گیا ہے کہ جنگل کا شیر بھی اتنی مار کھاتا تو مرجاتا پھر اسے گولی بھی ماری گئی تھی۔"

"یہاں اس کہاوت پر ایمان لے آئیں جسے اللہ.......... رکھے اسے کون چکھے' وہ زندہ ہے۔ اس نے ان چاروں گارڈز کو ہلاک کر دیا ہے جنہوں نے اسے گالیاں دی تھیں۔ گالیاں میں نے بھی دی تھیں اور تم نے بھی۔ میری موت ٹل جائے گی کیونکہ میں فرمان علی کو فائدہ پہنچانے والا سودا کرچکا ہوں مگر تم نہیں بچو گے۔ وہ تمہاری طرف آنے والا ہے۔"

انسپکٹر نے حقارت سے کہا۔ "میں بزدل ہوتا تو پولیس کے محکمے میں نہ آتا۔ اسے آنے دو۔ میں اسے حوالات میں بند کرکے تشدد کروں گا۔"

"بخاری صاحب! اس نے بھرے مجمع میں آپ کو زخمی کیا تھا اور آپ کی گردن دبوچ لی تھی۔ آپ کے چھ سپاہی بھی آپ کو اس کے شکنجے سے نہیں چھڑا سکے تھے۔ اب تو وہ زخمی شیر ہے۔ آپ کو پھاڑ کر کھا جائے گا۔"

"دیکھو ربانی! ایک مُردہ زندہ نہیں ہوسکتا۔ تم یہ باتیں چھوڑو اور اس واکنگ اسٹک گن کے سلسلے میں تم نے سلیم کامران سے جو بڑی رقم لی ہے' اس میں سے میرا حصہ دے دو۔"

اسپیکر آن تھا اس لئے میں نے کہا۔ "میں ایک عام سا پُرامن شہری تھا تم نے ربانی سے رقم لینے کے لئے مجھے کسی جرم کے بغیر گرفتار کیا۔ پھر مجھ پر اتنے ستم توڑے کہ مجھے زندہ سے مُردہ بنا دیا۔ اب یہ مُردہ زندہ ہوکر پوچھ رہا ہے' کیا ربانی سے اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے تم زندہ رہ سکو گے؟"

کلیم بخاری کو چپ سی لگ گئی۔ چند لمحوں تک وہ شاید حیران اور پریشان رہا پھر بولا "میں آواز پہچان رہا ہوں۔ تم فرمان علی ہو۔ ربانی بھی یہی کہہ رہا ہے مگر پھر بھی یقین نہیں آرہا ہے۔ تم زندہ کیسے ہوگئے؟"

"میں نے تمہیں سمجھایا تھا۔ وارننگ دی تھی کہ مجھے ماں کی گالی نہ دینا۔ اگر دو گے تو میں مرتے مرتے بھی تمہیں لے مروں گا۔ اب تمہارے مرنے کی باری ہے۔ چار تو ختم ہوچکے ہیں۔"

"میری بات سنو فرمان! محبت اور جنگ میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ جس طرح ربانی سے

تم نے سمجھوتا کیا ہے' اسی طرح مجھ سے کرو۔ میں جب تک اس تھانے میں رہوں گا' تمہیں اس علاقے کا دادا بنا کر رکھوں گا۔ تم جیسا بھی غیر قانونی دھندا کرو گے۔ میں تمہارے خلاف کبھی کوئی قانونی کارروائی نہیں کروں گا۔"

"اگر میں تمہارے جیسے تھانے دار کو قتل کردوں تو علاقے میں میری اور زیادہ دھاک بیٹھے گی۔ آئندہ آنے والے پولیس افسران بھی فرمان دادا کو سلام کیا کریں گے۔"

میں نے ریوالور سے سائلنسر نکال کر کہا۔ "انسپکٹر! ربانی نے مجھ سے جان چھڑانے کے لیے سیاست داں سلیم کامران کے کچھ اہم راز ثبوت کے ساتھ دیئے ہیں اور تین اعلیٰ سرکاری عہدے داروں کے خلاف بھی تصویری ثبوت مجھے دیئے ہیں۔ میں نے اس کے سیف سے پانچ لاکھ روپے سے بھی زیادہ رقم لے لی ہے لیکن اس کے بعد بھی ربانی زندہ نہیں رہے گا۔"

ربانی خوف سے چیخ کر بولا۔ "فرمان بھائی! یہ کیا کہہ رہے ہو۔ میں آئندہ بھی تمہیں فائدے........."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے میں نے ریوالور سے اس کے منہ پر ضرب لگائی۔ وہ تکلیف سے چیخ پڑا۔ میں نے کہا۔ "کتے! تو ساری دنیا کی دولت میرے قدموں میں لا کر رکھ دے لیکن میری ماں کو گالیاں دینے کے بعد ماں کی عظمت کہاں سے لائے گا۔ تجھے بھی مرنا ہے اور انسپکٹر کو بھی مرنا ہے۔ لے انسپکٹر آواز سن۔"

یہ کہتے ہی میں نے ربانی کو گولی مار دی۔ ٹھائیں کی زور دار آواز فون کے ذریعے انسپکٹر تک پہنچ گئی۔ تھوڑی دیر تک گہری خاموشی رہی پھر انسپکٹر کی آواز آئی۔ "ہیلو ربانی! میری بات کا جواب دو۔ یہ فائرنگ کی آواز کیسی تھی۔ تم زندہ ہونا؟ ہیلو۔ ہیلو........."

میں نے کہا۔ "مُردے کو ہلو ہلو بولو گے تو وہ نہیں ہلے گا۔ تم نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ وہ گولی ربانی کو کھا گئی ہے۔ موت ازل سے انسانوں کو کھا رہی ہے۔ اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ یہ موت اگلی دعوت پر تمہارے پاس آرہی ہے۔"

میں نے بٹن دبا کے اسپیکر آف کردیا۔ جو کچھ ربانی کے سیف سے حاصل کیا تھا' اسے لے کر جانے لگا۔ اسی وقت میرے موبائل سے بزر کی آواز ابھری۔ میں نے موبائل کو آن کرکے پوچھا۔ "ہیلو امی! آپ ہیں؟"

"ہاں بیٹے! کام ہوگیا؟"

"جی ہاں۔ صرف انسپکٹر رہ گیا ہے۔"

"میں نے جو ریوالور تمہیں دیا ہے' اس پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات مٹا کر ریوالور

کو وہیں لاش کے پاس پھینک دو۔ میں نے پچھلے دن کی تاریخ میں اس ریوالور کی گمشدگی کی رپورٹ درج کردی ہے' دیر نہ کرو۔ فوراً وہاں سے نکلو اور اپنے کاٹیج واپس جاؤ۔"

میں نے ریوالور کو رومال سے اچھی طرح صاف کیا پھر اسے وہیں پھینک کر اس کوٹھی سے باہر آگیا۔ مجھے کوئی دیکھنے اور روکنے والا نہیں تھا۔ میں تیزی سے چلتا ہوا اپنی کار میں آکر بیٹھ گیا۔ شہر سے دور اپنے کاٹیج کی طرف جانے لگا۔ اسی وقت پھر امی نے فون پر کہا۔ "میرا وہ باڈی گارڈ مراد چنگیزی جو تمہارے ساتھ کاٹیج سے شہر آیا تھا' وہ مال کے لائٹ اینڈ شیڈ فوٹو گرافر کی دکان پر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ وہاں جاؤ اور پاسپورٹ کے لیے اپنی تصویریں اتروا لو۔ تمہیں کچھ دنوں کے لیے ملک سے باہر جانا ہے۔"

"کیوں جانا ہے؟ میں پہلے ان دشمنوں سے نمٹنا چاہتا ہوں جو آپ کو ناحق بدنام کرتے رہے تھے۔"

"بیٹے! تمہاری ماں کمزور نہیں ہے۔ میں اس دشمن کو الٹا لٹکا چکی ہوتی۔ وہ دوبار میرے نشانے پر آیا مگر بچ کر نکل گیا۔ رُوپوش ہوگیا۔ اب پتا چلا ہے کہ وہ لندن میں ہے۔ اب تو تم ملک سے باہر جاؤ گے؟"

"آپ بہت اچھی ہیں امی۔ میں ضرور جاؤں گا۔"

میں نے اپنی کار مال روڈ کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ "آپ کے پاس اس دشمن کی تصویر ضرور ہوگی؟"

"تصویریں بھی ہیں اور اس کے بارے میں' میں نے اپنی ڈائری میں بہت کچھ لکھا بھی ہے۔ یہ سب کچھ اس سیف میں ہے' جو کاٹیج کے دوسرے کمرے میں ہے۔"

"میں نے وہ سیف دیکھا ہے لیکن وہ مخصوص نمبروں سے کھلتا ہے۔"

"تم نائن زیرو تھری فور سے کھول سکو گے۔"

"امی جان! میں نے کبھی پاکستان سے باہر قدم نہیں رکھا۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میں لندن میں رُوپوش رہنے والے دشمن کو تلاش کرسکوں گا؟"

"مراد چنگیزی گائیڈ بن کر تمہارے ساتھ رہے گا۔"

"تھینک یُو امی جان!"

انہوں نے فون بند کردیا۔ میں فوٹو گرافر کی دکان پر پہنچا تو مراد چنگیزی انتظار کر رہا تھا۔ فوٹو گرافر نے میری کئی تصویریں اتاریں۔ مراد چنگیزی نے اس سے کہا۔ "آج شام تک تصویریں تیار کردو۔ میں آکر لے جاؤں گا۔"

میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "امی جان کہہ رہی تھیں' تم میرے ساتھ لندن

جا رہے ہو۔"

"جی ہاں۔ میں کوشش کروں گا' پرسوں کی فلائٹ میں دو سیٹیں مل جائیں۔"

"پرسوں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "ابھی تو میرا پاسپورٹ بھی نہیں بنا۔"

"آپ کی امی کل ایک دن میں آپ کا پاسپورٹ اور دوسرے اہم کاغذات تیار کرالیں گی۔ آپ سفر کی تیاری کریں۔"

وہ چلا گیا۔ میں کار اسٹارٹ کرکے ڈرائیو کرتے ہوئے سوچنے لگا۔ میری امی ہیں کیا چیز؟ یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ وہ غیر معمولی شہرت حاصل کرنے والی لیڈی سرجن تھیں۔ بڑے بڑے سرکاری عہدے دار ان کے زیر علاج رہ چکے تھے اور ان کی قدر کرتے تھے۔ وہ یقیناً ایک دن میں میرا پاسپورٹ تیار کراسکتی تھیں لیکن تصویر کا دوسرا رخ یہ تھا کہ وہ خطرات سے کھیلنے والی خاتون تھیں۔ میں ان کا نشانہ دیکھ چکا تھا۔ ربانی کی کوٹھی میں انہوں نے مجھ پر حملہ کرنے والے کو گولی ماری تھی۔ نشانہ ایسا پکا تھا کہ دوسری گولی چلانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک ایسی ماں کا بیٹا ہوں گا جو شیطانوں کے لیے موت ہے' ان سے زندگی چھین لیتی ہے اور انسانوں کے لیے مسیحا ہے' پیچیدہ آپریشن کے ذریعے انہیں موت سے چھین کر نئی زندگی دیتی ہے۔

☆======☆======☆

فری نے ہوش میں آکر دیکھا' وہ اسپتال کے ایک کمرے میں تھی۔ جمشید اور شابے بستر کے قریب کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جمشید نے پاس آکر اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں محبت سے لیا پھر پوچھا۔ "کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔ او گاڈ دھماکے کی آواز کیسی خوف ناک تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے سامنے کوئی بم بلاسٹ ہوا ہے۔ وہ کیسا دھماکا تھا جمشید؟"

جمشید نے اس کے ہاتھ تھپتھپا کر کہا۔ "بم کا ہی دھماکا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو ہماری سلامتی منظور تھی۔ دیکھو ہم زندہ سلامت ہیں۔ ہمیں ذرا سی خراش نہیں آئی ہے۔"

"تعجب ہے۔ ہم کیسے بچ گئے؟"

"ہم دکان کے پچھلے حصے میں تھے۔ دھماکا ہوتے ہی میں تمہیں اٹھا کر پچھلے دروازے سے دور چلا آیا تھا۔"

شابے ڈاکٹر کو بلا کر لے آیا۔ ڈاکٹر نے اسے چیک کرنے کے بعد کہا۔ "آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ توانائی محسوس کررہی ہیں نا؟"

"جی ہاں مگر حلق خشک ہو رہا ہے۔"

"آپ کو ٹھنڈا دودھ یا جوس پینا چاہیے۔ اگر گھر جانا چاہیں تو جاسکتی ہیں۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے کاؤنٹر پر آکر اسپتال کا بل ادا کیا۔ پھر ایک قریبی ریستوران میں آکر برگر کے ساتھ تینوں کے لئے جوس کا آڈر دیا۔ فری نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "اتنی دیر ہوچکی ہے۔ ہم آٹھ بجے لبرٹی مارکیٹ آئے تھے اور اب گیارہ بجنے والے ہیں۔ ممی اور ڈیڈی میرے لیے پریشان ہوں گے۔"

جمشید نے کہا۔ "انہیں پریشان ہونے دو۔ آج گھر نہیں جاؤ گی۔"

"کیوں نہیں جاؤں گی؟ کوئی خاص پلاننگ ہے؟"

"ہاں۔ تم نے دیکھا تھا کہ تابانی اور مراد اپنی گاڑی میں ہمارا پیچھا کررہے تھے اور اس بات سے بے خبر تھے کہ شابے اور دلیر خان ان دونوں کا پیچھا کررہے ہیں۔"

"ہاں۔ تابانی اور مراد لبرٹی مارکیٹ تک ہمارے پیچھے آئے تھے۔"

فری نے شابے سے پوچھا۔ تم نے تابانی کو نہیں پکڑا؟"

شابے نے کہا۔ "ہم نے پکڑ لیا ہے۔ وہ ہمارا قیدی ہے۔ دلیر خان اسے لے گیا ہے۔ اسے ایسی جگہ رکھا جائے گا جہاں سے وہ فرار نہیں ہوسکے گا۔"

"وہ ہماری جان لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہی بم کا وہ دھماکا کیا تھا۔"

فری نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا واقعی؟"

"ہاں شابے نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تابانی بھی اسی جیولر کی دکان [illegible] تھا۔ وہاں اس نے شوکیس میں کچھ رکھا۔ شابے کو دور سے نظر نہیں آیا لیکن [illegible] دکان سے نکل کر تیزی سے بھاگتا ہوا شابے کی گاڑی کی طرف آرہا تھا تب ہی [illegible] پاس دھماکا ہوا تھا۔"

جمشید نے کہا۔ "مراد سمجھ رہا ہوگا۔ ہم دونوں مرچکے ہیں۔ اس نے [illegible] اور کچھ تمہارے والدین کو موت کی اطلاع دی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں' مراد کو ہماری موت [illegible] رسان ہوجائے۔ میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔ تم میری امی ابو کے ساتھ رہو گی۔ میں [illegible]' جو کے خلاف کچھ اور ثبوت حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ تم اپنا موبائل فون دو۔"

فری نے اپنا پرس کھولتے ہوئے کہا۔ "تم پر دھماکے کا اثر نہیں ہوا۔ تم اتنے ہوش و حواس میں تھے کہ میری بھی حفاظت کی اور میرے پرس کی بھی۔ آئی لو یو جمشید!"

اس نے پرس سے موبائل فون نکال کراسے دیا۔ وہ فون لے کر نمبر ڈائل کرتا ہوا ریستوران کے باہر ایک تاریک حصے میں آیا پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ "سر! میں جمشید بول

رہا ہوں۔ بہت اہم رپورٹ ہے اس لیے اتنی رات کو زحمت دے رہا ہوں۔ آپ لبرٹی مارکیٹ میں بم دھماکے کی خبر سن چکے ہوں گے۔"

"سن چکا ہوں۔ آگے بولو۔"

"میں اکرام شاہ سابق ایم این اے کی صاحب زادی فرخندہ کے ساتھ اس جیولری کی دکان میں تھا۔ تابانی اور مراد نے ہمیں ہلاک کرنے کے لیے وہ بم دھماکا کیا تھا۔"

آر یو شیور؟"

"میں پورے یقین سے کہہ رہا ہوں۔ ہیرا منڈی کی طوائفوں کی انجمن کا سیکریٹری شعبان عرف شابے چشم دید گواہ ہے۔ اس نے تابانی کو دکان میں بم رکھ کر بھاگتے دیکھا تھا۔ شابے کے ساتھی دلیر خان نے تابانی کو زخمی کر کے قیدی بنالیا ہے۔ میں اس سے تمام حقیقت اگلوانے کی کوشش کروں گا۔"

میں "وہ بم کیسے بلاسٹ ہوا تھا؟"

چلا۔ "سر! وہ ٹائم بم نہیں ہوگا۔ کاؤنٹر میں شوکیس کے قریب تھا۔ وہ ٹائم بم سے ابھرنے ٹک ٹک کی آواز سن سکتا تھا۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مراد کے پاس ریموٹ موت۔ ہوگا۔ جب تابانی دکان سے باہر بھاگتا ہوا دور نکلا تب مراد نے ریموٹ کنٹرول کا ذریعے اسے بلاسٹ کیا ہوگا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں ایسے خطرناک بم اپنے پاس چھپا کر رکھتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ یہ چیزیں اس موبائل دواخانے والی گاڑی میں چھپا کر رکھتے ہوں گے۔ بستر کے اجازت دیں تو میں آج ہی رات بڑی راز داری سے ان کے موبائل دواخانے ہاتھوں میڈیسنس کو چیک کروں۔"

"بڑی ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ مراد کو ذرا بھی شبہ ہوگیا تو وہ گرفت میں آنے سامنے کے تمام قابلِ گرفت دھماکا خیز مادہ اس ایمبولینس سے غائب کردے گا۔"

"میں بڑی ہوشیاری سے کام کروں گا۔ آپ ایک زحمت کریں، اکرام شاہ کی کوٹھی منظ ایک مسلح نائٹ چوکی دار ہے۔ آپ اپنے قابل اعتماد ایک افسر اور سپاہی کو وہاں بھیج کر ں نائٹ چوکی دار کو اپنے پاس بلا کر اسے اپنے اعتماد میں لیں۔ تاکہ وہ صبح سے پہلے اس کوٹھی میں اپنی ڈیوٹی پر واپس آکر مراد اور اکرام شاہ کو یہ نہ بتائے کہ رات کو وہ چند گھنٹوں کے لیے غیر حاضر رہا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ کام ہوجائے گا۔ تم تابانی کو میرے علاقے کے تھانے میں پہنچا دو۔ وہاں اسے کڑی نگرانی میں رکھا جائے گا۔"

وہ فون بند کرکے ریستوران میں آیا پھر فری سے بولا۔ "اب چلو۔ میں تمہیں اپنے گھر پہنچادوں گا۔ پھر شابے کے ساتھ جاکر تابانی کو ایک تھانے میں پہنچانا ہے۔"

انہوں نے برگر اور جوس کا بل ادا کیا پھر ریستوران سے نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ فری گھر نہیں پہنچی تھی۔ اس لیے گھر والے جاگ رہے تھے۔ ماں اس کے لیے رو رہی تھی۔ وہ سب جیولر کی تباہ شدہ دکان تک گئے تھے۔ وہاں بیگم نے اپنی تباہ ہونے والی کار بھی دیکھی تھی۔ بڑی حد تک فری کی موت کا یقین ہورہا تھا۔ دھماکے کے نتیجے میں ہلاک ہونے والوں کے جسموں کے ایسے چیتھڑے اڑے تھے کہ کوئی ثابت اور سالم نہیں رہا تھا۔ کسی کی بھی لاش قابل شناخت نہیں رہی تھی۔

بیگم نے اکرام شاہ سے کہا۔ "پولیس کو اطلاع دی جائے کہ ہماری بیٹی اس دکان میں تھی۔ وہ انکوائری کریں گے۔ ہوسکتا ہے، ہماری بیٹی اس دکان میں نہ گئی ہو۔"

اکرام شاہ نے کہا۔ "میں تمہیں پہلے سمجھا چکا ہوں، جب تک تابانی اور م مہمان ہیں، پولیس کو کسی بھی بہانے سے یہاں نہیں آنا چاہیے۔ پھر وہ جو دھماکا سراسر تخریب کاری ہے۔ ایسے معاملے میں پولیس یہاں نہ آئے تو اس میں ہے۔"

ہے آئندہ
تو نہیں
یجنٹ ان
ہیں۔
سے ملک کا

رخشندہ نے مراد کو بڑے پیار سے دیکھا پھر پوچھا۔ "تم کیا کہتے ہو مراد؟"

وہ بولا۔ "انکل ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں صبح تک انتظار کرنا چاہیے۔ میرا بھی واپس نہیں آیا ہے۔ مگر میں بھی پریشان ہونے کے باوجود صبح تک اس گا۔"

بیگم نے کہا۔ "ہماری ٹوٹی پھوٹی کار وہاں ہے۔ کیا اسے دیکھ کر پولیس انکوائری کے لیے نہیں آئیں گے۔"

اس نے کہا۔ "آنٹی! میں نے وہاں زخمیوں کو طبی امداد پہنچانے کے دوران اور کچھ کی کار کی نمبر پلیٹیں اِدھر اُدھر پڑی دیکھی تھیں۔ انہیں اٹھا کر اپنی گاڑی میں باقی کار اس حد تک جل چکی ہے کہ اب وہ آپ سے منسوب نہیں کی جائے گی۔ فری، جو

رخشندہ نے کہا۔ "ممی! آپ کو بیڈ روم میں جاکر سونے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"میری بچی گھر میں نہیں آئی ہے اور تم کہتی ہو، سو جاؤں؟ کیسے نیند آئے گی تم کیا جانو، میرے اندر بم کے دھماکے ہو رہے ہیں۔"

مراد نے کہا۔ "آنٹی! آپ بہت زیادہ ٹینشن میں ہیں۔ میں آپ کو دو گولیاں دیتا ہوں۔ اسے نگل جائیں۔ آپ اعصابی طور سے پُر سکون رہیں گی۔"

اکرام شاہ نے کہا۔ "مجھے بھی گولیاں دو۔ اس لڑکی نے مجھے ٹینشن میں مبتلا کیا ہے۔ ہزار بار سمجھایا۔ جمشید سے تعلق نہ رکھے مگر ضدی اولاد کو ایک دن اپنے والدین سے نافرمانی کی سزا ملتی ہے۔ خدا کرے' وہ سلامت ہو مگر اسے سزا ضرور ملے۔"

مراد اپنے کمرے سے جاکر چار گولیاں لے آیا۔ رخشندہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مراد نے اسے آنکھ ماری۔ وہ مسکرا کر پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس لے آئی۔ مراد نے دو گولیاں بیگم کو اور دو اکرام شاہ کو دیں۔ انہوں نے پانی سے ان گولیوں کو نگل لیا۔ رخشندہ نے کہا۔ "ڈیڈی! فری کی ایک سہیلی ایسی ہے جس کے گھر میں فون نہیں ہے۔ کیا میں اس کے گھر جاؤں ہو سکتا ہے' فری وہاں ہو۔"

"نہیں رخشی! رہنے دو۔ اتنی رات کو اکیلی کہاں جاؤ گی۔"

یمیہ مراد نے کہا۔ "انکل! میں آپ کی کار میں رخشی کو لے جاؤں گا۔"

میں ام شاہ نے انکار میں ہاتھ ہلا کر کہا۔ "نہیں۔ میں نے پہلے ہی دن تمہیں اور تابانی چلا۔ لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ میری بیٹیوں سے دور رہو گے۔ میری بیٹی اتنی رات کو کہتھ نہیں جائے گی۔"

موت ۔ نے منہ کھول کر جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے تھکن سی ہو رہی ہے۔ رخشی! ذریعے ر بیڈ روم میں چلو۔ آج تم میرے ساتھ سوؤ گی۔"

جھکے ہوئے انداز میں صوفے پر سے اٹھی پھر رخشی کے ساتھ جانے لگی۔ اکرام ڑبڑھتے ہوئے کہا۔ "میں بھی ذرا کمر سیدھی کروں گا۔ بھئی دوا بہت اچھی ہے۔ بستر کے اوس ہو رہا ہے۔"

ہاتھوں میڈب بولتا ہوا' دوسرے بیڈ روم میں چلا گیا۔ مراد تنہا ڈرائنگ روم میں کھڑا "یہ تابانی کے ساتھ انیکسی میں رہتا تھا۔ اس رات تابانی کے نہ آنے سے وہ سامنے کا تھا مگر یہ چاہتا تھا کہ وہ نہ آئے تو اچھا ہے۔ وہ اسے کسی لڑکی سے دوستی نہیں ، تھا۔ اس بات پر دونوں ساتھیوں میں لڑائی بھی ہوتی تھی۔ لاہور آنے کے بعد منظرہ کا جیسے دشمن ہو گیا تھا۔ مراد سے کہہ چکا تھا۔ اگر رخشندہ کو پھانسو گے اور کبھی ہ پاس جاؤ گے تو دوسرے دن گھر والوں کو اس کی لاش ملے گی۔

تابانی بہت بے رحم تھا۔ جسے ناپسند کرتا تھا' اسے بڑی سفاکی سے قتل کر دیتا تھا۔ مراد ں چاہتا تھا کہ اکرام شاہ کے گھر میں رہ کر بات بگڑے۔ اس گھر کی ایک لڑکی قتل ہو اور یجے میں "را" والوں کی طرف سے دونوں کو سزائے موت ملے۔

وہ بڑی دیر تک ڈرائنگ روم میں کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک بیڈ روم

آیا۔ وہاں سے دبے قدموں چلتا ہوا دوسرے بیڈ روم کے دروازے پر آیا۔ وہاں بیگم ایکری نیند میں تھی۔ رخشندہ اس کے پاس لیٹی ہوئی تھی۔ مراد کو دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ بستر ، اتر کر اس کے قریب آئی۔ پھر اس سے کترا کر ایک طرف جانے لگی۔ وہ اس کے آہ چلنے لگا۔ پوری کوٹھی کے اندر پُراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

اس وہ اپنے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر آئی۔ پھر سر گھما کر اسے شوخی سے دیکھتے "تےئ بولی۔ "میرے پیچھے کیوں آ رہے ہو؟"

"وہ قریب آکر بولا۔ "تمہاری ادائیں بلا رہی ہیں۔"

ہے "اگر میں کہوں' باہر جاؤ؟"

"تو اس کا مطلب ہو گا' نہ جاؤں۔ تمہارے کمزور انکار کو اقرار میں بدل دوں۔"

اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔

دوسرے کمرے میں اکرام شاہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اسے "را" کی طرف سے آئندہ الیکشن لڑنے کے لیے ڈیڑھ کروڑ روپے مل چکے تھے لیکن رقم دینے والے یونہی تو نہیں دے دیتے۔ اس کے عوض اپنے ایجنٹوں کے تحفظ کی ضمانت بھی لیتے ہیں اور ایجنٹ ان کے بیڈ روم کے بند دروازوں کے پیچھے ان کی عورتوں سے سود بھی وصول کرتے ہیں۔

کیا ایسے بے شرم سیاست دانوں کے الیکشن جیتنے سے اور حکومت بنانے سے ملک کا مقدر بدل جاتا ہے؟ کیا ایسے راہنماؤں سے قومیں پہچانی جاتی ہیں؟

دلوں کی گندگی' ذہنوں کی ویرانی نہیں جاتی
کب اپنی وضع بدلے گی' یہ حیرانی نہیں جاتی
میری ملت کی طرزِ فکر کب رشکِ جہاں ہوگی
بنا کردار کوئی قوم پہچانی نہیں جاتی

رات سونے کے لیے ہوتی ہے لیکن سارا عالم نہیں سوتا۔ کچھ گناہ کے لیے اور کچھ فرائض کی ادائیگی کے لیے جاگتے ہیں۔ جمشید کے ساتھ انٹیلی جنس کے کئی سراغ رساں اکرام شاہ کی کوٹھی کے احاطے میں آئے تھے۔ وہاں وہ بڑی سی وین کھڑی ہوئی تھی' جو موبائل شفاخانہ اور ایمبولینس کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ جمشید اور ایک سراغ رساں اس گاڑی کو اندر سے اچھی طرح چیک کرنے لگے۔ تین سراغ رساں انیکسی کے کمروں کی تلاشی لینے گئے۔ چار سراغ رساں کوٹھی کا بیرونی دروازہ ایک تار کے ذریعے کھول کر اندر پہنچے۔ وہ سب بڑی خاموشی سے دبے پاؤں چل رہے تھے اور بڑی احتیاط سے تلاشی لے رہے تھے۔

انہوں نے کوٹھی کے اندر دو بیڈ روم میں بیگم اور اکرام شاہ کو گہری میں
تیسرے بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ ایک نے دروازے سے کان لگا کر سنا۔ گھر
دھیمی دھیمی سی آوازیں ٹھہر ٹھہر کر سنائی دے رہی تھیں۔ باتیں صاف سنـ سے
تھیں۔ یہ پتا چل رہا تھا کہ ایک عورت اور ایک مرد بول رہے ہیں۔ پیچھے

اس سراغ رساں نے دروازے کی چٹخنی باہر سے لگا دی۔ باقی جاسوس لگائے بیگم اور اکرام شاہ کے کمروں کی تلاشی لینے لگے۔ بیگم کے تکئے کے نیچے ہو۔ گچھا رکھا ہوا تھا۔ وہاں سے چابیاں نکالتے وقت ایک جاسوس نے محسوس کیا کہ معمولی طور پر گہری نیند میں ہے۔ اس نے بیگم کی کنپٹی پر ریوالور کی نال رکھ کر مگر وہ سوتی رہی۔ دوسرے نے سرگوشی میں کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے' خواب آور گولی کر سو رہی ہے۔“

دوسرے بیڈ روم میں تلاشی لینے والوں نے اکرام شاہ کے بارے میں بھی یہ معلوم کیا۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ کوٹھی میں بیگم' اکرام شاہ' رخشندہ اور مراد ہیں۔ اب بیگم اور صاحب کی گہری نیند سے یہ واضح ہو گیا تھا کہ رخشندہ اور مراد ایک بیڈ روم میں ہیں اور وہ ایک بیڈ روم میں کیوں ہیں' یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی۔

اس موبائل شفاخانے اور ایمبولینس کے نیچے جو چور خانہ بنا ہوا تھا' ان میں سے کئی بم' ریموٹ کنٹرول' دو کلاشنکوف اور دو ٹی ٹی برآمد ہوئے۔ انیکسی سے تابانی اور مراد کے پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات نہیں ملے۔ یہ چیزیں بیگم کے بیڈ روم میں آئرن سیف کے اندر حفاظت سے رکھی ہوئی تھیں۔ چار دن پہلے اکرام شاہ نے ”را“ والوں سے ڈیڑھ کروڑ روپے وصول کیے تھے۔ اس رقم کے تین حصے بیگم' اکرام شاہ اور رخشندہ کے بینک میں جمع کر دیئے گئے تھے۔

اس کا کوئی حساب نہیں تھا اچانک اتنی رقم ان کے پاس کہاں سے آئی تھی۔ ہیرے موتیوں سے جڑے ہوئے زیورات کے دس عدد سیٹ تھے۔ جن کی مالیت ایک کروڑ سے اوپر ہو گی۔ ان کے علاوہ ایسی دستاویزات' جن سے ظاہر تھا ہوتا کہ انہوں نے لاہور اور اسلام آباد کے مہنگے علاقوں میں کروڑوں روپے کی زمینیں اور عالی شان کوٹھیاں خریدی ہیں۔

جمشید نے فون کے ذریعے انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل سے کہا۔ ”سر! ہم کامیاب رہے ہیں۔ صرف تابانی اور مراد ہی نہیں' اکرام شاہ کے خلاف بھی بہت سے دستاویزی ثبوت ہیں۔“

وہ تفصیل سے بتانے لگا۔ ڈائریکٹر جنرل نے کہا۔ ”میرا انتظار کرو۔ میں کمشنر اور ایک مجسٹریٹ کے ساتھ آ رہا ہوں۔“

رخشندہ کے بیڈ روم کے اندر زیرو پاور کی نیلی روشنی تھی۔ اس روشنی میں وہ آہستہ آہستہ بول رہے تھے اور ایک دوسرے کو تول رہے تھے۔ مراد نے ایک آدھ بار اس کے منہ پر ہاتھ رکھا تھا اور کان لگا کر کچھ سننے کی کوششیں کی تھیں۔ رخشندہ نے کہا۔ ”تم تیسری بار ایسا کر رہے ہو۔ کیا تم کسی کی آہٹ سن رہے ہو؟“

وہ اس کے کان میں بولا۔ ”میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ کوٹھی کے اندر کوئی ہے۔“

”کون ہو سکتا ہے؟ ممی اور ڈیڈی تو صبح سے پہلے نہیں اٹھیں گے۔“

وہ بولا۔ ”ایسا تو کبھی نہیں ہوا لیکن ہو سکتا ہے' دوا نے زیادہ اثر نہ کیا ہو۔“

وہ بستر سے اتر کر دروازے کے پاس آیا۔ پھر دروازے سے کان لگا کر سننے لگا۔ رخشندہ نے بھی آ کر سننے کی کوشش کی۔ تب انہیں بہت دھیمی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں دروازے سے ذرا دور ہو گئے۔ مراد نے سرگوشی میں کہا۔ ”آواز سے ایسا لگ رہا' کوئی یہاں سے دور ڈرائنگ روم میں ہے۔ ٹھہر ٹھہر کر بولنے کا انداز ایسا ہے جیسے ٹیلی فون پر باتیں کر رہا ہو۔“

”شاید ڈیڈی ہیں۔ ان کی آنکھ کھل گئی ہو گی۔ وہ فون پر کسی سے ضروری باتیں کر رہے ہوں گے۔“

”میں حیران ہوں کہ میری آزمائی ہوئی دوا بے اثر کیوں ہو گئی ہے۔“

وہ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ ”دوا کو بے اثر ہونے دو۔ میں تو تمہارے اثر میں ہوں۔ فکر نہ کرو۔ ڈیڈی فون کرنے کے بعد سو جائیں گے۔ میرے کمرے میں نہیں آئیں گے۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایسی آواز سنائی دی جیسے موبائل فون سے بزر کی آواز ابھر رہی ہو۔ وہ دونوں پھر تیزی سے دروازے کے پاس آ گئے۔ اس بار آواز قریب سے سنائی دی۔ بند دروازے کے باہر ٹی وی لاؤنج تھا۔ وہاں کوئی بول رہا تھا۔ ”ہیلو۔ اللہ دتا اسپیکنگ۔ ہاں۔ ویسے تو ہم نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ پھر بھی تلاش جاری ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی اور کام کا ثبوت حاصل ہو جائے۔ ہاں۔ ہاں جی۔ ہم ڈی جی صاحب کا انتظار کر رہے ہیں۔ اچھا۔ اچھا جی۔ خدا حافظ.........“

مراد پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بند دروازے کو دیکھنے لگا۔

دروازے کے اس پار موت۔ بم دھماکے کے الزام میں گرفتاری تھی۔ پاکستانی سراغ رسانوں نے بم دھماکے کا باقی مواد ایمبولینس کے چور خانے سے حاصل کرلیا ہوگا۔

اور اب تابانی کی عدم موجودگی کا مطلب یہ سمجھ میں آرہا تھا کہ پہلے سے اسے گرفتار کیا گیا ہے اور اس سے بہت کچھ اگلوانے کے بعد اس کوٹھی پر چھاپا مارا گیا ہے۔ وہ کمرے میں چاروں طرف گھوم کر دیکھنے لگا۔ فرار ہونے کے لیے کوئی دوسرا دروازہ نہیں تھا۔ ایک کھڑکی تھی۔ اس کی چوکھٹ پر لوہے کی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ "میں تو بری طرح پھنس گیا ہوں۔ میں کہاں جاؤں' کیسے جاؤں؟ کوئی راستہ نہیں ہے۔"

وہ دیوار پر گھونسا مار کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ کمرے کی ایک ایک چیز پر نظریں ڈالتا ہوا بولا۔ "کیا تمہارے پاس پستول وغیرہ ہے؟"

وہ انکار میں سرہلا کر بولی۔ "نہیں ہے۔ تمہاری جان پر بنی ہے اور میری عزت دو کوڑی کی ہونے والی ہے۔ اخباروں میں چرچا ہوگا کہ ہم ایک ہی بیڈ روم میں رات گزار رہے تھے۔"

اس نے ٹیلی ویژن کی طرف دیکھا۔ پھر رخشندہ کو اپنے سامنے سے ہٹاتے ہوئے تیزی سے چلتے ہوئے وہاں آیا۔ ٹی وی کے اوپر ایک ریموٹ کنٹرول رکھا ہوا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر دیکھنے اور سوچنے لگا۔

رخشندہ نے پوچھا۔ "تم اس ریموٹ کنٹرول سے کیا کرو گے؟"

مراد نے پوچھا۔ "یہاں کوئی لوہے یا پیتل کی چھوٹی سی چیز ہے؟"

وہ انکار میں سرہلانے والی تھی' اس سے پہلے ہی وہ تیزی سے پلٹ کر سنگار میز کی طرف آیا۔ اس کی دراز کھول کر دیکھا۔ وہاں کئی شیڈ کی لپ اسٹک رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے کور کا رنگ سنہری تھا۔ دور سے پیتل کی چیزیں لگتی تھیں۔ اس نے لپ اسٹک کو اٹھا کر رخشندہ سے کہا۔ "اپنے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا باندھو۔"

"تم کرنا کیا چاہتے ہو؟"

"جو کہہ رہا ہوں' فوراً کرتی جاؤ۔"

وہ دونوں ہاتھ پیچھے لے جاکر بالوں کو سمیٹ کر جوڑا باندھنے لگی۔ وہ اسے لپ اسٹک دکھاتے ہوئے بولا۔ "میں اسے تمہارے جوڑے میں آدھا ٹھونس دوں گا۔ یہ پیتل کے کور کا ایک ننھا سا بم نظر آئے گی۔ میں فریب نظر سے کام لینے کی کوشش کروں گا۔"

وہ اسے اس کے جوڑے کے اوپری حصے میں ٹھونسنے لگا۔ آدھی لپ اسٹک جوڑے

کے اوپری حصے سے جھلک رہی تھی اور وہ لپ اسٹک نہیں لگ رہی تھی۔ رخشندہ نے کہا۔ "میں سمجھ رہی ہوں' تم اسے ریموٹ کنٹرول سے بلاسٹ ہونے والا بم ظاہر کرنا چاہتے ہو لیکن یہ تو ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول ہے۔ وہ پہچان جائیں گے۔"

مراد نے جیب سے رومال نکال کر نصف ریموٹ کنٹرول کو لپیٹ لیا۔ اب وہ نصف دکھائی دے رہا تھا۔ "جب یہ دہشت پیدا کردی جائے کہ بالکل قریب ایک بم بلاسٹ ہونے والا ہے تو سب کو اپنے بچاؤ کی فکر ہوتی ہے۔ کوئی اس پر توجہ نہیں دے گا۔ صرف دیکھے گا۔ خوف زدہ ہو کر دیکھنے سے میری چالاکی سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

وہ رخشندہ کا بازو تھام کر اسے دروازے کے پاس لے کر آیا پھر اسے کھولنا چاہا۔ پتا چلا دروازے کو باہر سے بند کیا گیا ہے۔ وہ دستک دیتے ہوئے بولا۔ "دروازہ کھولو۔ میں جانتا ہوں' تم لوگ مجھے گرفتار کرنے آئے ہو لیکن تم اپنے چوہے دان میں شیر کو پھانس نہیں سکو گے۔ ذرا دروازہ کھول کر دیکھو' میں نے ریموٹ کنٹرول بم کے ذریعے کس طرح اپنے ساتھ تمہاری موت کا بھی سامان کیا ہے۔"

جمشید اور اس کے سراغ رساں ساتھی یہ باتیں سن کر ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ انہیں رخشندہ کی آواز سنائی دی۔ وہ رو رو کر کہہ رہی تھی۔ "میں مرنا نہیں چاہتی۔ پلیز مجھے بچالو۔ مراد نے ایک ننھا سا خطرناک بم میرے بالوں کے جوڑے سے منسلک کردیا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول ہے۔ میں مرنے والی ہوں۔ موت مجھ سے لگی ہوئی ہے۔ مجھے بچالو۔"

جمشید سوچتی ہوئی نظروں سے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے اونچی آواز میں کہا۔ "مراد! ہم دروازہ کھول رہے ہیں۔ رخشندہ کو کمرے میں چھوڑ کر باہر آجاؤ۔ سہولت سے گرفتاری پیش کرو گے تو تمہاری سزا میں نرمی کی جاسکے گی۔"

مراد نے چیخ کر کہا۔ "مجھے نادان بچہ سمجھ رہے ہو؟ تم لوگوں نے تابانی سے بم دھماکے کے بارے میں اگلوا لیا ہے۔ ہم کئی لوگوں کے قاتل بن چکے ہیں۔ میں گرفتار ہو کر سزائے موت سے بچ نہیں پاؤں گا۔ مجھے فرار ہونے کا موقع نہ دیا گیا تو یہاں ایک دھماکے سے سب کو ساتھ لے مروں گا۔"

وہ رخشندہ کے ساتھ کھڑکی کے پاس آیا۔ اس کے پردے کو ایک طرف ہٹایا۔ اس کے پٹ کھولے۔ پھر کہا۔ "یہاں کھڑکی کے پاس آکر دیکھو تمہیں یقین آجائے گا کہ میں صرف ایک بٹن دبا کر اس پوری کوٹھی کو کھنڈر بنا سکتا ہوں۔ میرے سر پر موت ناچ رہی ہے۔ میں مروں گا تو تم سب کے ساتھ مروں گا۔"

جمشید اور اس کے ساتھی کھڑکی کے پاس آکر دیکھنے لگے۔ مراد نے رخشندہ کی پشت کھڑکی کی طرف کی۔ ان سے کہا۔ "یہ دیکھو' میں نے بم کو اس کے جوڑے سے باندھ رکھا ہے اور میرے ہاتھ میں یہ ریموٹ کنٹرول ہے۔ میرے ساتھ یہ بھی مرے گی۔ سب مریں گے۔ زندگی چاہتے ہو تو دروازہ کھولو اور مجھے رخشندہ کے ساتھ جانے دو۔"

جمشید نے کہا۔ "ہم یہاں تباہی اور کسی کی موت نہیں چاہتے۔ تمہیں یہاں سے جانے دیں گے لیکن ذرا ٹھہر جاؤ۔ ہمارے ڈائریکٹر آنے والے ہیں۔ وہ بھی ان حالات میں تباہی نہیں چاہیں گے۔ امن و سلامتی کی خاطر تمہیں جانے دیں گے۔"

"مجھے باتوں میں الجھانے کی حماقت نہ کرو۔ میں اپنی سلامتی اور موت کا فیصلہ خود سنا رہا ہوں۔ ایک منٹ کے اندر یہ دروازہ نہیں کھلا تو موت ہم سب کا مقدر بن جائے گی۔"

رخشندہ نے ان کی طرف پلٹ کر روتے ہوئے کہا۔ "جمشید! مجھے بچالو۔ میں تمہاری فری کی بہن ہوں۔ میں زندہ رہوں گی تو فری سے تمہاری شادی ضرور کراؤں گی۔ مجھے بچالو۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔"

جمشید اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ رونے کے انداز میں بول رہی تھی مگر رو نہیں رہی تھی۔ اس کے سر سے موت بندھی ہوئی تھی۔ اسے خوف سے تھر تھر کانپنا چاہیے تھا لیکن ایسا کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔

مراد نے کہا۔ "چالیس سیکنڈ گزر چکے ہیں۔ ایک منٹ پورے ہونے میں...... بیس سیکنڈ رہ گئے ہیں۔"

جمشید نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں دروازہ کھول رہا ہوں۔"

اس نے دروازے کے پاس آکر اسے کھول دیا۔ پھر پیچھے ہٹ کر بولا۔ "باہر آجاؤ۔ ہم تمہیں جانے کا موقع دے رہے ہیں۔"

وہ رخشندہ کے پیچھے اس کی گردن دبوچ کر دروازے کے باہر آیا۔ پھر بولا۔ "تم سب ہتھیار پھینک دو اور اس کمرے میں چلے آؤ۔ میں تم سب کو کمرے میں بند کرکے جاؤں گا۔"

وہ رخشندہ کی گردن دبوچے دیوار سے لگ کر چلتا ہوا آگے بڑھا تاکہ وہ لوگ ہتھیار پھینک کر کمرے میں جائیں اور وہ دروازے کو باہر سے بند کردے۔ اس نے گرج کر کہا۔ "کیا تم لوگوں نے سنا نہیں؟ ہتھیار پھینکو اور کمرے میں جاؤ۔"

جمشید نے کہا۔ "تم نے ریموٹ کنٹرول کو رومال سے لپیٹ رکھا ہے۔ ذرا برقع اتار

کر اس کا جلوہ دکھاؤ۔ پھر ہم ہتھیار پھینک دیں گے۔"

جمشید کی باریک بینی نے اسے چونکا دیا۔ پھر بھی وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "میں ایسی چیزوں پر اپنی انگلیوں کے نشان نہیں چھوڑتا۔ اس لیے اسے رومال سے پکڑا ہے۔"

تمہیں یہاں سے فرار ہونے کا موقع دیا جارہا ہے۔ یہ ریموٹ کنٹرول بھی تمہارے ساتھ جائے گا۔ کوئی تمہاری انگلیوں کے نشانات نہیں دیکھ پائے گا۔ تم یہ رات رخشندہ کے ساتھ گزار رہے تھے۔ یہ رومال اسے محبت کی نشانی کے طور پر دے دو۔ کچھ تو دے جا نشانی' تیری مہربانی۔"

مراد نے غصے سے کہا۔ "جمشید! ہتھیار نہیں پھینکو گے۔ خواہ مخواہ ضد کرو گے تو اپنے ساتھ دوسروں کو بھی حرام موت مارو گے۔ میں دس تک گنتا ہوں۔ گنتی ختم ہوتے ہی میں اس کا بٹن دبا دوں گا۔"

وہ ایک سے گننے لگا۔ رخشندہ نے پریشان ہوکر ایک بار مراد کو دیکھا...... پھر جمشید کو دیکھا تو اس نے کہا۔ "اسے گنتی پڑھنے دو۔ تمہارے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی ہے لیکن موت کا خوف نہیں ہے۔ تمہیں خوف سے لرزنا چاہیے۔"

وہ فوراً ہی تھرتھرانے کے انداز میں لرزنے کی کوشش کرنے لگی۔ ادھر مراد نے نو تک گن کر کہا۔ "دیکھو۔ میری گنتی پوری ہونے والی ہے۔ اپنا نہیں تو اپنے ساتھیوں کی سلامتی کا خیال کرو۔"

جمشید نے پوچھا۔ "کیا تمہیں نو تک گنتی آتی ہے؟ اب دس تک گن بھی چکو۔ چلو میں کہہ دیتا ہوں۔ دس۔ کم آن!" مراد اسے غرا کر دیکھنے لگا۔ جمشید نے کہا۔ "اللہ دتا! ساتھیوں کے ساتھ اس کے قریب جاکر بڑی احتیاط سے ہتھکڑی پہناؤ۔ یہ ذرا سی بھی حرکت کرے تو اس کے پیروں پر فائر کردو تاکہ یہ بھاگنے کے نہیں' لنگڑانے کے قابل رہ جائے۔"

اللہ دتا اور ساتھیوں نے جمشید کی ہدایت پر عمل کیا۔ مراد کے ہاتھ سے ریموٹ کنٹرول چھوٹ کر گر پڑا۔ اسے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر ایک مجسٹریٹ اور انسپکٹر جنرل آف پولیس کے ساتھ آیا۔ مراد کو ہتھکڑی پہنا کر فرش پر اکڑوں بٹھایا گیا تھا۔ رخشندہ ایک گوشے میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ جمشید نے اعلیٰ افسران کے سامنے وہ تمام بم اور اسلحہ پیش کیا' جو ایمبولینس کے چور خانے سے برآمد ہوئے تھے۔ سیف سے برآمد ہونے والی دستاویزات اور ہیرے موتیوں سے جڑے ہوئے زیورات کے دس سیٹ بھی پیش کیے گئے۔ ان تمام چیزوں کی لسٹ

تحریری طور پر پہلے ہی تیار کی جاچکی تھی۔ اس پر مجسٹریٹ اور دوسرے افسران نے دستخط کیے۔ جمشید نے کہا۔ "اکرام شاہ اور اس کی وائف کو نہ جانے کیسی خواب آور دوا کھلائی گئی ہے۔ وہ اب تک گہری نیند میں ہیں۔"

ڈی جی نے اللہ دتا سے کہا۔ "فون کرو اور ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے ڈاکٹر کو بلاؤ۔ یہاں تمہارے ساتھ مسلح سپاہی رہیں گے۔ ڈاکٹروں کے علاوہ کسی اور کو کوٹھی کے احاطے کے بھی اندر نہ آنے دینا۔"

اللہ دتا نے کہا۔ "سر! اکرام شاہ سیاسی بندہ ہے۔ اگر کوئی سرکاری عہدے دار آئے تو کیا کرنا چاہیے۔"

"کوئی بڑا عہدے دار ہو تو اسے آنے دو لیکن پہلے مجھ سے فون پر بات کراؤ۔ اکرام شاہ اور اس کی وائف کو فون استعمال نہ کرنے دو۔"

جمشید اور دوسرے جاسوس وہاں اللہ دتا کو سپاہیوں کے ساتھ چھوڑ کر مراد کو لے کر اپنے اعلیٰ افسران کے حکم کے مطابق اس تھانے میں پہنچے' جہاں تابانی کو پہلے ہی حوالات میں پہنچادیا گیا تھا۔

مراد کو بھی آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیلا گیا۔ تابانی اسے دیکھتے ہی اس سے لپٹ کر بولا۔ "تھینکس گاڈ! تم آگئے ہم نے ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کی قسم کھائی تھی۔"

مراد نے لپٹے رہنے کے دوران میں اس کے کان میں پوچھا۔ "کیا تم نے سب کچھ اگل دیا ہے؟"

"وہ یہ اقرار کرانے کی کوشش کررہے تھے کہ ہم "را" کے ایجنٹ ہیں اور لبرٹی مارکیٹ میں ہم نے دھماکا کیا ہے لیکن میں اب تک انکار کررہا ہوں۔"

"شاباش! ہمیں انکار کرتے رہنا چاہیے۔ ہمارے امریکی پاسپورٹ کو جعلی ثابت کرنے میں انہیں مہینوں لگ جائیں گے۔ تب تک ہمارے اوپر والے ہمیں......... یہاں سے نکال کرلے جائیں گے۔"

"مراد! جب تک رہائی کی کوئی صورت نہ نکلے' میں تمہارے ساتھ جیل میں رہوں گا۔ تم سے دور نہیں رہ سکوں گا۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کو چومنے لگے۔ تابانی نے کہا۔ "اگرچہ ہم پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں مگر میں بہت خوش ہوں۔ تمہیں ایک خوش خبری سنانا چاہتا ہوں۔"

سپاہیوں نے حوالات کا آہنی دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "اے چلو۔ بڑے صاحب بلا رہے ہیں۔"

تابانی آگے نہ بول سکا۔ مراد اس کا ہاتھ تھام کر آہنی سلاخوں سے باہر آیا۔ ایس ایچ او کے کمرے میں انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر' آئی جی پولیس' کمشنر اور مجسٹریٹ کے ساتھ جمشید بھی موجود تھا۔ تابانی اور مراد کو ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ انٹیلی جنس کے ڈی جی نے کہا "تم دونوں "را" کے ایجنٹ ہو۔ راجستھان سے آئے ہو اور خود کو امریکی شہری کہتے ہو۔"

مراد نے کہا۔ "ہمارا "را" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ ہمارے پاسپورٹ کی تصدیق کرسکتے ہیں۔"

"تصدیق تو ہوجائے گی۔ تمہارے موبائل شفاخانے اور ایمبولینس سے اسلحہ اور دھماکا خیز مواد برآمد ہوا ہے۔ اس بات کے چشم دید گواہ ہیں کہ تم دونوں نے لبرٹی مارکیٹ میں بم دھماکے کے ذریعے تخریب کاری کی ہے۔"

"چشم دید گواہ خریدے جاسکتے ہیں۔ ہم موبائل شفاخانے کے ذریعے خدمتِ خلق میں مصروف رہتے ہیں۔ ہمیں جھوٹے الزامات میں پھانسنے کے لیے آپ ہمارے موبائل شفاخانے سے ایٹم بم بھی برآمد کرسکتے ہیں۔"

جمشید نے کہا۔ "بڑی ڈھٹائی سے انکار کررہے ہو لیکن ہمارے پاس اچھے خاصے ٹھوس ثبوت تمہارے خلاف ہیں۔ تابانی! مراد! تم لوگ کیسے انسان ہو؟ بے گناہ لوگوں کی جانیں لیتے وقت تمہارا ضمیر ذرا بھی ملامت نہیں کرتا ہے؟ تمہاری ماں نے جتنی تکلیف سے تمہیں پیدا کیا ہے' اتنی ہی تکلیف سے ان ماؤں نے بھی انہیں پیدا کیا تھا' جنہیں آج تم دونوں نے لبرٹی مارکیٹ میں پلک جھپکتے ہی مار ڈالا۔ تم اپنی ماں کو بلاؤ۔ ہم اس کے سامنے تمہیں قتل کریں گے تو تم قتل ہوتے وقت دیکھو گے کہ تمہاری ماں کی کوکھ میں کیسی آگ لگتی ہے۔"

تابانی نے کہا۔ "جمشید! اتنی لمبی تقریر نہ کرو۔ جب سے ہم یہاں آئے ہیں' تم دشمن بن کر ہمارے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ ہم مجرم نہیں ہیں۔ تم سب مل کر تمام قانونی داؤ پیچ آزمالو۔ ہم بے داغ ہیں۔ بے داغ ہی رہیں گے۔ دنیا کا کوئی قانون اور کوئی طاقت ہمیں مجرم ثابت نہیں کرسکے گی۔ تم ہمیں مجرم ثابت کرنے کے لیے خدا سے بھی دعا مانگو گے تو وہی سامنے آئے گا' جو سچ ہے اور سچ یہ ہے۔ ہے کہ........."

وہ بولتے بولتے اٹک گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ اچانک اس کا سر چکرانے لگا۔ پھر وہ ابکائی لینے لگا۔ "اونک۔ اونک۔" پھر اسے تھوڑی سی قے ہوئی۔ وہ گرنے والا تھا۔ مراد نے اسے سنبھال کر فرش پر بٹھایا۔ ایک سپاہی سے بولا۔ "پانی لاؤ۔" سپاہی دوڑ کر پانی لے آیا۔ مراد نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ پھر گلاس

اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ وہ دو گھونٹ پی کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ کمشنر نے پوچھا "اسے کیا ہو گیا ہے؟"

آئی جی نے کہا۔ "یہ لوگ بڑے زبردست اداکار ہوتے ہیں۔ کوئی نیا ڈراما پلے کر رہا ہے۔"

تابانی کا چہرہ پانی سے بھیگا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں نے ابھی کہا تھا کہ خدا سے بھی دعا مانگو گے تو وہی سامنے آئے گا' جو سچ ہے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "سچ سامنے آ گیا۔ میں حوالات میں مراد کو یہ خوش خبری سنانے والا تھا۔ اب سنا رہا ہوں۔ میں اپنے مراد کے بچے کی ماں بننے والا ہوں۔"

"کیا؟" کتنے ہی افسران حیرانی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ "ایک مرد اور ماں بننے والا ہے؟"

☆======☆======☆

اگر ماں زندہ نہ ہو اور باپ اپنے بچے کی پرورش کرے۔ اپنے بچے پر اتنی توجہ دے' اس سے اتنی محبت کرے کہ اس کی خاطر دوسری شادی نہ کرے تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے صرف باپ بن کر ہی نہیں ماں بن کر بھی اپنے بچے کو پروان چڑھایا ہے۔ ان حالات میں ایک مرد اپنے بچے کی ماں بھی کہلاتا ہے۔

ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ایک مرد کے پاؤں بھاری ہو جائیں۔ وہ نو ماہ تک بچے کو پیٹ میں رکھ کر اسے جنم دے اور اس کی ماں کہلائے۔

البتہ ایسا ہوتا ہے کہ قدرتی طور پر مرد کی جنس تبدیل ہوتی ہے۔ یہ دنیا میں ہوتا آیا ہے۔ ایسے کئی واقعات رُونما ہو چکے ہیں کہ جس مرد میں قدرتی تبدیلی ہونے لگتی ہے' وہ میڈیکل ٹریٹ منٹ کے مختلف مراحل سے گزر کر عورت بن جاتا ہے۔ پھر کسی سے شادی کرتا ہے اور اس کے بچے کی ماں بن جاتا ہے۔

اس وقت یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ مرد ماں بن گیا ہے۔ جب وہ بچے کو جنم دے چکا ہے تو پھر یہی کہا جائے گا کہ وہ ماں بن چکی ہے۔

تابانی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی پیچیدہ تھا۔ وہ ماں کے پیٹ سے ایک بیٹا بن کر پیدا ہوا تھا۔ اسے بچپن سے تعلیم حاصل کرنے اور ایک زبردست فائٹر بننے کا شوق تھا۔ وہ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی جوڈو کراٹے سیکھتا رہا تھا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ ایک دن چیک کیش کرانے ایک بینک میں گیا تو وہاں اچانک ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا۔ ڈاکوؤں کا سرغنہ ایک گن لیے بینک منیجر کو حکم دے رہا تھا کہ تمام کرنسی نوٹ ایک بیگ

میں بھر دے۔ تب ہی تابانی نے اس کی گن پر ایک کک ماری۔ گن اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس سرغنہ کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس نے دوسری کک اس کے منہ پر ماری۔ وہ دوسری طرف الٹ گیا۔ تابانی نے گن اٹھا کر اس کے ساتھیوں پر فائرنگ کی۔ پھر اس نے سرغنہ کو گن پوائنٹ پر للکارا۔ "اگر کسی نے گولی چلائی تو میں اسے گولی مار دوں گا۔"

انہوں نے اپنے سرغنہ کی سلامتی کے لیے فائرنگ تو نہیں کی لیکن وہاں سے بھاگ گئے۔ یہ اس کا پہلا کارنامہ تھا۔ اس نے ایک ڈاکو کو گولی ماری تھی اور ان کے سرغنہ کو گرفتار کرایا تھا۔ ان دنوں اس کا نام تابانی نہیں شنکر داس تھا۔ اخبارات میں اس کی تصویریں شائع ہوئیں اور اس کی دلیری کا خوب چرچا ہوا۔

دوسری بار اس نے دہشت گردوں کا تعاقب کر کے ان کا مقابلہ کیا تھا اور انہیں گرفتار کرایا تھا۔

تیسری بار ایسے چار خطرناک غنڈوں سے مقابلہ کیا تھا جو ایک نوجوان لڑکی کو اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ اس علاقے کی پولیس بھی ان غنڈوں کے دباؤ میں رہتی تھی۔ اس نے تین غنڈوں کو بری طرح زخمی کیا اور چوتھے کا ایک ہاتھ توڑ دیا۔ پتا چلا' وہ جوان لڑکی ایک فوجی میجر کی بیٹی تھی۔

شنکر کی دلیری کے چرچے میجر سنتا بھی رہا تھا اور اخبارات میں پڑھتا بھی رہا تھا۔ اس نے "را" کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ سے سفارش کی۔ پھر اسے ٹریننگ سینٹر میں داخلہ مل گیا۔

وہ ایک دلیر مرد کی حیثیت سے جتنی شہرت حاصل کر رہا تھا۔ اتنا ہی وہ اندر سے پریشان تھا۔ اس کے اندر جو قدرتی تبدیلیاں ہو رہی تھیں' انہیں کسی ڈاکٹر پر بھی ظاہر کرنے سے کتراتا رہا تھا۔ وہ مردانگی کے ذریعے جتنی شہرت حاصل کر چکا تھا' اس کے پیش نظر ایک عورت بنتے ہوئے شرما بھی رہا تھا اور توہین بھی محسوس کر رہا تھا۔

وہ نہایت ضدی' طاقت ور اور ناقابلِ شکست تھا لیکن قدرتی حالات سے نہیں لڑ سکتا تھا۔ آخر اسے ایک ڈاکٹر کو اپنا راز دار بنانا پڑا۔ اس نے ایسا طریقۂ کار اختیار کیا کہ بڑی راز داری سے اس کا علاج ہوتا رہا۔ آگے چل کر آپریشن لازمی تھا اور ٹریننگ سینٹر سے طویل چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ اسے مجبور ہو کر "را" کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کو بھی اپنا راز دار بنانا پڑا۔

اس دوران میں اس کے جذبات اور احساسات بھی بدلتے رہے لیکن وہ اپنی مردانگی کا بھرم رکھنے کے لیے کسی مرد سے دوستی نہیں کرتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اس مرد دوست کی

قربت میں جذبات بھڑک سکتے تھے اور بھید کھل سکتا ہے۔ وہ مرد کی طرح بولتا تھا کہ میں آتا ہوں۔ میں جاتا ہوں۔ میں سوتا ہوں۔ میں جاگتا ہوں۔ بچپن سے اسی طرح بولنے اور مردانہ لباس پہننے کا عادی تھا۔

آپریشن کے نتیجے میں مکمل عورت بننے کے بعد اس میں عورتوں جیسی نزاکت نہیں آئی تھی لیکن جذبات بدل گئے تھے۔ دل کسی سے دوستی کے لیے مچلتا تھا مگر دماغ سمجھاتا تھا' جس طرح اس نے ضروریات سے مجبور ہو کر ایک ڈاکٹر اور اپنے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کو اپنا راز دار بنایا ہے اسی طرح ایک آئیڈیل کو اپنا راز دار بنا سکتا ہے۔

وہ کبھی بھول سے بھی عورتوں کے انداز میں گفتگو نہیں کرتا تھا۔ اسے اپنے پیدائشی نام شنکر داس سے لگاؤ تھا۔ جب اسے راجستھان کے ٹریننگ سنٹر میں بھیجا گیا تو وہاں مراد سے ملاقات ہوئی۔ وہاں کے ٹریز نے اسے مراد کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنے اور یہ جاسوسی کرنے کا حکم دیا کہ پاکستان سے آنے والا اور وہاں تخریب کاری کی تربیت حاصل کرنے والا مراد واقعی "را" کا وفادار ہے یا نہیں؟

وہاں ہاسٹل کے ہر کمرے میں دو افراد رہا کرتے تھے۔ شنکر ایک ہی کمرے میں مراد کے ساتھ راتیں گزارنے کے دوران میں پہلے تو اپنے جذبات کو کچلنے اور اس سے دور رہنے کی کوششیں کرتا رہا۔ ایک دو راتوں کی بات ہوتی تو وہ اس سے کترانے میں کامیاب رہتا۔ انہیں ٹریننگ کے لیے تین ماہ تک ساتھ رہنا پڑا۔ پھر مراد اسے چھیڑا کرتا تھا۔ "یار! تُو اتنا حسین اور چکنا ہے کہ تجھے دیکھ کر نیت خراب ہو جاتی ہے۔"

شنکر بے اختیار شرما کر سر جھکا لیتا تھا۔ مراد حیرانی سے کہتا تھا۔ "تعجب ہے۔ تُو اتنا خطرناک فائٹر ہے کہ خالی ہاتھ فائٹ کرتے کرتے اپنے مقابل کی گردن توڑ دیتا ہے لیکن میرے چھیڑنے پر ایک دوشیزہ کی طرح شرمانے لگتا ہے۔ بھئی میرے سینے پر سر رکھ کر شرمائے گا۔ پھر میرے جذبات کا بھی بھلا ہو گا۔"

آخر ایک دن اس نے مراد سے کہا۔ "میں تمہیں راز دار بنانا چاہتا ہوں۔ میرا ایک ایسا راز ہے' جسے میرے ماتا پتا اور قریبی رشتے دار بھی نہیں جانتے ہیں۔ صرف ایک ڈاکٹر اور ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ جانتا ہے۔"

"ایسا کون سا راز ہے' جسے تم نے اپنے خون کے رشتوں سے بھی چھپا رکھا ہے۔"

"ہے ایسا ایک راز جسے میں صرف تمہیں بتاؤں گا لیکن بتانے سے پہلے ایک شرط ہے۔"

"بھئی تم نے تجسس میں مبتلا کر دیا ہے۔ اپنی شرط بتاؤ۔"

"میرا راز معلوم کرنے کے بعد تم آئندہ کسی سے دوستی نہیں کرو گے۔"

"کسی سے دوستی نہیں کروں گا۔" مراد نے کہا۔

"کسی لڑکی سے بھی دوستی نہیں کرو گے۔"

"یہ ذرا مشکل ہے پھر بھی کوشش کروں گا۔"

"کوشش نہیں۔ پکا وعدہ کرو۔ تم جانتے ہو' میں جتنا اچھا دوست ہوں' اتنا ہی بدترین جانی دشمن بھی ہو سکتا ہوں۔ مجھ سے وعدہ خلافی کرو گے' مجھے دھوکا دے کر کسی سے دوستی کرو گے یا کسی سے شادی کرو گے تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"میں مقابلے میں تم سے کم تر نہیں ہوں۔ تمہیں دبوچ لوں تو میری گرفت سے نکل نہیں پاؤ گے۔"

"اسی لیے تمہیں راز دار بنا رہا ہوں۔ مگر جانتے ہو نا؟ جہاں میری طاقت کام نہیں آتی' میرا داؤ نہیں چلتا' وہاں میں بڑی مکاری سے اپنے شکار کو ٹریپ کر کے اسے قتل کر دیتا ہوں۔"

"مانتا ہوں' تم مکارانہ چالوں سے میرا کام تمام کر سکتے ہو۔ چلو وعدہ کرتا ہوں' نہ کسی سے دوستی کروں گا اور نہ کسی سے شادی کروں گا۔ پلیز اب تو وہ راز بتا دو۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا سوئچ بورڈ کے پاس آیا پھر بولا۔ "دنیا کے تمام راز روشنی میں کھلتے ہیں۔ یہ راز ایسا ہے' جو تاریکی میں کھلے گا۔"

اس نے سوئچ آف کر دیا۔ کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ مراد نے کہا۔ "کمال کرتے ہو؟ تم نے راز بتانے کے لیے اندھیرا کر دیا ہے۔ یار! تم کہاں ہو؟"

چند سیکنڈ کے بعد مراد نے لمس محسوس کیا' ایک مکھن کا مجسمہ اس سے آلگا ہو۔ مجسمے میں ایسی حرارت تھی کہ مکھن کو پگھلنا چاہیے تھا لیکن مراد سر سے پاؤں تک پگھلتا چلا گیا۔ بڑی حیرتوں اور بڑی مسرتوں سے وہ راز کھلتا چلا گیا۔

"را" کی ایک اہم میٹنگ میں فیصلہ ہوا کہ شنکر داس کو دہشت گردی کے لیے مراد کے ساتھ پاکستان بھیجنا ہے۔ چونکہ وہ مسلمان بن کر جانے والا تھا اس لیے اس کا نام فیروز تابانی رکھا گیا۔ راجستھان کی "را" برانچ والے بھی اس کی اصلیت نہیں جانتے تھے۔ صرف ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ اس کا راز دار تھا۔

یوں شنکر داس وہیں بھارت میں نابود ہو گیا۔ تابانی اپنے یار مراد کے ساتھ راجستھان سے تھر کے علاقے میں آیا۔ پھر وہاں سے لاہور اکرام شاہ کی محفوظ پناہ گاہ میں آ گیا۔ مراد اپنے وعدے کے مطابق اس کا راز دار تھا۔ تنہائی میں بھی اسے عورت کے نام سے نہیں

پکارتا تھا۔ کیونکہ ابتدا ہی سے تابانی نے اپنا کوئی عورتوں والا نام نہیں رکھا تھا۔ وہ صرف مراد کے لیے عورت تھا۔ ورنہ ساری دنیا کے سامنے اپنی مردانگی کا سکہ جمائے رکھنا چاہتا تھا۔

"را" کے وسیع ذرائع سے جو امریکی پاسپورٹ حاصل ہوا تھا۔ اس کے مطابق بھی وہ ایک مرد تھا اور اس کا نام فیروز تابانی تھا۔ کوئی یہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ وہ مراد کی داشتہ ہے اور کوئی امریکی پاسپورٹ کو جھٹلا کر انہیں "را" کے دہشت گرد ثابت نہیں کر سکتا تھا۔

ایسے ہی وقت قدرت نے اپنا کھیل دکھایا اور یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ مراد کے بچے کی ماں بننے والا ہے۔

اس وقت بھی تابانی عارضی طور پر یہ بات چھپا سکتی تھی لیکن قدرتی طور پر ایک عورت کو ماں بننے کا جو فخر اور خوشی حاصل ہوتی ہے' انہی جذبوں کی شدت سے اس نے فخریہ ماں بننے کی خوش خبری سنا دی تھی۔

اس تھانے میں ڈی آئی جی' کمشنر اور مجسٹریٹ کے ساتھ جمشید علی بھی موجود تھا۔ تابانی کی زبان سے ایک چونکا دینے والی خبر سن کر کسی کو یقین نہیں آیا۔ ایک قریبی میٹرنٹی ہوم سے لیڈی ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے تابانی کو دوسرے کمرے میں لے جا کر چیک کیا۔ پھر ایس ایچ او کے کمرے میں تمام افسران کے سامنے آ کر بولی۔ "وہ مرد نہیں عورت ہے اور ماں بننے والی ہے۔"

"مراد نے کہا۔ "ڈاکٹر! اسے عورت نہ کہو بلکہ یہ کہو کہ وہ ماں بننے والا ہے۔ آپ لوگ نہیں جانتے' وہ کتنا خطرناک ہے۔ اسے کوئی عورت کہے تو اپنی توہین سمجھتا ہے۔ کہنے والے کا منہ توڑ سکتا ہے۔ قدرت نے اس کے اندر ممتا کے جذبات پیدا کر کے اسے کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ آپ سب میری اس عجیب سی بات کو نفسیاتی پہلو سے سمجھیں کہ وہ میری محبت میں ماں بنا چاہتا ہے۔ مگر ماں بننا نہیں چاہتی۔"

لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ "میں نفسیاتی الجھنوں کو سمجھتی ہوں۔ فی الحال اسے میڈیکل ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے۔ اسے اسپتال میں داخل کیا جائے۔ اس نے بتایا ہے کہ اس کی جنس تبدیل ہوئی تھی۔ اس بیک گراؤنڈ کے باعث پہلا حمل بہت سے پرابلم پیدا کر سکتا ہے۔ اسے ابتدائی دنوں میں دن رات ڈاکٹروں کی توجہ کی ضرورت ہے۔"

آئی جی پولیس نے کہا۔ "ٹھیک ہے اسے پولیس اسپتال میں رکھا جائے گا۔ وہاں پولیس کا سخت پہرا رہا کرے گا۔"

تابانی نے مراد سے لپٹ کر کہا۔ "نہیں مراد! میں اسپتال نہیں جاؤں گا۔ ایسی حالت میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔"

ایک پولیس افسر نے ان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "اے! یہ پولیس اسٹیشن ہے۔ یہاں ایک دوسرے سے لپٹ کر فلمی رومانس نہ کرو۔"

اس افسر نے تابانی کا ہاتھ پکڑ کر اسے مراد سے کھینچ کر الگ کرنا چاہا' تابانی نے الگ ہوتے ہی ایک الٹا ہاتھ افسر کے منہ پر رسید کیا۔ پھر اسے جوڈو کے داؤ پر لا کر اس طرح پھینکا کہ وہ الٹ کر ایس ایچ او کی میز پر گرا۔ پھر وہاں سے لڑھکتا ہوا نیچے فرش پر پہنچ گیا۔

یہ سب کچھ اتنی تیزی اور پھرتی سے ہوا تھا کہ کسی کو آگے بڑھ کر تابانی کو روکنے کا موقع نہیں ملا۔ مار کھانے والا افسر تکلیف سے کراہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ تابانی کا ایک ہاتھ پڑنے سے ہی اس کی باچھوں سے لہو رسنے لگا تھا۔

کئی سپاہی تابانی کو پکڑنے اور اس کی پٹائی کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ وہ تنبیہہ کے انداز میں ایک انگلی دکھاتے ہوئے بولا۔ "ہالٹ!"

تمام سپاہی اس کی سخت مزاجی اور طاقت کا مظاہرہ دیکھ چکے تھے' وہ سب بے اختیار رک گئے۔ تابانی نے کہا۔ "ابھی میں نے مردانگی دکھائی ہے۔ اپنے مرد ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ تم سب مرد ہو تو ایک ایک دو دو کر کے آؤ میری طرح اپنے مرد ہونے کا ثبوت دو۔"

جمشید نے سپاہیوں سے کہا۔ "دور رہو۔ اسے ہاتھ نہ لگاؤ۔"

وہ سب پیچھے چلے گئے۔ جمشید نے کہا۔ "تابانی! اس دنیا میں بے شمار مردانہ قوتوں کا مظاہرہ کرنے والے لوگ ہیں۔ مجھے انٹیلی جنس کے ٹریننگ سینٹر میں ناقابلِ شکست تسلیم کیا جاتا ہے۔ میں تمہیں صرف چند سیکنڈ میں اپاہج بنا سکتا ہوں لیکن اصل مردانگی یہ ہے کہ ہونے والے بچے کو نقصان سے بچایا جائے۔ تم ماں بننے والی ہو۔ اس لیے.........."

وہ بجلی کی طرح کڑک کر بولا۔ "ماں بننے والی نہیں' ماں بننے والا ہوں۔ اگر اب تم نے مجھے عورت سمجھ کر بات کی تو.........."

وہ حملہ کرنے کے انداز میں آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ مراد نے اسے دونوں بازوؤں میں جکڑ کر کہا۔ "تابانی! دماغ ٹھنڈا رکھو۔ جمشید کی مردانگی اور انسانیت کو سمجھو۔ یہ ہمارے ہونے والے بچے کی بہتری کی بات کر رہا ہے۔ اگر اس کی بات تمہیں چیلنج لگ رہی ہے تو اسے منہ توڑ جواب ضرور دینا۔ مگر ابھی نہیں' میرے بچے کو جنم دینے کے بعد.........."

پھر مراد نے تمام افسران سے کہا۔ "میں تابانی کی طرف سے معافی مانگتا ہوں۔ اس

نے ایک افسر پر ہاتھ اٹھایا لیکن آپ نے اس کے حاملہ ہونے کے باعث جوابی کارروائی نہیں کی ہے۔"

تابانی نے غصے سے کہا۔ "مراد! مائنڈ یور لینگویج' میں حاملہ نہیں ہوں' تمہارے بچے کا حامل ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ تم حاملہ نہیں ہو حامل ہو۔ اب بات نہ بڑھاؤ۔"

آئی جی نے حکم دیا۔ "ان دونوں کو حوالات میں رکھو۔ ہم کچھ اہم فیصلے کریں گے۔ پھر ان دونوں کے تحریری بیانات لینے کے بعد تابانی کو پولیس کسٹڈی میں اسپتال بھیجا جائے گا۔"

تابانی اپنے خطرناک ہونے کا ثبوت دے چکا تھا۔ اس لیے اسے اور مراد کو ہتھکڑیاں پہنا کر آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا گیا۔ ان کے جانے کے بعد انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل نے کہا۔ "تابانی بہت خطرناک ہے۔ اسپتال میں قانون کے محافظوں کے لیے دردِ سر بن سکتا ہے۔ میں آئی جی صاحب سے پوچھتا ہوں' کیا پولیس اسپتال میں اسے قیدی بنا کر رکھا جا سکے گا؟"

آئی جی نے کہا۔ "میں خود اس کیس کو ہینڈل کروں گا جس اسپیشل وارڈ کے کمرے میں اسے رکھا جائے گا' وہاں ڈاکٹر' نرسیں اور وارڈ بوائز وغیرہ بھی پولیس کے جاری کردہ شناختی کارڈ کے بغیر نہیں جا سکیں گے۔ اسپتال کے باہر چاروں طرف مسلح سپاہی دن رات موجود رہیں گے۔ آپ کے انٹیلی جنس والے بھی وہاں ڈیوٹی پر رہ سکتے ہیں۔"

انٹیلی جنس کے ڈی جی نے کہا۔ "جمشید کی نگرانی میں سراغ رسانوں کی ایک چھوٹی سی ٹیم وہاں رہے گی۔"

کمشنر نے کہا۔ "اتنے حفاظتی انتظامات بہت ہیں۔ تابانی وہاں سے فرار نہیں ہو سکے گا۔"

جمشید نے کہا۔ "نہیں ہو سکے گی۔"

کمشنر نے کہا۔ "ہاں۔ کہنا تو یہی چاہیے لیکن وہ زبردست انداز میں زبردستی مردانگی کا سکہ جما رہا ہے یعنی کہ جما رہی ہے۔ کوئی اس کے سامنے اسے عورت نہیں کہہ سکتا۔"

مجسٹریٹ نے کہا۔ "آپ تمام افسران نہایت دیانت دار اور فرض شناس ہیں۔ اپنے فرض کی ادائیگی کی خاطر آج تمام رات جاگتے رہے لیکن کل صبح سے شام تک ہمارے بیورو کریٹس اور کرپٹ سیاست داں کیا گل کھلائیں گے' اس کا اندازہ ہمیں کرنا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ آپ ان کا توڑ کیسے کر سکتے ہیں؟"

ان افسران نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پھر سر جھکا کر سوچنے لگے۔ اس ملک کے دیانت دار افسران کا یہی مقدر تھا۔ وہ خون پسینہ بہا کر' جان جوکھم میں ڈال کر خطرناک مجرموں کو گرفتار کرتے تھے لیکن اوپر سے ان کی ضمانت کے یا رہائی کے آرڈر آ جاتے تھے۔

جمشید نے اپنے اعلیٰ افسر نے کہا۔ "سر! ابھی میں ٹریننگ حاصل کر رہا ہوں۔ اس کے باوجود آپ بڑے بڑے معاملات میں مجھے عملی طور پر حصہ لینے کا موقع دیتے ہیں۔ میں نے آپ کی راہنمائی میں تابانی اور مراد کو گرفتار کیا ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس ملک کے بااختیار سیاست داں' جاگیردار اور بیورو کریٹس بھی تابانی اور مراد کو رہائی نہیں دلا سکیں گے۔"

مجسٹریٹ نے کہا۔ "برخوردار! ابھی جوان ہو۔ ابھی بہت تھوڑی سی دنیا تم نے دیکھی ہے۔ تمہیں یہ سمجھنے میں ایک عمر لگے گی کہ سیاسی مکڑیاں کتنے پیچیدہ جالے بنتی ہیں۔"

جمشید نے کہا۔ "آپ بزرگ ہیں اور تجربہ کار ہیں۔ میں آپ سے بحث نہیں کروں گا۔ ہم دونوں بھی دیکھیں گے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔"

تابانی اور مراد آہنی سلاخوں کے پیچھے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ تابانی کا سر مراد کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ وہ بولا۔ "ہمارا تھوڑی دیر کا ساتھ ہے۔ وہ مجھے کسی وقت بھی یہاں سے اسپتال لے جائیں گے۔ میری بات غور سے سنو۔ صبح ہونے والی ہے۔ میں اسپتال میں دس گھنٹے انتظار کروں گا۔ اس دوران میں اگر ضمانت پر ہماری رہائی نہ ہو سکی تو میں وہاں سے فرار ہو جاؤں گا۔"

"نہیں تابانی! اس وقت تمہیں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ تمہارے فرار ہونے کے دوران میں ہمارے ہونے والے بچے کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"میں اپنے بچے کی خاطر ہی رہائی چاہتا ہوں۔ ہمارا بچہ کسی جیل میں نہیں' آزاد فضاؤں میں پیدا ہو گا۔ اگر وہ جیل میں پیدا ہو گا تو اس بچے کو ہم سے چھین کر اسے ہماری کمزوری بنا کر ہم سے "را" کے اہم راز اگلوائے جائیں گے اور میں ایسا وقت آنے نہیں دوں گا۔"

"اگر تم کامیابی سے فرار ہو جاؤ گے۔ تب بھی میں پریشان رہوں گا کہ نہ جانے تم کہاں ہو اور کس حال میں ہو؟"

"میری فکر بالکل نہ کرنا۔ میرے دن رات صرف تمہیں رہائی دلانے کی جدوجہد میں

گزریں گے۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ یہ بچہ ہم دونوں کے سائے میں جنم لے گا اور ہم دونوں کی گود میں پروان چڑھے گا۔"

حوالات کا آہنی دروازہ کھلنے لگا۔ چند مسلح سپاہی انہیں لینے آئے تھے۔ انہیں تحریری بیان دینے کے لیے بلایا گیا تھا۔

جمشید گھر پہنچا تو صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ اس کے ابو علی احمد تارڑ برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ جمشید نے باپ کو سلام کیا۔ باپ نے کہا۔ "پچھلی رات لبرٹی مارکیٹ میں بم کا دھماکا ہوا تو میں سمجھ گیا' تم اب تمام رات مصروف رہو گے۔ میں تم سے پوچھے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ تم مجرموں کو گرفتار کر چکے ہو۔"

"ابو! آپ کی اور ڈی جی صاحب کی راہنمائی کام آئی ہے۔"

"بیٹے! میں تو صرف ایمان داری اور فرض شناسی کی نصیحتیں کرتا ہوں۔ ساتھ ہی یہ دعا کرتا ہوں کہ تمہارا انجام میری طرح نہ ہو۔ بیس برس سے ایک پولیس انسپکٹر ہوں۔ ہر آنے والی حکومت میری ترقی روک دیتی ہے۔ میں ناجائز احکامات کی تعمیل نہیں کرتا اس لیے مجھے ایک کھوٹا سکہ سمجھا جاتا ہے۔"

"جب میری ٹریننگ ختم ہو گی اور کسی عہدے پر میری پوسٹنگ ہو گی تو شاید میرا انجام بھی آپ جیسا ہو۔"

"نہیں بیٹے! ایسا ہو گا تو پھر تم بھی امیر حمزہ کے نقشِ قدم پر چلو گے۔ فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹیں ڈالنے والے بیورو کریٹس اور سیاست دانوں کی کمزوریوں کو ہاتھ میں لے کر انہیں مجبور کرو گے کہ وہ خود اپنا محاسبہ کریں اور اپنا اعمال نامہ لکھ کر خود عدالت میں پیش کریں۔"

جمشید نے آہٹ سن کر سر گھما کر کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں امیر حمزہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جمشید اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ دوڑ کر اس کے گلے لگتے ہوئے بولا "بھائی جان! آپ کب آئے؟"

امیر حمزہ اس کا سگا بھائی نہیں تھا۔ بچپن میں اس کے والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ علی احمد تارڑ اس کے باپ کا دوست تھا۔ اس نے امیر حمزہ کی پرورش کی۔ اسے ایسی تعلیم دلائی کہ وہ کیڈٹ کالج سے فارغ ہو کر انٹیلی جنس میں آ گیا تھا۔ پھر اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کے ذریعے کیپٹن کے عہدے پر پہنچ گیا تھا۔

وہ جمشید سے کہتا تھا۔ "تم اپنے ابو کے اکلوتے بیٹے نہیں ہو۔ بڑا بیٹا میں ہوں اور تم چھوٹے ہو۔"

اور جمشید کہتا تھا۔ "بھائی جان! امی اور ابو نے مجھ سے زیادہ آپ کو کلیجے سے لگا رکھا ہے۔ اسی لیے آپ کو آرمی میں پہنچا دیا اور میں سول انتظامیہ کے انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ میں پہنچنے والا ہوں۔ مجھ سے زیادہ آپ بااختیار ہیں۔"

امیر حمزہ نے کہا۔ "اب میں بااختیار نہیں رہا بلکہ میں زندہ بھی نہیں رہا۔ ڈیپارٹمنٹ کی فائل میں مُردہ ہو چکا ہوں۔ بائی دا وے تم رات بھر کے نکلے ہوئے ہو۔ ناشتا کر کے سو جاؤ۔"

"میں سونے سے پہلے صرف ایک گلاس لسی پیوں گا اور پینے کے دوران میں آپ سے ایک مشورہ چاہوں گا۔"

فری دو گلاس لسی بنا کر لے آئی۔ جمشید' امیر حمزہ کو تابانی کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ امیر حمزہ نے سب کچھ سننے کے بعد کہا۔ "تابانی کا کیس بہت دلچسپ ہے۔ یہ بتاؤ۔ اب پرابلم کیا ہے؟"

"وہی پرانے پرابلم ہیں۔ آج یا کل تک ان کے لیے سفارش آ جائے گی۔ بم دھماکے میں چشم دید گواہ شابے ہے۔ وہ طوائفوں کی انجمن کا سیکریٹری ہے۔ اس کی گواہی مستند نہیں سمجھی جائے گی۔ ان کے امریکی پاسپورٹ کو جعلی ثابت کرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ صرف ایک فراڈ ہے کہ تابانی نے عورت ہو کر ایک مرد کی حیثیت سے پاسپورٹ بنوایا لیکن یہ کوئی اتنا بڑا فراڈ نہیں ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ بم دھماکے سے جتنی ہلاکتیں ہوئیں' اس تخریب کاری کا اور ہلاکتوں کا الزام ان پر نہیں آئے گا۔"

امیر حمزہ نے کہا۔ "ہاں۔ سیاست کے کھلاڑی' تابانی اور مراد کو سنگین الزامات سے بچا لیں گے مگر تم انہیں بچنے نہیں دو گے۔"

"آپ سے یہی مشورہ چاہتا ہوں' مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"ان کی ضمانت لینے والے ثابت کرنا چاہیں گے کہ وہ مجرم نہیں ہیں لیکن ملزم پولیس کسٹڈی سے فرار ہو جائے تو وہ مجرم کہلانے لگتا ہے۔ تم تابانی کو اسپتال سے فرار ہونے کا موقع دو۔"

"واہ بھائی جان! زبردست آئیڈیا ہے۔"

"صرف اتنا ہی نہیں' تابانی کے فرار ہونے کے بعد کہیں قتل یا تخریب کاری کی واردات ہو تو اسے تابانی سے منسوب کرو۔ فون پر تابانی سے ملتی جلتی آواز میں پولیس اور انتظامیہ کو دھمکیاں دو کہ مراد کو رہا نہ کیا گیا تو تابانی کی طرف سے مزید تخریب کاری اور بم دھماکے ہوتے رہیں گے۔ کم آن باتیں بہت ہو چکیں۔ لسی پیو۔ گرم ہو رہی ہے۔"

وہ دونوں اپنا اپنا گلاس اٹھا کر لسی پینے لگے۔

☆======☆======☆

انیلا بانو ایک ہڈی کی طرح مرزا نیک بخت کے حلق میں اٹک گئی تھی۔ وہ اس ہڈی کو نہ اگل سکتا تھا' نہ نگل سکتا تھا۔ ایک بار اسے اگلنے اور اپنی زندگی سے نکال دینے کے لیے قتل کرانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بچ کر لندن پہنچ گئی تھی۔ وہاں سے اس نے اپنے مطالبات پیش کیے تھے۔ نیک بخت کو مجبور ہو کر وہ مطالبات پورے کرنے کے لیے لندن آنا پڑا۔

اس نے اخبار والوں بیان دیا کہ وہ انتخابی مہم کے سلسلے میں لندن آیا ہے۔ یہاں اپنے پارٹی ورکروں سے ملاقات کرے گا۔ کسی ہال یا آڈیٹوریم میں جلسے کا بھی اہتمام کرے گا اور بیرونی ممالک میں رہنے والے پاکستانیوں کو ان حقائق سے آگاہ کرے گا کہ سابقہ حکمرانوں نے ان کے پاک وطن میں کس طرح کرپشن پھیلائی ہے اور کس طرح اپنی پارٹی کے وڈیروں اور جاگیرداروں کو نوازنے کے لیے قومی خزانہ خالی کر دیا ہے۔

سیاسی زندگی میں اور ذاتی زندگی میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اسے سب سے زیادہ ذاتی زندگی سے نہ نکلنے والی انیلا کی فکر تھی۔ اس نے لندن پہنچتے ہی فون کے ذریعے اس سے رابطہ کیا۔ "ہیلو بانو! میں آگیا ہوں۔ کل صبح تمہارے بینک اکاؤنٹ میں پچاس لاکھ روپے کے حساب سے برطانوی پاؤنڈز جمع کرا دوں گا۔"

"پچاس لاکھ روپے سے کچھ نہیں ہو گا۔ تم نے آنے میں تین دن لگا دیئے' میں پے انگ گیسٹ کے طور پر رہتی ہوں۔ میرے کھانے پینے گھومنے پھرنے اور شاپنگ کرنے میں سات لاکھ خرچ ہو چکے ہیں۔ میرے اکاؤنٹ میں اسّی لاکھ جمع کرو۔"

"یہ تمہاری زیادتی ہے۔ کوئی بات نہیں اسّی لاکھ ہی جمع ہو جائیں گے۔ میرا فرنٹ مین ایک وکیل سے مکان کے کاغذات تمہارے نام کرا رہا ہے۔ میرے ساتھ چلنا پسند کرو تو کل کورٹ میں جا کر ہم ان کاغذات پر دستخط کر دیں گے۔"

"میں تمہارے ساتھ ضرور چلوں گی۔"

"میرے یہاں آنے سے پہلے تم نے فون پر نفرت سے کہا تھا کہ میری صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کرو گی۔ میرے سامنے کبھی نہیں آؤ گی۔"

"اب میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔ اب تمہارا سامنا بھی کروں گی اور تم سے کورٹ میرج بھی کروں گی۔"

وہ ایک دم سے چونک کر گھبرا کر بولا۔ "یہ۔ یہ کیا کہہ رہی ہو۔ تم نے شادی سے

انکار کر کے مجھے مطمئن کر دیا تھا۔ یہ تم گرگٹ کی طرح رنگ کیوں بدل رہی ہو؟"

"میں نے رنگ بدلنا گرگٹ سے نہیں' تمہارے جیسے سیاست داں سے سیکھا ہے۔"

"دیکھو یہ کورٹ میرج والی بات نہ کرو۔ باقی تمام مطالبات منوالو۔"

"اخبارات میں میری موت کی خبریں شائع ہو چکی ہیں اگر تم مجھ سے کورٹ میرج کیے بغیر یہاں سے جاؤ گے تو میں تمہارے پاکستان پہنچنے سے پہلے زندہ ہو جاؤں گی۔ تمہارے لیے ایسا اسکینڈل بن جاؤں گی کہ تم اپنی انتخابی مہم جاری نہیں رکھ سکو گے۔"

"پلیز! بانو میں یہاں صرف دو دنوں کے لیے آیا ہوں۔ مجھے واشنگٹن بھی جانا ہے۔ پاکستان جا کر عوامی رابطہ رکھنا ضروری ہے۔ میں کورٹ میرج سے انکار نہیں کروں گا۔ یہ نیک کام انتخابات کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔"

"نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ انتخابات ہر پانچ برس کے بعد ہوتے ہیں اور پاکستان میں تو ہر سال دو سال بعد ہوتے رہتے ہیں۔ شادی ایک ہی بار ہوتی ہے۔ سو یہاں ہو جائے۔ میں تمہیں سہاگ رات منانے کے لئے نہیں کہوں گی اور نہ شادی کے بعد تمہیں اپنے قریب آنے دوں گی۔"

"پھر شادی کیوں کرنا چاہتی ہو؟"

"تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ اپنے وجود سے ایک داشتہ کا داغ مٹانا چاہتی ہوں۔ کورٹ میرج کے بعد میرے پاس تمہاری منکوحہ ہونے کا سرٹیفکیٹ ہو گا۔ اس طرح میں نیک نام رہوں گی۔"

"تم مجھے سوچنے سمجھنے کی مہلت تو دو۔"

"لندن میں رہ کر جتنے عرصے تک سوچنا سمجھنا چاہتے ہو' سوچو اور فیصلہ کرو۔ یہاں مہلت ہی مہلت ہے لیکن کورٹ میرج کے بغیر یہاں سے نہیں جا سکو گے۔"

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "ٹھیک ہے میں کورٹ میرج کے لیے انتظامات کر رہا ہوں۔ اب تو پیچھا چھوڑ دو اور تو کوئی مطالبہ نہیں ہے؟"

"ابھی تو میں پرائی ہوں۔ اتنے ہی مطالبات کافی ہیں۔ شادی کے بعد بیوی کے مطالبات الگ ہوں گے۔ مثلاً یہ کہ میں گھر میں تنہا نہیں رہوں گی۔ ایک ملازمہ ضروری ہو گی۔ گھومنے پھرنے کے لیے ایک کار لازمی ہے اور کچن کے اخراجات تو شوہر پورے کرتا ہی ہے۔"

وہ دانت پیس کر یہ باتیں سن رہا تھا۔ اصولاً وہ شوہر بننے کے بعد اس کے ماہانہ اخراجات کا ذمے دار تھا۔ اس نے تمام مطالبات تسلیم کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔ پھر

اپنے مشیر سے بولا۔ "میں دس ہاتھی پال سکتا ہوں لیکن انیلا بانو کے اخراجات پورے نہیں کروں گا۔ مجھے بلیک میل ہونا پسند نہیں ہے۔"

مشیر نے کہا۔ "انیلا بانو کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ ایک چیونٹی ہے۔ جسے ایک چٹکی میں مسل سکتے ہیں لیکن امیر حمزہ اس چیونٹی کے پیچھے پہاڑ بنا ہوا ہے۔ ایک بار اسے قتل کرانے کی کوشش کی گئی' امیر حمزہ نے اسے بچالیا۔ دوسری بار بھی یہی کوشش کی جائے گی اور ہمیں ناکامی ہو گی تو امیر حمزہ انتقاماً آپ کا تمام سیاسی کیرئیر تباہ و برباد کر دے گا۔"

"میں برباد ہو جاؤں گا لیکن ایک عورت کا غلام بن کر نہیں رہوں گا۔"

"ابھی انیلا کی بلیک میلنگ آپ کو غصہ دلا رہی ہے۔ میں ایک مشیر کی حیثیت سے مشورہ دیتا ہوں' دماغ ٹھنڈا رکھیں۔ آپ یہاں دو دنوں کے لیے آئے ہیں۔ چار دن رہ جائیں۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ فی الحال ایسی تفریحات میں خود کو مصروف رکھیں کہ دو چار گھنٹوں کے لیے اس عورت کو بھول جائیں۔ انشاء اللہ اس سے نجات کا راستہ مل جائے گا۔"

وہ مشیر کے سمجھانے سے خاموش رہا لیکن انیلا اس کے اندر شور مچاتی رہی۔ مشیر کے جانے کے بعد اس نے لندن میں رہنے والے اپنے ایک فرنٹ مین کو بلایا۔ پھر اس سے کہا۔ "میں ایک بہت بڑی پرابلم میں ہوں۔ اگر تم مجھے اس پرابلم سے نجات دلا دو تو تمہیں منہ مانگا انعام دوں گا۔"

فرنٹ مین نے کہا۔ "جناب! آپ کی نظرِ کرم مجھ پر رہتی ہے۔ یہی میرے لیے بہت بڑا انعام ہے۔ آپ حکم کریں۔"

مرزا نیک بخت نے اسے انیلا بانو کے بارے میں بتایا پھر آخر میں کہا۔ "لندن میں اس کے اخراجات برداشت کرنا میرے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن کورٹ میرج کے بعد وہ مجھے تمام عمر بلیک میل کرتی رہے گی۔ میں اس سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ ایک بار اسے ہلاک کرانے میں ناکام رہے ہیں لیکن یہ لندن ہے میں اتنے بڑے شہر میں اسے کہاں گم کر دوں گا' کسی کو پتا ہی نہیں چلے گا۔"

"تم ایسا کر سکتے ہو مگر یہ یاد رکھو کہ اس کی پشت پر امیر حمزہ ہے۔ وہ یہاں نہیں ہو گا لیکن اس کے جاسوس ضرور ہوں گے۔ امیر حمزہ سے قتل کی سازش چھپی نہیں رہے گی۔"

"آپ انیلا کو کسی طرح اس بات پر راضی کر لیں کہ دو دنوں کے لیے آپ کا امریکا

جانا ضروری ہے۔ بہت ہی سنگین سیاسی معاملہ ہے۔ آپ تیسرے دن واپس آتے ہی اس سے شادی کر لیں گے۔"

"تم چاہتے ہو' میں انیلا کے مرڈر کے وقت لندن میں نہ رہوں ٹھیک ہے' میں کوشش کرتا ہوں۔"

اس نے فون کے ذریعے رابطہ کیا۔ پھر کہا۔ "انیلا! میں بول رہا ہوں۔ ابھی ابھی واشنگٹن والوں سے ہاٹ لائن پر گفتگو ہوئی ہے۔ انہوں نے مجھے فوراً بلایا ہے۔ وہاں میرا مخالف کاشف اکبر کچھ گڑبڑ کر رہا ہے۔ تم سمجھ سکتی ہو۔ اگر میں نہ گیا تو جیتنے والی بازی ہار جاؤں گا۔"

"تم مجھ سے سوچنے کے لیے مہلت مانگ رہے تھے۔ کہیں اس امریکی مہلت کے پیچھے کوئی چالبازی تو نہیں ہے؟"

"مجھ پر یقین کرو۔ تم چاہتی ہو' میں کورٹ میرج کیے بغیر پاکستان نہ جاؤں' میں نہیں جاؤں گا۔ امریکا سے دو یا تین دنوں بعد لندن واپس آؤں گا۔ پھر تمہارے تمام مطالبات پورے کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں مزید تین دنوں تک صبر کر لوں گی لیکن تمہیں پھر سمجھا دیتی ہوں' مجھ سے شادی کیے بغیر پاکستان جاؤ گے تو تمہارا سیاسی کیرئیر تباہ کر دوں گی۔"

"میں اپنا سیاسی کیرئیر برباد نہیں ہونے دوں گا۔ پلیز مجھے بار بار دھمکیاں نہ دو۔ میں آج شام تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"میں ملنا ضروری نہیں سمجھتی۔"

"دیکھو۔ مجھے یاد نہیں رہا اور تم بھی بھول رہی ہو کہ کل بینک ہولی ڈے ہے۔ میں تمہارے اکاؤنٹ میں رقم جمع نہیں کرا سکوں گا۔ میں چاہتا ہوں' شام کو ملو۔ میں تمہارے فوری اخراجات کے لیے دس ہزار پاؤنڈ دوں گا۔ پھر رُوبرو کچھ باتیں بھی ہو جائیں گی۔"

"اچھی بات ہے۔ میں چار بجے تمہارا انتظار کروں گی۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ نیک بخت نے ریسیور رکھ کر کہا۔ "ذلیل! کمینی! پہلے کیسی وفادار تھی۔ میرے قدموں میں بچھی رہتی تھی۔ امیر حمزہ کی شہ پا کر شبنم سے شعلہ بن گئی ہے۔"

"میں شعلے کو بجھا دوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ اس کا پتا بتائیں۔"

"چیئرنگ کراس کی تھرڈ اسٹریٹ میں مادام کیتھرائن کا ایک چھوٹا سا بنگلہ ہے۔ وہاں پے انگ گیسٹ کی حیثیت سے رہتی ہے۔"

"کیا آپ انیلا سے یہ معلوم کر سکیں گے کہ اس بنگلے میں کتنے کمرے ہیں اور اس کے علاوہ کتنے پے انگ گیسٹ دوسرے کمروں میں رہتے ہیں۔"

"میں اس سے باتوں ہی باتوں میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔"

ایک سروے کے مطابق لندن میں دو لاکھ سے زیادہ مس فٹ ہیں۔ وہاں ایسے افراد کو مس فٹ کہا جاتا ہے' جنہیں معاشرے نے ٹھکرا دیا ہو۔ یہ غربت کے باعث سستے نشے کے عادی ہوتے ہیں اور نشے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے چھوٹے بڑے جرائم کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ نیک بخت کا فرنٹ مین دس برسوں سے لندن کا شہری تھا اور ان علاقوں سے اچھی طرح واقف تھا' جہاں جرائم پیشہ افراد پائے جاتے تھے۔

کیمڈن ٹاؤن ٹیوب اسٹیشن اور چیرنگ کراس ٹیوب اسٹیشن کے قریب الکوحل زدہ افراد ہر موسم میں کانپتے تھر تھراتے نظر آتے ہیں۔ وہ سردی سے نہیں' نشے کی شدید ضرورت کے باعث کانپتے اور اپنے جسموں کو نوچتے رہتے ہیں۔ ایسے شکار کی تلاش میں رہتے ہیں' جو تنہائی یا زیر زمین ریلوے اسٹیشن کی ٹائلٹ وغیرہ میں مل جائے' وہ اس پر قاتلانہ حملہ کرکے اس سے رقم چھین کر فرار ہو جاتے ہیں۔

جیکی رالف ایک ایسا ہی صحت مند جوان تھا۔ ابھی اس لیے صحت مند تھا کہ اسے نئی نئی نشے کی لت پڑی تھی۔ ایک ہفتے پہلے فرنٹ مین سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "نشہ کیوں کرتے ہو؟ تمہارا جسم باڈی بلڈرز کی طرح خوبصورت ہے۔ اگر تم نے نشہ نہ چھوڑا تو چند مہینوں میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جاؤ گے۔"

جیکی نے کہا تھا۔ "کیا فرق پڑے گا۔ انسان مرنے کے بعد ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جاتا ہے۔ میں جیتے جی بن جاؤں گا اور سچ تو یہ ہے کہ میں زندہ نہیں ہوں۔ میں مرچکا ہوں۔"

"نشہ کرنے والے تمہاری طرح ہی کی باتیں کرتے ہیں۔ زندگی میں صدمات سہنے پڑتے ہیں۔ جو سہہ نہیں پاتے' وہ نشے کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ مرتے رہتے ہیں۔"

"ہاں۔ یہی سمجھ لو۔ میں جان بُوجھ کر روز تھوڑا تھوڑا مر رہا ہوں۔ مجھے جو صدمہ ملا ہے' اسے برداشت نہیں کر پا رہا ہوں۔ دراصل برداشت کرنے والی بات ہوتی تو میں کر لیتا لیکن غیرت کی بات ہو تو پھر بے غیرتی سے زندہ نہیں رہا جاتا۔"

"آخر تمہارے ساتھ کیا ٹریجڈی ہوئی ہے؟"

جیکی نے ایک گہری سانس لی۔ پھر آہستہ آہستہ سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔ "میری بوڑھی نانی نے میری پرورش کی ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ میرے والدین میرے بچپن ہی میں مر گئے تھے لیکن دس دن پہلے میری نانی بیمار پڑ گئی۔ اس نے دم توڑنے سے پہلے بتایا

کہ میری ماں زندہ ہے مگر میں اس کا پتا نہ پوچھوں.......... مجھ سے روپوش رہنے والی ماں ہر ماہ میرے گزارے کے لیے رقم بھیج دیا کرے گی۔"

وہ ایک آہ بھر کر بولا۔ "آہ! ماں زندہ ہے۔ آج تک میرے اخراجات پورے کرتی رہی۔ آئندہ بھی کرے گی لیکن بیٹے سے کیوں نہیں ملتی ہے؟ میری نانی نے بتایا' وہ نہیں چاہتی کہ عزت داروں کی سوسائٹی میں' میں اس کا بیٹا کہلاؤں.......... کیونکہ وہ پیشہ کرتی ہے۔"

جیکی اچانک رونے لگا۔ "وہ ماں مجھے سوسائٹی میں عزت دار دیکھنا چاہتی ہے۔ کیا حقیقت چھپانے سے میں سوسائٹی کا معزز فرد کہلاؤں گا۔ مجھے اپنے جسم سے' اپنے وجود سے گھن آتی ہے۔ پتا نہیں میں کیسی غلاظت سے یہ جسم لے کر دنیا میں آیا ہوں۔ مجھے ایک فرضی باپ کا نام بتایا گیا تھا۔ جبکہ میری ماں کے پاس بھی یہ حساب نہیں تھا کہ میرا باپ کون ہے؟ یہ۔ یہ ایسی بے غیرتی ہے' جو مجھے اندر سے نوچتی اور لہولہان کرتی رہتی ہے۔"

وہ روتے روتے بولا۔ "مجھے ایک پاؤنڈ دو گے۔ میں نشہ چاہتا ہوں۔ غم غلط کرنا چاہتا ہوں۔ ایک پاؤنڈ میں ایک اسپرٹ کی بوتل اور ایک ڈبل روٹی مل جائے گی۔"

"تم اسپرٹ پیو گے؟ کلیجا چھلنی ہو جائے گا۔"

"کیا کروں؟ یہی سستی چیز ہے۔ ہیروئن اور چرس اتنی مہنگی ہے کہ کوئی بڑی واردات کرنے کے بعد ہی یہ مہنگا نشہ کر سکتا ہوں۔ جیک اور سائیڈر جیسی سستی شراب بھی دو یا ڈھائی پاؤنڈ میں آتی ہے۔ میرا سر بھاری ہو رہا ہے۔ پلیز مجھے ایک پاؤنڈ دو۔"

فرنٹ مین نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر پوچھا۔ "ہیروئن سے شوق کرو گے؟"

اس نے ایک دم سے چونک کر اور خوش ہو کر پوچھا۔ "تمہارے پاس ہیروئن ہے؟ مگر وہ تو بڑی مہنگی ملتی ہے؟"

"تمہارے لیے مہنگی ہے لیکن ہم پاکستانیوں کے لیے سستی ہے کیونکہ یہ وہیں کی پیداوار ہے۔ یہ لو سگریٹ۔ اس کے کش لگاؤ۔"

اس نے ایک کش لگایا اور دھواں چھوڑتے ہوئے کھانسنے لگا۔ پھر بولا۔ "مجھے مہنگے نشے کی عادت نہیں ہے۔ سگریٹ کے ساتھ پہلی بار پی رہا ہوں اس لیے ٹھسکا لگ گیا۔ تم بتاؤ مجھے کیا کرنا ہوگا۔ میں دو سگریٹ کے لیے کسی کو قتل بھی کر سکتا ہوں۔"

"میں جب کہوں' ائرپورٹ پر آجایا کرو۔ مجھے پہلے سے اطلاع مل جاتی ہے کہ

پاکستان سے کوئی بندہ یہ مال لے کر آرہا ہے۔ پولیس اور کسٹمز والے مجھ جیسے خوش لباس پاکستانیوں کو شبے کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ تم پرانے اور میلے لباس میں ایسے گندے سے لگتے ہو کہ کسی کو تم پر شبہ نہیں ہوگا۔ تمہارے پاس میلا پھٹا ہوا بیگ ہوگا تو تمہیں مس فٹ سمجھ کر کوئی بیگ کو چیک نہیں کرے گا۔"

جیکی نے پوچھا۔ "ائرپورٹ پر کسٹم والے پاکستانی مسافر کو چیک نہیں کرتے ہیں؟"

"کرتے ہیں۔ مال کبھی پکڑا جاتا ہے اور کبھی نکل جاتا ہے۔ کل جو مال آنے والا ہے' اسے کوئی نہیں پکڑے گا۔"

"کیوں نہیں پکڑے گا؟"

"ہمارے ملک کے ایک صوبے کے بہت بڑے سیاست داں کا بیٹا اپنے ہی کھیت اور فیکٹری کا تیار کیا ہوا مال لا رہا ہے۔ اس نے وہاں سے یہاں تک ذرائع استعمال کیے ہوں گے۔"

مؤرخین جو پاکستانی تاریخ لکھ رہے ہوں گے' وہ ایسے سیاست دانوں کا ذکر ضرور تحریر میں لا رہے ہوں گے' جو منشیات کی باحفاظت اسمگلنگ کے لیے الیکشن میں جیت کر اسمبلیوں میں پہنچتے ہیں اور قانون کی ناک کے نیچے بیٹھ کر بے خوف و خطر اسمگلنگ کا دھندا کرتے ہیں۔

دوسرے دن جیکی رالف ائرپورٹ پر پہنچا تو فرنٹ مین بہت پریشان نظر آیا۔ اس نے کہا۔ "بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ مال بھی پکڑا گیا ہے اور سیاست داں کا بیٹا بھی۔"

جیکی نے پوچھا۔ "تم نے تو کہا تھا کہ بہت بڑے ذرائع استعمال کیے جارہے ہیں۔ مال پکڑا نہیں جائے گا۔"

"ہاں۔ مال آسانی سے نکل جاتا لیکن اچانک انٹرپول کے جاسوس کسٹمز آفس میں گھس آئے تھے۔ انہوں نے ہمارے باس کو بھی گرفتار کرلیا ہے۔"

سیاست داں کا وہ بیٹا' فرنٹ مین کا باس تھا۔ مرزا نیک بخت نہیں جانتا تھا کہ جس سے فرنٹ مین کا کام لیا کرتا ہے' وہ منشیات کے اسمگلر کا ایک کارندہ بھی ہے۔ اس نے جیکی کو دو سگریٹ دے کر کہا۔ "تم جاؤ اور ہرشام چیئرنگ کراس کے ٹیوب اسٹیشن میں آیا کرو۔ میں پھر کسی ضرورت کے وقت تم سے کام لوں گا۔"

ایک ہفتے بعد فرنٹ مین نے جیکی سے کہا۔ "روز مفت کے سگریٹ پیتے ہو۔ اتنا مہنگا نشہ تمہارا باپ بھی تمہیں خرید کر نہیں دے گا لیکن اب تمہیں ایک بہت بڑا کام کرنا ہوگا۔"

"کام کتنا ہی بڑا ہو' میں جان پر کھیل کر کروں گا۔"

"ایک پاکستانی عورت کو قتل کرنا ہے۔"

"میں سمجھ رہا تھا' دہشت گردی سے تعلق رکھنے والا کوئی خطرناک کام ہوگا۔ ایک عورت کو قتل کرنا معمولی سی بات ہے۔"

"قتل اس طرح ہونا چاہیے کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مطمئن ہوسکوں۔ اس سے پہلے اس عورت کو قتل کرنے والے ناکام رہے ہیں۔"

"میں-اسے تمہارے سامنے قتل کروں گا۔ جہاں کہو گے' وہاں کروں گا۔ مجھے گرفتاری اور موت کا خوف نہیں ہے۔ میں تو یوں بھی نشے کے زہر سے رفتہ رفتہ مرنے والا ہوں۔"

فرنٹ مین نے اسے مادام کیتھرائن کا بنگلا دکھایا پھر کہا۔ "جسے قتل کرنا ہے' وہ پاکستانی عورت ہے۔ اس کا نام انیلا بانو ہے۔ ہم اس اسٹریٹ کے موڑ پر اپنی کار میں بیٹھے انتظار کریں گے۔ شام کے وقت وہ تفریح اور شاپنگ وغیرہ کے لیے نکلے گی تو میں نشان دہی کروں گا۔ تم اسے چہرے سے اچھی طرح پہچان سکو گے۔ ابھی میں جارہا ہوں شام چار بجے سے پہلے آؤں گا۔ پھر تمہیں اپنی کار میں لے جاؤں گا۔"

وہ جیکی سے رخصت ہوکر چلا گیا۔ اسے اپنے باس کی گرفتاری کے سلسلے میں پریشانی تھی۔ بعض ممالک میں منشیات کے اسمگلروں کو سزائے موت دی جاتی ہے۔ برطانیہ میں یہ قانون نہیں تھا۔ سیاست داں کے اس بیٹے کو سزائے موت تو نہ ہوتی مگر ایک لمبی مدت تک قید بامشقت کی سزا ہوسکتی تھی۔

اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ بڑے مستحکم سیاسی ذرائع استعمال کیے جاتے اور وہ رہا ہو جاتا لیکن بات صرف قید اور رہائی کی نہیں تھی۔ پاکستان کی عزت اور وقار کی تھی۔ دنیا کے کسی بھی ملک میں جانے والا ایک عام پاکستانی بھی اپنے وطنِ عزیز کا ایک سفیر ہوتا ہے۔ وہ جہاں جاتا ہے' وہاں اپنے ملک کی ثقافت' اسلامی روایات اور پاکستانی قوم کی عزت اور وقار کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے لیکن بعض مفاد پرست لوگ پاکستان کو اس طرح بدنام کرتے ہیں جیسے اس سیاست داں کا بیٹا کررہا تھا۔

دوست نما دشمن ممالک کی یہی کوشش ہوا کرتی ہے کہ پاکستان کو منشیات فروش اور دہشت گرد ملک قرار دیا جائے۔ جبکہ دوسرے ممالک میں بھی بدترین دہشت گردی ہوتی ہے۔ بعض باضمیر سیاست دانوں کو جب اختیارات حاصل ہوتے ہیں تو وہ اپنے بہتر سیاسی عمل سے بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی نیک نامی کے لیے بھرپور کوششیں کرتے

ہیں۔ ان سیاست دانوں نے منشیات کے خاتمے کے لیے پوست کے کھیت جلا دیئے۔ ان کھیتوں کے مالکان کو متبادل کاروبار کی سہولتیں اور معقول رقمیں دیں لیکن جو اسمگلر اسمبلیوں میں پہنچے ہوتے ہیں' وہ بیورو کریٹس کے گٹھ جوڑ سے پھر وہی کرپشن شروع کر دیتے ہیں۔

☆======☆======☆

aazzamm@yahoo.com
اندھیر نگری
محی الدین نواب

ختم نبوت ﷺ زندہ باد **عظمت صحابہ زندہ باد**

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

❖ گروپ میں صرف کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈمن کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی و غیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔

❖ گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔

❖ سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

❖ تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔

❖ ہمارا اردو کتب کا وٹس گروپ جوائن کرنے کے لئے درج ذیل لنکس پر کلک کریں ہر دو کیٹیگری میں صرف ایک ہی گروپ جوائن کریں اگر پہلے سے جوائن ہیں تو اس کو سکپ کر دیں۔ عمران سیریز کے شوقین عمران سیریز گروپ جوائن کر سکتے ہیں۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے

اردو بکس 1	https://chat.whatsapp.com/EFrs3uGTgEm2319kK0wfu2
اردو بکس 2	https://chat.whatsapp.com/Ke9odWnuu7T9zRUGgYEcYV
اردو بکس 3	https://chat.whatsapp.com/IEl5cejf7Xc0b1HjApSyxI
اردو بکس 4	https://chat.whatsapp.com/J2HwtCI39spKjifu3aC61i
1 New ❤ Books	https://chat.whatsapp.com/EFrs3uGTgEm2319kK0wfu2
2 New ❤ Books	https://chat.whatsapp.com/D9yLIpv8dLVJHLjuVNIAtk
3 New ❤ Books	https://chat.whatsapp.com/I5dFInQasVTLcmKrbpa1bv
عمران سیریز 1	https://chat.whatsapp.com/Ggokw9DndA68GCuURnNA2H
عمران سیریز 2	https://chat.whatsapp.com/C11xpIXfws3JRqn8gSt3LZ

گروپ فل ہونے کی صورت میں ایڈمن سے وٹس ایپ پر میسیج کریں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے ریموو کر دیا جائے گا اور بلاک بھی کیا جائے گا۔

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد — پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

قلم کے نواب محی الدین نواب کا ایک طویل ناول
ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا۔
سیاست کے سانپ اور ان کی زہریلی سازشوں کا حال۔
پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے ''خفیہ ہاتھ'' کی سازشوں کا حال۔
چند سرپھروں کی ولولہ انگیز داستان، جو خفیہ ہاتھ سے ٹکرا گئے تھے۔
بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان۔
انڈر ورلڈ کے گاڈ فادروں کا خوفناک ٹکراؤ، موت کو بھی پسینہ آگیا۔
پاکستان کو گدھوں کی طرح نوچنے والے سیاستدانوں کی شرمناک داستان۔
سندھ کے وڈیروں کی ''خدائی'' کی ناقابلِ یقین داستانیں۔

ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا۔

اندھیر نگری

دوم

محی الدین نواب

الرفاعی پبلشرز اینڈ بک سیلرز

چوک میو ہسپتال، نسبت روڈ، لاہور۔

بار اوّل ـــــــــــــ ۲۰۰۲ء
مطبع ـــــــــــــ یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ـــــــــ صوبا کمپوزنگ سنٹر' لاہور

ہیمر کاک اٹلی کا باشندہ تھا۔ وہ انڈر گراؤنڈ مافیا کا سرغنہ تھا۔ اس نے جیل میں آکر اس سیاست داں کے بیٹے سے ملاقات کی۔ "ہیلو مسٹر خان! تم کو ایک دن یہاں پہنچنا تھا۔ آج پہنچ گئے۔ میں نے تم کو اور تمہارے باپ بادشاہ خان کو سمجھایا تھا کہ اپنے آس پاس کے دو چار ملکوں میں ہیروئن اسمگل کرو گے تو کوئی بات نہیں لیکن عالمی مارکیٹ میں دھندا کرنے کے لیے میرا حصہ دینا ضروری ہے۔ مگر تم باپ بیٹے کو بڑا غرور تھا کہ تم پاکستان سے امریکا تک تمام ممالک کی پولیس' انٹیلی جنس اور کسٹمز والوں سے نمٹ لو گے۔ اب دیکھ لو کہ تم کہاں پہنچے ہو؟"

"میں خوب سمجھتا ہوں' ائرپورٹ کسٹمز والوں کے پاس تم نے انٹرپول کے سراغ رسانوں کو بھیجا تھا۔"

"تمہارا باپ بھی یہی سمجھتا ہے۔ اس سے فون پر میری بات ہو چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انٹرپول والے تو میرے جانی دشمن ہیں لیکن میرے خلاف انہیں کبھی کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ بائی دا وے میں نے خفیہ ذریعے سے تمہارے بارے میں انٹرپول والوں تک خبر پہنچائی تھی۔ سیدھی سی بات ہے' تم نے انڈر ورلڈ ڈرگ مافیا کو ٹیکس ادا نہیں کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا۔"

"تم ہماری آمدنی کا نصف مانگتے ہو اور اسے ٹیکس کہتے ہو؟"

"تمہارے جنوبی ایشیا میں ہیروئن سستی چاندی کے بھاؤ بکتی ہے۔ یورپ اور امریکا میں ہیرے موتیوں کے برابر فروخت ہوتی ہے۔ تم ہمیں آدھا حصہ دے کر بھی کروڑوں روپے کما سکتے ہو۔ مگر لالچ بری بلا ہے۔ یہ بلا تمہیں یہاں لے آئی ہے۔"

"میرے خان بابا نے کیا کہا ہے؟"

"اب تمہارا خان بابا یعنی کہ بادشاہ خان راضی ہے۔ بولتا ہے' تم کو یہاں سے کسی طرح رہائی دلائی جائے۔"

"میں نے سنا ہے' یہاں کا قانون اور پولیس والے بہت سخت ہیں۔ یہاں کسی کی سفارش اور رشوت کام نہیں آتی۔"

"تم نے درست سنا ہے۔ یہاں بڑی سے بڑی رشوت اور سفارش کام نہیں آئے

گی۔ یہاں لمبی سزائیں پانے والوں کو آسمان دیکھنا نصیب نہیں ہوتا لیکن میں تمہیں کورٹ ٹرائل کے نتیجے میں باعزت بری کرالوں گا۔"

"جب معاملہ عدالت تک پہنچ جائے گا تو مجھے کیسے رہائی دلاؤ گے۔"

"ہم انڈر ورلڈ کے لوگ ہیں۔ قانون ساز اداروں میں' پولیس اور انتظامیہ میں ہر جگہ ہمارے آدمی ملازمت کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی تمہارے اس بیگ کا سامان بدل دے گا' جو پولیس کسٹڈی میں ہے۔ بیگ میں ہیروئن کے پیکٹ کی جگہ ٹوتھ پاؤڈر کے پیکٹ رکھ دیئے جائیں گے۔ پھر ہمارا وکیل تمہیں جو سمجھائے گا' تم وہی بیان عدالت میں دو گے۔"

"خدا کرے جلد ہی عدالت میں طلبی ہو۔ پاکستان میں میرے خان بابا کی بڑی بدنامی ہو رہی ہے۔ یہاں جیل میں جو اخبارات آتے ہیں' ان میں بھی خان بابا پر اس طرح کیچڑ اچھالی گئی ہے کہ ان کا سیاسی کیریئر بری طرح داغ دار ہو رہا ہے۔"

"شاید دو دنوں کے بعد تمہیں ٹرائل کورٹ کے لیے عدالت میں پہنچایا جائے گا۔ اطمینان رکھو۔ تم جیل سے باہر آجاؤ گے۔"

فرنٹ مین بھی جیل میں اس سے ملاقات کرنے گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "باس جیل کے باہر میں آپ کے لیے جان کی بازی لگا دیتا لیکن یہاں میرے جان دینے سے بھی آپ کو رہائی نہیں ملے گی۔ آپ حکم کریں' میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

بادشاہ خان کے بیٹے شہزاد خان نے کہا۔ "تمہیں کچھ نہیں کرنا ہے۔ جیل کے باہر میرا انتظار کرو۔ میں پہلی ہی پیشی میں رہا ہو جاؤں گا۔"

وہ مطمئن ہو کر شام چیئرنگ کراس کے ٹیوب اسٹیشن کے پاس آیا وہاں جیک رالف اس کا منتظر تھا۔ وہ اس کی کار میں آکر بیٹھ گیا۔ فرنٹ مین کار ڈرائیو کرتا ہوا مادام کیتھرائن کے بنگلے والی اسٹریٹ کے موڑ پر آکر رک گیا۔ وہاں سے وہ بنگلا نظر آرہا تھا۔ فرنٹ مین نے اسے انگلی کے اشارے سے بتایا۔ "وہ اس بنگلے میں رہتی ہے۔ ہم یہاں اندھیرا ہونے تک انتظار کریں گے۔ کل صبح اور شام کو بھی آئیں گے۔ میں چاہتا ہوں' تم ایک بار انیلا بانو کو اچھی طرح دیکھ لو۔"

"اس بنگلے میں کتنے پے انگ گیسٹ ہیں؟"

"صرف ایک فرانسیسی میاں بیوی ہیں۔ باقی کمرے خالی ہیں۔ مادام کیتھرائن اپنے بنگلے کی چھوٹی سی انیکسی میں رہتی ہے۔"

جیکی نے کہا۔ "پھر تو اپنے شکار کو پہچاننا آسان ہو گا۔ وہاں جو پاکستانی پے انگ گیسٹ

ہو گی' وہی انیلا ہو گی۔ میں آج رات اس کے بنگلے میں گھس کر اس کا کام تمام کر سکتا ہوں۔"

فرنٹ مین نے سوچتے ہوئے اثبات میں سرہلایا۔ اس نے مرزا نیک بخت سے وعدہ کیا تھا کہ تین دن کے اندر اسے انیلا سے نجات دلا دے گا۔ وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ آج ہی رات کو یہ کھیل ختم ہو جائے تو بہتر ہو گا لیکن وہ ایسا کہتے کہتے رک گیا۔ بنگلے کے برآمدے میں انیلا بانو نظر آرہی تھی۔ اس نے جیکی سے کہا۔ "وہ دیکھو۔ وہ انیلا بانو ہے۔ شاید وہ تفریح کے لیے کہیں جا رہی ہے۔"

جیکی اسے توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بنگلے کے احاطے سے نکل کر ٹہلنے کے انداز میں چلتی ہوئی مین روڈ پر آئی۔ پھر فٹ پاتھ پر ٹیوب اسٹیشن کی طرف جانے لگی۔ وہ اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "جیکی! یہ ٹیوب اسٹیشن جا رہی ہے۔ کیا تم ٹیوب ٹرین میں اپنا کام دکھا سکو گے؟"

"مجھے گرفتاری اور موت کا خوف نہیں ہے۔ میں کہیں بھی اپنا کام دکھا سکتا ہوں۔"

"میں نہیں چاہتا کہ تم گرفتار ہو جاؤ۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے تم سے کسی نہ کسی طرح حقیقت اگلوائیں گے تو میں پھنس جاؤں گا۔"

"میں کسی کے سامنے تمہارا ذکر کرنے سے پہلے خودکشی کرلوں گا۔ میں گرفتاری سے بچنے کی کوشش کروں گا۔ اگر بچ نہ پایا تو ان کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ انہیں میری لاش ملے گی۔"

ان کی کار سست رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ انیلا ان کی نظروں میں تھی۔ اس بنگلے سے ٹیوب اسٹیشن پیدل بیس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ سیڑھیوں سے اترتی ہوئی زیرِ زمین ریلوے پلیٹ فارم پر چلی گئی۔ فرنٹ مین نے اپنی کار ایک جگہ پارک کی۔ پھر جیکی کے ساتھ اسی پلیٹ فارم پر آیا۔ شام کے وقت ٹیوب ٹرین کے ذریعے لندن کے مختلف اہم مقامات پر جانے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ فرنٹ مین نے کہا۔ "نہیں جیکی! مسافروں کی بھیڑ میں اسے قتل کرنا حماقت ہو گی۔ ہم اس کا تعاقب کرتے رہیں گے اور دیکھیں گے کہ یہ لندن کے کس علاقے میں جائے گی۔ شاید وہاں تمہیں چانس مل جائے۔"

وہ لیڈیز ٹائلٹ کی طرف جا رہی تھی۔ جیکی نے کہا۔ "مجھے اس کے پیچھے جانے دو۔ میں جلد بازی سے کام نہیں لوں گا۔"

وہ ٹائلٹ کے اندر چلی گئی۔ دو عورتیں باہر آرہی تھیں۔ ایسے وقت ٹرین بھی آگئی

تھی اور پلیٹ فارم پر رک رہی تھی۔ مسافر مرد' عورتیں' بچے اور بوڑھے سب ہی ٹرین میں سوار ہو رہے تھے اور کچھ ٹرین سے اتر رہے تھے۔ ایک عورت ٹائلٹ سے نکل کر تیزی سے ٹرین کی طرف جانے لگی۔ انیلا کو بھی فوراً ہی باہر آنا چاہیے تھا لیکن وہ اندر ہی رہ گئی تھی۔

وہ تو شاید ٹرین کے ذریعے کہیں جانے والی تھی۔ جیکی اور فرنٹ مین نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پھر دروازے کے قریب آئے۔ انہیں ایک عورت کے کراہنے کی آواز سنائی دیں۔ وہ دونوں فوراً ہی دروازہ کھول کر اندر آئے پھر ایک دم ٹھٹک گئے۔ انیلا فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سینے میں ایک بڑا سا چاقو پیوست تھا۔ لہو اس کے لباس کو بھگوتا ہوا فرش پر بہہ رہا تھا۔ وہ دم توڑتے ہوئے بولی۔ "وہ۔ عورت میرا پرس۔ میرے دس ہزار ڈالرز لے۔ لے کر.........."

وہ آگے نہ بول سکی۔ اس نے دم توڑ دیا۔ وہ دونوں فوراً ہی پلٹ کر ٹائلٹ سے باہر آئے۔ ان پر قتل کا الزام آسکتا تھا۔ وہ وہاں سے دور ہوتے چلے گئے۔ ٹرین جا رہی تھی۔ جو عورت آخر میں ٹائلٹ سے نکل کر بھاگی اسی نے انیلا کے دس ہزار ڈالر لینے کے لیے اسے قتل کیا تھا اور شاید اس ٹرین میں بیٹھ کر فرار ہو رہی تھی۔

وہ دونوں زیر زمین پلیٹ فارم کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آئے۔ انہوں نے اس قتل کرنے اور چوری کرنے والی عورت کو توجہ سے نہیں دیکھا تھا۔ جیکی رالف نے ایک ٹیلی فون بوتھ میں جا کر قریبی پولیس اسٹیشن کے انچارج کو انفارم کیا کہ چیئرنگ کراس ٹیوب اسٹیشن کے پلیٹ فارم کے ٹائلٹ میں ایک عورت کا مرڈر ہو گیا ہے۔

وہ مختصر سی اطلاع دے کر فرنٹ مین سے بولا۔ "ہمیں ذرا دور جا کر دیکھنا چاہیے کہ پولیس یہاں آکر کیا کارروائی کرنے والی ہے؟"

وہ دونوں ٹہلنے کے انداز میں ذرا دور چلے گئے۔ چند منٹ میں ہی پولیس کی گاڑی ٹیوب اسٹیشن کے قریب رکی۔ پھر اس میں سے ایک افسر اور چند سپاہی نکل کر سیڑھیاں اترتے ہوئے زیر زمین پلیٹ فارم کی طرف جانے لگے۔ وہ دونوں ایک جگہ کھڑے انتظار کرنے لگے۔ جیکی نے کہا۔ "میرا کام کوئی دوسری کر گئی لیکن آپ مجھے سگریٹوں کا کوٹہ تو دیتے رہیں گے نا؟"

اس نے سگریٹ کا پورا ایک پیکٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "میرا یہ کام خواہ کسی سے ہوا مگر ہو گیا۔ میں مطمئن ہوں۔"

جیکی خوشامدانہ انداز میں اس کا بازو دباتے ہوئے بولا۔ "میں بدنصیب ہوں آپ کے

کسی کام نہیں آرہا۔ آپ کے حکم کے مطابق ائرپورٹ گیا تو آپ کا باس گرفتار ہو گیا یہاں اس عورت کا مرڈر کرنے آیا تو کسی دوسری نے دس ہزار ڈالر پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے مجھ سے پہلے اسے قتل کر دیا۔ پلیز مجھ سے جلد ہی کوئی کام لیں۔ میں ان سگریٹوں کے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔"

انہوں نے اسپتال کی ایک گاڑی کو وہاں رکتے دیکھا۔ دو آدمی اس گاڑی سے ایک اسٹریچر اٹھا کر تیزی سے چلتے ہوئے زیر زمین پلیٹ فارم کی طرف چلے گئے۔ پھر ایک منٹ کے بعد ہی وہ اسٹریچر پر انیلا کی لاش رکھ کر اس پر چادر ڈال کر واپس آئے۔ پولیس افسر کہہ رہا تھا۔ "اسے پوسٹ مارٹم کے لیے لے جاؤ۔ میں آرہا ہوں۔"

فرنٹ مین نے مطمئن ہو کر اپنی جیب سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا۔ پھر اس میں سے ایک سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔ "عجیب تماشا ہو گیا۔ ہم اسے قتل کرنے کے لیے اتنے پاپڑ بیل رہے تھے لیکن کسی نامعلوم عورت نے ہماری مشکل آسان کر دی۔ ایسے ہی وقت کہتے ہیں' ہلدی لگی نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا ہو گیا۔"

جیکی نے کہا۔ "پلیز مجھے بھی ایک سگریٹ پلائیں۔"

"میں نے ابھی تمہیں ایک بھرا ہوا پیکٹ دیا ہے۔ اسی میں سے سگریٹ پیو۔ میں ہیروئن کا عادی نہیں ہوں۔ یہ سادے سگریٹس ہیں۔"

"اتفاق سے میں بھی ہیروئن کا عادی نہیں ہوں۔ تم نے کبھی توجہ سے نہیں دیکھا۔ میں صرف ایک آدھ بار مجبور ہو کر دو چار کش لگاتا تھا پھر تمہیں باتوں میں لگا کر سگریٹ تبدیل کر دیا کرتا تھا۔"

جیکی نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر اسے سلگایا۔ پھر ایک لمبا کش لے کر دھواں چھوڑنے لگا۔ فرنٹ مین اسے سہم کر دیکھ رہا تھا۔

☆======☆======☆

میں نے کاٹیج کے سامنے پہنچ کر کار روک دی۔ میرے آس پاس دور دور تک جنگل کی گہری خاموشی تھی۔ وہاں اور کئی امیر و کبیر افراد کے کاٹیج تھے مگر وہ ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر تھے۔ میں نے کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں چابی کے ذریعے کاٹیج کا دروازہ کھولا۔ اندر آکر سوئچ آن کر کے روشنی کی۔ پھر باہر آکر ہیڈ لائٹس بجھا دیں۔ کار کو لاک کر دیا۔ پھر کاٹیج میں آکر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔

میں نے شہر میں امی کے باڈی گارڈ مراد چنگیزی کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ میں جلد سے جلد کاٹیج میں آکر سیف کھول کر دشمنوں کی تصویریں بھی دیکھنا چاہتا تھا اور وہاں رکھی ہوئی

ایک ڈائری میں لکھے ہوئے ان حالات کو بھی پڑھنا چاہتا تھا لیکن مراد چنگیزی نے کہا۔

"مادام نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ کو اچھی طرح کھلا پلا کر کاٹیج میں جانے دوں۔"

چونکہ امی نے کہا تھا اس لیے میں نے مجبوراً کچھ کھایا۔ وہ مجھے سمجھاتی تھیں کہ کسی کام میں جلدی نہ کرو۔ جوش میں نہ آیا کرو۔ ہمیشہ دماغ ٹھنڈا رکھو اور وہ مجھے عملی طور پر آزمایا کرتی تھیں کہ ان کی ہدایات پر عمل کرتا ہوں یا نہیں؟

ان کی آزمائشوں پر پورا اترنے کے لیے میں اس بے چینی اور جوش و جذبے کو اندر ہی اندر کچلتا رہا' جو دشمنوں کی تصویریں دیکھنے اور ڈائری پڑھنے کے لیے تھے۔ بہرحال کاٹیج کے اندر پہنچنے کے بعد میں صبر نہ کرسکا۔ دوسرے کمرے میں رکھے ہوئے آئرن سیف کے پاس آیا۔ وہ سیف مخصوص نمبروں کی ترتیب سے کھلتا تھا اور امی نے وہ نمبر مجھے بتائے تھے۔

میں نے ٹو زیرو تھری فور نمبروں کی ترتیب سے اسے کھولا۔ اندر ایک بڑے سے لفافے میں تصویریں رکھی ہوئی تھیں۔ میں بھی انعام ربانی کے سیف سے تصویروں سے بھرے ہوئے لفافے لے کر آیا تھا۔ میں ان لفافوں کو اور نوٹوں کی گڈیوں کو سیف میں رکھ کر امی کے سیف سے نکالی ہوئی تصویریں دیکھنے لگا۔

جن افراد کی تصویریں تھیں' وہ سب میرے لیے اجنبی تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ہر اجنبی کا نام اس کی تصویر کے پیچھے لکھا ہوا تھا۔ میں ان کے ناموں سے بھی انہیں نہیں پہچان سکتا تھا۔ ان میں کچھ ادھیڑ عمر کے اور کچھ جوان تھے۔ ایک خاتون اور دو نوجوان لڑکیوں کی بھی تصویریں تھیں۔ خاتون کی تصویر کے پیچھے بیگم عشرت عرفان لکھا ہوا تھا۔ یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ میری سوتیلی ماں ہے۔ ان جوان لڑکیوں کی تصویر کے پیچھے آنسہ ندرت عرفان اور آنسہ عابدہ عرفان لکھا تھا' یقیناً وہ میری سوتیلی بہنیں ہوں گی۔ اسی طرح دو جوانوں کی تصویروں کے پیچھے کامران ہدایت اور عمران ہدایت کے نام پڑھ کر سمجھ گیا کہ وہ دونوں سوتیلے بھائی تھے ان کے ناموں کے ساتھ ولدیت لکھی ہوئی تھی۔

باقی تصویروں والے افراد کو میں ان کے ناموں سے بھی نہ پہچان سکا۔

میں نے تصویروں کا وہ لفافہ رکھ کر ڈائری اٹھائی۔ سیف کو بند کیا پھر ایک ایزی چیئر پر بیٹھ کر اسے کھولا۔ چند اوراق کو الٹنے کے بعد میں نے اپنا نام لکھا ہوا دیکھا' امی نے لکھا تھا۔

"فرمان! میری جان! آج دس برس کے بعد تمہیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ تم تو پہاڑ جیسے قد آور گبرو جوان ہوگئے ہو۔ دس برس پہلے میں نے تمہارے دادا جان کے ساتھ

تمہیں اس لوہار کی دکان میں دیکھا تھا۔ پھر تین برس کے لیے سرجری کے ایک بہت ہی ماہر ڈاکٹر کے ساتھ کام کرنے امریکا چلی گئی۔ تین برس کے اختتام پر اس ماہر ڈاکٹر اور میرے استاد نے مرتے وقت کہا کہ میں اس کے اسپتال میں رہ کر اس کے مشن کو آگے بڑھاؤں اور اپنی طرح ماہر سرجن ڈاکٹروں کا اضافہ کروں۔

مجھے وہاں مزید سات برس تک رہنا پڑا۔ اس طرح پورے دس برس بعد آکر تمہیں دیکھا تو مسرتوں سے نہال ہوگئی۔ میرے خاص ماتحت مراد چنگیزی نے خفیہ طور پر تمہارے بارے میں مکمل معلومات حاصل کیں۔ پتا چلا کہ تمہارے دادا جان کا انتقال ہوگیا ہے اور تم اتنی بڑی دنیا میں تنہا زندگی گزار رہے ہو۔

اب میں ایک ایسے مقام پر آگئی ہوں کہ تمہیں یقین دلانا ہے کہ تمہاری ماں زندہ ہے اور تمہیں اس بات پر بھی آمادہ کرنا چاہتی ہوں کہ جن لوگوں نے مجھے تمہارے لیے مُردہ رہنے پر مجبور کیا' تم ان کا گریبان پکڑ کر سچ اگلواؤ گے کہ تمہاری ماں پارسا ہے یا نہیں؟

آج تمہیں دیکھنے کے بعد یہ سطور لکھنے بیٹھ گئی ہوں۔ میں چاہتی ہوں' اپنے مختصر حالات بیان کروں۔ مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے دادا جان نے میرے بارے میں کیا کہا ہے۔ میں جو لکھ رہی ہوں' اسے بھی پڑھ لو۔ پھر ایک غیرت مند بیٹے کی طرح ان کا محاسبہ کرو جن کی تصویریں اسی سیف میں رکھی ہوئی ہیں۔ میں ان کے بارے میں جس حد تک جانتی ہوں' وہ ابھی لکھ رہی ہوں۔

تمہارے باپ عرفان علی سے میری پہلی ملاقات اسپتال میں ہوئی تھی۔ وہ مریض تھے اور میں ان کی معالج تھی۔ وہاں ہم نے ایک دوسرے کو پسند کیا۔ انہوں نے شادی کی تجویز پیش کی۔ میں نے قبول کرلی۔

عرفان ایک بہت بڑے کارخانے کے مالک تھے۔ سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ میں ایک شاندار کوٹھی تھی۔ شادی سے پہلے میں نے کہہ دیا تھا کہ میں ایک لیڈی سرجن کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتی ہوں۔ اس لیے ہفتے میں چھ دن لاہور کے اسپتال میں فرائض انجام دیتی رہوں گی۔ باقی ایک دن اور ایک رات گوجرانوالہ میں گزارا کروں گی۔

عرفان مجھے بہت چاہتے تھے۔ وہ ہفتے میں دو دن کے لیے اپنا کاروبار جنرل منیجر کے حوالے کرکے میرے پاس لاہور آکر رہتے تھے۔ وہ جنرل منیجر عرفان کا ماموں تھا۔ اس کا نام ہدایت اللہ تھا۔"

میں نے یہاں تک ڈائری پڑھی۔ پھر اٹھ کر سیف کو کھول کر تصویروں والا لفافہ

کال لایا۔ ایزی چیئر پر بیٹھ کر لفافے میں سے وہ تصویر نکالی جس کے پیچھے ہدایت اللہ لکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے تھوڑی دیر تک دیکھا۔ پھر اسے پاس والے ایک اسٹول پر رکھ دیا۔ آگے پڑھنے لگا۔ امی نے لکھا تھا۔

"مجھے شادی کے بعد پتا چلا کہ عرفان کے ننھیال والے کارخانے کے اہم شعبوں میں ہیں اور عرفان ان پر بھروسا کرتے ہیں۔ ان کے ماموں ہدایت اللہ کے بڑے بیٹے عظمت اللہ کے ہاتھوں میں تمام آمدنی و اخراجات کا حساب رہتا تھا۔ ماموں کو پورا یقین تھا کہ عرفان ان کی بیٹی عشرت جہاں سے شادی کریں گے لیکن ان کی توقع کے خلاف میں وہاں دلہن بن کر آگئی تھی۔ اس بات پر ننھیال والوں نے پہلے جیسی اپنائیت ختم کردی۔ ایک تو کارخانے میں نقصان کرنے لگے اور دوسرے یہ کہ تمہارے ابو اور دادا کے کان بھرنے لگے کہ ایک کروڑ پتی کی بیوی اپنے شوہر کو چھوڑ کر چھ دن لاہور میں کیوں رہتی ہے۔ اسے اسپتال کی ملازمت کی ضرورت ہی کیا ہے؟

تمہارے دادا نے بھی اعتراض کیا۔ عرفان نے کہا۔ "آمنہ چھ دن نہیں صرف چار دن تنہا لاہور میں رہتی ہے۔ میں وہاں دو دن رہتا ہوں۔"

"مگر وہ چار دن بھی تنہا کیوں رہتی ہے۔ بہو سے کہو' ملازمت چھوڑ دے اور یہاں آکر گھر سنبھالے۔"

میں اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے اپنے گھر سے دور رہتی تھی۔ عشرت اس موقع سے فائدہ اٹھاتی تھی۔ وہ گوجرانوالہ کی کوٹھی میں رہ کر دن رات عرفان کی خدمت کرتی تھی۔ اس کے لئے کھانے پکاتی تھی۔ اس کے بیڈ روم کو صاف ستھرا رکھتی تھی۔ انہی خدمات کے دوران اس کے ناز و انداز عرفان کو لبھایا کرتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ فرائض کا خیال کروں گی تو اپنی جگہ دوسری کی جھولی میں ڈال دوں گی۔

میں اسپتال کی ملازت چھوڑ کر چلی آئی۔ گھر کے سارے انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ ویسے میں صرف ایک اسپتال کی ملازمت نہیں کرتی تھی۔ دوسرے اسپتالوں میں بھی بہت ہی پیچیدہ آپریشن کا معاملہ ہوتا تو تمام ڈاکٹر مجھے ہی بلایا کرتے تھے۔

اپنا گھر سنبھالنے کے ایک ہفتے بعد لاہور کے ایک اسپتال کے ایک بہت بڑے سرجن آئے۔ انہوں نے کہا۔ "کیس بہت ہی پیچیدہ ہے۔ میں تم سے سینئر ہوں۔ آپریشن کر سکتا ہوں پھر بھی تم مجھے اسسٹ نہیں کروگی تو کوئی بھی گڑ بڑ ہو سکتی ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ میں بہت نروس ہوں۔ اس آپریشن میں تمہاری موجودگی لازمی ہے۔"

دوسرے دن صبح دس بجے آپریشن تھا۔ میں نے عرفان سے کہا۔ "کسی کی زندگی اور

موت کا سوال ہے۔ مجھے آپریشن کے لیے جانے کی اجازت دیں۔"

پہلے تو انہوں نے رسمی طور پر اعتراض کیا۔ پھر مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ میں اس بات کو سمجھ نہیں پائی کہ انہوں نے محض کوٹھی میں عشرت کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے مجھے ایک فرض کی ادائیگی کے لئے جانے دیا تھا۔

جب میں کار میں بیٹھ کر جانے لگی تو تمہارے دادا جان نے کہا۔ "بہو! میں فرض کی ادائیگی سے نہیں روکوں گا لیکن ایک بات سمجھا دیتا ہوں کہ تم انجانے میں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہی ہو۔"

میں نے ان سے وعدہ کیا۔ "آئندہ گوجرانوالہ کے اسپتالوں میں فرائض انجام دوں گی اور دن رات اپنی کوٹھی میں آتی جاتی رہوں گی۔"

میں لاہور چلی گئی۔ وہاں آپریشن اس قدر پیچیدہ تھا کہ محنت اور تجربہ کام آیا۔ مریض بچ گیا لیکن اس کی حالت بہت نازک تھی۔ ہم شام تک اسے اٹینڈ کرتے رہے اور اسے زندگی اور موت کی کشمکش سے نکال کر زندگی کی طرف لانے کی کوششیں کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری محنت کو رائیگاں جانے نہیں دیا۔ رات کے ایک بجے اس کی حالت سنبھل گئی۔ اب ہم آرام کرسکتے تھے۔ میرے سینئر سرجن کی بیوی اسے گھر لے جانے آئی تھی۔ اس نے کہا۔ "تم اتنی رات کو گوجرانوالہ تنہا کیسے جاؤ گی۔ ہمارے ساتھ چلو۔ کل صبح چلی جانا۔"

میں نے وہ رات ان کے گھر گزار دی۔ دوسری صبح پھر اس مریض کو اٹینڈ کیا۔ اس کے بعد مطمئن ہو کر گھر واپس آئی تو عرفان کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ انہوں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "کل رات کہاں تھیں؟"

میں نے اپنی طرف سے صفائی پیش کی۔ عرفان نے گرج کر کہا۔ "جھوٹ مت بولو۔ کل صبح دس بجے آپریشن تھا۔ کیا تم تمام دن آپریشن کرتی رہی تھیں۔ پھر اس ڈاکٹر سے تمہارا کیا تعلق رشتہ ہے' جس کے ساتھ رات گزار کر آرہی ہو۔"

عرفان کے ماموں نے کہا۔ "تم اتنے بڑے خاندان کی بہو بن کر ہماری ناک کٹانے آئی ہو؟"

میں نے کہا۔ "ماموں جان! میں پاک دامن ہوں۔ آپ اس دامن پر داغ نہ لگائیں۔ میں ڈاکٹر احتشام کا فون نمبر بتا رہی ہوں۔ آپ خود معلوم کریں۔ میں ان کی بیوی کے ساتھ تھی۔"

ماموں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "نمبر بولو۔"

میں نے نمبر بتائے۔ ماموں نے نمبر ڈائل کیے۔ پھر عرفان کو ریسیور دے کر کہا۔
"بیٹے! دوسری طرف بیل ہو رہی ہے۔ تم بات کرو۔"
عرفان نے کان سے ریسیور لگایا۔ پھر پوچھا۔ "کیا ڈاکٹر احتشام صاحب ہیں؟"
دوسری طرف سے آواز آئی۔ "جی ہاں۔ میں بول رہا ہوں۔ آپ کون ہیں؟"
"میرا نام عرفان علی ہے اور لیڈی سرجن آمنہ میری بیوی ہے۔"
"او۔ اچھا سمجھ گیا۔ وہ شاید گھر نہیں پہنچی ہیں۔ تعجب ہے۔ میرے ساتھ تو صرف صبح تک رہی۔ شاید کسی دوسرے ڈاکٹر کے پاس گئی ہوں گی۔"
عرفان نے کہا۔ "میں آپ کی وائف سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"
دوسری طرف سے حیرت سے پوچھا گیا۔ "میری وائف؟ بھئی ذرا عقل سے کام لیں۔ میری کوئی وائف ہوتی تو آپ کی وائف میرے پاس تمام رات کیوں رہتیں؟"
عرفان نے غصے سے پوچھا۔ "تم ڈاکٹر ہو' یا شیطان؟ تم نے آپریشن کے بہانے میری وائف کو بلایا تھا۔"
"مجھے شیطان نہ کہو۔ آپ کی وائف نے کہا تھا کہ پرانی راتوں کو دہرانے کے لیے آپریشن کا ہی بہانہ کرنا ہوگا۔"
میں عرفان کی باتیں سن کر پریشان ہو رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "آپ میرے سینئر کو شیطان کیوں کہہ رہے ہیں؟"
عرفان نے طیش میں آکر ریسیور کو ایک طرف پھینکا۔ پھر اٹھ کر مجھے دونوں ہاتھوں سے مارنے لگا۔ میں نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ وہ اپنے ہاتھوں کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوششیں کرنے لگے مگر نہ چھڑا سکے۔ میں نے کہا۔ "عرفان! میں آپ کی عزت کرتی ہوں۔ جائز باتوں پر آپ کی ٹھوکریں کھا سکتی ہوں لیکن ناجائز بات برداشت نہیں کروں گی۔ دیکھو یہ ہاتھ آپریشن کے جان لیوا آلات سے کھیلتے ہیں۔ میں اپنے مریضوں کی موت سے لڑتی رہتی ہوں۔ میرے کردار پر کیچڑ اچھالنے کے لیے آئندہ مجھ پر ہاتھ نہ اٹھانا۔"
میں نے ان کے ہاتھوں کو چھوڑ کر کہا۔ "آپ کے ماموں نے فراڈ کیا ہے۔ میں نے جو فون نمبر بتائے تھے' وہ نمبر انہوں نے ڈائل نہیں کیے۔ یہ میرے خلاف بہت بڑی سازش کر رہے ہیں۔ میں ابھی ڈاکٹر احتشام سے رابطہ کرتی ہوں۔"
میں فون کے پاس نمبر ڈائل کرنے کے لیے جانا چاہتی تھی۔ عرفان نے غصے سے ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ وہ میری گرفت سے اپنے ہاتھ نہیں چھڑا پائے تھے' اس بات کا بھی انہیں غصہ تھا۔ انہوں نے ٹیلی فون توڑ ڈالا۔ پھر کہا۔ "جس ماموں نے

مجھے گود میں کھلایا ہے' تم انہیں فراڈ کہہ رہی ہو؟ میں نے سنا تھا کہ اسپتالوں کی نرسیں اور لیڈی ڈاکٹر بدچلن ہوتی ہیں۔ آج تم نے یہ ثابت کر دیا ہے۔ میں تمہیں طلاق دے کر دوسری شادی کروں گا۔"
میں نے تنبیہہ کے انداز میں انگلی دکھاتے ہوئے کہا۔ "خبردار! طلاق کا لفظ زبان پر نہ لانا۔ آپ میں سے کسی نے میرا دوسرا رخ نہیں دیکھا ہے۔ آپ مجھ پر بدچلنی کا الزام لگا کر اس لیے زندہ ہیں کہ میرے مجازی خدا ہیں۔ طلاق کے بعد یہ رشتہ ٹوٹے گا تو میں آپ کو اور آپ کے ان ذلیل رشتے داروں کو ابھی' اسی جگہ موت کی نیند سلا دوں گی۔"
یہ کہتے ہی میں نے اپنے پرس سے پستول نکال لیا۔ وہ سب سہم کر مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے کہا۔ "میں طلاق نہیں لوں گی لیکن آپ کی زندگی سے دور ہو جاؤں گی۔ مگر جانے سے پہلے یہ سن لیں کہ میں طلاق کیوں نہیں لینا چاہتی؟ اس لیے نہیں لینا چاہتی کہ آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"
عرفان نے مجھے چونک کر دیکھا۔ میں نے کہا۔ "جو شرمناک گالی مجھے دی گئی ہے' وہ گالی آپ کی اولاد کو پڑ رہی ہے۔ میں نہیں جانتی بیٹی ہو گی یا بیٹا ہو گا لیکن جو بھی اولاد ہو گی' وہ میری طرح ضدی اور شہ زور ہو گی اور ایک دن آپ کا گریبان پکڑ کر کہے گی میری ماں کی بے حیائی ثابت کرو یا ماں کی نیک نامی واپس لاؤ۔ اگر آپ نے میرے دامن سے بدنامی کا داغ نہ مٹایا تو آپ کی اولاد آپ ہی کو مٹا ڈالے گی۔"
میں نے پستول کا رخ ماموں ہدایت اللہ کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو سچ بتا دو۔ تم نے کس کے نمبر ڈائل کیے تھے؟ ڈاکٹر احتشام بن کر بولنے والا کون تھا؟ سچ بولو گے تو صرف تمہیں زخمی کروں گی۔ تمہیں اپاہج بنا کر زندہ رہنے دوں گی۔ مجھے اس کا نام اور پتا نہیں بتاؤ گے تو ابھی مرو گے۔"
ماموں اچھل کر عرفان کے پیچھے ہو گیا پھر بھانجے کو ڈھال بنا کر بولا۔ "بیٹے عرفان! میں تمہارا ماموں ہوں۔ کیا تمہیں دھوکا دے کر اپنا ہی گھر برباد کروں گا؟ یہ۔ یہ مجھے مار ڈالے گی۔ مجھے اس مصیبت سے نجات دلاؤ۔"
عرفان کے والد یعنی تمہارے دادا جان نے میرے سامنے آکر کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ میری پوتی یا پوتے کو جنم دینے والی قاتل کہلائے۔ دنیا یقین کرے یا نہ کرے' میں تمہاری پارسائی کا یقین دلاتا ہوں۔ تم نے یہ خوش خبری سنا کر مجھے نئی زندگی دی ہے کہ میں دادا بننے والا ہوں۔"
میں نے کہا۔ "بے شک آپ ایک جہاں دیدہ بزرگ ہیں۔ ایک باپ کی طرح اپنی

اس بیٹی کی پارسائی کا یقین کر رہے ہیں لیکن میں اس دنیا میں نیک نامی کے ساتھ جینا چاہتی ہوں۔"

"بیٹی! تمہیں نیک نامی ملے گی۔ یہ عارضی بدنامی ہے۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ تم اس گھر میں اپنے شوہر کو تنہا چھوڑ کر اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہی ہو۔ اصل بدچلن تو یہ میرا بیٹا ہے' جو تمہاری غیر موجودگی میں اپنے ماموں کی بیٹی کو یہاں کی مالکہ بنانے کے لیے تمہارے خلاف ایسی چالیں چل رہا ہے۔"

ماموں نے کہا۔ "دیکھو عرفان! یہ تمہارے ابو مجھے دلال کہہ رہے ہیں۔ میں شرم سے پانی پانی ہو رہا ہوں۔ اب اس گھر میں نہیں رہوں گا۔ کہاں ہے عشرت' بیٹی عشرت چلو یہاں سے۔"

دوسرے کمرے سے عشرت کی آواز آئی۔ "نہیں ڈیڈی! میں وہاں نہیں آؤں گی۔ اس کے ہاتھ میں پستول ہے۔ وہ مجھے مار ڈالے گی۔"

عرفان نے کہا۔ "ابو! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ ایک آمنہ کی خاطر میری امی کے رشتے داروں کو گالیاں دے رہے ہیں۔"

"بیٹے! آئندہ گالیاں دینے کے لیے میں اس گندے ماحول میں نہیں رہوں گا۔ میں اپنی بہو کے ساتھ جا رہا ہوں۔ مجھے بیٹا نالائق ملا۔ انشاء اللہ میری بہو سے ملنے والی اولاد قابلِ فخر ہو گی۔"

تمہارے دادا مجھے سمجھا بجھا کر وہاں سے لے آئے لیکن میں دشمنوں سے انتقام لینے کا عہد کر چکی تھی۔ مجھے رہائش کے لیے اسپتال کی طرف سے ایک بنگلا مل گیا۔ تمہارے دادا بہت خود دار تھے۔ انہوں نے کہا۔ "بیٹی! میں تمہارے ساتھ ضرور رہوں گا لیکن لوہار کا پرانا پیشہ اختیار کروں گا۔ دن کو محنت کروں گا' رات کو تمہارے پاس آجایا کروں گا۔"

تمہارے دادا جان مجھے دل و جان سے چاہتے تھے۔ میں نے ان کی خود داری کو ٹھیس پہنچنے نہیں دی۔ وہ ایک دکان کرائے پر لے کر محنت مزدوری کرنے لگے۔ مجھ سے کہتے تھے۔ "اگر پوتا ہو گا تو اسے پیشے کے اعتبار سے لوہار اور جسمانی اعتبار سے فولاد بناؤں گا اور تم اسے اپنی طرح تعلیم یافتہ بناؤ گی۔"

میں کہا کرتی تھی۔ "میں جسے جنم دوں گی' اس پر آپ کا مکمل حق ہو گا۔ آپ جیسا چاہیں گے' ویسا بنائیں گے۔"

لیکن میں نے انہیں کبھی یہ نہیں بتایا کہ میں دشمنوں سے نمٹنے کے لیے کس طرح ان کے پیچھے لگی رہتی ہوں اور ان کے متعلق بہت سی معلومات حاصل کرتی جا رہی ہوں۔

عرفان نے اپنے ماموں کی بیٹی عشرت جہاں سے شادی کر لی تھی۔ ان کی شادی کے چار ماہ بعد میں نے تمہیں جنم دیا۔ تمہارے دادا جان بہت خوش تھے۔ انہوں نے تمہارا نام فرمان علی تاباں رکھا۔ تمہارے دادا کے والد کا نام خورشید تاباں تھا۔ انہیں اپنے والد سے عقیدت تھی۔ اس لیے تمہارے نام کے ساتھ تاباں منسلک کر دیا۔

میں کیا بتاؤں کہ تم کیسے گورے چٹے' گول مٹول سے پیارے سے تھے۔ تمہیں دیکھ دیکھ کر بھی دل نہیں بھرتا تھا۔ میں ایک خود غرض ماں کی طرح سوچتی تھی کہ کبھی اپنے سے جدا نہیں کروں گی۔ تمہیں فولاد بننے کے لیے تمہارے دادا کے حوالے نہیں کروں گی۔ میں نے ان سے کہا۔ "آپ کا پوتا کتنا پیارا ہے۔ اسے ڈاکٹر بنانا چاہیے۔"

انہوں نے کہا۔ "ہم دونوں اپنے اپنے طور پر اسے ڈاکٹر اور لوہار بنانے کی کوششیں کریں گے۔ میں نے اپنے بیٹے کو بھی بچپن سے لوہار بناتے بناتے ایک کارخانے کا مالک بنا دیا۔ تم اپنی کوششوں سے اسے ڈاکٹر ضرور بناؤ۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اتنی زندگی ملے کہ میں اپنے پوتے کو اپنے بیٹے سے بڑا آدمی بنا کر اس کے مقابل کھڑا کروں اور اسے بتاؤں کہ اولاد محض گوشت پوست کا لوتھڑا ہوتی ہے۔ صرف ماں باپ اسے پہاڑ بناتے ہیں۔"

ہم نے تمہارے لیے بہت کچھ سوچ رکھا تھا لیکن حالات پوری طرح ہمارے موافق نہیں تھے۔ جب تم دو برس کے ہوئے تو ایک رات اسپتال سے اپنے بنگلے کی طرف جاتے ہوئے ایک بڑی سی وین نے میری کار کا راستہ روک لیا۔ مجھے زبردستی کار سے کھینچ کر وہاں سے اتار کر وین میں بٹھا دیا۔ وہ کلاشنکوف لیے ہوئے تھے اور دھمکی دے رہے تھے کہ میں ذرا بھی چیخوں گی تو مجھے گولی مار دی جائے گی۔

انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ پتا نہیں وہ مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔ میں تمہارے لیے پریشان بھی تھی اور یہ اطمینان بھی تھا کہ تم بنگلے میں اپنے دادا کے پاس ہو۔ وہ وین بڑی دیر تک چلتی ہوئی ایک جگہ رک گئی۔ مجھے سہارا دے کر اتارا گیا۔ پھر وہ میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر مجھے کسی مکان کے اندر لائے اور میری آنکھوں پر سے پٹی ہٹا دی گئی۔

وہ ایک بڑا سا کمرا تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک اسٹریچر بیڈ پر ایک زخمی لیٹا ہوا تھا۔ میں اغوا کو بھول کر اپنی عادت سے مجبور ہو کر دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ پھر بولی "خون بہت بہہ رہا ہے۔ اسے اسپتال کیوں نہیں لے جاتے؟"

ایک ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ "اسے اسپتال لے جائیں گے تو ہم سب گرفتار

ہو جائیں گے۔ یہ میرا جوان بیٹا ہے' پولیس مقابلے میں اسے دو گولیاں لگی ہیں۔ خدا کے لیے اسے کسی طرح بچالو۔"

میں نے دیکھا ایک میز پر آپریشن کے کچھ آلات رکھے ہوئے تھے اگرچہ وہ ضرورت کے مطابق نہیں تھے۔ مگر جتنے آلات تھے' میں ان سے کام کر سکتی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "اس کے خون کا گروپ کیا ہے؟ کم از کم دو خون کی بوتلیں ضروری ہیں۔"

اس زخمی جوان کے باپ نے کہا۔ "میں ایک بوتل لے آیا ہوں۔ دوسری بوتل ابھی آجائے گی۔ پلیز اس کے جسم سے گولیاں نکالو۔"

اس نے ایک سادہ سا کپڑا دیا۔ میں نے اسے ایپرن کے طور پر باندھ لیا۔ منہ کو دوپٹے سے لپیٹ لیا۔ پھر ضروری آلات ایک ٹرے میں رکھ کر ایک شخص سے کہا کہ وہ میرے قریب کھڑا رہے۔ باقی چھ افراد تھے۔ انہیں کمرے سے باہر جانے کے لیے کہہ دیا۔ وہ سب چلے گئے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر ایسے ماحول میں آپریشن شروع کیا جہاں ایک معمولی سا آپریشن بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

وہ تمام اسلحہ بردار مجرم تھے مجھے جبراً اٹھا کر لائے تھے۔ اگر میں آپریشن کرنے سے انکار کر دیتی تو وہ مجھے گولی نہیں مار سکتے تھے۔ اسلحہ پھینک کر میرے قدموں میں گر کر اپنے باس کے بیٹے کی جان بچانے کے لیے گڑگڑاتے رہتے لیکن میں نے ایسا موقع نہیں آنے دیا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ میں مسیحائی کا شدید جذبہ دیا ہے۔ میں زخمیوں کو دیکھ کر خود بے چین ہو جاتی ہوں اور ان کی موت سے لڑنے لگتی ہوں۔

بہرحال میں نے اس کے جسم میں پیوست ہونے والی دو گولیاں نکال دیں۔ خون کے بہاؤ کو روک دیا۔ اسے نیا خون پہنچانے کا انتظام کیا اور کمرے سے باہر آئی۔ باس نے تیزی سے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"تمہارا بیٹا خطرے سے باہر ہے مگر چند دوائیں ضروری ہیں انہیں فوراً منگواؤ۔"

میں نے دوائیں لکھ کر دیں پھر باس سے کہا۔ "یہ نہ سمجھنا کہ میں نے اپنی سلامتی کے لیے تمہارے بیٹے کی جان بچائی ہے۔ تم سب مجرم ہو لیکن میرے سامنے جو زخمی تھا' وہ میرے لیے صرف ایک مریض تھا۔ مریض دوست ہو' دشمن ہو' انسان ہو یا شیطان ہو' اس کا علاج میرے لیے ایک عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔"

باس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بیٹی! میں نے جوان بیٹے کی محبت سے مجبور ہو کر تمہیں اغوا کرایا ہے۔ میں نے تمہاری بڑی تعریفیں سنی ہیں۔ میں نے ایک بار ایک ڈاکٹر سے سنا تھا کہ تم صرف ایک چاقو اور ایک قینچی سے لالٹین کی روشنی میں آپریشن

کر سکتی ہو۔ آج تم نے ثابت کر دیا کہ ایک بے مثال سرجن ہو۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ تم نے آپریشن سے انکار کیا تو میں تمہارے بیٹے کو گھر سے اٹھا لاؤں گا۔ پھر تم اپنی ممتا سے مجبور ہو کر میرے بیٹے کی جان بچاؤ گی۔ مگر تم نے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ واقعی تم عبادت سمجھ کر اپنا فرض ادا کرتی ہو۔"

"آپ اطمینان رکھیں۔ میں اس کے زخم بھرنے تک اس کا علاج کرتی رہوں گی لیکن بار بار یہاں آنکھوں پر پٹی باندھ کر نہیں آؤں گی۔ آپ کو مجھ پر بھروسا کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھروسا کروں گا۔ میرا نام ملک قاسم جان ہے۔ یہاں سے اسلام آباد تک اونچی سوسائٹی میں میری بڑی شہرت ہے۔ بہت کم سیاست دان اور بیورو کریٹس جانتے ہیں کہ جنوبی ایشیا میں انڈر ورلڈ کا بے تاج بادشاہ ہوں۔ آج رات کاؤنٹر فائرنگ میں پولیس والے میرے بیٹے کو نہ پہچان سکے لیکن اسے اسپتال لے جاتے تو یہ پہچانا جاتا۔ پھر مجھے اپنے غیر قانونی ذرائع سے اس پولیس پارٹی کے افسر اور سپاہیوں کو مار ڈالنا پڑتا یا ان کا تبادلہ کرانا پڑتا۔ مگر تم نے اتنے بڑے معاملے کو بڑی خاموشی سے نمٹا دیا۔"

میں نے جو دوائیں لکھ کر دی تھیں۔ اسے ایک بندہ لے آیا۔ ملک قاسم جان نے کہا۔ "بیٹی! تم بتادو' یہ دوائیں کیسے استعمال کرائی جائیں گی پھر تم گھر جا کر آرام کرو۔"

"صرف دوائیں استعمال کرانے سے کام نہیں بنے گا۔ مجھے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھے چیک کرنا ہوگا کہ اس کی نبض اور دل کی دھڑکنیں اعتدال پر ہیں یا نہیں؟ جب آپ نے مجھے بیٹی کہا ہے تو میں اپنے بھائی کو ایسی حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

ملک قاسم جان خوشی سے کھل اٹھا۔ اس نے میری پیشانی چوم کر دعائیں دیں۔ میں نے فون کے ذریعے تمہارے دادا جان سے کہا کہ ایک مریض کی حالت بہت نازک ہے۔ میں اس کے علاج میں مصروف ہوں اس لیے کل دس گیارہ بجے تک آسکوں گی۔

تمہارے دادا جان نے کہا۔ "میں کئی بار اسپتال فون کر چکا ہوں۔ پتا نہیں تم کس مریض کے پاس ہو۔ میں تمہیں بہو سے زیادہ بیٹی مانتا ہوں۔ اس لیے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا یا تو یہ پیشہ چھوڑ دو یا مجھے یہاں سے جانے دو۔"

انہوں نے فون بند کر دیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اب تمہارے دادا جان بھی مجھ پر شبہ کرنے لگے ہیں۔ میں بڑی کشمکش میں مبتلا ہوگئی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایک لیڈی ڈاکٹر کی حیثیت سے کیسے نیک نام رہوں۔ جبکہ شوہر سے بھی علیحدگی ہوگئی تھی۔ جسے شوہر چھوڑ دے وہ عورت تو یوں بھی تنقید کا نشانہ بنتی رہتی ہے۔

ملک قاسم جان نے مجھے پریشان دیکھ کر پوچھا۔ "بیٹی! کوئی پریشانی ہے؟ مجھ سے بولو۔ میں ایک باپ کی طرح ہر پریشانی اور مصیبت کے سامنے ڈھال بن کر رہوں گا۔"

میں نے اسے تمام حالات بتائے۔ اس نے کہا۔ "میں ان کمینوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے ان کے نام اور پتے بتاؤ۔"

"مارنا ہوتا تو میں انہیں بہت پہلے ہلاک کر چکی ہوتی۔ ان کی موت سے میری بدنامی ختم نہیں ہوگی۔ میں انہیں مجبور کردوں گی کہ وہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر میری پارسائی کا اعتراف کریں۔"

"تم اپنے چھوٹے بچے اور سسر کے ساتھ رہتی ہو۔ اکثر ایمرجنسی میں راتوں کو اسپتال یا کسی مریض کے گھر جاتی ہوگی۔ لوگ تمہاری فرض شناسی کو نہیں سمجھیں گے۔ خواہ مخواہ بدنام کرتے رہیں گے۔"

"جو خواہ مخواہ عورتوں کو بدنام کرتے ہیں' میں انہیں سخت سے سخت سزا دے سکتی ہوں۔ اس کے لیے آپ کی مدد چاہتی ہوں۔"

"ہاں بولو۔ جو چاہو گی' وہ کروں گا۔"

"میں انڈر گراؤنڈ تنظیم میں ملک قاسم جان کی بیٹی کہلانا چاہتی ہوں۔ میرے پاس ایسے اختیارات ہوں کہ آپ کے تمام ماتحت میرے ایک حکم پر آدھی رات کو بھی میرے پاس دوڑے چلے آئیں اور میرے لیے جان کی بازی لگانے سے گریز نہ کریں۔"

"آمنہ! جب تم میری بیٹی ہو تو میرے تمام ماتحت تمہارے ماتحت بن کر رہیں گے۔ کوئی تمہارے جان لیوا حکم سے بھی انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔"

پہلے میں تنہا تھی۔ اب ایک انڈر گراؤنڈ خطرناک تنظیم کی قوت حاصل کر لی اور یہ اس لیے کہ آئندہ مجھے کمزور اور تنہا رہنے والی عورت سمجھ کر لوگ میرے فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ نہ بنیں۔

دوسرے دن ملک قاسم جان کے بیٹے ہاشم جان کی حالت سنبھل گئی۔ وہ باپ کو دیکھ کر مسکرایا۔ قاسم جان نے میری طرف اشارہ کرکے کہا۔ "بیٹے! اس لیڈی ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرو۔ اس نے تمہیں موت کے منہ سے بچایا ہے۔ یہ میری بیٹی اور تمہاری سگی بہن سے بھی بڑھ کر ہے۔"

ہاشم جان کچھ کہنا چاہتا تھا' میں نے کہا۔ "کچھ نہ بولو۔ میں دوا دے رہی ہوں۔ تمہیں پھر نیند آئے گی۔ تمہیں زیادہ سے زیادہ آرام کرنا چاہیے۔"

میں نے اسے دوائیں کھلائیں۔ ایک انجکشن لگایا۔ وہ تھوڑی دیر بعد سو گیا۔ میں دو

چار گھنٹے بعد واپس آنے کا وعدہ کرکے اپنے بنگلے میں آئی۔ تمہارے دادا مجھ سے سخت ناراض تھے۔ انہوں نے کچھ سخت باتیں بھی کیں۔ میں نے برداشت کیا پھر کہا۔ "میں ایک جوان لیڈی ڈاکٹر ہوں اور بدقسمتی سے یہ بات پھیل گئی ہے کہ خاوند نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ مگر حقیقت کیا ہے' یہ آپ جانتے ہیں لیکن آئندہ آپ کو بھی میرا گھر سے باہر رہنا ناگوار گزرے گا۔ میں کسی مریض کو زندگی اور موت کی کشمکش میں چھوڑ کر نیک نامی قائم رکھنے کے لیے راتوں کو گھر نہیں آسکوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ بات آپ کے ذہن پر گراں گزرے۔ میرا چال چلن اچھا ہے یا بُرا؟ یہ آپ خدا پر چھوڑ دیں اور میرے بیٹے کو یہاں سے لے جائیں۔"

انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم میرے پوتے کو میرے حوالے کرو گی؟ اپنے بیٹے کے بغیر رہو گی؟"

"ہاں کل رات ایک بہت خطرناک مجرم نے کہا تھا۔ اگر میں اس کے بیٹے کا آپریشن نہ کرتی تو وہ میرے بیٹے کو اغوا کر لیتا۔ میں نے اس خطرناک مجرم سے سمجھوتا کر لیا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں' ہماری دنیا میں وہی ایک خطرناک مجرم تو نہیں ہے۔ آئندہ کسی دوسری تنظیم اور مافیا والے میرے بیٹے کو میری کمزوری بنا سکتے ہیں۔ اس معصوم پر ظلم کر سکتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں' میری کوئی کمزوری کسی کے ہاتھ میں نہ آئے۔ یہ مجھ سے دور آپ کے سائے میں رہے گا تو کوئی اسے اغوا نہیں کر سکے گا۔"

انہوں نے کہا۔ "میں تمہاری ممتا اور دانش مندی کو سمجھ رہا ہوں۔ میرے پوتے اور تمہارے بیٹے کی بہتری اسی میں ہے کہ تم اپنے کلیجے پر پتھر رکھ لو۔ میں آج کرائے کا ایک مکان تلاش کرکے اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"مگر میری ایک شرط ہے' میں اپنے بیٹے کی پرورش اور تعلیم کے اخراجات پورے کرتی رہوں گی۔ یہ میرا حق ہے اور آپ مجھے یہ حق ادا کرنے دیں گے۔"

تمام معاملات طے ہونے کے بعد تمہارے دادا جان تمہیں اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے اطمینان تھا کہ تم جہاں رہو گے' میں وہاں جا کر تمہیں دور سے دیکھ لیا کروں گی۔ لیکن کسی دشمن کو معلوم نہیں ہونے دوں گی کہ تم کسی متوسط طبقے والوں کے علاقے میں اپنے دادا جان کے ساتھ رہتے ہو۔

میں نے تمہیں ہر طرح سے تحفظ فراہم کرنے کے بعد عرفان کے ماموں کی خبر لی۔ ایک رات ملک قاسم جان کے تین وفاداروں کے ساتھ کارخانے کے احاطے میں اس بنگلے کے اندر پہنچ گئی' جہاں وہ ماموں ہدایت اللہ رہتا تھا۔

رات کے نو بجے وہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی ایک دم سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ حیرانی سے بولا۔ "تم؟ تم یہاں کیسے آئیں؟ کیا گیٹ پر مسلح پہرے دار نہیں ہیں؟"

میں نے کہا۔ "پہرے دار تھے۔ ہم نے صبح تک کے لیے انہیں سلادیا ہے اور تمہیں قیامت تک کے لئے سلانے آئے ہیں۔"

وہ کرسی پر بیٹھ کر اپنے لباس کے اندر ہاتھ ڈال رہا تھا۔ میرے ساتھ آنے والے ایک ماتحت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر موڑ دیا۔ پھر دوسرا ہاتھ اس کے لباس میں ڈال کر ایک ریوالور نکال لیا۔ میں نے دوسرے ماتحت سے کہا۔ "اس کے ریوالور کو کپڑے سے صاف کرو۔ اسی ریوالور سے اسے قتل کرنے کے بعد اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا جائے گا۔ پولیس والے یہی سمجھیں گے کہ اس نے اپنے ہی ریوالور سے خودکشی کی ہے۔"

اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "نن۔ نہیں۔ مجھے قتل نہ کرو۔ آمنہ تم میری بیٹی ہو۔ میں تمہارے باپ جیسا.........."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے میں نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر مارا۔ پھر کہا "صرف کام کی بات کرو۔ تم نے فون نمبر غلط ڈائل کیا تھا۔ اپنے کسی آلہ کار کو پہلے سے سمجھا دیا تھا کہ وہ ڈاکٹر احتشام بن کر مجھے بدچلن ثابت کرے۔ کون تھا وہ تمہارا آلہ کار؟"

میں نے ماموں کو ایک لات ماری۔ وہ کرسی سمیت پیچھے کی طرف فرش پر الٹ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے سینے پر پیر رکھ کر کہا۔ "میں نے اسی دن کہہ دیا تھا، سچ کہو گے تو صرف اپاہج بنا کر زندہ چھوڑ دوں گی۔ جھوٹ بولو گے تو بڑی بے دردی سے ہلاک کروں گی۔"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "میں سچ کہتا ہوں۔ میں نے جس کا نمبر ڈائل کیا تھا اور جو ڈاکٹر احتشام بن کر تمہیں بدنام کر رہا تھا، وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ پتا نہیں وہ کتنے قتل کرچکا ہے۔"

"اس نے ہزاروں قتل کیے ہوں گے۔ مجھے ڈرانے کی کوشش نہ کرو۔ اس کا نام اور پتا بتاؤ۔"

"آمنہ! میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ پہلے اسے نہیں جانتا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں اپنی بیٹی کی شادی عرفان سے کرنے کے لیے تمہیں راستے سے ہٹانا چاہتا ہوں اور تمہیں بدنام کرکے عرفان کی نظروں سے گرانا چاہتا ہوں تو وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ وہ تمہارا دیوانہ ہے۔ اگر عرفان تمہیں طلاق دے تو وہ تمہیں اپنی داشتہ بنا کر رکھے گا۔

تب ہم نے تمہارے خلاف منصوبہ بنایا اور اس پر جس طرح عمل کیا، وہ تم دیکھ چکی ہو۔"

"اتنی لمبی باتیں نہ کرو۔ سیدھا سا جواب دو۔ وہ کون ہے؟ اس کا کیا نام ہے؟ اور وہ کہاں رہتا ہے؟"

"میں اپنے بچوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں، یہ نہیں جانتا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ وہ کوئی پُراسرار قاتل ہے۔ مگر ہاں میں نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ اپنی کچھ تصویریں دے گا تو میں ایک بہت ہی ماہر فوٹوگرافر کے ذریعے تمہاری اور اس کی تصویریں اس طرح مکس کراؤں گا کہ وہ تمہارے لیے شرمناک اور بدنامی کا باعث بن جائیں گی۔"

میں نے کہا "چلو اٹھو۔ مجھے اس کی تصویریں دکھاؤ اور ابھی تک تم نے اس کا نام نہیں بتایا ہے۔"

وہ فرش پر سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "اس نے اپنا اصل نام نہیں بتایا۔ صرف اتنا کہا کہ دوست اور دشمن اسے ڈینجرس مین کہتے ہیں۔"

ماموں ہمارے آگے کانپتے ہوئے چلنے لگا۔ میرے ایک ماتحت نے کہا۔ "میڈم! ہم ایک ڈینجرس مین کو جانتے ہیں۔ پتا نہیں یہ کس کا ذکر کر رہا ہے۔ ابھی تصویر دیکھ کر پتا چل جائے گا۔"

ماموں نے کمرے میں آکر ایک الماری کھولی۔ اندر سے ایک لفافہ نکال کر اس میں سے دو تصویریں نکالیں۔ میں نے ایک تصویر دیکھی۔ وہ ایک جوان صحت مند تھا۔ اس کا رنگ کچھ سیاہی مائل تھا۔ میرے ماتحت نے دوسری تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو شمشیر سنگھ کالیا ہے اور واقعی ڈینجرس مین کہلاتا ہے لیکن اسے تو بھارت میں ہونا چاہیے تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "تم اسے اچھی طرح جانتے ہو؟"

تینوں ماتحتوں نے کہا کہ وہ اسے اچھی طرح جانتے ہیں پھر ایک نے کہا۔ "میڈم! ہم اس شمشیر سنگھ کالیا کے بارے میں واپسی پر بتائیں گے پہلے آپ اس سے نمٹ لیں۔"

میں نے ماموں ہدایت اللہ سے کہا۔ "ایک لیٹر پیڈ اور قلم اٹھاؤ اور میز پر بیٹھ کر پوری تفصیل لکھو کہ اپنی بیٹی عشرت جہاں کو عرفان کی شریک حیات بنانے کے لیے مجھے بدچلن ثابت کرنے کی خاطر کیسے منصوبے بنائے گئے تھے اور شمشیر سنگھ کالیا عرف ڈینجرس مین کے ساتھ کیسے ان منصوبوں پر عمل کرکے مجھے بدنام کرکے عرفان کی زندگی سے نکالا گیا ہے۔"

وہ میرے حکم کے مطابق لکھنے لگا۔ میں درمیان میں اسے ٹوکتی رہی کہ وہ پوری تفصیل سے لکھے اور اپنی بیٹی عشرت کی بھی یہ بات نہ چھپائے کہ جب میں لاہور میں ہوئی

تھی تو عشرت اپنی اداؤں سے عرفان کو دیوانہ بنایا کرتی تھی۔

جب وہ تحریر ختم کرنے لگا تو میرے ایک ماتحت نے کہا۔ "ٹھہرو۔ ابھی اس اعتراف نامے کا اختتام نہ کرو۔ آگے لکھو کہ تم شمشیر سنگھ کالیا کی زیر زمین سرگرمیوں کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ بھارتی انڈر ورلڈ کا گاڈ فادر ہے۔ انٹرپول والوں سے چھپ کر آتا تھا اور تمہارے گھر میں پناہ لیتا تھا۔"

وہ گن پوائنٹ پر تھا۔ اس سے جو کہا گیا' وہ لکھتا چلا گیا۔ وہ تحریر لیٹر پیڈ کے چار کاغذوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے ان کاغذات کو تہہ کرکے اپنے پاس رکھتے ہوئے ماتحتوں سے کہا۔ "اسے پوری بوتل پلاؤ۔"

دو ماتحتوں نے اسے جکڑ لیا۔ تیسرے نے بوتل کھول کر اس کے منہ سے لگا دی۔ پانی یا سوڈے کے بغیر وہ شراب انگارے کی طرح جلتی ہوئی اس کے حلق سے اتر رہی تھی۔ پہلے تو وہ تڑپتا رہا۔ پھر شانت ہوگیا۔ نشے کے باعث اس کی کھوپڑی الٹ گئی تھی۔

میں نے کہا۔ "اس کا ایک پیر بیکار کردو۔"

ایک ماتحت نے ریوالور میں سائلنسر لگا کر اس کے گھٹنے کا نشانہ لیا۔ پھر کھٹا کھٹ فائر کرتے ہوئے چار گولیوں سے گھٹنے کی ہڈی کو ریزہ ریزہ کردیا۔ تکلیف کی شدت کے باعث نشہ ہرن ہو رہا تھا۔ وہ چیخنا چاہتا تھا لیکن اس کا منہ سختی سے دبا دیا گیا۔ وہ بے ہوش ہوگیا۔

اسپتال کی نرسیں اور وارڈ بوائز میری بے حد عزت کرتے تھے میں جب بھی کسی آپریشن کا معاوضہ وصول کرتی تھی تو انعام کے طور پر ان سب کو کافی رقم دیا کرتی تھی۔ میں نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ اسپتال کی انتظامیہ والے یا پولیس والے میرے بارے میں پوچھیں تو ان سب کا ایک ہی جواب ہونا چاہیے کہ میں رات آٹھ بجے سے صبح دس بجے تک اسپتال میں ڈیوٹی پر تھی۔ پھر میں نے ماموں ہدایت اللہ کو اپاہج بناتے ہی اسپتال پہنچ کر دو چار مریضوں کو اٹینڈ کیا تھا۔ ان مریضوں کے مختلف وارڈ میں دیوار گھڑیاں نہیں تھیں۔ دوسرے دن پولیس نے اسپتال آکر انکوائری کی تو اسپتال میں میری موجودگی ثابت ہو رہی تھی۔

اسپتال کی انتظامیہ کے اعلیٰ عہدے داروں نے کہا۔ "انسپکٹر! کیا آپ نہیں جانتے کہ ڈاکٹر آمنہ کتنی معروف سرجن ہیں۔ تمام سینئر ڈاکٹر بھی ان کی عزت کرتے ہیں۔ آپ ڈاکٹر آمنہ کے خلاف ایسی مضحکہ خیز بات کر رہے ہیں۔ جیسے وہ ڈاکٹر نہیں گینگ لیڈر ہوں اور اپنے ساتھ تین غنڈوں کو لے کر آئی ہوں۔"

میرے مجازی خدا عرفان میرے سامنے نہیں آئے لیکن عشرت کے ساتھ پولیس

والوں کے پاس دوڑتے رہے۔ مگر یہ ثابت نہ ہوسکا کہ میں نے ان کے ماموں کو اپاہج بنایا ہے۔ پھر ملک قاسم جان نے پولیس والوں کو وارننگ دی۔ "ڈاکٹر آمنہ میری بیٹی ہے۔ اس پر الزام لگانے والوں سے کہہ دو کہ ان سب کی شامت آگئی ہے اور تم لوگوں کی بھی وردیاں اترنے والی ہیں۔"

میرے ساتھ رہنے والے ماتحتوں نے ملک قاسم جان کو بتایا کہ بھارتی انڈر گراؤنڈ تنظیم کا گاڈ فادر شمشیر سنگھ کالیا عرف ڈینجرس مین یہاں آیا تھا اور میڈم آمنہ کو اپنی داشتہ بنانا چاہتا تھا۔

قاسم جان نے میرے سامنے خفیہ موبائل فون کے ذریعے ڈینجرس مین سے رابطہ کیا۔ پھر کہا۔ "ہیلو کالیا! میں کیو۔ جے ہوں۔"

اس نے کوڈ نیم کے طور پر خود کو کیو۔ جے کہا۔ ادھر سے وہ غرا کر بولا۔ "میں نے ہزار بار کہا ہے' مجھے کالیا نہ کہو۔ میں ڈینجرس مین ہوں۔ مجھے غصہ آگیا تو میں کوڈ نیم کے بدلے تمہارا اصلی نام لوں گا۔ پھر یہ فون کال پکڑی جائے گی تو انٹرپول والے تمہاری گردن دبوچنے پہنچ جائیں گے۔"

"ابے کالیے! کسے دھمکی دے رہا ہے؟ تو میرا اصلی نام لے گا۔ میں تیرا اصلی نام لوں گا۔ پھر تیرے انٹرپول والے رشتے دار تیری بھی گردن دبوچنے بھارت پہنچ جائیں گے۔ اب یہ بتا کہ پاکستان کیوں آیا تھا؟ یہاں تونے میری غفلت سے کیا فائدہ اٹھایا ہے؟"

"چور سے پوچھتا ہے' کیا چوری کرنے آیا تھا؟ تو وہاں کا تیس مار خاں ہے۔ خود ہی معلوم کرلے۔"

"وہ تو معلوم کرلوں گا لیکن تونے میری بیٹی ڈاکٹر آمنہ کا گھر اجاڑا ہے۔ میں بھارت کی زمین سے تیرے قدم اکھاڑ دوں گا۔"

"اے! اے! ذرا ٹھہر ٹھہر کر بول۔ یہ کیا بول رہا ہے؟ وہ ڈاکٹر آمنہ تیری بیٹی ہے؟ مگر تیرا تو صرف ایک ہی بیٹا ہے۔"

"میں جو کہہ رہا ہوں' اسے دماغ میں نقش کرلے۔ کل سے موت تیرا پیچھا کرتی رہے گی۔"

وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ "تیری بیٹی کی قسمت اچھی تھی کہ میں نے اس کا گھر اجاڑ کر اسے اغوا نہیں کیا کیونکہ یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ ہم ہندو گربھ وتی کو ہاتھ نہیں لگاتے اس لیے سوچا' ایک برس بعد خاص طور پر اس حسینہ کے لیے پاکستان آؤں گا۔ لیکن تیسرا برس گزر رہا ہے۔ یہاں کے معاملات میں کچھ اس طرح الجھ گیا ہوں کہ دل میں

اتر جانے والی کو اپنے بیڈ روم میں لانے کا موقع نہیں مل رہا ہے۔ مگر کچھ بھی ہو۔ آؤں گا۔ اس کے لیے ضرور ایک بار آؤں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ قاسم جان نے غصے سے اپنے موبائل کو دیکھا۔ پھر اسے آف کر کے بولا۔ "بیٹی! وہ بہت کمینہ ہے۔ آج سے تمہاری کوٹھی کے اطراف میرے آدمی خفیہ طور پر پہرا دیں گے۔ تم جس اسپتال میں بھی آپریشن کے لیے جاؤ گی' سیکورٹی گارڈز تمہاری نگرانی کرتے رہیں گے۔ وہ بہروپیا ہے۔ بھیس بدل کر دھوکا دیتا ہے۔ اس کا ایک بہت ہی خطرناک باڈی گارڈ ہے' اس کا نام بھیا داس ہے۔ اس کی جسمانی قوت ایسی ہے کہ دشمن اسے روبوٹ کہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں ایسے دشمنوں کے چہروں سے واقف رہنا چاہتی ہوں۔ کیا بھیا کی تصویر ہوگی؟"

"میرے پاس تصویر ہے۔ تمہیں مل جائے گی۔"

ایک وقت تھا۔ جب میں ایک سیدھی سادی سی لیڈی ڈاکٹر تھی۔ عرفان سے شادی کرنے کے بعد میرے خلاف ایسی سازشیں ہوتی رہیں کہ میری شخصیت اور میری زندگی گزارنے کا انداز بدلتا گیا۔ یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ایک جوان لیڈی ڈاکٹر شرافت اور سادگی سے زندگی نہیں گزار سکتی۔ بدنام کرنے والے اس طرح اس کا پیچھا کرتے ہیں کہ بدنامی اس کا مقدر بنتی چلی جاتی ہے۔

بہرحال حالات نے مجھے پتھر بنا دیا تھا۔ چھ برس گزر گئے۔ شمشیر سنگھ کالیا میرا دیوانہ بن کر نہیں آیا۔ اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ اس عرصے میں عشرت اور عرفان دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کے والدین بن گئے۔ میں نے عرفان کو چیلنج کیا تھا کہ میں اس کی اولاد کو جنم دوں گی' وہی اولاد جوان ہو کر اس کا گریبان پکڑے گی اور اس سے اپنی ماں کی بدچلنی کا ثبوت مانگے گی اس لیے میں نے عرفان سے اپنی توہین کا انتقام نہیں لیا۔

لیکن قدرت بھی بھٹکنے والوں کو کچھ سبق سکھاتی ہے۔ ایک رات عرفان لندن جا رہا تھا۔ لیکن فلائٹ مس ہونے کے باعث واپس آیا تو عشرت کو اپنے ایک عاشق کے ساتھ ایسی شرمناک حالت میں پایا کہ غصہ برداشت نہ کر سکا۔ اس نے عاشق کو مار ڈالنے کے لیے ریوالور نکالنا چاہا لیکن عاشق نے اس پر حملہ کر دیا۔ جس بریف کیس میں ریوالور تھا' وہ لڑائی کے دوران میں پلنگ کے نیچے چلا گیا۔ وہ عاشق بھاگتا ہوا کوٹھی کے باہر آیا۔ وہاں بھی ہاتھا پائی ہوئی۔ وہ بھاگ کر اپنی کار میں آ گیا۔ اسے اسٹارٹ کر کے جانے لگا لیکن عرفان نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ بھی لپک کر دروازہ کھولتا ہوا کار کے اندر پہنچ گیا۔

عشرت گھبرائی ہوئی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ اسے پتا نہ چلا کہ کار کے اندر ان کی لڑائی کا نتیجہ کیا نکلا؟ وہ کار ڈگمگاتی ہوئی تیز رفتاری سے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

بعد میں پتا چلا کہ وہ کار ایک آئل ٹینکر سے ٹکرا گئی تھی اور ٹکراتے ہی ایک دھماکے کے ساتھ شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔

میں اس واقعے کی تفصیل نہیں جانتی۔ میں نے اخبار میں عشرت کا بیان پڑھا۔ اس نے پولیس کو یہ بیان دیا تھا کہ گھر میں چور گھس آیا تھا۔ عرفان کو دیکھتے ہی فرار ہونا چاہتا تھا مگر عرفان بھی اسی کار میں گھس کر اسے پکڑنے اور اپنے قابو میں کرنے گئے تھے۔ پھر وہ کار عشرت کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ اس کار کو حادثہ پیش آیا اور وہ کار شعلوں میں گھر گئی۔

لیکن کار میں دو افراد تھے اور پولیس والوں کو اس کے اندر سے ایک ہی جلی ہوئی لاش ملی تھی۔ اس طرح یہ بات سمجھ میں آئی تھی کہ حادثے سے پہلے ایک نے کار سے باہر چھلانگ لگا دی تھی اور یوں جلنے مرنے سے بچ گیا تھا۔ جلی ہوئی لاش ناقابلِ شناخت تھی۔ عشرت کے بیان کے مطابق وہ جلی ہوئی لاش اس کے شوہر عرفان کی تھی۔ چور بچ گیا تھا اور اسے فرار ہونے کا موقع مل گیا تھا۔ اگر عرفان حادثے سے بچ جاتا تو گھر ضرور واپس آ جاتا۔

مجھے بھی یقین کرنا پڑا۔ اگر عرفان زندہ ہوتے تو وہ عشرت کو بے وفائی کی سزا دینے ضرور آتے۔ مجھے دکھ ہو رہا تھا۔ عرفان نے مجھ پر بدچلنی کا الزام لگایا تھا۔ مجھے دکھ اسی بات کا تھا کہ میرے مجازی خدا نے اپنی زندگی میں میرے دامن کے دھبے کو نہیں دھویا تھا۔

اس کی حادثاتی موت کے چالیس دن بعد گجرات کے ایک بہت بڑے مل مالک نے کورٹ سے نوٹس بھیجا کہ عرفان نے کارخانہ اور وہ شاندار کوٹھی تین کروڑ روپے میں ایک برس پہلے گروی رکھ دی تھی......... عرفان نے اپنی زندگی میں اس مل مالک سے تین قسطوں میں وہ رقم لی تھی اور پکے کاغذ پر لکھ کر دیا تھا کہ اگر اس نے ایک سال کے اندر وہ تین کروڑ روپے ادا نہ کیے تو گجرات کے اس مل مالک کو عرفان کے کارخانے اور کوٹھی کی ملکیت حاصل ہو جائے گی۔

میں نہیں جانتی تھی کہ عرفان نے اپنا کاروبار اور اپنی کوٹھی گروی رکھ کر اتنی بڑی رقم کیوں لی تھی۔ اب مرحوم عرفان سے پوچھا نہیں جا سکتا تھا لیکن اس کا برا نتیجہ عشرت اور اس کے بچوں کو بھگتنا پڑا۔ عدالت کے فیصلے کے مطابق انہیں کاروبار اور کوٹھی سے

بے دخل ہونا پڑا۔ میں نے عشرت کے باپ کو ایک پاؤں سے اپاہج بنا دیا تھا۔ اس کے جوان بیٹے نے باپ، بہن اور اس کے بچوں کو سہارا دیا۔ چونکہ وہ اپنے کیے کی سزا پا رہے تھے اس لیے میں نے انہیں نظرانداز کر دیا۔

میرے بیٹے! میں چاہتی ہوں تمہیں ضروری معلومات فراہم کردوں اور میرا خیال ہے کہ میں تمہیں اپنی زندگی کی اہم باتیں بتا چکی ہوں۔ دس برس تک ملک سے باہر رہنے کے دوران میں دو بار شمشیر سنگھ کالیا سے میرا سامنا ہوا۔ پہلی بار میں تنہا تھی۔ میں نے اچانک اس پر فائر کیا تھا۔ وہ زخمی ہو کر فرار ہوگیا تھا شاید اس وقت اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوگا۔

دوسری بار سامنا ہوا تو میرے ساتھ مراد چنگیزی تھا۔ اس نے جم کر اس کالیے کا مقابلہ کیا۔ دونوں جی دار تھے۔ زبردست فائٹر تھے شاید مراد چنگیزی اس پر غالب آجاتا لیکن پولیس گاڑیوں کے سائرن سن کر شمشیر سنگھ کالیے کو فرار ہونا پڑا۔ پولیس والوں سے پتا چلا کہ وہ اس کی تلاش میں ہیں۔

بہرحال دس برس کے بعد پاکستان میں واپس آکر میں نے تمہیں پہاڑ جیسے قد آور جوان کے روپ میں دیکھا ہے۔ میرا سر فخر سے بلند ہوگیا ہے۔ میں قاسم جان اور مراد چنگیزی کے ذریعے تمہارے بارے میں کچھ اور معلومات حاصل کروں گی۔ پھر سوچوں گی کہ تمہیں اپنی زندگی کے حالات سے آگاہ کرنے کے لیے یہ ڈائری تمہارے پاس کیسے پہنچاؤں؟"

اس ڈائری کی تحریر ختم ہوگئی تھی۔ آگے سادہ صفحات تھے۔ میں نے اس ڈائری کو یوں کھلا رکھا جیسے ان اوراق میں امی کی صورت دیکھ رہا ہوں۔ کوئی مخصوص صورت تو نہیں تھی لیکن ان کا مزاج، ان کے عزائم اور ان کی شخصیت ابھر کر میرے سامنے آگئی تھی۔

میں نے فون کے ذریعے مراد چنگیزی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "امی نے اپنی ڈائری پڑھنے کی اجازت دی تھی۔ اسے پڑھ کر ان کی زندگی کے حالات معلوم ہوئے لیکن یہ حالات اور واقعات اس وقت تک کے ہیں، جب انہوں نے مجھے زخمی حالت میں نہیں پایا تھا۔ مجھے آپریشن کے بعد نئی زندگی دینے کے بعد بہت کچھ معلوم کرنا رہ گیا ہے۔"

"سر! آئندہ آپ کو بہت سی چونکا دینے والی باتیں معلوم ہوں گی۔ میڈم نے کہا ہے کہ آپ کا فون آئے تو میں آپ کو آرام سے سو جانے کی ہدایت کروں۔ شب بخیر.........."

اس نے فون بند کر دیا۔ میں سونے سے پہلے تمام تصویروں کو دیکھ کر دشمنوں کے چہروں کو اچھی طرح پہچاننے لگا۔

☆======☆======☆

حکومت کے ایسے اعلیٰ عہدے داران جو دیانت داری سے ملک اور قوم کی بہتری کے لیے اپنے فرائض ادا نہ کرتے ہوں اور مالی فوائد حاصل کرنے کے لیے سیاسی معاملات میں ملوث رہتے ہوں اور غیر ملکی ایجنسیوں سے مالی منافع حاصل کرنے کے لیے رابطے رکھتے ہوں، ایسے سرکاری عہدے داروں کو بیورو کریٹ یعنی نوکر شاہی کہتے ہیں۔

انہیں نوکر شاہی اس لیے کہتے ہیں کہ یہ سرکاری ملازم اور عوام کے نوکر ہو کر حکمرانوں پر شاہانہ رعب اور دبدبہ رکھتے ہیں۔ ان بیورو کریٹ کا تعلق حکومت کے حساس شعبوں سے ہوتا ہے۔ وہ ان شعبوں کے بہت ہی اہم اور خفیہ رازوں سے واقف ہوتے ہیں۔ تمام وزراء کے سیکرٹری صرف حکومت کے ہی نہیں حکمرانوں کی ذاتی اور اندرونی عیاشیوں اور چالاکیوں کے ریکارڈ چھپا کر رکھتے ہیں۔ پولیس کے سربراہ، کمشنر، ڈپٹی کمشنر اور سی ایس پی جیسے افسران ہر آنے جانے والے حکمران کی کرپشن کے ثبوت آڈیو، ویڈیو اور تحریری دستاویزات کی صورت میں محفوظ کر لیتے ہیں۔

حکمران بدلتے رہتے ہیں لیکن بیورو کریٹ اپنی کرسیوں پر جمے رہتے ہیں۔ انہیں کوئی اقتدار سے گرا نہیں سکتا۔ ہر آنے والی حکومت انہیں خوش کرنے کے لیے ان کی ناز برداری کرتی رہتی ہے۔ اگر کبھی کسی بیورو کریٹ کے جرائم، ثبوت کے ساتھ پیش کیے جانے کی کارروائی کی جائے تو دوسرے تمام بیورو کریٹس اس ایک کرپٹ بیورو کریٹ کو بچانے کے لیے حکمرانوں پر طرح طرح سے دباؤ ڈالتے ہیں اور اس مجرم عہدے دار کے خلاف ہونے والی قانونی کارروائی کو سرد خانے میں ڈال دینے پر مجبور کرتے ہیں۔

ڈی سی رکن الدین پر بھی مصیبت آئی تھی۔ امیر حمزہ نے .... بار ایسوسی ایشن کے ذریعے یہ قانونی کارروائی شروع کرائی تھی کہ ڈی سی رکن الدین نے اپنی ملازمت کے صرف چار برسوں میں پونے دو کروڑ کی زمینیں کیسے خریدیں؟ اور اس کے بینک اکاؤنٹ میں ستر لاکھ روپے کہاں سے آئے؟ جبکہ وہ ملازمت سے پہلے صاحبِ جائیداد نہیں تھا، اس کا اور اس کی بیگم کا کوئی بینک اکاؤنٹ بھی نہیں تھا۔

ایسا تو پاکستان میں کبھی کسی کا محاسبہ نہیں ہوتا کہ کوئی راتوں رات کیسے لکھ پتی اور کروڑ پتی بن جاتا ہے۔ اگر محاسبے اور قانونی کارروائیوں کا ایسا سلسلہ شروع ہو جائے تو یہ بھید کھل جائے گا کہ سرکاری عہدے دار رشوتیں لے کر، حکمرانوں پر دباؤ ڈال کر اور غیر

ملکی ایجنسیوں کو اپنے ملکی راز فروخت کر کے کس طرح کروڑ پتی اور ارب پتی بنتے ہیں۔

چند بیورو کریٹس نے ڈی سی رکن الدین کو یقین دلایا کہ وہ اس کے کیس کو عدالت تک نہیں جانے دیں گے۔ رکن الدین نے کہا۔ "یہ خبر تمام اخبارات میں شائع ہو چکی ہے کہ میں ایک کرپٹ عہدے دار ہوں اور میری زمین جائیداد کی دستاویزات کی عکسی تصاویر بھی عوام کے سامنے آچکی ہیں۔"

"اخبارات تو اعلیٰ عہدے داروں کی کرپشن کی خبریں شائع کرتے رہتے ہیں لیکن عوام کی یادداشت کمزور ہے۔ وہ پچھلے پچاس برسوں سے ایسی خبریں پڑھتے آرہے ہیں اور بھولتے جارہے ہیں۔ آئندہ بھی بھولتے رہیں گے۔"

انھوں نے اوپر والوں پر دباؤ ڈالا۔ اوپر والوں نے اس جج پر دباؤ ڈالا کہ مقدمے کی تاریخیں اتنی بڑھاتے رہو کہ برسوں گزر جائیں۔ رکن الدین بوڑھا ہو کر ریٹائر ہو جائے۔ اس وقت تک وہ ارب پتی بن جائے گا اور مقدمہ اپنی جگہ چلتا رہے گا۔

اتفاق سے جج، صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔ دل میں خوفِ خدا رکھتا تھا۔ اس نے کہا "ٹھوس ثبوت کے پیشِ نظر یہ کیس آئینے کی طرح صاف ہے۔ ڈی سی رکن الدین ایک کرپٹ عہدے دار ہے۔ اسے پہلی ہی پیشی میں سزا سنائی جا سکتی ہے۔"

وہ ایماندار جج جس تاریخ کو سزا سنانے والا تھا، اس سے پہلے ہی اسے ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ جبکہ اس جج کی ابھی چھ ماہ کی سروس باقی تھی۔ اس پر جج نے اور کئی وکلا نے احتجاج کیا۔ احتجاجی تحریک چلتی رہی لیکن بیورو کریٹس نے رکن الدین کو کوئی نقصان نہیں پہنچنے دیا۔ وہ مزے سے ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر کام کرتا رہا۔ نہ اس کی زمین جائیداد ضبط ہوئی اور نہ ہی بینک اکاؤنٹس کو منجمد کیا گیا۔ اس کے برعکس ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے امیر حمزہ کے خلاف مہم شروع کر دی گئی۔

امیر حمزہ کے بارے میں سرکاری ریکارڈ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا کہ انٹیلی جنس میں جو کیپٹن امیر حمزہ تھا، وہ ایک برس پہلے افغانستان میں مارا گیا ہے۔ خفیہ ایجنسیوں نے بھی ملکی اور غیر ملکی اخبارات اور رسائل کے ذریعے تائید کی کہ کیپٹن امیر حمزہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ موجودہ امیرِ حمزہ جھوٹا فراڈ ہے کسی دشمن کا ایجنٹ ہے۔ اپنی باغیانہ حرکتوں سے سیاست دانوں کے خلاف محاذ آرائی کر کے پاکستانی عوام کے سامنے خود کو محبِ وطن ثابت کر رہا ہے۔ اس نے ملک کے ایک بڑے سیاست داں کاشف اکبر پر وطن فروشی کے الزام لگائے اور ڈی سی رکن الدین کے خلاف کرپٹ عہدے دار ہونے کا مقدمہ کیا لیکن آج تک انہیں وطن فروش اور کرپٹ ثابت نہ کر سکا۔

اس کے خلاف یہ بھی کہا جانے لگا کہ وہ سیاست دانوں اور معزز عہدے داروں کا محاسبہ کرنے کی آڑ میں قتل اور دہشت گردی کر رہا ہے۔ اس نے تھر کے ایک ہندو راہو اور ایک مسلمان پولیس انسپکٹر کو قتل کیا ہے۔ شہروں میں آئے دن جو قتل اور دہشت گردی ہو رہی تھی، اس کا ذمے دار بھی امیر حمزہ کو ٹھہرایا جانے لگا۔

پہلے کہا گیا تھا کہ عبوری حکومت کاشف اکبر کا محاسبہ نہیں کرے گی۔ انتخابات کے نتیجے میں جو نئے حکمران آئیں گے، وہ اس کا محاسبہ کریں گے اب امیر حمزہ کو غلط کہا جا رہا تھا کہ وہ کاشف اکبر کو وطن فروش ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے۔ کیٹی بندر کے سلسلے میں جو دستاویزات اس نے پیش کی تھیں، وہ سب جعلی ہیں۔ اگر وہ سچا ہے تو دستاویزات کو درست اور کاشف اکبر کو مجرم ثابت کرنے کے لیے عوام کے سامنے آئے۔ مجرموں کی طرح رُوپوش نہ رہے۔

امیر حمزہ نے اخبارات اور رسائل کے ذریعے جواب دیا۔ برسوں سے دو سیاست داں ایک دوسرے کو وطن دشمن ثابت نہ کر سکے۔ ان دونوں کے درمیان خفیہ سمجھوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو گالیاں دیں گے۔ ایک دوسرے کا محاسبہ کرنے کا بھرپور ڈراما پلے کریں گے لیکن سیاسی چالبازیوں سے محاسبے کے عمل کو کمزور بنا دیا کریں گے۔

یہ دونوں کسی تیسرے کو محاسبہ کرنے کا موقع نہیں دیتے۔ کوئی تیسرا سیاست داں ان کے مقابلے پر آنے کے لیے عوام کو سمجھائے کہ وہ ملک کا مقدر بنانے کے لیے کسی تیسری پارٹی کو حکومت بنانے کا موقع دیں تو وہ خفیہ ہاتھ کے دونوں نورِ نظر تیسری پارٹی کو بھی پنپنے کا موقع ہی نہیں دیتے اس پارٹی کو "را" یا "موساد" کی پیداوار کہہ کر عوام کو اس سے بدظن کرتے ہیں یا پھر اس لیڈر کو سیاسی چالوں سے قتل کرا کے تیسری پارٹی کی کمر توڑ دیتے ہیں۔ امیر حمزہ نے اخبارات کے ذریعے کہا۔ "میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ منظرِ عام پر آکر خفیہ ایجنسیوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاؤں، میں بزدلوں کی طرح رُوپوش نہیں ہوں۔ یہ میری سیاسی حکمتِ عملی ہے۔ میں اسی ملک میں ہوں مجھے منظرِ عام پر دیکھنا چاہتے ہو تو آج تک جتنے سیاسی راہنما قتل ہو چکے ہیں، ان کے قاتلوں کو عوام کے سامنے لا کر پھانسی پر چڑھاؤ۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں۔ جس دن تمام قرض نادہندگان سیاست داں خود اپنا محاسبہ آپ کریں گے اور قرض کا ایک ایک پیسہ قومی خزانے میں جمع کر دیں گے، میں خود عوام کے سامنے حاضر ہو جاؤں گا۔"

امیر حمزہ نے ایک طرف مخالفین سے اخبارات کے ذریعے سرد جنگ جاری رکھی تھی۔ دوسری طرف رکن الدین کے خلاف عملی اقدامات کر رہا تھا۔ اس نے قانون کی بالا

دستی قائم رکھنے کے لیے رکن الدین کو سمجھایا تھا کہ وہ اپنے اعمال نامے کے ساتھ خود کو عدالت میں پیش کر دے۔ اس طرح اسے کم سے کم سزا ملے گی وہ کم بخت زیادہ سے زیادہ سزا پانا چاہتا تھا اس لیے ایک صبح اپنے دفتر گیا تو شام کو گھر لوٹ کر نہیں آیا۔

شام کو جب دفتر سے اپنی کار میں آرہا تھا تو معمول کے مطابق ڈرائیور کار چلا رہا تھا۔ ایک سگنل پر گاڑی رکتے ہی پچھلی سیٹ کے دونوں دروازے کھل گئے۔ دو افراد ٹی ٹی لئے اس کے دائیں بائیں آکر بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا۔ "ڈرائیور! تمہارے صاحب کو اور تم کو گولی مارنے میں دیر نہیں لگے گی اس لیے شور نہ مچانا' کوئی چالاکی نہ دکھانا۔ خاموشی سے دریا کے پل تک چلو۔"

ڈرائیور نے سہم کر رکن الدین سے پوچھا۔ "سر! میں کیا کروں؟"

رکن الدین بھی بری طرح خوف زدہ تھا۔ وہ بولا۔ "یہ جو کہتے ہیں' وہی کرو۔ جہاں چاہتے ہیں' وہیں لے چلو۔"

سبز سگنل ہوتے ہی ڈرائیور نے کار آگے بڑھائی۔ پھر حکم کے مطابق راستہ بدل کر پل کی طرف جانے لگا۔ رکن الدین نے خوف سے لرزتے ہوئے پوچھا۔ "آ۔ آپ کون لوگ ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟ اس وقت میرے پاس کیش نہیں ہے۔ میں گھر چل کو دے سکتا ہوں۔"

دونوں گن مینوں نے جواب نہیں دیا۔ وہ اس کی کمر سے ٹی ٹی لگائے بیٹھے تھے۔ وہ دونوں آپس میں بھی نہیں بول رہے تھے۔ پل کے قریب پہنچ کر ایک نے ڈرائیور سے کہا "پل سے آگے اسی راستے پر چلو۔ آگے دائیں طرف گلی میں مڑ جاؤ۔"

وہ ڈرائیو کرتا ہوا آگے جا کر گلی میں مڑ گیا۔ پھر اس سے کہا کہ گلی کے پہلے ہی مکان کے دروازے کے سامنے کار روک دے۔ جسے اغوا کیا جاتا ہے' اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی جاتی ہے۔ تا کہ وہ شکار راستوں اور منزل کو نہ پہچانے لیکن وہ اسے پہچاننے کا موقع دے رہے تھے۔

کار رک گئی۔ وہ چاروں کار سے اس طرح نکل کر مکان میں داخل ہوئے کہ گلی سے گزرنے والوں نے ان پر شکار اور شکاری ہونے کا شبہ نہیں کیا۔ مکان بالکل خالی تھا۔ شاید کرائے پر لیا گیا تھا۔ وہ زینے چڑھتے ہوئے اوپری منزل کے ایک کمرے میں آگئے۔ وہاں امیر حمزہ بیٹھا ہوا تھا۔ رکن الدین اسے دیکھتے ہی چونک گیا۔ وہ اپنے اصلی چہرے کے ساتھ تھا اور اس کے چہرے کی تصویریں سکھر کے ہر تھانے میں پہنچائی گئی تھیں۔

اس نے کہا۔ "رکن الدین! اصلی چہرے کے ساتھ آیا ہوں۔ میرے اس چہرے کو

جتنی تعداد میں تم نے تھانوں تک پہنچایا ہے۔ ان تمام تھانوں میں میری تصویروں کے نیچے مفرور مطلوب (WANTED) لکھا ہوا ہے۔ جیسے میں بہت خطرناک مجرم ہوں اور میری آزادی اور روپوشی کے باعث امنِ عامہ کو زبردست خطرہ درپیش ہے۔"

رکن الدین موت کے خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ زبان سے کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ امیر حمزہ نے کہا۔ "یہ پولیس والے اور قانون کے بڑے بڑے محافظ مجھ جیسوں کی تصویریں کیوں لگاتے ہیں؟ تمہارے جیسے بیورو کریٹ اور کرپٹ سیاست دانوں کی تصویروں کے نیچے لکھا جانا چاہیے کہ یہ مفرور اور مطلوب ہیں۔ یہ عوام سے فرار ہو کر اپنے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ انہیں ان کے اندر سے گرفتار کر کے لانے والوں کو انعام کے طور پر پاکستان کی خوش حالی دی جائے گی۔ بیٹھ جاؤ۔"

ایک جانباز نے اسے دھکا دے کر کرسی پر بٹھا دیا۔ دوسرا جانباز اسے کرسی کے ساتھ رسیوں سے باندھنے لگا۔ امیر حمزہ نے کہا۔ "یہ نہ کہنا کہ میں نے قانون کا احترام نہیں کیا۔ تم عدالت میں جا کر خود اپنا اعمال نامہ پیش کر دیتے تو تمہیں کم سے کم سزا دی جاتی بلکہ میرا وکیل عدالت میں کہتا کہ رکن الدین نے خود احتساب کر کے ایمان کے تقاضے پورے کیے ہیں۔ اگر اپنا محاسبہ کرنے والوں کو کوئی سزا نہ دی جائے بلکہ ان کے ایمان کی واپسی کا اعتراف کر کے ان کے عہدوں کو برقرار رکھا جائے۔ ان کے لیے معافی کا اعلان کیا جائے تو ہمارے ملک میں بڑی حد تک کرپشن ختم ہو جائے۔"

امیر حمزہ نے ایک ذرا توقف سے کہا۔ "مگر تمہارے جیسے لوگ اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ اس ملک میں تمہیں کوئی سزا دینے والا پیدا نہیں ہو گا۔ تمہارے پاس پولیس فورس ہے۔ دولت ہے۔ اختیارات ہیں لیکن کہاں ہیں رکن الدین؟ ان لمحات میں تم اختیارات کی کرسی سے گر کر موت کی کرسی پر آگئے ہو۔"

اسے کرسی پر اس طرح باندھ دیا گیا تھا کہ صرف دونوں ہاتھ کھلے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ رسیوں کی گرہ اس کرسی کے پچھلے پائے سے بندھی ہوئی تھی۔ رکن الدین جھک کر یا کسی اور طریقے سے اپنے دونوں ہاتھ اس گرہ تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔

وہ بڑی مشکل سے بولنے کے قابل ہوا مگر لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "م۔ میں عدالت میں اقبال جرم کے لیے جانے والا تھا لیکن بڑے بڑے بیورو کریٹس نے یقین دلایا کہ وہ سب مل کر آپ کا محاسبہ کریں گے۔ آپ اصل کیپٹن امیر حمزہ نہیں ہیں۔ آپ ایک غیر ملکی..........."

امیر حمزہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے آگے کچھ کہنے سے روکتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے

بارے میں ایسی بہت سی باتیں سن چکا ہوں اور پڑھ چکا ہوں۔ صرف اپنی بات کرو۔ اگر میں غلط آدمی ہوں تو تم لوگوں کو غلطیاں کرنے سے کیوں روک رہا ہوں۔ میں راہو اور پولیس انسپکٹر کو بھی ذاتی محاسبہ کرنے اور خود کو قانون کے حوالے کرنے کا موقع دے رہا تھا لیکن انہوں نے اپنی غلطیاں مٹانے کے بجائے مجھے اس دنیا سے مٹا دینا چاہا۔ میں نے انہیں جہنم میں پہنچا دیا۔ تم بھی بیوروکریٹس کی بہت بڑی طاقت کے ذریعے مجھے مٹا ڈالنے کی بھرپور کوششیں کر چکے ہو۔ آج ایک آخری کوشش کرو۔ میں تمہیں بچنے کا موقع دوں گا۔"

رکن الدین نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ امیر حمزہ نے کہا۔ "تمہارے سامنے ٹیلی فون رکھا ہے۔ تم اس کے ذریعے کمشنر سے لے کر ہوم منسٹر تک سب ہی کو اطلاع کر دو گے کہ تم موت کی کرسی پر بیٹھے ہو۔ تمہاری زندگی صرف پچپن منٹ کی ہے۔ تمہاری کرسی کے نیچے ایک ٹائم بم رکھا ہوا ہے۔ وہ ٹھیک پچپن منٹ پر بلاسٹ ہو جائے گا۔ پھر تمہارا قیمہ اور ہڈیوں کے ٹکڑے پہچانے نہیں جائیں گے۔ نیچے سے اوپر تک تمہارے جتنے بااختیار محافظ ہیں ان سے کہو' وہ پچپن منٹ پورے ہونے سے پہلے یہاں آکر ٹائم بم کو ناکارہ بنا کر تمہیں پھر سے زندہ رہنے کا موقع دیں۔"

وہ خوف سے بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔ اس بار مجھے موقع دیں۔ ابھی چھوڑ دیں۔ میں ابھی ایک وکیل کے ساتھ جج صاحب کے پاس جا کر اقبال جرم کرنے جاؤں گا۔ اگر مجھے کل عدالت کے وقت بلایا گیا تو تمام رات کل صبح تک جج صاحب کی کوٹھی کے باہر بیٹھا رہوں گا۔"

"تم ضرور وہاں جاؤ مگر یہاں موت سے لڑنے کے بعد۔ تاکہ تمہارے تمام بیوروکریٹس کو معلوم ہو کہ پہلے میں اقبال جرم کے لیے آسان راستے پر چلنے کی ہدایت کرتا ہوں۔ جب کوئی مجھے دھوکا دیتا ہے تو اسے موت کے راستے سے گزر کر زندگی کی طرف آنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد بھی نئی زندگی گزارنے کے لیے لازمی ہو گا کہ وہ خود اپنے محاسبے کے لیے قانون کی دہلیز پر جائے۔"

ایک جانباز نے اس کے قریب ایک اسٹول پر ٹیلی فون لا کر رکھ دیا۔ "تمہارے دونوں ہاتھ اسی لیے کھلے رکھے گئے ہیں کہ تم آسانی سے ٹیلی فون استعمال کر سکو لیکن یہ ہاتھ کرسی کے پچھلے پائے تک نہیں پہنچ سکیں گے اور تم رسیوں کی گرہ نہیں کھول سکو گے۔"

دوسرے کمرے سے دوسرا جانباز ایک چھ انچ کا مستطیل ٹائم بم لے آیا۔ رکن

الدین ایک دم دہشت زدہ ہو کر اپنی جسمانی قوت سے رسیاں توڑنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اسے رسیوں اور کرسی کے درمیان اس مضبوطی سے جکڑا گیا تھا کہ وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ دونوں پاؤں کرسی کے اگلے پایوں سے باندھے گئے تھے اس لیے وہ پیروں کو فرش پر ٹیک کر زور نہیں لگا سکتا تھا۔

امیر حمزہ نے کہا۔ "تم ایک آرام طلب ڈی سی ہو۔ باڈی بلڈر نہیں ہو' رسیاں نہیں توڑ سکو گے۔ زیادہ سے زیادہ کرسی سمیت فرش پر گرو گے۔ کرسی نیچے رکھے ہوئے بم سے ٹکرائے گی تو ہو سکتا ہے' بم سے منسلک تاروں کو جھٹکا پہنچے گا وہ مقررہ وقت سے پہلے بلاسٹ ہو جائے گا۔"

پھر اس نے اپنے جانباز سے کہا۔ "اسے ٹائم بم کا فنکشن سمجھا دو۔"

جانباز نے رکن الدین کو بم دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ بہت حساس بم ہے۔ بم ڈسپوزل سکواڈ کے ماہرین جانتے ہیں کہ اسے بڑی احتیاط سے ہینڈل کرنا ہوتا ہے۔ اگر اسے ناکارہ بناتے وقت جھٹکا لگے تو یہ مقررہ وقت سے پہلے پھٹ پڑے گا۔ اس میں تین رنگوں کے تار بلاسٹ پوائنٹ سے منسلک ہیں۔ یہ تار سرخ' زرد اور سبز رنگ کے ہیں۔ یہ صرف ہم جانتے ہیں یا کوئی بم ڈسپوزل کا ماہر جان سکتا ہے کس تار کو الگ کرنے سے یہ بم ناکارہ ہو جائے گا۔"

امیر حمزہ نے کہا۔ "ہم اس کا بلاسٹنگ ٹائم مقرر کر کے اسے کرسی کے نیچے رکھ کر چلے جائیں گے۔ دروازے کھڑکیاں سب کھلی رہیں گی۔ تم چیخ چیخ کر اس علاقے کے لوگوں کو یہاں بلا سکو گے۔ سب آئیں گے لیکن بم کے قریب نہیں آئیں گے۔ سب کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔ کوئی یہاں سے بم کو دور پھینکنے کے لیے اسے ہاتھ نہیں لگائے گا۔ ڈور کا ایک سرا بم سے بندھا ہو گا دوسرا سرا تمہارے ایک پیر سے۔ یعنی وہ تمہیں بم سے الگ کرنے کے لیے رسیاں کھولیں گے پھر ڈور کھولیں گے تو ان کے اناڑی پن سے بم کو جھٹکا لگے گا۔ پھر تمہارے ساتھ نہ معلوم کتنوں کے پرخچے اُڑیں گے۔ للٰذا اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ اسے کوئی ماہر ہی ناکارہ بنا کر تمہیں موت سے بچا سکتا ہے۔ دوسرے لوگوں کو بلا کر تم خود اپنی موت کو دعوت دو گے۔"

امیر حمزہ جانے کے لیے اٹھ گیا۔ رکن الدین آنسوؤں سے رو رو کر گڑگڑانے اور بچوں کی قسمیں کھانے لگا کہ وہ ابھی خود کو قانون کے حوالے کرنے جائے گا۔ اسے اقبال جرم کا آخری موقع دیا جائے۔ ایک جانباز نے کہا۔ "ہم تمہارے ڈرائیور کو لے جا رہے ہیں۔ اسے ایک گھنٹے کے بعد آزاد کر دیں گے۔ تم زندہ رہو گے تو یہ تمہارے پاس واپس

آ جائے گا۔ ہم اپنی گاڑی میں جا رہے ہیں۔ تمہاری کار اسی مکان کے سامنے کھڑی رہے گی۔"

اس کے بولنے کے دوران میں دوسرا جانباز بم کو کرسی کے نیچے رکھ کر اس کی ڈور کے ایک سرے کو رکن الدین کے ایک پیر سے باندھ رہا تھا۔

وہ دونوں جانباز تمام کام مکمل کرنے کے بعد ڈرائیور کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ ان کے بعد امیر حمزہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کرسی کے پاس آیا۔ وہاں بیٹھ کر کرسی کے نیچے جھک کر اس نے بم کی گھڑی میں پچپن منٹ کا وقت مقرر کیا۔ پھر بٹن دبا کر اس گھڑی کو آن کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹک ٹک ٹک کی آواز ابھرنے لگی۔ سرخ کانٹا ایک ایک سیکنڈ کے حساب سے حرکت کرنے لگا۔ یوں ساٹھ سیکنڈ تک حرکت کرتے رہنے سے ایک بڑا سیاہ کانٹا ایک منٹ کی طرف حرکت کرتا۔ یعنی وہ سیاہ کانٹا پچپن بار حرکت کرتا اور وہ سرخ کانٹا تین ہزار تین سو (۳۳۰۰) بار حرکت کرتا تو وہ بم پھٹ پڑتا۔ ویسے ابھی اتنا وقت تھا کہ بم ڈسپوزل کے ماہرین آ کر اس کے متحرک کانٹوں کو مہارت سے روک کر اس کی جان بچا سکتے تھے۔

امیر حمزہ وہاں سے اٹھ کر جانے لگا۔ رکن الدین نے ٹیلی فون اٹھا کر اپنی گود میں رکھا' وہ ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنا چاہتا تھا۔ امیر حمزہ نے دروازے پر رک کر کہا۔

"ہماری قومی زندگی میں سرخ' زرد اور سبز رنگوں کی اہمیت ہے۔ ہر شہر کے ہر چوراہے پر ان تینوں رنگوں کے سگنل ہوتے ہیں۔ جب تک سبز سگنل نہیں ہوتا' گاڑیاں آگے نہیں بڑھ پاتیں' رکی رہتی ہیں۔ سرخ اور زرد سیاست داں بھی سبز سگنل نہیں ہونے دیتے۔ قوم کو آگے بڑھنے سے روکے رکھتے ہیں۔ اس ٹائم بم میں بھی سرخ' زرد اور سبز رنگ کے تار بلاسٹنگ پوائنٹ سے منسلک ہیں۔ اب یہ دیکھو کہ تمہاری زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھانے کے لیے کس رنگ کے تار کو بلاسٹنگ پوائنٹ سے ہٹایا جائے گا؟ سوچو کیا سبز تار کو ہٹایا جائے؟ لیکن کیوں اسے ہٹایا جائے؟ تمہارے جیسے کرپٹ لوگوں نے کبھی قوم کو آگے بڑھنے کے لیے سبز جھنڈی نہیں دکھائی۔ سوچو۔ سوچو۔ سوچو رکن الدین کہ کون سا رنگ تمہیں زندگی دے گا اور کون سا رنگ تمہیں موت کے گھاٹ اتارے گا؟"

امیر حمزہ یہ کہہ کر چلا گیا۔ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ فوراً ہی نمبر ڈائل کر کے انتظار کرنے لگا۔ دوسری طرف سے گھنٹی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر ایک آواز سنائی دی۔ "ہیلو!"

وہ بولا۔ "میں ڈی سی رکن الدین سکھر سے بول رہا ہوں۔ میں زندگی اور موت کے

درمیان ہوں۔ فوراً صاحب سے بات کراؤ۔"

وزارتِ داخلہ کے سیکریٹری کی آواز سنائی دی۔ رکن الدین نے کہا۔ "سر! امیر حمزہ نے مجھے اغوا کر کے ایک کرسی سے باندھ کر نیچے ایک ٹائم بم رکھ دیا ہے۔ اس بم کو پھٹنے کے لیے پچپن منٹ کا وقت مقرر کیا گیا ہے۔ میں اپنی گھڑی دیکھ رہا ہوں۔ تین منٹ گزر چکے ہیں۔ باون منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ فار گاڈ سیک آپ فوراً سکھر کے بم ڈسپوزل اسکواڈ کو یہاں بھیج دیں۔ میں اس جگہ کا پتا بتا رہا ہوں۔ آپ نوٹ کریں۔ اب میری زندگی آپ کے ہاتھ میں ہے۔"

اس نے اس جگہ کا پتا نوٹ کرایا۔ یہ بھی بتایا کہ اس مکان کے سامنے اس کی کار کھڑی ہو گی اور اس مکان کے لوہے کے دروازے کا رنگ سیاہ ہے۔ پھر اس نے کہا۔ "سر! امیر حمزہ نے مجھے اس فون کا نمبر نہیں بتایا ہے۔ میرے لیے تو یہ ون وے ہے میں ہی آپ کو پندرہ منٹ کے اندر فون کروں گا۔"

"رکن الدین فکر نہ کرو۔ حوصلے سے کام لو۔ ابھی اس بم کو ناکارہ بنانے والے وہاں پہنچ جائیں گے۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ رکن الدین نے کمشنر سے فون پر رابطہ کر کے اسے یہی بات بتائی۔ کمشنر نے کہا۔ "یہ تم نے اچھا کیا کہ پہلے وزارتِ داخلہ کے سیکریٹری سے مدد طلب کی ہے۔ اس کا حکم سنتے ہی پوری سکھر آرمی الرٹ ہو جائے گی اور بم ڈسپوزل اسکواڈ والے بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔ میں بھی متعلقہ افسران سے رابطہ کر رہا ہوں اور ماہرین کے ساتھ میں بھی وہاں آ رہا ہوں۔"

"سر! جلدی آئیں۔ آپ اس فون کے ذریعے ٹک ٹک ٹک کی آواز سن رہے ہوں گے اور سمجھ رہے ہوں گے کہ ہر ٹک کے ساتھ میری زندگی کی ایک سانس کم ہوتی جا رہی ہے۔"

کمشنر نے فوراً ماہرین کے ساتھ آنے کا وعدہ کر کے فون بند کر دیا۔ گفتگو کا سلسلہ ختم ہونے سے یوں لگا جیسے گفتگو کرنے والوں سے ساتھ چھوٹ گیا ہے۔ وہ بالکل تنہا ہے۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس کی مدد کرنے والے مقررہ وقت سے پہلے آ کر اسے بچا لیں۔ نیچے ٹک ٹک کی مسلسل آواز کہہ رہی تھی' موت برحق ہے۔ زندہ رہنے کے لیے جتنے بھی جتن کر لو۔ مرنا تو ہے۔ ابھی یا پھر کبھی اور شاید ابھی۔

پندرہ منٹ گزر گئے۔ اس نے پھر اسلام آباد وزارتِ داخلہ کے سیکریٹری سے رابطہ کرنا چاہا۔ دوسری طرف سے پتا چلا کہ فون مصروف ہے۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اس

کے دل میں موت کا ایسا دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ ریسیور پکڑتے وقت' نمبر ڈائل کرتے وقت اور بولتے وقت ایسے تھر تھر کانپ رہا تھا جیسے زور کا بخار چڑھا ہو۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا' دماغ کے اندر بموں کے دھماکے ہوتے جا رہے تھے۔

یکبارگی وہ چیخ پڑا جیسے اس کے سامنے دھماکا ہوا ہو۔ حالانکہ دھماکہ نہیں تھا۔ فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے دہشت زدہ نظروں سے ٹیلی فون کو دیکھا۔ پھر تھر تھراتے ہوئے ہاتھ سے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے امیر حمزہ کی آواز سنائی دی

"ہیلو رکن الدین! میری گھڑی کے حساب سے بائیس منٹ گزر چکے ہیں۔ کیا تمہاری مدد کے لیے کوئی آ رہا ہے؟"

اس نے بولنے کی کوشش کی۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ وہ ٹھیک طرح بول نہیں پا رہا تھا۔ موت سے پہلے اس کی آواز مر رہی تھی۔ وہ پھنسی پھنسی سی مُردہ آواز میں بولا۔ "معاف کرو۔ کرو اللہ۔ کے نام پر زن۔ زندہ رہنے دو۔"

امیر حمزہ نے کہا۔ "زندگی کی بھیک نہ مانگو۔ تھر کی کتنی ہی جوان لڑکیاں' ان کے باپ' ان کے بھائی وڈیروں اور پولیس والوں کے ظلم و ستم کی شکایتیں کرتے رہے۔ کیا تم نے ان کی فریادیں سنی تھیں؟ نہیں۔ نہیں سنی تھیں اس لیے مجھ سے بھی فریاد نہ کرو۔ میں نے اس ٹائم بم میں پچپن منٹ کا جو مقرر کیا ہے' اس کے مطابق ٹھیک آٹھ بج کر دس منٹ پر وہ بم پھٹ جائے گا۔ اس وقت میری گھڑی میں آٹھ بجنے میں پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔ یعنی ٹھیک بیس منٹ کے بعد تمہاری موت لازمی ہے۔"

جیسے جیسے دہشت بڑھ رہی تھی' وہ بد حواس ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے حلق سے بے اختیار کراہیں نکل رہی تھیں۔ زندگی زخمی ہو کر کراہ رہی تھی۔ امیر حمزہ نے کہا۔ "ہمارا اوپر والا اللہ تعالیٰ ہے۔ مگر تم آخری گھڑیوں میں بھی اللہ تعالیٰ کو نہیں' اپنے اوپر والوں کو پکارو گے۔"

دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ "موت اتنے قریب ہے اور میں نے اللہ تعالیٰ کو ابھی تک پکارا نہیں لیکن میں کیا کروں۔ وقت بہت کم ہے۔ مجھے اوپر والوں کو ہی فوراً بلانا ہے۔"

اس نے کمشنر سے رابطہ کیا۔ کمشنر نے کہا۔ "میں تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ میں بم ڈسپوزل اسکواڈ کے ساتھ نکل پڑا ہوں۔ تم مجھ سے میرے اسی موبائل پر رابطہ رکھو۔ یہ بتاؤ۔ پچپن منٹ کے حساب سے بم بلاسٹنگ کا آخری وقت کیا ہے؟"

وہ تھر تھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "امیر حمزہ کی گھڑی کے مطابق آٹھ بج کر دس منٹ لیکن اس کی اور آپ کی گھڑیوں میں آگے پیچھے کئی منٹ کا فرق ہو سکتا ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ "ہم دس منٹ' میں پہنچ رہے ہیں۔"

اسے ایک ذرا اطمینان ہوا کہ وہ چل پڑے ہیں اور پندرہ منٹ میں پہنچنے والے ہیں۔ اس نے فون بند نہیں کیا۔ ریسیور کان سے لگائے رکھا۔ دوسری طرف کمشنر کا موبائل فون بھی اس سے مربوط تھا۔ اس کے ذریعے رکن الدین کو آتی جاتی ہوئی گاڑیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر کمشنر کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔

"ادھر ٹریفک جام ہے تو دوسرے راستے سے لے چلو۔"

ایک شخص کی آواز سنائی دی۔ "سر! پیچھے کئی گاڑیاں رکی ہوئی ہیں۔ ہم کسی دوسرے راستے کے لیے مڑ نہیں سکیں گے۔"

رکن الدین کا اطمینان پھر غارت ہو گیا۔ اس کی مدد کو آنے والوں کی گاڑی ٹریفک کے بھنور میں پھنس گئی تھی۔ وہ رونے لگا۔ روتے روتے بولا۔ "سر! آپ لوگ کتنی دور ہیں؟ اگر قریب ہیں تو گاڑی چھوڑ کر دوڑتے ہوئے آ جائیں۔ میں مر رہا ہوں۔ آپ نہیں آئیں گے تو میں بم پھٹنے سے پہلے مر جاؤں گا۔"

"رکن الدین! حوصلہ کرو۔ ہم آ رہے ہیں۔ آگے والی گاڑیاں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہیں۔ راستہ صاف ہونے والا ہے۔ ہم تیزی سے آئیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔"

وہ ٹک ٹک کی زبان والی موت کی گود میں بیٹھا ہوا تھا اور اسے کہا جا رہا تھا کہ فکر نہ کرے۔ اس نے گھڑی دیکھی آٹھ بج چکے تھے۔ امیر حمزہ کی گھڑی کے مطابق صرف دس منٹ رہ گئے تھے۔ اس کی اپنی گھڑی کے حساب سے بارہ منٹ رہ گئے تھے۔ اس نے ہیلو ہیلو کہہ کر آواز دی۔ پتا چلا کہ موبائل بند کر دیا گیا ہے۔ اس نے کریڈل پر ہاتھ رکھ کر پھر کمشنر سے رابطہ کرنا چاہا۔ دوسری طرف کمشنر کسی دوسرے افسر سے باتیں کر رہا ہو گا اس لیے اس سے رابطہ نہیں ہوا۔ وہ بے اختیار روتے ہوئے' چیختے ہوئے کہنے لگا۔ "بچاؤ۔ خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔ کوئی ہے؟ کوئی ماہر نہ ہو۔ کوئی جان پر کھیل کر مجھے بچانے آ جائے۔ میں اسے اپنی زندگی کی ساری کمائی دے دوں گا۔"

رونے اور چیخنے سے وقت کبھی نہیں رکتا۔ موت کے قریب پہنچنے والا وقت گزرتا جا رہا تھا۔ صرف پانچ منٹ رہ گئے۔ تب میگا فون کے ذریعے گلی سے کمشنر کی آواز سنائی دی۔ "رکن الدین ہم آ گئے ہیں۔ رابطہ کرو۔"

اس نے فوراً ہی اس کے موبائل فون پر رابطہ کیا۔ کمشنر نے کہا۔ "ہماری گھڑی کے

مطابق صرف ایک منٹ رہ گیا ہے۔"

وہ چیخ کر بولا۔ "ایک نہیں' چار منٹ ہیں۔ پلیز جلدی آئیں۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔"

ایک شخص کی آواز سنائی دی۔ "سر! میں بم ڈسپوزل کا ماہر ہوں لیکن ہماری گھڑیوں میں کئی کئی منٹوں کا فرق ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم آپ کے پاس پہنچیں اور بم پھٹ پڑے۔"

دوسرے شخص کی آواز سنائی دی۔ "میں بھی بم ڈسپوزل کا ماہر ہوں۔ ہم اس مکان سے بہت دور چلے آئے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے۔ اگر صحیح وقت کا تعین ہوتا اور ہمیں صرف دس منٹ کا وقت مل جاتا تو ہم اس بم کو ناکارہ بنا دیتے۔ ابھی آپ کے پاس آنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم خودکشی کرنے آئیں گے۔"

رکن الدین نے چیخ کر گالی دیتے ہوئے کہا۔ "کیا یہاں میری موت کا تماشا دیکھنے آئے ہو۔ میں کہتا ہوں ابھی وقت ہے۔ مجھے بچالو۔ مجھے جان بُوجھ کر مرنے کے لیے نہ چھوڑو۔ فون کمشنر صاحب کو دو۔ وہ مجھے بچانے آئیں گے۔"

"کمشنر صاحب! اس محلے کے لوگوں کو خطرے سے آگاہ کر رہے ہیں۔ لوگ آس پاس کے مکانات سے نکل کر بھاگ رہے ہیں۔ آپ خود ہی سمجھیں' ایسی حالت میں ہم وہاں کیسے آسکتے ہیں۔ فی الحال ہم آپ کی سلامتی کی دعائیں کرسکتے ہیں۔"

دوسری طرف سے فون بند کردیا گیا۔ رکن الدین کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ ہاتھوں سے ریسیور اور ٹیلی فون چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ بس آخری وقت تھا اور ایسے وقت کو وقتِ دعا کہتے ہیں۔ دماغ سن ہوگیا تھا۔ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ایسی دماغی حالت میں اسے آخری بار پڑھنے کے لیے کلمہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ موت کی دہشت ایسے مرحلے پر پہنچ گئی تھی کہ اس پر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ وہ مُردے جیسا ہوگیا تھا۔ اس میں اتنی توانائی نہیں رہی تھی کہ سر اپنا توازن قائم رکھتا۔ اس کا سر ایک طرف شانے پر ڈھلک گیا۔

اس مکان سے بہت دور ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہوگئے تھے۔ وہ محلّہ خالی ہوگیا تھا۔ اسلام آباد سے وزارتِ داخلہ کے سیکریٹری نے کمشنر سے پوچھا۔ "کیا ڈی سی کو بچالیا گیا ہے؟"

کمشنر نے وہاں کی صورتِ حال بتائی کہ کسی وقت بھی بم کا دھماکا ہونے والا ہے۔ صحیح وقت کا تعین نہیں ہوسکا ہے۔ ایسی صورت میں بم ڈسپوزل کے ماہرین اس مکان میں

جائیں گے تو ڈی سی کے ساتھ وہ بھی مارے جائیں گے۔ ویسے آس پاس کے مکینوں اور دکان داروں کو محفوظ مقامات پر پہنچا دیا گیا ہے۔ صرف ڈی سی کے علاوہ کسی کو جانی نقصان نہیں پہنچے گا۔

انتظار میں اور ایسی باتوں میں آٹھ بج کر تیس منٹ ہوگئے۔ پھر آٹھ بج کر پینتالیس منٹ ہوئے۔ اس کے بعد نو بج گئے لیکن دھماکا نہیں ہوا۔ وہ مکان ایک زندہ شخص کے مقبرے کی طرح خاموش اور ویران دکھائی دے رہا تھا۔ موت کے ڈر سے کوئی اس مقبرے پر فاتحہ پڑھنے کے لیے بھی نہیں جا رہا تھا۔

کمشنر نے بم ڈسپوزل کے ماہرین سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ دھماکا نہیں ہوا؟"

ایک ماہر نے کہا۔ "جیسا کہ ہمیں وقت بتایا گیا ہے۔ اس حساب سے ایک گھنٹا پہلے دھماکا ہونا چاہیے۔"

دوسرے ماہر نے کہا۔ "ایک گھنٹا گزر چکا ہے۔ وہاں ٹائم بم نہیں رکھا گیا ہے۔ ڈی سی صاحب کو خواہ مخواہ دہشت زدہ کیا گیا ہے۔"

کمشنر نے کہا۔ "امیر حمزہ صرف ڈی سی کو نہیں ہم سب کو بھی دہشت زدہ کر رہا ہے۔ آپ دونوں ماہرین کو اب وہاں جانا چاہیے۔"

وہ سب اس مکان کے قریب جانے لگے۔ وہ اندر سے خوف زدہ تھے ماہرین کا اندازہ تھا کہ ٹائم بم میں زیادہ وقت نہیں رکھا جاتا۔ جب بم ایک گھنٹے بعد بھی بلاسٹ نہیں ہوا ہے تو اس میں کوئی ٹیکنیکل خامی پیدا ہوگئی ہوگی۔

کمشنر مکان سے ذرا دور رہا۔ ماہرین کو خطرات مول لینے پڑتے ہیں۔ وہ دونوں اللہ کا نام لے کر مکان میں داخل ہوئے۔ انہوں نے رکن الدین کو آواز دی۔ جواب نہیں ملا۔ وہ فون پر بتا چکا تھا کہ دوسری منزل کے ایک کمرے میں ہے۔ انہوں نے زینے چڑھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ "سر! آپ خیریت سے ہیں۔"

دوسرے نے کہا۔ "ہم بم کو ناکارہ بنانے آئے ہیں۔ کیا وہ ابھی تک آن ہے؟ پلیز اتنا بتا دیں' کیا ٹک ٹک کی آوازیں آ رہی ہیں؟"

وہ رک رک کر آگے بڑھتے جا رہے تھے اور کچھ نہ کچھ پوچھتے جا رہے تھے۔ یہ بھی پوچھ رہے تھے کہ وہ جواب کیوں نہیں دے رہا ہے؟

آخر وہ ایک کمرے کے قریب پہنچے۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ باہر سے دکھائی دے رہا تھا' وہ کمرے کے وسط میں ایک کرسی پر رسیوں سے بندھا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کا سر ایک شانے پر ڈھلکا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مسلسل دہشت کی زیادتی

سے اس کا دم نکل گیا ہے۔

انہوں نے پھر اسے آواز دی۔ وہ کرسی پر ٹس سے مس نہ ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہاں کی گہری خاموشی میں ٹک ٹک۔ ٹک ٹک کی آوازیں ایک ایک سیکنڈ کے وقفے سے ابھر رہی تھیں۔وہ آوازیں بتا رہی تھیں کہ بم واچ آن ہے اور ابھی خطرہ ہے۔

وہ دونوں زیرِ لب کلمہ پڑھتے ہوئے کمرے میں آئے۔ کرسی کے قریب پہنچے ڈی سی رکن الدین کی پتلون بھیگی ہوئی تھی اور غلاظت کی ناقابلِ برداشت بو آرہی تھی۔ اس کے نیچے فرش پر وہ بم رکھا ہوا تھا۔ دونوں نے اپنی ناک اور منہ پر رومال باندھ کر فرش پر دو زانو ہو کر اس ٹائم بم کو دیکھا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بے شمار بم دیکھے تھے لیکن ایسا بم پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ وہ بم کیا تھا' ایک پلاسٹک کا مستطیل ڈبا تھا۔ اس کے اوپر ایک اسٹاپ واچ رکھی ہوئی تھی۔ اسٹاپ واچ میں ایک بٹن ہوا کرتا ہے۔ جسے ایک بار دبایا جائے تو گھڑی کے سیکنڈ کا کانٹا ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ حرکت کرنے لگتا ہے۔ پھر اسی ایک بٹن کو دبایا جائے تو گھڑی بند ہو جاتی ہے۔ یعنی اسی ایک بٹن سے گھڑی چلتی ہے اور بند بھی ہوتی ہے۔

اور ٹائم بم سے کبھی اسٹاپ واچ منسلک نہیں ہوتی۔ ایک ماہر نے ہاتھ بڑھا کر اس واچ کو دو انگلیوں سے تھام کر اٹھایا تو وہ پلاسٹک کے ڈبے سے الگ ہو گئی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک نے کہا۔ "یہ ٹائم بم نہیں ہے۔"

دوسرے نے ذرا ڈرتے ہوئے اس ڈبے کو اٹھایا تو وہ بالکل ہلکا تھا جیسے اندر سے خالی ہو۔ اس کے اندر بیٹری اور دھماکا خیز مادے کا وزن ہونا چاہئے تھا لیکن کھوکھلے ڈبے کا صرف اپنا ہلکا سا وزن تھا۔ اس نے اس کے اوپری حصے کو کھولا تو اس کے خالی اور کھوکھلے ہونے کی تصدیق ہو گئی۔ اندر ایک چھوٹا سا تہہ کیا ہوا کاغذ رکھا تھا۔

دونوں نے اسے کھول کر پڑھا۔ امیر حمزہ نے لکھا تھا۔ "رکن الدین! میں کہہ چکا ہوں' قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لوں گا۔ مجھے اپنا قاتل بنانے پر مجبور نہ کرو۔ میں پھر مہلت دے رہا ہوں۔ عدالت میں جا کر اقبالِ جرم کرو اور یہ سبق حاصل کرو کہ بم ڈسپوزل ماہرین اور اس ملک کے تمام طاقت ور اور بااختیار اکابرین بھی تمہیں موت سے بچانے نہیں آئیں گے اور یہ دیکھ لو کہ کوئی نہیں آیا۔ بچایا میں نے ہے۔ فقط۔ امیر حمزہ۔"

انہوں نے رکن الدین کی نبض اور دل کی دھڑکنیں دیکھیں۔ پتا چلا وہ بے ہوش ہو

گیا ہے۔ انہوں نے فون کے ذریعے کمشنر کو بتایا۔ "سر! کوئی ٹائم بم نہیں ہے۔ یہاں کے لوگوں کو اور ڈی سی صاحب کو دہشت میں مبتلا رکھا گیا تھا۔ ڈی سی صاحب دہشت کے مارے بے ہوش ہو گئے ہیں۔ ان کی حالت ایسی ہے کہ فوراً کسی بھنگی کو بلا کر ان کی صفائی کرانی ہو گی۔ پھر دوسرا لباس پہنا کر یا چادر میں لپیٹ کر اسپتال پہنچانا ہو گا۔"

کمشنر نے کہا۔ "ابھی یہ ظاہر نہ کیا جائے کہ وہ بم نقلی تھا۔ میں بھنگیوں کو بھیج رہا ہوں۔ جب تک اس مکان میں نہ آؤں تم دونوں باہر نہ آؤ اور نہ ہی کسی اخبار والے سے بات کرو۔"

کمشنر نے اپنے ماتحتوں سے کہا۔ "اس علاقے میں بھنگی ہوں گے دو چار کو بلا کر لے آؤ۔ جلدی کرو۔ ڈی سی صاحب کو اسپتال پہنچانا ہے۔"

پھر اس نے اسلام آباد وزارت داخلہ کے سیکرٹری سے گفتگو کی۔ امیر حمزہ کے خلاف کارروائی کرنے اور عوام میں اس کی مقبولیت کا گراف نیچے لانے کے لیے ایک طریقۂ کار کا تعین کیا۔ پھر اس مکان میں گیا۔ کئی اخبارات کے نمائندے اور فوٹو گرافرز بھی مکان کے اندر آنا چاہتے تھے۔ انہیں پولیس نے روکا اور وعدہ کیا کہ ابھی انہیں بلایا جائے گا۔

کمشنر نے اس کمرے میں آکر دونوں ماہرین کو سمجھایا کہ اسے اصلی اور بہت ہی خطرناک بم ظاہر کیا جائے۔ اخبارات کے رپورٹرز اور فوٹوگرافرز کو وہ نقلی بم نہ دکھایا جائے اور نہ ہی اس کی تصویریں اتارنے کی اجازت دی جائے۔ دونوں ماہرین نے اسے ایک ڈبے میں بند کیا پھر کمشنر کے ساتھ مکان سے باہر آئے۔ فوٹو گرافر تصویر اتارنے لگے۔ کمشنر نے کہا۔ "میں تمام سوالات کے جواب دوں گا۔ فی الحال انہیں راستہ دیں۔ اس ڈبے میں بہت طاقتور دھماکا کرنے والا تباہ کن بم ہے۔ ماہرین نے بڑی مہارت سے اسے ناکارہ بنایا ہے۔ اس کے باوجود ایسی ٹیکنیکل مشکلات ہیں جنہیں سمجھنے کے لیے ابھی لیبارٹری لے جانا ضروری ہے۔ پلیز ایک طرف ہٹ جائیں۔ انہیں فوراً جانے کے لیے راستہ دیں۔ ورنہ یہاں کوئی بڑی تباہی آسکتی ہے۔"

دونوں ماہرین وہ ڈبا لے کر ایک گاڑی میں وہاں سے چلے گئے۔ رکن الدین ٹھنڈے پانی کے باعث ہوش میں آگیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے آس پاس دیکھنے لگا۔ اس نے کچھ بولنا چاہا۔ اس کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ وہ دہشت کے باعث عارضی طور پر قوتِ گویائی سے محروم ہو گیا تھا۔ بھنگیوں کو دیکھ کر یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ مر چکا ہے اور اسے آخری غسل دیا جا رہا ہے۔ وہ ہوش میں آچکا تھا لیکن حواس میں نہیں تھا اب نارمل ہو چکا تھا۔

کمشنر دوسرے ماتحتوں کے ساتھ مکان کے باہر کہہ رہا تھا۔ "آپ حضرات سچ لکھنے والے صحافی ہیں۔ آپ اخبارات کے ذریعے عوام کو حقیقت بتائیں کہ امیر حمزہ کتنا ظالم اور سنگ دل دہشت گرد ہے۔ اگر ہمارے ماہرین بروقت اس بم کو ناکارہ نہ بناتے تو رکن الدین جیسے دیانت دار ڈی سی کے ساتھ اس علاقے کے سیکڑوں افراد ہلاک اور زخمی ہو جاتے۔ رکن الدین سے ذاتی دشمنی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سیکڑوں بے گناہ افراد کی زندگیوں سے کھیلا جائے۔ اگر اس بم کو ناکارہ بنانے میں کامیابی نہ ہوتی تو یہ سکھر جیسے پُرامن شہر میں بدترین دہشت گردی ہوتی۔ بے گناہ افراد کی ہلاکت کے علاوہ درجنوں مکان اور دکانیں کھنڈر بن جاتیں.........."

وہ امیر حمزہ کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔ مخالفین اب اس کی شخصیت بگاڑنے، اسے دہشت گرد اور ملک دشمن ثابت کرنے کے لیے اخبارات کے علاوہ دوسرے سرکاری میڈیاز کو بھی استعمال کرنے والے تھے۔

☆======☆======☆

دوسری صبح صوبائی پارٹی کے لیڈر رحمان چنا نے فون پر کاشف اکبر سے گفتگو کی۔ اسے بتایا کہ راجہ نواز کے حوصلے کتنے بڑھ گئے ہیں۔ اس نے پچھلی تمام رات جمال صالح کو قیدی بنا کر نازاں کے ساتھ صبح تک وقت گزارا ہے اور رحمان چنا کو یہ دھمکی دی تھی کہ وہ ان بہن بھائیوں کی مدد کے لیے آئے گا تو ان کے "را" کے ایجنٹ بیج ناتھ عرف بیجو کو تمام ٹھوس ثبوت کے ساتھ قانون کے حوالے کر دے گا۔

کاشف اکبر نے کہا۔ "چنا صاحب! پچھلے دو دنوں سے اخبارات میں یہ خبریں شائع ہو رہی ہیں کہ سیاست دانوں کے ذریعے یونیورسٹی میں تعلیم کے سلسلے میں دھاندلیاں ہو رہی ہیں جو جوان پارٹی کے مقاصد کے لیے کام کرنے کا عہد کرتے ہیں، انہیں آسانی سے وہاں داخلہ مل جاتا ہے اور ذہین طلبا و طالبات کی امتحانی کاپیاں تبدیل کر کے ان کے زیادہ سے زیادہ نمبر پارٹی ورکز طلبا کو دے کر انہیں اونچے گریڈ سے پاس کر دیا جاتا ہے۔"

"جی ہاں۔ ایسی خبریں شائع ہو رہی ہیں۔ سب سے زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ ہماری پارٹی کے اسٹوڈنٹس یونین کے لیڈر جمال صالح کی بری طرح پٹائی ہونے کی خبر شائع ہو چکی ہے۔"

"آج کے اخباروں میں مرزا نیک بخت کے اسٹوڈنٹس یونین لیڈر صادق گیلانی کی پٹائی ہونے کی خبر شائع ہوئی ہے۔ راجہ نواز کے بارے میں لکھا ہوا ہے کہ وہ تعلیمی ماحول کو سیاسی گندگی سے پاک کرنے آیا ہے اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے تمام طلبا و طالبات

راجہ نواز کی حمایت کرتے ہیں۔"

"چنا صاحب! یہ راجہ نواز کوئی طالب علم نہیں ہے مگر ایک اسٹوڈنٹ بن کر یونیورسٹی میں پہنچا ہوا ہے اور دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں کا دشمن ہے۔"

"جی ہاں۔ جیسے امیر حمزہ دونوں سیاسی پارٹیوں کے خلاف سرگرم عمل رہنے لگا ہے۔ میں ایک بار آپ سے کہہ چکا ہوں، یہ راجہ نواز مجھے امیر حمزہ لگتا ہے جو "را" کے ایجنٹوں تک پہنچا ہوا ہے، وہ کتنا باخبر اور کتنی منظم پارٹی کا سربراہ ہو گا، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔"

"اسٹوڈنٹس ہماری فرنٹ لائن ہیں۔ ہمیں اس میں فوری تبدیلیاں کرنی ہوں گی۔ آپ یہاں آجائیں، میں اس سلسلے میں ضروری باتیں کروں گا۔"

کاشف اکبر کے ایک مشیر نے صبح بیدار ہوتے ہی اسے بتایا تھا کہ ان کی پارٹی کے اخبار کے مدیر نے فون پر اطلاع دی ہے کہ راجہ نواز نے پچھلی رات جمال صالح کی کوٹھی میں گھس کر اس کی پٹائی کی اور یہ معلوم کیا ہے کہ کس طرح ان کے تعلقات "را" کے ایجنٹوں سے ہیں۔

مشیر نے پوچھا۔ "کیا تمہیں یہ باتیں فون کے ذریعے بتائی گئی ہیں؟"

مدیر نے کہا۔ "جی نہیں۔ باقاعدہ پریس ریلیز کے طریقے پر فوٹو اسٹیٹ کاپی موصول ہوئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ یہ خبر دوسرے اخبارات کو بھی ارسال کی جا رہی ہے۔"

کاشف اکبر نے سوچا، اب وہ راجہ نواز ہو، یا امیر حمزہ، اس نے پریس ریلیز میں نازاں کا ذکر نہیں کیا۔ پھر تو وہ سچا عاشق ہے۔ محبوبہ کی عزت رکھ لی ہے۔ سنا ہے لڑکی بہت ہی خوب صورت اور بڑی پُرکشش ہے۔

سیکرٹری نے انٹرکام پر کہا۔ "سر! کمال صالح صاحب ہاٹ لائن پر ہیں اور بہت ہاٹ ہو کر بول رہے ہیں۔"

کاشف اکبر نے ہاٹ لائن کا ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو، میں ہوں کاشف اکبر۔"

دوسری طرف سے کمال صالح نے کہا۔ "سر! یہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک دو کوڑی کا جوان میرے بیٹے کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے اور صوبائی پارٹی کے تمام عہدے دار تماشا دیکھ رہے ہیں؟ پتا ہے، وہ کل رات کوٹھی میں گھس آیا تھا۔ اس نے چار خوں خوار کتوں کو اور ان کے ٹرینر بیجو کو بھی زہر کے ذریعے ہلاک کیا ہے۔ اگر وہ میرے بچوں کو بھی ہلاک کر دیتا تو آپ لوگوں کا کچھ نہ جاتا۔ مجھے آپ کی پارٹی میں رہنے کی سزا مل جاتی بلکہ سزا مل رہی ہے۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "کمال صاحب! غصہ دکھانے سے دشمن فوراً ہی ہماری گرفت میں نہیں آجائے گا۔ جیسا وہ چال باز ہے۔ ویسی ہی چال بازی سے ہم اسے آپ کے قدموں میں لا کر گرائیں گے اور آپ ہی اسے اپنی پسند کی موت دیں گے۔"

"میں ابھی آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"آپ ضرور تشریف لائیں اور اپنے ساتھ اپنی بیٹی اور بیٹے کو بھی لے آئیں۔ اس کم بخت نے آپ کی بیٹی کو بدنام کرنے کے لیے اخبار والوں تک بڑی شرمناک خبریں پہنچائی ہیں۔"

وہ ایک دم سے گڑبڑا کر بولا۔ "کیسی شرم ناک خبریں؟ میں قسم کھا کر کہتا ہوں' اس کمینے نے میری بیٹی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ وہ پاؤں کی دھول ہے۔ آپ کے سر تک نہیں پہنچ سکتا لیکن وہ بدنام کر رہا ہے تو ہمیں بھی جواباً اسے جھوٹا ثابت کرنا ہو گا اسی لیے کہتا ہوں آپ نازاں اور جمال کو ساتھ لے آئیں۔"

وہ ریسیور رکھ کر بڑبڑایا' گدھے کا بچہ! اپنی بیٹی کی پارسائی کا یقین دلا رہا ہے۔ جبکہ چنا صاحب کہہ رہے ہیں کہ وہ جوان صبح تک نازاں کے ساتھ تھا۔ میں بھی اسے پارسا ہی کہوں گا۔ پارٹی کو مضبوط رکھنے کے لیے ایسے لوگوں کے جھوٹ کو بھی سچ کہنا پڑتا ہے۔

اس نے انٹر کام پر سیکرٹری سے کہا۔ "مرزا سے بات کراؤ۔"

تھوڑی دیر بعد سیکرٹری نے اطلاع دی' مرزا نیک بخت فون تھری ٹو پر ہے۔ اس نے فون تھری ٹو کا ریسیور اٹھا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو۔ میں کاشف اکبر ہوں۔"

مرزا نیک بخت نے پوچھا۔ "مجھ سے گفتگو کی کیسے زحمت کی؟"

"میں کسی بھی معاملے میں آپ کا محتاج نہیں ہوں اور نہ ہی آپ میرے محتاج ہیں لیکن جب دونوں کے مفادات پر ضرب پڑتی ہے تو پھر ہم دونوں پر لازم ہوتا ہے کہ اس ضرب لگانے والے تیسرے شخص سے پہلی فرصت میں نمٹ لیا جائے۔"

"امیر حمزہ ایک عرصے سے ہم دونوں کے پیچھے پڑا ہے۔ اور ہم اپنے طور پر اس سے نمٹ رہے ہیں۔ آپ شاید راجہ نواز کی وجہ سے پریشان ہو رہے ہیں؟"

"کیا آپ اس سے خطرہ محسوس نہیں کر رہے؟ اس نے آپ کے اسٹوڈنٹس یونین کے لیڈر کی بھی پٹائی کی ہے۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ وہ ایک مستحکم اور وسیع ذرائع رکھنے والی تنظیم کا سربراہ ہے یا پھر اس تنظیم کا بہت ہی اہم پرزہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہمارے تمہارے تعلقات تھے۔"

"میں مانتا ہوں۔ راجہ نواز یونیورسٹی میں رہ کر ہم دونوں کو نقصان پہنچائے گا۔ ابھی ابتدا ہے' وہ تنہا ہمارے اسٹوڈنٹس سے نمٹ رہا ہے۔ اگر اسے ڈھیل دی گئی تو وہ دونوں اسٹوڈنٹس یونین کو وہاں سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا۔ بائی دا وے آپ اپنی دوسری فورس کے ذریعے اسے ٹھکانے کیوں نہیں لگا رہے؟"

"یہی سوال میں آپ سے کرتا ہوں' کیا آپ راجہ نواز کو موقع دیں گے کہ وہ آپ کی اسٹوڈنٹس یونین کو ختم کر دے۔"

"میں کسی دشمن کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دیتا لیکن راجہ نواز آپ کے کاندھے پر سوار ہو کر یونیورسٹی پہنچا ہے۔ بہتر ہے پہلے آپ اس کے خلاف کارروائی کریں۔ میں ایک گھنٹے بعد لندن کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ واپس آکر دیکھوں گا۔ آپ اسے ختم نہ کر سکے تو مجھے ہی کچھ کرنا ہو گا۔"

مرزا نیک بخت نے فون بند کر دیا۔ کاشف اکبر سوچنے لگا۔ یہ کم بخت پتا نہیں لندن جا رہا ہے یا واشنگٹن؟ ضرور خفیہ ہاتھ سے مزید اہم معاملات طے کرے گا اور دوسری خفیہ ایجنسیوں سے بھی کچھ لین دین کے معاہدے کر سکتا ہے۔

اس نے اپنے مشیر کو بلا کر کہا۔ "یورپ اور امریکا میں ہمارے جتنے کارکن ہیں' انہیں الرٹ کر دو۔ مرزا نیک بخت انتخابی مہم کے سلسلے میں کہاں جا رہا ہے اور کیسی کیسی اہم شخصیات سے مل رہا ہے۔ اس کی تمام مصروفیات کی رپورٹ ملنی چاہیے۔"

مشیر چلا گیا۔ صوبائی پارٹی کا لیڈر رحمان چنا ملاقات کے لیے آیا۔ پھر اس سے مصافحہ کر کے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ کاشف اکبر نے اسے مرزا نیک بخت کے بارے میں بتایا کہ وہ انتخابی مہم کے لیے غیر ملکی دورے پر گیا ہے۔ ابھی ابتدا ہے اور وہ اپنی سیاسی پوزیشن مستحکم کرتا جا رہا ہے۔

رحمان چنا نے کہا۔ "ہم نے بھی ملک گیر مہم چلا رکھی ہے۔ آپ بھی غیر ملکی دورہ کریں تو ہماری پوزیشن مضبوط ہوتی رہے گی۔ ویسے آپ یہاں آئے ہیں تو پہلے راجہ نواز کو ٹھکانے لگانے کا بندوبست کریں اور اپنی اسٹوڈنٹس فرنٹ کو مضبوط کریں۔"

"راجہ نواز کا پتا ٹھکانہ معلوم ہو تو اس پر حملہ کرایا جائے۔ اب وہ محتاط ہو گیا ہو گا۔ پتا نہیں یونیورسٹی آئے گا یا نہیں؟"

"اگر نازاں یونیورسٹی جائے گی تو وہ بھی سر کے بل جائے گا۔"

"پھر تو ہم اسے سر کے بل ہی زمین میں دفن کرائیں گے۔ وہ درندہ قاتل مختار پاشا کس جیل میں ہے؟"

"یہیں کراچی سینٹرل جیل میں۔"

"پھر تو بات بن جائے گی۔ جیلر سے سودا کریں۔ مختار پاشا دو چار گھنٹوں کے لیے جیل سے نکلے گا۔ راجہ کو قتل کرے گا پھر قیدی بن کر جیل کے اندر چلا جائے گا۔"

"یہ طریقۂ کار درست رہے گا۔ راجہ نواز کی تنظیم کے لوگ قاتل کو ڈھونڈتے رہ جائیں گے۔"

کاشف اکبر نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ نے وڈیرا کمال صالح کی بیٹی کو دیکھا ہے؟"

"جی ہاں۔ یونیورسٹی میں داخلے کے دنوں میں دو تین بار دیکھا ہے۔"

"کیا واقعی حسین ہے؟"

"غیر معمولی پر حسین ہے۔ دوسری لڑکیوں سے کچھ الگ ہی لگتی ہے۔ شاید مغرور ہونے کے باعث اس کے حسن میں اور زیادہ کشش پیدا ہو گئی ہے۔"

"ابھی وہ اپنے باپ کے ساتھ آنے والی ہے۔ آپ دوسرے کمرے میں رہیں گے۔ ان کے جانے کے بعد میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کروں گا۔"

"دیکھیے میں آپ کے ارادوں کو سمجھ رہا ہوں۔ آپ ہم سے زیادہ سمجھدار ہیں پھر بھی یہ کہہ دوں کہ وڈیرا جمال صالح ہماری پارٹی کے لیے بہت اہم ہے۔ تھر کے علاقوں کے تین ایم این اے اور تین ایم پی اے ہمیشہ اس کی مٹھی میں رہتے ہیں۔ ان سے اسمبلی میں ہماری تعداد بڑھتی ہے۔"

"میں سب سمجھتا ہوں۔ آپ خدشہ ظاہر کر رہے ہیں اس لیے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بات نہیں بگڑے گی۔ نازاں کو اغوا کیا جائے گا تو الزام راجہ نواز پر آئے گا۔ وڈیرا کمال صالح ہم پر کبھی شبہ نہیں کرے گا۔" وہ کچھ بے چین سا ہو کر بولا۔ "ہمیں اتنے سیاسی پتھر لگتے رہتے ہیں کہ ہمارے زخموں کی مرہم پٹی کے لیے ایک خوب صورت نرس لازمی ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو سیاست کے ریگستان میں پیاسے مر جائیں۔ سیاست کی سنگینی میں حسن و شباب کی رنگینی ضروری ہے۔"

انٹر کام کے ذریعے سیکرٹری نے کہا۔ "سر! سائیں کمال صالح تشریف لائے ہیں۔"

"انہیں بٹھاؤ۔ میں ابھی بلاتا ہوں۔"

وہ انٹر کام کو آف کر کے بولا۔ "چنا صاحب! آیئے' میں ذرا چھپ کر اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ دونوں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آئے۔ وہاں سے ایک کوریڈور میں

پہنچے۔ ایک طرف وسیع و عریض ڈرائنگ روم کا دروازہ اور کھڑکی تھی۔ کاشف اکبر نے پردے کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا۔ وہ کچھ فاصلے پر نظر آئی۔ اپنے باپ اور بھائی کے سامنے والے صوفے پر شاہانہ انداز میں ایسے تن کر بیٹھی تھی جیسے وہ صوفے پر نہیں' دل کی مسند پر بیٹھنے کے لیے پیدا ہوئی ہو۔ کاشف اکبر اسے دیکھ کر پلکیں جھپکانا بھول گیا۔

سیاست کے گرم تپتے ہوئے صحرا میں ننگے پاؤں چلتے چلتے ٹھنڈی مخملی گھاس قدموں تلے آگئی تھی۔ ساون کی بدلی اس پر برسنے چلی آئی تھی۔ وہ خیال ہی خیال میں بہت دور پہنچ گیا۔ حسن و شباب کی بارش میں بھیگنے لگا۔ رحمان چنا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو وہ خیالات سے چونک پڑا۔ کھڑکی سے ہٹ کر ایک کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "یہ تو قیامت ہے۔ میں ایک دن کے لیے آیا تھا۔ اب دو چار دن رہ سکتا ہوں۔"

"تو پھر اسے ٹریپ کیا جائے؟"

"ضرور کیا جائے اور جلد سے جلد کیا جائے۔ میرا اسلام آباد جانا بھی ضروری ہے۔"

"ہمارے لوگ ایسے ہیں کہ جو کہا جائے' کر گزرتے ہیں۔ دیر نہیں کریں گے۔ آج ہی اسے آپ کی شکار گاہ میں پہنچا دیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ جائیں۔ پہلے یہی کام کریں۔ بعد میں دوسرے مسائل پر باتیں ہوں گی۔"

وہ اپنے بیڈ روم میں آکر انٹر کام کے ذریعے سیکرٹری سے بولا۔ "انہیں بھیج دو۔"

تھوڑی دیر بعد وڈیرا کمال صالح اپنی بیٹی اور بیٹے کے ساتھ آیا۔ اس نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔ پھر انہیں صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ وڈیرا کمال صالح نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا بیٹا جمال صالح اور یہ میری بیٹی نازاں ہے۔ میں نے انہیں اس لیے شہر میں رہنے دیا ہے کہ آپ کا سایہ ان کے سر پر ہے لیکن بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ نہ سہی' آپ کے رحمان چنا صاحب تو ان کی حفاظت کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے میرے بچوں کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ صبح تک کوئی ان کی خیریت معلوم کرنے نہیں آیا۔"

کاشف اکبر نے سوچا تھا کہ نازاں کی طرف نہیں دیکھے گا۔ بار بار دیکھنے سے مرد کی نیت کا پتا چل جاتا ہے لیکن وہ اس کے باپ کی شکایات سننے کے دوران میں اسے چور نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس نے کہا۔ "سائیں! آپ جانتے ہیں' میں اسلام آباد میں تھا۔ اگر یہاں ہوتا تو اپنی جان پر کھیل جاتا مگر نازاں پر آنچ نہ آنے دیتا۔ کسی دشمن کا اس پر سایہ بھی نہ پڑنے دیتا۔"

اس نے ایک ہیرو کے انداز میں نازاں کو متاثر کرنے کے لیے ایسے الفاظ ادا کیے۔

نازاں نے اسے دیکھا۔ پھر نظریں ملتے ہی اس نے نظریں جھکالیں۔ اس کا اپنا تجربہ تھا کہ جو حسینہ نظروں کی تاب نہ لائے اور اپنی نظریں جھکا لے' وہ نظریں ملانے والے کی شخصیت سے متاثر ہو جاتی ہے۔

کمال صالح نے کہا۔ "آپ یہ نہ سمجھیں کہ میری بیٹی پر کوئی آنچ آئی ہے۔ اس کمینے کو اس کے قریب آنے کا بھی موقع نہیں ملا۔"

"لیکن اس نے تمام اخبارات کو یہ لکھ بھیجا ہے کہ وہ صبح تک ان بہن بھائی کے ساتھ اس کوٹھی میں تھا۔ اگرچہ اس نے کھل کر کچھ نہیں لکھا ہے لیکن اخبار پڑھنے والے تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ بتانے کی نہیں' سمجھنے کی بات ہے کہ وہ صبح تک وہاں کیا کر رہا تھا۔"

نازاں نے اس بات پر منہ پھیر لیا۔ سر پر آنچل اس طرح رکھا کہ چہرہ چھپنے لگا۔ کمال صالح نے کہا۔ "میری بیٹی جان دے سکتی ہے مگر عزت نہیں دے سکتی۔ ہم عزت کی خاطر دشمن کو مار دیتے ہیں یا مرجاتے ہیں۔"

جمال صالح نے کہا۔ "میں چشم دید گواہ ہوں کہ میری بہن اس سے محفوظ رہی ہے۔ جب نازاں نے دیکھا کہ راجہ نواز کوٹھی میں گھس آیا ہے اور میں اس سے لڑتے ہوئے اس کی پٹائی کر رہا ہوں تو یہ دوڑ کر اپنے بیڈ روم میں گئی۔ پھر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔"

کاشف اکبر نے پوچھا۔ "تم کب تک اس کا مقابلہ کرتے رہے؟"

"میں تو ساری رات مقابلہ کر سکتا تھا لیکن اس نے ہاتھاپائی کے دوران میں دھوکے سے مجھے ہتھکڑی پہنا کر کھڑکی کی جالی کے ساتھ پھنسا دیا۔"

"پھر تو وہ نازاں کے بیڈ روم کی طرف گیا ہو گا؟"

باپ نے کہا۔ "ہاں مگر اندر نہ جا سکا۔ نازاں نے دروازے کو لاک کر لیا تھا۔ راجہ نے دھمکی دی تھی کہ وہ فائرنگ کے ذریعے دروازے کا لاک توڑ دے گا۔ میری بیٹی نے کھڑکی سے ایک خنجر دکھا کر کہا کہ اس کے آنے سے پہلے ہی وہ اپنے سینے میں خنجر گھونپ لے گی۔ اسے زندہ نہیں ملے گی۔ وہ مجبور ہو گیا۔ کھڑکی کے پاس آکر صبح تک خوشامد کرتا رہا کہ یہ دروازہ کھول دے لیکن میری بیٹی خنجر کی نوک اپنے سینے سے لگائے کھڑی رہی۔ آخر اسے ناکام واپس جانا پڑا۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "میں نازاں کی پارسائی سے اور اس کی جان دینے والی دلیری سے متاثر ہو رہا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ چوبیس گھنٹے کے اندر راجہ نواز کو کتے کی موت

ماروں گا۔"

ملازم ایک ٹرالی میں چائے اور کھانے کی چیزیں لے آیا۔ کاشف اکبر نے انہیں کھانے کے لیے کہا۔ باپ اور بیٹا ایک ایک پلیٹ اٹھا کر کچھ کھانے کی چیزیں لینے لگے۔ کاشف اکبر ایک پلیٹ میں بسکٹ اور پیسٹری رکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کر نازاں کے پاس آیا۔ اس کی طرف پلیٹ بڑھا کر بولا۔ "تم پہلی بار میرے گھر آئی ہو۔ یہ لو۔ تکلف نہ کرو۔"

نازاں نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ "سائیں! آپ اپنی بیٹی کو بتائیں کہ میں نے کبھی کسی کے سامنے اس طرح پلیٹ پیش نہیں کی۔ یہ انکار کرے گی تو میری توہین ہو گی۔"

باپ نے کہا۔ "بیٹی! تمہیں فخر کرنا چاہیے۔ اس ملک کی بہت بڑی شخصیت تمہارے پاس چل کر آئی ہے اور تمہاری میزبانی کر رہی ہے۔"

بھائی نے کہا۔ "نازاں! انکار نہ کرو۔"

باپ اور بھائی کی طرف سے شہ ملتے ہی کاشف اکبر نے نازاں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ایک دم سے چونک گئی لیکن اس سے پہلے کہ ہاتھ چھڑاتی' کاشف اکبر نے پلیٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ نازاں نے مجبور ہو کر دونوں ہاتھوں سے پلیٹ کو تھام لیا۔ وہ اپنے صوفے پر واپس آکر بیٹھ گیا۔ نازاں کا ہاتھ ابھی تک کاشف اکبر کی ہتھیلی میں کھل رہا تھا اور سوال کر رہا تھا کہ ہاتھ ایسا ہے تو پوری کی پوری کیسی ہو گی؟

وڈیرا کمال صالح نے کہا۔ "صرف اسے قتل کرنے سے ہماری تسلی نہیں ہو گی۔ ہم چاہتے ہیں' پہلے اسے ٹارچر سیل میں لے جا کر خوب اذیتیں دی جائیں پھر اسے یونیورسٹی لے جا کر اسٹوڈنٹس کے سامنے نازاں اور جمال کے قدموں میں گرنے اور معافی مانگنے پر مجبور کیا جائے۔"

جمال نے کہا۔ "جب تک وہ تمام اسٹوڈنٹس کے سامنے ہمارے قدموں میں گر کر ہماری ٹھوکریں نہیں کھائے گا' تب تک ہم یونیورسٹی میں سر اٹھا کر نہیں رہ سکیں گے۔"

کاشف اکبر نے پوچھا۔ "کیوں نازاں؟ تم بھی یہی چاہتی ہو؟"

وہ سر کے آنچل کو گھونگھٹ بنا کر منہ چھپانے لگی۔ اس نے کہا۔ "جب سے تم آئی ہو' میں نے تمہاری آواز نہیں سنی۔ بھئی دشمن سے انتقام لینے کی بات ہے۔ کچھ تو کہو۔"

باپ نے کہا۔ "ہاں بیٹی! تم تو گرجنے اور برسنے والی لڑکی ہو۔ کسی کی چھوٹی سی غلطی معاف نہیں کرتی ہو۔ بتاؤ اس غنڈے سے کس طرح انتقام لینا چاہتی ہو؟"

وہ بولی۔ "میں۔ میں چاہتی ہوں' اسے میرے حوالے کیا جائے۔"
کاشف اکبر نے پوچھا۔ "تمہارے حوالے؟"
باپ نے پوچھا۔ "کیوں؟"
وہ سرد لہجے میں بولی۔ "میں اسے اپنے ہاتھوں سے گولی مارنا چاہتی ہوں۔"
کاشف اکبر نے خوش ہو کر بولا۔ "آخر ہو وڈیرے سائیں کی بیٹی۔ مجرم کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کرنا چاہتی ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں' تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔"

وہ تینوں چائے پینے کے بعد کاشف اکبر سے رخصت ہو کر اسی محل نما کوٹھی کے پورچ میں آئے۔ اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر باپ بیٹی بیٹھ گئے۔ بھائی اسٹیئرنگ پر بیٹھ کر اسے ڈرائیو کرتا ہوا احاطے کے بڑے گیٹ سے باہر آیا۔ پھر ساحلی سڑک پر ڈرائیو کرتا ہوا اپنی ڈیفنس والی کوٹھی کی طرف جانے لگا۔

راجہ نواز ایک چھوٹی سی ٹویوٹا میں بیٹھا ان کا منتظر تھا۔ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کاشف اکبر اسلام آباد سے آ کر ان کے لیے کیسے انتظامات کرنے والا ہے؟ اور اس سے انتقام لینے کے لیے کیا کارروائی کی جانے والی ہے؟

اسے توقع نہیں تھی کہ نازاں بھی باپ کے ساتھ کاشف اکبر کے محل میں جائے گی۔ یوں جانے کا مطلب یہی سمجھ میں آ رہا ہے کہ اس نے بھی اپنے ایک رات کے مہمان کے خلاف شکایتیں کی ہوں گی۔

راجہ نواز دوسرے دن یونیورسٹی جانے سے پہلے دشمنوں کی چالوں کو سمجھنا اور اپنے لیے حفاظتی تدبیر کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ ان کی خفیہ چال بازیوں کا پتہ نہیں چلے گا تو کل صبح تک جمال صالح کو اغوا کر کے اسے اپنے خفیہ اڈے میں قید کر کے یونیورسٹی جائے گا۔ اگر کاشف اکبر کے سیاسی غنڈے مسلح فوج کی صورت میں آئیں گے تو وہ انکشاف کرے گا کہ اس نے جمال صالح کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ اگر اسے نقصان پہنچایا جائے گا تو پھر انہیں جمال صالح کی لاش ملے گی۔

وہ صوبائی پارٹی کے لیڈر رحمان چنا کو بھی اغوا کر کے قیدی بنا سکتا تھا۔ ایسے کئی اہم مہرے تھے' جنہیں وہ اپنی سلامتی کے لیے ڈھال بنا کر دشمنوں کی انتقامی کارروائیوں کو ناکام بنا سکتا تھا۔

لیکن اچانک ہی ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وہ توقع نہیں کر سکتا تھا۔ نازاں جس کار میں جا رہی تھی' وہ رک گئی تھی۔ سامنے سے آنے والی ایک پجارو نے راستہ روک لیا

تھا۔ اس پجارو سے منہ پر ڈھاٹا باندھے ہوئے چار افراد باہر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوف دیکھ کر پہلے یہی سمجھ میں آیا کہ وہ ڈاکو ہیں۔ لوٹنے کے لیے راستہ روکا ہے لیکن انہوں نے کار کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر نازاں کو کھینچ کر باہر نکالا۔ ان باپ بیٹے کی تلاشی لے کر ان کا موبائل فون اور اسلحہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ جمال سے کار کی چابی بھی چھین لی۔ اس کے ایک پہیئے کو گولی مار کر ناکارہ بنا دیا۔ نازاں چیخ رہی تھی۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا۔ ایک قد آور شخص اسے کاندھے پر لاد کر پجارو کے اندر لے گیا۔ پھر وہ پجارو اسٹارٹ ہو کر ایک یوٹرن لے کر وہاں سے جانے لگی۔

راجہ نواز ان سے کافی فاصلے پر اپنی کار میں تھا اور دور سے وہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ ساحل پر کچھ لوگ تھے' جو خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ راجہ اپنی کار تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا' ان باپ بیٹے کے قریب سے گزرتا ہوا پجارو کے تعاقب میں جانے لگا۔

بے چارے باپ بیٹے وہیں کھڑے رہ گئے۔ وہ کر بھی کیا سکتے تھے؟ کار کی چابی چھین لی گئی تھی۔ ایک پہیئے کو بے کار کر دیا گیا تھا۔ وہ پولیس کو اور کاشف اکبر کو اطلاع نہیں دے سکتے تھے۔ ان سے موبائل فون بھی چھین لیا گیا تھا۔ جمال نے کار کی باڈی پر گھونسا مارتے ہوئے کہا "شٹ۔ ان کتوں نے مجھ سے اسلحہ بھی چھین لیا۔ ورنہ..........."
باپ نے بات کاٹ کر غصے سے کہا۔ "ورنہ تم اس ٹی ٹی سے خودکشی کر لیتے۔ گدھے کے بچے جب وہ پجارو سے باہر آ رہے تھے۔ تب ہی تم نے فائرنگ کیوں نہیں کی؟"

"بابا سائیں! وہ چار تھے۔ میں ایک کو مارتا تو باقی تین ہم دونوں کو مار ڈالتے۔"
"بکواس مت کرو۔ ایک گولی چلنے کے بعد وہ سب پجارو سے باہر نکلنے اور ہماری طرف آنے کی جرأت نہ کرتے۔ پھر تم کار کو ریورس گیئر میں رکھ کر ان سے دور ہو کر بہن کو بچا سکتے تھے۔ اب کیسے تعاقب کرو گے؟ کہاں سے بہن کو لاؤ گے؟ پتا نہیں وہ کون تھے؟"

"صاف ظاہر ہے' وہ راجہ نواز کے آدمی تھے۔ انہوں نے ہم سے رقم نہیں چھینی۔ صرف نازاں کو لے گئے۔ یہ صرف راجہ کی بدمعاشی ہے۔"
وڈیرا جمال صالح نے کار سے ٹیک لگا کر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ جوان بیٹی کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا' اس کے بارے میں سوچ کر شرم آ رہی تھی۔ اس نے کاشف اکبر کے سامنے بیٹھ کر بیٹی کی شرم و حیا اور پارسائی پر فخر کیا تھا اور یہ جھوٹ کہا تھا

کہ بیٹی نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ راجہ نواز کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔

لیکن اب کاشف اکبر سے اور پولیس والوں سے کہنا ہی پڑے گا کہ راجہ نواز اس کی عزت کی دھجیاں اُڑانے کے لیے اس کی بیٹی کو کہیں لے گیا ہے۔ پچھلی رات سے نازاں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا' اس کے نتیجے میں باپ بیٹے کا ضمیر بیدار نہیں ہو رہا تھا۔ وہ یہ نہیں سوچ رہے تھے کہ اپنے علاقوں میں غریب ہاریوں اور مزدوروں کی بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ کیا کرتے آئے ہیں۔ ان کے دماغوں میں باپ دادا کے زمانے سے ایک ہی بات سمائی ہوئی تھی کہ وہ اپنی غریب رعایا کے ساتھ بدترین سلوک کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ پولیس اور قانون صرف ان کی بہنوں اور بیٹیوں کے تحفظ کے لیے ہے۔

یہ کہاوت درست ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ وڈیرا کمال صالح اپنے علاقوں میں بڑی مچھلی تھی اور وہاں کی چھوٹی مچھلیوں کو کھا جایا کرتا تھا۔ شہروں میں کاشف اکبر بڑی مچھلی تھا۔ اس کے آگے وڈیرا جمال صالح چھوٹی مچھلی تھا اور یہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ کاشف اکبر ایک بڑی مچھلی بن کر اسے کھا سکتا ہے بلکہ کھانے کے انتظامات کر چکا ہے۔

اس نے فون پر رحمان چنا سے پوچھا۔ "میرے شکار کے لیے کیا ہو رہا ہے؟"

"سر! آپ کا حکم سنتے ہی تعمیل ہو جاتی ہے۔ ابھی ایک بندے نے فون پر اطلاع دی ہے کہ اسے اٹھا لیا گیا ہے۔ ان باپ بیٹے کی کار ناکارہ بنا دی گئی ہے اور ان سے موبائل فون چھین لیا گیا ہے۔ وہ پینتالیس منٹ میں اسے آپ کے پرائیویٹ بنگلے میں پہنچا دیں گے۔"

"ان اغوا کرنے والوں سے کہو۔ نازاں کوئی گڑ بڑ کر سکتی ہے۔ اسے اس طرح دہشت زدہ کیا جائے کہ وہ چیخنا چلّانا بھول جائے اور ایسی رکاوٹیں پیدا کی جائیں کہ اسے فرار ہونے اور اپنے باپ اور بھائی کے پاس واپس آنے کا راستہ نہ ملے۔"

"میں نے چھٹے ہوئے بدمعاشوں کو یہ کام دیا ہے۔ ہم ان سے پہلے بھی کئی بار کام لے چکے ہیں۔ نازاں ان کے شکنجے میں بھیگی بلی بن کر رہے گی۔"

پجارو کے اندر وہ بلی چار کتوں کے درمیان سہمی ہوئی تھی۔ انہوں نے دھمکی دی تھی کہ منہ سے آواز نکالے گی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔ وہ لوگ چہروں سے ہی جلاد دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی خونخوار آنکھیں اور سخت لہجہ کہہ رہا تھا کہ وہ جو کہتے ہیں' وہ کر گزرتے ہیں۔

ان کی گاڑی شہر کی شاہراہوں پر دوڑ رہی تھی۔ پھر وہ نیشنل ہائی وے پر جانے لگی۔ ان راستوں پر گاڑیوں کی آمدورفت تھی۔ اس لیے ان چاروں کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ایک ٹویوٹا ان کے تعاقب میں ہے۔

راجہ نواز نے موبائل کے ذریعے امیر حمزہ سے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے اس کے خاص ماتحت نے کہا۔ "سر! کیپٹن صاحب سکھر سے اسلام آباد چلے گئے ہیں۔ آپ حکم کریں۔"

اس نے کہا۔ "ایک پجارو کا نمبر نوٹ کرو۔ کے اے ٹو نائن نائن زیرو نائن۔ یہ پجارو ٹھٹھہ کی طرف جا رہی ہے۔ میں بھی نیشنل ہائی وے پر اس کے تعاقب میں ہوں۔ پجارو میں چار بندے مسلح ہیں۔ وہ نازاں کو جبراً لے جا رہے ہیں۔ پہلے ایک گاڑی لے کر وہاں کھڑے ہو جاؤ۔ کوشش کرو کہ کاؤنٹر فائرنگ نہ ہو۔ ایک بھی گولی نہ چلے۔ ناکہ بندی کے لیے تمہارے پاس صرف بیس منٹ ہیں۔"

"آل رائٹ سر! ہم وہاں پہنچ رہے ہیں۔"

راجہ نے موبائل آف کر کے اسے ڈیش بورڈ کے خانے میں رکھ دیا۔ وہاں سے ایک ٹی ٹی نکال کر اسٹیئرنگ کو سنبھالتے ہوئے اسے چیک کیا۔ اس کا چیمبر بھرا ہوا تھا۔ اس نے اسے اپنی ران کے نیچے رکھ لیا۔

نازاں بری طرح سہمی ہوئی تھی۔ ان سے کچھ نہیں پوچھ رہی تھی۔ خود ہی سمجھ گئی تھی کہ راجہ نواز کرائے کے غنڈوں کے ذریعے اسے اغوا کرا رہا ہے۔ ایک غنڈے نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "گھور کر دیکھ رہی ہو۔ ماں قسم بڑی غضب ناک لگ رہی ہو۔ اگر بادشاہ سلامت کی امانت نہ ہوتیں تو میں تمہیں یہیں چبانا شروع کر دیتا۔"

وہ حقارت سے بولی۔ "اونہہ! وہ دو کوڑی کا راجہ تمہارے لیے بادشاہ سلامت ہو گا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "وہ راجہ کیا بیچتا ہے۔ ہم اور اسے بادشاہ مانیں گے؟ اس ملک میں ہمارے تو ایک ہی بادشاہ سلامت ہیں۔ کاشف اکبر صاحب!"

نازاں نے چونک کر پوچھا۔ "کاشف اکبر؟"

"ہاں تم ایسی چیز ہو کہ ان کا دل تم پر آ گیا ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم سب راجہ نواز کے آدمی ہو۔ خواہ مخواہ کاشف صاحب کو بدنام کر رہے ہو۔ وہ میری پارسائی کا یقین کرتے ہیں۔ میری عزت کرتے ہیں۔ میں ایک عزت دار باپ کی بیٹی........"

وہ اس کی بات پر قہقہے لگانے لگے۔ گاڑی ڈرائیو کرنے والے نے رفتار سست کرتے ہوئے کہا۔ "خاموش ہو جاؤ۔ دور سامنے دیکھو۔ پولیس والے کھڑے ہیں۔ فوراً اسلحہ چھپاؤ۔"

وہ سب فوراً ہی سیٹوں کے نیچے اور درمیان میں اسلحہ چھپانے لگے۔ ایک نے نازاں کو چھوٹے سائز کا پستول دکھا کر کہا۔ "یہ میرے لباس میں چھپا رہے گا تم ہمارے خلاف کچھ کہنا چاہو گی تو ہم تمہیں گولی مار دیں گے۔"

پھر اس نے ڈرائیو کرنے والے سے کہا۔ "افسر چیکنگ کے لیے آئے تو اسے چنا صاحب کا کارڈ دکھا دینا۔ اگر وہ چنا صاحب کا زر خرید نہیں ہو گا تو پھر اسلحہ استعمال کرنا پڑے گا۔"

پجارو سست رفتاری سے چلتی ہوئی پولیس افسر اور سپاہیوں سے کچھ فاصلے پر رک گئی۔ اسی وقت راجہ نواز کی کار قریب آگئی تھی۔ ایک افسر دو سپاہیوں کے ساتھ چلتے ہوئے پجارو کے قریب آیا۔ دو سپاہی پجارو کے دونوں طرف کھڑکیوں کے پاس آئے۔ وہ چاروں توقع کر رہے تھے کہ ان سے کچھ پوچھا جائے گا لیکن سپاہیوں نے اچانک اپنی اپنی جیب سے ایک ایک اسپرے کین نکالا اور کھڑکیوں کے راستے پجارو کے اندر بے ہوشی کی دوا اسپرے کرنے لگے۔

سپاہیوں نے سانس روکی ہوئی تھی۔ نازاں اور وہ چاروں سمجھ نہیں پائے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ دوا زود اثر تھی۔ ان کے کچھ سمجھنے اور معلوم کرنے سے پہلے ان پر نقاہت طاری ہوئی اور وہ بے ہوش ہوتے چلے گئے۔ ان میں سے ایک بڑا جی دار تھا۔ نیم بے ہوشی کے دوران میں پجارو کا دروازہ کھول کر باہر آ کر کھلی ہوا میں سانس لینا چاہتا تھا۔

راجہ نواز نے ٹی ٹی کے دستے سے اس کے سر پر ایک ضرب لگائی۔ اسے کھینچ کر باہر پھینکا۔ پچھلی سیٹ پر نازاں بے ہوشی کی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں بازوؤں میں اٹھا کر اسے اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر لے آیا۔ ایک جانباز سے بولا۔ "ان چاروں میں سے کسی ایک کو اٹھا کر لے آؤ۔ ہوش میں آنے کے بعد اس سے اگلواؤ کہ یہ کون ہیں؟ اور نازاں کو کہاں لے جا رہے تھے؟"

اپنی کار اسٹارٹ کر کے وہ آگے بڑھ گیا۔

ادھر باپ بیٹے نے ایک گیراج میں پہنچ کر وہاں کے مالک کو اپنی روداد سنائی۔ مالک نے ایک مکینک کو اوزار کے ساتھ کار لانے کے لیے بھیج دیا۔ وڈیرا جمال صالح نے وہاں سے فون پر کاشف اکبر سے رابطہ کیا۔ اسے بھی بیٹی کے اغوا کی روداد سنائی۔ پھر کہا۔ "خدا

کے لیے فوراً ایسی کارروائی کریں کہ میری بیٹی ابھی مجھے مل جائے۔ آپ میری پوزیشن کا خیال کریں۔ میں بدنام ہو جاؤں گا۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "آپ حوصلہ کریں۔ ذرا صبر سے کام لیں۔ اسی بدمعاش راجہ نے نازاں کو اغوا کیا ہے۔ میں اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔ آپ کی بیٹی آپ کے حوالے کروں گا اور راجہ نواز کو گولی مار دوں گا۔"

"میں چاہتا ہوں۔ ابھی پولیس والوں کو خبر نہ ہو۔ میری عزت کا معاملہ ہے۔ اخبارات میں میری بیٹی کی تصویریں چھپیں گی۔ اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بنائی جائیں گی۔"

"میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ کیسی مشکلوں میں پڑ گئے ہیں۔ آپ کی عزت ہماری عزت ہے۔ ہم نہایت رازداری سے نازاں کو واپس لائیں گے۔"

"میں اپنی کوٹھی میں ہوں اور آپ کے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔"

کاشف اکبر نے اسے خوب جھوٹی تسلیاں دیں۔ پھر فون بند کر کے فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگا۔ دل اس بات پر ملامت نہیں کر رہا تھا کہ وڈیرا جمال صالح اس کی پارٹی کا وفادار ہے اور اسمبلی میں اس کے حمائتیوں کی تعداد بڑھانے کے لیے تین ایم این اے سپلائی کرتا تھا۔ اور وہ ایسے حمایتی اور وفادار کی بیٹی کو اغوا کر چکا تھا۔

ایسی کمینگی کے وقت دل اس لیے ملامت نہیں کرتا کہ پارٹی سے وفاداری کرنے والوں کو زمینیں الاٹ کی جاتی ہیں کروڑوں روپے کے ٹھیکے دیئے جاتے ہیں۔ بینکوں سے اربوں کے قرضے دلائے جاتے ہیں۔ ایک سیاست داں پوری قوم کا خون نچوڑ کر انہیں دیتا ہے اس لیے ان کی بہن اور بیٹی کو اپنے بیڈ روم میں لے جاتے وقت نہ شرم آتی ہے' نہ دل ملامت کرتا ہے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد رحمان چنا نے فون پر اسے مخاطب کیا۔ "سر! گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ کوئی نازاں کو ہمارے آدمیوں سے چھین کر لے گیا ہے۔"

"کون نازاں کو لے گیا ہے۔ آپ تو کہہ رہے تھے' وہ چاروں مسلح ہیں اور پہلے بھی بڑے تیر مار چکے ہیں۔"

"سر! مجھے یقین ہے' راجہ نواز اسے لے گیا ہے۔ ابھی ان چاروں سے میرا رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ ان کے پاس جو موبائل فون تھا۔ اس فون پر ایک اجنبی سے رابطہ ہوا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے ان چاروں میں سے ایک کو قیدی بنا لیا ہے۔ اس نے سچ اگل دیا کہ وہ لوگ نازاں کو آپ کے لیے اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔"

"کیا اس اجنبی نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

"سر! میں نے ایک بار امیر حمزہ کی آواز سنی تھی۔ اس فون والے اجنبی کی آواز اور لہجہ کچھ ویسا ہی تھا۔"

"ابھی آپ یقین سے کہہ رہے تھے کہ راجہ' نازاں کو لے گیا ہے اور اب کہہ رہے ہیں کہ اس کی آواز اور لہجہ امیر حمزہ جیسا تھا۔"

"سر! ہم تو شروع سے شبہ کر رہے ہیں کہ امیر حمزہ اور راجہ نواز ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ وہ کبھی یہ اور کبھی وہ بن کر ہمارے لئے مسائل پیدا کر رہا ہے۔"

"ہوں۔ آپ ہمارے ہر دلعزیز صحافیوں سے اور اخبارات والوں سے رابطہ کریں۔ امیر حمزہ کے خلاف پہلے ہی مہم چلائی جا رہی ہے۔ ایک الزام اغوا کا بھی ہو جائے۔"

"جی سمجھ گیا۔ کئی میڈیاز کے ذریعے اس پر کیچڑ اچھالی جائے گی۔"

"اور عوام کو یہ بھی بتایا جائے کہ وہ بہروپیا ہے۔ کبھی امیر حمزہ کے نام سے اور کبھی راجہ نواز کے نام سے واردات کرتا رہتا ہے۔"

کاشف اکبر نے غصے سے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ جو حسین اور دل نشین دیوانہ بنانے والی اس کے بیڈ روم میں آنے والی تھی' اسے راجہ نواز یا امیر حمزہ' پتا نہیں کون اُڑا لے گیا تھا۔

☆======☆======☆

میں نے پچھلی رات امی کی ڈائری پڑھی تھی اور ان کی شخصیت سے متاثر ہو رہا تھا۔ ان کی زندگی کے حالات معلوم کرنے کے باوجود کچھ اور باتیں معلوم کرنے کے لیے رہ گئی تھیں۔ میں نے فون کے ذریعے مراد چنگیزی سے معلوم کرنا چاہا۔ اس نے کہا کہ میری امی نے مجھے آرام سے سو جانے کی ہدایت کی ہے۔ میرے ذہن میں جو سوالات ہیں' ان کے جوابات بعد میں مل جائیں گے۔

صبح پانچ بجے موبائل فون کے بزر نے مجھے جگا دیا۔ میں نے اس کا بٹن آن کر کے پوچھا۔ "ہیلو؟"

"فرمان بیٹے! صبح بخیر۔"

"السلام علیکم امی! صبح بخیر۔"

انہوں نے سلام کا جواب دیا۔ دعائیں دیں۔ پھر کہا۔ "چنگیزی کہہ رہا تھا کہ میری ڈائری پڑھنے کے بعد بھی تمہارے ذہن میں کچھ سوالات ابھر رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں' کیا انڈر گراؤنڈ خطرناک گینگ سے آپ کا تعلق

ہے؟"

"اتنا ہی تعلق ہے' جتنا تم نے پڑھا ہے۔ میں نے ایک زیرِ زمین تنظیم کے گاڈ فادر ملک قاسم جان کے بیٹے کی زندگی آپریشن کے ذریعے بچائی تھی۔ تب سے وہ احسان مند ہے۔ اس نے مجھے بیٹی بنایا تھا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔ اس کا بیٹا ہاشم جان مجھے باجی کہتا ہے اور کہتا ہے کہ میں جتنی دولت چاہوں' اس سے حاصل کر سکتی ہوں۔"

"پھر تو آپ بہت دولت مند ہوں گی۔"

"دولت مند ہوں مگر حلال کی کمائی سے۔ حرام کی کمائی پر لعنت بھیجتی ہوں اس لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے مسیحائی کی غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ میں نے ہاشم جان سے کہا' تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔ اپنے طور پر باپ کی طرح زندگی گزار سکتے ہو لیکن میں جرائم کی کمائی کا ایک پیسہ نہیں لوں گی۔"

"امی! ہاشم انکل آپ کا احسان مند ہے۔ آپ نے اسے جرائم کی دنیا سے نکل آنے کی نصیحت کیوں نہیں کی؟"

"بیٹے! وہ اپنے باپ کی زندگی سے خطرات سے بھرپور دنیا میں رہنے کا عادی ہو گیا ہے۔ زیرِ زمین جرائم کے اتنے راز جانتا ہے کہ گاڈ فادر کے عہدے کو چھوڑنا چاہے گا تو مجرموں کی عالمی تنظیم کے بڑے بڑے مگرمچھ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"ہاشم جان کے جانباز آپ کے بھی ایک حکم پر جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ کیا یہ بات ان بڑے بڑے مگرمچھوں سے پوشیدہ ہو گی؟"

"ان سے پوشیدہ نہیں ہو گی لیکن وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ میں کسی بھی مجرمانہ کارروائی میں کبھی ملوث نہیں رہی۔ میں صرف ایک ایسی لیڈی سرجن ہوں جو گاڈ فادر ہاشم کے زخمی جانبازوں کا علاج راز داری سے کرتی رہتی ہوں۔ اس کے عوض وہ مجھے تحفظ فراہم کرتے ہیں۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولیں۔ "ایک لیڈی ڈاکٹر اپنے شوہر کے سائے میں یا قانون کے محافظ کے سائے میں محفوظ رہ سکتی ہے۔ مجھے شوہر کا سایہ نہیں ملا اور پولیس انتظامیہ پر میں اس لیے بھروسا نہیں کر سکتی کہ یہ تبدیل ہوتی رہنے والی حکومتوں کے تابع رہتے ہیں۔ مجھے تحفظ دینے والے کسی بھی قانون کے محافظ کا تبادلہ کہیں بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی جگہ میرے دشمن سے تعلق رکھنے والے افسر کو مجھ پر مسلط کیا جا سکتا ہے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں امی! تقدیر آپ کو بہت بڑے مجرموں کے سائے میں لے گئی ہے اور ان کے ذریعے آپ پچھلے کئی برسوں سے محفوظ اور مطمئن رہ کر زندگی گزار رہی ہیں

لیکن آپ حرام و حلال کا حساب کیوں کرتی ہیں؟ آپ کو گاڈ فادر ہاشم جان سے دولت حاصل کرنا چاہیے۔"

"میرے پاس جتنی دولت ہے' وہ ہم ماں بیٹے کے لیے کافی ہے۔ میں تمہیں سختی سے سمجھاتی ہوں' کبھی حرام کے پیسوں کو ہاتھ نہ لگانا۔ کبھی کوئی ایسا کام نہ کرنا' جس سے کسی بے گناہ شخص کو نقصان پہنچے۔ میں آپریشن کے ذریعے زخمیوں اور مریضوں کو نئی زندگی دیتی ہوں۔ جب میں زندگی دیتی ہوں تو دشمنوں سے ان کی زندگی نہیں چھینتی۔ انہیں اپاہج بنا کر کوئی سزا دے کر زندہ رہنے اور دوسروں کو ان سے عبرت حاصل کرنے کا موقع دیتی ہوں۔"

"آپ نے مجھے انعام ربانی اور اس کے غنڈوں کو ہلاک کرنے سے کیوں نہیں روکا؟ بلکہ ایک غنڈے کو آپ گولی مار کر گئی تھیں۔"

"میں ایسا نہ کرتی تو وہ تمہیں گولی مار دیتا اور ربانی وغیرہ نے تمہیں جان سے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اگر ایسا کوئی موقع آئے کہ سانپ تمہیں ڈسنے چلا آئے تو اسے کبھی زندہ نہ چھوڑنا' ورنہ وہ تمہیں نہیں چھوڑے گا۔"

"آپ کو بدنام کرنے والا شمشیر سنگھ کالیا بیرون ملک میں آپ سے دو بار ٹکرایا پھر اپنے حالات سے مجبور ہو کر بھاگ گیا اب آپ اس سے انتقام لینے کے لیے مجھے لندن بھیج رہی ہیں۔ آپ کیسے جانتی ہیں کہ وہ لندن میں ہے؟"

"گاڈ فادر ہاشم جان میری معلومات کا ذریعہ ہے۔"

"میں جانے سے پہلے اس انسپکٹر کو زندہ نہیں چھوڑوں گا' جو آپ کو گالیاں دیتا رہا ہے۔"

"بیٹے! اگر وہ انسپکٹر زندہ ہوتا تو اس بات کی گواہی دیتا کہ تم نے ربانی اور اس کے چار محافظوں کو قتل کیا ہے۔ میں نے اسے تمہارے خلاف گواہی دینے سے پہلے جہنم میں پہنچا دیا ہے۔"

"اوہ امی! آپ کو کچھ ہو سکتا تھا۔ آپ ایسے خطرات مول نہ لیا کریں۔"

"جب تمہیں تمام پہلوؤں پر بیک وقت نظر رکھتے ہوئے دشمنوں سے نمٹنا آجائے گا تو میں اطمینان سے گھر میں بیٹھ کر تمہاری جواں مردی کا تماشا دیکھتی رہوں گی۔ کچھ اور پوچھنا چاہتے ہو؟"

"آپ نے اپنی سوکن اور اس کے سپولیوں کو کیوں نظر انداز کیا ہے؟ کیا اس لیے کہ وہ ابو کے کاروبار اور جائیداد سے محروم ہو گئے ہیں؟ اور اس طرح انہیں اپنے کیے کی

سزا مل چکی ہے؟"

"ہاں۔ قدرت سزا دے رہی ہو تو انسان کو دور سے دیکھنا اور سبق حاصل کرنا چاہیے۔ وہ لوگ بالکل ہی کنگال ہو گئے تھے لیکن اب ان کے حالات بدل گئے ہیں۔ کل رات عشرت کے بڑے بیٹے نے مجھ سے فون پر بات کی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "تم نے میرے نانا جان کے ایک پیر میں گولیاں مار کر انہیں اپاہج بنا دیا تھا۔ میں تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ کر کسی مریض کا آپریشن کرنے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہاری باتوں سے پتا چل رہا ہے کہ تم عرفان کے بیٹے ہو۔"

اس نے حقارت سے کہا۔ "جس ذلیل نے ہمیں کنگال بنا دیا۔ اسے ہمارا باپ نہ کہو۔ ہمیں اپنے نانا جان ہدایت اللہ سے عقیدت ہے۔ اس لیے ہم نے اپنے نام کے ساتھ نانا کا نام لگایا ہے۔ میرا نام کامران ہدایت اور میرے چھوٹے بھائی کا نام عمران ہدایت ہے اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اب ہم کسی کے محتاج نہیں رہے۔ کروڑ پتی بن گئے ہیں اور اسی لاکھ کی کوٹھی میں رہنے کے لیے لاہور آگئے ہیں۔"

"پھر تو بہت قریب ہو گے۔ میرے دونوں ہاتھ کاٹنے کب آرہے ہو؟"

"میں کئی دنوں سے تمہاری تاک میں ہوں۔ ماموں جان نے سمجھایا تھا کہ میں تمہیں تنہا نہ سمجھوں اور واقعی میں دیکھ رہا ہوں' ایک باڈی گارڈ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ تمہاری کار کے پیچھے دو گاڑیاں ہوتی ہیں۔ اگرچہ وہ روز بدلتی رہتی ہیں لیکن کئی دنوں تک مشاہدہ کرنے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ ان میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی تمہارے محافظ ہوتے ہیں۔"

"تم کروڑ پتی ہو۔ اپنے لیے بھی درجنوں سیکورٹی گارڈز خرید سکتے ہو۔ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو اپنی کوٹھی کا پتا بتاؤ۔ کل میرا جوان بیٹا تمہارا سامنا کرنے آئے گا۔ اس پہاڑ کو راستے سے ہٹائے بغیر اس کی ماں تک نہیں پہنچ سکو گے۔"

"ہاں ابھی میں تمہارے بیٹے کے بارے میں بھی پوچھنے والا تھا کہ اسے کہاں چھپا رکھا ہے؟ مگر تم تو بڑے حوصلے سے میرے مقابلے میں اسے بھیجنا چاہتی ہو۔"

"صرف کوٹھی کا پتا بتا دو۔ پھر کل اپنا تماشا دیکھو۔"

"اس نے فون بند کر دیا۔ اپنی کوٹھی کا پتا نہیں بتایا۔ اس کی بزدلی ظاہر ہو چکی ہے۔ وہ کبھی تنہائی میں مجھ پر حملہ کرنے کی تاک میں ہے۔"

امی مجھے فون پر میرے سوتیلے بھائی کامران ہدایت کے بارے میں بتا رہی تھیں اور میں بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ اب تک امی نے یہ سوچ کر انہیں نظر انداز کیا تھا کہ تقدیر

نے انہیں سخت سزا دی ہے۔ وہ دربدر ہو گئے ہیں اور محتاجی کی زندگی گزار رہے ہوں گے۔ ان حالات میں انسان اپنی بداعمالیوں پر پچھتاتا ہے۔ غرور سے توبہ کرتا ہے اور دوسروں کو نقصان پہنچانے سے باز آجاتا ہے۔

لیکن کامران ہدایت جیسے لوگوں کی دُم ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہتی ہے۔ اس کی ماں عشرت' اس کے بہن بھائی اور نانا ہدایت بھی ان زیادتیوں کو بھول گئے ہوں گے' جو انہوں نے میری امی کے ساتھ کی تھیں۔ ایک ہی بات یاد رہ گئی ہو گی کہ امی نے نانا کو اپاہج بنا دیا تھا۔ اب وہ دولت مند ہوتے ہی پھر انتقام لینے پر اتر آئے تھے۔

میں نے کہا۔ "امی! ابو کے حوالے سے وہ ہمارے رشتے دار ہیں۔ یعنی آستین کے سانپ ہیں۔ پہلے میں آستین کی صفائی کروں گا پھر ملک سے باہر جاؤں گا۔"

"میں جانتی تھی۔ تم ان کے بارے میں سن کر ان سے نمٹنا چاہو گے۔ میں نے ان کا پتا معلوم کر لیا ہے۔"

"کیا واقعی؟ آپ نے کیسے معلوم کر لیا؟"

"یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ ہمارے ملک میں محنت مزدوری کر کے حلال کی کمائی سے کوئی کروڑ پتی نہیں بن سکتا۔ یہ کامران وغیرہ ضرور کوئی غلط دھندا کر رہے ہوں گے۔ میں نے گاڈ فادر ہاشم جان سے کہا' میں کامران ہدایت اور عمران ہدایت نامی دو جوانوں کے متعلق معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ یہ لوگ اچانک کروڑ پتی بن گئے ہیں۔ ان کی ماں میری سوکن ہے۔ اس کا نام عشرت جہاں ہے اور اس کے لنگڑے باپ کا نام ہدایت اللہ ہے۔ آج کل یہ لوگ لاہور میں ہیں۔ مجھے صرف ان کی کوٹھی کا پتا چاہیے۔"

ہاشم جان نے کہا۔ "باجی! آج کل منشیات اور اسلحے کا دھندا تیزی پر ہے۔ تیسرے نمبر پر انسانی اعضا دل' گردے اور آنکھیں فروخت کرنے سے ایک ہی سودے میں لاکھوں روپے مل جاتے ہیں۔ میں ان کمپنیوں کے بارے میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔ آپ میرے فون کا انتظار کریں۔"

ایک گاڈ فادر کے لیے یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہ تھا کہ اس ملک میں منشیات اور اسلحہ اور انسانی اعضا سپلائی کرنے والے ایجنٹ اور سب ایجنٹ کتنے ہیں اور ان کے نام اور پتے کیا ہیں۔ ہاشم جان نے ایک گھنٹے کے اندر مختلف ذرائع سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کیں پھر امی کو کامران اور عمران کی کوٹھی کا پتا بتایا اور کہا کہ ان کے ساتھ ان کی بہنیں ندرت' عابدہ اور ان کی ماں عشرت بھی یہ دھندا کرتی ہیں۔ ان کی ایک کوٹھی اسلام آباد میں بھی ہے۔

اس سلسلے میں اہم بات یہ تھی کہ وہ لوگ بھارتی انڈر گراؤنڈ سنڈیکیٹ کے گاڈ فادر شمشیر سنگھ کالیا عرف ڈینجرس مین کے لیے کام کر رہے تھے اور افغانستان سے پاکستان کے راستے بھارت اسلحہ اور ہیروئن پہنچایا کرتے تھے۔ عشرت اور اس کا بھائی عظمت کراچی جایا کرتے تھے وہ وہاں سے انسانی اعضا حاصل کرتے اور فروخت کرتے تھے۔ وہاں قتل و غارت گری زیادہ ہوا کرتی تھی۔ تازہ انسانی لاشوں سے آنکھیں' دل اور گردے حاصل کر کے فروخت کر دیئے جاتے تھے۔

گاڈ فادر ہاشم جان نے یہ تمام باتیں امی کو بتائیں۔ امی نے مجھے لاہور والی کوٹھی کا پتا بتا کر پوچھا۔ "وہاں کامران کو ہونا چاہیے۔ یہ بتاؤ تم اس سے نمٹنے کے لیے وہاں کب پہنچ رہے ہو۔"

میں نے گیارہ بجے تک وہاں پہنچنے کا وعدہ کیا۔ پھر فون بند کر کے شہر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ کامران ترنوالہ نہیں ہو گا۔ بھارتی گاڈ فادر نے اس کی اور تمام فیملی کی حفاظت کے خفیہ انتظامات کیے ہوں گے اور میری امی نے بھی میری حفاظت کے ساماں کیے ہوں گے۔ یوں تو خطرات سے کھیلنے والے سب ہی محتاط رہتے ہیں اور اپنے تحفظ کا مکمل ساماں کرتے ہیں لیکن تقدیر بھی اپنی طرف سے بہت کچھ کرتی ہے اور لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ جب تقدیر کا وار چلتا ہے تو تمام تدبیریں دھری رہ جاتی ہیں۔

کامران اپنی کوٹھی میں چھوٹی بہن عابدہ کے ساتھ تھا۔ اسے ایک کارندے کا انتظار تھا' جو اس کا مطلوبہ مال لانے والا تھا۔ اس کی بڑی بہن ندرت اپنے نانا کے ساتھ اسلام آباد میں تھی۔ عشرت اپنے دوسرے چھوٹے بیٹے عمران کے ساتھ کراچی گئی ہوئی تھی۔ عابدہ ایک بڑے سے صوفے پر لیٹی ہوئی فون پر اپنے بوائے فرینڈ سے باتیں کر رہی تھی۔ اور اس سے کہہ رہی تھی۔ "جو مال یہاں آرہا ہے تم اسے پہنچانے میرے ساتھ قصور جاؤ گے۔ وہاں سے دوسرے لوگ وہ مال لے کر بارڈر پر جائیں گے۔"

وہ خاموش رہ کر دوسری طرف کی باتیں سننے لگی پھر بولی۔ "مجھ سے بزدلی کی باتیں نہ کرو۔ تم خطرے کی بات سوچ رہے ہو۔ کیا میری کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ قصور تک ہمارا سفر کتنا رومانٹک ہو گا۔ کسی بھی پولیس چوکی پر ہماری گاڑی نہیں روکی جائے گی۔ تم پولیس کے ایک اعلیٰ افسر کے بیٹے ہو۔ چیک کرنے والے تمہیں دیکھتے ہی سیلوٹ کریں گے۔ کیا قصور میں میرے ساتھ رات نہیں گزارو گے؟"

اس نے دوسری طرف کی باتیں سنیں۔ پھر خوش ہو کر بولی۔ "شاباش! مرد ہو تو

تمہارے جیسا۔ یہ نہ سوچو' خطرات سے کھیلنا ہے' سوچو کہ مجھ سے کھیلنا ہے۔ اب میں ایک گھنٹے بعد فون کروں گی۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ کامران نے ناگواری سے کہا۔ "تمہیں پہلے بھی سمجھایا ہے کہ جوانوں کو پھانسنے کی باتیں میرے سامنے نہ کیا کرو۔ آخر میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ کچھ تو شرم کرو۔"

"کامران! میں تمہارا نام لیتی ہوں۔ بھائی جان نہیں کہتی۔ ہمارے وہ حیا کے رشتے مر چکے ہیں۔ میں تمہارے سامنے ایسی باتیں نہ کروں تو کیا فرق پڑے گا۔ کیا یہ حقیقت بدل جائے گی کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ مال پہنچانے کے لیے تنہا بوائے فرینڈ بدل بدل کر جاتی ہوں اور ایک آدھ رات ان کے ساتھ گزارتی ہوں؟"

"اچھا بس۔ زیادہ نہ بولو۔"

"کیوں نہ بولوں؟ کیا تم نہیں جانتے کہ ہماری بڑی بہن ندرت اسلام آباد میں کیا کرتی ہے اور ہماری ماں پر تو پھر سے جوانی آرہی ہے۔ کیا تم ان کی جوانی کے قصے نہیں جانتے ہو؟"

"یُو شٹ اپ۔" وہ غصے سے اس کی طرف بڑھا۔

وہ صوفے سے اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ کامران کی طرف انگلی اٹھا کر بولی۔ "جہاں ہو' وہیں رک جاؤ۔ ورنہ میں مال لے کر نہیں جاؤں گی اور اگر مال نہ پہنچا تو تمہیں لاکھوں روپے دینے والا گاڈ فادر جوتے مارے گا۔"

کامران ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ عابدہ نے کہا۔ "جب میں پیدا ہوئی تو تمہاری بہن تھی۔ جب تک ڈیڈی کی موت کار کے حادثے میں نہیں ہوئی اور ہم دولت مند رہے۔ تب تک میں بہن رہی لیکن جوان ہوتے ہی دولت کمانے کے لیے ممی نے اور آپ بھائیوں نے یہ نہیں سوچا کہ ہم دونوں بہنیں منشیات کی اسمگلنگ کرنے اور قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے کتنے بڑے بڑے افسروں کی راتیں روشن کریں گی۔"

وہ ایک سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر اسے لائٹر سے سلگانے لگی۔ پھر ایک کش لے کر کامران کی طرف دھواں چھوڑتے ہوئے بولی۔ "اب ہم رشتے دار نہیں ہیں۔ صرف بزنس پارٹنر ہیں۔ اگر رشتے دار سمجھو گے تو بہنوں کے دلال کہلاؤ گے۔"

وہ سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ وہ لاجواب سا ہو کر غصے سے تلملانے لگا۔ اسی وقت ٹی وی کم ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر ایک بٹن دبایا۔ ساتھ رکھے ہوئے ٹی وی اسکرین پر کوٹھی کے احاطے کا آہنی گیٹ نظر آیا۔

گیٹ کے باہر ایک اجنبی' ہاتھ میں ایک بڑی سی اٹیچی لیے کھڑا تھا۔ کامران نے پوچھا۔ "ہیلو کون ہو؟"

اجنبی نے کہا۔ "میں مسٹر کامران سے ملنا چاہتا ہوں۔ ان کے لیے مطلوبہ مال لایا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ گیٹ کھلنے کا انتظار کرو۔"

اس نے فون بند کرکے ایک انٹر کام کے ذریعے سیکورٹی افسر سے کہا۔ "ایک شخص مال لے کر آیا ہے لیکن اس نے کوڈ ورڈز ادا نہیں کیے۔ گیٹ کھول کر اسے انیکسی میں لے جاؤ۔ اپنے گارڈز سے کہہ دو کہ چھپ کر اسے گن پوائنٹ پر رکھے۔ اس کی اٹیچی سے مطلوبہ مال نہ نکلے تو اسے گولی مار دی جائے۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ کامران نے ریسیور اٹھا کر بٹن کو دبایا۔ ٹی وی اسکرین آن ہوگیا۔ وہاں احاطے کے آہنی گیٹ کے باہر اس اجنبی شخص کے علاوہ ایک اور جوان کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک اٹیچی تھی۔ کامران نے پوچھا۔ "ہیلو۔ تم کون ہو؟"

اس جوان نے کوڈ ورڈز ادا کیے۔ "میں گلاب لایا ہوں جنہیں انڈیا کے پہلے پردھان منتری نہرو جی پسند کرتے تھے۔"

"ٹھیک ہے گیٹ کھلنے کا انتظار کرو۔"

اس نے فون بند کرکے اس بار موبائل فون کے ذریعے سیکورٹی افسر سے کہا۔ "میں موبائل کے ذریعے اس لیے بول رہا ہوں کہ تم گیٹ کھولنے جارہے ہوگے۔"

"جی ہاں۔ میں گیٹ کی طرف جارہا ہوں۔"

"اب اس گیٹ کے باہر وہ شخص ہیں۔ جس کے ہاتھ میں سرخ رنگ کی اٹیچی ہے' اس نے صحیح کوڈ ورڈز ادا کیے ہیں۔ اسے میرے ڈرائنگ روم میں لے آؤ۔ دوسرے کو میرے اگلے حکم تک انیکسی میں قیدی بنا کر رکھو۔"

"آل رائٹ سر! میں اسے قیدی بنا کر رکھوں گا۔ دوسرے کو آپ کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔"

کامران نے موبائل کو آف کر دیا۔ پھر اس نے عابدہ کے کمرے میں آکر کہا۔ "عابی! وہ مال لے کر آرہا ہے۔ تم چھپ کر اس کی باتیں سنو اور اس پر نظر رکھو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آرہی ہوں۔"

کامران نے اپنے بیڈ روم میں آکر ایک الماری کھولی۔ اس میں سے ریوالور نکال کر

چیک کیا۔ وہ پوری طرح لوڈ تھا۔ اس نے اسے کوٹ کے اندر چھپا لیا۔ پھر ڈرائنگ روم میں آیا۔ وہاں میں سرخ رنگ کی اٹیچی لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ کامران کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے میری طرف آتے ہوئے کہا۔ "بیٹھو اور اٹیچی کھول کر مال دکھاؤ۔"

میں نے اٹیچی کو کھولتے ہوئے کہا۔ "اسے کھولنے کے لیے میرا بیٹھنا ضروری نہیں ہے۔"

اٹیچی میں سب سے اوپر ریوالور رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر کامران کو نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں دشمن کو موقع نہیں دیتا کہ وہ اپنے لباس کے اندر ہاتھ ڈالے۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کے لباس کو ٹٹول کر کوٹ کے اندر سے ریوالور نکالا۔ وہ بولا "کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے چاروں طرف موت ہے؟"

میں نے کہا۔ "میں یہاں مرنے آیا ہوں۔ تم صرف اپنی موت کو سامنے دیکھو اور اپنے آپ سے پوچھو' تمہیں زندگی کی بھیک ملے گی یا نہیں؟"

وہ مجھے ڈرانا چاہتا تھا پھر خود سہم کر بولا۔ "تم کون ہو؟"

"میں اس ماں کا بیٹا ہوں' جس کے دونوں ہاتھ تم کاٹنا چاہتے ہو۔"

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سہم کر بولا۔ "تت۔ تم ڈاکٹر آمنہ کے بیٹے ہو؟"

"امی تمہیں بتا چکی تھیں کہ میں تمہارے پاس پہنچنے والا ہوں مگر تم خود کو بہت محفوظ سمجھ رہے تھے۔ اب اپنے سیکورٹی افسر سے کہو کہ اس دوسرے شخص کو یہاں لے آئے۔"

"وہ دوسرا کون ہے؟"

"وہی تمہارا اصلی آدمی ہے۔ اس کی اٹیچی میں وہائٹ پاؤڈر ہے۔ میری امی کے وفاداروں نے اسے ٹریپ کر کے جان سے مارنے کی دھمکی دے کر اس سے کوڈ ورڈز معلوم کیے تھے اور حکم دیا تھا کہ وہ کوڈ ورڈز ادا نہیں کرے گا۔ اگر ہمارے حکم کی تعمیل کرتا رہے گا تو ہم اس پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ لہٰذا میں اس کی سلامتی چاہتا ہوں۔ اسے یہاں بلاؤ۔"

کامران نے انٹر کام پر سیکورٹی افسر سے کہا۔ "تم نے جسے قیدی بنایا ہے' اسے یہاں بھیج دو۔"

پھر وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ میں نے فوراً ہی انٹر کام کا بٹن دبا کر اسے آف کرتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے چال بازی نہیں چلے گی۔ اس انٹر کام کو آن رکھ کر سیکورٹی افسر کو خطرے سے آگاہ کر رہے تھے۔"

"مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں نے تمہاری ماں کو صرف دھمکی دی تھی۔ میں انتقام نہیں لینا چاہتا تھا۔"

"میں بھی انتقام نہیں لوں گا لیکن تمہارے سیکورٹی گارڈز کے درمیان سے زندہ سلامت نکلنے کے لیے تمہیں یہاں سے گن پوائنٹ پر لے جاؤں گا۔"

"میں کیسے یقین کروں کہ تم مجھ سے انتقام نہیں لو گے؟"

"تمہارے یقین نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے اور تمہاری ماں اور ماموں نے میری بہنوں کو بھی جرائم کی دلدل میں دھکیل دیا ہے۔ وہ بہنیں سوتیلی سہی' لیکن میرے باپ کا خون ہیں۔ ان بہنوں سے میرا خون کا اور غیرت کا رشتہ ہے۔ کیا تمہارے جیسے بھائی کا ضمیر کبھی ملامت نہیں کرتا ہے؟"

اچانک دروازہ کھل گیا ہم نے دروازے کی طرف دیکھا۔ عابدہ ہاتھ میں پرس لیے کھڑی تھی۔ کامران نے جھنجلا کر کہا۔ "تم چھپ کر تماشا دیکھ رہی تھیں۔ کیا اس پر فائر نہیں کر سکتی تھیں؟"

وہ بولی۔ "کر سکتی تھی۔ میرے پرس میں پستول ہے مگر پستول نکال کر گولی چلانے سے پہلے پوچھنا چاہتی ہوں۔ کسے گولی ماروں؟ سگے بے غیرت بھائی کو' یا سوتیلے غیرت مند بھائی کو؟ موت کا حق دار کون ہے؟ بے غیرت یا غیرت مند؟"

وہ غصے سے بولا۔ "عابی! تمہارا دماغ بچپن سے خراب ہے۔ میں نے ممی کو سمجھایا تھا کہ تم ہمارے مزاج کے خلاف ہو۔ کیا تم مجھے گولی مارو گی؟ کیا تمہیں اتنی سی عقل نہیں ہے کہ سوتیلا آخر سوتیلا ہوتا ہے۔ یہ ابھی ہم دونوں کو ہلاک کر سکتا ہے۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کامران کے پیچھے آکر اس کی گردن دبوچ کر ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے لگائی۔ پھر کہا۔ "سیکورٹی افسر سے کہو۔ تمام ہتھیار باہر پھینک کر اس شخص کو اندر لے آئے۔"

اس نے بلند آواز سے میری بات دہرائی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ سیکورٹی افسر اپنے چار گارڈز کے ساتھ خالی ہاتھ آیا۔ وہ دوسرا اٹیچی والا شخص بھی تھا۔ میں نے سیکورٹی افسر سے کہا۔ "تم دیکھ رہے ہو کہ تمہاری ذرا سی چالاکی دکھانے سے تمہارا آقا حرام موت مرے گا۔ میں جو کہہ رہا ہوں۔ اس پر عمل کرتے رہو گے تو یہ تمہیں زندہ ملیں گے۔ پہلی بات یہ کہ یہاں سے جاؤ۔ دوسری بات یہ کہ فون کے ذریعے کسی کو یہاں کے حالات نہ بتانا۔ باہر جا کر آہنی گیٹ کھول دو۔ میری گاڑیاں اندر آئیں گی۔ تم سب ان گاڑیوں سے دور رہو گے۔ کسی کے ہاتھوں میں کوئی ہتھیار نہ رہے۔ میں تمہارے آقا کو یرغمال

کے طور پر لے جا رہا ہوں۔ اس کی زندہ واپسی کا انحصار تمہاری سمجھ داری پر ہے۔ اب جاؤ۔"

وہ اپنے گارڈز کے ساتھ چلا گیا۔ میں نے دوسری اٹیچی والے کو کامران کا ریوالور دے کر کہا۔ "اسے نشانے پر رکھو۔ ذرا بھی چالاکی دکھائے تو ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر گولی چلا دو۔"

اس نے ریوالور لے کر کامران کو فرش پر اکڑوں بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ میں نے موبائل کے ذریعے اپنے ساتھی سے کہا۔ "یہاں حالات ہماری مرضی کے مطابق ہیں۔ وہ دونوں گاڑیاں احاطے کے اندر لے آؤ۔ یہاں کے گارڈز نہتے رہیں گے۔"

میں نے فون بند کر کے عابدہ کو دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی' میں نے کہا۔ "ابھی کامران نے تمہیں عابی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس کا مطلب ہے' تم میری چھوٹی بہن عابدہ ہو۔"

وہ منہ پھیر کر بولی۔ "خدا کے لیے مجھے بہن نہ کہیں۔ میں جرائم کی دلدل میں رہ کر ایک غیرت مند بھائی کی بہن کہلانے کے لائق نہیں رہی۔ آپ کامران سے پوچھ لیں۔ میں نے کبھی اس بے غیرت کو بھائی جان کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ میں نے قریب آکر اس کے سر پر آنچل رکھ کر کہا۔ "تمہارا جو آنچل نوچا گیا تھا۔ میں نے اسے مشرقی حیا کی علامت بنا کر تمہارے سر پر رکھا ہے۔ میری ایک بات کا جواب دو۔ اگر مجھے غیرت مند سمجھتی ہو تو کیا میرے ساتھ رہو گی؟"

وہ ایک دم سے پلٹ کر میرے سینے سے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے کہا۔ "تمہیں رونا چاہیے اپنے اندر کا غبار نکالنا چاہیے لیکن یہاں دیر کرنا مناسب نہیں ہے۔ چلو عابی! آج سے میری امی کو ایک بیٹی اور مجھے ایک پیاری گڑیا سی بہن مل رہی ہے۔"

میں اسے لے کر کوٹھی کے باہر آیا۔ کامران ریوالور کے نشانے پر تھا۔ سیکورٹی افسر اپنے گارڈز کے ساتھ دور کھڑا ہوا تھا۔ گاڑیاں احاطے کے اندر آگئی تھیں۔ میں نے مراد چنگیزی کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ "یہ میری بہن ہے۔ اسے ابھی امی کے پاس پہنچا دو۔ میں انہیں فون پر عابی کے متعلق سب کچھ بتا دوں گا۔ میں دوسری گاڑی میں کامران کو لے کر جا رہا ہوں۔"

پھر میں نے عابی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تم امی کے پاس جاؤ۔ ان کے پاس ہمیشہ

خوش رہو گی۔"

وہ چنگیزی کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔ میں نے موبائل کے ذریعے امی سے رابطہ کیا۔ انہوں نے پوچھا۔ "خیریت ہے؟"

"امی! خدا کے بعد آپ کا سایہ سر پر ہے۔ پھر خیریت کیسے نہ ہو گی۔ میں نے عابدہ عرف عابی کو اپنی بہن بنایا ہے اور اسے آپ کی بیٹی بنا کر بھیج رہا ہوں۔ وہ آپ کے ساتھ رہے گی۔"

میں نے امی کو بتایا کہ عابی کو کس طرح جرائم کی دلدل میں پہنچایا گیا تھا۔ جبکہ وہ فطرتاً ایک صاف ستھری زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ امی نے کہا۔ "بیٹے! یہ تم نے اچھا کیا۔ میں عابی کو اتنی محبت دوں گی کہ وہ کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں کرے گی۔"

میں فون بند کر کے دوسری گاڑی کی پچھلی سیٹ پر آیا۔ وہاں کامران ہمارے ایک آدمی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اگلی سیٹ پر تین مسلح آدمی تھے۔ وہ گاڑی چلتی ہوئی آہنی گیٹ سے باہر آئی۔ پھر مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی ملتان روڈ پر جانے لگی۔ پھر بہت آگے جا کر ایک کچے راستے پر مڑ گئی۔ ادھر ویرانی تھی۔ میں نے گاڑی رکوائی۔ پھر ایک جانباز کے ساتھ باہر آکر اسے سمجھایا کہ کامران کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔

انہوں نے میری مرضی کے مطابق عمل کیا۔ انہوں نے ایک درخت کی اونچی سی شاخ پر رسی لپیٹ کر اس کا ایک سرا کامران کے بازو سے باندھا۔ وہ ایک بازو کے ذریعے درخت سے لٹکنے لگا۔ وہ گڑگڑا رہا تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا کیا جا رہا ہے؟

اس کا جو ہاتھ درخت کی شاخ سے بندھا ہوا تھا' اس کی کلائی سے اس اٹیچی کو باندھ دیا گیا' جس میں ہیروئن کے پیکٹ بھرے ہوئے تھے۔ اس کا وزن بہت زیادہ تھا۔ وہ عاجزی سے بولا۔ "فرمان! ایسا نہ کرو۔ ہم ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ مجھے ایک بار معاف کر دو۔ میں ہمیشہ تمہارا غلام بن کر رہوں گا۔ یہ اٹیچی بہت بھاری ہے۔ پتا نہیں میں کب تک لٹکا رہوں گا میری یہ کلائی ٹوٹ جائے گی۔"

"تم میری امی کے بھی ہاتھ توڑنے والے تھے۔ اب تمہارے لوگوں کو تم سے کچھ تو عبرت حاصل کرنا چاہیے۔"

اس کا دوسرا ہاتھ خالی جھول رہا تھا۔ میں نے اس ہاتھ کی انگلیوں و جکڑ کر کہا۔ "تمہارے نانا کے گھٹنے پر فائرنگ کر کے ہڈیاں توڑ کر انہیں لنگڑا بنایا تھا تم بھی ایک ہاتھ سے اپاہج بن جاؤ۔"

میں نے ریوالور نکال کر تڑا تڑ فائرنگ کی۔ اس کی کلائی کو چھلنی کر دیا۔ اس ہاتھ کا

پنجہ کلائی سے آدھا الگ ہو کر ایک طرف لٹک گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔

ہم گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ جب گاڑی چلنے لگی تو میں نے قریبی تھانے فون کر کے بتایا کہ ایک شخص منشیات سے بھرے ہوئے بیگ کے ساتھ ایک درخت سے لٹک رہا ہے۔ مال کے ساتھ مجرم کو بھی وصول کر لو۔ میں نے اس جگہ کا پتا بتا کر فون بند کر دیا۔

☆======☆======☆

فی زمانہ یہی دیکھنے میں آرہا ہے کہ مال غنیمت اس کا ہوتا ہے' جس کے پاس طاقت ہوتی ہے۔ یعنی جس کی لاٹھی ہوتی ہے' اسی کی بھینس ہوتی ہے لیکن نازاں کو بھینس کہنا سراسر زیادتی ہوگی۔ وہ ایسی بے مثال حسینہ تھی' جسے دیکھ کر جوانی کو پسینہ آجاتا تھا۔ ایسی مہ جبین تھی کہ کاشف اکبر جیسا بڑا سیاست داں اس کے آگے جبیں جھکا رہا تھا۔ اپنی سیاسی نیک نامی برقرار رکھنے اور اسے راز داری سے حاصل کرنے کے لیے اغوا کرا رہا تھا۔

اگرچہ وہ بہت بڑے وڈیرے کمال صالح کی مغرور بیٹی تھی۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی لیکن حالات نے اسے مال غنیمت بنا دیا تھا۔ کاشف اکبر کو ناز تھا کہ وہ اپنی طاقت اور وسیع ذرائع سے اسے حاصل کر لے گا۔ نازاں کو اغوا کر کے اس کے بیڈ روم میں لایا جائے گا مگر وہ نازاں کے لیے ناز کرتا ہی رہ گیا اور راجہ نواز اس کے مسلح غنڈوں سے اسے چھین کر لے گیا۔

وہ اغوا کرنے والے مسلح غنڈے نیشنل ہائی وے کے کنارے ایک وین کے اندر بے ہوش پائے گئے۔ نازاں کو بھی بے ہوش کر کے لے جایا گیا ہوگا لیکن کون لے گیا تھا؟ یہ کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ کاشف اکبر اور صوبائی پارٹی کے لیڈر رحمان چنا کو یقین تھا کہ راجہ نواز یا امیر حمزہ ان غنڈوں سے نازاں کو چھین کر لے گئے ہیں۔ تمام مخالفین یہ اچھی طرح نہیں جانتے تھے کہ راجہ نواز اور امیر حمزہ ایک ہی شخص ہیں یا دو مختلف ہستیاں ہیں؟

کاشف اکبر نے فوراً ہی اپنے وسیع ذرائع سے نیشنل ہائی وے سے حیدر آباد تک ناکا بندی کرائی۔ اپنے ذاتی میڈیا سیل کے ذریعے اخبارات والوں تک خبر پہنچائی کہ بہروپیا امیر حمزہ جو بعض اوقات راجہ نواز کے نام سے واردات کرتا ہے' اس نے ٹھٹھہ کے ایک باعزت وڈیرے کمال صالح کی معصوم اور جوان بیٹی کو اغوا کیا ہے۔

لاہور کے چند اخبارات والوں نے فوراً ہی فون کے ذریعے کاشف اکبر سے کہا۔

"آپ ذاتی دشمنی کی بنا پر امیر حمزہ کو الزام نہ دیں۔ وہ یہاں لاہور میں ہے۔ لاہور کے کوڈ

نمبر پر موبائل کے ذریعے امیر حمزہ سے بات ہو چکی ہے۔"

رحمان چنا نے کاشف اکبر سے کہا۔ "پھر تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ راجہ نواز کی اپنی ایک الگ شخصیت ہے۔ وہ نازاں کا دیوانہ ہے۔ وہی اسے لے گیا ہے۔"

"مگر کہاں لے گیا ہے؟ پولیس اور انٹیلی جنس والے ہمارے کرائے کے غنڈے اور ہماری پارٹی کے سیکڑوں کارکن انہیں تلاش کر رہے ہیں۔ نیشنل ہائی وے کے اطراف تمام بستیوں میں ڈھونڈا جا رہا ہے۔ کہیں تو ان کا سراغ ملنا چاہیے۔"

"سراغ مل جائے گا۔ راجہ نواز بہت چالاک ہے۔ اس نے نازاں کو کسی ایسی جگہ چھپایا ہے جہاں اسے تلاش کرنے والے پہنچ نہیں پا رہے ہیں۔"

"ایسی کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟ کیا ہمارے جاسوس اتنے ذہین نہیں ہیں کہ اس غیر معمولی جگہ کے بارے میں سوچ سکیں اور وہاں جا کر اسے واپس لا سکیں؟"

"غیر معمولی جگہ......" وہ دونوں اپنے اپنے ذہن پر زور ڈال کر سوچنے لگے لیکن حقیقت یہ تھی کہ راجہ نواز نے اسے ایسی جگہ پھینکا تھا جہاں کچرا پھینکتے ہیں۔

وہ ایک کچرے سے لدے ہوئے بڑے سے ٹرک پر بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ دنیا کے کئی ممالک میں کچرا ٹرینیں چلتی ہیں۔ ان ٹرینوں کے ذریعے ہزاروں ٹن کچرا شہروں سے باہر لے جا کر پھینکا جاتا ہے۔ ایک کروڑ سے زیادہ آبادی والے شہر کراچی کے بارے میں بھی یہ منصوبہ بنایا گیا تھا کہ روزانہ تقریباً چھ ہزار ٹن کوڑے کو شہر سے باہر ویران مقام پر ٹرین کے ذریعے پہنچایا جائے لیکن آج تک اس مخصوص کچرا ٹرین کے منصوبے پر عمل نہ ہو سکا۔ بڑے بڑے کچرا ٹرکوں کے ذریعے دھابیجی سے کئی کلو میٹر دور کوڑا کرکٹ ڈمپ کیا جاتا ہے۔

راجہ نواز نے پہلے تو بے ہوش نازاں کو اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا تھا۔ آگے کئی کلو میٹر دور دھابیجی تھا لیکن اب اس راستے پر کاشف اکبر کے کتے اس کے پیچھے آسکتے تھے۔ وہ کار کو موڑ کر شہر کی طرف آیا۔ پیچھے اس کے ساتھی ایک گاڑی میں تھے۔

ویسے شہر میں بھی خطرہ تھا۔ وہ بلدیہ کے اس ٹرک اسٹینڈ پر آیا جہاں سے کچرا ٹرک سرجانی ٹاؤن سے چھ کلو میٹر دور جام چاکرو گوٹھ جایا کرتے تھے۔ وہاں دو پہاڑیوں کے درمیان پانچ سو ایکڑ اراضی پر شہر کا کچرا لے جا کر پھینکا جاتا تھا۔ اس کچرے کو وہاں جدید مشینوں کے ذریعے مٹی میں دبایا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ درخت لگانے کا کام بھی جاری رہتا تھا تاکہ وہاں ایک وسیع و عریض خوب صورت پارک تعمیر ہو سکے۔

راجہ نواز نے ایک ٹرک والے کو پانچ ہزار روپے دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارے

ہو سکتے ہیں بشرطیکہ تم کچرے میں ہمارا ایک مال لے جاؤ۔"

ٹرک ڈرائیور نے کہا۔ "صاحب! رقم کچھ بڑھا دیں۔ میری گھر والی بیمار ہے۔ اس کے آپریشن کے لیے.........."

راجہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "دس ہزار دوں گا۔ تم میری گھر والی کو اس کچرے میں لے چلو۔"

وہ راضی ہوگیا۔ اس طرح مختلف پرفیوم استعمال کرنے والی نازاں کچرے میں پہنچا دی گئی۔ ٹرک اپنی منزل کی طرف چل پڑا اس کے پیچھے کچھ فاصلہ رکھتے ہوئے راجہ نواز اور اس کے ساتھیوں کی گاڑیاں بھی جانے لگیں۔

وہ اتنی دیر سے بے ہوش تھی کہ اب ہوش میں آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ کوئی بے ہوش ہو تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے جاتے ہیں۔ خوشبو بھی سنگھائی جاتی ہے لیکن اس نے ایک ذرا کسمساتے ہوئے بدبو محسوس کی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ رفتہ رفتہ ہوش میں آرہی تھی لیکن بدبو کے باعث اس نے ذرا جلدی آنکھ کھول دی۔

وہ چاروں شانے چت پڑی تھی اسی لیے پہلے اسے آسمان دکھائی دیا۔ اسے محسوس ہوا وہ کسی گاڑی میں سفر کررہی ہے لیکن بدبو کے باعث دماغ بوجھل ہو رہا تھا۔ اس نے دائیں طرف سر گھما کر دیکھا تو چیخ پڑی۔ کوڑے کا ڈھیر دکھائی دیا۔ بائیں طرف دیکھا تو ادھر بھی کوڑا تھا۔ اس نے سر کو ذرا سا اٹھا کر دیکھا تو پتا چلا جس طرح زمین کو کھود کر قبر بنائی جاتی ہے' اسی طرح وہ قبر جیسی خالی جگہ پر پڑی ہوئی تھی۔ آس پاس تعفن پیدا کرنے والا کچرا ہی کچرا تھا۔ گاڑی کی تیز رفتاری کے باعث بہت سا کچرا اس کے بدن پر بھی گرا ہوا تھا۔

وہ لباس سے گندگی کو جھاڑتے ہوئے چیختے ہوئے اٹھنے لگی لیکن اٹھنے کے لیے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ جہاں ہاتھ ٹیک کر اٹھنا چاہتی تھی' وہاں کچرے میں ہاتھ دھنس جاتے تھے۔ وہ منہ کے بل گندگی پر گرتی تھی۔ پھر تھوکنے اور کھانسنے لگتی تھی۔

تب اسے موبائل فون کے بزر کی آواز سنائی دی۔ اس نے چونک کر سر جھکا کر دیکھا۔ اس کے گریبان کے اندر ایک موبائل فون دھنسا ہوا تھا۔ اس نے فوراً ہی فون نکال کر بٹن دبایا۔ پھر پوچھا۔ "ہیلو کون؟ کون ہے؟ میں یہاں کیسے آگئی ہوں؟ گاڑی روکو۔ میں کہتی ہوں روکو۔ ورنہ.........."

"شٹ اپ۔" راجہ نواز کی آواز سنائی دی۔ "میں تمہیں وارننگ دے رہا ہوں۔ چیخنا چاہوگی۔ کسی کو مدد کے لیے پکاروگی تو اس سے بھی زیادہ برا سلوک کیا جائے گا۔ ٹرک

چلانے والے بڑے درندے ہیں اس کچرے میں تمہارا کچرا کرڈالیں گے۔"

"راجہ! تم میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کررہے ہو؟"

"تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ جتنی نفرت اور غرور کی گندگی ایک امیرزادی کے ذہن میں ہے' اتنی گندگی اس کچرا ٹرک میں بھی نہیں ہے۔ میں نے محبت سے سمجھایا' تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔ تم نے مجھے اپنے خونخوار کتوں کی خوراک بنانے کی کوشش کی۔ میں نے تمہارے بھائی کی ایسی کی تیسی کی اور تمہیں تمام رات یہ سمجھاتا رہا کہ تمہارے باپ کی دولت' طاقت اور سیاسی اختیارات بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ پھر بھی تم اپنے باپ بھائی کے ساتھ کاشف اکبر کے پاس گئیں۔ تم نے اس کی طاقت اور اختیارات بھی دیکھ لیے۔ اس کے آدمی تمہیں اغوا کرکے اس کے عیش کدے میں پہنچانے والے تھے۔"

"تم خود اغوا کرکے لے جارہے ہو اور کاشف اکبر کو بدنام کررہے ہو۔"

"میں تمہیں کیوں اغوا کروں گا؟ جبکہ میں جب چاہوں تمہاری تنہائی میں پہنچ سکتا ہوں۔ میری باتوں کا یقین کرسکتی ہو تو کرو۔ اگر آج میں اس کے آدمیوں کو بے ہوش کرکے تمہیں ان سے چھین کر نہ لاتا تو تمہاری عزت دو کوڑی کی نہ رہتی۔"

اسے یاد آیا کہ چند مسلح غنڈے اسے وین میں لے جارہے تھے پھر ایک جگہ پولیس والوں نے اس وین کو روکا۔ قریب آکر بے ہوش کرنے والی دوا اسپرے کی پھر اسے ہوش نہ رہا۔

وہ بولی۔ "مجھے یاد آرہا ہے۔ جو غنڈے مجھے جبراً لے جارہے تھے' انہیں پولیس والوں نے روکا تھا اور بے ہوش کردیا تھا۔"

"کیا پولیس والوں نے انہیں بے ہوش کرکے تمہیں میرے حوالے کیا تھا؟ عقل سے سمجھو۔ وہ پولیس کی وردیوں میں میرے آدمی تھے۔"

وہ ذرا دیر چپ رہی پھر بولی۔ "تمہارا دعویٰ ہے کہ مجھ سے محبت کرتے ہو۔ میرے دیوانے ہو۔ کیا تم کچرے میں پھینکنے والی محبت کرتے ہو؟"

"کچرا ناپسندیدہ ہوتا ہے مگر ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ہمارا تمہارا کچرا ہے۔ یہ ہمارے گھروں سے' ہمارے جسموں سے اور ہمارے دماغوں سے نکلا ہوا کچرا ہے' جس پر تم بیٹھی ہوئی ہو۔ جب ہم مرجاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے؟ ہمیں بھی قبرستان کے کچرا گھر میں لے جاکر ڈال دیا جاتا ہے۔ مرنے کے بعد ہمارے جسم سے ایسی بدبو خارج ہوتی ہے کہ ہمارے پیارے بھی ہمیں گھر میں رکھنا پسند نہیں کرتے۔"

وہ رونے کے انداز میں بولی۔ "میں تمہاری باتیں سمجھ رہی ہوں۔ خدا کے لیے مجھے

یہاں سے نکالو۔ گاڑی کو رکوانے کو کہو۔ بدبو کے مارے دماغ پھٹا جارہا ہے۔"

"آگے اور تین چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے گاڑی رک جائے گی تب تک تم اپنے باپ اور بھائی سے فون پر بات کرسکتی ہو مگر صرف پندرہ منٹ بات کرو گی۔ اس کے بعد میں تم سے رابطہ کروں گا۔ میرا حکم یاد رکھنا۔ صرف پندرہ منٹ۔"

اس نے فون بند کردیا۔ نازاں نے فوراً بٹن دبا کر اپنے باپ کے موبائل فون پر رابطہ کیا۔ پھر باپ کی آواز سنتے ہی رو پڑی۔ کہنے لگی۔ "بابا سائیں! میں بول رہی ہوں۔"

باپ نے تڑپ کر پوچھا۔ "میری بیٹی! میری جان! کہاں ہو؟"

"میں کیا بتاؤں کہ کہاں ہوں؟ ویسے بابا سائیں! آپ کی سیاست کچرا ہے۔ اس نے مجھے کچرا گاڑی میں لاکر بٹھا دیا ہے۔ پتا نہیں یہ کچرا گاڑی کہاں جارہی ہے؟ میرا ذہن جاگ رہا ہے بابا سائیں! آپ پچاس برسوں سے عوام کو کچرا سمجھ کر دور پھینکتے رہے ہیں۔ ایک دن آپ بھی اسی کچرے میں آئیں گے۔"

"بیٹی! تم کیسی بہکی بہکی باتیں کررہی ہو۔ کیا وہ بدمعاش راجہ تمہیں کہیں لے جارہا ہے؟ تم جگہ کی نشان دہی کرو۔ میں ابھی پولیس فورس کے ساتھ پہنچتا ہوں۔ کاشف اکبر صاحب نے تمہارے لیے جگہ جگہ ناکا بندی کردی ہے۔"

"آپ اس کتے کا نام نہ لیں۔ اسی شیطان نے مجھے اغوا کرایا تھا۔ وہ دو دھاری تلوار ہے۔ وہ ایک طرف سے آپ کو اور دوسری طرف سے مجھ کو کاٹنا چاہتا تھا۔ اگر راجہ اس کے غنڈوں سے مجھے نہ بچاتا تو وہ میری عزت سے کھیل کر مجھے جان سے مار ڈالتا اور آپ سے ہمدردی بھی کرتا رہتا۔"

"بیٹی! ابھی تم صرف اتنا بتا دو' کہاں ہو؟"

"میں راجہ کے ساتھ ہوں اور جب تک آپ اس شیطان کی پارٹی میں رہیں گے' میں راجہ کے پاس ہی رہوں گی۔"

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کردیا۔ وڈیرا کمال صالح نے ہیلو ہیلو کہا پھر ریسیور کو کریڈل پر رکھا۔ جمال صالح نے پوچھا۔ "بابا سائیں! کیا ہوا؟ نازاں کہاں ہے' وہ کیا کہہ رہی ہے؟"

وہ غصے سے اٹھ کر پاؤں پٹختے ہوئے اور فضا میں گھونسا لہراتے ہوئے بولا۔ "وہ کہہ رہی ہے' ہم باپ بیٹے الو بن رہے ہیں۔ اسے کاشف اکبر نے اغوا کرایا تھا۔"

"کیا؟" جمال صالح اچھل کر کھڑا ہوگیا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "نہیں بابا سائیں! اسے ہمارے علاقے سے تین ایم این اے اور تین ایم پی اے کی حمائتیں حاصل ہوتی

ہیں۔ ہماری وجہ سے وہ حمائتیوں کی اکثریت سے حکومت بناتا ہے۔ کیا وہ اتنا احمق ہے کہ ہماری نازاں کو اغوا کرکے ہم سے دشمنی مول لے گا؟"

"وہ دشمنی مول نہیں لے گا لیکن دوغلی چالیں چل سکتا ہے۔ میٹھی چھری بن کر ہمیں اِدھر مٹھاس دے کر اُدھر ہماری عزت پر چھری پھیر سکتا ہے۔ اگر راجہ اسے کاشف اکبر کے غنڈوں نہ بچاتا تو وہ عزت سے بھی جاتی اور جان سے بھی جاتی۔ کاشف اکبر اسے اپنے خلاف گواہ بننے کے لیے زندہ نہ چھوڑتا۔"

وہ پیر پٹختا ہوا ٹیلی فون کے پاس آیا پھر ریسیور اٹھا کر کاشف اکبر کا ذاتی فون نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ ہونے پر کاشف اکبر کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو کون؟"

کمال صالح نے غصے سے کہا۔ "میں ہوں میں۔ میری بیٹی سے فون پر بات ہوچکی ہے۔ اس نے تمہارے چہرے سے سیاسی دوستی کا نقاب نوچ کر پھینک دیا ہے۔ اسے تم اغوا کررہے تھے۔ تمہارے غنڈے بے ہوش نہ ہوتے تو وہ تمہاری شکار گاہ میں پہنچا دی جاتی اور تم ہمیں دوست بن کر دھوکا دیتے رہتے۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "سائیں! آپ بہت غصے میں ہیں۔ آپ کی بیٹی کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں' اسے راجہ نواز نے میرے خلاف بہکایا ہوگا۔"

"بچوں کو بہکایا جاتا ہے۔ میری بیٹی نادان ہوسکتی ہے لیکن اسے راجہ نواز کے ساتھ بھکنا ہوتا تو وہ پہلے ہی دن پاؤں کی دھول اٹھا کر سر پر رکھ لیتی۔ ہم اونچے لوگ ہیں۔ کبھی جھک کر نیچے والوں کا ہاتھ نہیں پکڑتے اور جب تمہارے جیسے برابر والے کا ہاتھ پکڑتے ہیں تو دھوکا کھاتے ہی اس کا ہاتھ ایسے چھوڑتے ہیں کہ وہ اقتدار کی کرسی سے زمین کی پستی میں آجاتا ہے۔"

"سائیں! مجھے ایک بار صفائی کا موقع دیں۔ بات یہ نہیں ہے' جو آپ سمجھ رہے......... ہیلو۔ ہیلو سائیں ہیلو........"

اس نے کریڈل کو دبایا۔ پھر ریسیور رکھ کر چیختے ہوئے سیکرٹری اور مشیر کو بلایا۔ سیکرٹری سے بولا۔ "جاؤ۔ رحمان چنا کو فون پر بولو' ابھی اور اسی وقت میرے پاس آئے۔ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرے۔"

سیکرٹری فون کرنے چلا گیا۔ کاشف اکبر نے مشیر سے کہا۔ "اس وڈیرے کمال صالح کو معلوم ہوچکا ہے کہ میں اس کی بیٹی کو اغوا کرا رہا تھا۔ وہ ابھی ہماری پارٹی چھوڑنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس نے ساتھ چھوڑا تو ہم کتنے نقصان میں رہیں گے۔"

"سر! آپ آرام سے بیٹھیں۔ میرے چند سوالوں کے جواب دیں۔ کیا اسے بیٹی مل گئی ہے؟"

"نہیں۔ وہ کہہ رہا تھا' کہ بیٹی سے فون پر بات ہوئی ہے۔"

"یعنی وہ باپ کے پاس نہیں پہنچی ہے۔ اس کے پیچھے ضرور کوئی بات ہوگی۔ جب وہ آپ کے آدمیوں کی گرفت سے نکل بھاگی ہے تو باپ سے فون پر کیوں بات کررہی ہے؟ کیا وہ راجہ کی گرفت میں ہے؟ اور وہ وہی کہتی جارہی ہے' جیسا وہ اسے کہنے پر مجبور کررہا ہے۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "ہاں بیٹی' باپ سے دور رہ کر میرے خلاف بول رہی ہے۔ راجہ اسے مجبور کررہا ہوگا۔"

"سر! یہ صرف فلمی باتیں نہیں ہیں۔ امیرزادی اس غریب ہیرو سے پہلے متاثر ہوتی ہے' جو اس کی عزت بچاتا ہے۔ پھر اس سے محبت کرنے لگتی ہے اور یہ تو ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ نازاں کے ساتھ پوری ایک رات گزار چکا ہے اور اسے اپنی عزت بنا کر آپ سے اس کی عزت بچا رہا ہے۔ ایسے میں ان کے درمیان بڑی انڈر اسٹینڈنگ پیدا ہوگئی ہوگی۔"

"ہاں۔ یہ بات سمجھ میں آرہی ہے۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔"

"یہی کہ بیٹی کو باپ کے پاس نہیں پہنچنا چاہیے۔ ورنہ وہ باپ کے ساتھ آکر آپ کے منہ پر کہے گی کہ آپ نے اسے اغوا کرایا تھا۔ راجہ کے آدمی جن اغوا کرنے والوں میں سے ایک کو پکڑ کر لے گئے تھے' اس نے اعتراف کرلیا تھا اور خود کو آپ کا وفادار کہہ رہا تھا۔ آپ میری بات سمجھیں۔ بیٹی کو باپ کے پاس نہ پہنچنے دیں۔ آپ وڈیرے سائیں کو اپنی دوستی کا یقین دلا سکتے ہیں۔ نازاں باپ کے پاس نہیں پہنچے گی تو اسے یقین ہوتا رہے گا کہ راجہ نے اسے کہیں چھپا رکھا ہے یا اسے مار ڈالا ہے اور میں ایک مشیر کی حیثیت سے مشورہ دیتا ہوں کہ نازاں کو مرجانا چاہیے۔"

کاشف اکبر نے چونک کر مشیر کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ جہاں دیدہ مشیر اسی لیے رکھے جاتے ہیں کہ وہ پیچیدہ معاملات میں دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ نازاں اگر راجہ نواز کی تحویل میں رہ کر مرے گی تو اسے کاشف اکبر کے منہ پر سچ بولنے کا موقع ہی نہیں ملے گا اور اس کی ہلاکت کا الزام راجہ نواز پر آئے گا۔

نازاں ٹرک کے پیچھے کوڑے کے ڈھیر پر بیٹھی ہوئی گہری سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔ اس کے باپ اور بھائی نے راجہ کو اس سے دور کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟

اپنے وفاداروں کی فوج سے' دولت سے اور سیاسی اختیارات سے کچل ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن راجہ نے اسے پہلی بار ایک لفٹ میں نہیں چھوڑا۔ دوسری بار یونیورسٹی میں اس کے بھائی کے سامنے اور سب کے سامنے اعلان کیا کہ وہ اس کا دیوانہ ہے۔

تیسری بار تمام رات کے لیے اس کی کوٹھی میں گھس آیا اور صبح جانے سے پہلے یہ کہہ گیا۔ "تم میری عزت ہو اور میں کبھی اپنی عزت پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

وہ جو کہتا تھا' کر دکھاتا تھا.......... کاشف اکبر جو پورے ملک پر دھاک جمائے ہوا تھا' راجہ اس کے شکنجے سے اسے نکال لایا تھا۔ ایک عورت کیا چاہتی ہے؟ اپنا تحفظ' ایسا جو راجہ نواز جیسا مرد ہی دے سکتا ہے۔

اس نے سوچا۔ "میں بہت مغرور رہی۔ میرے باپ دادا نے' میری دولت اور جاگیر نے یقین دلایا تھا کہ میں کبھی ٹوٹنے والی نہیں ہوں۔ دوسروں کو توڑنے والی ہوں مگر حالات سمجھا رہے ہیں کہ عورت خواہ کتنی ہی ناقابل شکست ہو' اسے اپنے کسی ایک مرد کے سامنے راضی خوشی ٹوٹنا پڑتا ہے اور میرا وہ مرد یہی ہے۔ ہاں یہی ہے۔"

وہ کچرا گاڑی دو پہاڑیوں کے درمیان پہنچ کر رک گئی۔ وہاں بہت سے مزدور دور تک پھیلے ہوئے میدان میں کام کررہے تھے۔ ٹرک کے ذریعے جو کچرا لاکر وہاں پھینکا جارہا تھا۔ اسے دور تک پھیلا کر برابر کرتے تھے۔ پھر مشینوں کے ذریعے اسے مٹی میں دبا کر زمین کو ہموار کرتے تھے۔

انہوں نے زندگی میں پہلی بار کچرے کے ڈھیر میں ایک حسین و جمیل دوشیزہ کو دیکھا۔ وہاں کام کرنے والے تمام مزدوروں کے ہاتھ رک گئے۔ وہ حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے قریب آرہے تھے۔

اس وقت راجہ نواز اور اس کے مسلح ساتھیوں کی گاڑیاں بھی قریب آگئیں۔ اسلحہ بردار لوگوں کو دیکھ کر تمام مزدور ٹرک پر چڑھ کر کچرا نیچے گرانے لگے۔ جب آدھا ٹرک خالی ہوگیا تو راجہ نواز نے اپنے دونوں بازو آگے بڑھا کر نازاں سے کہا۔ "نیچے آجاؤ۔"

وہ سر جھکائے ہوئے تھی۔ غریب کسانوں اور مزدوروں پر حکومت کرنے والی کسی سے نظر نہیں ملا رہی تھی۔ اس نے سر کے آنچل کو کھینچ کر گھونگھٹ بنا کر منہ چھپا لیا تھا۔ راجہ نے اس کی طرف بازو بڑھائے تو پہلی بار دل نے کہا۔ "یہ بازو میرے لیے ہتھیار بھی ہیں اور ڈھال بھی ہیں۔"

وہ ٹرک سے نیچے اترنے کے لیے اس کے بازو میں آگئی۔ اپنی دونوں بانہیں اس کی گردن میں حمائل کرتے ہوئے اپنا منہ چھپا لیا۔ اس نے کہا۔ "میں تمہارا دشمن نہیں

ہوں اور نہ ہی کچرے میں ڈال کر تمہاری توہین کرنے کا ارادہ تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ کاشف اکبر کے کتے ہر جگہ تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ ان کے دماغوں میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ میں کنول کو کیچڑ میں چھپا کر لے جارہا ہوں۔ پھول گلشن میں رہے یا کوڑے میں رہے' وہ پھول ہی رہتا ہے۔"

وہاں زمین ہموار کرنے پانی کے ٹینکر بھی آئے ہوئے تھے۔ راجہ کے دو ساتھی پائپ کے ذریعے ان پر پانی ڈالنے لگے۔ نازاں دھلنے لگی۔ وہ بھی اس کے ساتھ بھیگنے لگا۔ کہنے لگا۔ "یہاں صابن اور شیمپو وغیرہ نہیں ہیں۔ فی الحال نصف صفائی ہوجائے گی۔ ابھی ہم یہاں سے آگے جائیں گے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ہم ایسی جگہ پہنچیں گے' جہاں تمہیں غسل کرنے کا تمام سامان مل سکے گا۔"

زیادہ دیر تک بھیگتے رہنے کے باعث بدن سے اور لباس سے کچرا دھل گیا۔ بو ختم ہوگئی لیکن وہ گھن محسوس کر رہی تھی۔ راجہ نے اسے اسی طرح بازوؤں میں اٹھائے کار کی اگلی سیٹ پر لاکر بٹھا دیا۔ پھر اسٹیئرنگ سیٹ پر آکر اسے اسٹارٹ کرکے آگے بڑھا دیا۔ اس کے مسلح ساتھی اپنی گاڑی میں اس کے پیچھے آنے لگے۔

وہ بھیگی ہوئی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ گرمی کا موسم تھا۔ یوں بھیگے رہنے سے نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ راجہ نے مین روڈ پر آکر گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں جبراً لے جارہا ہوں۔ آگے ایک چھوٹا سا رہائشی ہوٹل ہے۔ وہاں غسل کرنے کا انتظام ہوگا تو تم صابن وغیرہ سے اچھی طرح بدن صاف کرلینا۔ تمہارے پاس دوسرا لباس نہیں ہے۔ میری اٹیچی سے میرا کوئی لباس پہن لینا۔ اس کے بعد تم جہاں کہو گی' وہاں پہنچا دوں گا۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ راجہ نے کہا۔ "میں نے تمہیں پندرہ منٹ تک اپنے باپ سے بات کرنے کی اجازت دی تھی۔ کیا مجھے بتانا چاہوگی کہ ان سے کیا باتیں ہوئی ہیں؟"

وہ بدستور سر جھکائے ہوئے بولی۔ "بابا سائیں کو کاشف اکبر کی کمینگی کے بارے میں بتا دیا ہے۔"

"مگر تمہارے بابا سائیں مجھے اغوا کا مجرم سمجھ رہے ہوں گے۔"

"میں نے انہیں سچ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ تم نے مجھے اس کے غنڈوں سے بچایا ہے۔ اب بابا سائیں یقین کریں یا نہ کریں' ان کی مرضی ہے۔"

"بہتر ہے تم ابھی ان سے فون پر باتیں کرو۔ ان سے کہو کہ تمہاری حفاظت............ کرنے والے کہاں ہے؟ باپ اور بھائی کی موجودگی میں تمہیں اغوا کرلیا گیا۔ تم کراچی شہر میں محفوظ نہیں رہ سکوگی۔ کیا تمہیں تھر جاکر چھاچھرو والی حویلی میں رہنا چاہیے؟"

"میں ان سے کہہ چکی ہوں' جب تک وہ کاشف اکبر کی پارٹی سے علیحدگی اختیار نہیں کریں گے' میں ان کے پاس بھی واپس نہیں جاؤں گی۔"

"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں' تمہارے بابا سائیں اس پارٹی کو نہیں چھوڑیں گے۔"

وہ ڈیش بورڈ سے موبائل فون اٹھا کر اسے آن کرتے ہوئے اور نمبر ڈائل کرتے ہوئے بولی۔ "میں ابھی بابا سائیں کا آخری فیصلہ سنوں گی۔"

رابطہ ہونے پر اسے بھائی جمال صالح کی آواز سنائی دی۔ نازاں نے کہا۔ "میں بول رہی ہوں۔ فون بابا سائیں کو دو۔"

"نازاں! تم کہاں ہو؟ اپنا فون نمبر تو بتاؤ۔"

"میں کہہ رہی ہوں بابا سائیں سے بات کراؤ۔"

"وہ کاشف اکبر صاحب کے پاس جانے کے لیے لباس تبدیل کرنے کمرے میں گئے ہیں۔ میں انہیں بلاتا ہوں۔"

"وہ اس ذلیل کمینے کے پاس کیوں جارہے ہیں؟"

"پلیز نازاں! انہیں گالیاں نہ دو۔ ان کے مشیر' فرنٹ مین اور جناب رحمان چنا صاحب تمہاری وہ غلط فہمی دور کرنا چاہتے ہیں' جو تمہارے سلسلے میں پیدا ہوگئی ہے۔ یہ تمام صاحبان مجھے اور بابا سائیں کو لینے آئے ہیں۔ یہ لو بابا سائیں آگئے' بات کرو۔"

دوسری طرف سے کمال صالح نے کہا۔ "بیٹی! فکر نہ کرو۔ حوصلہ رکھو۔ ہم جلد ہی تمہیں واپس لے آئیں گے اور راجہ نواز کو گرفتار کرلیں گے۔"

"آپ اتنی زحمتیں کیوں اٹھا رہے ہیں۔ میں ابھی آپ کے پاس آسکتی ہوں لیکن آپ پہلے اس کی پارٹی چھوڑ دیں۔ اس سے ملنے نہ جائیں۔ وہ بہت چال باز ہے۔ وہ آپ کو مجھ سے بھی بدظن کردے گا۔"

"بیٹی! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے ان سے دو ٹوک باتیں کرنے دو۔ میں تمہاری بہتری اور سلامتی کے لیے کچھ سوچ کر ہی وہاں جارہا ہوں۔ تم اپنا فون نمبر دو۔ میں پھر تم سے بات کروں گا۔"

"میں فون نمبر نہیں جانتی مگر یہ جانتی ہوں کہ اس کم ظرف کے پاس جانے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ بہرحال میں پھر کسی وقت رابطہ کروں گی۔"

اس نے فون بند کردیا۔ راجہ نے کہا۔ "اچھا تو کاشف اکبر نے تمہارے بابا سائیں کو سمجھوتے کے لیے بلایا ہے۔ وہ انہیں ضرور یقین دلائے گا کہ تمہارے اغوا کا ذمے دار میں ہوں۔"

"اس کے یقین دلانے سے کیا ہوتا ہے۔ اغوا ہونے والی میں ہوں۔ میں مجرم کو جانتی ہوں۔ پھر میں بابا سائیں سے کہہ چکی ہوں' وہ اس کی پارٹی نہیں چھوڑیں گے تو میں گھر واپس نہیں آؤں گی۔"

"گھر نہیں جاؤ گی تو بتاؤ' میں تمہیں کہاں پہنچاؤں؟"

نازاں نے اسے دیکھا۔ پھر اس کی طرف جھک کر اس کے بازو پر سر رکھ کر کہا۔ "میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ جہاں تم گھر بناؤ گے' وہاں ساری زندگی گزار دوں گی۔"

راجہ نواز نے خوش ہو کر ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالا اور پھر دوسرے ہاتھ کے حصار میں اسے سنبھال لیا۔

وڈیرا کمال صالح اپنے بیٹے کے ساتھ کاشف۔ اکبر کی کوٹھی میں آیا۔ کاشف اکبر خود اس کے استقبال کے لیے کوٹھی سے باہر آیا۔ پھر اس سے بولا۔ "پانی میں لاٹھی مارنے سے پانی الگ نہیں ہوتا۔ ہم کبھی الگ نہیں ہوں گے۔ آیئے ابھی میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردوں گا۔"

وہ ایک وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں آئے۔ اس کے مشیر' فرنٹ مین اور رحمان چنا بھی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ مشیر نے کاشف اکبر سے کہا۔ "میں نے وڈیرے سائیں سے پوچھا تھا کہ بیٹی صرف فون پر کیوں باتیں کررہی ہے؟ سائیں سے ملنے کیوں نہیں آتی ہے؟"

کاشف اکبر نے پوچھا۔ "وہ واپس نہ آنے کے سلسلے میں کچھ تو کہتی ہوگی؟"

کمال صالح نے کہا۔ "وہ اغوا کا الزام آپ پر لگا رہی ہے اور کہتی ہے جب تک میں آپ کی پارٹی سے علیٰحدگی اختیار نہیں کروں گا' وہ واپس نہیں آئے گی؟"

"بیٹی نے کبھی آپ کی سیاست میں مداخلت نہیں کی لیکن اب وہ امیر حمزہ اور راجہ نوز کے بہکانے سے گھر واپس آنے کے لیے سیاسی قسم کی شرط منوا رہی ہے۔ آپ موٹی عقل سے بھی سمجھ سکتے ہیں کہ میری سیاسی پوزیشن کو کمزور کرنے اور ہمارے آپ کے برسوں کے رشتے کو توڑنے کے لیے ایسا کیا جارہا ہے۔"

کمال صالح نے کہا۔ "میں ایسی چالوں کو سمجھتا ہوں لیکن میں نازاں کو بچپن سے جانتا ہوں۔ وہ مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولتی...... بہت صاف گو ہے۔ کسی کی ناراضگی کی

پروا کیے بغیر صاف اور سیدھی بات کہہ دیتی ہے۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "آپ جانتے ہیں۔ میں پہلے سیاست کو اہمیت دیتا ہوں۔ آپ سے مجھ کو بڑے سیاسی فائدے ہیں۔ آپ کے بغیر تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ کیا میں دھوکا دے کر آپ سے حاصل ہونے والے تمام فائدوں سے محروم ہو جاؤں گا۔ کیا ایک ذرا سی ہوس کی خاطر اقتدار کی کرسی چھوڑ دوں گا؟"

ایک ملازم چاندی کی ایک خوب صورت سی صندوقچی اٹھا کر ان کے درمیان آیا۔ پھر اس صندوقچی کو سینٹر ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔ کاشف اکبر نے کہا۔ "میں ایک بیٹی کے لیے باپ کے جذبات کو سمجھ رہا ہوں۔ آپ کا ذہن اس قدر الجھا ہوا ہے کہ آپ موجودہ حالات کو سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔ ابھی آپ نے فرمایا ہے کہ آپ کی بیٹی آپ سے جھوٹ نہیں بولتی ہے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔"

کمال صالح نے جلدی سے کہا۔ "نہیں نہیں۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں دراصل یہ کہنا............"

کاشف اکبر نے بات کاٹ کر کہا۔ "آپ اپنی بات کی وضاحت نہ کریں۔ میں ابھی سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کردیتا ہوں۔ دیکھیے ہم سب مسلمان ہیں اور کلمہ گو ہیں۔"

کمال صالح نے کہا۔ "بے شک ہم مسلمان ہیں۔"

مشیر نے کہا۔ "بے شک نہ کہیں۔ الحمدللہ کہیں۔"

کمال صالح نے کہا۔ "الحمدللہ میں مسلمان ہوں۔"

کاشف اکبر صوفے سے اٹھ کر سینٹر ٹیبل کے پاس آیا۔ پھر چاندی کی صندوقچی کو کھول کر ایک مخملی جزدان میں لپٹا ہوا کلام پاک نکالا۔ اسے چوم کر دونوں آنکھوں سے لگا کر بولا۔ "میں خدا کو حاضر ناظر جان کر قرآن مجید کو ہاتھوں میں لے کر کہتا ہوں کہ میں نے نازاں کو اغوا نہیں کرایا ہے۔ آپ مسلمان ہیں' کیا اب آپ مجھ پر اعتماد کریں گے؟"

کمال صالح نے صوفے سے اٹھ کر قریب آکر کہا۔ "بے شک مجھے آپ پر اعتماد ہے۔"

"تو پھر اس مقدس کتاب کو ہاتھوں میں لے کر کہیں کہ آپ کی طرف سے میرا دل صاف ہوگیا ہے۔ میں آپ کی سیاسی پارٹی سے کبھی علیٰحدگی اختیار نہیں کروں گا۔"

وہ دونوں اس مقدس کتاب کو اپنے سینوں کے درمیان رکھتے ہوئے گلے ملنے لگے۔

پھر کاشف اکبر نے اسے چاندی کی صندوقچی میں رکھ کر بند کیا۔ دور کھڑے ہوئے ملازم کو اشارہ کیا۔ ملازم صندوقچی اٹھا کر واپس چلا گیا۔ دل سے کدورتیں دور ہوگئی تھیں۔ وہ سب آپس میں ہنسنے بولنے لگے۔

ملازم اس صندوقچی کو اٹھائے محل نما کوٹھی کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا ایک کمرے میں آیا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے صندوقچی کو کھول کر کتاب نکالی۔ اس کے مخملی جزدان کو کھول کر اس کتاب کو بے لباس کیا تو وہ مسلمانوں کا قرآن مجید نہیں تھا۔ انگریزی کی موٹی سی لغت تھی۔

ملازم کے دونوں ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس کا دھڑکتا ہوا دل کہہ رہا تھا۔ "یا خدا! یہ مجھ سے کیسا گناہ کرایا گیا ہے؟ کیا تو بھی ان سیاست دانوں کا کبھی محاسبہ نہیں کرے گا؟"

اس نے اس بار مخملی جزدان میں قرآن مجید کو رکھا۔ پھر اسے چاندی کی صندوقچی میں بند کرکے انگریزی لغت کو ایک طرف میز پر ڈال دیا۔

☆======☆======☆

پچھلے باب میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ انیلا بانو سے پیچھا چھڑانے کے لیے مرزا نیک بخت لندن سے تین دنوں کے لیے امریکہ چلا گیا تھا۔ اس کے فرنٹ مین نے وعدہ کیا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں انیلا بانو کو ہلاک کر دیا جائے گا۔

فرنٹ مین نے اسے قتل کرانے کے لیے.......... نشے کے عادی شخص جیکی رالف کو اپنا احسان مند بنایا۔ اسے ہیروئن سے بھرے ہوئے سگریٹ پینے کے لیے دیتا رہا لیکن جب وہ زیر زمین ریلوے پلیٹ فارم کے ٹائلٹ میں انیلا کو قتل کرنے گئے تو پتا چلا' اسے پہلے ہی قتل کر دیا گیا ہے۔ ایک نامعلوم عورت انیلا کے دس ہزار پاؤنڈز چھین کر اسے قتل کرکے فرار ہو گئی تھی۔

فرنٹ مین نے ٹائلٹ کے فرش پر اپنی آنکھوں سے انیلا بانو کی لاش دیکھی تھی۔ پھر وہ جیکی رالف کے ساتھ زیر زمین پلیٹ فارم کی سیڑھیاں چڑھ کر پارکنگ ایریا کی طرف آگیا تھا تاکہ انیلا بانو کے قتل کا الزام ان پر نہ آئے۔

پولیس والے وہاں آکر انیلا کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے ایک ایمبولینس میں لے جا رہے تھے۔ فرنٹ مین اور جیکی دور کھڑے دیکھ رہے تھے اور سگریٹ پینا چاہتے تھے۔ ایسے ہی وقت فرنٹ مین کے دماغ میں دھماکا سا ہوا۔ جیکی نے بتایا کہ وہ نشے کا عادی نہیں ہے۔ فرنٹ مین اسے نشے کے جتنے سگریٹ دیتا رہتا تھا' انہیں جیکی استعمال نہیں کرتا تھا۔ فرنٹ مین کو باتوں میں لگا کر یا کبھی اس کی نظریں بچا کر نشیلا سگریٹ پھینک دیا کرتا تھا۔

اس کی باتیں سن کر فرنٹ مین نے سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟ لیکن میں نے تو تمہیں ہیروئن بھرے سگریٹ کے کش لگاتے دیکھا ہے۔"

"بے شک تم نے دیکھا ہے۔ میں سگریٹ کے کش لگاتا تھا لیکن دھواں حلق سے نیچے نہیں اتارتا تھا۔ اسے منہ میں رکھ کر باہر پھونک دیا کرتا تھا۔ میں ہلکے پھلکے نشے کا عادی ہوں اسی لیے سگریٹ کے دھوئیں کے اثر کو برداشت کر لیتا تھا۔"

"تم۔ تم ایسا کیوں کرتے تھے؟ مجھے دھوکا کیوں دیتے تھے؟"

"دھوکا میں نہیں دیتا تھا' تم دیتے تھے۔ یاد کرو۔ میں تمہارے پاس نہیں آیا تھا۔ تم

میرے پاس آئے تھے۔ تم نے سمجھا' میں یہاں کا ایک مس فٹ جوان ہوں۔ نشہ کرتا ہوں لیکن میں یہاں نشے باز بن کر منشیات کا دھندا کرنے والوں کو پکڑنے آتا تھا۔"

"یعنی کہ تم پولیس والے ہو؟"

"میرا تعلق انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔ جس دن تمہارا باس شہزاد خان منشیات کی اسمگلنگ میں پکڑا گیا' اسی روز تمہیں بھی دھر لیا جاتا لیکن میرے کہنے سے ڈیپارٹمنٹ والوں نے تمہیں ڈھیل دی۔ ہم یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ تم مادام کیتھرائن کی پے انگ گیسٹ انیلا بانو کو کیوں قتل کرانا چاہتے ہو؟"

اس نے سگریٹ کا ایک کش لگایا۔ فرنٹ مین نے خوشامدی انداز میں کہا۔ "مسٹر رالف! ہم پچھلے دو ہفتوں سے دوست رہے ہیں۔ میں تمہیں غریب اور بے یارومددگار سمجھ کر عیش کراتا رہا۔ میرے اندر ایک اچھا اور غریب پرور انسان ہے۔ اسے سمجھو اور دوستی کی قدر کرو۔"

جیکی رالف نے کہا۔ "تم نے مجھے تقریباً پچاس پاؤنڈ دیئے۔ کھانا بھی کھلایا۔ مہنگے سگریٹ بھی پلاتے رہے لیکن ایک عورت کو قتل کرانے کے لیے یہ مہربانیاں کرتے رہے۔ اسے دوستی نہ کہو۔"

"کیا تم مجھے انکوائری کے لیے لے جاؤ گے؟"

"تم خود سمجھو۔ آخر میں نے تمہارے ساتھ اتنے دن کیوں ضائع کیے ہیں؟"

فرنٹ مین اپنے کوٹ کے بٹن کھولنے لگا۔ جیکی نے کہا۔ "کوئی ہتھیار نکالنے کے لئے کوٹ کے اندر ہاتھ نہ ڈالنا' تم نشانے پر ہو۔ تمہارے ہاتھ میں ریوالور وغیرہ نظر آتے ہی تمہارے آگے پیچھے گولیاں چلنے لگیں گی۔"

فرنٹ مین نے سڑک کے اس پار متلاشی نظروں سے دیکھا جہاں گاڑیاں پارک کی گئی تھیں' وہاں ایک پولیس کار بھی تھی۔ اس کی اگلی پچھلی کھڑکیوں سے دو پولیس مین نظر آئے۔ انہوں نے ریوالور اس طرح پکڑے ہوئے تھے کہ وہ عام راہ گیروں کو نظر نہ آئیں چونکہ جیکی نے نشان دہی کی تھی اس لیے وہ فرنٹ مین کو نظر آرہے تھے۔

فرنٹ مین نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ ایک شخص اوور کوٹ اور فلیٹ ہیٹ پہنے ایک پب کے کارنر پر کھڑا تھا۔ جب فرنٹ مین نے اسے دیکھا تو اس کا ہاتھ اوور کوٹ کے کھلے ہوئے حصے میں تھا اور اس ہاتھ میں ایک ریوالور نظر آرہا تھا۔ جیکی نے کہا۔ "تمہیں کھلے عام گن پوائنٹ پر لے جاسکتے ہیں لیکن یہ پبلک پلیس ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ لوگوں میں خوف و ہراس پیدا ہو۔ پلیز سیدھے چلتے ہوئے اور دونوں ہاتھ پیچھے گردن پر رکھتے ہوئے

سامنے والی پولیس کار میں جاکر بیٹھ جاؤ۔"

وہ بے بسی سے بولا۔ "میں جارہا ہوں لیکن مجھے خواہ مخواہ پھنسایا جارہا ہے۔ میرے خلاف کسی بھی جرم کا ثبوت پیش نہیں کرسکو گے۔"

"ثبوت نہ ملا تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ تم دو تین گھنٹوں کے اندر رہا کردیئے جاؤ گے' پلیز اب جاؤ۔"

وہ جانے کے لیے آگے بڑھا۔ جیکی نے کہا۔ "رک جاؤ۔ دونوں ہاتھ گردن پر رکھ کر نہیں جاؤ گے تو وہ تمہیں گولی مار دیں گے۔ میں انہیں سگنل دے چکا ہوں کہ تمہارے لباس میں ریوالور ہے۔"

وہ اپنے دونوں ہاتھ گردن پر رکھ کر پولیس کار کے پاس گیا۔ پولیس مین نے اس کے لباس کی تلاشی لے کر ریوالور برآمد کرلیا۔ پھر کار کی پچھلی سیٹ پر اسے بٹھا کر لے جانے لگے۔

وہ جانتا تھا کہ اسے انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے ایک ایسے کمرے میں لے جایا جائے گا جہاں میز کے اطراف دو چار جاسوس بیٹھے ہوں گے۔ اسے بھی ایک کرسی پر بٹھا دیا جائے گا۔ پھر اس سے طرح طرح کے سوالات کیے جائیں گے اور بڑے نفسیاتی انداز میں اس پر دباؤ ڈالا جائے گا۔ اس نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا تھا۔ ان کے ہر سوال کا معقول جواب دینے کے لیے بالکل تیار تھا۔

لیکن اس کے اندازے کے خلاف اسے ایک لاک اپ میں لے جاکر بند کردیا گیا۔ پھر کوئی اسے پوچھنے نہیں آیا۔ اس نے شام کو پوچھا۔ "یہ کیا ہورہا ہے؟ مجھ سے کچھ پوچھا نہیں جارہا ہے۔ مجھے یہاں خواہ مخواہ بند کیا گیا ہے۔"

حوالات کے انچارج نے پوچھا۔ "تم سے کیا پوچھا جائے؟ کیا تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"ایک شریف آدمی اور کیا کہے گا؟ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔"

"یہ اچھی بات ہے کہ تم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ جنہوں نے تمہیں یہاں لاکر بند کیا ہے۔ وہ نادان نہیں ہیں۔ تمہارے خلاف ثبوت جمع کررہے ہوں گے۔ اگر وہ ایسا نہ کرسکے تو کل صبح تمہیں رہائی مل جائے گی۔ تمہیں کاغذ قلم دیا جارہا ہے۔ تم آرام سے بیٹھ کر ان کاغذات پر لکھے ہوئے سوالوں کے جواب لکھ دو۔"

کاغذات کا ایک پیڈ اور قلم لاکر اسے دیا گیا۔ وہ لاک اپ کے اندر ایک میز کرسی پر بیٹھ کر پڑھنے لگا۔ پہلا سوال تھا۔ "تم منشیات کا دھندا کب سے کررہے ہو؟"

اس نے جواب لکھا۔ "میں نے کبھی منشیات کا دھندا نہیں کیا ہے۔"

دوسرا سوال تھا۔ "منشیات کے ایک پاکستانی اسمگلر شہزاد خان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ اگر اس سے تعلق نہیں ہے تو اس سے جیل میں کیوں ملاقات کرنے گئے تھے؟"

"میں شہزاد خان کو پاکستان سے جانتا ہوں لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ منشیات کا اسمگلر ہے۔ اس کی گرفتاری پر تعجب ہوا۔ میں اس سے پوچھنے گیا تھا کہ اس نے ایسی غیر قانونی حرکت کیوں کی ہے؟ اور کیا وہ پاکستان میں اپنے رشتے داروں کو میرے ذریعے کوئی پیغام بھیجنا چاہتا ہے؟"

تیسرا سوال تھا۔ "لندن میں تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے؟"

"میں پاکستان کے ایک بہت نامور سیاست داں مرزا نیک بخت کا ملازم ہوں۔ لندن میں مرزا نیک بخت کے بنگلے اور جائیداد کا نگراں ہوں۔ جب وہ یہاں قیام کرتے ہیں تو میں ان کے سیکرٹری کے فرائض انجام دیتا ہوں۔"

چوتھا سوال تھا۔ "پاکستان سے آنے والی لڑکی انیلا بانو کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟"

"میں کسی انیلا بانو کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

پانچواں سوال تھا۔ "اگر انیلا بانو کو جانتے ہو تو کیا اس کے مرڈر کے سلسلے میں قانون کے محافظوں کی راہنمائی کر سکتے ہو؟"

"سوری۔ جب میں اسے جانتا ہی نہیں ہوں تو قانون کے محافظوں کی راہنمائی کیسے کر سکتا ہوں؟"

آخری سوال تھا۔ "تم جیکی رالف سے کیوں ملاقات کرتے تھے؟"

"میں اسے ایک مس فٹ اور نشہ باز' غریب اور محتاج شخص سمجھ کر اس کی مدد کیا کرتا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس کا تعلق انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔ میں نے نہ کبھی اسے نقصان پہنچایا ہے اور نہ اس سے کوئی فائدہ حاصل کیا ہے؟"

اس نے تمام سوالات اور اپنے لکھے ہوئے جوابات کو کئی بار توجہ سے پڑھا۔ ان پر اچھی طرح غور کیا۔ پھر قلم اور کاغذات' حوالات کے انچارج کے سپرد کر دیئے۔

دوسری صبح مرزا نیک بخت امریکا سے واپس آیا۔ وہ اخبار میں انیلا بانو کے قتل کی خبر پڑھ کر مطمئن ہو گیا۔ اس نے پرسنل سیکرٹری سے کہا۔ "فرنٹ مین کو فون کرو اور اسے فوراً یہاں آنے کو کہو۔"

تھوڑی دیر بعد سیکرٹری نے آ کر کہا۔ "سر! اس کا موبائل بند ہے۔ ویسے وہ جانتا ہے کہ آج آپ واپس آنے والے ہیں۔ وہ یہاں آتا ہو گا۔"

نیک بخت نے غصے سے کہا۔ "اسے ائیرپورٹ آنا چاہیے تھا۔ میں نے کل رات اسے فون پر بتا دیا تھا کہ کون سی فلائٹ سے آ رہا ہوں۔"

ایک مشیر تیزی سے چلتا ہوا آیا پھر بولا۔ "سر! انٹیلی جنس والے آئے ہیں۔ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔"

وہ پریشان ہو کر بولا "یہ انٹیلی جنس والے کیوں آئے ہیں؟"

مشیر نے کہا۔ "ایک برس پہلے آپ نے انیلا کے بینک اکاؤنٹ میں رقم جمع کرنے کے لیے ایک چیک دیا تھا۔ اس چیک کے ذریعے انیلا سے آپ کا تعلق ظاہر ہو رہا ہے۔ آپ میرا مشورہ یاد رکھیں' انیلا سے لاتعلقی ظاہر نہ کریں ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔"

وہ اپنے مشیر کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آیا۔ انٹیلی جنس کے ایک افسر نے اپنا کارڈ دکھا کر کہا۔ "ہم ایک پاکستانی خاتون انیلا بانو کے مرڈر کے سلسلے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔"

نیک بخت نے کہا۔ "تشریف رکھیں۔ میں نے صبح اخبار میں یہ افسوس ناک خبر پڑھی ہے۔ وہ میری بہت فرض شناس لیڈی سیکرٹری تھی۔ میں ابھی متعلقہ افسران سے رابطہ کر کے اس کی لاش دیکھنا چاہتا ہوں اور اس کے پاکستانی عزیزوں کو اطلاع دینا چاہتا تھا۔"

ان کی گفتگو شروع ہوتے ہی دوسرے افسر نے ایک کیسٹ ریکارڈر آن کر کے نیک بخت اور اپنے اعلیٰ افسر کے درمیان رکھ دیا تھا۔ اعلیٰ افسر نے پوچھا۔ "آپ کی پرسنل سیکرٹری کو آپ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا لیکن وہ یہاں پے انگ گیسٹ کی حیثیت سے رہتی ہے۔"

"اس نے پاکستان میں ایک ماہ پہلے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اس لیے وہ پے انگ گیسٹ کی حیثیت سے یہاں آئی تھی۔"

"ہماری ایجنسی نے پاکستان سے رپورٹ بھیجی ہے کہ ایک ہفتہ پہلے پاکستان میں بھی اسی انیلا بانو کا قتل ہو چکا تھا۔ لاش کے لباس اور اس کے سامان سے تصدیق ہوئی کہ انیلا بانو کو قتل کر کے اس کا چہرہ بگاڑ دیا گیا ہے۔ پھر وہی انیلا بانو زندہ ہو کر لندن کیسے آ گئی؟"

"اس کا جواب انیلا بانو سے مل سکتا تھا۔ وہ میری اس بات کی تصدیق کر سکتی تھی کہ اپوزیشن سیاسی پارٹی والوں نے انیلا بانو کو اغوا کر کے قتل کرنا چاہا تھا۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ انیلا سے میرے ناجائز تعلقات تھے۔ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ میں نے اپنا سیاسی کیریئر بچانے کے لیے اسے قتل کرا دیا ہے لیکن میری قسمت اچھی تھی۔"

انیلا بانو پاکستان سے فرار ہو کر یہاں آگئی تھی۔ اپوزیشن والوں کا ڈراما فلاپ ہو گیا۔ میں نے انیلا بانو سے کہا تھا کہ تین دن کے لیے امریکا جا رہا ہوں۔ واپس آکر اس کی باقاعدہ رہائش اور سیکورٹی کے انتظامات کر دوں گا مگر افسوس خدا جانتا ہے کہ مجھے اس کی موت کا کتنا صدمہ ہے۔"

"ایک شخص شاہد جبار "فرنٹ مین" پچھلے دس برسوں سے یہاں رہتا ہے۔ خود کو آپ کا ملازم کہتا ہے۔ آپ اس کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟"

"بے شک وہ میرا ملازم ہے۔ یہاں میرے بنگلے کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ میرے یہاں قیام کے دوران میں کھانے پینے اور دوسری اہم ضروریات پوری کرنے کے انتظامات کرتا ہے۔"

"پچھلے برس انیلا بانو آپ کے ساتھ لندن آئی تھی؟"

"جی ہاں۔ اس وقت وہ میری پرسنل سیکرٹری تھی۔"

"پھر تو شاہد جبار آپ کی پرسنل سیکرٹری انیلا بانو کو اچھی طرح جانتا ہو گا؟"

"بے شک جانتا تھا۔"

"منشیات کا ایک اسمگلر شہزاد خان جیل میں ہے۔ آپ کا ملازم شاہد جبار اس سے ملنے جیل گیا تھا۔"

"میرے لیے یہ نئی اطلاع ہے کہ میرے ملازم کا تعلق منشیات کے اسمگلر سے ہے۔"

"جس عورت نے انیلا بانو کو قتل کیا تھا' وہ گرفتار ہو چکی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ وہ شاہد جبار کی گرل فرینڈ ہے۔ اس نے شاہد جبار کے کہنے پر انیلا بانو کو قتل کیا ہے۔"

"میں نہیں جانتا کہ وہ عورت کس قدر سچ کہہ رہی ہے۔ میرا ملازم شاہد جبار انیلا کو کیوں قتل کرائے گا؟"

اعلیٰ افسر نے کہا۔ "ہمارے پاس درجنوں پاکستانی اور دوسرے ملکوں کے اخبارات ہیں جن میں آپ کے اور انیلا بانو کے اسکینڈلز شائع ہوتے رہے ہیں۔ پاکستان میں انیلا بانو کا مرڈر ہوا تو بیشتر اخبارات نے یہی لکھا کہ آپ نے اسے قتل کرایا ہے۔"

نیک بخت نے کہا۔ "جبکہ اس کا قتل نہیں ہوا تھا۔ جو الزام تراشی میرے خلاف کی گئی' غلط ثابت ہوئی۔"

"ایسا بھی ہوتا ہے کہ پہلا قتل ناکام ہو تو دوسرا قتل کامیاب ہو جاتا ہے۔"

"یہ آپ کی قیاس آرائی ہے۔"

"میں پھر قیاس آرائی کے طور پر پوچھتا ہوں۔ کیا انیلا بانو کسی معاملے میں آپ کے لیے پرابلم بن گئی تھی؟ اور آپ اس پرابلم سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ بہت ذہین عورت تھی۔ میرے پرابلمز......... حل کرتی تھی۔ میرے لیے پرابلم نہیں بنتی تھی۔"

اعلیٰ افسر نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے ہمیں اپنا قیمتی وقت دیا۔"

اس نے جیب سے دو کاغذ نکال کر نیک بخت کو دیئے۔ پھر کہا۔ "یہ اس پولیس اسٹیشن کا پتا ہے' جہاں شاہد جبار کو لاک اپ میں رکھا گیا ہے۔ آپ کسی وقت بھی جاکر اس سے ملاقات کر سکتے ہیں اور اس دوسری پرچی پر اس اسپتال کا پتا ہے' جہاں مُردہ خانے میں انیلا بانو کی لاش رکھی ہے۔ ہم شام کو ٹھیک پانچ بجے اسپتال میں موجود رہیں گے۔ ہم چاہتے ہیں' آپ اس کی لاش شناخت کریں۔"

وہ تینوں افسر مصافحہ کر کے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی نیک بخت نے مشیر سے پوچھا۔ "یہ کیا ہو گیا؟ شاہد جبار لاک اپ میں ہے۔ اس کم بخت نے کس عورت سے اس کا مرڈر کرایا ہے؟"

مشیر نے کہا۔ "سر! یہ افسر....... کتنے چالاک ہیں۔ آپ سے دنیا جہان کے سوالات کرنے کے بعد آخر میں بتایا ہے کہ شاہد جبار لاک اپ میں ہے۔ پتا نہیں اس نے پولیس اسٹیشن میں کیا بیان دیا ہے۔ آپ دونوں کے بیانات میں تضاد ہو گا تو بڑے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔"

مرزا نیک بخت نے موبائل کے ذریعے خفیہ ہاتھ کی خفیہ ایجنسی سے رابطہ کیا پھر کہا "انیلا بانو مرڈر کیس میں میرے فرنٹ مین کو لاک اپ میں رکھا گیا ہے اور مجھے اس کیس میں الجھانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ میں یہاں مقدمے کی پیشیاں بھگتنے کے لیے نہیں رہ سکوں گا۔ مجھے جلد ہی پاکستان واپس جانا ہے اور نیک نامی کے ساتھ جانا ہے۔"

"آپ مرڈر کے وقت امریکا میں تھے۔ آپ پر پابندیاں عائد نہیں کی جا سکیں گی۔ آپ کے پاکستان واپس جانے کے لیے این او سی حاصل کر لی جائے گی۔ یہ معلوم کریں کہ آپ کے فرنٹ مین نے کیا بیان دیا ہے۔ آپ دونوں کے بیانات متضاد ہوں گے تو فرنٹ مین کو مرڈر کیس میں لٹکا دیا جائے گا۔"

مرزا نیک بخت نے موبائل کو بند کیا۔ پھر مشیر کو بتایا کہ ایجنسی والے کیا کر سکتے ہیں۔ ہمیں ابھی جاکر شاہد جبار سے ملنا چاہیے۔

وہ دونوں ایک کار میں بیٹھ کر پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئے۔ اسی وقت موبائل فون کا بزر سنائی دیا۔ نیک بخت نے اسے آن کرکے پوچھا۔ "ہیلو کون؟"

دوسری طرف سے امیر حمزہ کی آواز سنائی دی۔ نیک بخت ایک دم سے بوکھلا گیا۔ دوسری طرف سے آواز آرہی تھی۔ "تم لاکھوں کروڑوں میں میری آواز پہچان سکتے ہو۔ کیا اپنا نام بتاؤں؟"

نیک بخت نے اپنے مشیر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "جناب حمزہ صاحب! آپ کا نام تو دل پر لکھا ہے۔ کیا آپ لندن میں ہیں؟"

"بس ابھی پہنچا ہوں۔ مادام کیتھرائن کے بنگلے میں گیا تو پتا چلا انیلا بانو پچھلی رات سے نہیں آئی ہے۔ پھر تو وہ تمہارے ساتھ ہوگی۔"

"نہیں حمزہ صاحب! میں بھی صبح کی فلائٹ سے امریکا سے آیا ہوں۔ یہاں پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ اسے ایک عورت نے قتل کردیا ہے۔"

امیر حمزہ نے گرجتے ہوئے کہا۔ "کیا بکواس کررہے ہو؟ کس عورت نے اسے قتل کیا ہے؟ تم اسے یہاں چھوڑ کر امریکا کیوں گئے تھے؟ میں تمہیں وارن کرتا ہوں۔ مجھ سے کوئی ڈرامہ کرو گے تو یہاں سے تمہاری لاش پاکستان جائے گی۔ مجھے بتاؤ۔ اس کی لاش کہاں ہے؟"

نیک بخت نے اسپتال کا نام بتا کر کہا۔ "وہاں انٹیلی جنس والے شام کو پانچ بجے آئیں گے۔ ان کی موجودگی میں ہمیں اس کی لاش دکھائی جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ تم نے آج تک مجھے نہیں دیکھا۔ آج دیکھو گے۔ میں شام کو اسپتال آؤں گا۔ اگر میں نے اس کی لاش دیکھی تو سمجھو کل صبح تک دنیا والے تمہاری لاش دیکھیں گے۔"

دوسری طرف سے فون بند ہوگیا۔ نیک بخت کو لندن کی سردی میں پسینہ آرہا تھا۔ امیر حمزہ اس طرح گرج کر بول رہا تھا کہ مشیر احمد علی نے بھی اس کا چیلنج سنا تھا۔ وہ پریشان ہوکر بولا۔ "یہ عذاب یہاں کیسے نازل ہوگیا؟ پہلے تو مرڈر کیس سے بچنے کی بات تھی۔ اب اس امیر حمزہ سے جان چھڑانے کا مسئلہ ہے۔"

نیک بخت نے پھر خفیہ ہاتھ کی ایجنسی سے رابطہ کیا اور کہا۔ "میں کل صبح تک زندہ نہیں رہوں گا۔ امیر حمزہ شام کو پانچ بجے اسپتال آکر انیلا بانو کی لاش دیکھے گا تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ "کیا واقعی امیر حمزہ وہاں انیلا کی لاش دیکھنے آئے گا؟"

"ہاں ایک بار اس کی ہلاکت غلط ثابت ہوئی تھی۔ اس بار وہ آنکھوں سے اس کی لاش دیکھ کر یقین کرنا چاہتا ہے۔"

"پھر تو آپ ناحق پریشان ہورہے ہیں۔ ہم تو برسوں سے اس موقع کا انتظار کررہے ہیں۔ وہ ایک بار افغانستان میں ہم سے بچ نکلا تھا۔ آج اسپتال میں نہیں بچے گا۔ ہم اسے بھی مُردہ خانے میں پہنچائیں گے۔ آپ اطمینان رکھیں۔ خفیہ طور پر آپ کی سیکورٹی کا بھی انتظام رہے گا۔"

نیک بخت مطمئن نہیں رہ سکتا تھا مگر کسی حد تک اس کی تسلی ہوگئی تھی۔ وہ پولیس اسٹیشن پہنچے۔ انٹیلی جنس والوں نے وہاں کے انچارج سے کہہ دیا تھا کہ نیک بخت آئے تو اسے شاہد جبار سے ملنے دیا جائے۔ وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے ایک کرسی پر سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ مرزا نیک بخت اور مشیر احمد علی کو دیکھ کر وہ فوراً کھڑا ہوگیا۔ سلاخوں کے پاس آکر بولا۔ "سر! مجھے یقین تھا' آپ مجھے ضمانت پر رہا کرانے آئیں گے۔"

نیک بخت نے پوچھا۔ "تم نے یہاں کیا بیان دیا ہے؟"

وہ بتانے لگا کہ تحریری طور پر سوالات کیے گئے تھے۔ اس نے ان کے جوابات لکھ کر دیئے ہیں۔ وہ اپنے لکھے ہوئے جوابات سنانے لگا نیک بخت نے غصے سے پوچھا۔ "تم نے یہ کیوں لکھا کہ انیلا بانو کو نہیں جانتے ہو؟ وہ میری پرسنل سیکرٹری کے طور پر پچھلے سال میرے ساتھ یہاں آئی تھی پھر تم میرے فرنٹ مین ہوکر اسے کیسے نہیں جانتے ہو؟"

مشیر نے پوچھا۔ "تم نے کس عورت سے انیلا کو قتل کرایا تھا؟ وہ عورت گرفتار ہوچکی ہے۔"

"میں نے کسی عورت سے اسے قتل نہیں کرایا ہے۔ میں نے ایک نشہ کرنے والے سے یہ کام لینا چاہا تو پتا چلا کہ وہ نشہ کرنے والا انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کا ایک جاسوس ہے۔ اسی نے مجھے اس حوالات میں پہنچایا ہے۔ میں نے سوچا کہ جاسوس کے پاس ٹھوس ثبوت نہیں ہے کہ میں اس سے کسی کا مرڈر کرانا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے صاف انکار کردیا کہ میں کسی انیلا کو نہیں جانتا ہوں۔ وہ جاسوس بھی نہیں جانتا تھا کہ کس عورت نے انیلا کو قتل کیا ہے۔"

"کیا تمہاری عقل میں اتنی سی بات نہیں آئی کہ انکوائری ہوگی تو انیلا کا ہم سے تعلق ظاہر ہوجائے گا۔ اب تو یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ تم میری پرسنل سیکرٹری انیلا کو جانتے تھے۔ میرے امریکا جاتے ہی تم نے اسے قتل کرا دیا اور وہ قتل کرنے والی تمہاری کوئی گرل فرینڈ تھی۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ میں اس قتل کرنے والی کو نہیں جانتا۔"

"تم تحریری طور پر جھوٹا بیان دے چکے ہو۔ تمہاری کسی بات کو سچ نہیں مانا جائے گا۔"

"سر! مجھ سے غلطی ہو گئی........ مجھے کسی طرح بچالیں۔ احمد علی صاحب! آپ بہت ذہین ہیں۔ سر کو بڑی ذہانت سے مشورے دیتے ہیں۔ پلیز آپ مجھے بچانے کی تدبیر کریں۔"

مشیر نے کہا۔ "تم ہمارے وفادار ہو۔ ہم تمہیں ضرور بچائیں گے۔ سر! ہم چلیں۔ دوسرے ضروری کاموں سے بھی نمٹنا ہے۔"

وہ دونوں شاہد جبار کو جھوٹی تسلیاں دے کر پولیس اسٹیشن سے باہر آگئے' مشیر نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "سر! اس کے احمقانہ بیان سے آپ پر آنچ بھی نہیں آئے گی۔ آپ یہاں کے سراغ رسانوں کو آئندہ جو بیان دیں گے' وہ فرنٹ مین شاہد جبار کے خلاف ہو گا۔ آپ شبہ ظاہر کریں گے کہ شاہد جبار فرنٹ مین کی نیت انیلا پر خراب ہو گئی تھی یا انیلا کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ آپ کی غیر موجودگی میں اسمگلر شہزاد خان کے لیے کام کرتا ہے۔ انیلا کی زبان بند کرنے کے لیے اس نے اسے قتل کرایا ہے۔"

نیک بخت نے کہا۔ "واقعی جب میں یہاں نہیں رہتا ہوں تو وہ منشیات کا دھندا کرتا ہے۔ کم بخت نے یہ نہیں سوچا کہ کبھی گرفتار ہو گا تو میرے سیاسی کیریئر پر آنچ آئے گی۔ اسے سزا ضرور ملنی چاہیے۔ انیلا مرڈر کیس میں اسے پھانسنے سے میری جان چھوٹ جائے گی۔"

انٹیلی جنس کے وہ تینوں سراغ رساں پولیس اسٹیشن کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نیک بخت اور مشیر کے جانے کے بعد وہ تینوں فرنٹ مین شاہد جبار کے پاس آئے۔ ایک اعلیٰ افسر نے اسے چند کاغذات دکھا کر کہا۔ "تم سے ان کاغذات پر چند سوالات کیے گئے تھے اور تم نے ان کے جوابات اپنے ہاتھ سے لکھے۔ ہمارا خیال ہے' تم ان جوابات میں کچھ تبدیلیاں کرنا چاہو گے؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "مسٹر نیک بخت میرے لیے ایک وکیل کی خدمات حاصل کریں گے۔ میں وکیل سے مشورہ کر کے آپ کے سوالات کے جوابات دے سکوں گا۔"

"ہم یہاں تمہارے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرنے نہیں آئے ہیں۔ تم سے اہم معلومات حاصل کرنے کے لیے تمہیں کسٹڈی میں رکھا گیا ہے۔ تم سے وہی سوالات کیے جائیں گے' جن سے تمہارا تعلق ہے۔"

دوسرے سراغ رساں نے کہا۔ "اگر ہم یہ پوچھیں گے کہ تم کب پیدا ہوئے تھے تو تم ہی اپنی تاریخ پیدائش بتاؤ گے' تمہارا وکیل نہیں بتائے گا۔ اسی طرح تم ہی بتا سکتے ہو کہ مسٹر نیک بخت کو یہ کیوں نہیں معلوم تھا کہ تم منشیات کے اسمگلر کے لیے کام کرتے ہو؟"

"میں جواب لکھ چکا ہوں کہ اسمگلر شہزاد خان کے دھندے سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔"

ایک سراغ رساں نے کہا۔ "ہم نے شہزاد خان سے بھی اسی طرح تحریری بیان لیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق تم لندن میں اس کے مال کے سپلائر ہو۔ اس کا گواہ ہمارا ایک جاسوس جیکی رالف بھی ہے۔ تمہاری اور شہزاد خان کی وہ گفتگو بھی ریکارڈ کی گئی ہے جب تم اس سے جیل میں ملاقات کرنے گئے تھے۔"

دوسرے سراغ رساں نے کہا۔ "اتنے ثبوت اور گواہ کے باوجود تم یہ کہتے ہو کہ شہزاد خان کے منشیات کے دھندے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں تھا تو پھر کاغذ پر یہی لکھ دو مگر ایک بات یاد رکھو۔ تمہارے جوابات میں جتنی سچائی ہو گی اتنی ہی کم سزا ہو گی۔"

اعلیٰ افسر نے کہا۔ "میں ڈیپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر جنرل سے تمہیں یہ تحریری سند دوں گا کہ تم سلطانی گواہ ہو۔ تمہیں اصلی مجرموں کا مڈل مین بننے پر معافی دی جائے گی۔ بشرطیکہ تم انیلا مرڈر کیس میں اہم ثبوت اور گواہ پیش کرو۔"

"میں انیلا مرڈر کیس کے سلسلے میں کیا کہوں۔ جبکہ تحریری بیان دے چکا ہوں کہ میں انیلا بانو کو نہیں جانتا تھا۔"

"مسٹر نیک بخت کا بیان ہے کہ وہ اس کی پرسنل سیکریٹری تھی۔ پچھلے سال یہاں آئی تھی۔ یہاں تم بھی مسٹر نیک بخت کے ملازم ہو۔ لہٰذا ایک ملازم کی حیثیت سے اسے اچھی طرح پہچانتے ہو۔"

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا ایک سراغ رساں نے کہا۔ "اب زبان سے نہ بولو۔ تحریری بیان دو۔ جو کہنا چاہتے ہو' اسے لکھو۔"

"سوری۔ میں وکیل سے مشورہ کیے بغیر تحریری بیان نہیں دوں گا۔"

"انیلا بانو کو قتل کرنے والی عورت عدالت میں کہے گی کہ تم نے اسے قتل کرانے کے لیے خاصی رقم دی تھی۔ مسٹر نیک بخت سے سوال کیا جائے گا تو ان کا یہی جواب ہو گا کہ ان کے امریکا جاتے ہی پتا نہیں کیوں تم نے اسے قتل کرا دیا؟ ہو سکتا ہے' منشیات کے دھندے میں انیلا بانو تمہارے لیے پرابلم بن گئی ہو۔"

دوسرے جاسوس نے کہا۔ "مسٹر نیک بخت ایسے ملازم کے لیے وکیل نہیں دیں

گئے' جو انہیں دھوکا دے کر منشیات کا دھندا کرتا رہا ہو۔"

تیسرے جاسوس نے کہا۔ "ذرا سوچو اور غور کرو۔ تم ہر پہلو سے گرفت میں آنے والے ہو۔ مسٹر نیک بخت پر ایک ذرا بھی آنچ نہیں آئے گی۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "کیا مجھے ٹیلی فون کی سہولت مل سکتی ہے۔ میں مسٹر نیک بخت سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

افسر نے رسٹ واچ پر دیکھ کر کہا۔ "چالیس منٹ کے بعد وہ اسپتال سے انیلا بانو کی لاش دیکھنے جائیں گے۔ تمہیں بھی وہاں لے جایا جا رہا ہے۔"

افسر نے تھانہ انچارج سے کہا کہ وہ شاہد جبار کو اپنی کسٹڈی میں اسپتال لے آئیں۔ وہیں اس قاتل عورت کو بھی پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ تینوں سراغ رساں وہاں سے چلے گئے۔

اسپتال کے مُردہ خانے کے قریب ایک کمرے میں انیلا کی لاش تمام متعلقہ افراد کو دکھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ لاشیں سرد مُردہ خانوں میں رکھی جاتی ہیں۔ وہاں سے ایسی جگہ نہیں لے جائی جاتیں' جہاں اے سی کا مخصوص منفی ٹمپریچر کم نہ ہو۔

یہ بات کسی کے ذہن میں نہیں آئی کہ انیلا کی لاش اس کمرے میں کیوں لائی جائے گی۔ نیک بخت کا ذہن اس مسئلے میں الجھا ہوا تھا کہ کس طرح اس قتل کا الزام فرنٹ مین شاہد جبار کے سر پر تھوپ دیا جائے پھر دل میں یہ خوف سمایا ہوا تھا کہ وہاں امیر حمزہ پہلی بار اس کے رُوبرو آنے والا ہے۔

خفیہ ایجنسی والوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ امیر حمزہ وہاں سے زندہ نہیں جا سکے گا۔ گویا اسپتال کے اس حصے میں گولیاں چل سکتی تھیں۔ خون خرابا ہو سکتا تھا۔ اس بار امیر حمزہ کو مار ڈالنے کے لیے بہت کچھ کیا جا سکتا تھا۔

پولیس والے شاہد جبار کو اس کمرے میں بٹھا کر چلے گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد نیک بخت اپنے مشیر احمد علی کے ساتھ آیا۔ شاہد جبار نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سلام کیا۔ نیک بخت نے کہا۔ "میں جواب میں وعلیکم السلام نہیں کہوں گا کہ اس کا مطلب ہو گا' تم پر بھی سلامتی ہو اور تم پر سلامتی نہیں ہونی چاہیے۔"

"سر! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"تم نے آج تک مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی کہ تم منشیات کا دھندا کرتے ہو۔ انٹیلی جنس والوں کے پاس یہ تمام ثبوت موجود ہیں کہ تم یہاں منشیات سپلائی کرتے رہے ہو۔ شہزاد خان سے بھی ملنے جیل گئے تھے۔"

"سر! میں انکار نہیں کروں گا۔ آپ کی خفیہ ایجنسی والے میرے خلاف ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔"

"خفیہ ایجنسی کی بات نہ کرو۔ انیلا بانو کو تمہارے اس خفیہ دھندے کا علم ہو گیا تھا۔ تم نے اس کی زبان بند رکھنے کے لیے اسے قتل کرا دیا۔"

"سر! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ جبکہ آپ جانتے ہیں کہ اسے کس لیے قتل کیا.........."

"بکواس مت کرو۔ میں کیسے جان سکتا ہوں۔ جبکہ میں امریکا میں تھا۔"

"آپ اسی لئے امریکا چلے گئے تھے کہ........."

مشیر نے کہا۔ "خاموش رہو۔ یہ تمام باتیں عدالت میں کہو۔ کوئی تمہاری بات کا یقین نہیں کرے گا۔ تم نے ایک طرف نمک حرامی کی۔ اپنے مالک کی لاعلمی میں غیر قانونی دھندا کرتے رہے۔ پھر مالک کی پرسنل سیکریٹری کو بھی قتل کرا دیا۔"

ایک بونا شخص کمرے میں داخل ہوا۔ ایک پولیس افسر اس کے ساتھ تھا۔ اس نے کہا۔ "مسٹر نیک بخت! اس کمرے میں انیلا بانو سے تعلق رکھنے والوں کو آنے کی اجازت ہے مگر یہ شخص آپ سے ملنے کے لیے بضد ہے۔"

نیک بخت نے اس تین فٹ کے شخص سے پوچھا۔ "تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

وہ بولا۔ "یہ بتانے کے لیے کہ امیر حمزہ آ چکا ہے۔"

نیک بخت نے گھبرا کر مشیر کو دیکھا۔ پھر بونے سے پوچھا۔ "مسٹر حمزہ کہاں ہیں؟"

"پہلے آپ ان افسر صاحب کو رخصت کریں پھر مجھے بیٹھنے کی اجازت دیں۔ اس کے بعد باتیں ہوں گی۔"

نیک بخت نے پولیس افسر سے کہا۔ "آپ کا شکریہ۔ مجھے ان سے کچھ بات کرنی ہے۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

افسر چلا گیا۔ بونے نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "نیک بخت! آج ہم پہلی بار رُوبرو مل رہے ہیں۔ میرا نام امیر حمزہ ہے۔"
ب رانے میں
نیک بخت نے مصافحہ نہیں کیا۔ ناگواری سے بولا۔ یہ ہے کہ انہیں اکثر ان
تمہاری طرح ایک بالشت کا ہوتا تو اسے کوئی بھی جو تواداث حاصل کرنے کی تدابیر پیش
"تمہارے خفیہ ہاتھ کی ایجنسی والے گواہ ہونے والے ہیں۔"
پر پوچھ لو۔"
پڑ گئے ہو؟"
، والی بات نہیں سمجھائی۔ جب شاہد جبار

حوالات میں یہ کہہ چکا تھا کہ جس جیکی رالف کے ذریعے انیلا کو قتل کرانا چاہتا تھا' وہ دراصل جاسوس تھا تو پھر بھی تمہاری عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ جیکی رالف نے پہلی فرصت میں انیلا بانو کی حفاظت کے انتظامات کیے ہوں گے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی کمرے کا دروازہ کھلا۔ نیک بخت' مشیر احمد علی اور شاہد جبار ایک دم سے اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ کھلے ہوئے دروازے پر انیلا بانو کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے ایک عورت اور جیکی رالف بھی تھا۔ انٹیلی جنس کے دوسرے سراغ رساں ایک ایک کرکے اندر آرہے تھے۔

انیلا بانو نے شاہد جبار کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے قتل ہوتے دیکھا تھا۔ میں نے ٹائلٹ کے فرش پر دم توڑتے ہوئے کہا تھا' ایک عورت میرا پرس اور دس ہزار پاؤنڈ لے گئی ہے۔"

شاہد جبار نے کہا۔ "آں؟ ہاں۔ مگر نہ میں نے تمہیں قتل کرنے کی کوشش کی تھی نہ تمہارے دس ہزار پاؤنڈ لے گیا تھا۔"

انیلا کے پیچھے کھڑی ہوئی عورت نے آگے آکر ایک چاقو دکھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس چاقو سے انیلا کو قتل کیا تھا۔"

اس عورت نے وہ کھلا ہوا چاقو اپنے سینے میں گھونپ لیا چاقو کا لانبا پھل اس کے سینے کے اندر گیا لیکن دراصل وہ پھل چاقو کے کھوکھلے دستے کے اندر گیا تھا۔ اس عورت نے دستے کو سینے سے ہٹایا' پھل دستے کے اندر سے پھر باہر نکل آیا۔ وہ بولی۔ "ایسے چاقو تھیٹروں اور فلموں میں استعمال ہوتے ہیں۔ تم نے انیلا کو جس خون میں تربتر دیکھا تھا' وہ انسانی نہیں' ایک جانور کا تھا۔"

جیکی رالف نے شاہد جبار سے کہا۔ "تم نے مجھے انیلا کو قتل کرنے کی آفر دی۔ میں اسی دن تمہیں گرفتار کرا سکتا تھا لیکن اصل قاتل تک یا قتل کرانے والے تک پہنچنے کے لیے یہ ڈراما کرنا پڑا۔ کیا اب تم سچ بولو گے کہ انیلا بانو کو کون قتل کرانا چاہتا تھا۔"

شاہد جبار نے نیک بخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ انیلا بانو کی عزت سے کھیلنے کے بعد اس سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے اور یہ شادی کے لیے بضد تھیں۔ ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے مجھ سے کہا کہ یہ تین دنوں تک شادی کی بات ٹال دینے کے لیے ضروری کام کا بہانہ کرکے امریکا چلے جائیں گے۔ اس دوران میں انہیں قتل کرا دوں۔"

نیک بخت نے غصے سے کہا۔ "تم بکواس کر رہے ہو۔"

انیلا نے کہا۔ "اگر میں قتل ہو جاتی تو شاہد جبار کا بیان بکواس سمجھا جاتا۔ میں ایک قتل ہونے والی تمہارے خلاف گواہی دینے کے لیے زندہ رہ گئی ہوں۔ تم نے دوسری بار مجھ پر قاتلانہ حملہ کرایا۔ اللہ تعالیٰ مجھے طبعی عمر تک زندگی دے رہا ہے اس لیے تم اپنے مقصد میں ناکام ہوتے رہتے ہو۔"

نیک بخت نے کہا۔ "انیلا! تم غلط فہمیوں میں مبتلا ہو کر ان تمام محبتوں کو بھول رہی ہو جو میری ذات سے تمہیں ملتی رہی ہیں۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ امریکا سے واپس آتے ہی تم سے کورٹ میرج کروں گا اور اب بھی یہی کہتا ہوں۔ ہم کل ہی شادی کے لیے کورٹ میرج میں درخواست دیں گے۔"

"ہاں ایک ہفتے کے اندر تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہی ہوگی۔ میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔ مجھ پر دو بار قاتلانہ حملے ہوئے' اس سلسلے میں قانونی کارروائی نہیں کروں گی۔ یہ حمزہ صاحب کی پیش گوئی ہے کہ تم قانونی کارروائی سے بچ نکلو گے۔"

انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسر نے انیلا سے کہا۔ "مسٹر حمزہ نے ہم سے ایک گھنٹا پہلے کہا تھا کہ نیک بخت مکھن سے بال کی طرح نکل جائے گا اور ہم ان کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لے سکیں گے۔ آدھا گھنٹا پہلے امریکی اور برطانوی سفارتی سطح پر معاملات طے ہو چکے ہیں۔ مسٹر نیک بخت کے خلاف کوئی بھی قانونی کارروائی اس لیے نہیں ہوگی کہ انیلا بانو پر قاتلانہ حملے کے وقت وہ امریکا میں تھا۔ اگر انیلا بانو چاہیں تو پہلے قاتلانہ حملے کے سلسلے میں پاکستان جاکر قانونی چارہ جوئی کر سکتی ہیں۔"

"مجھ پر پاکستان میں جو حملہ ہوا' اس کا کوئی عینی شاہد نہیں ہے اور جب نیک بخت کتے کی موت مرے گا تو اس کا بھی کوئی عینی شاہد نہیں ہوگا۔ لہٰذا اسے بھی میری طرح طبعی عمر تک جینے کے لیے مجھ سے شادی کرنی ہوگی۔"

ایک صحت مند اور قد آور شخص انیلا کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ نیک بخت اسے توجہ سے دیکھنے لگا۔ جب وہ بولا تو نیک بخت سہم سا گیا کیونکہ وہ امیر حمزہ تھا۔ انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسر سے کہہ رہا تھا۔ "آپ نے اصلی مجرم تک پہنچنے کے لیے بڑی ذہانت سے یہ ڈراما پلے کیا تھا۔ آپ اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہے ہیں لیکن میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجرم اپنے انجام کو اس طرح نہیں پہنچے گا جس طرح ہم اسے پہنچانے والے ہیں۔"

اعلیٰ افسر نے کہا۔ "میں چاہوں گا کہ آئندہ یہاں انتقامی یا کسی بھی طرح کی غیر قانونی کارروائی نہ کی جائے۔"

امیر حمزہ نے کہا۔ "میں ہمیشہ قانون کی بالا دستی قائم رکھتا ہوں۔ میں نے پاکستان میں

بھی بڑے بڑے اختیارات کے حامل عہدیداران کو ہمیشہ یہ موقع دیا ہے کہ وہ خود اپنا محاسبہ کریں۔ ہم نیک بخت کو بھی اپنا محاسبہ کرنا سکھا دیں گے۔"

انیلا بانو نے اعلیٰ افسر سے کہا۔ "میں آپ کو تحریری بیان دے چکی ہوں کہ آئندہ مسٹر امیر حمزہ کے ساتھ یہاں محفوظ رہ سکوں گی۔ لہٰذا ہمیں جانے کی اجازت دیں۔"

امیر حمزہ نے اعلیٰ افسر اور دوسرے افسران سے مصافحہ کیا۔ پھر انیلا کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ ایک افسر نے آگے بڑھ کر شاہد جبار کو ہتھکڑی پہناتے ہوئے کہا۔ "انیلا مرڈر کیس تو سیاست کے کھاتے میں چلا گیا۔ تمہیں منشیات کا دھندا کرنے کے الزام میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔"

مرزا نیک بخت اور مشیر احمد علی کو جانے سے روکا نہیں گیا لیکن یہ بات دونوں کے دماغوں میں گونج رہی تھی کہ نیک بخت قانون کے شکنجے سے نکلنے کے بعد بھی محفوظ نہیں ہے۔ انیلا نے ایسی قوت حاصل کر لی تھی کہ نیک بخت کو مشکل ترین حالات سے بچانے والا خفیہ ہاتھ بھی اسے امیر حمزہ کے محاسبے سے نہیں بچا سکے گا۔

انیلا اور امیر حمزہ کار میں جا رہے تھے۔ انیلا ڈرائیو کر رہی تھی۔ امیر حمزہ عقب نما آئینے میں محتاط نظروں سے دیکھتا جا رہا تھا۔ انیلا نے پوچھا۔ "ابھی ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

اس نے کہا۔ "شاہراہوں کو چھوڑ کر چھوٹی سڑکوں پر چلتی رہو۔ ایسی سڑکوں پر تعاقب کرنے والے نظر آسکیں گے۔"

وہ اس کی ہدایت کے مطابق ایسی سڑکوں پر کار چلانے لگی، جہاں اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ وہ بولی۔ "آپ نے دوبار نیک بخت کے حملوں سے بچایا ہے۔ میری یہ نئی زندگی آپ کی مرہونِ منت ہے۔"

"میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا ہے۔ ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھے یوں بھی نیک بخت اور کاشف اکبر کا محاسبہ کرتے رہنا ہے۔"

"کیا اس طرح محاسبہ کرنے سے کچھ حاصل ہو رہا ہے؟"

"کچھ تو حاصل ہو رہا ہے۔ کاشف اکبر کو اقتدار سے محروم ہونا پڑا۔ سکھر میں رکن الدین کے ساتھ میں نے جو رویہ اختیار کیا تھا اس کے نتیجے میں وہ بری طرح دہشت زدہ ہو کر نیم پاگل ہو گیا ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا رہے گا تو انہیں رفتہ رفتہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ قانون کو کھلونا بنا کر کھیلتے ہیں۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح سزا پاتے ہیں۔"

"آپ بہت مصروف رہتے ہیں۔ پتا نہیں کب پاکستان چلے جائیں۔ پھر میرا کیا بنے

گا؟"

"اسے دباؤ میں رکھنے کے لیے میں نے مشورہ دیا ہے کہ اس سے شادی کر لو۔ جائز طور پر شریکِ حیات بن کر اسے اچھی طرح ہینڈل کر سکو گی۔"

اسی اثنا میں موبائل فون کا بزر بج اٹھا، امیر حمزہ نے موبائل فون کا ایک بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ "ہاں۔ میں بول رہا ہوں۔ کیا خیریت ہے؟"

"جی ہاں پہلے ایک گاڑی آپ کے تعاقب میں تھی۔ ہم نے سائلنسر لگے ہوئے ریوالور سے اس کے ایک پہیئے کو بیکار کر دیا ہے۔ ولنگٹن اسٹریٹ سے دس منٹ پہلے ایک کار نکلی تھی، وہ بڑی دیر سے آپ کے تعاقب میں ہے۔ میں اور دس منٹ تک تصدیق کروں گا۔ وہ بھی دشمن کی کار ہوئی تو اسے تعاقب کے قابل نہیں چھوڑا جائے گا۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ انیلا نے پوچھا۔ "کیا یہ نیک بخت کے آدمی ہوں گے؟"

"نیک بخت اور اس کے آدمی اتنے فاسٹ نہیں ہیں۔ یہ خفیہ ہاتھ کی ایجنسی والے ہیں۔"

"یہ سانپوں کی طرح اپنے بل سے نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، آج آپ کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔"

"میں ایک مدت کے بعد منظرِ عام پر آیا ہوں۔ ابھی کاشف اکبر کی ایجنسی والے بے خبر ہیں۔ ورنہ وہ بھی مجھ پر چڑھ دوڑتے۔"

پھر فون سے رابطہ کیا گیا۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔ "سر! ہم نے دوسری گاڑی کو بھی بیکار کر دیا ہے۔"

"شاباش! اب ہم ڈنر کے لیے شیرٹن جا رہے ہیں۔ وہاں میرے لیے دوسری کار پہنچا دیں۔ دشمنوں کو پتا نہیں چلے گا کہ میں نے گاڑی تبدیل کی ہے۔ اس کے بعد تم لوگ بھی جا کر آرام کرو۔ گاڑی تبدیل ہونے کے بعد میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر اپنے بنگلے میں پہنچ جاؤں گا۔"

اس نے فون بند کیا۔ وہ بیس منٹ کے بعد ہوٹل شیرٹن کے احاطے میں پہنچ گئے۔ ایک جگہ کار پارک کر کے وہ ہوٹل کے اندر آئے۔ ڈائننگ ہال میں کئی عورتیں، مرد، بچے اور بوڑھے مختلف میزوں پر تھے۔ کئی میزیں خالی بھی تھیں۔ وہ دونوں ایک میز کے اطراف میں آ کر بیٹھ گئے۔ ایک ویٹر نے انہیں کھانے کا مینو لا کر دیا۔ انیلا نے پوچھا۔ "حمزہ صاحب! آپ کیا پسند کریں گے؟"

"میں بہت کم کھاؤں گا۔ تم کچھ بھی منگوا لو۔ ویسے تمہارے کھانوں کا انتخاب اچھا

ہے۔ آج تمہاری پسند کا لنچ بھی بہت اچھا تھا۔“

انیلا نے کھانے کا آرڈر دیا پھر ویٹر کے جانے کے بعد کہا۔ ”کیا میں ذاتی سا سوال کروں؟“

”کیا پوچھنا چاہتی ہو؟“

”کیا آپ تنہا زندگی گزار رہے ہیں؟ یا کہیں بیوی بچے ہیں؟“

”میں بالکل تنہا ہوں۔ زندگی میں ایک لڑکی پسند آئی تھی۔ وہ بھی میری شریکِ حیات بننا چاہتی تھی۔ ان ہی دنوں میں افغانستان گیا۔ خفیہ ہاتھ کی ایجنسی والے میری جان کے دشمن بن گئے۔ ان کے آلۂ کار نے رات کی تاریکی میں کسی اور کو ہلاک کر کے اسے پہاڑ کی بلندی سے پستی کی طرف پھینک دیا۔ مجھے کچھ عرصے روپوش رہنا پڑا تاکہ دشمنوں کو میری موت کا یقین آجائے۔“

”پھر تو آپ پاکستان واپس آئے ہوں گے اور اپنی پسند کی شادی کی ہوگی؟“

”نہیں۔ جس سے میں شادی کرنا چاہتا تھا‘ اس نے مجھے مُردہ سمجھ کر دوسرے سے شادی کر لی۔“

”دنیا میں ایک لڑکی تو نہیں ہے؟“

”انیلا! میری موجودہ زندگی میں کسی بیوی بچے کی گنجائش نہیں ہے۔ ابھی تمہارے ساتھ ہوں۔ کل صبح اپنے بستر پر مُردہ پایا جا سکتا ہوں۔ میں ہمیشہ دشمنوں پر غالب نہیں آسکتا۔ کبھی دشمن بھی غالب آسکتے ہیں۔ پھر میں کسی کو آج بیوی بنا کر کل اسے بیوہ کیوں بناؤں۔“

”اگر کوئی آپ کی شخصیت سے متاثر ہو کر بیوگی کی پروا نہ کرے۔ آپ کے ساتھ جتنی زندگی ملے‘ اسے گزارنا چاہے تو؟“

”تو میں سختی سے انکار کر دوں گا۔ میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔“

”اگر کوئی گرل فرینڈ بن کر رہنا چاہے تو؟“

”میری خفیہ رہائش گاہ کا علم کسی کو نہیں ہوتا۔ کسی کو گرل فرینڈ بنانے کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ میری رہائش گاہ سے واقف ہو جائے گی اور میں کسی کی رہائش گاہ میں جا کر وقت نہیں گزارتا۔“

”لیکن آج آپ نے کہا ہے کہ ہمارے لیے ایک بنگلے کا انتظام ہو چکا ہے۔“

”تم نے پولیس والوں کو تحریری بیان دیا ہے کہ میرے ساتھ محفوظ رہو گی۔ اس لیے میں نے ان کے سامنے یہی کہا ہے کہ ہمارے لیے ایک بنگلے کا انتظام ہو چکا ہے۔

ورنہ وہ بنگلا صرف تمہارے لیے ہے۔ میں تمہیں وہاں پہنچا کر اپنی خفیہ رہائش گاہ میں چلا جاؤں گا۔“

انیلا کچھ مایوس ہو گئی۔ ویٹر میز پر کھانے کی ڈشیں لا کر رکھنے لگا۔ انیلا کے ٹھیک پیچھے والی میز پر میں مراد چنگیزی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ چنگیزی اور انیلا کی پشت ایک دوسرے کی طرف تھی۔ ان کرسیوں کے درمیان اتنا کم فاصلہ تھا کہ چنگیزی بہ آسانی ان کی گفتگو سن سکتا تھا۔ امیر حمزہ میز کی دوسری طرف تھا۔ اس کی گفتگو صاف طور سے سنائی نہیں دی۔ پھر بھی اس کے منہ سے افغانستان کا ذکر سن کر چنگیزی کو یقین ہو گیا کہ وہی کیپٹن امیر حمزہ ہے۔

چنگیزی نے میری طرف جھک کر دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”آپ نے پاکستان میں امیر حمزہ کے متعلق اخبارات میں پڑھا ہو گا یا کچھ سنا ہو گا؟“

میں نے کہا۔ ”اخباروں میں پڑھا ہے۔ کچھ اخبارات اسے ملک دشمن اور دہشت گرد کہتے ہیں اور کچھ اخبارات لکھتے ہیں کہ وہ محب وطن ہے اور کرپٹ سیاست دانوں اور بیوروکریٹس کا محاسبہ کرتا ہے۔“

چنگیزی نے کہا۔ ”آپ ذرا دھیمی آواز میں بولیں۔ میرے پیچھے جو عورت ہے‘ ٹھیک اس کے سامنے جو شخص بیٹھا ہے‘ وہی امیر حمزہ ہے۔ پلیز اسے چونک کر نہ دیکھنا۔ وہ بہت چالاک اور محتاط شخص ہے۔ آپ کی نظروں کو تاڑ لے گا۔“

میں نے ادھر دیکھا۔ اگر وہ انیلا سے باتیں کر رہا ہوتا تو میں نظریں جھکا لیتا لیکن وہ ایک کے بعد دوسری ڈش اٹھا کر اپنی پلیٹ میں کھانے کے لیے کچھ لے رہا تھا۔ اس وقت اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ میں بڑی تفصیل سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھنے والے کہتے تھے کہ میں ایک لوہار کا پوتا ہوں۔ میرا چہرہ اور میرا جسم ایسا سخت ہے جیسے لوہا آگ میں تپ کر نکلا ہو۔ امیر حمزہ کا چہرہ زندگی کی آگ میں سلگتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ میری طرح صحت مند اور قد آور تھا۔ ہماری عمروں میں بڑا فرق تھا۔ وہ مجھ سے کم از کم دس سال بڑا ہو گا۔

چنگیزی نے پھر میری طرف جھک کر دھیمی آواز میں کہا۔ ”سر! آپ اسے مسلسل دیکھ رہے ہیں‘ گڑبڑ ہو جائے گی۔ میرا مشورہ ہے کہ ہم چھپ کر اس کی رہائش گاہ کا پتا چلائیں اور اس کی مصروفیات پر نظر رکھیں۔“

میں نے کہا۔ ”چنگیزی! میں یہاں امی کے دشمن گاڈ فادر شمشیر سنگھ کالیا عرف ڈینجرس مین کو تلاش کرنے آیا ہوں۔“

"سر! بعض اوقات کئی محاذوں پر بیک وقت جنگ لڑنی پڑتی ہے۔ کیا آپ نے صبح کے اخبار میں یہ نہیں پڑھا تھا کہ ایک پاکستانی خاتون انیلا بانو کو قتل کر دیا گیا ہے اور اسے قتل کرنے والی ایک عورت کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

"ہاں میں نے پڑھا تھا پھر؟"

"پھر یہ کہ جو انیلا بانو قتل ہو چکی ہے' وہ زندہ ہے اور میرے پیچھے بیٹھی ہوئی ہے۔"

"کیا؟" میں نے حیرانی سے چونک کر انیلا کی طرف دیکھا۔

چنگیزی نے جلدی سے ایک ڈش اٹھا کر میرے چہرے کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "سر! اسے تو آپ نے چکھا ہی نہیں ہے۔ بہت لذیذ ہے۔" پھر اس نے میری طرف جھک کر ڈش میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "فار گاڈ سیک! یوں چونک کر نہ دیکھیں۔ ویسے بھی اس کا چہرہ نظر نہیں آئے گا۔ اس کی پشت آپ کی طرف ہے۔"

"تم نے تو میرے اندر تجسس پیدا کر دیا ہے۔ جو مر چکی ہے' وہ اسپتال کے مردہ خانے سے یہاں کیسے آ گئی - یہ امیر حمزہ زبردست فراڈ ہے۔ اسے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ لندن کے لاکھوں افراد نے اخباروں میں مقتولہ انیلا بانو کی تصویر دیکھی ہو گی۔ وہ اسے یہاں پہچان سکتے ہیں؟"

"ہاں امیر حمزہ بے خوف و خطر اسے یہاں لے آیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے قتل ہونے والی غلط خبر شائع کی گئی ہو۔ پاکستان کے معروف سیاست داں مرزا نیک بخت سے انیلا بانو کے اسکینڈل شائع ہوتے رہتے ہیں۔ امیر حمزہ اس سیاست داں کا محاسبہ کرتا آ رہا ہے۔ پھر اس کی محبوبہ کو کس مقصد کے لیے ساتھ لیے پھر رہا ہے؟"

میں نے کہا۔ "سوال پر سوال اور تجسس پر تجسس پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ کسی نے بھی مدتوں سے امیر حمزہ کو نہیں دیکھا ہے۔ آج ہم اتفاق سے اسے دیکھ رہے ہیں۔ میں تو اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ یہ ضرور معلوم کروں گا کہ یہ کہاں چھپ کر رہتا ہے۔"

"پلیز سر! اس کے پیچھے آپ نہیں' میں جاؤں گا۔ آپ لندن میں بالکل نئے ہیں۔ بھٹک جائیں گے۔"

"صرف تم امیر حمزہ کے پیچھے کیوں جاؤ گے؟ کیا میں ساتھ نہیں چل سکتا؟"

"امیر حمزہ نے انیلا کے لیے کسی دوسرے بنگلے کا انتظام کیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے ایسا کیوں کیا؟ وہ تو اسے بنگلے میں چھوڑ کر اپنے خفیہ اڈے پر جائے گا۔ آپ انیلا کے

بنگلے میں جائیں گے اور وہاں چھپ کر رہیں گے۔ ہو سکتا ہے وہاں مرزا نیک بخت آئے۔ ہو سکتا ہے' انیلا امیر حمزہ اور نیک بخت سے مل کر ڈبل گیم کھیل رہی ہو۔ یا کسی طرح خفیہ سمجھوتا ان کے درمیان کرا رہی ہو۔"

میں نے ویٹر کو بل لانے کے لیے کہا۔ وہ چلا گیا۔ چنگیزی نے کہا۔ "آپ کے لباس کے اندر اندرون شہر کا نقشہ ہے اور ضروری ٹیلی فون نمبرز ہیں۔ خاص طور پر دو نمبرز ہیں' جنہیں ڈائل کر کے بھٹکنے والا صحیح راہنمائی حاصل کر لیتا ہے۔ پھر ہم دونوں کے پاس موبائل فون ہیں۔ کوئی بھی مسئلہ پیش آئے تو آپ فوراً مجھے کال کریں۔"

ہم بل ادا کر کے وہاں سے اٹھ گئے۔ اس وقت امیر حمزہ موبائل فون پر کہہ رہا تھا۔ "اچھا کار آ گئی ہے۔ اس کی نمبر پلیٹ بتاؤ۔"

پھر وہ دوسری طرف سے کچھ سننے لگا۔ میں وہاں سے گزرتا ہوا' چور نظروں سے انیلا کو دیکھتا ہوا چنگیزی کے ساتھ ہوٹل سے باہر آیا۔ پارکنگ کی ایک قطار میں ہماری ایک رینٹڈ کار تھی۔ چنگیزی نے کہا۔ "پتا نہیں ان کی کار ہم سے کتنی دور ہے۔ میں نے فون پر یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ان کی کار ابھی آئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "کار ابھی آئی ہے تو اندر کاروں کی بھیڑ میں نہیں ہو گی سامنے کہیں ہو سکتی ہے۔"

ہم اپنی کار میں آ کر بیٹھ گئے۔ میرے کوٹ کے اندر بغلی ہولسٹر میں ایک ریوالور تھا۔ اور کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک سائلنسر اور ایک اسپرے کرنے والا چھوٹا سا کین تھا۔ اس میں ایسی دوا تھی جسے اسپرے کر کے کسی بھی مخالف کو بے ہوش کیا جا سکتا تھا۔

ہمیں تقریباً آدھے گھنٹے تک انتظار کرنا پڑا۔ پھر وہ دونوں ہوٹل سے باہر آتے ہوئے دکھائی دیے۔ انہیں دیکھتے ہی چنگیزی نے کار اسٹارٹ کی۔ ان کی کار پارکنگ ایریا کے بالکل قریب تھی۔ وہ اس کا دروازہ کھول کر بیٹھ رہے تھے۔ ہم نے اس کی پلیٹ پر لکھے ہوئے نمبروں کو یاد کر لیا چنگیزی نے اپنی کار آہستہ آہستہ آگے بڑھائی۔ اگلی کار بھی ہوٹل کے احاطے سے باہر نکل رہی تھی۔ چنگیزی بڑا تجربہ کار بندہ تھا۔ مین روڈ پر آنے کے بعد چند کاروں کے پیچھے رہ کر ان کا تعاقب کر رہا تھا تاکہ ہماری کار امیر حمزہ کی نظروں میں نہ آئے۔

تقریباً ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد اگلی کار ایک بنگلے کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ میں نے کہا۔ "شاید انیلا اسی بنگلے میں رہے گی۔"

چنگیزی نے اپنی کار کو اگلی گلی میں موڑ کر ہیڈ لائٹس بجھا دیں۔ میں نے کار سے اتر

کر کہا۔ "اگر مجھ سے رابطہ نہ ہو تو سمجھ لینا' میں نے کسی وجہ سے فون بند رکھا ہے۔ صبح تک اپنے کاٹیج میں ملاقات ہوگی۔"

امیر حمزہ کی کار احاطے سے باہر نکل رہی تھی۔ جب وہ ایک طرف مڑ کر جانے لگی تو چنگیزی بھی کار آگے بڑھاتے ہوئے اس کے تعاقب میں جانے لگا۔ میں پیدل چلتا ہوا اس بنگلے کے قریب پہنچا تو ایک مسلح گارڈ آہنی گیٹ کو لاک کر رہا تھا۔ میں دبے قدموں گیٹ کے ساتھ بنے ہوئے کیبن کے پیچھے آیا۔ وہ گیٹ کو لاک کرنے کے بعد کیبن میں آنے لگا تو میں نے اچانک کیبن کے پیچھے سے نکل کر ایک گھونسا اس کے منہ پر مارا۔ جب میں گرم لوہے پر ضرب لگاتا تھا تو دادا جان کہا کرتے تھے' میرے ہاتھ ہتھوڑا ہیں۔ اب میری عملی زندگی میں یہ ثابت ہو رہا تھا۔ ایک ہی گھونسے سے وہ چکرا کر گر پڑا۔ اس کے ہونٹ ایسے پھٹ گئے تھے جیسے آہنی سلاخ سے ضرب لگائی گئی ہو۔ شاید اس کے دانت بھی ٹوٹ گئے تھے۔ منہ سے خون ابل رہا تھا۔ میں نے گردن دبوچ کر پوچھا۔ "اندر کتنے گارڈز اور ملازم ہیں؟"

وہ تکلیف کے باعث بول نہیں پا رہا تھا مگر اپنی گردن بھی چھڑانا چاہتا تھا اس نے انگلیوں کے اشارے سے بتایا کہ ایک وہ ہے۔ دوسرا اندر ہے۔ میں نے اسپرے کین نکال کر اپنی سانس روک کر ایک ذرا سی دوا اسپرے کی' وہ چند سیکنڈ میں بے ہوش ہو گیا۔ اب وہ صبح سے پہلے بیدار ہونے والا نہیں تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر کیبن کے بیڈ پر لٹا کر کمبل ڈال دیا۔ پھر اس کی جیب سے چابیاں نکال کر آہنی گیٹ کو کھولا اور بڑے اعتماد سے چلتے ہوئے احاطے سے گزرنے لگا۔ بنگلے کے بیرونی دروازے پر کھڑے ہوئے مسلح گارڈ نے کہا۔ "ہالٹ۔ کون ہے؟"

میں نے اس کے قریب جاتے ہوئے کہا۔ "کیپٹن صاحب نے بھیجا ہے۔"

پھر اسپرے کین دکھاتے ہوئے بولا۔ "میڈم صاحب اسپرے بھول گئی تھیں۔"

مسلح گارڈ نے اسے لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے سانس روک کر دوا اسپرے کی۔ ایسی زود اثر دوا تھی کہ اسے اپنی گن سیدھی کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ گرنے ہی والا تھا کہ میں اسے سنبھال کر کھینچتا ہوا بیرونی دروازے کے پاس لے آیا۔ اسے کھول کر اندر آیا۔ وہ کمرا نائٹ گارڈ کے لیے تھا۔ ایک بستر بچھا ہوا تھا۔ میں نے اس گارڈ کو بھی بستر پر لٹا کر اس پر کمبل ڈال دیا۔ پھر اس کمرے کے دوسرے دروازے کو کھول کر بنگلے کے اندر آ گیا۔

وہ ایک بڑا سا ڈرائنگ روم تھا۔ میں نے دبے قدموں چلتے ہوئے دوسرے کمرے

کے دروازے کو کھولا۔ وہ بیڈ روم تھا۔ ایک بڑے سے آرام دہ بستر پر وہ لباس پڑا ہوا تھا' جسے انیلا ہوٹل میں پہنے ہوئے تھی۔ باتھ روم کا دروازہ ایک ذرا سا کھلا ہوا تھا اور شاور سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی بھاپ دروازے سے باہر آ رہی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ گرم پانی سے غسل کر رہی تھی۔

بستر پر پڑا ہوا لباس بتا رہا تھا کہ وہ کمرے میں سے بے لباس ہو کر باتھ روم گئی ہے اور کسی وقت بھی اسی حالت میں واپس آ سکتی ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر چھپنے کی جگہ تلاش کی پھر قالین پر لیٹ کر لڑھکتا ہوا پلنگ کے نیچے چلا گیا۔

اپنے بارے میں یہ بتا دوں کہ میری زندگی میں اب تک کوئی لڑکی نہیں آئی۔ شاید اس لیے کہ میں لڑکیوں سے دور بھاگتا تھا۔ بڑی عمر کی عورتوں سے بھی گفتگو کرتے وقت نظریں جھکائے رکھتا تھا میرے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ انیلا کے مکان میں جاسوسی کے لیے آؤں گا تو ان حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایسے معاملات میں لڑکیاں شرما کر چھپتی ہیں لیکن میں شرما کر اور گھبرا کر پلنگ کے نیچے چھپ گیا تھا۔

شاور کی آواز بند ہو گئی۔ اس کے گنگنانے کی آواز ابھرنے لگی۔ بہت دھیمی آواز تھی مگر بڑی مترنم تھی۔ باتھ روم کا دروازہ پوری طرح کھل گیا۔ اس کا خوب صورت جسم' میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس کا بھی قصور نہیں تھا۔ وہ خود کو اس مکان میں تنہا سمجھ رہی تھی۔ میں نے وارڈ روب کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنی۔ تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ لباس پہن چکی تھی۔ لندن کی سردی سے محفوظ رہنے کے لیے پیروں میں لیگن پہن لیے تھے۔ پھر وہ بستر کے اوپر آ گئی۔ ہر بات الٹی ہو رہی تھی۔ عورت کو شرمانا چاہیے میں شرما رہا تھا۔

اوپر سے اس کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو۔ میری آواز کو پہچان رہے ہو؟ اتنی بڑی دنیا میں ایک میں ہی ہوں جو تمہاری نیندیں حرام کر سکتی ہے۔"

چند لمحوں تک خاموشی رہی پھر وہ ہنس کر بولی۔ "اچھا' تم بھی جاگ رہے ہو۔ ظاہر ہے پریشانیاں سونے نہیں دیتیں۔ تمہارے والدین نے تمہارا نام نیک بخت رکھا تھا مگر تم بڑے بدبخت ثابت ہو رہے ہو۔"

وہ دوسری طرف کی بات سن کر بولی۔ "میں تو صرف طعنے دے رہی ہوں۔ تم تو موت دے رہے تھے۔ کیا خیال ہے۔ کورٹ میرج کے بعد پھر مجھ پر قاتلانہ حملہ کراؤ گے؟"

وہ پھر چپ ہوئی۔ دوسری طرف کی بات سن کر بولی۔ "دین اور دنیا کی تمام قسمیں کھالو۔ پھر بھی میں تم پر بھروسا نہیں کروں گی۔ اپنا وہ کاٹیج جلد سے جلد میرے نام کرو۔ میں ماہانہ دس ہزار پاؤنڈ لوں گی اور یہ معاہدہ ہو گا کہ تمہارے بعد تمہاری دولت اور جائیداد کی آدھی حق دار رہوں گی۔"

وہ تھوڑی دیر تک سنتی رہی پھر بولی۔ "تم تمام شرائط تسلیم کرنے اور معاہدہ کرنے کے بعد ہی یہاں سے جاسکو گے۔ ورنہ حمزہ صاحب یہاں سے تمہاری لاش بھیجیں گے۔"

نیک بخت اسے پھر کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا وہ بولی۔ "میں کبھی تم سے تنہائی میں بات کرنے یا سمجھوتا کرنے نہیں آؤں گی۔ حتیٰ کہ کورٹ میرج کے بعد تمہارے ساتھ سہاگ رات بھی نہیں مناؤں گی۔ میری زندگی کی ایک رات بھی تمہارے لیے نہیں ہو گی۔ میں تو پاکستان سے لندن تک تمہاری داشتہ کے طور پر بدنام ہو چکی ہوں تو پھر بدنامی ہی سہی۔ میں بچوں کی ماں بنوں گی۔ کورٹ میرج کے بعد تمہاری بیوی رہوں گی تو تم ہی ان بچوں کے باپ کہلاؤ گے۔ اگر مجھے قتل کرنے سے تمہیں پھانسی کی سزا ہوتی تو وہ کم ہوتی۔ سزا تو یہ ہو گی کہ بچے کسی کے ہوں گے اور باپ تم کہلاؤ گے اور اپنی دولت جائیداد میں سے آدھا حصہ ان بچوں کو دینے پر مجبور ہو جاؤ گے۔"

وہ پھر ایک ذرا وقفے سے بولی۔ "ہاں ہے۔ اس وقت بھی میرے کمرے میں میرا ایک یار ہے۔ تم جو بھی سمجھ لو۔ اس یار کا کوئی بھی نام ہو سکتا ہے۔ میں یہاں اس کے ساتھ خوشبوؤں کی سیج پر رہوں۔ تم کانٹوں کے بستر پر کروٹیں بدلتے رہو۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔ اس نے فون بند کر دیا تھا۔ میں اس کی باتیں سننے کے بعد سمجھ رہا تھا کہ نیک بخت اسے قتل کرانا چاہتا تھا مگر ناکام رہا۔ اب انیلا کے حقوق دلانے کے لیے امیر حمزہ نیک بخت کے سر پر سوار ہو گیا تھا۔

میں نے سنا تھا کہ نیک بخت بڑے وسیع ذرائع کا مالک ہے۔ صرف کاشف اکبر سے برابری ہے۔ ورنہ وہ بڑی سے بڑی شخصیت کو چیونٹی کی طرح دو انگلیوں میں مسل سکتا ہے۔ لیکن امریکا تک اپنا اثر و رسوخ رکھنے والا ایک امیر حمزہ سے خوف زدہ تھا۔

اور یہ خوف محض اس لیے تھا کہ امیر حمزہ ایک آسیب بنا ہوا تھا۔ کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اندھیرے سے چلنے والا تیر کسی بھی وقت نیک بخت کے سینے میں اتر سکتا تھا۔ ورنہ عالمی سطح کے خطرناک قاتلوں اور خفیہ ایجنسی کے سراغ رسانوں کے لیے امیر حمزہ کو ہلاک کر دینا مشکل نہ تھا۔ وہ صرف آنکھ مچولی کھیلنے کے باعث بڑے بڑے مکار قاتلوں سے بچا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد پھر انیلا کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو حمزہ صاحب! میں بول رہی ہوں۔ آپ تھکے ہوئے ہوں گے، شاید سونے جا رہے ہوں گے۔"

امیر حمزہ نے کچھ کہا۔ وہ بولی۔ "آپ عظیم انسان ہیں۔ خدا گواہ ہے۔ میں زندگی میں کبھی کسی سے اتنی متاثر نہیں ہوئی جتنی آپ سے ہوں۔"

اس نے پھر چپ ہو کر کچھ سنا، اس کے بعد پوچھا۔ "ایک بات بتائیں، کیا میں خوب صورت نہیں ہوں۔ اگر ہوں تو کیا مجھ میں کشش نہیں ہے؟"

وہ چند لمحوں کے بعد خوش ہو کر بولی۔ "شکریہ! آپ نے چند الفاظ میں میری جو تعریف کی ہے، وہ میرے دل پر نقش ہو گئی ہے۔ آپ سچے اور کھرے ہیں۔ ایک بات دل کی سچائی سے بولیں، کیا آپ مجھ میں کشش محسوس کرتے ہیں؟"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر اس نے پوچھا۔ "آپ خاموش کیوں ہو گئے۔ میں اپنی جان کی قسم دیتی ہوں مجھ سے دل کی بات نہ چھپائیں اور آپ کے کچھ کہنے سے پہلے میں یہ کہہ دیتی ہوں کہ نیک بخت سے کورٹ میرج پر لعنت بھیج کر آپ کی بیوی اور کل آپ کی بیوہ بن سکتی ہوں۔ آپ نے یہی کہا تھا نا کہ جس طرح آپ جہاد کر رہے ہیں، آپ کو کسی دن کسی وقت بھی شہادت نصیب ہو سکتی ہے تو میں ایک شہید کی بیوہ کہلانے پر فخر محسوس کروں گی۔"

وہ پھر چپ ہو گئی۔ امیر حمزہ کی باتیں سننے لگی۔ میں نیچے لیٹا ہوا محسوس کر رہا تھا کہ پلنگ ہل رہا ہے۔ وہ خوش ہو کر ادھر سے اُدھر کروٹیں بدلتی جا رہی تھی۔ کبھی ہنس رہی تھی اور کبھی "آئی لو یو" کہہ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ "یا خدایا! آج تک میں نے جتنی مصیبتیں اٹھائیں، ان کے عوض مجھے بہت بڑا انعام مل رہا ہے۔ آپ میرے ہوں گے تو ساری دنیا میری ہو گی۔ میں آپ کو اتنی خوشیاں دوں گی، اتنی خوشیاں دوں گی کہ آپ ہمیشہ تازہ دم ہو کر دشمنوں کو منہ توڑ جواب دیتے رہیں گے۔"

وہ بڑی دیر تک بولتی رہی اور امیر حمزہ کی باتیں سنتی رہی۔ میں اس کی باتیں سن رہا تھا۔ رومانی گفتگو اور رومانی انداز ایسے دلچسپ ہوتے ہیں، مجھے یہ پہلی بار معلوم ہو رہا تھا۔ میں پانچ برس کی عمر سے اکیس برس کی عمر تک بڑے بڑے وزنی ہتھوڑے چلاتا رہا۔ لوہے کو لوہے سے کاٹتا رہا۔ لوہے کی سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے موڑتا رہا۔ ایسی محنت اور ماحول میں رومانس کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک بار ایک حسین لڑکی مجھے دیکھنے میں اچھی لگی۔ میرے دل نے کہا۔ اگر میں اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر مروڑ دوں تو دو ٹکڑے ہو جائے گی۔

دیکھا جائے تو ہزاروں گلاب کی خوب صورتی کو شاخ سے نوچ کر خوشبو سونگھتے ہیں۔ پھر گلاب کی ایک ایک پتی نوچ کر پھینک دیتے ہیں۔ اس طرح ایک حسین دوشیزہ کو بیاہ کر لاتے ہیں پھر دو چار بچوں کے بعد اسے ہڈیوں کا ڈھانچا بنا کر بیزار ہونے لگتے ہیں۔ میری سمجھ میں یہی آتا تھا کہ دنیا کا ہر شخص حسنِ خوباں کے ساتھ لوہاروں جیسا سلوک کرتا ہے۔

اس وقت پلنگ کے نیچے لیٹا ہوا میں انیلا کی رومانی گفتگو سن کر عجیب احساسات سے دوچار ہو رہا تھا۔ اس دنیا کے ہر حسن کو اس لیے فنا ہونا چاہیے کہ گلاب کے حسن کو نچوڑ کر اس کی عرقیاتی خوشبو محفوظ کر لی جاتی ہے اور ایک حسین دوشیزہ اپنے حسن کو اپنے محبوب کی تحویل میں دے کر آئندہ کے لیے حسین نسل پیدا کرتی ہے اور ایسا کرنے کے لیے ہر مرد عارضی طور پر لوہار بن جاتا ہے۔

سوچتے سوچتے خاموشی کا احساس ہوا۔ پتا نہ چلا کہ فون کا رابطہ کب ختم ہوا اور وہ کب سے خاموش بستر پر پڑی ہوگی۔ اتنا تو سمجھ رہا تھا کہ وہ جاگ رہی ہوگی۔ توقعات سے زیادہ مسرتیں ملنے لگتی ہیں تو آنکھوں سے نیند اُڑ جاتی ہے۔

میں یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ انیلا اخباری رپورٹ کے مطابق قتل کر دی گئی تھی۔ پھر وہ زندہ ہو کر امیر حمزہ کے ساتھ کیسے دکھائی دے رہی تھی۔ اس میں کیا راز ہے کہ نیک بخت کے ساتھ انیلا کا اسکینڈل اخبارات میں شائع ہوتا رہا؟ اسکینڈل کے مطابق اسے نیک بخت کے ساتھ ہونا چاہیے تھا؟

ایسے کئی سوالات ذہن میں تھے۔ وہاں چھپ کر باتیں سننے سے بہت سے سوالوں کے جواب مل گئے۔

پہلی بات یہ معلوم ہوئی کہ انیلا کے ساتھ زیادتی ہوتی رہی۔ نیک بخت اس پر قاتلانہ حملے کراتا رہا اور امیر حمزہ اس کی حفاظت کرتا رہا۔ انیلا نے پہلے فیصلہ کیا تھا کہ نیک بخت سے انتقام لینے کے لیے اس سے کورٹ میرج کرے گی۔ اس کی آدھی دولت اور جائیداد حاصل کرے گی لیکن وہ ایک شریف عورت کی طرح محبت کی بھوکی تھی۔ جب اسے امیر حمزہ کی محبت مل رہی تھی تو وہ نیک بخت کو اور اس کی آدھی دولت اور جائیداد کو ٹھکرانے پر آمادہ ہو گئی تھی۔

میں یک بیک خیالات سے چونک گیا۔ اوپر لیٹی ہوئی انیلا کے حلق سے بھی چیخ نکل گئی۔ بیڈ روم کے دروازے کو لات مار کر زور دار آواز کے ساتھ کھولا گیا تھا۔ تین گن مین دندناتے ہوئے اندر آئے۔ ایک نے للکار کر کہا۔ "تمہارے منہ سے دوسری چیخ نکلے

گی تو ہم وارننگ دیئے بغیر گولی مار دیں گے۔"

میں نیچے لیٹا ہوا آنے والوں کی ٹانگیں گن رہا تھا۔ چھ ٹانگیں تھیں۔ انیلا سہم کر پوچھ رہی تھی۔ "تم؟ تم لوگ کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟"

ایک شخص نے کہا۔ "ہمیں وہ تحریری معاہدہ چاہیے جو نیک بخت اور خفیہ ہاتھ کے درمیان پاکستان میں ہوا تھا۔"

وہ بولی۔ "نیک بخت جانتا ہے کہ میں نے وہ معاہدہ امیر حمزہ کو دے دیا تھا۔"

"ہم بھی جانتے ہیں کہ وہ امیر حمزہ کے پاس تھا لیکن امیر حمزہ خفیہ ہاتھ سے ایک سمجھوتہ کرنے والا تھا۔ خفیہ ہاتھ کی شرط تھی کہ وہ معاہدہ لے کر لندن آئے پھر سارے معاملات طے ہو جائیں گے۔"

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتی۔"

"جانتی ہو کہ امیر حمزہ یہاں کیسے پہنچتے ہی تمہارے نام نہاد مرڈر کیس میں الجھ گیا تھا۔ مگر تمہیں اپنے دوسرے معاملات بھی بتاتا رہا۔"

"تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"امیر حمزہ دوہری چال چل رہا ہے۔ اس نے ایک طرف خفیہ ہاتھ سے سمجھوتے کی بات کی ہے۔ دوسری طرف اس نے اس کی خفیہ ایجنسی کے اہم کارندوں کو اسپتال میں گرفتار کروا دیا اور مطمئن ہو گیا کہ اب خفیہ ایجنسی والے اس کے تعاقب میں نہیں رہیں گے۔ وہ تمہارے ساتھ آزادی سے ہوٹل شیرٹن گیا۔ پھر تمہیں بنگلے میں چھوڑتا ہوا اپنے کسی خفیہ اڈے کی طرف چلا گیا۔ اس کا تعاقب کرنے کے دوران میں اس کے جانبازوں نے ہماری دو کاروں کے پہیے بیکار کر دیئے مگر ہم قبر تک پیچھا چھوڑنے والوں میں سے نہیں ہیں۔"

دوسرے شخص نے کہا۔ "ہوٹل شیرٹن میں تم لوگوں کے لیے جو رینٹڈ کار لائی گئی تھی' اس میں ہمارے ایک آدمی نے ڈیکٹو مائیک لگا دیا تھا۔ تم اور حمزہ کار میں جو باتیں کرتے رہے' اسے ہم سنتے رہے۔ اس بنگلے کے احاطے میں پہنچ کر امیر حمزہ نے تم سے کہا۔ "یہ بہت اہم لفافہ ہے۔ اسے حفاظت سے رکھو۔" تم نے پوچھا۔ "یہ لفافہ بہت بڑا اور بھاری ہے اس میں کیا ہے؟" اس نے تمہیں صاف لفظوں میں کہا تھا کہ اس لفافے میں وہی خفیہ ہاتھ اور نیک بخت کا کیا ہوا معاہدہ اور اس کی چند فوٹو اسٹیٹ کاپیاں ہیں چونکہ لندن میں امیر حمزہ کا کوئی بہت ہی محفوظ اڈا نہیں اس لیے وہ لفافے کو تمہارے پاس چھوڑ گیا ہے۔"

ایک اور شخص نے کہا۔ "فوراً اٹھو اور وہ لفافہ ہمارے حوالے کر دو۔ اس طرح تمہیں پھر ایک بار نئی زندگی ملے گی۔ ورنہ ہم تمہیں گولی مار کر پورے بنگلے کی تلاشی لے کر اس لفافے کو حاصل کر سکتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "آج کی رات میری زندگی کی سب سے اہم رات ہے۔ آج سے مجھے ایک سچے انسان کی سچی محبت مل رہی ہے۔ اس کا دیا ہوا لفافہ میری جان سے بڑھ کر ہے۔ میں مر جاؤں گی مگر اس کی امانت کسی کے حوالے نہیں کروں گی۔ میری موت کے بعد بھی وہ لفافہ تم یہاں سے نہیں لے جا سکو گے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے امیر حمزہ کو فون پر مخصوص لاک نمبرز بتائے ہیں۔ وہ آہنی تجوری اتنی مضبوط ہے کہ نہ اسے توڑ سکو گے اور نہ دیوار سے اکھاڑ کر اسے لے جا سکو گے۔"

وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ میں نے فون پر ہونے والی تمام گفتگو سنی تھی۔ اس نے امیر حمزہ کو کسی آہنی تجوری کے مخصوص نمبرز نہیں بتائے تھے۔ وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر انہیں ٹالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

انیلا کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ اس پر کچھ جبر کیا گیا تھا۔ ایک شخص نے کہا۔ "چلو اٹھو۔ مجھے بتاؤ' وہ آہنی تجوری کہاں ہے؟"

پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "تم دونوں یہاں ٹھہرو۔ اگر اس آئرن سیف کو توڑنا پڑا تو میں تمہیں بلاؤں گا۔ ویسے یہ مرتے مرتے بچتی آ رہی ہے۔ اس بار لفافہ دے کر اپنی سلامتی چاہے گی۔"

اس کی باتوں کے دوران میں نے دیکھا۔ انیلا کے پاؤں قالین پر آئے۔ ایک شخص اسے دھکے دیتا ہوا کسی دوسرے کمرے کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں نے رومال نکال کر ناک اور منہ پر باندھا۔ پھر جیب سے کین نکال کر پلنگ کے سرے کی طرف اسپرے کرنے لگا۔ صرف چند سیکنڈ میں وہ چاروں پاؤں جو کھڑے ہوئے تھے' وہ ڈگمگاتے ہوئے فرش پر لیٹ گئے۔

میں نے لڑھکتے ہوئے پلنگ کے نیچے سے نکل کر دو بے ہوش گن مینوں کو دیکھا۔ پھر بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکال کر اس میں سائلنسر لگاتے ہوئے دبے قدموں چلتا ہوا اس کمرے میں سے نکل کر دوسرے کمرے کے دروازے پر آیا۔

کمرے کے اندر ایک آہنی تجوری دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے انیلا کھڑی ہوئی کہہ رہی تھی۔ "امیر حمزہ نے اب تک میرے بدن کو ہاتھ نہیں لگایا ہے لیکن میں اسے اپنے جسم و جان کا مالک بنا چکی ہوں۔ میں اس کے لیے جان دے دوں گی مگر اس

کی امانت نہیں دوں گی۔"

اس شخص نے اپنی گن سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ "تم جان دینا آسان سمجھتی ہو۔ ہم آسانی سے نہیں ماریں گے۔ پہلے ہم تینوں تمہارے لباس کو نوچ کر تمہاری عزت سے کھیلیں گے۔ تمہارے بدن کے ایک ایک حصے کو چاقو سے کاٹیں گے۔ تب تم زندگی کی بھیک مانگتی ہوئی اس تجوری کے لاک نمبرز بتاؤ گی۔"

وہ بولتے بولتے تکلیف سے چیخ پڑا۔ میرے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی اس کے ہاتھ میں لگی تھی۔ اس کے ہاتھوں سے گن چھوٹ گئی تھی۔ ان دونوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں نے ناک اور منہ سے رومال ہٹا کر کہا۔ "یہ دل و جان سے امیر حمزہ کو چاہتی ہے اپنی جان دے دے گی مگر اس کی امانت نہیں دے گی۔ اب تم بتاؤ گے کہ لندن میں تمہاری خفیہ ایجنسی کا سربراہ کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ اور اس کا فون نمبر کیا ہے؟ ابھی اس سے بات ہو جائے گی۔"

انیلا اور وہ شخص پلنگ کے دوسری طرف آہنی تجوری کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ وہ شخص اچانک ہی فرش پر گر پڑا۔ اس کی چالاکی سمجھ میں آ گئی۔ میں اچھل کر پلنگ پر آ گیا۔ وہ فرش پر گرتے ہی وہاں پڑی ہوئی گن اٹھا کر پلنگ کے نیچے سے میرے پیروں پر گولیاں مارنا چاہتا تھا اور پھر اٹھ کر میرے جسم کے کسی بھی حصے میں گولی اتار سکتا تھا۔

اس کی توقع کے مطابق ایسا نہیں ہوا۔ اس نے فرش پر گرتے ہی گن اٹھا کر میرے پیروں کا نشانہ لینا چاہا مگر میں وہاں نہیں تھا۔ اس نے مجھے ڈھونڈنے کے لیے سر اٹھایا تو میں نے ٹریگر دبا دیا۔ سائلنسر کے باعث ہلکے سے کھٹکے کی آواز ابھری۔ گولی اس کی پیشانی میں پیوست ہو گئی تھی۔ اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ وہ پیچھے کی طرف الٹ کر پھر فرش پر پہنچ گیا۔ اس کے بعد وہ کبھی اٹھنے کے قابل نہیں رہا۔

انیلا نے اس کی گن اٹھا کر پوچھا۔ "تم کون ہو؟ کیا حمزہ صاحب کے آدمی ہو؟"

"فی الحال میں اجنبی ہوں۔ میرا نام فرمان علی تاباں ہے۔ آج پہلی بار امیر حمزہ کو تمہارے ساتھ ہوٹل شیرٹن میں دیکھا ہے۔ پھر یہ معلوم کرنے یہاں آیا ہوں کہ تم قتل ہونے کے بعد زندہ کیسے ہو گئی ہو؟ اوہ میرا خیال ہے کہ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے پھر کوئی دشمن یہاں آ سکتا ہے۔ تم وہ لفافہ لے کر یہاں سے نکل چلو۔"

وہ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "تم چالباز بھی ہو سکتے ہو۔ میں تمہیں دوست کیسے سمجھوں؟"

"میں دوست ہوں اسی لیے اس مُردے کی گن اٹھانے دی۔ مجھ پر شبہ نہ کرو۔ اس

گن سے تم اپنی حفاظت کر سکتی ہو۔"

"یہاں تین دشمن آئے تھے۔ باقی دو کہاں ہیں؟"

"میں نے انہیں بے ہوش کر دیا ہے۔ وہ اسی کمرے میں پڑے ہیں۔"

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "خفیہ ایجنسی کے کارندے شیطان کی آنت کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ کیا تم چاہتی ہو' یہاں دیر کرو۔ پھر وہ یہاں آکر تمہارے ساتھ مجھے بھی مار ڈالیں؟"

اس نے موبائل نکال کر اسے آن کیا۔ میں نے کہا۔ "تم پھر حمزہ کو بلاؤ گی' اس کے یہاں آنے میں دیر ہو سکتی ہے۔"

وہ بولی۔ "میں ٹیکسی کے لیے کال کر رہی ہوں۔"

اس نے رابطہ کر کے کہا۔ میں پیکاڈلی کی ایک اسٹریٹ ہال مون سے بول رہی ہوں۔ جتنی جلدی ہو سکے بنگلا نمبر بائیس میں ٹیکسی بھیج دیں۔ شکریہ۔"

اس نے موبائل کو بند کیا۔ مجھے دیکھا۔ پھر گھوم کر مخصوص لاک نمبرز کے ذریعے تجوری کو کھولا۔ تجوری کے اندر بہت کچھ تھا۔ اس نے صرف ایک بڑے سے لفافے کو نکالا۔ پھر تجوری کو بند کر کے میری طرف پلٹ کر کہا۔ "مسٹر فرمان! میں یہ لفافہ لے کر تمہارے ساتھ چل رہی ہوں مگر یاد رکھو۔ دھوکا دو گے تو جان پر کھیل جاؤں گی مگر یہ لفافہ تمہارے ہاتھ لگنے نہیں دوں گی۔"

"تم جس طرح چاہو' مطمئن رہ کر میرے ساتھ چلو یا یہاں سے نکلتے ہی مجھے چھوڑ کر ٹیکسی میں چلی جاؤ مگر یہاں سے چلو۔"

وہ میرے پیچھے چلتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں آئی۔ وہاں وہ دونوں فرش پر بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ انیلا نے انہیں دیکھا۔ پھر ایک دروازہ کھول کر اس کمرے میں آئی جہاں میں نے ایک مسلح گارڈ کو بے ہوش کر کے بستر پر سلا دیا تھا۔ وہ ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔ انیلا نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجوڑا پھر کہا۔ "یہ بھی بے ہوش ہے۔"

میں نے کہا۔ "گیٹ کے کیبن والا گارڈ بھی بے ہوش ہے۔"

انیلا نے یہ سنتے ہی دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ تاکہ میں اس کے چہرے کے تاثرات نہ پڑھ سکوں۔ اس وقت میں نے دھیان نہیں دیا۔ وہ سوچ رہی تھی' کمرے کے دو آدمیوں کو میں نے بے ہوش کیا ہے تو اس کے گارڈز کو بھی میں نے ہی بے ہوشی کی نیند سلایا ہو گا اور یہ غلط نہیں تھا۔ میں سچ بول کر اسے اور شبہے میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ سوچتی ہوئی میرے ساتھ بنگلے کے باہر احاطے میں آئی۔ پھر چونک کر بولی۔ "اوہ۔

میں اپنا آئیڈنٹی کارڈ اور چیک بک چھوڑ آئی ہوں۔ پلیز یہاں ٹھہرو۔ ٹیکسی آ رہی ہو گی۔ تم اسے روکو۔ میں ابھی ضروری چیزیں لے کر آ رہی ہوں۔"

وہ تیزی سے چلتی ہوئی پھر بنگلے کے اندر چلی گئی۔ میں نے سوچا۔ وہ میری طرف سے مطمئن نہیں ہے۔ بنگلے کے اندر ضرور امیر حمزہ کو فون پر رابطہ کرنے گئی ہو گی۔ اسے پوری طرح مطمئن ہونے کا موقع دینا چاہیے۔ یہاں جو خطرہ پیش آئے گا' اس سے نمٹ لیا جائے گا۔

ایک منٹ کے بعد ہی رات کے سناٹے میں ٹھائیں سے گولی چلنے کی آواز گونجی۔ میں دوڑتا ہوا بنگلے کے پیچھے جانے لگا۔ آواز ادھر سے ہی آئی تھی۔ میں بنگلے کے پیچھے آیا تو نیم تاریکی میں کسی شخص کو دوڑتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ آگے انیلا چیختی ہوئی بھاگ رہی تھی۔ بنگلے کے پچھلے حصے سے گھوم کر اگلے حصے کی طرف جا رہی تھی۔ یعنی وہ مجھے دھوکا دے کر پچھلے دروازے سے فرار ہونا چاہتی تھی۔ مگر وہاں ایک دشمن تاک میں تھا۔ اس نے انیلا پر فائر کیا۔ وہ بچ گئی تھی۔ کھلے ہوئے گیٹ کے باہر ٹیکسی آگئی تھی۔ وہ ٹیکسی کے قریب پہنچ کر پچھلا دروازہ کھول رہی تھی۔ اسی وقت تعاقب کرنے والے نے پھر فائر کیا۔ گولی ٹیکسی کے دروازے پر لگی۔ فائرنگ کی دہشت کے باعث اس کے ہاتھ سے لفافہ چھوٹ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور فائرنگ کی وجہ سے رک نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے رفتار بڑھا کر روانہ ہو گیا۔ انیلا ٹیکسی میں رہ گئی۔ لفافہ سڑک کے کنارے پڑا رہ گیا۔

تعاقب کرنے والا اس لفافے کی طرف دوڑ لگا رہا تھا۔ میں نے اس کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ اسے گولی لگی۔ وہ زمین سے اچھلا پھر گر پڑا۔ میں اس کے بہت پیچھے تھا۔ تیزی سے دوڑتا ہوا اس کی لاش کو پھلانگتا ہوا گیٹ کے باہر جا کر لفافہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اسی وقت ایک کار تیزی سے آکر رکی' دروازہ کھلا اور کسی نے ہاتھ بڑھا کر اس لفافے کو اٹھا لیا۔ میں نے گولی چلائی۔ اس کی کھڑکی کے کلرڈ شیشے میں سوراخ ہو گیا۔ شیشہ تڑخ گیا مگر کار جتنی تیزی سے آئی تھی' اتنی ہی تیزی سے دور ہوتی چلی گئی۔

میں نے گیٹ کے باہر آکر سڑک پر دوڑتے ہوئے اندازہ کیا۔ وہ کار فائرنگ رینج سے باہر جاتے ہوئے ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی۔ میں نے شکست خوردہ انداز میں اپنے ریوالور کو جھکا لیا۔ اس بنگلے میں کئی گھنٹے گزار کر میں نے کیا پایا؟ کیا کھویا؟ میرا خیال ہے۔ ابھی مجھے اپنی ہار اور جیت کا حساب نہیں کرنا چاہیے۔ ابھی تو میں میدانِ عمل میں آیا ہوں۔ پتا نہیں ابھی مجھے کتنی ٹھوکریں کھانی ہوں گی اور کتنے جان لیوا

تجربات کی بھٹی میں تپ کر کندن بنا ہو گا۔

☆======☆======☆

بھارتی سرحد پار کر کے آنے والا دہشت گرد مراد حوالات میں تھا اور تابانی کو اسپتال بھیج دیا گیا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اسے چیک کر کے رپورٹ دی تھی کہ حمل کا تیسرا مہینہ ہے اور وہ ماں بننے والا ہے۔

پچھلے باب میں بیان کیا گیا تھا کہ کوئی تابانی کو یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ وہ بچپن سے مرد بن کر رہنے کا عادی تھا۔ اسے عورت کہا جائے تو اپنی توہین سمجھتا تھا۔ وہ اتنا زبردست فائٹر تھا کہ جو اسے عورت کہتا تھا وہ اس کی بری طرح پٹائی کر دیتا تھا۔

اتنی بڑی دنیا میں وہ صرف اپنے ایک عاشق مراد کے لیے عورت تھا اور اس کے بچے کی ماں بننے والا تھا۔

ویسے یہ پڑھنے اور سننے سے نہایت عجیب' بالکل غیر فطری اور مضحکہ خیز لگتا ہے کہ کوئی ماں بننے والا ہے۔ جمشید نے پولیس افسران اور اسپتال کے عملے کو سمجھا دیا تھا کہ اسے مرد ہی کہا جائے ورنہ وہ پورے اسپتال میں ہنگامہ برپا کرتا رہے گا۔ جو ڈاکٹر اس کے کمرے میں ٹریٹ منٹ کے لیے آئے گا' اس کی اچھی طرح مرمت کر دے گا۔ بہرحال اس اسپتال میں اس لیے سکون تھا کہ وہاں کا تمام عملہ اسے مرد کہتا تھا۔

تابانی اور مراد نے پچھلی رات لبرٹی مارکیٹ کی ایک دکان میں بم دھماکا کیا تھا۔ اس دھماکے کے الزام میں انہیں گرفتار کیا گیا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق چونکہ تابانی کی جنس تبدیل ہوئی تھی' وہ مرد سے عورت بن گیا تھا اس لیے پہلی بار حاملہ ہونے کے باعث کچھ میڈیکل پرابلمز تھے۔ اسے ابتدائی مہینوں سے ہی زیر علاج رکھنا لازمی تھا۔ اسے پولیس کے سخت پہرے میں اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ اسے جس کمرے میں رکھا گیا تھا' وہاں خاص شناختی کارڈ دکھائے بغیر کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔

تابانی اور مراد نے پاسپورٹ وغیرہ کے ذریعے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ امریکا سے آئے ہیں اور انہوں نے اپنے باپ کے ایک دوست اکرام شاہ کی کوٹھی میں قیام کیا تھا۔ صرف تابانی کے پاسپورٹ میں یہ فراڈ تھا کہ اس نے عورت ہو کر خود کو مرد ظاہر کیا تھا۔ یہ ایک نفسیاتی کیس تھا اس لیے اسے فراڈ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

لیکن آئندہ الیکشن لڑنے اور اسمبلی میں پہنچنے والا اکرام شاہ مصیبت میں پڑ گیا۔ دوسری صبح اس کی اور بیگم کی آنکھ کھلی تو ان کی بڑی بیٹی رخشندہ نے رو رو کر بتایا کہ ان کی کوٹھی کے اطراف پولیس کا پہرا ہے۔ مراد کو بم دھماکے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا

ہے اور ڈرائنگ روم میں دو جاسوس اکرام شاہ سے ملنے اور اہم سوالات کرنے کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں۔

بیگم نے پریشان ہو کر میاں سے پوچھا۔ "کیا معاملہ بہت ہی سنگین ہے۔ تابانی بھی حراست میں ہے۔ اتنا سنگین ہے کہ پولیس والوں نے کوٹھی کو گھیر لیا ہے؟"

رخشندہ نے کہا۔ "انٹیلی جنس والے جمشید کے ساتھ آئے تھے۔ وہ آپ کے سیف سے ایسی اہم دستاویزات لے گئے ہیں جو ڈیڈی کے خلاف استعمال کی جا سکتی ہیں۔"

اکرام شاہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے سوچ رہا تھا۔ بیگم نے کہا۔ "پہلے کسی افسر سے نہ ملیں۔ اسلام آباد بات کریں۔ رخشندہ' اپنے ڈیڈی کا موبائل لاؤ۔"

"ممی! موبائل فون ایک افسر نے لے رکھا ہے۔ ٹیلی فون بھی وہیں ہے۔ ایکسٹینشن لائن کاٹ دی گئی ہے۔"

اکرام شاہ نے کہا۔ "اس سختی کا مطلب ہے' یہ لوگ مجھے کوٹھی سے باہر نہیں جانے دیں گے۔"

رخشندہ نے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا۔ "میں نے ایک چالاکی کی ہے۔ انہیں یہ نہیں معلوم ہونے دیا ہے کہ میرا اپنا ایک موبائل فون ہے۔ میں نے اسے چھپا لیا تھا۔ آپ میرے کمرے میں چلیں اور دروازے کو اندر سے بند کر کے باتیں کریں۔"

وہ ماں باپ اپنی بیٹی کے کمرے میں آئے۔ دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر اکرام شاہ نے موبائل کے ذریعے اسلام آباد کاشف اکبر سے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے پرسنل سیکرٹری نے کہا۔ "صاحب ابھی سو رہے ہیں۔"

"ان سے کہو' اکرام شاہ لاہور سے بول رہا ہے۔ اگر انہوں نے مجھ سے بات نہ کی تو مرزا نیک بخت میرے سر پر ہاتھ رکھنے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔"

"پلیز آپ انتظار کریں۔"

تھوڑی دیر بعد کاشف اکبر کی آواز سنائی دی۔ "کیا بات ہے شاہ صاحب سیکرٹری کہہ رہا ہے' آپ غصے میں ہیں۔"

"اگر آپ کے محل کے گرد پولیس والے محاصرہ کرتے تو آپ کو بھی غصہ آتا۔ میں نے آپ کی فرمائش پر تابانی اور مراد کو اپنے گھر میں پناہ دی۔ انہوں نے کوئی گڑبڑ نہیں کی ہے لیکن پچھلی رات ہونے والے بم دھماکے کا الزام لگا کر انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ہم غافل سو رہے تھے۔ ہمارے گھر کی تلاشی لی گئی۔ وہ ہمارے سیف سے اہم دستاویزات نکال کر لے گئے ہیں۔"

"آپ سے اس سلسلے میں کیا پوچھا جا رہا ہے؟"

"دو افسر........... مجھ سے سوالات کرنے کے لیے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیا یہی میری اوقات رہ گئی ہے کہ بی گریڈ اور سی گریڈ کے افسران مجھ سے سوالات کریں اور میں ایک مجرم کی طرح جواب دوں؟ انہوں نے میرا موبائل فون لے لیا ہے۔ ٹیلی فون کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں تاکہ میں آپ حضرات سے بات نہ کر سکوں۔ یہ ایک موبائل فون ہم نے چھپا کر رکھا تھا۔ ایک بند کمرے میں ان جاسوسوں سے چھپ کر آپ سے بات کر رہا ہوں۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "شاہ صاحب! ذرا صبر و تحمل سے کام لیں۔ یہ سوچ کر دماغ ٹھنڈا رکھیں کہ ہم اقتدار میں نہیں ہیں۔ اس کے باوجود ہم کمزور نہیں ہیں۔ میں ایک گھنٹے کے اندر آپ کی کوٹھی سے محاصرہ ہٹوا دوں گا۔ جاسوس بھی چلے جائیں گے۔ کوئی ہائی لیول کا عہدیدار آ کر آپ سے گفتگو کرے گا۔ آپ یہ بتائیں' آپ کی کوٹھی سے کوئی قابلِ اعتراض یا غیر قانونی چیز برآمد ہوئی ہے؟"

اکرام شاہ نے رخشندہ سے یہ سوال کیا۔ وہ بولی۔ "جمشید نے تابانی اور مراد کے موبائل شفا خانے سے کچھ بم اور اسلحہ برآمد کیا تھا۔"

بیگم نے کہا۔ "میں پہلے ہی کہتی تھی کہ جمشید آستین کا سانپ ہے۔ آخر وہ ہمیں ڈس رہا ہے۔"

اکرام شاہ نے ڈانٹ کر کہا۔ "خاموش رہو' مجھے بات کرنے دو۔"

پھر اس نے فون پر کاشف اکبر سے کہا۔ "انٹیلی جنس میں ایک نوجوان جمشید ہے۔ اس نے میری چھوٹی بیٹی فری کا رشتہ مانگا تھا۔ ہم نے انکار کر دیا تھا۔ وہی جمشید دشمنی سے یہ بیان دے رہا ہے کہ ہمارے موبائل شفا خانے سے بم اور اسلحہ برآمد ہوا ہے۔ جمشید ابھی انڈر ٹریننگ ہے۔ وہ انتقام لینے کے لیے اس ڈیپارٹمنٹ کے ایسے سراغ رسانوں کو لے کر آیا تھا جو اس کے رشتے دار' دوست اور ہمنوا تھے۔"

"آپ ایک گھنٹے تک اپنے کمرے سے باہر نہ نکلیں۔ کسی افسر........... سے ملاقات نہ کریں۔ پہلے میں محاصرہ ہٹاؤں گا پھر تابانی اور مراد کی رہائی کے لیے کوششیں کروں گا۔"

فون کا رابطہ ختم ہو گیا۔ کاشف اکبر اعلیٰ سطح کے عہدیداروں سے رابطہ کرنے لگا۔ انہیں بتانے لگا کہ جمشید نامی ایک جوان انٹیلی جنس کے ادارے میں زیر تربیت ہے۔ ابھی اسے ایک سراغ رساں کی سند حاصل نہیں ہوئی ہے۔ وہ نوجوان جمشید ذاتی دشمنی کی بنا پر اکرام شاہ کی کوٹھی کا اچانک محاصرہ کر کے' یہ جھوٹی رپورٹ پیش کر رہا ہے کہ اکرام شاہ

کی کوٹھی سے بم اور اسلحہ برآمد ہوئے ہیں اور لبرٹی مارکیٹ میں ہونے والے بم دھماکے کے ذمے دار اکرام شاہ کے دو مہمان تابانی اور مراد ہیں۔

لہٰذا انٹیلی جنس کے اعلیٰ عہدیداروں کا محاسبہ کیا جائے کہ غیر سند یافتہ سراغرساں جمشید کی قیادت میں ایک عزت دار اور معروف سیاسی شخصیت کی کوٹھی کا محاصرہ کیوں کیا گیا ہے۔ کیوں ان کے خاندان کو حبسِ بے جا میں رکھا گیا ہے۔ انٹیلی جنس والوں کے غیر قانونی اقدامات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اکرام شاہ کی کوٹھی سے فوراً محاصرہ ہٹایا جائے۔

کئی متعلقہ عہدیداروں نے اس اہم نکتے کو تسلیم کیا کہ اکرام شاہ کی کوٹھی کا محاصرہ کرنے والی ٹیم میں غیر سند یافتہ سراغرساں کو شامل نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔ جمشید نے بم اور اسلحہ وہاں سے برآمد کرنے کی جو رپورٹ دی ہے' وہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا فوراً وہاں سے محاصرہ ہٹا لیا جائے اور اس سلسلے میں معزز اکرام شاہ کو پریشان نہ کیا جائے۔

جمشید دوپہر کو انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل کے پاس آیا تو اس نے بتایا کہ اکرام شاہ کی کوٹھی سے محاصرہ ختم کر دیا گیا ہے۔ اوپر سے احکامات صادر کیے گئے تھے۔ ان کے دو افسر بھی اکرام شاہ سے کوئی سوال کیے بغیر آ گئے ہیں۔ اعلیٰ افسر نے جمشید سے کہا۔ "انہوں نے تم پر الزام لگایا ہے تمہاری ذاتی دشمنی اکرام شاہ سے تھی۔ بم اور اسلحے کی برآمدگی کے سلسلے میں' میں نے تم سے رپورٹ لکھوائی تھی۔ میں آئندہ کے لیے تمہارے سروس ریکارڈ کو بہتر بنانا چاہتا تھا لیکن تم نے باقاعدہ ایک جاسوس ہونے کی سند حاصل نہیں کی ہے اس لیے تمہاری پیش کردہ رپورٹ کو ناقابلِ قبول کہا جا رہا ہے۔ ہماری تمام محنتوں پر پانی پھیرا جا رہا ہے۔"

"سر! یہ ہم پہلے سے جانتے تھے کہ اکرام شاہ جیسے سابقہ ایم این اے کے خلاف کارروائی کی جا رہی ہے۔ وہ خود پر کوئی الزام نہیں آنے دے گا۔"

"میں تقریباً تیس برس سے اس محکمے سے وابستہ ہوں۔ ایک جونیئر جاسوس کے عہدے سے موجودہ عہدے تک پہنچنے کے دوران میں اکثر سیاسی بداعمالیاں دیکھی ہیں اور خون کے گھونٹ پیتا رہا ہوں۔ آج کل میں آرڈرز آئیں گے کہ تابانی اور مراد کو ضمانت پر رہا کر دیا جائے۔ ان پر مقدمہ چلایا جائے گا۔"

"پھر مقدمہ چلتا رہے گا اور نہ جانے کب تک چلتا رہے گا۔ حتیٰ کہ یہ مقدمہ کمزور ہو کر ختم ہو جائے گا۔ بم دھماکے سے جن کی جانیں گئیں اور جو اپاہج ہو گئے' وہ جیسے انسان نہیں تھے' پاکستانی نہیں تھے۔ کیڑے مکوڑے تھے۔ کسی بھی انصاف کے مستحق نہیں تھے۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ڈائریکٹر جنرل نے فون اٹھا کر کہا۔ "میں ڈی جی بول رہا ہوں۔"

"اور میں اکرام شاہ بول رہا ہوں۔ آپ نے مجھے اچھی طرح جانتے ہوئے بھی کسی سرچ وارنٹ کے بغیر میرے گھر میں گھسنے کی جرأت کیسے کی؟ میرے ذاتی سیف کو کھول کر چند دستاویزات' ڈیڑھ کروڑ مالیت کے زیورات اور اسّی لاکھ روپے نقد لے گئے۔"

ڈی جی نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ "یہ جھوٹ ہے۔"

"یہ سچ ہے۔ بغیر سرچ وارنٹ کے گھروں میں گھسنے والے قانون کے محافظ بھی نقدی اور زیورات لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ میں بھری عدالت میں آپ کی وردی اتروادوں گا۔"

ڈائریکٹر جنرل نے "شٹ" کہہ کر فون رکھ دیا۔ جمشید نے کہا۔ "کون تھا سر؟"

"اکرام شاہ سرچ وارنٹ کے بغیر اپنے.........گھر میں گھسنے کے سلسلے میں بکواس کر رہا تھا۔ ہم پر مقدمہ کرے گا کہ ہم اس کے سیف سے ڈیڑھ کروڑ کے زیورات اور اسّی لاکھ روپے نقد لے آئے ہیں۔"

"کیا وہ کم بخت نہیں جانتا کہ ہنگامی حالات میں سرچ وارنٹ کے بغیر اس لئے چھاپے مارے جاتے ہیں کہ اس طرح مجرم گرفت میں آجاتے ہیں اور ہم نے مجرم مراد کو گرفتار کیا ہے۔"

"اس کے خلاف کیا ثبوت ہے کہ اس نے بم دھماکہ کیا ہے؟ ایک چشم دید گواہ شعبان عرف شابے ہے اور وہ طوائفوں کی انجمن کا سیکرٹری ہے۔ معاشرے میں نہ کوئی اس کا مقام ہے' نہ کوئی عزت ہے۔ اس ایک شخص کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس تابانی اور مراد موبائل رعایتی شفا خانے کے ذریعے خدمتِ خلق کے سلسلے میں نیک نام ہیں۔"

ڈی جی نے ریسیور اٹھایا پھر تھانے کے انچارج سے رابطہ کر کے پوچھا۔ "کیا اکرام شاہ کا فون آیا تھا؟"

"جی نہیں مگر فون آسکتا ہے بلکہ وہ خود آسکتا ہے۔"

"میں آپ سے ایک تعاون چاہتا ہوں۔"

"سر! آپ حکم کریں۔"

"اکرام شاہ کا فون آئے تو کہہ دیں کہ مراد کو آپ کے تھانے میں نہیں لایا گیا تھا۔"

"وہ خود آکر اسے حوالات میں دیکھ سکتا ہے۔"

"اسے حوالات سے نکال کر تھانے کے پیچھے ایک کوارٹر کے کمرے میں بند کر دو۔

اسے بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں دکھا کر کہو۔ یہ رقم اکرام شاہ نے تمہیں اس لیے دی ہے کہ تم یہاں سے فرار ہو جاؤ۔ کیونکہ اکرام شاہ کی پارٹی اقتدار میں نہیں ہے اس لیے کمزور ذرائع کام نہیں آرہے ہیں اور اس کے خلاف ثبوت اور گواہیاں بہت سخت ہیں۔"

"میں سمجھ گیا سر! اسے کس وقت فرار ہونے کا موقع دیا جائے؟"

"ابھی دو بجے ہیں۔ اسے ٹھیک چار بجے بھاگنے دو۔"

"آل رائٹ سر!"

ڈی جی نے ریسیور رکھ کر کہا۔ "جمشید! ٹھیک چار بجے تھانے کے پیچھے والے کوارٹر سے مراد فرار ہو گا۔ ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ ہم نے صحیح مجرم کو گرفتار کیا تھا۔ اس نے پولیس کسٹڈی سے فرار ہو کر پولیس والوں سے مقابلہ کیا پھر کاؤنٹر فائرنگ میں مارا گیا۔"

"آل رائٹ سر! ہم ثابت کریں گے کہ صحیح مجرم کو گرفتار کرنے کے لیے ہم نے سرچ وارنٹ کے بغیر صحیح کوٹھی پر چھاپہ مارا تھا۔"

"اسے گولی مارنے سے پہلے دیر تک بھاگتے رہنے کا موقع دیا جائے تاکہ ہم اعلیٰ عہدیداروں تک اس کے فرار ہونے کی خبر پہنچاتے رہیں اور یقین دلاتے رہیں کہ وہ مفرور گرفتار کر لیا جائے گا۔"

جمشید سیلوٹ کر کے چلا گیا۔ ڈائریکٹر جنرل نے دیوار پر لگی ہوئی قائد اعظم محمد علی جناح کی تصویر دیکھی پھر سر کو جھکا لیا۔ دل میں کہنے لگا۔ "ہم پولیس اور انٹیلی جنس والے بدنام کیے جاتے ہیں کہ ہم قانون کے محافظ ہو کر قانون توڑتے ہیں۔ مگر کیا کریں؟ اس شعبے کو سیاست دانوں نے بگاڑا ہے۔ میں تیس برسوں سے دیکھتا آرہا ہوں کہ دیانت دار اور فرض شناس سپاہیوں سے لے کر افسران تک سب ہی کی محنتوں اور کارناموں کو کس طرح خاک میں ملایا جاتا ہے۔ آج اگر مراد کو مجرم ثابت نہ کیا گیا تو اکرام شاہ میرے افسران پر ڈکیتی کا الزام لگائے گا۔ سرچ وارنٹ کے بغیر کوٹھی میں داخل ہونے والے افسران مجرم بن جائیں گے اور مجرم مراد معزز کہلائے گا۔ محسن پاکستان محترم قائد اعظم محمد علی جناح! میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ آپ نے روشن پاکستان بنایا تھا۔ مگر ہم اس کے رکھوالے' اندھیر نگری میں بیٹھے ہیں۔ اسے دوبارہ روشن کرنے کے لیے چوپٹ راجاؤں کو اینٹ کا جواب پتھر سے دینا پڑ رہا ہے۔ آپ ایک عظیم قانون دان تھے۔ ہم قانون کے خلاف انصاف کا تقاضا پورا کر رہے ہیں۔ سو سوری می لارڈ!"

مراد کو جس تھانے میں رکھا گیا تھا' وہاں کے انچارج نے روزنامچے میں لکھا کہ چار ماہ سے جس قاتل چھیپے کی تلاش تھی' معتبر ذریعے سے پتا چلا ہے کہ وہ شاہدرہ کے علاقے

میں ہے اور وہاں ایک مکان میں رُوپوش ہے۔ میں تین بج کر بیس منٹ پر مسلح سپاہیوں کی ایک ٹیم کے ساتھ اسے گرفتار کرنے جا رہا ہوں۔

وہ یہ روزنامچہ ڈھائی بجے لکھ رہا تھا۔ اس وقت تھانے میں دس سپاہی تھے۔ سب انسپکٹر چھٹی پر تھا۔ اس کی جگہ دوسرا سب انسپکٹر پولیس ہیڈ کوارٹر سے آنے والا تھا۔ انٹیلی جنس اور پولیس والوں کا آپس میں سمجھوتا ہو گیا۔ ہیڈ کوارٹر سے تھانے جانے والے انسپکٹر اور چار سپاہیوں کو روک دیا گیا۔

ادھر مراد کو حوالات سے ایک کوارٹر میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اسے سمجھا دیا گیا تھا کہ اکرام شاہ نے بھاری رشوت دے کر پولیس والوں کو خرید لیا ہے۔ تابانی کو بھی اسپتال سے فرار ہونے کا موقع دیا جا رہا ہے۔ وہ ملتان روڈ پر شہر سے باہر کہیں بھی مل سکتا ہے۔ ساڑھے تین اور چار بجے کے درمیان ایک موٹر سائیکل اس کوارٹر کے سامنے آئے گی۔ وہ اس موٹر سائیکل پر فرار ہو سکے گا۔

نئے سب انسپکٹر کی جگہ ایک اجنبی شخص نے ڈیوٹی کا چارج سنبھالنے کے رجسٹر پر لکھا کہ وہ ہیڈ کوارٹر سے چار سپاہیوں کے ساتھ آ کر اس تھانے کی ذمے داری کو سنبھال رہا ہے۔ وہ اجنبی شخص ضابطے کی کارروائی کے مطابق لکھ کر اپنے دستخط کر کے چلا گیا۔ اس کا تھانے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ تھانے کے جن چار سپاہیوں کی ڈیوٹی بدلنے والی تھی' انہیں اچھی طرح معاملات سمجھا کر چھٹی دے دی گئی۔

وہ روزنامچے کے مطابق تین بج کر بیس منٹ پر چھ مسلح سپاہیوں کے ساتھ ایک قاتل چھپے کو گرفتار کرنے کے لیے شاہدرہ کی طرف چلا گیا۔ تھانہ خالی ہو گیا۔ وہ ہیڈ کوارٹر سے آنے والے سب انسپکٹر کو چہرے سے نہیں پہچانتا تھا۔ اس نے ہیڈ کوارٹر کے کاغذات دکھائے تھے اس لیے وہ دھوکا کھا گیا تھا۔ تھانے کے پیچھے ایک کوارٹر کے سامنے ایک شخص موٹر سائیکل لے کر آیا اور مراد کو آواز دی۔ وہ آواز سنتے ہی باہر آیا۔ اس شخص نے اسے ایک ریوالور دے کر کہا۔ "فوراً یہاں سے جاؤ' دیر نہ کرو۔ کم آن ہری اپ۔"

مراد نے ریوالور لیا۔ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا پھر تابانی سے ملنے کے لیے ملتان روڈ کی طرف چل پڑا۔ دوسری طرف جمشید بھی ایک موٹر سائیکل پر تھا۔ باقی سپاہی ایک جیپ میں تھے۔ تعاقب کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ مراد کو خبر نہ ہو سکی کہ اس کے پیچھے جمشید سپاہیوں کے ساتھ آ رہا ہے۔

ڈائریکٹر جنرل نے اعلیٰ عہدیداروں سے رابطہ کیا۔ ہر ایک سے کہا۔ "میرا ایک جونیئر افسر تھانے میں مراد سے کچھ سوالات کرنے گیا تو پتا چلا کہ تھانہ خالی ہے۔ مراد بھی

حوالات میں نہیں ہے۔ چار بجے ایک سب انسپکٹر چار سپاہیوں کے ساتھ ڈیوٹی کا چارج لینے آیا تو وہ بھی پریشان ہو گیا کہ معاملہ کیا ہے؟"

نئے سب انسپکٹر کا بیان تھا کہ ڈیوٹی کا چارج لینے والے رجسٹر پر ایک اجنبی سب انسپکٹر کی تحریر اور دستخط تھے اور وہ فراڈ تھا۔

تھانے کے انچارج سے موبائل فون پر پوچھا گیا۔ اس نے کہا۔ "روزنامچہ دیکھا جائے۔ میں سب انسپکٹر کو چہرے سے نہیں پہچانتا تھا۔ اس نے ہیڈ کوارٹر کے آرڈرز کے کاغذات پیش کیے۔ میں نے تھانہ اس کے حوالے کر دیا۔"

فائل کھول کر دیکھنے سے پتا چلا' ہیڈ کوارٹر کے جو کاغذات پیش کیے گئے تھے' وہ جعلی تھے۔ اس پر لگی ہوئی مہر بھی جعلی تھی لیکن اس جعل سازی کو کوئی ماہر ہی سمجھ سکتا تھا اس لیے تھانے کا انچارج دھوکا کھا گیا تھا۔

پکا منصوبہ تھا۔ پولیس اور انٹیلی جنس پر کوئی الزام نہیں آ سکتا تھا۔ ان سے کسی کوتاہی کی شکایت نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے برعکس یہ ثابت ہو رہا تھا کہ مراد کوئی معمولی مجرم نہیں تھا۔ اس کے پیچھے ایک منظم اور بااثر گروہ تھا۔ جس نے اسے ایسے ڈرامائی انداز میں فرار ہونے کا موقع دیا تھا۔

اکرام شاہ تک جب بات پہنچی تو وہ ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ اس نے سوچا تھا' شام کو تھانے جا کر مراد سے ملاقات کرے گا اور بڑے فخر سے اسے بتائے گا کہ بم دھماکے کا الزام اس پر عائد نہیں کیا جا سکے گا۔ اس کے خلاف کوئی گواہ کوئی ثبوت نہیں ہے۔ للٰذا دوسرے دن اسے ضمانت پر رہا کر دیا جائے گا۔

وہ جھنجلا گیا۔ "بیگم! ہم پر پھر مصیبت آنے والی ہے۔ مراد نے حوالات سے فرار ہو کر خود کو مجرم ثابت کر دیا ہے۔"

"اس کم بخت کو فرار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا تابانی بھی اس کے ساتھ گیا ہے؟"

اکرام شاہ نے تھانے والوں سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "میں اکرام شاہ بول رہا ہوں۔ کیا مراد کے ساتھ تابانی بھی فرار ہوا ہے؟"

"کون تابانی؟ میں نیا انسپکٹر آیا ہوں۔ ایک گھنٹا پہلے اس تھانے کا چارج سنبھالا ہے۔ فی الحال میرے علم میں صرف ایک مراد نامی قیدی حوالات میں تھا جو میرے آنے سے پہلے فرار ہو گیا ہے۔"

اکرام شاہ نے فون بند کرنے کے بعد ڈائریکٹر جنرل سے رابطہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں اکرام شاہ بول رہا ہوں۔ مجھے شبہ ہے کہ مراد بھاگا نہیں ہے' اسے بھگایا گیا ہے۔"

"حسینوں کو بھگا کر لے جایا جاتا ہے۔ ویسے آپ کو اس سلسلے میں تھانے جاکر رپورٹ درج کرانا چاہیے۔"

"وہاں کوئی نیا انسپکٹر ہے۔ میں نے تابانی کے بارے میں اس سے پوچھا تو اس نے لاعلمی ظاہر کی ہے۔"

"ہاں وہ نہیں جانتا کہ تابانی حوالات میں نہیں اسپتال میں ہے۔ وہاں پولیس کا سخت پہرا ہے کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی جارہی ہے۔"

"تابانی میرا مہمان ہے۔ میں اس سے ضرور ملوں گا۔ اس سے ملاقات کرنے کے لیے اوپر والوں سے احکامات صادر کراؤں گا۔"

"آپ جیسوں کے اوپر والوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

"آپ یہ تو بتاسکتے ہیں کہ تابانی کو کیا تکلیف ہے۔ وہ اسپتال میں کیوں ہے؟؟"

"اس لیے کہ وہ ماں بننے والا ہے۔"

"کیا؟" اکرام شاہ نے غصے سے چیخ کر پوچھا۔ "آپ اتنے بڑے افسر ہو کر بچکانا سا مذاق کر رہے ہیں۔"

"یہ مذاق نہیں ہے۔ آپ کیسے میزبان ہیں' اتنا نہیں جانتے تھے کہ تابانی مرد نہیں عورت ہے۔ بس اب میرا وقت برباد نہ کریں۔ آپ اسپتال میں فون کرکے میری بات کی تصدیق کرسکتے ہیں۔"

ڈائریکٹر جنرل نے اسپتال کا نام اور نمبر بتا کر فون بند کردیا۔ اکرام شاہ نے ریسیور رکھتے ہوئے اپنی بیگم اور بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "عورت دور سے کسی بھی عورت کو پہچان لیتی ہے۔ کیا تم دونوں یہ یقین سے کہہ سکتی ہو کہ تابانی عورت ہے؟؟"

ماں بیٹی نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ ریسیور اٹھا کر اسپتال والوں سے رابطہ کرکے تابانی کے سلسلے میں پوچھنے لگا پھر ریسیور رکھ کر شدید حیرانی سے بولا۔ "بیگم! اسپتال والوں نے تصدیق کی ہے۔ وہ ماں بننے والا ہے۔ یعنی کہ بننے والی ہے۔"

ماں بیٹی بے یقینی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ جب اسپتال والوں نے تصدیق کی تھی تو پھر بے یقینی کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

شام کو لاہور کی سڑکوں پر بڑا زبردست ٹریفک ہوتا ہے۔ تمام ماڈلز کی نئی پرانی گاڑیاں ایک دوسرے کے آگے پیچھے اس طرح پھنسی رہتی ہیں کہ وہاں سے موٹر سائیکل اور پیدل چلنے والوں کا گزرنا محال ہوجاتا ہے۔ مراد فرار ہونے کے لیے کسی کم ٹریفک

والے راستے کی طرف جاسکتا تھا لیکن اسے بتایا گیا تھا کہ تابانی شہر کے باہر ملتان روڈ پر کہیں ملے گی۔ لہٰذا اسے ٹریفک کے ہجوم سے گزر کر ملتان روڈ پہنچنے میں پون گھنٹا لگ گیا پھر ملتان روڈ پر بھی ایورنیو اسٹوڈیو تک ٹریفک کا اچھا خاصا میلہ لگا رہتا تھا۔ ایسے راستوں سے گزرتے وقت اس نے کئی بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دائیں بائیں بھی نظر رکھی لیکن اس بھیڑ میں پولیس والے نظر نہیں آئے۔

شہر سے باہر تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے عقب نما آئینے میں ایک موٹر سائیکل سوار کو دیکھا۔ رات کی تاریکی چھا چکی تھی۔ فاصلہ بہت تھا اس لیے اس نے تعاقب کرنے والے جمشید کو نہیں پہچانا۔ کچھ اور فاصلہ طے کرنے کے بعد جیپ کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ اسے خطرے کا احساس ہوا۔ کبھی کبھی دوسری گاڑیاں تیز رفتاری سے اس کے قریب آکر گزر جاتی تھیں لیکن وہ موٹر سائیکل اور جیپ پیچھے برابر فاصلہ رکھ کر آرہی تھیں۔ نہ اس کے قریب پہنچ کر اسے روک رہی تھیں اور نہ ہی اسے اوور ٹیک کرکے آگے بڑھ رہی تھیں۔

اس نے اپنا شبہ دور کرنے کے لیے اپنی موٹر سائیکل کی رفتار ذرا سست کی تو پیچھے آنے والی دونوں گاڑیاں بھی سست رفتاری سے چلنے لگیں۔ اس نے اچانک رفتار بڑھائی۔ پیچھے والی گاڑیاں بھی تیز رفتاری سے بڑھنے لگیں۔ جمشید کو وقت ضائع کرنا تھا اور اوپر والوں کو سمجھانا تھا کہ مفرور مراد کو تلاش کیا جارہا ہے اور وہ اب تک نظروں میں نہیں آیا ہے۔

اسے تلاش کرنے کے لیے دوسری پولیس پارٹی پنڈی جانے والی شاہراہ پر بھیجی گئی تھی۔ آگے تمام علاقوں کے تھانے والوں کو ایک مجرم کے فرار ہونے کی اطلاع دی گئی تھی۔ اپنی مصروفیات اور پریشانیوں سے اعلیٰ عہدے داروں کو یقین دلایا جارہا تھا کہ صبح سے پہلے مراد کو گرفتار کرلیا جائے گا۔

جسے تلاش کیا جارہا تھا' وہ پولیس والوں کی نظروں کے سامنے جارہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا' کس طرح پولیس والوں کو ڈاج دے کر راستہ بدلے اور پھر ایک لمبا چکر لگا کر دوبارہ ملتان روڈ پر آجائے۔ کیونکہ اسے دی ہوئی اطلاع کے مطابق تابانی اسی روڈ کے آس پاس ملنے والا تھا۔

آگے جاکر بدقسمتی اس کے دماغ پر دستک دینے لگی۔ پٹرول ختم ہو رہا تھا۔ یہ تو پہلے سے تیار کردہ منصوبہ تھا کہ پٹرول کی ٹینکی فل نہ ہو اور آگے جانے والا رکنے پر مجبور ہوجائے۔ تھانے والوں نے پچھلی رات اس کی جیب خالی کردی تھی۔ پٹرول بھروانے کے

لئے بھی رقم نہیں تھی۔ گاڑی کی رفتار سست ہوتے ہوتے رکنے لگی۔ پیچھے آنے والی گاڑیوں کی رفتار بڑھ گئی۔ وہ موٹر سائیکل کو سڑک کے کنارے چھوڑ کر درختوں کے جھنڈ کی طرف بھاگنے لگا۔ جمشید اور دوسرے مسلح سپاہی بھی وہاں گاڑیاں روک کر اس کے پیچھے دوڑنے لگے۔ درختوں کے باعث وہاں گہری تاریکی تھی۔ جمشید اور سپاہیوں کے پاس کئی ٹارچ تھیں لیکن جو بھی ٹارچ روشن کرتا' مراد روشنی کی سمت گولی چلا دیتا۔ یوں جان جانے کا اندیشہ تھا۔ وہ تاریکی میں دبے قدموں دور دور پھیل گئے۔ اندھیرے میں صرف قدموں کی چاپ سن کر یا سوکھے پتوں کی کراہیں سن کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ شکار کہاں ہے؟ اور کتنے فاصلے پر ہے؟

وہ کہیں قریب تھا کیونکہ دور جانے کے لیے اسے دوڑنا یا تیزی سے چلنا پڑتا۔ اس طرح قدموں سے ابھرنے والی آواز اور سوکھے پتوں کی چرمراہٹ اس کی موت کا سبب بن جاتی۔ اس تاریکی میں جمشید اور دوسرے سپاہی ایک دوسرے سے دور اپنی اپنی جگہ تنہا رہ گئے تھے۔ ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ وہ دھوکے سے ایک دوسرے کو گولیوں کا نشانہ بنا دیتے۔ ویسے جمشید نے تمام سپاہیوں کو سمجھا دیا تھا کہ جب تک پوری طرح یقین نہ ہو کہ مراد نشانے پر ہے' تب تک کبھی گولی نہ چلانا۔

اس نے سپاہیوں کی سلامتی کے لیے یہ بات سمجھائی تھی مگر یہی بات ایک سپاہی کی موت کا باعث بن گئی۔ اس نے تاریکی میں قریب ہی آہٹ سنی تھی۔ وہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ آہٹ پیدا کرنے والا اپنا ساتھی سپاہی ہوگا۔ اسی وقت مراد نے اسے گولی ماردی۔

ویرانے میں اس کی آخری چیخ گونجی۔ پھر گہری خاموشی چھاگئی۔ جمشید اور دوسرے سپاہیوں نے سمجھ لیا کہ ان کا ایک ساتھی اپنے فرض کی ادائیگی میں مارا گیا ہے۔

جمشید نے ایک درخت کی آڑ لے کر کہا۔ "مراد! میں اپنی آواز سنا رہا ہوں۔ کہیں سے چھپ کی مجھے گولی مارو۔ دیکھو' میں بولتا جارہا ہوں۔ آواز سناتا جارہا ہوں۔ کم آن شوٹ می۔"

ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ایک گولی جمشید کی طرف آئی اور ایک درخت کے تنے میں پیوست ہوگئی۔ اس نے درخت کے پیچھے سے نکل کر ٹارچ روشن کرتے ہوئے کہا "تمہارا کھیل ختم ہوگیا۔"

وہ روشنی میں نظر آیا۔ اس نے روشنی کی طرف گولیاں چلائیں لیکن کھٹ کھٹ کی آواز ابھر کر رہ گئی۔ جمشید نے کہا۔ "تمہاری موٹر سائیکل کی ٹنکی کی طرح وہ ریوالور بھی پورا لوڈ نہیں تھا۔ میں نے اس میں صرف دو گولیاں رکھوائی تھیں تمہیں فرار ہونے کی

عجلت میں ریوالور کو چیک کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اب تمہارے ہاتھ میں محض ایک کھلونا رہ گیا ہے۔"

ایک سپاہی نے غصے سے کہا۔ "سر! اس کتے نے ہمارے ساتھی کو مار ڈالا ہے۔ ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

جمشید نے کہا۔ "مفرور مجرم سے کاؤنٹر فائرنگ ہوتی ہے۔ ہمارے پاس اسے گولی مارنے کا جواز ہے کہ ہم اسے ہلاک نہ کرتے تو یہ ہمارے ایک سپاہی کی طرح سب کو بھی قتل کردیتا۔"

جمشید نے اپنا ریوالور ہولسٹر میں رکھا وہاں سے پلٹ کر سڑک کی طرف جانے لگا۔ اسے اپنے پیچھے تڑا تڑ فائرنگ کی آوازوں کے ساتھ مراد کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

☆======☆======☆

نازاں نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی دیر تک غسل نہیں کیا تھا۔ وہ دو گھنٹے تک صابن کے جھاگ سے بھرے ہوئے باتھ ٹب میں بیٹھی رہی اور ایک گھنٹے تک شاور کے نیچے بدن کو اچھی طرح مل کر صاف کرتی رہی۔ غسل کے ان مراحل سے گزر کر وہ بالکل صاف ستھری اور شفاف آئینے کی طرح ہوگئی۔ اس کے باوجود ذہن میں اس کچرا ٹرک کا خیال تھا اور اس خیال سے ہی ناگواری محسوس ہونے لگتی تھی۔

اس نے تولئے سے بدن کو پونچھنے کے بعد پورے باتھ روم کے اندر پرفیوم سے اسپرے کیا۔ وہ باتھ روم خوشبوؤں سے بھر گیا۔ اس نے باتھ ٹب میں دوسری بار صابن کا جھاگ بنایا۔ پھر اس کے اندر نیم دراز ہوکر صابن ملنے لگی۔ ریشمی زلفوں کو دوبار شیمپو سے دھوچکی تھی۔ آخر میں پھر ایک بار شاور کے نیچے آکر بھیگنے لگی۔

اس نے راجہ نواز کو فیصلہ سنا دیا تھا کہ اب وہ اسی کے ساتھ رہے گی۔ راجہ نواز اسے گوٹھ امیر کھوکھر لے آیا تھا۔ وہاں کے وڈیرے رئیس کھوکھر سے اس کی گہری دوستی تھی۔ اس وقت نازاں اسی حویلی کے باتھ روم میں نہا رہی تھی۔ راجہ نواز اور رئیس حویلی کی اندرونی بیٹھک میں بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ رئیس اس کے عشق کی داستان سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "بھئی راجہ! تمہارا جواب نہیں۔ تم نے لیلیٰ مجنوں سے بڑھ کر عشق کیا ہے۔ وہ تو محبت میں ناکام رہے تھے مگر تم نے وڈیروں اور سیاست دانوں سے جنگ کرتے ہوئے اپنی نازاں کو حاصل کرلیا ہے۔"

"ہاں۔ مگر ابھی منزل نہیں ملی ہے۔ نازاں کے باپ اور بھائی اور وہ خطرناک سیاست داں کاشف اکبر میرے خون کے پیاسے ہورہے ہیں۔"

رئیس نے کہا۔ "یہ کاشف اکبر سندھ کے اندرونی علاقوں میں پتھاروں اور ڈاکوؤں کے ذریعے اپنا رعب اور دبدبہ قائم رکھتا ہے۔ ایسے کتنے ہی ڈاکو ہیں جن کی گرفتاری کے لیے حکومت نے لاکھوں روپے کے انعامات رکھے ہیں۔ ان میں سے کچھ کاشف اکبر کی پناہ میں رہتے ہیں۔ وہ ان ڈاکوؤں کی دہشت طاری کرکے الیکشن میں ووٹ حاصل کرتا ہے اور عام دنوں میں انہیں پولیس اور ضلعی انتظامیہ کی کارروائیوں سے باخبر رکھ کر انہیں فرار ہونے اور رُوپوش رہنے کا موقع دیتا ہے۔"

راجہ نواز نے کہا۔ "پاکستان سے پہلے جب برٹش حکومت تھی تو انگریز ان ڈاکوؤں اور وڈیروں کے گٹھ جوڑ کے ذریعے حکومت کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد پولیس میں جو کالی بھیڑیں ہیں' وہ وڈیروں کے ساتھ مل کر ڈاکوؤں کو تحفظ فراہم کرتی ہیں۔"

"تم یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی نازاں کو یہاں لائے ہو۔ اندرون سندھ جہاں بھی جاؤ گے' کاشف اکبر کی پروردہ پولیس اور ڈاکو تمہیں گھیریں گے۔ نازاں کے ساتھ تم کہیں بھی سکون سے نہیں رہ سکو گے۔ میں ساری عمر تمہیں پناہ دے سکتا ہوں لیکن مجھ پر اور میرے خاندان کے افراد پر آفتیں نازل ہوتی رہیں گی۔"

راجہ نے کہا۔ "رئیس! تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں مصیبتوں میں مبتلا نہیں کروں گا۔ شام ہونے سے پہلے نازاں کو لے کر چلا جاؤں گا۔"

"تمہیں اندرون سندھ کا رخ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ پنجاب چلے جاتے تو بڑی حد تک محفوظ رہتے۔"

"میں سپر ہائی وے یا نیشنل ہائی وے کے راستے پنجاب جاتا تو اب تک مخالفین کے شکنجے میں آجاتا۔ امیر حمزہ سے میرے ایسے گہرے تعلقات ہیں کہ حکومت بھی میری مخالف ہے اسی لیے میں نے یہ اندرونی راستے اختیار کیے ہیں۔ یہاں سے میں گوٹھ شاہ بیگ کے راستے سے بلوچستان جاؤں گا۔ پھر وہاں سے پنجاب کا رخ کروں گا۔"

"مگر تمہاری کار اپنے ماڈل اور نمبروں کی وجہ سے پہچانی جائے گی اگر میں اپنی گاڑی دوں تو یہاں آکر تمہیں تلاش کرنے والوں سے یہ بات چھپی نہیں رہے گی۔"

"مجھے گاڑی کی پروا نہیں ہے۔ میں ہزاروں کلومیٹر پیدل چل سکتا ہوں۔ مجھے نازاں کی فکر ہے۔"

"یہاں کے ناہموار راستوں پر پجارو یا لینڈ کروزر جیسی گاڑیاں چلتی ہیں یا پھر گدھا گاڑی لیکن گدھا گاڑی سے تمہارا کچھ بھلا نہیں ہوگا۔"

"جس طرح ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملتا ہے۔ اسی طرح گدھا گاڑی ہمارے کام آسکتی

ہے۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ میں ایک گاڑی کا انتظام کردیتا ہوں۔ میرے کھیتوں کا ٹیوب ویل کام نہیں کررہا۔ میں وہاں جارہا ہوں۔ ایک گھنٹے بعد حویلی کے پیچھے گدھا گاڑی آجائے گی۔ میں بھی تمہیں رخصت کرنے آؤں گا۔ تمہیں راستے میں اچھی خاصی رقم کی ضرورت پڑے گی۔ یہ یار کس دن کام آئے گا۔ جتنی رقم چاہو' یہاں سے لے جانا۔"

راجہ نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "رقم کی ضرورت ہوگی تو میں بعد میں آکر لے جاؤں گا۔ میں صرف چند گھنٹوں تک نازاں کی خاطر یہاں رہنا چاہتا تھا اور یہ میرا پختہ اعتماد ہے کہ تم دوسرے وڈیروں سے مختلف ہو۔ یعنی وڈیرے بعد میں ہو۔ پہلے میرے یار ہو۔"

وہ دونوں ہنستے ہوئے گلے مل گئے پھر رئیس نے ملازم کو بلا کر سمجھایا کہ بی بی جی غسل کرلیں تو مہمانوں کے لیے دستر خوان بچھا دینا۔ کسی چیز کی کمی نہ ہونے دینا۔ اگر کوئی باہر والا پوچھے کہ کار میں آنے والے کون ہیں تو کہہ دینا۔ میرے مہمان ہیں اور میرے ساتھ کھیتوں کی سیر کرنے گئے ہیں۔

اس نے راجہ سے بھی کہا۔ "تم نازاں کے ساتھ اکیلے باہر نہ نکلنا اور کوئی بھی آئے تو حویلی کے پچھلے کمرے میں جاکر چھپ جانا۔ ویسے حویلی کے باہر جو ملازم ہے' وہ میری اجازت کے بغیر کسی کو اندر نہیں آنے دے گا۔ تم اطمینان سے رہو۔"

وہ چلا گیا۔ راجہ نے حویلی کے اندرونی حصے میں آکر ایک دروازے پر دستک دی۔ اس حویلی کے مالک رئیس کے بیوی بچے شہر گئے ہوئے تھے۔ وہاں تقریباً ویرانی تھی۔ اندر صرف ایک ہی ملازم تھا۔ دستک کی آواز سن کر نازاں نے پوچھا۔ "کون؟"

"میں ہوں' تمہارے دل پر راج کرنے والا راجہ۔"

اس نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ وہ غسل خانے سے نکل کر آئی تھی۔ بدن کو ایک بڑے سے تولیے سے لپیٹ لیا تھا۔ راجہ نے اندر آکر دروازے کو بند کیا۔ نازاں نے پوچھا۔ "باہر خیریت ہے؟ کوئی دشمن تو نہیں ہے؟"

"خیریت کیسے ہوسکتی ہے؟ ایک دشمن ہے۔"

اس نے پریشان ہوکر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"وہ دشمن یہ تولیہ ہے۔"

اس نے اسے بازو میں سمیٹ لیا۔ وہ اس کی دھڑکنوں سے لگ کر بولی۔ "تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

اس کے گورے بدن پر پانی کے قطرے شبنم کے موتیوں کی طرح لرز رہے تھے اور جذبوں کو لرزنے پر مجبور کر رہے تھے۔ اس نے کہا۔ "تمہیں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن حقیقتاً ہم خطرات میں گھرے ہوئے ہیں۔ یہاں کاشف اکبر کے پروردہ ڈاکو بھی آسکتے ہیں۔ تمہیں یہاں رئیس کی بیوی کا کوئی لباس پہننے کو مل جائے گا۔"

وہ بولی۔ "میں نے کبھی کسی کی اترن نہیں پہنی مگر مجبوری ہے۔ کیا ہم ابھی یہاں سے جائیں گے۔"

"ہاں لباس پہن لو۔ کھانے کے بعد چل پڑیں گے۔"

وہ کمرے سے باہر آگیا۔ ملازم ان کے لیے دوسرے کمرے میں دسترخوان لگا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد نازاں ایک سندھی لباس پہن کر آئی۔ اس لباس میں وہ خوب جچ رہی تھی۔ ویسے بھی وہ سندھی تھی۔ وہاں کے پہننے اوڑھنے اور رسم و رواج کو خوب سمجھتی تھی۔ راجہ نے کہا۔ "ہم شہر میں رہ کر سمجھ نہیں پاتے۔ اس صوبے کے اندر ڈوبنے سے پتا چلتا ہے کہ سندھ کی خوب صورتی سب سے منفرد اور سب سے نمایاں ہے۔"

شام کے پانچ بجے رئیس واپس آگیا۔ وہ دونوں روانگی کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ رئیس نے نوٹوں کی ایک گڈی بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے رکھ لو۔ مانا کہ تمہارے پاس رقم ہے لیکن نازاں بھابی پہلی بار میرے گھر آئی ہیں۔ میں یہ رقم بھابی کو دے رہا ہوں۔"

راجہ نے کہا۔ "ابھی ہماری شادی نہیں ہوئی ہے۔ یہ جلد ہی تمہاری بھابی بنے گی۔ میں پہلے بھی تم سے کہہ چکا ہوں۔ رقم لینے میں تمہارے پاس آؤں گا۔ تم سے بڑا حاتم طائی دوست اور کون ہے؟"

وہ حویلی کے پچھلے دروازے سے باہر آئے۔ رئیس نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم تھانے کے سامنے سے گزرو۔ تھانے دار بہت لالچی اور خود غرض ہے۔ کاشف اکبر کے آدمیوں کو تمہارے پیچھے لگا دے گا۔ یہاں سے تم کھیتوں کے راستے چلے جاؤ۔"

نازاں گاڑی پر بیٹھنے لگی۔ راجہ نے کہا۔ "تمہاری گاڑی کے یہ گدھے بہت صحت مند ہیں۔"

رئیس نے کہا۔ "تم گوٹھ شاہ بیگ کے راستے سے جاؤ گے۔ اتفاق سے یہ گدھے مال برداری کے لیے اسی راستے پر جانے اور آنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ تمہیں پریشان نہیں کریں گے۔"

وہ دونوں رئیس سے رخصت ہوکر وہاں سے چل پڑے۔ گاڑی تیزی سے چلنے لگی۔ گدھے تیز رفتاری سے جا رہے تھے۔ نازاں نے کہا۔ "تم انہیں ایسے ہانک رہے ہو'

جیسے پہلے بھی گدھا گاڑی چلاتے رہے ہو۔"

"گدھوں کو قابو میں رکھ کر ہانکنا اور اپنی مرضی کے راستے پر انہیں چلانا' میں نے خوب سیکھا ہے۔ تم خود دیکھ رہی ہو کہ تمہارے باپ بھائی اور کاشف اکبر کو کس طرح ہانکتے ہوئے اپنے راستے پر چلا رہا ہوں۔"

وہ پیار سے غصہ دکھاتے ہوئے بولی۔ "میرے بابا سائیں اور بھائی جان کو گدھا نہ کہو۔"

"ہاں۔ اپنوں کو برا کہا جائے تو برا لگتا ہے لیکن کسی کو غلط نہ کہا جائے تو اس کی غلطیاں ختم نہیں ہوجاتیں۔ تمہارے بھائی اور تمہارے بابا سائیں کٹھ پتلیوں کی طرح کاشف اکبر کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں۔ انہوں نے تمہاری اس بات پر بھروسا نہیں کیا کہ کاشف اکبر نے تمہیں اغوا کرانے کی کوشش کی تھی۔ وہ بیٹی کی عزت کے دشمن کو فرشتہ سمجھ رہے ہیں۔"

"راجہ! ان کی باتیں نہ کرو مجھے صدمہ پہنچتا ہے۔"

وہ خاموش رہا۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ گاڑی کو کھینچنے والے گدھے واقعی گوٹھ بیگ کے راستے پر چلنے کے عادی تھے۔ راستے میں دو موڑ آئے مگر وہ سیدھے چلتے رہے۔ تاریکی میں بھی انہیں راستہ دکھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ راجہ ایک جگہ گاڑی روک کر ایک سوکھے ہوئے درخت کی دو شاخیں توڑ لایا۔ پھر ان دونوں کو اپنے اور نازاں کے بیٹھنے کی جگہ پر مضبوطی سے باندھنے لگا۔ نازاں نے پوچھا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

راجہ نے کہا۔ "تم یہ گٹھڑی حویلی سے لائی ہو۔ کیا اس میں کپڑے ہیں؟"

"ہاں الماری میں رئیس کی بیوی کے تین نئے جوڑے رکھے تھے۔ انہیں استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ میں انہیں لے آئی ہوں۔"

راجہ نے گٹھڑی کھولی۔ اس میں سے ایک بڑا سا دوپٹہ نکال کر اس درخت کی شاخ کے اوپر ڈال دیا۔ دوسرا گہرے رنگ کا کپڑا دوسری شاخ پر ڈال کر کہا۔ "اب ہم انہیں ذرا دور سے دیکھیں گے تو تاریکی میں ایسا لگے گا جیسے ہم دونوں بیٹھ کر جا رہے ہیں۔"

راجہ نے اپنی اٹیچی اور نازاں نے اپنی گٹھڑی اٹھالی۔ اس نے گدھوں کو ہانک دیا۔ وہ پھر آگے بڑھنے لگے۔ نازاں نے دور جانے والی گدھا گاڑی کو دیکھ کر کہا۔ "واقعی ایسا لگ رہا ہے جیسے گاڑی میں دو افراد بیٹھ کر جا رہے ہوں۔ کیا تم خطرہ محسوس کر رہے ہو؟"

وہ دونوں کچے راستے کو چھوڑ کر اس راستے سے ذرا دور رہ کر درختوں کے درمیان

سے گزرنے لگے۔ راجہ نے کہا۔ "ابھی تمہیں اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔"

"میں نے ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔ ورنہ عقل اتنا تو سمجھاتی ہے کہ کاشف اکبر کے شہری کارندے اور اس کے پروردہ ڈاکو مجھے لے جانے اور تمہیں مار ڈالنے ادھر ضرور آئیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد ہی رات کے سناٹے میں گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ ان کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ بڑی دیر سے اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے اور کسی حد تک دیکھنے کے عادی ہوگئے تھے۔ انہیں چار گھڑسوار سائے کی طرح نظر آئے۔ وہ ایک دوسرے سے دور ہوتے ہوئے اس گدھا گاڑی کو گھیر رہے تھے۔ ایک گھڑسوار نے ہوائی فائر کرنے کے بعد کہا۔ "گاڑی روکو۔"

گدھے تو پھر گدھے ہوتے ہیں۔ بندوق کی گولیوں سے نہیں ڈرتے۔ صرف ڈنڈے کی زبان سمجھتے ہیں۔ وہ بے چارے دھمکی سے بے نیاز چلے جا رہے تھے۔ ان چار گھڑسواروں کو بتایا گیا ہوگا کہ راجہ نواز کے پاس اسلحہ ہے اس لیے وہ احتیاطاً گاڑی سے دور تھے۔ ان میں سے پھر ایک نے کہا۔ "ہم دھمکی نہیں دے رہے ہیں۔ گاڑی روک کر اپنا ہتھیار دور پھینک دو۔ ورنہ چاروں طرف سے گولیاں چلیں گی اور تم حرام موت مرو گے۔"

وہ تھوڑی دیر تک گاڑی سے دور رہ کر چلتے رہے پھر ایک نے کہا "اے لڑکی! تُو گاڑی سے اتر جا۔ ہم اسے گولی ماریں گے۔ سائیں اکبر نے تجھے زندہ لانے کا حکم دیا ہے۔"

راجہ نے نازاں کے کان میں پوچھا۔ "ریوالور چلانا آتا ہے؟"

"ہاں۔ میں نے پندرہ برس کی عمر میں سیکھا تھا۔"

اس نے اسے ایک ریوالور دیتے ہوئے کہا۔ "گولی کی عمر سولہ برس ہوگی تو دشمن فوراً مرمٹے گا۔"

اس نے اٹیچی کھول کر ایک ٹی ٹی نکالی۔ پھر کہا۔ "تم اس سفید گھوڑے والے کا نشانہ لو۔ اس کے فوراً بعد ہی جو نشانے پر آجائے اسے جانے نہ دینا۔ چلو نشانہ لو۔"

نازاں نے نشانہ لے کر گولی چلائی۔ اس کے ساتھ ہی راجہ نے فائر کیا۔ بیک وقت دو گھوڑے ہنہنائے۔ دو سواروں کی چیخیں ابھریں اور وہ زمین پر پہنچ گئے۔ راجہ نے تیسرے کا نشانہ لیا اور نازاں نے چوتھے کو گولی ماری۔ راجہ کا شکار گھوڑے سمیت گرا' نازاں کے شکار کا گھوڑا اگلے دو پاؤں اٹھا کہ ہنہنایا پھر وہاں سے بھاگنے لگا۔ اس کا سوار

دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ اس کے پاؤں اس طرح رکاب میں پھنسے ہوئے تھے کہ وہ گر بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر آگے جاکر کہیں نہ کہیں گرنے والا تھا۔ اسے گولی لگ چکی تھی۔

اس گدھا گاڑی کے اطراف تین گھوڑے بھٹک رہے تھے انہوں نے دوڑتے ہوئے آکر دو گھوڑوں کی لگامیں تھام لیں پھر ان پر سوار ہوگئے۔ راجہ نے کہا۔ "تم نے تو کمال کردیا۔ میں سمجھتا تھا' صرف دل کا نشانہ لیتی ہو۔ تم نے تو دو کی جان لے لی۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "تم بولتے خوب ہو؟"

دونوں نے اپنے اپنے گھوڑے کو ایڑھ لگائی۔ پھر اسے سرپٹ دوڑانے لگے۔

رات کا ایک بجا تھا۔ تھانے دار دو سپاہیوں کے ساتھ جاگ رہا تھا جبکہ اندھیرا ہوتے ہی وہ پینا شروع کردیتا تھا۔ پھر رات نو بجے تک کھانے کے بعد تھانے کے پیچھے ایک مکان میں جاکر سو جاتا تھا۔ اس نے وال کلاک کو دیکھ کر بے چینی سے کہا۔ "پتا نہیں' وہ چاروں کہاں مرگئے ہیں۔ انہیں بارہ بجے سے پہلے واپس آجانا چاہیے تھا۔"

ایک سپاہی نے کہا۔ "حضور! ڈاکو پھر ڈاکو ہوتے ہیں۔ ان کی نیت خراب ہوسکتی ہے۔ وہ لڑکی بہت خوب صورت ہے۔"

اس کی بات پر تھانے دار کچھ کہنا چاہتا تھا۔ پھر چپ ہوگیا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں۔ آوازیں دور سے آرہی تھیں۔

ایک سپاہی نے کہا۔ "میں دیکھ کر آتا ہوں' وہ لڑکی کو لے آئے ہوں گے۔"

وہ باہر چلا گیا۔ تھانے دار نے دوسرے سپاہی سے کہا۔ "میں نے ان سے کہا تھا۔ لڑکی کو کوئی ہاتھ نہ لگائے جاکر دیکھو' وہ اسے الگ گھوڑے پر لا رہے ہیں یا نہیں؟ وہ سائیں اکبر کی چیز ہے۔ اسے کچھ ہوگیا تو وہ میری وردی اتروا کر الٹا لٹکا دیں گے۔ گولی بھی مار سکتے ہیں۔"

دوسرا سپاہی بھی باہر چلا گیا۔ تھانے کے اندر اور باہر خاموشی چھاگئی۔ گھوڑوں کی ٹاپیں بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ وہ ٹہلتے ہوئے انتظار کرنے لگا۔ پھر اس نے رک کر دیکھا کھلے ہوئے دروازے پر نازاں کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف تھے۔ وہ خوش ہوکر بولا۔ "خدا کا شکر ہے' تم آگئیں۔ نہیں تو سمجھو میری نوکری گئی تھی۔ اندر آؤ۔ آرام سے بیٹھو۔ کچھ اداس لگ رہی ہو۔ ہاں ہاں۔ میں سمجھ گیا۔ وہ تمہیں بھگا کر لانے والا مارا گیا ہے۔ بھئی اسے تو مرنا ہی تھا۔ اس نے کام ہی ایسا کیا تھا۔ تمہیں شیر کے جبڑے سے نکال کر لے جانے کی حماقت کر رہا تھا۔"

وہ بولی۔ "مجھے لے جانے والا ایسا شکاری ہے' جو شیروں کے جبڑے چیر ڈالتا ہے۔"

اس نے ایک ہاتھ آگے کیا۔ اس ہاتھ میں ریوالور تھا وہ اسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولی۔ "حکومت سے تنخواہ لے کر سیاست دانوں کے تلوے چاٹنے والے کتے! کیا کاشف اکبر ابھی آکر تمہیں بچا سکتا ہے؟"

تھانے دار نے اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھتے ہی بوکھلا کر پوچھا۔ "یہ کیا کر رہی ہو۔ اسے ادھر کرو۔ گولی چل جائے گی۔"

"یہ ریوالور تمہارے ساتھ کھیلنے کے لیے نہیں' گولی چلانے کے لیے ہے۔"

"دیکھو۔ ایسی غلطی نہ کرو۔ ان نمک حرام ڈاکوؤں نے مجھ پر گولیاں چلانے کے لیے تمہیں آزاد کیوں چھوڑ دیا ہے؟"

راجہ نے نازاں کے پیچھے آکر کہا۔ "تمہارے نمک حراموں نے مجھے بھی تمہاری موت بنا کر آزاد چھوڑ دیا ہے۔"

"را۔ راجہ۔ تت۔ تم زندہ ہو؟ یا۔ یعنی کہ۔ کہ تم نے ان ڈاکوؤں کو مار ڈالا؟"

"اگر مرنے والے ڈاکو تھانے میں حاضر ہوسکتے ہیں تو انہیں آواز دو یا پھر جواب دو' تمہارے اشاروں پر کام کرنے والے اور کتنے ڈاکو ہیں؟"

"میں تو ایک معمولی تھانے دار ہوں۔ ان علاقوں کے ڈاکو مجھ جیسے معمولی تھانے داروں کے نہیں' وڈیروں کے تابع دار ہوتے ہیں۔"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میرے وڈیرے دوست رئیس نے ان ڈاکوؤں کو میری ہلاکت کے لیے بھیجا تھا؟"

"ہاں۔ وڈیرا کسی کا دوست نہیں ہوتا۔ وہ صرف سیاست دانوں سے دوستی رکھتا ہے۔ وہ ان کے لیے اپنے علاقوں میں ووٹ بینک بناتا ہے اور انہیں اسمبلی میں پہنچا کر ان سے مراعات حاصل کرتا ہے۔"

"اور سیاست داں اور وڈیرے جیسے بڑے مگرمچھ جیسا چاہتے ہیں' ویسا ہی تمہارے پولیس اسٹیشنوں کا قانون بدلتا رہتا ہے اور قانون اکثر یہی رہتا ہے کہ ڈاکوؤں کی حفاظت کرو اور ہم جیسوں کو مار ڈالو۔"

"میں تو حکم کا بندہ ہوں۔ جیسا کہا جاتا ہے' ویسا کرتا ہوں۔"

"تمہارے ویسا ہی کرنے کے نتیجے میں ہم مر چکے ہیں......... لیکن ہمارے نہ مرنے کے نتیجے میں تم زندہ نہیں رہ سکو گے۔ ناز اس تھانے دار کو دکھاؤ تمہارا نشانہ بڑا پکا ہے۔"

تھانے دار نے چیخ کر کہا۔ "نہیں مجھے نہ مارو۔ دیکھو۔ گو گو۔ گولی چل جائے گی۔"

وہ سپاہیوں کو پکارنا چاہتا تھا مگر نازاں نے ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کے سینے میں لگی۔

اور وہ سپاہیوں کو مدد کے لیے بلانے کے قابل نہ رہا۔ صوبوں کے اندرونی علاقوں میں معصوم افراد کو ظالموں سے بچانے اور ان کے حقوق کی حفاظت کرنے کے لیے تھانے قائم کیے جاتے ہیں لیکن جب بڑے بڑے شہروں کے تھانے فروخت ہوجاتے ہیں تو ان چھوٹے تھانوں کی کیا اوقات ہے؟

نازاں اور راجہ اس تھانے سے باہر آئے۔ وڈیرے رئیس کی حویلی کی طرف جانے لگے۔ نازاں نے کہا۔ "تم نے اپنے دوست پر بھروسا کیا تھا۔"

"نہیں ناز! میں اپنے سائے پر بھی بھروسا نہیں کرتا۔ مجھے اس پر شبہ تھا اسی لیے میں نے گدھا گاڑی سے تمہیں اتار کر ایسی تدبیر کی تھی کہ شکاری اب خود شکار ہوتے اور بے موت مرتے جارہے ہیں۔"

وہ دونوں حویلی کے احاطے والے بڑے گیٹ کے قریب ایک دیوار کی آڑ میں رک گئے۔ وہاں گیٹ پر ایک نائٹ چوکیدار رائفل لیے بیٹھا تھا۔ اسی وقت حویلی کی اوپری بالکونی سے رئیس کی آواز سنائی دی۔ "جمعہ خان! اے جمعہ خان!"

نائٹ چوکی دار نے پلٹ کر اوپر بالکونی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "جی مالک؟"

"کیا تھانے سے کوئی آیا تھا؟"

"نہیں مالک!"

"وہ چاروں گھڑسوار بھی واپس نہیں آئے۔ انہیں تو دو گھنٹے پہلے واپس آجانا چاہیے تھا۔ جاؤ تھانے دار سے پوچھو' وہ نازاں کو واپس لائے بھی ہیں یا نہیں؟"

"ابھی جاتا ہوں مالک!"

رئیس بالکونی سے حویلی کے اندر چلا گیا۔ جمعہ خان جانے کے لیے اس دیوار کی طرف سے گزرنے لگا۔ راجہ نے آگے بڑھ کر ایک ہاتھ سے اس کی گردن شکنجے میں لے لی۔ وہ شکنجے سے نکلنے کی کوششیں کرنے لگا۔ نازاں نے اسے ریوالور کے نشانے پر لیا تو وہ جدوجہد کرنا بھول گیا۔ راجہ نے اس کی گردن چھوڑ کر رائفل کے دستے سے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ وہ چکرا کر زمین پر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔

وہ دونوں وہاں سے گیٹ کے پاس آئے۔ اس کے چھوٹے دروازے کو کھولا۔ انہوں نے حویلی میں رئیس کی خدمت کے لیے ملازم کو دیکھا تھا۔ وہ اس پر بھی قابو پاسکتے تھے لیکن وہ حویلی کی بیٹھک میں پہنچ کر ٹھٹک گئے۔ وہاں ایک گن مین صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ڈاکو ہے۔ اس کے قریب ہی ایک کلاشنکوف رکھی ہوئی تھی۔ سامنے میز پر کچھ کھانے کی چیزیں' شراب کی دو بوتلیں اور گلاس وغیرہ

رکھے ہوئے تھے۔ اس نے اتنی پی تھی کہ ایک بوتل خالی ہو چکی تھی۔ دوسری بوتل آدھی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد وہ پینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ مدہوش ہو کر صوفے پر آدھا بیٹھا اور آدھا لیٹا ہوا تھا اور ادھ کھلی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

وہ دونوں اسے ریوالور اور ٹی ٹی کے نشانے پر لے کر آگے بڑھنے لگے۔ اگر وہ اپنی کلاشنکوف کی طرف ہاتھ بڑھاتا تو وہ اسے گولی مار دیتے۔ راجہ نے قریب پہنچ کر اس کی کلاشنکوف اٹھالی۔ وہ اسی طرح مدہوش پڑا رہا۔ وہ اس پر جھک کر توجہ سے دیکھ کر بولا "ناز! یہ تو بہت خطرناک قاتل اور ڈاکو ہے۔ حکومت نے اس کی گرفتاری کے لیے پانچ لاکھ روپے کا انعام رکھا ہے۔"

انہیں رئیس کی آواز سنائی دی۔ وہ ملازم کو آواز دے کر بلا رہا تھا۔ ملازم کا جواب نیچے ایک کمرے سے سنائی دیا۔ "آیا مالک! ابھی آیا۔"

وہ دونوں اسی کمرے کے دروازے کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی ملازم کمرے سے نکلا' اس کے سر پر بھی قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ بھی ہوش سے بے گانہ ہو کر گر پڑا۔ راجہ نے کہا۔ "ناز! تم اس ڈاکو کی نگرانی کرو۔ میں اپنے پیارے دوست سے نمٹ کر آتا ہوں۔"

وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپری منزل پر آیا۔ رئیس اپنے کمرے میں فون پر کہہ رہا تھا "جناب عالی! چار ڈاکو گئے تھے۔ ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں۔ میں نے ملازم کو تھانے دار کے پاس بھیجا ہے۔ مجھے یقین ہے۔ وہ نازاں کو لے کر آتے ہی ہوں گے۔ جی۔ جی۔ جی ہاں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ جیسے ہی نازاں یہاں پہنچے گی۔ میں آپ کو فون پر اطلاع دوں گا بلکہ اس کی آواز بھی سناؤں گا۔"

وہ ریسیور رکھ کر پلٹا۔ پھر دروازے پر راجہ کو دیکھتے ہی خوف سے چیخ نکل گئی۔ راجہ نے کہا۔ "میں نے پہلا دوست دیکھا ہے' جو اپنے دوست کو دیکھ کر خوف سے چیخ پڑتا ہے۔ ویسے اعمال اچھے ہوں تو دوست کو سلامتی ملتی ہے' خوف اور موت نہیں ملتی۔ مگر تم نے میری موت کا سامان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

وہ اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "مجھے غلط نہ سمجھو۔ کاشف اکبر صاحب نے خطرناک ڈاکو غلام بخش کو تمہیں مار ڈالنے اور نازاں کو یہاں سے کراچی پہنچانے کے لیے بھیجا تھا۔ تم سمجھ سکتے ہو۔ غلام بخش کتنا درندہ ہے۔ میں اس کا ساتھ دینے سے انکار کرتا تو وہ مجھے بھی مار ڈالتا۔"

"تم کاشف اکبر کے تابع دار ہو اسی لیے بے چینی سے میری موت کا اور نازاں کی

واپسی کا انتظار کر رہے تھے اور نازاں کے یہاں پہنچتے ہی اس کی سریلی آواز کاشف اکبر کو سنانے والے تھے۔"

"آں وہ بات دراصل یہ ہے کہ........"

"اصل بات یہی ہے کہ وڈیرے' سیاست دانوں کے بغیر اور سیاست داں' وڈیروں کے بغیر اقتدار اور قوت حاصل نہیں کر سکتے۔ تم سے دوستی کرنے کے باوجود میں نے اس حقیقت کو نہیں بھلایا تھا اس لیے تمہیں زندہ نظر آ رہا ہوں۔"

وہ بولا۔ "مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اس غلطی کو معاف کر دو۔ میں تمہیں اور نازاں کو دشمنوں سے بچا کر اس علاقے سے دور لے جاؤں گا۔"

"ہم اور تم موت سے کتنی دور جا سکتے ہیں؟ میری موت آئے گی تو میں مروں گا۔ تمہاری موت آئی ہے تو تم مرنے والے ہو۔"

راجہ نے اسے ٹی ٹی کے نشانے پر لیا۔ وہ پیچھے ہٹ کر دیوار سے لگ گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "تم میری بیوی کو بھابی سے زیادہ بہن سمجھتے ہو۔ اس کا سہاگ نہ اجاڑو۔ میرے بچوں کو اپنے بچے سمجھتے ہو۔ انہیں یتیم نہ بناؤ۔"

راجہ نے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر کہا۔ "تم نے میری دکھتی رگ پر انگلی رکھی ہے۔ میں اپنی بہن جیسی بھابی اور بچوں کی خاطر ایک بار تجھے معاف کر دوں گا۔ میرے سامنے ہاتھ نہ جوڑو۔"

وہ خوش ہو کر اپنا ہاتھ بڑھاتا ہوا مصافحہ کرنے آیا۔ راجہ نے کہا۔ "تم نے سنا ہو گا کہ ہر ہاتھ ملانے والا دوست نہیں ہوتا۔ ہاتھ کی لکیریں یہ نہیں بتاتیں کہ اس کی دوستی میں کتنا کھوٹ ہے۔ ابھی تم میرے لیے کھوٹے سکے ہو۔ چلو ریسیور اٹھاؤ اور کاشف اکبر سے رابطہ کرو۔"

اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ پھر رابطہ ہونے کے بعد بولا۔ "سیکرٹری! جناب عالی سے کہو' رئیس فون پر ہے۔ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

راجہ نے اس سے ریسیور لے کر کان سے لگایا۔ چند لمحوں کے بعد کاشف اکبر کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو۔ میں بول رہا ہوں۔"

"اس فون کے بعد بولنا بھول جاؤ گے۔ میں راجہ بول رہا ہوں۔"

ادھر سے کاشف اکبر بولا۔ "کیا؟ کون بول رہا ہے؟"

"تمہارا باپ۔ اس ملک کے اتنے بڑے سیاست داں ہو اور اپنا فون درست نہیں رکھ سکتے؟ میں راجہ بول رہا ہوں۔"

"راجہ؟ مگر میرا سیکرٹری کہہ رہا تھا کہ تم رئیس بول رہے ہو۔ کیا مذاق کررہے ہو؟ تم رئیس ہو یا نہیں؟"

"میں اتنا بڑا دل کا رئیس ہوں کہ نازاں مجھ پر جان دیتی ہے۔ تم نے میری نازاں کو حاصل کرنے کے لیے جتنے حربے آزمائے' وہ سب ناکام ہوگئے۔ تمہارے پالتو ڈاکو اور تمہارا زرخرید تھانے دار وغیرہ سب جہنم میں پہنچ گئے ہیں۔ یہ تمہارے خواب میں آئیں تو ان سے جہنم کا پتا پوچھ لینا۔ تمہیں ایک دن اس پتے پر پہنچنا ہے۔"

"بہت چہک رہے ہو اور بھول رہے ہو کہ اس ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک میری بے تاج بادشاہی ہے۔ خواہ اقتدار میں رہوں یا نہ رہوں۔ میری طاقت اور میرے اختیارات ختم نہیں ہوتے۔"

"تمہارے شاہی محل سے یہاں تک نازاں کو لاکر تمہارے اختیارات کو کھوکھلا کرچکا ہوں۔ تم اپنے جیسے سیاست دانوں سے الجھتے رہتے تو بہتر ہوتا۔ یہ جو بول رہا ہے نا؟ یہ اپنی نازاں کا دیوانہ ہے۔ دیوانہ تو پھر دیوانہ ہی ہوگا۔ پیار کے دشمنوں کو مارے گا یا مرجائے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے' جب تک نازاں کو حاصل کرنے کی ضد کرتے رہو گے' تب تک تمہارے منہ پر ناکامیوں کے جوتے پڑتے رہیں گے۔"

دوسری طرف ذرا دیر تک خاموشی رہی۔ وہ غصے سے دانت پیس رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "میرے وفادار وڈیرے رئیس کو بھی مار ڈالو اور بھاگو۔ میں دیکھتا ہوں کہ کہاں تک بھاگو گے۔ اب تمہیں کتے کی موت مارنے کے لیے کچھ نئے انتظامات کروں گا۔"

راجہ نے پوچھا۔ "کیا؟ ابھی تم نے کیا کہا؟ رئیس کو کیا کروں؟ فون میں گڑبڑ ہوگئی تھی۔ پھر سے بولو۔"

یہ کہتے ہی اس نے ریسیور رئیس کے کان سے لگا دیا۔ رئیس حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُدھر کی باتیں سننے لگا۔ پھر چیخ کر بولا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا میری وفاداری کا یہی صلہ ہے۔ آپ میری مدد نہیں کررہے اور راجہ سے کہہ رہے ہیں کہ مجھے مار ڈالے؟"

"رئیس! تم مجھ سے سیکڑوں میل دور ہو۔ وہاں پولیس اور ڈاکوؤں کے جتنے ذرائع تھے' انہیں راجہ نے ختم کردیا۔ دوسرے علاقوں سے مدد پہنچنے تک وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"آپ راجہ سے کوئی سمجھوتا تو کرسکتے ہیں۔"

"میں اپنے پالتو کتوں کی موت برداشت کرسکتا ہوں لیکن سمجھوتا کرنے کے لیے

چھوٹے لوگوں کے سامنے جھک نہیں سکتا۔ میرا وقت برباد نہ کرو اور مرجاؤ۔"

فون بند ہوگیا۔ وہ غصے سے فون کو پٹخ کر بولا۔ "مار دو۔ مجھے مار ڈالو۔ اس نے مجھے پالتو کتا کہا ہے۔ مجھے مرجانا چاہیے۔"

راجہ نے کہا۔ "جو دوست کو مار کر غلامی کو زندہ رکھتے ہیں۔ ایسے غلام کا یہی انجام ہوتا ہے۔ چلو اپنی تجوری کھولو۔"

وہ تجوری کے پاس جاکر اسے کھولتے ہوئے بولا۔ "ابھی صرف دو لاکھ روپے نقد اور زیورات ہیں۔ میں کل تک تمہیں پچاس لاکھ دے سکتا ہوں۔ مجھے نہ مارو۔ مجھے کاشف اکبر سے انتقام لینے کے لیے زندہ چھوڑ دو۔"

"تمہارے جیسا وڈیرا اس پہاڑ سے نہیں ٹکرا سکے گا۔"

اس نے دو لاکھ روپے کی ایک گڈی لے کر کہا۔ "میں ڈاکو نہیں ہوں اور نہ ہی ایسا کم ظرف ہوں کہ جسے دوست سمجھتا رہا' اس کی تجوری سے رقم لوٹ کر لے جاؤں۔ یہ رقم ابھی تمہیں منافع کے ساتھ واپس ملے گی۔"

"میں نہیں سمجھا۔ ابھی رقم لے رہے ہو اور ابھی منافع کے ساتھ واپس کرو گے مگر کیسے؟"

"میرے مشورے پر عمل کرو گے تو............ رقم بھی ملے گی۔ کاشف اکبر سے انتقام بھی لے سکو گے اور زندہ بھی رہو گے۔ میں تمہیں ہلاک نہیں کروں گا۔"

وہ فوراً ہی راجہ کے قدموں میں گر کر بولا۔ "تم ایک عظیم دوست ہو۔ مجھے ڈوب کر مرجانا چاہیے۔ میں نے دوستی کی قدر نہیں کی۔ مجھے بتاؤ کیا کرنا چاہیے؟"

"نیچے چلو۔"

وہ اسے اپنے آگے چلاتے ہوئے نیچے بیٹھک میں لے آیا۔ وہاں نازاں نے اس مدہوش ڈاکو غلام بخش کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ دیئے تھے۔ وہ راجہ کو دیکھ کر بولی "یہ اس قدر پینے اور مدہوش ہونے کے باوجود حرکت کررہا تھا۔ میں نے احتیاطاً اسے باندھ دیا ہے۔"

پھر وہ رئیس کو دیکھ کر بولی۔ "تم نے اسے ابھی تک زندہ رکھا ہے؟"

"نازاں! اگر ایک دوست کم ظرف ہو تو دوسرے کو بھی کم ظرف نہیں ہونا چاہیے۔ میں رئیس کو پھر ایک بار دوستی نباہنے کا موقع دوں گا۔"

پھر اس نے رئیس سے کہا۔ "یہ غلام بخش بہت خطرناک ڈاکو ہے۔ کئی قتل کرچکا ہے۔ کاشف اکبر اس علاقے میں اس کے ذریعے دہشت طاری رکھتا ہے۔ پولیس اور فوج

کے آپریشن سے یہ گرفتار نہیں ہوسکتا۔ اگر تم اسے گرفتار کراؤ گے تو اس سے علاقے میں کاشف اکبر کی سیاسی قوت کمزور پڑ جائے گی۔ وہ یہاں سے ووٹ حاصل نہیں کرسکے گا۔ اس طرح تم اس سے انتقام لے سکو گے۔"

وہ فضا میں گھونسا لہراتے ہوئے بولا۔ "میں اسے ضرور گرفتار کراؤں گا۔ کاشف سے انتقام لوں گا۔ وہ اس علاقے میں کبھی سیاسی کامیابیاں حاصل نہیں کرسکے گا۔"

راجہ نے کہا۔ "اس کی گرفتاری کے انعام کے طور پر تمہیں پانچ لاکھ روپے ملیں گے۔ ان میں سے یہ دو لاکھ میں لے جارہا ہوں اس طرح ایک دوست کی تجوری نہیں لوٹ رہا۔"

"راجہ! تمہاری اعلیٰ ظرفی کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ تمہیں تو پورے پانچ لاکھ ملنے چاہئیں۔"

"یوں سمجھو کہ پانچ لاکھ ہی لے رہا ہوں۔ اپنی پندرہ لاکھ کی کار تمہارے پاس چھوڑ کر تمہاری لینڈ کروزر لے جارہا ہوں۔ حساب تقریباً برابر ہوجائے گا۔"

وہ دونوں نازاں کے ساتھ گیراج میں آئے۔ اس کا پٹرول چیک کیا۔ پھر پٹرول کے دو فاضل کین رکھے۔ پھر اس نے کہا۔ "اگر تم نے اس ڈاکو کو قانون کے حوالے نہ کیا اور پھر میرے خلاف کوئی کارروائی کی تو پھر سمجھ لو' کوئی تمہیں مجھ سے بچا نہیں سکے گا۔"

وہ فوراً ہی موبائل نکال کر بولا۔ "میرے عظیم دوست میں ابھی ضلع کے کمشنر اور آئی جی کو اس ڈاکو کے بارے میں مطلع کرتا ہوں۔"

وہ رابطہ کرتے ہوئے متعلقہ افسران کو غلام بخش کے بارے میں بتانے لگا۔ پھر بولا "وہ اسے گرفتار کرنے کے لیے پولیس پارٹی کے ساتھ آرہے ہیں۔ راجہ تم فوراً چلے جاؤ۔"

وہ نازاں کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ کر بولا۔ "تم پولیس کو یہ نہیں کہو گے کہ تمہاری یہ گاڑی کوئی لے گیا ہے اور نہ ہی گاڑی کی نمبر پلیٹ بتاؤ گے۔"

"کوئی پوچھے گا تو کہہ دوں گا کہ میرا ایک عزیز گاڑی لے گیا ہے۔ تم مطمئن ہوکر جاؤ۔"

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ پھر اسے ڈرائیو کرتا ہوا وہاں سے جانے لگا۔ جب وہ گاڑی بڑے گیٹ سے گزر کر نظروں سے اوجھل ہوگئی تو رئیس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

☆=======☆=======☆

میں دھوکا کھا گیا۔ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوگیا کہ انیلا بانو مجھ پر اعتماد کررہی ہے۔ لیکن جب اس نے اپنے مسلح گارڈ کو بے ہوش دیکھا تو سمجھ گئی کہ جس طرح میں نے اس پر حملہ کرنے والوں کو بے ہوش کیا تھا' اسی طرح اس کے گارڈ کو بھی بے ہوش کیا ہے اور میں دوہری چال چل رہا ہوں۔ اسے ٹریپ کرکے اس اہم معاہدے کو حاصل کرنا چاہتا ہوں' جو نیک بخت اور خفیہ ہاتھ کے درمیان ہوا تھا۔

وہ مجھ سے بہانہ کرکے دوبارہ کوٹھی کے اندر گئی اور پچھلے دروازے سے فرار ہونے لگی لیکن بنگلے کے پچھلے حصے میں ایک دشمن اس کی تاک میں تھا۔ اس پر فائرنگ کررہا تھا۔ اسے موت کے گھاٹ اتار کر اس معاہدے والے لفافے کو لے جانا چاہتا تھا۔ جب وہ ایک ٹیکسی میں سوار ہونے لگی تو فائرنگ کے خوف سے لفافہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے فائرنگ کرنے والے کو ہلاک کردیا لیکن لفافے تک پہنچنے سے پہلے ایک کار والا اسے اٹھا کر لے گیا۔

اس طرح میں بازی جیتتے جیتتے ہار گیا۔ ایسے وقت میں نے سوچا کہ ابھی مجھے ہار جیت کا حساب نہیں کرنا چاہیے۔ ابھی تو میں میدانِ عمل میں آیا ہوں۔ پتا نہیں ابھی مجھے کتنی ٹھوکریں کھانی ہوں گی اور نہ جانے کتنے جان لیوا تجربات کی بھٹی میں تپ کر کندن بننا ہوگا۔

میں نے موبائل کے ذریعے چنگیزی کو بتایا کہ میں ابھی تک انیلا بانو کے بنگلے کے سامنے ہوں اور اب اپنے کاٹیج کی طرف جانے والا ہوں۔ اس نے کہا۔ "آپ انتظار کریں میں ابھی آتا ہوں۔"

میں انتظار کرنے لگا۔ وہ تقریباً آدھے گھنٹے بعد آیا۔ میں اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار آگے جانے لگی۔ میں اسے انیلا بانو کے بنگلے میں ہونے والا واقعہ سنانے لگا۔

اس نے سننے کے بعد کہا۔ "جو ہوگیا سو ہوگیا۔ آپ نے انیلا بانو پر اعتماد کیا۔ آئندہ اپنے سائے پر بھی اعتماد نہ کریں۔ بعض اوقات سایہ دوسرے کا ہوتا ہے اور ہم چھاؤں میں کھڑے ہوکر بھول جاتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارا ہی سایہ ہے۔"

"تم امیر حمزہ کے تعاقب میں گئے تھے' کیا ہوا؟"

"وہ بہت ہی زمانہ شناس' بہت ہی چالاک اور بہت ہی مکار ہے۔ میں دماغی طور پر حاضر رہتے ہوئے بھی یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ مجھے کس طرح ڈاج دے گیا یا شاید حالات سے میں دھوکا کھا گیا۔ ایک جگہ پر ٹریفک کے ہجوم میں اس ماڈل کی دوسری کار تھی۔ میں دوسری کار کے پیچھے لگ گیا۔ ایک ریستوران کے سامنے وہ کار رک گئی۔ اس میں سے ایک اجنبی شخص باہر آیا۔ پھر ریستوران میں چلا گیا۔ میں نے اس کار کے قریب جاکر

دیکھا۔ وہ خالی تھی۔ اس میں امیر حمزہ نہیں تھا۔ اب میں اس اجنبی کے پاس جاکر امیر حمزہ کے بارے میں کچھ نہیں پوچھ سکتا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ امیر حمزہ کوئی چال چل رہا ہو۔ میرے تعاقب کرنے کی تصدیق ہوتے ہی امیر حمزہ یا اس کے ماتحت مجھے گولی مار سکتے تھے۔"

اس رات ہم اپنے کاٹیج میں آکر سوگئے۔ ہمارے ذہن میں یہ بات تھی کہ ہم وہ اہم معاہدہ حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں اور میں نے انیلا بانو کے پہلو سے سوچا' کوئی بات نہیں' اسے غلط فہمی ہوگئی ہے۔ آئندہ کہیں ملاقات ہوگی تو میں اس کا دل صاف کردوں گا۔

لیکن میں ایک ناتجربہ کار جوان یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بات کا بتنگڑ بن چکا ہے۔

انیلا نے یہ تو نہیں دیکھا تھا کہ وہ معاہدے والا لفافہ نامعلوم کار والے اٹھا کرلے گئے ہیں۔

اس نے ٹیکسی میں بیٹھتے وقت یہی دیکھا تھا کہ ایک شخص اس پر فائرنگ کررہا ہے اور اس شخص کے پیچھے میں ہوں۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ ہم دونوں اس پر گولیاں چلا رہے ہیں۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ اس پر فائرنگ کرنے والے کو میں ہلاک کرچکا ہوں اور اس طرح اس کی جان بچا رہا ہوں۔ وہ اپنی جان بچانے کی خاطر اپنے ہاتھ سے گرے ہوئے لفافے کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

اس نے بہت دور جاکر ٹیکسی چھوڑ دی۔ موبائل کے ذریعے کہا۔ "حمزہ! میں انیلا بول رہی ہوں۔ میرے بنگلے پر دشمنوں نے حملہ کیا تھا۔ میں بڑی مشکلوں سے جان بچا کر وہاں سے نکل آئی ہوں اور ابھی وگ مور اسٹریٹ کے چرچ کے سامنے کھڑی........ ہوں۔ اگر تم کہو تو میں کسی دوسرے جگہ چلی جاؤں۔"

امیر حمزہ نے کہا۔ "وہیں رہو۔ چاروں طرف نظر رکھو۔ کوئی خطرہ درپیش ہو تو دوسری جگہ جاؤ اور مجھے بذریعہ فون انفارم کرتی رہو۔ ویسے میں وگ مور اسٹریٹ کی طرف آرہا ہوں۔"

وہ اس کا انتظار کرنے لگی۔ ایک پولیس والے نے اس سے پوچھا۔ "تمہا تنی رات کو چرچ کے سامنے کیوں کھڑی ہو؟"

وہ بولی۔ "اگر میں کوئی غلط عورت ہوتی تو کسی نائٹ کلب کے سامنے ہوتی۔ میں اس مقدس چرچ کے سامنے اپنے ایک ساتھی کا انتظار کررہی ہوں۔ یہاں نئی ہوں۔ راستہ بھول گئی ہوں۔"

اس نے پرس سے کاغذات نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ "میں پاکستانی ہوں۔ یہاں گائیڈ کرنے والی کمپنی کے ذریعے اپنے بنگلے میں پہنچ سکتی ہوں لیکن اس کی ضرورت نہیں

ہے۔ میرا ساتھی آنے ہی والا ہے۔"

اس کی گفتگو کے دوران میں امیر حمزہ وہاں پہنچ کر کار سے باہر آیا۔ انیلا دوڑتی ہوئی آکر اس سے لپٹ گئی۔ زندگی میں پہلی بار امیر حمزہ کا دل ایک حسینہ کے دل سے لگ کر دھڑکنے لگا۔ اس کی قربت سمجھانے لگی کہ صنف نازک کے بدن میں کتنی نرمی' گرمی اور کشش ہوتی ہے۔

پولیس مین نے قریب آکر کہا۔ "مسٹر! جب آپ کی کوئی رہائش گاہ ہے تو پھر یہاں رومینس نہ کریں۔ اپنی شناخت کرائیں۔"

انیلا شرماتے ہوئے سر جھکا کر الگ ہوگئی۔ امیر حمزہ نے کار سے اپنے کاغذات نکال کر پولیس مین کو مطمئن کیا۔ پھر وہ دونوں اپنے کاٹیج میں آگئے۔ وہاں امیر حمزہ کے جانباز چھپ کر پہرا دے رہے تھے۔ ان دونوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

وہ دونوں بیڈ روم میں آئے۔ انیلا اس کے جوتے اتارنے لگی۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "یہ کیا کررہی ہو؟"

وہ بولی۔ "اپنی برسوں کی خواہش پوری کررہی ہوں۔ میں سوچتی تھی۔ میرا کوئی ایسا مرد ہو جو میری حفاظت کرے۔ تم زمین ہو' میرے پاؤں میں کانٹے چبھنے نہیں دوگے۔ تم آسمان ہو' نہ دھوپ ہوگے اور نہ اولے بن کر کسی کو برسنے دو گے۔ میں لندن کے ماحول میں بھی تمہارے لیے ایک مشرقی عورت ہوں۔"

اس کی باتوں میں اتنا خلوص اور اتنی سچائی تھی کہ انگاروں پر چلنے والا اور کانٹوں کے بستر پر سونے والا اس سے متاثر ہوتا چلا گیا۔ اس نے انیلا کے دونوں بازو پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم نے میرے جوتے اتار دیئے۔ قدموں میں رہنے کے جو فرائض تھے' وہ ختم ہوگئے۔ اب دھڑکنوں سے لگنے کا فرض ادا کرو۔"

وہ دو سے ایک ہوگئے۔ دل لگ کر دھڑکنے لگا۔ جو لوگ گرم تپتے ہوئے صحرا سے گزرتے ہیں اور جب پیار کی ٹھنڈی چھاؤں ملتی ہے تب انہیں ایک محبت کرنے والی عورت کی قدروقیمت معلوم ہوتی ہے۔ امیر حمزہ نے اسے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ تسلیم کرکے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

دوسری صبح امیر حمزہ گہری نیند سوتا رہا۔ ایک مدت کے بعد اس کی تھکن دور ہوئی تھی۔ انیلا وہاں سے اٹھ کر ایک صوفے پر آئی۔ فون کے ذریعے مرزا نیک بخت سے رابطہ کیا۔ سیکرٹری نے کہا۔ "صاحب سو رہے ہیں۔"

"اپنے صاحب کی نیند اُڑانے کے لیے اتنا کہہ دو کہ انیلا بانو بات کرنا چاہتی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ہی نیک بخت کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو انیلا؟ کیا تم ہو؟"

"ہاں میں ہوں اور صبح سویرے تمہیں یہ خوش خبری سناتی ہوں کہ نہ تمہارے جیسے ذلیل انسان سے شادی کروں گی اور نہ ہی تم سے ماہانہ ہزاروں پاؤنڈ لے کر تمہاری ممنون و احسان مند رہوں گی۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "مجھ سے کیسے شادی کروگی۔ مجھے ماہانہ اخراجات ادا کرنے پر کیسے مجبور کروگی؟ اب میری کوئی کمزوری تمہارے ہاتھوں میں نہیں ہے۔"

انیلا نے انجان بن کر پوچھا۔ "تمہاری کمزوریاں میرے ہاتھوں میں کیوں نہیں ہیں؟"

وہ بولا۔ "انیلا! میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ جان بوجھ کر انجان نہ بنو۔ پچھلی رات جو کچھ ہوا' اس کا مجھے علم ہے۔ اب وہ میرے اور خفیہ ہاتھ کے درمیان ہونے والا معاہدہ تمہارے پاس نہیں ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ پچھلی رات تمہارے آدمی میرے بنگلے میں گھس آئے تھے؟"

"میرے نہیں' خفیہ ہاتھ کی خفیہ ایجنسی والے تھے۔ وہ معاہدہ خفیہ ہاتھ سے پاس پہنچ گیا ہے۔ اب اپنے یار امیر حمزہ سے کہو کہ وہ ہمیں بلیک میل کرے۔"

"ایک بار پھر امیر حمزہ کو میرا یار کہو شاید تمہیں احساس ہو کہ میں نے اسے پانے کے لیے تم پر تھوک دیا ہے۔"

"تم مجھ پر کیا تھوکو گی؟ تم میرا جھوٹا کھانا ہو جسے امیر حمزہ کھا رہا ہے۔"

"نیک بخت! ایک بار تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری ماں بہت خوب صورت تھی۔ اس نے اپنے ایک کلرک شوہر سے طلاق لے کر بہت بڑے سرمایہ دار سے شادی کی تھی۔ اس شادی کے بعد تم پیدا ہوئے تھے۔ یعنی تمہارے باپ نے بھی جھوٹا کھانا کھایا تھا۔"

وہ غصے سے دہاڑ کر بولا۔ "بکواس مت کرو۔"

"تم اپنی لالچی ماں کے جھوٹے کھانے کی وہ کھرچن ہو' جسے گٹر میں پھینکنا چاہیے اور امیر حمزہ تمہیں ایک دن ضرور گٹر میں پھینکے گا۔"

دوسری طرف سے نیک بخت نے فون بند کردیا۔ انیلا موبائل رکھ کر غسل کرنے چلی گئی۔ واپس آئی تو امیر حمزہ بیدار ہوگیا تھا۔ وہ آنکھیں کھولے چھت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آہٹ سن کر چونک گیا۔

انیلا فون پر نیک بخت سے گفتگو کر کے باتھ روم میں گئی تھی۔ امیر حمزہ جیسے گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن وہ جاگ رہا تھا۔ درندہ نما انسانوں کے جنگل میں وہ شیر کی طرح زندگی گزار رہا تھا۔ کبھی غفلت کی نیند نہیں سوتا تھا۔ بند کمرے کے باہر مکان کے کسی حصے میں ہلکی سی آہٹ بھی ہو تو اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔

انیلا کے بستر سے اٹھتے ہی وہ بیدار ہوگیا۔ وہ صوفے پر بیٹھ کر نیک بخت سے فون پر باتیں کرتی رہی۔ وہ آنکھیں بند کیے سنتا رہا۔ انیلا جواباً نیک بخت سے جو باتیں کہہ رہی تھی' اس سے پتا چل رہا تھا کہ دوسری طرف سے کیا کہا جا رہا ہے۔ امیر حمزہ پچھلی رات سے انیلا کے احساسات و جذبات کو اور اس کی دیوانہ وار مسرتوں کو سمجھ رہا تھا۔ اس کی جذباتی وابستگی بتا رہی تھی کہ اسے امیر حمزہ کی صورت میں ساری دنیا کا خزانہ مل گیا ہے۔

وہ ایک شریف زادی تھی۔ ایک جیون ساتھی کے ساتھ شریفانہ گھریلو زندگی گزارنا چاہتی تھی لیکن نیک بخت حسن و شباب کا رسیا تھا۔ ایک عورت کی فطری شریفانہ آرزوؤں کو سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔ امیر حمزہ اسے عین فطرت کے مطابق عزت اور محبت دے رہا تھا۔ ایک مرد سے عزت اور محبت جس عورت کو مل جائے' اس سے زیادہ خوش نصیب پھر کوئی نہیں ہوتا۔

انیلا نے صبح ہوتے ہی اپنی خوش قسمتی کی خبر اس عیاش نیک بخت کو فون پر سنائی اور اس سے صاف کہہ دیا کہ نہ اس سے کورٹ میرج کرے گی اور نہ اس سے ماہانہ ہزاروں پاؤنڈ وصول کرے گی۔ اس کے جواب میں نیک بخت نے اس سے جو کہا' اسے امیر حمزہ بند آنکھوں اور کھلے کانوں سے نہ سن سکا لیکن انیلا نے جب یہ پوچھا۔ "تمہاری کمزوریاں میرے ہاتھوں میں کیوں نہیں ہیں؟" تو امیر حمزہ نے فوراً سمجھ لیا کہ خفیہ ہاتھ سے کیا ہوا معاہدہ اب نیک بخت اور خفیہ ہاتھ میں پہنچ گیا ہے۔ آئندہ نیک بخت' انیلا کے دباؤ میں نہیں رہے گا۔

پھر اس کی کسی بات پر انیلا نے پوچھا۔ "اس کا مطلب یہ ہے' کہ پچھلی رات تمہارے آدمی میرے بنگلے میں گھس آئے تھے؟"

اس کے بعد انیلا نے اس کا جواب سن کر کہا تھا۔ "ایک بار پھر امیر حمزہ کو میرا یار کہو۔ شاید تمہیں احساس ہو کہ میں نے اسے پانے کے لیے تم پر تھوک دیا ہے۔"

اب فون پر دونوں طرف سے ایک دوسرے کو طعنے دیئے جا رہے تھے۔ انیلا نے آخری طعنہ دے کر فون بند کر دیا تھا۔ وہ طعنہ نیک بخت کے لیے یہ تھا۔ "تم اپنی لالچی ماں کے جھوٹے کھانے کی وہ کھرچن ہو' جسے گٹر میں پھینکنا چاہیے اور امیر حمزہ تمہیں ایک

دن ضرور گٹر میں پھینکے گا۔"

اس کے بعد وہ ریسیور رکھ کر غسل خانے میں چلی گئی تھی۔ امیر حمزہ آنکھیں کھول کر سوچنے لگا۔ "نیک بخت نے آخر میں انیلا کو کوئی بات ایسی کہہ دی ہے' جس سے ایک عورت کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ تب ہی وہ پچھلی تمام رات مسرتوں سے نہال رہنے والی ناگواری سے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ کر باتھ روم میں چلی گئی تھی۔

امیر حمزہ پچھلی رات چرائے جانے والے معاہدے کے سلسلے میں الجھا ہوا تھا۔ جب انیلا ناگواری سے چلی گئی تو اسے دکھ ہوا۔ معلوم نہیں فون پر اس کمبخت نے کون سی دل دکھانے والی بات کہہ دی تھی؟ وہ ایسی چاہنے والی ہستی تھی کہ اس کا دل دکھانا گناہ ہوتا پھر وہ امیر حمزہ کی تنہائیوں میں آنے والی پہلی عورت تھی۔ برسوں کی دماغی تھکن دور کی تھی۔ زندگی کے تپتے صحرا میں اس کے لیے ٹھنڈی چھاؤں بن کر آئی تھی۔ آج سے وہ اور تازہ دم ہو کر اپنے مخالفین سے نمٹ سکتا تھا۔ وہ سوچنے لگا' آج ہی اپنی .... انیلا کا دل دکھانے والے سے نمٹ لے گا۔

اسی .... وقت وہ باتھ روم سے باہر نکل آئی۔ غسل کرنے کے بعد گیلے بالوں کو تولئے سے لپیٹ لیا تھا۔ اس کے باوجود زلفوں سے ٹپکنے والی بوندیں گلاب جیسے چہرے پر شبنم کی طرح لرز رہی تھی۔ امیر حمزہ اس حسن سراپا کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتا لیکن یہ دیکھ کر چونک گیا کہ اس کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کے قطرے تھے۔

اس نے بستر سے اٹھ کر پوچھا۔ "کیا تم رو رہی ہو؟"

وہ تولیے سے آنسو پونچھنے کے بہانے چہرہ چھپاتے ہوئے بولی۔ "نہیں تو۔ میں بھلا کیوں روؤں گی۔ مجھے تو اتنی خوشیاں ملی ہیں۔ اتنی خوشیاں ملی ہیں کہ.........."

وہ آگے بڑھ کر اس کے گورے گداز بازوؤں کو پکڑ کر بولا۔ "منہ پر سے تولیا ہٹاؤ۔"

"مجھے تمہارے سامنے شرم آرہی ہے۔"

"آنسوؤں کا بھرم رکھنے کے لیے شرم کا سہارا لے رہی ہو؟"

اس نے تولیے کو اس کے چہرے پر سے کھینچ لیا۔ وہ دوسری طرف منہ پھیرنا چاہتی تھی' اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو اپنے روبرو کیا۔

پھر پوچھا۔ "مجھ سے خوش نہیں ہو۔"

وہ ایک دم سے فرش پر بیٹھ کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی۔ "میرا خدا گواہ ہے۔ جو خوشیاں تم سے مل رہی ہیں' ایسی خوشیاں کوئی مجھے کبھی نہیں دے سکے گا۔ خدا کی قسم میں سربازار' ساری دنیا کے سامنے ذلتیں برداشت

کرسکتی ہوں لیکن تمہیں کوئی ذلیل کرے تو میں رو رو کر جان دے دوں گی۔"

"کس نے تمہیں ذلیل کیا ہے؟"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "وہ بدبخت کہہ رہا تھا کہ تم جھوٹا کھانا کھا رہے ہو۔"

امیر حمزہ نے دونوں بازو پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بکواس کر رہی ہو؟"

وہ چیخ کر بولی۔ "یہ بکواس نہیں ہے۔ تم اس حقیقت کو تسلیم کرو کہ میں تمہارے پاس کنواری نہیں آئی ہوں۔ تسلیم کرو کہ میں داغ دار ہوں۔ ہم میں سے کوئی سچائی جھٹلا نہیں سکتا۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ ساری زندگی تمہارے قدموں میں پڑی رہوں گی۔ تمہاری خدمت کرتی رہوں گی مگر تمہیں جھوٹا نہیں کھانے دوں گی۔ تم اتنے عظیم ہو کہ تمہاری زندگی میں کسی عظیم ہستی ہی کو آنا چاہیے۔"

وہ اسے جھنجوڑ کر بولا۔ "اور وہ عظیم ہستی تم ہو۔ آگے کچھ نہ کہنا۔ نہ میں زیادہ بولتا ہوں۔ نہ زیادہ کسی کی سنتا ہوں۔ اب اگر تم اپنا دل دکھاؤ گی اور آنسو بہاؤ گی تو میں ہمیشہ کے لیے تم سے دور چلا جاؤں گا پھر تم مجھے کبھی نہیں دیکھ سکو گی۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں اور کسی دن تمہیں میری موت کی خبر.........."

انیلا نے فوراً ہی اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ وہ اس کا ہاتھ ہٹا کر بولا۔ "میرا حکم مانو گی؟"

"حکم مانتے مانتے جان دے دوں گی۔"

"تو پھر جب بھی داغ دار ہونے پر توہین کا احساس ہو تو خود سے یہ کہنا۔

کیا داغ داغ کرتی ہے سب داغ دار ہیں
بے داغ گر ہے تو وہ پروردگار ہے

انیلا نے اسے بڑی آسودگی اور فخر سے دیکھا۔ وہ بولا۔ "اب اگر نیک بخت سے بات ہو تو حوصلے سے کہنا کہ تم داغ دار ہو اور تمہاری جیسی چاند چہرے والی نے یہ چاند سے سیکھا ہے کہ داغ اپنے پاس رکھو اور روشنی دنیا کو دیتی رہو اور تمہاری دنیا صرف امیر حمزہ ہے۔"

وہ خوشی سے دہاڑیں مار کر روتے ہوئے امیر حمزہ سے لپٹ گئی اور بے اختیار اس کی گردن اور چہرے کو چومنے لگی۔ ایسے میں آگ بھڑکتی ہے اور ایسے ہی وقت کہا جاتا ہے' دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ یہ ایسی آگ ہوتی ہے کہ فائر بریگیڈ کا فون نمبر یاد رکھنا ضروری نہیں ہوتا۔ وہاں جو آگ لگی تھی' وہ شاور کے نیچے بجھ گئی۔

وہ اس کے لیے ناشتا تیار کرنے لگی۔ امیر حمزہ ڈائننگ روم کی میز پر دو موبائل فون

لے کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ایک ماتحت سے رابطہ کرنے کے بعد کہا۔ "میں ابھی ناشتے سے فارغ ہو جاؤں گا۔ پلاسٹک سرجری کے ماہر کو بھیج دو۔"

پھر اس نے فون بند کر کے سیکورٹی افسر سے رابطہ کیا۔ اس نے کہا۔ "آئی ایم ایٹ یور سروس سر!"

اس نے کہا۔ "ابھی نوشاد پلاسٹک سرجری کے ماہر کو گاڑی میں لائے گا۔ اس کے ساتھ سرجری کا سامان ہو گا۔ تمام سامان کو اچھی طرح چیک کرنے کے بعد اسے اندر بھیج دینا۔"

"آل رائٹ سر!"

اس نے فون بند کیا۔ میز پر رکھتے ہی فون کا بزر بج اٹھا۔ اس نے فون کو اٹھا کر اسے آن کر کے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے کوڈ ورڈز ادا کیے گئے۔ امیر حمزہ نے جواباً کوڈ ورڈز ادا کر کے پوچھا۔ "کچھ معلوم ہوا؟"

"یس سر! پچھلی رات وہ لفافہ لے جانے والے خفیہ ہاتھ کے خفیہ ایجنسی والے تھے۔ وہ ایک کار میں تھے۔ اس کا اگلا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس اگلی سیٹ والے نے تیزی سے چلتی ہوئی کار سے سڑک پر پڑے ہوئے لفافے کو بڑی مہارت سے اٹھایا تھا۔ ہم اس سے بہت فاصلے پر تھے۔ فائرنگ کر کے اس گاڑی کو روک نہیں سکتے تھے۔"

"یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ خفیہ ہاتھ کے کارندے تھے؟"

"ان کے کارندے اسی نمبر اور اسی ماڈل کی کار کو پہلے بھی ایک بار استعمال کر چکے ہیں۔ ہم نے دوربین کے ذریعے اس کار کے نمبر کو پڑھا تھا۔ اس کے چاروں پہیے کورڈ بلٹ پروف تھے۔ یہ خفیہ ہاتھ کی خاص گاڑیوں میں سے ہے۔ اس کے کلرڈ شیشے اور پوری باڈی بھی بلٹ پروف ہو گی۔"

"اس کا مطلب ہے' وہ اہم لفافہ ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔"

"سر! ہم شرمندہ ہیں۔ ہم سے کوتاہی ہو گئی۔"

"اسے بھول جاؤ۔ ہم نے ہمیشہ جیتنے اور کامیابیاں حاصل کرنے کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔ ہماری ہزارہا مردانہ صلاحیتوں اور ذہانتوں کے باوجود تقدیر ہمیں ٹھوکر مارتی ہے۔ یوں ٹھوکریں کھانے سے ہی تجربات میں اضافہ ہوتا ہے۔"

"سر! وہاں ایک اور نوجوان تھا۔ وہ بھی اس لفافے کو سڑک پر سے اٹھانے کے لیے دوڑتا ہوا آ رہا تھا لیکن وہ ناکام رہا۔ ہم نے سوچا اگر وہ بھی خفیہ ہاتھ کا کارندہ ہے تو کار والے اسے کیوں چھوڑ گئے ہیں؟ ہم نے اس پر نظر رکھی۔ دس منٹ کے بعد ہی ایک کار

اس کے قریب آئی۔ وہ اس میں بیٹھ گیا پھر ہم اس کا تعاقب کرنے لگے۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی اس کار کا نمبر بتا کر گائیڈ کیا کہ وہ کہاں سے گزر رہا ہے اور بڑی ہوشیاری سے اس کی منزل تک اس کا پیچھا کرنا ہے۔"

"کچھ کامیابی ہوئی؟"

"جی ہاں۔ اس جوان کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ وہ ایک فور اسٹار ہوٹل میں گئے۔ ہم نے دور سے دیکھا۔ انہوں نے ایک کاؤنٹر پر رینٹڈ کار کا بل ادا کیا تھا پھر ہوٹل کے اندر چلے گئے۔ میں کار سے اتر کر ایک ساتھی کے ساتھ اس کاؤنٹر پر گیا۔ انٹیلی جنس برانچ کے ایک افسر کا جعلی کارڈ دکھا کر اس رینٹڈ کار کو حاصل کرنے والوں کے متعلق سوالات کیے۔ جواب ملا کہ ان میں سے ایک کا نام فرمان علی تاباں اور دوسرے کا نام مراد چنگیزی ہے۔ ان دونوں کا قیام اس ہوٹل کے روم چار سو بیس میں ہے۔"

"اچھا تو وہ دونوں مسلمان ہیں۔ یہاں کے مہنگے ہوٹل میں قیام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جرائم پیشہ ہیں۔ کالی کمائی پر عیش کر رہے ہیں۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خفیہ ہاتھ کی ایجنسی سے تعلق رکھتے ہوں۔ وہ لفافہ لے جانے والے جلدی میں تھے۔ اسے ساتھ نہیں لے گئے لیکن دس منٹ کے اندر اس کے لیے دوسری کار بھیج دی۔"

"بے شک ایسا ہوتا ہے۔ ان دونوں کو بڑی ہوشیاری سے گھیر کر خفیہ ایجنسی کے اڈے تک پہنچنا ہو گا۔"

"کل رات سے ہمارے دو آدمی ہوٹل کے اگلے اور پچھلے دروازے کی نگرانی کر رہے ہیں۔ جب وہ دونوں ہوٹل سے باہر نکلیں گے تو ہم سب کو اطلاع مل جائے گی۔"

"وہ دونوں ہوٹل کے کمرے میں پچھلی رات کی نیند پوری کر رہے ہوں گے۔ میں تھوڑی دیر بعد بتاؤں گا کہ انہیں کیسے ٹریپ کرنا چاہیے۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ انیلا ناشتا لے آئی۔ وہ دونوں کھانے لگے۔ اس نے دونوں فون کو میز پر دیکھ کر کہا۔ "تم دن رات مصروف رہتے ہو۔ شاید تم بھی نہیں جانتے ہو گے کہ اتنی بڑی دنیا میں تمہارے کتنے دشمن ہیں۔ تم موت سے کھیلتے کھیلتے سکون سے کیسے سو جاتے ہو؟"

"مجھے برسوں سے جدوجہد کرتے کرتے کانٹوں کے بستر پر سونا آ گیا ہے۔"

وہ چائے پیتے ہوئے بولی۔ "مجھے اس شخص پر غصہ آ رہا ہے' جو تمہارا اہم لفافہ لے گیا۔ مجھے شرمندگی ہے' پہلی بار تم نے ایک اہم امانت میرے پاس رکھوائی اور میں اس

کی حفاظت نہ کر سکی۔"

"جب کبھی ناکامی ہو تو اسے دماغ سے نکالنے کی کوشش کیا کرو۔ کیا تم میری پیشانی پر ناکامی کی شکنیں دیکھ رہی ہو۔"

"میں تمہارے جیسا حوصلہ کہاں سے لاؤں؟"

"رفتہ رفتہ بہت کچھ سیکھ جاؤ گی۔ ویسے تمہیں جس شخص پر غصہ آ رہا ہے' وہ میرا لفافہ نہیں لے گیا ہے۔ وہ تو خفیہ ہاتھ کا کوئی معمولی سا کارندہ ہو گا لیکن اس نے تمہارے بنگلے میں گھسنے اور تمہیں گولی سے مارنے کی کوشش کی تھی۔ میں اسے اپاہج بنا دوں گا۔"

"اس کی چلائی ہوئی گولی ٹیکسی کے دروازے پر لگی تھی۔ میں خوف کے مارے اس لفافے کو سڑک پر سے نہ اٹھا سکی۔"

"تم شام تک دیکھو گی کہ تم سے الجھنے والا جہنم میں پہنچ گیا ہے۔"

"کیا تم اسے جانتے ہو؟"

"جان گیا ہوں۔ اس کا نام فرمان علی ہے۔ وہ ایک ہوٹل میں ہے۔ خفیہ ایجنسیاں اپنے کارندوں کو تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ ان کی باقاعدہ رہائش' کھانے پینے اور عیش کرنے کے انتظامات کرتی ہیں لیکن فرمان اور اس کا ساتھی نئے رنگروٹ ہیں اس لیے انہیں ہوٹل میں رہنے کا حکم دیا گیا ہو گا۔ کئی وارداتوں میں آزمانے کے بعد وہ قابلِ اعتماد ثابت ہو جائیں گے تو انہیں بھاری معاوضہ دے کر ہر طرح ان کے تحفظ کا انتظام کیا جائے گا۔"

"تم اپنے طور پر دشمنوں سے نمٹ لیتے ہو۔ میں اپنی چھوٹی سی عقل سے مشورہ دیتی ہوں۔ فرمان علی کو ابھی زندہ رہنے دو اور اس کے ذریعے مگرمچھ تک پہنچو۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "یہی ہو گا لیکن دوسرے طریقے سے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ آج فرمان میرے ہاتھوں مارا جائے گا لیکن اس کے ساتھی مراد چنگیزی کو زندہ رہنے' بھاگنے اور چھپتے رہنے کا موقع دیا جائے گا۔ خفیہ ایجنسی والے بھی اسے کہیں تحفظ دینے کے لیے لے جائیں گے تو ہماری نظروں میں آ جائیں گے۔ یہ دشمن کے لیے ایک چیلنج ہو گا کہ میں نے ایک کو مار کر دوسرے کو زندہ چھوڑا ہے اور اس دوسرے کو بھی مارنے والا ہوں تو میرا یہ طریقہ ان کے لیے چیلنج ہو گا اور انہیں چیلنج کرنے کے لیے فرمان کو قتل کرنا ضروری ہے۔"

سیکورٹی افسر نے اطلاع دی کہ پلاسٹک سرجری کا ماہر آ چکا ہے۔ اسے میک اپ روم میں بٹھایا گیا ہے۔ امیر حمزہ نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ "انیلا! یہاں کئی جانے انجانے دشمن ہیں۔ وہ ہمیں چہروں سے پہچانتے ہیں۔ لہٰذا ہم دونوں کے چہروں پر تھوڑی سی تبدیلیاں کی

جائیں گی۔"

"ہاں یہ ضروری ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ کبھی ضرورت سے باہر جاؤں گی تو نیک بخت کے حواری میرے ساتھ تمہیں بھی پہچان کر دونوں کو ہی نقصان پہنچائیں گے۔"

"پہلے تمہارے چہرے کی سرجری ہو گی۔ سرجری سے فارغ ہوتے ہی اپنا ضروری سامان اٹیچی میں رکھ لینا۔ ہمیں اس کاٹیج سے بھی جانا ہو گا۔"

"او۔ گاڈ! کیا دشمن یہاں پہنچ سکتے ہیں؟"

"ہاں۔ پلاسٹک سرجری کا ماہر جو یہاں آیا ہے' وہ جرائم پیشہ افراد سے تعلق رکھتا ہے۔ کئی خفیہ ایجنسیوں کے لیے کام کرتا ہے۔ خفیہ ہاتھ سے بھی اسے بڑی رقمیں ملتی ہوں گی۔"

انیلا نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم نے ایسے سرجری کے ماہر کو کیوں بلایا ہے؟"

"اسے مخبری کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ میرے آدمی اس کی نگرانی کرتے رہیں گے۔ میں ایسے خطرات مول لے کر خفیہ ہاتھ کی خاص خفیہ ایجنسی تک پہنچنا چاہتا ہوں۔"

"میں نہیں چاہتی کہ تم جان بوجھ کر خطرات مول لیا کرو۔"

"اگر ایسا نہ کروں تو اپنے شکار تک یا اپنے کسی ٹارگٹ تک پہنچنے میں برسوں لگ جائیں۔"

وہ چائے پینے کے بعد سرجری کے ماہر کے پاس آئے۔ ماہر نے ایک البم پیش کرتے ہوئے کہا۔ "اس میں ایسی عورتوں اور مردوں کی تصویریں ہیں' جو برسوں سے لاپتا ہیں۔ میرے پاس ان لاپتا ہونے والوں کی پوری ہسٹری ہے۔ آپ ان میں سے کسی کے بھی ہم شکل ہو سکتے ہیں۔ آپ ان کی ہسٹری پڑھنے کے بعد مطمئن ہو سکیں گے۔"

امیر حمزہ نے کہا۔ "البم اپنے پاس رکھو۔ میں ایک عورت کی تصویر دے رہا ہوں۔ تم اس کے مطابق انیلا کے چہرے پر تبدیلیاں کرو۔ اس کے بعد میں سرجری کراؤں گا۔"

امیر حمزہ کے دست راست نے ایک حسین عورت کی تصویر سرجری کے ماہر کو دی۔ اس حسینہ کی تصویر کئی زاویوں سے اتاری گئی تھی۔ فون کے بزر کی آواز ابھری۔ اس کا دست راست اور دو خاص ماتحت سرجری کے دوران میں وہاں موجود رہے۔ امیر حمزہ نے دوسرے کمرے میں آ کر موبائل فون کو آن کیا۔ کوڈ ورڈز کے تبادلے کے بعد اس نے پوچھا۔ "کیا فرمان اپنے ساتھی کے ساتھ ہوٹل میں ہے؟"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "وہ پچھلی رات تین بج کر بیس منٹ پر ہوٹل پہنچے تھے۔ شاید اب تک اپنے کمرے میں سو رہے ہیں۔ میں لفٹ اور سیڑھی کے قریب ہوں۔

انہیں اب تک گراؤنڈ فلور پر آتے نہیں دیکھا اور کاؤنٹر کی بورڈ پر ان کے کمرے کی چابی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ دونوں کمرے میں ہیں۔"

"ہوٹل کی ٹیلی فون ایکسچینج گرل کی مٹھی گرم کی گئی ہے؟"

"جی ہاں۔ اس نے بتایا ہے کہ اس کمرے کا فون ڈس کنکٹ کیا گیا ہے۔ ان دونوں نے سونے سے پہلے ایسا کیا ہو گا تاکہ نیند کے دوران کوئی فون نہ آئے۔"

"میں ابھی پلاسٹک سرجری کے سلسلے میں مصروف ہوں۔ وہاں ایک بجے تک آسکوں گا۔ میری آمد تک دونوں پر نظر رکھو۔ خاص کر فرمان کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔ میں اس سے پچھلی رات کا حساب لوں گا۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "سر! جسٹ اے منٹ۔ فون کو آن رکھیں۔"

امیر حمزہ نے انتظار کیا پھر اسے ماتحت کی آواز سنائی دی۔ "سر! یہ نوشاد ابھی آکر رپورٹ دے رہا ہے کہ وہ دونوں کمرے میں نہیں ہیں۔"

"وہاٹ نان سینس۔ وہ پچھلی رات لفٹ سے اپنے کمرے میں گئے تھے۔ اس کے بعد نیچے نہیں آئے۔ تم لفٹ اور سیڑھیوں کے پاس ہو پھر وہ اوپری منزل سے کہاں جا سکتے ہیں؟"

اس بار نوشاد کی آواز سنائی دی۔ "سر! پچھلے گیٹ کے چوکی دار نے اس کمرے کی چابی لا کر کاؤنٹر پر دی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ وہ چابی رات کو یا صبح کو نہ جانے کون وہاں پھینک کر چلا گیا تھا۔ ہوٹل کے مینیجر نے اوپر جا کر کمرے کو کھول کر دیکھا تو وہاں فرمان علی اور مراد چنگیزی نہیں تھے۔ ایک اٹیچی اور ایک بریف کیس میں فضول سامان رکھا ہوا تھا۔ یعنی پرانے کپڑے، شیونگ کا سامان ایک ٹوٹا ہوا موبائل فون اور چند پرانی کتابیں تھیں۔"

"لیکن وہ ہوٹل سے کب گئے اور کیسے گئے کہ تم میں سے کسی کو نظر نہیں آئے؟"

"ان کے اس طرح غائب ہو جانے سے سمجھ میں آتا ہے کہ انہیں ہمارے تعاقب کرنے کا علم تھا۔ وہ ہمیں اپنے پیچھے ہوٹل تک لے گئے۔ رینٹڈ کار کے کاؤنٹر پر چابی واپس کی۔ بل ادا کیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ہم ہوٹل کے احاطے کے باہر اپنی گاڑیوں میں ہیں۔ ہمارے درمیان تقریباً ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ تھا۔ انہوں نے اس دوری سے فائدہ اٹھایا۔ ہوٹل کے اندر جا کر کاؤنٹر سے اپنے کمرے کی چابی لی۔ اس وقت ہم اپنی گاڑیوں سے اتر کر احاطے میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ ہماری نظروں میں نہیں تھے۔ ہم نے ہوٹل کے اندر جا کر معلوم کیا۔ وہ دونوں اوپری منزل پر اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے کاؤنٹر سے چابی لے گئے تھے۔ ہم نے کی بورڈ پر دیکھا۔ ان کے کمرے کی چابی وہاں نہیں

تھی۔"

امیر حمزہ نے کہا۔ "بس۔ اب بات سمجھ میں آگئی۔ واقعی انہیں تعاقب کیے جانے کا علم تھا۔ وہ دونوں کاؤنٹر سے کمرے کی چابی لے کر پچھلے راستے سے باہر گئے اور پچھلے گیٹ کے باہر چابی پھینک کر کسی ٹیکسی میں کہیں چلے گئے۔ انہوں نے لفٹ کے ذریعے اوپر جانے کی زحمت نہیں کی۔"

"آپ ہمیں تھوڑا وقت دیں۔ ہم انہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔"

"انہیں ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ خفیہ ہاتھ کے نئے رنگروٹ ہیں۔ وہ بھی مسلمان اور پاکستانی ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق وہ ہمیں بول چال اور طور طریقوں سے پہچان سکیں گے۔ اس لیے ان دونوں کو آزمائشی طور پر ہمارے پیچھے لگایا گیا ہے۔ چونکہ وہ مستقل کارندے نہیں ہیں اس لیے وہ ہوٹلوں میں، کرائے کے اپارٹمنٹس میں یا کہیں پے انگ گیسٹ کے طور پر رہ سکیں گے۔ ایسے مقامات پر انہیں بہ آسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔"

"انشاء اللہ ہم انہیں گردن سے پکڑ کر لے آئیں گے۔"

امیر حمزہ نے فون بند کر کے دوسرے ماتحتوں سے رابطہ کرنے لگا۔

☆=======☆======☆

میں مراد چنگیزی کے ساتھ ناشتے کی میز پر تھا۔ مراد پہلے میری امی کا باڈی گارڈ تھا۔ اب میرا باڈی گارڈ بھی تھا اور گائیڈ بھی۔ امی نے کہا تھا۔ "اسے ملازم کبھی نہ سمجھنا بلکہ وہ تمہارا استاد رہے گا۔ جرائم کی دنیا میں تمہیں کانٹوں پر چلنا اور بھڑکتے ہوئے شعلوں سے گزرنا سکھائے گا۔ تم بہت ذہین ہو لیکن وہ تمہیں ایسی حاضر دماغی سکھائے گا کہ تم ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں دشمنوں کی الجھی ہوئی چالوں کو سمجھ کر ان کا توڑ کرنا سیکھ جاؤ گے۔"

اور واقعی وہ ایک استاد کی طرح ہمہ وقت مجھے ایک معمولی سی غلطی پر بھی ٹوکتا تھا اور حکم دیتا تھا کہ جو غلطی ہوئی اس کا تجزیہ کرو۔ بے شک تجزیہ کرنے پر میں نے سمجھا کہ پچھلی رات انیلا کے پیچھے اس دشمن کو پہلے گولی مار دیتا تو وہ انیلا پر فائر نہ کرتا۔ گولی ٹیکسی کے کھلے ہوئے دروازے پر لگی۔ اس طرح وہ بچ گئی لیکن لفافہ ہاتھ سے گر پڑا، جو بعد میں دشمنوں کے ہاتھ لگ گیا۔

بعض اوقات جلد بازی میں، گھبراہٹ میں یا ایکشن کے دوران میں ذہنی الجھنوں میں اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ پہلے کیا کرنا چاہیے۔ یعنی میں نے پہلے انیلا کے پیچھے

دوڑنے والے دشمن کو گولی نہ مار کر غلطی کی تھی۔

بہر حال مراد چنگیزی مختلف انداز میں مجھے بہت کچھ سکھا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "یہاں لندن میں امی کا ایک چھوٹا سا بنگلا ہے۔ ایک اپارٹمنٹ بھی ہے۔ ایک کار اور ایک لینڈ کروزر ہے۔ پھر آپ ہوٹل اور کرائے کے اپارٹمنٹ میں مجھے لیے کیوں پھرتے ہیں؟"

"شمشیر سنگھ کالیا عرف ڈینجرس مین تمہاری امی کا پرانا دشمن ہے۔ وہ میرے ہاتھوں سے دو بار بچ کر نکل گیا۔ تیسری بار تم اسے ٹھکانے لگانے آئے ہو اور اس بار اس کالیا کا خطرناک باڈی گارڈ بھیما بھی ہے۔ انڈر گراؤنڈ کے مجرم اسے روبوٹ کہتے ہیں۔ جسمانی طور پر پہاڑ ہے اور چٹان کی طرح سخت ہے۔ تمہاری امی نے تمہیں دنیا گھومنے' تجربات حاصل کرنے اور کالیا کے علاوہ بھیما جیسے روبوٹ سے ٹکرانے کے لیے بھیجا ہے۔ وہ فخر سے کہتی ہیں کہ بھیما اگر روبوٹ ہے تو میرا بیٹا نہ پگھلنے والا فولاد ہے۔"

"لیکن ہم تو نیک بخت' انیلا اور امیر حمزہ کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔"

"آئندہ تم کئی چکرا دینے والے چکروں میں پڑو گے۔ نیک بخت کا تعلق کئی خفیہ ایجنسیوں سے ہے۔ امیر حمزہ اسے ٹریپ کرنے کے چکر میں لگا ہوا ہے۔ ایسے ہی مجرموں کے بھرے ہوئے میلے میں شمشیر سنگھ کالیا اور بھیما سے ہمارا اچانک سامنا ہو سکتا ہے۔"

"لیکن ہم کرائے کے اپارٹمنٹ میں کیوں ہیں؟"

"مخالفین کو ڈاج دینے کے لیے۔ جیسا کہ پچھلی رات ہم انہیں اپنے ہوٹل تک لائے۔ انہوں نے سمجھا' ہم وہاں رہتے ہیں۔ کمرے کی چابی لی۔ انہیں یقین ہو گیا کہ ہم فلاں کمرے میں قیام کر رہے ہیں لیکن پچھلے دروازے سے نکل کر چابی پھینک کر چلے آئے۔ اگر تم اپنے ذاتی بنگلے میں ہوتے تو ان کے گھیرے میں آ جاتے۔ تمہارا بنگلا اور اپارٹمنٹ لاکڈ رہے گا۔ کبھی بہت زیادہ خطرے کے وقت تم انہیں خفیہ پناہ گاہ کے طور پر استعمال کر سکو گے۔"

پاکستان میں انڈر ورلڈ کا گاڈ فادر قاسم تھا۔ ایک بار اس کے بیٹے ہاشم جان کو پولیس کاؤنٹر فائرنگ کے دوران میں گولی لگی تھی۔ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا۔ میری امی لیڈی سرجن آمنہ نے آپریشن کے ذریعے اس کے بیٹے ہاشم جان کو ایک نئی زندگی دی تھی۔

انڈر گراؤنڈ گاڈ فادر قاسم جان پر یہ بہت بڑا احسان تھا۔ امی نے اس کے اکلوتے بیٹے کی جان بچائی تھی اور معاوضہ لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ جرائم کے ذریعے حاصل کی ہوئی رقم کو ہاتھ نہیں لگائیں گی۔ انہوں نے ایک ڈاکٹر کے پیشے کی

عظمت برقرار رکھنے کے لیے آپریشن کیا تھا۔ ایک ڈاکٹر علاج کرتے وقت کسی بھی مجرم کا علاج اپنے پیشے کے تقاضوں کے مطابق کرتا ہے۔

گاڈ فادر قاسم جان نے کہا۔ "اور ڈاکٹر اپنی محنت کا معاوضہ لیتا ہے۔ وہ مریض خواہ کیسی ہی کمائی سے معاوضہ ادا کرے۔ تم نے میرے بیٹے کی جان بچائی ہے' اس کا معاوضہ لو۔ انعام میں جو لاکھوں روپے دینا چاہتا ہوں اسے قبول نہ کرو۔"

امی نے اپنی محنت کا معاوضہ لیا۔ آئندہ بھی گاڈ فادر کے جتنے جاں نثار زخمی ہوتے تھے' ان کا علاج کر کے معاوضہ لیتی تھیں۔ گاڈ فادر نے انہیں بیٹی بنایا تھا۔ اس کا بیٹا ہاشم جان انہیں بڑی بہن بنا کر مختلف حیلوں بہانوں سے ان کی دولت اور جائیداد میں اضافہ کرتا رہتا تھا۔ اس نے مراد چنگیزی جیسے ذہین اور دلیر شخص کو امی کا باڈی گارڈ یہ کہہ کر بنایا تھا۔

"باجی! آپ نے میری زندگی بچائی ہے۔ آپ کو بھی دشمنوں سے بچانے کے لیے یہ باڈی گارڈ آپ کے ساتھ رہا کرے گا۔"

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ امی کو احساس ہوتا چلا گیا کہ وہ بھی جرائم کی دنیا میں چلی آئی ہیں۔ انہوں نے خود کبھی جرم نہیں کیا تھا لیکن گاڈ فادر اور اس کے بیٹے ہاشم نے انہیں بیٹی اور بہن کی حیثیت سے اتنی زیادہ اہمیت دی تھی کہ جنوبی ایشیا کے تمام ممالک کے گاڈ فادرز کی نظروں میں امی فرنٹ لائن پر آ گئی تھیں۔ وہ ایسی عجیب و غریب صلاحیت کی مالک تھیں کہ ایک موم بتی کی روشنی میں پیچیدہ سے پیچیدہ آپریشن کر کے قاسم جان کے جاں نثاروں کی جانیں بچا لیا کرتی تھیں۔

میرے جوان ہونے اور میدان عمل میں آنے تک یورپ اور ایشیا کے تمام جرائم پیشہ افراد امی کے نام اور کام سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔

عالمی سطح کے مجرم یہ تسلیم کرتے تھے کہ میری امی موجودہ گاڈ فادر ہاشم جان (اس کا باپ قاسم جان مر چکا ہے) کی بہن ہونے کے باوجود مخالف مجرموں اور خفیہ ایجنسیوں کے زخمیوں کا علاج پوری تندہی سے کرتی ہیں جب تک وہ مجرم صحت یاب ہو کر اپنی پناہ گاہ میں نہ چلا جائے' تب تک دشمنوں کی طرف سے اس پر آنچ نہیں آنے دیتی ہیں۔ اس وقت گاڈ فادر ہاشم جان کے تمام جاں نثار بھی اس دشمن مریض کی حفاظت کرتے ہیں تاکہ میری امی کی نیک نیتی پر کسی کو کوئی شبہ نہ ہو۔

ایک طرح سے دیکھا جائے تو میری امی عام لوگوں کی نظروں میں ایک حیرت انگیز غیر معمولی صلاحیت رکھنے والی لیڈی سرجن تھیں لیکن عالمی سطح کے خطرناک مجرموں کے دلوں پر حکومت کرتی تھیں۔ میں امی کے متعلق بہت کچھ سوچتا ہوا چائے پی رہا تھا۔ مراد

چنگیزی نے کہا۔ "چائے پی کر انیلا سے رابطہ کرو اسے بتاؤ کہ تم اس لفافے کے ساتھ اس کی حفاظت کر رہے تھے لیکن دونوں طرف غلط فہمی رہی۔ انیلا تمہیں دھوکا دے کر بنگلے کے پچھلے راستے سے بھاگ جانا چاہتی تھی اور تم نے تعاقب کرنے والے دشمن کو گولی مارنے میں دیر کر دی۔ تم دونوں کی غلط فہمی کے باعث وہ لفافہ دشمنوں کے ہاتھ لگ گیا۔"

پچھلی رات جب میں انیلا کے بیڈ روم میں تھا اور وہ غسل کرنے گئی تھی۔ تب میں نے اس کے موبائل فون کے نمبر یاد کر لیے تھے۔ میں نے چائے کا آخری گھونٹ پینے کے بعد اپنا فون اٹھایا پھر اس کے نمبروں پر رابطہ کیا۔ انیلا کا موبائل فون اب پچھلی رات والے بنگلے میں نہیں رہا تھا' وہ اسے اپنے ساتھ امیر حمزہ کے ایک کاٹیج میں لے آئی تھی۔

اس وقت دوسرے کمرے میں اس کے چہرے کی پلاسٹک سرجری ہو رہی تھی۔ امیر حمزہ نے بیڈ روم میں آکر اس کے موبائل فون کو اٹھایا پھر اسے آن کر کے پوچھا۔

"کون؟"

میں سمجھ گیا۔ انیلا' امیر حمزہ کی پناہ میں پہنچ گئی ہے اور اس وقت فون پر وہی بول سکتا ہے۔ میں نے انجان بن کر پوچھا۔ "ارے انیلا! تمہاری آواز اتنی موٹی اور بھاری کیسے ہو گئی؟"

اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "تم کون ہو اور انیلا کو کیسے جانتے ہو؟"

"میں اس انیلا کو جانتا ہوں جو پچھلی رات اپنے بنگلے میں تنہا تھی۔ میں دشمنوں سے اس کی حفاظت کرتا ہوا ایک اہم لفافے کے ساتھ وہاں سے لے جانا چاہتا تھا لیکن وہ مجھ سے پتا نہیں کیوں بدظن ہو کر مجھے دھوکا دے کر بھاگنا چاہتی تھی۔ جس کے نتیجے میں وہ اس اہم لفافے سے محروم ہو گئی۔"

"او۔ اب سمجھا۔ تم فرمان علی ہو۔ وہ اہم لفافہ تمہارے ساتھی لے گئے اور تم اپنے ایک ساتھی مراد چنگیزی کے ساتھ میرے تعاقب کرنے والے آدمیوں کو اسی طرح بے وقوف بناتے رہے جس طرح انیلا کو بے وقوف بنا کر اس کے ہمدرد بن کر اس لفافے کو اپنے باس کے پاس پہنچا چکے ہو۔"

"میرا کوئی باس نہیں ہے۔ تم بھی انیلا کی طرح مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ تم ایک پاکستانی محب وطن ہو۔ میں دل سے تمہارا احترام کرتا ہوں۔ تمہاری طرح ان کا بھی دشمن ہوں' جو پچھلی رات انیلا پر حملہ کرنے آئے تھے۔"

"تم نے پچھلی رات انیلا کے سامنے بھی یہی ڈائیلاگ ادا کیے۔ وہاں دو چار آدمیوں کو فرش پر لٹا دیا اور انیلا کو یہ تاثر دیا کہ تم نے اس کی خاطر دشمنوں کو بے ہوش کیا ہے۔

اپنے دو ساتھیوں کو فلمی ریوالور سے گولیاں ماریں۔ انہیں عارضی طور پر مردہ بنایا۔ اس طرح انیلا کا اعتماد حاصل کر کے تم اس کے ساتھ وہ لفافہ لے جانا چاہتے تھے لیکن انیلا نے نائٹ چوکی دار کو بے ہوش دیکھ کر سمجھ لیا کہ تم فراڈ کر رہے ہو لیکن یہاں تک درست تھا کہ اس کے دشمنوں کو بے ہوش کیا لیکن رات کے وقت چوکی داری کرنے والے کو کیوں بے ہوش کیا؟"

"میں نے نائٹ چوکی دار کو اس وقت بے ہوش کیا' جب یہ جانتا بھی نہیں تھا کہ دشمن انیلا پر حملہ کرنے والے ہیں۔"

"جب دشمنوں کے حملے سے بے خبر تھے تو انیلا کے بنگلے میں کیوں گھسے تھے؟ تم نے دشمنوں کے لیے راستہ صاف کرنے کی خاطر نائٹ چوکی دار اور گیٹ کے دربان کو بے ہوش کیا تھا۔"

"تم میرے دوستانہ رویے کو غلط رنگ دے رہے ہو۔"

"دوست ہو تو زیادہ نہ بولو۔ صرف وہ لفافہ واپس لے آؤ۔"

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ وہ لفافہ دشمن لے گئے ہیں۔"

"ہاں۔ تم سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔ وہ لفافہ لے جانے والے تمہیں تنہا سڑک پر چھوڑ گئے پھر ان کا ایک آدمی مراد چنگیزی تمہیں دوسری کار میں ہوٹل تک لے آیا اور میرے آدمیوں کو آج صبح تک دھوکا دیتا رہا۔"

"بس کرو۔ مجھے یقین ہو گیا کہ تم امیر حمزہ نہیں ہو کیونکہ امیر حمزہ تمہاری طرح ایسی جاسوسی کہانیاں نہیں سناتا ہے' جیسی تم مجھے سنا رہے ہو۔ اب یہ بھی سمجھ میں آ رہا ہے کہ بے چاری انیلا تمہیں اصل امیر حمزہ سمجھ کر دھوکا کھا رہی ہے۔"

"انیلا سے تمہیں بہت ہمدردی ہے۔ کل اس کے بنگلے میں گھس آئے تھے۔ بات کیا ہے؟"

"بات کیا ہو سکتی ہے؟ میں کنوارا ہوں۔ کسی بھی حسینہ کے بیڈ روم میں گھس سکتا ہوں۔"

"برخوردار! ایک بار میرے سامنے آجاؤ پھر تمہیں اپاہج بنا دوں گا تو میرے امیر حمزہ ہونے کا یقین آجائے گا۔"

"مجھے تمہارا چیلنج منظور ہے۔ تم جہاں مجھ سے مقابلہ کرنا چاہو وہاں صرف ایک شرط پر مجھے بلاؤ۔ میں ضرور آؤں گا۔"

"تمہاری شرط کیا ہے؟"

"تم اپنے ساتھ انیلا کو لاؤ گے۔ تاکہ میں تمہارا کام تمام کر کے اس بے چاری کو اصل امیر حمزہ تک پہنچا دوں۔"

"مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔ میں انیلا کو ساتھ لاؤں گا۔"

"تو پھر بولو کہاں مردانگی کے جوہر دکھانا چاہتے ہو؟"

"آج شام پانچ بجے ہائیڈ پارک میں سرپنٹائن کے نارتھ میں کہیں بھی ہمارا سامنا ہو سکتا ہے۔"

"اٹ از ڈن!"

یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ مراد میرے کان سے کان لگا کر تمام باتیں سن رہا تھا اور پھر اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اپنے لیے ایک پیالی چائے اور بناتے ہوئے بولا۔ "جتنی گفتگو ہو چکی ہے۔ اس کا تجزیہ کرو۔"

"تجزیہ کیا کروں؟ اس نے مجھے چیلنج کیا ہے۔ آج شام اسے آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔"

"کیا اس طرح تجزیہ ہوتا ہے؟ ذرا سنجیدگی سے خاموش رہ کر غور کرو۔ ایک اہم لفافہ اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں اس کے پاس ضرور ہوں گی۔ وہ تم سے مقابلہ کر کے اس لفافے کو حاصل نہیں کر پائے گا اور نہ ہی اس لفافے کے لیے افسوس کر رہا ہو گا۔ تمہیں طیش دلا کر بلانے کا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے تمہاری صورت شکل سے تمہیں پہچانے گا۔ تمہارے سامنے نہیں آئے گا۔ وہ بہت ذہین ہے۔ عارضی طور پر بزدل بن جائے گا۔ تم اس کے انتظار سے مایوس ہو کر وہاں سے جہاں بھی جاؤ گے اور آئندہ جو کچھ بھی کرتے رہو گے' اس پر وہ اور اس کے جاں نثار نظر رکھیں گے۔"

وہ ایک گھونٹ چائے پی کر بولا۔ "ہماری نگرانی کرنے سے ہو سکتا ہے کہ اس کی غلط فہمی دور ہو جائے۔ ہمارا تعلق نیک بخت اور خفیہ ایجنسیوں سے نہیں ہے لیکن اس دوران میں شمشیر سنگھ کالیا اور بھیا سے ہمارا ٹکراؤ ہو گیا اور یکے بعد دیگرے دشمنوں سے مقابلہ ہوتا رہے گا تو امیر حمزہ یہ سمجھے گا کہ ہم دونوں اسی خفیہ ہاتھ کی تنظیم کے لیے اپنے دشمن تک پیدا کرتے جا رہے ہیں۔ لہٰذا اس اہم لفافے کو ہم ہی نے اس خفیہ ہاتھ تک پہنچایا ہے۔ غلط فہمیاں شیطان کی آنت کی طرح بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ کیا تم سمجھ رہے ہو کہ کسی سے گفتگو کرنے یا اس سے ملاقات کرنے کے بعد اس کے بارے میں کیسے تجزیہ کیا جاتا ہے؟"

"آپ مجھے اچھی طرح سمجھا رہے ہو اور میں سمجھ رہا ہوں لیکن اس نے چیلنج کیا ہے۔"

"کرنے دو۔ تم وہاں نہیں جاؤ گے تو بزدل نہیں بن جاؤ گے۔ انیلا تمہیں پہچانتی ہے۔ لہٰذا تم شام کو یہاں آرام کرو گے۔ میں وہاں جاؤں گا۔"

میں نے اس کی باتوں پر غور کیا۔ وہ بڑا جہاں دیدہ تھا۔ خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا تھا۔ انیلا اور امیر حمزہ اسے چہرے سے نہیں پہچانتے تھے لیکن اس نے پچھلی رات ان دونوں کو فائیو اسٹار ہوٹل میں دیکھا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "میں آپ کی تمام ہدایات پر عمل کرتا ہوں۔ اس ہدایت پر بھی عمل کروں گا۔ ہائیڈ پارک نہیں جاؤں گا لیکن مجھے یہاں آرام کی ہدایت نہ کریں۔ میں کہیں اور جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ریڈی میڈ میک اپ کے ذریعے چہرے پر تھوڑی سی تبدیلی کر کے باہر نکلو۔ لندن میں اب تک صرف انیلا تمہیں چہرے سے پہچانتی ہے۔ شام کے بعد جب تم انہیں نہیں ملو گے اور وہ امیر حمزہ کے ساتھ کہیں شاپنگ کرنے یا ڈنر کے لیے جائے گی تو اتفاقاً اس سے سامنا ہو سکتا ہے۔ تمہیں محتاط رہنا چاہیے۔"

وہ مجھے ریڈی میڈ میک اپ' عارضی فیشل میک اپ اور مستقل سرجری اور ماسک میک اپ کے بارے میں بہت کچھ سکھاتا رہتا تھا اور میں کامیابی سے سیکھتا رہتا تھا۔ میں شام کو اس سے پہلے ہی تفریح کے لیے باہر چلا گیا۔ میرے جاتے ہی چنگیزی نے اوور سیز کال پر گاڈ فادر ہاشم جان سے رابطہ کیا۔ اسے وہاں کے مختصر حالات بتائے پھر کہا۔ "امیر حمزہ سیاسی حوالوں سے ہمارے پاک وطن کا ہیرو ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ آپ کے بھانجے فرمان علی سے ٹکرائے۔ لندن میں آپ کا جو پلان میکر ہے۔ اسے حکم دیں کہ دونوں کی غلط فہمیاں دور کرے ورنہ آپ جانتے ہیں کہ امیر حمزہ اپنی ذہانت کو آزمائے گا تو فرمان کو زبردست نقصان پہنچے گا۔ اگر فرمان نے اپنی جسمانی قوت آزمائی تو امیر حمزہ کو نچوڑ کر رکھ دے گا۔ دونوں صورتوں میں ہمارا اور ہمارے ملک کا نقصان ہے۔"

گاڈ فادر ہاشم جان نے کہا۔ "میں ابھی اس سلسلے میں کچھ کرتا ہوں۔ تب تک تم اپنی حکمتِ عملی سے ان دونوں کو ایک دوسرے سے دور رکھو۔"

ہاشم جان نے رابطہ ختم کر دیا۔ مراد نے انیلا کا فون نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ ہونے پر انیلا کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا۔ "فون امیر حمزہ کو دو۔"

چند سیکنڈ کے بعد امیر حمزہ کی آواز سنائی دی۔ مراد نے کہا۔ "تم شاید انیلا کے ساتھ ہائیڈ پارک جا رہے ہو۔ شاید کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ تم اپنی محبوبہ کو خطرات سے

دو چار کرنے کے لیے اسے وہاں نہیں لے جاؤ گے اور خود وہاں جانے کی نادانی نہیں کرو گے۔"

"تم ایک دانش مند بزرگ کی طرح بات کر رہے ہو اپنا تعارف کراؤ۔"

"تعارف نام سے نہیں.......... اچھے کام سے ہوتا ہے۔ تم فرمان علی کو خفیہ ہاتھ کا یا کسی خفیہ ایجنسی کا کارندہ سمجھ رہے ہو۔ یہ تمہاری غلطی ہے اور اگر وہ خفیہ ایجنسی سے تعلق رکھتا ہے تو تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ ہائیڈ پارک میں خفیہ ایجنسی کے درجنوں کارندے فرمان کی حفاظت کے لیے اور تمہیں موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے پہنچ چکے ہوں گے۔"

"تم کیسے جانتے ہو کہ میں فرمان سے ہائیڈ پارک میں ملاقات کرنے والا ہوں اور میرے ساتھ انیلا بھی ہو گی۔"

"میں تمہارے کئی سوالوں کے جواب اس لیے نہیں دوں گا کہ تم ایک محب وطن پاکستانی ہو اور ہم جرائم کی دنیا میں رہتے ہیں۔"

"آخر اپنی اصلیت بتا دی کہ تمہارا تعلق جرائم پیشہ افراد سے ہے۔ ہماری ہائیڈ پارک میں ملاقات کرنے والی بات صرف وہی جان سکتا ہے جو فرمان کے ساتھ رہتا ہے۔ تم مراد چنگیزی ہو؟"

"مجھے کوئی سا نام بھی دے دو مگر اس بات کا یقین کر لو کہ کسی بھی آزمائش کی گھڑی میں ہم تمہارے لیے جان دے سکتے ہیں لیکن تمہاری جان سے کھیل کر اپنے وطن کو نقصان پہنچانے والی بات سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"اسی لیے فرمان میرا کام تمام کرنے ہائیڈ پارک میں ملنا چاہتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ قہقہے لگانے لگا۔ مراد نے کہا۔ "تمہاری طرح فرمان بھی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ میں تم دونوں کی غلط فہمیاں.........."

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ دوسری طرف سے قہقہے رکنے کے باعث پتا چلا کہ امیر حمزہ نے فون بند کر دیا ہے۔ اس نے دوبارہ نمبر ڈائل کئے' رابطہ ہونے پر اسے مخاطب کیا۔ وہ بولا "خواہ مخواہ وقت ضائع نہ کرو۔ اگر تم اور فرمان سچے ہو' مسلمان ہو' پاکستانی ہو تو جو لفافہ لے گئے ہو' اسے واپس لے آؤ۔ زبان سے نہیں' عمل سے سچائی ثابت کرو۔ دیٹس آل۔"

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ انیلا نے کہا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ فرمان نے تمہیں چیلنج کیا ہے اور یہ مراد تم سے محبت اور دوستی جتا رہا ہے۔ کیا ان کی چالیں سمجھ

میں آ رہی ہیں؟"

"مجھ جیسے کو ٹریپ کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے آزمائے جاتے ہیں۔ فرمان میرے لیے زہریلی چھری اور مراد میٹھی چھری بن رہا ہے۔"

انیلا نے پوچھا۔ "اور تم ان کے لیے کیا بننا چاہتے ہو؟"

"قربانی کا بکرا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے فرمان کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے' وہ اناڑی اور جذباتی ہے۔ تم اسے پہچانتی ہو' اس لیے وہ بھیس بدل کر ہائیڈ پارک آ سکتا ہے۔"

"وہ جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ فرمان وہاں تنہا نہیں ہو گا۔"

"ظاہر ہے پوری تیاریوں کے ساتھ آئے گا لیکن میں بارات لے کر نہیں جاؤں گا۔"

انیلا نے حیرانی سے پوچھا۔ "یعنی کہ ہم وہاں جا رہے ہیں؟"

امیر حمزہ نے مسکرا کر کہا۔ "جب بارات نہیں جائے گی تو دلہن بھی نہیں جائے گی۔ تم میرے دست راست رضا ربانی کے ساتھ نئی خفیہ رہائش گاہ میں جاؤ۔ میں بعد میں آؤں گا۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "پلیز ہائیڈ پارک نہ جاؤ۔"

وہ دروازے تک گیا پھر پلٹ کر بولا۔ "میرے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہو تو کسی بھی لمحے بیوہ بننے کے لیے تیار رہا کرو۔"

یہ کہہ کر وہ دروازہ بند کرتا ہوا چلا گیا۔

دوسری طرف مراد چنگیزی نے فون کے ذریعے ایک ماتحت سے رابطہ کر کے پوچھا۔ "فرمان کی نگرانی ہو رہی ہے؟"

"ہو رہی تھی مگر اچانک وہ کہیں گم ہو گیا ہے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟ کہاں گم ہو گیا ہے؟ کیسے گم ہو گیا ہے؟ کیا تم سب اندھے ہو گئے تھے؟"

"جناب! وہ ایک بہت بڑے اسٹور کے سامنے ٹیکسی رکوا کر اندر گیا تھا۔ ہم نے سمجھا واپس آئے گا۔ جب دیر ہو گئی تو ہم نے ٹیکسی ڈرائیور کے پاس پہنچ کر پوچھا۔ "تمہاری ٹیکسی میں آنے والے صاحب کہاں ہیں؟"

اس نے کہا۔ "صاحب نے انتظار کرنے کو کہا ہے مگر آدھا گھنٹا گزر چکا ہے۔ پتا

نہیں کب واپس آئیں گے؟"

"ہم نے جنرل اسٹور کے گراؤنڈ فلور اور فرسٹ فلور پر تلاش کیا مگر وہ نظر نہیں آئے۔ اب تو ڈیڑھ گھنٹا گزر چکا ہے۔ وہ جنرل اسٹور کے پچھلے راستے کہیں گئے ہوں گے۔"

مراد چنگیزی نے فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر فون بند کرتے ہوئے کہا۔ "او خدایا! فرمان ضرور ہائیڈ پارک گیا ہوگا۔"

وہ فوراً ہی باہر آیا پھر اپارٹمنٹ کو لاک کر کے جانے لگا۔ سڑک کے کنارے ٹیکسی نظر نہیں آ رہی تھی اور دماغ چیخ کر پوچھ رہا تھا کہ دو پہاڑ ٹکرائیں گے تو کیا نتیجہ نکلے گا؟

☆=======☆=======☆

اکرام شاہ نے اپنے تمام ذرائع اختیار کر کے یہ ثابت کرنا چاہا کہ مراد علی اور تابانی دہشت گرد نہیں بلکہ اس کے معزز مہمان ہیں۔

اکرام شاہ نے اپنے پارٹی لیڈر کاشف اکبر کو دھمکی دی تھی کہ مراد اور تابانی پر سے الزامات ختم نہ کیے گئے تو وہ نیک بخت کی پارٹی میں چلا جائے گا۔ کاشف اکبر نے اپنے مشیروں اور وکیلوں کے ذریعے پولیس اور انٹیلی جنس والوں کو الزام دیا کہ انہوں نے اکرام شاہ جیسے ایم این اے کے گھر کسی وارنٹ کے بغیر چھاپہ مارا تھا اور جمشید نامی ایک ایسے جوان سراغ رساں کے ذریعے کوٹھی میں گھس کر ضروری دستاویزات کے علاوہ لاکھوں روپے کے زیورات اور نقدی لے گئے تھے' یہ سب کچھ ذاتی دشمنی کی بناء پر کیا گیا تھا۔

ذاتی دشمنی یہ تھی کہ جمشید' ایم این اے کی چھوٹی بیٹی فری سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ رشتہ منظور نہ کرنے کے باعث وہ دشمن بن گیا۔ اس نے اچانک پولیس کارروائی کر کے اکرام شاہ کے معزز مہمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنے کے لیے جھوٹ موٹ کا اسلحہ اور بم برآمد کیے۔ یہ ساری کارروائی یک طرفہ ہوئی۔

اس کیس کا کمزور پہلو یہ تھا کہ انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ میں جمشید زیر تربیت تھا۔ تربیت کے دوران میں اس کی کارکردگی ہمیشہ عمدہ رہی تھی۔ اس لیے ڈائریکٹر جنرل کے حکم پر جمشید کی راہنمائی میں اکرام شاہ کی کوٹھی پر کارروائی کی گئی تھی۔ جبکہ جمشید کو کسی بڑے یا چھوٹے عہدے پر فائز نہیں کیا گیا تھا۔ چار ماہ بعد تربیت کی تکمیل کے بعد اسے کوئی عہدہ ملنے والا تھا۔ اس خلافِ اصول عمل کو جمشید اور اکرام شاہ کی دشمنی کا رنگ دے کر کیس کو کمزور بنایا جانے لگا۔

ان تمام پولیس اور انٹیلی جنس والوں پر عتاب نازل ہونے والا تھا۔ کسی کو ٹرانسفر کر دیا جاتا اور کسی کو ملازمت سے فارغ کر دیا جاتا اور وہ دونوں دہشت گرد مراد اور تابانی باعزت طور پر بری کر دیئے جاتے۔

اس وقت ایک چال چلی گئی۔ ان دونوں کو مجرم ثابت کرنا لازمی ہو گیا تھا۔ اس لیے ایسی چال چلی گئی کہ مراد حوالات سے فرار ہو گیا۔ تمام تھانوں میں اس کے فرار ہونے کی اطلاع دی گئی۔ اعلیٰ افسران کو تسلیاں دی جاتی رہیں کہ مفرور مراد کا تعاقب کیا جا رہا ہے پھر بڑی دیر تک تجسس پیدا کرتے رہنے کے بعد اطلاع دی گئی کہ کاؤنٹر فائرنگ میں مراد نے ایک سپاہی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا اس لیے مجبور ہو کر مراد کو بھی گولیوں سے چھلنی کیا گیا ہے۔

جب سپاہی کی لاش شہر کے تھانے میں لائی گئی تو اکرام شاہ کا سر جھک گیا۔ جس مراد کو وہ بچانا چاہتا تھا' وہ مجرم ثابت ہو گیا اور جمشید کے حکم پر سپاہیوں نے مراد کے دونوں گھٹنوں اور ٹانگوں پر اتنی گولیاں برسائی تھیں کہ اس کا آدھا دھڑ نیچے سے مردہ ہو چکا تھا اور آدھا دھڑ اوپر سے ابھی زندہ تھا۔ اسے اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ انٹیلی جنس کے ڈی جی نے ڈاکٹروں سے کہا تھا کہ پوری محنت اور لگن سے آپریشن کیا جائے۔ اس زخمی کو مرنا نہیں چاہیے۔

اکرام شاہ اپنے مقصد میں ناکام رہا تھا۔ ڈائریکٹر جنرل نے سختی سے کہا تھا کہ وہ مراد اور تابانی سے ملنے کے لیے اسپتال نہ جائے۔ وہاں اتنا سخت پہرہ لگایا گیا تھا کہ اکرام شاہ کسی پولیس والے کو رشوت دے کر بھی اپنے کسی بندے کو تابانی کے پاس نہیں بھیج سکتا تھا۔

جمشید یہی چاہتا تھا کہ تابانی کو ابھی مراد کے زخمی اور اپاہج ہونے والی بات معلوم نہ ہو۔ اس کے کمرے میں ایک بھی اخبار نہیں جاتا تھا ورنہ اسے اخبار سے پتا چل جاتا کہ مراد فرار ہونے کے بعد بری طرح زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا ہے۔ ایسی خبر پڑھتے ہی تابانی اسپتال سے فرار ہو کر مراد تک پہنچنے کی کوشش کرتا (کرتی)۔

لیڈی ڈاکٹر کا بھی مشورہ تھا کہ تابانی کو کم از کم ایک ہفتے تک اسپتال میں باقاعدہ زیر علاج رہنا چاہیے۔ اس لیے اس کے کمرے سے ٹیلی فون کو بھی ہٹا دیا گیا تھا۔ اکرام شاہ ایسی سہولت سے فائدہ اٹھا کر تابانی سے رابطہ کر سکتا تھا۔

مراد کے دونوں پیروں میں کئی گولیاں پیوست ہوئی تھیں۔ دونوں گھٹنوں میں اتنی گولیاں ماری گئی تھیں کہ گھٹنوں کی ہڈیاں چکنا چور ہو گئی تھیں۔ آپریشن کے دوران میں

انہیں جوڑنا ممکن نہیں تھا۔ ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ گھٹنوں کی تمام ہڈیاں خارج کر کے آہنی راڈ کے ذریعے مصنوعی ہڈیوں کا جوڑ لگایا جائے پھر گولیوں کا زہر بھی پھیلنے کا مسئلہ تھا۔ ایک فیصلہ یہ بھی تھا کہ دونوں گھٹنوں کی طرف سے ٹانگیں کاٹ دی جائیں۔

زیادہ محنت سے بچنے کے لیے تمام ڈاکٹر اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ دینا چاہتے تھے مگر انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل نے لیڈی سرجن آمنہ سے رجوع کیا اور کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ اس مجرم کی ٹانگیں نہ کاٹی جائیں۔"

آمنہ نے پوچھا۔ "آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟ مجھے اس زخمی مجرم کی مختصر ہسٹری بتائیں۔ اس کیس کو اچھی طرح سمجھ کر شاید میں کامیاب آپریشن کر سکوں۔"

آمنہ کو مراد کے علاوہ تابانی کی بھی ہسٹری بتائی گئی کیونکہ دونوں کی داستانِ حیات ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی تھی۔ تابانی کے بارے میں سن کر آمنہ نے کہا۔ "یہ ایک نفسیاتی کیس ہے۔ وہ ذہنی طور پر مرد.......... اور جسمانی طور پر عورت ہے۔ اپنے مراد کے بچے کے لیے ایک ماں ہے مگر مخالفین کے لیے خطرناک بلا ہے۔ بہرحال آپریشن کی تیاری کی جائے۔"

جب بھی آمنہ کو کسی اسپتال میں مشکل ترین آپریشن کے لیے بلایا جاتا' وہاں کے بوڑھے اور تجربہ کار ڈاکٹر ناگواری سے منہ بناتے تھے اور پیش گوئی کرتے تھے۔ "یہ لیڈی ڈاکٹر بہت زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہوتی جا رہی ہے۔ اس بار ضرور ناکام ہو گی۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ کامیابی حاصل ہوتی رہے۔"

وہ آپریشن آمنہ کے لیے واقعی ایک چیلنج تھا۔ کئی ٹکڑوں میں ٹوٹ کر تقسیم ہونے والی ہڈیوں کو جوڑ کر ان گھٹنوں کو پہلے کی طرح مکمل کرنا ناممکن سا لگتا تھا۔ آمنہ نے بڑی محنت کی۔ ایک ایک دو دو دنوں کے وقفوں سے تین مرحلوں میں آپریشن کیا۔ اوپر سے پلاسٹر لگا کر ماتحت ڈاکٹروں اور نرسوں کو ہدایت دی کہ اس کے دونوں پیروں کو ران سے لے کر نیچے ٹخنوں تک اس طرح باندھ کر رکھا جائے کہ مراد انہیں ذرا بھی ہلا نہ سکے۔ وہ بارہ دنوں تک صبح و شام مراد کو اٹینڈ کرتی رہی۔ اس کی ذاتی توجہ کے باعث ایکسرے رپورٹ نے بتایا کہ گھٹنوں کی ہڈیاں جڑ رہی ہیں۔ اسی توجہ سے علاج ہوتا رہا تو گھٹنے مضبوط ہو جائیں گے۔

آمنہ کے لیے بھی یہ ایک تجربہ تھا۔ اسے شبہ تھا کہ گھٹنے مضبوط تو ہو جائیں گے لیکن وہ کیا مڑ سکیں گے؟ کیا وہ اکڑوں بیٹھ سکے گا؟ یہ بات رفتہ رفتہ معلوم ہونے والی تھی۔

یہ ایسا غیر معمولی آپریشن تھا کہ اس کی شہرت میں بے انتہا اضافہ ہونے لگا۔ اخبارات' ریڈیو اور دوسرے میڈیاز کے ذریعے پاکستان سے باہر بھی اس کی لائف ہسٹری اور غیر معمولی آپریشن کا ذکر ہونے لگا۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن' ریڈ کراس سوسائٹی کو آرگنائز کرنے والے بین الاقوامی شہرت کے حامل ڈاکٹروں نے اور عالمی سطح کے بون اسپیشلسٹ نے اس کی پذیرائی کی۔ اسے کئی ممالک میں مدعو کیا گیا اور اس کی آمد پر طبی حوالوں سے بڑے بڑے سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔

بیرونی ممالک کے دورے سے واپسی پر اس نے مراد کو دیکھا۔ اس کے گھٹنوں سے پلاسٹر ہٹا دیا گیا تھا۔ اس حد تک کامیابی ہوئی تھی کہ گھٹنے مضبوط تو ہو گئے تھے لیکن جیسا کہ پہلے اندیشہ تھا' وہ اپنے گھٹنوں کی طرف سے پیروں کو نہیں موڑ سکتا۔

مراد نے کہا۔ "ڈاکٹر! میرا آدھا جسم مر چکا تھا۔ آپ نے اسے زندہ کر دیا ہے۔ اگرچہ میں گھٹنوں کو موڑ نہیں سکتا ہوں لیکن اسی طرح پیروں کو سیدھا رکھ کر جینے کا عادی ہو جاؤں گا۔"

آمنہ نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ "میں کبھی ادھورا علاج نہیں کرتی۔ اگر تم حوصلہ کرو گے تو میں چند ماہ بعد پھر آپریشن کروں گی پھر تم دونوں گھٹنوں کو موڑ سکو گے۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "اوہ ڈاکٹر! مجھے آپ پر یقین ہے۔ میں آپ کی بہت شہرت سن رہا ہوں اور یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ آپ نے میرے مردہ پیروں میں جان پیدا کر دی ہے۔ کبھی آزمائش کی گھڑی آئے گی تو یہ جان آپ پر نچھاور کر دوں گا۔"

"مجھے تمہاری جان کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کچھ اور چاہتی ہوں۔"

"آپ جو چاہیں گی' میں وہی کروں گا۔"

آمنہ نے کہا۔ "میں ایک جوان بیٹے کی ماں ہوں۔ یہ چاہتی ہوں کہ تم اپنی اولاد کو اپنی طرح مجرم نہ بناؤ۔"

مراد نے سر جھکا لیا۔ آمنہ نے کہا۔ "مجھے تابانی سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی ورنہ اس سے بھی یہی کہتی کہ اولاد کو اتنی عظمت دو کہ ماں کا سر کبھی نہ جھکے۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ "پتا نہیں اب کبھی تابانی سے مل سکوں گا یا نہیں اور جب وہ میری اولاد کو جنم دے گا تو اس بچے کی صورت بھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ شاید اس وقت تک پھانسی پر چڑھ جاؤں۔"

"میں نے سنا ہے کہ وہ عورت کے نہ سے غصے میں آجاتی ہے اور ایسا کہنے والے کو اپاہج بنا کر چھوڑ دیتی ہے۔"

"ہاں ڈاکٹر! کبھی اس سے سامنا ہو تو اسے یہی تاثر دیں کہ آپ اسے مرد سمجھ رہی ہیں۔"

"زچگی کے بعد اسے بھی موت کی سزا ہو سکتی ہے۔ لبرٹی بم بلاسٹنگ میں کئی بے گناہ انسان مارے گئے ہیں۔ ایسا کر کے تم لوگوں نے کیا پایا؟ پہلے تم دونوں نے سوچا ہو گا کہ ایک دن سب کو مرنا ہے لہٰذا موت آئے گی تو دونوں گلے لگ کر مر جائیں گے لیکن اب تم دو نہیں ہو۔ تم دونوں نے آنے والے اس تیسرے کے بارے میں کبھی سوچا تھا؟"

"نہیں ڈاکٹر! اتنی دور تک نہیں سوچا تھا۔ مجھ جیسے باپ بننے والے کو اب موت بھاری لگ رہی ہے۔ پتا نہیں اس ماں بننے والے کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی؟"

"کیا دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کوئی کرشمہ ہو جائے۔ تمہیں اور تابانی کو ایک نئی زندگی مل جائے تو تم اپنے بچے کے ساتھ شریفانہ اور پُرامن زندگی گزارو گے اور اپنے بچے کو ایک اچھا نیک نام انسان بناؤ گے۔"

"بخدا ایسا خیال آتا ہے پھر اپنے آپ پر ہنسی آتی ہے۔ کانٹے بو کر پھول نہیں اگائے جا سکتے۔ ہمیں اپنے بُرے انجام تک پہنچنا ہے۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے کہ انجام برا ہو۔ ارادے نیک ہوں گے تو انجام بدل جائے گا۔ اگر اپنے اندر کے ایمان کو زندہ کرتے رہو گے تو میں تم دونوں کو بچے کے ساتھ زندگی دوں گی۔"

اس نے چونک کر آمنہ کو دیکھا۔ وہ بولی۔ "خدا کے بعد زندگی دینے والا ڈاکٹر ہوتا ہے۔ میں جس مریض کو ہاتھ لگاتی ہوں' وہ زندہ گھر واپس جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اس کے کمرے سے چلی گئی۔ مراد اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ کمرے سے نکل کر ایک ڈاکٹر کے چیمبر میں آئی تو وہاں انٹیلی جنس کا ڈی جی بیٹھا ہوا تھا اور کرسی کے قریب جمشید انٹیشن کھڑا ہوا تھا۔ ڈی جی نے آمنہ سے پوچھا۔ "اب تو وہ پیروں پر کھڑا ہو سکتا ہے؟"

"ہاں مگر سہارے کے بغیر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اس کے گھٹنوں کو مڑنا چاہیے۔ میں اور ایک ماہ تک کچھ ضروری اسٹڈی کروں گی پھر اس کا آپریشن کروں گی۔"

"کیا پھر آپریشن کرو گی؟ میرے منصوبے کے مطابق یہ ضروری نہیں ہے۔ پولیس اسپتال کی لیڈی ڈاکٹر نے رپورٹ دی ہے کہ تابانی کو اسپتال سے لے جایا جا سکتا ہے۔ اب وہ کسی دن بھی وہاں سے فرار ہو گی۔"

"ہو گی نہیں ہو گا۔ پلیز آپ تابانی کی نفسیات کو سمجھ کر اسے مرد ہی سمجھا کریں۔

بائی داوے آپ یہ کیوں سوچ رہے ہیں کہ وہ اسپتال سے فرار ہو گا۔"

"یہ قانونی معاملات ہیں۔ ہم اپنے طور پر اس کیس کو ہینڈل کر رہے ہیں۔ میں اس کیس میں آپ کو مراد کے آپریشن کے لیے لایا تھا۔ اب آپ کا کام ختم ہو چکا ہے۔"

"نہیں آفیسر! میں کہہ چکی ہوں۔ ابھی مراد کا ایک آپریشن ضروری ہے۔"

"سوری' میں مزید آپریشن کی اجازت نہیں دوں گا۔"

آمنہ نے مسکرا کر کہا۔ "یہ پولیس اسٹیشن اور انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ نہیں' اسپتال ہے۔ آپ ڈاکٹر کے فیصلے کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے پھر میں لیڈی سرجن آمنہ ہوں۔ میری مرضی کے خلاف میرے مریض کو قانون کا کوئی محافظ نہیں لے جا سکے گا۔"

"آپ انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل کو چیلنج کر رہی ہیں۔"

"ابھی تو صرف باتیں ہیں۔ میں اپنے مریض کو اپنے زیرِ علاج رکھنے کے لیے انٹرنیشنل سوسائٹی آف ڈاکٹرز کو صرف ایک کال کروں گی تو کیا آپ پھر کوئی جوابی کارروائی کر سکیں گے؟"

ڈی جی نے مسکرا کر کہا۔ "ڈاکٹر! آپ قابلِ احترام ہیں۔ آپ نے ساری دنیا میں پاکستان کا نام روشن کیا ہے۔ میں آپ کی اجازت کے بغیر آپ کے مریض کو یہاں سے نہیں لے جاؤں گا۔"

"آپ مجھے قابلِ احترام کہہ رہے ہیں لیکن مجھے تابانی سے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں دے رہے۔"

"وہ آپ کی مریضہ' میرا مطلب ہے آپ کا مریض نہیں ہے۔"

"کیا یہی وجہ ہے یا کوئی اور بات ہے؟"

"آپ پہلے بھی تابانی سے ملنے کی فرمائش کر چکی ہیں۔ میں صاف اور سیدھی بات کہتا ہوں۔ آپ کے خلاف بے شمار رپورٹس ہیں۔ آپ کی پہنچ صرف عالمی سطح کے معزز ڈاکٹروں تک نہیں' عالمی سطح کے خطرناک مجرموں تک بھی ہے۔ آپ دم توڑتے ہوئے مریضوں کو بھی زندگی کی طرف واپس لے آتی ہیں۔"

"کیا مرنے والوں کو زندگی دینا جرم ہے؟"

"یہی تو مشکل ہے کہ آپ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مجرمہ نہیں کہلا سکتیں۔ میرا خیال ہے۔۔ آپ دنیا کی پہلی خاتون ہیں جو دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام معزز ہستیوں اور تمام خطرناک مجرموں کے لیے قابلِ احترام ہیں۔ اگر آپ نے تابانی کا کیس ہاتھ میں لیا تو ہم بے بس ہو جائیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ تابانی کے سلسلے میں

آپریشن کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس لیے وہاں آپ کی ضرورت نہیں ہے۔"

آمنہ نے مسکرا کر کہا۔ "آپ بھول رہے ہیں کہ تابانی کی جنس تبدیل ہوئی ہے۔ وہ مرد سے عورت بنا ہے ایسے کیس میں زچگی کے وقت آپریشن کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ آپ دعا کریں' آپریشن پیچیدہ نہ ہو۔ اگر پیچیدہ ہوا تو میں پہنچ جاؤں گی۔"

"میں سمجھتا ہوں' ایسا وقت نہیں آئے گا۔"

ڈی جی نے کرسی سے اٹھ کر جمشید سے کہا۔ "چلو۔ مراد ان کا مریض ہے۔ ان کی مرضی کے مطابق اسے یہاں رہنے دو۔ جب یہ مراد کو اسپتال سے ڈسچارج کریں گی تو ہم اسے پولیس کسٹڈی میں پہنچا دیں گے۔"

ڈی جی ڈاکٹر سے مصافحہ کر کے پھر آمنہ کو سلام کر کے جمشید کے ساتھ کمرے سے باہر آیا پھر بولا۔ "میں نہیں جانتا تھا کہ یہ مراد کا ایک اور آپریشن کرے گی۔ اس طرح اسے اور دو تین ماہ تک یہاں رکھے گی۔ تم ایک کام کرو۔ مراد کے کمرے میں.......... ڈیٹکٹو آلات چھپا کر رکھوا دو۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ مراد سے کن موضوعات پر گفتگو کرتی ہے۔"

"میں ڈیٹکٹو.......... آلے وہاں رکھوا دوں گا۔ مجھے بھی ڈاکٹر آمنہ پر شبہ ہے۔ وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مراد کو وزٹ کرنے گئی تھی۔ ہمیں ڈاکٹر کے چیمبر میں پتا چلا کہ وہ آدھے گھنٹے سے اس کے پاس ہے۔ آمنہ جیسی مصروف ڈاکٹر صرف ایک مجرم مریض کے ساتھ اتنا وقت کیوں ضائع کرتی ہے۔"

"آئندہ ہمیں ڈیٹکٹو.......... آلے سے معلوم ہو جائے گا۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے اسپتال سے باہر چلے گئے۔ ڈاکٹر کے چیمبر میں بیٹھی ہوئی آمنہ سوچ رہی تھی' ڈائریکٹر جنرل اتنے یقین سے کیوں کہہ رہا تھا کہ تابانی اسپتال سے فرار ہو گا؟

اس کے سامنے بیٹھے ہوئے ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ کی شخصیت بڑی باوقار ہے۔ آپ کے چہرے' آواز اور لہجے سے ایسا رعب اور دبدبہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈائریکٹر جنرل جیسے لوگ آپ کے سامنے بول نہیں پاتے۔"

آمنہ نے کہا۔ "انسان سچا اور کھرا ہو اور اس کے اعمال اچھے اور مستحکم ہوں تو اس کی شخصیت خود ہی باوقار بنتی جاتی ہے۔"

"اس ملک کے اکابرین اور قانون کے تمام اعلیٰ عہدے دار جانتے ہیں کہ آپ ڈبل رول پلے کرتی ہیں۔ ساری دنیا میں نیک نام بھی ہیں اور زندگی و موت سے لڑنے والے

مجرموں کو زندگی کی طرف واپس لانے اور انہیں تحفظ دینے کے سلسلے میں بدنام بھی ہیں اور اپنے ایسے عمل کو قانونی حیثیت دے دیتی ہیں۔"

"میں نے جب بھی کسی خطرناک مجرم کا آپریشن کیا اسے زندگی دی۔ وہ کبھی میرے پاک وطن میں تخریبی کارروائی کے لیے دوبارہ نہیں آیا۔ میں ان سے آپریشن کا یہی معاوضہ لیتی ہوں۔ وہ صحت یاب ہوتے ہی میرے وطن کی مٹی کو سلام کر کے جاتے ہیں پھر لوٹ کر نہیں آتے۔"

"یو آر سو گریٹ ڈاکٹر! ہم سب آپ کو سلام کرتے ہیں۔"

ایک نرس نے آ کر کہا۔ "ڈاکٹر! دس نمبر کے مریض کی حالت بہت خراب ہے۔ آپ پلیز اسے اٹینڈ کریں۔"

ڈاکٹر فوراً ہی اٹھ کر آمنہ کو سلام کرتے ہوئے نرس کے ساتھ چلا گیا۔ آمنہ چند لمحوں تک سوچتی رہی پھر اس نے ڈاکٹر کی میز کے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر گاڈ فادر ہاشم جان کے نمبر ڈائل کیے۔

رابطہ ہونے پر آمنہ کی آواز سنتے ہی ہاشم جان نے پوچھا۔ "باجی! آپ نے مجھے یاد کیا ہے۔ آپ خیریت سے ہیں نا؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہیں مراد علی اور تابانی کا کیس معلوم ہے؟"

"اس سلسلے میں کم جانتا ہوں۔ آپ اس کیس میں دلچسپی لے رہی ہیں تو پوری معلومات حاصل کر لوں گا۔ آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"تابانی کو پولیس اسپتال میں بڑے سخت پہرے میں رکھا گیا ہے۔ کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ مجھے بھی اجازت نہیں دی گئی۔ انٹیلی جنس کے ڈی جی نے بڑے یقین سے کہا ہے کہ تابانی اسپتال سے فرار ہو گا۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ پولیس والے کسی مجرم کو فرار ہونے کا موقع دیتے ہیں تو کسی عدالتی کارروائی کے بغیر اسے کاؤنٹر فائرنگ میں ہلاک کر کے مجرم ثابت کر دیتے ہیں۔ میں تابانی کی زندگی اور سلامتی چاہتی ہوں۔"

"میری پیاری باجی! بس اتنی سی بات ہے؟ وہ زندہ بھی رہے گا اور سلامت بھی۔ آپ کے حکم کی تعمیل ہو گی۔"

آمنہ نے ریسیور رکھ دیا۔

شام کو چار بجے ایک نرس نے تابانی کے کمرے میں آ کر پھولوں کا ایک بکے اسے دے کر کہا۔ "یہ انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔"

تابانی نے اس بکے کو لے کر کہا۔ "اس ڈی جی سے کہو۔ آئندہ پھول نہ بھیجیں۔ صرف ایک پرچی پر یہ لکھ کر بھیج دیں کہ میرا مراد کس جیل میں ہے؟"

نرس چلی گئی۔ وہ بکے ایک پرانے اخبار میں آدھا لپٹا ہوا تھا۔ تابانی نے اخبار کو بکے سے الگ کرنے کے لیے اسے ہاتھ لگاتے ہوئے دیکھا تو ایک دم سے چونک کر اٹھ بیٹھا۔ وہ ایک پرانا اخبار تھا' اس میں مراد کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ مجرم مراد علی نے حوالات سے فرار ہو کر پولیس مقابلے میں ایک سپاہی کو ہلاک کر دیا۔ جواباً پولیس نے گولیاں چلا کر اسے بری طرح زخمی کر دیا ہے۔ اب ایک اسپتال میں اس کا علاج کیا جا رہا ہے۔

تابانی بستر سے اتر کر چیختا ہوا دروازے پر آیا پھر بولا۔ "میں مراد پر گولیاں چلانے والوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے بتاؤ اسے کس اسپتال میں رکھا گیا ہے؟"

دروازے پر کھڑے ہوئے سپاہیوں نے گنیں سیدھی کر لیں۔ ایک نے کہا۔ "تم دروازے سے باہر قدم رکھو گے تو تم پر گولیاں چلائی جائیں گی۔ ہمیں سختی سے حکم دیا گیا ہے کہ دروازے سے باہر آتے ہی تمہیں گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے۔"

تابانی نے حقارت سے کہا۔ "میں بچپن سے ایسے کھلونوں سے کھیلتا آیا ہوں۔ اگر ابھی ڈی جی سے میری بات نہ کرائی گئی تو اس اسپتال میں قیامت برپا کر دوں گا۔"

ایک جونیئر افسر نے آ کر کہا۔ "تم کمرے میں آرام سے بیٹھو۔ ہنگامہ نہ کرو۔ ابھی یہاں فون کنکشن دیا جا رہا ہے۔ تم ڈی جی صاحب سے بات کر سکو گے۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا بستر کے سرے پر آ کر بیٹھ گیا۔ دو ملازم ایک ٹیلی فون سیٹ لے کر آئے۔ ایک نے تار ٹیلی فون سوئچ سے منسلک کر کے اس کا ریسیور اٹھایا۔ کسی کے نمبر ڈائل کر کے فون کو آزمایا پھر ایک ملازم نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر کہا۔ "یہ کام کر رہا ہے۔ آپ بات کر سکتے ہیں۔"

دونوں ملازم چلے گئے۔ تابانی نے جونیئر افسر سے کہا۔ "ڈی جی سے رابطہ کراؤ۔ کم آن ہری اپ۔"

جونیئر افسر نے ریسیور اٹھا کر ڈی جی سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "سر! میں سہیل احمد بول رہا ہوں۔ تابانی آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

جواب سننے سے پہلے ہی تابانی نے ریسیور اس سے چھین کر اسے کان سے لگایا پھر کہا۔ "ہاں میں تابانی ہوں۔ میرے یار کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے' وہ تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔ ڈاکٹر نے مجھے غصہ کرنے اور چیخنے چلانے سے منع کیا ہے۔ اگر مجھے پُرسکون رکھنا

چاہتے ہو تو بتاؤ' مراد کا علاج کس اسپتال میں ہو رہا ہے؟"

ڈی جی نے کہا۔ "کوئی کارنامہ دکھایا جائے تو انعام ملتا ہے۔ اپنے پیا سے ملنا چاہتی ہو۔ سوری۔ "چاہتے" ہو تو اسے تلاش کرو۔ وہ اسی شہر کے ایک اسپتال میں ہے۔"

"یہاں اسپتال کے اندر اور باہر مسلح پولیس کا سخت پہرا لگا کر کہتے ہو کہ میں مراد کو تلاش کرنے جاؤں۔ فار یور کائنڈ انفارمیشن میں ایک ایک کو موت کے گھاٹ اتار کر یہاں سے جا سکتا ہوں لیکن مراد کو ڈھونڈنے میں وقت لگے گا۔ صرف اس اسپتال کا نام بتا دو پھر دیکھو میں یہاں سے کیسے جاؤں گا؟"

"میں تمہیں اسپتال سے جانے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ یہاں تم پر کوئی گولی نہیں چلائے گا۔ تمہیں صرف آدھے گھنٹے کی رہائی ملے گی پھر آدھے گھنٹے بعد پوری پولیس فورس تمہیں چاروں طرف سے گھیر لے گی۔ جس اسپتال میں مراد ہے' وہاں بھی تمہیں گرفتار کیا جا سکے گا۔"

تابانی نے کچھ سوچ کر کہا۔ "ہم نے تربیتی کیمپ میں بہت کچھ سیکھا ہے۔ تمہاری یہ بچکانہ پلاننگ سمجھ میں آ گئی ہے۔ تم نے مراد کو بھی فرار ہونے کا موقع دے کر اسے زخمی کیا ہو گا۔ جبکہ پولیس مقابلے کا نام دے کر مجرم کو قتل کر دیا جاتا ہے۔"

"ہم اسے قتل سے بھی بدترین سزا دینا چاہتے تھے۔ اس کے دونوں پیروں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا اور گھٹنے کی ہڈی کو ایسا چکنا چور کیا تھا کہ اس کا آدھا جسم ہمیشہ کے لیے مردہ ہو جاتا لیکن ایک عالمی شہرت یافتہ لیڈی سرجن آمنہ نے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ جو گھٹنے کبھی ثابت و سالم نہیں ہو سکتے تھے' ان کی ہڈیوں کو جوڑ کر اسے کھڑے ہونے اور چلنے کے قابل بنا دیا ہے۔"

"تم نے مراد کو فرار ہونے کا موقع دے کر اسے ایک مجرم ثابت کر دیا ہے۔ اب مجھے بھی مفرور ثابت کرنے کے لیے آدھے گھنٹے کی رہائی دے رہے ہو۔ جبکہ مراد تک آدھے گھنٹے میں نہیں پہنچ سکوں گا۔ اسپتال کے باہر جاتے ہی مجھ پر گولیاں برسائی جائیں گی۔"

"تم اس سے عشق کرتی ہو۔ میرا مطلب ہے کرتے ہو' تو عاشق تک پہنچنے کے لیے خطرہ مول لو۔"

"میں تو مراد تک ضرور پہنچوں گا مگر ذرا موجودہ حالات پر غور کر لوں پھر تم سے رہائی چاہوں گا۔"

"شام کے پانچ بجنے والے ہیں۔ تم آج رات بارہ بجے تک جب بھی اسپتال سے جانا

چاہو گے' تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔ اس کے بعد پھر سخت پہرا لگا دیا جائے گا اور تم کبھی مراد سے نہیں مل سکو گی۔"

وہ غصے سے چیخ کر بولا۔ "سکوں گی نہیں سکوں گا۔ تم مجھے طیش دلانے کے لیے شروع سے گفتگو کے دوران میں مجھے عورت کہہ کر مرد کہتے رہے ہو۔ کوئی بات نہیں' ابھی حراست میں ہوں۔ یہاں سے نکلنے کے بعد تمہیں مردانگی دکھاؤں گا۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھنے اور سوچنے لگا پھر اس نے دروازے کے پاس آکر دیکھا۔ اب وہاں کوئی مسلح سپاہی نہیں تھا۔ اس نے کمرے کے باہر آکر دور تک کوریڈور میں دیکھا۔ ایک بھی سپاہی نظر نہیں آرہا تھا۔

اس نے کمرے میں آکر دروازے کو اندر سے بند کر دیا پھر ٹیلی فون کے پاس بیٹھ کر نیل کے ننھے سے چاقو سے اس فون کے ماؤتھ پیس اور کریڈل کے نچلے حصے کو کھول کر دیکھا۔ اس کے اندر ایک سراغ رساں آلہ تھا' جس کے ذریعے اس فون پر ہونے والی گفتگو کہیں دوسری طرف سنی جا سکتی تھی۔

اس نے آلے کو وہاں سے نکال کر ٹیلی فون سیٹ کو پہلے کی طرح جوڑ دیا اور اس آلے کو بستر کے نیچے چھپا دیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے دروازہ کھولا' سامنے جمشید کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "ہماری پرانی جان پہچان ہے۔ تم نے یقیناً مجھے یاد رکھا ہو گا۔"

تابانی نے کہا۔ "تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ ہماری تباہی کے تم ہی ذمے دار ہو۔"

"تباہی تم نے دیکھی کہاں ہے۔ اب دیکھو گے۔ تمہیں یہ اطلاع دینے آیا ہوں کہ اب سے رات بارہ بجے تک اسپتال کے اندر اور باہر کوئی سپاہی نہیں رہے گا۔ موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ اس کے بعد تمہارے لیے رہائی ناممکن ہو جائے گی۔"

"اور کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"ہاں جب تمہیں اور مراد کو گرفتار کر کے تھانے لایا گیا تھا تو تم نے ہمارے ایک افسر پر جوڈو کراٹے کا داؤ آزما کر دور پھینک دیا تھا اور چیلنج کیا تھا کہ تمہیں عورت کہنے والا کوئی مرد کا بچہ ہے تو ایک ایک کر کے سامنے آئے لیکن میں نے تمام افسران اور سپاہیوں کو روک دیا تھا۔"

"تم نے یہ مہربانی کیوں کی تھی؟"

"اس لیے کہ اس وقت تم حمل ظاہر ہونے کے پرابلم میں تھے۔ لیڈی ڈاکٹر تمہارے لیے اسپتال میں داخل ہونے کی سفارش کر رہی تھی۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسے

وقت ہم میں سے کوئی مردانگی دکھانے کے لیے تمہارا چیلنج قبول کرے۔"

جمشید نے اپنے لباس کے اندر سے ایک ریوالور نکال کر کہا۔ "میڈیکل رپورٹ کے مطابق فی الحال تمہیں کوئی پرابلم نہیں ہے۔ اس ریوالور کو دیکھو۔"

اس نے ریوالور کا چیمبر دکھایا۔ چیمبر کے کسی بھی خانے میں گولی نہیں تھی۔ وہ بولا۔

"یہ ریوالور صبح تک خالی رکھوں گا۔ اس میں ایک بھی گولی نہیں رہے گی۔ تمہیں اپنے ناقابلِ شکست فائٹر ہونے پر ناز ہے۔ میں صبح سے پہلے اپنے ان دو خالی ہاتھوں سے تمہارا حلیہ بگاڑتا ہوا آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کروں گا۔ وِش یو بیڈ لک۔"

وہ ریوالور کو لباس کے اندر رکھتا ہوا وہاں سے جانے لگا۔ تابانی بڑی حقارت سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

☆=======☆=======☆

کاشف اکبر غصے اور بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس کا خاص مشیر اور صوبائی پارٹی کا لیڈر رحمان چنا ایک طرف کھڑے ہوئے تھے۔ نازاں کا باپ وڈیرا کمال صالح اور اس کا بیٹا جمال صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کاشف اکبر نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر رحمان چنا کو دیکھا پھر کہا۔ "آپ صرف ہمارے صوبائی پارٹی لیڈر نہیں بلکہ اس صوبے کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ یہاں کے تمام اہم علاقے آپ کے کنٹرول میں ہیں۔ پولیس ہے' انتظامیہ ہے' ڈاکو ہیں اور پتھارے دار وغیرہ سب ہی آپ کی جی حضوری کرتے ہیں۔ اتنی قوت' اختیارات اور وسائل رکھنے کے باوجود صرف ایک شخص' صرف ایک راجہ نواز آپ کی گرفت میں نہیں آرہا ہے؟"

رحمان چنا نے کہا۔ "سندھ کے پہاڑی' دلدلی علاقے اور گھنے جنگلات ایسے ہیں کہ ایک شخص کہیں بھی مہینوں چھپ کر رہ سکتا ہے۔"

وڈیرا کمال صالح نے کہا۔ "وہ ایک نہیں ہے' تنہا نہیں ہے۔ میری بیٹی نازاں اس کے ساتھ ہے۔ راجہ نواز جہنم میں جائے۔ میری بیٹی تو مجھے ملنی چاہیے۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "سائیں! آپ کی بیٹی ضرور ملے گی۔ آپ میری مصروفیات کو سمجھتے ہیں۔ میں ایک دن کے لیے یہاں آیا تھا لیکن نازاں کی خاطر چار دنوں سے ہوں۔"

مشیر نے کہا۔ "آپ وڈیرے سائیں اور ان کی بیٹی کی محبت میں بہت بڑا سیاسی نقصان اٹھا رہے ہیں۔ آپ کو اسلام آباد میں ہونا چاہیے۔ لندن سے ہماری ایجنسی کے سیکرٹری نے رپورٹ دی ہے کہ نیک بخت لندن سے امریکا گیا تھا۔ وہاں سے کوئی بڑا گیم کھیل کر پھر لندن واپس آگیا ہے۔ وہاں اس کی بڑی پُراسرار مصروفیات ہیں۔ ہمارے آدمی

وہاں نیک بخت کی چالوں کو اچھی طرح سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "وڈیرا سائیں سے میری برسوں کی دوستی ہے۔ میں دوست اور اس کی بیٹی کی خاطر سیاست کو چھوڑ سکتا ہوں۔ جب تک نازاں یہاں نہیں لائی جائے گی' میں سائیں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔"

وڈیرا کمال صالح نے صوفے سے اٹھ کر بڑی عقیدت سے کاشف اکبر کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر کہا۔ "مجھے آپ کی دوستی پر فخر ہے۔ آپ میری پریشانی نہیں دیکھ سکتے' میں بھی آپ کو نقصان پہنچانے والی بات نہیں کروں گا اور سیاست تو ہم وڈیروں کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اس کے بغیر ہم اپنے اپنے علاقے کے حکمران بن کر نہیں رہ سکتے۔"

جمال صالح نے کہا۔ "آپ میری بہن کی خاطر صرف اپنا نہیں ہم سب کا نقصان کریں گے۔ رحمان چنا صاحب پوری کوششیں کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ آپ کو اسلام آباد اور لندن جانا چاہیے۔"

کاشف اکبر' نازاں کے لیے پریشانی ظاہر کرتا رہا اور دونوں باپ بیٹے ضد کرتے رہے کہ کاشف اکبر کو صرف سیاست پر توجہ دینا چاہیے۔ اس طرح ان سب کے درمیان ایک گھنٹے تک بحث ہوتی رہی پھر کاشف اکبر نے ہار ماننے کے انداز میں کہا۔ "آپ سب اس قدر مجبور کر رہے ہیں تو میں ابھی شام کی فلائٹ سے چلا جاؤں گا۔"

پھر ان کے درمیان تھوڑی دیر تک یہ منصوبہ بنتا رہا کہ آئندہ کس طرح نازاں اور راجہ نواز کو ٹریپ کیا جائے گا۔ وڈیرا کمال صالح اور اس کا بیٹا جمال صالح نئے منصوبے سے مطمئن ہو کر کاشف اکبر سے گلے مل کر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد کاشف اکبر نے اطمینان کی گہری سانس لے کر کہا۔ "یہ باپ بیٹے تو کمبل بن گئے تھے۔ خدا کا شکر ہے۔ میں آج ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

مشیر نے کہا۔ "ان باپ بیٹے کو آئندہ مطمئن کرنے کے لیے نازاں کو یہاں زندہ نہیں لانا چاہیے ورنہ وہ آپ کے خلاف بہت زہر اگلے گی۔"

"سیاست میں رہ کر حسین عورتوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ نازاں کا غضب ناک حسن دیکھ کر میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ اب وہ حسینہ حلق میں ہڈی کی طرح پھنس گئی ہے۔ چنا صاحب! آپ میرے لیے کوئی بہت بڑا کام کرنا چاہتے ہیں تو کسی بھی طرح نازاں کو ہلاک کرا دیں۔ وہ زندہ رہے گی تو صوبائی اور قومی اسمبلیوں سے ہمارے چھ ارکان کم ہو جائیں گے۔"

رحمان چنا نے کہا۔ "آپ مطمئن ہو کر جائیں۔ میں نازاں اور راجہ نواز کی ہلاکت

کی خبر جلد ہی سناؤں گا۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ رحمان چنا نے ریسیور اٹھا کر پوچھا۔ "ہیلو کون؟"

"حضور! میں آپ کا خادم ہلڑی شاہ کریم کے تھانے سے بول رہا ہوں۔ آپ کو خوش خبری سناتا ہوں۔ وہ راجہ نواز گرفتار ہو گیا ہے' اس کے ساتھ نازاں بھی ہے۔"

رحمان چنا نے خوشی سے چیخ کر بولا۔ "کیا سچ کہہ رہے ہو؟ راجہ نواز گرفتار ہو گیا ہے؟ او گاڈ! مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

"یہ یقین نہ آنے والی خبر ہے۔ آپ تھانے دار سے تصدیق کر لیں۔"

چند سیکنڈ بعد تھانے دار کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا۔ "سر! میں تو کاشف اکبر صاحب کا تابع دار ہوں۔ انہوں نے اپنے اقتدار کے دور میں مجھے یہاں تھانے دار لگوایا تھا۔ میں انسپکٹر غلام رسول ہوں۔"

رحمان چنا نے کہا۔ "جسٹ اے منٹ!"

پھر اس نے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کاشف اکبر سے کہا۔ "سر! اپنے دورِ حکومت میں آپ نے ایک شخص غلام رسول کو ہلڑی شاہ کریم کے تھانے میں انسپکٹر کا عہدہ دلایا تھا۔ آپ کو یاد ہے؟"

کاشف اکبر نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "ہم اقتدار میں رہ کر ہزاروں افراد کو ایسی چھوٹی چھوٹی نوکریاں دیتے رہتے ہیں۔ یہ بندہ بھی ہمارے احسان مندوں میں سے ہو گا۔ کیا واقعی اس نے راجہ نواز کو گرفتار کیا ہے؟"

"ہمارے ایک مخبر کا یہی دعویٰ ہے۔ میں نے تھانے دار سے پوری بات نہیں کی ہے۔ کیا آپ بات کریں گے؟"

"میں ایسے چھوٹے لوگوں سے کیا بات کروں۔ آپ اس کمینے کی گرفتاری کی تصدیق کریں۔"

رحمان چنا نے فون پر پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ راجہ نواز گرفتار ہو چکا ہے؟ اور کیا نازاں اس کے ساتھ ہے؟"

"حضور! بالکل سچ ہے لیکن میں نے دشمن بن کر انہیں حوالات میں نہیں' اپنے گھر میں مہمان بنا کر پناہ دی ہے۔ راجہ کو پورا یقین دلایا ہے کہ آپ حضرات کو ان کی یہاں موجودگی کا پتا نہیں چلے گا۔"

"یہ تو تم نے بہت ہی دانش مندی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ راجہ ہمارے آدمیوں کے وہاں پہنچنے تک مطمئن رہے گا۔ کاشف اکبر صاحب تمہیں بہت انعام دیں گے اور تمہاری

ترقی کے لیے سفارش بھی کریں گے۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "چنا صاحب! اپنے آدمیوں کو اتنی دور بھیجنے کی کیا ضرورت ہے؟ یوں بھی نازاں کو یہاں نہیں لانا ہے۔ راجہ کو پہلی فرصت میں ختم کردینا چاہیے۔ وہ تھانے دار ان دونوں کو گولی مار کر ان کی لاشوں کو جنگل میں پھنکوا سکتا ہے۔"

چنا نے فون پر کہا۔ "غلام رسول! کیا تم اور تمہارے سپاہی ان دونوں کو ہلاک نہیں کرسکتے؟"

"کرسکتے ہیں حضور! لیکن.........."

"لیکن ویکن نہیں۔ پکی بات کرو۔ ہمارا ایک آدمی اس کام کے عوض آج ہی ایک لاکھ روپے تمہارے لیے لائے گا۔ ان لاشوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ ان کی تصویریں اتار کر ہمیں لاکر دکھائے گا۔ سودا پکا کرو۔"

"سودا تو برابر کے لوگوں میں ہوا کرتا ہے۔ ہم تو آپ کے نوکر ہیں۔ آپ نے حکم دیا ہے۔ سمجھیں کہ ان کی سانسیں پوری ہوچکی ہیں۔ آپ کے آدمی کو ان دونوں لاشوں کی درجنوں تصویریں مل جائیں گی لیکن آپ اپنے بندے کو آج رات تک پہنچنے کا حکم دیں۔ وہ دیر کرے گا تو لاشیں متعفن ہوں گی۔ انہیں جلد سے جلد کہیں دفن کرنا ضروری ہے۔"

"ابھی گیارہ بجے ہیں۔ اسے روانہ کیا جارہا ہے' وہ رات کے آٹھ یا نو بجے تک وہاں پہنچ جائے گا۔"

رحمان چنا نے فون بند کرکے ایک ملازم کو بلایا۔ اس سے پوچھا۔ "تم ہلڑی شاہ کریم کے قریب رہتے ہو۔"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "جی سائیں! شاہ کپور میں رہتا تھا۔ ہلڑی شاہ کریم کا ایک ایک علاقہ میرا دیکھا ہوا ہے۔"

"تم موٹر سائیکل پر ابھی ایک لاکھ روپے لے کر وہاں کے تھانے دار غلام رسول کے پاس جاؤ۔ وہ رقم اسے دے کر کچھ تصویریں لے آؤ۔ نازاں اور راجہ نواز کی لاشیں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آنا۔"

"یہ نازاں اور راجہ کون ہیں سائیں؟"

"کوئی بھی ہیں۔ تم ان کی لاشوں کو آنکھوں سے دیکھو اور ان کی تصویریں لے آؤ۔"

کاشف اکبر نے اپنے سیکرٹری سے کہا۔ "اسے بڑے نوٹوں والی ایک لاکھ روپے کی

گڈی دے دو۔"

ملازم نے عرض کیا۔ "سائیں کا درجہ اونچا رہے۔ میں نے آپ سے دس ہزار روپے قرض مانگے تھے۔ آپ کی مہربانی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی گھر والی وہیں شاہ کپور سے لاؤں گا۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "پہلے یہ کام کرو پھر شادی کے لئے چلے جانا تمہیں روپے مل جائیں گے۔"

وہ ملازم دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر الٹے پاؤں چلتا ہوا سیکرٹری کے ساتھ چلا گیا۔

کاشف اکبر نے کہا۔ "ایک بار ایک شکاری دوست نے مجھ سے کہا تھا کہ اس نے ایک بہت ہی خونخوار شیر کو اپنی بندوق سے ہلاک کیا تھا۔ اس شیر کی اتنی دہشت تھی کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اسے کئی منٹ تک یقین نہیں آیا کہ وہ مر چکا ہے۔ مجھے بھی بے چینی سی ہے۔ پتا نہیں راجہ نواز مارا جائے گا یا نہیں؟"

"سائیں! تھانے دار نے اس شیر کو مہمان خانے کے پنجرے میں رکھا ہے۔ موت اس کا مقدر بن چکی ہے۔"

"چنا صاحب! اس ملازم کو حکم دیں' راستے میں کہیں آرام نہ کرے۔ کل صبح تک یہاں آکر آپ کو رپورٹ دے اور ان کی لاشوں کی تصویریں دکھائے۔ میں کل صبح......... اسلام آباد میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔"

رحمان چنا ملازم کو حکم دینے کے لئے سیکرٹری کے دفتری کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد لندن سے اس کی ایجنسی کے لیڈر نے مخاطب کیا۔ "سر! ایک چونکا دینے والی خبر سنا رہا ہوں۔ نیک بخت سے تعلق رکھنے والی انیلا بانو جو پاکستان میں قتل کردی گئی تھی' وہ زندہ ہے اور لندن میں ہے۔"

کاشف اکبر نے فون کے وائڈ اسپیکر کو آن کیا۔ تاکہ مشیر سن سکے پھر حیرانی سے پوچھا۔ "یہ کیسے ممکن ہے' جو انیلا یہاں مرچکی تھی' وہ لندن میں زندہ کیسے ہوگئی ہے؟ کہیں تمہاری آنکھیں دھوکا تو نہیں کھارہی ہیں؟"

"نو سر! ہمارے کئی پارٹی ورکرز نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ آپ پاکستان میں نیک بخت کے خلاف مہم چلا رہے تھے کہ اس نے اسکینڈل کو ختم کرنے کے لئے انیلا کو ختم کرا دیا۔ شاید کل سے "انیلا اِن لندن" اور "انیلا پلیز ڈبل رول" جیسے عنوانات سے خبریں شائع ہوں گی۔"

"اس کا مطلب ہے' نیک بخت کے خلاف ہماری زبردست مہم ناکام ہوجائے گی۔ یہ

مسٹری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔"

"سر! یہ تو یقینی بات ہے کہ نیک بخت اس حسینہ سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔ اس نے مڑر کی بھی کوشش کی ہوگی لیکن امیر حمزہ نے اسے بچالیا ہے۔"

اس نے چونک کر پوچھا۔ "امیر حمزہ؟"

"جی ہاں۔ وہ بھی لندن میں ہے۔ ہم نے ایک رات اسے انیلا کے ساتھ فائیو اسٹار ہوٹل میں دیکھا تھا۔ جب وہ ہوٹل سے جانے لگے تو ہم نے اس کا تعاقب بھی کیا تھا لیکن اس کے خفیہ محافظوں نے ہماری کار کے ایک پہیئے کو برسٹ کر دیا۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "یہ خبریں اس حد تک میرے لئے اطمینان بخش ہیں کہ امیر حمزہ پاکستان میں نہیں ہے اور وہ مجھے نظر انداز کر کے نیک بخت کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ وہ نیک بخت کے ساتھ الجھا رہے گا تو میرا بھلا ہوگا۔"

"سر! ایک اور مزے کی خبر ہے۔ وہ نیک بخت سے شاید اس لئے الجھ رہا ہے کہ وہ انیلا پر عاشق ہو گیا ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟ امیر حمزہ جیسا سنجیدہ' خشک اور پتھر جیسا آدمی کبھی عشق و محبت کے چکر میں نہیں پڑے گا۔"

"پڑ چکا ہے سر! انیلا کے حسن و شباب نے اس پتھر کو پگھلا دیا۔ انیلا لندن میں اس کے ساتھ رہتی ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو زبردست خبر بن سکتی ہے۔ ٹرائی اینگل آف لو (عشق کا تکون) نیک بخت' انیلا اور امیر حمزہ کے درمیان زبردست رسا کشی۔ امیر حمزہ' نیک بخت سے انیلا کو چھین رہا ہے۔ ایک کارٹون شائع کرایا جائے کہ دو کتے ایک ہڈی کے لئے لڑ رہے ہیں اور ایسا کارٹون بھی بنایا جائے کہ نیک بخت' انیلا کا ایک ہاتھ اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور امیر حمزہ' انیلا کا دوسرا ہاتھ اپنی طرف کھینچنے کے لئے زور لگا رہا ہے۔"

رحمان چنا بھی کمرے میں واپس آ کر وہ باتیں سن رہا تھا۔ مشیر نے کہا۔ "تم لوگ لندن میں رہ کر خبریں اچھی سناتے ہو لیکن ہماری پارٹی صرف خبریں سننے کے لئے تم لوگوں کو ہزاروں پاؤنڈز نہیں دیتی ہے۔ کبھی ایکشن میں رہ کر ہمیں فائدہ پہنچاؤ۔ اگر یہ کہو گے کہ امیر حمزہ کے خفیہ محافظوں نے تمہارے تعاقب کو ناکام بنا دیا تھا تو تمام خوش خبری پر پانی پھر جائے گا۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "سر! ہم اتفاقاً ناکام ہو گئے۔ آپ حکم کریں' کیا چاہتے ہیں؟ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

"نیک بخت اور امیر حمزہ کے درمیان انیلا رس ملائی بنی ہوئی ہے۔ کسی طرح اسے اغوا کرو۔ اسے کہیں گم کر دو۔ اس کے بعد دونوں عاشقوں کے درمیان ایسی طویل جنگ شروع ہو جائے گی کہ ہمارے وہ دونوں مخالفین ایک لمبے عرصے تک پاکستان نہیں آسکیں گے۔ ہمیں انتخابی مہم کے لئے ان کے خلاف بڑی گرما گرم خبریں ملتی رہیں گی۔"

"سر! ہم امیر حمزہ کی موجودہ رہائش گاہ کی تلاش میں ہیں۔ جلد ہی اس کا پتا ٹھکانا معلوم کر کے وہاں سے انیلا کو نکال لائیں گے۔"

"یاد رکھو' وہ دونوں جب تک پاکستانی عوام سے دور رہ کر آپس میں الجھتے رہیں گے' ہم یہاں عوام سے قریب ہوتے جائیں گے۔"

مشیر انہیں ہدایت دیتا رہا پھر کاشف اکبر نے کہا۔ "جو ہدایات دی جا رہی ہیں' اس پر جتنی جلدی عمل کرو گے' اتنے ہی زیادہ انعامات کے مستحق ہوتے رہو گے۔"

اس نے فون بند کر دیا پھر مشیر سے کہا۔ "حالات ہمارے موافق ہیں۔ میں اسلام آباد پہنچتے ہی خفیہ ہاتھ کے ایجنٹ سے ملاقات کروں گا اور اسے بتاؤں گا کہ نیک بخت سیکس اسکینڈل میں ملوث ہو کر اپنا سیاسی وقار کھو رہا ہے۔ ان حالات میں اس کے سر پر خفیہ ہاتھ ہوگا تو عوام نیک بخت کو بدبخت بنا دیں گے۔ ووٹنگ کے وقت جیسے گھپلے کئے جاتے ہیں' ویسے گھپلوں میں خفیہ ہاتھ کو ناکامی ہوگی۔ ایسے وقت عوام کی تھوڑی بہت حمایت لازمی ہوتی ہے۔"

رحمان چنا نے کہا۔ "ہمارے ستارے عروج پر ہیں۔ اُدھر امیر حمزہ عشقیہ معاملات میں الجھتا رہے گا۔ اِدھر راجہ نواز حرام موت مرے گا۔ پاکستان میں ہمارے لئے راستے ہموار ہو رہے ہیں۔"

کاشف اکبر اسلام آباد چلا گیا۔ دوسری صبح بلڑی شاہ کریم کے تھانے سے ایک سپاہی ایک بند لفافہ لے کر رحمان چنا کے پاس آیا۔ اس نے لفافہ لیتے ہوئے پوچھا۔ "ہمارا آدمی کہاں ہے؟ وہ کیوں نہیں آیا؟"

"حضور! آپ کا کوئی ملازم نہیں آیا۔ تھانے دار صاحب اس کا انتظار کرتے رہے پھر مجھے یہ لفافہ دے کر بھیجا ہے۔"

اس نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں کئی تصویریں تھیں۔ ایک تصویر میں راجہ نواز کھڑا تھا۔ کئی سپاہی اسے گولیاں مار رہے تھے اور وہ گولیاں لگنے کے بعد گرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ دوسری تصویر میں نازاں کو بھی اسی طرح گولیاں ماری جا رہی تھیں پھر ان دونوں کی لاشوں کی تصویریں کئی زاویوں سے اتاری گئی تھیں۔ تھانے دار غلام رسول نے

ایک خط میں لکھا تھا۔
"حضور! آپ کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ میں نے آپ کے حکم پر فوراً عمل کیا ہے۔ رات گیارہ بجے تک آپ کے ملازم کا انتظار کرتا رہا۔ ان لاشوں کو تھانے میں زیادہ دیر رکھنے سے بڑے مسائل پیدا ہو جاتے' اس لئے دونوں لاشوں کو دلدل میں پھینک دیا ہے۔ آپ کا ملازم تو نہیں آیا لیکن میں جانتا ہوں' آپ میرا انعام بھیج دیں گے۔"
رحمان چنا نے اسلام آباد کاشف اکبر سے رابطہ کرکے اسے یہ خوش خبری سنائی کہ نازاں اور راجہ نواز کا کام تمام کردیا گیا ہے۔ "ان کی لاشوں کی تصاویر تھانے کا ایک سپاہی لایا ہے لیکن ہمارا ملازم جو ایک لاکھ روپے لے کر گیا ہے' وہ ہلڑی شاہ کریم تھانے میں نہیں پہنچا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ وہ کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے یا پھر ایک لاکھ روپے لے کر فرار ہوگیا ہے۔ میں اصل بات ابھی معلوم کرتا ہوں۔"
اس نے سیکرٹری کے پاس آکر کہا۔ "ایک لاکھ روپے لے جانے والا ملازم لاپتا ہے۔ ہمارے کھوجی کو چند آدمیوں کے ساتھ بھیجو۔ وہ اسے ڈھونڈ کر اور پکڑ کر لائیں گے۔"
کاشف اکبر کو نازاں اور راجہ نواز کی ہلاکت کی خبر مل گئی تھی۔ رحمان چنا نے ان کی لاشوں کی تصاویر دیکھ کر ان کی موت کی تصدیق کی تھی۔ اس کے باوجود کاشف اکبر تذبذب میں تھا۔ اسے شکاری دوست کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ کسی خونخوار شیر کی دہشت دل و دماغ میں سما جائے تو اس کی ہلاکت کے بعد بھی اس کی موت کا یقین نہیں ہوتا۔
حقیقت یہی تھی' راجہ نواز کوئی مچھر تو نہیں تھا کہ ایک چھوٹے سے علاقے کا تھانے دار ایک تالی بجا کر مچھر کو مار دیتا۔ صبح نو بجے وہ تھانے میں انسپکٹر غلام رسول کے کمرے میں آیا۔ غلام رسول اسے دیکھتے ہی چونک گیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ جس راجہ نواز کو گرفتار کرنے یا قتل کردینے کے لئے کاشف اکبر نے کئی تھانوں میں اس کی تصویریں بھیجی ہیں' وہی راجہ نواز بڑی بے باکی سے اس کے سامنے میز کے دوسری طرف آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا ہے۔ وہ اسے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔
راجہ نواز نے پوچھا۔ "اس طرح کیا دیکھ رہے ہو۔ میں وہی ہوں۔ تمہارے پاس میری تصویر ہوگی' اسے نکال کر میری صورت سے ملاؤ۔ میں اس کا فلمی جڑواں بھائی نہیں ہوں۔"

وہ بولا۔ "تصویر میز کی دراز میں ہے۔ میں اسے نکال کر دیکھتا ہوں۔"
"تصویر نکال سکتے ہو۔ ریوالور نہ نکالنا ورنہ اس سے پہلے میرے ریوالور سے گولی چل جائے گی۔ میرا ریوالور والا ہاتھ میز کے نیچے ہے۔"

اس نے سر جھکا کر دیکھا۔ میز کے نیچے راجہ نواز کے ایک ہاتھ میں ریوالور دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سہم کر بولا۔ "دراز کھول کر تصویر کیا دیکھوں؟ آپ کو پہچان گیا ہوں۔"
"تمہیں اب تک کی رپورٹ مل چکی ہوگی کہ میں کتنے تھانے داروں اور ڈاکوؤں کو قتل کرچکا ہوں۔ اپنا ٹیلی فون نمبر بتاؤ۔"
اس نے نمبر بتائے۔ راجہ نواز نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے پھر رابطہ ہونے پر کہا "نازاں! نمبر نوٹ کرو۔ میرے فون بند کرنے کے پانچ منٹ بعد یہاں فون کرو۔"
راجہ نواز نے نازاں کو فون نمبر نوٹ کرانے کے بعد ریسیور رکھ کر کہا۔ "تم علاقے کے تھانے دار ہو۔ تمہیں یہاں ہونے والی ہر واردات کا علم ہونا چاہئے مگر تم تو گدھے ہو۔ اپنے ہی گھر میں ہونے والی واردات سے بے خبر ہو۔"
انسپکٹر غلام رسول نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"
"ابھی ایک گھنٹے پہلے تمہارا سپاہی تمہارے بارہ برس کے اکلوتے بیٹے کو اسکول پہنچانے گیا۔ تمہارا بیٹا پڑھنے سے زیادہ کھیلنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اس نے سپاہی کو اسکول پہنچنے سے پہلے ہی واپس جانے کا حکم دیا اور دھمکی دی کہ تمہیں یہ نہ بتایا جائے کہ وہ اسکول نہیں گیا ہے۔ کہیں کھیل رہا ہے۔ اب ہم تمہارے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ تمہارے بیٹے کو اغوا کرلیا ہے۔ ہمارے خلاف کوئی حرکت کرنے کے نتیجے میں اسے قتل بھی کیا جاسکتا ہے۔"
وہ تھوک نگل کر بولا۔ "میرے معصوم اور بے گناہ بیٹے نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ آپ اسے کیوں قتل کریں گے؟"
"میں نے تمہارا یا قانون کا کیا بگاڑا ہے۔ کاشف اکبر کی خیرات پر عیش کرنے والے تھانے دار میری جان کے دشمن کیوں ہیں؟ میں نے وڈیرے کی بیٹی نازاں کو اغوا نہیں کیا ہے۔ وہ بالغ ہے۔ اس کی مرضی سے کل ایک گوٹھ کی مسجد میں ہمارا نکاح ہو چکا ہے۔ اب بتاؤ کہ میں تم سب کی نظروں میں مجرم کیوں ہوں؟"
وہ جواباً کچھ کہنا چاہتا تھا' فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ راجہ نے کہا۔ "ریسیور اٹھاؤ اور اپنے بیٹے سے بات کرو۔"
اس نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ پھر بے تابی سے بولا۔ "ہیلو کون ہے؟"
دوسری طرف سے بیٹے کی آواز سنائی دی۔ "ابا! میں ہوں آپ کا بیٹا سلام رسول۔"
"میرے بیٹے! تم کہاں ہو؟"
"پتا نہیں ابا! ایک عورت نے میری آنکھوں پر رومال باندھا ہوا ہے۔ اس کے پاس

آتی ہے۔ یہ مجھے مار ڈالے گی۔"

"نہیں بیٹے! ڈرنا نہیں' میں اس سے کہتا ہوں' وہ تمہیں نہیں مارے گی اس سے کہو' مجھ سے بات کرے۔"

تھوڑی سی دیر میں نازاں کی آواز سنائی دی۔ "تمہیں یقین دلانا ضروری تھا کہ تمہارا بیٹا ہمارے قبضے میں ہے اس لیے فون پر اس کی آواز سنائی ہے۔ باقی باتیں راجہ سے کرو۔"

نازاں نے فون بند کر دیا۔ انسپکٹر نے ہیلو ہیلو کہہ کر آوازیں دیں پھر ریسیور رکھ کر عاجزی سے بولا۔ "میرے بیٹے کو اغوا کر کے کیا فائدہ اٹھانا چاہتے ہو۔"

راجہ نے ریوالور کو اپنے لباس میں رکھتے ہوئے کہا۔ "فائدہ یہ ہے کہ میں نے ہتھیار رکھ لیا ہے۔ تمہیں قتل کرنے کی دھمکی نہیں دے رہا ہوں۔ اب تم اور تمہارے سپاہی نہ مجھے گولی ماریں گے اور نہ ہی نازاں کو کاشف اکبر کے پاس پہنچائیں گے۔ میں تمہیں قانون کی کرسی پر بیٹھ کر عورت کی دلالی کرنے سے روک رہا ہوں اور جب تک تمہارا بیٹا ہمارے قبضے میں رہے گا' تم صراط مستقیم پر چلتے رہو گے۔"

"دیکھئے میں آپ کے ارادوں کو سمجھ رہا ہوں' آپ چاہتے ہیں' میرے علاقے سے بخیریت گزر جائیں۔ میں اور میرے سپاہی آپ کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں۔ وعدہ کرتے ہیں۔ میں اپنے بیٹے کی قسم کھا کر کہتا ہوں' آپ جہاں کہیں گے' وہاں خود آپ کو پہنچا کر آؤں گا۔"

"میں چاہتا ہوں' تم مجھے اور نازاں کو دوسری دنیا میں پہنچا دو۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "جی میں سمجھا نہیں؟"

"بھئی تم ہم دونوں کو گولی مار دو اور کاشف اکبر سے انعام وصول کرو۔"

وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ "آپ مذاق کر رہے ہیں۔ وہاں میرے بیٹے کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق میرے اندر کچھ ایسی خرابی پیدا ہو گئی ہے کہ آئندہ ہمارے ہاں کوئی اولاد نہیں ہو گی۔"

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں' تم مجھے اور نازاں کو ہلاک کرو گے تب ہی تمہیں بیٹا زندہ سلامت ملے گا۔ جب ہمیں گولیاں ماری جائیں گی تو اس کی تصویریں اتاری جائیں گی۔ گولیاں کھا کر مرتے وقت بھی اور ہماری لاشوں کی تصویریں بھی کاشف اکبر کو پہنچائی جائیں گی۔ تم جب تک ہماری موت کا ثبوت پیش نہیں کرو گے' تمہیں اپنے آقا سے انعام نہیں ملے گا۔"

انسپکٹر غلام رسول بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ راجہ نے کرسی سے اٹھ کر کہا۔ "چلو اٹھو۔ اس چھوٹے شہر میں جو سب سے اچھا فوٹو گرافر ہے اور جسے تم راز دار بنا کر اس کی زبان بند رکھ سکتے ہو' اسے بھی یہاں لے آؤ۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ راجہ کے ساتھ ایک چھوٹی سی مارکیٹ میں آیا۔ وہاں کے سب ہی لوگ انسپکٹر کو دیکھ کر سلام کر رہے تھے۔ چھوٹے علاقوں میں تھانے دار بے تاج بادشاہ ہوا کرتا ہے۔ وہ تمام سلام کرنے والے نہیں جانتے تھے کہ ان کے بادشاہ سلامت اندر سے سلامت نہیں ہیں۔ اکلوتے بیٹے کے باعث اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔

وہ ایک ماہر فوٹو گرافر کو تھانے میں لے آئے۔ راجہ یہ معلوم کر چکا تھا کہ اس تھانے میں کتنے سپاہی ہیں۔ اس نے تھانے دار سے کہا۔ "تمام سپاہیوں کو حکم دو کہ تمام ہتھیار اسٹور روم میں رکھ کر دروازہ لاک کر دیں اور چابی مجھے دے دیں۔ صرف تمہارے پاس ایک ریوالور اور چار سپاہیوں کے پاس چار خالی بندوقیں رہیں گی۔ ان میں ایک بھی گولی نہیں ہو گی۔"

تھانے دار نے اس کے حکم کی تعمیل کرائی پھر راجہ کے حکم سے ایک بکرے کو ذبح کیا گیا۔ اس نے تھانے دار اور فوٹو گرافر کو جیسی ہدایات دیں' اس کے مطابق وہ تھانے کی دیوار کے پاس کھڑا ہو گیا۔ تھانے دار اور چار سپاہیوں نے اس کا نشانہ لیا۔ تھانے دار نے کہا۔ "فائر!"

اس کے ساتھ ہی راجہ نے جسم میں گولیاں لگنے کی ایکٹنگ کی' اپنے سینے اور پیٹ پر دونوں ہاتھ رکھے۔ لباس کے اندر ننھے سے غبارے میں بکرے کا خون بھرا ہوا تھا۔ راجہ کے ہاتھوں میں نوکیلی پن تھی جو کیمرے کی آنکھ سے نظر نہیں آ سکتی تھی۔ پن کے لگنے سے غبارے میں سوراخ ہو گیا پھر یوں سینے اور پیٹ سے خون نکلا جیسے گولیوں کے زخموں سے خون بہہ رہا ہو۔

فوٹو گرافر نے مہارت سے تصویریں اتار دیں۔ ایک تصویر میں راجہ گولیاں کھا کر گرنے والا تھا۔ دوسری تصویر میں زمین پر گھٹنے کے بل گر رہا تھا پھر وہ زمین پر چاروں شانے چت مردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کی لاش کی لہو آلودہ تصویریں کئی زاویوں سے اتاری گئیں۔

پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تھانے دار اور فوٹو گرافر کے پاس آ کر بولا۔ "انسان کو زندگی میں بہت کچھ سیکھنا پڑتا ہے۔ آج تمہیں فلمی شوٹنگ سکھا رہا ہوں۔ اسے یاد رکھو۔ اب میں یہاں سے جاؤں گا۔ آدھے گھنٹے کے بعد نازاں یہاں تنہا آئے گی۔ تمہارا بیٹا میرے

قبضے میں رہے گا۔ نازاں کی تصویریں بھی بالکل اسی طرح اتاری جائیں۔ تصویریں اتروانے کے بعد وہ یہاں سے میرے پاس آئے گی۔ میں تمہارے بیٹے کو اس کے حوالے کر کے یہاں آؤں گا پھر تمہیں سمجھاؤں گا کہ آئندہ تمہیں اپنے بیٹے کی سلامتی کے لیے کیا کرنا چاہیے۔"

پھر اس نے فوٹو گرافر سے کہا۔ "اپنے بادشاہ سلامت کی بھلائی چاہتے ہو تو آج شام سے پہلے یہاں اتاری ہوئی تمام تصویریں پرنٹ کر کے تھانے لے آؤ۔ تصویروں میں کوئی خرابی نہیں ہونی چاہیے۔"

وہ انہیں وارننگ دے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد نازاں آئی۔ اس کی تصویریں بھی اس طرح ڈرامائی انداز میں اتاری گئیں۔ وہ ایک ڈراما تھا لیکن تصویری ثبوت کے ذریعے وہ حقیقت بن گیا تھا۔ انسپکٹر غلام رسول نے اس کے حکم کے مطابق کاشف اکبر اور رحمان چنا کو ان تصاویر کے ذریعے یقین دلایا کہ نازاں اور راجہ نواز کو ہلاک کر کے ان کی لاشوں کو دلدل میں پھینک دیا گیا ہے۔ جبکہ اس ملازم کو گولی مار کر دلدل میں پھینکا گیا تھا جو کاشف اکبر سے ایک لاکھ روپے لے کر اپنی آنکھوں سے نازاں اور راجہ کی لاشیں دیکھنے آیا تھا۔ راجہ اس کے ایک لاکھ روپے تھانے دار کو دے کر بولا۔
"یہ حرام کی کمائی تم اپنے ہی پاس رکھو۔ ابھی تمہارا بیٹا بھی تمہیں مل جائے گا۔"

پھر راجہ نے ریسیور اٹھا کر یونہی الٹے سیدھے نمبر ڈائل کیے پھر کہا۔ "ہاں میں راجہ نواز بول رہا ہوں۔ کیا تمہارے تمام آدمی مسلح ہیں؟"

پھر اس نے پوچھا۔ "کیا وہ تھانے دار کے گھر کے اطراف چھپے ہوئے ہیں؟"

اس نے جیسے دوسری طرف سے جواب سنا پھر کہا۔ "انہیں اچھی طرح تاکید کر دو اس طرح چھپے رہیں کہ پولیس والوں کو نظر نہ آئیں۔ اگر کوئی سپاہی جاسوس بننے کی کوشش کرے تو اسے ہلاک کر کے دلدل میں پھینک دیں۔ اگر تھانے دار اپنے آقاؤں کو کسی بھی بہانے سے یہ بتانا چاہے کہ ہم زندہ ہیں تو اس کے گھر میں گھس کر اس کے بیٹے کو گولی مار دینا۔ تم سب کم از کم دو ماہ تک یہاں رہ کر تھانے دار کی نگرانی کرتے رہو گے۔ میں اب نازاں کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھ کر کہا۔ "ہم زندہ ہیں۔ یہ تم' تمہارے سات عدد سپاہی اور یہ فوٹو گرافر جانتا ہے۔ تم سب کے لئے ضروری ہے کہ نیند میں بھی ہمیں مردہ کہو ورنہ ہمیں زندہ رکھنے والا زندہ نہیں رہے گا۔"

وہ کرسی سے اٹھ کر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد تھانے دار

کی بیوی اس کے بیٹے سلام رسول کے ساتھ آ کر بولی۔ "میرا بیٹا کہہ رہا تھا ایک عورت اور مرد اسے ایک قریبی جنگل میں لے گئے تھے۔ آپ سے ٹیلی فون پر بات بھی کرائی تھی۔"

تھانے دار نے بیٹے کو دیکھتے ہی گلے سے لگا کر پیار کیا پھر کہا۔ "دیکھو جو بچے اسکول جانے کے بہانے کہیں کھیلنے جاتے ہیں' ان کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ اغوا کرنے والے جان سے مار ڈالتے ہیں۔ آج میں نے کسی طرح تمہیں بچا لیا ہے۔ آئندہ میری اور اپنی ماں کی اجازت کے بغیر گھر سے نہ نکلنا۔"

پھر اس نے بیوی سے کہا۔ "بیٹے کو گھر لے جاؤ۔ میں آ کر بتاؤں گا کہ ہم پر بہت بڑی قیامت آنے والی تھی مگر وہ قیامت ٹل گئی ہے۔ جاؤ آئندہ میری اجازت کے بغیر بیٹے کو گھر سے نکلنے نہ دینا۔"

اس کی بیوی اور بیٹا وہاں سے چلے گئے۔ تھانے دار نے ایک بڑے لفافے میں وہ تصویریں رکھ کر ایک خط لکھ کر ایک سپاہی کو کاشف اکبر کے پاس بھیجا۔ کاشف اکبر اسلام آباد جا چکا تھا لیکن دوسرے دن رحمان چنا نے اسے فون پر نازاں اور راجہ کی ہلاکت کی خوش خبری سنا دی۔ جو ملازم ایک لاکھ روپے لے گیا تھا' اس کی تلاش میں ایک کھوجی کے ساتھ اپنے چند آدمیوں کو روانہ کر دیا۔

یوں راجہ نواز نے اپنی اور نازاں کی ہلاکت کا یقین دلا کر تمام مخالفین کو کتوں کی طرح اپنے پیچھے دوڑنے سے روک دیا۔ اب وہ دشمنی کرنے والوں سے بے فکر ہو کر جا رہے تھے۔ وہ لینڈ کروزر ڈرائیو کر رہا تھا۔ نازاں نے پوچھا۔ "ہم کب تک یونہی بھٹکتے رہیں گے؟"

"تم بیزار ہو گئی ہو۔ تمہیں مہم جوئی کی عادت نہیں ہے۔"

"میں تمہاری خاطر اپنے مزاج کے خلاف ہر بات کی عادی ہو سکتی ہوں لیکن کوئی ایسی جگہ' ایسا مکان تو ہو' جہاں ہم کچھ دنوں تک پیار بھری ازدواجی زندگی گزار سکیں۔"

"میں نے مستقل ایک جگہ رہنے کے لئے اپنی اور تمہاری موت کا ناٹک رچایا ہے۔ کاشف اکبر کے علاوہ تمہارے بابا سائیں اور تمہارا بھائی ان تصویروں کو دیکھ کر کچھ دنوں تک تم پر......... ماتم کر کے صبر کر لیں گے۔ کوئی بھی مخالف نہ یہ سوچ سکے گا اور نہ کبھی سمجھ سکے گا کہ ہم پھر کراچی آ کر ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "کیا ہم کراچی واپس جا رہے ہیں؟"

"ہاں دوسرے راستے سے جا رہے ہیں۔ امیر حمزہ ملک سے باہر کہیں مصروف ہے۔"

اس کی عدم موجودگی میں مجھے کراچی جاکر رہنا چاہئے۔"

"کیا امیر حمزہ تمہارا دوست ہے؟"

"دوست بھی ہے اور ایسی مہماتی زندگی گزارنے کے معاملات میں استاد بھی ہے۔ اسے آگ اور خون کے سمندروں سے گزرنا آتا ہے اور یہ ہنر میں نے اس سے سیکھا ہے۔ آئندہ بھی سیکھتا رہوں گا۔"

"اس سے تمہارے تعلقات اتنے گہرے ہیں لیکن کبھی تم نے فون پر بھی اس سے رابطہ نہیں کیا۔"

"تمہارا عشق مجھے اس طرح بھٹکا رہا ہے کہ میرا اس سے رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ میں نہیں جانتا وہ کس ملک میں ہے۔ وہ میرے لئے پریشان ہوگا کہ میں کراچی سے کہاں چلا گیا۔ میرا موبائل فون بدل گیا ہے۔ اس کے ساتھ بھی ایسا کچھ ہوا ہے کہ ہمارا فون کے ذریعے رابطہ ختم ہوگیا ہے۔ کراچی پہنچتے ہی اس کے جاں نثاروں سے سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اس سے رابطہ بھی رہا کرے گا۔"

"ایک بات پوچھوں؟"

"کیا ہمارے درمیان کوئی تکلف باقی رہ گیا ہے کہ کچھ کہنے سے پہلے اجازت طلب کروگی؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "ہمارے درمیان کوئی تکلف نہیں رہا ہے۔ میں تمہارے اور حمزہ صاحب کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔ ایسی زندگی کیوں گزار رہے ہو کہ نئے نئے جانی دشمن پیدا کرتے جا رہے ہو۔ جب ایک آرام دہ پُرسکون زندگی گزار سکتے ہو تو خطرات مول لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"جب تک خطرات مول نہ لئے جائیں، تب تک زندگی نہیں سنورتی۔ تم سے اپنی زندگی سنوارنے کے لئے میں اب تک خطرات سے کھیلتا رہا ہوں۔ عارضی طور پر اپنی اور تمہاری ہلاکت کا ڈراما رچایا ہے۔ آئندہ کبھی یہ جھوٹ سامنے آئے گا تو پھر دشمن پیچھے پڑ جائیں گے۔ اب تمہارا جواب کیا ہوگا؟ کیا اپنے آرام و سکون کے لئے تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں؟"

وہ "نہیں" کہہ کر اپنا سر اس کے شانے پر رکھ کر بولی۔ "تم میرے لئے مشکلات کا سامنا کرتے ہو تو مجھے اپنی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔ میں فخر کرتی ہوں کہ تم میرے لئے ساری دنیا سے لڑتے رہوگے۔"

"اسی طرح ایک دن پوری قوم مجھ جیسے اور امیر حمزہ جیسے مجاہدوں پر فخر کرے گی کہ

ہم پاکستان میں عام انسانوں کی خوش حالی کے لئے جہاد کرتے ہیں۔"

"آدھی صدی گزر چکی ہے راجہ! پاکستان میں ایسا کوئی مائی کا لال نہیں ہے جو ہم وڈیروں اور سیاست دانوں سے خوش حالی کے ذرائع چھین سکے۔ تم برا نہ ماننا۔ تمہاری تمام جدوجہد ناکام رہے گی۔ پچاس برس کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ تم خوابِ غفلت میں رہنے والی قوم کو جگانے کی ناکام کوششوں میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔"

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ "ہاں کبھی کبھی اپنی عوام کی بے حسی سے مایوسی ہوتی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے۔ "باؤجی! میں کراچی آکر لٹ گیا۔ لاہور جانے کے لئے ٹرین کا کرایہ نہیں ہے۔ کچھ رقم دے دو۔" وہ پاکستانی قوم کے سامنے ہاتھ پھیلا کر یہ کہتا ہے اور یہی پاکستانی قوم دیکھتی ہے کہ اس ملک کے حکمرانوں کے پاس تین ذاتی ہوائی جہاز ہیں۔ جس کے ایک جہاز پر فی گھنٹا ایک لاکھ ۲۵ ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں۔ یہاں لاکھوں افراد کو ایک وقت روٹی ملتی ہے۔ دوسرے وقت نہیں ملتی۔ اسی ملک کے شاہی محل میں مہمانوں کے لئے اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کے لئے جو فرنیچر تیار ہوتا ہے، اس پر دس کروڑ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ ایک حکمران کے جاگنے سے لے کر سونے تک ہر روز ایک کروڑ روپے سے زیادہ خرچ کئے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت اس ملک کا ہر پڑھا لکھا شخص جانتا ہے۔ جو لوگ نہیں جانتے، انہیں قلم کے ذریعے اور ہماری جدوجہد کے ذریعے بتایا جاتا ہے۔"

"ہاں، ہم وڈیروں کے بھی اخراجات روزانہ لاکھوں روپے تک ہوتے ہیں ہم موجودہ سیاست دانوں کو سانپ کی طرح دودھ پلا کر پالنے کے لئے کسانوں اور مزدوروں کا لہو نچوڑتے ہیں لیکن تم دن رات ان سے لڑتے رہو گے تو کیا یہ اپنا چلن بدل دیں گے؟"

"ہاں ایک ذرا عوامی شعور کی ضرورت ہے۔ شعور یہ ہے کہ عوام یہ سمجھ لیں کہ ملک پر حملہ کرنے والے دشمنوں سے زیادہ خطرناک دشمن ہمارے اپنے ملک کے اندر ہیں۔ جنہیں ہم نے خود اپنے سر پر بٹھا رکھا ہے۔ دوسرا شعور یہ ہونا چاہئے کہ ہم آئندہ الیکشن میں ایسے سانپوں کو دودھ (ووٹ) نہیں پلائیں گے جو ہمیں ڈستے آرہے ہیں۔ جو قوم بارہ کروڑ کی آبادی میں سے خوفِ خدا رکھنے والے دیانت دار سیاست دانوں کو پہچان کر اپنا نصیب نہ بدل سکے، وہ قوم بہت ہی کم فہم اور ہمیشہ بدنصیب رہے گی۔"

"اور تمہاری باتوں کا جواب ہے کہ جو خوش حالی مانگنے سے نہیں ملتی، وہ چھین لی جاتی ہے۔ میں تمہیں مانگتا تو تم کبھی نہ ملتیں۔ اب تمہیں چھین کر یہ ثابت کرچکا ہوں کہ ہم نے ہاتھ پھیلا کر مانگنے کے لئے پاکستان نہیں بنایا ہے کہ دے بی بی جی! اللہ کے نام پر

دے میاں جی!"

راجہ نواز کی آخری بات ایسی تھی کہ نازاں لاجواب ہو گئی۔ یہ تو وہ دیکھ رہی تھی کہ اس نے ایک وڈیرے اور سیاست داں سے اسے چھین کر حاصل کیا ہے اور وہ خود اعتراض نہیں کر رہی ہے کیونکہ اسے محبت سے بھرپور خوش حالی مل رہی ہے۔

راجہ نواز نے اچانک ہیڈ لائٹس بجھا کر گاڑی روک دی۔ تاریکی پہلے ہی تھی۔ گاڑی کے سامنے بھی گہری تاریکی چھا گئی۔ نازاں نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"نازاں! میرے ساتھ رہتی ہو تو باتوں کے دوران میں بھی آگے پیچھے کا خیال رکھو۔ ابھی کوئی بہت دور سے بھاگتا ہوا جھاڑیوں کے پیچھے گیا ہے۔"

"پھر کوئی خطرہ ہے؟"

وہ ڈیش بورڈ کا خانہ کھول کر بلٹ کیٹس.......... نکالتا ہوا بولا۔ "تمہارا ریوالور اور میرا ٹی ٹی پوری طرح لوڈ ہے پھر بھی ایکسٹرا بلٹ کیٹس.......... اپنے پاس رکھو۔ اپنی طرف کا دروازہ آہستگی سے کھول کر چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتی ہوئی گاڑی کے پیچھے جاؤ۔ میں بھی وہیں آرہا ہوں۔"

وہ راجہ کی ہدایت کے مطابق دروازہ کھول کر رینگتی ہوئی گاڑی کے پیچھے آئی۔ اسے راجہ کی سرگوشی سنائی دی۔ "اور قریب آؤ۔"

وہ قریب آکر اس سے ذرا ٹکرائی۔ راجہ نے اس کے کان سے منہ لگا کر کہا۔ "ہم ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دیکھتے رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں آنکھیں اندھیرے میں کچھ نہ کچھ دیکھنے کی عادی ہو جائیں گی۔ فی الحال ہلکی سی آہٹ سننے کی کوشش کرو۔ سامنے اور دائیں بائیں دیکھتی رہو۔"

وہ گہری تاریکی میں دیکھنے اور آہٹیں سننے کی کوششیں کرنے لگی۔ ایک منٹ کے بعد ایسی آواز سنائی دی جیسے دو یا دو سے زیادہ لوگ دوڑتے ہوئے ایک طرف گئے ہوں۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

نازاں کو اپنے کان میں سرگوشی سنائی دی۔ "زمین پر لیٹ جاؤ اور رینگتی ہوئی گاڑی کے نیچے جاؤ۔ جلدی کرو۔"

لینڈ کروزر اتنی اونچی ہوتی ہے کہ بہ آسانی اس کے نیچے لیٹا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ راجہ بھی اوندھے منہ لیٹ کر رینگتا ہوا نیچے آیا پھر نازاں اس کی ہدایت کے مطابق بائیں کروٹ ہو کر وہاں سے باہر تاریکی میں گھور گھور کر دیکھنے اور کچھ سننے کی کوششیں کرنے لگی۔ راجہ اس کے ساتھ لگا ہوا دائیں کروٹ لیٹا ہوا تھا۔

یک بیک تڑا تڑ فائرنگ ہوئی۔ کئی گولیاں گاڑی کی باڈی پر آکر لگیں۔ وہ لوگ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ہیڈ لائٹس بجھا کر وہ گاڑی والے کیا کر رہے ہیں؟ سیٹوں کے نیچے دبک گئے ہیں یا باہر نکلنے کی فکر میں ہیں؟ نہتے ہیں یا مسلح ہیں؟

نازاں اور راجہ کی طرف سے جوابی فائرنگ نہیں ہوئی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ ان کے پاس مقابلے کے لیے ہتھیار نہیں ہیں۔ وہ پس و پیش میں رہے۔ قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں پھر ایک نے بلند آواز سے کہا۔ "ہم جان نہیں لیں گے۔ صرف مال لیں گے۔ گاڑی کی لائٹیں جلا کر باہر آجاؤ۔"

ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ ان میں سے ایک نے آخری وارننگ دی پھر بھی اس گاڑی کی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ اس کے برعکس گاڑی کے دائیں اور بائیں طرف سے ان کی آوازیں سن کر دونوں کو ان کی پوزیشن معلوم ہوئی۔

تاریکی میں گوریلا جنگ لڑنے کی مختلف حکمتِ عملی آزمائی جاتی ہے۔ انہوں نے یہ حکمتِ عملی آزمائی یک وقت فائرنگ کرتے ہوئے گاڑی کے قریب آئے۔ اگر گاڑی والے چھپے ہوں گے تو گولیوں کی مسلسل بوچھاڑ سے گھبرا کر چیختے چلاتے اور جان کی امان چاہتے ہوئے گاڑی سے باہر آنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

دائیں طرف کے ایک شخص نے چیخ کر کہا۔ "دوڑو اور ایک ساتھ فائرنگ کرتے ہوئے گاڑی کے پاس آؤ۔ ایک۔ دو۔ تین.........."

تین کی گنتی ختم ہوئی، کئی گنوں سے فائر کا شور بلند ہوا۔ وہ سب گولیاں چلاتے اور دوڑتے ہوئے گاڑی کے قریب آئے۔ اتنی دیر میں آنکھیں قریب کی چیزوں کو دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ انہیں ان دوڑ کر آنے والوں کے پیر دکھائی دینے لگے۔ راجہ نے نازاں سے کہا۔ "فائر.........."

دونوں نے بیک وقت گولیاں چلائیں۔ رات کے سناٹے میں ان کی چیخیں گونجنے لگیں۔ کسی کے گولیاں گھٹنے کے نیچے، کسی کے گھٹنے کے اوپر، کسی کو گھٹنے کے نیچے، کسی کو دونوں ٹانگوں کے درمیان لگتی گئیں۔ وہ اچھل اچھل کر گرنے اور تڑپنے لگے۔ جب وہ زمین پر گرے تو انہوں نے ان کے سروں اور سینوں میں گولیاں ماریں۔ شاید ایک ہی زخمی رہ گیا تھا۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ راجہ نے آواز کی سمت گولی مار کر کراہنے کی آواز کو ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیا۔

نازاں سر اٹھا کر گاڑی کے سامنے تاریکی میں اندھادھند فائرنگ کرنے لگی۔ راجہ نے گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف یہی کیا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ دشمن آگے پیچھے سے

آرہے ہیں یا نہیں۔ انہوں نے احتیاطی تدابیر پر عمل کیا تھا۔ یہ تدابیر کام آئیں۔ گاڑی کے پیچھے سے تین چیخیں سنائی دیں پھر خاموشی چھا گئی۔

یہ خاموشی بڑی دیر تک رہی۔ اس وقت یہ خوف اور تجسس تھا کہ سب مر چکے ہیں یا باقی رہنے والے تاک میں لگے ہیں۔ راجہ نے سرگوشی کی۔ "پیچھے کی طرف کھسکتی ہوئی گاڑی کے پیچھے جاؤ۔ پیچھے گاڑی کی سیڑھی پر چڑھ کر چھت پر لیٹ جاؤ۔"

وہاں چھت پر سامان سفر باندھ کر رکھنے کے لیے پیچھے ایک چھوٹی سی سیڑھی تھی۔

تھوڑی سی دیر میں وہ دونوں کوئی آواز پیدا کیے بغیر چھت پر آکر لیٹ گئے۔ دشمن دور رہ کر گاڑی کے نیچے فائر کرتے تو گولیاں انہیں نہیں لگ سکتی تھیں۔ ان دونوں کو مارنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ کچھ قریب آکر زمین پر لیٹ کر فائرنگ کے ذریعے نیچے لیٹنے والوں کو ہلاک کر سکتے تھے لیکن آدھے گھنٹے تک چھت پر لیٹے رہنے کے بعد بھی کوئی گاڑی کے نیچے فائر کرنے نہیں آیا۔ نازاں نے سرگوشی کی۔ "بڑی دیر ہو چکی ہے۔ انہوں نے ہمیں تجسس میں مبتلا کر دیا ہے۔"

راجہ نے کہا۔ "شاید اب کوئی نہیں رہا۔ تم آواز پیدا کیے بغیر نیچے اتر کر گاڑی میں بیٹھو۔ میں آرہا ہوں۔"

وہ چھت پر لیٹے ہی لیٹے کھسکتی ہوئی پیچھے سیڑھی سے اتر کر گاڑی کے اندر گئی۔

راجہ نے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی دیکھی اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ چھت پر سے کود کر نیچے آیا۔ اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر دروازے کو بند کیا۔ گاڑی کو اسٹارٹ کیا۔ پھر اسے آگے بڑھانے سے پہلے ہیڈ لائٹس کو آن کیا۔ گاڑی دو چار گز آگے بڑھی پھر راجہ نے اسے روک دیا۔ سامنے کچھ دور ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دو آدمی نظر آئے۔ ان میں سے ایک خوب رو جوان میلے پھٹے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ دوسرا شخص اپنے منہ پر ڈھاٹا باندھے کلاشنکوف کی نال کو اس جوان کی گردن سے لگائے کہہ رہا تھا۔ "پہلے ہمارے لوگوں نے سمجھا' تم پولیس والے ہو مگر نہیں' تم مسافر ہو اور یہ جو جوان میرے آگے ہے۔ اس کی قیمت پانچ کروڑ سے زیادہ ہے......... دولت کون نہیں چاہتا؟ تم چاہتے ہو تو میں دو کروڑ روپے دوں گا۔ مجھ کو اپنے پیچھے بٹھا کر وڈیرے اللہ بخش کے پاس لے چلو۔ یہ اللہ بخش کا ایک ہی جوان بیٹا کریم بخش ہے۔ بولو دو کروڑ چاہتے ہو؟"

راجہ نے گاڑی کی کھڑکی سے ایک ہاتھ اور سر نکال کر کہا۔ "دو کروڑ دو پیسے نہیں ہوتے۔ اتنی بڑی رقم سے میں انکار نہیں کروں گا مگر تم پیچھے بیٹھو گے تو میرے لیے خطرہ بن جاؤ گے۔ میں تمہاری کلاشنکوف کے نشانے پر رہوں گا۔ تم اگلی سیٹ پر میرے ساتھ

بیٹھ سکتے ہو۔"

وہ دونوں روشنی میں تھے۔ نازاں اور راجہ ہیڈ لائٹس کے پیچھے تاریکی میں تھے۔ اس ڈاکو کو نظر نہیں آرہا تھا کہ راجہ کے ہاتھ میں ٹی ٹی ہے۔ ڈاکو کا خیال تھا کہ راجہ دو کروڑ کے لالچ میں گولی نہیں چلائے گا۔ اس لالچ دینے والے کی شلوار گھٹنے کے نیچے لہو سے بھیگ رہی تھی۔ گویا اس کے ایک پیر میں گولی لگی تھی۔ وہ تاریکی میں چھپ کر کہیں اپنے خفیہ اڈے تک زخمی پیر کے باعث نہیں جا سکتا تھا۔ اسے ایک گاڑی کی ضرورت تھی اور وہ بہت بڑا لالچ دے کر ہی راجہ کی گاڑی حاصل کر سکتا تھا۔

ڈاکو نے کہا۔ "تمہارے ساتھی کے پاس بھی ہتھیار ہے۔ وہ میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھے گا تو میں تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکوں گا۔"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ تم میرے ساتھی کے ساتھ پیچھے بیٹھ سکتے ہو۔ میری اس دو کروڑ کی اسامی کے ساتھ چلے آؤ۔"

اس نے کلاشنکوف سے اس جوان کریم بخش کو دھکا دیتے ہوئے آگے بڑھایا۔ خود اس کے پیچھے لنگڑاتے ہوئے چلنے لگا۔ چلتے وقت توازن قائم نہیں رکھ سکتا تھا اس لیے کلاشنکوف کی نال اس جوان کی گردن پر سے کبھی کبھی ہٹ جاتی تھی۔ ایک بار جیسے ہی وہ نال گردن سے ہٹی راجہ نے فائر کر دیا۔ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ہی ڈاکو کے حلق سے چیخ نکلی۔ وہ کلاشنکوف پکڑے لڑکھڑایا۔ راجہ نے دوسری گولی ماری۔ اس بار ہاتھ سے کلاشنکوف چھوٹ گئی اور وہ دھپ سے زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ وہ بڑا جی دار تھا۔ ایک تو پہلے ہی پیر میں گولی لگی تھی۔ راجہ نے دو گولیاں ماری تھیں۔ اس کے باوجود اس میں اتنی جان تھی کہ وہ زمین پر گرنے اور تڑپنے کے دوران میں کلاشنکوف اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا تھا۔

راجہ نے چیخ کر کہا۔ "کریم بخش! اسے ہتھیار نہ اٹھانے دو۔"

کریم بخش نے فوراً ایک قدم آگے بڑھا کر کلاشنکوف کو اٹھایا پھر تڑا تڑ فائر کرتے ہوئے اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ آخر وہ ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔ کریم بخش نے گھوم کر گاڑی کی طرف دیکھا۔ راجہ نے کہا۔ "ہم تمہیں گھر تک پہنچائیں گے۔ ہمیں دوست اور مددگار سمجھتے ہو تو ہتھیار پھینک کر یہاں آجاؤ۔"

اس نے چند لمحوں تک اپنے ہاتھوں میں کلاشنکوف کو دیکھا اور سوچا پھر اسے ایک طرف پھینک کر سر جھکائے چلتا ہوا گاڑی کے پاس آگیا۔ نازاں نے گاڑی سے اتر کر کہا "یہاں سامنے بیٹھو۔"

وہ پیچھے آ کر بیٹھ گئی۔ کریم بخش نے راجہ کے پاس اگلی سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سامنے تین لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ راجہ نے کریم بخش سے پوچھا۔ "کہاں جانا ہے۔ علاقے کا نام اور راستہ بتاؤ۔"

وہ بولا۔ "بخشو گوٹھ یہاں سے پندرہ کلو میٹر پر ہو گا۔ وہاں سیکڑوں کلو میٹر ہماری زمین جائیداد ہے۔ مجھے وہاں پہنچا دیں۔ بابا سائیں آپ کو منہ مانگی رقم دیں گے۔"

"ہمیں رقم کا لالچ ہوتا تو اس ڈاکو کو نہ مارتے۔"

"آپ بہت دلیر ہیں۔ اس ڈاکو کے نو ساتھی تھے۔ آپ نے کسی کو بھاگنے نہیں دیا۔ سب کو مار ڈالا۔ ان کا یہی انجام ہونا تھا۔"

"تم اپنی بات کرو۔ کیا وہ تمہیں اغوا کر کے لے گئے تھے؟"

"ہاں بابا سائیں سے میری واپسی کے لیے ایک کروڑ روپے مانگ رہے تھے۔ وہ آپ سے جھوٹ کہہ رہا تھا کہ میرے ذریعے پانچ کروڑ ملنے والے ہیں۔ وہ آپ کو دھوکا دے کر یہ گاڑی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ویسے میں ایک ہی بیٹا ہوں اور ایک اٹھارہ برس کی بہن ہے۔ بابا سائیں میرے لیے پانچ کروڑ بھی دے سکتے ہیں۔ میں ہی ان کی تمام دولت اور جائیداد کا اکیلا وارث ہوں۔ بہن کو تو کچھ نہیں ملے گا۔"

راجہ نے پوچھا۔ "بہن کو دولت اور جائیداد سے کیوں محروم کیا جائے گا؟"

"بابا سائیں میری بہن جمیلہ سے حق بخشوائیں گے۔"

راجہ نے اندر کے عقب نما آئینے میں نازاں کو دیکھا۔ نازاں بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ سندھ میں اپنی بیٹیوں سے حق بخشوانے کی رسم بہت قدیم ہے۔ بہت سے بلوچ اور سید قبیلوں کے سرکردہ لوگ اپنے خاندان سے بڑا دوسرے خاندان کو نہیں سمجھتے۔ لہٰذا اپنے سے کم تر خاندان میں بیٹی کو بیاہنا اپنی توہین سمجھتے ہیں لیکن اصل معاملہ دولت اور جائیداد کا ہے کہ بیٹی بیاہ کر جائے گی تو گھر کی دولت سے اپنا حصہ لے جائے گی۔ وہ کسی کو داماد بنا کر اپنی ملکیت میں اسے حصے دار بنانا نہیں چاہتے۔

حق کا مطلب ہے۔ "شوہر" یعنی عورت اپنے شوہر کو اپنا حق کہتی ہے۔ باپ اپنی بیٹی کی گود میں قرآن شریف رکھ کر کہتا ہے۔ "بیٹی! میں نے تمہارا حق تمہیں دے دیا ہے۔ اب تم ساری عمر قرآن شریف کے ساتھ زندگی گزارو گی اور میکے میں صبر و شکر سے رہو گی۔ اس عمل کو حق بخشانا کہتے ہیں۔

راجہ نے پوچھا۔ "کیا تمہیں اپنی بہن جمیلہ سے محبت ہے۔"

کریم بخش نے کہا۔ "وہ میری ایک ہی سگی بہن ہے۔ میں اسے بہت چاہتا ہوں۔"

"چاہتے بھی ہو اور اپنی دولت میں اسے اس کے حصے سے محروم بھی کر رہے ہو۔ سرخ جوڑا پہننے اور دلہن بننے کا خواب ہر لڑکی دیکھتی ہے۔ تم اپنی محبت کرنے والی بہن سے اس کے خواب بھی چھین رہے ہو۔"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ نازاں نے کہا۔ "تم تعلیم یافتہ لگتے ہو۔ یہ تو جانتے ہو گے کہ ایسی ظالمانہ رسم کے باعث کتنی لڑکیاں خودکشی کر لیتی ہیں اور کتنی گھر سے بھاگ جاتی ہیں پھر ان بھاگنے والیوں کا بھی انجام کیا ہوتا ہے؟ وہ گھر سے باہر کی دنیا میں ٹھوکریں کھاتی ہیں۔ اگر کوئی کھوجی اسے پکڑ کر واپس لاتا ہے تو اس بیٹی کو اس لیے گولی مار دی جاتی ہے کہ وہ میلی ہو چکی ہے۔"

کریم بخش نے کہا۔ "انسان کے پاس علم کی روشنی ہو تو اندھیرا سمجھ میں آتا ہے۔ میں سوچتا تھا کہ ایسی رسم میں مردوں کی خود غرضی ہے مگر بابا سائیں کے سامنے زبان کھولنے اور مخالفت میں کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی مگر اب ہو گی۔"

"اب جرأت کیسے پیدا ہو گی؟"

"میں نے ڈاکوؤں کی قید میں رہ کر سوچا۔ بابا سائیں جب مجھے واپس حاصل کرنے کے لیے ڈاکوؤں کو ایک کروڑ روپے دے سکتے ہیں تو کیا وہ ایک کروڑ روپے میری بہن کو سہاگن نہیں بنا سکتے؟ ایک کروڑ ہوں یا ایک روپیہ' ڈاکو کو دیا جا سکتا ہے بیٹی کو نہیں دیا جا سکتا۔"

نازاں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اگر تم یہ بات دل سے کہہ رہے تو تم بے شک ایک اچھے اور سچے بھائی ہو۔"

"باجی! اگر میرے پاس فون ہوتا تو میں ابھی اپنی سچائی ثابت کر دیتا۔"

"ہمارے پاس موبائل فون ہے۔ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"آپ مجھے فون دیں اور صرف میری باتیں سنیں۔"

نازاں نے اسے فون دیا۔ اس نے اسے آن کر کے نمبر ڈائل کیے پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ "بابا سائیں! میں آپ کا بیٹا کریم بخش بول رہا ہوں۔"

باپ نے خوشی سے اونچی آواز میں پوچھا۔ "میرے بیٹے! تم کہاں ہو۔ اس ڈاکو نے کہا تھا کہ میں رقم تیار رکھوں۔ وہ جب مطمئن ہو گا کہ پولیس والے دور دور تک نہیں ہیں تو وہ تمہیں میرے پاس پہنچا کر رقم لے جائیں گے۔"

"بابا سائیں! اب یہ لوگ ایک کروڑ نہیں تین کروڑ مانگ رہے ہیں۔ کہتے ہیں' آپ راضی ہو جائیں گے تو یہ ابھی مجھے آپ کے پاس پہنچا دیں گے۔"

"بیٹے وہ میری مجبوری سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میں اپنے ایک ہی بیٹے کی جان بچانے کے لیے ان کے مطالبات ضرور پورے کروں گا۔ میرے لیے اس سے بڑی خوشی کی بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ اگر تم ابھی میرے پاس آجاؤ گے۔ ان سے کہو۔ انہیں تین کروڑ روپے مل جائیں گے۔"

"بابا سائیں! اگر میں آپ کو مفت میں مل جاؤں تو کیا آپ میری بہن جمیلہ کو تین کروڑ دے کر اسے سہاگن بنا کر رخصت کریں گے؟"

"یہ کیسی بات کر رہے ہو۔ میں جمیلہ سے حق بخشوانے والا ہوں۔"

"اس لیے حق بخشوائیں گے کہ بیٹی ہمارے گھر سے اپنا حصہ لے کر دوسرے خاندان میں نہ جائے لیکن وہی حصہ آپ ایک ڈاکو کو دینے کے لیے راضی ہیں۔"

"بیٹے! اپنے لیے میری محبت کو سمجھو۔ میں تمہاری خاطر تین کروڑ کا نقصان کروں گا۔"

"یہی رقم بیٹی کو دیں گے تو نیکی بھی ہوگی اور فرائض کی ادائیگی بھی۔"

"تم کبھی کہتے ہو ڈاکو تین کروڑ مانگ رہے ہیں اور کبھی کہتے ہو' ڈاکو کو کچھ نہیں دینا ہو گا۔ اسی رقم سے میں بیٹی کو دلہن بنا دوں۔"

"آپ کو میری بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ یہ لیجئے آپ ڈاکو صاحب سے بات کریں۔"

اس نے فون راجہ کی طرف بڑھایا۔ راجہ ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے فون لے کر کان سے لگا کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "سائیں! میں زیادہ نہیں بولتا۔ میں آدھے گھنٹے کے اندر کریم بخش کو تمہارے پاس پہنچا دوں گا۔ اس نیک کام کے لیے ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا۔ تم بھی نیکی کرو۔ اپنی بیٹی جمیلہ کو ایک ہفتے کے اندر دلہن بنا کر عزت آبرو سے رخصت کرو اور اپنی ملکیت میں سے اس کا جائز حق ادا کرو۔ بولو منظور ہے۔"

وہ جلدی سے بولا۔ "منظور ہے۔ بالکل منظور ہے۔ آپ کے جیسا نیک دل ڈاکو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میرے لیے اس سے بڑی خوشی کوئی نہیں ہو سکتی کہ میرا بیٹا ابھی مجھے مل جائے گا۔"

راجہ نے سخت لہجے میں کہا۔ "کام کی بات کرو۔ کیا بیٹی کی شادی ایک ہفتے کے اندر کرو گے؟"

"کروں گا۔ ضرور کروں گا۔"

"بیٹی کو اس کا جائز حق دو گے؟ اور دو گے تو کتنا دو گے؟"

"میں حساب کروں گا کہ ملکیت میں سے اس کا حق کتنا نکلتا ہے۔"

"تو پھر حساب کتاب ہونے تک میں تمہارے بیٹے کو اپنی قید میں رکھوں گا۔ جب تم بیٹی کی شادی کر دو گے تو اسے رہا کر دوں گا۔"

"نن۔ نہیں ابھی .... ملنے والی خوشیاں مجھ سے نہ چھینیں۔ جو تین کروڑ روپے ڈاکو کو میرا مطلب ہے آپ کو دینے والا تھا' وہ رقم میں اپنی بیٹی جمیلہ کو ضرور دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اس اعتماد کے ساتھ ابھی کریم بخش کو تمہارے پاس پہنچا رہا ہوں کہ تم اپنی زبان سے نہیں پھرو گے۔ ایک ہفتے کے اندر تم نے بیٹی کی شادی نہ کی اور سے تین کروڑ روپے نہ دیے تو آٹھویں دن خواہ تم کتنے ہی حفاظتی انتظامات کر لو' میں اور میرے آدمی تمہیں اور کریم بخش کو قتل کر دیں گے۔ جب تم باپ بیٹے دنیا میں نہیں رہو گے تو بیٹی جمیلہ تمام دولت اور جائیداد کی قانونی طور پر مالک بن جائے گی۔"

راجہ نے فون بند کر کے پیچھے بیٹھی ہوئی نازاں کو دیا۔ کریم بخش نے کہا۔ "یہ آپ نے اچھا کیا' جمیلہ کی شادی کے لیے ایک ہفتے کا وقت مقرر کر دیا۔ میں بھی اس ضد پر قائم رہوں گا کہ ایک ہفتے تک صرف ایک وقت کھانا کھاؤں گا' بابا سائیں مجھے بھوکا پیاسا نہیں دیکھ سکیں گے۔ وہ ضرور حق بخشوانے کی رسم سے باز آجائیں گے۔"

ایک جگہ پہنچ کر اس نے راستہ بدلنے کی راہنمائی کی۔ آگے دو تین موڑ کے بعد ایک بستی کے کچے پکے مکانات نظر آئے۔ پچھلے پہر کا پورا چاند نکل آیا تھا۔ چاندنی میں بہت دور ایک اونچی حویلی نظر آرہی تھی۔ کریم بخش نے کہا۔ "وہی ہماری حویلی ہے۔"

راجہ نے بستی میں داخل ہونے سے پہلے ہی گاڑی روک کر کہا۔ "ہم آگے نہیں جائیں گے۔ ہماری کچھ مجبوریاں ہیں۔ تم مہمان نوازی کی ضد نہ کرنا۔"

وہ بولا۔ "سائیں! آپ مجھ پر اور میری بہن پر بہت بڑا احسان کر کے میرے گھر کا ایک گلاس پانی بھی نہیں پئیں گے تو میں ہمیشہ شرمندہ رہوں گا۔"

"تم بھی ہماری جان بچانے کے لیے میزبان نہ بنو۔ تم نہیں جانتے کہ ہمارے پیچھے بہت خطرناک دشمن ہیں اور تم سے چاہتے ہیں کہ یہاں کسی سے ہم دونوں کا اور اس لینڈ کروزر کا ذکر نہ کرو۔ یہی بیان دو کہ صرف ایک مسلح شخص ٹویوٹا سوزوکی میں تھا۔ وہ تمہیں یہاں پہنچا گیا ہے۔"

"اگر آپ دونوں کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جھوٹ بولنا ضروری ہے تو میں بولوں گا لیکن آپ بھی وعدہ کریں۔"

"اگر تمہاری بات قابلِ عمل ہوئی تو میں وعدہ کرتا ہوں۔ تم کیا چاہتے ہو؟"

"آپ باجی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ بابا سائیں نے ایک ہفتے کے اندر اپنا وعدہ پورا نہ کیا تو آپ کسی دن بھی یہاں آکر ہم باپ بیٹے کو گولی مار دیں گے؟"

راجہ نے مسکراتے ہوئے نازاں کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اگر تمہارے بابا سائیں نے ایک ہفتے کے اندر بیٹی کی شادی نہ کی اور اسے تین کروڑ نہ دیے تو میں تم دونوں باپ بیٹے کو گولی نہیں ماروں گا لیکن تمہارے باپ کو زندہ رکھ کر جمیلہ کی شادی کرنے پر مجبور کر دوں گا۔"

وہ دروازہ کھول کر گاڑی سے اتر گیا۔ نازاں پچھلی سیٹ سے آکر راجہ کے پاس بیٹھ گئی۔ کریم بخش نے مصافحہ کرتے وقت راجہ کے ہاتھ کو چوما۔ نازاں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر نیک تمناؤں کا اظہار کیا پھر وہ گاڑی کو یوٹرن دے کر وہاں سے جانے لگے تو کریم بخش رو رہا تھا اور آستین سے آنسو پونچھ رہا تھا۔

☆======☆======☆

اسپتال کے باہر چاروں طرف مسلح پولیس کا سخت پہرا لگایا گیا تھا۔ پولیس کی موٹر سائیکلیں اور موبائل گاڑیاں جگہ جگہ موجود تھیں۔ جمشید کے پاس بھی ایک موٹر سائیکل تھی لیکن ڈائریکٹر جنرل نے اسے ہدایت دی تھی۔ "تم اس آپریشن میں پیش پیش نہیں رہو گے۔ اس ماہ کی دس تاریخ کو تمہاری ٹریننگ ختم ہو گی۔ ابھی کسی عہدے پر تمہاری تقرری نہیں ہوئی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ پہلے کی طرح مراد اور تابانی سے تمہاری ذاتی دشمنی کے بہانے اس کیس کو کمزور کر دیا جائے۔"

جمشید نے کہا۔ "سر! تابانی سے کہا گیا ہے کہ وہ اسپتال سے نکل کر جائے گا تو رات بارہ بجے تک اسے گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ بارہ بجتے ہی اسے ہتھکڑیاں پہنا دی جائیں گی لیکن یہ اتنا آسان نہیں ہو گا۔ وہ چار گھنٹوں میں اس اسپتال کو بھی تلاش کرے گا' جہاں مراد کو رکھا گیا ہے اور اسے تلاش کرنے کے دوران میں فرار ہونے کی راہیں بھی نکالتا رہے گا۔"

"بے شک وہ ایسا ہی کرے گا لیکن پولیس کے سپاہیوں اور افسران کی تعداد پچاس ہے اور بیس گاڑیاں ہیں۔ وہ اسپتال سے نکل کر جہاں بھی جائے گا' پولیس کے نرغے میں رہے گا۔ لاحول ولا قوۃ ہم خواہ مخواہ اسے مرد کہنے لگے ہیں۔ وہ ہمارے نرغے میں رہے گی۔"

"سر! میں نے آپ سے ہی سیکھا ہے کہ مجرم بھی ایسی تدابیر کر سکتا ہے' جنہیں ہم

بعد میں سمجھ پاتے ہیں اور اس وقت تک وہ ہماری گرفت سے نکل چکا ہوتا ہے۔"

"یہ تابانی کیا تدبیر کرے گا؟ اسپتال میں بالکل تنہا ہے۔"

"شام تک تنہا تھا لیکن اس کے کمرے میں فون پہنچا کر ہم نے اس کے لیے سہولت فراہم کر دی ہے۔"

"اس کے فون میں ڈیکٹو آلہ چھپا کر رکھا گیا ہے۔"

"شام کو پانچ بجے اس کے کمرے میں فون پہنچا دیا گیا تھا۔ اب رات کے آٹھ بجے ہیں۔ اس نے ان تین گھنٹوں میں کسی سے بات نہیں کی ہے یا پھر اس نے فون کے اندر سے ڈیکٹو آلہ نکال دیا ہے۔ جس کے باعث ہمارے ریکارڈر کے ذریعے اس کی کوئی فون کال سنائی نہیں دے رہی ہے۔"

ڈائریکٹر جنرل نے سوچتی ہوئی نظروں سے جمشید کو دیکھا پھر کہا۔ "تابانی تربیت یافتہ مجرم ہے۔ یقیناً اس نے فون سے وہ آلہ نکال کر الگ رکھ دیا ہو گا۔ اس طرح وہ سابق ایم این اے اکرام شاہ سے اور "را" کے دوسرے ایجنٹوں سے رابطے کر رہا ہو گا۔"

"میں یہی عرض کر رہا تھا۔ تابانی کوئی ایسی تدبیر بھی کر سکتا ہے کہ باہر نکلنے کے بعد ہمارے سپاہیوں کے نرغے سے نکل جائے۔ اس لیے آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ میں اس کے ساتھ جیسا چاہوں' ویسا سلوک کروں اور اسے حوالات میں پہنچا دوں۔"

"جب وہ نرغے سے نکل جائے گا تو تم اسے کیسے گرفتار کرو گے؟"

"سر! میری دعا ہے کہ وہ آپ حضرات کے نرغے سے نہ نکلے۔ نکلے گا تو بد دعا کی طرح عبرت ناک حالت میں حوالات کے اندر پہنچے گا۔ میں آپ کی اجازت سے جانا چاہتا ہوں۔ آپ کی ٹیم سے بہت دور رہوں گا۔ اس کی کوئی چال کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔"

"ہوں۔ اب میں بھی کھٹک رہا ہوں۔ اب تو چار گھنٹے سے بھی کم وقت رہ گیا ہے اور وہ اسپتال سے باہر نہیں آ رہا ہے۔ شاید اسے باہر سے کوئی مدد ملنے والی ہے مگر ہم کسی بھی مشتبہ شخص کو اندر نہیں جانے دیں گے اور کسی ایمبولینس یا دوسری گاڑی کو چیکنگ کے بغیر نہیں جانے دیں گے۔ تم جاؤ۔ اپنے طور پر اس کے خلاف کچھ بھی کرو۔ میں سمجھ لوں گا۔"

ایسے ہی وقت ڈائریکٹر جنرل اور جمشید کے قریب ایک کار آ کر رکی۔ اس کی پچھلی سیٹ پر آمنہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ "ہیلو ڈی جی! مجھے پوچھنا تو نہیں چاہیے لیکن اسپتال کے آس پاس پولیس کی اتنی بھیڑ دیکھ کر تجسس پیدا ہو گیا پھر آپ جیسا اتنا بڑا سینئر

افسر بھی موجود ہے آخر پرابلم کیا ہے؟"

اس کی باتوں کے دوران میں ایک سوزوکی.......... اسپتال کے گیٹ پر آئی۔ ایک افسر اور سپاہیوں نے اسے روک کر چیک کیا۔ ڈائریکٹر جنرل اور جمشید بھی تیزی سے ادھر گئے۔ سوزوکی کے پچھلے حصے میں اسٹین لیس اسٹیل کے کئی لمبے لمبے راڈز اور ان راڈز کو جوڑنے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے اسپتال کی ایک گاڑی آئی۔ افسر نے پوچھا۔

"یہ فولادی راڈز کس لیے ہیں؟"

ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے اسپتال کا اپنا شناختی کارڈ دکھا کر کہا۔ "اسپتال کے تین بڑے کمرے ہیں۔ ان کے اندر اپارٹیشن بنانے کے لیے یہ راڈز لے جا رہے ہیں۔"

ان راڈز کے سوا اور کوئی قابلِ اعتراض سامان نہیں تھا۔ اسے اسپتال کے احاطے میں جانے کی اجازت دے دی گئی پھر اس کے پیچھے آنے والی اسپتال کی گاڑی کو چیک کیا گیا۔ اس کے پچھلے حصے میں دھلے ہوئے اور استری کیے ہوئے کپڑے گاڑی کے فرش سے چھت تک بھرے ہوئے تھے۔ وہ اسپتال کی لانڈری سے دھل کر آئے تھے۔ سپاہیوں نے اپنی گنوں کو ان کپڑوں کے اندر ٹھونس ٹھونس کر دیکھا۔ گاڑی والے نے اپنا شناختی کارڈ دکھا کر کہا۔ "جناب! میں اسپتال کی لانڈری کا ٹھیکے دار ہوں۔ آپ کے سپاہی اتنی محنت سے دھلے ہوئے اور استری کیے ہوئے کپڑوں کو برباد کر رہے ہیں۔ ان سب پر شکنیں پڑ رہی ہیں۔"

چیکنگ کے بعد اس گاڑی کو بھی جانے کی اجازت دے دی گئی۔ آمنہ اپنی گاڑی سے باہر آ گئی۔ ڈائریکٹر جنرل تیزی سے چلتا ہوا اس کے پاس آ کر بولا۔ "کیا آپ اسپتال میں جائیں گی۔"

"ابھی تو باہر ہوں اور آپ پریشان ہو گئے ہیں؟ میں تو یہ پوچھنے کے لیے رک گئی ہوں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟ میری دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ سوچ رہی ہوں' اگر میں اندر جانا چاہوں تو کیا مجھے بھی روکا جائے گا؟"

دیکھئے آپ بین الاقوامی شہرت یافتہ لیڈی سرجن ہیں۔ ہم آپ کو اندر جانے سے روک نہیں سکیں گے لیکن.........."

"لیکن؟"

"یہ ایک بہت اہم پولیس کیس ہے۔ ایک مجرم یہاں سے فرار ہونے والا ہے۔ ہم اس کے فرار ہونے کی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیں گے۔"

"اوہ پھر تو یہاں گولیاں بھی چل سکتی ہیں۔ مجھے ایسی جگہ نہیں رہنا چاہیے۔"

وہ جانے کے لیے کار کا پچھلا دروازہ کھولنے لگی پھر رک کر سوچنے لگی۔ پلٹ کر ڈی جی سے بولی۔ "آپ نے اس روز کہا تھا کہ تابانی اسپتال سے فرار ہونے والا ہے۔ یعنی کہ تابانی اسی اسپتال میں ہے اور آپ مجھے یہاں کا پتا نہیں بتا رہے تھے۔"

"ہاں۔ ہم پولیس والے اپنے طریقۂ کار کے مطابق بہت سی باتیں راز میں رکھتے ہیں۔"

"چلیں یہ آپ نے اچھا کیا کہ مجھے اس اسپتال کا نام نہیں بتایا تھا اور آپ گواہ ہیں کہ میں اسپتال کے اندر گئی' نہ تابانی کو پہلے کبھی دیکھا ہے اور نہ ہی کبھی اس سے میرا سامنا ہوا ہے۔ ایسے میں وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گا تو مجھ پر کوئی الزام نہیں آئے گا کہ میں نے ایک مجرم کی مدد کی ہے۔ میں آپ لوگوں کی نظروں میں اور خاص کر ایسے معاملات میں خاصی بدنام ہوں۔"

وہ دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور سے کہا۔ "یہاں کی آب و ہوا ہمارے لیے ناموافق ہے۔ چلو۔"

ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کی۔ وہ کھڑکی سے ہاتھ ہلا کر بولی۔ "میں چلتی ہوں۔ خدا ہی حافظ ہے۔"

وہ کار سے آگے بڑھتے ہوئے دور چلی گئی۔ جمشید نے کہا۔ "سر! یہ طنزیہ انداز میں کہہ گئی ہیں۔ کیا یہ محض اتفاقاً یہاں آئی ہوں گی؟"

"اگر کسی ارادے سے بھی آئی ہو تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ کیا ہم اسے اسپتال کے اندر جانے سے روک سکتے تھے؟ خدا کا شکر ہے' یہ خود نہیں گئی۔"

پھر ڈی جی نے رسٹ واچ دیکھ کر کہا۔ "گیارہ بجنے میں پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔ تابانی اب تک باہر نہیں آئی ہے۔ جبکہ وہ سوا گھنٹے کے بعد گرفتار کر لی جائے گی پھر مجھے توقع تھی کہ سابق ایم این اے اکرام شاہ یا "را" کے ایجنٹ تابانی کو لے جانے کے لیے کوئی گڑبڑ کریں گے۔ شاید اچھی خاصی تعداد میں مسلح پولیس کو دیکھ کر تابانی کے حمایتی کچھ کر نہیں پا رہے ہیں۔"

ڈی جی نے موبائل فون کے ذریعے اسپتال میں تابانی کے فون نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف سے ایسی آواز آ رہی تھی جیسے فون انگیجڈ ہو اور تابانی کسی سے فون پر باتیں کر رہا ہو۔

ڈی جی نے دس منٹ کے بعد پھر فون کیا۔ اس بار تابانی کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو۔"

میں تابانی بول رہا ہوں۔"

"میں ڈی جی ہوں۔ ابھی فون کیا تو انگیجڈ تھا۔ کیا کسی سے گفتگو ہو رہی تھی؟ وہ گفتگو کرنے والا خوش نصیب کون ہے؟"

"آپ نے میرے کمرے میں فون لگایا' اس کا شکریہ۔ اب میں یہ کیوں بتاؤں کہ اپنے عاشق بامراد سے باتیں کر رہا تھا۔"

"جھوٹ نہ بولو۔ مراد کے کمرے میں فون نہیں ہے۔"

"اس اسپتال میں فون ہے۔ وہ ڈاکٹر کے کمرے تک یا کاؤنٹر تک چل کر آسکتا ہے۔"

"وہاں بھی پولیس کا سخت پہرا ہے اور تمام عملے کو تاکید کی گئی ہے کہ کوئی بھی مراد کے بارے پوچھے' اس سے کہا جائے کہ اس نام کا کوئی مریض وہاں نہیں ہے۔"

"میں اس سلسلے میں بحث نہیں کرنا چاہتا۔ گیارہ بج چکے ہیں۔ مجھے یہاں سے نکلنا بھی ہے۔"

"تمہیں شام کے بعد چھ گھنٹے تک آزاد رہنے کی اجازت دی گئی تھی پھر تم نے اتنا وقت کیوں برباد کیا ہے؟"

"مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں شام سے آپ لوگوں کو تھکا رہا ہوں۔ سوری آپ کو اتنی زحمت دی۔ اب میں یہاں سے دس پندرہ منٹ میں نکلنے والا ہوں۔"

فون بند ہو گیا۔ ڈی جی نے جمشید اور دوسرے افسران سے کہا۔ "تیار رہو۔ وہ دس پندرہ منٹ میں باہر آنے والا ہے۔"

تابانی کمرے سے نکل کر کوریڈور سے گزرتا ہوا پھر سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر آیا۔ وہ چار منزلہ عمارت تھی۔ ٹویوٹا سوزوکی میں جو اسٹین لیس اسٹیل کے راڈز لائے گئے تھے' انہیں جوڑ کر اس میں پیرا شوٹ کپڑا اس طرح لگایا گیا تھا کہ وہ فلائنگ کائٹ بن گئی تھی۔ وہ پیرا شوٹ کپڑا اسپتال کی لانڈری کے کپڑوں کے پیچھے چھپا کر لایا گیا تھا۔

ایک شخص نے تابانی کو ایک قطب نما آلہ دے کر کہا۔ "گاڈ فادر ہاشم جان نے کہا ہے۔ جنوب کی طرف فلائی کرتے ہوئے جاؤ۔ نیچے جہاں سرخ اور سبز روشنی جلتی بجھتی دکھائی دے' وہاں اتر جانا۔ وسیع میدان میں اترتے وقت کوئی دشواری نہیں ہو گی۔"

وہ چھت بہت وسیع و عریض تھی۔ تابانی نے اس فلائنگ کائٹ کے راڈ کو ہاتھوں سے تھام کر اٹھایا پھر چھت کے ایک سرے سے دوڑتا ہوا دوسرے سرے پر پہنچتے ہی اوپر کی طرف چھلانگ لگائی پھر کنٹرولنگ پیڈلس پر دونوں پیر رکھ کر پرواز کرنے لگا۔ دنیا کے

تمام بڑے ممالک کے ساحلی علاقوں میں سیاحوں کی تفریح کے لیے ایسے بے شمار فلائنگ کائٹس ملتے ہیں۔ ہاشم جان کے ایک ماتحت نے فون پر ڈی جی سے کہا۔ "دروازوں کو نہ دیکھیں۔ دعا کے لیے سر اٹھائیں۔ تابانی چھت پر سے جا رہا ہے۔"

ڈی جی نے چونک کر اوپر دیکھا پھر میگا فون پر چیخ کر کہا۔ "وہ دیکھو۔ وہ فلائنگ کائٹ کے ذریعے جا رہا ہے۔"

تمام پولیس فورس میں ہلچل مچ گئی۔ کچھ اوپر دیکھنے لگے۔ وہ پرواز کرتا ہوا عمارتوں کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ تمام گاڑیاں اسٹارٹ ہو کر اس سمت جانے لگیں۔ نیچے دوڑتی ہوئی گاڑیوں میں سے اسے دیکھنا ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ بار بار عمارتوں کے پیچھے گم ہو جاتا تھا۔ اس کے باوجود اس کی پرواز کی سمت معلوم کرتے ہوئے اس کا تعاقب کیا جا رہا تھا۔

پولیس کی گاڑیاں مختلف راستوں سے گزر رہی تھیں۔ تابانی سب کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ آسمان پر ستاروں کی دھیمی سی روشنی کے باعث کبھی کسی کو نظر آجاتا تو وہ وائرلیس کے ذریعے دوسری گاڑیوں کی راہنمائی کرتا تھا۔

آگے جنوب کی سمت کھیت ہی کھیت تھے۔ کہیں کہیں ایسے ناہموار کچے راستے چوڑائی میں ایسے تنگ تھے کہ گاڑیاں کبھی کبھی پگڈنڈیوں پر چڑھ جاتی تھیں۔ پہلے ان گاڑیوں کی رفتار سست ہوئی پھر وہ رک گئیں۔ وہ پرواز کرنے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سب تاریک آسمان کی طرف متلاشی نظروں سے ایسے دیکھنے لگے جیسے عید کا چاند تلاش کر رہے ہوں۔

وہ سب ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ وائرلیس کے ذریعے کہہ رہے تھے کہ انہیں وہ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ اندازے کے مطابق مضافاتی پنڈ اور چھوٹے شہروں کے تھانے والوں کو تابانی کے بارے میں بتا رہے تھے کہ ایک مجرم فلائنگ کائٹ کے ذریعے شاید ادھر سے پرواز کرتا ہوا گزر رہا ہو گا۔ جس تھانے دار کو وہ نظر آئے' وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ اس کا تعاقب کرے اور فلاں فلاں نمبر پر اطلاع دے کہ وہ پرواز کرتا ہوا کس سمت جا رہا ہے۔

وہ تابانی کو ڈھونڈنے اور اس کے پاس پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ جمشید ان سے الگ تھا اور ایک موٹر سائیکل پر کھیتوں کے درمیان کچے ناہموار راستوں سے گزر رہا تھا۔ کہیں کہیں رک کر آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کی پرواز کی سمت معلوم تھی۔ لہٰذا امید تھی کہ آگے جا کر وہ نظر آجائے گا۔

ڈی جی چند سپاہیوں کے ساتھ اسپتال کے اندر انکوائری کر رہا تھا کہ اتنی بڑی فلائنگ کائٹ چھت پر کیسے پہنچائی گئی؟ اور کس نے پہنچائی۔

چھت پر اسٹین لیس اسٹیل راڈز جوڑنے کے اوزار اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ اسپتال کے انچارج سے پوچھا گیا۔ "یہ سامان کیسے آیا؟ ہمیں چیکنگ کے وقت بتایا گیا تھا کہ یہ سامان اور فولادی راڈز کمروں میں پارٹیشن کے لیے لائے گئے ہیں۔ اب سمجھ میں آیا کہ ان راڈز کو فلائنگ کائٹ تیار کرنے کے لیے لایا گیا تھا۔"

انچارج نے کہا۔ "جی ہاں' وہ کمروں میں پارٹیشن بنانے کے لیے لائے گئے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ انہیں اسٹور روم میں پہنچایا جائے۔ کل پارٹیشن کا کام ہو گا پھر میں اپنے آفس میں چلا گیا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ کون انہیں چھت پر لے گیا تھا۔"

"لے جانے والے دو یا دو سے زیادہ ہوں گے۔ یہ پہلے سے پلاننگ کی گئی ہو گی کہ آج ہی وہ تمام راڈز یہاں پہنچائی جائیں۔"

جس گاڑی میں وہ سامان لایا گیا تھا' وہ جا چکی تھی۔ اس گاڑی والے نے اسپتال والوں کے آرڈر کے مطابق مال پہنچایا تھا۔ وہ اس بات کو نہیں جانتے تھے کہ ان راڈز کو کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کیا جا چکا ہے۔

جمشید کچے راستوں اور کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں آگے کھلا میدان تھا۔ وہاں ایک پجارو کھڑی ہوئی تھی۔ ایک شخص دونوں ہاتھوں میں دو ٹارچ پکڑے ان کا رخ آسمان کی طرف کیے کبھی سرخ لائٹ اور کبھی سبز لائٹ جلا رہا تھا اور بجھا رہا تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جو تابانی کو نیچے اترنے کا سگنل دے رہے تھے۔ تابانی ابھی تک وہاں پہنچا نہیں تھا یا شاید دوسری سمت بھٹک گیا تھا۔ جو کچھ بھی ہو۔ بہت دور سے موٹر سائیکل کی آواز سنتے ہی دونوں ٹارچ بجھا کر سیٹوں کے نیچے رکھ دی گئیں پھر گاڑی کا بونٹ اٹھا کر تیسری ٹارچ کے ذریعے وہاں کچھ خرابیاں پیدا کی گئیں۔ اس کے بعد یوں مصروف ہو گئے جیسے گاڑی کی خرابیاں درست کر رہے ہوں۔

جمشید نے قریب پہنچ کر کہا۔ "کون ہو تم لوگ؟ اتنی رات کو اس ویرانے میں کیا کر رہے ہو؟"

وہ تین تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "گاڑی یہ نہیں سمجھتی کہ یہ کسی ویرانے میں پہنچ کر خراب ہو رہی ہے۔ بائے دا وے آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

جمشید نے انہیں انٹیلی جنس کا انڈر ٹریننگ شناختی کارڈ دکھایا۔ اسے دیکھ کر دوسرے نے کہا۔ "پھر تو آپ کو ہم پر شبہ کرنے کا' ہر طرح کے سوال کرنے کا اور ہماری گاڑی

چیک کرنے کا حق ہے۔ ہم ٹھوکر سے آ رہے ہیں اور یہ شارٹ کٹ راستہ اختیار کر کے لاہور جا رہے ہیں۔"

"میں آپ لوگوں پر شبہ نہیں کر رہا ہوں۔ ایک مجرم فلائنگ کائٹ کے ذریعے فرار ہو رہا ہے۔ کیا آپ میں سے کسی نے کائٹ کو ادھر سے گزرتے دیکھا ہے؟"

"سوری۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ گاڑی کی مرمت کے لیے ہمارے سر انجن پر جھکے ہوئے ہیں۔ ہمیں سر اٹھا کر تاریک آسمان دیکھنے کا خیال بھی نہیں آیا۔"

جمشید سر اٹھا کر سوچتی ہوئی نظروں سے آسمان کی طرف کبھی اِدھر کبھی اُدھر دیکھنے لگا پھر اس نے جھک کر زمین سے مٹھی بھر مٹی اٹھائی۔ سیدھا کھڑا ہو کر اس مٹی کو آہستہ آہستہ نیچے چھینکنے لگا۔ ہلکی پھلکی مٹی ایک ہی سمت میں اڑتی ہوئی نیچے جا کر گرنے لگی۔ اس طرح اس نے ہوا کا صحیح رخ معلوم کیا۔

وہ جانتا تھا' فلائنگ کائٹس ہمیشہ ہوا کے رخ پر پتنگ کی طرح اڑتی ہیں۔ اس میں ایک چھوٹا سا راڈ ایسا ہوتا ہے۔ جسے اپنی مرضی کی سمت گھمانے سے اس کے دو طرفہ راڈ پیراشوٹ کپڑے کے ساتھ گھوم جاتے ہیں اور انہیں گھمائے رکھنے کے لیے چھوٹے راڈ کو ہینڈل کی طرح تھامے رہنا پڑتا ہے۔ ہینڈل کو چھوڑا جائے تو فلائنگ کائٹس پھر ہوا کے رخ پر جانے لگتی ہیں۔

جمشید نے پھر موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا اور ہوا کے رخ کی سمت جانے لگا۔ وہ تینوں اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ "بہت چالاک بندہ ہے۔ پتا نہیں تابانی فلائنگ کائٹ کو کیسے ہینڈل کر رہا ہو گا؟"

دوسرے نے کہا۔ "تابانی کو اب تک ادھر آ جانا چاہیے تھا۔ معلوم ہوتا ہے' وہ فلائنگ کائٹ کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔"

تیسرے نے موبائل فون کے ذریعے رابطہ کیا۔ تابانی کی کائٹ نیچی پرواز کے دوران میں ایک .... درخت سے الجھ گئی تھی۔ وہ درخت کی ایک شاخ پر آ کر نیچے اتر رہا تھا۔ اسی وقت فون کے بزر کی آواز ابھری۔ اس نے گریبان سے موبائل فون نکال کر اسے آن کیا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "ہیلو ہیلو تابانی! تم کہاں ہو۔ ہم سرخ اور سبز سگنل دیتے رہے تھے۔ کیا تمہیں بلندی سے سگنل نظر نہیں آیا؟"

تابانی نے کہا۔ "میں نے دور سے سگنل دیکھا پھر کائٹ کا رخ موڑ کر دوسری طرف آ گیا ہوں۔"

"ویسے تو تم نے اچھا ہی کیا۔ ادھر ایک جاسوس تمہاری تلاش میں آیا تھا۔ اس کے

آئی ڈی کارڈ پر جمشید کا نام لکھا ہوا تھا۔ اگر تم ادھر آتے تو جمشید سے ٹکراؤ ہو جاتا۔ بائے داوے تم نے راستہ کیوں بدل دیا ہے؟"

تابانی نے جواب دیا۔ "میں نے اسپتال میں پہلی بار گاڈ فادر ہاشم جان سے فون پر بات کی تھی۔ اس نے مجھے فرار ہونے کی پلاننگ بتائی تھی۔ اس پلاننگ کے مطابق تم سب نے میرا ساتھ دیا ہے۔ گاڈ فادر ہاشم جان کو میرا شکریہ کہہ دینا لیکن میں کسی اجنبی پر بھروسہ نہیں کرتا۔ آسمان سے گر کر کھجور میں نہیں اٹکتا۔ پولیس والے ہوں یا جرائم پیشہ افراد ہوں' وہ دوہری چالیں چلتے ہیں۔ فرار ہونے کا موقع دے کر یا تو گولی مار دیتے ہیں یا اپنے پاس بلا کر بلیک میلنگ کے ذریعے تابع دار بنا لیتے ہیں۔ میری بات کا برا نہ مان جانا۔ مجھ پر جو احسان کیا گیا ہے' اس کے بدلے کبھی میں بھی تمہارے گاڈ فادر پر ضرور احسان کروں گا۔"

"تابانی! تم اپنے طور پر بہت محتاط اور ہوشیار رہو۔ تمہیں گاڈ فادر سے یہ تو پوچھنا چاہیے تھا کہ تمہیں فرار کرانے کے لیے اتنی درد سری کیوں کی جاتی رہی ہے؟"

"کسی مقصد کے بغیر کوئی کسی کے لیے درد سری مول نہیں لیتا۔"

"مراد کا آدھا جسم مُردہ ہو گیا تھا۔ اس کے مقدر میں سزائے موت ہے لیکن لیڈی سرجن آمنہ نے اس نصف مُردے کو کیوں زندہ کیا؟ اور وہی لیڈی سرجن اسے سزائے موت سے ضرور بچائے گی۔ جبکہ اسے مراد سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔ مراد کوئی بہت بڑا تیس مار خاں نہیں ہے۔ جرائم کی دنیا میں اس کے اور تمہارے جیسے کتنے آتے ہیں اور فنا ہو جاتے ہیں۔ کبھی مراد سے بات ہو تو اس سے پوچھ لینا کہ لیڈی سرجن آمنہ کیا چیز ہے؟ پھر تمہیں معلوم ہو گا کہ دنیا کے تمام مجرم اس کے آگے گھٹنے ٹیکتے ہیں اور دنیا کی تمام عدالتیں اسے ایک معزز لیڈی سرجن تسلیم کرتی ہیں۔ اب تم جہاں جانا چاہو' جاؤ ہمارا کام ختم ہو چکا ہے۔ ڈیٹس آل؟!"

دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔ تابانی نے اپنا فون بند کر کے اسے گریبان میں رکھا پھر درخت سے اتر کر ایک سمت تیزی سے چلنے لگا۔ وہ اس درخت سے بہت دور چلا جانا چاہتا تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ اتنی بڑی فلائنگ کائٹ آس پاس کسی بستی کے تھانے والوں کی نظر میں آ گئی تو وہ اسے تلاش کریں گے۔ اتنا تو وہ سمجھ رہا تھا کہ ہر شہر اور پنڈ کے تھانوں میں اس کے فرار ہونے کی خبر پہنچا دی گئی ہو گی۔

تقریباً ایک کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ رک گیا۔ اسے موٹر سائیکل کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ ایک جھاڑی کے پیچھے آ گیا۔ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ

کر دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد دور ایک ہیڈ لائٹ کی روشنی دکھائی دی۔ اس نے اپنی جیب سے ایک پستول نکال لیا۔ گاڈ فادر ہاشم جان نے موبائل فون' پستول اور پنسل ٹارچ وغیرہ جیسی ضرورت کی تمام چیزیں اس کے پاس پہنچا دی تھیں۔ وہ موٹر سائیکل دور ایک جگہ تھوڑی دیر کے لیے رک گئی پھر آگے بڑھنے لگی۔ تابانی جہاں چھپا ہوا تھا' وہ موٹر سائیکل انہی جھاڑیوں کی طرف آ رہی تھی۔ اس نے پستول کے دستے کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ انگلی ٹریگر پر تھی۔ اسے یاد آیا' جمشید نے کہا تھا کہ وہ صبح تک اپنا ریوالور خالی رکھے گا اور خالی ہاتھوں سے اس ناقابلِ شکست فائٹر کو مارتا ہوا حوالات میں لے جائے گا۔

تابانی نے سوچا' اگر وہ زبان کا پکا ہے تو اس کا ریوالور ضرور خالی ہو گا۔ وہ فائرنگ کے جواب میں فائر نہیں کر سکے گا اور اپنی مردانگی دکھانے کے جوش میں ریوالور رکھتے ہوئے بھی مارا جائے گا پھر دم توڑتے وقت عقل آئے گی کہ مجرموں کو چیلنج کرنے کے بعد پورا ریوالور خالی نہیں رکھنا چاہیے۔ مرد کی مردانگی طاقت سے ہوتی ہے۔ خواہ وہ جسمانی طاقت ہو یا ہتھیار کی۔

موٹر سائیکل تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ سامنے ہیڈ لائٹ کی وجہ سے سوار کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کوئی مسافر بھی ہو سکتا تھا۔ تابانی جھاڑیوں کے پیچھے سے پہلے اس کی صورت دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے گزرنے کے بعد پشت پر بھی گولی ماری جا سکتی تھی۔

یہ ضروری نہیں کہ آدمی جو سوچے' وہی ہو جائے۔ بات کچھ ایسی ہو جاتی ہے کہ اپنی سوچی ہوئی بات دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ وہ موٹر سائیکل جھاڑیوں کے قریب سے گزرتی ہوئی گئی۔ ہیڈ لائٹ گزرتے ہی جمشید کا چہرہ نظر آیا۔ وہ چند سیکنڈ میں آگے نکل گیا۔ تابانی فائر نہ کر سکا کیونکہ اس کے پیچھے ایک چادر میں لپٹی ہوئی عورت بیٹھی تھی۔ اس عورت کی وجہ سے جمشید کی پشت پر گولی نہیں لگ سکتی تھی۔

اس نے اکرام شاہ کی کوٹھی میں رہ کر جمشید کی ذہانت' چالاکی اور دلیری کے خوب چرچے سنے تھے۔ اگر وہ پیچھے بیٹھی ہوئی عورت کو کسی طرح بچا کر فائر کرتا تو ضروری نہیں تھا کہ تیزی سے دوڑنے والی موٹر سائیکل کے باعث جمشید کو گولی لگتی' وہ ہلاک ہوتا یا زخمی ہو جاتا۔ عقل کہتی تھی کہ ایک فائر بھی ضائع ہو گا تو جمشید اپنی حکمتِ عملی سے بچتا ہوا تاریکی میں گم ہو جائے گا پھر اس کے لیے پریشانی کا باعث بنے گا کہ پتا نہیں' تاریکی میں کدھر سے آ کر اس پر حملہ کرنے والا ہے۔

تابانی نے دانش مندی کی' اس پر گولی نہیں چلائی۔ موٹر سائیکل دور جاتی رہی پھر اس کی بیک لائٹ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک رات کے سناٹے میں اس

کی آواز سنائی دیتی رہی پھر آواز بھی گم ہو گئی۔ تاباں نے دل میں اعتراف کیا' واقعی یہ ذہین ہے۔ تمام پولیس والے نہ جانے کہاں بھٹک گئے لیکن یہ صحیح سمت معلوم کرتا ہوا تعاقب کر رہا ہے۔

وہ تھوڑی دیر تک جھاڑیوں کے پیچھے کھڑا سوچتا رہا پھر وہاں سے پلٹ کر ایک طرف دوڑتے ہوئے جانے لگا۔

جمشید نے ایک چھوٹے سے پنڈ میں پہنچ کر ایک مکان کے سامنے موٹر سائیکل کو روکا۔ پیچھے سے ایک عمر رسیدہ عورت نے گاڑی سے اتر کر چادر سنبھالتے ہوئے دعا دی۔

"بیٹا! خدا تمہیں ہمیشہ سلامت رکھے۔ میری بہو ماں بننے والی ہے۔ اگر تم مجھے اپنی گاڑی میں نہ لاتے تو میں یہاں تک پہنچ نہ پاتی۔"

وہ اسے سلامتی کی دعائیں دیتی ہوئی مکان کے دروازے پر دستک دینے لگی۔ جمشید موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے وہاں سے جانے لگا۔ اس بار اس کے پیچھے کوئی ڈھال نہیں تھی اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ اس نے ایک عمر رسیدہ عورت سے نیکی کی تھی۔ اکثر لوگوں کو پتا نہیں چلتا کہ آدمی کی نیکی کس طرح اس کے لیے ڈھال بن کر اسے ایک نئی زندگی دیتی ہے۔

☆======☆======☆

اب تک بے شمار افراد نے سلسلے وار داستان حیات لکھیں اور اپنی داستان کی ابتدا ہی سے خود کو بڑی عاجزی سے ہرفن مولا بتایا خود کو کسی غیر معمولی صلاحیت کا حامل دکھایا اور ایک مکمل ہیرو کی طرح داستان کے صفحات پر کارنامے دکھاتے رہے۔

میں فرمان علی تاباں شاید سلسلے وار داستان کا پہلا راوی ہوں کہ خود کو امیر حمزہ' راجہ نواز اور جمشید وغیرہ کے مقابلے میں کم تر بنا کر پیش کر رہا ہوں کیونکہ میری داستان میں جتنے ہیرو وطن عزیز کی خاطر جہاد کر رہے ہیں' وہ سب مجھ سے سینئر ہیں۔ انہوں نے مجھ سے پہلے ہی زندگی کے پل صراط سے گزرنا شروع کر دیا تھا۔ لہٰذا وہ مجھ سے زیادہ تربیت یافتہ اور تجربے کار ہیں۔

مراد چنگیزی کے ذریعے میری تربیت ہو رہی تھی۔ جہاں میں ٹھوکر کھاتا ہوں' وہاں مراد چنگیزی مجھے سنبھال لیتا ہے۔ وہ صبح سے رات تک کبھی زبانی طور پر اور کبھی عملی طور پر بتاتا تھا کہ اچانک خطرناک مرحلوں سے گزرنا پڑے تو کس طرح حاضر دماغی سے کام لینا چاہیے۔ ذہانت ایک الگ سی چیز ہے لیکن ناگہانی اور غیر متوقع مصائب میں ذہین حضرات بھی بوکھلا جاتے ہیں اور جو بدحواس نہ ہوں اور خود اعتمادی سے آزمائشی مراحل سے گزر

جائیں' وہی حاضر دماغ کہلاتے ہیں۔

مراد چنگیزی نے اپنے تجربات کی روشنی میں دور رس نتائج کے بارے میں سوچ کر مجھے ہائیڈ پارک جانے اور امیر حمزہ کا چیلنج قبول کرنے سے منع کیا تھا۔ میں جوشیلا اور جذباتی تھا۔ یہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ ایک مخالف صرف مقابلہ کرنے کے لیے چیلنج نہیں کرتا بلکہ اپنے دوسرے مقاصد حاصل کرنے کے لیے اپنے چیلنج کے پیچھے نادیدہ جال بچھاتا ہے۔

امیر حمزہ یہی کر رہا تھا۔ وہ کبھی انٹیلی جنس میں کیپٹن کے عہدے پر رہ چکا تھا اور پاکستان سے اسکاٹ لینڈ یارڈ میں آ کر چھ ماہ تک ٹریننگ حاصل کی تھی۔ لندن کی انٹیلی جنس کے سراغ رسانوں سے بھی اس کے تعلقات تھے۔ انہی تعلقات کی بنا پر اس نے انیلا کے فراڈ مرڈر کیس میں لندن کے سراغ رسانوں کی مدد کی تھی اور اسپتال میں خفیہ ایجنسی کے ایجنٹوں کو گرفتار کرایا تھا۔

اس بار پھر اس نے لندن انٹیلی جنس کے چیف سے رابطہ کیا۔ اسے بتایا کہ فرمان علی اور مراد چنگیزی پاکستان سے آئے ہیں اور خفیہ ہاتھ کے نئے رنگروٹ کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ اگر انہیں گرفتار کر کے ٹارچر سیل پہنچایا جائے اور ان سے اصلیت اگلوائی جائے تو ان کے ذریعے بہت اہم معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

امیر حمزہ نے انٹیلی جنس کے چیف کو بتایا۔ "فرمان علی شام کو ہائیڈ پارک آئے گا۔ یقیناً میک اپ میں ہو گا' مگر نیا پاکستانی رنگروٹ ہے۔ اسے پہچاننا دشوار نہیں ہو گا۔ میں اس کی وجہ سے ایک بہت بڑی جیتی ہوئی بازی ہار چکا ہوں۔ وہ معاہدہ میری تحویل سے نکل کر خفیہ ہاتھ کے پاس واپس پہنچ گیا ہے۔ اب میں فرمان علی کے ذریعے خفیہ ہاتھ کے خاص ایجنٹوں تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا آپ کے سراغ رسانوں کو ہائیڈ پارک میں موجود رہنا چاہیے۔"

میں اس سازش سے بے خبر تھا۔ امی نے مجھے سمجھایا تھا کہ مراد چنگیزی کو محض ایک باڈی گارڈ نہ سمجھنا' اسے استاد مان کر سیکھتے رہو گے تو جرائم کی دنیا کے حیرت انگیز تجربات حاصل کرتے رہو گے۔ میں امی کی ہدایت کو حکم کا درجہ دیتا ہوں اور ان کی تمام ہدایات پر عمل کرتا رہتا ہوں۔ اس بار میری کھوپڑی ذرا کھسک گئی۔ امیر حمزہ کے چیلنج نے مجھے جوش دلایا۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ جوش میں آنے والا ہوش میں نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوچا' مراد چنگیزی نے مجھے نصیحت کی ہے کہ شام کو ہائیڈ پارک نہیں جانا چاہیے لیکن امیر حمزہ تو یہ نہیں سمجھ پائے گا کہ میں اپنے جہاں دیدہ استاد کی نصیحت پر عمل کر رہا ہوں۔ وہ تو مجھے بزدل سمجھے گا۔ اس کے ساتھ انیلا جیسی حسینہ ہے۔ بزدل بننے سے ایک حسینہ کے سامنے

توہین ہوگی۔

میں نے یہ سب کچھ اپنے طور پر سوچا اور مراد چنگیزی سے بہانہ کیا کہ میں لندن شہر دیکھنا اور تفریح کرنا چاہتا ہوں۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس شہر کے تمام علاقوں اور راستوں کو اچھی طرح دیکھ لوں۔ اس لیے اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ اتنے دنوں سے مراد کے ساتھ رہتے ہوئے میں سمجھ گیا تھا' وہ بھولا یا نادان نہیں ہے۔ وہ کچھ سوچ سمجھ کر ہی مجھے اپنی مرضی سے کچھ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

جب میں اپارٹمنٹ سے نکل کر وقت سے ذرا پہلے ہائیڈ پارک جانے کے لیے سڑک کے کنارے آیا تو ہمارے پاس کوئی رینٹڈ کار نہیں تھی۔ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈرائیور سے بولا۔ ”کہیں بھی چلتے رہو۔ میں سیر کرنے کے موڈ میں ہوں۔“

ٹیکسی چل پڑی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے سمجھ لیا کہ میرا تعاقب کیا جارہا ہے۔ تعاقب کرنے والوں کو اس بات کی فکر نہیں تھی کہ وہ میری نظروں میں آجائیں گے کیونکہ وہ مراد کی طرف سے بھیجے ہوئے میرے اپنے ہی وفادار تھے اور ذرا دور دور رہ کر میری نگرانی کر رہے تھے۔

یہ میں پچھلے باب میں بیان کرچکا ہوں کہ میں نے انہیں کس طرح ڈاج دے کر ان کے تعاقب کو ناکام بنایا تھا۔ ایک بہت بڑے جنرل اسٹور میں داخل ہوکر فوراً ہی تیزی سے چلتا ہوں پچھلے دروازے سے باہر آگیا۔ فٹ پاتھ پر پہنچ کر دوڑنے کے انداز میں چلتا ہوا سڑک پر دیکھتا رہا کہ دوسری ٹیکسی نظر آئے گی تو میں بیٹھ کر ہائیڈ پارک جاؤں گا۔

میں نے ایک بلیک ہنڈا اکارڈ دیکھی جو جنرل اسٹور والی عمارت کے دوسرے کارنر سے گھوم کر آرہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے اپارٹمنٹ سے نکل کر ٹیکسی میں بیٹھ کر اس سیاہ ہنڈا اکارڈ کو کئی بار دیکھا تھا۔ اس کا نمبر بھی مجھے یاد ہوگیا تھا۔ وہ کار کبھی نظر آتی تھی اور کبھی ٹریفک کے ہجوم میں گم ہوجاتی تھی۔

میں نے دوسری ٹیکسی حاصل کرنے کے لیے سوچا' اس راستے کو پیدل کراس کرکے دوسری طرف جاؤں۔ اس طرح ٹیکسی مل سکتی تھی۔ میں سڑک پار کرنے کے لیے زیبرا کراسنگ کے پاس آکر ٹھہر گیا۔ اسی وقت وہ بلیک ہنڈا کارڈ میرے بالکل قریب آکر رک گئی۔ میں نے سوچ لیا۔ اگر اس کار میں میرے مخالفین ہیں اور کسی پلاننگ کے تحت میرے پیچھے رہے ہیں تو میں بھی انہیں کار سے نکال کر اپنے ہاتھوں کے لوہاری ہتھوڑے برسا کر وہیں فٹ پاتھ پر لٹا دوں گا۔

اس کار کے شیشے کلرڈ تھے۔ اندر بیٹھے ہوئے افراد باہر سے نظر نہیں آتے تھے۔ میں

نے گھور کر اس کار کو دیکھا۔ اگلی ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی کا شیشہ آہستہ آہستہ نیچے آنے لگا۔ شیشہ گہرے رنگ کا تھا۔ ایسا لگا گہری رات میں چاند طلوع ہو رہا ہو۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نہایت ہی گوری گوری گلابی سی حسین لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اسے دیکھتے ہی لندن شہر کی رونقیں بھول گیا۔ جیسا کہ میری عادت ہے' میں ہمیشہ.......... لڑکی سے بات کرتے ہوئے شرماتا ہوں۔ کسی حسینہ کو سر اٹھا کر نہیں دیکھتا لیکن ان لمحات میں شرمانا بھول گیا۔ میری نظریں ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے پیدا ہونے کے بعد پہلی بار حسن و جمال کی مورت دیکھ رہا ہوں۔

وہ مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ہائے! کچھ پریشان سے لگ رہے ہو۔ کیا میں تمہاری کوئی مدد کرسکتی ہوں؟“

”نن۔ نہیں۔ میں تو بس یونہی یہاں آکر یعنی کہ یہاں سے سڑک پار کرنے کے لیے کھڑا ہوا ہوں۔“

”تم ایک سڑک پار کرنا چاہتے ہوں۔ میں اس شہر کی تمام سڑکیں پار کرادوں گی۔ میری کار میں آسکتے ہو۔“

وہ کار میں تنہا تھی۔ میں نے باتوں کے دوران دیکھا تھا۔ آگے اور پیچھے کی سیٹوں پر کوئی نہیں تھا۔ وہ پاکستان نہیں تھا کہ کوئی لڑکی ملاقات کی ابتدا شرمانے سے کرتی۔ وہاں تو مرد و زن کے درمیان دوری نہیں تھی۔ کوئی بھی کسی کو لفٹ دے سکتا تھا اور وہ لفٹ دے رہی تھی۔ میں ہی احمقوں کی طرح شرما رہا تھا اور جھجک رہا تھا۔

اس نے اچانک ہی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا تعاقب کرنے والے اس جنرل اسٹور کے پچھلے دروازے پر آگئے ہیں۔ جلدی آؤ ورنہ وہ تمہیں دیکھ لیں گے۔“

یہ ایسی بات تھی کہ میں فوراً دوڑتا ہوا کار کے اگلے حصے کی طرف سے گھوم کر دروازہ کھول کر اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی پھر اسے اسی جنرل اسٹور کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”یہ کلرڈ شیشے ہیں۔ باہر سے تمہیں کوئی دیکھ نہیں سکے گا۔“

ہم اندر رہ کر باہر والوں کو دیکھ سکتے تھے۔ جنرل اسٹور کے پاس میرا تعاقب کرنے والے نظر نہیں آئے۔ کار آگے بڑھتی چلی گئی۔ میں نے کہا۔ ”وہاں تو کوئی میرا تعاقب کرنے والا نہیں تھا۔“

وہ ہنسنے لگی۔ میں نے ایک نسوانی ہنسی کے ترنم کو بھی پہلی بار محسوس کیا۔ وہ بولی ”میں بہت دیر سے دیکھ رہی تھی کہ کچھ لوگ ایک کار میں تمہارا پیچھا کر رہے تھے۔

میرے دل میں تجسس پیدا ہوا کہ تمہاری ایسی کیا اہمیت ہے کہ یوں تمہارا تعاقب کیا جارہا ہے۔ میں بھی تمہارا پیچھا کرنے لگی۔ تم ایک جنرل اسٹور میں گئے تو میں نے اپنے ملازم سے کہا کہ وہ جنرل اسٹور میں جا کر تم پر نظر رکھے اور مجھے موبائل فون پر اطلاع دیتا رہے۔"

اس نے کن انکھیوں سے مسکرا کر مجھے دیکھا پھر کہا۔ "بڑے سمجھ دار ہو۔ ملازم نے اطلاع دی کہ تم اگلے دروازے سے داخل ہو کر اس وسیع و عریض جنرل اسٹور کے اندر تیزی سے چلتے ہوئے پچھلے دروازے سے باہر جارہے ہو۔ یہ سنتے ہی میں تمہاری مدد کرنے کے لیے تمہارے پاس آگئی۔"

"اس شہر میں نہ جانے کتنے جرائم ہوتے ہیں۔ مختلف گروہ کے افراد ایک دوسرے کے تعاقب میں رہتے ہیں۔ کیا تم سب ہی کا پیچھا اس طرح کرتی ہو؟"

"نہیں' میں بے اختیار تمہارے پیچھے آئی ہوں بلکہ یہ کہوں گی کہ میں نہیں' میرا دل تمہارے پیچھے آیا ہے۔"

"میں نے سنا تھا کہ یورپ کی لڑکیاں بڑی بے باک ہوتی ہیں۔ کسی نہ کسی کو بوائے فرینڈ بناتی رہتی ہیں۔"

"میں یورپ کی بے باک لڑکی نہیں ہوں۔ ایک ہندوستانی ہوں۔ شرم و حیا ہمارا زیور ہے لیکن اس حد تک آزادانہ ذہن رکھتی ہوں کہ پہلی نظر میں کوئی دل کھینچ لے اور وہ بالکل اپنا لگے تو ایسے وقت شرمانا نہیں چاہیے۔ اپنے دل کی ترجمانی کرنا بے حیائی نہیں ہے۔"

"مم۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا.......... کہ مجھے کیا کہنا چاہیے؟"

"یہ تو کہہ سکتے ہو کہ میں نے دل کی بات کہہ کر صاف گوئی سے کام لیا جو کہا' وہ تمہیں اچھا نہیں لگا اور تم مجھے فلرٹ کرنے والی لگتی ہو۔"

"نن۔ نہیں۔ میں ایسا کیسے کہہ سکتا ہوں۔ سچی اور صاف بات کہنے والی لڑکیاں تو بہت اچھی اور صاف دل والی ہوتی ہیں.......... مگر مجھ میں ایسی کیا بات ہے؟ میں کوئی پاکستانی اور ہندوستانی فلموں کا ہیرو نہیں ہوں کہ تمہاری جیسی حسین لڑکی ایک نظر میں دل ہار جائے۔"

"اکثر پہلی نظر میں محبت ہوتی ہے۔ محبت کرنے کا کوئی کیلنڈر نہیں ہوتا کہ پیار کرنے کے لیے تاریخ مقرر کی جائے۔ اگر تم کوئی جیوتشی ہو تو گھر جا کر میری اور اپنی جنم کنڈلی دیکھ کر محبت کرنے کا کوئی اچھا سا مہورت نکالو۔"

"تم طعنے دے رہی ہو اور میں کہہ نہیں پارہا ہوں کہ یہ سب کچھ اچانک ایسے ہو رہا ہے کہ مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"تو پھر اسے اچانک نہ سمجھو۔ ہم رفتہ رفتہ ملتے رہیں گے پھر تین گھنٹے کی فلم کے آخری سین میں شادی کرلیں گے۔ تم جتنے فولادی پہاڑ دکھائی دیتے ہو' اتنے ہی بدحواس ہوجانے والے اناڑی ہو۔ مجھے بتاؤ کہاں جانا ہے۔ میں وہاں ڈراپ کردوں گی۔"

اس نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ میں نے کہا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں اناڑی بھی ہوں اور باتوں میں الجھ کر بھول گیا کہ مجھے ہائیڈ پارک جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی پچاس منٹ میں پہنچ جاؤ گے۔"

"تمہارے انداز سے پتا چلتا ہے' ناراض ہوگئی ہو؟"

"کیا میری ناراضگی سے تمہارا کچھ بگڑنے والا ہے؟"

"ہاں۔ کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ تم اتنی اچھی ہو کہ تمہیں ناراض کرنا جیسے گناہ کرنا ہے۔"

"میں تو ہندو ہوں۔ کیا تم مسلمان مولوی ہو؟ ایسے ماحول میں گناہ اور ثواب کی باتیں کررہے ہو۔"

"میں دراصل جو کہنا چاہتا ہوں' وہ کہہ نہیں پارہا ہوں۔ پتا نہیں یہ شاعر لوگ حسین اور جوان لڑکیوں کے بارے میں کیسے شاعری کرلیتے ہیں۔"

میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک حسین لڑکی مجھے جتنا حوصلہ دے رہی تھی' میں اتنا ہی حوصلہ ہار رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کہنا چاہیے۔ میں نے بڑی تکلیف سے کراہتے ہوئے پوچھا۔ "آہ! ہائیڈ پارک کب آئے گا؟"

"ابھی آدھا گھنٹا گزرا ہے۔ بیس منٹ کے بعد ہم وہاں پہنچیں گے۔"

"ہم؟ یعنی کہ تم بھی اس پارک میں چلوگی؟"

"تم کیا سمجھتے ہو' وہاں عورتوں کا جانا منع ہے؟ ہم اتنی دیر سے ایک دوسرے کے ساتھ شانہ بشانہ بیٹھے ہیں مگر تم نے ابھی تک نہ میرا نام پوچھا ہے اور نہ ہی اپنا نام بتایا ہے۔"

"میرا نام فرمان علی تاباں ہے۔"

"نام کے ساتھ ولدیت اور پتا ٹھکانا بھی بتایا جاتا ہے۔"

"مجھے باپ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ میں اپنی امی سے عبادت کی حد تک محبت کرتا ہوں۔ وہ عالمی شہرت یافتہ لیڈی سرجن ہیں۔ ان کا نام آمنہ خاتون ہے۔"

"یہ نام میں نے بہت سنا ہے۔ تم ایک عظیم ماں کے بیٹے ہو۔ اب میرے بارے میں سنو گے تو تمہیں دن میں تارے نظر آنے لگیں گے۔ باہر دیکھو' دن ہے ابھی شام کا اندھیرا نہیں پھیلا ہے۔"

میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں لڑکیوں کے معاملے میں شرمیلا ہوں لیکن خطرے کا ذرا سا بھی احساس ہو تو پھر پاس بیٹھی ہوئی حسین لڑکی لوہے کی سلاخ دکھائی دیتی ہے' جسے میں ایک جھٹکے سے موڑ سکتا ہوں اور توڑ سکتا ہوں۔

وہ بڑے اطمینان سے ڈرائیو کرتے ہوئے بولی۔ "میرا نام شلپا ہے۔ شلپا سنگھ اور میرے ڈیڈی کا نام ہے۔ شمشیر سنگھ کالیا جسے ساری دنیا ڈینجرس مین کہتی ہے۔"

میرے اندر جیسے طوفان اٹھا۔ شلپا جیسی حسینہ میرے لیے کچھ بھی نہیں تھی لیکن اس کے باپ کا نام سن کر میں نے دونوں مٹھیاں بھینچ لیں۔ میرے اندر مراد چنگیزی کی ہدایات گونج رہی تھیں' مرد وہی ہے جو شدید غصے کی حالت میں خود کو ٹھنڈا رکھنا جانتا ہے۔ جو غصہ برداشت نہ کرے' وہ جیتی ہوئی بازی بھی ہار جاتا ہے۔

میں چند لمحوں تک خاموش رہا۔ اچھا ہوا کہ میرے قریب شلپا تھی' اس کا باپ نہیں تھا اس لیے میں نے جلد ہی غصے پر قابو پالیا۔ وہ بولی۔ "چپ کیوں ہوگئے۔ ہائے دا وے میرے ڈیڈی کا نام سن کر اچھے اچھوں کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔"

میں نے اپنا ایک ہاتھ اس کے پیچھے سیٹ کی پشت پر رکھا۔ وہ بولی۔ "مجھے کسی طرح کا نقصان پہنچانے کی حماقت نہ کرنا۔ میں تمہیں بتا دوں کہ اس وقت تم بارود کے ڈھیر پر بیٹھے ہو۔ اس کار کے ایک خفیہ وائرلیس مائیک کے ذریعے ڈیڈی ہماری باتیں سن رہے ہیں اور وہ ہم سے پہلے ہائیڈ پارک پہنچ چکے ہوں گے۔ اس کار کے آگے پیچھے میرے مسلح گارڈز کی گاڑیاں ہیں۔ میں نے اب تک لمبی گفتگو کرکے یہ سمجھ لیا ہے کہ تم یہاں کے راستوں کو نہیں جانتے ہو۔ اسی لیے ایک گھنٹے سے ڈرائیو کرتے ہوئے لمبے راستوں سے تمہیں ہائیڈ پارک لے جا رہی ہوں۔"

"میری امی اور مراد چنگیزی نے مجھے سمجھایا تھا کہ جرائم کی دنیا میں پھونک پھونک کر قدم رکھو۔ نیند کے وقت اپنی آنکھوں کو سونا اور ذہن کو جاگتا رکھو اور کبھی اپنے سائے پر بھی بھروسا نہ کرو۔ ایسی نصیحتوں میں کتنے تجربات چھپے ہوئے ہیں' یہ ابھی معلوم ہوا۔ میں تمہاری باتوں سے بہل رہا تھا۔ اتنی دیر بعد معلوم ہوا کہ تم ایک کتے کی بیٹی ہو۔"

"یو شٹ اپ۔ میرے ڈیڈی کو گالی نہ دینا۔"

"میں یہاں خفیہ مائیک کے ذریعے اس کتے کو کتا کہہ رہا ہوں جو میری امی کو بد چلن

ثابت کرنے کے لیے میرے سوتیلے رشتے داروں کا ساتھ دیتا رہا۔ اس نے میری امی کی عزت کو خاک میں ملانے کے لیے دوبارہ انہیں ٹریپ کرنے کی کوشش کی لیکن مراد چنگیزی نے اسے میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ان دنوں میں بچہ تھا۔ آج اس کی موت کا فرشتہ جوان ہوگیا ہے۔"

"تعجب ہے۔ موت کے فرشتوں نے تمہیں چاروں طرف سے جکڑ رکھا ہے پھر بھی تم ڈینگیں مار رہے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس بند گاڑی میں مجھے یرغمال بنا کر ڈیڈی کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردو گے؟"

"میں کیا کروں گا' یہ بعد کی بات ہے۔ فی الحال اپنے باپ سے ایک بار بات کراؤ۔ میں سننا چاہتا ہوں کہ وہ کتنے سُروں میں بھونکتا ہے۔"

"تم بار بار میرے ڈیڈی کی انسلٹ کر رہے ہو لیکن مجھے سمجھایا گیا ہے کہ میرے مزاج کے خلاف کوئی بات ہو تو اسے برداشت کروں اور ایک بار تو وہ بھی تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

اس نے موبائل آن کرکے نمبر ڈائل کیے پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ "ہیلو ڈیڈ! میں بول رہی ہوں شلپا۔"

باپ کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "شلپا! میں اچانک پرابلم میں پڑ گیا ہوں۔ تمہارے ساتھ جتنے گارڈز ہیں' انہیں فوراً میری حفاظت کے لیے بھیجو۔ جلدی کرو۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔"

"میں انہیں بھیج رہی ہوں۔ اتنا تو بتا دیں پرابلم کیا ہے؟ میں ابھی آ رہی ہوں۔ ہیلو۔ ہیلو۔ ہیلو۔ ہیلو۔"

بار بار ہیلو کہنے کے بعد پتا چلا' دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کا باپ کسی بہت بڑی مصیبت میں پڑ گیا ہے۔

اس نے اپنے فون کے ذریعے آگے پیچھے آنے والے مسلح گارڈز کے سیکورٹی افسر سے کہا۔ "آپ دونوں گاڑیوں کے گارڈز کو لے کر فوراً ہائیڈ پارک جائیں۔ ڈیڈی کسی بڑی پرابلم میں ہیں۔ انہیں تم سب کی ضرورت ہے۔ ابھی جاؤ۔ شارٹ کٹ راستوں سے جاؤ۔ ہری اپ۔"

اس نے فون بند کرکے اپنے باپ کے کسی نامعلوم پرابلم کے بارے میں سوچنا چاہا۔ پھر ایک دم سے چونک کر مجھے دیکھا۔ باپ کی مصیبت اور پریشانی کے باعث وہ ذرا سی دیر کے لیے دنیا جہان کو بھول گئی تھی۔ میں بھی اس کے پریشان دماغ سے نکل گیا تھا۔ اب

مجھے دیکھ کر وہ بری طرح گھبرا گئی۔

میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ تم نے بڑی دیر سے سڑک کے کنارے گاڑی روکی ہوئی ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ زندگی کی گاڑی رکنے لگے تو انسان دوسری گاڑی چلانا بھول جاتا ہے۔"

وہ جلد سے جلد باپ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے جانا چاہتی تھی۔ اس نے کار اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی گھمائی۔ میں نے چابی کو گھما کر نکال لیا پھر کہا۔ "پہلے بتاؤ ہائیڈ پارک میں تقدیر تمہارے باپ کو کس طرح جوتے مار رہی ہے؟"

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا باپ کس مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔

بازی یوں پلٹ گئی تھی کہ شمشیر سنگھ کالیا اپنی کار ڈرائیو کرتا ہوا وائرلیس کے ایک خفیہ اسپیکر کے ذریعے اپنی بیٹی شلپا اور میری باتیں سن رہا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں ہائیڈ پارک جانا چاہتا ہوں تو وہ ہم سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔ ایک بار مراد چنگیزی نے مجھے اس کی اور اس کے روبوٹ باڈی گارڈ بھیما کی کئی تصویریں دکھائی تھیں۔ میں ان دونوں کو کہیں بھی دیکھ کر پہچان سکتا تھا۔

شمشیر سنگھ کالیا کے بھی بڑے وسیع ذرائع تھے۔ وہ اور بھیما بھی مجھے پہچانتے ہوں گے۔ لندن میں بھیما اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ کسی دوسرے ملک میں مصروف تھا۔ امی نے ایک بار فون کے ذریعے ان دونوں کو چیلنج کیا تھا کہ ان میں سے بھیما میرے ہاتھوں مارا جائے گا اور شمشیر سنگھ کالیا کو میں بری طرح زخمی کرکے اسے امی کے قدموں میں گراؤں گا اور وہ زندگی کی بھیک مانگتا ہوا اس سچائی کا اعتراف کرے گا کہ میری امی ہمیشہ پاک دامن رہیں۔ اس نے میرے سوتیلے رشتے داروں سے مل کر انہیں بد چلن ثابت کرنے کی کوششیں کی تھیں۔

اب شمشیر سنگھ کالیا امی کے چیلنج کا جواب دینے کے لیے مجھ سے پہلے ہائیڈ پارک پہنچ گیا تھا۔ وہ مجھے گولی مار کر میری لاش امی کے پاس پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ ایسا مراد چنگیزی کی موجودگی میں نہیں کرسکتا تھا۔ لہٰذا مجھے پھانسنے کے لیے اس نے اپنی بیٹی کے حسن کا جال پھینکا تھا۔ شلپا مجھے تنہا دیکھ کر حسین چال بازی سے اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔

ایسے وقت ہائیڈ پارک ایک شکار گاہ بن گئی تھی۔ پہلے تو میں امیر حمزہ کو اور امیر حمزہ مجھے شکار کرنے آرہا تھا۔ یہ ہنٹنگ گیم شروع ہونے سے پہلے شمشیر سنگھ کالیا بھی پارک میں پہنچ گیا تھا ابھی میں وہاں نہیں پہنچا تھا مگر پہنچنے والا تھا۔ میں ریڈی میڈ میک اپ کے ذریعے اپنے چہرے پر تبدیلی کرچکا تھا تاکہ امیر حمزہ کے ساتھ انیلا ہو تو مجھے پہچان نہ سکے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ ہماری دشمنی کی وجہ صرف وہ معاہدے والا لفافہ تھا۔ امیر حمزہ کو یقین تھا کہ میں نے وہ لفافہ خفیہ ہاتھ تک پہنچا دیا ہے۔

میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنے ساتھ انیلا کو ہائیڈ پارک میں لائے لیکن وہ تنہا آیا تھا۔ اس کے جاں نثار بھی تھے جو پارک میں مختلف مقامات پر مجھے تلاش کر رہے تھے۔ وہ سب مجھے قد' جسامت اور ایک پاکستانی کی حیثیت سے پہچان سکتے تھے۔

میں نے امیر حمزہ کو دیکھا تھا لیکن وہ بھی میک اپ میں ہوگا۔ ابھی میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کس طرح پہچان پاؤں گا۔ پہچان کا ایک آخری راستہ یہ تھا کہ امیر حمزہ مجھے پہچان کر حملہ کرے۔ اس کے بعد فیصلہ ہوگا کہ مرد میداں کون ہے؟

امیر حمزہ کے خیال کے مطابق ایک پاکستانی یا کوئی بھی مسلمان وہاں کے کسی اوپن ریستوران یا لائٹ ریفریش منٹ کی دکانوں میں اس لیے نہیں جائے گا کہ وہاں سور جیسے حرام جانوروں کی ڈشیں تیار ہوتی تھیں۔ کسی بار یا پب میں بھی شراب اور بیئر کی فروخت ہوتی ہے۔ میں ٹھنڈی بوتل' جوس یا کافی وغیرہ پینے کی جگہ پر پایا جاسکتا تھا۔ وہ مجھے تلاش کرتا ہوا ایسی ہی ایک جگہ کافی پینے کے لیے آیا۔ سیلف سروس کے طور پر بل ادا کرکے خود ہی کافی کا مگ لے کر ایک میز کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک ایک گھونٹ پی کر کبھی ادھر کبھی ادھر متلاشی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ایسے وقت شمشیر سنگھ کالیا ایک ٹرے میں ویجیٹیبل سینڈوچز اور کافی لے کر اس کی میز کے دوسری طرف آکر بولا۔ "اگر تم اکیلے ہو تو کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"

امیر حمزہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر کہا۔ "ضرور بیٹھ سکتے ہو۔ میں بالکل تنہا ہوں۔"

امیر حمزہ اس کی آواز سن کر چونک گیا تھا۔ اس کی یادداشت غضب کی تھی۔ اس نے سر جھکا کر کافی کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے آنکھیں بند کیں۔ اس کی بند آنکھوں کے پیچھے تقریباً پندرہ برس پہلے آرمی کا ایک میجر اس سے کہہ رہا تھا۔

"حمزہ! یہ ٹیپ سنو۔ شمشیر سنگھ کالیا کی کوئی تصویر ہاتھ نہیں لگی۔ اس کی آواز کا ٹیپ ہمیں ملا ہے' اسے سنو۔"

ایک ٹیپ ریکارڈر کو آن کیا گیا۔ اس میں سے ایک شخص کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ پندرہ برس پہلے پاکستان میں ہیروئن کا کاروبار ابتدائی مراحل میں تھا۔ اس کی اسمگلنگ کے نئے نئے ہتھکنڈے آزمائے جارہے تھے۔ کلاشنکوف کلچر شروع ہورہا تھا۔ شمشیر سنگھ کالیا صوبہ سرحد کے ایک سردار سے اسی موضوع پر گفتگو کررہا تھا۔

ان کی گفتگو ختم ہونے کے بعد میجر نے کہا۔ "حمزہ! یہ کالیا کئی بار ہندوستان سے ہمارے ملک میں آچکا ہے۔ بھیس بدلنے اور آواز بدلنے میں مہارت رکھتا ہے' اس لیے کبھی ہماری گرفت میں نہیں آیا۔"

امیر حمزہ نے کہا۔ "سر! بھیس بدلنے والے کبھی اپنے اصلی چہرے کی تصویریں نہیں اتارتے۔ اس ٹیپ میں وہ آواز بدل کر بھرائی ہوئی آواز میں بول رہا ہے لیکن کبھی مجھ سے سامنا ہوگا تو میں اس کی گفتگو سے اسے پہچان لوں گا۔"

"جب یہ آواز بدل کر بول رہا ہے تو اسے کیسے پہچانو گے؟"

"سر! ویسے تو یہ بڑی روانی سے بول رہا ہے لیکن اس کی گفتگو میں ایک عیب ہے۔ یہ حرف "س" کو دوبار بولتا ہے جیسے سسوری' سسامان' سسائیکل وغیرہ لیکن یہی حرف "س" لفظ کے درمیان آئے تو اسے دوبار نہیں ایک ہی بار بولتا ہے۔ جیسے اسمگلنگ' برسات وغیرہ۔ آپ دوبارہ ٹیپ چلا کر اس کی یہ کمزوری نوٹ کرسکتے ہیں۔"

یہ پندرہ برس پہلے کی بات تھی۔ امیر حمزہ نے کافی کا ایک اور گھونٹ پی کے شمشیر سنگھ کالیا کو دیکھا۔ اس نے ابھی ٹرے میں سینڈوچ اور کافی اٹھا کر اس کے سامنے آکر پوچھا تھا۔ "اگر تم یہاں اکیلے ہو تو میں یہاں بیٹھ سسکتا ہوں۔"

اس نے "سسکتا" کے "س" کو دوبار ادا کیا تھا اسی لیے امیر حمزہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا پھر اس نے ٹرے کو دیکھا جس میں سبزی والے سینڈوچ رکھے ہوئے تھے۔ اس سے یہ خیال قائم کیا جاسکتا تھا کہ وہ ہندو ہے۔ گوشت کے بجائے سبزی کے سینڈوچ کھا رہا ہے۔ اس نے کھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم پاکستانی ہو؟"

"ہاں میں پاکستانی ہوں اور تم ہندوستانی؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں سمجھ گیا۔ یہ ویجی ٹیبل سینڈوچز دیکھ کر مجھے ہندو سمجھ رہے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بے شمار ہندو گوشت کھاتے ہیں پھر دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جرائم کو پروان چڑھانے والا تو ضرور گوشت کھاتا ہے۔"

اس نے چونک کر سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا پھر پوچھا۔ "کسے کہہ رہے ہو۔ کون جرائم کو پروان چڑھاتا ہے؟"

"شمشیر سنگھ کالیا عرف ڈینجرس مین۔"

وہ ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہوا پھر بیٹھ گیا۔ فوراً ہی ریوالور نکال کر ہاتھ میز کے نیچے لے جاکر بولا۔ "کون ہو تم؟"

"گولی چلاؤ گے تو فائر کی آواز بلند ہوگی۔ یہاں سادہ لباس میں پولیس والے ہیں۔ تمہیں ریوالور میں سائلنسر لگانا چاہیے تھا۔"

"میں سادہ لباس والوں سے نمٹ لوں گا۔ تم بتاؤ کون ہو اور مجھے کس طرح پہچان گئے ہو؟"

"میں جو بھی ہوں۔ تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ڈینجرس مین نام رکھنے سے خطرناک نہیں بن جاؤ گے۔ دیکھو ڈینجرس مین ایسے ہوتے ہیں۔"

یہ کہتے ہی اس نے ایک انگلی سے اپنی پیشانی کھجائی۔ دو یا تین سیکنڈ کے بعد ہی شمشیر سنگھ کالیا کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ ریوالور ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر آگیا۔ اس کے ہاتھ کی ہتھیلی کی پشت سے خون بہہ رہا تھا ایک گولی اس کو چھیلتی ہوئی گزر گئی تھی۔

امیر حمزہ نے کہا۔ "میرے دونوں ہاتھ میز پر ہیں۔ کہیں سے فائرنگ بھی ہوئی اور کسی نے آواز بھی نہیں سنی۔ میری کافی ابھی گرم ہے۔ تمہارے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ بولو ہم میں ڈینجرس مین کون ہے؟"

"میں سمجھ گیا۔ تم پولیس والے ہو۔"

"پولیس والوں کی آنکھوں میں ایکسرے کی یہ خاصیت نہیں کہ وہ اندر چھپے ہوئے کالیا کی کالک کو باہر لے آئیں۔"

"اگر پولیس والے نہیں ہو تو پھر ہم دوست بن سسکتے ہیں۔"

"میں تو تم جیسوں سے دوستی کرنے کے لیے ہی پیدا ہوا ہوں۔ مجھ سے دوستی کرنے والوں کو موت نہیں آتی۔"

وہ خوش ہوگیا۔ امیر حمزہ نے کہا۔ "میں دوستی کروں گا۔ تم زندہ رہو گے لیکن دن رات موت کے لیے ترستے رہو گے۔"

اس کی خوشی بجھ گئی۔ ایک جاں نثار قریب آیا۔ امیر حمزہ نے کہا۔ "ریوالور اٹھالو۔ اسے یہیں بیٹھنے دو۔ یہ فرمان علی نہیں ہے۔ ہم اسے شکار کرنے آئے تھے۔ یہ مرغا پھنس گیا۔ تم جاؤ۔"

وہ میز کے نیچے سے ریوالور اٹھا کر چلا گیا۔ شمشیر سنگھ کالیا نے پوچھا۔ "تم کس فرمان علی کی بات کر رہے ہو؟ میں بھی ایک فرمان علی کو شکار کرنے آیا ہوں مگر تم راستے کی دیوار بن گئے۔"

"اچھا تو تمہارے بھی ٹارگٹ کا نام فرمان علی ہے؟ کیا دشمنی ہے اس سے؟"

"دشمنی تو اس کی ماں سے تھی۔ اس نے چیلنج کیا تھا کہ اس کا......... بیٹا مجھے بری

طرح زخمی کرکے اس کے قدموں میں لے جائے گا۔"

امیر حمزہ نے کہا۔ "جب ایک ماں نے چیلنج کیا ہے تو اس چیلنج کے پیچھے ممتا کا تقدس ضرور ہوگا۔ کون ہے وہ؟ کیا نام ہے اس کا؟"

"آمنہ۔ ایک لیڈی سرجن ہے۔"

"کیا؟" وہ کرسی پر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ "تم عالمی شہرت یافتہ لیڈی سرجن آمنہ خاتون کی بات کررہے ہو جو لاہور میں رہتی ہیں؟"

"ہاں۔ فرمان علی اسی کا بیٹا ہے۔ اگر اس کا محافظ مراد چنگیزی اس کے ساتھ یہاں نہ ہوتا تو ہم فرمان کو بہت پہلے ہی نرک میں پہنچا دیتے۔"

امیر حمزہ حیرانی سے زیر لب بڑبڑایا۔ "مراد چنگیزی؟"

پھر وہ سوچنے لگا۔ "یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ جسے میں خفیہ ہاتھ کا ایک نیا رنگروٹ سمجھ رہا تھا' وہ ایک عظیم خاتون کا بیٹا ہے۔ میں انہیں غلط سمجھ رہا تھا۔ حالانکہ فون پر انہوں نے اپنی طرف سے صفائی پیش کی تھی مگر انیلا کی طرح میں بھی یہ سمجھتا رہا کہ وہ معاہدے والا لفافہ خفیہ ہاتھ تک پہنچانے کے لیے ان کا آلۂ کار بنا ہوا تھا۔"

کالیا نے کہا۔ "تم میری باتوں سے کچھ الجھ گئے ہو۔"

اس نے خیالات سے چونک کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا تم فرمان علی کو اس کے موجودہ چہرے اور حلئے سے پہچانتے ہو؟"

"اگر تنہا آتا تو شاید نہ پہچان سکتا۔ میری بیٹی اسے ٹریپ کرکے لا رہی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ فرمان علی نے اپنے چہرے میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔"

"کیا فرمان علی جانتا ہے کہ اسے ٹریپ کیا جارہا ہے؟"

"ہاں۔ میری بیٹی نے اپنا اور میرا نام اسے بتایا ہے۔ میری بیٹی کی کار کے آگے پیچھے مسلح گارڈز کی گاڑیاں ہیں۔ فرمان فرار ہونے کی جرأت نہیں کرسکے گا۔"

امیر حمزہ نے کہا۔ "اگر تمہارے پاس موبائل فون ہے تو اسے نکالو اور اپنی بیٹی سے رابطہ کرو۔ اس سے کہو تم اچانک پرابلم میں پڑگئے ہو۔ وہ وقت ضائع کیے بغیر دونوں گاڑیوں کے مسلح گارڈز کو فوراً یہاں بھیج دے۔ تمہیں ان کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تمام گارڈز یہاں آجائیں گے تو میری بیٹی تنہا فرمان کے پاس رہ جائے گی۔ اس کی جان خطرے میں ہوگی۔"

"اپنی بیٹی کی بات نہ کرو۔ ایک عظیم ماں کے بیٹے کی حفاظت کرنا میرا پہلا فرض ہے۔ جو کہہ رہا ہوں' اس پر فوراً عمل کرو ورنہ اس بار بے آواز گولی تمہارے سینے کے

پار ہوگی۔"

اس نے مجبور ہوکر موبائل فون نکالا۔ اسی وقت فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے فون کو آن کرکے کان سے لگایا پھر بیٹی کی آواز سن کر وہی باتیں کہیں' جو امیر حمزہ کہہ چکا تھا۔ جب اس نے فون بند کیا تو امیر حمزہ نے اپنے موبائل کے ذریعے پولیس اور انٹیلی جنس کے ان افسران سے رابطہ کیا' جو اس پارک میں مختلف جگہ اپنی اپنی ایک پولیس ٹیم بناکر موجود تھے۔ اس نے انہیں بتایا کہ دو گاڑیوں میں مسلح گارڈز آرہے ہیں۔ ان کے پاس اسلحے کا لائسنس ہوگا۔ اس کے باوجود ان سے اسلحہ لے کر قریبی پولیس اسٹیشن میں جمع کردیا جائے اور آپ میں سے کسی ایک افسر کی ٹیم ڈولی اسنیک بار کے سامنے آجائے۔ میں یہاں موجود ہوں۔"

شمشیر سنگھ کالیا تمام باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "تم یہاں کے افسروں کو حکم دے رہے ہو اور وہ عمل کررہے ہیں پھر بھی کہتے ہو کہ پولیس والے نہیں ہو۔"

"میں نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ میرا تعلق قانون کے محافظوں کے کسی بھی شعبے سے نہیں ہے۔ نہ پولیس میں ہوں' نہ فوجی اور نہ انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہوں۔ اس کے باوجود لندن اور اسکاٹ لینڈ کے سراغ رساں اور پولیس والے مجھ سے تعاون حاصل کرتے ہیں۔ وہ میری نشان دہی پر اعتماد کرکے انڈر ورلڈ کے گاڈ فادر شمشیر سنگھ کالیا کو ہتھکڑیاں پہنا کر عدالت میں پہنچائیں گے۔"

"یہ میرے لیے نئی عجیب اور ناقابل اعتماد بات ہے کہ تمہارا لاء اور کرمنلز سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے باوجود تمہاری پہنچ اسکاٹ لینڈ یارڈ تک ہے۔ پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ اپنے بارے میں سچ بتاؤ۔"

"کچھ عرصے پہلے....... انٹیلی جنس کیپٹن امیر حمزہ کو افغانستان میں ہلاک کیا گیا تھا۔ وہی مُردہ کیپٹن امیر حمزہ تمہارے سامنے زندہ بیٹھا ہے۔"

وہ چونک کر بولا۔ "تم؟ کیپٹن امیر حمزہ ہو؟"

"ہاں۔ میں نے اسکاٹ لینڈ یارڈ میں رہ کر تربیت حاصل کی تھی۔ لندن انٹیلی جنس بیورو کے سراغ رسانوں کے ساتھ کچھ عرصے تک کام کرتا رہا۔ تب سے اب تک یہاں غیر سرکاری سراغ رساں ہوں۔ وہ مجھ سے تعاون حاصل کرتے ہیں اور میں ان کے تعاون سے تمہارے جیسے گاڈ فادر کے بارہ بجا دیتا ہوں۔"

شمشیر سنگھ کالیا نے مسکرا کر کہا۔ "تمہیں ایک معمولی افسر وغیرہ سمجھ کر تمہاری ان بچکانہ کارروائیوں کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ میرے سامنے ایک خطرناک

شخص بیٹھا ہوا ہے تو میں اپنا اتنا وقت ضائع نہ کرتا تم سے پنجہ لڑائے بغیر یہاں سے جا چکا ہوتا۔"

"کوئی بات نہیں اب اپنے ہتھکنڈے آزماؤ اور یہاں سے جاسکتے ہو تو جاؤ۔"

"اب کیا جانا ہے اور کیا آنا ہے۔ اپنی گرفتاری سے پہلے بیٹی سے دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اجازت دیں گے؟"

"بے شک تم اپنی بیٹی سے بات کرسکتے ہو۔"

اس نے موبائل کے ذریعے شلپا سے رابطہ کیا۔ "ہیلو بیٹی' کیسی ہو اور کہاں ہو؟"

"ڈیڈی! میں آپ کے پاس آنا چاہتی تھی لیکن فرمان نے کار کی چابی چھین لی ہے۔"

"اس نے اچھا ہی کیا' تمہیں یہاں آنے سے روک دیا۔ مجھے اتنی دیر بعد پتا چلا ہے کہ مجھے اور میرے مسلح گارڈز کو گرفتار کرنے والا کیپٹن امیر حمزہ ہے۔ اب تو بڑے زبردست ٹکراؤ والی بات سامنے آئی ہے۔ ہماری ناک نہیں کٹنا چاہیے اور نہ ہی تمہارے باپ کے ہاتھوں میں کسی کو ہتھکڑی پہنانے کا موقع دینا چاہیے۔"

"میں بہت کچھ کرسکتی ہوں۔ کیا آپ گائیڈ کرنا چاہیں گے۔"

"ہاں' ہمارے یہ کیپٹن صاحب کو فرمان علی کی زندگی بہت عزیز ہے۔ یہ فرمان علی کو ہر حال میں زندہ و سلامت دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم اپنی زبان سے بتادو کہ فرمان کس طرح سلامت رہے گا۔"

میں فون پر بات کرنے والی شلپا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ذرا وقفے سے بولی۔ "ہیلو کیپٹن امیر حمزہ صاحب! آپ کے بڑے چرچے سنے ہیں۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ میرے باپ کو ہتھکڑیاں پہنا سکتے ہیں۔ وہ ہتھکڑیاں ان کے قریب لے جانے سے پہلے سن لیں۔ اس وقت فرمان کے ساتھ بلیک ہنڈا اکارڈ میں ہوں۔ اس کے دروازے اور کھڑکیاں خود کار ہیں۔ ایک ٹیکنیک کے ذریعے میں ہی انہیں کھول سکتی ہوں۔ اگر فرمان مجھ پر کسی طرح کا جبر کرے گا یا کھڑکیوں اور ونڈ اسکرین کے کلرڈ شیشے توڑ کر باہر جانا چاہے گا تو شیشوں کے ٹوٹنے سے پہلے ہی اس کار میں ایک زبردست دھماکہ ہوگا۔ پھر میرے اور فرمان کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ ہم رہیں گے' نہ کار رہے گی۔"

وہ خاموش ہو کر سننے لگی پھر ہنستے ہوئے بولی۔ "میں نے فرمان سے پہلے ہی کہا تھا کہ مجھے کسی طرح کا نقصان پہنچانے کی حماقت نہ کرنا۔ اس وقت یہ بارود کے ڈھیر پر بیٹھا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ فرمان کے ساتھ میں بھی بلاسٹنگ میں ماری جاؤں گی۔ جب جرائم سے بھرپور دنیا میں سانس لے رہے ہیں تو پھر مرنے سے کیا ڈرنا؟"

اس نے خاموش ہو کر امیر حمزہ کی بات سنی پھر کہا۔ "زیادہ بحث کرنے سے وقت ضائع ہوگا۔ میں صرف آدھے گھنٹے تک اپنے ڈیڈی کی باعزت واپسی کا انتظار کروں گی۔ اگر وہ مقررہ وقت تک میرے پاس نہ آئے تو اس راستے سے گزرنے والے' قیامت کا منظر دیکھیں گے۔ آپ کو یقین ہو جائے گا کہ ایک بیٹی نے اپنے باپ کی خاطر اپنے جسم کا قیمہ اور اپنی ہڈیوں کا سُرمہ بنا ڈالا ہے۔ کم آن میری گھڑی سے وقت ملائیں اس وقت چھ بج کر پندرہ منٹ ہوئے ہیں۔ ٹھیک چھ بج کر پینتالیس منٹ پر نہ ہم رہیں گے نہ گاڑی رہے گی۔ میں فخر سے کہہ رہی ہوں' مر جاؤں گی مگر باپ کا جھکا ہوا سر نہیں دیکھوں گی۔ دیٹس آل!"

اس نے فون بند کر دیا۔ میں اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ حالات یہی بتا رہے تھے کہ واقعی میرے ساتھ وہ بھی بارود کے ڈھیر پر بیٹھی ہوئی ہے۔
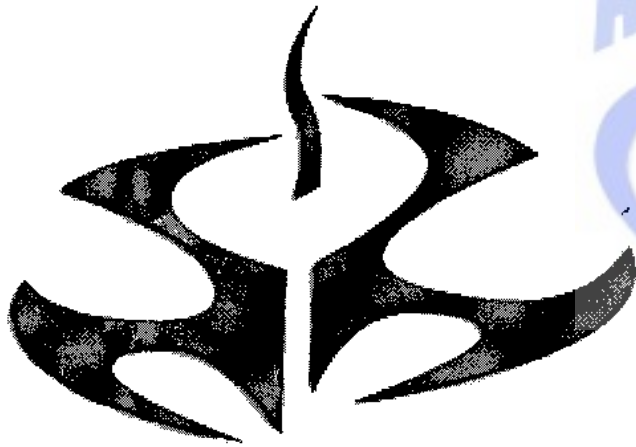
☆=======☆======☆

جو بات توقع کے خلاف ہو' وہ ذہنی کرب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ حسن اپنی سوغات پیش کرنے کی آس دلائے اور عین وقت پر دغا دے جائے تو وہ جذباتی انداز کا ذہنی کرب ہوتا ہے۔ اگر بیمار کو زندگی ملنے والی ہو اور ڈاکٹر مسیحائی نہ کر رہا ہو تو وہ بیمار بھی ذہنی عذاب جھیلنے لگتا ہے۔

یہی حال میرا تھا۔ پہلے شلپا جیسی حسینہ مجھ پر ایسے واری جاتی رہی جیسے حسن و شباب کی سوغات پیش کرنے والی ہو۔ پھر ذہن کو ایک دھچکا سا لگا' جب اس نے بتایا کہ وہ میرے اور امی کے دشمن شمشیر سنگھ کالیا کی بیٹی ہے اور مجھے ٹریپ کرکے لے جارہی ہے۔

پھر میں ایک اور ذہنی کرب میں مبتلا ہوا کہ جس جدید ہنڈا اکارڈ کے اندر اس کے ساتھ بیٹھا ہوں' اس کے دروازے اور کھڑکیاں خود کار ہیں اور انہیں ایک مخصوص تکنیک سے کھولا جاتا ہے۔ پھر اس کار کے کسی حصے سے اتنا پاور فل بم منسلک ہے جو آدھے گھنٹے میں پھٹنے والا ہے۔

شلپا نے چھ بج کر پندرہ منٹ پر موبائل فون کے ذریعے امیر حمزہ کو دھمکی دی تھی کہ اس کے باپ شمشیر سنگھ کالیا کو آدھے گھنٹے کے اندر پولیس کی گرفت سے نکل کر بیٹی کے پاس نہ آنے دیا گیا تو وہ چھ بج کر پینتالیس منٹ پر ایسا دھماکا کرے گی کہ اس کار کے ساتھ میرے اور خود اس کے جسم کے پرخچے اُڑ جائیں گے۔

وہ باپ کو رہائی دلانے کی خاطر اپنی جان دینا اور میری جان لینا چاہتی تھی جبکہ امیر حمزہ میری زندگی اور سلامتی چاہتا تھا۔

شلپا اس کار کو بم سے اُڑانے اور میرے ساتھ اپنی جان دینے کے سلسلے میں سچ مچ دھمکی دے رہی تھی یا قانون کے محافظوں کو ذہنی کرب میں مبتلا کر رہی تھی؟ حقیقت کیا تھی؟ کوئی اس کے دماغ میں گھس کر اس کے اصل ارادے کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔

لیکن دنیا کے تمام قوانین انسانی سلامتی کے لیے ہیں۔ لندن کی پولیس بھی یہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اور شلپا مارے جائیں۔ وہ ہم دونوں کی سلامتی کے لیے' دو انسانوں کی جان بچانے کے لیے ایک مجرم کو رہا کر سکتے تھے۔

میں اس بات پر حیران تھا کہ جو امیر حمزہ میرا جانی دشمن ہے اور مجھ سے مقابلہ کرنے

ہائیڈ پارک میں آیا تھا' وہ اچانک کیوں بدل گیا ہے؟ میری سلامتی کیوں چاہتا ہے؟ کیا اس لیے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے مجھے ہلاک کرنا چاہتا ہے؟ لہٰذا کسی اور طرح سے میرا مرنا گوارا نہیں کررہا ہے یا وہ مجھے زندہ رکھ کر یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اس خفیہ معاہدے والے لفافے کو میں نے کہاں پہنچایا ہے؟

مراد چنگیزی نے مجھے سمجھایا تھا کہ کبھی اپنے سائے پر بھی بھروسا نہ کرنا۔ میں اپنے استاد کے سبق کے مطابق امیر حمزہ پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا اور منفی انداز میں یہ سمجھ لیا کہ وہ خاص مقاصد حاصل کرنے کے لیے میری سلامتی چاہتا ہے۔

لندن انٹیلی جنس بیورو کے چیف نے فون کے ذریعے شلپا سے کہا۔ "ہم نہیں جانتے کہ تم فرمان علی کے ساتھ اپنی کار میں بم بلاسٹنگ میں مرنے کی بات کس حد تک درست کہہ رہی ہو؟ ہم بم کی موجودگی کا یقین کرنے اپنے ماہرین کو بھیجیں گے تو تم کسی کو کار کے قریب نہیں آنے دو گی۔ ان کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی کار کو بلاسٹ کر دو گی۔"

شلپا نے کہا۔ "آپ نادانوں جیسی باتیں کررہے ہیں۔ جبکہ میں اپنے ڈیڈی کو اس کار میں بلا کر خود اس کار سے باہر آکر ڈیڈی کو یہاں سے جانے دوں گی اور اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دوں گی۔"

"ہم تمہارے ساتھ فرمان کو بھی زندہ سلامت یہاں سے لے جانا چاہتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے ڈیڈی کو گرفتار کرکے نہیں لے جائیں گے۔"

"سوری۔ میرے ڈیڈی یہاں بالکل تنہا آئیں گے۔ اس وقت دور دور تک پولیس والوں کو نظر نہیں آنا چاہیے۔ مجھ سے کوئی چالاکی نہ کی جائے۔"

شلپا نے فون بند کر دیا۔ میں نے کہا۔ "تم اپنے ڈیڈی کو یہاں بلا کر مجھے قیدی بنا کر لے جانا چاہتی ہو۔ بے چارے پولیس والے بم بلاسٹنگ کے خوف سے تمہارا راستہ نہیں روکیں گے لیکن وہ بات تم نہیں جانتی ہو' جو میں کرنے والا ہوں۔"

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ "کیا کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے اس کی کلائی کو دیکھ کر کہا۔ "گھڑی بتا رہی ہے کہ ابھی دس منٹ گزرے ہیں۔ تم نے اپنے باپ کی واپسی کے لیے آدھے گھنٹے کا وقت دیا ہے۔ یعنی تم بیس منٹ گزرنے کے بعد دھماکا کرو گی۔ میں تمہارے مقررہ وقت سے دو منٹ پہلے نکل جاؤں گا اور یہ میں سچ نہیں کہہ رہا ہوں۔"

"کیا مجھے نادان بچی سمجھ کر الٹی سیدھی باتیں کررہے ہو؟ دو منٹ پہلے یہاں سے نکلنے کی بات بھی کررہے ہو اور اپنے اس دعوے کو جھوٹ بھی کہہ رہے ہو۔"

"سچ کیا ہے' یہ تمہارے مقررہ وقت سے ایک منٹ پہلے بتاؤں گا۔"

"میں تم سے کچھ سننا نہیں چاہتی۔"

"سننا تو پڑے گا۔ میں تمہارے پیچھے نہیں آیا تھا' تم نے میرا پیچھا کیا۔ مجھے لفٹ دی' اس کار میں اپنے برابر بٹھایا۔ میں زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کے ساتھ بند کار میں ہوں اور تم نہ جانے کتنوں کے ساتھ بند کمروں میں رہ چکی ہو۔"

"شٹ اپ۔ آج تک میری زندگی میں کوئی مرد نہیں آیا ہے۔"

"کیا تمہارا باپ مرد نہیں ہے؟"

"یو نان سینس۔ میں بند کمرے کی بات کررہی ہوں۔ تم زبردست اداکار ہو۔ جب میں تم سے رومانی گفتگو کررہی تھی تو تم لڑکیوں کی طرح شرما رہے تھے اور اب مجھ سے بدمعاشی کی باتیں کررہے ہو۔"

"شریف زادیوں کے سامنے آج بھی میری نظریں جھک جاتی ہیں اور میں ان سے کچھ کہہ نہیں پاتا ہوں۔ میں تمہیں بھی شریف زادی سمجھ کر شرما رہا تھا' جھجک رہا تھا۔"

"کیا اب میں شریف زادی نہیں ہوں؟"

"توبہ کرو۔ تمہارا باپ' بیٹی کا دلال ہے' اس نے مجھے پھانسنے کے لیے تمہارے حسن وشباب کا چارا ڈالا ہے۔ اتنی ٹھوس حقیقت کو دیکھتے ہوئے کوئی تمہارے باپ کو شریف اور تمہیں شریف زادی نہیں کہے گا۔"

اس نے مجھے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "کوئی بھی کنواری لڑکی یہ تہمت برداشت نہیں کرے گی کہ وہ باپ کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے اپنا کنوارا پن کھوچکی ہے۔ میں اپنے ڈیڈی کی ایک ہی اولاد ہوں اس لیے ان کے معاملات میں ملوث رہ کر خطرناک مجرموں سے نمٹنے کے ہتھکنڈے سیکھتی رہتی ہوں۔ اس وقت بھی تم دیکھ رہے ہو کہ میں ایک محبت کرنے والی شریف زادی کی طرح ڈیڈی کو بچانے کے لیے مرنے کو تیار بیٹھی ہوں۔ تم مجھے مکار اور شیطان کی اولاد کہہ لو مگر میری بے عزتی نہ کرو۔"

"میں تمہارے کردار کے بارے میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں لیکن تمہارے ڈیڈی یہ کیسے برداشت کررہے ہیں کہ مقررہ وقت پر بم پھٹے اور ایک پیار کرنے والی بیٹی کے جسم کے چیتھڑے اُڑ جائیں؟"

"جب تمہیں کسی سے محبت ہوگی تو میری یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ پیار کرنے والے قربانی دیتے ہیں۔ یہ حساب نہیں کرتے کہ اس کا پیارا اس کے لیے قربانی دیتا ہے یا نہیں؟ میری زندگی میں میرے ڈیڈی ہی ایک میرے پیارے ہیں۔ میں ان سے پیار کرتی

ہوں' پیار کا انعام نہیں چاہتی۔"

میں نے اس کی باتوں سے متاثر ہوکر بڑی لگن سے اسے دیکھا پھر کہا۔ "مجھے یہ سبق پڑھایا گیا ہے کہ اپنے سائے پر بھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے اور دل کی گہرائیوں سے بولنے والے کی بات کا بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ انسان دل کی گہرائیوں سچ بولتا ہے تو دل کی گہرائیوں سے جھوٹ بھی بولتا ہے اور فریب کو اپنی فطرت بنا لیتا ہے۔ ویسے ابھی تمہاری باتوں نے مجھے متاثر کیا ہے۔ آئندہ کوئی دوسرا دھوکا کھانے تک میں ایک باپ کے لیے تمہارے جذبات کی قدر کروں گا اور تمہاری عزت بھی کرتا رہوں گا۔"

وہ گھور کر بولی۔ "دھماکا ہونے میں صرف آٹھ منٹ رہ گئے ہیں۔ ہم مرنے والے ہیں اور تم آئندہ میری قدر کرنے اور عزت کرنے کی بات کررہے ہو۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں اس ماں کا بیٹا ہوں' جو دم توڑتے ہوئے مریضوں کو زندگی دیتی ہے۔ میری امی کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کا مریض طبعی عمر تک زندہ رہے۔ میں اپنی ماں کا بیٹا ہوں۔ تمہیں طبعی عمر تک زندہ رکھنے کے لیے یہاں ہونے والے بم دھماکے کی حرام موت سے بچالوں گا۔"

"کیا تم کوئی فلمی معجزہ دکھاؤ گے۔ جہاں موت مقدر بن چکی ہے' وہاں سے ہیروئن کو دور لے جاکر حرام موت سے بچاؤ گے؟"

"میں تھوڑی دیر پہلے کہہ چکا ہوں کہ جو مجھے کرنا ہے' وہ مقررہ وقت سے ایک یا دو منٹ پہلے بتاؤں گا۔ گھڑی دیکھو' آدھا منٹ اور گزر چکا ہے۔ ساڑھے سات منٹ رہ گئے ہیں۔"

"کیا ضروری ہے کہ جو منصوبہ تم نے بنایا ہے' اس میں تمہیں کامیابی ہو؟"

"یہی سوال تمہارے لیے ہے' کیا تم نے جو سوچا ہے' وہ ہوگا؟"

فون کا بزر بولنے لگا۔ وہ اسے آن کرکے بولی۔ "ہیلو' میرے ڈیڈی کو رہا کرکے یہاں بھیج رہے ہو؟"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "میں انٹیلی جنس بیورو کا چیف بول رہا ہوں۔ مجھے یہاں کے حالات بتائے گئے ہیں۔ میں دوسری مصروفیات چھوڑ کر آیا ہوں اور تمہارے ڈیڈی کی رہائی کا فیصلہ کرچکا ہوں لیکن تم ہماری ایک بات مان لو۔"

"میں ڈیڈی کی رہائی کے لیے ہزار باتیں مان سکتی ہوں۔"

چیف نے کہا۔ "تم نے بم بلاسٹنگ کا جو وقت مقرر کیا ہے' اس وقت میں تبدیلی کردو۔ میں تمہیں عقل کی ایک بات سمجھاتا ہوں۔ ابھی تمہارے ڈیڈی تمہارے پاس آکر

کار میں بیٹھ جائیں گے اور تم اس کے ساتھ فرمان علی کو بھی قیدی بنا کر لے جاؤ گی تو فرمان تمہارے لیے پرابلم بن جائے گا۔ وہ رہائی کے لیے تمہارے باپ سے فائٹ کرے گا۔ تمہیں دو باتوں پر مجبور کرے گا۔ ایک تو یہ کہ خود کار دروازہ کھول کر اسے جانے دو یا پھر بم بلاسٹ کرو مگر تم اپنے ڈیڈی کی خاطر دھماکا نہیں کروگی کیونکہ اس وقت وہ باپ بھی دھماکے میں مرجائے گا جسے بچانے کے لیے تم یہ سب کچھ کررہی ہو۔"

"مسٹر چیف! تم نے واقعی ذہانت کی بات سمجھائی ہے لیکن ہمارے پاس بھی ہر داؤ کا جوابی داؤ ہوتا ہے۔ امیر حمزہ تمہیں بتا چکا ہوگا کہ فرمان کی ماں سے ڈیڈی کی برسوں کی دشمنی ہے۔ میرے ڈیڈی بھی اس کار میں آتے ہی فرمان کو گولی ماردیں گے۔ اگر وہ گن پوائنٹ پر خاموش رہے گا اور ہمیں پریشان نہیں کرے گا تو ہم اسے زندہ یہاں سے لے جائیں گے۔"

میں شلپا کے قریب جھکا ہوا دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "میں فرمان بول رہا ہوں۔ میں زندہ رہنے کے لیے گن پوائنٹ پر ان کا قیدی بن کر جاؤں گا۔ مگر میری صرف ایک شرط ہے کہ یہ آپ کی ہدایت کے مطابق بم بلاسٹنگ کے وقت کو ذرا آگے بڑھادے۔"

چیف نے کہا۔ "مسٹر فرمان! اگر تم اپنی مرضی سے قیدی بن کر جانا چاہتے ہو تو ہمیں اعتراض نہیں ہے لیکن تمہاری یہ شرط مان لی جائے کہ بم بلاسٹنگ کا وقت کچھ بڑھا دیا جائے۔"

شلپا نے پوچھا۔ "وقت بڑھانے پر اصرار کیوں کیا جارہا ہے؟"

"تم اپنے ڈیڈی سے بات کرو۔ شاید ان کی بات تمہاری سمجھ میں آجائے۔"

چند لمحوں کے بعد آواز آئی۔ "بیٹی! میں تمہارا ڈیڈی شمشیر سنگھ بول رہا ہوں۔ ہم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ ہم دو الگ گاڑیوں میں یہاں سے جائیں۔ اس طرح تم فرمان کو قیدی بنا کر لے جاسکو گی اور میں دوسری گاڑی میں تم سے دور رہ کر موبائل فون کے ذریعے رابطہ رکھوں گا۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرتے رہیں گے اور میں تنہا ایک گاڑی میں رہ کر کیا کرسکتا ہوں' یہ تم سمجھ سکتی ہو۔"

"میں سمجھ گئی ڈیڈی! اب میں چھ بج کر پینتالیس منٹ پر نہیں بلکہ سات بج کر پندرہ منٹ پر بلاسٹنگ کی وارننگ دے رہی ہوں یعنی میں مزید آدھے گھنٹے کا وقت دے رہی ہوں۔ آپ انٹیلی جنس کے چیف سے معاملات طے کرلیں لیکن آپ رہائی پا کر اس سڑک پر مجھے اپنی صورت دکھاتے ہوئے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں معاملات طے کرکے پندرہ منٹ میں نکلوں گا اتنا وقت اس لیے ضروری ہے کہ میں پولیس والوں کی دی ہوئی گاڑی میں نہیں جاؤں گا۔ پارک کے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جا کر اپنی پسند کی ٹیکسی میں جاؤں گا۔"

فون بند کردیا گیا۔ میں نے کہا۔ "تمہاری یہ کار میرے لیے قید خانہ ہے مگر اس قید میں تم ہو۔ تمہارا حُسن ہے' تمہارے وجود کی خوشبو ہے۔ یہ اچھا ہوا کہ میں مزید آدھے گھنٹے تک اس بہار آفریں پنجرے میں رہ سکوں گا۔"

"تم جتنے شرمیلے تھے' اتنے ہی رومانٹک ہورہے ہو۔"

"ابھی تم پوچھ رہی تھیں کہ مرنے کے لیے آٹھ منٹ رہ گئے ہیں اور میں آئندہ تمہاری قدر کرتے رہنے کی بات کررہا ہوں۔ دیکھو' اسی کو مقدر کہتے ہیں کہ اب آٹھ منٹ نہیں' آدھے گھنٹے تک تمہاری قدر کرنے کا موقع ملتا رہے گا۔ زندگی کی طوالت اور موت کا وقت کوئی نہیں جانتا۔ ہوسکتا ہے آدھے گھنٹے کے بعد ہمارے زندہ رہنے کی معیاد اور بڑھ جائے۔"

"بہت زیادہ خوش فہمی میں ہو۔ بس یہ آدھا گھنٹا آخری ہے۔ اگر ڈیڈی کو رہائی نہ ملی تو سات بج کر پندرہ منٹ پر ہم دونوں کا وجود حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا۔"

"تم نے بلاسٹنگ کے لیے پہلے جو وقت دیا تھا' میں نے کہا تھا' مقررہ وقت سے ایک یا دو منٹ پہلے تمہیں بتاؤں گا کہ اپنے تحفظ کے لیے کیا کرسکتا ہوں۔ گھڑی دیکھو' تمہارے پہلے مقررہ وقت کے پورے ہونے میں صرف دو منٹ رہ گئے ہیں اس لیے اب میں تمہیں اپنا کرتب دکھاتا ہوں۔"

میں نے یہ کہتے ہی اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ میں نے اسے اٹھا کر پچھلی سیٹ پر پھینک دیا۔ اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ میں اگلی سیٹ پر سے اس کا موبائل فون اٹھا کر پیچھے آیا۔ وہ سیٹ پر گرنے کے بعد اٹھنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے دبوچ کر پھر لٹا دیا۔

وہ میرے شکنجے میں پہلے ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ پھر ذرا سخت لہجے میں بولی۔ "کیا حرام موت مرنا چاہتے ہو؟"

"کسی کنواری کے ساتھ کنوارہ مرنے کو حرام موت کہتے ہیں تو ایسی موت کا تجربہ ہوجائے گا۔"

"کیا تم یہاں آنے والی موت کو مذاق سمجھ رہے ہو؟"

"وہ مرد ہی کیا جو موت کو مذاق نہ بنادے۔ بھئی زیادہ سے زیادہ قیامت کے دن یہی

پوچھا جائے گا کہ میں نے مرنے سے پہلے منہ کالا کیوں نہیں کیا۔ یہ مسئلہ پیدا ہوگا کہ میری موت کو حرام قرار دیا جائے یا نہیں؟"

"میرے ڈیڈی رہائی پاکر یہاں سے گزرتے وقت مجھے نہیں دیکھیں گے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟"

"وہ بھی کار کے قریب آکر کلرڈ شیشے پر دستک دے کر کہیں گے' بے حیا! کلموہی' بند گاڑی میں رنگ رلیاں منارہی ہے۔ دروازہ کھول! یہ تو میں بھی دروازہ کھولنے کا بٹن دبانا جانتا ہوں۔ جاننا صرف یہ ہے کہ بم بلاسٹنگ کا بٹن کون سا ہے؟"

"میں تمہیں نہیں بتاؤں گی؟"

"اور میں نہیں پوچھوں گا۔ جانتی ہو کیوں؟ یہ بات چھوٹی سی عقل سے بھی سوچی جاسکتی ہے کہ دھماکا کرنے والا بٹن کوئی سا ہو' اس کو دبانے کے لیے ایک ہاتھ یا ایک انگلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں پچھلی سیٹ پر اسی لیے تمہیں لایا ہوں کہ تم یہاں سے اپنے ہاتھ اور پاؤں بڑھا کر نہ اس بٹن تک پہنچ سکو گی اور نہ ہی اسے دبا کر دھماکا کرسکو گی۔"

وہ حیرانی اور پریشانی سے مجھے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ پھر وہ میری گرفت سے نکلنے کی جدوجہد کرنے لگی۔ پہلے مطمئن تھی اس لیے آرام سے میری گرفت میں تھی لیکن اب تڑپ کر نکلنے کی کوششیں کرنے لگی۔

وہاں سے ہائیڈ پارک یقیناً دو کلو میٹر دور ہوگا۔ وہاں سے امیر حمزہ' شمشیر سنگھ کالیا' انٹیلی جنس کا چیف باہر آگئے تھے۔ پارک کے باہر ان کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کئی مسلح پولیس والے اور امیر حمزہ کے جاں نثار اِدھر اُدھر عام لوگوں کی حیثیت سے موجود تھے۔

شلپا نے باپ کو رہائی دلانے کے لیے سب پر ذہنی دباؤ ڈالا ہوا تھا۔ امیر حمزہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کار کے اندر مجھے نقصان پہنچے اور یہ قانونی تقاضا بھی تھا کہ اس کار میں موجود دو انسانوں کی جانیں بچائی جائیں۔

اور ایسا کرنے کے لیے وہ انڈر گراؤنڈ کے ایک گاڈ فادر کو رہا کرنے پر مجبور ہورہے تھے۔ انٹیلی جنس کے چیف نے اس کی رہائی کے لیے اپنی یہ بات منوائی تھی کہ وہ بم بلاسٹنگ کے مقررہ وقت میں تبدیلی کرے اور شلپا نے راضی ہوکر انہیں مزید آدھے گھنٹے کا وقت دیا تھا۔

امیر حمزہ نے شمشیر سنگھ کالیا سے کہا۔ "اپنی بیٹی سے کہو کہ تمہیں رہائی دی جارہی ہے۔ اس کے عوض وہ فرمان کو رہا کردے۔ اسے کار سے باہر جانے دے۔"

شمشیر سنگھ کالیا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "فرمان تو میرا شکار ہے اور تم مجھے رہا نہیں

کررہے ہو۔ یہ قانون کے محافظ نہیں چاہتے کہ دو انسانوں کی جان جائے اور بم دھماکے کے باعث شہریوں میں خوف و ہراس پیدا ہو۔ یہ میرا اور قانون کے محافظوں کا معاملہ ہے۔"

امیر حمزہ نے کہا۔ "بیٹی کی چالاکی پر بہت چہک رہے ہو۔"

"تمہیں میری بیٹی کی ذہانت کی داد دینی چاہیے۔ فرمان اپنی ماں کی توہین کا بدلہ مجھ سے لینا چاہتا تھا۔ اسے میری بیٹی نے پنجرے میں بند کردیا۔ تم برسوں سے میرے مخالف ہو۔ آج مجھے ہلاک نہ کرتے تو اپاہج بنا دیتے یا ان افسران کے تعاون سے مجھے آہنی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیتے۔ مگر میری بیٹی کی ایک چال نے آج تمہارے جیسے شاطر کو بھی بے بس کردیا ہے۔ میں تمہارے سامنے رہائی پاکر جاؤں گا اور تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔"

امیر حمزہ نے کہا۔ "میں ابھی تمہاری بیٹی کی چال کو ناکام بناسکتا تھا مگر میں فرمان علی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ہوں۔ اگر پہلے سے واقفیت ہوتی تو فون کے ذریعے میرے ایک اشارے پر وہ کار میں بیٹھے بیٹھے بازی پلٹ دیتا۔"

کالیا نے کہا۔ "دیر کس بات کی ہے۔ فون پر اسے اشارہ دو۔"

"نہیں۔ فون تمہاری بیٹی بھی سنے گی اور وہ محتاط ہوجائے گی۔"

انٹیلی جنس کا چیف مزید وقت ملنے کے بعد فون کے ذریعے اپنے اعلیٰ افسران سے باتیں کررہا تھا اور کوڈ ورڈز میں کہہ رہا تھا کہ کالیا کسی بھی ٹیکسی میں جائے' سادہ لباس والے قانون کے محافظ اس کا تعاقب کریں۔

چیف نے اچھی طرح خفیہ پلاننگ کرنے کے بعد شلپا کے موبائل فون کے نمبر ڈائل کیے۔ تھوڑی دیر تک دوسری طرف سے آواز آتی رہی لیکن کوئی فون اٹینڈ نہیں کررہا تھا۔ چیف نے فون کے وائڈ اسپیکر کو آن کرتے ہوئے کالیا سے کہا۔ "ادھر فون کا بزر بول رہا ہے مگر تمہاری بیٹی فون اٹینڈ نہیں کررہی۔"

وائڈ اسپیکر سے بزر کی آواز بند ہوگئی۔ ادھر سے میں نے فون کو آن کردیا تھا لیکن مجھے اور شلپا کو بولنے کی فرصت نہیں تھی۔

انٹیلی جنس کا چیف' امیر حمزہ اور شمشیر سنگھ کالیا وغیرہ سوالیہ نظروں سے وائڈ اسپیکر کو دیکھ رہے تھے اور وہاں سے ابھرنے والی جذباتی آوازیں سن رہے تھے۔

آوازیں طرح طرح کی ہوتی ہیں۔ وہ آوازیں الفاظ ادا نہیں کرتیں لیکن آواز کی ادائیگی سے کچھ سمجھاتی ہیں اور کچھ سمجھنے کے لیے تجسس برقرار رکھتی ہیں۔

"ہوں۔" ایک آواز ہے۔ اگر "ہوں" مختصر ہے تو نکاح قبول کیا ہے۔ اگر طویل ہے تو "ہوں" کہنے والی کچھ پالینے کے سحر میں ڈوب رہی ہے۔

"نہیں نہیں........" کا مطلب صاف انکار ہے۔ اگر بند کمرے یا بند گاڑی میں نہیں نہیں ہے۔ تو پھر وہ پیار بھرا ہاں ہاں ہے۔

"آہ!" میں حیرانی ہے کہ دشمن پیارا ہوگیا۔

آہ! ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جو توڑ دے، مروڑ دے اور نچوڑ دے، وہی پیارا ہوجاتا ہے۔ باقی پرائے ہوجاتے ہیں۔

"ہائے!" جس ہائے میں ترنم ہو، وہ سات سُروں کے جادو سے پوچھتی ہے، ہائے سوچا تھا کیا؟ کیا ہوگیا؟ اور اگر یہ نہ ہوتا تو عمرِ رفتہ کو زنگ لگ جاتا اور لوہار کبھی لوہے کو زنگ لگنے نہیں دیتا۔ جارے بیدردی! جو ہوا، سو ہوا۔ دیا رے دیا آگے کیا ہوگا؟

وائڈ اسپیکر سے کوئی بول نہیں رہی تھی اور کوئی اپنا بول بالا نہیں کررہا تھا۔ کسی کی زبان الفاظ ادا نہیں کررہی تھی۔ پتا نہیں اس موئے وائڈ اسپیکر کو کیا ہوگیا تھا، چغلیاں کھا رہا تھا۔ جو سن رہے تھے، ان کے تصور میں نیلے پیلے مناظر جگا رہا تھا۔

لندن کی سردی میں شمشیر سنگھ کالیا کو پسینہ آگیا۔ شاید پسینہ نہیں تھا، وہ شرم سے پانی پانی ہورہا تھا۔ اس نے انٹیلی جنس کے چیف سے موبائل فون چھین کر اسے اپنے کان سے لگا کر گرجتے ہوئے پوچھا۔ "شلپا! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

امیر حمزہ نے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے لگا کر کہا۔ "یہ اسپیکر دنیا کی بین الاقوامی جذباتی زبان بول رہا ہے۔ تم کیسے بے شرم باپ ہو؟ بیٹی سے وضاحت طلب کررہے ہو۔"

پھر اس نے چیف سے کہا۔ "میں جو سوچ رہا تھا، وہی فرمان نے کیا ہے۔ شلپا کو وہاں سے دور کردیا ہے، جہاں بلاسٹنگ کا خفیہ بٹن ہوگا۔ اب وہاں دھماکا نہیں ہوگا۔ دونوں سلامت رہیں گے۔ آپ اس کالیا کو حراست میں لیں۔"

بات ختم ہوتے ہی ایک فائر ہوا۔ امیر حمزہ کے ہاتھ پر گولی لگی۔ ریوالور ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اسے سنبھل کر دوسرے ہاتھ سے ریوالور اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ ایک کے بعد کئی مسلسل فائر ہونے لگے۔ امیر حمزہ زمین پر لڑھکتے ہوئے ایک دیوار کی آڑ میں چلا آیا۔ اس دوران میں ایسے کئی بم پھینکے گئے جن سے سفید دھواں خارج ہوکر پھیلنے لگا۔ اس دھوئیں میں کوئی کسی کو نظر نہیں آرہا تھا۔ اس وقت شمشیر سنگھ کالیا کے پاس آکر ایک گاڑی رکی۔ دروازہ کھلا پھر اس کے بیٹھتے ہی گاڑی چل پڑی۔

دھوئیں کے سبب ٹھہر ٹھہر کر فائرنگ ہورہی تھی۔ سوچ سمجھ کر گولیاں چلائی جارہی

تھیں تاکہ اپنی گولیوں سے اپنے ہی لوگ زخمی یا ہلاک نہ ہوں۔ وہ سڑک بالکل خالی ہوگئی تھی۔ ایسی بھگدڑ ہوئی تھی کہ لوگ شوٹنگ رینج سے بہت دور چلے گئے تھے۔

مراد چنگیزی بہت پہلے ہی میری تلاش میں نکلا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں امیر حمزہ کا چیلنج قبول کرنے ہائیڈ پارک ضرور جاؤں گا اس لیے وہ بہت پہلے سے اس پارک میں پہنچ کر مجھے تلاش کررہا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب امیر حمزہ اور شمشیر سنگھ کالیا ایک ہی میز پر بیٹھے تھے۔ مراد چنگیزی میک اپ کے باعث دونوں کو پہچان نہ سکا۔ اس نے ایک سراغ رساں، ایک پولیس افسر اور چند سپاہیوں کو جب اس میز کے اطراف دیکھا تو اندازہ ہوا کہ وہ دونوں شاید مجرم ہیں۔ پھر دور سے پتا چلا کہ قانون کے وہ محافظ ان دونوں میں سے ایک شخص "امیر حمزہ" کی عزت کررہے ہیں اور دوسرے شخص "کالیا" کا محاسبہ کررہے ہیں۔

مراد صحیح معلومات حاصل کرنے کے لیے ان کے قریب ایک میز پر آیا۔ رفتہ رفتہ ان کی گفتگو سے پتا چلا کہ ان میں سے ایک امیر حمزہ ہے اور وہ شمشیر سنگھ کالیا کو گرفتار کرا رہا ہے مگر گرفتاری کا معاملہ کچھ طول پکڑ رہا ہے۔ اس کی وجہ بھی معلوم ہوئی کہ اس کی بیٹی شلپا اس پارک سے کچھ دور کسی کو یرغمال بناکر اور بم دھماکے کی دھمکی دی کر اپنے باپ کی رہائی کا مطالبہ کررہی ہے۔

امیر حمزہ اور ان افسران کے درمیان جو باتیں ہوتی رہیں پھر فون کے ذریعے شلپا سے رابطہ ہوتا رہا تو ان کی گفتگو کے دوران میں میرا ذکر ہوا۔ تب مراد کو معلوم ہوا کہ شلپا نے مجھے قیدی بناکر اپنے پاس بند کار میں بٹھایا ہے۔ کوئی خود کار دروازے کو باہر سے کھول نہیں سکے گا اور کار کے اندر ایک خفیہ بٹن ہے جسے دباتے ہی کار سے منسلک بم پھٹ پڑے گا۔

مراد چنگیزی کو یقین تھا کہ قانون کے محافظ اس کار کے اندر دو انسانوں کو مرنے نہیں دیں گے۔ وہ میری طرف سے مطمئن تھا۔ میں زندہ سلامت رہوں گا۔ ایسے وقت وہ دو باتیں سوچ رہا تھا، ایک تو یہ کہ شمشیر سنگھ کالیا نظروں میں آگیا ہے۔ اس کا پیچھا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ موبائل فون کے ذریعے مجھ سے بات کرے اور یہ سمجھائے کہ جب بچاؤ کی کوئی صورت نہ رہے تو شلپا کو دونوں ہاتھوں اور پیروں کو استعمال کرنے کا موقع نہ دوں۔ اس طرح وہ دھماکا نہیں کرسکے گی۔

لیکن اس نے اس دوسرے خیال کو مسترد کردیا۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ مجھے جو ہدایت دی جائے گی، اسے شلپا ضرور سنے گی پھر وہ میرے قریب آنے سے پہلے ہی بم بلاسٹنگ کا بٹن دبا دے گی۔ مراد نے یہ سوچ کر صبر کیا کہ قانون کے محافظ مجھے ضرور

بچائیں گے اور میں ذہانت سے کام لوں گا تو وہی کروں گا جو وہ سوچ رہا ہے۔

انٹیلی جنس کے چیف' امیر حمزہ' شمشیر سنگھ کالیا اور مسلح سپاہی پارک کے باہر آئے کیونکہ شلپا نے آدھے گھنٹے کا وقت بڑھا دیا تھا۔ وہ لوگ شمشیر سنگھ کالیا کو وہاں سے کسی ٹیکسی میں روانہ کرنے والے تھے۔ مراد چنگیزی بھی کچھ فاصلہ رکھے ہوئے اس کے ساتھ تھا۔ ایسے ہی وقت بازی پلٹ دی گئی تھی۔ امیر حمزہ نے کالیا کو گن پوائنٹ پر رکھا تو اچانک گولیاں چلنے لگیں۔ گیس بموں کے ذریعے سفید دھواں اس طرح پھیلنے لگا کہ ایک دوسرے کو دیکھنا اور پہچاننا دشوار ہو گیا۔ مراد چنگیزی بڑی محفوظ جگہ تھا۔ اس نے امیر حمزہ کو دیکھا' جس کے ہاتھ سے ریوالور گر گیا تھا اور وہ زمین پر لڑھکتا ہوا ایک دیوار کی آڑ میں آ گیا تھا۔

اس کے باوجود امیر حمزہ محفوظ نہیں تھا۔ جس دیوار کی آڑ میں تھا' اس کے دائیں بائیں سمت سے کبھی کبھی گولیاں آکر اس دیوار سے لگ رہی تھیں۔ مراد چنگیزی کچھ فاصلے پر چھپا ہوا تھا۔ اس نے چیخ کر آواز دی۔ "حمزہ صاحب! ادھر دیکھیں۔"

امیر حمزہ نے ادھر دیکھا۔ مراد نے اپنے ریوالور کو اس کی طرف اچھالا۔ اس نے کیچ کیا۔ پھر دائیں بائیں فائرنگ کرتا ہوا' زمین پر رینگتا ہوا مراد کے پاس محفوظ جگہ پہنچ گیا۔ مراد نے کہا۔ "اس دھوئیں میں کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔ کیا آپ نے شمشیر سنگھ کالیا کو دیکھا ہے؟"

"نہیں۔ مگر جہاں وہ تھا' وہاں ایک گاڑی کے رکنے اور پھر جانے کی آواز سنی ہے۔ اگر وہ فرار ہو گیا ہے تو ہو سکتا ہے کہ پولیس والے یا میرے جانباز اس کا پیچھا کر رہے ہوں۔"

"اسے ہاتھ سے نکلنا نہیں چاہیے۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس اسلحہ نہیں ہے۔ میرے پاس ایک ہی ریوالور ہے۔ یہ میں نے آپ کو دے دیا ہے۔ پھر پتا نہیں چل رہا کہ کس کے آدمی کہاں کہاں سے فائر کر رہے ہیں۔"

امیر حمزہ نے اپنے ہاتھ میں ریوالور کو دیکھا پھر کہا۔ "اوہ' آپ کا شکریہ۔ میں پوچھنا بھول گیا کہ آپ کون ہیں؟ آپ نے ایسے خطرناک حالات میں اپنی گن مجھے دے دی ہے۔"

مراد نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "پتا نہیں آپ مجھ سے مصافحہ کرنا پسند کریں گے یا نہیں؟ میرا نام مراد چنگیزی ہے۔"

امیر حمزہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ مراد نے کہا۔ "میں خالی ہاتھ ہوں۔ آپ کے

پاس بھرا ہوا ریوالور ہے۔ اگر آپ مجھے خفیہ ایجنسی کا آلہ کار سمجھتے ہیں تو مجھے گولی مار دیں۔"

امیر حمزہ نے اسے کھینچ کر گلے لگا کر کہا۔ "برادر! ہمارے درمیان غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی۔ اگر صرف اتنا ہی کہہ دیا جاتا کہ فرمان ایک عظیم لیڈی سرجن آمنہ خاتون کا بیٹا ہے تو میں سر کے بل چلتا ہوا فرمان کے پاس آجاتا۔"

"ابھی تو کار کے اندر شلپا نے اسے پھنسایا ہوا ہے۔"

امیر حمزہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ نے وائڈ اسپیکر سے آوازیں نہیں سنیں۔ وہ ذہین ماں کا بیٹا ہے۔ اس نے بازی پلٹ دی ہے۔ پہلے شلپا نے اسے پھانسا تھا' اب اس نے اسے پھانس لیا ہے۔"

"پھر تو مجھے معلوم کرنا چاہیے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس کار سے نکل چکا ہے یا نہیں؟"

وہ موبائل پر میرے فون کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ میں کار کے جذباتی و رومانی ماحول میں ایسا بخیریت تھا کہ ایسی خیریت کی نیک تمنائیں اپنے نوجوان قارئین کے لیے بھی کرتا رہوں گا۔ انسان چاہے تو اپنے حالات سے اچھے اچھے سبق سیکھ سکتا ہے مثلاً یہ کہ برے حالات سے لڑنا چاہیے لیکن اپنی طاقت کے غرور میں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ خدا صرف ہمارا نہیں' ہمارے مقابل کا بھی ہے۔ جو طاقت ہمیں سیر بھر ملی ہے' خدا نے ہمارے مقابل کو سوا سیر بنایا ہو گا۔

شلپا نے میرے اور اپنے لیے موت کا وقت مقرر کیا تھا۔ یعنی آدھے گھنٹے کے اندر اس کے باپ کو رہائی نہ ملتی تو مجھے موت ملتی لیکن تقدیر نے مجھے موت نہیں دی۔ موت دینے والی دے دی۔ جو وہ چاہتی تھی' نہیں ہوا۔ وہی ہوا جو منظورِ خدا ہوا۔

پھر میں اور شلپا دونوں ہی چونک گئے۔ ہڑبڑا کر پچھلی سیٹ پر اٹھ بیٹھے۔ دور سے فائرنگ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے شرارت سے شلپا کے موبائل کو آن رکھا تھا۔ اس کے ذریعے بھی پتا چل رہا تھا کہ جہاں سے شمشیر سنگھ کالیا کو رہائی ملنے والی تھی' اسی جگہ سے فائرنگ ہو رہی ہے۔

وہ بکھری ہوئی تھی۔ خود کو سمیٹتی جا رہی تھی اور پریشان ہو کر کہہ رہی تھی۔ "میرے ڈیڈی کے ساتھ دھوکا ہو رہا ہے۔ وہاں گولیاں چل رہی ہیں۔ میں ڈیڈی کی رہائی کے منصوبے پر عمل کر رہی تھی۔ پتا نہیں ان کے ساتھ اب کیا سلوک کیا جا رہا ہے۔"

وہ اب تک میرے ساتھ سحر زدہ تھی۔ اپنے حواس میں نہیں تھی کہ کس عالم بے

خودی میں پہنچی ہوئی ہے۔ جب اس نے اپنے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا تو پتا چلا کہ وہ فون پتا نہیں کب سے آن ہے اور اسی کے ذریعے ہمیں فائرنگ کی آوازیں صاف سنائی دے رہی ہیں۔ اس نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔ "تم نے اسے آن کیا تھا؟"

میں نے کہا۔ "مدہوشی میں کچھ پتا نہیں چلتا کہ خود ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اگر یہ بڑی دیر سے آن ہے تو یقیناً دوسری طرف سے تمہیں کال کیا گیا ہوگا اور تم نے خواب زدہ' سحر زدہ اور نہ جانے کیا کیا زدہ ہو کر اسے آن کر دیا ہوگا۔ دوسری طرف سے تمہیں کچھ کہا گیا ہوگا اور تم نے یہاں سے بین الاقوامی زبان میں جواب دیا ہوگا۔ انہوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ تم بم بلاسٹنگ بٹن سے دور ہواؤں میں اُڑ رہی ہو۔ یہ پولیس والے بڑے بدمعاش ہوتے ہیں' فوراً حالات کا تجزیہ کر لیتے ہیں۔"

وہ بے بسی سے گھور کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اگلی سیٹ سے اس کا پرس اٹھا کر اس میں سے پستول نکال کر اپنی جیب میں رکھا۔ پھر اسے پرس دیتے ہوئے کہا۔ "اگر پولیس کی حراست میں نہیں آنا چاہتی ہو تو فوراً یہاں سے چلو۔"

میں نے دروازے کھولنے والے بٹن کو دبایا۔ پھر ایک دروازے کو کھول کر اس کا بازو پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر آیا۔ وہ بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "چھوڑو مجھے' تم نے میرا پستول کیوں رکھا ہے؟"

"جب تم سر سے پیر تک میری ہو تو کیا پستول میرا نہیں ہو سکتا؟ ہم بالغ ہو گئے ہیں۔ بچوں کی طرح ایک کھلونے کے لیے نہیں الجھنا چاہیے۔"

میں اسے تیزی سے چلاتا ہوا سڑک پار کر کے دوسرے فٹ پاتھ پر آیا۔ وہ بولتی رہی' میں نہیں جاؤں گی۔ ڈیڈی کسی مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔ تم نے مجھے زندگی کی نئی مسرتیں دی ہیں' مجھ سے محبت کرتے ہو تو اس جگہ اجنبی بن کر چلو' جہاں میرے ڈیڈی اور پولیس والے ہیں۔"

اسی وقت فون کا بزر سنائی دیا۔ شلپا نے اسے آن کر کے کان سے لگا کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے اس کے باپ نے کہا۔ "بیٹی! میری فکر نہ کرو۔ میں سب ہی کو ڈاج دے کر نکل گیا ہوں۔ اب وہ میرے سائے تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ تم اس کار سے نکل کر کسی ٹیکسی میں جاؤ۔ میں کچھ دیر بعد تمہیں بتاؤں گا کہ فی الحال تمہیں مجھ سے دور رہ کر کہاں پناہ لینی چاہیے۔"

"او ڈیڈ! آپ بہت گریٹ ہیں' قانون کے لمبے ہاتھ آپ کو کبھی پکڑ نہیں پائیں گے۔"

میں باپ بیٹی کی پوری باتیں نہ سن سکا۔ میرے موبائل فون پر مراد چنگیزی کی آواز سنائی دی۔ "فرمان! کیا اس کار سے نکل چکے ہو؟"

"جی ہاں۔ کار والی کے ساتھ کھلی فضا میں بہت دور نکل آیا ہوں۔ مجھے گائیڈ کریں کہ شلپا کے ساتھ کہاں آنا ہے؟"

"جسٹ اے منٹ۔ ابھی بتاتا ہوں۔"

اس نے امیر حمزہ سے کہا۔ "شلپا' فرمان کے قابو میں ہے۔ کیا اسے یرغمال بنا کر رکھنے کے لیے آپ کے پاس کوئی جگہ ہے؟"

"ہاں' اس سے کہو جہاں سے گزر رہا ہے' وہاں رک کر ایک گاڑی کا انتظار کرے۔ میرے دو جاں نثار اس گاڑی سے اتر کر یہ کوڈ ورڈز ادا کریں گے۔ "امیر حمزہ فار فرمان اینڈ فرمان فار امیر حمزہ۔" یہ کوڈ ورڈز سنتے ہی فرمان' شلپا کے ساتھ اس گاڑی میں بیٹھ جائے۔"

مراد چنگیزی نے فون پر پہلے مجھے یہ بتایا کہ امیر حمزہ اور ہمارے درمیان غلط فہمی ختم ہو گئی ہے اور وہ میری امی کی عظمت کا قائل ہے اور ان کا احترام کرتا ہے۔ پھر میں نے بتایا کہ میں کس دکان کے سامنے فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا ہوں اور جو گاڑی والے میرے پاس آکر مقررہ کوڈ ورڈز ادا کریں گے میں اس گاڑی میں شلپا کے ساتھ جاؤں گا۔"

میں نے فون بند کیا' وہ بولی۔ "میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ تم میرے ساتھ چلو۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو وہ مجھے غصے سے دیکھ کر بولی۔ "کیا تم مجھے جبراً لے جا سکو گے؟"

"اگر میں نہ لے جا سکا تو پولیس والے لے جائیں گے۔ میں گواہی دوں گا کہ تم نے مجھے کار میں قید کر کے بم بلاسٹ کرنے کی دھمکی دے کر باپ کو رہائی دلانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ تم قانون کے شکنجے میں رہو گی تو تمہارا باپ کبھی تمہیں رہائی نن راکھور آیا گا۔ میرے ساتھ رہو گی تو ہو سکتا ہے' تمہارا گاڈ فادر کالیا باپ کے حوش تھا۔ اس نے بڑی چھین کر لے جائے۔" س لی۔ میرا بیٹا خیریت سے

وہ میری باتوں سے قائل ہو کر سر جھکا کر سوچنے لگی۔
تھی کہ فی الوقت مجھ سے نجات حاصل نہیں کر سکے گی۔ ل باد دیتے ہوئے پوچھا۔ "کریم

☆=====☆=====

"تہ یا کے باپ نے میرے پاس
ایک تھانے دار ایک پرانی کھٹارا سی جیب میں چار نہ پچیس یا تیس ہزار میں اس

ایک علاقے تلہار سے ٹنڈو باگو جا رہا تھا۔ ایک جگہ اس نے اچانک جیپ روکنے کو کہا۔ اس کی ہیڈ لائٹس میں دور سڑک پر کوئی چھ یا سات آدمی لیٹے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کوئی اوندھا تھا اور کوئی چاروں شانے چت لیٹا ہوا تھا۔

تھانے دار اور تمام سپاہی اپنی اپنی گن کے ساتھ چوکس ہو گئے۔ یہ سمجھ میں آ گیا کہ وہ لوگ سڑک پر آرام سے نہیں سو رہے تھے بلکہ مُردہ ہو چکے ہیں۔ ان کے نزدیک اور دور کلاشنکوف اور رائفلیں پڑی ہوئی تھیں۔ تھانے دار جمن راٹھور نے کہا۔ "گاڑی بالکل آہستہ آہستہ آگے بڑھاؤ اور تم سب چاروں طرف رخ کر کے گنیں سیدھی رکھو۔ معلوم ہوتا ہے' ادھر بڑی خونریزی ہوئی ہے۔"

جیپ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ اس کی روشنی میں خون کی سرخی نظر آنے لگی۔ ان سب مرنے والوں کا لہو سڑک پر بہہ رہا تھا۔ جمن راٹھور نے اپنے ریوالور سے ایک ہوائی فائر کرتے ہوئے بلند آواز میں پوچھا۔ "یہاں اور کون ہے؟ اگر کوئی ڈاکو ہے یا کوئی ڈاکوؤں سے محفوظ رہنا چاہتا ہے تو میرے سامنے آ جائے۔ میں اسے نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

وہ بولتا رہا۔ جیپ آگے بڑھتی رہی پھر ان لاشوں سے ذرا فاصلے پر رک گئی۔ وہ سب جیپ سے اتر کر محتاط انداز میں چاروں طرف سے آگے بڑھے۔ آگے کچھ دور ایک اور شخص کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہ وہی ڈاکو تھا جو راجہ نواز کو دو کروڑ روپے کا لالچ دے کر وڈیرے اللہ بخش کے اکلوتے بیٹے کریم بخش کو اس کی گاڑی میں بٹھا کر اس کے باپ کے پاس رقم وصولی کے لیے لے جانا چاہتا تھا۔

تھانے دار جمن راٹھور اس ڈاکو کو دیکھتے ہی بولا۔ "اوہ' یہ تو ڈاکو رجب جسکانی ہے۔ اس نے وڈیرے اللہ بخش کے بیٹے کو اغوا کیا تھا اور ایک کروڑ روپے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ یہ تو یہاں مرا پڑا ہے۔"

اسی وقت سپاہی نے کہا۔ "اتنا خطرناک ڈاکو سڑک پر کتے کی طرح پڑا ہوا ہے۔ لگتا دوسری طرف سے اس سے مقابلہ ہوا ہے؟"

دے کر نکل گیا ہوں۔ اب وہ۔ مقابلہ کرنے والے بھی تعداد میں ان سے زیادہ ہوں گے نکل کر کسی ٹیکسی میں جاؤ۔ میں ۔ کو چھین کر لے گئے ہیں۔ اب اصل معاملہ کیا ہے' یہ رہ کر کہاں پناہ لینی چاہیے۔" گا۔ جیپ یہاں لاؤ' ہم ابھی اس کی حویلی میں جائیں

"او ڈیڈ! آپ بہت گریٹ

گے۔" ہوا لاشوں سے کتراتا ہوا تھانے دار کے پاس آیا۔ وہ

سب اس میں بیٹھ کر حویلی کی طرف جانے لگے۔ آج صبح کراچی سے رحمان چنا کے سیکریٹری نے تھانے دار جمن راٹھور سے کہا تھا کہ ڈاکو رجب جسکانی سے معاملہ طے کرو۔ وہ وڈیرے اللہ بخش سے بہت بڑی رقم تانگ رہا ہے۔ تم پچیس یا تیس ہزار میں یہ معاملہ ختم کرا دو۔ رجب جسکانی راضی نہ ہو تو پولیس مقابلے کے بہانے اسے گولی مار دو۔ وڈیرا اللہ بخش ہمارا خاص آدمی ہے' جلد سے جلد اس کے بیٹے کو باپ کے پاس پہنچاؤ۔"

تھانے دار جمن راٹھور اس ڈاکو سے اور وڈیرے سے اپنا کمیشن وصول کرنے والا تھا لیکن اب واردات کچھ سے کچھ ہو گئی تھی۔ وڈیرے کا بیٹا کریم بخش خدا جانے کس ڈاکو کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اگر وہ دوسرا ڈاکو تھانے دار سے معاملہ طے کئے بغیر کریم بخش کو اس کے باپ کے پاس پہنچا کر رقم وصول کرے گا تو تھانے دار جمن راٹھو کا نقصان ہو گا اور یہ نقصان دوسرے ڈاکو کو آئندہ مہنگا پڑے گا۔ کوئی بھی ڈاکو تھانے دار کا حق مار کر اس علاقے میں کوئی واردات نہیں کر سکتا تھا۔

تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی تھی۔ تھانے دار کی جیپ حویلی کے قریب پہنچی تو باہر بڑے گیٹ پر ہی نائٹ چوکیدار سے پتا چل گیا کہ وڈیرے سائیں کا بیٹا کریم بخش واپس آ گیا ہے۔ تھانے دار نے چوکیدار سے پوچھا۔ "کریم بخش کے ساتھ اور کتنے لوگ آئے تھے؟"

"حضور! کوئی ان کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ اکیلے پیدل چلتے ہوئے رات کے تین بجے آئے تھے۔"

تھانے دار نے ناگواری سے پوچھا۔ "کیا بکتے ہو۔ اسے ڈاکو اغوا کر کے لے گئے تھے اور تم کہتے ہو اس کے ساتھ ڈاکو نہیں تھے۔ کریم بخش کو واپس کرنے کے لیے کوئی لین دین کے لیے نہیں آیا تھا؟"

"حضور! آپ سے جھوٹ کہہ کر جوتے کھانا نہیں چاہتا۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ اندر جا کر وڈیرے سائیں سے پوچھ لیں۔"

جیپ کی آواز سنتے ہی حویلی کے اندر خبر پہنچ گئی تھی کہ تھانے دار جمن راٹھور آیا ہے۔ وڈیرا اللہ بخش خود اس کے استقبال کے لیے آیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "اللہ تعالیٰ نے ہماری سن لی۔ میرا بیٹا خیریت سے واپس آ گیا ہے۔ آیئے تشریف لایئے۔"

تھانے دار نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے اسے مبارک باد دیتے ہوئے پوچھا۔ "کریم بخش کو کس نے پہنچایا ہے؟"

وہ حویلی کی بیٹھک میں آئے۔ [illegible] نے کہا۔ "[illegible] کے باپ نے میرے پاس [illegible] پچیس یا تیس ہزار میں اس

گے یا لسی؟"

"یہاں تو ہم کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں' چنا صاحب کا آرڈر تھا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر آپ کے بیٹے کو واپس لایا جائے۔ اب ہمیں کریم بخش کی واپسی کی رپورٹ دینی ہوگی' لہٰذا پہلے کام کی بات ہو جائے۔ آپ کے صاحب زادے کو یہاں کون لایا ہے؟"

اللہ بخش نے کہا۔ "کوئی رحمت کا فرشتہ تھا۔ ایک گاڑی...... اس راستے سے گزر رہی تھی جہاں سے ڈاکو رجب جسکانی اپنے ساتھیوں کے ساتھ میرے بیٹے کو یہاں لا رہا تھا۔ وہ فرشتہ بہت دلیر تھا۔ اس نے رجب جسکانی اور اس کے تمام ساتھیوں کو مار ڈالا۔ پھر کریم بخش کو بستی میں چھوڑ کر چلا گیا۔"

تھانے دار نے کہا۔ "سائیں! آپ جہاں دیدہ ہیں۔ کیا یہ بات ماننے والی ہے کہ ایک شخص نے تنہا سات ڈاکو مار دیئے۔ کیا آپ نے اسے دیکھا ہے' وہ کون ہے؟ اس نے اپنے بارے میں کچھ بتایا ہوگا؟"

"میرا بیٹا ضد کر رہا تھا کہ وہ ہماری حویلی میں آئے اور ہمیں میزبانی کا موقع دے لیکن وہ بستی میں داخل ہوتے ہی میرے بیٹے کو گاڑی سے اتار کر چلا گیا۔"

"تعجب ہے۔ اس نے آپ سے کوئی رقم طلب نہیں کی؟"

"نہیں۔ رقم تو طلب نہیں کی ہے مگر بڑے پیار سے دھمکی دے گیا ہے۔"

"کیسی دھمکی؟"

"اس نے میرے بیٹے سے کہا ہے کہ میری بیٹی جمیلہ سے حق نہ بخشوایا جائے۔ میں اپنی ملکیت میں سے اسے جائز حصہ دے کر اسے دلہن بنا کر رخصت کردوں اور ایک ہفتے کے اندر اگر ہم نے جمیلہ کے حقوق دے کر اس کی شادی نہ کی تو وہ ایک ہفتہ کے بعد ہم باپ بیٹے کو گولی مار دے گا۔ ہماری ہلاکت کے بعد جمیلہ میری تمام دولت اور جائیداد کی حقدار بن جائے گی۔"

"یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے۔ اس بندے نے سات ڈاکو مارے۔ آپ کے صاحب زادے کو بخیریت یہاں پہنچایا۔ اس کے عوض اس نے ایک پیسہ بھی نہیں لیا۔ اس کے برعکس آپ کی بیٹی کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے دھمکی دے گیا۔ کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسے جما۔ سے ہمدردی کیوں ہے؟"

"او ڈیڈ! آپ بہت کہ انسانیت کے ناتے جمیلہ کو اس کا حق دلانا چاہتا ہے۔ اس ر نہ ہی اس کی شادی سے وہ کوئی مالی فائدہ اٹھانا چاہتا گے۔"

ہے۔"

"میں نے حاتم طائی کا قصہ پڑھا ہے۔ وہ ساری زندگی مفت میں نیکیاں کرتے کرتے مر گیا لیکن آج کے دور میں کوئی ایسا مائی کا لال نہیں ہے جو اپنی جان کی بازی لگا کر سات ڈاکو مارے اور اس کا معاوضہ لیے بغیر آپ کو بیٹی کا حق بخشوانے سے منع کرے اور اس کی بات نہ ماننے پر باپ بیٹے کو قتل کی دھمکی بھی دے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ جس کریم بخش کو ڈاکوؤں سے بچایا' اسی کو باپ سمیت گولی مارنے کی وارننگ دے گیا؟"

کریم بخش حویلی کے زنان خانے میں اپنی بہن اور دوسری رشتے دار عورتوں کے ساتھ بیٹھا ہنس بول رہا تھا۔ ایک ملازمہ نے آکر کہا۔ "سائیں جی! آپ کو بڑے سائیں بیٹھک میں بلا رہے ہیں۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر حویلی کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا بیٹھک میں آگیا۔ تھانے دار کو دیکھ کر سلام کیا پھر اس سے مصافحہ کرکے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھانے دار جمن راٹھور نے اس سے بھی وہی سوالات کئے جو اس کے باپ سے کر چکا تھا۔ کریم بخش نے بھی اپنے باپ کی طرح جوابات دیئے۔

تھانے دار نے پوچھا۔ "اس نے اپنا نام تو بتایا ہوگا؟"

"میں نے نام پوچھا تھا۔ اس نے کہا کہ میں اسے بھائی جان کہوں۔"

"تم کہہ رہے ہو تو ہمیں یقین کرنا پڑے گا لیکن یہ قصہ کہانیوں والی بات لگتی ہے۔ کہ ایک تنہا شخص نے سات ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا اور انہیں مار ڈالا۔"

"جی ہاں۔ یہ یقین کرنے والی بات نہیں ہے لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس نے اندھیرے میں چھپ چھپ کر گولیاں ماری تھیں۔"

وڈیرے اللہ بخش نے کہا۔ "بیٹے! میں نے کہا تھا' تم تھکے ہوئے ہو' تمہیں آرام سے سونا چاہیے مگر تم اب تک جاگ رہے ہو۔"

"بابا سائیں! میں ابھی جاکر سو جاؤں گا۔"

تھانے دار نے کہا۔ "تم جاسکتے ہو۔ میں اور کوئی سوال نہیں کروں گا۔"

کریم بخش وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ تھانے دار نے کہا۔ "مجھے آپ کے صاحب زادے کی واپسی کی بہت خوشی ہے۔ رحمان چنا صاحب بھی بہت خوش ہوں گے۔ مگر سائیں' اس بیچ میں میرا کمیشن مارا جائے گا۔"

"وہ کمبخت ڈاکو مجھ سے ایک کروڑ مانگ رہا تھا۔ جیسے اس کے باپ نے میرے پاس رقم رکھوائی ہو۔ کراچی سے چنا صاحب نے یقین دلایا تھا کہ پچیس یا تیس ہزار میں اس

ڈاکو کو راضی کرلیں گے۔ اگر وہ تین میں بھی راضی ہوتا تو میں آپ کو پانچ ہزار دیتا اور اب بھی دوں گا۔ ڈاکو سے بھی آپ کو پانچ ہزار ملتے۔ اس طرح آپ کے دس ہزار بن جاتے۔ میں آپ کو دس ہزار سے بھی زیادہ دے سکتا ہوں۔ اگر آپ میرا ایک کام کریں۔"

"حکم کریں سائیں! کیا کام ہے؟"

"آپ اس شخص کا نام اور پتا ٹھکانا معلوم کریں جو میرے بیٹے کو یہاں چھوڑ گیا ہے۔ میں اس کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا لیکن اس کی دھمکی مجھ سے برداشت نہیں ہورہی ہے۔"

"میں بھی تجسس میں مبتلا ہوں۔ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے زمانے میں ایسا حاتم طائی کہاں سے پیدا ہوگیا۔ ویسے وہ مہربان ہونے کے علاوہ ظالم بھی ہے۔ جب وہ سات ڈاکوؤں کو مار سکتا ہے تو آپ باپ بیٹے کو بھی ہلاک کرسکتا ہے۔ ویسے آپ ایک ہفتے کے اندر بیٹی کی شادی کردیں گے تو وہ آپ باپ بیٹے کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

"میں ایسا پاگل نہیں ہوں کہ بیٹی کی شادی کردوں۔ آپ نہیں جانتے وہ کریم بخش سے کہہ گیا ہے کہ بیٹی کی شادی کرکے اسے تین کروڑ روپے دے کر رخصت کروں۔ جو ڈاکو میرے بیٹے کو لے گیا تھا' وہ تو اس سے بھی بڑا ڈاکو بن رہا ہے۔ تین کروڑ کی رقم کوئی معمولی ہوتی ہے؟"

"ہوں' وہ کوئی بہت بڑا مکار ہے۔ ایک طرف آپ کے بیٹے کو واپس کرکے اور ایک پیسہ نہ لے کر آپ پر احسان کررہا ہے' دوسری طرف آپ کی بیٹی کے ذریعے تین کروڑ لے رہا ہے۔ اب میں سمجھ رہا ہوں۔ وہ آپ کا بیٹا دے کر آپ کی بیٹی کو تین کروڑ روپے کے ساتھ اغوا کرکے لے جائے گا۔"

"یہی بات میں اپنے بیٹے کریم بخش کو سمجھا رہا ہوں لیکن وہ تو اسی اجنبی کے گن گا رہا ہے۔ صاف کہتا ہے کہ جمیلہ کی شادی ایک ہفتے کے اندر کرکے اسے تین کروڑ دیئے جائیں۔ میں نے اس سلسلے میں بیٹے سے حجت نہیں کی ہے۔ وہ میرا گم شدہ سرمایہ ہے جو مقدر سے واپس مل گیا ہے۔ میں بیٹے کی مخالفت نہیں چاہتا اور بیٹی کو تین کروڑ تو کیا تین روپے بھی نہیں دینا چاہتا۔"

"پھر بات کیسے بنے گی۔ بیٹا ناراض ہوجائے گا اور وہ اجنبی اپنی دھمکی کے مطابق آپ کو قتل کرنے چلا آئے گا۔ اگر آپ حکم دیں گے تو میں اتنا سخت پہرا لگاؤں گا کہ اس کا باپ بھی آپ کو ہاتھ لگانے نہیں آئے گا۔"

"آپ کتنے دنوں تک پہرا لگائے رکھیں گے۔ تنہا سات ڈاکوؤں کو ہلاک کرنے والا کوئی بہت ہی چالاک اور دلیر بندہ ہوگا۔ وہ ایک ہفتے بعد نہ سہی' دس ہفتے بعد ہمیں قتل کرسکتا ہے۔ کیا آپ کا پورا تھانہ دس ہفتوں تک صرف میری حفاظت کے لیے ڈیوٹی پر رہا کرے گا؟"

"اس کا تو ایک ہی راستہ ہے' اس اجنبی کو کسی طرح تلاش کیا جائے پھر وہ جہاں نظر آئے' وہیں اسے گولی ماردی جائے۔"

"اسے تلاش کرنے کے لیے کریم بخش کو ساتھ رکھنا ہوگا کیونکہ اسی نے اس اجنبی کو دیکھا ہے۔ ہم میں سے کوئی اس کا صورت آشنا نہیں ہے اور میرا بیٹا کریم بخش تو اس کے لیے جان بھی دے سکتا ہے۔ اس کی جان لینے کے لیے ہمارے راستے پر نہیں چلے گا۔ میں نے بیٹی کو تین کروڑ دینے کے سلسلے میں دبی زبان سے اعتراض کیا تھا۔ وہ ناراض ہوکر بولا اگر میں نے اس کے اجنبی دوست کی یہ شرط پوری نہ کی تو وہ حویلی' ساری دولت اور جائیداد چھوڑ کر کہیں چلا جائے گا۔ پھر میں اس کی صورت کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔"

"آپ اکلوتے بیٹے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسی بیٹے سے آپ کی نسلیں بڑھتی' پھلتی پھولتی جائیں گی۔ اس کے لیے آپ تین کروڑ کی قربانی دیں۔"

"میرا بیٹا کہتا ہے کہ میں اس کی واپسی کے لیے ڈاکوؤں کو کروڑوں روپے دے سکتا ہوں تو پھر ایک بیٹی کو دلہن بنا کر تین کروڑ کیوں نہیں دے سکتا۔ میں نے بیکار اسے اسکول اور کالج میں تعلیم دلائی۔ آباؤ اجداد کے رواج کے خلاف بولتا ہے کہ بیٹی سے حق بخشانا اور تمام عمر اس کی شادی نہ کرکے میکے میں بٹھائے رکھنا بہت بڑا ظلم ہے۔ اس لڑکے کو کیسے سمجھاؤں کہ بیٹی اتنی بڑی رقم دوسرے خاندان میں لے جائے گی۔ پھر ہمارے برابر کا خاندان دُور دُور تک نہیں ہے۔ ہم جھک کر کسی چھوٹے خاندان میں بیٹی دیں گے تو ہماری ناک کٹے گی۔"

"کیا' کیا جاسکتا ہے؟ آپ نے اس سلسلے میں کچھ سوچا ہے تو مجھے بتائیں۔ شاید میں آپ کے لیے کچھ کرسکوں۔"

وہ تھانے دار کی طرف جھک کر بولا۔ "فرض کریں۔ ڈاکو میرے بیٹے کی جگہ بیٹی کو لے جاتے تو کیا میں اس کی واپسی چاہتا؟ کبھی نہیں۔ ہمارے خاندان میں لڑکیاں اغوا کی جائیں یا گھر سے بھاگ جائیں اور پھر کبھی واپس آئیں تو ہم اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے لڑکی کو گولی مار دیتے ہیں۔ اس کی واپسی قبول نہیں کرتے کیونکہ وہ میلی ہوجاتی ہے۔"

"ہوں۔ میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ اگر کوئی آپ کی بیٹی کو اغوا کرلے تو اس

کی شادی کا معاملہ ٹل جائے گا۔ اغوا ہونے والی کی واپسی منظور نہیں ہوگی۔ وہ خود آئے گی تو اسے گولی ماردی جائے گی۔"

"ہاں' اب آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں آپ کو کھرے پچاس ہزار دوں گا۔ اب آگے آپ سوچیں اور بولیں کیا پچاس ہزار منظور ہیں۔ میں بیٹی کے لیے اس سے زیادہ نہیں دوں گا۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "میں یہ سوچتا ہوا آرہا تھا کہ آپ کا بیٹا خود ہی واپس آگیا ہے اور ڈاکو مارا گیا ہے۔ شاید مجھے پانچ ہزار بھی نہیں ملیں گے۔ اب تو آپ پچاس ہزار دے رہے ہیں۔ کون کافر انکار کرے گا؟"

"میں ابھی بیس ہزار لاکر دیتا ہوں۔ آج شام حویلی کی عورتیں درگاہ شریف چادر چڑھانے جارہی ہیں۔ میں نے بیٹے کی واپسی کی منت مانی تھی' ان کے ساتھ میری بیٹی جمیلہ بھی ہوگی۔"

"بس تو پھر آج ہی کام ہوجائے گا۔"

وڈیرا اللہ بخش وہاں سے اٹھ کر اپنی خواب گاہ کی طرف جانے لگا۔ ایسے وقت ضمیر نام کی کوئی چیز ایک باپ کے احساس کو نہیں جگا رہی تھی۔ بیٹی تو ایک دن پرائی ہونے کے لیے پیدا ہوتی ہے۔ وہ میکے سے ضرور جاتی ہے خواہ دلہن کا جوڑا پہن کر جائے' خواہ حق بخشانے کی رسم کے خلاف احتجاجاً کسی کے ساتھ بھاگ جائے یا کوئی اسے اغوا کرکے لے جائے۔ اسے تو جانا پڑتا ہے۔ اس لیے وڈیروں کا ضمیر اس معاملے میں کچھ نہیں پوچھتا' کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟ کیا بیٹی حق نہ بخشے تو باپ اسے اغوا کرا دیتا ہے؟

کریم بخش کی پیدائش کے چھ برس بعد اس کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ اللہ بخش نے دوسری شادی نہیں کی۔ حویلی میں جوان عورتوں کو ملازمہ رکھتا تھا اور ہوس کے شادیانے بجالیا کرتا تھا۔ پھر ایک بیوہ پر دل آگیا کیونکہ وہ زمین جائیداد کی مالک تھی۔ اس کی کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ اس نے شادی کا پیغام بھیجا۔ بیوہ نے کہا۔ "میں شادی کروں گی لیکن وعدہ کیا جائے کہ بیٹی ہوگی تو فرسودہ رواج پر عمل کرکے اس سے حق نہیں بخشایا جائے گا بلکہ میری ملکیت میں سے اسے حصہ دے کر اس کی شادی کرا دیں گے۔"

اللہ بخش نے وعدہ کیا۔ اس مالدار بیوہ سے شادی کی۔ شادی کے ایک سال بعد جمیلہ پیدا ہوئی۔ اللہ بخش کو بیٹی کی پیدائش ناگوار گزری تھی لیکن ناگواری کا اظہار نہیں کرسکتا تھا کیونکہ جمیلہ جوان ہوکر دلہن بن کر اپنی ماں کی دولت اور جائیداد میں سے حصہ لے کر جانے والی تھی لیکن وہ بدقسمت تھی۔ جب دس برس کی ہوئی تو ماں کا انتقال ہوگیا۔

مرحومہ کی تمام ملکیت اب اللہ بخش کی ہوگئی۔ مرحومہ کی دولت کا گھی اللہ بخش کی دولت کی کھچڑی میں مل گیا۔ کوئی اس سے جمیلہ کے حقوق کا حساب لینے والا نہیں تھا۔

اب اس کے لیے آسان ہوگیا تھا کہ بیٹی سے حق بخشاتا لیکن راجہ نواز نے اس آسانی کو دشواری میں بدل دیا۔ بڑی سختی سے کہہ دیا کہ ایک ہفتے کے اندر جمیلہ کی شادی کرکے اسے تین کروڑ روپے دیئے جائیں۔ راجہ نواز کو یہ نہیں معلوم تھا کہ جمیلہ اپنی ماں کی طرف سے کتنی دولت مند ہے۔ اس نے محض انسانیت کے ناتے ایک وڈیرے باپ کی معصوم بیٹی کے لیے انصاف کا تقاضا کیا تھا۔

وڈیرے اللہ بخش نے اپنی خواب گاہ میں آکر دروازے کو اندر سے بند کیا پھر دو چابیوں سے ایک آہنی تجوری کو کھولا۔ اس میں ہیرے جڑے ہوئے لاکھوں روپے کے زیورات اور بڑے بڑے نوٹوں کی بہت ساری گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے بیس ہزار روپے اس میں سے نکال کر تجوری کو دوبارہ مقفل کردیا۔

وہ بیس ہزار روپے جو جمیلہ کو اغوا کرانے کے لیے دیئے جارہے تھے' وہ اسی بے چاری کی دولت سے نکالے گئے تھے۔ جب وڈیرے اور تھانے دار کے درمیان حویلی میں جمیلہ کے خلاف سازش ہورہی تھی تب حویلی کے باہر کئی کلومیٹر دور نازاں اور راجہ نواز اپنی گاڑی میں سفر کررہے تھے۔ اب انہوں نے کراچی واپس جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ کاشف اکبر اور رحمان چنا وغیرہ کو اپنی ہلاکت کا یقین دلا چکے تھے۔ آئندہ کراچی میں رہ کر راجہ نواز ریڈی میڈ میک اپ کے ذریعے چہرے میں تھوڑی تبدیلی کرکے رہتا تو اسے کوئی پہچان نہ پاتا۔ نازاں برقع یا آدھے نقاب میں رہتی یا وہ بھی میک اپ کے ذریعے چہرہ تبدیل کرکے رہ سکتی تھی۔

فی الوقت وہ دونوں بہت تھکے ہوئے تھے۔ کراچی سے اندرون سندھ آنے کے بعد ان دونوں کو کہیں آرام سے رات گزارنے یا پوری نیند سونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ راجہ نواز نے ڈرائیو کرنے کے دوران میں دائیں طرف کھڑکی کے باہر دیکھا۔ بہت دور ایک نشیبی علاقے میں گھاس پھوس کی چھت والا ایک کچا مکان دیکھا۔ اس کے آس پاس کوئی دوسرا مکان نظر نہیں آیا۔ دور تک اونچی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ اس نے گاڑی کا رخ ادھر موڑتے ہوئے سڑک کو چھوڑ کر کچے راستے پر جاتے ہوئے کہا۔ "ہم دونوں کو محبت میں مسرتیں مل رہی ہیں لیکن آرام اور سکون نہیں مل رہا۔ آگے ایک مکان ہے' چل کر دیکھتے ہیں کہ ہمارے نصیب میں یہاں بھی آرام لکھا ہے یا نہیں؟"

نازاں نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ پھر اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر اپنا سر اس کے

شانے پر رکھ کر بولی۔ "ایک تم مل گئے' میرے نصیب سے مجھے سب کچھ مل گیا۔ میں پہلے ایک شہزادی تھی' دولت اور طاقت کا غرور تھا۔ زندگی میں یکسانیت تھی۔ تمہارے ساتھ رہ کر دیکھ رہی ہوں کہ زندگی کے بے شمار رنگ ہوتے ہیں اور یہ شعور حاصل ہوا ہے کہ اصل دولت اپنے مرد کا پیار ہے اور تمہارے ساتھ رہ کر میں نے ایسی قوت حاصل کی ہے جس کے آگے کاشف اکبر جیسے سیاست داں اور کروڑ پتی وڈیرے ٹوٹ پھوٹ رہے ہیں۔"

وہ سحر زدہ سا ہو کر بولا۔ "ہائے اتنے قریب نہ آیا کرو۔ دل کا فرشتہ بہکنے لگے تو پھر وہ فرشتہ نہیں رہ پاتا۔"

وہ بڑے پیار سے اس کے سینے پر مکا مارتے ہوئے بولی۔ "تم پکے بدمعاش ہو۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "ایک شوہر کو اتنی رعایت تو ملے کہ وہ اپنی بیوی کے لیے بدمعاش بن کر رہ سکے۔"

وہ اس کے بازو میں منہ چھپا کر مسکرانے لگی۔ راجہ نے ایک ایسی جگہ گاڑی روکی جہاں چاروں طرف اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ دور سڑک سے گزرنے والوں کو وہ گاڑی نظر نہیں آسکتی تھی۔ اس کی آواز سن کر ایک ادھیڑ عمر کا دبلا پتلا شخص مکان سے باہر آیا۔ نازاں اور راجہ مکان کی طرف آرہے تھے۔ وہ شخص دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "سلام سرکار! آپ کون ہیں؟"

راجہ نے کہا۔ "اگر تم یہاں برسوں سے رہتے ہو تو اپنے تجربے سے بتاؤ' ہم کون ہیں؟"

"میں تو دور سے دیکھ کر سمجھ گیا تھا' آپ سرکاری افسر ہیں۔"

راجہ نے تعریف کی۔ "بھئی تم تو بڑی تیز نظر رکھتے ہو۔ یہ زمینیں کس کی ہیں؟"

"حضور لاشاری صاحب یہاں کے مالک ہیں۔"

"اچھا تمہارے مالک کا نام حضور لاشاری ہے؟"

"جی نہیں' حضور تو ہم انہیں کہتے ہیں۔ ان کا نام پیر محمد لاشاری ہے۔ یہ جو مکان ہے' حضور نے ہمیں رہنے کے لیے دیا ہے۔ ہم چوکیداری کرتے ہیں۔ یہاں سے حضور کی زمین شروع ہوتی ہے۔ پھر پتا نہیں کہاں جاکر ختم ہوتی ہے۔ ہمیں تو یہاں سے کہیں جانے کا حکم نہیں ہے۔"

"یہاں تمہارے ساتھ اور کون ہے؟"

"میری.......... گھر والی ہے اور ایک دو برس کا بیٹا ہے۔"

"تمہارے مالک حضور لاشاری یہاں آتے رہتے ہوں گے؟"

"نہیں' مہینے دو مہینے میں کبھی ادھر سے گزر جاتے ہیں۔ ان کا کمدار چار چھ دنوں میں آتا ہے' کل ہی آکر گیا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تمہارے حضور کا کوئی آدمی آج ادھر نہیں آئے گا؟"

"جی کوئی نہیں آئے گا مگر آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

اس نے سو سو کے دس نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہیں گنتی آتی ہے تو انہیں گن کر بتاؤ' کتنے ہیں؟"

اس نے نوٹوں کو دوبار گنا۔ "یہ دس سو ہیں۔"

"اور یہ تمہارے ہیں۔"

"جی؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"بھئی۔ ہم جانتے ہیں اس صوبے کے لوگ اتنے غریب ہیں کہ ان کی زندگی میں کبھی یک مشت ایک ہزار روپے ہاتھ میں نہیں آتے۔ ہاں اگر کھیت مزدوری کے لیے اپنے بیوی بچوں کو وڈیرے کے پاس گروی رکھ دیں تو انہیں چار پانچ ہزار روپے مل جاتے ہیں۔"

"مگر سرکار! یہ ایک ہزار روپے؟"

"یہ میں تمہیں دے رہا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ میں سرکاری افسر نہیں ہوں۔ یہ میری بیوی ہے۔ ہم مسافر ہیں۔ صرف شام تک تمہارے مکان کے کسی ایک کمرے میں رہ کر چلے جائیں گے۔ اس کے بدلے تمہیں ہزار روپے دیئے جارہے ہیں۔"

"سرکار! آپ تو ہمارے مہمان ہیں۔ ہم مہمان سے کچھ نہیں لیتے۔"

"تم ہمارے رہنے کا کرایہ نہ لو مگر انعام تو لینا ہوگا اور اگر شام تک تم ہماری یہاں موجودگی کی اطلاع نہیں دوگے اور اپنے حضور تک ہماری خبر نہیں پہنچاؤ گے تو جاتے وقت اور ایک ہزار روپے انعام میں ملیں گے۔"

"ہم اپنے بچے کی قسم کھاتے ہیں' کسی کو آپ کے بارے میں نہیں بتائیں گے لیکن اچانک کوئی آسکتا ہے۔"

"کسی کو دور سے دیکھتے ہی ہمیں نیند سے جگا دینا۔ جب تک ہم سوتے رہیں' تم مکان کے باہر پہرا دیتے رہو۔ تمہاری گھر والی گھر کے اندر رہے گی۔ تمہارا اشارہ پاتے ہی وہ ہمیں خطرے سے آگاہ کردے گی۔ ہم کوئی مجرم نہیں ہیں۔ تمہیں اور تمہاری بیوی بچے کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

ان میاں بیوی کو راجہ نے اپنے تحفظ کے سلسلے میں ایک ایک بات اچھی طرح سمجھائی۔ اس کی گھر والی نے پچھلی رات کی بچی ہوئی روٹیاں اور بکریوں کا دودھ ناشتے کے لیے دیا۔ انہوں نے سوکھی پاپڑ جیسی روٹیاں دودھ میں بھگو کر کھائیں پھر ایک کمرے میں آکر اس کے دروازے کھڑکی اندر سے بند کر کے سوگئے۔

جنگ جاری رہے تو غفلت کی نیند نہیں سونا چاہیے۔ دشمن کسی وقت بھی شب خون مار سکتا ہے لیکن نازاں اور راجہ کو ایک ذرا اطمینان اس لیے ہوگیا تھا کہ ان دونوں نے اپنے دشمنوں کو اپنی ہلاکت کا یقین دلایا تھا۔ اس طریقۂ کار کے نتیجے میں اب کوئی انہیں تلاش نہیں کر رہا تھا۔

وڈیرا پیر محمد لاشاری اور اس کے کارندے کبھی کبھی اِدھر سے گزرتے تھے۔ اس روز بھی وہاں سے کسی کا گزر نہیں ہوا۔ وہ شام تک گہری نیند سوتے رہے۔ جب نازاں کی آنکھ کھلی تو مغرب کی اذان ہورہی تھی۔ اس نے راجہ نواز کو جگایا۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کھڑکی اور دروازے کے پاس آکر کان لگا کر باہر کسی کی آواز یا آہٹ سننے کی کوشش کی۔ پھر اس نے دروازے کو کھولا۔ دونوں میاں بیوی نے انہیں سلام کیا' میاں نے کہا۔ ”سرکار! سب خیریت ہے۔ ادھر کوئی نہیں آیا۔ ہم نے سوچا' روٹی کھلانے کے لیے دوپہر کو جگا دیں مگر آپ دونوں بہت تھکے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ گہری نیند سو رہے تھے۔ دروازہ بھی اندر سے بند تھا اس لیے ہم نے نہیں جگایا۔“

راجہ نے پوچھا۔ ”یہ کس وقت کی اذان ہورہی ہے۔؟“

”مغرب کی اذان ہے۔ یہاں سے کچھ دور ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔“

”او گاڈ! ہم صبح سے شام سوتے رہے۔ کیا غسل کرنے کے لیے پانی ملے گا؟“

پانی وغیرہ کی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے اچھی طرح غسل کیا۔ اس کی گھر والی نے گوشت اور سبزی پکائی تھی۔ پھر انہیں تازہ روٹیاں پکا کر دیں۔ انہوں نے لالٹین کی روشنی میں پیٹ بھر کر کھایا۔ ان کا شکریہ ادا کیا پھر وہاں سے چلتے وقت نازاں نے انہیں ایک ہزار روپے دیئے۔ وہ میاں بیوی بار بار انہیں دعائیں دیتے رہے۔ راجہ نے جھاڑیوں کے درمیان چھپی ہوئی گاڑی نکالی۔ اس کے انجن وغیرہ کو ٹارچ کی روشنی میں چیک کیا۔ پٹرول کی کمی نہیں تھی۔ دو کین فاضل پٹرول تھا۔ نازاں اگلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ راجہ نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر میزبانوں کو خدا حافظ کہہ کر ڈرائیو کرتا ہوا وہاں سے روانہ ہوگیا۔

وہ دونوں خوب سونے' نہانے اور کھانے پینے کے بعد تازہ دم ہوگئے تھے۔ نازاں نے دونوں کے اسلحہ چیک کئے۔ بُلٹس کی کمی نہیں تھی۔ ایکسٹرا میگزین بھی پوری طرح

لوڈڈ تھے۔ راجہ نے کہا۔ ”یہ اچھی بات ہے کہ تم نے محتاط رہنا سیکھ لیا ہے۔ میری اور اپنی سیکورٹی کا سامان کر رہی ہو۔“

”یہ تمہاری صحبت کا اثر ہے۔ میں تم سے ایک سپاہی بننا سیکھتی جارہی ہوں۔“

”ہمارے حالات نے تمہیں ایک جنگجو محبوبہ بنادیا ہے۔“

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”جنگجو محبوبہ کا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ میں محبوبہ بن کر تم سے لڑتی رہتی ہوں۔“

”یہ بات غلط نہیں ہے۔ بند دروازے کے پیچھے لڑتی رہی ہو۔“

اس نے محبت سے گھور کے دیکھا پھر ”بے شرم“ کہہ کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ باہر ہر سُو تاریکی تھی۔ صرف ہیڈ لائٹس کی روشنی میں آگے راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ کبھی کبھی سڑک کے اطراف چھوٹی بڑی آبادیاں نظر آتی تھیں۔ وہاں کے گھروں اور دکانوں میں لالٹین یا پٹرو میکس کی روشنیاں کہیں کہیں ہوتی تھیں ورنہ ایسی چھوٹی بستیوں میں اندھیرا ہوتے ہی کاروبارِ زندگی صبح تک کے لیے ملتوی ہوجاتا تھا۔ لوگ سرِ شام ہی گھروں میں بند ہوجاتے تھے یا کہیں پانچ دس افراد بیٹھ کر اپنی محدود زندگیوں سے تعلق رکھنے والی محدود باتیں کرتے رہتے تھے۔ ویسے عام طور پر رات کی تاریکی پھیلتے ہی تمام انسانی آبادیاں ویران ہی دکھائی دیتی تھیں۔

نازاں نے کہا۔ ”ہم تقریباً ساٹھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرچکے ہیں۔ سڑک کے اطراف ایسے کتنے ہی گوٹھ گزر چکے ہیں مگر کہیں کہیں دوچار انسان نظر آئے۔ یہ لوگ ایسی ویرانی میں زندگی گزار دیتے ہیں؟“

”ہاں۔ یہ دن کی روشنی میں نظر آتے ہیں۔ وڈیروں اور چھوٹے زمینداروں کی حویلیوں اور کھیتوں میں مزدوری کرتے ہیں۔ کوئی ایسا صنعتی ادارہ نہیں ہے کہ رات کو بھی کاروبار زندگی چلے۔ پھر ادھر بجلی کی روشنی بھی نہیں ہے۔ ان کی آدھی زندگی اندھیروں میں صبر و شکر کے ساتھ گزرتی ہے۔ یہ اس سے زیادہ نہیں جانتے کہ پیدا ہو کر اسی طرح جیتے ہوئے مرنا ہے۔ انہوں نے کبھی زندگی کا کوئی خوبصورت چہرہ نہیں دیکھا......... جس نگری میں اندھیرا ہو وہاں زندگی کا کوئی حسن کبھی دکھائی نہیں دیتا۔“

ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سڑک کے اطراف مکانات نظر آرہے تھے۔ کوئی چھوٹی سی بستی تھی۔ قریب پہنچنے پر اچانک چار سپاہی سڑک پر آگئے۔ ان کے پاس بندوقیں تھیں اور ان کا رخ نازاں اور راجہ کی طرف تھا۔ اس نے گاڑی روک کر کہا۔ ”میرا ٹی ٹی مجھے دے دو“ وہ ٹی ٹی دیتے ہوئے بولی۔ ”کیا قانون کے محافظوں پر گولی چلاؤ گے؟“

"کیا تم نے سنا نہیں یا اخبارات میں نہیں پڑھا کہ ڈاکو' پولیس کی وردیاں پہن کر واردات کرتے ہیں؟ توجہ سے سنو' میں گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے ان سے کچھ فاصلہ پر روک دوں گا۔ جیسے ہی گاڑی رکے تو دروازہ کھول کر اس دروازے کو ڈھال بنا کر ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر ان کے ہاتھوں یا پیروں میں گولیاں مارتے ہی زمین پر گر پڑنا۔"

وہ سست رفتاری سے گاڑی آگے بڑھانے لگا۔ نازاں نے پوچھا۔ "کیا زمین پر گرنا ضروری ہے؟"

"ہاں' ان چاروں کے علاوہ دوسرے ڈاکو بھی ہوسکتے ہیں۔ وہ تاریکی میں چھپ کر تم پر گولیاں چلا سکتے ہیں۔ تم فوراً ہی زمین پر گر کر محفوظ رہوگی۔"

وہ وردی والوں کی حقیقت نہیں جانتا تھا۔ پولیس والے بھی ہوسکتے تھے اس لیے انہیں صرف زخمی کرنا چاہتا تھا۔ ویسے پولیس والوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سڑک کے کنارے اپنے افسر کے ساتھ کھڑے رہتے ہیں۔ جب وہاں سے کوئی گاڑی گزرتی ہے تو صرف ایک پولیس مین سڑک پر آکر ہاتھ اٹھا گاڑی کو رکنے کا اشارہ کرتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ پُرامن شہریوں کی گاڑیاں روکنے کے لیے جارحانہ انداز میں بندوقیں دکھائی جائیں۔

وہ گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا ان چاروں کے سامنے تقریباً بارہ گز کے فاصلے پر رک گیا۔ دونوں نے اپنی طرف کے دروازے کھولے راجہ نے کہا "ایکشن" اس کے ساتھ ہی نازاں نے دروازے کو آدھا کھول کر باہر آتے ہی تڑاتڑ فائرنگ کی۔ پھر فوراً ہی زمین پر لیٹ گئی۔ اس نے تین گولیاں چلائی تھیں اور دو وردی والے گر پڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں سے بندوقیں چھوٹ گئی تھیں۔ راجہ کی فائرنگ سے بھی دو آدمی ناکارہ ہوگئے تھے۔ وہ زمین پر گرنے کے بعد تکلیف سے کراہ رہے تھے۔ باقی دو کی خاموشی سے پتا چل گیا کہ نازاں نے عجلت میں فائر کرتے ہوئے انہیں ہلاک کردیا ہے۔ وہ جلدی میں ان کے ہاتھوں اور پیروں کا نشانہ نہیں لے پائی تھی۔

وہ دونوں چند منٹوں تک زمین پر لیٹے رہے۔ راجہ نے گاڑی کے نیچے سرک کے جاکے سرگوشی کی۔ "اپنی جگہ سے لڑھکتی ہوئی گاڑی کے نیچے آجاؤ۔ میں تاریکی میں جارہا ہوں۔ ہلکی سی آہٹ پر بھی توجہ دیتی رہو۔"

سڑک پر پڑے ہوئے چار وردی والوں میں سے ایک تڑپ رہا تھا جیسے جان نکل رہی ہو۔ دو تو مرچکے تھے۔ چوتھا شخص اپنا بازو تھامے تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ اس کے قریب اس کی بندوق پڑی ہوئی تھی جسے وہ اٹھا نہیں پارہا تھا۔ جس ہاتھ سے فائرنگ کرتا

تھا' وہی بازو زخمی ہوا تھا۔

راجہ نواز لیٹے ہی لیٹے لڑھکتا ہوا سڑک کے کنارے ڈھلان پر آگیا۔ فائرنگ کے پندرہ منٹ بعد بھی جوابی فائرنگ نہیں ہوئی تھی جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا تھا کہ سڑک پر پڑے ہوئے چاروں افراد کے علاوہ اور پانچواں کوئی نہیں ہے اگر چار سے زیادہ تھے تو وہ بھاگ گئے ہیں یا پھر اس انتظار میں تھے کہ گاڑی کے کھلے ہوئے دونوں دروازوں سے نازاں اور راجہ داخل ہونا چاہیں تو ان پر گولیاں برسائی جائیں۔

دور دور کے مکانات کی کھڑکیوں سے لالٹین کی روشنیاں باہر آرہی تھیں لیکن فائرنگ کی آوازیں گونجنے کے بعد تمام کھڑکیاں بند ہوگئی تھیں۔ وہ وہاں سے اٹھ کر چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتا ہوا ایک کچے مکان کی دیوار کے پاس آیا احتیاط سے آگے بڑھتا ہوا' پنجوں کے بل چھلانگ لگا کر دوسرے مکان کی دیوار کے پاس آیا۔ وہ چھپنے کے لئے سڑک کے کنارے والے مکانات کا سہارا لے رہا تھا اور اپنی گاڑی کی ہیڈ لائٹس سے دور جارہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ سڑک سے ذرا فاصلے پر رہ کر دور تک جائے گا پھر تاریکی میں سڑک پار کرکے اسی طرح دوسری طرف چھپتا ہوا اپنی گاڑی کے چاروں طرف چکر لگا کر تاریکی میں چھپنے والوں کو تلاش کرے گا۔

وہ چھپتا ہوا وہاں تک آیا جہاں گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی نہیں پہنچ رہی تھی لیکن گہری تاریکی بھی نہیں تھی۔ وہاں بہت ہی مدھم سی روشنی میں ایک پرانی کھٹارا سی جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ اس جیپ کے پیچھے ایک شخص ریوالور لئے چھپا کھڑا تھا اور دور کھڑی ہوئی راجہ کی گاڑی کے کھلے ہوئے دروازوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ زمین پر کہنیوں کے بل رینگتا ہوا اس جیپ کے ذرا قریب پہنچ کر رک گیا۔ جیپ کے ایک طرف سے ایک شخص رینگتا ہوا ریوالور لئے ہوئے شخص کے پاس آیا۔ اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور منہ پر ڈھاٹا باندھا ہوا تھا۔ اس نے جیپ کے پیچھے آکر ریوالور والے شخص سے کہا۔ "حضور' تھانے دار صاحب! میں اس گاڑی کے بالکل قریب نہیں گیا۔ پتا نہیں وہ دونوں فائرنگ کرنے والے کہاں چھپے ہوئے ہیں۔"

تھانے دار نے کہا۔ "تم لوگ بزدل ہو۔ ایک لڑکی کو اغوا کرکے وڈیرے نادر چگی کے پاس پہنچانے میں بڑی دلیری دکھائی۔ اب مقابلے کا وقت آیا ہے تو بزدلی دکھا رہے ہو۔"

"حضور! میرے دو ساتھی آپ کی پولیس والی وردی میں تھے' وہ مارے گئے۔ ایک میں بچا ہوں۔ آپ مجھ سے اغوا کرانا چاہتے تھے' میں نے لڑکی وہاں پہنچادی۔ آپ میرے

پانچ ہزار دے دیں۔ میں چلا جاؤں گا۔"

"کتے! تجھے اپنے معاوضے کی پڑی ہے۔ یہاں میری جیپ خراب ہوگئی ہے۔ تیرے دو ساتھیوں کے ساتھ میرے سپاہیوں میں سے بھی ایک مرچکا ہے۔ دوسرا زخمی پڑا ہے۔ اس مصیبت میں ساتھ دینا چاہیے اور تو معاوضہ لے کر بھاگنا چاہتا ہے۔"

"آپ حالات کو سمجھیں اور میرے ساتھ بھاگیں۔ وہ گاڑی والے بندے چالاک مجرم ہیں۔ مقابلہ کرنا جانتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم اس گاڑی کے دونوں کھلے ہوئے دروازوں کو یہاں سے دیکھتے رہیں اور وہ پیچھے سے آکر ہمیں گولیاں مار دیں۔"

اس کی بات سنتے ہی تھانے دار نے گھبرا کر پیچھے دیکھا اسی لمحے میں راجہ نے اس کے ہاتھ پر گولی ماری۔ ڈاکو کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔ اسے کلاشنکوف سیدھی کرنے اور فائرنگ کی سمت معلوم کرنے میں جتنا وقت لگا' اتنے وقت میں راجہ نے اسے دو گولیاں ماریں۔ وہ دونوں ہی زمین پر گر پڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں سے ہتھیار نکل چکے تھے۔

تھانے دار نے اپنے زخمی ہاتھ کو پکڑ کر کراہتے ہوئے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

راجہ نے کہا۔ "یہی سوال میرا ہے۔"

"میں تلہار تھانے کا انچارج جمن راٹھور ہوں۔"

"ہوں۔ تو پولیس اور ڈاکو چولی دامن کی طرح ساتھ پڑے ہیں۔ بڑی مجبوری ہے۔ اس ملک میں تم دونوں ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔"

راجہ نے آگے بڑھ کر تھانے دار کا ریوالور اٹھایا پھر کلاشنکوف کو ایک ٹھوکر ماری۔ وہ دور اندھیرے میں کہیں چلا گیا پھر اس نے بلند آواز میں کہا۔ "میں تم سے مخاطب ہوں۔ نہ میں تمہارا نام لوں گا اور نہ ہی تم مجھے نام سے مخاطب کرو۔ گاڑی کے نیچے سے نکل کر اندر جاؤ اور ہیڈ لائٹس بجھا دو۔"

تھانے دار کراہتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔ "میرے ہاتھ سے بہت خون بہہ رہا ہے۔ مجھے فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہے۔"

"تمہارا یہ آلہ کار ڈاکو شاید مرچکا ہے۔ یا اگر مرنے کی ایکٹنگ کررہا ہے تو آخری سین میں فلم کے ولن کی طرح مرجائے گا۔ میری گاڑی میں فرسٹ ایڈ کا سامان ہے۔ تمہاری مرہم پٹی ہوجائے گی۔"

"میں......... میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ تمہارے بہت کام آؤں گا۔"

"اگر گولی مارنے کا احسان کبھی نہیں بھولو گے تو میں ایک اور گولی مار سکتا ہوں۔"

"مم.......... میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ پلیز' میرے زخم سے بہنے والا خون روک

دو۔ مرہم پٹی کردو۔"

"تم جتنی جلدی میرے سوالوں کے جواب دو گے' اتنی ہی جلدی مرہم پٹی ہوجائے گی۔ پہلا سوال' تم نے اس ڈاکو کے ذریعے کسی لڑکی کو اغوا کرایا ہے؟"

"یہ پوچھ کر کیا کرو گے؟ تم لڑکی اور اس کے گھر والوں کو نہیں جانتے ہو۔"

"میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ لڑکی انسان کی بچی ہے۔ جس پر تم نے ظلم کیا ہے تم نہیں بتاؤ گے تو میں تمہیں گولی مار کر وڈیرے نادر ٹکلی کے پاس جاکر معلوم کرلوں گا۔"

"نادر ٹکلی بہت خطرناک ہے۔ اس کی نجی جیل میں پچاس خاندانوں کے افراد قیدی بن کر رہتے ہیں۔ اس کے تمام خاص ملازم مسلح رہتے ہیں۔ تم وہاں جاؤ گے تو زندہ واپس نہیں آؤ گے۔"

"جمن راٹھور! تم اپنی بکواس میں بھول رہے ہو کہ خون بہتا جارہا ہے۔ مجھے لڑکی اور اس کے گھر والوں کا بتاؤ۔"

"تم میری بات کا یقین نہیں کرو گے۔ جب اس کے باپ نے ہی بیٹی کو اغوا کرایا ہے تو اس کے گھر والوں کا پتا پوچھ کر کیا کرو گے؟"

"بات بڑی حیران کن اور دلچسپ ہے۔ مجھے ایسے باپ سے ضرور ملنا چاہیے اور ہاں' زیادہ خون بہنے سے تم بے ہوش ہو جاؤ گے۔ بولنے کے قابل نہیں رہو گے تو میں تمہیں گولی مار کر چلا جاؤں گا۔"

"میں بتاتا ہوں' لڑکی کا نام جمیلہ ہے۔ اس کا وڈیرا باپ اللہ بخش اس کی شادی نہیں کرانا چاہتا مگر اس کا جوان بیٹا کریم بخش بضد ہے اور کہتا ہے کہ اس کی بہن سے حق نہ بخشایا جائے۔ وہ بیٹے کو ناراض نہیں کرنا چاہتا اس لئے اس نے بیٹے کی لاعلمی میں بیٹی کو اغوا کرا دیا ہے۔"

راجہ نواز کا دماغ ایک دم سے سُن ہوگیا۔ چند لمحوں تک وہ سوچنے کے قابل نہیں رہا۔ باپ اور بھائی کے لئے بیٹی غیرت ہوتی ہے۔ اس ملک میں کتنے لوگ ہیں جو ۱۴ اگست کو اپنے محلوں اور حویلیوں پر جوان بیٹیوں اور بہنوں کے پھٹے ہوئے آنچل لہرا کر غیرت مند بنتے ہیں اور پوری قوم کو بے غیرتی کے وہ آنچل دور سے پاکستانی پرچم نظر آتے ہیں۔

راجہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ تھانے دار سے ایک قدم پیچھے چلا گیا۔ دونوں ہاتھوں سے ٹی ٹی کو تھام کر اس کا نشانہ لیا۔ وہ تڑپ کر بولا۔ "یہ کیا کررہے ہو؟"

"میں تنہا اپنے وطن سے تمام بے غیرتوں کو ختم نہیں کرسکوں گا لیکن میرے اس عمل کے بعد پاکستان کا ہر جوان صرف ایک بے غیرت ختم کرے تو انشاء اللہ ہمارے وطن

عزیز کی نیک نامی واپس آجائے گی۔"

یہ کہتے ہی اس نے ٹھیک دل کی جگہ گولی ماردی۔ وہ ذرا سی دیر میں تڑپ کر مرگیا۔ بس اتنی سی زندگی تھی اور اتنی سی زندگی کے لئے خود غرض لوگ پوری قوم کو تباہ کرکے جاتے ہیں۔ راجہ نے ڈاکو کو ایک ٹھوکر مار کر کہا۔ "یہ تھانے دار مرچکا ہے۔ اپنی موت کا ڈراما نہ کرو' تھانے دار کی جیب میں ہزاروں روپے ہوں گے۔ تم انہیں لے جاسکتے ہو۔ میں جس طرح دبے پاؤں آیا تھا' اسی طرح جارہا ہوں۔"

وہ چپ ہوگیا۔ چاروں طرف گہری خاموشی چھاگئی۔ وہ ڈاکو کئی منٹ تک بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر اس نے ذرا سی آنکھ کھول کر دیکھا۔ کوئی نظر نہیں آیا۔ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا پڑتا ہے۔ اس نے دونوں آنکھیں کھول کر سر اٹھا کر غور سے اِدھر اُدھر دیکھا جو موت بن کر آیا تھا' وہ جاچکا تھا۔ وہ بڑی دیر سے اپنے زخموں کی تکلیف برداشت کر رہا تھا۔ تکلیف سے کراہنے پر قابو پارہا تھا تاکہ سچ مچ اسے مُردہ سمجھ لیا جائے۔

وہ اپنی چالاکی میں کامیاب رہا تھا۔ اس نے اطمینان کے لئے جیپ کے دوسری طرف جاکر دیکھا۔ وہاں راجہ موت کے سائے کی طرح کھڑا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "میں پہلے کہہ چکا تھا کہ تم اگر زندہ ہو تو آخری سین میں فلم کے ولن کی طرح مرجاؤ گے۔"

یہ کہتے ہی اس نے گولی ماردی۔ تھانے دار کی جیبوں سے نوٹوں کی گڈی نکالی پھر بلند آواز سے کہا۔ "میں ٹھیک گاڑی کے سامنے سے آرہا ہوں' گولی نہ چلانا۔"

وہ آہستہ آہستہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا گاڑی کے پاس آیا پھر اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ کر دروازے کو بند کرکے سر کو جھکا لیا۔ نازاں نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟ کیا تمام دشمن مرچکے ہیں؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "ہاں سب مرچکے ہیں۔ میں بھی اندر سے مررہا ہوں۔"

وہ فوراً ہی کھسک کر قریب ہوکر بولی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

وہ اسے جمیلہ کے اغوا کے متعلق بتانے لگا۔ وہ تمام باتیں سن کر بولی۔ "خدا کرے جمیلہ صرف اغوا کی گئی ہو اور اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کی گئی ہو۔ ہم اسے واپس لائیں گے۔"

"انشاء اللہ ضرور واپس لائیں گے مگر میں نادر گچکی اور اس کے دو جوان بیٹوں کو جانتا ہوں۔ بہت ہی بے رحم اور عیاش ہیں۔ خدا کرے جمیلہ پر آنچ نہ آئی ہو۔"

اس نے موبائل نکال کر رابطہ کیا پھر کہا۔ "ہیلو "وہ تُو" میں راجہ ہوں۔"

"یس سر! بول رہا ہوں۔ سر نے لندن سے آپ کی خیریت پوچھی ہے۔"

"میں حمزہ بھائی سے بات کروں گا۔ ابھی تم ایک بڑے آپریشن کے لئے فوراً چل پڑو۔ ہمیں کم از کم پندرہ جانبازوں کی ضرورت ہوگی۔ ضروری اسلحے کے علاوہ ٹیئر بم' گیس بم اور ہینڈ گرینیڈ ساتھ رکھو۔ نادر گچکی کے نجی جیل خانے سے تمام قیدیوں کو اور حویلی کی قیدی عورتوں کو رہائی دلا کر اس حویلی کو کھنڈر بنانا ہے۔ میں وہاں دو گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔ اس علاقے کے آس پاس جو جانباز ہیں' ان سے کہو حویلی کے پیچھے دو کلو میٹر کے فاصلے پر میں ایک لینڈ کروزر میں انتظار کروں گا۔ اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"صرف یہ کہ میں آپ سے بہت دور ہوں۔ صبح تک پہنچ سکوں گا۔"

"کوئی بات نہیں۔ فی الحال جانبازوں کو روانہ کرو۔"

اس نے فون بند کرکے گاڑی اسٹارٹ کی پھر اسے آگے بڑھا دیا۔ یہاں میں بنام محی الدین نواب بحیثیت مصنف یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ابھی اس داستان کے چند مثبت کردار امیر حمزہ' راجہ نواز' جمشید' لیڈی سرجن آمنہ' فرمان علی تاباں اور مراد چنگیزی وغیرہ ہیں۔

چند قارئین کرام کو یہ داستان پڑھنے سے یوں لگتا ہے جیسے یہ تمام مذکورہ کردار سپرمین ہیں اور ہر مرحلے پر کامیابیاں حاصل کرتے جارہے ہیں۔ جواباً عرض ہے کہ یہ تمام کردار داستان کی ابتدا سے کامیابیوں کے ساتھ ناکامیوں کا منہ بھی دیکھتے آرہے ہیں۔ ابتدا میں امیر حمزہ نے کامیابی سے کیٹی بندر گاہ کا معاہدہ' دستاویزی ثبوت کے طور پر حاصل کیا۔ اس کے نتیجے میں کاشف اکبر کو مجرم قرار دیا جانا چاہیے تھا لیکن وہ آج بھی ایک معزز سیاست داں کی حیثیت سے الیکشن لڑنے والا ہے۔

امیر حمزہ نے تھر کی تین کم سن معصوم بچیوں کو شکاریوں سے بچانے کی بھرپور کوششیں کیں لیکن ناکام رہا۔ حتیٰ کہ غیر ملک سے آنے والے شکاری بھی عزت و احترام کے ساتھ اپنے ملک واپس چلے گئے۔

جمشید "را" کے ایجنٹوں تابانی اور مراد کو گرفتار کرانے اور انہیں سزا دلانے کی ہر ممکن کوششیں کررہا ہے مگر ناکام جارہا ہے۔

لیڈی سرجن آمنہ عالمی سطح پر کامیابیاں حاصل کرنے کے باوجود اپنا شوہر' اس کی دولت اور جائیداد ہار چکی ہے اتنی بدقسمت ہے کہ اب تک اپنے جوان بیٹے فرمان علی کے روبرو نہیں آئی ہے۔ قسم کھائی ہے کہ فرمان اس کے دشمن شمشیر سنگھ کالیا کو گھٹنے ٹیک کر

ماں کے قدموں میں گرائے گا تب وہ بیٹے کی صورت سامنے آکر دیکھے گی اور فرمان ماں کی قسم پوری کرنے میں ناکام ہورہا ہے۔

امیر حمزہ اور انیلا لندن میں یہ ثابت نہ کرسکے کہ نیک بخت انیلا کو دوبار قتل کرانے کی کوشش کرچکا ہے۔

اس داستان کے تمام مثبت کردار جتنے زبردست ہیں' منفی کردار بھی ویسے ہی زہریلے ہیں۔ اگر تمام مثبت کردار ہر مرحلے پر کامیاب ہوتے تو منفی کردار' قوم کی رگوں میں بے حسی' بے شعوری اور بزدلی کا زہر نہ پھیلاتے رہتے۔

اگر داستان ایک فینٹسی ہوتی یا خیالی ہوتی تو اس میں سپرمین قسم کے ہیروز پیدا کئے جاسکتے تھے۔ ان سطروں میں وہی کچھ لکھا جارہا ہے جو ہمارے آپ کے آس پاس ہورہا ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان میں امیر حمزہ' راجہ نواز' جمشید اور فرمان علی نہیں ہیں تو یہ ہم سب کی توہین ہے کہ اس پاک سرزمین پر مجاہدین نہیں ہیں۔ جو یہ سمجھتا ہے' وہ کم از کم اپنا سر جھکا لے اور سوچے کہ۔

غیروں کی اطاعت سے خادم بنے حاکم
اب تم ہی کہو حفظِ وطن کون کرے گا؟
آغاز جنوں' مشقِ سخن کون کرے گا
اس آگ کے دریا کو چمن کون کرے گا؟

☆======☆======☆

جمشید اور تابانی ایک دوسرے کے لئے سیر پر سوا سیر بنے ہوئے تھے۔ جمشید جانتا تھا کہ تابانی کے پیچھے بڑے لمبے اور مضبوط ہاتھ ہیں۔ ان کی مدد سے وہ پولیس کے سخت پہرے کے باوجود فلائنگ کائٹ کے ذریعے ایسی حکمتِ عملی سے فرار ہوا تھا جس کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

اور تابانی نے دل ہی دل میں یہ تسلیم کرلیا تھا کہ اگر وہ لوہا ہے تو جمشید مقناطیس ہے۔ وہ فرار ہوکر جہاں جہاں جائے گا جمشید مقناطیس کی طرح اس کی طرف کھنچا چلا آئے گا۔ اتنا ضدی' مستقل مزاج مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہے کہ دنیا کے آخری سرے تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔

اسپتال کا محاصرہ کرنے والے قانون کے محافظ تابانی کے فرار ہونے کا تماشا دیکھتے رہ گئے۔ اس کا تعاقب کرنے والی موبائل پولیس فورس کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی اور آگے

بڑھنے کے بعد بھی تابانی کے نقشِ پا تک نہیں پہنچ سکتی تھی لیکن جمشید موت کے فرشتے کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اگرچہ وہ دونوں ایک دوسرے کی نظروں میں نہیں تھے لیکن ایسے تربیت یافتہ تھے کہ اپنی اپنی ذہانت سے کام لے کر سمجھ رہے تھے کہ فرار ہونے والا کیسی کیسی راہیں اختیار کرے گا اور اپنے راستے بدلتا جائے گا۔ تابانی سمجھ رہا تھا کہ اس کا تعاقب کرنے والا کہیں آگے چل کر اس کی راہ میں کیسی رکاوٹیں پیش کرسکتا ہے۔

جمشید نے ایک تھانے میں پہنچ کر دیکھا' اس کا گیٹ بند تھا۔ اندر تین چار سپاہی سورہے تھے۔ اس نے موٹر سائیکل سے اتر کر گیٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ جھنجوڑتے ہوئے آواز دی۔ "یہ گیٹ کھولو۔ باہر آؤ۔"

پہلے تو خاموشی رہی پھر بار بار گیٹ کو جھنجوڑنے کے باعث ایک سپاہی بنیان اور شلوار پہنے' ایک ہاتھ میں بندوق اور دوسرے ہاتھ میں ٹارچ لئے آیا پھر چلا کر بولا۔ "اوئے کھوتے دا پتر۔ کیوں شور مچا رہا ہے؟ کیا تیری ماں مرگئی ہے؟"

"ابھی تمہاری ماں مرے گی گیٹ کھولو۔"

دوسرا سپاہی بھی بنیان اور شلوار پہنے بڑبڑاتا ہوا آیا۔ "اتنی رات کو کون کتا بھونک رہا ہے؟"

جمشید نے گن والے سپاہی کے ہاتھ پر گولی ماری۔ وہ چیختا ہوا دیوار سے جاکر لگ گیا۔ گن نیچے گر پڑی تھی۔ دوسرا خالی ہاتھ تھا۔ جمشید نے پوچھا۔ "نیچے پڑی ہوئی گن اٹھا کر مرنا چاہو گے یا گیٹ کھولو گے؟"

وہ سہم کر بولا۔ "جا.......... چابی لاکر گیٹ کھولتا ہوں' گولی نہ چلانا۔"

وہ الٹے قدموں اندر گیا۔ جمشید نے موٹر سائیکل وہیں چھوڑی۔ احاطے کی دیوار کے پاس جھکتا ہوا گیا۔ پھر تھانے کے پیچھے دیوار پھاند کر اندر آگیا۔ پیچھے ایک لکڑی کی سیڑھی تھی جس کے ذریعے چھت پر جاتے تھے۔ وہ دوسرا سپاہی ایک بندوق لئے سیڑھی کی طرف جارہا تھا تاکہ چھت پر سے گیٹ پر آنے والے پر فائر کرسکے۔

جمشید تاریکی میں دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ سپاہی سیڑھی پر چڑھتا ہوا جب چھت کے قریب پہنچا تو جمشید نے سیڑھی کو ایک لات ماری۔ ایک ہی ٹھوکر میں سیڑھی ایسی گری کہ وہ بلندی سے چیختا ہوا نیچے آکر اوندھے منہ گر پڑا۔ تکلیف سے کراہتے ہوئے دوسرے سپاہی کو پکارنے لگا۔ تھانے کے پیچھے انچارج کی رہائش کے لئے ایک بڑا سا کوارٹر تھا۔ اندر سے انچارج نے نیند بھری آواز میں ڈانٹ کر پوچھا۔ "یہ کون چلاتا ہے؟ یہاں کیا ہورہا ہے؟"

گرنے والے نے کہا۔ "جناب عالی! یہاں کوئی ڈاکو آگیا ہے۔ اس نے رحیم داد کو فائر کرکے زخمی کیا ہے۔ مجھے چھت پر سے گرا دیا ہے۔ آپ باہر نہ آئیں۔ دروازہ نہ کھولیں۔"

جمشید نے تاریکی میں ایک محفوظ جگہ پر پہنچ کر کہا۔ "میں آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی ہوں۔ تھانہ انچارج کو حکم دیتا ہوں فوراً باہر آئے ورنہ تم سب کو لائن حاضر کیا جائے گا۔"

کوارٹر کے اندر اور باہر بلب روشن ہوگئے۔ انچارج نے پہلے ایک کھڑکی کو کھول کر باہر دیکھا۔ جمشید نے اپنا آئی ڈی کارڈ کھڑکی کی طرف بڑھایا۔ انچارج نے اسے لے کر پڑھتے ہی بنیان اور نیکر میں اٹینشن ہوکر سیلوٹ کیا پھر عاجزی سے بولا۔ "سر! جسٹ اے منٹ میں وردی پہن کر آتا ہوں۔"

پھر اس نے اونچی آواز میں سپاہیوں سے کہا۔ "بڑے صاحب آئے ہیں۔ تھانے میں روشنی کرو' میں آرہا ہوں۔"

وہ تاریکی میں ڈوبا ہوا پولیس اسٹیشن جو ویران نظر آرہا تھا۔ ذرا سی دیر میں روشن ہوگیا۔ انچارج اور چھ سپاہی وردی پہن کر حاضر ہوگئے۔ جس سپاہی کو گولی لگی تھی' وہ اپنا زخمی ہاتھ تھامے دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ جس سپاہی نے جمشید کو کہا تھا کہ اتنی رات کو کون کتا بھونک رہا ہے' اس کے منہ پر جمشید نے الٹا ہاتھ رسید کرتے ہوئے پوچھا۔ "کوئی مصیبت زدہ فریادی یہاں مدد حاصل کرنے آئے تو تم لوگ اسے کتا سمجھتے ہو؟"

وہ گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا۔ جمشید نے اسے دوسرا ہاتھ مارا۔ وہ فرش پر گر پڑا۔ پھر جمشید نے اسے ٹھوکریں مارنے کے بعد انچارج سے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ یہ تمہاری ڈیوٹی کا وقت نہیں ہے لیکن تمہارے ماتحت سپاہی تمہاری غیرذمہ داری کے باعث ہڈ حرام ہیں۔ ڈیوٹی کے وقت تھانے میں اندھیرا کرکے گہری نیند سوتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی ہے۔ پھر بھی ان کی نیند پوری نہیں ہوئی ہیڈ کوارٹر میں تم سب سے جواب طلبی ہوگی۔"

انچارج نے عاجزی سے کہا۔ "سر! ہم نے یہاں قانون کا بول بالا رکھا ہے۔ یہاں کوئی چھوٹی سی بھی واردات نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے ہم رات کو بھی مطمئن رہتے ہیں۔"

"مطمئن رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ڈیوٹی کے وقت آرام فرمایا جائے اور جسم پر وردی بھی نہ ہو اور یہاں آنے والوں کو کتا سمجھا جائے۔"

"سر! ہم شرمندہ ہیں۔ آپ سے التجا کرتے ہیں کہ ہماری آج کی غلطی معاف

کردیں۔ آئندہ آپ جب بھی سرپرائز چیکنگ کے لئے آئیں گے تو ہمیں ڈیوٹی کے وقت مستعد پائیں گے۔"

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں ایک مفرور مجرم کا پیچھا کررہا ہوں۔ مجھے ایک بہت ہوشیار اور تجربہ کار کھوجی کی ضرورت ہے۔ ابھی اپنی گاڑی میں سپاہیوں کے ساتھ کھوجی کو لے چلو۔ وہ ضرور اس کا سراغ لگائے گا۔"

انچارج نے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ تھانے کی جیپ نکالے اور دوسرے سپاہی سے کہا کہ وہ دوڑ کر جائے اور نورا نامی کھوجی کو فوراً بلا کر لائے۔ جمشید جو احکامات دے رہا تھا اس کی فوراً تعمیل کی جارہی تھی۔

جب آفتاب طلوع ہورہا تھا تب تابانی' جمشید سے کئی کلومیٹر دور جا چکا تھا۔ تابانی نہیں جانتا تھا کہ جمشید اب بھی صحیح سمت میں اس کا تعاقب کررہا ہے یا نہیں؟ لیکن یہ مانتا تھا کہ بہت ذہین اور چالباز جاسوس ہے' بھٹکتے بھٹکتے بھی کسی طرح سراغ لگا کر اس کی شہ رگ تک پہنچنے کی کوششیں کرتا رہے گا۔

کئی میل تک دوڑتے رہنا معمولی بات نہیں تھی۔ وہ کبھی دوڑتا تھا اور کبھی تیزی سے چلتا تھا۔ ہانپتے رہنے کے باوجود رکتا نہیں تھا۔ بڑا جی دار تھا۔ نہ تھکن محسوس کررہا تھا اور نہ ہی اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ صبح کی ہلکی سی روشنی پھیلنے لگی تو اس نے ایک جگہ رک کر موبائل فون کے ذریعے "را" کے ایک زونل افسر امرناتھ چھاگلا سے رابطہ کیا۔ وہ اسلام آباد میں "را" کا زونل افسر تھا اور اس کی گائیڈ لائن کے مطابق مراد اور تابانی کام کرتے تھے۔

تابانی نے کہا۔ "سر! شاید آپ تک خبر پہنچ گئی ہوگی کہ میں اسپتال سے فرار ہوگیا ہوں۔"

"ہاں مجھے خبر مل چکی ہے لیکن یہ مضحکہ خیز خبر سن کر حیران ہوں کہ تم مرد ہو اور تمہیں عورت کہا جارہا تھا۔ مجھے جو رپورٹ ملی ہے' اس سے پتا چلا ہے کہ تم ماں بننے والے ہو اسی لئے تمہیں ابتدائی علاج کے لئے اسپتال لے جایا گیا تھا۔"

"سر! ان باتوں کا میرے موجودہ حالات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ فوراً میری مدد کے لئے کچھ کریں۔"

"تم جہاں ہو' وہاں تمہارے لئے کوئی گاڑی پہنچادی جائے گی۔ اسلحہ اور رقم بھی پہنچادی جائے گی۔"

"میں لاہور سے فرار ہوکر جنوب کی سمت جارہا تھا۔ ایک اونچے درخت میں میری

فلائنگ کائٹ الجھ گئی۔ وہاں سے میں کھیتوں اور ویرانوں میں کئی کلومیٹر تک دوڑتا آیا ہوں۔ جمشید نامی ایک جاسوس میرے تعاقب میں ہے۔ اس ایک جاسوس سے میں نمٹ لوں گا۔ ابھی میرے چاروں طرف دور تک کھیت ہی کھیت اور کہیں کچے مکانات نظر آرہے ہیں۔ میں کسی چھوٹے ٹاؤن یا بڑے شہر پہنچ کر فون کروں گا۔ آپ میرے فون کا انتظار کریں۔"

"میں انتظار کروں گا جو بھی گاڑی لے کر آئے گا' وہ تمہیں قصور کی سمت لے جائے گا۔ وہاں سے تم بہ آسانی بارڈر پار کرسکو گے۔"

"میں مراد کے بغیر سرحد پار کرکے انڈیا نہیں جاؤں گا۔"

"اٹس مائی آرڈر۔ تمہیں اپنے اسکیپ کو کامیاب بنانا ہوگا۔"

"ہم آپ کے حکم پر عمل کرتے آئے ہیں لیکن میں یہاں آنے سے پہلے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ سے کہہ چکا تھا کہ میں مراد کے بغیر نہ کسی مشن پر جاؤں گا اور نہ اسے کہیں بے یارو مددگار چھوڑ کر آؤں گا۔"

"مراد سے تمہاری گہری دوستی سہی لیکن کسی بھی مشن کے دوران میں صرف اپنے مقاصد کو اہمیت دی جاتی ہے' دوستی کو نہیں۔"

"مراد صرف میرا دوست نہیں' جیون ساتھی بھی ہے۔ میرے ہونے والے بچے کا باپ بھی ہے۔"

زونل افسر نے حیرانی سے کہا۔ "یہی تو میں پہلے تم سے پوچھ رہا تھا۔ مجھے درست رپورٹ دی گئی ہے۔ یعنی کہ تم عورت ہو' مرد نہیں ہو۔"

وہ سخت لہجے میں بولا۔ "آپ میرے سینئر ہیں' کوئی دوسرا مجھے عورت کہتا تو میں اس کا منہ توڑ دیتا۔ میں مرد ہوں مرد' ڈیپارٹمنٹ کے تمام اعلیٰ افسران جانتے ہیں کہ میں مرد ہوں اور تنہا درجنوں مردوں کا مقابلہ کرکے ان کے ہاتھ پاؤں توڑ سکتا ہوں۔ انہیں نرک میں پہنچا سکتا ہوں۔"

زونل افسر نے کہا۔ "میں نے تمہارا ریکارڈ پڑھا ہے۔ تمہیں غصہ ور اور بہت ہی خطرناک فائٹر کہا گیا ہے اور یہ تاکید کی گئی ہے کہ تمہیں بڑی نرمی سے ہینڈل کیا جائے اس لئے میں افسر ہوکر تمہاری بدمزاجی برداشت کررہا ہوں مگر یہ بتاؤ تم مراد کے بچے کی ماں بن رہے ہو تو کیا تمہیں ماں نہیں کہا جائے گا؟"

"نہیں۔ مجھے بچے کی ماں نہیں' بچے کا ماں بولا جائے اور پلیز' اس سلسلے میں بحث نہ کی جائے تو بہتر ہے۔ میں بعد میں فون کروں گا۔"

وہ آہستہ آہستہ کھیتوں سے گزرتا ہوا باتیں کرتا جارہا تھا پھر فون بند کرکے دوڑنے لگا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ کسی سمت بھی بھاگتا رہے گا تو کسی پختہ سڑک تک یا کسی چھوٹے بڑے شہر تک پہنچ جائے گا۔

ویسے وہ جنوب کی سمت ہی دوڑ رہا تھا۔ اس کے پاس قطب نما آلہ تھا جس کے ذریعے وہ کسی سمت کا تعین کرسکتا تھا۔ آخر وہ کبھی تیزی سے چلتے ہوئے اور کبھی دوڑتے ہوئے ملتان جانے والی سڑک پر آگیا۔ ایک بس دور سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ سڑک کے کنارے کانٹے دار جھاڑیاں تھیں' ان کے درمیان سے گزرتے وقت اس کی قمیض کی آستین الجھ گئی۔ کپڑا پھٹنے کے باعث آستین کی دھجی کانٹوں میں پھنس کر رہ گئی۔ بس قریب آرہی تھی۔ اسے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے بس کو روک کر اس میں سوار ہوگیا۔ کئی گھنٹوں تک دوڑتے رہنے کے بعد اسے آرام سے جانے کے لئے ایک عوامی بس مل گئی تھی۔

بس کی تیز رفتاری کے باعث وہ جمشید سے بہت دور ہوتا جارہا تھا۔ جمشید تھانے کی جیپ کے ساتھ اپنی موٹر سائیکل پر جارہا تھا۔ کھوجی کہیں کہیں جمشید کو اور تھانے والوں کو روک کر اتارتا تھا۔ پھر قدموں کے نشان تلاش کرتا تھا۔ تابانی نے کینوس کے جوتے پہنے تھے۔ ان علاقوں میں کھیتوں کے آس پاس ایسے مہنگے کینوس کے جوتے پہننے والے شاذو نادر ہی ہوں گے۔ کھوجی ایسے ہی جوتوں کے نشانات دیکھتا آرہا تھا۔ یہ نشانات کہیں گھاس وغیرہ کے باعث گم ہوجاتے تھے اور کہیں نظر آنے لگتے تھے۔

ایسے ہی وقت تھانے کی پرانی جیپ کا ایک پہیا پنکچر ہوگیا۔ ایسی صورت میں وہ سب آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ جمشید نے کھوجی کو اپنے پیچھے بٹھالیا۔ پھر تھانے والوں کو وہیں چھوڑ کر آگے جانے لگا۔ آدمی مایوس نہ ہو اور مستقل مزاجی سے منزل تک پہنچنا چاہے تو آخر کار پہنچ ہی جاتا ہے۔

وہ ملتان جانے والی سڑک پر اسی جگہ پہنچا جہاں جھاڑیوں کے کانٹوں میں تابانی کی آستین کی ایک دھجی الجھی ہوئی تھی۔ کھوجی ادھر اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "صاحب جی! وہ دیکھیں' کیا اس کپڑے کو پہچان سکتے ہیں؟"

جمشید نے موٹر سائیکل سے اتر کر قریب آکر دیکھا۔ اس نے پچھلی شام تابانی کو اسی رنگ کی شلوار قمیض میں دیکھا تھا۔ اسی سوتی پرنٹڈ کپڑے کی وہ دھجی تھی۔ کھوجی سڑک پر آکر بولا۔ "ادھر انہی جوتوں کے نشان ہیں۔ یہاں کوئی بس یا کار وغیرہ آکر رکی ہوگی۔ مجرم اس میں سوار ہوکر گیا ہے۔ کیونکہ آگے پیچھے سڑک پر کہیں بھی جوتوں کے نشان نہیں

ہیں۔"

وہ موٹر سائیکل پر آگیا پھر کھوجی کے ساتھ ملتان جانے والی سمت اپنی گاڑی تیز رفتاری سے دوڑانے لگا۔ بسیں مختلف اسٹاپس پر رکتی جاتی ہیں۔ اس طرح بسوں کی تیز رفتاری کے باوجود وہ دوسری گاڑیوں کے مقابلے میں دیر سے منزل تک پہنچتی ہیں۔

تابانی نے سوچا تھا کہ پندرہ بیس کلومیٹر آگے جاکر بس سے اتر جائے گا۔ یہ اندیشہ تھا کہ جمشید اس کے تعاقب میں اس سڑک پر آسکتا ہے۔ تقریباً بارہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ دور سے ایک موٹر سائیکل آتی ہوئی دکھائی دی۔ اتنی دور سے جمشید پہچانا نہیں گیا۔ تابانی نے سوچا' جمشید کو تنہا ہونا چاہیے لیکن اس کے پیچھے ایک اور شخص بیٹھا ہوا ہے یہ شاید جمشید نہیں ہے۔

بس ایک جگہ دو مسافروں کو اتارنے کے لئے رکی۔ موٹر سائیکل اپنی رفتار سے چلی آرہی تھی۔ بس پھر چل پڑی لیکن فاصلہ اتنا کم ہوگیا تھا کہ جمشید صاف طور سے نظر آنے لگا۔ تابانی کا ہاتھ ایک دم سے قمیض کے اندر شلوار کے نیفے پر آیا۔ وہاں ریوالور تھا۔ بس کے اندر مسافروں کی خاصی بھیڑ تھی۔ وہ ان کے درمیان سے گزرتا ہوا بس کے درمیانی حصے میں آگیا۔ اس کی تدبیر یہ تھی کہ جمشید اگر اگلے دروازے سے آئے گا تو وہ پچھلے دروازے سے فرار ہوگا اور وہ پچھلے دروازے سے داخل ہوگا تو یہ اگلے دروازے سے فرار ہوسکے گا۔

وہ موٹر سائیکل کی رفتار بڑھاتے ہوئے بس کے برابر آیا۔ پھر اور آگے بڑھ کر بس ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔ بس کی رفتار سست ہونے لگی۔ تابانی مسافروں کے درمیان کھڑا جمشید سے نمٹنے کے لئے بالکل تیار تھا۔ بس رک گئی۔ جمشید نے موٹر سائیکل کو بس کے آگے لاکر روک دیا۔ پھر وہاں سے اتر کر اگلے دروازے کی طرف آیا۔ تابانی تیزی سے مسافروں کو دھکا دیتا ہوا پچھلے دروازے پر آیا۔ جمشید اسے تلاش کرنے آگے سے سوار ہوا۔ وہ پیچھے سے اتر کر جھک کر دوڑتا موٹر سائیکل کے پاس آیا۔ وہاں کھوجی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ریوالور سے اس کے بازو پر گولی ماری۔ وہ چیختا ہوا ایک طرف جاکر گرا۔

تابانی نے موٹر سائیکل پر سوار ہوتے ہی چابی گھمائی۔ اسے اسٹارٹ کیا۔ جمشید نے مسافروں کے درمیان اسے تلاش کرنے کے دوران میں فائر کی آواز سنی۔ پلٹ کر دیکھنا چاہا مگر بھیڑ کے باعث تابانی اور موٹر سائیکل کو نہ دیکھ سکا۔ کھوجی کے چیخنے سے سمجھ میں آیا۔ اس وقت تک تابانی موٹر سائیکل کی رفتار بڑھاتا ہوا دور جارہا تھا۔ جمشید نے ریوالور نکالتے ہوئے سڑک پر آکر اس کا نشانہ لینا چاہا لیکن یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ شوٹنگ رینج سے

دور نکل گیا ہے۔ پھر بھی اسے دہشت زدہ کرنے کے لیے فائرنگ کی لیکن وہ دہشت زدہ ہونے والا نہیں تھا۔ موٹر سائیکل کو دائیں بائیں لہراتا ہوا دور ہوتا چلا گیا۔ کئی مسافر بس سے اتر کر آگئے تھے۔ جمشید نے ڈرائیور سے کہا۔ "یہ بے چارہ زخمی ہوگیا ہے۔ اسے آگے کسی اسپتال تک پہنچاؤ۔"

دو مسافر کھوجی کو سہارا دے کر بس میں لائے۔ بس اسٹارٹ ہوکر چلنے لگی۔ جمشید نے اپنا آئی ڈی کارڈ مسافروں کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "میں پولیس افسر ہوں۔ اس بھاگنے والے مجرم کا پیچھا کر رہا ہوں۔ آگے جو بھی آبادیاں اور اسپتال آئے' اس زخمی کو لے جاکر اس کی مرہم پٹی کرا دو۔ میں اس بس میں اس کا پیچھا کروں گا۔"

لیکن تابانی سیدھی سڑک پر جانے کی نادانی نہیں کرسکتا تھا۔ بس کو بہت پیچھے چھوڑتے ہی وہ بائیں طرف کھیتوں اور چند مکانوں کے درمیان سے گزرتا چلا گیا۔ ادھر بس اپنے روٹ پر دوڑتی چلی گئی۔ دونوں کے راستے الگ ہوگئے جمشید کو معلوم نہ ہوسکا کہ تابانی کس طرح ڈاج دے گیا ہے۔ اگرچہ وہ بس کے اندر رہ کر دائیں بائیں کھڑکیوں سے باہر دیکھتا جارہا تھا لیکن وہ موٹر سائیکل سڑک چھوڑنے کے بعد نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔

دونوں کے ستارے ٹکراتے ٹکراتے رہ جاتے تھے۔ ابھی تقدیر کو منظور نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ جمشید کی موٹر سائیکل حاصل کرنے کے بعد وہ دن کے گیارہ بجے تک کھیتوں' میدانوں اور جنگلوں سے گزرتا رہا۔ پھر گاڑی رک گئی۔ پٹرول ختم ہوگیا تھا۔ پیچھے پٹرول سے بھرا ہوا کین رکھا ہوا تھا۔ وہ کین اٹھا کر ٹنکی میں پٹرول ڈالنے لگا۔

ایسے وقت میں وہ سوچ رہا تھا کہ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اس موٹر سائیکل سے پیچھا چھڑا لینا چاہیے۔ اسے کہیں گھنی جھاڑیوں کے اندر جاکر چھپا دینا چاہیے تاکہ جمشید راستہ بدل کر ادھر سے گزرے تو اسے اپنی موٹر سائیکل نظر نہ آئے اور وہ یہ نہ سمجھ پائے کہ ادھر سے تابانی کا گزر ہوا ہے۔

پٹرول ڈال کر کین کو پیچھے باندھتے وقت اسے آہٹ سنائی دی۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ ایک قد آور شخص کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بڑے ہی چکنے جوان ہو' کیا اکیلے ہو؟"

"ہاں اکیلا تھا۔ اب تو تم آگئے ہو اور آنے سے پہلے تم بھی اکیلے تھے۔"

"میں لاہور جارہا ہوں۔ مجھے اس گاڑی کی ضرورت ہے۔"

"مگر میں لاہور نہیں جارہا ہوں۔"

وہ جیب سے ایک چاقو نکال کر اسے کھولتے ہوئے بولا۔ "لاہور جانے کے لئے مجھے تمہاری نہیں صرف گاڑی کی ضرورت ہے۔"

تابانی چاہتا تو ریوالور نکال کر اس کے چاقو کی دہشت کو صفر کردیتا لیکن اس نے سہم کر دور ہٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے نہ مارو' یہ گاڑی لے جاؤ۔"

وہ ہنستا ہوا گاڑی پر بیٹھ گیا۔ تب تابانی نے ریوالور نکال کر کہا۔ "چاقو بند کرکے جیب میں رکھ لو۔"

اس نے سہم کر ریوالور کر دیکھا چاقو بند کرکے جیب میں رکھتے ہوئے گاڑی سے اترنے لگا۔ تابانی نے کہا۔ "گاڑی پر بیٹھے رہو اور فوراً یہاں سے جاؤ۔ ویسے لاہور پہنچنے سے پہلے اسے کہیں پھینک دینا۔ یہ چوری کا مال ہے۔"

وہ پریشان ہوکر بولا۔ "یہ.......... یہ چوری کی گاڑی ہے' راستے میں پولیس والے پکڑلیں گے۔"

"لاہور پہنچنے سے پہلے کوئی نہیں پکڑے گا۔ اب جاؤ' ورنہ گولی چل جائے گی۔"

اس نے ٹریگر پر انگلی رکھی۔ اجنبی نے فوراً ہی گاڑی اسٹارٹ کی۔ پھر اسے ایک یوٹرن دے کر تیزی سے چلاتا ہوا دور ہوتا چلا گیا۔ تابانی اس کی مخالف سمت پھر دوڑنے لگا۔ اسے کسی ایسے چھوٹے شہر میں پہنچنے کا موقع نہیں مل رہا تھا جہاں وہ کسی ہوٹل میں رہ کر اپنے زونل افسر سے دوبارہ رابطہ کرکے وہاں اپنے لئے ایک گاڑی اور دوسری ضروری چیزیں منگواسکے۔

وہ دوڑتے دوڑتے رک گیا۔ پتا چلا کہ جس جنگل سے وہ گزر رہا ہے' وہ آگے اور گھنا ہوتا جارہا ہے۔ پتا نہیں کہاں جاکر ختم ہونے والا ہے۔ کچھ فاصلے پر خوب صورت ڈیزائن کے چند کاٹیج نظر آرہے تھے اور وہ کاٹیج ایک دوسرے سے دور گھنے سایہ دار درختوں کے سائے میں تھے۔

ایسے کاٹیج عیاش رئیسوں یا شکاریوں کے ہوا کرتے ہیں۔ تابانی درختوں کے پیچھے چھپتا ہوا ایک کاٹیج کے قریب پہنچا۔ پھر اس کے چاروں طرف گھومتا ہوا یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ وہاں کتنے افراد رہتے ہیں۔ ایسے گھنے ویران جنگل میں اس کاٹیج کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کھڑکیاں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک کھڑکی کے پاس آکر اندر جھانک کر دیکھا۔ کوئی دکھائی نہیں دیا لیکن کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ "اندر آجاؤ۔ کب تک دوڑتے رہو گے؟ تمہیں آرام کرنا چاہیے۔"

یہ سنتے ہی تابانی نے ریوالور نکال لیا۔ کھڑکی سے ہٹ کر دیوار سے لگ کر بولا۔ "تم کون ہو؟ یہ کیسے جانتی ہو کہ میں کہیں سے دوڑتا آرہا ہوں؟"

"میں یہاں اکیلی ہوں کھڑکی کے پاس آگئی ہوں۔ تم بھی سامنے آجاؤ۔"

تابانی نے ایک قدم بڑھا کر دیکھا۔ بہت باوقار خاتون کھڑکی کے پاس نظر آئی۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر تھے۔ ان ہاتھوں میں ایک تصویر تھی۔ پتا نہیں کس کی تصویر تھی۔ اس تصویر کی پشت نظر آرہی تھی۔ تابانی نے دونوں ہاتھوں سے ریوالور تھام کر اس کے سامنے آکر کہا۔ "اگر تم اکیلی نہ ہوئیں اور کسی نے چھپ کر مجھ پر گولی چلائی تو اس کے ساتھ ہی میں بھی تمہیں گولی مار دوں گا۔"

"گولی ٹھیک میرے دل پر مارنا۔ اس دل سے یہ تصویر لگی ہوئی ہے لیکن گولی چلانے سے پہلے اس تصویر کو دیکھ لو۔"

اس نے تصویر کو پلٹ کر دکھایا تو تابانی ایک دم سے چونک گیا۔ وہ اس کے مراد کی تصویر تھی' اس نے پوچھا۔ "یہ تصویر تمہارے پاس کیسے آئی؟"

"یہ میرا مریض ہے۔ ڈاکٹر اس کی دونوں ٹانگیں کاٹنا چاہتے تھے کیونکہ اس کے گھٹنوں کی ہڈیاں نہیں جڑ سکتی تھیں لیکن میں نے اسے پیروں سے اپاہج نہیں ہونے دیا۔ آپریشن کرکے دونوں گھٹنوں کی ہڈیاں جوڑدیں۔"

"آ.......... آپ لیڈی سرجن آمنہ خاتون ہیں؟"

وہ کھڑکی کے پاس سے دوڑتا ہوا کاٹیج کے برآمدے میں آیا۔ کھلے ہوئے دروازے سے کمرے کے اندر پہنچا پھر فرش پر گھٹنے ٹیکتے ہوئے آمنہ کے قدموں سے لپٹ کر بولا "میرے مراد کی مسیحا! آپ دیوی ماں کا اوتار ہیں۔ میں نے کبھی کسی کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ آج آپ کے چرنوں میں جھک رہا ہوں۔"

اس نے اپنا سر آمنہ کے پیروں پر رکھ دیا۔

☆======☆======☆

وڈیرے نادر گچکی کے پاس دولت کی بھی طاقت تھی اور سیاست کی بھی۔ زمینوں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس کا اتنا رعب اور دبدبہ تھا کہ الیکشن میں اس کے دو جوان بیٹوں کے مقابلے میں کوئی کھڑا ہونے کی جرأت نہیں کرتا تھا اس لئے بڑا بیٹا قادر گچکی جیت کر قومی اسمبلی میں چھوٹا بیٹا صفدر صوبائی اسمبلی میں جایا کرتے تھے۔

اس علاقے میں اس کی مرضی کے تھانے دار اور سپاہی ہوا کرتے تھے اور اس کے غیر قانونی اقدامات کی طرف سے آنکھیں بند کرلیا کرتے تھے۔ اس کی حویلی کے پیچھے ایک

وسیع و عریض احاطے میں نجی جیل قائم کی گئی تھی جس میں تقریباً پچاس خاندان کے افراد قیدیوں کی زندگی گزار رہے تھے۔

تھانہ اور قانون تو اپنی مٹھی میں تھا۔ اس کے علاوہ نادر گچکی کے کئی مسلح ملازم تھے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا کہ ان ملازموں کے پاس ہتھیار کیوں ہیں اور وہ دن رات نجی جیل کی پہرا داری کیوں کرتے ہیں۔ اگر کوئی قیدی فرار ہونے کی کوشش کرتا تھا تو اسے گولی ماردی جاتی تھی۔

وہاں جو قیدی تھے' ان سے دن رات کام لیا جاتا تھا۔ سونے کا وقت کم دیا جاتا تھا۔ دو وقت کے کھانے سے ان کا پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ جوان عورتیں نادر گچکی اور اس کے دونوں بیٹوں کے استعمال میں رہا کرتی تھیں۔ ان عورتوں کی کبھی شادی نہیں ہوتی تھی۔

خود نادر گچکی کے دو بیٹوں کے علاوہ ایک جوان بیٹی تھی جس سے جبراً حق بخشایا گیا لیکن وہ ایک رات اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ گئی تھی پھر اپنی بد قسمتی سے پکڑی گئی تھی۔ اس کے دونوں غیرت مند بھائیوں قادر گچکی اور صفدر گچکی نے بہن کو گولی ماردی تھی۔ اس کے عاشق کو نجی جیل میں باندھ کر نادر گچکی نے حکم دیا تھا کہ اسے ننگا رکھا جائے اور صبح شام لوہے کی گرم سلاخ سے اس کے بدن کے ہر حصے کو داغا جائے۔

نادر گچکی روز صبح و شام اپنی حویلی میں بیٹھا اپنی بیٹی کے عاشق کی کربناک چیخیں سنتا تھا۔ ایک صبح اس نے ملازم سے پوچھا۔ "اس کی چیخیں کیوں سنائی نہیں دے رہی ہیں؟"

ملازم نے جواب دیا۔ "وڈیرے سائیں! وہ گرم سلاخ سے روز جلتے جلتے مرچکا ہے۔"

نادر گچکی کے دونوں بیٹوں نے اپنی بہن کو گولی ماردی۔ جسے اپنا بہنوئی بناتا تھا' اسے اذیتیں دے دے کر مار ڈالا۔ ایسے سنگدل باپ بیٹوں کو بھلا اور کس پر رحم آسکتا تھا؟ جب تھانے دار جمن راٹھور نے ڈاکوؤں کے ذریعے جمیلہ کو اغوا کرکے نادر گچکی کے سامنے پہنچایا تو اس کے حسن و شباب کو دیکھ کر باپ اور بیٹوں کی رال ٹپکنے لگی۔ تھانے دار نے کہا۔ "سائیں! اس لڑکی کو اپنی جیل میں رکھیں۔ اسے زندہ واپس نہیں جانا چاہیے۔"

نادر گچکی نے کہا۔ "تم ایک حویلی سے ہیرا لائے ہو۔ یہ پہلے حویلی میں رہے گی۔ بعد میں اسے جیل میں قید رکھا جائے گا۔ یہ اپنا انعام لو۔"

تھانے دار کو دس ہزار روپے ملے۔ وہ چلا گیا۔ نادر نے اپنے خاص ملازم سے کہا "اسے میری خواب گاہ میں لے جاؤ اور دروازہ بند رکھو۔"

جمیلہ رو رہی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر فریاد کر رہی تھی لیکن تگڑا ملازم اسے کھینچتے ہوئے

وہاں سے لے گیا۔ اس کے جانے کے بعد دونوں بیٹوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ جمیلہ نہایت ہی حسین اور نوخیز دوشیزہ تھی۔ اس سے پہلے ان بھائیوں کی خواب گاہوں میں غریبوں کی مرجھائی ہوئی بیٹیاں اور بہنیں آیا کرتی تھیں یا کبھی شہر سے زر خرید فیشن ایبل لڑکیاں مل جاتی تھیں لیکن جمیلہ قدرتی حسن سے مالا مال تھی۔ ایسا لاجواب قدرتی حسن کسی نصیب والے کو ہی ملتا ہے۔

بڑے بیٹے قادر گچکی نے کہا۔ "ابا! تو بوڑھا ہوگیا ہے اور وہ تیری بیٹی کے برابر ہے"

نادر نے کہا۔ "شیر کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ اگر تم نے اسے میری بیٹی کے برابر کہا تو وہ تمہاری بہن بن جائے گی' مطلب کی بات کرو۔"

دوسرے بیٹے صفدر نے گچکی نے کہا۔ "ابا! تو صرف اپنے مطلب کی بات سمجھتا ہے۔ ملک سردار حیات کو وزارت ملنے والی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کرانا چاہتا تھا۔ مگر تو نے میری شادی نہیں ہونے دی۔"

نادر نے کہا۔ "ملک سردار حیات کی بیٹی امریکا سے پڑھ کر آئی ہے۔ شادی ہوجاتی تو وہ تجھے اور میری دولت و جائیداد کو بیچ کر کھا جاتی۔"

"تو کوئی نجومی نہیں ہے ابا! اور ملک سردار حیات کنگلا نہیں ہے۔ تو نے برابر کے رشتے کو ٹھکرا دیا۔"

قادر نے کہا۔ "تجھے اپنی دولت اور جائیداد کی بڑی فکر رہتی ہے۔ ہم دو جوان بیٹے ہیں۔ ہم سے بس اس لئے محبت ہے کہ ہم تعلیم یافتہ ہیں اور اسمبلیوں میں رہ کر تجھے قومی خزانے سے کروڑوں روپے قرض دلاتے ہیں۔ تیری غیر قانونی حرکتوں پر پردے ڈالتے ہیں۔"

"کیا تم دونوں پھر وہی پرانے جھگڑوں کو شروع کرنا چاہتے ہو؟"

"جھگڑے کی کیا بات ہے؟ اس عمر میں سب ہی تسبیح پکڑ لیتے ہیں۔ تو حج کرنے جا۔ آج اپنی خواب گاہ میں نہ جا۔"

"بیٹے ہو' باپ کی طرح حاکم بن کر نہ بولو۔"

"ہم بول سکتے ہیں۔ ہمارا قد تیرے برابر ہوگیا ہے۔"

"تمہارا قد میری دولت کے برابر نہیں ہوا ہے۔ یہ جائیداد اور زمینیں سب میرے نام ہیں۔"

"تیرے پاس دولت کی طاقت ہے۔ ہمارے پاس سیاست کی۔ ہم اسمبلیوں میں

ہیں۔ تیرے خلاف قانونی کارروائیاں کرائیں گے تو قرض نادہندگان کی فہرست میں تیرا نام آئے گا۔ نجی جیل قائم کرنے کے جرم میں جیل جانا پڑے گا۔"

صفدر نے بھائی سے کہا۔ "اتنی زحمت اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ ایک سیکنڈ میں ابا اپنے بڑے قد کے ساتھ زمین کے اندر چلا جائے گا۔"

نادر ٹچکی غصے سے اٹھ کر بولا۔ "اپنے باپ کو قتل کرنے کی دھمکی دے رہے ہو؟"

"پیارے ابا! تُو ہمیں اسمبلیوں میں بھیج کر سیاست داں نہ بناتا تو تیرا بھلا ہوتا۔ تیرے بعد ساری دولت اور جائیداد ہماری ہوگی۔ قومی خزانے سے پچاس کروڑ کا قرض تیرے نام پر لیا ہے۔ تُو نہیں رہے گا تو کوئی عدالت ہم سے تیرا لیا ہوا قرضہ وصول نہیں کر سکے گی۔"

دوسرے بیٹے نے کہا۔ "تُو انگوٹھا چھاپ ہے ابا! تجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ قرضہ حاصل کرنے کی درخواست کے علاوہ ہم نے اور کتنے کاغذات پر تجھ سے انگوٹھا لگوایا ہے۔ ان کاغذات کی رُو سے ہم تیری تمام زمین جائیداد کے مالک پہلے ہی بن چکے ہیں۔ بس تیرے رخصت ہونے کا انتظار ہے۔"

وہ دونوں بیٹوں کو حیرانی سے دیکھ کر بولا۔ "تم نے اعتماد کرنے والے باپ کو دھوکا دیا ہے؟"

"دھوکا نہیں دیا۔ تیری تمام ملکیت ایک دن ہماری ہونے والی تھی۔ اسے اپنے نام کر لیا۔ تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ تُو باعزت اور باوقار وڈیرا ہے اور اپنی آخری سانس تک رہے گا۔ ہم تجھے گولی مارنے کا گناہ نہیں کریں گے۔ صرف تجھے اچھی باتیں سمجھائیں گے کہ آج اپنی خواب گاہ میں نہ جا۔"

وہ غصے سے بولا۔ "میں وڈیرا نادر ٹچکی ہوں۔ کسی کی بات نہیں مانتا۔ اپنی باتیں منواتا ہوں۔ تم لوگ مجھے میرے کمرے میں جانے سے منع کر رہے ہو؟ کیا میں تمہارا پابند ہوں؟"

"ہم تجھے کبھی اپنا پابند نہیں بنائیں گے۔ تُو اپنی خواب گاہ میں ضرور جا لیکن جمیلہ کو یہاں بھیج دے۔"

"ہرگز نہیں، میں اپنی جاگیر کا وڈیرا ہوں۔ یہاں کی ہر چیز پہلے میری ہوتی ہے اس لئے جمیلہ بھی میرے کمرے میں رہے گی۔ تم دونوں بغاوت پر اتر آئے ہو۔ یہ نہ سمجھو میں کمزور پڑ گیا ہوں۔ آئندہ الیکشن میں تم دونوں کے مقابلے پر اپنے وفاداروں کو کھڑا کروں گا تو اس حلقے کے تمام ووٹ انہیں ملیں گے۔ تم ساری زندگی ووٹوں کی بھیک مانگتے

رہو گے تو تمہیں ہر گھر سے دھتکار دیا جائے گا۔"

"ابا! تیری غریب رعایا تجھ سے ڈرتی ہے اور ہم یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے کہ تیری زندگی میں ہی ہم تیری تمام جاگیر کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ اس سے پہلے کہ تُو عدالت میں جا کر ہماری ملکیت کے کاغذات کو منسوخ کرائے، ہم تجھے عدالت تک جانے نہیں دیں گے۔"

ایک بیٹے نے اپنا ریوالور نکالا پھر اس کا رخ باپ کی طرف کیا۔ نادر ٹچکی نے غصے سے پوچھا۔ "تم ملکیت حاصل کرنے کے لئے مجھے قتل کرو گے؟"

"تُو نے اپنی ملکیت کا تھوڑا سا حصہ اپنی بیٹی کو نہیں دیا۔ اسے گولی مارنے کی اجازت ہمیں دے دی۔ جب باپ، بیٹی کو قتل کرا سکتا ہے تو بیٹے، باپ کو کیوں قتل نہیں کر سکتے؟"

اس نے بھائی سے پوچھا۔ "کیوں صفدر ایک مجرم باپ کو اس کی بے گناہ اور معصوم بیٹی کے پاس بھیج دیا جائے؟"

"ہاں یہ قصہ تمام ہو جائے تو بہتر ہے۔ ورنہ یہ اندیشہ رہے گا کہ ابا ہماری ملکیت کے کاغذات منسوخ کرا دے گا۔"

قادر ٹچکی نے ٹریگر دبایا۔ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ گولی چلی، باپ کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر لڑکھڑاتا ہوا صوفے سے ٹکرایا اور فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ قادر نے کہا۔ "سوری ابا! اگر ہم بھی بیٹیاں ہوتے تو تُو ہمیں بھی بیٹی کی طرح قتل کرا دیتا۔ یہ سب ملکیت اور سیاست کا بگڑا ہوا کھیل ہے، ہم نے بگڑی بنالی ہے۔"

صفدر نے وفادار اور رازدار ملازموں کو بلا کر کہا۔ "ہماری ماں کی قبر پکی ہے۔ اسے توڑ کر اس قبر کو دوبارہ کھودو اور ہمارے ابا کو اس میں ڈال کر قبر کو پھر پکی بنا دو۔ ابا کو اس عمر میں ہماری ماں کے ہی ساتھ رہنا چاہیے اور یہاں سے خون کے تمام دھبے مٹا دو۔"

ملازم حکم کی تعمیل کرنے لگے۔ جب وہ لاش اٹھا کر اور فرش سے خون صاف کر کے چلے گئے تو دونوں بھائی ایک بڑے صوفے پر بیٹھ گئے۔ قادر ٹچکی نے کہا۔ "ایک انار ہے اور ہم دو بیمار ہیں، انار کس بیمار کے حصے میں آئے گا؟"

صفدر نے بڑے بھائی کی ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ "تم وفاقی اسمبلی میں ہو اور میں صوبائی اسمبلی میں۔ صوبائی حکومت سے زیادہ وفاقی حکومت کے اختیارات ہوتے ہیں اس لئے جمیلہ تمہارے اختیار میں رہے گی۔"

قادر نے مسکرا کر کہا۔ "باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو قتل کر دیتا ہے۔ بھائی بھی اپنے سگے بھائی کو قتل کر دیتا ہے لیکن دو سیاسی بھائی ایک دوسرے کو قتل کریں تو اسمبلیوں میں

اپنی اکثریت نہیں رہتی۔ ہم دونوں میں سے ایک بھی کم ہوجائے گا تو اپوزیشن مضبوط ہوجائے گی۔"

"بے شک خون کا رشتہ اتنا مضبوط نہیں ہوتا جتنا سیاست کا ہوتا ہے۔ ہم کبھی ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کی حماقت نہیں کریں گے۔"

قادر پچکی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔ بے چاری اکیلی ہوگی۔"

وہ بھائی سے رخصت ہوکر زینے پر چڑھتا ہوا مرحوم باپ کی خواب گاہ کے دروازے پر آیا۔ وہاں ایک مسلح ملازم کھڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ قادر نے پوچھا۔ "کیا اسے کچھ کھانے پینے کو دیا ہے؟"

"سائیں! آپ کے حکم کے بغیر کیسے دے سکتا ہوں؟"

"کیا دروازہ کھولنے کو کہہ رہی تھی؟"

"پہلے تو دروازہ پیٹتی رہی۔ اللہ رسول ﷺ کا واسطہ دیتی رہی پھر چپ ہوگئی۔ دروازہ کھولوں؟"

"ہاں کھولو۔"

مسلح ملازم نے آگے بڑھ کر دروازے کی چٹخنی ہٹائی پھر اسے کھولنا چاہا' وہ نہیں کھلا۔ اس نے دروازے کو دھکا مارا۔ وہ پھر بھی نہ کھلا۔ اس نے کہا۔ "سائیں! اس نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا ہے۔"

قادر نے دروازے پر دستک دے کر آواز دی۔ "جمیلہ! دروازہ کھولو۔ اب میں اس علاقے کا وڈیرا ہوں۔ مجھے جو چیز نہیں ملتی۔ میں اسے توڑ دیتا ہوں۔ دروازہ نہیں کھولو گی تو اسے توڑ دیا جائے گا۔"

صفدر نے آکر پوچھا۔ "کیا بات ہے بھائی؟"

"پارسا بن رہی ہے۔ دروازے کو اندر سے بند کرلیا ہے۔"

صفدر نے ملازموں کو بلایا پھر انہیں دروازہ توڑنے کا حکم دیا۔ ملازم دروازے کو ٹکریں مارنے لگے۔ دوسرے دو ملازم رائفلوں کے بٹ سے دروازے پر ضربیں لگانے لگے۔ وہ بہت مضبوط تھا۔ ٹوٹنے میں دیر لگی مگر ٹوٹ گیا۔ دونوں بھائی اندر جانا چاہتے تھے۔ مگر ٹھٹک گئے۔ جمیلہ اپنے دوپٹے کا پھندا بنا کر چھت کے پنکھے سے لٹکی ہوئی تھی اور فرش پر ایک کرسی الٹی پڑی تھی۔

وہ چند لمحوں تک گم صم رہے۔ پھر قادر نے اسے غصے اور نفرت سے دیکھتے ہوئے

کہا۔ "کتے کی بچی نے ہاتھ بھی لگانے نہیں دیا۔"

صفدر نے ملازموں سے کہا۔ "لاش نیچے اتارو۔ حویلی سے دور کہیں گڑھا کھود کر اسے چھپا دو۔"

وہ دونوں کمرے سے باہر آئے۔ صفدر نے زینے سے اترتے ہوئے بڑے بھائی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "وہ کمینی کچھ دیر جی لیتی تو قیامت نہیں آجاتی۔ تمہارا موڈ تو اچھا رہتا۔ لعنت بھیجو اس پر۔ میرے کمرے میں چلو۔ میں بوتل کھولتا ہوں' تمہارا موڈ ٹھیک ہوجائے گا۔"

قادر اپنے بھائی کے کمرے میں آکر بیٹھ گیا اور بھائی امپورٹڈ وہسکی کی بوتل اور گلاس نکالنے لگا۔ ان کے وفادار چار ملازم پہلے ہی ان کے باپ کی لاش کو ماں کی پکی قبر توڑنے اور وہاں دفن کرنے لے گئے تھے۔ دوسرے چھ وفادار ملازم جمیلہ کی لاش کو ایک بوری میں ڈال کر ایک سوزوکی میں رکھ کر حویلی کے پیچھے تقریباً ایک کلومیٹر دور لے آئے اور چند درختوں کے درمیان ایک گڑھا کھودنے لگے۔

راجہ نواز نے "وہ تو" سے فون پر کہا تھا کہ پندرہ جانبازوں کی ضرورت ہے۔ حویلی کے پیچھے ایک کلومیٹر دور ان کی آمد کا انتظار کرے گا۔ اس وقت وہ لینڈ کروزر کی ہیڈ لائٹس بجھائے نازاں کے ساتھ گاڑی کے اندر بیٹھا ان کا انتظار کررہا تھا۔ ایسے وقت انہوں نے ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی دیکھی۔ نازاں نے کہا۔ "وہ دیکھو شاید تمہارے جانباز ساتھی آرہے ہیں۔"

راجہ نے سوچتی ہوئی نظروں سے ادھر دیکھا پھر کہا۔ "نہیں۔ وہ ہمارے ساتھی نہیں ہوں گے۔ گاڑی حویلی کی طرف سے آرہی ہے۔ چلو اترو' ہمیں اپنی گاڑی سے دور رہنا چاہیے۔"

وہ دونوں ضروری سامان لے کر گاڑی سے باہر آئے۔ پھر وہ نازاں کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے چلتا ہوا گھنے درختوں کے پیچھے جانے لگا۔ آنے والی سوزوکی ایک طرف مڑ کر رک گئی۔ اس طرح آنے والوں کو دور کھڑی ہوئی لینڈ کروزر نظر نہیں آئی۔ وہ اپنی گاڑی کے پیچھے سے کدال اور بیلچے لے کر ایک جگہ گڑھا کھودنے لگے۔ سوزوکی کی ہیڈ لائٹس میں چھ اشخاص نظر آرہے تھے۔ ان میں سے دو کے پاس رائفلیں تھیں' باقی چار کے پاس صرف کدال اور بیلچے تھے۔

گڑھا کھودنے کے بعد ایک رائفل والے نے گڑھا کھودنے والوں کو حکم دیا۔

"لاش اٹھا کر لاؤ اور گڑھے میں ڈال کر مٹی برابر کردو۔"

نازاں نے سرگوشی میں کہا۔ "پتا نہیں یہ کسے ہلاک کر کے چھپا رہے ہیں؟"

راجہ نے کہا۔ "ابھی جو رائفل والا حکم دے رہا تھا' تم اس کا نشانہ لے کر گولی چلاؤ۔ کم آن میں دوسرے کو ختم کروں گا۔"

وہ دونوں رائفل والے روشنی میں صاف نظر آ رہے تھے۔ نازاں نے ایک کا نشانہ لیتے ہی ایک درخت کی آڑ سے گولی چلائی۔ اس کے ساتھ ہی راجہ نے بھی فائر کیا۔ دونوں رائفلوں والے چیختے ہوئے گر پڑے۔ باقی چار اشخاص سہم کر کدالیں اور بیلچے پھینک کر زمین پر بیٹھ گئے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ وہ سب روشنی میں تھے اور تاریکی میں انہیں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ غریب اور مظلوم ملازم تھے۔ انہیں ہتھیار پکڑنا بھی نہیں آتا تھا اس لئے مرنے والوں کی رائفلیں زمین پر سے کوئی نہیں اٹھا رہا تھا۔

راجہ نے بلند آواز میں کہا۔ "جو ہتھیار اٹھائے گا' وہ مارا جائے گا۔ تم میں سے ایک ان رائفلوں کو نال کی طرف سے پکڑ کر دور اندھیرے میں پھینک دے۔ کوئی چالاکی نہ دکھائے۔"

ایک شخص نے اٹھ کر پہلے ایک رائفل کو پھر دوسری رائفل کو نال کی طرف سے پکڑ کر دور اندھیرے میں پھینک دیا۔ موبائل فون کے بزر کی آواز سنائی دی راجہ نے فون کو آن کر کے کہا۔ "ہیلو "وہ تو""؟"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "نو سر! ہم آپ کے جاں نثار ہیں۔ مسٹر "وہ تو" نے ہمیں یہاں کی ہدایت کی تھی۔ ابھی ہم نے فائرنگ کی آواز کے بعد آپ کی آواز سنی ہے۔"

راجہ نے کہا۔ "تمہیں سوزوکی کی ہیڈ لائٹس میں چار نہتے افراد نظر آ رہے ہوں گے۔"

"یس سر! ان میں سے ایک نے آپ کے حکم کے مطابق مرنے والوں کی رائفلیں دور پھینک دی ہیں۔ ایک رائفل میرے پاس آ کر گری ہے۔"

"اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں جاؤ اور چاروں کے ہاتھ پاؤں باندھ دو۔ میں آ رہا ہوں۔ یاد رکھو' فائرنگ کی آواز حویلی تک گئی ہوگی اس لئے وہاں پہنچتے ہی سوزوکی کی ہیڈ لائٹس بجھا دو۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہیڈ لائٹس بھی بجھ گئیں۔ جب وہ نازاں کے ساتھ وہاں پہنچا تو کئی جاں نثار موجود تھے۔ ان میں سے کچھ کلاشنکوف پکڑے حویلی کی سمت رخ کئے کھڑے تھے۔ چار ان چاروں کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ رہے

تھے۔ ایک پوچھ رہا تھا۔ "یہاں کس کی لاش چھپانے آئے ہو؟"

ایک نے کہا۔ "حضور! ایک لڑکی کی لاش ہے۔ ہم اسے نہیں جانتے۔ بس یہ جانتے ہیں کہ تھانے دار جمن راٹھور اس لڑکی کو حویلی میں چھوڑ گیا تھا۔"

نازاں اور راجہ کے دلوں پر گھونسا سا لگا۔ وہ سمجھ گئے کہ وہاں جمیلہ کی لاش لائی گئی ہے۔ راجہ نے پوچھا۔ "اس لڑکی کو کس نے قتل کیا ہے؟"

"کسی نے قتل نہیں کیا ہے۔ اس نے اپنی آبرو بچانے کے لئے خودکشی کی ہے۔"

وہ چاروں باری باری بتانے لگے کہ وہ وڈیرا نادر چکی کی نجی جیل کے قیدی ہیں۔ حویلی میں کام کرنے آئے تھے۔ وہیں انہوں نے جمن راٹھور کو دیکھا۔ وہ لڑکی کو جبراً لایا تھا۔ وڈیرے نے اسے اپنے کمرے میں بند کیا تھا لیکن وڈیرے نادر چکی اور اس کے دونوں بیٹوں کے درمیان جھگڑا ہوا۔ بڑے بیٹے نے اپنے باپ نادر چکی کو گولی ماردی۔ ان کے چار وفادار نادر چکی کی لاش چھپانے کے لئے کہیں گئے ہیں اور جمیلہ کی لاش چھپانے کے لئے وہ سب یہاں آئے ہیں۔

ان کے بیان دینے کے دوران میں کئی ٹارچ کی روشنیاں دور سے دکھائی دیں۔ شاید حویلی کے مسلح وفادار ٹارچ اور گنیں لئے آ رہے تھے۔ راجہ کے جاں نثار زمین پر اوندھے منہ لیٹ کر کہنیوں کے بل رینگتے ہوئے جانے لگے۔ راجہ' نازاں کے ساتھ سوزوکی کی آڑ میں آ گیا۔ دور ایک ٹارچ والے نے بلند آواز سے پوچھا۔ "اے لاکھن! تُو کہاں ہے؟ کیا تم لوگوں نے فائرنگ کی تھی؟"

اس کے سوالات کے جواب میں خاموشی رہی۔ ان ٹارچ والوں کے قریب آنے کا انتظار رہا پھر اچانک فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ ٹارچ والے چیختے ہوئے گر رہے تھے۔ کچھ واپس بھاگنا چاہتے تھے لیکن جاں نثاروں نے خاموشی سے زمین پر رینگتے ہوئے دور جا کر انہیں گھیر لیا تھا اور ان پر گولیاں برسا رہے تھے۔ راجہ نے فون پر ایک جاں نثار سے کہا۔ "گڑھا کھودنے والے قیدی کہہ رہے ہیں کہ حویلی کے اندر دس مسلح افراد تھے۔ ان میں سے چار وڈیرا نادر چکی کی لاش لے گئے ہیں اور دو مر چکے ہیں۔ اس حساب سے حویلی میں دو بھائی اور چار مسلح افراد ہیں۔ نجی جیل کے پاس بھی چند ہتھیار والے ہو سکتے ہیں۔ اپنے چند ساتھیوں کو یہاں کے ایک قیدی کے ساتھ وہاں بھیجو' جہاں نادر چکی کی لاش لے جائی گئی ہے۔ میں حویلی کی طرف جا رہا ہوں۔ جمیلہ کی لاش اپنی گاڑی میں رکھوا لو۔"

وہ فون بند کرنے کے بعد تیزی سے نازاں کے ساتھ اپنی گاڑی میں آیا۔ پچھلی سیٹ

پر دو جاں نثار بھی آگئے۔ وہ سب حویلی کی طرف جانے لگے۔ حویلی کے اندر بیٹھے ہوئے بھائیوں کو رہ رہ کر فائرنگ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اپنا موڈ ٹھیک کرنے کے لئے شراب پینا چاہتے تھے لیکن ایک گلاس پینے کے بعد ہی انہیں فائرنگ کی آوازوں نے پریشان کردیا تھا۔

قادر نے ایک مسلح وفادار کو حکم دیا۔ "باہر جاکر دیکھو' کیا ہورہا ہے۔ پولیس والے ہمارے نمک خوار ہیں۔ وہ اس طرف نہیں آئیں گے۔"

ملازم چلا گیا۔ صفدر نے کہا۔ "شاید کسی ڈاکو کی شامت آئی ہے۔ اپنے گینگ کے ساتھ یہاں ڈاکا ڈالنے آرہا ہوگا۔"

انہوں نے باقی تین مسلح ملازموں سے کہا کہ تمام دروازے بند کردیں اور کھڑکیوں سے باہر دیکھتے رہیں۔ باہر تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ چھپ کر آنے والے نظر نہیں آسکتے تھے۔ دونوں بھائی اپنی اپنی کلاشنکوف اٹھا کر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ انہوں نے جس مسلح ملازم کو باہر کی خبر لانے کے لئے بھیجا تھا' وہ آدھا گھنٹا گزرنے کے بعد بھی واپس نہیں آیا۔ ایک بھائی بڑبڑایا۔ "سلامت ابھی تک واپس نہیں آیا۔ پتا نہیں کہاں مرگیا ہے؟"

دوسرے بھائی نے کہا۔ "مرہی گیا ہے اسی لئے واپس نہیں آیا ہے۔"

اسی وقت کھڑکیوں کے راستے دو بم آکر گرے اور ہلکی آواز سے پھٹ پڑے۔ دونوں نے چونک کر دیکھا۔ وہ جہاں آکر گرے تھے' وہاں سے سفید دھواں خارج ہورہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں بھائی اور تینوں مسلح ملازم کھانسنے لگے۔ سانس لینے سے حلق میں جلن اور خراشیں پیدا ہورہی تھیں۔ انہیں کسی کی آواز سنائی دی۔ "ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤ ورنہ کھانستے کھانستے مرجاؤ گے۔"

قادر نے ملازموں سے کہا۔ "ہتھیار یہاں چھوڑ کر باہر جاؤ۔ ان سے پو.......... پوچھو.........."

وہ بات پوری نہ کرسکا اور کھانسنے لگا۔ ملازم بھی کھانستے کھانستے پریشان ہورہے تھے۔ وہ رائفلیں پھینک کر دوڑتے ہوئے دروازے کے پاس آئے پھر اسے کھول کر باہر نکلتے ہی کھلی فضا میں گہری گہری سانسیں لینے لگے۔ کھلے ہوئے دروازے سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔ وہ دونوں بھی کھانستے ہوئے دروازے کے پاس آئے۔ وہی آواز پھر سنائی دی۔ "ہتھیار کے ساتھ باہر آنے والے کو فوراً گولی ماردی جائے گی۔ ہاتھوں میں جو وزا اٹھا رکھا ہے' اسے پھینک دو۔"

اب حلق کی جلن' خراشیں اور کھانسی برداشت نہیں ہورہی تھی۔ وہ دونوں

کلاشنکوف کو ایک طرف پھینک کر باہر آگئے۔ کھلی فضا میں آتے ہی لڑکھڑا کر گر پڑے۔ دو گن مین ان کے پاس آکر انہیں نشانے پر رکھ کر بولے۔ "دونوں ہاتھ اٹھا کر سر کے پیچھے رکھو۔ تلاشی کے وقت کوئی حرکت کرو گے تو گولی چل جائے گی۔"

دوسرے دو جاں نثاروں نے آکر ان کے لباس کی تلاشی لی۔ دونوں نے ریوالور چھپا رکھے تھے۔ ان ریوالوروں کو دور پھینک دیا گیا۔ ایک نے راجہ سے کہا۔ "سر! اب ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔"

ایک جاں نثار نے آکر کہا۔ "سر! ہمارے ساتھی شہباز خان نے نجی جیل کے گیٹ کو توڑ دیا ہے اور ہر قیدی کو ایک ایک ہزار روپے دے کر یہاں سے جانے کے لئے کہا اور انہیں یہ سمجھا رہا ہے کہ کہیں بھی قانون کے محافظ ان سے پوچھیں کہ نجات دہندہ کون تھا تو جواب دیا جائے۔ اس فرشتے کا نام امیر حمزہ تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے ہیں۔"

قادر گچکی اور صفدر گچکی زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ راجہ نے ان کے پاس آکر کہا "تم نے بھی سن لیا' میرا نام امیر حمزہ ہے اور یہ نام جہاں پہنچتا ہے' وہاں موت بھی پہنچ جاتی ہے۔"

قادر نے کہا۔ "حمزہ صاحب! آپ ہم پر گولی نہ چلائیں' آپ کا جو بھی مطالبہ ہوگا' ہم اسے پورا کریں گے۔"

"آج تک جتنی عورتوں کی آبرو لوٹتے رہے' ان کا یہ مطالبہ رہا کہ انہیں باعزت رہنے دیا جائے۔ کیا تم لوگوں نے کبھی ان کے مطالبات پورے کیے؟"

اس نے دونوں کو ٹھوکریں مارتے ہوئے کہا۔ "جمیلہ جیسی معصوم لڑکی نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ تم لوگوں نے اسے خودکشی پر مجبور کردیا۔ تم نے کتنے ہی غریبوں کو اغوا کرکے نجی جیل میں رکھا۔ ان کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرتے رہے۔"

نازاں نے کہا۔ "ابھی ہمیں بتایا گیا ہے کہ تم لوگ اپنی بہن سے حق بخشا رہے تھے۔ تمام عمر اس کی شادی نہیں کرانا چاہتے تھے۔ وہ اپنے محبوب کے ساتھ فرار ہوگئی تھی۔ تم لوگوں نے اسے پکڑ کر گولی ماردی۔ تمہیں اپنی ماں جائی پر بھی رحم نہیں آیا۔ تم لوگوں کو ایسی موت مارنا چاہیے کہ تمہارا انجام دیکھ کر دوسرے ظالم اور درندے عبرت حاصل کریں۔"

راجہ نے جاں نثاروں سے کہا۔ "ان دونوں کے ہاتھوں کی کمند دو۔"

چار جاں نثاروں نے دونوں بھائیوں کے چاروں ہاتھوا

گڑانے اور رحم کی بھیک مانگنے لگے۔ وہاں کھڑے ہوئے دوسرے جاں نثاروں نے ان کی کہنیوں کا نشانہ لے کر تڑا تڑ گولیاں چلائیں اور ان کی ہڈیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ وہ دونوں تکلیف کی شدت سے چیختے چلاتے رہے۔ راجہ نے کہا۔ "انہیں قیدی بنا کر جمیلہ کے باپ وڈیرا اللہ بخش کے پاس لے چلو۔"

تھوڑی دیر بعد کئی گاڑیاں ایک قافلے کی صورت میں وہاں سے چل پڑیں۔ نازاں اور راجہ اپنی لینڈ کروزر میں تھے۔ دوسری گاڑیوں میں کئی جاں نثار جمیلہ کی لاش کو اور دونوں بھائیوں کو قیدی بنا کر لے جا رہے تھے۔

نازاں کی آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں اور وہ آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "میں بھی ایک وڈیرے کی بیٹی ہوں۔ اونچی اور شاندار حویلیوں اور کوٹھیوں میں رہ کر ایسی داستانیں سنتی رہتی تھی۔ مجھے سمجھایا جاتا تھا کہ غریب عورتوں اور اغوا کی ہوئی امیر زادیوں کی کوئی عزت نہیں ہوتی' اب آنکھوں سے دیکھ کر سمجھ میں آ رہا ہے کہ امیر زادی ہو یا غریب زادی' سب ہی کی عزت آبرو ایک جیسی ہوتی ہے' لوٹنے کا موقع ملے تو مرد سب ہی کی عزت آبرو لوٹ لیتا ہے۔ سلامتی بھی مرد سے ملتی ہے۔ بربادی بھی مرد سے ملتی ہے۔"

☆==========☆==========☆

ختم نبوت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ باد　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈمن کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- ہمارا اردو کتب کا وٹس گروپ جوائن کرنے کے لئے درج ذیل لنکس پر کلک کریں ہر دو کیٹیگری میں صرف ایک ہی گروپ جوائن کریں اگر پہلے سے جوائن ہیں تو اس کو سکپ کر دیں۔ عمران سیریز کے شوقین عمران سیریز گروپ جوائن کر سکتے ہیں۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے

اردو بکس 1	https://chat.whatsapp.com/EFrs3uGTgEm2319kK0wfu2
اردو بکس 2	https://chat.whatsapp.com/Ke9odWnuu7T9zRUGgYEcYV
اردو بکس 3	https://chat.whatsapp.com/IEl5cejf7Xc0b1HjApSyxI
اردو بکس 4	https://chat.whatsapp.com/J2HwtCI39spKjifu3aC61i
1 New Books	https://chat.whatsapp.com/EFrs3uGTgEm2319kK0wfu2
2 New Books	https://chat.whatsapp.com/D9yLIpv8dLVJHLjuVNIAtk
3 New Books	https://chat.whatsapp.com/I5dFInQasVTLcmKrbpa1bv
عمران سیریز 1	https://chat.whatsapp.com/Ggokw9DndA68GCuURnNA2H
عمران سیریز 2	https://chat.whatsapp.com/C11xpIXfws3JRqn8gSt3LZ

گروپ فل ہونے کی صورت میں ایڈمن سے وٹس ایپ پر میسج کریں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے ریموو کر دیا جائے گا اور بلاک بھی کیا جائے گا۔

0306-7163117　　0343-7008883　　0333-8033313

محمد سلمان سلیم　　پاکستان زندہ باد　　راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو

aazzamm@yahoo.com
اندھیر نگری
محی الدین نواب
AZAM

aazzamm@yahoo.com
قلم کے نواب محی الدین نواب کا ایک طویل ناول
ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا۔
سیاست کے سانپ اور ان کی زہریلی سازشوں کا حال۔
پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے ''خفیہ ہاتھ'' کی سازشوں کا حال۔
چند سر پھروں کی ولولہ انگیز داستان، جو خفیہ ہاتھ سے ٹکرا گئے تھے۔
بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان۔
انڈر ورلڈ کے گاڈ فادروں کا خوفناک ٹکراؤ، موت کو بھی پسینہ آ گیا۔
پاکستان کو گدھوں کی طرح نوچنے والے سیاستدانوں کی شرمناک داستان۔
سندھ کے وڈیروں کی ''خدائی'' کی ناقابل یقین داستانیں۔
AZAM

ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا۔

اندھیر نگری

سوئم

محی الدین نواب

الرفاعی پبلشرز اینڈ بک سیلرز

چوک میو ہسپتال، نسبت روڈ، لاہور۔

بار اوّل ———— ۲۰۰۲ء
مطبع ———— یوایندڈی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ———— صوبا کمپوزنگ سنٹر' لاہور
قیمت ———— ۱۵۰ روپے

وہ قافلہ صبح سات بجے وڈیرے اللہ بخش کی حویلی کے سامنے پہنچ گیا۔ اندر خبر پہنچ گئی کہ کئی لوگ اسلحہ سمیت کئی گاڑیوں میں آئے ہیں۔ اللہ بخش نے حکم دیا کہ باہر کا گیٹ نہ کھولا جائے۔ اس کے بیٹے کریم بخش نے دوسری منزل کی کھڑکی کھول کر پوچھا۔
"تم سب کون ہو؟ اور کیا چاہتے ہو؟"
نازاں اور راجہ نے اپنی گاڑی سے باہر آکر پوچھا۔ "کریم بخش! ہمیں پہچانتے ہو؟"
کریم بخش نے انہیں دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا۔ "باجی! آپ آئی ہیں۔ میں ابھی آرہا ہوں۔"
وہ زینے سے اتر کر جانے لگا۔ باپ نے پوچھا۔ "کہاں جارہے ہو؟ ان لوگوں کو کیسے جانتے ہو؟"
وہ بولا۔ "یہی تو وہ فرشتے ہیں جنہوں نے مجھے ڈاکوؤں سے چھڑا کر یہاں پہنچایا تھا۔"
یہ سنتے ہی اللہ بخش سہم گیا' کہنے لگا۔ "باہر نہ جاؤ۔ گیٹ نہ کھولو۔ ہم نے تمہاری بہن کی شادی نہیں کی ہے' وہ ہمیں مار ڈالے گا۔"
"آپ خواہ مخواہ گھبرا رہے ہیں۔ انہوں نے ایک ہفتے کی مہلت دی تھی۔ ابھی تو دو ہی دن گزرے ہیں۔ آپ ان کی خوبیاں نہیں جانتے ہیں۔ یہ میری گم شدہ بہن کو تلاش کرکے لے آئیں گے۔"
اللہ بخش جواباً کچھ کہہ نہ سکا۔ وہ نہیں جانتا کہ آنے والے کیوں آئے ہیں۔ جب گیٹ کھل گیا اور بھائی اپنی بہن کی لاش دیکھ کر رونے لگا تو باپ کے ہوش اُڑ گئے۔ نازاں نے کریم بخش کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آنسو پونچھ لو۔ رونے کے لئے زندگی پڑی ہے۔ پہلے اپنے باپ سے پوچھو' بہن کو اغوا کیا گیا تھا؟ یا تمہارے باپ نے اپنی اس معصوم بیٹی کو اغوا کرایا تھا؟"
اللہ بخش نے غصے سے کہا۔ "یہ کیا بکواس ہے۔ کوئی باپ کیا اپنی بیٹی کو اغوا کرائے گا؟"
"کریم بخش' تم سے ضد کر رہا تھا کہ جمیلہ کی شادی ضرور ایک ہفتے کے اندر کرائی جائے۔ تم بیٹے کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے بیٹے کی لاعلمی میں تم نے تھانے دار

جمن راٹھور اور ڈاکوؤں کے ذریعے اسے اغوا کرادیا۔ یہ الزام لگایا کہ یہ اپنے کسی عاشق کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔ میرے بیٹے کو میرے خلاف بھڑکا رہی ہو۔"

چند جاں نثار ایک گاڑی سے قادر چگلی اور صفدر چگلی کو اٹھا کے اندر لائے اور انہیں زمین پر ڈال دیا۔ راجہ نے کہا۔ "کریم بخش! کیا تم وڈیرے نادر چگلی کے ان بیٹوں کو پہچانتے ہو؟"

کریم بخش نے سرہلا کر کہا۔ "ہاں۔ یہ اپنے حلقے کے ایم این اے اور ایم پی اے ہیں۔"

راجہ نے دونوں بھائیوں سے کہا۔ "جمیلہ کو تمہاری حویلی میں کون لایا تھا اور اسے کس نے اغوا کرایا تھا' سچ سچ بولو۔"

وہ دونوں بھائی تکلیف سے کراہتے ہوئے کریم بخش کو بتانے لگے کہ تھانے دار جمن راٹھور ان کی حویلی میں جمیلہ کو لایا تھا اور انعام کے طور پر دس ہزار روپے لے گیا تھا۔ اسی تھانے دار نے بتایا تھا کہ جمیلہ کو اس کے باپ اللہ بخش کے منصوبے کے مطابق اغوا کرایا گیا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ جمیلہ پر گھر سے بھاگنے کا الزام لگے گا تو وہ بد چلن کہلائے گی۔ برابر کے خاندان میں اس کی شادی نہیں ہوسکے گی۔ راجہ نے دھمکی دی تھی کہ ایک ہفتے کے اندر اس کی شادی نہ کی گئی تو وہ باپ اور بیٹے کو گولی مارے گا لیکن راجہ کو معلوم ہوگا کہ لڑکی شادی سے پہلے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے تو راجہ ان باپ بیٹے کو گولی نہیں مارے گا۔ اس طرح بیٹی کو باپ کی ملکیت سے حصہ نہیں ملے گا۔

راجہ نے کریم بخش سے کہا۔ "میں ان دو زخمیوں کو گواہوں کے طور پر لایا ہوں۔ تاکہ تم اپنے بے غیرت باپ کا مکروہ چہرہ پہچان سکو۔"

کریم بخش حیرانی اور صدمے سے ایک ایک کی باتیں سن رہا تھا۔ پھر اس نے باپ کو دیکھ کر کہا۔ "کیا یہ سب لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔ اولاد اپنے والدین کو سچا اور کھرا سمجھتی ہے۔ کیا میں صرف آپ کو سچا سمجھوں اور ساری دنیا کو جھوٹا سمجھ لوں۔"

راجہ نے کہا۔ "تھانے دار جمن راٹھور اور اس کے پالتو ڈاکوؤں سے مقابلہ ہوا تھا۔ میں نے انہیں مار ڈالا۔ اگر معلوم ہوتا کہ جمیلہ اس انجام کو پہنچے گی تو میں جمن راٹھور کو ہلاک نہ کرتا۔ ان دو بھائیوں کی طرح اسے بھی زخمی کرکے گواہ کے طور پر یہاں لاتا۔"

کریم بخش بہن کے چہرے پر چہرہ رکھ کر رو رہا تھا۔ اللہ بخش نے کہا۔ "میری معصوم بیٹی پر ظلم ہوا ہے لیکن اتنا بڑا جھوٹ کیوں کہا جارہا ہے کہ میں نے اپنی بیٹی کو اغوا

کرایا ہے؟"

راجہ نے گرج کر کہا۔ "کتے! تمہارے جیسے دولت مند سچ کو جھوٹ بنا کر عدالتوں سے باعزت طور پر بری ہوجاتے ہیں لیکن امیر حمزہ کی عدالت سے کوئی جھوٹا' بے غیرت اور.......... بے ایمان بچ کر نہیں جائے گا۔ ایسے بے غیرتوں اور بے ایمانوں کو ہرحال میں سزائے موت ملتی رہے گی۔ میں نے صرف گواہی کے لئے ان دونوں بھائیوں کو زخمی کرکے زندہ رکھا تھا۔ اب ان کی زندگی کی معیاد پوری ہوچکی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے ٹی ٹی سے قادر کی کمر پر پھر صفدر کی کمر پر گولیاں ماریں۔ وہ پہلے ہی زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ وہیں تڑپ تڑپ کر معافیاں مانگنے لگے۔ وہ بولا۔ "دیکھو تشدد کسے کہتے ہیں۔ تمہاری بہن سے محبت کرنے اور شادی کرنے والے کو لوہے کی گرم سلاخ سے روز داغا جاتا تھا۔ روز اسے زندہ رکھ کر مارا جاتا تھا۔ یہی تشدد ہے کہ تمہیں ایک ایک گولی اس طرح ماری جائے کہ تم مرتے مرتے زندہ رہو اور زندہ رہ کر تڑپتے رہو۔"

پھر اس نے وڈیرے اللہ بخش سے کہا۔ "میں تمہارے بیٹے سے کہہ چکا تھا کہ تم باپ بیٹے کو سزائے موت دوں گا لیکن بیٹا بے قصور ہے۔ تم نے بیٹے کو بھی دھوکا دیا اور اس کی لاعلمی میں بیٹی سے ناانصافی کرکے اسے خودکشی پر مجبور کردیا۔ تمہیں جو سزا ملنے والی ہے' اس کا تماشا دیکھو۔"

اس نے پھر دونوں بھائیوں کی ٹانگوں پر ایک ایک گولی ماری۔ وہ تکلیف کی شدت سے جنونی انداز میں چیخنے اور تڑپنے لگے۔ وڈیرے اللہ بخش کا خون خشک ہورہا تھا۔ وہ تھر تھر کانپتے ہوئے کریم بخش سے بولا۔ "بیٹے! ان دونوں کے بعد میری باری آئے گی۔ تم چاہو تو اپنے اس بوڑھے باپ کو بچاسکتے ہو۔ یہ سزا دینے والا تمہیں بے قصور مانتا ہے۔ تمہاری قدر کرتا ہے' مجھے ایک بار معافی دلا دو۔"

شدید تکلیف کے باعث دونوں بھائیوں کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ ان کے تڑپنے کے انداز میں اتنی کمی آگئی تھی کہ اب وہ ذرا ذرا سا ہل رہے تھے اور بڑی کمزور سی آواز میں زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے۔

نازاں نے پوچھا۔ "کیا ایسی اذیتیں برداشت کرتے وقت اپنی نجی جیل کے بے قصور اور مظلوم قیدی یاد آرہے ہیں؟ وہ بے چارے بھی تمہارے غیر انسانی سلوک کے باعث سسک سسک کر جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارتے رہے۔"

انہوں نے بڑی رحم طلب نظروں سے نازاں کو دیکھا' وہ بولی۔ "جوان عورتوں پر تم

رحم نہیں کرتے تھے۔ میں بھی جوان ہوں۔ مجھے رحم طلب نظروں سے نہیں' للچائی ہوئی نظروں سے دیکھو۔ اٹھو اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گھسیٹتے ہوئے اپنی حویلی میں لے چلو۔"

ان کے جسموں سے لہو اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ راجہ وہاں زیادہ دیر رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے دو فائر کئے۔ ان کے سینوں میں دل کی جگہ ایک ایک گولی پیوست کردی۔ وہ کراہ بھی نہ سکے۔ ان کے دیدے پھیل گئے۔ پھر وہ ہمیشہ کے لئے بصارت سے' سماعت سے اور سانسوں سے محروم ہوگئے۔

راجہ نواز نے پلٹ کر ٹی ٹی کو لوڈ کیا۔ پھر اس کا رخ وڈیرے اللہ بخش کی طرف کردیا۔ وہ گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا۔ اس کا بیٹا ایسے وقت ایک ڈھال کی طرح باپ کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ نازاں نے کہا۔ "کریم بخش! تم باپ کی موت نہیں دیکھ سکوگے۔ حویلی کے اندر چلے جاؤ۔"

راجہ نے کہا۔ "کریم بخش! تم میری شریک حیات کو باجی کہتے ہو اور میں جمیلہ کو چھوٹی بہن سمجھتا رہا۔ تم اپنی اور میری بہن کے ساتھ ہونے والے ظلم کو بھول رہے ہو۔"

کریم بخش صدمات سے چُور تھا۔ وہ باپ کے پاس سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا راجہ نواز کے سامنے آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے دیکھا پھر مانگنے کے انداز میں اپنا ایک ہاتھ ٹی ٹی کی طرف بڑھایا۔

راجہ نے ایک گہری سانس لی پھر ٹی ٹی کو اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

اس نے پلٹ کر باپ کی طرف دیکھا اور ٹی ٹی کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہا۔ "بابا سائیں! آپ مجھ سے حق بخشائیں۔ میرے ہاتھوں پر قرآن مجید رکھ کر سب کے سامنے کہہ دیں کہ تمام عمر میری شادی نہیں ہونے دیں گے۔"

"بیٹے! یہ کیا کہہ رہے ہو۔ تمہاری شادی نہیں کراؤں گا تو ہماری نسل کیسے آگے بڑھے گی۔"

"ایسی نسل پر لعنت ہے جو بیٹیوں کو جیتے جی مار کر بیٹے پیدا کرائے۔ ابھی میرے سر میں صرف یہ جنون ہے کہ آپ سب کے سامنے مجھ سے حق بخشائیں۔ تاکہ میں بھی اپنی بہن کی طرح خود کشی کرلوں۔ میرے دونوں ہاتھوں میں میری موت ہے۔ آپ نے جو ناانصافی بیٹی سے کی ہے' وہ بیٹے سے بھی کریں۔ اگر آپ نے بیٹے سے انصاف کیا تو میں آپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ سب کے سامنے بولیں' میں خود کشی کروں یا آپ مریں گے؟"

اللہ بخش نے انکار میں ہاتھ ہلاکر کہا۔ "نہیں بیٹے' خود کشی نہ کرنا تمہارے بعد میرے پاس کچھ نہیں رہے گا۔"

"میں ہمیشہ آپ کی بات مانتا آیا ہوں۔ خود کشی نہیں کروں گا۔"

یہ کہتے ہی اس نے فائر کیا۔ گولی باپ کے ایک شانے پر لگی۔ وہ چیخ کر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے گیا۔ کریم بخش نے روتے ہوئے کہا۔ "مجھ جیسا بد نصیب کون ہوگا؟ ابھی بہن پر رورہا تھا' اب باپ پر روتا رہوں گا۔ مجھے معاف کردیں بابا سائیں!"

اس نے دوسری گولی چلائی۔ باپ اچھل کر زمین پر گرا۔ "میں بہن کی حیا پر ناز کرتا رہوں گا۔ مجھے معاف کردیں بابا سائیں!"

اس نے تیسری گولی ماری۔ باپ ایک دم سے تڑپ کر ٹھنڈا پڑگیا۔ بیٹے کے ہاتھوں سے ٹی ٹی گر پڑی۔ پھر وہ دہاڑیں مار مار کر روتا ہوا زمین پر گھٹنوں کے بل گر کر جھکتا چلا گیا۔

☆======☆======☆

جمشید چند کلومیٹر تک بس میں گیا۔ اسے تابانی نظر نہیں آیا تو وہ بس سے اتر گیا۔ دور تک دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ "وہ موٹر سائیکل میں بڑی تیز رفتاری سے نکل گیا ہے۔ بس میں اس کا تعاقب نہیں کیا جاسکے گا۔ کسی کار میں اس کے پیچھے جانا ہوگا۔ ویسے وہ کتنی دور جاسکے گا۔ سرحد پار نہیں کرسکے گا۔ بھٹک کر دوسری سمت جارہا ہے۔"

وہ سڑک کے کنارے کھڑا ہوا تھا۔ وہاں سے جو بھی کار یا وین گزرتی تھی' وہ لفٹ حاصل کرنے کا ہاتھ سے اشارہ کرتا تھا لیکن اس کی مطلوبہ گاڑیاں رکنے کے بجائے اور اپنی رفتار بڑھا کر اس کے سامنے سے تیزی سے گزر جاتی تھیں۔

وہ جھنجلاہٹ میں اس بات پر توجہ نہیں دے رہا تھا کہ اس نے اپنے ریوالور کو پتلون کی بیلٹ سے اٹکا کر رکھا ہے جو دور سے نظر آتا ہے۔ گاڑیوں والے اس ریوالور کو دور سے دیکھتے ہی رکنے کے بجائے رفتار تیز کرتے ہوئے گزر جاتے تھے۔

جب وہ ضرورت سے مجبور ہوکر سڑک سے ذرا دور جھاڑیوں کے پیچھے گیا' تب اس نے ریوالور پر توجہ دی۔ تابانی اس کی موٹر سائیکل لے کر فرار ہورہا تھا۔ اس وقت اس نے ناکام فائرنگ کی تھی پھر ریوالور کو پتلون کی بیلٹ میں پھنسا کر رکھ دیا تھا۔ جبکہ ریوالور نمائش کی چیز نہیں ہوتی لیکن ایسی غلطی پریشانی کے باعث ہوگئی تھی۔

وہ اسے اپنے لباس میں چھپاکر جھاڑیوں کے پیچھے سے سڑک کے کنارے آیا۔ اب تابانی کے پیچھے جانا فضول تھا۔ پتا نہیں وہ کتنی دور نکل گیا ہوگا اور راستے بھی بدلتا گیا ہوگا۔

اس صوبے کے تمام تھانوں میں تابانی کے فرار ہونے کی خبر پہنچا دی گئی تھی۔ اس کا حلیہ بیان کیا گیا تھا۔ صبح سے ٹی وی اسکرین پر اس کی تصویریں دکھائی جارہی تھیں۔ کسی نہ کسی تھانے سے اس کے بارے میں کوئی اطلاع مل سکتی تھی۔ اب وہ کسی گاڑی والے سے لفٹ لے کر لاہور واپس جانا چاہتا تھا۔ ایسے وقت ایک پولیس وین آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے رکنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی اس کے قریب آکر رک گئی۔ پولیس ٹیم کے انچارج نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے جوان؟"

"مجھے لاہور جانا ہے۔"

"ضرور جاؤ۔ بے شمار بسیں اور پبلک وین لاہور جاتی ہیں۔"

"مجھے اسی گاڑی میں جانا ہے۔"

اس نے اپنا آئی ڈی کارڈ دکھایا۔ انچارج نے فوراً گاڑی سے باہر آکر سیلوٹ کیا۔ سپاہیوں نے بھی گاڑی سے اتر کر سیلوٹ کیا۔ جمشید نے گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھ کر انچارج سے پوچھا۔ "تم نے تابانی کے فرار ہونے کی خبر سنی ہے۔"

"یس سر! میں ساہیوال سے آرہا ہوں۔ تابانی ادھر نہیں آیا ہے۔ کسی دوسرے راستے سے فرار ہوا ہے۔"

وہ سب گاڑی میں بیٹھ کر جانے لگے۔ انچارج نے کہا۔ "سر! ہم نے سنا ہے' وہ مفرور بہت خطرناک ہے۔ وہ بے شمار مسلح سپاہیوں کے نرغے سے نکل بھاگا ہے۔"

"ہاں' ہم اسے صرف "را" کا آلہ کار سمجھ رہے تھے لیکن اس کی پشت پر کچھ اور بیرونی طاقتیں ہیں۔ وہ بڑی زبردست پلاننگ پر عمل کرتے ہوئے فرار ہوا ہے۔"

ایسا کہتے وقت اسے لیڈی سرجن آمنہ کی یاد آئی۔ وہ پچھلی رات تابانی کے فرار ہونے سے پہلے اسپتال کے باہر اپنی کار میں آئی تھی۔ اس نے پہلے کئی بار تابانی سے ملنے کے لئے ڈی جی سے درخواست کی لیکن قانون کا حوالہ دے کر اسے تابانی کے پاس جانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

اس کے جواب میں آمنہ نے قانون کا حوالہ دے کر مراد کو اسپتال سے جیل لے جانے کی اجازت نہیں دی تھی اور کہا تھا کہ مراد اس کا مریض ہے۔ اس کا ایک اور آپریشن کیا جائے گا۔ جب تک وہ مراد کی صحت مندی سے مطمئن نہیں ہوگی تب تک پولیس والے اسے اپنی حراست میں نہیں لے جاسکیں گے۔

آمنہ کے اس عمل سے یقین کی حد تک شبہ ہوتا تھا کہ وہ خفیہ طور پر بیرونی ملکوں سے طاقت اور ذرائع استعمال کرکے تابانی اور مراد کی مدد کررہی ہے۔ شاید اس طرح

دوسرے مجرموں کے کام آتی ہوگی لیکن اس کے خلاف ایسی باتوں کا ثبوت نہیں تھا۔ اس کے برعکس وہ عالمی سطح پر ایک معزز اور غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل لیڈی سرجن سمجھی جاتی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا اور اِدھر اُدھر دیکھتا جارہا تھا۔ پھر وہ ایک دم سے چونک کر بولا "گاڑی روکو۔"

پولیس وین رک گئی۔ سڑک کے دائیں جانب تقریباً سو گز کے فاصلے پر کچھ مکانات تھے ان میں سے ایک مکان کے سامنے اسے اپنی موٹر سائیکل نظر آئی۔ وہ اس سرکاری موٹر سائیکل کو لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ اس نے انچارج سے کہا۔ "اس مکان کے سامنے ایک موٹر سائیکل کھڑی ہوئی ہے۔ وہ میرے استعمال میں رہتی ہے۔ تابانی اسی گاڑی کو دھوکے سے لے کر بھاگا تھا۔" انچارج نے پوچھا۔ "کیا تابانی اس گھر میں چھپا ہوگا؟"

"ہوسکتا ہے' وہاں گاڑی چھوڑ کر کسی دوسری گاڑی میں گیا ہو یا اس مکان میں چھپا ہو۔ تم سب وردی میں ہو گاڑی سے اتر کر ایک لمبا چکر کاٹتے ہوئے اور چھپتے اس مکان کو چاروں طرف سے گھیرلو۔ پھر کسی کو باہر نہ نکلنے دو۔ میں بھی چھپتا ہوا وہاں پہنچوں گا۔"

گاڑی سے اتر کر اس نے دور جاکر سڑک کو پار کیا۔ پھر اپنے تجربے اور مہارت کے مطابق چھپتے ہوئے اس مکان کی چاروں طرف آگئے۔ پھر جمشید نے ایک درخت کے پیچھے سے بلند آواز میں کہا۔ "تابانی! اگر تم موجود ہو تو میری آواز سن رہے ہو اور مجھے پہچان رہے ہو۔ پولیس نے اس مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ ہتھیار پھینک کر دونوں ہاتھ پیچھے گردن پر رکھ کر باہر آجاؤ۔"

اس چھوٹی سی آبادی کے چند گھروں سے عورتیں مرد اور بچے نکل آئے تھے۔ پولیس والوں کو ہتھیاروں کے ساتھ دیکھ کر اپنے گھروں میں گھس گئے تھے۔ دروازے اور کھڑکیوں سے جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ جہاں موٹر سائیکل کھڑی ہوئی تھی' اس مکان کے اندر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ جمشید نے کہا۔ "اگر یہاں مفرور مجرم نہیں ہے تو مکان والوں کو کسی خوف کے بغیر باہر آنا چاہیے۔ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ ہم تین تک گن رہے ہیں۔ تین تک گنتی ختم ہوگی تو ہم فائر کرتے ہوئے مکان کے اندر داخل ہوجائیں گے۔"

اس نے ایک ذرا وقفے سے کہا "ایک.........."

دو بولنے سے پہلے ہی ایک قد آور شخص دونوں ہاتھ اپنی گردن پر رکھ کر باہر آیا پھر اونچی آواز میں بولا۔ "جناب عالی! یہاں کوئی مجرم نہیں ہے۔ گھر میں تین عورتیں ہیں۔ ایک میری بوڑھی ماں' دوسری میری بیوی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے ایک بیٹے کو

جنم دیا ہے۔ تیسری ایک بوڑھی دائی ماں ہے۔ آپ اندر آکر دیکھ سکتے ہیں۔"

جمشید نے کہا۔ "تم جس گاڑی کے پاس کھڑے ہو' مجرم اس گاڑی میں فرار ہوا تھا۔ یہ تمہارے پاس کیسے آئی؟"

اس نے گاڑی کو دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس گاڑی کی وجہ پولیس والے آئے ہیں۔ اس نے کہا۔ "جناب! اب میں سمجھا۔ دراصل یہ گاڑی کوئی مجرم چک نمبر چھتیس کے ایک کچے راستے پر پھینک کر گیا تھا۔ میں اُدھر سے گزر کر یہاں آرہا تھا۔ اتنی اچھی گاڑی دیکھ کر سمجھ میں نہیں آیا کہ کون اس ویرانے میں اسے چھوڑ گیا ہے۔ میں نے دور تک دیکھ کر آوازیں دیں اور پوچھا کہ گاڑی کس کی ہے؟ مجھے نہ کوئی بندہ دکھائی دیا' نہ ہی کہیں سے جواب ملا۔ میں نے آدھے گھنٹے تک وہاں کھڑا رہ کر انتظار کیا پھر اسے اٹھا کر یہاں لے آیا۔"

تم نے اسے کسی پولیس اسٹیشن میں کیوں نہیں پہنچایا؟"

"کیسے پہنچاتا جناب! میری گھروالی بیمار ہے۔ تھوڑی دیر پہلے ایک بیٹا پیدا ہوا ہے۔ میں اسے چھوڑ کر تھانے جاتا تو یہ بے چاری دوا اور دائی کے بغیر مرجاتی۔"

جمشید نے دو سپاہیوں کے ساتھ اس گھر کے اندر آکر تین عورتوں کو دیکھا۔ ایک نوزائیدہ بچہ اپنی ماں کے پاس لیٹا ہوا تھا۔ پورے گھر کی اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد وہ باہر آیا۔ اس شخص سے بولا۔ "تم نے جہاں سے یہ گاڑی پائی ہے' مجرم اس راستے سے فرار ہوا ہے۔ تم ہمارے ساتھ مل کر وہ صحیح جگہ بتاؤ۔ پولیس سے تعاون کرو گے تو تم پر گاڑی کی چوری کا الزام عائد نہیں کیا جائے گا۔"

"بندہ آپ کا خادم ہے۔ کوئی چوری نہ کرکے چور بننے سے بہتر ہے' میں بیمار بیوی کو چھوڑ کر آپ کے ساتھ چلوں۔ چلیں جناب! حاضر ہوں۔"

پولیس والے اپنی وین وہاں لائے اور اس شخص کو اس میں بٹھا کر لے جانے لگے۔ جمشید اپنی موٹر سائیکل پر ان کے ساتھ چلنے لگا۔ اس شخص نے تابانی سے وہ گاڑی جہاں لی تھی' وہاں پہنچ کر بولا۔ "یہی جگہ ہے جناب! آپ دیکھ لیں۔ یہاں دور دور تک کوئی بندہ نظر نہیں آرہا ہے۔ میں یہاں سے گاڑی اٹھا کر پچھتا رہا ہوں۔ اب توبہ کرتا ہوں' کہیں ہوائی جہاز بھی پڑا ملے گا تو اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

پولیس ٹیم کے انچارج نے جمشید سے کہا۔ "سر! وہ ادھر لاہور کی طرف کبھی واپس نہیں جائے گا۔ اس راستے سے......... آگے گیا ہوگا۔"

جمشید نے تائید کی۔ "میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ ہمیں اس راستے پر آگے جانا

چاہیے۔"

انہوں نے اس شخص کو اپنے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ پھر وہاں سے آگے جانے لگے۔ جمشید نے بار بار بھٹکنے کے باوجود پھر ایک بار صحیح سمت پائی تھی۔ ٹھیک اسی طرف جارہا تھا' جہاں تابانی گیا تھا۔

آگے کئی کلومیٹر تک جانے کے بعد گھنے جنگلات کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہاں کئی کاٹیجز ایک دوسرے سے دور دور دکھائی دیئے۔ پہلے ہی کاٹیج کے برآمدے میں آمنہ کو دیکھتے ہی جمشید ٹھٹک گیا۔ اس نے پولیس وین کو رکنے کے لئے کہا۔ آمنہ برآمدے میں ایک ایزی چیئر پر بیٹھی عینک لگائے ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ پولیس والوں کو دیکھ کر اس نے کتاب بند کر دی۔ جمشید نے برآمدے کے بالکل قریب موٹر سائیکل روک کر حیرانی سے پوچھا۔ "آپ اور یہاں؟"

آمنہ نے پوچھا۔ "کیا مجھے یہاں نہیں ہونا چاہیے؟ تم حیران کیوں ہو؟"

"کیا یہ حیرانی کی بات نہیں ہے کہ یہ جگہ لاہور سے تقریباً تین سو کلو میٹر دور ہے۔ آپ وہاں دن رات مصروف رہتی ہیں اور رہائش یہاں اختیار کی ہے؟"

"میں جتنی معزز ڈاکٹر ہوں' اتنی ہی مشکوک بھی ہوں۔ کیا تمہارے ذہن میں یہ بات نہیں آرہی کہ میں نے مجرمانہ سرگرمیوں کے لئے یہاں رہائش اختیار کی ہے؟"

"ہم قانون کے محافظ ہیں۔ ہر ایک پر شبہ کرنا ہماری عادت ہے۔ میں آپ پر بھی شبہ کرسکتا ہوں۔"

"بے شک کرو لیکن میں یہ وضاحت کردوں کہ لاہور میں میری رہائشی کوٹھی ہے۔ میں ہفتے میں ایک دن چھٹی کرتی ہوں اور چھٹی کا ایک دن شہر کے ہنگاموں سے دور اسی کاٹیج میں گزارتی ہوں۔ یہاں دور دور تک جاکر دیکھو' امیر کبیر افراد کے کاٹیج ہیں۔ آج تم یہی کام کرو' ہر کاٹیج والے سے جاکر پوچھو کہ انہوں نے یہاں کاٹیج بنانے کا جرم کیوں کیا ہے؟"

"میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ یہاں کاٹیج بنا کر رہنا جرم ہے۔"

"جرم نہیں ہے تو مجھے یہاں دیکھ کر حیران کیوں ہوئے؟"

"آپ کے دہرے کردار کے باعث۔ آپ ڈاکٹر ہیں' کسی کا بھی علاج کرسکتی ہیں لیکن بدترین دہشت گردوں کا بھی علاج کرکے انہیں آئندہ دہشت گردی کے لئے نئی زندگی دیتی ہیں۔"

"کوئی ایک مثال دو کہ کسی بھی ایک مجرم نے میرے ہاتھوں شفا پاکر پھر کوئی جرم کیا

ہو؟"

"یہی تو دشواری ہے' آپ کے خلاف کوئی بھی ثبوت نہیں مل سکے گا کیونکہ آپ کا پیشہ علاج کرنا ہے۔ مجرم خواہ کتنے ہی خطرناک ہوں' ان کا علاج کرنا آپ کا فرض ہے۔"

"میرا مشورہ ہے' کبھی دینی کتابیں بھی پڑھ لیا کرو۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بدترین بیمار دشمنوں کی عیادت کے لئے ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ کیا آپ دشمنوں یا مجرموں کی سرپرستی کرتے تھے؟ اگر نہیں تو کیا میں مجرموں کی سرپرستی کرتی ہوں؟"

"میں آپ سے بحث نہیں کروں گا۔ میں یہاں تک تابانی کے تعاقب میں آیا ہوں۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ تم نے مجھے یہاں دیکھتے ہی سوچ لیا ہوگا کہ میں نے تابانی کو یہاں چھپا رکھا ہے؟"

"میں سیدھی سی بات کہہ رہا ہوں۔ آپ کے کاٹیج کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔"

"سیدھی سی بات نہیں کہہ رہے ہو بلکہ سیدھی سی بات یہ ہے کہ میرے گھر کی تلاشی لینے کے لئے سرچ وارنٹ لانا چاہیے تھا۔"

"مجھے معلوم ہوتا کہ یہاں آپ کا ذاتی کاٹیج ہے تو ضرور سرچ وارنٹ لے کر آتا۔"

"تو اب جاکر لے آؤ۔ کاٹیج کہیں نہیں جائے گا' یہیں رہے گا۔"

موبائل پولیس کے انچارج نے کہا۔ "آپ بڑی دیر سے بہت بول رہی ہیں۔ کیا پولیس والوں کو نہیں جانتیں؟ ہم ایک مفرور مجرم کو ڈھونڈ نکالنے کے لئے زبردستی اس کاٹیج کی تلاشی لے سکتے ہیں۔"

آمنہ نے سامنے چھوٹی سی میز پر رکھے ہوئے موبائل فون کو اٹھا کر کہا۔ "میری اجازت کے بغیر برآمدے میں بھی قدم رکھو گے تو ایک فون کروں گی اور تمہاری وردی اتر جائے گی۔ آئندہ لیڈی ڈاکٹر آمنہ خاتون سے بات کرتے وقت اپنی اوقات میں رہنا۔"

جمشید نے انچارج سے کہا۔ "وردی پہن کر غیر قانونی باتیں نہ کیا کرو۔ اپنے سامنے والی شخصیت کو سمجھا کرو۔ ہم فی الحال درخواست کرسکتے ہیں کہ یہ قانون کی بالادستی کے لئے قانون کے محافظوں سے تعاون کریں اور ہمیں کاٹیج کی تلاشی لینے کی اجازت دیں۔"

آمنہ نے کہا۔ "ان تمام وردی والوں سے کہو' یہاں سے جائیں اور اپنی گاڑی میں بیٹھیں۔ تم وردی میں نہیں ہو اس لئے تمہیں گھر کے اندر جانے کی اجازت دیتی ہوں۔ جاؤ گھر کا ایک ایک گوشہ اچھی طرح دیکھ لو۔"

جمشید نے انچارج سے کہا۔ "تم سپاہیوں کے ساتھ گاڑی میں جاکر بیٹھو' میں ابھی آتا

ہوں۔"

انچارج ناگواری سے منہ بناکر سپاہیوں کے ساتھ جانے لگا۔ آمنہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جمشید کے ساتھ کاٹیج کے اندر آئی۔ وہ کمرے کی ہر چیز کو توجہ سے دیکھنے لگا۔ بستر کے نیچے' الماریوں کے پیچھے' ایک کمرے کی چھت کے ساتھ بنی ہوئی مچان پر بھی چڑھ کر دیکھا۔ کچن اور ٹائلٹ جیسی جگہ بھی نہیں چھوڑی۔ آمنہ نے کہا۔ "تم بہت ترقی کرو گے' میں نے سنا ہے کہ بہت ضدی اور مضبوط قوتِ ارادی کے مالک ہو۔"

وہ اپنی تعریف سن کر خوش نہیں ہوا۔ ایک دروازے کو دیکھ کر بولا۔ "یہ پچھلا دروازہ کھلا ہوا کیوں ہے؟"

"تمہیں رفتہ رفتہ تجربہ ہوگا۔ اس موبائل پولیس کے انچارج کو بھی اتنی سی عقل نہیں آئی کہ کسی مجرم کو تلاش کرنا ہے تو دو چار سپاہیوں کو کاٹیج کے پیچھے بھیج دیتا۔ مجھ سے بحث کرنے میں آدھا گھنٹا گزر گیا۔ پتا نہیں تابانی اور کتنی دور جاچکا ہوگا۔"

"وہ کتنی دور جائے گا' قانون کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں۔"

"میں نے قانون کے ہاتھ نہیں دیکھے۔ پولیس کے لمبی کمائی والے لمبے ہاتھ دیکھے ہیں۔"

وہ کوئی جواب دیئے بغیر جانے لگا۔ پھر ایک کمرے میں پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے بھی وہاں کینوس کے جوتے دیکھے تھے۔ اس بار اسے وہ کھوجی یاد آیا جس نے کینوس کے جوتوں کے نشانات دیکھتے ہوئے اسے ایک بس میں تابانی کے قریب پہنچایا تھا۔

جمشید نے قریب آکر ان جوتوں کو اٹھا کر توجہ سے دیکھا۔ پھر کہا۔ "میں نے کسی لیڈی ڈاکٹر کو کینوس کے جوتے پہنتے نہیں دیکھا۔"

"ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ آئندہ ہر روز صبح کے وقت دیکھا کرو۔ میری طرح کتنی ہی ڈاکٹرز ایسے جوتے پہن کر صبح جوگنگ کرتی ہیں۔"

وہ جوتے وہاں رکھ کر باہر آتے ہوئے بولا۔ "مجھے افسوس ہے' میں نے آپ کو زحمت دی۔"

"مجھ سے رسمی باتیں نہ کرو میں تمہیں اپنے بیٹے جیسا سمجھتی ہوں اور تمہیں سمجھاتی ہوں کہ ہر مجرم کو سزا دینا ضروری نہیں ہے۔ قانون کا ایک محافظ محبت اور حسنِ سلوک سے مجرم کو راہِ راست پر لاسکتا ہے۔"

"مجرم نصیحت کرنے سے راہِ راست پر نہیں آتے۔ جو ماں کی گود سے مدرسے

سے' مسجد سے' اسکول اور کالج سے گزر کر بھی جرم کرتا رہے جسے ماں کی گود اور مسجد کی پاکیزگی بھی شریف انسان نہ بناسکے' اسے ہماری نصیحتیں کیا رہ راست پر لائیں گی؟"

"کوئی ایک ٹھوکر سے سنبھل جاتا ہے اور کوئی ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھا کر بھی نہیں سنبھلتا۔ کسی مجرم کی کوئی کمزوری ہاتھ آجائے تو اس کی کمزوری سے کھیل کر اسے راہِ راست پر لایا جاسکتا ہے۔"

"کیا تابانی کی کوئی کمزوری آپ کے ہاتھ آگئی ہے؟"

"بیٹے! تمہارے لہجے میں طنز ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ مراد اور اس کا ہونے والا بچہ تابانی کی کمزوری بن گئے ہیں۔ تابانی ساری عمر خود کو مرد کہتی رہے' لیکن وہ اپنے اندر ممتا کو نہیں کچل سکے گی۔ وہ ہونے والا بچہ اس کی زندگی کا سرمایہ اور مراد سے ملنے والی محبت کا انعام ہے۔"

"آپ کیا سمجھتی ہیں' وہ ایک بچے کی خاطر دہشت گردی سے باز آجائے گا۔"

"ہاں۔ مراد نے مجھ سے کہا ہے کہ بیٹی ہو یا بیٹا' وہ اسے کبھی مجرم بننے نہیں دے گا اور یہی بات تابانی بھی دل کی گہرائیوں سے کہتا ہے یا کہتی ہے۔"

"کیا ان کے ایسا کہنے سے عدالت ان کی دہشت گردی کی پچھلی تمام وارداتوں کو معاف کردے گی؟"

"تم اگلے ماہ کسی افسر کا عہدہ حاصل کرنے والے ہو۔ اگر تمہارے جیسے چند افسران تابانی اور مراد کی ضمانت لیں گے تو انہیں آزمائشی طور پر رہا کرکے' چند پابندیوں میں رکھ کے تجربہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ راہِ راست پر نہیں آئیں گے تو ان کے لئے سزا لازمی ہوگی۔"

"آپ افسانوی باتیں کررہی ہیں۔ ہم انٹیلی جنس اور پولیس والوں کو یہ تعلیم اور تربیت دی جاتی ہے کہ جس سے جرم سرزد ہوگیا' وہ مجرم ہوگیا۔ اسے گرفتار کرکے عدالت تک پہنچانا ہمارا فرض ہے۔ اس کے بعد ہم نہیں جانتے کہ عدالت اسے سزا دے گی یا آپ کی طرح اللہ کے نام پر اسے معاف کردے گی۔"

"طنز کررہے ہو تو کڑوی حقیقت سن لو کہ تم وردی پہن کر اور سینے پر ہزار تمغے سجاکر کسی ایک بھی ایسے سیاست داں کو گرفتار نہیں کرو گے جس نے قومی خزانہ خالی کیا ہے۔ قرض کے نام پر کروڑوں اور اربوں روپے کا ڈاکا ڈالنے والے کو تم کبھی گرفتار کرکے عدالت میں نہیں لے جاؤ گے۔ اس وقت انٹیلی جنس اور پولیس کی یہ تعلیم و تربیت بھول جاؤ گے کہ جس نے جرم کرلیا' وہ مجرم ہوگیا اور اسے گرفتار کرکے عدالت

تک پہنچانا تمہارا فرض ہے۔"

"سوری محترم خاتون! میں بحث نہیں کروں گا۔"

وہ پلٹ کر جانے لگا۔ آمنہ نے پوچھا۔ "حقیقت سے منہ موڑ کر جارہے ہو؟"

وہ برآمدے سے جاتے ہوئے بولا۔ "میں ڈیوٹی پر جارہا ہوں۔"

"نہیں جاسکو گے۔ یہ سن کر تمہارے قدم رک جائیں گے کہ تابانی میرے پاس ہے۔"

وہ ایک دم سے چونک گیا۔ واقعی اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس کا ایک پیر برآمدے پر اور دوسرا پیر برآمدے کے زینے پر تھا۔ وہ حیرانی سے بولا۔ "آ....... آپ اعتراف کررہی ہیں کہ آپ نے ایک خطرناک دہشت گرد کو پناہ دی ہے؟"

"کیا پھر ایک بار اعتراف کروں؟ یا کاغذ پر تحریری بیان دوں؟"

"میں نے سنا ہے کہ آپ بڑی حوصلہ مند ہیں۔ کیا آپ تحریری بیان دے کر حوصلے کا ثبوت دیں گی؟"

"ایک شرط پر۔"

"شرط کیا ہے؟"

"تم بھی ایک تحریری بیان دوگے کہ قومی خزانے کے ڈاکوؤں کو گرفتار کرکے عدالت تک پہنچاؤ گے۔ میں تحریری بیان دوں گی کہ جس دن تم یہ قومی فرض ادا کرو گے' اسی دن میں تابانی کو عدالت میں پہنچادوں گی۔"

"میرا تحریری بیان ہوگا کہ میں قومی خزانے کے ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔"

"یہ تو سیاسی بیان ہوگا کہ کوئی قرض نادہندہ قانون کی گرفت سے نہیں بچے گا۔ کسی قرض نادہندہ کو ملک سے باہر نہیں جانے دیا جائے گا اور کسی قرض نادہندہ کو الیکشن میں امیدوار بننے نہیں دیا جائے گا۔ ایسے بیانات پوری قوم برسوں سے سنتی آرہی ہے۔ ایک بیان تم بھی لکھ کر مجھے دے دوگے۔ میں بھی مجبور ہوکر تحریری بیان دوں گی کہ جلد ہی تابانی کو تلاش کرکے اسے قانون کے حوالے کروں گی۔ کیا یہی سیاسی بچکانہ انداز اختیار کرو گے؟"

وہ لاجواب سا ہوکر اسے چند لمحوں تک دیکھتا رہا پھر برآمدے سے اتر کر موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ "آپ اعتراف نہ کرتیں' تب بھی مجھے یقین ہوگیا تھا کہ آپ نے اسے کہیں پناہ دی ہے۔ میں اسے آپ کی خفیہ پناہ گاہ سے نکال کر نہ

لے جاؤں تو میرا نام جمشید نہیں۔"

وہ موٹر سائیکل کو موڑ کر تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا پولیس وین کے ساتھ جانے لگا۔ آمنہ اسے مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔

☆======☆======☆

میں شلپا کے ساتھ ایک فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا تھا۔ مراد چنگیزی نے فون پر مجھے بتایا تھا کہ ہمارے اور امیر حمزہ کے درمیان جو غلط فہمی تھی' وہ ختم ہوگئی ہے۔ امیر حمزہ کے آدمی ایک گاڑی لے کر میرے پاس آرہے ہیں۔ ان سے میرا کوڈ ورڈز کا تبادلہ ہوگا کہ "امیر حمزہ فار فرمان اینڈ فرمان فار امیر حمزہ۔"

وہ آنے والے صحیح کوڈ ورڈز ادا کریں گے تو میں شلپا کے ساتھ اس گاڑی میں سوار ہو جاؤں گا۔ پھر وہ گاڑی ہمیں امیر حمزہ کے ایک خفیہ اڈے پر پہنچا دے گی۔

شلپا نے پہلے میرے ساتھ کہیں جانے سے انکار کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میری امی اس کے باپ کی دشمن ہیں اور میں بھی اس کے باپ سے کسی موقع پر انتقام لے سکتا ہوں۔ اب اسے یرغمال بنا کر کہیں لے جا رہا ہوں۔ ایسے حالات میں اس کا باپ شمشیر سنگھ اسے واپس حاصل کرنے کی کوشش کرے گا تو ہم سب اس کے باپ کو پھر کسی طرح ٹریپ کر کے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

میں نے اس سے کہا۔ "تم نے مجھے اپنی کار کے اندر قیدی بنا کر اس کار کو بلاسٹ کرنے کی دھمکی دے کر پولیس کو اپنے باپ کی رہائی پر مجبور کر دیا۔ وہ رہا ہو کر کہیں جاچکا ہے اس لئے تم مجرم ہو اور پولیس کو مطلوب ہو۔ تم دھوکا دے کر بھاگنا چاہوگی تو میں ریوالور سے تمہیں زخمی کر کے پولیس کے حوالے کر دوں گا پھر تمہارا مفرور باپ تمہیں پولیس کی حراست سے رہائی نہیں دلا سکے گا۔"

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس باپ کو بیٹی کی خاطر پھر پولیس سے ٹکرانا چاہیے لہٰذا اس نے ایسے سر جھکا لیا جیسے حالات کے سامنے جھک گئی ہو لیکن وہ مختلف پہلوؤں سے سوچ رہی تھی کہ خود کو کس طرح یرغمال بنائے جانے سے بچا سکتی ہے؟

اس نے کہا۔ "فرمان! تم جو چاہو گے' وہ ہوگا۔ میں نے پہلی بار اپنے آپ کو کسی کے سپرد کیا ہے۔ جب آبرو دی ہے تو تمہارے لئے جان بھی دے سکتی ہوں۔ کیا آج مجھے پالینے کے بعد تمہارے دل میں میرے لئے تھوڑی سی بھی محبت پیدا نہیں ہو رہی ہے؟"

سچ تو یہی تھا کہ اسے ایک بار پالینے کے بعد بار بار حاصل کرنے کو اور اپنا بنائے رکھنے کو جی چاہتا تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی کسی عورت کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ یہ نہیں

جانتا تھا کہ عورت شلپا کی طرح حسن کا مجسمہ ہوتی ہے۔ قدرت نے اس کے اندر کچھ ایسا جادو بھرا ہے کہ ایک بار وہ مرد کی دسترس میں آجائے تو پھر اس حسن و شباب کے طلسم سے نکل نہیں پاتا۔ وہاں فٹ پاتھ پر آنے جانے والوں کے درمیان کھڑا رہ کر بھی کار کے اندر گزرنے والے حسین' رنگین اور سنگین لمحات یاد آرہے تھے اور اندر بڑی خاموشی سے اسے بار بار پالینے کی ہلچل پیدا ہو رہی تھی۔

وہ بولی۔ "کس سوچ میں پڑ گئے؟ تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟ ٹھیک ہے کہ میں دشمن کی بیٹی ہوں۔ کیا تم نے میری قربت میں اتنی سی بھی کشش محسوس نہیں کی کہ دشمن کی بیٹی کو دوست بنا سکو؟"

"تم بہت حسین اور پُرکشش ہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ تمہیں پالینے کے بعد پھر کسی عورت کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہیے لیکن میں جذبات میں بہہ کر اپنی امی سے ہونے والی دشمنی نہیں بھول سکتا۔"

"اپنی یہی بات اس طرح کہو کہ ہم دونوں جذبات میں بہہ کر ہمیشہ کے لئے ایک ہو کر اپنے بزرگوں کی دشمنی کو دوستی میں بدل سکتے ہیں۔ تمہاری امی جب خطرناک مجرموں کا آپریشن کر کے انہیں نئی زندگی دیتی رہتی ہیں تو کیا تمہارے جیسے اکلوتے بیٹے کی محبت اور محبوبہ کی خاطر صرف ایک گاڈ فادر شمشیر سنگھ کالیا کی ایک غلطی معاف نہیں کریں گی؟"

"میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ آئندہ میری امی کا فیصلہ تمہارے باپ کے سلسلے میں کیا ہوگا؟"

"تم میرے ایک مشورے پر غور کرو گے تو ہم اولاد ہو کر بزرگوں کے حق میں کچھ اچھا کر سکیں گے۔"

"تم کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"دیکھو' تم اپنی امی سے بہت دور ہو اور اب میں بھی اپنے ڈیڈی سے دور ہوگئی ہوں۔ اگر میری طرح تمہارے دل میں بھی میرے لئے سچی محبت ہوگی تو ہم دونوں کچھ عرصے کے لئے ان سے دور رہیں گے اور دور رہ کر انہیں قائل کریں گے کہ تمہاری امی اپنے اکلوتے بیٹے اور میرے ڈیڈی اپنی اکلوتی بیٹی کی بہتری چاہتے ہیں اور ہماری سچی محبت کی قدر کر سکتے ہیں تو انہیں اپنی دشمنی کو دوستی میں بدلنا ہوگا۔ پھر جانتے ہو' میں کیا کروں گی؟"

"کیا کرو گی؟"

"جب تمہاری امی راضی ہوجائیں گی تو میں ان کی مرضی کے مطابق اپنے ڈیڈی کو مجبور کروں گی کہ وہ تمہاری امی کے سامنے گھٹنے ٹیک کر شرمندہ ہوکر اپنی غلطی کی معافی مانگیں۔"

میں نے خوش ہوکر بڑی محبت اور عقیدت سے شلپا کو دیکھا۔ میری امی یہی چاہتی تھیں کہ میں شمشیر سنگھ کالیا کو ان کے سامنے لاکر گھٹنے ٹیکنے اور معافی مانگنے پر مجبور کردوں۔

میں نے اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر کہا۔ "اگر تم نے ایسا کردکھایا تو تمام عمر میرے دل پر حکومت کرتی رہوگی۔ میں امی سے اس سلسلے میں ابھی فون پر بات کروں گا۔"

"راستے میں ایسی اہم باتیں کرنا مناسب نہیں ہے۔ پہلے یہاں سے چلو۔ اگر ہمارے لئے بھیجی جانے والی گاڑی یہاں آجائے گی تو وہ لوگ ہمیں مجبوراً اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ پہلے یہاں سے چلو۔"

میں اس کے ساتھ فٹ پاتھ پر چلتا ہوا ایک اسٹریٹ پر آیا۔ وہاں بھی ہم آگے بڑھتے رہے۔ وہ کہتی رہی۔ "ہم اس طرح ان سب سے دور رہ کر اپنے بزرگوں کی نفرت کو محبت میں بدل سکیں گے۔ تم مشورہ دو۔ ہمیں فی الحال کسی چھت اور چار دیواری میں چھپ کر رہنا چاہیے۔ کسی ہوٹل میں یا کسی کے بنگلے میں پے انگ گیسٹ بن کر رہیں گے تو تمہارے امیر حمزہ' مراد چنگیزی اور میرے ڈیڈی ہمیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ ہماری پناہ گاہ ایسی ہو کہ ان میں سے کوئی وہاں تک نہ پہنچ سکے۔"

"میں پہلی بار لندن آیا ہوں۔ میں تمہیں صحیح مشورہ نہیں دے سکوں گا۔ تم مجھ سے زیادہ اس شہر کے بارے میں جانتی ہو۔ کیا کسی خفیہ اڈے سے واقف ہو؟"

"کئی خفیہ اڈوں سے واقف ہوں لیکن ڈیڈی بھی ان اڈوں سے واقف ہیں۔ اگر انہوں نے وہاں پہنچ کر مجھے تم سے جدا کیا اور اپنے آدمیوں کے ذریعے تمہیں نقصان پہنچایا تو میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔ اب میرے اس جسم کو تمہارے سوا کوئی ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔"

میں نے چلتے چلتے رک کر اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگالیا۔ مغربی ممالک میں راہ چلتے محبت کرنے والے ایک دوسرے کو کس کرتے ہیں۔ وہ اپنی باتوں سے اور اپنے عمل سے ثابت کررہی تھی کہ ایسی کسی جگہ نہیں جائے گی' جہاں اس کا باپ مجھے نقصان پہنچا سکے۔

میں نے کہا۔ "میں تمہارے بزرگوں کے درمیان دشمنی ختم کرانے والے نیک ارادوں کو بھی سمجھ رہا ہوں اور اپنے لئے تمہاری محبت کی انتہا پر بھی فخر کررہا ہوں۔ میں بھی تمہارے لئے محبت کی انتہا کردوں گا لیکن فوری طور پر فیصلہ کرو کہ ہمیں اپنے تمام لوگوں سے دور رہنے کے لئے کہاں جانا چاہیے؟"

"مشکل یہ ہے کہ ہم دونوں کے پاسپورٹ ہماری رہائش گاہوں میں رکھے ہیں۔ اگر وہ ہماری جیب میں ہوتے تو ابھی ایسٹ بورن جاتے اور وہاں سے کسی بحری جہاز سے فرانس پہنچ جاتے۔ میں جانتی ہوں کہ جعلی پاسپورٹ کہاں سے بنوائے جاسکتے ہیں لیکن ایسے پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے بھی کم سے کم بارہ گھنٹے لگیں گے۔ اس وقت تک ہم کہاں بھٹکتے رہیں گے۔ رات ہوچکی ہے۔ میں نے لندن کی سردی میں کبھی باہر رات نہیں گزاری.........."

اس نے کہتے کہتے چپ ہوکر سوچا پھر چٹکی بجاکر بولی۔ "میری ایک سہیلی سوزی تنہا ایک اپارٹمنٹ میں رہتی ہے۔ ڈیڈی میری اس سہیلی کے بارے میں نہیں جانتے ہیں۔ میں اس سے بات کرتی ہوں۔ شاید وہ ہم دونوں کو ایک رات اپنے اپارٹمنٹ میں رہنے کی اجازت دے دے۔ شاید کیا' وہ ضرور راضی ہوجائے گی۔ میں اس کی ایک کمزوری جانتی ہوں۔"

"اس کی کیا کمزوری ہے؟"

"وہ لالچی ہے۔ میں اسے سو پاؤنڈز دوں گی تو وہ ہمارے قدموں میں بچھی رہے گی۔"

شلپا کا موبائل فون میرے پاس تھا۔ میں نے اسے دیا۔ اسی وقت بزر کی آواز سنائی دی۔ شلپا نے اس کا پاور آف کرکے کہا۔ "شاید......ڈیڈی میری خیریت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم جب تک کسی چھت کے نیچے پہنچ کر محفوظ نہیں ہوں گے' کسی سے بات نہیں کریں گے۔"

"شلپا! تم بہت سمجھ دار ہو۔ میرے فون کی بیٹری ڈاؤن ہوچکی ہے ورنہ مراد چنگیزی اور امیر حمزہ مجھ سے رابطہ کرکے یہ پوچھتے کہ میں اس فٹ پاتھ پر تمہارے ساتھ کیوں نہ رہا جہاں میرے لئے ایک گاڑی پہنچنے والی تھی۔ اب وہ سب پریشان ہوکر مجھے اور تمہیں تلاش کررہے ہوں گے۔"

شلپا موبائل کا پاور آن کرکے اپنی سہیلی سوزی سے رابطہ کرنے لگی۔

واقعی مراد چنگیزی میرے لئے پریشان ہورہا تھا۔ وہ خود ایک گاڑی میں مجھے اور شلپا

کو لے جانے کے لئے مقررہ جگہ پر آیا تھا اور وہاں ہم دونوں کو نہ پاکر اپنے ماتحتوں کو آس پاس کی گلیوں میں دوڑایا تھا لیکن وہ ہم تک نہیں پہنچ سکے۔ اس نے موبائل کے ذریعے رابطہ کیا تو بیٹری کے ناکارہ ہونے وجہ سے وہ میری آواز نہ سن سکا۔

اس نے امیر حمزہ سے رابطہ کرکے اسے بتایا۔ "فرمان اور شلپا کہیں گم ہوگئے ہیں۔ یہ اندیشہ ہے کہ شمشیر سنگھ عرف کالیا نے کوئی چال چلی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ ہم اس کی بیٹی کو اغوا کرتے وہ فرمان کو اغوا کرکے لے گیا ہے۔"

امیر حمزہ نے کہا۔ "میں ابھی شمشیر سنگھ کالیا سے رابطہ کرکے فرمان کے بارے میں معلوم کرتا ہوں۔ تم بھی اس کالیا کا ذاتی موبائل فون نمبر نوٹ کرلو۔"

امیر حمزہ نے کالیا کا فون نمبر نوٹ کرانے کے بعد اپنے فون کو آف کیا پھر وہ شمشیر سنگھ کالیا سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ اسی وقت فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے اسے آن کرکے کان سے لگا کر پوچھا۔ "کون؟"

"میں انیلا بول رہی ہوں۔ تم کب تک ہائیڈ پارک کے پاس رہوگے۔ تھوڑی دیر پہلے تم نے بتایا تھا کہ شمشیر سنگھ کالیا فرار ہوگیا ہے۔ اب تمہیں میرے مسئلے سے نمٹنا چاہیے۔ نیک بخت نے مجھ پر دوبار قاتلانہ حملے کرائے لیکن ہم اس کے خلاف کچھ نہیں کرسکے۔ ابھی اس نے میرے موبائل پر بڑے فاتحانہ انداز میں کہا ہے کہ وہ کل صبح کی فلائٹ سے الیکشن کے سلسلے میں پاکستان جارہا ہے اور میں امیر حمزہ کا سہارا لے کر بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔"

"تم اس کے فاتحانہ انداز سے اپنی توہین محسوس کررہی ہو۔ میری جان! دشمن اپنی عارضی کامیابیوں پر فخر کرے تو اپنے دل کو سمجھانا چاہیے کہ کامیابی اور ناکامی' ہار اور جیت انسان کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ تم فون رکھو' میں ابھی اس سے نمٹ لیتا ہوں۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ امیر حمزہ نے نیک بخت کو اہمیت نہیں دی۔ اس نے پہلے میری فکر کی اور شمشیر سنگھ کالیا سے رابطہ کرکے پوچھا۔ "فرمان علی کہاں ہے؟"

کالیا نے کہا۔ "یہ سوال مجھ سے کررہے ہو؟ کیا کوئی نئی چال چل رہے ہو؟ تم نے یا مراد چنگیزی نے میری بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ اس سے موبائل فون بھی چھین لیا ہے۔ میں نے ابھی اس سے رابطہ کیا تھا لیکن دوسری طرف سے فون بند کردیا گیا اور اپنا اغوا کرنے والے ہی کرسکتے ہیں۔"

"کالیا! سنجیدگی سے بات کرو۔ جھوٹ بولو گے' فرمان کو اغوا کرکے مجھ سے مسخرا پن کروگے تو بہت پچھتاؤ گے۔ میں نے اور مراد چنگیزی نے تمہاری بیٹی کو اغوا نہیں کیا

ہے۔"

"تو پھر فرمان میری بیٹی کو مجبور کرکے کسی دوسری جگہ لے گیا ہوگا۔ فرمان کی نیت تو پہلے ہی میری شلپا پر خراب ہوچکی تھی۔ اب پتا نہیں وہ بدمعاش میری بیٹی کے ساتھ کیسا سلوک کررہا ہوگا۔ اگر تم سچ مچ نہیں جانتے کہ فرمان نے میری بیٹی کو اغوا کیا ہے تو کسی طرح بھی حقیقت معلوم کرو کہ اس کے ساتھ میری بیٹی بھی کہاں گم ہوگئی ہے؟"

اس نے فون بند کردیا۔ امیر حمزہ نے مراد چنگیزی سے رابطہ کرکے کہا۔ "کالیا الزام دے رہا ہے کہ فرمان نے اس کی بیٹی شلپا کو اغوا کیا ہے۔ کیا تم نے فون کے ذریعے فرمان سے بات نہیں کی؟"

"فرمان کا فون خاموش ہے۔ شاید بیٹری ناکارہ ہوگئی ہے۔"

"فرمان نئی بیٹری خرید سکتا ہے' کسی فون بوتھ سے رابطہ کرسکتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کررہا ہے تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ کہیں مجبور اور بے بس ہوگیا ہے یا پھر وہ چالاک باپ کی مکار بیٹی اسے اُلو بناکر پھانس رہی ہے۔"

مراد نے پریشان ہوکر کہا۔ "فرمان غیر معمولی جسمانی طاقت کا حامل ہے۔ ذہین بھی ہے لیکن دوسروں کی مجرمانہ چالبازیوں کو اچھی طرح سمجھ نہیں پاتا ہے۔ جرائم کی دنیا میں پہلی بار انیلا بانو کے بنگلے میں جاکر دشمنوں سے نمٹنے کے باوجود ایک معاہدے کو حاصل نہ کرسکا۔ وہ معاہدہ دشمن لے گئے اور اس نے آپ کو اور انیلا کو غلط فہمی میں مبتلا کردیا۔ اب کالیا کی بیٹی شلپا کے فریب میں آکر کسی دوسری جگہ چلا گیا ہے۔"

"یہی بات ہوسکتی ہے۔ شلپا اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹکاتے ہوئے اپنے باپ کے پاس ضرور لے جائے گی۔"

"آپ کی پہنچ لندن پولیس اور اسکاٹ لینڈ یارڈ تک ہے' آپ پولیس اور سراغ رسانوں کے ذریعے اسے تلاش کرسکتے ہیں۔"

"مجھ سے ملو اور فرمان کی تصویر ہو تو اس کے نیگیٹو سے کئی درجن تصاویر پرنٹ کرالو۔ وہ تصاویر پولیس اور سراغ رسانوں کو دی جائیں گی۔ میرے جانباز بھی اسے تلاش کریں گے۔"

"میں ابھی اپارٹمنٹ جاکر اس کی تصویر کے پرنٹس تیار کراتا ہوں' پھر آپ سے رابطہ کروں گا۔"

اس نے فون بند کیا۔ پھر پاکستان میں آمنہ سے رابطہ کرکے بتایا کہ فرمان اس کے دشمن کی بیٹی شلپا کے ساتھ یا تو اپنی مرضی سے گیا ہے یا شلپا اسے پھانس کے اپنے باپ

کے پاس لے جارہی ہے۔

آمنہ نے پوچھا۔ "کیا شمشیر سنگھ کالیا سے تمہارا سامنا ہوا تھا؟"

"جی ہاں۔ وہ پولیس کی حراست میں تھا مگر اس کی بیٹی نے بڑی چالاکی سے باپ کو فرار ہونے کا موقع دیا اور آپ کے صاحب زادے کو کہیں لے گئی.........."

مراد چنگیزی' آمنہ کو ہائیڈ پارک میں ہونے والے واقعات کی تفصیل بتانے لگا۔ ادھر امیر حمزہ نے فون پر نیک بخت سے رابطہ کیا۔ اس کے مشیر نے فون پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟"

"اپنے باپ بد بخت سے کہو' میرا نام امیر حمزہ ہے۔"

"مسٹر حمزہ! آپ کو شریفانہ لہجے میں گفتگو کرنا چاہئے۔"

"وطن دشمن سیاست داں کے کتوں سے ایسا ہی انداز اختیار کرنا چاہیے۔"

"آپ نے........ نیک بخت صاحب کو بدبخت کہا ہے اور انہیں میرا باپ کہا ہے۔ آپ اپنے الفاظ واپس لیں ورنہ........"

"ورنہ کے بعد کوئی چیلنج کرنے والی بات کرو گے تو تم اس بدبخت کے ساتھ کل صبح کی فلائٹ سے پاکستان نہیں جاسکو گے۔"

"میری اتنی جرأت کہاں ہے کہ دو بڑوں کے معاملات میں پڑ کر مصیبتوں کو دعوت دوں۔ آپ ہولڈ کریں۔ میں ان سے آپ کی بات کراتا ہوں۔"

امیر حمزہ نے تھوڑی دیر انتظار کیا پھر اسے نیک بخت کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو آپ حمزہ صاحب ہیں؟"

"ہاں۔ میں امیر حمزہ ہوں۔ یہ کہنے کے لئے فون کیا ہے کہ تمہاری وطن دشمنی کی فہرست بہت لمبی ہے۔ تم نے دوبار انیلا پر قاتلانہ حملے کرائے اور اپنے وسیع ذرائع استعمال کرکے قانون کی گرفت سے پہلے کی طرح بڑے محفوظ اور مطمئن ہو کر پاکستان جانا چاہتے تھے۔"

"مجھے تو پاکستان جانا ہی ہے۔ تمہیں کیا تکلیف ہے؟"

"تکلیف یہ ہے کہ تم قانون کی گرفت میں نہیں آرہے ہو لہٰذا اب میری عدالت میں تمہارے جرائم اور کمینگی کا محاسبہ ہوگا۔ جب تک تمہیں سزا نہیں ملے گی' تم یہاں سے نہیں جاؤ گے۔ تمہاری طرف سے انیلا کو جتنے نقصانات پہنچے ہیں' ان کی تلافی کرنے کے بعد شاید جاسکو.........."

"حمزہ صاحب! انیلا جیسی حسینائیں دنیا میں لاکھوں ہیں۔ میں آپ کے اطراف

حسیناؤں کا میلہ لگا دوں گا۔ اس کی خاطر آپ مجھ سے دشمنی نہ کریں۔"

"کیا سچ کہہ رہے ہو؟ انیلا سے زیادہ حسین عورتیں میرے لئے فراہم کرسکتے ہو؟"

"بے شک۔ آپ ایک بار مجھے آزما کر تو دیکھ لیں۔"

"آزمانے کی کیا ضرورت ہے؟ تم اپنی زبان سے اقرار کررہے ہو کہ حسینائیں سپلائی کرنے والے دلال ہو۔ کیا یہ خاندانی پیشہ ہے؟"

"دیکھیں' آ........ آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ بھی بڑے وسیع ذرائع کے مالک ہیں لیکن میرے خلاف انیلا کا ساتھ دے کر اور میرا کچھ نہ بگاڑ کر اپ کو سمجھ لینا چاہیے کہ میں آپ سے کم نہیں ہوں۔"

"تو پھر پاکستان جاؤ' کل جاؤ گے' پرسوں تمام اخبارات' ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے ووٹ دینے والے عوام کو بتایا جائے گا کہ تم نے دوبار انیلا پر قاتلانہ حملے کرائے اور اس کے باوجود وہ زندہ ہے۔ وہ پاکستان جاکر تمہاری انتخابی مہم کو ناکام بنائے گی۔"

نیک بخت سوچ میں پڑ گیا۔ اگرچہ خفیہ ہاتھ سے کیا ہوا معاہدہ اس کے ہاتھ آگیا تھا لیکن اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپیوں کے ساتھ انیلا پاکستان آکر اس کے خلاف بیانات دے گی تو مخالف سیاسی پارٹی کے لیڈر کاشف اکبر کو فائدہ پہنچے گا۔ خفیہ ہاتھ کی حمایت کے باوجود اس کے چال چلن اور کردار کی دھجیاں اُڑتی رہیں گی تو اپنی ہی پارٹی کے دوسرے کئی لیڈر پٹڑی بدل کر وزارتیں حاصل کرنے کے لئے کاشف اکبر سے جاملیں گے۔ جتنے لیڈر اس کا ساتھ چھوڑیں گے' اتنے حلقوں کے ووٹ اس کی جھولی سے نکل کر کاشف اکبر کی جھولی میں چلے جائیں گے۔

امیر حمزہ نے پوچھا۔ "کیا ہوا بدبخت! تمہارا فون چپ کیوں ہوگیا؟" ں ا ـں ہے

"میں آپ کے جواب میں بہت کچھ بول سکتا ہوں اور بہت ضرور کریں گی۔"

پہلے عقل کی بات سمجھاتا ہوں۔ ہمیں دشمنی کا راستہوں مگر صورت سے نہیں پہچانتی

چال اور سیاست داں کی چالبازیاں پلٹ جایا کرتی ظابق ہوتی ہے۔ آدمی کا بچہ آدمی اور

والا ہے لیکن وہ سامنے والے کی ترپ چال کو

بعد عقل آتی ہے کہ کوئی کسی سے کم نہیں ہایسا کہہ رہی ہیں۔ آپ میری ایک بات مان

"تم جو نصیحت کررہے ہو' اس کے نفرت ختم ہو جائے یا کچھ کم ہو جائے۔"

"یہ نصیحت نہیں ہے' دھمکی بھی نہ

آپ بہت بڑے ذہین بازیگر ہیں۔ کوئی سے کان سے لگا کر بولی۔ "ہیلو نمستے' آداب! کیا جائے۔"

"اللہ کو منظور ہو گا تو ایک دن تم مجھے امی بھی کہو گی۔ فی الحال ڈاکٹر' میڈم وغیرہ کہہ سکتی ہو۔"

"میں نے آپ کی بہت تعریفیں سنی ہیں۔ آپ نے مشکل سے مشکل آپریشن کئے ہیں اور مریضوں کی اندرونی خرابیوں کو دور کر کے انہیں ایک نئی زندگی دی ہے مگر میرے اندر ڈیڈی کا زہر بھرا ہے تو کیا آپ محبت اور انسانیت کے آلات سے آپریشن کر کے میرے اندر سے زہر نہیں نکال سکیں گی؟"

"تم بہت اچھی باتیں کرتی ہو۔"

"میں نے فرمان سے وعدہ کیا ہے کہ اگر آپ ڈیڈی کی غلطی معاف کرنا چاہیں گی تو میں ڈیڈی کو مجبور کروں گی کہ وہ آپ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر سر جھکا کر اپنی غلطی کی معافی مانگیں۔"

"کیا تم نے ایسی بات اپنے ڈیڈی سے کی ہے اور کیا تمہارے ڈیڈی میرے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر راضی ہو گئے ہیں؟"

"جب سے آپ کے بیٹے کی محبت ملی ہے' میں ڈیڈی سے دور ہو گئی ہوں۔ ابھی تک ان سے فون پر بھی گفتگو نہیں کی ہے۔ میں فرمان کے ساتھ ایک جگہ رُوپوش ہوں تاکہ ڈیڈی آپ کی دشمنی میں اسے نقصان نہ پہنچائیں۔ آپ سے باتیں کرنے کے بعد ان سے فون پر رابطہ کروں گی۔"

"اپنے باپ سے پھر کبھی بات کر لینا۔ پہلے فرمان سے پوچھو کیا ہم ماں بیٹے نے ایک دوسرے کو رُوبرو دیکھا ہے؟"

شلپا نے..........ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے پوچھا۔ "کیا تم نے اپنی امی کو کبھی اپنے سامنے نہیں دیکھا ہے؟"

"نہیں۔ وہ کہتی ہیں' تمہارے ڈیڈی کی سازش کے باعث میرے والد نے میری امی سے ہمیشہ کے لیے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور امی کو گھر چھوڑ کر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ جب میں جوان ہوا تو امی نے فون کے ذریعے مجھ سے کہا تھا' جب تک میں تمہارے باپ کو سزا نہ دوں' اس وقت تک ان کے سامنے نہ آؤں۔"

شلپا نے فون پر امی سے کہا۔ "ابھی فرمان نے بتایا ہے کہ میرے ڈیڈی نے کس طرح آپ کو ذلیل اور رسوا کر کے اپنے شوہر کے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا تھا' یہ سن کر مجھے شرم آ رہی ہے۔"

"آئندہ تمہیں شرمانے کا بہت وقت ملے گا۔ ابھی اس بات کو سمجھو کہ جب ماں

بیٹے ایک دوسرے کے رُوبرو نہیں آتے ہیں تو پھر ایک چھت کے نیچے بھی نہیں رہتے ہوں گے اور جب بیٹا ماں کے ساتھ نہیں رہتا تو بہو کیسے ساتھ رہے گی؟ ساس کے ساتھ رہے گی یا شوہر کے ساتھ؟"

"آپ چاہتی ہیں کہ میرے ڈیڈی کو سزا ملے۔ اس سے بڑی سزا اور کیا ہو گی کہ وہ ایک طاقتور انڈر گراؤنڈ مافیا کے گاڈ فادر ہو کر آپ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر معافی مانگیں گے۔"

"یہ واقعی حیرانی کی بات ہے کہ اتنا بڑا گاڈ فادر میرے سامنے جھکے گا۔ فرمان کو ریسیور دو۔ میں ابھی فیصلہ سناؤں گی۔"

میں نے ریسیور لے کر کہا۔ "امی! میں بول رہا ہوں۔"

"بیٹے! تم جانتے ہو کہ عالمی سطح کے کتنے ہی خطرناک مجرم اور دنیا کے کتنے ہی ممالک کے انڈر گراؤنڈ گاڈ فادر مجھے سلام کرتے ہیں۔"

"جی امی! میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"ان میں سے ایک گاڈ فادر شمشیر سنگھ کالیا میرے سامنے جھک کر سلام کرے گا اور معافی مانگے گا تو کون سی نئی اور بڑی بات ہو گی۔"

"لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ شمشیر سنگھ کالیا کو آپ کے سامنے لا کر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دوں۔"

"اس لئے کہا تھا کہ وہ میرے بیٹے کے ہاتھوں مار کھا کر لہولہان ہو کر میرے قدموں میں آئے۔ مگر تم اسے رشتے دار بنا کر لا رہے ہو۔ کیا تم اپنی ماں کو اتنا کم ظرف سمجھتے ہو کہ میں اپنی بہو کے باپ کو اپنے قدموں پر سر جھکا کر اس بہو کی توہین کروں گی جو آئندہ میرے بیٹے کی نسل پیدا کرے گی؟"

"آپ کی باتوں نے مجھے الجھا دیا ہے۔"

"تم اس لئے الجھ رہے ہو کہ سلجھی ہوئی باتیں نہیں سمجھ پا رہے ہو۔ یہ تمہاری اور شلپا کی محبت اور شادی کا معاملہ نہیں ہے' جنوبی ایشیا اور مشرق بعید کے چند گاڈ فادرز ایک دوسرے سے برتر رہنے اور مخالف گاڈ فادرز کی کمزوریاں معلوم کرنے کے لئے اپنے جاسوس دوسرے گاڈ فادرز کی مافیا تنظیم میں بھیجتے رہتے ہیں۔ تمہارے گاڈ فادر ماموں ہاشم جنوبی ایشیا میں سب سے زیادہ طاقتور ہیں۔ شمشیر سنگھ کالیا پچھلے بائیس برس سے تمہارے گاڈ فادر ماموں ہاشم کو کمزور نہ بنا سکا۔ مگر اب شلپا میری بہو بن کر میرے ساتھ رہ کر گاڈ فادر ہاشم کے بہت سے اہم راز معلوم کر سکتی ہے اور ہاشم کی بہت سی خفیہ سرگرمیوں کی

اطلاع اپنے باپ تک پہنچا سکتی ہے۔"

"امی! آپ مجھ سے بہت زیادہ تجربہ کار ہیں۔ میں آپ کی ہر بات مانتا ہوں لیکن آپ یہ نہیں مانیں گی کہ شلپا اپنی جان سے بھی زیادہ مجھے چاہتی ہے۔"

"یہ خوشی کی بات ہے کہ ایک لڑکی میرے بیٹے کو دل و جان سے چاہتی ہے لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ شلپا سے شادی کر کے لاہور کبھی نہ لاؤ۔ ایک جاہل اور بد اخلاق جوان کی طرح اپنی بیوی کے باپ پر کبھی ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ کبھی اسے مار پیٹ کر لہولہان کر کے میرے قدموں میں لا کر رشتوں کی توہین نہ کرو۔"

"کیا شلپا سے شادی کرنے کے بعد میں آپ سے کبھی نہیں مل سکوں گا؟"

"نہ مجھ سے' نہ اپنے گاڈ فادر ماموں ہاشم سے اور نہ ہی مراد چنگیزی سے تمہارا.......... کوئی تعلق رہے گا۔ بس تم اپنی بیوی اور اس کے باپ کے ساتھ رہا کرو گے؟"

"آپ یہ کیسی بے تکی باتیں کر رہی ہیں؟"

"جو کہہ رہی ہوں' اس سے انکار نہ کرو۔ میں تمہیں اجازت دیتی ہوں کہ شلپا سے محبت کر کے اور شادی کر کے ایک نیا تجربہ حاصل کرو۔ تم جتنے تجربات حاصل کرتے جاؤ گے' فولاد کی طرح مضبوط ہوتے جاؤ گے۔ میں فون بند کر رہی ہوں۔ ابھی مراد چنگیزی سے بات کرو۔"

فون بند ہونے کے بعد میں نے سوچتے ہوئے ریسیور کریڈل پر رکھا ہی تھا کہ شلپا نے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہیں؟"

"وہ کہتی ہیں' جب تم ہمارے گھر کی عزت بن جاؤ گی تو تمہارے ڈیڈی کو ان کے قدموں میں جھکانا ہماری کم ظرفی اور تمہاری توہین ہو گی۔"

"تمہاری امی بہت اچھی ہیں۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ بزرگوں سے دور رہ کر ہم ان کی دشمنی کو دوستی میں بدل سکتے ہیں اور اب بدل رہے ہیں۔ شادی کے بعد میں تمہاری امی کے پاس رہ کر ان کی خدمت کرتی رہوں گی۔"

"شادی کے بعد تم تو کیا' میں بھی ان کے سامنے نہیں جاؤں گا۔ انہوں نے لاہور آنے سے منع کر دیا ہے۔"

"تو پھر شادی کرنے کا فائدہ کیا ہو گا؟"

"کیا مطلب؟ تم شادی مجھ سے کرو گی اور رہو گی امی کے پاس؟"

"ہاں میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ شادی کے بعد سسرال میں رہ ساس کی ایسی خدمت

کروں گی کہ وہ مجھے بیٹی کا پیار دینے لگیں۔"

میں نے فون کے ذریعے مراد چنگیزی کو مخاطب کیا۔ چنگیزی نے کہا۔ "میں تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ تمہیں یہ بتانا ضروری تھا کہ میں نے وہ اپارٹمنٹ چھوڑ دیا ہے۔ اب پتا نہیں کہاں جا کر رہوں گا' تم شلپا کے ساتھ زندگی گزارو۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ آپ میرے استاد ہیں۔ آپ کہیں چلے جائیں گے تو میری تربیت کون کرے گا؟"

"شادی کے بعد بیوی پال پوس کر تمہیں تربیت دیتی رہے گی۔"

مراد چنگیزی نے فون بند کر دیا۔ میں ریسیور ہاتھ میں پکڑے سوچ میں پڑ گیا۔ شلپا نے کہا۔ "کیا ہوا؟ کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟"

"امی نے اپنے پاس آنے سے روک دیا اور مراد چنگیزی اپارٹمنٹ چھوڑ چکا ہے اور پتا نہیں کہاں جا رہا ہے؟"

"یعنی تمہاری امی کو ہماری محبت اور شادی پر اعتراض ہے؟"

"اعتراض نہیں ہے۔ انہوں نے شادی کرنے کی اجازت دی ہے۔"

"تو پھر اپنے پاس آنے سے کیوں منع کر رہی ہیں؟"

"صرف اس لئے کہ شمشیر سنگھ کالیا کو سزا نہیں دے سکوں گا۔"

"میں بیٹی ہو کر کہتی ہوں کہ باپ کو اس کی غلطی کی سزا دو۔"

"اب وہ صرف تمہارے باپ ہی نہیں بلکہ میرے سسر اور بزرگ بھی ہوں گے۔ اس لئے میں ان پر ہاتھ نہیں اٹھا سکوں گا۔"

"تمہاری امی کی ذہانت اور چالاکی کی داد دینی چاہیے۔ انہوں نے ہمیں شادی کرنے سے منع نہیں کیا لیکن اپنے پاس آنے سے اس لئے منع کر دیا کہ تم میرے ڈیڈی سے انتقام نہیں لو گے۔ اگر ماں کی قسم پوری کرنے کے لئے انتقام لو گے تو یہ سسر کے ساتھ بدتمیزی ہو گی۔ ان حالات میں تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

میں سوچنے لگا کہ امی کے اس مشورے کے پیچھے گہرائی ہے کہ شلپا سے محبت کر کے اور شادی کر کے ایک نیا تجربہ حاصل کرو۔ تم جتنے تجربات حاصل کرتے جاؤ گے' فولاد کی طرح مستحکم ہوتے جاؤ گے۔

میں نے شلپا سے کہا۔ "میں تم سے شادی کروں گا اور تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔"

میں اس کے قریب ہونے لگا تو وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ "ابھی نہیں' شادی کے

بعد............"

"ہماری شادی تو تمہاری لاکڈ کار میں ہو چکی ہے۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ تمہاری امی نے مجھے مایوس کیا ہے۔"

وہ کمرے سے جاتے ہوئے بولی۔ "میں سوزی کے کمرے میں اس کے ساتھ سونے جا رہی ہوں۔"

وہ چلی گئی۔ میں اِدھر کا رہا' نہ اُدھر کا۔ امی نے بڑی محبت سے یا میری تربیت کی خاطر مجھے اپنی طرف آنے سے منع کر دیا تھا اور شلپا امی کے رویے سے مایوس ہو کر مجھے چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ میں پہلی بار لندن آیا تھا۔ رات کو زیادہ سردی محسوس ہوتی تھی اس لئے میں آتش دان کے قریب بستر پر کمبل اوڑھ کر سو گیا۔

تھکن کے باعث جلد ہی آنکھ لگ گئی پھر جلد ہی کھل بھی گئی۔ ایسا لگا جیسے تھوڑی دیر کے لئے سویا تھا لیکن رات کے تین بج گئے تھے۔ کمرے میں اچانک بجلی کی روشنی ہوئی تو میں نے آنکھوں کو ہاتھوں سے ملتے ہوئے دیکھا۔ دو آدمی گن لئے آتش دان کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ دروازے پر شلپا ایک ادھیڑ عمر کے شخص کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس شخص نے کہا۔ "تم اپنی ماں کی زبان سے شمشیر سنگھ کالیا عرف ڈینجرس مین کا نام سنتے رہے تھے۔ آج آنکھوں سے دیکھ لو۔ میں وہی ہوں اور یہ میری بیٹی شلپا ہے۔ یہ میرا رائٹ ہینڈ ہے۔"

شلپا نے کہا۔ "تم نے دیکھا تھا کہ میں نے ڈیڈی کو کس طرح پولیس کی حراست سے نکالا تھا۔ میری پلاننگ تھی کہ میں تمہاری ماں کے پاس بہو بن کر جاؤں اور تمہارے ماموں گاڈ فادر ہاشم کی انڈر ورلڈ حکومت کا تختہ الٹ دوں مگر تمہاری ماں بہت مکار ہے' اس نے بڑی حکمت عملی سے میری چال ناکام بنا دی۔ آخر مجبور ہو کر ڈیڈی کو یہاں بلانا ہی پڑا۔"

باپ بیٹی کی تمام چالبازیاں صاف طور سے میری سمجھ میں آ گئیں۔ وہ ناکامی کے بعد مجھے یرغمال بنا کر لے جانے آئے تھے۔ میری امی' مراد چنگیزی اور امیر حمزہ کے لئے چیلنج بن رہے تھے۔ کالیا نے مجھ سے کہا۔ "ریسیور اٹھاؤ' مراد چنگیزی اور امیر حمزہ کو فون کرو۔ ان سے کہو' کل صبح کی فلائٹ سے نیک بخت صاحب پاکستان جائیں گے' اگر انہیں روکا گیا تو تمہیں گولی مار دی جائے گی اور اگر وہ تمہیں زندہ اور سلامت واپس چاہتے ہیں تو انیلا کو ہمارے حوالے کریں اور تمہیں لے جائیں۔ اس ہاتھ دیں اور اس ہاتھ لیں۔"

میں نے دل ہی دل میں تسلیم کیا کہ میری امی کتنے گہرے مشاہدے اور کتنے زہریلے تجربات رکھتی ہیں۔ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ میں دشمن کی بیٹی کی محبت کے جال میں پھنس

گیا ہوں۔ چند گھنٹوں ہی میں اس عورت نے کتنی شدت سے اپنی محبت اور وفاداریوں کا یقین دلا کر میرا اندھا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔

شلپا نے چند گھنٹے پہلے خود کو سر سے پیر تک میرے حوالے کر دیا تھا۔ مجھ جیسا مرد جس نے کبھی کسی عورت کو ہاتھ نہ لگایا ہو' وہ حسن و شباب سے بھرا جام پی کر کیسا بدمست ہو گا' یہ اب میری سمجھ میں آ رہا تھا۔

امیر حمزہ اور مراد چنگیزی چاہتے تھے کہ شلپا کو یرغمال بنا کر اس کے باپ شمشیر سنگھ کالیا کو کمزور بنایا جائے۔ شلپا اپنے باپ کی طرح چالباز تھی۔ اس نے یہ کہہ کر میرا دل جیت لیا کہ جس طرح میں اپنی امی سے دور ہوں' اسی طرح وہ اپنے باپ سے دور میرے ساتھ کہیں چھپ کر بزرگوں کی دشمنی کو دوستی میں بدل دے گی۔

پھر اس نے ظاہر کیا کہ وہ کسی بھی ایسے خفیہ اڈے میں میرے ساتھ چھپنا نہیں چاہتی جہاں اس کا باپ آ کر مجھے نقصان پہنچائے۔ یعنی وہ باپ کے مقابلے میں میری حفاظت کو اہمیت دے رہی تھی۔

تھوڑی دیر تک میرے ساتھ بھٹکنے کے بعد وہ اپنی ایک سہیلی سوزی کے اپارٹمنٹ میں یہ کہہ کر لے گئی کہ اس کا باپ ہم تک وہاں نہیں پہنچ سکے گا۔ جبکہ مجھے بے وقوف بنانے کے آخری مرحلے میں اس کا باپ گویا میری موت بن کر پہنچ گیا تھا اور شلپا اس کے ساتھ بڑے فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ اب وہ مسکراہٹ میرے دل میں اترنے کے لیے نہیں' دل توڑنے کے لیے تھی۔

مسجد ڈھادے' مندر ڈھادے' ڈھادے جو کچھ ڈھیندا اے
پر کسے دا دل نہ ڈھائیں' رب دلاں وچ رہندا اے

یہ شعر اپنی جگہ بہت سچا ہے لیکن پہلی بار ایک زہریلے تجربے نے مجھے سمجھایا کہ رب کو اپنے دل میں قائم و دائم رکھنے کے لیے صرف دل کی نہیں' ذہانت کی بھی ضرورت ہے۔ ذہانت سے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ شدتِ شوق میں ہم کسی پھول کو چوم رہے ہیں یا کانٹے کو؟

شمشیر سنگھ کالیا نے مجھے حکم دیا تھا۔ "ریسیور اٹھاؤ۔ مراد چنگیزی اور امیر حمزہ کو فون کرو۔ ان سے کہو' کل صبح کی فلائٹ سے نیک بخت صاحب پاکستان جائیں گے۔ انہیں روکا گیا تو تمہیں گولی مار دی جائے گی اور اگر وہ تمہیں زندہ اور سلامت واپس چاہتے ہیں تو انیلا کو ہمارے حوالے کریں اور تمہیں لے جائیں۔ اس ہاتھ دیں اور اس ہاتھ لیں۔"

وہ اپنی بیٹی کے ذریعے مجھے پھانس کر بڑی زبردست سودے بازی کر رہا تھا۔ مجھے

زندہ رکھنے کے لیے نیک بخت کو پاکستان جا کر اپنی سیاست چمکانے کا موقع ملتا اور امیر حمزہ کے وطنِ عزیز کے لیے جو نیک مقاصد تھے' وہ دھرے کے دھرے رہ جاتے۔ پھر میری سلامتی اور واپسی کے لیے انیلا کو طلب کیا جا رہا تھا۔ میری زن مریدی کے باعث صرف امیر حمزہ کو ہی زیادہ نقصان پہنچنے والا تھا۔

میں بڑی ندامت محسوس کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا' ایسا کیا کر گزروں کہ میں بھی زندہ رہوں۔ امی کو جوان بیٹے سے محروم نہ کروں اور امیر حمزہ کی ہونے والی شکست کو فتح میں بدل دوں۔

شمشیر سنگھ کالیا نے مجھے گہری سوچ میں دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ایک جہاں دیدہ ماں نے اپنے بچے کو تجربات کی آگ میں کندن بننے کے لیے جرائم کی دنیا میں بھیجا ہے۔ بیچارہ بچہ اپنی ماں کو مدد کے لیے پکارے گا تب بھی وہ ہزاروں میل دور سے یہاں فوراً پہنچ نہیں پائے گی۔“

وہ مجھے طعنے دے کر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا پھر اسی طرح کان سے ریسیور لگائے انتظار کرنے لگا۔ اس کے بعد بولا۔ ”میں شمشیر سنگھ کالیا عرف ڈینجرس مین بول رہا ہوں۔ یہ تو مراد چنگیزی کا موبائل ہونا چاہیے۔ تم کون ہو؟“

وہ دوسری طرف سے جواب سننے لگا پھر ناگواری سے بولا۔ ”تم گھنشام بول رہے ہو؟ میں نے تمہیں امیر حمزہ پر نظر رکھنے کے لیے کہا تھا اور تم نے مراد چنگیزی کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھیر کر گولی مار دی؟“

میں نے چونک کر کالیا کو دیکھا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ ”کیا مراد مر چکا ہے؟ یو نان سینس! تم سمجھتے ہو' یہ سن کر مجھے خوشی ہو گی اور میں تمہیں انعام دوں گا؟ تم اتنے برسوں سے میرے ساتھ ہو اور میرے لائن آف ایکشن کو نہیں سمجھتے ہو۔ گدھے کے بچے! دشمن کو زندہ رکھ کر اسے کمزور' مجبور اور بے بس بنا کر اس سے کئی طرح کے فائدے حاصل کئے جاتے ہیں اور تم نے میری اجازت کے بغیر اسے گولی مار دی؟“

مراد چنگیزی کی موت کی خبر سن کر میں غم اور غصے سے کانپنے لگا لیکن جب کالیا نے اپنے ماتحت کو گدھے کا بچہ کہہ کر اپنے لائن آف ایکشن کی بات کی تو میری ذہانت نے مجھے سمجھایا' کالیا خود گدھے کا بچہ ہے۔ اس نے غصے میں میری موجودگی کو نظر انداز کر کے مجھے سمجھا دیا کہ وہ اپنے طریقۂ کار کے مطابق مجھے ہلاک نہیں کرے گا۔ مجھے میری امی کی کمزوری بنا کر مجھے مجبور اور بے بس بنا کر زندہ رکھے گا۔

شلپا نے کہا۔ ”ڈیڈی! غصہ تھوک دیں۔ گھنشام سے غلطی ہو گئی۔ آپ فرمان کو

اپنے خفیہ ٹارچر سیل میں رکھ کر اس کی امی کی ممتا کو بھڑکاتے رہیں اور اس کی ماں سے اپنی شرائط منواتے رہیں۔“

”بیٹی! میں غصے میں نہیں ہوں۔ نارمل ہوں۔ گھنشام کہہ رہا تھا کہ وہ مجبور ہو گیا تھا۔ مراد چنگیزی ان پر بھاری پڑ رہا تھا اس نے کاؤنٹر فائرنگ میں ہمارے چھ آدمیوں کو مار ڈالا تھا۔ لہٰذا جوابی فائرنگ میں اس دشمن مراد کو بھی مرنا پڑا۔“

اس نے پھر نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ ہونے پر کہا۔ ”میں شمشیر سنگھ کالیا عرف ڈینجرس مین بول رہا ہوں۔ تم شاید انیلا ہو۔ فون امیر حمزہ کو دو۔“

تھوڑی دیر بعد امیر حمزہ کی آواز سنائی دی۔ ”بول کالیے! تیری بیٹی مل گئی؟“

”میری بیٹی کہیں گم نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو دور رہ کر بھی میرے پاس رہتی ہے اور میرے دشمنوں کو تگنی کا ناچ نچاتی ہے۔ اس نے عالمی شہرت یافتہ لیڈی سرجن آمنہ کے بیٹے فرمان کو نچاتے ہوئے میرے قدموں میں لا گرایا ہے۔ شاید تمہیں میری باتوں کا یقین نہ ہو۔ یہ لو خود ہی اس سے بات کرو۔“

اس نے ریسیور میری طرف بڑھایا۔ میں نے ریسیور کو کان سے لگا کر کہا۔ ”ہیلو حمزہ صاحب! آپ سے کبھی سامنا نہیں ہوا لیکن ہائیڈ پارک میں آپ نے پولیس فون کے وائڈ اسپیکر پر میری آوازیں سنی ہیں۔ میں گہرے صدمے کے ساتھ یہ بری خبر سنا رہا ہوں کہ کالیا کے غنڈوں نے کاؤنٹر فائرنگ کے دوران میں میرے استاد محترم مراد چنگیزی کو قتل کر دیا ہے۔“

امیر حمزہ نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”خدا مغفرت کرے۔ اس مردِ مجاہد نے ہائیڈ پارک میں میری جان بچائی تھی میں فائرنگ کرنے والوں کے درمیان گھرا ہوا تھا' وہ اپنا ریوالور میری طرف اچھال کر خود نہتا رہ گیا تھا۔ میں کالیا اور اس کے غنڈوں کی زندگی حرام کر دوں گا۔ کیا بتا سکتے ہو کہ اس نے تمہیں کہاں قیدی بنا کر رکھا ہے؟“

”میں اس شہر میں پہلی بار آیا ہوں۔ یہاں کے علاقوں سے واقف نہیں ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ اپارٹمنٹ کس علاقے میں ہے۔“

شمشیر سنگھ کالیا نے مجھ سے ریسیور چھین کر اپنے کان سے لگا کر کہا۔ ”حمزہ! تم یہاں کا پتا معلوم کرنا چاہتے ہو؟ تم نے سن لیا کہ یہ اناڑی اس جگہ سے واقف نہیں ہے۔ اگر تم لیڈی سرجن آمنہ کے عقیدت مند ہو تو دو شرائط پر فرمان کو زندہ حاصل کر سکتے ہو۔ ایک شرط یہ ہے کہ نیک بخت کو صبح کی فلائٹ سے پاکستان جانے سے نہ روکو۔ انیلا کو ہمارے حوالے کر کے فرمان کو لے جاؤ۔“

"چھوٹی سی کامیابی پر بڑی بڑی شرائط پیش کر رہے ہو اور اتنی اونچی آواز میں بول رہے ہو جیسے دنیا فتح کرلی ہو۔ تم یہی چاہتے ہو نا کہ میں نیک بخت کو پاکستان جانے سے نہ روکوں؟ کوئی بات نہیں' میں نہیں روکوں گا لیکن موت اسے روک دے تو میری ذمے داری نہیں ہے۔ ویسے تم فرمان کو ہلاک نہیں کر سکو گے۔"

"کیوں نہیں کر سکوں گا؟"

"تمہیں کل صبح دس بجے تک اس بات کا انتظار کرنا ہو گا کیونکہ نیک بخت صحیح سلامت یہاں سے جا رہا ہے یا نہیں؟ وہ نہیں جاسکے گا تب تم فرمان کو ہلاک کرو گے۔ میں تمہاری پہلی شرط پر عمل کرتا ہوں یا نہیں' یہ دیکھنے کے لیے تم کل صبح دس بجے تک فرمان کو زندہ رکھو گے۔ ائرپورٹ پر جب نیک بخت بورڈنگ کارڈ لینے جائے گا تو میں فون کے ذریعے فرمان کی آواز سنوں گا۔ اگر مجھے اس کی آواز سنائی نہ دی تو نیک بخت کی آواز ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گی۔"

کالیا سوچ میں پڑ گیا۔ امیر حمزہ کی باتیں سن کر یہ خیال آرہا تھا کہ کل صبح دس بجنے میں بہت دیر ہے۔ اتنی دیر میں وہ مجھے اس کی قید سے نکال لے جانے کے لیے کوئی چال چل سکتا ہے۔ اس نے کہا۔ "پہلے میری دوسری شرط پوری کرو۔ انیلا کو ہمارے حوالے کرو۔ ہم نہیں چاہتے' وہ پاکستانی عوام کے سامنے دوبارہ زندہ نظر آئے۔ اسے مُردہ سمجھا جا رہا ہے۔ وہ مُردہ رہے گی اور نیک بخت صاحب کو سیاسی نقصان نہیں پہنچائے گی۔"

"تمہاری دوسری شرط یہ ہے کہ انیلا کو تمہارے حوالے کروں اور فرمان کو لے جاؤں۔ کیا تم اپنی شرط پر قائم رہو گے۔ میں ابھی انیلا کو تمہارے حوالے کرنے آؤں گا تو فرمان کو میرے حوالے کرو گے؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ فرمان کو اسی وقت واپس کیا جائے گا جب تک نیک بخت صاحب یہاں سے بخیریت روانہ ہو جائیں گے۔"

"تو پھر ائرپورٹ پر بدبخت کے سامنے انیلا سے فرمان کا تبادلہ ہو گا۔"

"تم بڑی ہیرا پھیری والی باتیں کررہے ہو۔ یہ بھول رہے ہو کہ لیڈی سرجن آمنہ کا بیٹا ہمارے رحم و کرم پر ہے۔"

"اور تم یہ بھول رہے ہو بدبخت کبھی فرمان کی ہلاکت نہیں چاہے گا۔ اگر یہ ہلاک ہو گیا تو میں انیلا کو پاکستان لے جاکر تمہارے بدبخت کا پورا سیاسی کیریئر برباد کر دوں گا۔ کیا وہ ایک فرمان کو ہلاک کرکے ساری زندگی سیاست کا پٹا ہوا مہرہ بن کر رہے گا؟"

"میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ انہیں پاکستان نہ جانے دیا گیا تو فرمان کو زندہ نہیں

رہنے دیا جائے گا۔ ویسے تم جیسی چالیں چلنے والے ہو' میں ان کے متعلق......... نیک بخت صاحب سے ابھی ان کی رائے معلوم کروں گا پھر تم سے رابطہ کروں گا۔"

میرے اندر یہ بات لاوے کی طرح پک رہی تھی کہ میری ایک غلطی سے اور میری موجودہ بے بسی سے مراد چنگیزی کی جان گئی۔ امیر حمزہ اگر اپنی چال میں کامیاب نہ ہوا تو اسے انیلا سے محروم ہونا پڑے گا۔ وہ میری ہلاکت نہیں چاہے گا اور میری امی خواہ کتنی ہی سنگدل اور سخت مزاج کی حامل ہوں' ان کی ممتا میرے لیے اندر ہی اندر تڑپ رہی ہو گی۔ وہ مجھے تجربات کی جلتی ہوئی بھٹی میں جھونک کر نہ جانے کتنے کرب میں مبتلا ہو گئی ہوں گی۔

میں جواں مرد ہوں۔ بچہ تو نہیں ہوں کہ کوئی مارنے آئے تو چپ چاپ مار کھالوں۔ مجھے امی کے سامنے یہ ثابت کرنا ہو گا کہ میں بدترین جان لیوا حالات سے گزر کر کسی کی مدد کے بغیر اپنی ماں کا سر اونچا کر سکتا ہوں۔

اس وقت شمشیر سنگھ کالیا کے موبائل فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے فون کو آن کر کے کان سے لگایا۔ "شمشیر سنگھ کالیا عرف ڈینجرس مین۔ تم کون ہو؟"

"میں برما انڈیا گراؤنڈ مافیا کا گاڈ فادر ناچی بول رہا ہوں۔ انڈونیشیا' بنکاک اور منیلا کے تمام انڈر گراؤنڈ مافیا کے گاڈ فادر تم سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ گاڈ فادر ہاشم جان کے بیٹے فرمان کو کوئی نقصان نہ پہنچاؤ۔ اسے فوراً رہا کرو۔ تمہاری ہم سے دوستی نہ سہی' دشمنی بھی نہ کرو۔ لیڈی سرجن آمنہ کی حمایت میں عالمی سطح کے بے شمار خطرناک مجرم تمہاری جان کے دشمن بن جائیں گے۔ ہمارا نیک مشورہ ہے کہ فرمان کے جسم پر ہلکی سی خراش ڈالنے سے پہلے پیش آنے والے خطرات کا اندازہ کر لو۔"

کالیا نے کہا۔ "تم سب گاڈ فادر ہاشم کی زبان بول رہے ہو اور یہ بھول رہے ہو کہ کئی ممالک کے انڈر گراؤنڈ مافیا کے گاڈ فادرز میرے بھی دوست اور حمایتی ہیں اور عالمی سطح کے بدترین اور بے رحم قاتل میرے ایک اشارے پر کسی کو بھی صفحہ ہستی سے مٹا سکتے ہیں۔ تم سب کو میرا مشورہ ہے کہ اپنے نیک مشورے کی آڑ میں متحد ہو کر مجھے دھمکیاں نہ دو۔ ایک طویل عرصے کے بعد آمنہ اور گاڈ فادر ہاشم کی ایک بہت بڑی کمزوری میرے ہاتھ آئی ہے اور یہ کمزوری میرے آہنی ہاتھوں کے شکنجے میں رہے گی۔"

کالیا نے اگرچہ مجھے بے بس قیدی بنا رکھا تھا لیکن مجھے اس اپارٹمنٹ سے قیدی بنا کر لے جانے میں دیر ہو رہی تھی بہت دیر ہو رہی تھی۔ دراصل وہ بار بار فون کے ذریعے اپنے دشمنوں کو یعنی میرے حمایتیوں کو یہ تاثر دے رہا تھا کہ اس کے ہاتھ میں اتنا بڑا مہرہ

آگیا ہے کہ اسے یہاں سے لے جاتے وقت کوئی راستے میں رکاوٹ پیدا کرے گا تو وہ اس اہم مہرے کو یعنی مجھ کو گولیوں سے چھلنی کر دے گا۔

ان لمحات میں وہ نفسیاتی طور پر ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ ایک طرف امیر حمزہ نے اسے یہ تاثر دیا کہ وہ نیک بخت کے کام نہیں آسکے گا۔ دوسری طرف یہ اندیشہ تھا کہ جتنے مخالف گاڈ فادرز ہیں' وہ میری رہائی کے لیے نہ جانے کیا کچھ کر رہے ہیں۔

لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے اپنی ماں کی دعاؤں اور ان کی توقعات کے مطابق کسی مدد کا محتاج نہیں رہنا چاہیے۔ وہ ریسیور اٹھا کر ذرا جھک کر نیک بخت سے بات کرنے کے لیے نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں نے یکبارگی گردن پر ایک ہاتھ ڈال کر اس کے حلق کو اس طرح دبوچ لیا کہ اس کی سانس رکنے لگی۔ اس کے ریوالور والے ہاتھ کو اپنے دوسرے ہاتھ سے جکڑ لیا۔ ٹریگر پر اس کی انگلی تھی۔ میں نے اس کی انگلی پر انگلی رکھ دی۔ آتش دان کے پاس کھڑے ہوئے دونوں گن مینوں نے مجھے للکارا۔ "باس کو چھوڑ دو' ورنہ ...."

میں نے کالیا کو اسی طرح گرفت میں لیے ہوئے اس کا رخ دونوں گن مینوں کی طرف کیا۔ اپنی انگلی کا دباؤ ڈالا۔ ٹھائیں کی آواز سے گولی چلی۔ ایک گن مین اچھل کر گرتے ہوئے آتش دان کی آگ میں گیا۔ وہاں سے چیختا ہوا باہر آیا لیکن کپڑوں میں لگی ہوئی آگ کو بجھانے سے پہلے ہی اس نے دم توڑ دیا۔ دوسرا گن مین مجھ پر گولی نہیں چلا سکتا تھا۔ میں نے کالیا کو اپنے سامنے ڈھال بنا رکھا تھا۔

پیچھے کھڑی ہوئی شلپا اپنے باپ کو میری گرفت سے چھڑانے کے لیے اپنے دونوں ہاتھوں سے مجھے مار رہی تھی اور لانبے ناخنوں سے نوچ کھسوٹ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "تم نے بند کار میں میرے فولادی جسم کو آزمایا۔ اب تمہارا پہلوان باپ سمجھ رہا ہے کہ اس آہنی شکنجے سے مرنے کے بعد ہی نکل پائے گا۔"

کالیا کی گرفت ریوالور پر ڈھیلی پڑ رہی تھی۔ میں نے اس ریوالور سے فائر کیا۔ دوسرا گن مین چیخ مار کر گر پڑا۔ کالیا کے ہاتھ سے ریوالور گرتا ہوا فرش پر آیا۔ میں نے اسے اٹھا کر بیٹی کے اوپر پھینکا۔ بیٹی کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ باپ کے بوجھ تلے دب گئی تھی۔ جب وہ دونوں الگ ہوئے تو میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر وہیں فرش پر پڑے رہ گئے۔ خوف کے باعث ان کے چہرے زرد پڑ گئے تھے۔

میں نے کہا۔ "تمہارے جیسے قاتلوں کو سزائے موت سے ڈر لگتا ہے۔ دوسروں کو قتل کرتے وقت بڑا ہی عجیب طرح کا مزہ آتا ہے۔ مجھے بھی مزہ آئے گا۔ کیوں شلپا! پہلے

باپ کو مرنا چاہیے یا بیٹی کو؟"

کالیا نے کہا۔ "تم ہمیں مار کر زندہ نہیں رہ سکو گے۔ اس اپارٹمنٹ کے باہر میرے گن مین چھپے ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں دیکھتے ہی گولیوں سے چھلنی کر دیں گے۔"

"تمہاری اطلاع کا شکریہ۔ میں تمہیں گن پوائنٹ پر یہاں سے لے جاؤں گا تو وہ مجھ پر حملہ کرنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ میں یہاں سے دور کسی محفوظ جگہ لے جا کر تم باپ بیٹی کا رام نام ست ہے' کروں گا۔"

وہ دونوں بے بسی سے مجھے دیکھنے لگے۔ مجھے یہی کرنا تھا جو میں کہہ رہا تھا لیکن مراد کی موت کے بعد میں جیسے بے یار و مددگار ہو گیا تھا۔ میری اپنی رہائش کی جگہ محفوظ نہیں رہی تھی۔ میں اس اجنبی شہر میں کوئی دوسری محفوظ جگہ تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ ان باپ بیٹی کو بھلا کہاں لے جاتا؟ میں نے کالیا سے کہا۔ "ریسیور اٹھاؤ اور حمزہ صاحب سے رابطہ کرو۔ میں بات کروں گا۔"

شلپا نے کہا۔ "ڈیڈی! یہ امیر حمزہ کا فون نمبر نہیں جانتا ہے۔ آپ نمبر ڈائل نہ کریں۔ یہ اسے مدد کے لیے بلائے گا۔"

میں نے ریوالور سے شلپا کا نشانہ لے کر پوچھا۔ "میرے حکم کی تعمیل کرو گے یا بیٹی کی بات مانو گے؟"

وہ بولی۔ "دھمکی نہ دو۔ ہماری موت کے بعد تم بھی باہر نکلتے ہی کتے کی موت مارے جاؤ گے۔"

"میں تمہارے باپ کو یرغمال بنا کر لے جاؤں گا تو کوئی مجھے نقصان نہیں پہنچائے گا۔ تمہیں قتل کر دوں گا تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ میرے دشمن تو صرف یہ دیکھیں گے کہ ان کا گاڈ فادر کالیا زندہ ہے اور میرے زندہ رہنے سے ہی یہ زندہ رہے گا۔ کم آن' حمزہ صاحب سے میری بات کراؤ۔"

باپ نے بیٹی کی طرف دیکھا۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ شلپا کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ وہ اپنی ایک ٹانگ پکڑ کر تکلیف کے باعث تڑپنے لگی۔ میں نے کالیا سے کہا۔ "پہلے ایک ٹانگ' پھر دوسری ٹانگ' پھر ایک بازو' پھر دوسرا بازو پھر آخر میں سینے پر گولیاں ماروں گا۔ تمہاری بیٹی کو قسطوں میں موت آئے گی۔"

وہ فرش پر کھسکتا ہوا فون کے پاس آیا پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ میں نے کہا۔ "شلپا! تم بڑے ناز و انداز سے چلتی تھیں۔ دیکھنے والے تمہاری چال پر قربان ہوتے تھے۔ اب زندہ رہو گی تو عمر بھر لنگڑا کر چلتی رہو گی۔"

کالیا نے مجھے ریسیور دیا۔ میں نے اسے کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو میں فرمان بول رہا ہوں۔ حمزہ صاحب آپ اپنی آواز سنائیں۔"

حمزہ صاحب کی آواز سنائی دی۔ "شاباش اس طرح محتاط رہنا چاہیے۔ میں امیر حمزہ بول رہا ہوں۔"

"حمزہ صاحب! میں نے بازی پلٹ دی ہے۔ کالیا اور اس کی بیٹی میرے گن پوائنٹ پر ہیں۔ میں نے اس کے دو حواریوں کو مار ڈالا ہے۔"

"تم نے تو کمال کر دیا فرمان! تم نے ثابت کر دیا ہے کہ لیڈی سرجن آمنہ خاتون کے بیٹے ہو۔"

"حمزہ صاحب! میں آپ کی راہنمائی چاہتا ہوں۔ اس کتے کالیا کے کئی پلے باہر موجود ہیں اور میں ان باپ بیٹی کو یرغمال بنا کر لے جانا چاہتا ہوں۔" میں نے حمزہ صاحب کو یہاں کا ایڈریس بھی بتا دیا۔

"میرا انتظار کرو اور میرے آنے تک محتاط رہو۔"

فون بند ہو گیا۔ میں نے ریسیور رکھ کر کالیا سے کہا۔ "تم دونوں اسی طرح زمین پر پڑے رہو۔ تمہارا باپ آ رہا ہے۔"

باپ بیٹی پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ میں نے امیر حمزہ کا موبائل فون نمبر نوٹ کر لیا۔ ہر شخص اپنی ذہانت اور ذرائع کے مطابق احتیاطی تدابیر کرتا ہے۔ جیسا کہ میں کر رہا تھا اور آئندہ کیا کرنا چاہیے؟ اس کے لیے امیر حمزہ سے راہنمائی حاصل کر رہا تھا۔ اس وقت یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے مخالفین بھی ذہانت، ذرائع اور بڑے اختیارات کے مالک ہوتے ہیں۔ شمشیر سنگھ کالیا بھی وسیع ذرائع رکھتا تھا۔ وہ نیک بخت کے کام آ رہا تھا اور نیک بخت کو خفیہ ہاتھ کی آشیرباد حاصل تھی اور خفیہ ہاتھ یہ مکمل پلان بنا چکا تھا کہ پاکستان میں آئندہ نیک بخت اقتدار حاصل کرے گا۔ اس پلان میں کامیاب ہونے کے لیے مخالفین کو کچلنے اور کمزور بنانے کی بھی پلاننگ ہو چکی تھی۔

لندن اور اسکاٹ لینڈ یارڈ کے جاسوس امیر حمزہ سے تعاون حاصل کر کے شمشیر سنگھ کالیا کو گرفتار کرنے والے تھے لیکن وہ فرار ہو گیا۔ انیلا کو قتل کرنے کی سازش کرنے والے نیک بخت کو بھی گرفتار کر سکتے تھے لیکن واردات کے وقت وہ امریکا چلا گیا تھا۔ اس لیے وہ مجرم ثابت نہ ہو سکا مگر یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ امیر حمزہ لندن اور اسکاٹ لینڈیارڈ کے سراغ رسانوں کے کام آتا تھا اور وہ بھی ضرورت کے وقت امیر حمزہ کے کام آتے تھے۔

اس کے باوجود کئی سراغ رساں خفیہ ہاتھ کے زیر اثر تھے اور امیر حمزہ کے کام آنے کے باوجود لندن میں اس کے خفیہ معاملات سے بڑی حد تک باخبر رہتے تھے۔ جنوبی ایشیا میں جغرافیائی حوالے سے پاکستان کی بڑی سیاسی اہمیت ہے۔ اس لیے خفیہ ہاتھ یہاں اپنی کٹھ پتلی حکومت بنانے کے لیے دنیا کی تمام خفیہ ایجنسیوں اور عالمی شہرت یافتہ سراغ رسانوں سے کام لیتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ نیک بخت کے پاکستان جانے کی راہ میں کوئی رکاوٹ بنے اور پاکستان میں انیلا کو اس کے خلاف استعمال کر کے اسے اقتدار حاصل نہ کرنے دے۔

خفیہ ہاتھ نے پچھلی بار خفیہ طور پر لندن اور اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغ رسانوں کے ذریعے انیلا کی پناہ گاہ تک رسائی حاصل کی تھی اور ایک خفیہ ایجنسی کے ذریعے نیک بخت سے کیے ہوئے خفیہ معاہدے کے کاغذات حاصل کر لیے تھے۔ تاکہ اس معاہدے کو نیک بخت کی سیاسی کمزوری نہ بنایا جا سکے۔

نیک بخت کی دوسری سیاسی کمزوری انیلا تھی۔ خفیہ ہاتھ اس کی کوئی کمزوری امیر حمزہ کے ہاتھ نہیں رہنے دینا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے لندن اور اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغ رسانوں کے ذریعے یہ معلوم کر لیا کہ امیر حمزہ نے انیلا کو کہاں چھپا کر رکھا ہے۔

جب امیر حمزہ میری مدد کے لیے اپنے جانبازوں کے ساتھ اس اپارٹمنٹ میں آیا تو یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے خلاف در پردہ کیسی سازشیں کی جا رہی ہیں۔ اس نے اپارٹمنٹ میں آ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ میری امی سے عقیدت ظاہر کی پھر شمشیر سنگھ کالیا سے کہا۔ "میرے ساتھ یہاں یہ چار جانباز آئے ہیں۔ باقی چھ جانباز اسی اپارٹمنٹ کے باہر مختلف مقامات پر مورچہ بنائے ہوئے ہیں۔ اگر تم اپنی بیٹی کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہو تو اپنے چمچوں سے فون پر کہو کہ تم ہمارے ساتھ جاؤ گے تو کوئی چھپ کر فائر نہیں کرے گا اور نہ ہی ہمارا تعاقب کرے گا۔"

شمشیر سنگھ کالیا نے کہا۔ "تم جو کہو گے میں کروں گا لیکن پہلے میری زخمی بیٹی کی مرہم پٹی کرا دو۔"

وہ شلپا کی سہیلی کا اپارٹمنٹ تھا۔ اس کی سہیلی نے فرسٹ ایڈ کا سامان لا کر دیا۔ امیر حمزہ کا ایک جانباز شلپا کی مرہم پٹی کرنے لگا۔ کالیا نے فون پر کہا۔ "گھنشام! اپنے آدمیوں کو یہاں سے ہٹا لو۔ میں اور شلپا ابھی امیر حمزہ اور فرمان علی کے ساتھ جا رہے ہیں۔ میرا حکم ہے کہ کوئی گولی نہ چلائے۔"

اس نے حکم دے کر فون بند کر دیا۔ امیر حمزہ نے اسے حکم دیا۔ "اپنی بیٹی کو سہارا

دے کر لے چلو۔ کم آن۔"

وہ رونے کے انداز میں بولی۔ "میں نہیں چل سکوں گی۔ بہت تکلیف ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ایک ٹانگ سے اچھل اچھل کر چلو۔ تماشا بنو گی۔ ہم میں سے کوئی تمہیں اٹھا کر نہیں لے جائے گا کیونکہ تم بازاری عورت سے بدتر ہو۔ باپ کے فائدے کی خاطر کسی کے ساتھ بھی ہو سکتی ہو۔"

وہ مجبوراً باپ کا سہارا لے کر لنگڑاتے ہوئے اپارٹمنٹ کے باہر آئی۔ دروازے کے قریب ہی امیر حمزہ کی بڑی سی ویگن کھڑی تھی۔ اس میں باپ بیٹی کے ساتھ ہم سب بیٹھ گئے۔ امیر حمزہ نے موبائل فون کے ذریعے کسی سے کہا۔ "ہم یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ دور تک نظر رکھو' کوئی ہمارے تعاقب میں نہ آئے۔"

ہم ان باپ بیٹی کو یرغمال بنا کر وہاں سے جانے لگے۔ ہمارے آگے پیچھے امیر حمزہ کے جانباز اپنی گاڑیوں میں اس طرح چل رہے تھے کہ وہ دشمنوں کی نظروں میں نہ آئیں اور تعاقب کرنے والے دشمن ہماری نظروں میں آجائیں لیکن کئی کلومیٹر کا سفر طے کرنے کے بعد بھی کسی گاڑی پر شبہ نہیں ہوا کہ کوئی ہمارے تعاقب میں ہے۔

امیر حمزہ نے مجھ سے کہا۔ "اب تک کوئی تعاقب کرنے والا ہماری نظروں میں نہیں آیا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے' ہمارا تعاقب نہیں ہو رہا ہے؟"

"سمجھنا تو یہی چاہیے کہ تعاقب نہیں کیا جا رہا ہے لیکن یہ کالیا کوئی معمولی مجرم نہیں ہے۔ ایک تنظیم کا گاڈ فادر ہے۔ اس کے وفاداروں نے اسے ہمارے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا ہو گا۔ وہ کوئی ایسی چال چل رہے ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔"

"تم میدانِ عمل میں نئے ہو۔ میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ دشمن کی دکھتی رگوں کو پکڑنا جانتا ہوں لیکن اس وقت میرے تجربات اور میری ذہانت بھی کام نہیں کر رہی ہے۔ میرا ذہن یہ تسلیم نہیں کر رہا ہے کہ انہوں نے اپنے گاڈ فادر کو ہمارے پاس مرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ نیک بخت اور خفیہ ہاتھ یقیناً کچھ کر رہے ہوں گے۔"

اور واقعی وہ کچھ نہیں' بہت کچھ کر رہے تھے۔ امیر حمزہ نے انیلا کو جس خفیہ رہائش گاہ میں چھپا کر رکھا تھا' وہاں خفیہ ہاتھ کے ایجنٹ پہنچ گئے تھے۔ وہ اپنے بیڈ روم میں لیٹی اپنے محبوب کا انتظار کر رہی تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ دروازے مقفل تھے لیکن وہ سائلنسر لگے ہوئے ریوالور سے لاک توڑ کر دروازہ کھول کر اندر آئے اور بیڈ روم میں پہنچے تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے تکیے کے نیچے ایک پستول رکھا ہوا تھا لیکن دشمن اچانک

آئے تھے۔ وہ فوراً پستول نہ نکال سکی۔ پہلے حیرانی اور پریشانی سے چار آدمیوں کو دندناتے ہوئے کمرے میں گھستے دیکھا۔ وہ سب تیزی سے بیڈ کے دونوں طرف آئے اور آتے ہی ایک نے تکیے کو الٹ کر اس کے پستول کو اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

ان میں سے ایک نے کہا۔ "ہم جانتے ہیں کہ اس وقت تمہارا یار کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "ہم یہاں خالی میدان دیکھ کر آئے ہیں اور یہ جانتے ہیں وہ دو چار گھنٹوں کے اندر واپس آئے گا تو اسے گولیوں سے چھلنی کرنا ہمارے لیے آسان ہو گا۔ کیونکہ وہ خوش فہمی میں مبتلا ہو کر آئے گا اور مارا جائے گا۔"

تیسرے نے پوچھا۔ "تمہاری عقل کیا کہتی ہے؟ کیا وہ مارا جائے گا؟ یا تقدیر کی مہربانی سے بچ جائے گا؟"

انیلا نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں تو اب تک مقدر سے بچتی ہوئی آئی ہوں۔ مجھ پر دو بار قاتلانہ حملے ہوئے اور ہر بار حمزہ نے مجھے بچالیا۔ میں یہ نہیں چاہوں گی کہ وہ یہاں بے خبری میں آئے اور جان سے جائے۔ تم لوگ اس نیک اور انسان دوست دلیر شخص کو بزدلوں کی طرح چھپ کر کیوں مارنا چاہتے ہو؟"

"اگر تم اس کی زندگی چاہتی ہو تو ہم اسے قتل نہیں کریں گے۔ ہمارے مشوروں پر عمل کرو گی تو تم بھی زندہ رہو گی۔"

"تم کیا مشورہ دینا چاہتے ہو؟"

"امیر حمزہ کو چھوڑ دو۔ تم جس ملک کے جس شہر میں رہنا چاہو گی' وہاں تمہاری رہائش کا انتظام ہوجائے گا۔ تمہارے تمام اخراجات پورے کیے جائیں گے۔"

"مجھ پر یہ مہربانی کیوں کی جائے گی؟ تم لوگ حمزہ کی طرح مجھے بھی قتل کر سکتے ہو؟"

"تمہیں قتل کریں گے اور حمزہ بچ نکلے گا تو آتش فشاں بن جائے گا۔ نیک بخت چھپنا چاہے گا تو اسے ماں کے پیٹ سے بھی نکال کر قتل کر دے گا۔"

دوسرے نے کہا۔ "تم کہیں دور زندہ رہ کر اس سے رابطہ رکھو گی تو وہ تمہاری سلامتی کے لیے نیک بخت کو کسی طرح کا سیاسی نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

انیلا نے کہا۔ "یہاں حمزہ کو قتل کرنے کے ارادے سے آئے ہو۔ مجھے بھی قتل کر دو گے تو تمہارے نیک بخت کی راہ میں کانٹے نہیں رہیں گے پھر مجھے زندہ کیوں رکھنا چاہتے ہو؟"

"ہمارے ایک منصوبے کے مطابق تمہیں زندہ رکھنا اور حمزہ کو اپنے دباؤ میں رکھنا

ضروری ہے۔ منصوبہ کیا ہے' یہ بتایا نہیں جائے گا۔"

ایک اور شخص نے کہا۔ "ہم تمہیں جبراً لے جاسکتے ہیں لیکن اپنی مرضی سے چلو گی تو ہمارے منصوبے کی تکمیل بھی ہوتی رہے گی اور تمہارا حمزہ بھی زندہ رہے گا۔"

ایک اور شخص نے کہا۔ "تمہیں صرف یہ فیصلہ کرنا ہے کہ حمزہ کی زندگی چاہتی ہو یا موت؟"

وہ سوچنے لگی۔ "اگر حمزہ زندہ رہے گا تو جلد ہی ان کے منصوبے کو خاک میں ملا دے گا پھر مجھے ان سے چھین کر لے آئے گا۔"

ایک نے سخت لہجے میں کہا۔ "سوچنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ فوراً فیصلہ سناؤ۔"

"میں حمزہ کی زندگی اور سلامتی چاہتی ہوں۔"

"شاباش۔ اب ہمارا دوسرا مشورہ ہے کہ اپنا ضروری سامان لے کر ہمارے ساتھ چلو۔ کار میں سفر کرتے وقت حمزہ سے فون پر رابطہ کرو۔ اس سے کہو' تم اس کے ساتھ خطرات سے بھرپور زندگی نہیں گزار سکتیں۔ لہٰذا اسے چھوڑ کر بہت دور جا رہی ہو۔ آئندہ وقتاً فوقتاً اس سے فون پر باتیں کرتی رہو گی۔ تاکہ اسے یقین ہوتا رہے کہ تم جہاں بھی ہو زندہ سلامت ہو۔"

"میں اس کی سلامتی کے لیے ایسا کروں گی لیکن نیک بخت اور خفیہ ہاتھ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ محبِ وطن ہے۔ صرف ایک انیلا کو زندہ رکھنے کے لیے وہ اپنے ملک اور قوم کو نقصان نہیں پہنچنے دے گا اور الیکشن تو ابھی دور ہیں' وہ اسے لندن سے ہی نہیں جانے دے گا۔"

وہ سب قہقہے لگانے لگے پھر ایک نے کہا۔ "تم سب سمجھ رہے تھے کہ وہ ہیتھرو ائرپورٹ سے جہاز پر سوار ہو کر پاکستان جائے گا۔ جبکہ وہ ہیلی کاپٹر کے ذریعے پیرس اور پیرس سے ایک طیارے کے ذریعے پاکستان پہنچ گیا ہے۔ خفیہ ہاتھ کے مقابلے میں حمزہ ہے کیا چیز؟ سانپ نکل گیا ہے اور حمزہ اب تک لکیر پیٹ رہا ہے۔"

انیلا سوچنے لگی۔ "واقعی دشمن بہت زبردست ہے۔ دنیا کے تمام ممالک میں ایسے وسیع ذرائع کا مالک ہے کہ ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے اور اپنے زیرِ اثر رہنے والوں کے مسائل کو بڑی چالبازی سے حل کر دیتا ہے۔ اگر میں ان کے ساتھ نہیں جاؤں گی تو پاکستان میں نیک بخت کی سب سے بڑی سیاسی دشمن سمجھی جاؤں گی اور یہ لوگ مجھے اس کی سیاسی دشمن بننے اور حمزہ کے ہاتھ مضبوط کرنے سے پہلے قتل کر کے چلے جائیں گے۔"

وہ حمزہ کی سلامتی کے لیے سوچتی ہوئی ایک اٹیچی میں ضروری سامان رکھنے لگی پھر

اس نے بیڈ کے سرہانے والی میز کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "میرا موبائل فون کہاں ہے؟"

"ہمارے پاس ہے اور ہمارے ہی پاس رہے گا۔ ضرورت کے وقت تمہیں دیا جائے گا۔ تم ہماری موجودگی میں وہی باتیں کرو گی جو ہم چاہیں گے۔"

ایک نے اس کی اٹیچی اٹھالی۔ وہ حالات سے مجبور ہو کر ان کے ساتھ چلتی ہوئی اس بنگلے سے باہر آئی اور ان کی ایک بڑی سی وین میں بیٹھ گئی۔ جب وین چلنے لگی تو اس نے بڑے صدمے سے اور بڑی حسرت سے اس بنگلے کو دیکھا۔ وہ اپنے حمزہ کا آخری دیدار کئے بغیر جا رہی تھی۔ اس کا محبوب ایک آدھ گھنٹے میں واپس آنے والا تھا۔ آخری بار اس کے سینے سے لگنے کی حسرت تھی مگر یہ اطمینان تھا کہ وہ بنگلے میں آئے گا تو وہاں اسے ہلاک کرنے والے دشمن نہیں رہیں گے۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے وین میں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ اس نے پوچھا۔ "تم لوگوں کو کیسے معلوم ہوا کہ میں حمزہ کے ساتھ اس بنگلے میں رہتی ہوں۔"

ایک نے مسکرا کر کہا۔ "ہم تو یہ بھی جانتے تھے کہ یہاں سے پہلے تم کس بنگلے میں چھپی ہوئی تھیں۔ تم نے خود دیکھا تھا کہ ہم نے اچانک وہاں پہنچ کر وہ خفیہ معاہدہ چھین لیا تھا۔ آج یہاں کی خفیہ رہائش گاہ سے تمہیں لے جا رہے ہیں۔"

"یہی تو معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ تم لوگوں کو حمزہ کے خفیہ اڈوں کا پتا کیسے چل جاتا ہے؟"

"ہم تمہارے اس سوال کا جواب دیں گے۔ پہلے تم حمزہ سے بات کرو۔ اس سے صاف صاف کہہ دو کہ آئندہ اس کے ساتھ نہیں رہو گی۔"

اسے موبائل فون دیا گیا۔ وہ حمزہ کے موبائل فون کا نمبر پنچ کرنے لگی۔ اس وقت حمزہ اور اس کے ساتھی بریڈ فورڈ کے ایک پرانے سے مکان میں پہنچے ہوئے تھے۔ ان باپ بیٹی کالیا اور شلپا کو ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ ہم اسکاٹ لینڈ یارڈ سے زیادہ دور نہیں تھے۔ ایک سراغ رساں افسر نے دوست کی حیثیت سے حمزہ کو یقین دلایا تھا کہ وہ جگہ بالکل محفوظ ہے۔ کسی کی مجال نہیں ہے کہ انڈر گراؤنڈ ڈرگ مافیا کے گاڈ فادر شمشیر سنگھ کالیا کو رہائی دلانے کے لیے کوئی وہاں قدم رکھے۔

کالیا ایک گاڈ فادر کی حیثیت سے ایک بدنام زمانہ مجرم تھا۔ اسے اسکاٹ لینڈ یارڈ پہنچا کر عدالتی کارروائی کے بعد سزائے موت دلائی جا سکتی تھی۔ اب ہم مطمئن تھے کہ کالیا اسکاٹ لینڈ کے سراغ رسانوں کے حصار میں رہے گا۔ ایسے ہی وقت حمزہ کے موبائل کا بزر سنائی دیا۔ اس نے موبائل کو آن کر کے اپنے کان سے لگا کر پوچھا۔ "ہیلو' کون؟"

دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ "میں انیلا بول رہی ہوں۔"

"ہیلو انیلا! میں جانتا ہوں' تم میری واپسی کا انتظار کر رہی ہو گی۔ مجھے کالیا کو محفوظ گرفت میں رکھنے کے لیے اسکاٹ لینڈ آنا پڑ گیا۔ ویسے میں کل صبح تک آجاؤں گا۔"

"تم آؤ گے لیکن مجھے نہیں پاؤ گے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کیا کل صبح تم کہیں شاپنگ کے لیے جانا چاہتی ہو؟ اگر ایسا ارادہ ہے تو میرا انتظار کرو۔ میں نے تمہیں سمجھایا ہے کہ کچھ عرصے تک تمہیں تنہا کہیں باہر نہیں جانا چاہیے۔"

"اب تو میں ساری زندگی تنہا رہوں گی۔ اگر میرے مقدر میں زندگی رہی تو کبھی کبھی فون پر تمہاری خیریت پوچھ لیا کروں گی۔"

حمزہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "تمہاری آواز' لہجے میں بڑی سنجیدگی اور صدمہ چھپا ہوا ہے۔ تم خیریت سے تو ہو؟"

"میں خیریت سے ہوں اور آئندہ بھی خیریت سے رہنے کے لیے تمہاری خطرات سے بھری زندگی سے دور جا رہی ہوں تاکہ سکون سے کہیں رہ سکوں اور تم پر میری حفاظت کی جو ذمے داریاں ہیں' ان سے تم نجات حاصل کر سکو۔"

"انیلا! ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ تم اپنی جان سے زیادہ مجھے چاہتی ہو' میں نہیں مان سکتا کہ میری خطرات سے بھری زندگی سے گھبرا کر مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو۔ سچ بتاؤ ابھی تم تنہا ہو یا کسی کے دباؤ میں ہو؟ وہاں جو بھی ہے' اس سے میری بات کراؤ۔"

"میں بالکل تنہا ہوں اور اپنے اٹیچی میں ضروری سامان لے کر ایک ٹیکسی میں جا رہی ہوں مجھے بھولنے کی کوشش کرو۔ کبھی یاد کرو تو ایسے کہ جیسے میں ایک خواب تھی۔ آنکھ کھلتے ہی تعبیر بدل گئی ہے۔"

"انیلا! میں اناڑی نہیں ہوں۔ تم یقیناً دشمنوں کے دباؤ میں آگئی ہو۔ اگر سچ نہیں بولو گی تو میں ابھی نیک بخت کی شہ رگ تک پہنچ کر حقیقت معلوم کر لوں گا۔"

"اب تم نیک بخت تک نہیں پہنچ پاؤ گے۔ وہ یہاں سے ہیلی کاپٹر کے ذریعے پیرس گیا اور پیرس سے ایک فلائٹ میں پاکستان پہنچ گیا ہے۔"

"ہوں۔ اب بات سمجھ میں آرہی ہے۔ خفیہ ہاتھ اپنی شیطانی چالیں چل رہا ہے۔ نیک بخت کو پاکستان پہنچا کر اس کے سیاسی کیریئر کو بے داغ رکھنے کے لیے تمہیں مجھ سے دور کر رہا ہے۔ مجھے اس دباؤ میں رکھنا چاہتا ہے کہ میں نیک بخت کے خلاف کوئی قدم اٹھاؤں گا تو تمہیں قتل کر دیا جائے گا پھر میں یہ ثابت نہیں کر سکوں گا کہ تم زندہ ہو۔ تم

میری بہت بڑی طاقت تھیں۔ اس نے یہ طاقت مجھ سے چھین لی ہے۔"

"میں ایسے سیاسی داؤ پیچ میں الجھنا نہیں چاہتی۔ تمہیں مشورہ دوں گی کہ ان الجھنوں سے نکل کر میرے ساتھ کہیں پُرسکون آرام دہ زندگی گزارو تو تم میری بات نہیں مانو گے۔ اپنے ملک اور قوم کے لیے برسوں سے جہاد کرتے آرہے ہو۔ مجھ جیسی عورت کی خاطر جہاد کرتے رہنے سے باز نہیں آؤ گے۔ اسی لیے میں نے اپنا اور تمہارا راستہ الگ کر لیا ہے۔"

"تم اپنے دل سے راستہ الگ نہیں کر رہی ہو۔ تمہیں الگ کرایا جا رہا ہے۔ وہ تمہیں کہیں لے جا کر ہلاک کر دیں گے تو مجھے خبر نہیں ہو گی اور میں یہی سمجھتا رہوں گا کہ تم کہیں بخیریت زندگی گزار رہی ہو۔"

"میں نے یہ سوچنا چھوڑ دیا ہے کہ آنے والے لمحات میں زندہ رہوں گی یا مر جاؤں گی۔ فی الوقت تمہاری سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہی ہوں۔ اس حد تک اطمینان ہے کہ کل صبح نہ تم اس بنگلے میں جاؤ گے اور نہ دھوکے سے مارے جاؤ گے۔ خداحافظ میرے حمزہ! جب تک سانس لیتی رہوں گی' تمہیں یاد کرتی رہوں گی۔"

انیلا نے فون بند کر دیا۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے شخص نے موبائل فون اس سے لے کر اس فون کا پاور آف کر دیا تاکہ پھر کوئی انیلا کو فون کرے تو مایوس ہوتا رہے۔

میں نے حمزہ کو دیکھا۔ وہ فون بند کر کے گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ ادھر سے انیلا نے جو کچھ کہا تھا' وہ میں سن نہ سکا لیکن حمزہ جواباً جو کچھ کہہ رہا تھا' اس سے معلوم ہوا کہ خفیہ ہاتھ نے کیسی چال چلی ہے۔ ایک طرف نیک بخت کو پاکستان بھیج دیا ہے اور دوسری طرف انیلا کو یرغمال بنا لیا ہے۔

میں نے کہا۔ "آپ میری مدد کے لیے آئے اور دشمنوں نے وہاں آپ کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا لیا۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ دشمنوں کو میری خفیہ رہائش گاہ کا پتا کیسے معلوم ہو جاتا ہے؟ پہلے بھی ایک خفیہ رہائش گاہ پر حملہ کیا تھا اور خفیہ معاہدہ انیلا سے چھین کر لے گئے تھے۔"

میں نے کہا۔ "آپ بہت محتاط رہتے ہیں۔ صرف قابلِ اعتماد جانبازوں کو راز دار بناتے ہیں۔ کیا آپ اس سلسلے میں کسی پر شبہ کریں گے؟"

"نہیں' میرے قابلِ اعتماد جانباز جان دے سکتے ہیں۔ ایمان نہیں دے سکتے اور نہ ہی میرے خلاف سازشیں کر سکتے ہیں۔"

"میری تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ آپ جیسے فولاد تک دشمنوں کو کوئی گھر کا بھیدی ہی پہنچا سکتا ہے۔ آپ غور کریں' کیا اپنے جانبازوں کے علاوہ آپ کسی اور پر بھی اعتماد کرتے ہیں یا کبھی بھی بحالت مجبوری کسی کو وقتی طور پر رازدار بنا لیتے ہیں۔"

میری اس بات پر امیر حمزہ نے مجھے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ "لندن کے ایک سراغ رساں نے میرے اور انیلا کے لیے اس خفیہ رہائش گاہ کا انتظام کیا تھا۔ صرف وہی ہماری اس رہائش گاہ کے بارے میں جانتا تھا لیکن میں تو اس کے بہت کام آرہا ہوں۔ کیا اس پر شبہ کروں؟ ہاں شبہ تو اپنے سائے پر بھی کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے' میرا وہ دوست سراغ رساں خفیہ ہاتھ کے دباؤ میں آگیا ہو۔"

اس نے اپنے ایک خاص ماتحت سے فون پر کہا۔ "جیری! ایک بری خبر ہے' انیلا کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ شاید اسے دھمکی دی گئی ہے کہ وہ دشمنوں کے ساتھ نہ گئی تو مجھے گولی مار دی جائے گی۔ اس نے میری سلامتی کی خاطر میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔"

جیری نے کہا۔ "لیکن سر! کوئی آپ کو کیسے مار سکتا ہے۔ کوئی آپ کے سائے تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ آپ کی وائف کو ان کی دھمکیوں میں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"میری ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی مجھے سرِعام پہچان نہ پائے اور کبھی کوئی میری خفیہ رہائش گاہ پر نہ پہنچ سکے۔ اس کے باوجود انیلا کو اغوا کرنے والے ہمارے موجودہ بنگلے تک پہنچ گئے۔ کیا تم سمجھ سکتے ہو کہ انہیں میرے اور انیلا کے چھپنے کی جگہ کیسے معلوم ہو گئی؟"

"سر! یہ حیرانی کی بات ہے۔ یہ معلوم کرنا ہو گا کہ انہیں آپ کی خفیہ رہائش گاہ کا علم کیسے ہو گیا؟ ہم میں سے چند افراد پر آپ اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ باقی دوسرے جانبازوں کو راز کی باتیں نہیں بتاتے ہیں۔ کیا آپ یہ بتانا چاہیں گے خفیہ رہائش گاہ کے لیے اس بنگلے کو کس نے آپ کے لیے تلاش کیا تھا؟"

حمزہ نے کہا۔ "تم بھی وہی سوچ رہے ہو' جو میں سوچ رہا ہوں۔ میرے ایک دوست سراغ رساں ہیرالڈ نے میرے لیے اس بنگلے میں ہماری رہائش کے انتظامات کیے تھے۔"

"پھر تو سراغ رساں ہیرالڈ کا محاسبہ کرنا چاہیے۔"

"وہ سچ نہیں اگلے گا۔ بڑی راز داری سے اس نے میرے خلاف سازش کی ہو گی تاکہ مجھے اس پر شبہ ہو تو میں اس شبہے کی تصدیق کسی طرح نہ کر سکوں۔ بہرحال میرے آس پاس رہنے والے جانبازوں کو میری موجودہ پوزیشن بتا دو۔ ان سے کہہ دو کہ مجھ پر حملے کیے جا سکتے ہیں انہیں زیادہ سے زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔"

اس نے جیری سے رابطہ ختم کر کے سراغ رساں ہیرالڈ کے نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ ہونے پر کہا۔ "میں امیر حمزہ بول رہا ہوں۔ مسٹر ہیرالڈ کو ریسیور دو۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "میں مسٹر ہیرالڈ کا دوست بول رہا ہوں۔ وہ امریکا جا چکے ہیں۔ کل جاتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ آپ کا فون آئے تو کہہ دوں کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ لندن چھوڑ چکے ہیں اور امریکا میں رہائش کے لیے جا چکے ہیں۔ آئندہ شاید کبھی ملاقات نہ ہو۔"

امیر حمزہ نے فون بند کر کے مجھے دیکھا اور کہا۔ "ایک آستین کا سانپ مجھے ڈس کر امریکا چلا گیا ہے۔ سراغ رساں ہیرالڈ نے خفیہ ہاتھ کے آدمیوں کو میری خفیہ رہائش گاہ تک پہنچایا تھا۔"

میں نے کہا۔ "آپ کا شبہ درست نکلا۔ جس دوغلے نے آپ کے لیے خفیہ رہائش کا انتظام کیا تھا' وہی آپ کا راز دار بھی تھا اور خفیہ ہاتھ کا زر خرید آلۂ کار بھی۔"

"وہ پوری فیملی کے ساتھ امریکا چلا گیا ہے۔ یہ جانتا تھا کہ بھید کھلنے کے بعد میں اسے اور اس کے پورے خاندان کو خاک میں ملا دوں گا۔"

"ہمیں یہ سراغ لگانا چاہیے کہ وہ میڈم انیلا کو کہاں لے گئے ہیں۔ وہ اتنی جلدی میڈم کو لندن سے باہر نہیں لے گئے ہوں گے۔"

"تم خفیہ ہاتھ کے وسیع ذرائع اور اختیارات کو سمجھو۔ جو اس کے کام آتا ہے' وہ اس آلۂ کار کو منٹوں میں ایک ملک سے نکال کر دوسرے کسی بھی ملک میں پہنچا دیتا ہے پھر انیلا تو ان کے لیے بہت اہم ہے۔ اسے ابھی تک زندہ رکھا گیا ہے تاکہ میں نہ چاہوں کہ اسے قتل کیا جائے اور اسے زندہ رکھنے کے لیے نیک بخت کی مخالفت پاکستان میں نہ کروں۔"

"ایک طرح سے یہ اطمینان ہے کہ میڈم زندہ سلامت رہیں گی لیکن ان کی زندگی اور سلامتی آپ کی آنکھوں کے سامنے رہے تو آپ بالکل مطمئن رہیں گے۔"

"میں چاہوں تو انیلا آج ہی مجھے واپس مل سکتی ہے لیکن اسے پاس بلا کر اسے ساتھ رکھنے کے لیے مجھے خفیہ ہاتھ سے معاہدہ کرنا ہو گا۔ کم از کم یہ تحریری بیان دینا ہو گا کہ انیلا کے قتل یا گمشدگی سے نیک بخت کا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ کبھی پہلے کوئی تعلق تھا۔ اس طرح اس ملک دشمن نیک بخت کو میری تحریر کے ذریعے نیک چال چلن کا سرٹیفکیٹ مل جائے گا۔"

ہم دونوں ایک صوفے پر بیٹھے اپنے اپنے طور پر سوچنے لگے' انیلا کو کس طرح

واپس لایا جا سکتا ہے؟ اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا تھا کہ اسے اغوا بھی کیا گیا ہے اور وہ حمزہ کی سلامتی کی خاطر اپنی مرضی سے دشمنوں کے رحم و کرم پر رہنے کے لیے کہیں چلی گئی ہے۔

ہم نے شمشیر سنگھ کالیا سے جو موبائل لے کر اپنے پاس رکھا تھا' اس کا بزر سنائی دیا۔ حمزہ نے اس سے آن کیا پھر کان سے لگا کر بولا۔ "میں حمزہ بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "ہمارا خیال درست نکلا۔ تم نے گاڈ فادر کالیا اور اس کی بیٹی کو کہیں قید کر کے اس کا موبائل فون اپنے پاس رکھا ہو گا۔ دراصل ہم نے تمہیں ہی کال کیا ہے۔"

"کال کیوں کیا ہے؟"

"میں ایک انڈر گراؤنڈ مافیا کا گاڈ فادر کارتا بن بلا بول رہا ہوں۔ میرے ساتھ ایشیا کے چار ملکوں کے انڈر گراؤنڈ مافیا کے گاڈ فادرز بیٹھے ہوئے ہیں۔ تم ان سے فرداً فرداً گفتگو کر کے تصدیق کر سکتے ہو کہ ہم سب واقعی مختلف ممالک کے گاڈ فادرز ہیں۔"

"جب میں ضروری سمجھوں گا تو تصدیق کروں گا۔ تم اپنے مطلب کی بات کرو۔"

"ہم ہر حال میں گاڈ فادر کالیا اور اس کی بیٹی شلپا کی رہائی چاہتے ہیں۔ ہم تمہارے بڑے سے بڑے مطالبات پورے کر سکتے ہیں۔"

حمزہ نے پوچھا۔ "تم لوگوں کی پہنچ کہاں تک ہے؟"

"یوں سمجھو کہ زمین سے آسمان تک ہے۔"

"یعنی مجھے پہنچانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ خود اوپر پہنچ جاؤ گے۔"

"مسٹر حمزہ! اتنی خوش فہمی اچھی نہیں ہوتی۔ تم کبھی ہمارے سائے تک بھی نہیں پہنچ سکو گے اور ہم تمہاری شہ رگ تک پہنچ جائیں گے۔"

"تم سب کے لیے کھلی دعوت ہے' میری شہ رگ تک پہنچنے کے لیے آؤ۔"

"ہم تم سے لین دین کا دوستانہ انداز اختیار کر رہے ہیں اور تم دشمنوں کے انداز میں چیلنج کر رہے ہو۔"

"تم نہیں جانتے' میں مجرموں سے لین دین نہیں کرتا۔ کوئی معاہدہ نہیں کرتا۔ مجھ پر کتنا ہی برا وقت آئے' میں مجرموں سے کوئی سمجھوتا بھی نہیں کرتا۔"

"جب ہم برا وقت لائیں گے تو ہم سے سمجھوتا کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔"

"اچھا اور برا وقت صرف اللہ کی طرف سے آتا ہے۔ بندوں کو آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے پھر وہ وقت گزر جاتا ہے۔"

"ایسا کہنا آسان ہے لیکن جب برا وقت آئے گا۔ اگر تمہاری محبوبہ انیلا کو اغوا کیا جائے گا یا نقصان پہنچایا جائے گا تو............"

"آگے مت بولو۔ انیلا کو اغوا کیا جا چکا ہے۔ ایسا خفیہ ہاتھ کے ایجنٹوں نے کیا ہے لیکن میں نے اس مجرمانہ ذہن رکھنے والے سے انیلا کی واپسی کے لیے کوئی معاہدہ یا سمجھوتا نہیں کیا ہے۔"

دوسری طرف سے گاڈ فادر کارتا بن بلا نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا واقعی انیلا کو اغوا کیا گیا ہے؟"

"میں تمہیں یقین دلانا ضروری نہیں سمجھتا۔"

"مجھے یقین ہو گیا ہے۔ وہ بہت حسین اور جوان ہے اور تم اس سے جی بھر کر کھیلتے رہے۔ تم انیلا جیسی داشتہ کے لیے نہیں جھکو گے۔ وہ چلی گئی تو کیا ہوا' ویسی سینکڑوں مل جائیں گی۔"

حمزہ نے فون بند کر دیا پھر مجھ سے کہا۔ "تم اپنی امی سے بات کرو۔ میں بھی ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے حمزہ صاحب کے موبائل فون کے ذریعے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے ان کی آواز سن کر کہا۔ "امی! آداب!"

"تم سلامت رہو بیٹے! کیا کسی ضرورت سے فون کیا ہے؟"

"جی ہاں۔ بری خبر سنا رہا ہوں میرے استاد محترم مراد چنگیزی کو قتل کر دیا گیا ہے۔"

امی نے بڑے صدمے کا اظہار کیا' میں نے انہیں بتایا کہ شلپا نے مجھے کیسے ٹریپ کیا تھا؟ لیکن اب وہ اور اس کا باپ شمشیر سنگھ کالیا میری قید میں ہیں۔ اس وقت میرے ساتھ......... امیر حمزہ صاحب ہیں۔ خفیہ ہاتھ سے معاہدہ کرنے والے نیک بخت نے ان کی ہونے والی شریکِ حیات کو اغوا کرا دیا ہے اور وارننگ دی ہے کہ حمزہ صاحب پاکستان میں نیک بخت کو سیاسی طور پر نقصان پہنچائیں گے تو میڈم انیلا کو ہلاک کر دیا جائے گا۔"

امی نے کہا۔ "حمزہ سے بات کراؤ۔"

میں نے حمزہ صاحب کو فون دیا۔ وہ اسے کان سے لگا کر بولے۔ "باجی السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام! تم نے مجھے باجی کہا ہے۔ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہو۔ اس کے باوجود میں تمہارے عزائم اور حوصلوں کو سلام کرتی ہوں۔"

"آپ بزرگ ہو کر میرے لیے خراجِ عقیدت پیش کر رہی ہیں میرے حوصلوں میں اور تازگی اور استحکام پیدا ہو گیا ہے۔ انشاء اللہ آپ کا بیٹا بھی بہت جلد ہمارے جیسے تجربات

کی آگ میں تپ کر کندن بنے گا۔ آج اس نے بڑی ذہانت اور دلیری سے شمشیر سنگھ کالیا جیسے گاڈ فادر اور اس کی بیٹی شلپا کو قیدی بنالیا ہے۔"

"مجھے اپنے بیٹے پر ناز ہے۔ وہ تمہارے سائے میں رہے گا تو میری خواہش کے مطابق فولاد بنتا چلا جائے گا۔"

"انشاء اللہ! ایسا ہی ہو گا۔ آپ کالیا اور اس کی بیٹی کو کیا سزا دینا چاہتی ہیں۔ پانچ ملکوں کے انڈر گراؤنڈ گاڈ فادرز میرے تمام مطالبات پورے کر کے کالیا اور اس کی بیٹی شلپا کو رہائی دلانا چاہتے ہیں۔ جبکہ میرا کوئی مطالبہ نہیں ہے اور نہ ہی میں کبھی مجرموں سے لین دین کرتا ہوں۔"

"شاباش۔ میں نے تمہاری بڑی تعریفیں سنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ ہماری پاکستانی قوم کے بچے بھی امیر حمزہ بن کر اپنے ملک کی بھلائی اور بہتری کے لیے جہاد کرتے رہیں۔"

میں نے حمزہ صاحب سے کہا۔ "آپ امی سے پوچھیں ہمیں کالیا کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟"

حمزہ صاحب نے فون پر پوچھا۔ امی نے کہا۔ "اس کالیا نے میرے رشتے داروں کے ساتھ مل کر میری ازدواجی زندگی برباد کر دی۔ شوہر کی نظروں میں مجھے بدچلن بنا دیا۔ مجھے گھر سے بے گھر کر دیا۔ ایسے مجرم کو سزا ملنی چاہیے۔ میں چاہتی ہوں' وہ زندہ رہے لیکن اپنی موجودہ طاقت اور ذرائع سے محروم ہو جائے۔ ایک اپاہج بن کر زندگی گزارے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے سرجری کی غیر معمولی صلاحیت دی ہے۔ ٹوٹنے اور ریزہ ہونے والی ہڈیوں کو جوڑنے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے مجھے مہارت دی ہے۔ تم اسے اس طرح گولی مارو کہ اس کے ایک گھٹنے کا جوڑ اور اس کے ایک ہاتھ کی کہنی کا جوڑ اور ہڈیاں چُور چُور ہو جائیں پھر اس کے جتنے حمایتی گاڈ فادرز ہیں' اسے ان کے حوالے کر دو۔ اس کا آپریشن دنیا کے کسی بھی ملک اور کسی بھی اسپتال میں ہو گا تو میں لیڈی سرجن کی حیثیت سے اس کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ ڈاکٹر سچے مسیحا ہوتے ہیں۔ وہ دشمنوں کا بھی علاج کرتے ہیں اور انہیں ایک نئی زندگی کی طرف لے آتے ہیں۔ میں بھی یہی کروں گی لیکن اسے یہ سبق سکھاؤں گی کہ اپنے پیشے کے تقدس کو برقرار رکھنے کے لیے میں نے پہلے دشمن بن کر اسے اپاہج بنایا پھر اسے ایک نئی زندگی بھی دی۔"

"باجی! میں آپ کا طریقۂ کار سمجھ گیا ہوں۔ آپ جیسا چاہتی ہیں۔ ابھی ویسا ہی ہو گا۔"

پھر میں نے امی سے باتیں کیں۔ انہوں نے تاکید کی کہ آئندہ مجھے حمزہ صاحب کے ساتھ رہ کر ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتے رہنا چاہیے۔ میں نے ان کے ساتھ رہنے کا وعدہ کر کے فون بند کر دیا پھر ہم دونوں اس کمرے میں آئے جہاں باپ بیٹی کو قید کیا تھا۔ حمزہ صاحب نے کہا۔ "کالیا! ایشیا میں تمہارے جتنے حمایتی گاڈ فادرز ہیں' انہوں نے ہم سے تمہاری رہائی کا مطالبہ کیا ہے۔ تم باپ بیٹی کو رہا نہ کرنے کے نتیجے میں دھمکی دی ہے کہ مجھے گولی مار دیں گے۔ مجھ سے میری زندگی چھین لیں گے۔"

کالیا نے کہا۔ "میں تمہاری بہتری کے لیے مشورہ دے رہا ہوں۔ ان کی دھمکیوں کو صرف دھمکیاں نہ سمجھو۔ وہ سب بہت خطرناک ہیں۔ تم ان سے چھپنا چاہو گے تو اپنی قبر میں بھی نہیں چھپ سکو گے۔"

"یہی میں سوچ رہا ہوں کہ مجھ جیسے بزدل کو تمہارے حمایتی خطرناک گاڈ فادرز سے نہیں ٹکرانا چاہیے۔ میں نے اور فرمان نے تم باپ بیٹی کو رہا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

انہوں نے ہمیں بے یقینی سے دیکھا پھر کالیا نے پوچھا۔ "کیا سچ کہہ رہے ہو؟ تمہاری باتوں سے طنز جھلک رہا ہے۔ تم بزدل نہیں ہو اور خود کو بزدل کہہ رہے ہو۔"

"جو شخص اپنی اغوا ہونے والی محبوبہ کو واپس نہ لا سکے اور دشمنوں کے خلاف جوابی کارروائی نہ کر سکے' اس سے زیادہ بزدل اور کون ہو گا؟ لہٰذا میری طرف سے تم دونوں آزاد ہو لیکن رہائی تمہیں فرمان سے ملے گی کیونکہ برسوں پہلے تم نے اس کی والدہ کے خلاف سازشیں کیں اور اب اپنی بیٹی کے ذریعے اسے ٹریپ کیا۔ اگر یہ مردانگی نہ دکھاتا تو تم اسے قیدی بنا کر لے جاتے اور نامعلوم اس کے ساتھ کتنا برا سلوک کرتے۔"

شلپا نے کہا۔ "ہمیں فرمان سے ذاتی دشمنی نہیں ہے یہ میری زندگی کا پہلا مرد ہے۔ میں اب بھی اسے دل و جان سے چاہتی ہوں۔ میری خود غرضی صرف اتنی ہے کہ میں فرمان کو اپنے ڈیڈی کے زیر اثر رکھ کر اسے اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی برا سلوک کرنے کا ہرگز ارادہ نہیں تھا۔"

میں نے کہا۔ "گرگٹ بھی ایسے رنگ نہیں بدلتا ہو گا جیسے تم بدل رہی ہو۔ تم نے مجھ پر غالب آ کر مجھے قیدی بنا کر بڑے فاتحانہ انداز میں کہا تھا کہ تم اپنے باپ کی برتری کے لیے سازشیں کر رہی تھیں۔ میری امی کی بہو بن کر ان کے بھائی گاڈ فادر ہاشم کی کمزوریاں معلوم کرنا چاہتی تھیں اور میرے ماموں ہاشم کو اپنے باپ سے کمتر بنا کر انہیں ہلاک کر دینا چاہتی تھیں۔"

وہ اس بات کا جواب نہیں دے سکتی تھی۔ میں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر

اس کے ہونٹوں پر ٹیپ چپکا دیا۔ حمزہ صاحب نے کالیا کے ساتھ بھی یہی کیا۔ اس کا بھی منہ اسی طرح بند کر دیا۔ میں نے ریوالور نکالا دونوں خوفزدہ ہو کر ”نہیں.......... نہیں..........“ کے انداز میں سرہلانے لگے۔

میں نے کہا۔ ”کالیا! میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گا۔ صرف تمہیں اپاہج بنا کر رہا کردوں گا۔“

میں نے ایک فائر کیا۔ گولی اس کے دائیں گھٹنے کی ہڈی پر لگی۔ وہ تکلیف کی شدت سے صوفے پر سے اچھل کر فرش پر گر پڑا۔ یہ فطرت ہے کہ ایسے وقت آدمی زور سے چیخنا چاہتا ہے۔ شاید چیخنے سے تکلیف میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ ٹیپ ہٹانے کے لیے اپنا ایک ہاتھ منہ کی طرف لے گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ کی کہنی پر گولی ماری۔ ہاتھ کے جوڑ کی ہڈی ٹوٹی۔ وہ اور تکلیف سے تڑپنے لگا۔ منہ کی طرف جانے والا ہاتھ ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح فرش پر آگیا۔ اس نے اپنے منہ کی طرف دوسرا ہاتھ بڑھایا لیکن وہاں سے پٹی ہٹا نہ سکا۔ میں نے اس کے دوسرے ہاتھ کی کہنی کے جوڑ کو بھی تیسرے فائر سے توڑ دیا۔

شلپا رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ انڈر گراؤنڈ ڈرگ مافیا والے ایک اپاہج کو گاڈ فادر تسلیم کریں گے یا نہیں؟“

میں نے اس کے اسی دائیں گھٹنے پر مزید دو گولیاں ماریں۔ وہ تڑپ تڑپ کر بیہوش ہو گیا۔ حمزہ صاحب نے شلپا کے منہ سے ٹیپ ہٹا کر اور ٹھنسا ہوا کپڑا منہ سے نکال کر کہا۔ ”فرمان پہلے ہی تمہاری ایک ٹانگ زخمی کر چکا ہے۔ تم بھی باپ کی طرح عمر بھر لنگڑاتی رہو گی۔ اب ہماری طرف سے اور کوئی تشدد نہیں کیا جائے گا۔ تمہارے جتنے حمایتی گاڈ فادرز ہیں‘ وہ یہاں آکر تم دونوں کو لے جائیں گے۔“

شلپا نے گاڈ فادر کارتا بن بلا کا فون نمبر بتایا۔ حمزہ نے رابطہ کر کے کہا۔ ”ہیلو کارتا! میں اپنے فیصلے کے مطابق گاڈ فادر کالیا اور اس کی بیٹی کو رہا کر رہا ہوں۔ پتا نوٹ کرو اور یہاں آکر انہیں لے جاؤ۔“

حمزہ نے پتا بتا کر فون بند کیا پھر ہم دونوں اس مکان سے نکل کر دروازے کو باہر سے بند کر کے ایک گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے جانے لگے۔ میں نے کہا۔ ”دشمنوں کو میرے اپارٹمنٹ کا پتا معلوم ہو چکا ہے۔ میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ آپ کے ساتھ بھی یہی ہو چکا ہے۔ آپ اس بنگلے میں نہیں جائیں گے جہاں سے دشمن میڈم انیلا کو لے جا چکے ہیں۔ ان حالات میں کہاں رہنا چاہیے؟“

”یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ میں یہاں انیلا کو نیک بخت کی کمزوری بنا کر اسے پاکستان میں سیاسی بازیگری سے روکنا چاہتا تھا لیکن وہ جا چکا ہے۔ اب ہم بھی پاکستان جائیں گے۔ میری کوشش ہو گی کہ وہ آئندہ ہمارے ملک میں اقتدار حاصل نہ کر سکے۔“

”میڈم انیلا کا کیا بنے گا؟“

”وہ خفیہ ہاتھ کی مضبوط گرفت میں آچکی ہے۔ مجھے اس کے سائے تک بھی پہنچنے نہیں دیا جائے گا۔ جوابی کارروائی یہی ہو سکتی ہے کہ نیک بخت اور خفیہ ہاتھ مجھے پاکستان میں دیکھ کر پریشان ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے ان کی پریشانی اور بدحواسی کے باعث مجھے انیلا کا کوئی سراغ مل جائے۔“

ہم نے دوسرے ہی دن پی آئی اے میں دو سیٹیں حاصل کیں۔ عارضی میک اپ اور فرضی ناموں سے سفر کیا پھر پاکستان پہنچتے ہی حمزہ نے بذریعہ فون نیک بخت سے کہا۔ ”میں یہاں آگیا ہوں۔ تم نے انیلا کو اغوا کرا کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ میرے پاس صرف انیلا ہی تمہارے خلاف ایک مہرہ نہیں تھی۔ تمہارے جیسے کرپٹ سیاست دانوں کے خلاف میرے پاس بہت سے دستاویزی ثبوت ہیں۔ اب میں رفتہ رفتہ تمہاری کرپشن کا پٹارا کھولتا رہوں گا اور تمہاری انتخابی مہم کو ناکام بناتا رہوں گا۔“

”ہوں۔ تو تم میرا پیچھا نہیں چھوڑو گے؟ انیلا کی موت کی خبر سننا چاہتے ہو۔“

”کیا میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں اور پاکستان کبھی نہ آؤں اور تمہارے خلاف کوئی بات نہ کروں تو انیلا مجھے لندن میں مل جائے گی؟“

”تم اتنی بڑی عقلمندی کا ثبوت دو گے تو انیلا تمہیں ضرور واپس ملے گی۔“

”مجھے یقین نہیں ہے کہ تم نے انیلا کو زندہ چھوڑا ہو گا۔ میں لندن جاؤں گا تو خفیہ ایجنسی والے میرے پیچھے ہوں گے اور کہیں بھی مجھے ٹریپ کرنا چاہیں گے۔ بہرحال میں اپنے مخالفین سے نمٹنا جانتا ہوں۔ کسی بھی فلائٹ سے لندن واپس جاؤں گا لیکن جانے سے پہلے تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ انیلا زندہ ہے۔“

”لندن جاؤ گے تو اسے آنکھوں سے دیکھ لو گے۔“

”لندن جانے سے پہلے اس سے فون پر بات کر سکتا ہوں؟“

فون پر تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ حمزہ صاحب نے پوچھا۔ ”کیا ہو گیا؟ خاموش کیوں ہو؟“

وہ بولا۔ ”فون پر انیلا سے بات کرائی جا سکتی ہے لیکن ایک گھنٹے بعد فون کرو۔“

حمزہ صاحب نے فون بند کر کے مجھے کہا۔ ”وہ چاہتا تو پندرہ یا بیس منٹ میں انیلا سے

میری بات کرا سکتا تھا لیکن وہ ایک گھنٹے بعد انیلا سے رابطہ کرائے گا۔ تم بتاؤ کہ ہمارا رابطہ کرانے کے لیے وہ اتنی دیر کیوں کر رہا ہے؟"

میں نے کہا۔ "میری سمجھ میں سیدھی سی بات آتی ہے کہ پہلے وہ اپنے سیاسی سرپرست خفیہ ہاتھ سے اس سلسلے میں بات کرے گا اگر خفیہ ہاتھ نے اجازت دی تو وہ انیلا سے بات کرائے گا۔"

"ہوں۔ فی الحال یہی بات میری سمجھ میں بھی آ رہی ہے۔ کوئی بات نہیں' ایک گھنٹے بعد جو حقیقت ہوگی' وہ سامنے آجائے گی۔"

اسی وقت میرے موبائل فون پر امی نے کہا۔ "تم نے مجھے اپنے آنے کی اطلاع دی تھی۔ میں اس وقت ایک آپریشن میں مصروف تھی۔ آپریشن سے فارغ ہونے کے بعد یہاں اسپتال میں تمہارا پیغام ملا۔ میں بہت خوش ہوں کہ تم نے شمشیر سنگھ کالیا سے انتقام لے لیا ہے اور اسے اپاہج بنا کر زندہ چھوڑ دیا ہے۔ تمہیں اسی طرح امیر حمزہ کے ساتھ رہ کر طرح طرح کے آزمائشی حالات سے گزر کر ذہانت' حاضر دماغی اور فوری حکمتِ عملی کے تجربات سیکھنے ہیں۔ میں اپنے وعدے کے مطابق تمہارے روبرو آؤں گی' تم یہاں نہیں آؤ گے۔ میں تمہارے پاس کراچی آؤں گی۔"

پھر امی نے حمزہ صاحب سے باتیں کیں۔ ان سے بھی یہی کہا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ رکھ کر جان لیوا تجربات کی آگ میں تپا کر کندن بنائیں۔ لاہور میں ان کی کچھ اہم مصروفیات ہیں۔ ان سے فارغ ہو کر وہ ایک دو دن کے لیے کراچی آئیں گی۔

ایک گھنٹے بعد حمزہ صاحب نے فون پر نیک بخت سے کہا۔ "ایک گھنٹا گزر چکا ہے۔ کیا انیلا سے بات کراؤ گے؟"

"ہاں۔ وہ لندن میں ہے۔ اس کا فون نمبر نوٹ کرو۔ اس سے بات کرنے کے بعد مجھ سے ضرور گفتگو کرنا۔ میری ذات سے تمہیں بہت سے فائدے پہنچیں گے۔"

اس نے فون نمبر بتایا۔ حمزہ صاحب نے کہا۔ "نیک بخت! ایک طوائف اپنا جسم دینے سے پہلے اپنی فیس وصول کرتی ہے اور ایک سیاست داں فائدے پہنچانے کے سبز باغ دکھا کر پہلے ووٹ حاصل کرتا ہے۔ میں کبھی کسی طوائف اور سیاست داں سے لین دین کرنا سب سے بڑی حماقت سمجھتا ہوں۔"

اس نے نیک بخت سے فون کا رابطہ ختم کیا پھر لندن کے فون نمبر ڈائل کیے۔ تھوڑی دیر بعد انیلا کی کھانسی اور کمزور سی آواز سنائی دی۔ اس نے پوچھا۔ "کون؟"

حمزہ صاحب نے پوچھا۔ "کیا تم میری آواز نہیں پہچان سکتی ہو؟"

وہ حیرانی سے بولی۔ "تم؟ حمزہ بول رہے ہو؟ تمہیں میرا یہ فون نمبر کیسے معلوم ہوا؟"

"نیک بخت نے یہ نمبر دیا ہے۔ تمہیں زندہ رکھ کر نیکی کر رہا ہے اور ہم دو بچھڑوں کو ملانا چاہتا ہے لیکن پہلے میں تصدیق کر رہا ہوں کہ میری انیلا زندہ ہے یا نہیں؟"

وہ کھانستے ہوئے بولی۔ "میں زندہ ہوں مگر یہ نہیں چاہتی کہ تم میری خاطر اپنا وطن چھوڑ دو اور دور رہ کر بھی وطن دشمن سیاست دانوں کا محاسبہ نہ کرو۔"

"تمہاری مسلسل کھانسی اور نقاہت زدہ آواز سے پتا چل رہا ہے کہ بہت بیمار ہو۔ کیا اپنا علاج کرا رہی ہو؟"

"ہاں ایک ڈاکٹر صبح اور شام مجھے اٹینڈ کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں موسم بدلنے کے باعث سردی زکام اور کھانسی میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ جلد ہی صحت یاب ہو جاؤں گی۔"

"انیلا! جب میں آخری بار اس خفیہ بنگلے سے رخصت ہو رہا تھا تو یاد ہے کہ میں نے کیا کہا تھا؟"

"اتنے دن گزر چکے ہیں' تم نے جو کچھ کہا' وہ کیسے یاد رہے گا؟"

"محبت کرنے والی اپنے محبوب کے آخری فقرے اور اس کے پیار بھرے انداز کو یاد رکھتی ہے۔"

"میں تو ہمیشہ تمہیں "وِش یو گڈ لک" کہہ کر رخصت کیا کرتی تھی۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔ آخری رات میرے بدن پر شرٹ نہیں تھی۔ تمہیں تو یاد ہو گا کہ میرے سینے پر پیدائشی نشان دیکھ کر پھر تم نے اس نشان کو چوم کر کیا کہا تھا؟"

"تم ایسے سوالات کر رہے ہو جیسے مجھ پر شبہ ہو۔ کیا مجھے نہیں پہچان رہے ہو؟"

"تمہاری اصل آواز اور لہجہ کھانسی اور زکام کے باعث بدل گیا ہے لیکن جو تمہارے پیار کا انداز ہے' وہ تو کبھی نہیں بدلے گا۔"

"میں تمہارے سینے کے پیدائشی نشان پر ہاتھ پھیرتی تھی اور چومتی تھی اور سحر زدہ سی ہو کر جانے کیا کیا کہتی چلی جاتی تھی۔"

"درست ہے۔ پیار میں سحر زدہ ہو کر جذب کے عالم میں دو محبت کرنے والے کیا کچھ کہتے رہتے ہیں' وہ باتیں بعد میں پوری تفصیل سے یاد نہیں رہتیں لیکن۔ میں آپ سینے سے لگنے والی انیلا! تمہیں یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ میرے سینے گا۔ ان کی لاشیں سڑکوں ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "تم خواہ مخواہ الجھا رہے ہو۔ آدمیوں کو بڑی راز داری سے

نازاں اور راجہ نواز کے پیچھے چھوڑ رکھا تھا۔ انہیں تاکید کی تھی کہ کبھی ان سے سامنا نہ کریں اور نہ ہی ان کے معاملات میں مداخلت کریں۔ حتیٰ کہ وہ دونوں کبھی نشانے پر آئیں تو انہیں گولی نہ ماریں۔ اگر نشانہ چُوک جائے تو رازداری نہیں رہے گی۔

رحمان چنا کو یقین تھا کہ وہ دونوں زیادہ دنوں تک خانہ بدوشوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹکتے نہیں رہیں گے۔ کہیں نہ کہیں اپنا مستقل ٹھکانہ ضرور بنائیں گے۔ اس کا یہ یقین درست نکلا۔ اس کے جاسوسوں نے اطلاع دی کہ وہ دونوں اپنے مخالفین کو گمراہ کرنے کے لیے دوبارہ کراچی آگئے ہیں۔

پھر اطلاع ملی کہ نازاں بیمار ہے۔ رحمان چنا نے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے اسپتال کے ایک ڈاکٹر سے معلوم کیا۔ اس نے بتایا کہ نازاں ماں بننے والی ہے۔ میڈیکل چیک اپ سے پتا چلا ہے کہ اسے سینے کا کینسر ہے۔ یہ بیماری پہلے اسٹیج پر ہے۔ بچے کی پیدائش سے قبل مسلسل علاج ہوتا رہے گا تو اس مہلک بیماری سے نجات حاصل کرلے گی۔ اسے ایک اسپتال کے اسپیشل وارڈ کے ایک کمرے میں رکھا گیا تھا۔ ایسے قدرتی حالات پیش آئے تھے کہ اس کے چہرے پر عارضی میک اپ ہمیشہ نہیں رہ سکتا تھا اور چہرے کو پلاسٹک سرجری کے ذریعے تبدیل کرنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ للذا وہ اپنی اصلی شکل و صورت کے ساتھ اسپتال کے کمرے میں تھی۔

راجہ نواز عارضی میک کے ذریعے کئی طرح کے بہروپ میں اس کے پاس اسپتال میں آسکتا تھا لیکن دشمن ایسے بھی نادان نہیں تھے کہ نازاں کے پاس دن رات آنے جانے والے کو سمجھ نہ پاتے کہ وہ راجہ نواز ہے۔ نازاں نے اس سے کہا۔ ”میں اسی شرط پر اسپتال میں رہوں گی کہ تم مجھ سے ایک منٹ کے لیے بھی نہیں ملنے آؤ گے۔“

وہ بولا۔ ”محبت ایسی نہیں ہوتی کہ میں برے وقت میں تم سے منہ چھپا کر رہوں۔“

”تم مجھ سے نہیں‘ دشمنوں سے منہ چھپاؤ گے اور فون کے ذریعے میری خیریت معلوم کرتے رہو گے۔“

”نازاں! صرف خیریت معلوم کرنے سے بات نہیں بنے گی۔ تمہارے پاس دوائیں پہنچانے‘ ایکسرے کرانے اور مختلف میڈیکل ٹیسٹ کراتے رہنے کے لیے میری موجودگی لازمی ہے۔“

”یہ سارے کام تمہارا کوئی جانباز بھی کرسکتا ہے۔ اگر تم مجھ سے سچی محبت کرتے ہو تو میں اپنی جان کی قسم دیتی ہوں۔ اسپتال میں کبھی کسی بھیس میں بھی نہ آؤ۔ آؤ گے تو میں علاج نہیں کراؤں گی۔ اپنے اور تمہارے بچے کی ماں بننے سے پہلے مرجاؤں گی۔“

ایک جانباز نے بھی کہا۔ ”یہ درست کہہ رہی ہیں۔ آپ دور رہ کر ان کی نگرانی بھی کرسکتے ہیں اور دشمن آپ کو اسپتال میں کبھی نہ پا کر خوفزدہ رہیں گے کہ انہوں نے میڈم نازاں کو نقصان پہنچایا تو آپ انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

حالات کا یہی تقاضا تھا کہ اسے جذبات سے نہیں‘ حکمتِ عملی سے کام لینا چاہیے۔ نازاں سے دور رہ کر اس کی حفاظت کرنا چاہیے۔ اس نے ایک ہی دن میں اسپتال سے قریب ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا پھر وہاں رہ کر دور ہی دور سے یہ تاڑنے لگا کہ اسپتال کے اندر جانے والوں میں کتنے دشمن ہو سکتے ہیں۔ عیادت کرنے والوں اور دشمن بن کر آنے والوں کے انداز میں ایسا نامعلوم سا رازدارانہ فرق ہوتا ہے‘ جسے تاڑنے والی نظریں ہی سمجھ سکتی ہیں۔

راجہ نواز بھی کسی دشمن کو پہچان سکتا تھا۔ اسپتال میں صرف ایک گھنٹا صبح......... اور ایک گھنٹا شام کے وقت عیادت کرنے والوں کو آنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ آنے جانے والوں کی بھیڑ صرف دو گھنٹے تک رہتی تھی۔ صرف اسپیشل وارڈ کے کمرے میں مریض یا مریضہ کے ساتھ کسی ایک تیمار دار عزیز کو رہنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ نازاں کے کمرے میں دن میں ایک جانباز رہتا تھا اور رات کو دوسرا جانباز آیا کرتا تھا اور راجہ نواز فون کے ذریعے نازاں کی خیریت معلوم کرتا رہتا تھا۔

رحمان چنا اپنی چال چل رہا تھا۔ اس نے نازاں کے برابر والے کمرے میں ایک عورت کو مریضہ بنا کر بھیج دیا تھا۔ وہ مریضہ بننے والی عورت دو قتل کے الزام سے نجات پانا چاہتی تھی۔ اس لیے ایک آلۂ کار بن کر اس کمرے میں آئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور قاتل اس کا شوہر اور تیمار دار بن کر آیا تھا۔ رحمان چنا ان دونوں قاتلوں کی سرپرستی کررہا تھا اور انہیں قانون کی گرفت سے بچاتا آرہا تھا۔

راجہ نواز کی یہ تدبیر کمزور رہی کہ وہ اسپتال کے قریب مکان کرائے پر لے کر نازاں کی نگرانی کرسکے گا۔ نازاں کے قاتل تو اس کے پڑوسی بن کر آگئے تھے اور یہ تاڑنے کی کوشش کررہے تھے کہ نازاں کے پاس تیمار داری کے لیے آنے والے دو آدمیوں میں کون راجہ نواز ہے جو بھیس بدل کر آیا کرتا ہے؟

رحمان چنا نے دونوں آلۂ کار سے کہا۔ ”عقل سے کام لو۔ جو شخص رات کو نازاں کے پاس تیمار داری کے لیے رہتا ہے‘ وہی اس کا یار راجہ نواز ہے۔ نازاں کسی غیر کے ساتھ رات کو نہیں رہے گی۔“

نازاں کی پڑوسن مریضہ نے کہا۔ ”ہاں‘ عورت اپنے مرد کے ساتھ ہی رات کو رہتی

ہے۔ ہم آج آدھی رات کے بعد انہیں قتل کر دیں گے۔"

"ہو سکے تو صرف نازاں کو قتل کرو۔ راجہ نواز کو زخمی کر کے قیدی بنا کر لے آؤ۔ اسپتال کے آگے پیچھے ہماری کئی گاڑیاں اور ماتحت ہوں گے۔ تم کسی بھی گاڑی میں آسکو گے۔"

وہ دونوں اپنے اپنے ریوالور میں سائلنسر لگا کر رات کے دو بجے تک موبائل فون کے ذریعے اسپتال کی گاڑی والوں سے رابطہ قائم کرتے رہے۔ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ "اتنی دیر کیوں کی جا رہی ہے؟"

اس عورت نے کہا۔ "نازاں اور راجہ نواز میاں بیوی ہیں۔ انہوں نے رات کے وقت دروازے کو اندر سے بند کیا ہو گا۔ دروازے پر دستک دے کر جانے کا مطلب ہے انہیں ہوشیار کیا جائے۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "پھر تو وہ دروازہ صبح تک بند رہے گا۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے۔ نازاں اچانک کسی تکلیف میں مبتلا ہو سکتی ہے یا کسی اور ضرورت کے تحت راجہ نواز دروازہ کھول کر تھوڑی دیر کے لیے باہر جا سکتا ہے۔ ایسے وقت ہم دونوں ان دونوں سے نمٹ لیں گے۔"

آدھی رات گزرنے کے بعد ساتھ والے کمرے میں خاموشی رہی اور کسی ضرورت کے تحت دروازہ نہیں کھلا۔ انتظار کرنے والے بیزار ہوتے رہے۔ رحمان چنا نے سختی سے تاکید کی تھی کہ اس میں ذرا سی بھی عجلت سے کام نہ لیا جائے۔ جو کام آج نہ ہو سکے' اسے کل کیا جائے۔ راجہ نواز بہت شاطر ہے۔ اس بار بچ نکلے گا تو اس کے خلاف قیامت برپا کر دے گا۔

اس حکم کے مطابق انتظار کرنے والے صبر کر رہے تھے مگر بیزار ہو رہے تھے۔ رات کے دو بجے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اس قاتل عورت کے ساتھی نے روشندان سے جھانک کر دیکھا۔ جسے راجہ نواز سمجھا جا رہا تھا' وہ ہاتھ میں تھرماس لے کر جا رہا تھا۔ نازاں کو نیند نہیں آرہی تھی' وہ چائے پینا چاہتی تھی۔ اس لیے ساتھ رہنے والا وہ جانباز تھرماس لے کر اسپتال کی کینٹین کی طرف جا رہا تھا۔

بس یہی موقع تھا۔ وہ روشندان کے پاس میز سے اتر کر دروازہ کھول کر اس کے پیچھے گیا۔ عورت نے اس کمرے سے نکل کر نازاں کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہی فائرنگ شروع کر دی۔ وہ بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پاس بھی تکیے کے نیچے پستول تھا لیکن جب قضا.......... آتی ہے تو جینے کی ادا نہیں آتی۔ اسے اپنے پستول تک پہنچنے کا موقع

نہیں ملا۔ اس قاتلہ نے جیسے سانس لیے بغیر کئی فائر کیے۔ کئی گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں پھر وہ وہاں سے دوڑتے ہوئے کوریڈور میں آئی۔ وہاں کوریڈور کے ایک موڑ پر اس کے ساتھی نے پیچھے سے جانباز پر فائر کیا تھا۔ اس بیچارے کو بھی سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔ وہ جوابی فائر کرنے کے لیے اپنا ریوالور نکالتے ہی قاتل کی طرف پلٹا لیکن اتنی دیر میں قاتل نے دو فائر کر کے اس کے جسم میں گولیاں اتار دی تھیں۔ تیسرے فائر میں اس کے ہاتھ سے ریوالور گرا دیا پھر اپنے ریوالور کی باقی گولیاں بھی اس کے جسم میں پیوست کر دیں۔ اس کے بعد اپنی ساتھی عورت کے ساتھ بھاگتا ہوا اسپتال سے باہر جانے لگا۔

باہر راجہ نواز دور سے چھپ کر نگرانی کرتا رہتا تھا۔ دشمنوں کی گاڑیاں اسپتال کے احاطے میں دوسری گاڑیوں کے ساتھ کھڑی رہتی تھیں اس لیے ان گاڑیوں پر شبہ نہیں ہوا۔ جب اس نے ایک عورت اور مرد کو دوڑتے ہوئے اسپتال سے نکلتے ہوئے دیکھا تو چونک گیا۔ ان کے ہاتھوں میں سائلنسر لگے ریوالور تھے۔ احاطے میں کھڑی ہوئی ایک گاڑی کا دروازہ کھل گیا تھا۔ اس میں سے ایک شخص نکل کر انہیں اپنی طرف آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

راجہ نواز نے انہیں دیکھتے ہی پہلے مرد پر فائر کیا۔ وہ بچ کر آگے نکل گیا۔ گولی عورت کو لگی۔ وہ چیخ مار کر گر پڑی۔ راجہ نواز اچھل کر احاطے کی دیوار پر آیا۔ گاڑی سے نکل کر اشارہ کرنے والا نشانے پر تھا۔ اسے گولی لگی۔ جانباز کے قاتل نے گاڑی کی آڑ لے کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسی وقت گاڑی کے پہیے کا ٹائر زور دار دھماکے سے برسٹ ہوا۔ وہ اچھل کر دور جا گرا جس گاڑی میں وہ فرار ہو سکتا تھا' اسے راجہ نواز نے ناکارہ بنا دیا تھا۔ وہ بوکھلا کر زمین سے اٹھتے ہوئے دوسری گاڑی کے پیچھے چھپنا چاہتا تھا لیکن پسلی میں گولی لگتے ہی کراہتے ہوئے زمین پر گر پڑا۔

فائرنگ کی آوازیں اسپتال کے سامنے والے احاطے میں بھی گئی تھیں۔ وہاں کھڑی ہوئی ایک گاڑی میں رحمان چنا کے دو حواری تھے۔ انہوں نے فوراً اسے اسٹارٹ کیا۔ تیزی سے ڈرائیو کرتے ہوئے احاطے کے باہر آ کر اسپتال کے پچھلے حصے کی طرف جانے لگے۔ راجہ نواز احاطے کی دیوار سے کود کر تیزی سے چلتا ہوا اس قاتل کے پاس آیا۔ اس میں ابھی جان باقی تھی۔ راجہ نواز نے پوچھا۔ "کیا رحمان چنا نے تمہیں بھیجا ہے؟ سچ بولو گے تو ابھی طبی امداد ملے گی اور موت سے زندگی کی طرف لوٹ آؤ گے۔ جواب دینے میں دیر کرو گے تو میں ایک گولی اور مار دوں گا۔"

وہ اکھڑتی ہوئی سانسوں کے درمیان بولا۔ "ہاں' ہاں۔ چنا صاحب۔ صاحب

نے..........."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے دوسری گاڑی اس پچھلے احاطے میں داخل ہوئی۔ اس کے دروازے کھلے۔ انہوں نے راجہ نواز کو دیکھتے ہی فائر کیا لیکن جوابی فائر کے نتیجے میں مارا گیا۔ دوسرا گاڑی لے کر بھاگنے لگا۔ راجہ نواز نے اس کی گاڑی کے پہیئے کو بھی بیکار کرنا چاہا۔ کئی فائر کئے لیکن وہ گاڑی احاطے سے تیزی سے نکلتی چلی گئی۔ آخری دشمن بچ کر نکل گیا۔ وہ دوڑتا ہوا اسپتال کے اندر جانے لگا۔

فائرنگ کی آوازوں پر جونیئر ڈاکٹر‘ لیڈی ڈاکٹر‘ نرسیں اور وارڈ بوائز سہم گئے تھے۔ اسپتال کے اندر ہی ایک دوسرے کے قریب آرہے تھے۔ ایسے وقت انہوں نے کوریڈور میں جانباز کی لاش دیکھی۔ اسے دیکھتے ہی جونیئر ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ اسپیشل وارڈ کے کمرا نمبر دو کی مریضہ کے ساتھ رہتا تھا۔"

ایک نرس پولیس کو فون کرنے لگی۔ باقی سب کمرا نمبر دو کی طرف دوڑتے ہوئے آئے تو دروازہ کھلا ہوا تھا اور نازاں خون سے لت پت بے جان دکھائی دے رہی تھی۔

اس وقت راجہ نواز بھی دوڑتا ہوا آیا پھر نازاں کو دیکھتے ہی اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر گر پڑا۔ ڈاکٹر وغیرہ ریوالور دیکھتے ہی سہم کر دور ہو گئے۔ موبائل فون کے بزر کی آواز نے راجہ نواز کو چونکا دیا۔ اس نے اسے آن کر کے کان سے لگا کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

دوسری طرف سے ایک جانباز نے کہا۔ "سر! ایک خوشخبری ہے۔ جناب امیر حمزہ.........کراچی آگئے ہیں۔ آپ کو پوچھ رہے ہیں۔"

وہ ہارے ہوئے جواری کے انداز میں بولا۔ "حمزہ کو یہ بری خبر سنا دو کہ اس کے یار کی شریکِ حیات نازاں کو ابھی اسپتال میں قتل کر دیا گیا ہے۔"

"او گاڈ! آپ کہاں ہیں؟"

"اسپتال میں ہوں۔ اپنی جان سے زیادہ عزیز کا آخری دیدار کر رہا ہوں۔"

"سر! کاشف اکبر اور رحمان چنا اپنی سازش میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ انہیں مزید کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ فوراً وہاں سے نکل جائیں۔ آپ کے خلاف ایف آئی آر درج ہے کہ آپ نے نازاں کو اغوا کیا ہے۔ اب آپ پر اس کے قتل کا بھی الزام لگایا جائے گا۔ پلیز آپ فوراً وہاں سے نکل جائیں۔"

راجہ نواز آہستہ آہستہ چلتا ہوا فون بند کر کے نازاں کے قریب آیا پھر اس کی پیشانی کو چوم کر اس کی خون آلودہ لاش سے لپٹ گیا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی

دے رہی تھیں پھر وہ کمرے کے دروازے پر رک گئیں۔ پولیس والے آگئے تھے۔ انسپکٹر نے اپنی جیب سے رومال نکال کر راجہ نواز کے فرش پر پڑے ہوئے ریوالور کو اٹھالیا۔ پھر کہا۔ "راجہ نواز! آخرِ قانون کے شکنجے میں آگئے۔ ہم یہاں پچھلی دو راتوں سے چھپے ہوئے تھے۔ ابھی ہم بار بار ہونے والی فائرنگ کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ چنا صاحب نے کہا تھا‘ تم پیچیدہ چال چلو گے اور ہمیشہ کی طرح بچ نکلو گے اور میں نے دعویٰ کیا تھا کہ تم یہاں فائرنگ کے نتیجے میں مرو گے یا پھر ہمارے شکنجے میں آؤ گے۔"

راجہ نواز کے موبائل سے بزر کی آواز آنے لگی۔ سپاہیوں نے قریب آکر اسے نشانے پر رکھا ہوا تھا۔ انسپکٹر نے اس کی جیب سے موبائل نکال کر آن کیا پھر اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ "ہیلو‘ کون ہے؟"

دوسری طرف سے امیر حمزہ کی آواز سنائی دی۔ "میں کوئی بھی ہو سکتا ہوں۔ جس کا یہ فون ہے‘ اسے بات کرنے دو۔"

"سوری۔ راجہ نواز پولیس کی حراست میں ہے۔ میں انسپکٹر رانا سجاد بول رہا ہوں۔ تمہیں جو کہنا ہے‘ وہ ڈیفنس کے تھانے میں آکر کہو۔"

اس نے فون بند کر دیا پھر اسی موبائل فون کے ذریعے رحمان چنا سے رابطہ کر کے بولا۔ "چنا صاحب! میں انعام کا حقدار ہو گیا ہوں۔ راجہ نواز میری حراست میں ہے اور میں اسے تھانے لے جا رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے رحمان چنا نے حیرانی اور بے یقینی سے پوچھا۔ "کیا سچ کہہ رہے ہو؟ تم نے راجہ نواز کو گرفتار کر لیا ہے؟ پہاڑ کو زنجیر پہنائی ہے؟ مجھے یقین نہیں آرہا ہے نازاں کہاں ہے؟"

"وہ مر چکی ہے‘ ہم نے اسی کے قتل کے الزام میں راجہ نواز کو گرفتار کیا ہے۔"

"میں یقین کرنے کے لیے تھانے آسکتا ہوں مگر بہت رات ہو چکی ہے۔ صبح آکر اپنی آنکھوں سے اسے دیکھوں گا۔ فی الحال یقین کرنے کے لیے اپنے سیکرٹری کو بھیج رہا ہوں۔"

"بے شک آپ پہلے اچھی طرح یقین کر لیں۔ انعام تو آپ مجھے ضرور دیں گے۔ میں ابھی پندرہ منٹ میں تھانے پہنچ جاؤں گا۔"

"نازاں کے وڈیرے باپ اور بھائی کو فون کرو۔ تاکہ وہ فوراً اسپتال میں آکر اپنی بیٹی کو مُردہ اور اس کے قاتل کو زندہ تمہاری گرفت میں دیکھ کر راجہ نواز کے خلاف ٹھوس گواہ بن جائیں۔"

"جناب عالی! میں ابھی فون پر انہیں اطلاع دے رہا ہوں۔"

اس نے فون بند کر کے وڈیرے کمال صالح سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "میں انسپکٹر رانا سجاد بول رہا ہوں۔ آپ کے لیے ایک دردناک خبر ہے۔ راجہ نواز نے آپ کی بیٹی نازاں کو اسپتال میں قتل کر دیا ہے۔ قاتل ہماری حراست میں ہے۔ آپ یہاں آئیں تاکہ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجا جا سکے۔ ویسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ پوسٹ مارٹم کے بعد آئیں گے تو بیٹی کی لاش آپ کے حوالے کر دی جائے گی۔"

وہ فون بند کر کے جونیئر ڈاکٹر‘ لیڈی ڈاکٹر اور نرسوں کے تحریری بیانات ان کے دستخط کے ساتھ لینے لگا۔ لاش کو اسی اسپتال میں پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ اس کارروائی میں چار بج گئے۔ وڈیرا کمال صالح اور اس کا بیٹا جمال صالح وہاں آئے وہ دونوں نازاں کی لاش دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے۔ راجہ نواز کو گالیاں دینے لگے۔ وہ گرج کر بولا۔

"ایک کے بعد دوسری گالی نکالی تو تم دونوں کو بھی پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دوں گا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں پولیس کی حراست میں گالیاں سن کر خاموشی سے سر جھکا لوں گا۔ یہاں کوئی چشم دید گواہ نہیں ہے کہ میں نے نازاں کو قتل کیا۔ رحمان چنا نے تم باپ بیٹے کو الو بنا کر اپنے آدمیوں کے ذریعے میری نازاں کو قتل کرایا ہے۔ اب وہ بھی زندہ نہیں رہے گا۔"

انسپکٹر نے باپ بیٹے سے کہا۔ "آپ اس کے منہ نہ لگیں۔ نازاں کی لاش لے جائیں۔ ہم قاتل سے نمٹ لیں گے۔"

وہ راجہ نواز کو ہتھکڑیاں پہنا کر اسپتال سے باہر آئے پھر اسے پولیس وین میں بٹھا کر ڈیفنس تھانے پہنچے تو صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ انسپکٹر تھانے میں تین سپاہیوں کو چھوڑ کر گیا تھا۔ آج تو اس نے ناقابلِ گرفت مجرم کو گرفتار کیا تھا۔ فاتحانہ مسرتوں کے نشے میں اس نے تھانے کے سپاہیوں کی وردی اور ان کے سیلوٹ کو دیکھا۔ چہرے نہیں دیکھے تھے لیکن اپنے دفتری کمرے میں پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ میں ایک بڑی سی میز کے پیچھے اس کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور میرے ریوالور کا رخ اس کی طرف تھا۔

مجھے ٹریننگ دینے کے لیے حمزہ صاحب نے اپنی جگہ بھیجا تھا۔ میں نے ان کے چھ جانبازوں کے ساتھ تھانے میں آکر ان تین سپاہیوں کو زخمی اور بیہوش کر کے حوالات میں بند کر دیا تھا۔ ان تینوں کی وردیاں ہمارے تین جانبازوں نے پہن لی تھیں۔ انسپکٹر کے آنے سے پہلے رحمان چنا کا سیکرٹری آیا تھا۔ اسے میں نے میز کے پاس اپنے قدموں میں بٹھا لیا تھا اور وارننگ دی تھی کہ منہ سے کچھ بولے گا تو پھر کچھ اور بولنے کے قابل نہیں رہے گا۔

انسپکٹر میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اپنا ہاتھ ہولسٹر کی طرف لے جا رہا تھا۔ پیچھے سے جانبازوں نے آکر اسے اور سپاہیوں کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔ میں نے سپاہیوں سے کہا۔ "اپنی رائفلیں پھینک دو ورنہ پہلی گولی انسپکٹر کو لگے گی۔"

ایک جانباز نے انسپکٹر کے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔ دوسرے نے اس کی جیب سے چابی نکال کر راجہ نواز کی ہتھکڑی کھولی۔ اس نے اسپتال کے ڈاکٹر وغیرہ سے جو تحریری بیانات لیے تھے۔ ان تمام بیانات کے کاغذات اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ وغیرہ لے لی گئی پھر رحمان چنا کے سیکرٹری سمیت ان سب کو آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کر کے تالا لگا دیا۔

راجہ نواز نے انسپکٹر سے کہا۔ "تم قانون کی بالادستی کے لیے وردی پہنتے ہو مگر کاشف اکبر اور رحمان چنا کی نوکری کرتے ہو۔ تم اس سے انعام لینے والے تھے۔ آج شام تک سنو گے کہ میری نازاں کو قتل کرانے والا کیسی عبرتناک موت مرے گا۔"

میں نے ایک وین تھانے کے پیچھے کھڑی کی تھی۔ ہم سب وہاں آئے‘ ایک جانباز نے تعارف کراتے ہوئے راجہ نواز سے کہا۔ "سر! یہ مسٹر فرمان علی تاباں ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ لیڈی سرجن آمنہ خاتون کے بیٹے ہیں اور ہمارے سر امیر حمزہ صاحب کے دست راست ہیں۔"

ہم نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا۔ میں نے کہا۔ "آپ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ حمزہ صاحب سے آپ کی بڑی تعریفیں سنی ہیں۔"

ہم وین میں بیٹھ کر جانے لگے۔ حمزہ صاحب ڈیفنس کی ایک کوٹھی میں تھے۔ ہم وہاں پہنچے تو وہ موجود نہیں تھے۔ ایک جانباز نے کہا۔ "وہ ضروری کام سے گئے ہیں ابھی آجائیں گے۔"

ہم نے وہاں کے مختلف باتھ روم میں غسل کیا پھر تازہ دم ہو کر ناشتے کی میز پر آگئے۔ راجہ نواز بہت خاموش تھا۔ اس کے اندر جو صدمہ چھپا ہوا تھا اسے سمجھا جا سکتا تھا۔ نازاں اسے بھرپور محبت دے کر اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی تھی۔ وہ اسے بھلا نہیں سکتا تھا۔ اس نے ناشتے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ صرف ایک کپ چائے ٹھہر ٹھہر کر سوچ سوچ کر ایک ایک گھونٹ پیتا رہا۔

ہم پچھلی رات سے جاگ رہے تھے۔ سونے کا ارادہ تھا۔ ایسے وقت حمزہ صاحب آگئے۔ انہیں دیکھتے ہی راجہ نواز دونوں بازو پھیلا کر اس سے گلے ملنے کے لیے آگے بڑھا۔ حمزہ صاحب نے اسے انگلی دکھاتے ہوئے کہا۔ "رک جاؤ۔ میں گلا کاٹنے والوں سے گلے نہیں ملتا۔"

راجہ نواز نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"راجہ! ہم دونوں نے قسم کھائی تھی کہ زر سے' زمین سے اور زن سے بچ کر رہیں گے اگر کبھی کوئی عورت ہماری زندگی میں آئے گی تو ہم اس کی محبت کا جواب محبت سے دیں گے لیکن اس عورت کو اپنے ملک اور قوم پر ترجیح نہیں دیں گے۔ ہمارا ایک ہی مقصد ہے' قوم کو بیدار کرنا' عوام کو یہ شعور دینا کہ مفاد پرست اور وطن دشمن کیسی کیسی پیچیدہ چالیں چل کر خود کو محبِ وطن سیاست داں بنا کر پچاس برسوں سے اس ملک کو کھوکھلا کرتے آ رہے ہیں۔ کیا تم نے کل رات اپنے اس عزم اور اہم مقصد کو یاد رکھا تھا؟"

"ہاں یاد رکھا تھا۔ میں اپنے عزائم اور مقاصد کو کبھی نہیں بھول سکتا۔"

حمزہ صاحب نے اچانک ہی اس کے منہ پر ایک گھونسا مارا۔ وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑا کر ایک کرسی سے ٹکراتا ہوا فرش پر جا گرا پھر جھنجلا کر حمزہ صاحب سے بولا۔ "یار! یہ تو یاری دکھا رہا ہے؟ میری غلطی تو بتا؟"

"راجہ! ہماری جانیں ملک اور قوم پر نثار ہونے کے لیے ہیں۔ کل رات تجھے نازاں کی لاش دیکھتے ہی فرار ہونا چاہیے تھا۔ اس طرح وہاں تیرے خلاف ڈاکٹر وغیرہ چشم دید گواہ نہ ہوتے۔ کاشف اکبر اور رحمان چنا نے تجھے قانون کے ذریعے سزائے موت دلانے اور عوام کے سامنے یہ ثابت کرنے کا پورا پلان بنا لیا تھا کہ راجہ نواز اور امیر حمزہ جیسے مجاہدین درپردہ قاتل اور دہشت گرد ہیں۔ تو جذبات میں اس قدر اندھا ہو گیا تھا کہ اپنے اصولوں کو بھول کر نازاں کی لاش سے لپٹ گیا تھا اور ایک احمق کی طرح اپنی گرفتاری کا انتظار کر رہا تھا۔ اگر میں فرمان کو جانبازوں کے ساتھ تھانے نہ بھیجتا تو تیری موت ملک اور قوم کے لیے نہیں' صرف ایک عورت کے لیے ہوتی۔"

راجہ نواز نے سر کھجاتے ہوئے سوچا پھر کہا۔ "سوری میں تسلیم کرتا ہوں کہ نازاں کی لاش دیکھ کر میں اس قدر جذبات سے ٹوٹ گیا تھا کہ اپنے اصولوں کو اور اپنے آپ کو بھی بھول گیا تھا۔ بہرحال ایک گمراہ کو اس کی گمراہی کا احساس دلانے والا سچا یار ہوتا ہے۔"

راجہ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ حمزہ صاحب نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے فرش سے اٹھایا پھر اسے گلے سے لگا کر کہا۔ "میری زندگی میں بھی انیلا آئی تھی۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ میں نے اس کی موت کا زہریلا گھونٹ خاموشی سے پی لیا ہے۔ ہمارے ملک میں روزانہ کتنی نازاں اور انیلا کو قتل کیا جاتا ہے۔ ہم ان کی موت پر

ماتم نہیں کرتے۔ اب اسے روز کا معمول سمجھ کر دہشت گردوں سے خوف کھاتے رہتے ہیں۔ سوچتے ہیں' ان دہشت گردوں سے اللہ بچائے گا۔ یا ہمارے راہنما بچائیں گے۔"

حمزہ صاحب نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "اللہ کبھی غافل قوم کو اور بصارت رکھتے ہوئے اندھی بننے والی قوم کو تحفظ نہیں دیتا۔ ایک سامنے کی روشن چمکتی ہوئی سچائی کسی کی سمجھ میں نہیں آتی کہ تمام دہشت گرد ہمارے سیاست دانوں کے بال بچے ہیں۔ سیاست داں اقتدار میں ہوں یا اپوزیشن میں' انہیں حکمرانوں سے حکومت چھیننے اور حکومت کو دہشت گردی کے ذریعے بدنام کرنے کے لیے مسلح غنڈوں اور قاتلوں کی پرورش کرنی پڑتی ہے اور حکمران بھی اپنی حکومت کو برقرار رکھنے اور طول دینے کے لیے اپوزیشن کی دہشت گردی کا جواب اپنے پالتو دہشت گردوں کے ذریعے دیتے ہیں۔ ہم میں اور ان میں یہ فرق ہے کہ ہم اولاد کی پرورش کرتے ہیں اور سیاست داں دہشت گردوں کی دل و جان سے پرورش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ہمارے ملک کے سیاست دانوں کا ایک ہی مخصوص فقرہ ہے۔ جب وہ عوام کے سامنے آتے ہیں تو کہتے ہیں۔ "اب کسی کو دہشت گردی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔"

میں ان کی زبان سے یہ تمام تلخ حقائق سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ واقعی ہم کیسے لوگ ہیں۔ سچائی کو آنکھوں سے دیکھ کر دوسرے ہی لمحے میں فٹ بال اور کرکٹ ورلڈ کپ دیکھنے لگتے ہیں۔ ملک دشمن عناصر کو بڑی حد تک سمجھتے ہیں لیکن تینوں وقت کی دال روٹی کی فکر میں مبتلا ہو کر دشمنوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور یہ دشمن بھی عوامی کمزوریوں کو سمجھتے ہوئے مہنگائی بڑھاتے رہتے ہیں' کسی کو اس دلدل سے نکلنے نہیں دیتے۔ یہ ملک دشمن عناصر کا چیلنج ہے کہ تم اپنے بچوں کو مہنگا ہوتے رہنے والا لباس پہنانے کی فکر میں رہو گے۔ اس طرح ہمیں ننگا کرنے کی تمہیں فرصت نہیں ملے گی۔

ہم سب ایک ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ حمزہ صاحب نے راجہ نواز سے کہا۔ "ہمیں اپنے لائن آف ایکشن میں تھوڑی تبدیلی کرنا چاہیے تم نازاں کے ساتھ اندرونِ سندھ مخصوص علاقوں میں جاتے رہے ہو اور وہاں کی زر خرید پولیس' ڈاکو اور وڈیروں کو ذلیل کرتے اور ہلاک کرتے رہے۔ اسی طرح ان علاقوں میں کاشف اکبر اور رحمان چنا کی سیاسی پوزیشن کمزور ہو گئی ہے۔ تمہارا یہ کارنامہ نیک بخت کی نظروں میں ہو گا۔ وہ چاہے گا کہ تم اس کی طاقت بن کر اسی طرح کاشف اکبر کا ووٹ بینک خالی کرتے رہو۔"

راجہ نواز نے کہا۔ "کیا تم چاہتے ہو کہ میں نیک بخت کا اعتماد حاصل کر کے اس کا تختہ کر دوں؟"

"ہاں۔ یہ اچھا موقع ہے۔ وڈیرے صالح کی بیٹی کا قتل ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ کاشف اکبر اس کے علاقے سے چار سیٹیں حاصل کیا کرتا ہے۔ اب نیک بخت کو پوری ہسٹری معلوم ہو گی کہ تم اس کی بیٹی کو اغوا.......... کر کے سندھ کے کئی علاقوں میں کاشف اکبر کے سیاسی قدم اکھاڑتے رہے ہو۔ نیک بخت تم سے ملنے اور تمہارا پتا اور فون نمبر معلوم کرنے کے لیے بے چین ہو گا۔"

نازاں کو جس آلۂ کار نے گولی ماری تھی' اسے راجہ نواز نے گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا لیکن نازاں کو قتل کرانے والا اصل محرک رحمان چنا تھا۔ راجہ نواز نے کہا۔ "میں نازاں کے قتل کے سلسلے میں زر خرید قاتلوں کو ہلاک کر چکا ہوں لیکن اصل قاتل رحمان چنا ہے۔ میں اسے ہلاک کروں گا تو نیک بخت کی نظروں میں میری اہمیت اور بڑھ جائے گی۔"

حمزہ صاحب نے کہا۔ "یہی میں تم سے کہنے والا تھا۔ تم ابھی فون کے ذریعے نیک بخت سے رابطہ کرو۔ گفتگو کے دوران میں اسے یہ بتا دو کہ آج شام تک کاشف اکبر کے سب سے اہم مہرے رحمان چنا کو تم قتل کر دو گے۔"

میں نے اور راجہ نواز نے حیرانی سے انہیں دیکھا پھر میں نے پوچھا۔ "کیا اسے قتل کرنا آسان ہے۔ میں نے سنا ہے' اس کی محل نما کوٹھی کے چاروں طرف مسلح گارڈز کا پہرا رہتا ہے۔ کوئی اجنبی وہاں قدم نہیں رکھ سکتا۔"

راجہ نے بڑے یقین سے کہا۔ "جب حمزہ کہہ رہا ہے کہ آج شام تک رحمان چنا جہنم میں پہنچ جائے گا تو پھر یہ میرا یار جہنم کا دروازہ کھول کر آیا ہو گا۔"

"ہاں' میں ابھی وہاں گیا تھا۔ تمام مسلح گارڈز اور گھریلو ملازم رحمان چنا کے وفادار ہیں۔ وہاں کسی مخالف کی سازش کام نہیں آئے گی پھر بھی میں نے ایک ایسے ملازم کو شیشے میں اتارا ہے' جو ہمارا یہ کام ہر حال میں کرے گا۔"

میں نے اس وقت یہ نہیں پوچھا کہ کسی وفادار ملازم کو اپنے آقا کے خلاف کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔ راجہ نواز کو یقین تھا کہ جو حمزہ صاحب نے کہہ دیا ہے' وہ پتھر کی لکیر ہے۔ شام تک دیکھا جائے گا کہ رحمان چنا کا آخری وقت کیسے آئے گا؟

حمزہ صاحب نے ایک موبائل فون پر نیک بخت کے نمبر پنچ کیے۔ وہ اسلام آباد میں تھا۔ رابطہ ہونے پر راجہ نواز نے اس فون کو کان سے لگا کر کہا۔ "میرا نام راجہ نواز ہے۔ آپ کون ہیں؟"

"میں نیک بخت کا پرسنل سیکرٹری ہوں۔ کیا آپ صاحب کو کوئی پیغام دینا چاہتے

ہیں؟"

"میں خود ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"وہ ایک اہم میٹنگ میں مصروف ہیں۔"

"آپ ان کے سامنے میرا نام لیں' وہ نام سنتے ہی اہم میٹنگ بھی ملتوی کر دیں گے۔"

"آل رائٹ! آپ ہولڈ کریں۔"

تھوڑی دیر بعد نیک بخت کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو! کیا واقعی تم راجہ نواز ہو؟"

"میری ممی زندہ ہوتیں تو یقین دلاتیں کہ انہوں نے ہی راجہ نواز کو سیاست دانوں کی خدمت کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔"

"یہ گفتگو کا کون سا انداز ہے؟ مجھ سے گفتگو کرتے وقت یاد رکھو کہ میں کبھی اس ملک کا سربراہ رہ چکا ہوں اور آئندہ بھی اقتدار حاصل کرنے والا ہوں۔"

"آئندہ کی باتیں میں نہیں جانتا' نجومی جانتے ہیں۔ فی الحال اتنا جانتا ہوں کہ نہ تم وزیر ہو' نہ فقیر ہو۔ بس ایک بازیگر ہو۔ جیت بھی سکتے ہو' ہار بھی سکتے ہو۔ میں تم سے اچھی بازیاں کھیلتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہو چکا ہو گا کہ میں نے کاشف اکبر کو اندرونِ سندھ کس طرح سیاسی طور پر کمزور بنا دیا ہے۔"

"مجھے تمہاری پوری ہسٹری معلوم ہو چکی ہے۔ پہلے ہم سمجھتے تھے کہ امیر حمزہ اور راجہ نواز ایک ہی شخص کے دو نام ہیں لیکن امیر حمزہ کے لندن میں رہنے کے دوران میں تم نے ایک وڈیرے ایم این کی بیٹی نازاں کو اغوا کیا۔ اس کے بعد جو کچھ کرتے رہے' اس کے نتیجے میں میری سیاسی پوزیشن وہاں مضبوط ہو رہی ہے۔"

"میں شام تک کاشف اکبر کے سب سے اہم مہرے رحمان چنا کو قتل کر دوں گا تو تمہاری سیاسی پوزیشن اور مضبوط ہو جائے گی۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا واقعی تم رحمان چنا کو قتل کر دو گے؟ اس کی رہائش گاہ کے احاطے میں کوئی پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا اور تم اتنا بڑا دعویٰ کر رہے ہو؟"

"تمہارے اطراف بھی زبردست سیکورٹی رہتی ہے۔ جب شام تک رحمان چنا کے قتل کی خبر مل جائے تو یقین کر لینا کہ تمہاری سیکورٹی کو بھی خاک میں ملا کر تمہاری شہ رگ تک پہنچ سکتا ہوں۔ میرا سب سے دلچسپ مشغلہ یہی ہے حمزہ کا فرض ہے کہ اسے ... ہتا
ن ہے تو اس کی بھی انتخابی مہم کو
ہوں۔"

"میں شام تک دیکھوں گا کہ تم ناممکن کو کیسے اگر وہ راجہ نواز کو ختم کر دے گا تو

خفیہ ہاتھ کی پشت پناہی بھی نیک بخت کے کام نہیں آئے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی امیر حمزہ سے رابطہ کر رہا ہوں۔"

اس نے فون بند کر کے امیر حمزہ کے موبائل فون پر رابطہ کیا۔ ایک جانباز نے کہا۔ "وہ موجود نہیں ہیں اور ہمیں بتایا نہیں جاتا ہے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔"

دوپہر کو کھانے کا وقت ہوا تو رحمان چنا کے بوڑھے ملازم نے اس کے لیے میز پر کھانا لا کر رکھا پھر اس کے کھانے کے دوران بولا۔ "حضور! میں آپ کا پرانا نمک خوار ہوں۔ آپ کے جائز اور ناجائز احکامات کی تعمیل کرتا ہوں۔ کبھی یہ نہیں سوچتا کہ غلطی یا جرم کر رہا ہوں۔ آپ کو خوش رکھنے کے لیے اپنے ضمیر کو کچل دیتا ہوں۔"

رحمان چنا نے لقمہ چباتے ہوئے پوچھا۔ "تم اتنی لمبی باتیں کیوں کر رہے ہو؟ کچھ کہنا چاہتے ہو تو سیدھی اور مختصر بات کرو۔"

"حضور! آپ کو یاد ہوگا۔ ایک دن وڈیرا کمال صالح اور جمال صالح آئے تھے۔ کاشف اکبر صاحب انہیں یقین دلانا چاہتے تھے کہ انہوں نے ان کی بیٹی کو اغوا............ نہیں کیا ہے۔"

"ہاں وہ باپ بیٹے مصیبت بن گئے تھے۔ ہم انہیں ناراض بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے کاشف صاحب کو قرآن مجید ہاتھ میں لے کر قسم کھانی پڑی کہ انہوں نے نازاں کو اغوا نہیں کرایا ہے۔"

"لیکن وہ قرآن مجید نہیں تھا۔ میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے جزدان میں سے قرآن مجید کو نکال کر ایک موٹی سی انگریزی لغت رکھ دی تھی۔"

رحمان چنا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہاں ہم نے ان باپ بیٹے کو خوب بے وقوف بنایا تھا۔ اسمبلیوں میں اپنی اکثریت برقرار رکھنے کے لیے قرآن مجید ہاتھ میں اٹھانے کا فراڈ کیا تھا۔"

"لیکن اس دن سے میرا ضمیر' میرا ایمان مجھے اندر ہی اندر مار رہا ہے۔ میں نے دنیا اور دین کی سب سے مقدس کتاب کی جگہ ایک لغت رکھ کر دو انسانوں کو دھوکا دیا اور یہ بھول گیا کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟"

"یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"سچ کہتا ہوں۔ اس کے دوسرے دن میرا جوان بیٹا حادثے میں مارا گیا۔ میری بیوی جوان بیٹے کے غم میں پاگل ہو گئی۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرے دماغ میں پھوڑا ہو گیا ہے جیسے مجھے سزا مل رہی ہے۔ میں تنہائی میں پاگلوں کی طرح بہکی بہکی باتیں کرتا رہتا ہوں۔"

"تم اس وقت بھی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ کوئی دوسری بات کرو' یا خاموش رہو۔"

بوڑھے ملازم نے ایک ڈش اٹھا کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "اسے آپ نے چکھ کر نہیں دیکھا ہے یہ بہت لذیذ ہے۔"

رحمان چنا نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

اس نے ڈش.......... کا ڈھکن اٹھایا پھر ایک دم سے چونک گیا۔ اس میں ایک بم رکھا ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ملازم کے ہاتھ میں ایک ریموٹ کنٹرول تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "حضور! ڈھکن کو واپس نہ رکھنا۔ میری انگلی کے نیچے یہ بٹن دب جائے گا۔"

وہ خوفزدہ ہو کر بولا۔ "تم برسوں سے میرے وفادار ملازم رہے ہو۔ کیا میری جان لینا چاہتے ہو؟"

"میں مرنا چاہتا ہوں۔ مجھ پر قرآن مجید کی مار پڑتی رہی اور میں سمجھتا نہیں تھا۔ آج ایک فرشتے نے صبح مجھ سے مل کر سمجھایا کہ قرآن مجید کو مذاق سمجھنے والے رحمان چنا کے ساتھ جان دو گے اور دنیا میں اتنی بڑی غلطی کی تلافی کرو گے تو عاقبت میں اللہ کریم مجھے معاف کرے گا۔"

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ بٹن پر سے انگلی ہٹاؤ۔ تمہیں کس فرشتے نے بے وقوف بنایا ہے؟"

"اس نے عقل سکھائی ہے۔ میں اس فرشتے کو نہیں جانتا۔ ویسے وہ اپنا نام راجہ نواز بتا رہا تھا؟"

"نہیں۔" رحمان چنا کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ اس وقت اس بوڑھے ملازم نے اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے بٹن دبا دیا۔ یکبارگی کان پھاڑ دینے والا دھماکا دور تک گونج اٹھا۔ اس محل نما کوٹھی میں بھگدڑ ہونے لگی۔ پہلے تو تمام سیکورٹی گارڈز دہشت زدہ ہو کر کوٹھی سے دور بھاگے پھر دیر تک خاموشی رہی تو واپس آئے۔ کوٹھی کے اندر جا کر دیکھا۔ ڈرائنگ اور ڈائننگ روم کھنڈر بن چکے تھے اور دو انسانی جسموں کے اعضا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر دور تک بکھرے پڑے تھے اور بڑی بے زبانی سے کہہ رہے تھے۔

اپنی ہستی پہ نہ اترائے کوئی کوہ غرور
وقت نے پھینک دیئے ایسے اٹھا کر کتنے

☆======☆======☆

نیک بخت اپنے مشیروں کے سامنے بیٹھا فون کے ذریعے خفیہ ہاتھ سے کہہ رہا تھا۔

"بے شک آپ بھی یہی سمجھتے رہے ہے کہ امیر حمزہ اور راجہ نواز ایک ہی شخص کے نام ہیں۔ لیکن ابھی میں نے فیکس کے ذریعے راجہ نواز کے کارناموں کی تفصیل ارسال کی ہے۔ کیا آپ نے اسے پڑھا ہے؟"

"میں نے پڑھا ہے۔ اس نے بڑے غیر معمولی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اس کے کارناموں کے باعث سندھ میں تمہاری کامیابی کی راہیں ہموار ہو رہی ہیں۔ اس راجہ نواز کو کسی بھی قیمت پر خریدو۔ یہ بہت کام آتا رہے گا۔"

نیک بخت نے کہا۔ "راجہ نواز کی ہسٹری فیکس کرنے کے بعد ایک چونکا دینے والی خبر ملی ہے۔ راجہ نواز نے صبح مجھے فون پر کہا تھا کہ وہ سخت سے سخت پہرے کے باوجود آج شام تک رحمان چنا کو قتل کردے گا اور ابھی معلوم ہوا ہے کہ رحمان چنا کو اس کی کوٹھی کے اندر بم دھماکے سے اُڑا دیا گیا ہے۔ اس کی ہستی کو مٹا کر راجہ نواز نے ناممکن کو ممکن بنادیا ہے۔"

خفیہ ہاتھ نے کہا۔ "پھر تو وہ صرف خطرناک ہی نہیں' نہایت چالباز اور بہترین منصوبے بنانے والا شخص ہے۔ اب ہم اسے اپنے لیے خریدنا چاہیں گے۔ راجہ نواز سے ہماری بات کراؤ۔"

"وہ آج رات آٹھ بجے مجھ سے رابطہ کرے گا۔ میں اسے آپ کی ایک ایجنسی کا فون نمبر دوں گا۔ آپ سے گزارش ہے کہ الیکشن میں میری کامیابی تک اسے میرے لیے کام کرنے کی اجازت دیں۔"

"الیکشن میں تمہاری کامیابی یقینی ہے۔ خدا بندوں کی تقدیریں لکھتا ہے۔ ہم سیاست دانوں کا مقدر بناتے ہیں۔ ہم جو کہہ رہے ہیں' وہ کرو۔ ہم تمہارے ملک کے وقت کے مطابق راجہ نواز سے فون پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔"

ادھر سے فون بند ہوگیا۔ نیک بخت نے خوش ہو کر ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔ "سر نے آج بھی یہی کہا ہے کہ الیکشن میں میری کامیابی یقینی ہے اور راجہ نواز کے ستارے بھی عروج پر ہیں۔ سر اسے اپنی خفیہ ایجنسیوں میں سے کسی ایک ایجنسی میں کوئی بہت ہی اہم عہدہ دینے والے ہیں۔"

ایک مشیر نے کہا۔ "ہمیں خفیہ ہاتھ کی یقین دہانی پر شبہ نہیں ہے۔ آئندہ آپ ہی اقتدار حاصل کریں گے لیکن امیر حمزہ کی طرف سے آپ کی جان کو خطرہ ہے۔ اسے انیلا کو قتل کیے جانے کا یقین ہوگیا ہے۔ وہ آپ سے انتقام ضرور لے گا۔"

"میں سر سے یہی بات کہنا چاہتا تھا کہ کچھ عرصے تک راجہ نواز کو میرا باڈی گارڈ بنا

دیا جائے۔ وہ امیر حمزہ کو میرے قریب نہیں آنے دے گا لیکن سر نے میری پوری بات نہیں سنی۔ وہ راجہ نواز کے حیرت انگیز کارناموں سے بہت ہی متاثر ہیں۔ اسے فوراً اپنی کسی خفیہ ایجنسی میں بلائیں گے۔"

دوسرے مشیر نے کہا۔ "اس میں شبہ نہیں ہے کہ راجہ نواز نے کاشف اکبر کے پیروں تلے سے زمین نکال دی ہے۔ اب وہ سندھ کے صوبے میں نیا پارٹی لیڈر لائے گا۔ رحمان چنا کی جگہ دوسرے لیڈر کو اس صوبے میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوگی۔ ہماری پارٹی کا سندھی لیڈر اس کی الیکشن مہم پر حاوی رہے گا۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سیکرٹری نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف کی باتیں سنیں پھر ریسیور نیک بخت کو دیتے ہوئے کہا۔ "ہماری ایجنسی کا انچارج ہے۔"

نیک بخت ریسیور کان سے لگا کر بولا۔ "ہاں بولو۔"

"جناب عالی! کل کے اخبارات میں کاشف اکبر کا یہ بیان جلی حرفوں میں شائع ہونے والا ہے کہ نیک بخت کی سیاسی حکمتِ عملی نے اس کے صوبائی پارٹی لیڈر رحمان چنا کو قتل کیا ہے کیونکہ رحمان چنا پورے سندھ میں مقبول اور ہر دلعزیز تھا اور الیکشن میں کاشف اکبر کو ووٹوں کی اکثریت حاصل ہو رہی تھی۔"

نیک بخت نے کہا۔ "یہ پرانی سیاست ہے کہ اپنے اہم پارٹی لیڈروں کے قتل کا الزام مخالف پارٹی پر لگایا جاتا ہے۔ ہم اس کا جواب دیں گے۔"

اس نے ریسیور رکھ کر سیکرٹری سے کہا۔ "نوٹ کرو۔"

سیکرٹری کاغذ قلم لے کر نوٹ کرنے لگا۔ نیک بخت نے کہا۔ "رحمان چنا کے بیوی بچوں کو ہماری طرف سے تعزیتی ٹیلی گرام دو۔ تمام اخبارات کے رپورٹرز اور فوٹوگرافرز کو رات آٹھ بجے پریس کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت دو۔ رات آٹھ بجے کا مطلب ہے کہ ہماری طرف سے بہترین ڈنر پارٹی ہوگی اور جو بکنے والے رپورٹرز ہیں انہیں بھرے ہوئے لفافے بھی ملیں گے۔"

سیکرٹری لکھ رہا تھا اور وہ ڈکٹیٹ کرا رہا تھا۔ "پریس کانفرنس کے لیے ہماری تقریر لکھواؤ۔ جس میں اہم بات یہ کہی جائے گی کہ امیر حمزہ لندن میں تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ ایک وڈیرے ایم این اے کی ایک شریف بیٹی کو رحمان چنا نے اغوا کرایا ہے تو وہ لندن سے واپس آگیا حالانکہ وہ ایم این اے رحمان چنا کی پارٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ جب نازاں بیمار ہوئی تو رحمان چنا نے مجبور ہو کر اسے اس کے ایک فرضی شوہر راجہ نواز کے نام سے اسپتال میں داخل کرا دیا۔ اسے یہ خوف تھا کہ امیر حمزہ کی آمد پر نازاں کو مضبوط

سہارا ملے گا تو وہ رحمان چنا کی اصلیت بیان کردے گی۔ اس اندیشے کے باعث نازاں کو اسپتال میں قتل کرادیا گیا۔ اس کے نتیجے میں رحمان چنا زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ شبہے کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ امیر حمزہ نے رحمان چنا کو قتل کیا ہے۔"

سیکرٹری تیزی سے لکھ رہا تھا۔ وہ روانی سے بول رہا تھا۔ "امیر حمزہ نے ایک طویل عرصے سے میرے خلاف محاذ بنا رکھا ہے۔ پہلے اس نے میرے خلاف یہ اسکینڈل کھڑا کیا کہ میں نے انیلا بانو کو قتل کیا ہے لیکن لندن کی پولیس اور انٹیلی جنس والے گواہ ہیں کہ اس نے انیلا بانو کو اپنی داشتہ بنا کر رکھا تھا۔ جب میں پاکستان واپس آیا تو پتا چلا کہ اس نے انیلا کو قتل کردیا ہے۔ امیر حمزہ نے یہاں آکر خود مجھے فون پر دھمکی دی ہے کہ نہ وہ میری الیکشن مہم کو کامیاب ہونے دے گا اور نہ ہی کاشف اکبر کو اقتدار حاصل کرنے دے گا۔ اس نے کاشف اکبر کے دستِ راست کو قتل کرکے مجھے کہا ہے کہ رحمان چنا کی ہلاکت کے بعد اب میری باری ہے لیکن میں بزدل نہیں ہوں۔ میں اپنے ملک اور قوم کی خدمت کرنے کے لیے سر پر کفن باندھ کر آیا ہوں۔ میرے منشور میں جو پہلی بات لکھی گئی ہے' وہ یہ ہے کہ عوام کی بھرپور حمایت سے اقتدار حاصل کرتے ہی اسلامی نظام نافذ کرکے اس ملک خداداد کو قیامت تک قائم رکھنے کی ضمانت دوں گا۔"

جب وہ سیکرٹری کو یہ باتیں ڈکٹیٹ کرا رہا تھا' اس وقت سہ پہر کے تین بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ میں حمزہ صاحب کے ساتھ ایک فلائٹ سے اسلام آباد جارہا تھا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے اپنے جانبازوں سے میرا تعارف کرایا۔ کئی جانباز انہیں نیک بخت اور کاشف اکبر کی مصروفیات کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرنے لگے۔

حمزہ صاحب نے پوچھا۔ "ابھی چھ بجے ہیں۔ آٹھ بجے پریس کانفرنس میں ہمارے کتنے ساتھی ہوں گے؟"

ایک نے کہا۔ "میں وہاں رپورٹر کی حیثیت سے رہوں گا اور ادریس فوٹوگرافر بن کر جائے گا۔"

حمزہ صاحب نے کہا۔ "نیک بخت کے محل میں جب بھی ظہرانہ یا عشائیہ دیا جاتا ہے پریس کانفرنس ہوتی ہے تو اس کا ایک قابلِ اعتماد ماتحت خالد لطیف لذیذ کھانوں کا انتظام کرتا ہے۔ کھانا کھلانے والے باوردی ملازمین کی بھی وہ نگرانی کرتا ہے۔ تم میں سے کون خالد لطیف کی گھریلو زندگی کے بارے میں زیادہ جانتا ہے؟"

ایک جانباز نے کہا۔ "سر! نیک بخت کے محل کے پیچھے چار چھوٹے بنگلے ہیں۔ وہاں کے ایک بنگلے میں خالد لطیف اپنی ایک بیوی اور بارہ برس کے بیٹے کے ساتھ رہتا ہے۔"

"کیا وہ چاروں بنگلے ایک قطار میں ہیں؟"

"نو سر! ہر بنگلے کے درمیان تقریباً پچیس گز کا فاصلہ ہے۔"

"تم اپنے دو یا تین ساتھیوں کے ساتھ جاؤ۔ اس کی بیوی اور بیٹے کو گن پوائنٹ پر رکھو' دروازے کو لاک کرکے بنگلے میں اندھیرا کردو۔ اگر باہر سے کوئی ملاقات کرنے والے رشتے دار آئیں گے تو یہی سمجھیں گے کہ ماں بیٹے کہیں شاپنگ وغیرہ کے لیے گئے ہیں۔"

"یس سر! میں ابھی جاتا ہوں۔"

"ٹھیک سات بجے خالد لطیف کو فون کرو کہ اس کی بیوی اور اکلوتا بیٹا کسی لمحے بھی مرسکتے ہیں۔ اسے یقین دلانے کے لیے اسے فون پر بیوی اور بیٹے کی آواز سناؤ اور کہو کہ وہ زبان بند رکھے۔ چہرے سے پریشانی ظاہر نہ کرے۔ اگر وہ احکامات کی تعمیل کرتا رہے گا تو بیوی اور بیٹا بھی محفوظ رہیں گے اور نیک بخت کو بھی اس کی وفاداری پر شبہ نہیں ہوگا۔"

"یس سر! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں اور فرمان وردی پہن کر بیرے بن کر جائیں گے۔ ایسی پریس کانفرنسوں میں پارٹی کے بہت بڑے بڑے لیڈر بھی آتے ہیں۔ ان کی پرائیویٹ دعوت محل کے اندر ہوتی ہے کیونکہ وہ اخبار والوں سے چھپ کر شراب پیتے ہیں۔ تم خالد لطیف سے کہو گے کہ حمزہ اور فرمان ان خاص مہمانوں کے بیرے بن کر محل کے اندر رہیں گے اور محل کے جس حصے میں جائیں گے' وہاں ان کے جانے پر نہ وہ اعتراض کرے گا اور نہ ہی نیک بخت کو خفیہ سگنل دے گا۔"

ایسے منصوبے میرے لیے نہایت سنسنی خیز تھے۔ میں حمزہ صاحب کی پلاننگ کو توجہ سے سن رہا تھا۔ وہ دوسرے جانبازوں کو بھی اس سلسلے میں ضروری ہدایات دے رہے تھے۔ یوں تو میں نے مرحوم مراد چنگیزی سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اب حمزہ صاحب کے سامنے یوں لگ رہا تھا کہ میں دریا میں تیرتا ہوا سمندر میں غوطے لگانے آگیا ہوں۔

سات بج کر بیس منٹ پر ہم نے بیروں کی وردی پہن لی تھی۔ حمزہ صاحب نے موبائل فون کے ذریعے پوچھا۔ "کیا پوزیشن ہے؟"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "سر! سچویشن اپنی پلاننگ کے مطابق ہے۔ خالد لطیف بیوی اور بیٹے کی آوازیں فون پر سن کر یقین کرچکا ہے کہ اس کی خاموشی ہی بیوی اور بیٹے کو زندہ رکھے گی۔ آپ کے لیے راستہ صاف ہے۔"

انہوں نے فون بند کیا۔ ہم اس محل کے احاطے میں تھے۔ وردی کے باعث کوئی ہم پر شبہ نہیں کرسکتا تھا۔ خالد لطیف شاہی کچن میں مصروف تھا اور پریشان بھی۔ حمزہ نے اس کے قریب جا کر کہا۔ "میں حمزہ ہوں اور یہ فرمان۔"

وہ ہمیں دیکھ کر جبراً مسکرانے لگا۔ انہوں نے کہا۔ "تمہیں فون پر کہا گیا ہوگا کہ چہرے سے پریشانی ظاہر نہیں کرو گے لیکن تم پریشان نظر آرہے ہو۔"

وہ بولا۔ "میں کوشش کر رہا ہوں۔ دیکھیے حمزہ صاحب وہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اب میری بیوی ماں نہیں بن سکے گی۔ اگر اسے کچھ ہوگیا تو ہم میاں بیوی زندہ نہیں رہ سکیں گے۔"

"خالد میاں! شیطان کی غلامی کرتے ہوئے خطرات مول لینے پڑتے ہیں اور خطرات سے بچنے کے لیے اپنی ساری دولت لٹا دینی پڑتی ہے۔ تمہیں ایک پیسہ بھی نہیں لٹانا ہے۔ بیٹے کو زندہ رکھنے کے لیے صرف مسکراتے رہنا اور ہشاش بشاش نظر آتے رہنا ہے۔"

وہ عاجزی سے بولا۔ "میں یہی کروں گا۔"

"تم نہیں کر رہے ہو۔ ابھی تمہارے عمل سے عاجزی ظاہر ہو رہی ہے۔"

وہ فوراً ہنستے ہوئے بولا۔ "میں خوش رہوں گا۔ اسی طرح ہنستے بولتے ہوئے اللہ کے بعد آپ پر اعتماد کرتا رہوں گا کہ میرے اکلوتے بیٹے کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"ہم ابھی محل کے اندر شراب کی ٹرالیاں لے جا کر بڑے بڑے لیڈران کی خدمت کر رہے ہیں۔ جب نیک بخت کانفرنس ہال میں جائے تو دوسرے چار ویٹروں کو عمل میں لے آؤ اور ہمیں دوسرے کام سے بلا کر نیک بخت کی خواب گاہ میں پہنچا دو۔ رائٹ؟"

"رائٹ سر! میں یہی کروں گا۔"

ہم دونوں شراب کی ٹرالیاں' خشک میوے اور تازہ پھلوں کی ٹرالیاں لے کر محل کے بڑے سے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ بڑے لیڈروں کے ساتھ نیک بخت بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "آپ حضرات جانتے ہیں کہ مجھے ابھی اخبار والوں کے سامنے کانفرنس ہال میں جانا ہے۔ میں شراب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ آپ شروع کریں۔ پریس کانفرنس کے بعد میں آپ کا ساتھ دوں گا۔"

آٹھ بجے سے پہلے راجہ نواز نے فون پر نیک بخت کو مخاطب کیا۔ وہ فون کان سے لگائے لیڈروں کے پاس سے اٹھ کر ہماری طرف آیا۔ ہم دونوں تربیت یافتہ بیروں کی طرح مؤدب کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے کہا۔

"ہیلو راجہ نواز' تم نے ایسا کمال کیا ہے جس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ہم حیران ہیں

کہ تم نے ناممکن کو ممکن کیسے بنا دیا؟"

"یہ میرا طریقۂ کار ہے۔ سوری میں اپنا لائن آف ایکشن کسی کو نہیں بتاتا۔ جس بات کا ارادہ کرلیتا ہوں' اسے کر گزرتا ہوں۔"

"بے شک' بے شک۔ یہ تو تم ثابت کر چکے ہو۔ میں تمہیں ایک بہت بڑی خوشخبری سنا رہا ہوں۔ عالمی سیاست کا خفیہ کھلاڑی ہاتھ تمہارے کارناموں سے متاثر ہے۔ وہ تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

راجہ نواز نے انجان بن کر پوچھا۔ "یہ عالمی سیاست کے خفیہ کھلاڑی ہاتھ کا مطلب کیا ہے؟ اتنا تو سمجھ میں آرہا ہے کہ یہ کوئی زبردست خفیہ سیاست داں ہوگا جو سب پر بھاری پڑتا ہوگا۔ یا خود کو بھاری بھرکم سمجھتا ہوگا۔"

"سمجھتا ہوگا نہیں' واقعی بھاری بھرکم ہے۔ یوں سمجھو سیاست کا پہاڑ ہے' جس کی قوت اور بلندی تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ وہ ترقی پذیر ممالک میں اور تیسری دنیا کے ممالک میں اپنی مرضی کی حکومتیں قائم کرکے آدھی سے زیادہ دنیا کا حکمران بنا ہوا ہے۔"

"پھر تو اس کی طاقت' دولت' ذرائع اور اختیارات کی کوئی انتہا نہیں ہوگی۔"

"کوئی انتہا نہیں ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں اس کی کئی خفیہ ایجنسیاں ہیں۔ ان ایجنسیوں میں تمہارے جیسے ذہین' دلیر' چالاک اور منصوبہ ساز ایجنٹس ہیں۔ وہ خفیہ ہاتھ تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر تم اس کے خفیہ ایجنٹ بن جاؤ گے تو تمہاری دولت اور طاقت میں تو اضافہ ہوگا ہی اس کے علاوہ تم لامحدود ذرائع کے مالک بن جاؤ گے۔ کسی بھی ملک کا قانون تمہیں اپنی گرفت میں نہیں لے گا کیونکہ تم ایسے ہی ملکوں میں کام کرو گے' جن کے حکمران اور قانون ساز خفیہ ہاتھ کے سامنے گھٹنے ٹیکتے رہتے ہیں۔"

"آپ نے تو بہت بڑی بات کہہ دی ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آدھی سے زیادہ دنیا پر حکومت کرنے والا میری خدمات حاصل کرنا چاہے گا۔ آپ درست کہہ رہے ہوں گے مگر مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا ہے۔"

نیک بخت نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہارے کان درست سن رہے ہیں۔ تمہارے ستارے عروج پر ہیں۔ میں اتنا ہی چاہوں گا کہ عروج پر پہنچ کر مجھے بھول نہ جانا۔"

"جس دن عالمی سیاست کی کھچڑی پکانے والے کچن خانساماں تک پہنچ جاؤں گا۔ تمہیں پیرو مرشد مان لوں گا اور تمہاری ہر ضرورت کے وقت کام آؤں گا۔"

نیک بخت نے خفیہ ہاتھ کے چار مختلف فون نمبر نوٹ کرائے پھر کہا۔ "ابھی خفیہ

ہاتھ سے رابطہ کر لو۔ میں یہاں مصروف ہوں۔ بعد میں تم سے رابطہ کروں گا۔"

اس نے فون بند کیا۔ سیکرٹری آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "سر! کانفرنس ہال میں آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔"

وہ اپنی پارٹی کے بڑے لیڈران سے رخصت ہو کر کانفرنس ہال کی طرف جانے لگا۔ خالد لطیف دو بیروں کے ساتھ آکر حمزہ سے بولا۔ "یہ دونوں یہاں خدمات انجام دیں گے۔ تم دونوں میرے ساتھ آؤ۔"

ہم اس کے پیچھے ادب سے چلتے ہوئے دوسرے کمرے میں آئے پھر محل کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے نیک بخت کی خواب گاہ میں پہنچ گئے۔ حمزہ صاحب نے خالد لطیف سے کہا۔ "تم جاؤ' ہمیں یہاں سے جانے کے لیے تمہارے سہارے کی ضرورت پڑے گی تو ہم تمہارے پاس آئیں گے۔"

وہ چلا گیا۔ حمزہ صاحب نے ایک بڑے سے آئرن سیف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "اپنا کام دکھاؤ۔ اس سیف کو کھولو۔"

میں سیف کی طرف گیا۔ انہوں نے موبائل کے ذریعے راجہ نواز کو مخاطب کیا۔ "میں نے تمہاری اور نیک بخت کی باتیں سنی ہیں۔ کیا تم خفیہ ہاتھ سے رابطہ کر رہے ہو؟؟"

"رابطہ کرنا چاہیے لیکن میں تمہاری کال کا انتظار کر رہا تھا۔"

"تم اس سے ضرور معاملات طے کرو مگر یہ کہو کہ تم تنہا نہیں ہو۔ تمہارا ایک دستِ راست ہے' اسے ہر مہم پر ساتھ رکھتے ہو۔ اس دستِ راست کا کوئی فرضی نام بتا دو۔"

"ٹھیک ہے' اور کچھ؟"

"نہیں۔ باقی تم اپنے طور پر سوچ سمجھ کر معاملات طے کرو۔"

انہوں نے فون بند کیا پھر میرے قریب آئے۔ میں ایسی چابیوں کا گچھا لے کر آیا تھا جو عام چابیوں سے مختلف تھیں۔ اس کے علاوہ چار عدد موٹے اور پتلے تار تھے۔ ایک لوہار کی حیثیت سے میں بڑے بڑے خفیہ تالوں اور آہنی تجوریوں سے کھیلنا جانتا تھا۔ میں نے صرف ایک منٹ میں اس سیف کے خفیہ تالے کو کھول لیا تھا مگر وہاں ڈبل تالے تھے۔ دوسرا تالا نمبروں کی خاص ترتیب سے کھولا جا سکتا تھا۔ میں نے ریوالور میں سائلنسر لگایا۔ حمزہ صاحب نے بستر سے دو تکیے اٹھا کر میرے ریوالور کو اوپر نیچے سے ڈھانپ دیا پھر میں نے یکے بعد دیگرے تین فائر اس لاک پر کیے۔ ہلکا سا کھٹکا سنائی دیا۔ میں نے سیف کے ہینڈل کو پکڑ کر دبایا اور کھینچا تو سیف کا پٹ کھل گیا۔

اندر اوپر سے نیچے تک کئی خانوں میں بہت کچھ تھا۔ زیورات اور نوٹوں کی گڈیوں

کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے آڈیو اور ویڈیو کیسٹس کو نکال کر ایک بیگ میں رکھا۔ حمزہ صاحب کئی دستاویزات اور فائلوں پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے انہیں میری طرف بڑھاتے رہے۔ میں انہیں بیگ میں رکھتا گیا۔ منی ویڈیو کیسٹس اور مائیکرو فلمیں اور چند ڈائریاں تھیں۔ ہم نے وہ سب کچھ رکھ لیا پھر وہاں سے چلتے ہوئے خواب گاہ سے نکل کر خالد لطیف کے پاس آئے۔ حمزہ صاحب نے کہا۔ "ہمارے پاس بیگ ہے۔ سیکورٹی والے باہر جاتے وقت اسے چیک کریں گے۔ تم اپنی کار میں محل کے احاطے سے باہر لے چلو۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ ہمیں اپنی کار میں بٹھا کر احاطے کے گیٹ پر آیا۔ وہاں کھڑے ہوئے گارڈز نے خالد لطیف کو دیکھ کر سلیوٹ کیا پھر بڑے آہنی گیٹ کو کھول دیا۔

حمزہ صاحب نے فون پر اپنے جانباز سے کہا۔ "خالد لطیف نے ہم سے تعاون کیا ہے۔ اس کی بیوی اور بیٹے کو چھوڑ کر اس بنگلے سے چلے جاؤ۔ میں دس منٹ کے بعد خالد لطیف کو واپس جانے دوں گا۔"

حمزہ صاحب نے ایک مارکیٹ کے پارکنگ ایریا میں اپنی کار کھڑی کی تھی۔ انہوں نے پھر فون پر کسی سے رابطہ کر کے کہا۔ "ہم خالد لطیف کی کار سے اتر کر اپنی کار میں جا رہے ہیں۔ اگر خالد لطیف دس منٹ سے پہلے یہاں سے جائے تو اسے گولی مار دینا۔ دور سے اس پر نظر رکھو۔ تاکہ یہ کسی سے موبائل فون پر رابطہ نہ کر پائے۔"

ہم اپنی کار میں آئے۔ حمزہ صاحب اسے ڈرائیو کرتے ہوئے ایک خفیہ رہائش گاہ کی طرف جانے لگے۔ اس وقت نیک بخت کانفرنس ہال میں تقریر کے دوران میں حمزہ صاحب کے خلاف زہر اگل رہا ہو گا اور ملک و قوم کے لیے اپنے لہو کا آخری قطرہ تک بہا دینے کی قسمیں کھا کر تالیوں کی گونج میں داد وصول کر رہا ہو گا۔

ہم نے رہائش گاہ میں پہنچ کر آڈیو کیسٹس سنیں۔ ان میں بہت اہم فون کالیں ٹیپ کی ہوئی تھیں۔ نیک بخت نے خفیہ ہاتھ سے بھی جو اہم راز داری کی باتیں کی تھیں' انہیں بھی خفیہ ریکارڈر کے ذریعے ٹیپ کیا گیا تھا۔ ایک آڈیو کیسٹ میں خفیہ معاہدے والی مختصر سی باتیں بھی تھیں اور خفیہ ہاتھ نے نیک بخت کو یہ خوشخبری سنائی تھی کہ انیلا بانو کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔ اب وہ بے خوف و خطر اپنی الیکشن مہم کو جاری رکھ سکے گا۔

ٹی وی اسکرین پر کئی ویڈیو فلمیں اِدھر اُدھر سے آگے بڑھا کر دیکھی گئیں۔ ان میں چند بڑی شخصیات کے گناہ آلود مناظر تھے' جن کے ذریعے انہیں بلیک میل کیا جاتا تھا اور وہ مجبور ہو کر اسمبلیوں میں نیک بخت کی حمایت کر کے وہاں اس کے حمایتیوں کی اکثریت قائم رکھتے تھے۔

چند ایسے کاغذات تھے جن پر نیک بخت کے چند حمایتی ایم این اے اور ایم پی اے نے اپنے گناہوں اور قتل جیسے بڑے جرائم کا اعتراف کیا تھا۔ اپنے دستخط کے علاوہ انگوٹھے کے نشانات بھی لگائے تھے۔

یہ سب میرے لیے نئے تجربات تھے۔ میں گناہوں اور جرائم کی دنیا کے بڑے عجیب و غریب واقعات سے واقف ہو رہا تھا اور یہ سمجھتا جا رہا تھا کہ ایک مجرم دوسرے مجرم کی کمزوریوں سے کس طرح کھیل کر اسے مجبور اور اپنا تابعدار بنا کر رکھتا ہے۔

ہم اس سیف سے جتنا ذخیرہ لائے تھے' ان میں دوسروں کی کمزوریاں اور جرائم کے ثبوت کم تھے۔ نیک بخت کی کمزوریاں اور غیر قانونی حرکتوں کے ثبوت زیادہ تھے۔ وہ ایسے دستاویزی ثبوت کو جلا کر ختم نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ ایسی دستاویزات کو اور اپنی غیر قانونی حرکات کو قانونی پیچیدگیوں سے جائز قرار دے کر اپنے اقتدار کو طول دے سکتا تھا۔ کروڑوں اور اربوں روپوں کو سیاہ سے سفید کر سکتا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ مجھے ایسی ایسی سیاسی پیچیدگیاں معلوم ہو رہی تھیں جنہیں میں پاکستان کے ایک عام شہری کی حیثیت سے کبھی معلوم نہیں کر سکتا تھا۔

ہمارے سامنے سیاست کا اتنا ملبہ تھا کہ جسے دیکھتے دیکھتے اور پڑھتے پڑھتے رات کے دو بج گئے۔ حمزہ صاحب نے ان تمام چیزوں کو سمیٹ کر ایک فرشی تجوری میں رکھا۔ اس تجوری کے سلائیڈنگ پٹ کو ریموٹ کنٹرول کے ذریعے بند کیا۔ تجوری کا وہ پٹ موزائیک فلور کی طرح تھا۔ دیکھنے سے پتا نہیں چلتا تھا کہ وہاں فرش کا الگ سے ٹکڑا ہے۔ پورا فرش بالکل یکساں دکھائی دیتا تھا۔ میں نے فولڈ کئے ہوئے قالین کو کھول کر وہاں کے فرش پر بچھا دیا۔

انہوں نے کہا۔ "نیک بخت خوابگاہ میں پہنچ کر اپنا کھلا ہوا سیف دیکھ چکا ہو گا۔ اس پر قیامت گزر رہی ہو گی۔ وہ سو نہیں سکے گا۔ ہمیں سو جانا چاہیے۔ بہت رات ہو چکی ہے۔ ہمیں جو کرنا ہے' وہ صبح کریں گے۔"

میں دوسرے بیڈ روم میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ حمزہ صاحب اپنے بیڈ روم میں آئے۔ انہوں نے ابھی کہا تھا کہ نیک بخت کی نیند اُڑ گئی ہو گی لیکن حمزہ صاحب کی بھی نیند اُڑ گئی۔ ایک آڈیو کیسٹ سننے کے بعد انیلا کی ہلاکت کی تصدیق ہو گئی تھی۔ ظالموں نے اس بے گناہ کو مار ڈالا تھا۔

انہوں نے خلا میں تکتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ "سو سوری انیلا! میں تمہاری حفاظت نہ کر سکا۔ ہم خواہ کتنے ہی ذہین اور دلیر ہوں' تقدیر سے نہیں لڑ سکتے۔ انشاء اللہ

کل سے پھر ایک نئی جنگ شروع ہو گی..........."

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

دوسری صبح راجہ نواز نے فون پر کہا۔ "اس خفیہ ہاتھ سے میری گفتگو ہو چکی ہے۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ مجھ سے رابطہ ہونے سے پہلے اس نے میرے بارے میں مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کی ہیں۔ اس کے جاسوس میرے اس گھر تک پہنچ گئے تھے' جہاں میں یونیورسٹی جانے کے دنوں میں رہا کرتا تھا۔ خفیہ ہاتھ بہت محتاط ہے۔ آئندہ مجھے مزید آزمائے گا۔ اس کی تین خفیہ ایجنسیاں کراچی' لاہور اور اسلام آباد میں ہیں۔ اس نے تینوں ایجنسیوں کے پتے' ان کے انچارج کے نام اور فون نمبرز دیئے ہیں۔ مجھے ان سب سے ملاقات کرنے کو کہا ہے۔ آج میں کراچی والی خفیہ ایجنسی میں جاؤں گا پھر تمہارے پروگرام کے مطابق لاہور اور اسلام آباد کا رخ کروں گا۔"

"کیا تم نے بتایا ہے کہ تنہا نہیں رہتے۔ تمہارا ایک ساتھی بھی ہے۔"

"ہاں میں نے ایک ساتھی کا فرضی نام عمران بتایا ہے اور یہ کہا ہے کہ وہ میرے سائے کی طرح چھپا رہتا ہے۔ مصیبت کی دھوپ میں نظر آتا ہے۔ صرف مجھے نظر آتا ہے کسی اور کو دکھائی نہیں دیتا۔"

"یہ تم نے اچھی بات کہہ دی۔ تمہاری نگرانی کرنے والے ساتھی کو تمہاری حفاظت کے لیے چھپ کر رہنا چاہیے۔"

"لیکن وہ فرضی ساتھی عمران کون ہو گا؟"

"کبھی میں اور کبھی فرہان تمہارے باڈی گارڈز بن کر چھپے رہیں گے۔ کراچی کی خفیہ ایجنسی والوں سے ملاقات کر کے دوسرے دن لاہور چلے جاؤ پھر یہاں اسلام آباد چلے آؤ۔"

انہوں نے فون بند کر کے مجھ سے کہا۔ "تمہاری امی کسی دن ہم سے ملنے کراچی آنے والی تھیں۔ انہیں فون پر بتا دو کہ تم یہاں ہو اور آج شام تک ان کے پاس لاہور پہنچ رہے ہو۔"

میں نے امی سے فون پر کہا۔ "میں آج شام تک آ رہا ہوں۔ آپ کہاں ہوں گی۔"

انہوں نے خوش ہو کر کہا۔ "آج اتوار ہے۔ میں چھٹی کرنے اور آرام کرنے کے لیے پرائیویٹ کاٹیج میں آئی ہوئی ہوں۔ تم یہیں آ جاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔ میں وہیں آؤں گا۔"

"حمزہ کہاں ہے؟"

"یہاں میرے قریب ہیں۔ آپ بات کریں۔"
حمزہ صاحب نے فون لے کر انہیں سلام کیا پھر کہا۔
"آپ کی دعاؤں سے ہم بڑی کامیابیاں حاصل کر رہے ہیں۔ کچھ ناکامیاں بھی ہوتی رہتی ہیں مگر ناکامیوں کو برداشت کرنے اور ان ناکامیوں سے سبق سیکھنے والوں کو کامیابیاں ضرور حاصل ہوتی ہیں۔"
"درست کہتے ہو۔ کیا فرمان کے ساتھ آ رہے ہو؟"
"نہیں آسکوں گا' یہاں بہت کام نکل آیا۔ نیک بخت کو الیکشن میں ناکام کرنے کے لیے آج ہی سے ضروری اقدامات کر رہا ہوں۔"
"کوئی بات نہیں' ملاقات پھر ہو جائے گی۔ پہلے کام کرو۔ فرمان کو ابھی روانہ کرو گے تو وہ شام تک میرے پرائیویٹ کاٹیج تک پہنچ سکے گا۔"
"ٹھیک ہے۔ یہ ابھی ناشتا کر کے روانہ ہو جائے گا۔"
میں ان کے پروگرام کے مطابق ناشتا کر کے روانہ ہو گیا۔ حمزہ صاحب نے ایک ایم این اے سے فون پر رابطہ کیا پھر کہا۔ "تم مجھے نہیں جانتے۔ میں تمہیں جانتا ہوں اور یہ خوشخبری سنا رہا ہوں کہ آج سے تم آزاد ہو۔ نیک بخت تمہیں ویڈیو فلم اور تحریری بیان کے ذریعے اپنے دباؤ میں نہیں رکھے گا۔"
اس نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟ یہ کیسے جانتے ہو کہ نیک بخت نے مجھے اپنے دباؤ میں رکھا ہے؟"
"یہ نہ پوچھو' میں کون ہوں۔ ابھی نیک بخت کو فون کر کے اتنا کہو کہ وہ تمہارے تحریری بیان کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی اور ویڈیو فلم کا کوئی ایک سین کسی دوسرے کیسٹ میں ریکارڈ کر کے دے دے۔ اگر وہ بہانہ کرے کہ یہ چیزیں دوسرے کسی شہر میں ہیں تو وہ تمہاری تحریر کو فیکس کر کے یہاں منگوا سکتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو سمجھ لینا کہ اس کے پاس اب تمہاری کوئی کمزوری نہیں رہی ہے۔"
پچھلی رات سے نیک بخت کی نیند اُڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ سیکرٹری اور تمام مشیر جاگ رہے تھے۔ وہ اپنے سراغ رسانوں کے ذریعے یہ معلوم کرنے کی کوششیں کر رہا تھا لیکن سراغ نہیں مل رہا تھا کہ اس کی خواب گاہ میں کون آیا تھا؟ کب آیا تھا؟ وہ تجوری کا سامان لے گیا اور اسے کسی نے کیوں نہیں دیکھا؟ اس کے محل میں بڑے چھوٹے ملازمین' سیکورٹی گارڈز' سیکرٹری اور تمام مشیر حضرات سب ہی سہمے ہوئے تھے۔ اتنا بڑا نقصان ہوا تھا جیسے محل میں زلزلہ آگیا ہو۔

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سیکرٹری نے ریسیور اٹھا کر سنا پھر نیک بخت سے کہا۔ "سر! ایم این اے رفیق صاحب کا فون ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"
نیک بخت نے ناگواری سے ریسیور لے کر کہا۔ "رفیق کسی دوسرے وقت فون کرو۔ ابھی میں بہت پریشان ہوں۔"
"جسٹ اے منٹ۔ بات بہت اہم ہے۔ آپ سن لیں۔"
"جلدی بولو۔"
"میرا جو خفیہ تحریری بیان آپ کے پاس ہے' اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی مجھے آدھے گھنٹے کے اندر چاہیے اور میں اپنی تسلی کے لیے اپنی ویڈیو کا صرف ایک منظر دیکھنے کے لیے ابھی آرہا ہوں۔"
وہ غصے سے بولا۔ "میں یہاں اہم معاملات میں الجھا ہوا ہوں اور تم مجھے ڈسٹرب کرنے کے لیے یہاں آنا چاہتے ہو۔ یہ باتیں تم کسی دوسرے وقت کر سکتے ہو۔"
"آپ جن معاملات میں الجھے ہوئے ہیں' انہیں دور کرنے میں آپ سے تعاون کروں گا لیکن آپ میرا مطالبہ ابھی پورا کریں۔"
"بات سمجھا کرو۔ تمہاری وہ چیزیں کراچی میں ہیں۔"
"کوئی بات نہیں۔ میرے تحریری بیان کو کراچی سے فیکس کرنے کا حکم دیں۔ میرا مطالبہ پورا ہو جائے گا۔"
"تم اپنے مطالبات کے سلسلے میں ضد کیوں کر رہے ہو؟"
"آپ میرے معمولی سے مطالبات پورے کرنے سے کیوں کترا رہے ہیں؟"
"رفیق! پہلے تم مجھ سے ایسے انداز میں گفتگو نہیں کرتے تھے۔ اب تمہارے تیور کیوں بدل گئے ہیں؟"
"میں پارٹی بھی بدل سکتا ہوں۔ آپ الیکشن کے نازک موڑ پر کھڑے ہیں۔ میں آپ کو چھوڑ کر اپوزیشن والوں کا بول بالا کر سکتا ہوں۔"
اسے اندازہ ہو گیا کہ بلیک میل ہونے والے ایم این اے رفیق کو کسی طرح اہم دستاویزات کی چوری کا علم ہو گیا ہے۔ وہ پریشان ہو کر بولا۔ "پلیز ایک گھنٹے تک صبر کرو۔ میں تمہیں خود ہی فون کروں گا۔"
"کوئی بات نہیں۔ ایک گھنٹے میں قیامت نہیں آجائے گی۔ میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔"
اس نے ریسیور رکھ کر اپنے مشیروں کو دیکھا پھر کہا۔ "آپ حضرات نے فون پر

ہونے والی باتوں سے اندازہ کیا ہو گا کہ ایم این اے رفیق تیور بدل کر بول رہا تھا۔ وہ ہماری پارٹی چھوڑنے کی بھی دھمکی دے رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے' اسے میرے سیف سے چرائی جانے والی چیزوں کے بارے میں کسی سے کچھ معلوم ہو گیا ہے۔"

ایک مشیر نے کہا۔ "جناب عالی! کسی سے کیا؟ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ واردات امیر حمزہ نے کی ہے اور اس نے رفیق کو سمجھایا ہے کہ وہ آئندہ آپ کے دباؤ میں نہیں رہے گا۔"

"ہوں۔ اسے انیلا کی ہلاکت کا یقین ہو چکا ہے۔ اس نے انتقاماً ایسا کیا ہے۔ مجھے معلوم تھا' وہ جواباً مجھے بھی ہلاک کرنا چاہے گا پھر سیاسی طور پر مجھے نقصان پہنچائے گا۔ او گاڈ! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ میرے بیڈ روم کے سیف تک پہنچ کر مجھے سیاسی طور پر اس قدر کمزور کر دے گا۔"

دوسرے مشیر نے کہا۔ "تین ایم این اے اور دو ایم پی اے آپ کے دباؤ میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے تین اور دوست ایم این اے کو آپ کا حمایتی بنا دیا تھا۔ آئندہ اسمبلیوں میں اکثریت حاصل کرنے کی جنگ لڑی جائے گی تو یہ چھ ایم این اے ہمارا ساتھ چھوڑ کر ہمارے حمایتیوں کی تعداد کم کریں گے۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سیکرٹری نے ریسیور اٹھا کر سنا پھر نیک بخت کی طرف سے بڑھا کر کہا۔ "چوہدری سلامت علی آپ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔"

نیک بخت نے ریسیور لے کر اس کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر مشیروں سے کہا۔ "یہ چوہدری بھی ہمارے دباؤ میں تھا۔ معلوم ہوتا ہے' یہ بھی رفیق کی طرح تیور بدلنے والا ہے۔"

مشیروں نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ نیک بخت نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ہیلو چوہدری صاحب! مجھے کیسے یاد کیا ہے؟"

وہ دوسری طرف کی باتیں سنتے ہوئے اپنے مشیروں کو اشارے سے سمجھانے لگا کہ چوہدری سلامت علی بھی پٹڑی بدلنے کی دھمکیاں دے رہا ہے پھر اس نے فون پر کہا۔ "چوہدری صاحب! آپ صرف اتنا بتا دیں کون آپ کو میرے خلاف بھڑکا رہا ہے؟ آپ دشمنوں کی چال میں آ رہے ہیں۔ جبکہ میں ابھی اپنے مشیروں کے ساتھ بیٹھا آپ ہی کا ذکر کر رہا تھا کہ آئندہ الیکشن کے نتیجے میں ہم اپنی حکومت بنائیں گے تو آپ کو کسی بہت اہم شعبے کا وزیر بنائیں گے۔"

"آپ کی عنایت ہے جو ایسا سوچ رہے ہیں لیکن جب حکمران بنے ہوئے تھے' تب

آپ نے وزارت تو کیا پچاس لاکھ کا قرضہ بھی نہیں دلایا۔ آپ جانتے تھے کہ ہم آپ کے دباؤ میں رہیں گے۔ ہمیں کچھ حاصل نہ ہو' تب بھی آپ کی اکثریت توڑ کر اپوزیشن والوں سے نہیں ملیں گے۔"

"چوہدری صاحب! آپ مجھے غلط سمجھ رہیں ہیں۔"

"یہ تو میں کئی برسوں سے سمجھ رہا ہوں۔ آج مجھے زنجیریں توڑنے کا موقع مل گیا ہے اور صرف میں ہی نہیں میرے ساتھ دوسرے دباؤ میں رہنے والے بھی آپ کی پارٹی چھوڑ رہے ہیں۔ اس اجنبی نے فون پر مجھے کہا تھا کہ میری کوئی کمزوری اب آپ کے ہاتھ میں نہیں رہی ہے۔ اس نے درست کہا تھا۔ اب آپ ہمارے لیے ایک کھوٹے سکے ہیں۔"

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ نیک بخت نے غصے میں ریسیور کو ایک طرف پھینک دیا پھر سیکرٹری سے کہا۔ "خفیہ ہاتھ سے بات کراؤ۔"

ایک مشیر نے کہا۔ "آپ ضرور خفیہ ہاتھ سے گفتگو کریں لیکن امیر حمزہ نے جو نقصان پہنچایا ہے' اس نقصان کو پورا کرنے کے لیے ہمیں خود ہی کچھ کرنا ہو گا۔ خفیہ ہاتھ آپ کو صرف دولت اور طاقت دے سکتا ہے۔ اپنے وسیع ذرائع اور اختیارات کا سہارا دے سکتا ہے۔ ورنہ وہ بھی آج تک امیر حمزہ کو نہ قابو کر سکا اور نہ ہی کسی مرحلے پر اسے پسپا کر سکا۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ خفیہ ہاتھ بھی میرا آج کا نقصان پورا نہیں کر سکے گا۔ نہ چوری شدہ اہم چیزیں واپس دلا سکے گا اور نہ ہی امیر حمزہ کا محاسبہ کر سکے گا لیکن وہ کوئی کار آمد مشورہ دے سکتا ہے۔"

سیکرٹری نے ایک موبائل فون بڑھاتے ہوئے کہا۔ "خفیہ ہاتھ کا سیکرٹری لائن پر ہے۔"

نیک بخت نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ "میں نیک بخت بول رہا ہوں۔ صاحب سے کہو' بہت اہم مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

اسے انتظار کرنے کو کہا گیا پھر خفیہ ہاتھ کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "اہم مسئلہ کیا ہے؟"

وہ بتانے لگا کہ امیر حمزہ پچھلی رات اس کے سیف سے اہم دستاویزات' آڈیو' ویڈیو اور مائیکرو فلمیں چرا کر لے گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں چھ ایم این اے اور چار ایم پی اے اس کی بلیک میلنگ سے آزاد ہو کر اپوزیشن پارٹی میں چلے جائیں گے۔"

خفیہ ہاتھ نے کہا۔ "اس سے پہلے انیلا تمہارے سیف سے ہمارا خفیہ معاہدہ چرا کر لے گئی تھی۔ اب ویسی ہی چوری دوبارہ ہوئی ہے۔ تم کیسی کمزور سیکورٹی رکھتے ہو؟ میں نے تمہیں پہلی غلطی سے بچایا۔ چوری ہونے والے خفیہ معاہدے کو واپس حاصل کیا۔ انیلا اور تمہارے اسکینڈل کو ختم کرانے کے لیے انیلا کو ہمیشہ کے لیے ختم کرا دیا۔ اب کیا سمجھتے ہو' میں امیر حمزہ کو بھی ختم کر دوں گا؟ کیا وہ کبھی قابو میں آیا ہے۔ فرض کرو' اسے ہلاک کر دیا ہے۔ کیا اس کی ہلاکت کے بعد چرائی ہوئی وہ اہم دستاویزات واپس ملیں گی۔ وہ تمہارے خلاف سنگین بدعنوانی اور کرپشن کے ثبوت لے گیا ہے۔ اب سر پکڑ کر بیٹھے رہو اور اقتدار کی کرسی کو خواب میں بھی دیکھنا چھوڑ دو۔"

"سر! مجھے ایک موقع اور دیں۔ کچھ عرصے کے لیے راجہ نواز کو میری خدمات کے لیے چھوڑ دیں۔ میں دوسری چالیں چلوں گا۔"

"میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں تمہاری دوسری چالوں کی تفصیلات سنوں۔ راجہ نواز کو اپنی خدمات کے لیے رکھو۔ میں بعد میں نتائج معلوم کروں گا۔ میں اسے کہتا ہوں۔ وہ ابھی تم سے رابطہ کرے گا۔"

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ نیک بخت نے اپنا فون آف کر کے سیکرٹری کو دیا۔ ایک مشیر نے کہا۔ "موجودہ الیکشن میں آپ کی پوزیشن اسی وقت مضبوط ہو سکتی ہے کہ آپ کے خلاف جتنے دستاویزات چوری کئے گئے ہیں' وہ واپس مل جائیں۔ کیا راجہ نواز وہ دستاویزات واپس لا سکے گا؟"

"ابھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ذہن خالی ہو گیا ہے۔ میں سوچنے کے قابل نہیں رہا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد راجہ نواز نے فون پر رابطہ کیا۔ نیک بخت نے اسے سیف سے چوری ہونے والے دستاویزات کی اہمیت بتائی۔ اس چوری کے باعث اسے جو نقصان پہنچ رہا تھا' اس کے بارے میں بھی بتایا پھر امیر حمزہ کے خلاف زہر اگلتا رہا۔ راجہ نواز نے کہا۔

"ہم میں سے کوئی امیر حمزہ کا پتا ٹھکانا نہیں جانتا ہے۔ اسے تلاش کرنے کی کوششیں کی جائیں گی تو الیکشن کی تاریخ سر پر آجائے گی۔ کیا آپ امیر حمزہ کو تلاش کرنے میں وقت ضائع کرنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں اسے ڈھونڈ نکالنا مشکل ہو گا۔ میں اسے اپنے خلاف زہر اگلنے کا موقع دوں گا کیونکہ میرے خلاف دستاویزات پیش کرنے کے وسیع ذرائع اس کے پاس نہیں ہیں۔ اخبارات' ریڈیو اور ٹی وی وغیرہ جیسے میڈیاز خفیہ ہاتھ کے زیرِ اثر ہیں۔ چند اخبارات جو

دستاویزی ثبوت کے ساتھ ہماری کرپشن اور بدعنوانیوں کی تفصیلات شائع کرتے ہیں' انہیں پڑھنے والے زیادہ ہیں' سمجھنے والے کم ہیں۔ ہمارے خلاف آواز اٹھانے سے پہلے اپنی آل اولاد اور مہنگائی کا بوجھ اٹھانے لگتے ہیں۔ ہماری حمایت میں بولنے والے اور ہمارا بہترین چال چلن پیش کرنے والے میڈیاز بہت مضبوط ہیں۔ اسی لیے ہماری کرپشن کی تفصیلات چھوٹے پیمانے پر سامنے آنے کے باوجود ہم محبِ وطن سیاست داں مانے جاتے ہیں۔ ہماری قوم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ آنکھوں دیکھی مکھی نگل جاتی ہے۔"

راجہ نواز نے کہا۔ "پھر تو آپ کو مطمئن رہنا چاہیے۔ امیر حمزہ ان دستاویزات کو چرا کر آپ کو عوام میں بدنام نہیں کر سکے گا۔"

"بیشک یہ اطمینان ہے لیکن اس نے چند اہم کاغذات کے ذریعے میرے کئی حمایتی سیاست دانوں کو مجھ سے الگ کر دیا ہے۔ وہ اس الیکشن میں کامیاب ہو کر کاشف اکبر کا ساتھ دیں گے تو میں اسمبلی میں اکثریت حاصل نہیں کر سکوں گا۔"

"تو پھر یہ کہئے کہ امیر حمزہ سے زیادہ آپ کا حریف کاشف اکبر ہے۔"

"ہاں جس طرح تم نے رحمان چنا کو ہلاک کیا اور سندھ کے اندرونی علاقوں میں اس کے رعب اور دبدبے کو ختم کیا ہے' اسی طرح پنجاب میں کاشف اکبر کی مقبولیت کا گراف نیچے گرا دو۔ اگر میرے آٹھ حمایتی اس کی طرف جائیں تو اس کے سولہ حمایتی میرے پاس آئیں۔"

"ایسا کرنے کے لیے اپنے مخالف کی بہت بڑی بڑی کمزوریاں معلوم کرنی پڑتی ہیں۔ یہ بات آپ سے زیادہ کون جان سکتا ہے کہ اسمبلی میں اپنے حمایتی دولت اور وزارت کا لالچ دے کر خریدے جاتے ہیں۔ یا پھر ان کی ذاتی کمزوریوں کا ثبوت حاصل کر کے انہیں بلیک میل کیا جاتا ہے۔"

"کاشف اکبر کے تمام اہم اور خفیہ دستاویزات اس کی بیوی دردانہ بیگم کی تحویل میں رہتے ہیں۔ امیر حمزہ کیٹی بندر گاہ کا خفیہ معاہدہ سیاپا کے ڈائریکٹر جنرل ہیرالڈ جان سے چھین کر لے گیا تھا۔ ایسے ہی کئی خفیہ معاہدوں کے کاغذات دردانہ بیگم کے ذاتی سیف میں یا بینک کے لاکرز میں ہیں اور ان کے ایسے ذاتی راز بھی تحریری صورت میں ہوں گے' جنہیں ہم نہیں جانتے ہیں۔ تم ان کے ایسے دستاویزی ٹھوس ثبوت حاصل کر کے ان کی سیاسی پوزیشن کو کمزور بنا سکتے ہو۔"

"آپ دردانہ بیگم کے محل کا اندرونی نقشہ ان کے ملازمین اور سیکورٹی گارڈز کی تعداد اور بینک کے لاکرز نمبرز فراہم کریں۔ میں وہاں سے ان کی کمزوریاں نکال کر لاؤں

گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہاری مطلوبہ معلومات کل تک فراہم کروں گا۔ کل دن کے بارہ بجے تک مجھ سے رابطہ کرو۔"

ان کی گفتگو ختم ہو گئی۔ کسی کے محل کے اندر تک پہنچنا دشوار ہوتا ہے۔ ناممکن بھی ہوتا ہے لیکن سیاست میں ایک ٹیم کے کھلاڑی زیادہ مراعات اور زیادہ اختیارات حاصل کرنے کے لیے دوسری ٹیم میں چلے جاتے ہیں۔ دونوں طرف کی ٹیموں کے کھلاڑی اِدھر اُدھر ہوتے رہتے ہیں۔ یوں دوسری طرف کے کھلاڑی اس ٹیم کے تمام راز لے کر آتے ہیں۔ محل کے بہت سے اندرونی معاملات کی جاسوسی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود نیک بخت نے کہا۔ "دردانہ بیگم کی کنیزوں میں جو سب سے منہ چڑھی ہے اور دردانہ بیگم کی راز دار ہے' اسے اغوا کر کے لایا جائے۔ اس کے ذریعے محل کے تمام راز معلوم ہوں گے۔"

دوسری طرف راجہ نواز نے فون پر امیر حمزہ سے کہا۔ "اب ایک نئے پہلو سے دو کتے ایک دوسرے کو بھنبھوڑنے اور کاٹنے والے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ جس طرح امیر حمزہ نے تمہارے راز چرائے ہیں' اسی طرح کاشف اکبر کے راز چرا کر اس کی سیاسی کمزوریاں تمہارے پاس پہنچاؤں گا۔ پتا چلا' کاشف اکبر کی تمام اہم دستاویزات دردانہ بیگم کی تحویل میں رہتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں اس کے محل کے سیف میں ہوں گی یا بینک کے لاکرز میں۔"

"کیا تم نے دستاویزات چرانے کا وعدہ کیا ہے؟"

"اس شرط پر وعدہ کیا ہے کہ مجھے دردانہ بیگم کے محل کا اندرونی نقشہ اس کے ملازمین اور سیکورٹی گارڈز کی تعداد اور بینک کے لاکرز نمبر بتائے جائیں۔"

"دردانہ بیگم کی محل نما کوٹھی اسلام آباد میں ہے۔ میں دیکھوں گا کہ وہ تمہاری مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں؟"

"پہرے داروں کے درمیان سے گزرنے اور محل کے اندرونی حصوں سے واقف ہونے کے لیے انہیں وہی کرنا ہو گا' جو ہم نے نیک بخت کے محل میں گھس کر کیا تھا۔ یعنی دردانہ بیگم کی کوٹھی میں کسی خاص ہستی کو اپنے قابو میں کر کے اسے مجبور اور بے بس بنا کر وہاں کے صحیح حالات معلوم کرنے ہوں گے۔"

"اس محل نما کوٹھی کی سب سے خاص ہستی دردانہ بیگم کی پرسنل سیکرٹری ہو گی' جو

دردانہ کے بہت سے راز بھی جانتی ہو گی اور اس کی خواب گاہ یا کسی خفیہ کمرے کے بارے میں بھی کچھ جانتی ہو گی۔"

"نیک بخت نے تم سے کہا ہے کہ کل تک دردانہ کی کوٹھی اور بینک کے لاکرز کے متعلق معلوم کر کے بتائے گا۔ اس کا مطلب ہے۔ آج رات تک اس کے کارندے اس محل نما کوٹھی کی اہم ہستی کو اغوا کر کے اس سے جبراً معلومات حاصل کریں گے۔ ٹھیک ہے' ہم بھی دیکھیں گے کہ وہ آج رات تک کسی طرح کی بھی واردات کیسے کرتے ہیں۔"

امیر حمزہ نے فون سے رابطہ ختم کرنے کے بعد اپنے جانبازوں سے کہا۔ "ہمیں دردانہ بیگم کی محل نما کوٹھی کے اطراف مستعد رہنا چاہیے۔ ہم ابھی ایک گھنٹے کے بعد یہاں سے نکلیں گے۔ دوسرے جانبازوں کو بھی وہاں پہنچنے کے لیے کہہ دو۔"

دردانہ بیگم کی کوٹھی کا جو وسیع و عریض احاطہ تھا' اس کی دیواریں بھی بہت اونچی تھیں۔ کوٹھی کے اندر جھانکنا تو دور کی بات ہے' کوٹھی کے باہر احاطے کے اندر بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نیک بخت جیسے مخالفین کے کارندے اس کوٹھی کے چاروں طرف بھٹک سکتے تھے لیکن کسی طرح کی جاسوسی نہیں کر سکتے تھے۔

امیر حمزہ نے ٹھیک سوچا تھا کہ نیک بخت وہاں سے کسی کو اغوا کرائے گا' تب ہی کوٹھی کے اندر جانے کا کوئی راستہ معلوم کر سکے گا۔ اس کوٹھی سے کچھ دور اس کے کارندے تین مختلف جگہ تین گاڑیوں میں موجود تھے۔ امیر حمزہ کے جانباز بھی کئی جگہ دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ کہیں بیٹھے ہوئے تھے اور کہیں راہ گیروں کی طرح گزر رہے تھے۔ ان کی گاڑیاں مختلف جگہ پارک کی ہوئی تھیں۔

دن کے دو بجے اس کے احاطے سے تین گاڑیاں باہر آئیں۔ آگے پیچھے والی گاڑیوں میں مسلح گارڈز تھے۔ کار کی پچھلی سیٹ پر کاشف اکبر اپنی بیگم دردانہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کہیں جا رہے تھے۔ ان میں سے کسی کو اغوا کرنے سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ اس لیے نیک بخت کے کارندوں نے ان کا تعاقب نہیں کیا۔ امیر حمزہ نے موبائل کے ذریعے تمام جانبازوں سے کہا۔ "تم سب اسی کوٹھی کے اطراف میں رہو۔ میں ابھی واپس آؤں گا۔"

وہ اپنے دو جانبازوں کے ساتھ دردانہ اور کاشف اکبر کا تعاقب کرنے لگا۔ وہ ایک بینک کی بہت بڑی عمارت کے سامنے آ کر رک گئے۔ اس بینک میں امیر حمزہ کا اکاؤنٹ ایک فرضی نام سے تھا۔ وہ میاں بیوی دو باڈی گارڈز کے ساتھ بینک کے داخلی گیٹ کے

پاس آئے۔ وہاں دونوں باڈی گارڈز رک گئے کیونکہ کسی بھی مسلح شخص کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میاں بیوی اندر گئے۔ حمزہ ان کے پیچھے تھا۔ وہ حمزہ کو چہرے سے نہیں پہچانتے تھے۔ بینک کا تمام عملہ انہیں دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کر سلام کر رہا تھا' کیونکہ ماضی میں کاشف اکبر اس ملک کا حکمران رہ چکا تھا اور یہ سارے پاکستانی جانتے تھے کہ موجودہ الیکشن کے نتیجے میں دو میں سے کوئی حکمران بننے والا ہے۔ کاشف اکبر یا نیک بخت۔ بینک کا عملہ بھی کاشف اکبر کو سلام کر کے خوش رکھنا چاہتا تھا۔ تاکہ سلام کے جواب میں آئندہ ان کی ملازمتیں سلامت رہیں۔

وہ دونوں بینک کے مینجر کے دفتری کمرے میں آئے۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر سلام کرتے ہوئے آگے بڑھا۔ کاشف اکبر نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو مینجر نے اس کے ہاتھ کو عقیدت سے چوم لیا۔ ان کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں صاف کرنے لگا۔ جبکہ چپراسی انہیں صاف کر چکا تھا۔

امیر حمزہ بھی اس کمرے میں آیا۔ مینجر نے کہا۔ "مسٹر! پلیز ابھی ایک پارٹی سے ضروری گفتگو ہو رہی ہے۔ آپ باہر تشریف رکھیں۔ میں ابھی آپ کی خدمت کے لیے آپ کو بلاؤں گا۔"

حمزہ نے کہا۔ "یہ......... کاشف اکبر صاحب آپ کے لیے صرف بینک ڈیلنگ کرنے والی پارٹی ہیں لیکن ہمارے تو حکمران ہیں۔ پہلے بھی تھے اور ہماری جدوجہد سے اس الیکشن میں بھی کامیاب ہو کر حکمران بنیں گے۔"

دونوں میاں بیوی نے گھوم کر حمزہ کو دیکھا۔ اس نے بڑے ادب سے انہیں سلام کیا۔ پھر کہا۔ "سر! میں تنہائی میں آپ سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ صرف دو منٹ چاہتا ہوں۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "یہاں تنہائی ہے۔ بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اس نے میز کے پاس آکر ایک کاغذ قلم لے کر لکھا۔

"یہاں مینجر ہے میں راز کی یہ بات نہیں کہہ سکوں گا کہ پچھلی رات نیک بخت کی خفیہ تجوری سے بہت اہم دستاویزات' سیاسی نوعیت کے آڈیو اور وڈیو کیسٹس چوری ہو چکے ہیں۔ میں جو لکھ رہا ہوں اور جو مزید کہنا چاہتا ہوں' اس کا ثبوت ابھی میرے پاس ہے۔ آپ مینجر کو تھوڑی دیر کے لیے بھیج دیں یا پھر مجھے اپنے ساتھ لے چلیں۔"

حمزہ نے وہ تحریر کاشف اکبر کو دی۔ اس نے اسے پڑھ کر چونک کر حمزہ کو دیکھا۔ کچھ سوچا۔ دردانہ نے بھی اسے پڑھا پھر کاشف اکبر نے کہا۔ "بیگم! تم اپنے لاکر سے ضروری

زیورات نکالنے آئی ہو۔ مینجر صاحب کے ساتھ لاکرز......... روم میں جاؤ۔ میں یہاں تمہارا انتظار کروں گا۔"

مینجر نے دردانہ کے لاکر والی چابی لی۔ دوسری چابی دردانہ کے پاس تھی۔ وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔ کاشف اکبر نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ نیک بخت کے بہت سے اہم راز چوری ہو گئے ہیں؟ تم کون ہو؟"

"میں اپنے بارے میں بتاؤں گا۔ پہلے آپ میری سچائی کا یقین کریں۔ نیک بخت کی پارٹی میں چوہدری سلامت علی' رفیق اور خالد احمد تین ایم این اے اپنی کمزوریوں کے باعث اسمبلی میں نیک بخت کی حمایت کرتے ہیں لیکن اب وہ حمایت نہیں کریں گے۔ ان کی کمزوریاں ویڈیو کیسٹ اور ان کے اپنے تحریری بیان میں تھیں۔ اب یہ میری جیب میں ہیں۔ یہ دیکھیے۔"

حمزہ نے ان تینوں ایم این اے کے کاغذات جیب سے نکال کر اسے دیئے۔ اس نے تینوں کاغذات کو پڑھ کر کہا۔ "بے شک میں ان تینوں کی تحریروں اور دستخطوں کو پہچانتا ہوں لیکن یہ فوٹو اسٹیٹ کاپیاں ہیں۔"

"جی ہاں۔ اصل کاغذات اور نیک بخت کے تمام اہم راز امیر حمزہ کے پاس محفوظ ہیں۔"

کاشف اکبر نے چونک کر حمزہ کو دیکھا۔ اس نے کہا۔ "میں حمزہ صاحب کا ایک جانباز ہوں۔ سیاست میں دوست کبھی دشمن ہو جاتے ہیں اور دشمن کبھی دوست بن جاتے ہیں۔ حمزہ صاحب نے پوچھا ہے' کیا آپ پرانی دشمنی بھول کر دوستی کرنا چاہیں گے؟"

کاشف اکبر نے خوش ہو کر حمزہ کا ہاتھ تھام کر مصافحے کے انداز میں ہلاتے ہوئے کہا "حمزہ صاحب کی دوستی سر آنکھوں پر۔ میں خود بھی ان سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ کئی بار پرانے نمبروں پر فون کیا۔ میرا مڈل مین بھی ان کا سراغ لگانے میں مصروف ہے۔"

حمزہ نے پوچھا۔ "آپ حمزہ صاحب سے کیوں دوستی کرنا چاہتے ہیں۔ جبکہ اس کی وجہ سے کیٹی بندر کے خفیہ معاملات کو حمزہ صاحب نے اچھالا پھر یکے بعد دیگرے آپ کے خلاف کئی الزامات ثابت کر کے آپ کی حکومت گرا دی۔"

"اب میری حکومت گرانے والے وہی حمزہ صاحب مجھے نیک بخت کے مقابلے میں کامیاب ہونے کا موقع دیں گے۔ میں جانتا ہوں' اس کم ظرف نے حمزہ صاحب کی محبوبہ ایلا کو قتل کرایا ہے اور ان سے خفیہ ہاتھ کا معاہدہ چھین کر لے گیا ہے۔ ان حالات میں ان کے کام میں آسکتا ہوں اور وہ میرے کام آسکتے ہیں۔"

حمزہ نے فون کے ذریعے بینک کے باہر ایک جانباز سے رابطہ کر کے کہا۔ "حیدر علی! میں کوڈ ورڈز کہہ رہا ہوں۔ جناب امیر حمزہ صاحب کو اطلاع دو۔ صحرا میں پھول کھل سکتے ہیں۔ میں ابھی صحرا کے باغبان کے ساتھ ہوں۔ یہاں سے ان کے ساتھ کہیں تنہائی میں اہم معاملات طے کرنے جاؤں گا۔ تمام جانبازوں سے کہہ دو کہ صحرا کے باغبان کو دشمن اور مجھے ان کا قیدی سمجھ کر حملہ نہ کریں۔ ان سے مذاکرات کے جو نتائج ہوں گے' ان کے مطابق میں حمزہ صاحب سے رابطہ کر کے انہیں تفصیلات بتاؤں گا۔ ہو سکتا ہے کہ حمزہ صاحب صحرا کے باغبان سے فون پر گفتگو کرنا چاہیں۔"

دوسری طرف سے جانباز حیدر علی نے کہا۔ "آل رائٹ کمانڈر! آپ کی ہدایات پر عمل ہو گا اور کوئی خاص بات؟"

حمزہ نے کہا۔ "اپنے دلیر اور ہوشیار جانبازوں کو دردانہ بیگم کے محل کے اطراف چھپ چھپ کر نگرانی کرنے کو کہو۔ راجہ نواز مجھے دردانہ بیگم کے ساتھ دیکھ کر کوئی ایسی چال چل سکتا ہے جس کی ہم توقع نہیں کر سکتے۔ راجہ نواز سے بہت زیادہ محتاط رہو۔ دیٹس آل۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ کاشف اکبر نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "یہ تم نے اچھا کیا۔ راجہ نواز کسی بھی وقت' کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ ہمارے حمزہ صاحب لوہے کے چنے ہیں۔ راجہ نواز انہیں چبانا چاہے گا تو اپنے سارے دانت توڑ بیٹھے گا۔"

دردانہ بینک منیجر کے ساتھ آ گئی۔ کاشف اکبر نے کہا۔ "بیگم! یہ ہمارے دوست ہی نہیں' راز دار بھی ہیں۔ ابھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔"

دردانہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ "میرا نام احمد رمزی ہے۔ آپ یہاں کام نمٹا لیں پھر ہم چلیں گے۔"

دردانہ نے اپنا لاکر کھولنے اور وہاں سے سامان نکالنے کے سلسلے میں ایک رجسٹر پر دستخط کیے پھر وہ تینوں بینک سے باہر آ کر دردانہ کی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ جانباز انہیں دور سے دیکھ رہے تھے۔ حمزہ ان کے ساتھ وہاں سے جا رہا تھا۔ کاشف اکبر اپنی بیگم دردانہ کو یہ خوش خبری سنا رہا تھا کہ امیر حمزہ سے دوستی ہو رہی ہے اور دوستی کی ابتدا میں ہی امیر حمزہ نے نیک بخت کے خفیہ سیف کو لوٹ کر بہت بڑا سیاسی دھچکا پہنچایا ہے۔

دردانہ خوشی سے نہال ہو رہی تھی۔ کاشف اکبر سینہ تان کر کہہ رہا تھا کہ اب خفیہ ہاتھ بھی نیک بخت کو آئندہ اقتدار نہیں دلا سکے گا۔ وہ خوش ہونے والے یہ سوچ بھی

نہیں سکتے تھے کہ امیر حمزہ میٹھی چھری بن کر ان کی بغل میں بیٹھا ہوا ہے۔

☆======☆======☆

لیڈی ڈاکٹر آمنہ کا تیسرا آپریشن بھی کامیاب رہا۔ پہلے دو آپریشنوں میں مراد کے گھٹنوں کی ریزہ ریزہ ہونے والی ہڈیاں مضبوطی سے جڑ گئی تھیں لیکن اس کے دونوں پیر سیدھے رہتے تھے۔ وہ گھٹنے موڑ نہیں سکتا تھا۔

وہ پولیس اسپتال میں پولیس والوں کی حراست میں زیرِ علاج تھا۔ انٹیلی جنس والے خفیہ طور پر اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ وہ اب اسے جیل میں پہنچا کر مقدمہ چلا کر اسے سزائے موت دلانا چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر آمنہ نے کہا۔ "جب تک مراد اس کے زیرِ علاج ہے تب تک اس کے خلاف قانونی کارروائی نہیں کی جا سکتی۔ انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل اور اس کے ماتحت جمشید نے کہا۔ "اس کا علاج ہو چکا ہے۔ گھٹنے کی ہڈیاں جڑ گئی ہیں۔ اب اسے عدالت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔"

آمنہ نے کہا۔ "ہڈیاں جڑ گئی ہیں لیکن اس کے گھٹنے مڑ نہیں سکتے ہیں۔ اس کے دونوں پیر بالکل سیدھے رہتے ہیں۔ میں ایک اور آپریشن کر کے اس کے گھٹنوں کو موڑنے کے قابل بنا دوں گی۔"

میڈیکل لاء کے مطابق کسی بیمار اور زیر علاج رہنے والے مجرم پر مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا تھا اس لیے پولیس اور انٹیلی جنس والے تیسرے آپریشن کا انتظار کرتے رہے۔

تیسرا آپریشن کامیاب ہوا اور ڈاکٹر آمنہ نے کہا کہ اب مراد اپنے گھٹنے موڑ سکے گا لیکن آپریشن کا زخم مندمل ہونے اور چلنے پھرنے' اٹھنے بیٹھنے کا طبی معائنہ کرنے کے بعد اسے پولیس والے لے جا سکیں گے۔

قانون کے محافظوں کو اندیشہ تھا کہ مراد بھی اپنے ساتھی تابانی کی طرح اسپتال سے فرار ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر آمنہ کو سرجری کے سلسلے میں عالمی شہرت حاصل تھی۔ شہرت کے ساتھ یہ بدنامی بھی تھی کہ وہ زخمی اور موت سے لڑنے والے بدنامِ زمانہ مجرموں کا بھی خفیہ طور پر آپریشن کر کے انہیں نئی زندگی دیتی ہے۔ انہیں اپاہج ہونے سے بچا لیتی ہے۔ آمنہ کے اس عمل پر قانونی طور پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ ڈاکٹر اپنے پیشے کے مطابق انسانی جانیں بچاتے ہیں' خواہ وہ انسان اچھا ہو' یا برا ہو۔ معصوم ہو' یا قاتل ہو۔ علاج کے بعد کسی مجرم کے خلاف قانونی کارروائی کی جا سکتی ہے۔ علاج کے دوران میں

مجرم' ڈاکٹر کی پناہ میں رہتا ہے۔

مراد کا ساتھی تابانی اسپتال سے بڑے ڈرامائی انداز میں فرار ہوا تھا اور اب تک قانون کی گرفت میں نہیں آیا تھا۔ جمشید اور تمام افسران یقین سے کہتے تھے کہ ڈاکٹر آمنہ نے تابانی کو فرار ہونے کے سلسلے میں سہولتیں فراہم کی تھیں۔ اگرچہ یہ ثبوت نہیں تھا کہ ڈاکٹر آمنہ نے ایسا کیا ہے لیکن اس نے ایک بار کہا تھا کہ تابانی ماں بننے والا (والی) ہے۔ اگر وہ زچگی کے مرحلے سے گزرنے تک اس کے زیرِ علاج آئے گا تو وہ زچہ اور بچہ کے طبی طور پر بخیریت ہونے تک تابانی کو پولیس کسٹڈی میں نہیں جانے دے گی۔

دوسری طرف آمنہ انسانیت کے ناتے مراد کے اندر یہ جذبہ پیدا کر چکی تھی کہ وہ اپنے ہونے والے بچے کی خاطر دہشت گردی سے باز آجائے گا اور جس پاکستان میں تخریب کاری کے لیے بھارت سے آیا ہے۔ اسی پاکستان کی حفاظت اور بقا کے لیے جنگ لڑے گا اور اپنے بچے کو بھی محبِ وطن بنائے گا۔

آمنہ نے تابانی کو بھی اس کے جرائم کا احساس دلانے کے لیے پوچھا۔ "تم سزائے موت پا کر اپنے بچے کو لاوارث بناؤ گے یا ایک فرض شناس ماں کی طرح اپنے بچے کو اچھا اور عظیم انسان بناؤ گے؟"

تابانی دنیا والوں کے سامنے خود کو عورت تسلیم نہیں کرتا تھا لیکن اس کے اندر کی مامتا نے کہا کہ اسے جرائم سے پاک زندگی گزارنے کا موقع ملے گا تو وہ مراد کے ساتھ ایک پُر امن زندگی گزارے گا اور اپنے بچے کو بھی مجرم نہیں بنائے گا۔

آمنہ نے دونوں کے وعدوں اور قسموں پر یقین کر کے اپنے منہ بولے بھائی انڈر گراؤنڈ مافیا کے گاڈ فادر ہاشم سے کہا تھا کہ کسی طرح بھی مراد اور تابانی کو قانون کی گرفت سے نکال کر انہیں ایک اچھی اور کارآمد زندگی گزارنے کا موقع دو۔

بے شک مراد اور تابانی نے پچھلے دنوں دہشت گردی کے ذریعے درجنوں معصوم اور بے گناہوں کی جانیں لی تھیں۔ وہ جانیں واپس نہیں مل سکتی تھیں لیکن جان لینے والے صراطِ مستقیم پر آجاتے ہیں تو آئندہ آزمائشی مراحل میں درجنوں انسانوں کی جانیں بچا سکتے تھے۔ توقع سے زیادہ کارنامے انجام دے سکتے تھے۔

گاڈ فادر ہاشم نے اپنی باجی آمنہ کے حکم کی تعمیل کی۔ اسے بڑے ہی ڈرامائی انداز میں ایک اسپتال سے فرار ہونے کا موقع دیا۔ اب آمنہ نے ہاشم کو بتایا تھا کہ تیسرا آپریشن بھی کامیاب رہا ہے۔ دو ہفتوں میں مراد گھٹنے موڑ کر بیٹھنے اور چلنے پھرنے لگے گا لیکن دو ہفتوں سے پہلے ہی کسی بھی طرح اسے اسپتال سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پہنچا دو۔

ہاشم نے کہا۔ "میں آپ کی مرضی کے مطابق مراد کو بھی گرفتار ہونے اور سزائے موت پانے سے بچاؤں گا لیکن بار بار ایک طریقۂ کار کام نہیں آتا۔ میں نے تابانی کو اسپتال سے فرار کرایا تھا۔ لہٰذا مراد کو اسپتال سے نکالنا دانش مندی نہیں ہوگی۔ اس بار پولیس اور انٹیلی جنس والوں نے پتا نہیں کیسے کیسے خفیہ انتظامات کیے ہوں گے۔ آپ مراد کو اسپتال سے جیل جانے دیں۔ ہم اسے جیل سے نکال لائیں گے۔"

پولیس اور انٹیلی جنس والوں نے واقعی اس بار بڑے سخت انتظامات کیے تھے۔ مراد کے کمرے میں مائیک اور وڈیو کیمرے لگائے گئے۔ اس کے پاس دانستہ ایک ٹیلی فون رکھا گیا تھا۔ جس پر ہونے والی گفتگو خفیہ طور پر ریکارڈ کی جاتی تھی۔ آمنہ نے تحریری طور پر اجازت دے دی تھی کہ آج سے دو دن کے بعد تیسرے دن صبح اسے پولیس کسٹڈی میں لے جایا جا سکتا ہے۔

جمشید نے اپنے ڈائریکٹر جنرل سے کہا۔ "سر! مجھے لیڈی سرجن آمنہ خاتون پر بھروسا نہیں ہے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ اس ڈاکٹر آمنہ کی پوجا کرنے والے انڈر گراؤنڈ مافیا اور بدنام زمانہ مجرم وغیرہ اس گاڑی پر ضرور حملہ کریں گے، جس میں ہم مراد کو لے جائیں گے۔"

ڈائریکٹر جنرل نے کہا۔ "مجھے بھی شبہ ہے کہ کچھ ضرور ہوگا لیکن مراد کو لے جانے والی گاڑی پر حملہ نہیں ہوگا۔ پوری پولیس فورس اسپتال سے سینٹرل جیل تک چاق و چوبند رہے گی۔ اسپتال میں زمین سے لے کر چھت تک پہرا ہے۔ پرسوں صبح اسپتال میں مریضوں کی عیادت کرنے والوں کو نہیں آنے دیا جائے گا کسی ایمرجنسی میں کوئی ایمبولینس آئے گی تو اسے پوری طرح چیک کرنے کے باوجود ایمبولینس میں لائے جانے والے مریض کے ساتھ اسپتال کے اندر بھی مسلح سپاہی ساتھ جائیں گے۔ اسپتال سے کوئی چیز نہ باہر جائے گی اور نہ اندر آئے گی۔"

☆ تابانی اگرچہ خود کو عورت نہیں کہتا تھا لیکن مراد کے قریب رہ کر اسے رہائی دلانے کی خاطر اس نے عورت کا لباس پہن لیا تھا۔ لانبے بالوں والی وگ سر پر رکھ لی تھی۔ چہرے پر میک اپ کے ذریعے عارضی تبدیلی کی تھی۔ گاڈ فادر ہاشم کے ایک ماتحت کے ساتھ لاہور کی ایک کوٹھی میں آکر رہنے لگی تھی۔ کسی کو اس پر شبہ نہیں ہوا تھا۔ اس علاقے کے لوگ سمجھتے تھے کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ وہاں رہتی ہے۔ اس نے اس ماتحت کو اس لیے شوہر کہنا گوارا کیا کہ اس کے ذریعے گاڈ فادر اور ڈاکٹر آمنہ سے بہ آسانی رابطہ ہوتا رہتا تھا اور مراد کی خیریت معلوم ہوتی رہتی تھی۔ یہ سن کر اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں

رہا تھا کہ مراد کا تیسرا آپریشن کامیاب رہا ہے اور وہ پہلے کی طرح اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا۔

پھر پتا چلا کہ مراد کو اسپتال سے فرار نہیں کرایا جائے گا۔ پولیس کو موقع دیا جائے گا کہ اسے جیل لے جائیں۔ گاڈ فادر ہاشم نے وعدہ کیا تھا کہ اسے جیل سے فرار کرایا جائے گا۔ تابانی نے اس منصوبے پر اعتراض کیا۔

"پلیز اسے جیل نہ جانے دیں۔ اس پر ظلم کیا جائے گا۔ وہ پہلے ہی تین آپریشنوں سے گزر کر لاغر ہو گیا ہے۔"

آمنہ نے کہا۔ "میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ہر دوسرے تیسرے دن اس کا معائنہ کرنے جاؤں گی۔ مجھے اس سے ملنے سے کوئی روک نہیں سکے گا۔"

تابانی نے پوچھا۔ "اگر اسے جیل سے فرار کرانے میں ناکامی ہوئی تو آپ میں سے کوئی اسے سزائے موت سے بچا نہیں سکے گا۔"

گاڈ فادر ہاشم نے کہا۔ "تم یقین رکھو۔ ہم اسے پھانسی کے تختے سے بھی اٹھا لائیں گے۔ جب میری باجی نے کہا ہے کہ مراد کو زندہ رہنا چاہیے تو پھر میں جان کی بازی لگا کر بھی اسے زندہ سلامت تمہارے پاس پہنچا دوں گا۔"

"یہ سب مجھے فلمی ڈائیلاگ لگ رہے ہیں۔ تم لوگ میرے اندر کی حالت نہیں جانتے ہو۔ مجھے کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ میرا ہونے والا بچہ میری کوکھ سے مراد کو' اپنے باپ کو پکار رہا ہے۔"

آمنہ نے کہا۔ "میں تمہارے احساسات کو سمجھتی ہوں۔ یہ ایسا وقت ہے کہ تمہیں صرف جذبات سے نہیں عقل سے بھی سوچنا چاہیے کہ جلد بازی میں مراد کے لیے زیادہ خطرات پیدا ہو سکتے ہیں۔"

تابانی بے چینی سے ٹہلنے اور سوچنے لگا۔ آمنہ نے کہا۔ "میں جا رہی ہوں۔ کل چھٹی کا دن اپنے کالج میں گزاروں گی۔ پرسوں جیل میں مراد سے ملنے جاؤں گی۔"

وہ گاڈ فادر ہاشم کے ساتھ چلی گئی۔ تابانی کے اندر لاوا پک رہا تھا۔ اس کے دماغ میں ایک ہی بات سمائی ہوئی تھی کہ گاڈ فادر ہاشم ناکام ہوگا تو اس کا مراد بے موت مارا جائے گا۔ وہ بڑی دیر تک ٹہلتا رہا۔ کبھی بیٹھ کر سوچتا رہا۔ اس کا شوہر بن کر رہنے والے ماتحت ڈپٹی نے کہا۔ "یوں پریشان رہنے سے بات نہیں بنے گی۔ ہمارے گاڈ فادر پر بھروسہ کرو۔ وہ تمہارے مراد کو لے آئے گا۔"

وہ غصے سے بولا۔ "کیا تمہارا گاڈ فادر زندگی میں کبھی ناکام نہیں ہوا ہے؟ کامیابیاں

حاصل کرنے والے بڑے بڑے ذہین اور دلیر انسان بھی بعض اوقات ناکام ہوتے رہتے ہیں۔"

"تم یقین کرو۔ ہمارے گاڈ فادر' باجی آمنہ کو اتنی عقیدت سے چاہتے ہیں کہ ان کے حکم کی تعمیل کرنے تک اپنی موت سے بھی لڑتے لڑتے مراد کو کال کوٹھری سے نکال کر لائیں گے۔"

تابانی نے سوچتی ہوئی نظروں سے ڈینی کو دیکھا پھر کہا۔ "میں بہت اپ سیٹ ہوں۔ چھت پر تنہا ٹہلنا چاہتی ہوں۔ تم اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔"

وہ کمرے سے نکل کر کوریڈر کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر آ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے چھت پر آنے والے دروازے کی چٹخنی لگا دی تاکہ ڈینی وہاں نہ آ سکے۔ اس نے چھت کے درمیانی حصے میں آ کر موبائل فون نکالا پھر نمبر پنچ کرنے لگا۔ رابطہ ہونے پر آواز سنائی دی۔ "ہیلو جمنا پرساد دھاون بول رہا ہوں۔"

تابانی نے "را" کے مخصوص کوڈ ورڈز ادا کیے پھر کہا۔ "سر! میں ہوں شنکر داس' پوری "را" تنظیم میں صرف آپ ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کی حیثیت سے یہ راز جانتے ہیں کہ میں مرد نہیں ہوں۔ آپ نے مجھے راجستھان کے ٹریننگ کیمپ میں.......... بھیجا تھا۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "او شنکر داس! تم کہاں ہو؟"

"میں لاہور سے بول رہا ہوں۔"

"تمہیں پاکستان میں "را" کے زونل افسر سے رابطہ کرنا چاہیے۔"

"سر! بات کچھ ایسی ہے کہ صرف آپ جیسے رازدار سے کہہ سکتا ہوں۔"

"یہ اب تک مردوں کی طرح بولنے والی عادت نہیں گئی؟ میں نے سنا تھا کہ تم اور مراد گرفتار ہو گئے ہو؟"

"درست سنا تھا۔ میں قید سے فرار ہو گیا ہوں۔ مراد جیل میں ہے۔ میں اس کے بچے کی ماں بننے والا ہوں۔"

"بھگوان کے لیے اب تو عورتوں کی طرح بولو۔ تم ماں بننے والی ہو۔"

"سوری سر! میں مرتے دم تک صرف مراد کے لیے عورت اور ساری دنیا کے لیے مرد بن کر رہوں گا۔ ایک انڈر گراؤنڈ ورلڈ کے گاڈ فادر نے وعدہ کیا ہے کہ وہ میرے مراد کو جیل سے نکال لائے گا۔ اس گاڈ فادر کا نام ہاشم ہے۔ میں اسی کی مدد سے فرار ہوا تھا لیکن مراد کی اطراف سخت پہرا رہتا ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ اسے جیل سے رہا

کرایا جا سکے گا۔"

"شنکر! تم جس گاڈ فادر ہاشم کا ذکر کر رہے ہو' وہ ہمارا دشمن ہے۔ وہ ہمارے کئی اہم ایجنٹس کو قتل کر چکا ہے۔ اگر اس نے فرار ہونے میں تمہاری مدد کی ہے تو اس کے پیچھے اس کا کوئی بڑا مقصد ہو گا۔"

"لیکن سر! آپ لیڈی سرجن آمنہ کو جانتے ہوں گے' وہ ایک سچی اور کھری عورت ہے۔"

"افسوس تم اس سچی اور کھری عورت کا دوسرا روپ نہیں جانتے ہو۔ اس نے اپنے بیٹے کے ذریعے لندن میں گاڈ فادر کالیا کو اپاہج بنا دیا ہے۔ کالیا ہماری تنظیم کے لیے بہت کام کیا کرتا تھا۔"

"او گاڈ! اتنی بڑی بات میں نہیں جانتا تھا۔ یہ آمنہ ایک طرف میری سرپرستی کر رہی ہے اور دوسری طرف سے پشت میں خنجر گھونپ رہی ہے۔ میں مراد کی رہائی کے سلسلے میں اس عورت پر بھروسا کر کے غلطی کر رہا ہوں۔"

"تمہاری اور تمہارے بچے کی سلامتی اسی میں ہے کہ فوراً وہاں سے نکلو۔ میں تمہارے بارڈر پار کرنے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"میں نے اسی لیے براہِ راست آپ سے رابطہ کیا ہے۔ آپ میری باتیں نوٹ کریں۔ چھانگا مانگا سے دس کلومیٹر پہلے جنوب مغرب کی طرف ایک سرسبز و شاداب جنگل ہے۔ جہاں امیر کبیر افراد کے کاٹیج بنے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک ہلکے سبز رنگ کا کاٹیج ہے۔ میں وہاں رہوں گا۔ اس کاٹیج سے سو گز کے فاصلے پر ایک کھلا میدان ہے۔ وہاں آسانی سے ہیلی کوپٹر اتارا جا سکتا ہے۔ کیا آپ کل دوپہر یا شام تک میرے لیے ہیلی کوپٹر بھیج سکتے ہیں۔"

"ضرور بھیج سکتا ہوں۔ "را" کے دوسرے افسران تمہاری غیر معمولی صلاحیتوں سے بہت خوش ہیں اور میں نے تو تمہیں تربیتی کیمپ میں تراش کر ہیرا بنایا ہے۔ کل ٹھیک پانچ بجے شام کو تمہاری بتائی ہوئی جگہ پر ایک ہیلی کوپٹر پہنچ جائے گا۔ پائلٹ کے پاس تمہاری ایک تصویر ہو گی۔ اس کے باوجود تم اسے کوڈ ورڈز سناؤ گی۔"

"نو سر! سناؤں گی نہیں' سناؤں گا۔"

"اچھا بابا! سناؤ گے۔"

فون کا رابطہ ختم ہو گیا۔ تابانی چھت کی منڈیر سے ٹیک لگائے سوچنے لگا۔ منصوبے بنانے لگا کہ اسے دوسرے دن کیا کرنا چاہیے؟

جمشید اکثر چھپ چھپ کر ڈاکٹر آمنہ کی نگرانی کرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اسی نے تابانی کو اسپتال سے فرار کرانے کے بعد کہیں چھپایا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ تابانی کوئی خطرہ مول لینے کے لیے لاہور واپس نہیں آئے گا۔ اس لیے وہ بڑے دنوں کے بعد صبح دس بجے آمنہ کے کاٹیج میں پہنچا۔ اسے امید تھی کہ اچانک وہاں پہنچے گا تو تابانی کو اسی کاٹیج سے گرفتار کر سکے گا۔

اس نے کاٹیج سے بہت دور اپنی موٹر سائیکل روک دی۔ ایک درخت کی آڑ سے دیکھنے لگے۔ کاٹیج کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ آمنہ برآمدے میں ایزی چیئر پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ اس دوران میں کمرے کے کھلے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کسی سے کچھ کہا۔ دور سے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کسی سے کیا کہہ رہی ہے لیکن یہ اچھی طرح سمجھ میں آگیا کہ کمرے کے اندر کوئی ہے' جس نے اس سے گفتگو کی ہے۔

وہ درختوں کی آڑ لے کر چھپتا ہوا ایک لمبا چکر کاٹ کر اس کاٹیج کے پیچھے آیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے کاٹیج کے پچھلے دروازے کی کنڈی باہر سے لگا دی تاکہ تابانی ہو تو پچھلے دروازے کو کھول کر فرار نہ ہو سکے۔

پھر وہ اطمینان سے چلتا ہوا ہاتھ میں ریوالور لیے کاٹیج کے سامنے آیا۔ آمنہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر حیرانی سے پوچھا۔ "تم کاٹیج کے پیچھے سے پیدل آرہے ہو؟ کیا گاڑی نہیں ہے؟"

"ہے۔ اسے میں نے بہت دور چھوڑ دیا ہے۔ یہاں تک پیدل آکر پہلے اس کاٹیج کے پچھلے دروازے کو باہر سے بند کر دیا ہے۔"

"او۔ اب سمجھی۔ تم اب تک یہی سمجھ رہے ہو کہ میں نے تابانی کو یہاں چھپا رکھا ہے۔"

"میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ اندر ہے۔ ابھی آپ چائے پیتے ہوئے اس سے باتیں کر رہی تھیں۔"

آمنہ نے مسکرا کر کہا۔ "پہلی بار تم یہاں آئے تھے تو میں نے کہا تھا' تم ایک دن بہت بڑے سراغ رساں بنو گے۔ تمہارے اندر کام کی لگن ہے۔ بہت محنتی ہو۔ اس کے باوجود غلط سمت میں چل پڑتے ہو۔"

"پلیز آپ باتیں نہ کریں۔ اسے باہر بلائیں اور یہ تاکید کر دیں کہ ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہ ہو۔ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے گردن پر رکھ آئے۔"

آمنہ نے کمرے کی طرف رخ کر کے کہا۔ "بھئی اگر تم سن رہی ہو تو یہ بچہ جیسا

کہہ رہا ہے' اسی طرح چلی آؤ۔"

جمشید نے دیکھا۔ کھلے ہوئے دروازے پر ایک معصوم سی نوجوان لڑکی دونوں ہاتھ گردن پر رکھ کر برآمدے میں آئی۔ آمنہ نے کہا۔ "اس کا نام عابدہ ہے۔ میری سوکن کی بیٹی ہے۔ اپنی ماں کی گمراہی سے نفرت کرتی ہے۔ میرے پاس رہتی ہے۔ سگی بیٹی کی طرح خدمت کرتی ہے۔ مجھے سگی ماں کہہ کر میری ہدایات پر عمل کرتی ہے۔"

پھر اس نے عابدہ سے کہا۔ "عابی! ہاتھ نیچے کر لو اور جمشید تمہیں اجازت ہے۔ اندر جا کر سرچ وارنٹ کے بغیر تلاشی لے سکتے ہو۔"

وہ ہاتھ میں ریوالور لیے برآمدے میں آیا۔ عابی سہم کر آمنہ کے پاس آگئی۔ وہ محتاط انداز میں چلتا ہوا کاٹیج کے اندر چلا گیا۔ عابی نے پوچھا۔ "امی! یہ کون ہے؟"

"نیا نیا جاسوس بنے۔ بہت محنتی ہے۔ اپنی دھن کا پکا ہے۔ تجربات اسے بہت کچھ سکھا دیں گے۔"

جمشید نے تھوڑی دیر بعد برآمدے میں آکر کہا۔ "سوری! میں نے آج آپ کو ڈسٹرب کیا ہے۔"

"نہیں بیٹے! پہلی بار تم چائے پیئے بغیر چلے گئے تھے۔ آج پی کر جانا۔ بیٹی! چائے بنا کر لے آؤ۔"

عابی کاٹیج کے اندر چلی گئی۔ جمشید نے کہا۔ "میں آپ کے اس طریقہ کار سے انکار نہیں کروں گا کہ زخمی مجرموں کی بھی مرہم پٹی ہونا چاہیے۔ انہیں پوری طرح میڈیکل ایڈ پہنچانا چاہیے لیکن جو جرائم کی راہ پر چل نکلے ہوں' انہیں آپ اپنی محبت اور مسیحائی سے راہِ راست پر نہیں لا سکیں گی۔"

"تم کسی حد تک درست کہہ رہے ہو۔ میں چند مجرموں کو سیدھے راستے پر لا چکی ہوں اور چند ایسے مجبور ہیں' جو جرائم کی دنیا سے واپس آئیں گے تو ان کی اپنی مافیا یا گینگ والے انہیں مار ڈالیں گے۔ تاکہ باقی مجرموں کی فہرست اور ان کے گینگ کے راز قانون کے محافظوں تک نہ پہنچ سکیں۔ کچھ مجرم رہے ہیں' جن کی جانیں میں نے بچائیں تو انہوں نے قسم کھائی کہ آئندہ کبھی کسی کی جان نہیں لیں گے۔ مختصر یہ کہ میں نے اپنے اعمال سے مجرموں کو پورا نہ سہی' آدھا انسان ضرور بنایا ہے۔ اس کے برعکس آدھے مجرموں کو جیل بھیجا جائے تو وہ پورے اور پکے مجرم بن کر جیل سے باہر آتے ہیں۔"

عابی چائے لے آئی۔ اس نے چائے کا ایک گھونٹ پی کر کہا۔ "میں مانتا ہوں' جیلوں میں سدھارا نہیں جاتا' بگاڑا جاتا ہے۔ حالانکہ جیلوں میں مسجدیں اور دینی تعلیمات کے

مدارس ہوتے ہیں۔ ہنرمند قیدیوں سے ان کے ہنر کے مطابق کام لیا جاتا ہے پھر بھی جیل کی یونیورسٹی سے مجرم بڑی تعداد میں باہر آتے ہیں۔"

وہ چائے پیتا رہا اور باتیں کرتا رہا پھر وہاں سے چلا گیا۔ اس نے جب بھی تابانی کا تعاقب کیا' صحیح سمت میں کیا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی اور تابانی کی خوش نصیبی کہ وہ ہمیشہ اس کی گرفت میں آنے سے بچتا رہا۔ اگر اس وقت بھی وہ چائے پی کر کاٹیج سے نہ جاتا یا چند گھنٹوں کے بعد کاٹیج آتا تو تابانی ضرور اس کی گرفت میں آ جاتا۔

تابانی وہاں شام کو ساڑھے چار بجے پہنچا۔ آمنہ نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ "تم اکیلے آئے ہو؟ یہ کس کی گاڑی ہے؟"

تابانی نے کہا۔ "پتا نہیں کس کی موت آئی تھی۔ میں نے اسے گولی مار کر یہ گاڑی چھین لی۔"

آمنہ نے بے یقینی سے پوچھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ڈینی کہاں ہے؟"

"وہ مجھے یہاں آنے سے روک رہا تھا۔ میں نے اسے ختم کر دیا۔"

وہ بولتا ہوا کاٹیج میں آیا۔ آمنہ اس کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔ "تابانی! اگر سچ کہہ رہے ہو تو پھر ابنارمل ہو۔ تم نے اپنے ہونے والے بچے کی قسم کھا کر کہا تھا کہ آئندہ کبھی مجرمانہ حرکت نہیں کرو گے۔"

اس نے آمنہ کی بات کا جواب نہیں دیا۔ عابی کو دیکھ کر پوچھا۔ "یہ لڑکی کون ہے؟"

"میری بیٹی ہے۔"

"میری معلومات کے مطابق تمہارا ایک ہی بیٹا ہے۔"

"یہ میری سوکن کی بیٹی ہے لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہارے انداز اور تیور بدل گئے ہیں۔ آخر بات کیا ہے؟"

"میری تو ایک ہی بات ہے۔ میں اپنے مراد کی رہائی اور سلامتی چاہتا ہوں۔"

"اللہ نے چاہا تو وہ رہائی حاصل کرے گا۔"

"تمہارا اللہ نہیں چاہے گا۔ میرا بھگوان نہیں چاہے گا۔ صرف میں چاہوں گا تو اسے رہائی اور نئی زندگی ملے گی۔"

اس نے ریوالور نکال کر کہا۔ "اے تم کمرے میں جاؤ۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔"

آمنہ نے کہا۔ "عابی! جاؤ بیٹی۔ اس کی بات مان لو۔"

عابی کمرے کے اندر گئی۔ تابانی نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی پھر آمنہ سے کہا

"تمہارا گاڈ فادر بھائی تمہاری خاطر جان بھی دے سکتا ہے۔ اگر میں تمہیں اغوا کر کے لے جاؤں اور یہ کہوں کہ بہن کو زندہ سلامت واپس چاہتے ہو تو مراد کو رہائی دلا کر میرے حوالے کرو تو وہ پوری جیل میں آگ لگا کر میرے مراد کو لے آئے گا۔"

"تم ایسی بے جا حرکت نہیں کرو گے' تب بھی وہ مراد کو لائے گا۔ میری ایک معمولی سی بات میرے بھائی کے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔"

"میں بھی یہی سمجھتا تھا لیکن کل رات پتا چلا کہ تمہارا بھائی اس شمشیر سنگھ کالیا کا بدترین دشمن ہے' جو ہماری "را" تنظیم کے کام آتا رہتا ہے اور تم اتنی سیدھی سادی' بھولی بھالی بننے والی اندر سے مکار ہو۔ تم نے کالیا کو اپاہج بنانے کے لیے اپنے بیٹے کو لندن بھیجا ہے۔"

دور سے ایک ہیلی کوپٹر کی آواز سنائی دی۔ آمنہ نے کہا۔ "میرا بیٹا فرمان لندن میں نہیں' پاکستان میں ہے اور ابھی یہاں آنے والا ہے۔ وہ بچپن میں مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ آج پہلی بار ہم ماں بیٹے ایک دوسرے کو قریب سے دیکھ کر ایک دوسرے کے دلوں کی دھڑکنوں سے لگیں گے۔"

"تمہاری یہ حسرت دل ہی میں رہ جائے گی۔ ابھی میرے ساتھ یہاں سے چلو اور چلنے سے پہلے جو کہتا ہوں' اسے ایک کاغذ پر لکھو۔"

"کیا مجھ سے زبردستی کرو گے؟"

اس نے دروازہ کھول کر عابی کو کھینچ کر باہر نکالتے ہوئے کہا۔ "اگر باتوں میں وقت ضائع کرو گی تو میں اسے گولی مار دوں گا۔"

آمنہ نے مجبور ہو کر میز کے پاس آ کر کاغذ قلم نکالا۔ تابانی نے کہا۔ "لکھو۔ بھائی ہاشم اور بیٹے فرمان! تابانی مجھے یرغمال کے طور پر بھارت لے جا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ مراد کو زندہ سلامت بھارت لے کر آؤ گے تو وہاں مجھے زندہ سلامت پاؤ گے۔ اگر مراد کو سزائے موت ہو گی تو میں بھی تم لوگوں کو زندہ نہیں ملوں گی۔ فقط تمہاری بہن' تمہاری ماں آمنہ۔"

آمنہ نے اس کے کہنے کے مطابق وہ تحریر لکھ دی۔ تابانی نے اس کاغذ پر ایک پیپر ویٹ رکھا پھر عابی کی گردن پکڑ کر اسے نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ چلتی رہو گی تو تمہاری جان سلامت رکھنے کی خاطر ڈاکٹر آمنہ بھی ساتھ چلے گی۔"

وہ عابی کو گن پوائنٹ پر رکھ کر کاٹیج سے باہر آیا۔ چند درختوں کے پیچھے کھلے میدان میں ایک ہیلی کوپٹر کھڑا ہوا تھا۔ آمنہ مجبور ہو گئی تھی۔ عابی کو بچانے کے لیے اس کے

ساتھ جا رہی تھی۔ تابانی نے ہیلی کوپٹر کے قریب پہنچتے ہوئے کوڈ ورڈز ادا کئے۔ پائلٹ نے اسے چہرے سے بھی پہچان لیا۔

ایسے ہی وقت میں ایک رینٹڈ کار ڈرائیو کرتا ہوا کاٹیج کے سامنے آیا۔ وہاں تابانی کی لائی ہوئی گاڑی کھڑی تھی۔ کاٹیج کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے امی سے پہلی بار ملنے کی خوشی میں کار سے نکلتے ہوئے آواز دی۔ "امی! امی!"

اس کے ساتھ ہی ہیلی کوپٹر کے گردش کرتے ہوئے پنکھے کی آواز سنائی دی۔ میں نے چونک کر گھومتے ہوئے دیکھا۔ چند درختوں کے پیچھے ایک ہیلی کوپٹر دکھائی دیا پھر عالی نظر آئی۔ تابانی نے اس کی گردن سے ریوالور لگا رکھا تھا۔ میں نے یک لخت ادھر دوڑتے ہوئے دیکھا تو امی نظر آئیں۔ وہ ہیلی کوپٹر میں سوار ہو کر ایک سیٹ پر بیٹھنے جا رہی تھیں۔ میں نے اکثر انہیں دور دور سے چھپ کر دیکھا۔ اس بار دیکھتے ہی پوری قوت سے چیخ کر آواز دی "امی! امی! اے تم کون ہو؟ میری امی اور بہن کو کہاں لے جا رہے ہو؟"

میں نے تابانی کا نام سنا تھا۔ اسے دیکھا نہیں تھا۔ میری چیختی ہوئی آوازیں گردش کرتے ہوئے پنکھے کے شور میں دب رہی تھیں۔ تابانی نے میری طرف دیکھا پھر عالی کو دھکا دے کر زمین پر گراتے ہوئے ہیلی کوپٹر پر چڑھنے لگا۔ وہ ہیلی کوپٹر زمین چھوڑ کر فضا میں بلند ہو رہا تھا۔ میں نے پوری تیز رفتاری سے دوڑ لگائی۔ اب بھی میں قریب پہنچتے ہی ہیلی کوپٹر کے نیچے لٹکتے ہوئی دشمن تک پہنچ سکتا تھا لیکن تابانی نے باہر کی طرف جھکتے ہوئے مجھ پر فائر کیا۔ ایک گولی میرے بازو کے گوشت کو ذرا سا ادھیڑتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے زمین پر گرتے ہی اپنا ریوالور نکالا پھر ہیلی کوپٹر کا نشانہ لیا۔ وہ میری فائرنگ رینج میں تھا مگر دماغ نے جیسے......... چیخ کر کہا نہیں' اگر گولی پائلٹ کو لگے گی یا پٹرول کی ٹنکی میں سوراخ کرے گی تو وہ پلک جھپکتے ہی دھماکے کی زوردار آواز سے بلاسٹ ہو گا۔ اس کے ٹکڑے ہوں گے پھر میں کبھی اپنی امی کو نہیں پا سکوں گا۔

ہیلی کوپٹر ایک لمبا سا موڑ لے کر دور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا سلائیڈنگ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ ماں اور بیٹے کے درمیان' زمین اور آسمان کے بیچ ایک دیوار بن گئی تھی۔ ہم ملتے ملتے بھی ایک دوسرے کی دھڑکنوں سے نہ لگ سکے۔ عالی دوڑتے ہوئے روتے ہوئے آکر مجھ سے لپٹ گئی۔

میں جوش اور جنون سے لرزتے ہوئے مٹھیاں بھینچ کر' دانت پیستے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہیلی کوپٹر دور ہوتے ہوئے ایک نقطہ بن کر نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ آہ! ماں کے سینے سے لگنا تو دور کی بات ہے' میں ان قدموں کو بھی نہ چھو سکا جن کے

نیچے جنت ہوتی ہے۔

میں خالی آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ آسمان میرے دیکھتے ہی دیکھتے میری امی کو نگل گیا تھا اور میں دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ جتنا چیختا چلاتا تھا' اس سے زیادہ میں حلق پھاڑتا رہا تھا۔ بعض اوقات جوش اور جنون میں آدمی پاگلوں کی طرح چیختا اور گالیاں دیتا ہے جیسے......... ماں بہنوں کو اغوا کرنے والے دشمن گالیاں کھا کر یا ہم سے سہم کر ہماری ماں بہنوں کو واپس کر دیں گے۔

ظلم ہمیشہ رُلانے کے لئے ہوتا ہے' آنسو پونچھنے کے لئے نہیں ہوتا۔ میری بہن عالی مجھ سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ میرے اندر آتش فشاں پھٹ کر لاوے کی طرح ابل کر ادھر بہنا چاہتا تھا' جدھر امی کو لے جایا گیا تھا۔ جبکہ میں زمین پر رہ کر آسمان پر ہیلی کوپٹر کی تیز رفتاری سے دوڑ لگا کر امی کو واپس لانے کے لئے نہیں جا سکتا تھا۔

اس نے میری امی کو لے جاتے وقت اور ہیلی کوپٹر کے بلند ہوتے وقت کئی فائر کئے تھے۔ صرف ایک گولی بازو کے گوشت کو ذرا سا ادھیڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ میرا وہ بازو اور ادھر لباس کا حصہ میرے لہو سے بھیگ رہا تھا۔ مجھے اپنے زخم کا' اپنی تکلیف کا اور لہو کے بہنے کا ذرا احساس نہیں تھا۔ وہ اپنے لہو میں نو ماہ تک پیٹ میں رکھ کر پالنے والی مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔ ایسے وقت جو صدمہ ہوتا ہے' وہ دکھ نہیں پہنچاتا' ایک چیلنج بن جاتا ہے۔

اور اب یہ اللہ ہی بہتر جانتا تھا کہ میں امی کو دنیا کے آخری سرے سے بھی واپس لانے کے لئے کس طرح دشمنوں کی موت بن سکتا ہوں۔ اس پورے ملک کو آگ لگا سکتا ہوں جہاں انہیں لے جایا گیا ہے۔

عالی روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "بھائی جان! ہماری امی کو لے جانے والا "را" کا بہت ہی خطرناک دہشت گرد ہے۔ اس کا نام تابانی ہے۔"

میں نے چونک کر عالی کو دیکھا۔ اگرچہ میں نے تابانی کو نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے بارے میں سنا تھا۔ تمام اخبارات میں یہ مضحکہ خیز خبر شائع ہو چکی تھی کہ ایک مرد ماں بننے والا ہے۔ ایسی انوکھی اور مضحکہ خیز خبر کے باعث مجھے تابانی اور اس سے تعلق رکھنے والے مراد کا نام یاد رہ گیا تھا۔

عالی نے کہا۔ "بھائی جان! فوراً کاٹیج میں چلیں۔ وہاں تابانی نے امی سے کچھ لکھوایا ہے۔"

یہ سنتے ہی میں دوڑتا ہوا کاٹیج کی طرف جانے لگا۔ ادھر جا کر میں......... حمزہ صاحب اور راجہ نواز کو امی کے اغوا کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ میں نے ایک جیب کو ٹٹولا' وہاں

موبائل فون نہیں تھا۔ دوسری جیب کو دوسرے ہاتھ سے ٹٹولنا چاہا' تب تکلیف کے احساس سے پتا چلا کہ میرا ایک بازو زخمی ہے اور میرے لباس کا ایک حصہ لہو سے بھیگتا جارہا ہے۔

میں کاٹیج کے اندر آیا۔ تیزی سے چلتا ہوا امی کے بیڈروم میں پہنچا۔ ان کی میز پر دور ہی سے ایک کاغذ پیپر ویٹ کے نیچے نظر آیا۔ میں نے دوڑ کر قریب پہنچ کر اسے اٹھایا پھر پڑھا۔ امی نے لکھا تھا۔

"بھائی ہاشم اور بیٹے فرمان! تابانی مجھے یرغمال کے طور پر بھارت لے جارہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ مراد کو زندہ سلامت بھارت لے کر آؤ گے تو وہاں مجھے زندہ سلامت پاؤ گے۔ اگر مراد کو سزائے موت ہوگئی تو میں بھی تم لوگوں کو زندہ نہیں ملوں گی۔ فقط تمہاری بہن' تمہاری ماں امنہ۔"

میں اپنی امی کی تحریر پڑھ کر لرز گیا۔ غصے سے ہانپنے لگا۔ اتنا تو معلوم ہوگیا تھا کہ وہ میری امی کو بھارت لے گیا ہے۔ اب میں وہاں جیسے اُڑ کر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ عابی نے فرسٹ ایڈ کا سامان لاکر کہا۔ "آپ بیٹھ جائیں۔ مجھے بہتے ہوئے خون کو روکنے دیں۔"

"خون کو بہنے دو۔" میں نے غصے سے آگے بڑھتے ہوئے باہر جاتے ہوئے کہا۔ "خون بہنے دو۔ پہلے امی کو واپس لاؤں گا۔"

وہ دوڑتے ہوئے مجھ سے آکر لپٹ گئی۔ روتے ہوئے بولی۔ "جب سارا خون بہہ جائے گا۔ آپ زندہ نہیں رہیں گے تو امی کو واپس کیسے لائیں گے۔ آپ کو میری قسم! امی کی قسم! رک جائیں۔"

میں ہارے ہوئے جواری کی طرح بے بسی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ کس طرح میری مرہم پٹی کر رہی ہے۔ ایسے وقت جیسے قدرتی طور پر راہنمائی ملی۔ مجھے اپنے استاد مقتول مراد چنگیزی کی بات یاد آئی۔ انہوں نے کہا تھا۔ "غصہ انسان کی عقل کو کھا جاتا ہے۔ جہاں فولادی جسم اور ہتھیار کام نہ آئیں' وہاں صرف ذہانت کام آتی ہے۔"

میں کچھ دھیما سا پڑ گیا۔ کوشش کرنے لگا کہ دشمن کو کچلنے سے پہلے اپنے اندر کے غصے' جوش اور جنون کو کچل دوں۔ اگر ایسے وقت عقل سے کام نہیں لوں گا اور خود کو ہر پہلو سے مضبوط نہیں بناؤں گا اور ایک جنونی کی طرح بھارت کی طرف دوڑتا جاؤں گا تو امی کو زندہ نہیں پاؤں گا۔

اس وقت بھی جب ہیلی کوپٹر میں وہ امی کو لے جارہا تھا' میں نے زخمی ہو کر گرنے

کے باوجود دوسرے ہاتھ سے ریوالور نکال کر ہیلی کوپٹر کی طرف فائر کرنا چاہا تھا۔ وہ میری فائرنگ رینج میں تھا۔ گولیاں لگتے ہی وہ پرواز کے قابل نہ رہتا لیکن اس وقت عقل نے یہی سمجھایا تھا کہ ہیلی کوپٹر گرے گا یا بلاسٹ ہوگا تو میری امی کو بھی نقصان پہنچے گا۔ میں انہیں زندہ نہیں پاؤں گا۔

میں مرہم پٹی ہونے تک اسی طرح ذہانت سے سوچتے ہوئے سب سے بڑے انسانی دشمن غصے کو ختم کرنے اور سنجیدگی سے اقدامات کرنے کے لئے خود کو سمجھاتا رہا۔ عابی نے کہا۔ "بھائی جان! آپ پہلے انکل ہاشم کو فون کریں۔"

"میرا موبائل فون شاید باہر گاڑی میں رہ گیا ہے۔ تم اسے لے آؤ۔"

اس نے اسی کمرے سے امی کا فون اٹھا کر نمبر ڈائل کرتے ہوئے مجھے دیا۔ میں نے اسے لے کر کان سے لگایا۔ ہاشم انکل کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو باجی! یہ نمبر صرف آپ جانتی ہیں۔"

"میں فرمان بول رہا ہوں انکل! ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ تابانی میری امی کو اغوا کر کے بھارت لے گیا۔"

وہ غصے سے دہاڑنے والے انداز میں بولا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو فرمان! میری بہن کو کوئی ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ یہ کتنی دیر کی بات ہے؟"

"انکل! ویسے تو میں دشمنوں کا خون پی جانا چاہتا ہوں لیکن غصے میں کوئی قدم اٹھانے سے امی کو وہ مار ڈالے گا۔ امی جو لکھ کر گئی ہیں' پہلے آپ اسے سن لیں۔"

عابی وہ کاغذ اٹھا کر لائی۔ میں پڑھ کر انہیں سنانے لگا۔ وہ سن کر بولے۔ "ہوں' تو اس نے اپنے یار کو زندہ سلامت حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا ہے۔ میں نے باجی کے حکم سے اس کتیا کو پولیس کی حراست سے فرار کرایا تھا۔ اب وہ دشمن بن کر اپنی محسنہ کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ میری بہن کو لے گئی ہے۔ اب میں اس کے سامنے اس کے یار مراد کو گولی مار کر باجی کو واپس لاؤں گا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا مراد کو جیل سے فرار کرایا جاسکتا ہے؟"

"میں جان پر کھیل کر اسے رہا کراسکتا ہوں مگر کچھ وقت لگے گا۔ پولیس والوں نے بڑی رازداری سے کام لیا ہے۔ اسے کسی دوسرے شہر کی جیل میں منتقل کر دیا ہے۔ ایک تو اس جیل کا پتا چلانا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تابانی کے فرار ہونے کے بعد پولیس والوں نے مراد کے سلسلے میں بڑی سختی کی ہوئی ہے۔ پولیس اور انتظامیہ کی تمام سختیوں کو اچھی سمجھنے کے بعد کوئی جوابی کارروائی کرنی ہوگی۔"

"پھر تو ہفتوں اور مہینے بھی لگ سکتے ہیں۔ میں اتنے عرصے تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہوں گا۔ میں بھارت جاؤں گا۔"

"بیٹے! ایک تو تابانی کو اپنی توقع سے زیادہ خطرناک عورت یا مرد کہہ لو۔ دوسری اہم خطرے کی بات یہ ہے کہ وہ "را" تنظیم کی پناہ میں ہوگی۔ ہم نہیں جانتے وہ کس صوبے کے کس شہر میں ہوگی اور پتا نہیں اس نے باجی کو کہاں چھپا کر رکھا ہوگا۔"

"انکل! ایک اندھا بھی لاٹھی ٹیکتا ہوا اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ میں عقل کا اندھا نہیں ہوں۔ شمشیر سنگھ کالیا نے پاکستان کے راستے اسمگلنگ کرانے کے لئے یہاں کتنے ہی مجرموں کو خرید رکھا تھا۔ کیا آپ نے بھارت میں مجرموں کو نہیں خریدا ہے؟"

"بے شک وہاں کے ہر بڑے شہر میں اور تمام سرحدی چوکیوں پر میرے زر خرید مجرم بھی ہیں' سیاسی بھی ہیں اور کسٹم افسران بھی۔ تم جہاں جاؤ گے' تمہیں ان سے ضرورت کی ہر چیز ملے گی لیکن مراد کو لے جائے بغیر تابانی کے علم میں آؤ گے تو وہ باجی کے لئے مشکلات پیدا کرے گا۔"

"وہ مجھے چہرے سے نہیں پہچانتا ہے۔ میں وہاں نام بدل کر رہوں گا۔ میں تابانی کو پہچاننے کے لئے اس کی تصویر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ تم اس کی تصویر دیکھ لوگے۔ اس کی جتنی ہسٹری ہمارے علم میں ہے' وہ تمہیں بتا دی جائے گی۔ "را" تنظیم کے بارے میں بھی پوری معلومات فراہم کی جائیں گی۔ ویسے میں حیران ہوں کہ تابانی نے ہم پر بھروسا کیوں نہیں کیا۔ اتنا بڑا قدم کیوں اٹھایا ہے؟"

عالی نے کہا۔ "وہ امی سے کہہ رہا تھا کہ شمشیر سنگھ کالیا ضرورت کے وقت "را" تنظیم کے کام آتا ہے۔ امی نے اس کالیا کو اپاہج بنانے کے لئے اپنے بیٹے فرمان کو لندن بھیجا تھا۔ ایک تو آپ گاڈفادر کی حیثیت سے ان کے دشمن ہیں پھر بھائی جان کو بھی کالیا کا دشمن کہہ کر وہ امی کو یہاں سے لے گیا ہے۔"

ہاشم نے مجھ سے کہا۔ "بیٹے باجی کے بعد تمہیں خطرات سے کھیلنے کی اجازت دینا دانش مندی نہیں ہے لیکن خود باجی چاہتی رہی ہیں کہ تم خطرات سے کھیلتے رہو۔ تم عالی کو لے کر لاہور کی کوٹھی میں جاؤ۔ میں آج ہی رات تمہیں دو آدمیوں کے ساتھ سرحد پار کراؤں گا۔ وہ دونوں بہت چالاک ہیں' بھارت کے تمام علاقوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ وہاں تمہارے گائیڈ اور باڈی گارڈ بن کر رہیں گے۔ مجھے بھی اطمینان رہے گا کہ تم وہاں تنہا نہیں ہو۔"

ہمارا فون سے رابطہ ختم ہوگیا۔ عالی نے کہا۔ "بھائی جان! آپ کو امی کی خاطر ضرور جانا چاہیے لیکن آپ زخمی ہیں۔ خون بہت بہہ چکا ہے۔"

"میں خون کا ہی حساب کرنے جارہا ہوں۔ انسانی جسم سے خون نکلتا ہے تو قدرتی طور پر بنتا بھی رہتا ہے۔ مجھے دودھ اور جوس پلاؤ پھر ہم لاہور چلیں گے۔"

وہ فریج سے پھل اور دودھ نکالنے کے لئے چلی گئی۔ میں نے فون کے ذریعے حمزہ صاحب سے رابطہ کرنا چاہا' رابطہ نہیں ہوا۔ انہوں نے فون بند کر رکھا تھا۔ یوں فون کو بند رکھنے میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔

دراصل یہ وہی وقت تھا جب حمزہ صاحب نے ایک بینک میں کاشف اکبر اور دردانہ بیگم سے ملاقات کی تھی۔ ان کا اعتماد حاصل کرکے ان کے اس محل میں گئے تھے' جہاں کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ ایسے وقت وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے موبائل فون سے کوئی انہیں حمزہ کا نام لے کر مخاطب کرے اسی لئے انہوں نے فون بند رکھا تھا۔

عالی میرے لیے پھل اور دودھ لے کر آئی۔ میں نے انہیں کھاتے پیتے ہوئے راجہ نواز سے رابطہ کیا پھر اپنا نام بتا کر اپنی امی کے متعلق بتایا۔ اس نے کہا۔ "فرمان ایک ماں کو اغوا کیا جائے تو یہ ناقابلِ برداشت ہوتا ہے لیکن تمہیں برداشت بھی کرنا ہوگا اور پریشانیوں کو پس پشت رکھ کر یہ سمجھنا ہوگا کہ تمہاری امی کو یرغمال بنانے کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ تابانی اپنے مراد کی خاطر ایسا کر رہا ہے۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا اور بھی کوئی وجہ ہوسکتی ہے؟"

"ہاں۔ ہم سیاست کو بہت دور تک سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے ضروری اقدامات کرتے ہیں۔ تابانی بھی یہی سمجھ رہا ہوگا کہ اس کے مراد کو حاصل کرنے کی خاطر "را" والے تمہاری امی کو یرغمال بنانے کے لئے اسے ہیلی کوپٹر وغیرہ کی سہولتیں فراہم کرچکے ہیں۔ ذرا غور کرو۔ "را" جیسی سیاسی تنظیم میں مراد جیسے ایک مہرے کی کیا اہمیت ہوگی۔"

"پلیز! وضاحت کریں اور کیا وجہ ہوسکتی ہے؟"

"را" اور "موساد" جیسی تنظیموں میں ابتری پھیلانے کے لئے انڈر گراؤنڈ کارکنوں کی اہمیت ہوتی ہے۔ تابانی اور مراد سے زیادہ اس انڈر ورلڈ مافیا شمشیر سنگھ کی اہمیت ہے۔" راجہ نے بتایا.......... "وہ "را" کے اور بھارتی حکومت کے بہت سے راز جانتا ہے اور انڈر گراؤنڈ رہ کر بھارت کے لئے بڑے بڑے کام کرتا ہے۔ تم نے اسے اپاہج بنادیا ہے۔ تمہاری امی اسے پھر سے چلنے پھرنے کے قابل بناسکتی ہیں۔ اسی لئے تابانی کے عشقیہ جذبات سے فائدہ اٹھا کر تمہاری امی کو وہاں لے جایا گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "بخدا میں نے اتنی دور تک نہیں سوچا تھا۔"

"میں نے دور تک سوچنے کی بات بتائی۔ اب گہرائی تک سوچنے کی بات کہنے سے پہلے کیا تم سے امید رکھوں کہ تم صرف اپنی ماں کے بیٹے بننے کے لئے نہیں' پاکستان کی ہر ماں کے بیٹے بننے کے لئے پیدا ہوئے ہو۔ تم صرف ایک ماں کی جان ہارنے سے اپنا حوصلہ نہیں ہارو گے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"وہی کہہ رہا ہوں جو اس وقت حمزہ تم سے کہتا۔ یہ ہماری قسم ہے کہ ہم اپنی ماؤں' بہنوں اور بیٹیوں کے ماتم نہیں' جہاد کریں گے۔"

"میں نے بھی حمزہ صاحب کے ساتھ رہ کر قسم کھائی ہے۔"

"تو پھر سنو۔ تمہاری امی عالمی شہرت کی حامل ہیں۔ "را" یا بھارت حکومت یہ تسلیم نہیں کرے گی کہ پاکستان کی ایک عالمی شہرت یافتہ لیڈی ڈاکٹر کو اغوا کر کے بھارت لے جایا گیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کالیا کا علاج ہونے تک انہیں کہیں چھپا کر زندہ رکھا جائے گا۔ اس کے بعد انہیں ہمیشہ کے لئے چھپا دیا جائے گا۔"

یہ ایسی بات تھی کہ میرے دماغ میں آندھی سی چلنے لگی۔ میں نے خود کو ایک تنکے کی طرح اُڑتے ہوئے محسوس کیا۔ کیا امیر حمزہ اور راجہ نواز کی مائیں بہنیں نہیں ہیں۔ اگر نہیں ہیں تو پہلے تھیں؟ کیا ان کے دماغوں میں آندھیاں نہیں چلتی ہوں گی۔ کیا وہ میری طرح تنکے بن کر اڑ جاتے ہیں یا فولادی چٹانوں کی طرح سیاسی طوفانوں سے لڑتے جا رہے ہیں۔

راجہ نواز نے پوچھا۔ "کیا تم پر سکتہ طاری ہو گیا؟"

"نہیں۔ میں آپ کے اور حمزہ صاحب کے بارے میں سوچ رہا ہوں' کیا میں آپ لوگوں کی طرح فولاد نہیں بن سکتا؟"

"شاباش فرمان! تمہیں اچھی طرح سمجھنے کے بعد ہی حمزہ نے ساتھ رکھا ہے۔ اب تمہیں یہ حوصلہ رکھنا ہے کہ کالیا کا آپریشن پیچیدہ ہو گا۔ کم از کم دو تین ماہ کا عرصہ لگے گا اور یہ عرصہ کم ہونے کے باوجود حوصلہ مندوں کے لئے بہت ہوتا ہے۔"

"خدا کی قسم! یہ عرصہ میرے لئے بہت ہے۔"

"حمزہ ایک جگہ مصروف ہے۔ اس کا موبائل آن ہو گا تو میں اسے تمام حالات بتاؤں گا۔ ہم کوئی ٹھوس پلاننگ کریں گے۔"

میں نے اپنے موبائل کے علاوہ امی کے موبائل اور لاہور کی کوٹھی کے فون نمبر

بتائے پھر رابطہ ختم کر دیا۔ عالی اپنی اٹیچی میں ضروری سامان رکھ رہی تھی۔ میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ اپنی جسمانی قوت اور حوصلوں کی بلندیوں پر صرف اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ سیاست' بدلتے ہوئے ملکی حالات اور اپنے آزمودہ سیاست دانوں کے تمام ہتھکنڈوں کو' خفیہ ایجنسیوں کو اور آس پاس کے جغرافیائی حالات کو بیک وقت ذہن میں رکھ کر حمزہ صاحب اور راجہ نواز کی طرح دور تک گہرائی سے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے۔

ان کی طرح عمل کرنے والوں میں ایک میرا اضافہ ہوا تھا۔ آج ہم تین ہیں تو کل تین لاکھ اور تین کروڑ پاکستانی ایسے ہو سکتے ہیں۔ میرے اندر امی کے لیے تڑپ تھی مگر میں خود کو پتھر بنانے کی کوشش کر رہا تھا پھر میں نے عالی کی اٹیچی اٹھا کر کہا۔ "آؤ چلیں۔"

"بھائی جان! آپ کا ایک ہاتھ زخمی ہے۔ آپ کار کیسے ڈرائیو کریں گے۔ آپ مجھے اجازت دیں۔ میں ڈرائیو کر سکتی ہوں۔"

"ویسے تو میں ڈرائیو کر سکتا ہوں مگر تمہیں ایکٹو بنانا چاہتا ہوں۔ کم آن تم گاڑی چلاؤ۔"

وہ اندرونی دروازے لاک کر رہی تھی پھر ہم کاٹیج کے باہر برآمدے میں آ کر رک گئے۔ پولیس کی گاڑیوں سے مسلح سپاہی اترتے ہوئے ہمارے کاٹیج کو چاروں طرف سے گھیر رہے تھے۔ میں نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ عالی نے ایک موٹر سائیکل سے اترنے والے جوان کو دیکھ کر کہا۔ "بھائی جان! یہ صبح بھی آیا تھا۔ اس کا نام جمشید ہے۔ یہ انٹیلی جنس کا ایک افسر ہے۔"

جمشید نے ایک پولیس وین کے پیچھے کھڑے ہو کر ہاتھ میں ریوالور نکال کر کہا۔ "ہم صحیح وقت پر آئے ہیں۔ دیر ہوتی تو فرار ہو جاتے۔"

وہ عالی کی اٹیچی کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "بات کیا ہے؟"

جمشید نے میرے سوال کو نظر انداز کر کے پوچھا۔ "ڈاکٹر آمنہ خاتون اور تابانی کہاں ہیں؟"

میں نے کہا۔ "پولیس ہمیشہ دیر سے پہنچتی ہے مگر پولیس کو کیا الزام دوں؟ مقدر نے مجھے بھی دیر سے یہاں پہنچایا ہے۔ میں لیڈی ڈاکٹر آمنہ خاتون کا بیٹا فرمان علی ہوں۔ میری یہ بہن عالی ہے۔ تابانی میری امی کو گن پوائنٹ پر یہاں سے اغوا کر کے لے گیا ہے۔"

میں نے جیب سے امی کی تحریر نکال کر اسے دی۔ وہ اسے پڑھنے لگا پھر میں نے شرٹ کے بٹن کھول کر اپنا زخمی بازو دکھاتے ہوئے کہا۔ "اگر مجھے یہ گولی نہ لگتی تو میں

اس ہیلی کوپٹر تک پہنچ جاتا۔ وہ ذلیل نہ مرد ہے اور نہ عورت کہلانا پسند کرتا ہے۔ میں اسے امی کو لے جانے کا موقع نہ دیتا۔"

میں اور عالی اسے امی کے اغوا کے بارے میں تمام تفصیلات بتانے لگے۔ جمشید ہماری باتیں سنتا ہوا دو پولیس افسران کے ساتھ کاٹیج کے اندر آگیا تھا۔ عالی دروازہ کھول رہی تھی۔ وہ پورے کاٹیج کا اندر سے دیکھنے کے بعد بولا۔

"تمہاری والدہ عالمی سطح پر جتنی مشہور اور معزز ہیں' قانون کی نظروں میں اتنی ہی مشکوک ہیں۔ میں نے انہیں سمجھایا تھا کہ تابانی کو جہاں بھی چھپا کر رکھا ہے' اسے پولیس کے حوالے کردیں۔"

"میری امی نے اسے نہیں چھپایا تھا۔"

"لاہور کی ایک کوٹھی میں تابانی بالوں کی وگ لگا کر عورت بن کر رہتا تھا اور ڈینی نام کا شخص اس کا نمائشی شوہر بنا ہوا تھا۔ کل رات تابانی نے ڈینی کو قتل کردیا۔ ہم نے تفتیش کی۔ آس پاس کی کوٹھی والوں نے اس عورت کا جو حلیہ بتایا' وہ تابانی کی طرح تھا۔ جب تابانی کی تصویر دکھائی گئی تو شناخت ہوگئی۔ آس پاس کی کوٹھی والوں نے تصدیق کی پھر یہ بھی بیان دیا کہ لیڈی ڈاکٹر آمنہ خاتون وہاں دو بار آچکی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کوئی ڈاکٹر سوچ سمجھ کر کسی مجرم کے گھر نہیں جاتا۔"

"یہ بات پولیس کے ریکارڈ میں ہے کہ تمہاری والدہ' تابانی اور مراد کی حمایت کرتی تھیں۔ انہوں نے تابانی کو پولیس کسٹڈی سے فرار ہونے میں مدد کی تھی۔ تم نے یہ جو تحریر دی ہے' اس میں انہوں نے گاڈ فادر ہاشم کو مخاطب کرکے ہمیں اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ تابانی کو فرار ہونے کے لئے ہاشم کی طرف سے وہ فلائنگ کائٹ فراہم کی گئی ہوگی۔"

میں نے غصے سے کہا۔ "ایک تو وہ میری امی کو یرغمال بنا کر لے گیا ہے۔ اس پر آپ میری امی کو ہی الزام دے رہے ہیں۔"

"مجرموں کو پناہ دینے والے ایسی ہی مصیبتوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔"

ایک پولیس افسر نے کہا۔ "ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلو اور وہاں تحریری بیان دو۔"

اس نے ریوالور نکال لیا تھا۔ دو سپاہیوں نے میری تلاشی لی۔ ایک ریوالور برآمد ہوا۔ آفیسر نے پوچھا۔ "اس کا لائسنس ہے؟"

"میں کراچی میں چھوڑ آیا ہوں۔"

عالی کی اٹیچی کی تلاشی لی گئی۔ اسی وقت میرے موبائل فون سے بزر کی آواز ابھری۔ میں نے اسے آن کیا۔ جمشید نے فوراً ہی اسے میرے ہاتھ سے لے کر کہا۔

"سوری۔ اسے تفتیش کا ایک حصہ سمجھو۔"

اس نے فون کو کان سے لگایا پھر پوچھا۔ "ہیلو۔ کون ہے؟"

دوسری طرف سے حمزہ نے تعجب سے پوچھا۔ "جمشید! تم بول رہے ہو؟"

جمشید نے بھی حیرانی سے پوچھا۔ "بھائی جان! آپ؟ آپ نے ڈاکٹر آمنہ کے بیٹے کو فون کیا ہے؟"

"ہاں۔ فرمان کہاں ہے؟"

"میرے سامنے ہے۔ ہم اس سے تحریری بیان لینے کے لئے تھانے لے جارہے ہیں۔ ایک مجرم تابانی نے لاہور میں ایک شخص کا مرڈر کیا ہے اور ڈاکٹر آمنہ کو یہاں سے بھارت لے گیا ہے۔"

"مجھے ابھی معلوم ہوا ہے۔ بیان لینے کے لئے فرمان کو تھانے کیوں لے جارہے ہو؟"

"تابانی کے فرار میں ڈاکٹر آمنہ ملوث رہی ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک تحریر میں انڈرورلڈ کے ایک گارڈ فادر ہاشم کو مخاطب کیا ہے۔ اسے اطلاع دی ہے کہ تابانی' مراد کو حاصل کرنے کے لئے انہیں یرغمال بنا کر لے جارہا ہے۔"

"کیا اس سے ڈاکٹر آمنہ کی مظلومیت ظاہر نہیں ہوتی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ عالمی سطح کے خطرناک مجرم بھی احسان مند ہوکر ڈاکٹر آمنہ خاتون کو فون کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ زخمی مجرموں کی جان بچانے' ان کا علاج کرنے کے لئے قانون سے لڑتی ہیں۔"

"جی ہاں۔ یہ تو جانتا ہوں لیکن.........."

"کوئی بحث نہ کرو۔ جس طرح تم مجھے بھائی جان کہتے ہو۔ اسی طرح میں ڈاکٹر آمنہ کو باجی کہتا ہوں۔ وہ قابلِ احترام ہستی ہیں۔ ان کا بیٹا فرمان میرا دست راست ہے' اگر اس سے بیان لینا ضروری ہے تو تھانے نہ لے جاؤ۔ وہ جہاں ہے' وہیں بیان لو۔ اسے پولیس کی بے مقصد کارروائیوں میں نہ الجھاؤ۔ فون اسے دو۔"

اس نے مجھے فون دیا۔ میں نے ان کی آواز سن کر کہا۔

"حمزہ صاحب! اتنی دیر سے آپ بول رہے تھے؟"

"ہاں۔ مجھے راجہ نواز نے سب کچھ بتا دیا ہے اور یہ جمشید میرا چھوٹا بھائی ہے۔ میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔ یہ تمہیں تھانے نہیں لے جائے گا۔ وہیں بیان لے گا۔ ان لوگوں

سے نمٹنے کے بعد مجھے فون کرو۔"

فون پر ہماری گفتگو کے دوران میں جمشید نے پولیس کے دونوں افسران کو سمجھا دیا تھا۔ انہوں نے کاٹیج کے اندر رسمی سا بیان لیا پھر تمام سپاہیوں کے ساتھ چلے گئے۔ جمشید نے جانے سے پہلے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ بھائی جان کے دست راست ہیں۔ یہ ایسا معاملہ تھا کہ میں نے پولیس والوں کی طرح سخت رویہ اختیار کیا تھا۔ مجھ سے جو گستاخی ہوئی ہے۔ اس کی معافی چاہتا ہوں۔"

میں نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے گستاخی نہیں کی ہے بلکہ مہربانی کی ہے۔ پولیس والوں سے جان چھڑا دی ہے۔"

اس بات پر ہم سب ہنسنے لگے۔ وہ اپنی موٹر سائیکل پر چلا گیا۔ عالی نے کاٹیج کو باہر سے لاک کیا پھر ہم کار میں بیٹھ کر لاہور جانے لگے۔ وہ ڈرائیو کر رہی تھی۔ میں نے موبائل کے ذریعے حمزہ صاحب سے رابطہ کیا۔ انہوں نے پوچھا۔ "کیا جمشید چلا گیا؟"

"جی ہاں! میں اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ لاہور والی کوٹھی میں جارہا ہوں۔"

"تمہیں راجہ نے بتایا ہے کہ تقریباً دو ماہ تک تمہاری امی کی جان کو خطرہ نہیں ہے؟"

"انہوں نے مجھے بہت کچھ سمجھایا ہے۔ میں آج رات بھارت جارہا ہوں۔ ہاشم انکل اس سلسلے میں انتظامات کر رہے ہیں۔"

"ہوں۔ ماں کے لئے تو تمہیں جانا ہی ہوگا لیکن تمہیں "را" تنظیم سے پوری طرح واقفیت رکھنی چاہیے۔"

"انکل تمام معلومات فراہم کریں گے۔ میرے ساتھ دو گائیڈز رہیں گے لیکن میں مقتول استاد مراد چنگیزی اور آپ کے اصولوں پر عمل کرتا رہوں گا۔ میں ان دو گائیڈز تو کیا' اپنے سائے پر بھی بھروسا نہیں کروں گا۔"

"یہی میں کہنا چاہتا تھا۔ سب کی سنا کرو مگر اپنی ذہانت' تجربات اور حاضر دماغی سے کام لیا کرو۔ یہ سمجھا کرو کہ میں تمہارے پاس ہوں۔ جب کال کرو گے' میں تمہارے پاس چلا آؤں گا۔"

"شکریہ حمزہ صاحب! اللہ کے بعد آپ کو پکاروں گا اور آپ سے رابطہ رکھوں گا۔"

"کیا تمہاری چھوٹی بہن تنہا رہے گی؟"

"اس کی حفاظت کی ذمے داری انکل پر ہے۔ کوٹھی کے باہر مسلح گارڈز رہا کریں گے۔ ماشاء اللہ میری بہن بھی بڑے حوصلے والی ہے۔"

انہوں نے پھر رابطہ کرنے کو کہا اور فون بند کر دیا۔ عالی نے کہا۔

"بھائی جان! یہ حمزہ صاحب کون ہیں؟"

میں نے کہا۔ "ویسے تو عام پاکستانی ہیں لیکن عام پاکستانیوں کے مقابلے میں زیادہ حساس ہیں۔ ہمہ وقت ملک دشمن عناصر کی سرگرمیوں سے باخبر رہتے ہیں۔ ان کے جانباز سراغ رسانی کے لئے ایسی تمام جگہ موجود رہتے ہیں جہاں دشمن ہماری ملکی سلامتی کو نقصان پہنچانے کے لئے آنا چاہتے ہیں اور ناکام ہوتے رہتے ہیں۔"

"پھر تو جانبازوں کی بہت بڑی فوج ہوگی۔ ان کے اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں؟"

"پاکستان میں کوئی ملازمت کرتا ہو' یا کوئی کاروبار کر رہا ہو' وہ آٹھ یا دس گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کرتا۔ صحت مندی کے لئے پانچ گھنٹے یا چھ گھنٹے کی نیند کافی ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ سونے والے بے پرواہ اور غیر ذمے دار ہوتے ہیں۔ فضول تفریحات میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ جاپان ایک ایسا مثالی ملک ہے جہاں پوری قوم صرف وقت کے مطابق سوتی ہے۔ باقی اٹھارہ گھنٹے کام کرتی ہے۔ ان کی تیار کردہ مصنوعات سپرپاور امریکا کی مصنوعات پر حاوی ہو گئی ہیں۔ ہمارے پاکستانیوں کا مقابلہ سپرپاور سے نہیں بلکہ اپنے ہی ملک کے کرپٹ سیاست دانوں سے ہے۔ ملک کا سیاسی نظام بہتر ہوگا تو ہماری قوم کے لئے خود بہتری کے راستے ہموار ہوتے چلے جائیں گے۔ میری بہن! تمہارا سوال ہے کہ جانبازوں کی فوج کے اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں؟ جان باز کا مطلب ہے جان کی بازی لگانے والے۔ جو جان دینے کا جذبہ رکھتے ہیں وہ صلے میں ملک کی سلامتی اور بقا چاہتے ہیں۔ وہ تنخواہ نہیں مانگتے' ظالم سیاست دانوں کے سر مانگتے ہیں۔ اپنا فاضل وقت خواہ مخواہ تفریحات میں نہیں گزارتے' وہ حمزہ صاحب اور راجہ نواز جیسے محبان وطن سے فاضل اوقات میں ٹریننگ حاصل کرتے ہیں۔ ٹریننگ حاصل کرنے کا کوئی اسکول نہیں ہے۔ وہ عملی طور پر ان کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں اور یوں تربیت حاصل کرتے رہتے ہیں کہ ملک کو تباہی کی طرف لے جانے والے سیاست دانوں سے کیسے نمٹنا چاہیے۔ ابھی ہم زر خرید سیاستدانوں کے قدم اکھاڑ نہیں پائے ہیں لیکن یہ سمجھا چکے ہیں کہ پاکستانی عوام تر نوالہ نہیں ہیں۔ لوہے کے چنے ہیں۔ ہمیں چبانے والوں کے دانت ٹوٹ جائیں گے۔"

میں لاہور والی کوٹھی میں پہنچا تو امی کی یاد ستانے لگی۔ میں اس کے بیڈ روم میں بیٹھ کر سوچنے لگا۔ جب وہ گھر سے بے گھر ہوئیں تو جوان تھیں۔ مجھے میرے بے حس باپ

اور سوتیلے رشتے داروں کے پاس چھوڑ کر دوسری شادی کرسکتی تھیں لیکن انہوں نے بڑے عزم سے مجھے اپنے لئے فولادی ڈھال بنانے اور اپنے دامن پر لگے ہوئے دھبے کو مٹانے کے لئے دوسرا گھر نہیں بسایا۔ انہوں نے یہ دوہرا گھر اور جتنی جائیداد بنائی' سب میرے لئے اپنی خواہشات کو کچل کر بنائی۔

میں نے ہاشم انکل کو فون پر بتایا کہ عالی کے ساتھ لاہور والی کوٹھی میں آگیا ہوں۔ انہوں نے کہا۔ ابھی آدھے گھنٹے میں تین بندے میرے پاس آئیں گے اور بھارت جانے کے سلسلے میں اہم گفتگو کریں گے۔ انہوں نے ان تینوں کے نام بتا کر رابطہ ختم کردیا۔

☆======☆======☆

کاشف اکبر کی محل نما کوٹھی جیسے ایک قلعہ تھی۔ دشمن تو کیا دوست بھی اپنی شناخت کرائے بغیر اس کے احاطے میں گیٹ کے سامنے کھڑے نہیں ہوسکتے تھے۔ گیٹ پر اور احاطے میں کوٹھی کے چاروں طرف مسلح گارڈز تعینات تھے۔ کوٹھی کے اندر ایسے الیکٹرونک آلات تھے' جو کسی خطرے کے وقت باآواز الارم اور سرخ لائٹ کے ذریعے مسلح گارڈز کو سگنل دیتے تھے۔

ایسی جگہ کو کہا جاتا ہے کہ وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا اور ایسی ہی جگہ امیر حمزہ بڑے آرام سے کاشف اکبر اور دردانہ بیگم کے ساتھ کار میں بیٹھ کر ان کی کوٹھی کے احاطے میں پہنچ گیا۔ پچھلے باب میں یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ کاشف اکبر اور دردانہ بیگم جب بینک منیجر کے کمرے میں گئے تھے تو امیر حمزہ نے ان کے مخالف نیک بخت کی بہت بڑی کمزوریاں بتاکر ان سے دوستی بھی کی تھی اور ان کا اتنا اعتماد حاصل کرلیا تھا کہ وہ دونوں اسے اپنی کوٹھی میں لے آئے تھے۔

انہوں نے ڈرائنگ روم آکر کہا۔ "مسٹر رمزی تشریف رکھیں۔ ہم ابھی آتے ہیں۔ بائی دا وے آپ ٹھنڈا پئیں گے یا گرم.........."

"آپ تکلف نہ کریں جو پینا ہوگا' وہ آپ دونوں کے ساتھ بیٹھ کر پیئوں گا۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "آپ کچھ خیال نہ کریں۔ آپ نے بینک میں جو تحریریں دی ہیں۔ ہم ان کی تصدیق کریں گے اس میں کچھ وقت لگے گا۔ آپ تنہا بور ہوں گے۔"

"آپ میری فکر نہ کریں۔ ہم نے نیک بخت کو ہمیشہ کے لئے بدبخت بنانے کا جو پلان بنایا ہے' اس پلان میں سب سے اہم بات آپ سے دوستی ہے۔ آپ ساتھ دیں گے تو پلان کبھی ناکام نہیں ہوگا۔ میں کامیابی کی خاطر یہاں گھنٹوں تنہا بیٹھا رہوں گا۔"

وہ حمزہ کی باتیں سن کر خوش ہورہے تھے۔ حمزہ نے اپنا نام انہیں احمد رمزی بتایا تھا۔

بینک میں جن تین ایم این اے کی تحریر کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں دی تھیں' کاشف اکبر اپنے بیڈ روم میں جاکر فون کے ذریعے ان تینوں ایم این اے سے گفتگو کرکے ان سے تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

وہ دردانہ بیگم کے ساتھ جانے لگا۔ حمزہ نے کہا۔

"پلیز.........! جسٹ اے منٹ۔ آپ ان تحریروں کے بارے میں ضرور تصدیق کریں۔ ان کے علاوہ اور پکا ثبوت چاہتے ہیں تو میں ابھی فون کرکے ان تین ایم این اے کی آڈیو اور ویڈیو کیسٹس یہاں منگواتا ہوں۔ آپ ٹی وی اسکرین پر آنکھوں سے انہیں دیکھیں گے اور ویڈیو کے ذریعے ان کی رازدارانہ گفتگو سن سکیں گے۔"

"اوہ..........! اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔ آپ ابھی منگوائیں۔"

حمزہ نے ان کے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے پھر اپنے ایک جانباز سے کہا۔ "حیدر علی! ہمارے حمزہ صاحب نے ان تینوں کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹس کے چند مناظر اور ان کی تھوڑی سی گفتگو الگ ریکارڈ کرائی تھی۔ کاشف اکبر صاحب انہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہاں۔ ہاں.......... ہاں اچھا۔ ان سے کہہ دینا کہ دردانہ بیگم صاحبہ کے محل میں ہماری کوئی چیز غلط ہاتھوں میں نہیں پہنچے گی۔ یہاں محل کے گیٹ پر آؤگے تو.......... تو اچھا ذرا ٹھہرو۔"

حمزہ نے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کاشف اکبر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا پندرہ منٹ کے بعد آپ کا سیکورٹی افسر مین گیٹ پر رہے گا؟ ایک شخص ایک بیگ میں تین ویڈیو کیسٹس اور دو آڈیو کیسٹس لائے گا۔ میرے اس آدمی کا یہاں آنا ضروری نہیں ہے۔ آپ کا سیکورٹی افسر بیگ میں لائی ہوئی چیزوں کو خود اچھی طرح چیک کرکے یہاں لے آئے گا؟"

دردانہ بیگم نے کہا۔ "ہاں۔ میں ابھی انٹرکام پر سیکورٹی افسر سے کہہ دیتی ہوں۔"

حمزہ نے ریسیور کے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹا کر کہا۔ "ہاں حیدر علی! سنو۔ تم ایک بیگ میں وہ چیزیں لے کر صرف مین گیٹ تک آؤگے اور وہ بیگ سیکورٹی افسر کو دے دوگے۔ تمہارا یہاں اندر آنا ضروری نہیں ہے جو بات ہوگی' اس کے مطابق میں حمزہ صاحب سے براہ راست فون پر انہیں تفصیلات بتادوں گا۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ دردانہ بیگم نے کہا۔ "ہمیں خوشی ہے کہ تم ہمارے کچھ کہنے سے پہلے ہی اتنی احتیاطی تدابیر پر عمل کر رہے ہو۔ میں ابھی جاکر سیکورٹی افسر کو حکم دیتی ہوں۔ وہ مین گیٹ پر رہے گا۔"

وہ دونوں وہاں سے محل کے دوسرے حصے کی طرف چلے گئے۔ حمزہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گیا۔ ان دونوں نے بیڈ روم میں آکر اپنے ذاتی فون کے ذریعے پہلے ایم این اے رفیق سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "میں کاشف اکبر بول رہا ہوں۔ اس بار الیکشن جیت کر ساتھ دوگے۔ نیک بخت سے تمہیں کچھ نہیں ملا۔ مجھ سے جو چاہوگے، ملے گا۔"

دوسری طرف سے رفیق نے کہا۔ "اسمبلی میں اکثریت حاصل کرنے کے لئے نیک بخت نے بھی پچھلی بار بڑے وعدے کئے تھے۔ اس کے بعد وعدوں سے پھر گیا تھا۔"

"نہیں مسٹر رفیق! جھوٹ نہ بولو۔ نیک بخت نے تمہاری حمایت حاصل کرنے کے لئے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ تمہاری ایک تحریر اور ویڈیو کیسٹ کے ذریعے تمہیں، چوہدری سلامت کو اور خالد احمد کو بلیک میل کرتا رہا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

فون پر تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر وہ بولا۔ "کاشف صاحب! ہماری کوئی کمزوری نہیں ہے۔ کسی نے بے پر کی اڑائی ہوگی اور آپ نے یقین کرلیا۔"

"میں آپ حضرات کی تحریر اور دستخط پہچانتا ہوں۔ یہ تحریریں ابھی میرے سامنے ہیں۔"

پھر وہ خاموش رہا۔ اس کے بعد بولا۔ "تعجب ہے۔ آپ تحریر اور دستخط پہچاننے میں غلطی کرسکتے ہیں۔"

"لیکن آپ اپنے ہاتھوں سے لکھنے میں غلطی نہیں کریں گے۔ میں آپ کی تحریر کا ایک پیراگراف پڑھ رہا ہوں۔ ذرا توجہ سے سنیں۔"

وہ پڑھ کر سنانے لگا۔ دوسری طرف ایک پیراگراف سننے کے بعد پھر خاموشی رہی۔ کاشف اکبر نے چوہدری سلامت علی اور خالد احمد کی تحریروں کے بھی ایک ایک پیراگراف سنائے۔ رفیق نے پریشان ہوکر پوچھا۔ "یہ۔ یہ کاغذات آپ کے پاس کیسے پہنچ گئے۔"

"بھئی خفیہ ہاتھ تک پہنچنے کے لیے اور اس کا آشیرباد حاصل کر کے اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

رفیق نے کہا۔ "مجھے فون پر کسی نے کہا تھا کہ نیک بخت کے سیف سے تمام اہم سیاسی دستاویزات چوری ہوگئے ہیں۔ اب ہم آزاد ہیں۔"

"اس میں کیا شبہ ہے۔ آزاد ہوچکے ہیں۔ نیک بخت آپ تینوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ میں نے حساب لگایا ہے کہ تم صرف تین نہیں ہو۔ تمہارے تین اور رشتے دار ہمیشہ کامیاب ہوکر قومی اسمبلی میں پہنچتے ہیں اور اس کی حمایت کرتے ہیں، جس کی تم تینوں

کرتے ہو۔ اس حساب سے آئندہ حکومت بنانے کے لئے مجھے چھ ایم این اے کی حمایت حاصل ہوجائے گی۔ میرا حساب درست ہے نا؟"

وہ بے چارہ کیا جواب دیتا۔ کاشف اکبر نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں آپ، چوہدری سلامت علی اور خالد احمد کل شام کی چائے ہمارے غریب خانے میں نوش فرمائیں۔ آپ حضرات کی کچھ آڈیو کیسٹس بھی سناؤں گا اور کچھ ویڈیو کیسٹس بھی دکھاؤں گا۔ ہم دوست بن کر چائے پئیں گے تو شام اچھی گزرے گی۔" اس نے جواب کا انتظار کیا۔ کاشف اکبر نے کہا۔ "عورتوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی خاموشی میں "ہاں" چھپی ہوتی ہے۔ بھئی آپ مرد ہیں۔ مردوں کی طرح جواب دیں۔ اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ کل شام پانچ بجے آرہے ہیں؟"

بہت مُردہ سی آواز سنائی دی۔ "میں ابھی چوہدری اور خالد احمد سے بات کرتا ہوں۔ ایک گھنٹے بعد جواب دوں گا۔"

"کوئی بات نہیں۔ ایک گھنٹے بعد سہی۔ جواب تو آپ ہماری توقع کے مطابق ہی دیں گے۔"

کاشف اکبر نے ریسیور رکھتے ہی دردانہ کو اپنی آغوش میں کھینچتے ہوئے کہا۔ "میری جان! اسے کہتے ہیں تقدیر مہربان تو گدھا پہلوان۔ نیک بخت مجھے گدھا سمجھتا تھا۔ اب اسے بتاؤں گا کہ سیاست میں بازی کیسے پلٹی جاتی ہے۔"

دردانہ بھی خوش تھی۔ اس نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر کہا۔ "پتا نہیں کیوں پہلے مجھے احمد رمزی پر شبہ تھا۔ اب تو واقعی کہنا چاہیے کہ اللہ نے ہمارے لئے یہ فرشتہ بھیجا ہے۔ ہمیں چلنا چاہیے۔ وہ تنہا بور ہورہا ہوگا۔ اسے زیادہ سے زیادہ خوش رکھنا چاہیے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ امیر حمزہ سے دوستی کے سلسلے میں اپنے مشیروں سے پہلے بات کی جائے؟"

"پہلے ہم آڈیو سن لیں۔ ویڈیو فلمیں دیکھ لیں پھر مشیروں کو شامل کریں گے۔ ویسے ہم اپنی توقع سے زیادہ بازی جیتنے والے ہیں۔ میں اس سلسلے میں مشیروں کا انکار یا تنقید نہیں سنوں گی۔"

وہ ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھا ایک فیشن میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ وہ وہاں آئے تو اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ کاشف اکبر نے کہا۔ "بیٹھیں بیٹھیں۔ تف حصوں سے کریں۔ آپ نے ہمارے لئے جو کیا ہے اور کرنے والے ہیں، اس کے وازے کو اندر سے

نہیں رہے۔ ہمارے اپنے ہیں۔ بالکل سگے رشتے دار جیسے۔"

کاشف اکبر الگ صوفے پر بیٹھا تھا۔ حمزہ بڑے سے صوفے پر تھا۔ دردانہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ حمزہ نے کہا۔

"اس سے زیادہ اپنائیت کیا ہوسکتی ہے۔ بیگم صاحبہ مجھے اپنا سمجھ کر میرے پاس بیٹھ گئی ہیں۔"

دردانہ نے کہا۔ "ہم زبان کے پکے ہیں۔ جب آپ کو اپنا کہہ دیا ہے تو ہمیشہ اپنا بن کر دکھائیں گے۔"

کاشف اکبر نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ہم آپس کی ایک بات کرنا چاہتے ہیں۔ بات ایسی ہے کہ ہم تینوں کے سوا کسی چوتھے کو خبر نہیں ہونی چاہیے۔"

حمزہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آپ بات کہیں۔ وہ بات اس سینے میں ہمیشہ دفن رہے گی۔"

"دیکھئے ہم نے آپ کی سچائی کی تصدیق کرلی ہے۔ ابھی آڈیو بھی سنیں گے اور ویڈیو بھی دیکھیں گے۔ آپ ہمارا اتنا بڑا کام کر رہے ہیں۔ ہم بھی آپ کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔"

"نہیں جناب! جب آپ نے مجھے اپنا بنالیا ہے تو پھر اپنوں میں لین دین والی سودے بازی نہیں ہوتی۔"

دردانہ نے کہا۔ "لیکن آپس میں تحفے تحائف تو دیئے جاتے ہیں۔ دیکھیں ہم بہت خوش ہو کر آپ کی ایک نہیں بہت سی فرمائشیں پوری کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کھل کر بتائیں۔ آپ کی جو خواہشات ہیں، ہم پوری کریں گے۔"

حمزہ نے ایسے جھجکتے ہوئے کہا جیسے فرمائش کرنا چاہتا ہو مگر نہیں کر رہا ہو۔

"نن.......... نہیں میری.......... ایسی تو کوئی فرمائش نہیں ہے۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "بھئی آپ کچھ جھجک رہے ہیں۔ کیا اپنا کہنے کے باوجود ہمیں اپنا نہیں سمجھ رہے ہیں؟"

"جی۔ بات یہ نہیں ہے۔ دراصل بات.........."

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ دردانہ نے کہا۔ "ہم زمینیں دیں گے۔ آپ کے اکاؤنٹ میں
ڑی رقم جمع کرائیں گے۔ اگر کلفٹن کے علاقے میں چاہتے ہیں یا کسی دوسرے
گا۔ میں نے حنانا چاہتے ہیں تو.........."
کامیاب ہوکر توڑیل میں یہ ہے کہ مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہیے مگر وہ..........

وہ.........."

"ہاں ہاں اتنے اعتماد سے کہیں کہ جو چاہیں گے وہ مل جائے گا۔"

"میں صاحبِ جائیداد ہوں۔ میرے پاس دولت بھی ہے۔ بس ایک فرمائش ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو.........."

"ہرگز برا نہیں مانیں گے۔ آپ کہیں تو سہی!"

"وہ دراصل آپ کے اس محل میں ایک چیز پسند ہے۔"

"بھئی کیا چیز پسند ہے؟ آپ تو شرما رہے ہیں۔"

"جی ہاں شرم کی بات ہے مگر دل سے مجبور ہو کر کہہ رہا ہوں۔ میں نے اس محل میں ایک حسین دوشیزہ کو دیکھا ہے۔ بس مجھے وہی چاہیے۔"

دردانہ اور کاشف اکبر قہقہے لگانے لگے۔ کاشف اکبر نے کہا۔ "بھئی رمزی صاحب آپ نے مرد ہو کر شرمانے کا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ بھئی اس محل میں جتنی حسینائیں ہیں، ہم انہیں آپ کے نام کردیں گے۔"

"نہیں۔ مجھے تو بس وہی چاہیے۔"

"کون ہے وہ؟"

"میں اس کا نام نہیں جانتا۔ آپ کے ساتھ یہاں آتے ہوئے اسے لان میں دیکھا تھا۔ چہرہ دیکھ کر پہچان لوں گا۔"

"کوئی بات نہیں، ہم تمام کنیزوں کو بلا کر یہاں ایک قطار میں کھڑا کرتے ہیں۔ جس کی طرف انگلی اٹھائیں گے، وہ ہمیشہ کے لئے آپ کی ہوجائے گی۔"

اسی.......... وقت ملازم نے آکر کہا۔ "سیکورٹی افسر کچھ لے کر آئے ہیں۔"

حمزہ نے کہا۔ "اپنی بات بعد میں ہوگی۔ آپ سیکورٹی افسر کو بلائیں۔"

سیکورٹی افسر کو بلایا گیا۔ دردانہ اور کاشف اکبر کو بھی آڈیو اور ویڈیو کا بے چینی سے انتظار تھا۔ سیکورٹی افسر نے آکر سیلوٹ کیا پھر ایک چھوٹے سے چرمی بیگ کو ان کے درمیان سینٹرل ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔ حمزہ نے اسے اٹھا کر کھول کر دیکھا پھر کہا۔ "دو آڈیو کیسٹس اور تین ویڈیو کیسٹس ہیں لیکن یہ ایسی ہیں کہ ہمیں کسی بند کمرے میں دیکھنا ہوگا۔"

دردانہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "ہمارا بیڈ روم مناسب رہے گا۔"

کاشف اکبر نے تائید کی۔ حمزہ ان کے ساتھ چلتا ہوا محل کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا ان کے شاہانہ طرز کے بیڈ روم میں آیا۔ کاشف اکبر نے دروازے کو اندر سے

بند کر کے دردانہ سے پوچھا۔ "پہلے آڈیو سنوگی یا ویڈیو دیکھوگی؟"

دردانہ نے حمزہ سے پوچھا۔ "آپ نے تو سنا ہوگا۔ آڈیو میں کوئی رازدارنہ گفتگو ہے جو ہمارے کام آئے؟"

"حمزہ صاحب کی ایک ایک چیز آپ کے کام آئے گی۔"

اس نے ایک آڈیو کیسٹ نکال کر اس کے لیبل کو پڑھ کر کہا۔ "نیک بخت نے اپنے دورِ اقتدار میں اسٹیل ملز کے تین کروڑ روپے خرد برد کرائے تھے۔ اس سلسلے میں اسٹیل ملز کے جنرل منیجر اور آڈیٹر سے جو گفتگو ہوئی تھی۔ ان باتوں کے دوران میں نیک بخت نے صاف طور پر کہا ہے کہ موجودہ الیکشن میں کامیاب ہو کر اپنی حکومت بناتے ہی تین کروڑ کے گھپلے کو سمندر میں پھینک دیا جائے گا۔"

"یہ تو بڑے اہم ثبوت ہیں لیکن اس سے زیادہ قابلِ قبول ثبوت ویڈیو کے ذریعے پیش کیا جاسکتا ہے۔ ہم پہلے ویڈیو دیکھیں گے۔"

کاشف اکبر نے ٹی وی اور وی سی آر سیٹ کیا۔ حمزہ نے ایک ویڈیو کیسٹ دیا۔ وہ اسے آپریٹ کر کے دیکھنے لگے۔ وہ اصل ویڈیو کیسٹ کا ڈپلیکیٹ تھا۔ اس میں رفیق چوہدری سلامت علی' خالد احمد اور چند عورتوں کے ایسے مناظر تھے کہ دردانہ نے نفرت سے "شٹ" کہہ کر بند کردیا۔

کاشف اکبر نے حمزہ سے دوسرا کیسٹ لیا۔ دردانہ نے کہا۔ "رہنے دو یہ بھی واہیات ہوگا۔ ہمیں آڈیو سننے کے بعد امیر حمزہ صاحب سے فون پر بات کرنا چاہیے۔"

حمزہ نے تیسرا ویڈیو کیسٹ بیگ سے نکال کر کہا۔ "بے شک وہ دونوں کیسٹس واہیات ہیں لیکن یہ تیسرا بڑا کار آمد ہے۔ اسے دیکھتے ہی عاقبت سنور جاتی ہے۔"

کاشف اکبر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہم سیاسی لوگ دنیا سنوارتے ہیں۔ عاقبت سنوارنے والا کیسٹ کیوں لائے ہیں؟"

"یہ ضروری ہے۔ حمزہ نے اس تیسرے کیسٹ کے اوپری حصے کو ذرا قوت سے توڑنے کے انداز میں کھولا۔ اس کے اندر ایک سائلنسر لگا ہوا ریوالور تھا۔ اس نے کیسٹ کے خول میں سے اسے نکالا تو دونوں نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "یہ شور نہیں مچاتا۔ تم دونوں بھی شور نہ مچانا' یہ دیکھو۔"

اس نے سامنے والی دیوار پر فائر کیا۔ "پچاک" جیسی ہلکی سی آواز ابھری اور دیوار میں سوراخ ہوگیا۔ حمزہ نے کہا۔ "گولی اس مضبوط دیوار کے اندر پیوست ہوگئی ہے۔ یہ تو تم دونوں کے آر پار بھی ہوسکتی ہے۔ اس ریوالور کی طرح تمہاری آواز بھی نہیں نکلے

گی۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ کیا تم ہمیں قتل کردوگے؟"

"میں تمہیں یقین دلانے کے لئے پہلے دردانہ بیگم کو گولی مار سکتا ہوں۔"

وہ دہشت کے مارے "نہیں" کہتی ہوئی کاشف اکبر کے پیچھے چلی گئی۔

حمزہ نے کہا۔ "تمہاری یہ "نہیں" کی آواز کچھ اونچی تھی۔ آئندہ بے اختیار بھی کوئی آواز نکلے تو اسے صرف میں سن سکوں۔ دنیا والوں کو سنانے کی حماقت نہ کرنا۔"

کاشف اکبر نے پوچھا۔ "تم نے دوست بن کر دشمن کے خلاف سچے ثبوت پیش کئے ہیں۔ یوں دھوکا دینے کا مقصد کیا ہے؟"

"میں نیک بخت کے حمایتیوں کے خلاف سچے اور ٹھوس ثبوت پیش نہ کرتا تو تم مجھ پر اس طرح اندھا اعتماد کر کے اپنے بیڈ روم میں نہ لاتے۔ اتنا تو ہم جانتے ہیں کہ تمہارے اور نیک بخت جیسے سیاسی مگرمچھ اپنے اہم راز بیڈروم میں چھپا کر رکھتے ہیں۔"

"کیا تم امیر حمزہ ہو؟"

"میں ایک پاکستانی ہوں۔ مجھے باتوں میں الجھا کر خطرے کا سگنل دوگے تو دونوں کی لاشیں باہر جائیں گی۔"

"تم یقین کرو اس بیڈ روم میں ہمارا کوئی اہم راز نہیں ہے۔"

"میں یقین کرلوں گا۔ دردانہ بیگم زندہ رہنا چاہتی ہو تو وقت ضائع کئے بغیر سیف کھولو۔"

دردانہ نے کاشف اکبر کو دیکھا۔ وہ بولا۔ "سیف کھول دو۔ یہ جان ہتھیلی پر رکھ کر آیا ہے۔ کچھ بھی کرسکتا ہے۔"

وہ چابیاں نکال کر سیف کھولنے لگی۔ کاشف اکبر گھور کر دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا پھر بولا۔ "تمہاری بات مانی جارہی ہے۔ اتنا بتادو۔ کسی طرح بھی ہمارے درمیان کوئی سمجھوتا ہوسکتا ہے؟"

"میں کرپٹ سیاستدانوں سے سمجھوتا نہیں کرتا۔"

"میں سیاست چھوڑ دوں گا۔ تم اس سیف کی چیزیں نہ لے جاؤ۔"

"اگر سیاست چھوڑ دوگے تو یہ تمہارے اہم راز میرے پاس امانت کے طور پر رہیں گے۔ یہ میرے پاس امانت رہیں گے تو تمہارے سیاست چھوڑنے کی ضمانت برقرار رہے گی۔"

سیف پوری طرح کھل گیا۔ حمزہ نے دردانہ بیگم سے کہا۔ "جتنی تحریری

دستاویزات' ویڈیو اور آڈیوز ہیں' انہیں اپنے لیڈیز بیگ میں رکھو۔"

وہ اپنے ایک بیگ میں مطلوبہ چیزیں رکھنے لگی۔ کاشف اکبر نے پوچھا۔ "تم میری وائف کا بیگ یہاں سے کیسے لے جاؤ گے۔ باہر مسلح گارڈز ہیں۔"

"جو بھی شلوار پہنتا ہے' وہ پہلے اپنا ازار بند باندھنا سیکھ لیتا ہے۔ فکر نہ کرو۔ یہاں سے جاتے وقت میری شلوار ڈھیلی نہیں ہوگی۔"

پھر اس نے کہا۔ "دردانہ بیگم! میں باتیں تمہارے مرد سے کر رہا ہوں مگر نظریں تم پر ہیں۔ ابھی تم نے جو کاغذ نوٹوں کی گڈیوں کے پیچھے چھپایا ہے۔ اسے بھی نکال کر بیگ میں رکھو۔ میں ایک بار بولتا ہوں' دوسری بار گولی چلادیتا ہوں۔"

وہ فوراً ہی نوٹوں کی گڈیوں کے پیچھے سے وہ کاغذ نکال کر بیگ میں رکھتے ہوئے بولی۔ "میں آپ کی کسی بات سے انکار نہیں کر رہی ہوں۔ مجھے بہن سمجھ کر صرف یہ کاغذ میرے پاس رہنے دو۔ ورنہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔"

"ہمارے ملک میں کتنی ہی ماؤں بہنوں کو ننگا کرکے سربازار گھمایا گیا۔ تم بھی ان کی طرح سر جھکا کر زندہ رہو گی۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "میں سمجھ گیا' تم امیر حمزہ ہو۔"

"میں نے کہا نا کہ ایک پاکستانی ہوں۔ نام کچھ بھی ہوسکتا ہے۔"

"میں پھر التجا کرتی ہوں' کوئی ایسا سمجھوتا کرلو کہ تمہارے محبِ وطن ہونے پر بھی کوئی فرق نہ آئے اور ہماری عزت بھی رہ جائے۔"

"اور میں پہلے ایک مسلمان کی حیثیت سے پھر ایک پاکستانی کی حیثیت سے وعدہ کرتا ہوں۔ یہ ملک چھوڑ کر چلے جاؤ یا سیاست نہ کرنے کی توبہ کرو اور یہاں عزت سے زندگی گزارتے رہو۔ میں تمہارے سیف سے جو کچھ لے جارہا ہوں' وہ امانت اور ضمانت کے طور پر میرے پاس محفوظ رہیں گے' ان پر کسی اور کی نظر نہیں پڑے گی۔"

سیف میں صرف نوٹوں کی گڈیاں اور زیورات رہ گئے۔ حمزہ نے قریب آکر دیکھا۔ مطمئن ہوکر کاشف اکبر سے کہا۔

"میں نے نیک بخت کے حمایتیوں کے کاغذات اور آڈیو ویڈیوز دیئے تھے۔ وہ میرے چرمی بیگ میں رکھ دو۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ حمزہ نے بائیں ہاتھ سے اپنا بیگ لیا۔ دائیں ہاتھ کو ریوالور سمیت کوٹ کی جیب میں رکھ کر کہا۔ "انٹر کام پر کہو۔ کار پورچ میں ٹھیک دروازے کے سامنے لائی جائے۔ تم ڈرائیو کرو گے' دردانہ صاحبہ تمہارے ساتھ جائیں گی اور یہ مہمان

پچھلی سیٹ پر بیٹھے گا۔"

دردانہ نے اس کے حکم کے مطابق وہی باتیں کہہ دیں۔ حمزہ نے کہا۔ "میری دائیں جانب کی جیب میں ریوالور ہے۔ دردانہ میرے ساتھ دائیں طرف چلیں گی اور تم دردانہ کے دائیں طرف یا ذرا آگے چلو گے۔ ذرا سی بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کرو گے تو ہم تو ڈوبیں گے صنم' تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔"

اس کے حکم کے مطابق کاشف اکبر نے ذرا آگے چل کر دروازہ کھولا پھر وہ حمزہ کی بتائی ہوئی ترتیب سے چلتے ہوئے محل کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے کوٹھی کے بیرونی دروازے پر آئے۔ سامنے کار کے پاس ڈرائیور کھڑا ہوا تھا۔ کاشف اکبر نے ڈرائیو سے چابی لی۔ حمزہ نے دردانہ سے اس کا بیگ لیا پھر وہ آگے پیچھے بیٹھ گئے۔ یعنی میاں بیوی آگے اور مہمان پیچھے۔ وہ کار اسٹارٹ ہوکر آگے بڑھی۔ باہر کا مین آہنی گیٹ کھلا۔ تمام گارڈز اور سیکورٹی افسرانہیں سیلوٹ کرتے رہے۔ احاطے سے باہر ذرا دور آکر حمزہ نے موبائل کے ذریعے کہا۔ "حیدر علی! میں آرہا ہوں۔ گاڑی تیار رکھو۔"

تین یا چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد حمزہ نے سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی گاڑی کے پاس رکنے کو کہا۔ وہاں حیدر علی ایک اور جانباز کے ساتھ کھڑا تھا۔ حمزہ نے کاشف اکبر سے کہا۔ "تم نے ڈرائنگ روم میں کہا تھا کہ میں جس حسینہ کی طرف انگلی اٹھاؤں گا' وہ ہمیشہ کے لئے میری ہوجائے گی۔ کیوں ہوجائے گی؟ اس لئے کہ تمہاری کنیز ہے۔ غربت اسے تمہارے محل میں لے آئی ہے۔ میں نے انگلی نہیں اٹھائی' ریوالور تمہاری وائف کی طرف اٹھایا ہے۔ اسے تم میری ہونے سے نہیں روک سکو گے۔ کیا تم میں اتنی مردانگی ہے؟"

دردانہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "مجھے اپنے ساتھ نہ لے جاؤ۔ میں تمہیں بھائی کہتی ہوں۔"

"میں بدنیت نہیں ہوں لیکن تمہیں تھوڑی دور تک لے جاؤں گا۔ یہ تمہارا مرد یہاں تمہاری فون کال کا انتظار کرے گا۔ تم اسے فون پر جہاں بلاؤ گی۔ یہ وہاں کار لے کر آجائے گا۔"

وہ گن پوائنٹ پر تھے۔ زندگی سے محبت تھی اس لئے حمزہ کے احکامات کی تعمیل کر رہے تھے۔ دردانہ' حمزہ کے ساتھ دوسری گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ کاشف اکبر بے بسی سے اپنی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھا اپنی بیگم کو حمزہ اور اس کے جانبازوں کے ساتھ جاتے دیکھتا رہا۔

ایک تھکا دینے والے اور اپنی بے بسی پر رُلا دینے والے انتظار کے بعد موبائل فون سے بزر کی آواز ابھری۔ اس نے آن کر کے کان سے لگا کر پوچھا۔ "ہیلو۔"

دردانہ بیگم کی غصے اور نفرت بھری آواز سنائی دی۔

"مجھے ہیلو کہہ رہے ہو۔ اپنی جگہ سے تو ہل نہ سکے۔ اب ہلو اور آؤ۔ اس بدمعاش نے اسلام آباد اور پنڈی کے درمیان زیرو پوائنٹ پر چھوڑتے ہوئے کہا۔ "اب ہم بھی زیرو ہوگئے ہیں۔ لہٰذا یہیں زیرو پوائنٹ پر اپنے مرد کو پکارو' ابھی تک فون سن رہے ہو' یا گاڑی بھی چلا رہے ہو؟"

وہ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ "چلا رہا ہوں' بس ابھی آ رہا ہوں۔"

وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا تیزی سے جانے لگا۔

امیر حمزہ اپنی خفیہ رہائش گاہ میں پہنچ کر دیکھنا چاہتا تھا کہ کاشف اکبر کے کتنے اہم راز اور اس کی کمزوریاں لے کر آیا ہے۔ اسی وقت راجہ نواز نے فون کے ذریعے میرے حالات بتائے۔ تب حمزہ صاحب نے مجھ سے رابطہ کر کے مجھے حوصلہ دیا تھا کہ مجھے ضرور بھارت جانا چاہیے اور میں جب بھی انہیں مدد کے لئے بلاؤں گا' وہ یہاں کی مصروفیات کے باوجود ہر حال میں میرے پاس پہنچ جائیں گے۔ مجھ سے وعدہ کرنے کے بعد انہوں نے کاشف اکبر اور دردانہ کے سیف سے لائے ہوئے دستاویزات' آڈیو اور ویڈیو کیسٹس دیکھے۔ ان میں بھی منفی سیاست اور غیر اخلاقی ملبہ بھرا ہوا تھا۔ قانون شکنی کے بے شمار ثبوت تھے۔ اپنے دورِ حکومت میں انہوں نے خفیہ ہاتھ سے جو بہت اہم رازدارانہ گفتگو کی تھی' وہ تمام گفتگو آڈیو کیسٹس میں محفوظ تھی۔

نیک بخت ہو یا کاشف اکبر' دونوں خفیہ ہاتھ کے چہیتے تھے لیکن ان میں جو بڑی سیاسی غلطی کرتا تھا اور ہمارے وطنِ عزیز پر خفیہ ہاتھ کی گرفت ڈھیلی کر دیتا تھا' اسے اقتدار کی کرسی سے گرا کر دوسرے چہیتے سے خفیہ معاہدہ کیا جاتا تھا تاکہ وہ خفیہ ہاتھ کی گرفت پہلے سے زیادہ مضبوط کرے۔

اس بار نیک بخت نے یہ معاہدہ کیا تھا لیکن حمزہ اس کی سیاسی پوزیشن کمزور کرتا جا رہا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ خفیہ ہاتھ اس کی کمزوری کے باعث کاشف اکبر کو ترجیح دے اس لئے اس نے کاشف اکبر کو بھی اس کے برابر کمزور بنا دیا تھا۔

اب ملکی سیاسی پوزیشن اس مرحلے پر آگئی تھی کہ خفیہ ہاتھ دو کرپٹ سیاستدانوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دے گا یا کسی تیسرے کرپٹ کو فرشتہ اور محبِ وطن بنا کر اس ملک پر مسلط کرے گا۔ بارہ کروڑ پاکستانیوں میں محبانِ وطن جماعتیں ہیں مگر اتنی مؤثر نہیں

ہیں جو کھلی کتاب کی طرح کرپٹ دکھائی دینے والے سیاست دانوں پر پچاس برسوں میں سبقت لے جاسکیں۔ اس کی یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ یہ محبانِ وطن جماعتیں صرف اپنے ملک کو اور اپنے نظریات کو اتنی زیادہ اہمیت دیتی ہیں کہ ان میں ذرا سی بھی لچک پیدا کر کے عالمی سیاست کے ساتھ نہیں چلتیں جبکہ دنیا والوں کے درمیان رہ کر کچھ دو اور کچھ لو کے اصولوں پر سیاست کرنی پڑتی ہے۔ کاش! کوئی ایسی سیاسی جماعت وجود میں آئے جو میانہ روی اختیار کرے۔ ایسا سیاسی رویہ اپنائے کہ پاکستانی قوم کو کرپٹ سیاست دانوں سے نجات مل جائے۔ اب یہ قوم مزید پچاس برسوں تک سیاسی گھٹن میں نہیں رہے گی۔ بھڑک اٹھے گی' تمام سیاسی بازیگروں کا تختہ کر کے رکھ دے گی کیونکہ قوم ہو یا ایک ہستی' جب وہ ڈوبتی ہے تو اپنے ساتھ سبھی کو لے ڈوبتی ہے۔

ابھی یہ ظاہر نہیں کیا گیا تھا کہ نیک بخت کی طرح کاشف اکبر کو بھی لوٹ لیا گیا ہے۔

نیک بخت یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ اپنے حریف کے مقابلے میں کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ اس نے خفیہ ہاتھ سے التجا کی تھی کہ ہر قیمت پر راجہ نواز کی خدمات حاصل کرے۔ خفیہ ہاتھ اور راجہ نواز کے درمیان ابتدائی شرائط طے پاگئی تھیں۔ راجہ سے کہا گیا تھا کہ کراچی' لاہور اور اسلام آباد میں جو خفیہ ایجنسیاں ہیں۔ راجہ خفیہ ہاتھ کی ان ایجنسیوں میں جا کر وہاں کے اہم افراد سے ملاقات کرے پھر نیک بخت کی گرتی ہوئی سیاسی پوزیشن کو سنبھالنے کے لئے کاشف اکبر کو کوئی بہت بڑا نقصان پہنچا کر نیک بخت کے مقابلے میں اسے اوندھے منہ گرا دے۔

راجہ نواز پہلے کراچی کے ایک قونصل خانے میں گیا۔ وہاں استقبالیہ کاؤنٹر کی ایک گوری میم سے بولا۔ "میرا نام راجہ نواز ہے۔ میں سفیر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

اس میم صاحبہ نے پوچھا۔ "کیا پہلے اپائنٹ منٹ ہے؟"

"نہیں۔ میں ان خاص لوگوں میں سے ہوں جو کسی اپائنٹ منٹ کے بغیر صاحب سے ملتے ہیں۔ آپ انہیں میرا نام بتا دیں۔ راجہ نواز........"

اس نے فون پر صاحب کے سیکرٹری کو اس کا نام بتایا۔ سیکرٹری نے کہا۔ "اسے میرے کمرے میں بھیج دو۔"

کاؤنٹر والی نے ریسیور رکھ کر راجہ نواز کو گائیڈ کیا۔ وہ اس وسیع و عریض عمارت کے گراؤنڈ فلور کے کئی حصوں سے گزرتا ہوا سیکرٹری کے دروازے پر پہنچا۔ چپراسی سے کہا۔ "اپنے صاحب کو بتاؤ راجہ نواز آیا ہے۔"

چپراسی نے کہا۔ "ادھر جا کے بیٹھو۔ ابھی صاب بجی ہے۔"

"کیا ہے؟"

"بجی بجی۔ تم انگریزی نہیں سمجھتا ہے تو پھر صاب سے کیسے بولے گا؟"

"اگر انگریزی ایسی ہوتی ہے' جیسی تم بول رہے ہو تو پھر میں تم سے سیکھ لوں گا۔ ابھی صاحب کو جا کر صرف میرا نام بتا دو۔"

"تم کو ایک بار بولا نا؟ صاب بہت بجی ہے۔ ادھر جا کے بیٹھو۔"

راجہ نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن پکڑی پھر اسے وزیٹنگ روم کی طرف دھکا دے کر کہا۔ "تمہارے صاحب کی ایسی کی تیسی۔"

وہ دروازہ کھول کر اندر آیا تو صاحب نے غصے سے راجہ کو دیکھ کر پوچھا۔ "وہاٹ نان سینس؟ تم اجازت کے بغیر کیوں آئے ہو؟"

"میں آفس سمجھ کر آیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ سیکس کلب ہے۔"

"یو شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔"

"میرا نام راجہ نواز ہے۔ میں گیٹ آؤٹ نہیں ہوتا تمہارے جیسے کو گیٹ آؤٹ کر دیتا ہوں۔"

راجہ کا نام سن کر وہ دھیما پڑ گیا۔ ٹائپسٹ سے بولا۔ "تم سیٹ پر جاؤ۔" پھر راجہ سے بولا۔ "کم آن۔ ٹیک یور سیٹ۔ بائی دا وے تمہیں اس طرح اجازت کے بغیر نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"اکثر دفاتر کے چپراسی جب یہ کہتے ہیں کہ صاحب بزی ہیں' انتظار کرو تو سمجھ میں آ جاتا ہے کہ اندر صاحب بہادر فون پر بیوی سے لمبی باتیں کر رہے ہوں گے یا بیوی سے کترا کر منہ کا مزہ بدل رہے ہوں گے۔ یا دوستوں کے ساتھ بیٹھے لمبی لمبی ہانک رہے ہوں گے۔ انٹر کام پر صاحب سے بولو۔ میں انتظار کرنے نہیں آیا ہوں۔ فوراً بلائیں۔ ورنہ ان کے آفس میں بھی گھستا چلا جاؤں گا۔"

سیکرٹری نے اسے ناگواری مگر بے بسی سے دیکھا پھر انٹر کام پر کہا۔ "سر! راجہ نواز آئے ہیں۔"

اس نے دوسری طرف کی باتیں سنیں پھر کہا۔ "سر! میں نے بھی یہی سمجھایا تھا مگر یہ زبردستی اندر آئے تھے۔ یہ صاحب ڈسپلن نہیں جانتے ہیں۔ دھمکی دے رہے ہیں کہ آپ کے آفس میں بھی گھس جائیں گے۔ سیکرٹری دوسری طرف کی باتیں سنتا رہا اور "یس سر! یس سر!" کہتا رہا پھر انٹر کام کا بٹن آف کرتے ہوئے بولا۔ "جائیے! سر نے بلایا ہے۔ سامنے کوریڈور سے گزر کر رائٹ ٹرن ہو جائیں۔ سامنے ہی دروازے پر نیم پلیٹ

ہے۔"

وہ جواب سنے بغیر باہر آیا۔ وہاں چپراسی اسے دیکھتے ہی پیچھے ہٹ گیا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا کوریڈور سے گزر کر دائیں طرف مڑ کر رک گیا۔ کچھ فاصلے پر اس سفیر کا دفتر تھا جس نے ابھی انٹر کام پر اسے بلایا تھا۔ دفتر کے دروازے پر دو گن مین کھڑے تھے۔

یہ ایک چیلنج تھا کہ وہ سیکرٹری کے دفتر میں جبراً گھس گیا تھا لیکن باس کی مرضی کے بغیر وہ اس کے دفتر میں قدم نہیں رکھ سکے گا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے کے قریب آیا۔ دونوں گن مینوں نے اسے نشانے پر رکھا تھا۔ اس نے کہا۔ "مجھے صاحب نے بلایا ہے۔"

ایک نے کہا۔ "بلایا تھا مگر ابھی مصروف ہیں۔ واپس ویٹنگ روم میں جاؤ۔ انتظار کرو۔ جب تک بلایا نہ جائے' ادھر کا رخ نہ کرنا۔"

"آل رائٹ۔ میں جا رہا ہوں۔"

وہ جانے کے لئے پلٹ گیا۔ دونوں گارڈز کی گنیں نیچی ہو گئیں۔ ان میں سے ایک دروازہ کھول کر اندر جا کر راجہ کے بارے میں رپورٹ دینا چاہتا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی راجہ نے پلٹ کر فضا میں اچھل کر دونوں کو کک ماری۔ وہ دونوں کھلے ہوئے دروازے سے لاتیں کھا کر اندر آ گئے۔ ان کا باس کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں گارڈز کے فرش سے اٹھنے سے پہلے راجہ نے ریوالور نکال کر انہیں زخمی کیا پھر ان کی گنیں اٹھا کر دور پھینک کر دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے باس سے کہا۔

"میں کسی کے باپ کا نوکر نہیں ہوں کہ دروازے پر ہاتھ باندھ کر انتظار میں کھڑا رہوں۔ تم لوگ وقت کے بڑے پابند کہلاتے ہو لیکن ہمیں مجبور اور تابعدار سمجھ کر غلاموں جیسا برتاؤ کرتے ہو۔"

ریوالور کا رخ اس کی طرف تھا۔ وہ سہم کر بولا۔ "مسٹر راجہ! بات دراصل یہ ہے کہ ہمیں اوپر سے احکامات ملے تھے کہ پہلے آپ کی وفاداری اور تابعداری آزمائی جائے۔"

راجہ نے کہا۔ "بیٹھو اور ایک کاغذ پر لکھو۔"

وہ بیٹھ کر ایک کاغذ اور قلم لے کر راجہ کو دیکھنے لگا۔ راجہ نے کہا۔ "لکھو۔ مسٹر سیکرٹ ہینڈ! راجہ نواز یہاں آیا تھا' اس نے کہا ہے کہ وہ لین دین میں دیانت دار ہے مگر کسی کا تابعدار نہیں ہے۔ ہم نے اس سے تابعداری کرانے کی کوشش کی۔ جس کے نتیجے میں اس نے ہمارے دو سیکورٹی گارڈز کو زخمی کر دیا ہے اور مجھے گن پوائنٹ پر کہیں لے

جا رہا ہے لیکن مجھے زندہ چھوڑ دے گا۔ ویسے تمہیں نہیں چھوڑے گا۔ تم نے اسے یہاں بلا کر اپنی قوت کا مظاہرہ کرنا چاہا تھا۔ دعا کرو، کبھی اس سے سامنا نہ ہو۔"

راجہ بولتا گیا۔ وہ لکھتا گیا پھر اس نے ریوالور سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اٹھو۔ ابھی میرے سامنے اس تحریر کو فیکس کرو۔"

وہ سہما ہوا تھا۔ فیکس مشین کے پاس جا کر اسے آپریٹ کرنے لگا۔ اس کے بعد راجہ نے کہا۔ "یہاں سے نکل کر میرے آگے آگے چلو۔ تم اپنی کار ڈرائیو کرو گے۔ میں پچھلی سیٹ پر تمہیں گن پوائنٹ پر رکھوں گا۔"

اس نے دونوں گارڈز کی گنیں اٹھائیں پھر اس کے ساتھ آگے چلتا ہوا عمارت کے مختلف حصوں سے گزرنے لگا۔ وہاں کا تمام اسٹاف حیرانی سے اپنی اپنی جگہ کھڑا ہو کر اپنے سفیر صاحب کو مصیبت میں دیکھ رہا تھا اور راجہ کہتا جا رہا تھا۔ "کوئی پولیس کو فون کرنے کی حماقت کرے گا تو اپنے باس کی لاش پر ماتم کرے گا۔"

اس عمارت سے باہر نکلنے سے پہلے ہی ایک حسین دوشیزہ اندر آئی پھر انہیں دیکھتے ہی خوف سے ٹھٹک گئی۔ اس نے سفیر سے کہا۔ "اوہ ڈیڈ! یہ کیا ہے؟ یہ آپ کو گن پوائنٹ پر رکھنے والا کون ہے؟"

"بیٹی! یہ وہی راجہ نواز ہے جس کا ذکر تم سے کرتا رہا ہوں۔ تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ یہ مجھے خواہ مخواہ ہلاک نہیں کرے گا۔"

وہ "نہیں" کہتی ہوئی باپ سے آکر لپٹ گئی روتی ہوئی کہنے لگی۔ "یہ آپ کو ہلاک نہیں کرے گا تو اس طرح آپ کو کہاں لے جا رہا ہے؟"

راجہ نے کہا۔ "میں جو کہتا ہوں، وہی کرتا ہوں صرف اپنی حفاظت کے لئے تمہارے باپ کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔ ایک آدھ گھنٹے بعد چھوڑ دوں گا۔"

"اپنی حفاظت چاہتے ہو تو مجھے اپنے ساتھ لے چلو، ڈیڈ کو چھوڑ دو۔"

"مجھے اعتراض نہیں ہے۔ اپنے ڈیڈ کے ساتھ تم بھی چلو۔"

وہ اپنے باپ کا بازو پکڑتے ہوئے ساتھ چلنے لگی۔ باپ نے کہا۔ "ٹینا! حماقت نہ کرو۔ یہاں آفس میں میرا انتظار کرو۔ میں ابھی آجاؤں گا۔"

"اگر میں یہاں رہوں گی تو آپ کے واپس آنے تک روتی رہوں گی۔ ساتھ چلوں گی تو آپ کو زندہ سلامت دیکھ کر مطمئن رہوں گی۔"

وہ تینوں عمارت کے باہر آکر ایک کار میں بیٹھ گئے۔ ٹینا نے اسٹیئرنگ سیٹ پر آکر کار اسٹارٹ کی۔ اس کے ساتھ باپ بیٹھ گیا۔ راجہ پچھلی سیٹ پر ایک گارڈ کی گن لئے ہوئے

تھا۔ وہ کار کلفٹن کی طرف جانے لگی۔ ٹینا نے پوچھا۔ "مسٹر راجہ! میرے ڈیڈ آپ کی دلیری کی تعریفیں کر رہے تھے اور یہ خوش خبری سنا رہے تھے کہ تم ہمارے لئے کام کرنے والے ہو لیکن یہ اچانک دشمن کیوں بن گئے ہو؟"

"واپسی میں اپنے ڈیڈ سے پوچھ لینا۔"

"میں اپنے ڈیڈ کے لیے انسلٹ محسوس کر رہی ہوں۔ شاید تم نہیں جانتے، یہ دل کے مریض ہیں۔ پلیز ایک مریض کی خاطر میری ایک بات مان لو۔"

"کون سی بات منوانا چاہتی ہو؟"

"تم دیکھ رہے ہو کہ ہمارے پیچھے پولیس والے نہیں ہیں۔ ہم کافی دور نکل آئے ہیں۔ تم میرے ڈیڈ کو یہاں ڈراپ کر دو۔ یہ ٹیکسی میں جا کر فوری طور پر دوائیں کھا سکتے ہیں۔ ضمانت کے طور پر میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ تم جتنے گھنٹے چاہو، مجھے اپنے تحفظ کی خاطر رکھ سکتے ہو۔"

باپ نے کہا۔ "ٹینا! ایسی باتیں نہ کرو۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ تمہیں ایک خطرناک شخص کے ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔"

"اور آپ نہ گئے تو میں کار سے باہر کود کر جان دے دوں گی۔ ڈاکٹر کہہ چکے ہیں کہ تیسرا ہارٹ اٹیک آپ کے لئے جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔"

وہ اچانک کار روک کر بولی۔ "مسٹر راجہ! میرے ڈیڈ کو سمجھاؤ کہ یہاں اتر جائیں یا پھر تم مجھے گولی مار دو۔ مسیح مصلوب کی قسم، یہ ابھی ٹیکسی میں جا کر دوائیں نہیں لیں گے تو میں کچھ کر بیٹھوں گی۔ اس کار کو تیزی سے ڈرائیو کرتے ہوئے کہیں ٹکرا دوں گی۔"

راجہ نے گن کی نال کو اس سفیر کی کنپٹی پر رکھ کر کہا۔ "میں اپنی حفاظت کے لئے تمہاری بیٹی کو لے جاؤں گا۔ تم یہاں اتر جاؤ۔"

ٹینا نے باپ کی طرف والے دروازے کو کھول کر اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "کم آن ڈیڈ! آپ مجھے زندہ دیکھنا چاہتے ہیں تو باہر جائیں۔ پلیز ہری اپ۔"

وہ دھکا کھاتے ہوئے باہر آیا۔ جھنجلا کر کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی ٹینا نے کار کو تیزی سے آگے بڑھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی عقب نما آئینہ میں دیکھا۔ باپ کی ایک جھلک نظر آئی۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے پکار رہا تھا پھر وہ نظر نہیں آیا۔ تیزی سے ڈرائیونگ کے دوران میں پلٹ کر دیکھ نہیں سکتی تھی۔ راجہ نے پچھلی اسکرین کے پار دیکھا۔ وہ ٹینا کو پکارنے کے بعد تھک کر کمر پر ہاتھ رکھ کر دیکھ رہا تھا۔ راجہ نے کہا۔ "تم اپنے باپ سے بہت پیار کرتی ہو؟"

"میری طرح کتنی ہی بیٹیاں ہیں جو اپنے باپ پر قربان ہو جاتی ہیں مگر میں بدنصیب ہوں۔ بچپن میں یتیم ہو گئی تھی۔"

راجہ نے چونک کر پوچھا۔ "کیا مطلب؟ وہ تمہارا باپ نہیں تھا؟"

"نہیں۔ میں ان کا مہرہ ہوں۔ انہوں نے اسی عمارت کے اندر تمہیں ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور یہ طے کیا تھا کہ کسی طرح تم وہاں سے بچ نکلو گے تو تمہیں باہر ٹریپ کیا جائے گا۔"

"تم اسے کار سے نکال کر بچانے کے بعد اس اعتماد سے یہ بتا رہی ہو کہ میں ان کے بچھائے ہوئے جال سے نکل نہیں پاؤں گا۔"

"تمہاری ذہانت اور دلیری کے چرچے سنے ہیں اس لئے بتا رہی ہوں کہ ابھی وقت ہے۔ خود بھی بچ سکتے ہو اور مجھے بھی ان کے شکنجے سے نکال سکتے ہو۔"

"تم اور ان کے شکنجے میں؟"

"ہاں۔ مجھے خود غرض کہہ سکتے ہو۔ میں تمہاری دلیری پر بھروسا کر کے پہلے سے بتا رہی ہوں۔ تم نجات کا راستہ نکالو گے تو مجھے بھی نجات مل جائے گی۔"

"ہوں۔ ان کی پلاننگ کیا ہے؟"

"تم نازاں کو اغوا کر لے گئے تھے۔ ان کا خیال ہے' تم حسن پرست ہو اس لئے میرے جال میں بھی پھنس جاؤ گے۔ ابھی تم نے سفیر کی کنپٹی پر گن کی نال رکھ کر اسے کار سے اترنے پر مجبور کیا تھا۔ تمہاری اس حرکت سے انہیں یقین ہو جائے گا کہ تم نے میرے ساتھ اس کار میں رہنے کے لئے میرے باپ کو بھگا دیا ہے۔"

"مجھے پلاننگ بتاؤ؟"

"انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں سمندر کے کنارے تمہیں بوٹنگ کے لئے لے جاؤں وہاں دشمن ہوں گے۔ یہاں شبہ ہے کہ تمہیں تعاقب کا علم ہو جائے گا۔ تمہارے جانباز تمہاری نگرانی کرتے ہیں۔"

"کیا میرے جانباز بوٹنگ ڈیک کی نگرانی نہیں کریں گے۔ وہاں دشمن کیا کریں گے؟"

"بڑی ٹھوس پلاننگ ہے۔ ان کے حکم کے مطابق میں تمہیں اپنے ساتھ ایک بوٹ میں دور تک سمندر میں لے جاؤں گی۔ دو بوٹ پر دشمن ہمارا تعاقب کریں گے۔ باقی ڈیک پر جتنی کرائے کی بوٹس اور دوسری کشتیاں ہیں' ان کے مالکان کو منہ مانگی رقم دے کر تمام بوٹس اور کشتیوں کو ناکارہ بنا دیا گیا ہے۔ تمہارا کوئی جانباز تمہاری مدد کے لئے سمندر میں

نہیں آسکے گا۔"

"بے شک اچھی اور ٹھوس پلاننگ ہے۔"

اس نے موبائل فون کے ذریعے ایک جانباز سے کہا۔ "کار یہاں لے آؤ۔"

پھر اس نے اسے کار روکنے کو کہا۔ اس کے بعد پوچھا۔ "ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ میرے کارناموں سے متاثر تھے۔ نیک بخت کی حمایت میں کاشف اکبر کو میرے ذریعے کمزور بنانا چاہتے تھے اور خفیہ ہاتھ تو اپنی خفیہ ایجنسیوں میں رکھ کر میری خدمات حاصل کرنا چاہتا تھا' کیا یہ چالبازی تھی؟"

"راجہ! تم نے خفیہ ہاتھ کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ جو آدھی سے زیادہ دنیا پر حکومت کر رہا ہو' وہ اتنا نادان ہو گا کہ وہ تمہارے اور امیر حمزہ کے تعلقات کو نہیں سمجھتا ہو گا؟ تم دونوں کے نظریات اور لائن آف ایکشن بالکل ایک ہیں۔ تم دونوں نیک بخت اور کاشف اکبر جیسے زر خرید سیاست دانوں کی کرپشن اور کمزوریاں عوام پر ظاہر کرتے رہتے ہو۔ انہیں نقصان پہنچاتے رہتے ہو۔ جس کاشف اکبر کے کیٹی بندر والے کیس کو اچھال کر نیک بخت نے اسے اقتدار کی کرسی سے گرایا ہے' تم نے کاشف اکبر کو بھی بڑے نقصانات پہنچائے ہیں۔ کیا اس طرح ظاہر نہیں ہوتا کہ تم دونوں محبان وطن ہو اور تم میں سے کوئی مخلص اور وفادار رہ کر خفیہ ہاتھ کے لئے کام نہیں کرے گا بلکہ کام کرنے کے بہانے خفیہ ہاتھ کے گہرے رازوں تک پہنچنے کا منصوبہ بنائے گا۔ کیا تم یقین کر رہے ہو کہ خفیہ ہاتھ تمہارے اور نیک بخت کے تعلقات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہے؟"

"بے شک۔ ہم سوچ رہے تھے کہ خفیہ ہاتھ ہم پر شبہ کر سکتا ہے۔ ہم کوئی چال چلتے وقت منفی پہلو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ تمہاری باتوں سے تصدیق ہو رہی ہے۔ ویسے تم کون ہو؟"

"مجھے اپنی صحیح ہسٹری معلوم نہیں ہے ہوش سنبھالا تو خود کو ایک عیسائی مشنری میں پایا۔ وہاں تعلیم حاصل کرتی رہی۔ میری ذہانت اور حاضر دماغی کا ریکارڈ دیکھ کر مجھے نیو یارک کے ایک آرمی تربیتی ہوسٹل میں بھیج دیا گیا۔ وہاں سراغ رسانی اور ہتھیاروں کو استعمال کرنا سکھایا جاتا ہے۔ تربیت مکمل ہونے کے بعد مجھے مڈل ایسٹ جانے کا حکم دیا۔ ایک اسلامی ملک کے سلطان کو ایک پیچیدہ سیاسی معاملے میں پھانسنا تھا اور ایسا کرنے کے لئے مجھے اس سلطان کے ساتھ رات گزارنے کو کہا گیا تھا۔ میں نے اسے اس رات اتنی پلائی کہ گناہ سے بچ گئی اور باس کے حکم کے مطابق کام بھی نکال لیا۔"

چند جانباز دو گاڑیاں لے کر آ گئے۔ راجہ' ٹینا کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھ گیا اور

سفیر کی گاڑی چھوڑ کر اپنی خفیہ رہائش گاہ کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "اس میں شبہ نہیں ہے کہ تم حسین اور پرکشش ہو۔ تمہیں اسی لئے سراغ رسانی سکھائی گئی ہے کہ تم حسن و شباب کا جال بچھا کر دشمنوں کے اہم راز معلوم کرتی رہو۔"

"ہاں اس سلطان سے اپنی عزت بچانے کے بعد میں یہی سوچتی رہی کہ مجھے خفیہ ایجنسی سے بھاگ کر کہیں روپوش رہ کر زندگی گزارنا چاہیے۔ ویسے میں نے راز دار بن کر فرار ہونے والوں کو مرتے ہی دیکھا ہے۔ میں مرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ ایسے ہی وقت مجھ سے کہا گیا کہ مجھے پاکستان جانا ہے اور راجہ نواز کو اس طرح گھیرنا ہے کہ اسے بچ نکلنے کا موقع نہ ملے۔"

"ہوں۔ گھیرنے کا منصوبہ اچھا تھا۔ سمندر میں دور دور تک میری مدد کے لئے کوئی جانباز نہیں آسکتا تھا۔"

"بات صرف تمہیں گھیرنے کی نہیں ہے' سمندر میں دو بوٹس پر بیٹھے ہوئے دشمن فائرنگ کرتے اور گرینیڈ پھینکتے تو تمہارے ساتھ میں بھی مرجاتی اور خفیہ ہاتھ کو مجھ جیسی آلۂ کار کی موت کا افسوس کبھی نہ ہوتا۔"

"تم نے اپنی جان بچانے کے لیے اور مجرمانہ زندگی گزارنے سے بچنے کے لیے میرا ساتھ دیا ہے۔ تم بتاؤ کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"ہو سکے تو مجھے پاکستان میں یا کسی دوسرے ملک میں ایسی جگہ پناہ دے دو کہ خفیہ ایجنسیوں کے آدمی مجھ تک نہ پہنچ سکیں۔"

"یہ تو ممکن نہیں ہے۔ تم بھی جانتی ہو کہ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ان کے وسیع ذرائع ہیں وہ تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے پھر تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔ آج تم نے ان کا منصوبہ مجھے بتا کر انہیں بہت بڑا نقصان پہنچایا ہے۔"

"تو پھر مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں میک اپ اور گیٹ اپ کی ماہر ہوں۔ مجھے بھیس بدلنا آتا ہے۔ فائٹنگ اور شوٹنگ کا موقع آئے گا تو وہ مجھے آسانی سے ہلاک نہیں کر سکیں گے۔"

"میں نے تمہیں پناہ دینے سے انکار نہیں کیا ہے۔ تمہیں بے یارو مددگار چھوڑنا مردانگی نہیں ہے۔ ابھی میرے ساتھ چلو پھر ہم آئندہ کے لئے سوچیں گے۔"

"میں تم پر بوجھ نہیں بنوں گی۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی تو کچھ نئی مصیبتیں گلے پڑتی رہیں گی۔"

"تم ساتھ نہیں رہو گی تب بھی مصیبتیں میرے پیچھے پڑ جائیں گی۔ بہرحال کوئی

محفوظ پناہ گاہ تلاش کرنے تک تم میرے ساتھ رہو گی۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر کو جھکا کر سنجیدگی سے سوچنے لگی۔

☆=======☆=======☆

میں عالی کے ساتھ ایک کمرے میں بیٹھا' اسے حمزہ صاحب اور راجہ نواز کے پرائیویٹ فون نمبر نوٹ کرا رہا تھا۔ وہ گاڈ فادر انکل ہاشم کے کئی فون نمبرز جانتی تھی ویسے وہ بہت سمجھ دار تھی۔ اس کے باوجود میں اسے سمجھا رہا تھا کہ میں بھارت چلا جاؤں گا تو اسے تنہا کس قدر محتاط رہنا چاہیے۔ اس نے کہا۔ "بھائی جان! یہ میرے میڈیکل کا آخری سال ہے۔ میں بھی امی کی طرح ایک باصلاحیت ڈاکٹر اور سرجن بننا چاہتی ہوں۔ یہاں دھڑکا لگا رہے گا کہ انجانے دشمن اور خود ہمارے خاندان والے نہ جانے کیسی سازشیں کریں۔ میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں پھر انکل ہاشم دن رات میرا خیال رکھیں گے لیکن یہ بہتر ہو گا کہ میں ہاسٹل میں رہوں۔ کم از کم میرے دشمن رشتے دار یہ نہیں سمجھ پائیں گے کہ میں اتنی عالی شان کوٹھی کو چھوڑ کر ہوسٹل میں رہنے لگی ہوں۔"

میں نے فون پر انکل ہاشم کو بتایا کہ عالی احتیاطی تدابیر کے طور پر میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں رہنا چاہتی ہے۔ انہوں نے چند لمحوں تک سوچنے کے بعد کہا۔ "اچھا آئیڈیا ہے۔ اسے ہاسٹل میں رہنا چاہیے۔ میں اس کوٹھی میں اپنے گینگ کی ایک لڑکی کو رہنے دوں گا۔ وہ اس طرح وہاں رہے گی کہ دشمن اسے عالی سمجھتے رہیں گے اور ہاسٹل سے لے کر کالج تک میرے خاص آدمی ہمیشہ عالی کی نگرانی کرتے رہیں گے۔"

ایسے وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔ میں نے کہا۔ "انکل! کوئی دروازے پر آیا ہے۔ شاید وہی تین افراد ہوں گے جو مجھے آج رات بھارت لے جانے والے ہیں۔"

"تم فون بند کرو۔ میں ابھی کال بیک کروں گا۔"

میں فون بند کرتے ہوئے بیرونی دروازے سے آکر لگ گیا وہ اندر سے بند تھا۔ باہر وہ آنے والے منتظر تھے۔ میں نے باہر سے موبائل فون کے بزر کی آواز سنی پھر ایک نے کہا۔ "ہیلو میں ہری پرشاد بول رہا ہوں۔"

اس نے دوسری طرف کی آوازیں سنیں پھر کہا۔ "یس باس! میں فرمان صاحب کی کوٹھی کے دروازے پر ہوں اور ابھی کال بیل کا بٹن دبایا ہے۔"

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی رہی پھر میرے موبائل سے اشارہ ملا۔ میں نے اسے آن کر کے انکل ہاشم کی آواز سنی۔ انہوں نے کہا۔ "دروازہ کھول دو۔ وہ ہمارے ہی لوگ ہیں۔ ان سے تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد مجھ سے رابطہ کرو۔"

انہوں نے فون بند کیا۔ میں نے بھی موبائل کو آف کر کے عابی کو دوسرے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا پھر اس کے جانے کے بعد دروازہ کھولا۔ باہر دو افراد کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے ان تینوں سے مصافحہ کر کے اندر بلایا۔ ہم ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک کا نام ہری پرشاد' دوسرے کا نام اعظم بیگ اور تیسری کا نام پوجا پانڈے تھا۔

ہری پرشاد نے کہا۔ "فرمان صاحب! یہاں سے بھارت جانے کے لئے اٹاری اور قصور کی طرف سرحدیں قریب ہیں لیکن ادھر بات نہیں بن رہی ہے۔ پاک آرمی نے بڑی سختی کی ہوئی ہے لیکن آپ تھر اور راجستھان کی سرحد آسانی سے پار کر سکیں گے۔ وہاں کے ایجنٹ نے آپ کے بھارتی شہری ہونے کے سلسلے میں تمام ضروری کاغذات تیار کر دیئے ہیں۔ آپ تین گھنٹے بعد یہاں سے چھ بجے کی فلائٹ سے کراچی جائیں گے۔"

"کیا میں تنہا جاؤں گا؟"

"نہیں۔ پوجا اور اعظم بیگ آپ کے ساتھ رہیں گے۔ آپ ان کی راہنمائی میں بھارت کے چھوٹے بڑے شہروں سے وہاں کے لوگوں کے مزاج.......... اور وہاں کے رسم و رواج سے واقف ہوتے رہیں گے۔ آپ کا نام وجے شرما ہوگا۔ پوجا اور اعظم آپ کو ہندی کے زیادہ سے زیادہ الفاظ سکھاتے جائیں گے۔"

میں نے پوجا کو دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملتے ہی بولی۔ "ہندی کی شکشا سفر کے سمے ہوتی رہے گی۔ ابھی ایک بات اچھی طرح یاد رکھو کہ ہندی میں حرف "ز۔ ذ' ض' اور ظ" کا تلفظ نہیں ہوتا۔ تمہیں رازداری کو راج داری' ذات برادری کو جات برادری' ناراض کو ناراج اور اعظم بیگ کو آجم بیگ کہنا ہوگا۔"

اعظم بیگ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھئی پاکستان میں تو میرا نام نہ بگاڑو۔"

ہم سب مسکرانے لگے۔ ہری پرشاد نے کہا۔ "فرمان صاحب! آپ کی والدہ' تابانی اور مراد کو راہِ راست پر لانے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ ان دونوں کا تعلق بھارت کی "را" ایجنسی سے تھا۔ وہاں "را" والوں سے آپ کا واسطہ پڑے گا۔ اس لیے آپ کو "را" کے متعلق کچھ معلومات فراہم کر رہا ہوں۔ آئندہ یہ معلومات آپ کے کام آسکتی ہیں۔"

ہری پرشاد نے صوفے پر ذرا سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "را میں آر کا مطلب ریسرچ' اے کا مطلب اینالائیس اور ڈبلیو کا مطلب ہے ونگ یعنی ریسرچ اینڈ اینالائیس ونگ کا مخفف "را" ہے۔"

وہ بتانے لگا کہ ۱۹۶۸ء میں اندرا گاندھی کے دور میں یہ ایجنسی بنائی گئی تھی۔ آج یہ ایجنسی بیرونی ملکوں میں سراغ رسانی کے حوالے سے سی آئی اے' کے جی بی اور موساد سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

اس ایجنسی کا پہلا اور بنیادی کام یہ ہے کہ اپنے تمام پڑوسی ملکوں میں اور خاص طور پاکستان میں ایسے اہم لوگوں کو ٹریپ کرتی ہے جو حسین عورتوں اور دولت کے لالچ میں پاکستانی ہو کر بھی پاکستان کے خلاف کام کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔

"را" ایجنسی کی ترتیب کچھ یوں ہے کہ اس کی ایک جوائنٹ انٹیلیجنس کمیٹی ہے۔ اس کا ایک ڈائریکٹر جنرل ہے۔ موجودہ ڈائریکٹر جنرل کا نام جمنا پرساد دھاون ہے۔ اس کے ماتحت تین ایڈیشنل ڈائریکٹرز ہیں۔

انہوں نے پوری دنیا کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہر حصے یا ہر ایریا کا ایک جوائنٹ ڈائریکٹر ہوتا۔ ایریا نمبر۱ میں صرف پاکستان ہے۔ جبکہ دوسرے چار ایریاز میں کئی ممالک ہیں لیکن پاکستان کو نمبر۱ پر صرف اس لیے رکھا گیا ہے کہ یہ ملک خدا داد' بھارت کے کلیجے میں کانٹے کی طرح چبھتا رہتا ہے۔

"را" میں دو شعبے اسپیشل سروسز بیورو SSB اور ایوی ایشن ریسرچ سینٹر ARS ایسے ہیں جو پاکستان کے ذرائع ابلاغ اور ریڈارز.......... کو مانیٹر کرتے اور جام کرتے رہتے ہیں۔ ان کے پاس پہلے ہی فضائی آلات بہت تھے۔ اب یہ خلائی سیاروں سے بھی مدد حاصل کرنے لگے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ "را" ایجنسی پاکستان کے اندر کتنے منظم طریقوں سے جاسوسی کرتی ہے اور زر خرید پاکستانی سیاست دانوں کے ذریعے اس ملک کو کھوکھلا کرتی جارہی ہے۔

وہ بول رہے تھے اور میں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ہم سب پاکستانی محنت مزدوری کر کے تین وقت کی روٹیاں کھا کر زندہ رہتے ہیں اور راتوں کو سوجاتے ہیں لیکن پاکستان کو زندہ اور قائم رکھنے والی معلومات سے بے خبر رہتے ہیں۔ کبھی سمجھ نہیں پاتے کہ ہماری بے خبری میں ہمارے پیروں تلے سے زمین کھسکائی جارہی ہے۔

میں نے امی کو بھارت سے واپس لانے کا عزم کیا تھا لیکن اب میرے اندر کا ایک غیرت مند پاکستانی کہہ رہا تھا کہ میں صرف اپنی امی کے لیے ہی نہیں بلکہ اپنے پورے ملک اور پوری قوم کو سلامتی کی خاطر جہاد کرنے جارہا ہوں۔

ہری پرشاد نے کہا۔ "وقت کم ہے۔ آپ کو پوجا اور اعظم کے ساتھ ائرپورٹ جانا ہے۔ میں نے چند اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ باقی معلومات ان دوساتھیوں سے حاصل

ہوتی رہیں گی۔ چلیں اٹھیں اور ایک چھوٹے سے بیگ میں جو نہایت ضروری سامان ہے.......... رکھ کر لے آئیں۔ لباس وغیرہ کہیں بھی خرید سکتے ہیں۔"

میں دوسرے کمرے میں آیا۔ عالی مجھ سے لپٹ کر بھیگی آنکھوں سے دیکھتے ہوئی بولی۔ "میں ایک بزدل کی طرح نہیں رو رہی ہوں۔ میرا ایمان اور میرا یقین کہہ رہا ہے کہ میرے بھائی جان امی کو یہاں لے آئیں گے۔ بس یونہی آپ سے بچھڑتے ہوئے رونے کو جی چاہ رہا ہے۔"

میں نے اس کی پیشانی کو چوم کر کہا۔ "میں جانتا ہوں' تم بڑے حوصلے والی ہو۔ اللہ پر بھروسا رکھو' امی یہاں ضرور آئیں گی۔"

میں نے ایک ہینڈ بیگ میں ضروری مختصر سا سامان رکھا پھر فون پر انکل ہاشم سے کہا۔ "میں پوجا اور اعظم کے ساتھ روانہ ہو رہا ہوں۔ انکل آپ مجھ سے بہت زیادہ تجربے کار ہیں پھر بھی پوچھ رہا ہوں' کیا ہری پرشاد پر اندھا اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ کیا پوجا بھی ہندو ہے؟"

"بیٹے! ہری پرشاد ہندو نہیں مسلمان ہے۔ اکثر بھارت میں میرے کام سے جاتا رہتا ہے۔ اس لئے ہم اسے ہری پرشاد کہتے رہتے ہیں۔ یہ پچھلے پندرہ برس سے ہمارے ساتھ ہے۔"

"اور پوجا پانڈے؟"

"پوجا بے شک ہندو ہے لیکن میں نے پچھلے دو برس کے دوران میں اسے ایسی آزمائشوں میں مبتلا کیا ہے کہ وہ غداری کر کے مجھے نقصان پہنچا سکتی تھی لیکن وہ مجھے باپ کی طرح چاہتی ہے۔ تم اس پر اعتماد کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "میں یہاں سے نکل رہا ہوں عالی تنہا رہ جائے گی۔"

"نہیں رہے گی۔ اس کوٹھی کے چاروں طرف مسلح گارڈز ہیں۔ میں نے عالی کو ان کے کوڈورڈز بتا دیئے ہیں۔ دو چار روز میں اسے ہاسٹل منتقل کردوں گا۔ تم بے فکر ہو کر یہاں سے جاؤ۔"

میں نے فون کو بند کیا۔ عالی کو گلے لگا کر اس کی پیشانی چوم کر اس سے رخصت ہوا پھر کوٹھی کے باہر آکر ہری پرشاد' اعظم بیگ اور پوجا کے ساتھ ایک کار میں بیٹھ کر ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆======☆======☆

دردانہ بیگم غصے کی شدت سے پھٹی پڑ رہی تھی اور کاشف اکبر کو باتیں سنا رہی

تھی۔ کاشف اکبر نے کہا۔ "تم میرے پیچھے پڑ گئی ہو جیسے میں نے سیف میں سے اہم راز نکالے ہیں۔"

دردانہ نے کہا۔ "تم اسے میری کوٹھی میں لائے تھے۔ اسے نہ لاتے تو ہمارے رازوں تک کسی کا سایہ بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔"

"صرف میں نہیں' تم بھی اسے لائی تھیں۔ وہ ہم دونوں کی رضامندی سے یہاں آیا تھا۔ اس نے نیک بخت کے خلاف ٹھوس ثبوت پیش کئے تھے۔ میری طرح تم نے بھی اس پر اعتماد کیا تھا۔"

"ہاں کیا تھا مگر تم کیسے مرد ہو' اس کے ہاتھ سے ایک ریوالور نہ چھین سکے؟"

"مردانگی کا طعنہ نہ دو۔ میں ولن کے ہاتھ سے ریوالور چھیننے والا فلمی ہیرو نہیں سیاست داں ہوں۔ اگر تم چاہتی تھیں کہ مجھے ایک گولی لگے' میں مر جاؤں اور بیوہ ہو جاؤ تو پھر تم نے سیف سے تمام اہم راز خود اپنے ہاتھوں سے نکال کر انہیں اپنے ہی بیگ میں رکھ کر اسے کیوں دیا تھا؟"

"میں تو عورت ہوں۔ قدرت نے عورتوں کو ڈرپوک بنایا ہے اسی لئے مرد اس کا باڈی گارڈ بنتا ہے۔"

باڈی گارڈ کی بات پر کاشف اکبر نے چونک کر سیکورٹی افسر کو بلایا۔ اس نے آکر سلیوٹ کیا۔ کاشف اکبر نے گرج کر پوچھا۔ "کیا تم صرف سلیوٹ کرنے کی تنخواہ لیتے ہو یا پوری ذمے داری سے ڈیوٹی بھی کرتے ہو؟"

وہ بولا۔ "سر! میں نے کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔"

"ہمارے ساتھ جو مہمان آیا تھا' اس کے یہاں آنے کے بعد ایک شخص ایک بیگ میں آڈیو اور ویڈیو کیسٹس لے کر آیا تھا۔ کیا تم نے ان ویڈیو کیسٹس کو چیک کیا تھا؟"

"یس سر! اس بیگ میں صرف دو آڈیو اور تین ویڈیو کیسٹس تھے اور کچھ نہیں تھا۔"

"تم نے ویڈیو کیسٹس کو کھول کر چیک کیوں نہیں کیا؟"

"سر! کسی بھی کیسٹ کو کیسے کھولا جاسکتا ہے۔ وہ تو ہر طرف سے پیکڈ ہوتا ہے۔ اسے کھولنے سے تمام ویڈیو ٹیپ کھل کر بکھر جاتا۔"

"کیا تمہارے پاس اتنی سی عقل نہیں ہے کہ ایک ویڈیو کیسٹ میں چھوٹے سائز کا ایک ریوالور چھپا کر یہاں بھیجا جاسکتا ہے؟"

وہ حیرانی سے بولا۔ "میں کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور آپ نے بھی اپنی عقل

سے ایسا نہیں سوچا تھا۔ ورنہ باہر سے ویڈیو کیسٹس نہ منگواتے۔"

"یوشٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔"

وہ سیلوٹ کر کے چلا گیا۔ دردانہ نے کہا۔ "وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ہماری عقل میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ ایک کیسٹ کے اندر ہماری موت کا سامان آسکتا ہے۔ یہ کمینہ امیر حمزہ بہت ہی مکار ہے۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ کاشف اکبر نے ریسیور اٹھا کر پوچھا۔ "ہیلو کون ہے؟"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "کیا.......... کاشف اکبر صاحب ہیں؟ خفیہ ہاتھ کے پرسنل سیکرٹری بات کرنا چاہتے ہیں۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "جی ہاں! میں ہی کاشف اکبر ہوں آپ بات کرائیں۔"

اس نے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر خوشی سے کہا۔ "خفیہ ہاتھ نے ہمیں یاد کیا ہے۔ ضرور کوئی خاص بات ہوگی اور ہمارے مطلب کی بات ہوگی۔"

تھوڑی دیر بعد پرسنل سیکرٹری نے کہا۔ "ہیلو مسٹر کاشف اکبر! آپ کو ایک خوشخبری سنا رہا ہوں۔ ہمارے باس آپ کو ترجیح دینے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔"

"کیا واقعی؟ آپ ایک اتنی بڑی خوشخبری سنا رہے ہیں .... لیکن وہ تو نیک بخت کو ہم پر ترجیح دے رہے تھے؟"

"سیاست میں کسی وقت بھی باپ کو گدھا اور گدھے کو باپ بنایا جاسکتا ہے۔ نیک بخت کے سیف سے ایسے ایسے اہم راز چرائے گئے ہیں کہ عوام میں اس کی مقبولیت کا گراف نیچے آرہا ہے۔ لہٰذا آپ کو دوبارہ اقتدار کی کرسی پر لانے کا فیصلہ کیا جارہا ہے۔"

"پلیز میرے ہی حق میں فیصلہ کریں۔ خفیہ ہاتھ سے میری بات کرائیں۔"

"ان سے بات ہو جائے گی لیکن آپ پہلے یہ لکھ کر بھیج دیں کہ نیک بخت کی طرح آپ کی پوزیشن کمزور نہیں ہے اور آپ کے مخالفین آپ کی کسی بھی کمزوری کا فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔"

"آں؟" وہ پریشان ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے بھول گیا تھا کہ نیک بخت کی طرح اس کے سیف کو بھی لُوٹ لیا گیا ہے۔ اس کے کئی اہم راز عوام کے سامنے آئیں گے تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔"

پرسنل سیکرٹری نے پوچھا۔ "ہیلو! آپ خاموش کیوں ہو گئے؟"

"وہ.......... وہ میں خوشی کے مارے کچھ بول نہیں پا رہا ہوں مگر پہلے ان سے ایک خفیہ ملاقات ہو جائے تو بہتر ہوگا۔ میں کچھ ایسی راز کی باتیں کرنا چاہتا ہوں جو فون پر نہیں

کر سکتا۔"

"خفیہ ملاقات بھی ہو جائے گی۔ پہلے ضمانت دیں کہ کیٹی بندر کی طرح آئندہ آپ کی کوئی کمزوری کسی مخالف کے ہاتھ نہیں آئے گی۔ آپ ضمانت نہیں دیں گے تو بات نہیں بنے گی۔ باس اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے۔"

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ کاشف اکبر نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ کر کہا۔ "لعنت ہے اس بدمعاش پر۔ ایسے وقت لُوٹ کر گیا ہے جب کرسی مل رہی ہے اور کرسی خریدنے والی رقم نہیں رہی ہے۔"

وہ دردانہ بیگم کو بتانے لگا۔ "خفیہ ہاتھ نیک بخت کو کمزور ہونے کے باعث اسے چھوڑ رہا ہے اور میرے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھنا چاہتا ہے لیکن اسے معلوم ہوگا کہ میرا سیف بھی لوٹ لیا گیا ہے تو وہ ہمیں بھی بیٹھنے کے لئے تختہ دے گا۔ تخت نہیں دے گا۔"

دردانہ غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگی۔ کہنے لگی۔ "آخر یہ حمزہ ہے کیا چیز؟ یہ نہ تو پولیس کے قبضے میں آتا ہے' نہ فوج اسے پکڑتی ہے۔ سی آئی اے اور انٹرپول جیسے ادارے بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ پاتے ہیں۔ جی چاہتا ہے' وہ ابھی سامنے آئے اور میں اس کا گلا دبا کر اپنے سیف کی ایک ایک چیز واپس چھین لوں۔"

"اس کی گردن موٹی ہے اور تمہارے ہاتھ چھوٹے ہیں۔ غصے سے نہیں عقل سے سوچو۔ ایسے سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے میری عقل کہتی ہے کہ حمزہ سامنے آئے تو ہم دونوں اس کے قدموں میں گر پڑیں۔"

"اس کا منہ کبھی نظر نہیں آتا۔ پاؤں کیسے نظر آئیں گے؟ پاؤں نظر آئیں گے' تب قدموں میں گریں گے نا۔ وہ یہاں سے چوری کر کے گیا ہے اور چور کبھی اپنے گھر کا پتا اور فون نمبر نہیں بتاتا۔ بڑی مشکل ہے۔ ہم اسے کہاں تلاش کریں؟"

"کیا تمام اخبارات میں یہ پیغام شائع کرایا جائے کہ امیر حمزہ صاحب! آپ کل شام جس کی کوٹھی میں مہمان تھے' وہ میزبان آپ سے فون پر گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ آپ فون نمبر جانتے ہی ہیں۔ ہم آپ کے فون کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"دوپہر ہو چکی ہے۔ پیغام آج دیں گے تو کل کے اخبارات میں شائع ہوگا۔ آپ اخبارات کے علاوہ ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے بھی یہی پیغام دیں اور یہ اچھی بات ہوگی کہ پیغام میں ہمارا فون نمبر نہیں بتایا جائے گا۔ اس طرح ہمارے مخالفین کو اور خصوصاً نیک بخت کو معلوم نہیں ہوگا کہ یہ پیغام ہم نے امیر حمزہ کو دیا ہے۔"

"پھر یہ کہ ہم اسے چور نہیں' مہمان کہیں گے تو کسی کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ

ہمارے گھر آنے والے نے سیف سے چوری کی ہے۔"

انہوں نے سیکرٹری کو بلا کر وہ مختصر سا پیغام نوٹ کرایا۔ اسے حکم دیا۔ "کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ یہ پیغام ہماری طرف سے ہے۔ ابھی جاکر ریڈیو اور ٹی وی کے اشتہاری ریٹ کے مطابق انہیں نقد رقم دے کر تاکید کرو کہ ہر پندرہ منٹ کے بعد اس پیغام کو نشر کیا جائے۔"

سیکرٹری حکم کی تعمیل کے لیے چلا گیا۔ شام کو خفیہ ہاتھ کے سیکرٹری نے فون پر کہا۔ "مسٹر کاشف اکبر! آپ نے جس مہمان کو فون کرنے کا پیغام دیا تھا' اس نے ہمیں فون کیا ہے۔"

کاشف اکبر نے انجان بن کر پوچھا۔ "آپ کس مہمان کی بات کررہے ہیں؟ میں نے کسی کو پیغام نہیں دیا تھا۔"

"ٹھیک ہے تو پھر آپ یہ معلوم نہیں کرنا چاہیں گے کہ وہ مہمان کون تھا؟ اور اس نے فون پر ہمیں کون سی بات بتائی ہے؟"

وہ الجھن میں پڑ گیا۔ یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ کس نے اس سیکرٹری سے بات کی ہے اور اسے کیا بتایا ہے؟ اس نے کہا۔ "آپ نے ابھی فرمایا تھا کہ میں نے کسی مہمان کو فون کرنے کا پیغام دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے۔ اس مہمان نے آپ سے میرا ذکر کیا ہے۔ اس نے اپنا نام بتایا ہوگا؟"

"جب آپ نے کسی مہمان کو کوئی پیغام نہیں دیا تو پھر آپ اس کا نام کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"آپ مجھ سے اس کا ذکر کررہے ہیں اس لئے تجسس پیدا ہورہا ہے۔"

"تو پھر تجسس میں مبتلا رہیں۔ آپ اقرار نہیں کررہے ہیں کہ آپ نے کسی کو......... پیغام دیا تھا۔ لہٰذا آپ کا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ معقول بات کر رہا ہوں نا؟ کیا فون بند کردوں؟"

"جسٹ اے منٹ۔ میں......... میں اقرار کرتا ہوں۔ میں نے امیر حمزہ کو فون پر بات کرنے کا پیغام دیا ہے۔ پلیز بتائیں' اس نے آپ سے کیا کہا ہے؟"

"آپ کی کوٹھی کے بیڈ روم میں جو واردات اس نے کی ہے' اس کی اطلاع ہمیں دی ہے۔"

اس نے پریشان ہوکر دردانہ کو دیکھا پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "اس کمینے کتے نے ہمارے سیف کو لوٹنے کی بات بھی خفیہ ہاتھ تک پہنچا دی ہے۔"

دوسری طرف سے سیکرٹری نے پوچھا۔ "اب کس سوچ میں پڑ گئے ہیں۔ حمزہ نے آپ کو اور نیک بخت کو ایک ساتھ ایک ایسے مقام پر لاکر کھڑا کر دیا ہے جہاں ایک پھونک مارتے ہی تم دونوں بلندی سے بہت گہری پستی میں گر پڑو گے۔"

"آپ درست فرماتے ہیں۔ آپ میری ایک بات اپنے باس تک پہنچا دیں۔ حمزہ دراصل آپ کے باس کا مخالف ہے۔ اگر باس نے ہمارے سروں پر ہاتھ نہ رکھا اور کسی تیسرے چوتھے کو یہاں کا حکمران بنانے کی کوشش کی......... تو حمزہ انہیں بھی ہماری طرح برباد کردے گا۔ کسی زر خرید سیاست داں کے پیچھے وہ آپ کے باس کو اس ملک میں اپنی من مانی نہیں کرنے دے گا۔"

سیکرٹری نے ریسیور رکھ دیا۔ خفیہ ہاتھ قریب ہی ایک ریوالونگ چیئر پر بیٹھا فون کے وائڈ اسپیکر سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "اس نے آخری بات درست کہی ہے۔ میں کسی بھی سیاست داں کو آلہ کار بنا کر پاکستان کو اپنے زیر اثر رکھنا چاہوں گا۔ حمزہ اور راجہ نواز اس کے قدم اکھاڑ دیں گے۔"

سیکرٹری ادب سے سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ وہ ریوالونگ چیئر پر دائیں سے بائیں گھوم کر بولا۔ "سانپ کا زہر نکال دیا جائے تو پھر وہ کسی کو ڈسنے کے قابل نہیں رہتا۔ راجہ نواز کے لئے انتظامات کئے جاچکے ہیں۔ اس کا اختتام ہونے والا ہے۔ کل تک حمزہ کے اندر سے بھی تمام زہر نچوڑ ڈالوں گا۔"

☆======☆======☆

راجہ نوز نے ہنستے ہوئے ٹینا کو دیکھا پھر کہا۔ "تم خوامخواہ ڈر رہی ہو۔ میری یہ رہائش گاہ بالکل محفوظ ہے۔"

وہ بولی۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو' خفیہ ہاتھ کتنے وسیع ذرائع کا مالک ہے۔ اگر اس کا کوئی مخالف زندہ کسی قبر میں بھی جاکر چھپ جائے تو اس کے جاسوس وہاں بھی پہنچ جاتے ہیں۔"

"آج تک اس کا کوئی جاسوس ہمارے سائے تک بھی نہیں پہنچ سکا۔ اللہ ہماری مدد کرتا ہے۔ یہی دیکھ لو کہ مجھے کھلے سمندر میں دور کہیں قتل کرنے کا منصوبہ تھا۔ واقعی میرے جانبازوں کو کوئی موٹر بوٹ نہ ملتی تو وہاں دشمنوں کی موٹر بوٹس دونوں طرف سے گھیر کر مجھے فرار ہونے کا موقع نہ دیتیں۔ میں بوٹ سے کود کر سمندر کے پانی میں کئی کلومیٹر دور ساحل تک نہ پہنچ پاتا۔ وہ میرے ساتھ تمہیں بھی مار ڈالتے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں میری جان بچانے کا وسیلہ بنا دیا۔ تم نے ان سے نجات پانے کے لئے مجھ پر بھروسا

کیا ہے۔ انشاء اللہ میں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

وہ ایک ایزی چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹینا اس کے سامنے فرش پر گھٹنے ٹیک کر اس کے زانو......... پر سر رکھ کر بولی۔ "میں نے آدھی سے زیادہ دنیا پر حکومت کرنے والے کی پناہ میں رہنا گوارا نہیں کیا۔ تم پر بھروسا کرکے یہاں نہ آتی تو وہاں میرے پاس بہت کچھ ہوتا مگر عزت آبرو نہ ہوتی۔"

وہ فرش پر گھٹنے ٹیکے اس کے زانو......... سے ایسے لپٹی ہوئی تھی کہ وہ اس کے حسن و شباب کی حرارت محسوس کررہا تھا۔ سامنے خالی دیوار پر اسے اپنی نازاں دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس کی زندگی کی پہلی محبت تھی اور شاید آخری بھی ہوسکتی تھی کیونکہ حسین ترین دوشیزاؤں کو دیکھ کر بھی اس کا دل کسی پر نہیں آتا تھا۔ جہاں حسن و شباب کا نظارہ ہوتا' وہاں نازاں کا تصور ان تمام نظاروں پر حاوی ہوجاتا تھا۔

وہ ٹینا کو دور کرنے کے لئے کرسی سے اٹھنے لگا تو اسے بھی فرش سے اٹھتے ہوئے الگ ہونا پڑا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا تمہارے ساتھی نہیں ہیں؟ اتنے بڑے مکان میں ہم تنہا رہیں گے؟"

"میرے دو جانباز تمام رات مکان کے باہر چھپے رہیں گے۔ صبح وہ جائیں گے ان کی جگہ دوسرے دو جانباز آجائیں گے۔ خطرہ محسوس ہوتے ہی موبائل کے ذریعے کال کریں گے۔ پھر منٹوں میں درجنوں جانباز یہاں پہنچ جائیں گے۔"

"تمہاری احتیاطی تدابیر سے بڑا حوصلہ ہورہا ہے لیکن میں اتنے بڑے مکان کے ایک بیڈ روم میں تنہا نہیں رہوں گی۔ تم بھی اسی کمرے میں رہو۔ میں اعتراض نہیں کروں گی۔"

"دیکھو اس کمرے کے ساتھ ہی میرا کمرا ہے۔ دونوں کمروں کی درمیان یہ دروازہ ہے۔ اس باہر کھلنے والے دروازے کو لاک کرلو اور اس درمیانی دروازے کی چٹخنی اِدھر سے لگالو۔ جیسے ہی کوئی خطرہ محسوس کرو تو چٹخنی ہٹا کر کھول کر میرے پاس چلی آنا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

اس نے رضا مندی سے سر ہلایا۔ راجہ نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ "شاباش! اسی طرح حوصلہ رکھو اور سمجھو کہ میں تمہارے بالکل قریب ہوں۔"

اس نے درمیانی دروازے کی چٹخنی ہٹائی۔ اسے کھول کر دوسرے کمرے میں جانے لگا۔ ٹینا نے اس کے بازو کو تھام کر کہا۔ "میں نے تمہارے مخالفین کی زبان سے سنا تھا کہ تم ہوس پرست ہو......... اسی لئے وڈیرے کی حسین اور جوان بیٹی کو اغوا کرکے لے گئے

تھے لیکن آج یہ الزام غلط ثابت کر رہے ہو۔ میں بھی حسین اور پُر کشش ہوں مگر تم شرافت سے مجھے چھوڑ کر اپنے کمرے میں جارہے ہو۔"

"میں اور امیرِ حمزہ زر' زن اور زمین کے پیچھے نہیں بھاگتے۔ ہم نے خود کو ملک اور قوم کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ وہ ایک قدرتی معاملہ تھا کہ نازاں میرے دل و دماغ پر چھاگئی تھی مگر اس بے چاری کو محبت کرنے کی سزا ملی۔ میں اسے کبھی بھول نہیں پاؤں گا۔ اسلام میں رہبانیت ممنوع ہے۔ مسلمان کے لئے شادی کرنا اور اپنی نسل کو آگے بڑھانا لازمی ہے لیکن کیا کروں؟ مجبور ہوں۔ نازاں کے بعد کوئی حسین ترین عورت بھی مجھے متاثر نہیں کرسکے گی۔"

وہ دروازے کے دوسری طرف جاکر اسے بند کرتے ہوئے بولا۔ "اپنی طرف سے چٹخنی چڑھالو۔"

اس نے بھی اپنی طرف کی چٹخنی چڑھالی۔ ایک میز پر تھرماس میں چائے تھی۔ وہ ایک کپ میں چائے ڈالنے کے بعد پینے لگا۔ ٹینا کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میک اپ اور گیٹ اپ میں اسے مہارت حاصل ہے۔ دوسرے دن اس کے لئے تمام ضروری سامان منگوالیا جائے گا پھر خفیہ ایجنسیوں والے اسے پہچان نہیں سکیں گے۔ اس کے فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے اسے آن کرکے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے حمزہ کی آواز سنائی دی۔ "راجہ! میں نے اچانک اسلام آباد چھوڑ دیا ہے۔ تم بھی فوراً کراچی چھوڑ دو۔"

"آخر بات کیا ہے؟"

"کوئی سوال نہ کرو۔ ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر اس شہر سے نکلو۔ یا کوئی بھیس بدل کر ایسی جگہ رُوپوش ہوجاؤ کہ تم پر کوئی شبہ نہ کرے۔ میں پندرہ منٹ کے بعد تمہیں تمام حالات بتاؤں گا۔"

حمزہ نے فون بند کردیا۔ راجہ پریشان ہوکر سوچنے لگا۔ ہم یقیناً خطرات میں گھر گئے ہیں۔ اسی لئے حمزہ نے فورا جگہ بدلنے کا مشورہ دیا ہے لیکن ایسی ہنگامی حالت میں ٹینا کو کہاں لے جاؤں؟

اس نے موبائل کے ذریعے ایک جانباز کو مخاطب کیا۔ اس سے پوچھا۔ "تم مکان سے کتنی دور ہو؟"

جواب ملا۔ "تقریباً تیس گز کا فاصلہ ہے۔ ایک مکان کی چھت پر ہوں۔"

"ابھی حمزہ نے مجھے فوراً دوسری جگہ جانے کے لئے کہا ہے۔ کوئی تشویش ناک

معاملہ ہوگا۔ میں ٹینا کو ساتھ نہیں لے جاسکوں گا اور وہ یہاں تنہا خوفزدہ رہے گی۔ تم فوراً پچھلے دروازے سے میرے پاس آؤ۔"

"سر! میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔"

راجہ نے فون کو آف کیا پھر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ اس نے کمرے کے پچھلے دروازے کو کھول دیا تھا۔ ایک جانباز پانچ منٹ کے اندر وہاں پہنچ گیا۔ راجہ نے کہا۔ "وہ صرف مجھ پر بھروسا کرتی ہے۔ اسے معلوم ہوگا تو مجھے تنہا نہیں جانے دے گی۔ تم میری جگہ یہاں رہو۔ میں بعد میں تم سے رابطہ کروں گا۔"

وہ ضروری سامان کا ایک بیگ لے کر پچھلے دروازے سے باہر آگیا۔ باہر تاریکی تھی۔ آسمان پر صرف ستارے چمک رہے تھے۔ راجہ وہاں کے راستوں سے واقف تھا۔ تاریکی میں......... چلتا ہوا اس مکان سے دور جانے لگا۔ پندرہ منٹ کے بعد حمزہ نے اسے فون پر مخاطب کیا۔ "تم کہاں ہو؟"

"کھوکھراپار کے ایک کچے راستے پر ہوں۔ تم مجھے بتاؤ تو سہی بات کیا ہے؟"

"ہمیں جو خفیہ امداد مل رہی تھی' وہ اچانک بند ہوگئی ہے۔ جو ریٹائرڈ محب وطن فوجی ہمارے جانباز بنے ہوئے تھے' انہیں واپس بلایا جارہا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو حمزہ! ہمارا یہ ملک پاک آرمی کے دم قدم سے ہی سلامت اور قائم ہے۔"

"بے شک! آج بھی آرمی نے ہمارے ملک کو سلامت اور قائم رکھا ہے لیکن جس طرح ملک کے ہر شعبے میں ملک دشمن عناصر چھپے ہوئے ہیں۔ اسی طرح فوج میں بھی چند مفاد پرست لوگ ہیں۔ وہ ایک عرصے سے خفیہ ہاتھ کے سائے میں رہ کر محبانِ وطن فوجی افسران پر اعتراض کرتے رہے ہیں کہ وہ درپردہ کرپٹ سیاست دانوں کے خلاف اندرون ملک اور بیرون ممالک میں امیر حمزہ کو ضروری امداد پہنچاتے رہتے ہیں۔"

"او گاڈ! یہ خفیہ ہاتھ اس حد تک پہنچا ہوا ہے۔"

"ہاں! اچانک مفاد پرست لوگوں کو اعلیٰ عہدے دے کر بڑی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ جو افسران ہماری مدد کرتے تھے' ان میں سے کسی کو جبراً ریٹائر کیا گیا ہے اور کسی کو چھٹی پر بھیج دیا گیا ہے۔ جتنے جانباز ہمارا ساتھ دیتے رہے تھے' ان کو دوبارہ ملازمت دینے کے لئے بلاکر کیمپ تک محدود رکھا جائے گا۔ تاکہ انہیں ہمارے کسی کام آنے کا موقع نہ ملے۔"

"اس کا مطلب ہے' ہم دونوں تنہا رہ گئے ہیں؟"

"تنہا بھی رہ گئے ہیں اور چند سہولتوں سے بھی محروم ہوگئے ہیں۔ مثلاً ہم اپنے

مددگار افسران کے تعاون سے نیک بخت اور کاشف اکبر کی بداعمالیاں' ریڈیو' ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے عوام پر ظاہر کرسکتے تھے لیکن ان تمام میڈیاز کے افسران تبدیل کردیئے گئے ہیں۔ اخبارات کو بھی پابند کیا جائے گا کہ وہ نیک بخت اور کاشف اکبر کے خلاف حقائق شائع نہ کریں۔"

"یار حمزہ! تم......... دونوں کے سیف تک پہنچ کر ان کے اہم راز اور کئی سیاسی کمزوریاں حاصل کرنے کے لئے بڑے خطرات سے کھیلے تھے۔ تمہاری اتنی محنت ضائع ہوگئی؟"

"محنت کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ ہمارے جہاد کے نتائج ابھی سامنے نہیں آسکیں گے لیکن مؤرخ حضرات تک، ہماری محنت پہنچے گی۔ آج نہ سہی' آنے والے دور میں پاکستان کی تاریخ کے یہ سیاہ باب ضرور لکھے جائیں گے۔"

"ہمارا کوئی اڈا یا کوئی پناہ گاہ اب خفیہ نہیں رہ پائے گی۔ جن ریٹائرڈ جانبازوں کو دوبارہ ملازمت دے کر کیمپ میں رکھا جائے گا' وہاں ان سے ہمارے بہت سے راز اگلوائے جائیں گے۔"

"جانبازوں میں شاید چند ہی ایسے ہوں گے جو کسی نہ کسی مجبوری کے باعث انہیں کچھ بتا دیں گے۔ اسی لئے میں تم سے کہہ رہا ہوں' وہ شہر چھوڑ دو۔ میں تو اسلام آباد چھوڑ چکا ہوں اور اب ایک گھنٹے میں لاہور پہنچنے والا ہوں۔"

"جب سیاست دانوں کو محاسبے' گرفتاری اور سزا پانے کا خوف ہوتا ہے تو وہ دوسرے ملکوں میں جاکر سیاسی پناہ حاصل کرتے ہیں۔ کیا ہمیں بھی کسی دوسرے ملک میں جاکر پناہ لینی ہوگی؟"

"ہم حکمران بننے کا لالچ کرنے والے سیاست داں نہیں ہیں۔ ہم کسی دوسرے ملک میں جاکر منہ نہیں چھپائیں گے۔ اگرچہ ہم سے تمام سہولتیں چھین لی گئی ہیں۔ ہمارے ذرائع اتنے محدود کردیئے گئے ہیں کہ ان حالات میں بھاگنا ہی پڑتا ہے لیکن ہم نہیں بھاگیں گے۔ یہ ملک ہمارا گھر ہے اور ہم گھر سے بے گھر ہوکر مخالفین کو اپنا گھر تباہ کرنے نہیں دیں گے۔"

"بے شک گھر سے بھاگنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے گھر کے دوسرے تمام افراد کو مخالفین کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے۔ ان مخالفین سے نمٹنے کے لئے اب ہم اپنی حکمتِ عملی میں تبدیلیاں کریں گے۔"

"خفیہ ہاتھ کے ذرائع اتنے وسیع ہیں کہ وہ سیٹلائیٹ کے ذریعے ہماری فون پر

ہونے والی گفتگو ریکارڈ کرا سکتا ہے۔ اس لئے ہم آئندہ یہ فون استعمال نہیں کریں گے۔ پرسوں سے رائے ونڈ میں لاکھوں مسلمانوں کا تبلیغی اجلاس شروع ہونے والا ہے۔ کل تک اپنے چہرے پر کچھ تبدیلیاں کر کے پرسوں رائے ونڈ پہنچو۔ میں بھی چہرے سے پہچانا نہیں جاؤں گا۔ ہم پاس ورڈز کے ذریعے ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ ہم میں سے ایک کہے گا "دنیا بدل جاتی ہے۔" دوسرا جواب میں کہے گا۔ "دین نہیں بدلتا۔"

"ہم لاکھوں کے مجمع میں کہاں ملیں گے؟"

"ریلوے اسٹیشن والی مسجد میں ملاقات ہو گی۔"

اس گفتگو کے دوران میں راجہ چلتا جا رہا تھا۔ تقریباً دو کلو میٹر کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ ایسے ہی وقت بہت دور بم کا دھماکا سنائی دیا۔ وہ چونک کر رک گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ جس آبادی کو چھوڑ کر آیا تھا۔ وہاں رات کی تاریکی میں آگ کا ایک بڑا سا گولا بلندی کی طرف، ابھرتا ہوا دور تک پھیل رہا تھا۔ وہ بے اختیار بولا۔ "یا اللہ! بے شک تو عالم الغیب ہے۔"

حمزہ نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ میں نے دھماکے کی آواز سنی ہے۔"

"ہاں جس آبادی سے آیا ہوں' وہاں زبردست قوت والے بم کا دھماکا ہوا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہماری اس خفیہ رہائش گاہ میں مجھے ہلاک کرنے کے لئے بم بلاسٹ کیا گیا ہے۔ اللہ تیری شان! قدرتی حالات مجھے اتنی دور لے آئے۔"

"پتا نہیں کہاں کہاں ہماری ہلاکت کا سامان کیا گیا ہو گا۔ جتنی جلدی ہو سکے' راجہ نواز کی شخصیت کو عارضی طور پر غائب کر دو۔ چہرے پر پلاسٹک سرجری کے لئے ڈاکٹر آفتاب شیرازی کے پاس نہ جانا۔ خفیہ ہاتھ کے کارندے ہمارے کسی ساتھی پر ٹارچر کر کے یہ اگلوا سکتے ہیں کہ ہم یا ہمارے جانباز کبھی کبھی چہروں پر تبدیلیاں کرنے کے لئے ڈاکٹر آفتاب شیرازی کے پاس جایا کرتے ہیں۔"

"میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ مجھے ٹینا کے لئے افسوس ہو رہا ہے۔ اس نے خفیہ ایجنسی سے نجات حاصل کرنے کے لئے مجھ پر بھروسا کیا تھا۔"

"کیا پاکستان میں پہلی بار ایک ٹینا کو اس طرح ہلاک کیا گیا ہے؟ اگر اس دھماکے میں تم ہلاک ہو جاتے تو میں افسوس نہ کرتا۔ ہم مرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ مخالفین کے خلاف جہاد میں شدت پیدا کرنا ہے۔ میں تمہیں سختی سے منع کر رہا ہوں جہاں بم دھماکے میں ٹینا ماری گئی ہے' ادھر پلٹ کر نہ جانا۔ جتنی جلد ممکن ہو' وہاں سے بہت دور نکل جاؤ۔ فون پر یہ ہماری آخری گفتگو ہے۔ اب پرسوں رائے ونڈ میں ملاقات ہو گی۔ اللہ حافظ۔"

حمزہ نے موبائل فون بند کر دیا۔ راجہ نے بھی اپنے موبائل کو آف کرتے ہوئے سوچا۔ میں اپنی جگہ ایک جانباز کو چھوڑ آیا تھا۔ بے چارے نے میری جگہ جان دے دی لیکن کوئی معجزہ بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کسی وجہ سے وہ بچ گیا ہو میں اسے کال کر کے معلوم کر سکتا ہوں۔

اس نے اس جانباز کے موبائل فون کے نمبر پنچ کئے پھر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ دل اداس ہو گیا۔ اس جانباز کے ساتھ ٹینا کی ہلاکت کی بھی تصدیق ہو گئی۔ اس نے اپنے فون کے پاور کو بند کر کے اسے بڑی مایوسی سے ایک طرف دور پھینک دیا۔ دل میں کہا۔ "مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔ ٹینا کے پاس بھی موبائل فون تھا' مجھے اس کا نمبر پوچھنا چاہیے تھا۔ سوچا تھا' اطمینان سے پوچھوں گا۔"

ویسے پوچھنے یا نہ پوچھنے سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا جب اپنا جانباز فون سمیت ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا تھا تو موت ٹینا کو بھی ہمیشہ کے لئے خاموش کر چکی ہو گی۔

☆======☆======☆

پاکستان میں تھر اور بھارت میں راجستھان کے ریگستانی علاقے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ صرف ان دو ملکوں کے دل ملے ہوئے نہیں ہیں۔ دونوں ملکوں کے مذاہب' رسم و رواج' مسلمانوں اور ہندوؤں کے ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کے جذبات نے انسان کو انسان سے الگ کر دیا ہے۔

صرف اپنے ملک میں اپنا اسلامی نظام قائم نہ ہو سکا۔ اسلامی نظام کو قائم نہ کرانے کے لئے لاکھوں مسلمانوں اپنے ہی لاکھوں مسلمانوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ پاکستان میں پچاس برسوں سے کوئی ہندو کسی مسلمان کو ہلاک نہیں کر رہا مسلمان ہی مسلمان کو قتل کر رہا ہے یا معاشی طور پر اسے کچل رہا ہے۔ اس کے باوجود بچپن سے اب تک نصابی کتابوں میں نظریہ پاکستان کے طور پر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ ملک اسلامی ریاست بنانے کے لئے اور نظام اسلام قائم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی مدد سے وجود میں لایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد تو مل گئی لیکن نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی نظام اسلام نافذ نہ کیا جا سکا۔

میں پوجا اور اعظم بیگ کے ساتھ سرحد پار کر کے بھارتی علاقے راجستھان میں آ گیا تھا۔ وہاں ہمارا ایک ہندو گائیڈ پدما شری تھا۔ وہ ہمیں اونٹوں پر بٹھا کر بڑی تیز رفتاری سے ایک چھوٹے سے ٹاؤن یا ایک چھوٹی سی بستی کہہ سکتے ہیں' لے جا رہا تھا۔ پدما شری نے بتایا کہ اس ٹاؤن کا نام کھڑی ہے۔ وہاں سے ہم ایک ٹیکسی میں جیسل میر رات کے نو بجے سے پہلے پہنچیں گے۔ جیسل میر' راجستھان ریلوے کا آخری اسٹیشن تھا۔ وہاں سوا نو بجے

ایک ٹرین تمام رات چلتی ہے اور صبح سات بجے جودھ پور پہنچا دیتی ہے۔
ہندو بھی اپنے ہندوستان کو اکھنڈ بھارت بنانے کے لئے وہاں کے مسلمانوں کو قتل کر رہے تھے۔ یا ہندو دھرم اختیار کرنے پر مجبور کر رہے تھے لیکن پچاس برسوں سے وہ بھی ناکام ہوتے آرہے تھے۔ جس طرح چند مسلمان اپنے ہی پاکستان کے خلاف بھارتی حکومت کے آلۂ کار تھے۔ اسی طرح پدما شری جیسے چند ہندو اپنے ہی بھارت کے خلاف ہم جیسے ضرورت مند مسلمانوں کو سرحد پار کراتے تھے اور ان کی راہنمائی کرتے ہوئے بھارت کے کسی بھی علاقے میں پہنچا دیا کرتے تھے۔"

اکیسویں صدی بتائے گی کہ بھارت کے ہندو عوام پہلے ایک دو وقت کی روٹیوں کے لئے دن رات محنت کرتے تھے۔ اپنا خون بیچ کر اپنے بچوں کی فیس دیتے اور بیوی کا علاج کراتے تھے اور پاکستان کے مسلمان اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لئے انصاف کے تقاضوں کو پکارتے تھے۔ آج بھی پکارتے پکارتے اپنی نسلوں کو کلاشنکوف کلچر دے رہے ہیں۔ تباہی پہلے سے زیادہ ہے۔ آبادی اور عیاشی صرف دونوں ملکوں کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے لئے ہے۔

ٹرین لیٹ تھی۔ ہم صبح آٹھ بجے جودھ پور پہنچے۔ اسٹیشن کے پیچھے ایک ڈھابے (ہوٹل) میں ناشتا کرتے ہوئے اعظم نے کہا۔ "یہاں قریب ہی ایک ایم جی اسپتال ہے۔ وہاں جاکر معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ہڈیوں کے امراض کا علاج کہاں ہوتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "وہ میری امی کو ہیلی کوپٹر میں جس سمت لے گیا تھا' وہاں سے پنجاب کی سرحدیں ہندوستان سے ملتی ہیں اور ہم سندھ کی ایک سرحد سے آئے ہیں۔ وہ میری امی کو دہلی یا منڈوا کی طرف لے گیا ہوگا۔"

پوجا نے کہا۔ "تم درست کہتے ہو لیکن وہ "را" والوں کا ذاتی ہیلی کوپٹر ہوگا' بھارت میں آکر دہلی کے بجائے ادھر کے کسی شہر کے اسپتال میں تمہاری امی کو لاسکتا ہے۔"

میں نے سوچا۔ "شمشیر سنگھ کالیا کے گھٹنے کی ہڈیاں جوڑنے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ اسے کسی بڑے شہر کے بڑے اسپتال میں لے جایا جائے۔ انہیں اندیشہ رہے گا کہ میں اپنی ماں کے لئے امیر حمزہ کے ساتھ وہاں پہنچ سکتا ہوں۔ چھوٹے شہروں کے چھوٹے اسپتالوں میں کالیا کے آپریشن کے انتظامات کئے جاسکتے ہیں اور کالیا کی ہڈیاں جوڑنے کے لئے امی کو وہاں رازداری سے قیدی بنا کر لایا جاسکتا ہے۔"

ہم ناشتہ کرنے کے بعد ایم جی اسپتال کے قریب پہنچے اور ایک بس اسٹینڈ کے سائے میں کھڑے ہوگئے' صرف پوجا اسپتال کے اندر گئی پھر پندرہ منٹ بعد واپس آکر بولی۔

"ہڈیوں کا کوئی معمولی مرض ہو تو اسپتال میں ہوجاتا ہے۔ کسی بڑے یا پیچیدہ آپریشن کے لیے انتظامات نہیں ہیں۔ ورنہ ہڈیوں کے امراض کے ماہرین کو بلایا جاسکتا تھا۔ ویسے اس شہر میں ہڈیوں کے دو اسپتال ہیں۔ میں نے ان کے پتے نوٹ کرلئے ہیں۔ چلو وہیں چلتے ہیں۔"

اعظم نے کہا۔ "سائیکل رکشا میں چلیں گے۔ فرمان اس شہر کو اچھی طرح دیکھتا چلے گا۔"

پوجا نے کہا۔ "اعظم تمہیں بھول سے بھی اسے فرمان نہیں کہنا چاہیے۔ یہاں اس کا نام وجے شرما ہے۔"

"سوری بے اختیار منہ سے اصل نام نکل گیا تھا۔ آئندہ محتاط رہوں گا۔ کیوں وجے شرما سائیکل رکشے میں چلیں۔"

"میں امی کے لیے پریشان ہوں۔ ہمیں جلد سے جلد ٹیکسی یا آٹو رکشے میں چلنا چاہیے۔"

پوجا نے مجھ سے کہا۔ "وجے! تم بھی غلطی کر رہے ہو۔ یہاں اپنی ماں کو امی نہ کہو۔ انہیں ماتاجی' یا ماں جی یا پھر ممی کہو۔"

میں نے کہا۔ "تھینک یو پوجا! تم ذرا ذرا سی غلطیوں کو بھی اہمیت دیتی ہو۔"

میں نے پوجا کے ساتھ یکے بعد دیگرے دونوں اسپتال کو اندر سے دیکھا۔ اس وارڈ میں بھی گئے جہاں ہڈیوں کے امراض کا علاج کرانے والے بستروں پر پڑے تھے۔ اسپیشل وارڈ میں بھی شمشیر سنگھ کالیا نظر نہیں آیا۔ وہاں ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے کا آپریشن کیا جاتا تھا۔ ایسے کسی بھی اسپتال میں کالیا کو لایا جاسکتا تھا لیکن وہ نہیں تھا۔ جبکہ اسے لندن سے بھارت پہنچا دیا گیا تھا۔

جودھ پور اور جے پور کے درمیان "را" کا وہ کیمپ تھا' جہاں را کے تربیت یافتہ ایجنٹ تین ماہ یا چھ ماہ کے لئے یہ سیکھنے آتے تھے کہ انہیں پاکستان کے کس صوبے اور کس شہر میں جاکر دہشت گردی کرنی ہے۔ تخریب کاری سے موجودہ حکومت پر کس طرح دباؤ ڈالنا ہے اور وہاں اپوزیشن سیاسی پارٹیوں کے زرخرید سیاست دانوں کے تعاون سے ملک کے امن و امان کو بد سے بدتر بناتے رہنا ہے۔

اعظم نے کہا۔ "اب ہمیں جے پور جانا ہے۔ وہاں کے اسپتالوں میں دیکھنے کے بعد ہم..........."

پوجا نے بات کاٹ کر کہا۔ "جے پور سے پہلے ایک پشکر ٹاؤن ہے۔ ہمیں وہاں جانا

چاہیے۔"

اعظم نے کہا۔ "تم جانتی ہو پشکر سے دس کلومیٹر دور "را" کا کیمپ ہے جو لوگ کسی دوسرے شہر سے یا علاقے سے آتے ہیں' وہاں کے پولیس والے ان کی سختی سے نگرانی کرتے ہیں۔ ان کے سامان کی تلاشی بھی لیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہم انہیں اپنا سامان چیک کرائیں گے ہمارے پاس کوئی غیر قانونی سامان نہیں ہے۔ یہاں کی سرکاری مہر کے ساتھ ہمارے پاس قانونی کاغذات اور شناختی کارڈز ہیں۔"

"بے شک ہیں لیکن وہاں پولیس والوں کے درمیان "را" کے جاسوس بھی ہیں۔ اگر وہ ہیرا پھیری کے ساتھ سوالات کریں گے تو جواب دینے میں تم سے کوئی غلطی ہو سکتی ہے۔ میں تو ممی کی خاطر وہاں سے "را" کے تربیتی کیمپ بھی جاؤں گا۔"

"ہم ایسے اندیشوں میں رہیں گے تو صحیح منزل تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ ہم سے غلطی کہیں بھی ہو سکتی ہے اور نہیں بھی ہو سکتی۔ پوجا اور اعظم نے مجھے چونک کر دیکھا پھر پوجا نے کہا۔ "وہاں جانا سراسر نادانی ہوگی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہاری ممی کو وہاں کے کیمپ میں پہنچایا گیا ہوگا؟"

میں نے کہا۔ "یہ ممکن تو نہیں ہے۔ "را" والے اپنے سخت سیکورٹی انتظامات سے مطمئن ہو کر یہ سوچ سکتے ہیں کہ اس کیمپ کے اندر کوئی داخل نہیں ہو سکتا بلکہ اس کیمپ کے اندر کوئی گزر نہیں سکتا۔ لہٰذا میری ممی کو وہاں قید کیا جاسکتا ہے۔ کالیا کو وہاں پہنچایا جاسکتا ہے۔ "را" کے ذرائع اتنے ہیں کہ ہڈیوں کا آپریشن کرنے کے لئے جدید مہنگے آلات اور مشینیں منگوائی جاسکتی ہیں۔"

پوجا نے کہا۔ "تمہیں اس مشن کی ابتدا میں اتنے بڑے خطرات سے دوچار نہیں ہونا چاہیے۔"

"ممی کو جہاں چھپایا جائے گا اس جگہ کو ہمارے لئے خطرناک بنا دیا جائے گا۔ تاکہ ہم ادھر کا رخ کرنے کی جرأت بھی نہ کر سکیں۔"

"میں تمہارے اس اہم نکتے کو سمجھتی ہوں' مانتی ہوں کہ دشمن ایسا کر سکتے ہیں لیکن............"

"لیکن یہ کہ تم اعظم کے ساتھ پشکر میں رہو۔ میں تنہا "را" کیمپ میں جاؤں گا۔"

اعظم نے کہا۔ "ایسی باتیں نہ کرو۔ گاڈ فادر ہاشم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم تمہیں کہیں بھی تنہا نہ جانے دیں گے؟"

"کیا قبر میں بھی تنہا نہیں جانے دو گے؟"

"قبر میں جانے سے محفوظ رکھنے کے لئے تمہیں سمجھایا جا رہا ہے۔"

"یہ بات لاہور میں کہہ دیتے تو میں اتنی دور نہ آتا۔ قبر میں جانے والا کوئی قدم نہ اٹھاتا۔ صبر کر کے بیٹھا رہتا کہ ممی خود لاہور آجائیں گی۔"

"تم طعنے دے رہے ہو۔ میں تم سے عمر میں اور تجربے میں بڑا ہوں۔"

"آپ بڑے ہیں اور میں بچہ نہیں ہوں۔ آپ مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہیں تو جواب دیں۔ "را" والے آپ کی ماں کو لے جاتے تو وہ اپنی قید میں رکھتے یا انہیں عام اسپتال میں کالیا کا علاج کرانے لے جاتے؟"

اعظم نے میرا گریبان پکڑ کر کہا۔ "خبردار! میری ماں کا نام نہ لینا۔ میری ماں مجرموں کی سرپرستی نہیں کرتی تھی۔"

پوجا نے کہا۔ "اعظم! یہ کیا حماقت ہے' وجے کا گریبان چھوڑو۔"

میں نے گریبان پکڑنے والے ہاتھ کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی۔ تب اسے پتا چلا کہ میری گرفت کتنی مضبوط ہے۔ اس نے اپنی کلائی چھڑانے کے لیے اپنے دوسرے ہاتھ کی قوت آزمائی۔ پورا زور لگانے لگا۔ پوجا نے کہا۔ "پلیز اعظم! یہ کیا کر رہے ہو گریبان چھوڑ دو۔"

"پہلے اسے کہو' میری کلائی چھوڑ دے۔"

"پہلے تم نے میرا گریبان پکڑا ہے۔ پہلے تم چھوڑو اور میری ماں کو غلط سمجھنے کی معافی مانگو۔ وہ مجرموں کی سرپرستی نہیں' ان کا علاج کرتی ہیں۔"

پوجا نے کہا۔ "اعظم یہ درست ہے' تم نے وجے کی ماں کو غلط الزام دیا ہے اور پہلے گریبان پکڑا تھا۔ اسے سوری کہہ کر گریبان چھوڑ دو۔"

اعظم کو ایسا لگ رہا تھا جیسے کلائی آہنی شکنجے میں آگئی ہے۔ وہ چھڑا نہیں سکے گا۔ اس نے گریبان چھوڑ کر کہا۔ "کلائی چھوڑ دو۔"

"میری ممی کے لئے جو کہا تھا' اس کی معافی مانگو۔"

اعظم نے تکلیف سے جھنجلا کر میری ٹھوڑی پر ایک گھونسا مارا پھر خود ہی تکلیف سے کراہنے لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے فولاد کے کسی حصے پر گھونسا مارا ہو۔ وہ گریبان چھوڑ کر بولا۔ "چھوڑو میرا ہاتھ۔"

"حکم نہ دو۔ پہلے میری ماں سے معافی مانگو۔ ممی نہیں سن رہی ہیں مگر یہ بیٹا سن کر معاف کر دے گا۔"

پوجا نے کہا۔ "وجے! کلائی چھوڑ دو۔ یہ تم سے بڑے ہیں۔"

"اور میری ممی ان سے بڑی ہیں۔"

"میں معافی مانگتا ہوں۔ وہ معزز لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے کبھی مجرموں کی سرپرستی نہیں کی ہے۔"

میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی۔ کلائی کی ہڈی جیسے چیخ گئی تھی اور گھونسا مارنے والے ہاتھ کی انگلیاں بری طرح دکھ رہی تھیں۔ وہ تکلیف سے دہرا ہوکر دونوں ہاتھوں کو آہستہ آہستہ جھٹک رہا تھا اور دھیمی آواز میں کراہ رہا تھا۔

پوجا نے میرے شانے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تم صرف ماں کی بات پر بھڑک گئے تھے۔ ورنہ تم میں بڑی قوتِ برداشت ہے۔ اس نے تمہیں گھونسا مارا لیکن تم نے جوابی حملہ نہیں کیا۔"

"میں اکثر جوابی حملے نہیں کرتا۔ میرا جسم خود ہی جوابی حملہ بن جاتا ہے۔ تم اعظم سے پوچھو۔ کیا مجھے دوسرا گھونسا مارنا چاہتا ہے؟"

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "لعنت ہے تم پر۔ تم گوشت پوست کے انسان ہو یا فولادی روبوٹ؟"

میں مسکرانے لگا۔ پوجا نے کہا۔ "تعجب ہے، تم مار کھا کر مسکرا رہے ہو اور یہ تمہیں مار کر ہائے ہائے کر رہا ہے۔"

میں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا کر اعظم سے کہا۔ "آپس میں نرمی گرمی ہوتی رہتی ہے۔ آؤ ہاتھ ملاؤ۔"

"اس بار ہاتھ ملایا تو ہاتھ تمہارے پاس رہ جائے گا۔ مجھے تو معاف کرو۔"

پوجا ہنسنے لگی۔ میں نے اعظم کو گلے لگالیا۔ جب گلے سے لگایا تو سارے گلے شکوے جاتے رہے۔ ہم صدر مارکیٹ میں تھے۔ وہاں سری مشری لال کا ایک ہوٹل ہے، جہاں کی بالائی بھری کھمنیا لسی بہت مشہور ہے۔ ہم نے لسی پی۔ واقعی بیحد لذیذ تھی۔ میں نے لسی پیتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں "را" کے کیمپ میں جانا ممکن نہیں ہوگا لیکن مجھے صرف معلوم ہوجائے کہ میری ممی کو وہاں چھپایا گیا ہے تو میں ناممکن کو ممکن بنا دوں گا۔"

اعظم نے کہا۔ "میں یہ مان چکا ہوں کہ تم جسمانی طور پر فولاد ہو لیکن "را" والوں سے نمٹنے کے لئے جسمانی قوت سے زیادہ ذہانت ضروری ہے۔ سیاسی جنگ میں ڈپلومیسی اور حکمتِ عملی لازمی ہوتی ہے۔"

"میں نہیں جانتا کہ کس قدر ذہین ہوں لیکن حمزہ صاحب اور راجہ نواز سے جو کچھ

سیکھا ہے، وہ تمام حربے آزماتا رہوں گا تو میرے تجربات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ یہ بتاؤ کہ پشکر ٹاؤن سے "را" کیمپ کتنی دور ہے۔"

پوجا نے کہا۔ "پشکر میں ایک وسیع و عریض حصے میں جھیل ہے۔ ہندو روایت کے مطابق خلا کی بلندی سے برہما کے ہاتھ سے ایک بڑا سا کنول کا پھول زمین پر گر پڑا تھا تو وہاں کنول کے لئے پانی ابھر کر دور تک جھیل کی صورت میں پھیل گیا تھا۔ ہندو یاتری یہاں عقیدت مندی سے آتے ہیں اور جھیل کے اشنان گھاٹ میں نہاتے ہیں۔"

اعظم نے کہا۔ "تم اسے ہندو دھرم کی باتیں بتا رہی ہو کہ بھگوان برہما کے ہاتھوں.......... کنول گرا اور پشکر میں ایک بہت بڑی جھیل بن گئی اور وہ ہندوؤں کے لئے یاترا کی جگہ بن گئی ہے۔"

وہ بولی۔ "یہاں اسے وجے شرما بن کر رہنا ہے۔ اس کے لیے ہندو دھرم سے تعلق رکھنے والی باتیں بتانا ضروری ہے۔ بہرحال جھیل کے شمالی کنارے پہاڑیوں کا سلسلہ ہے۔ اسے ناگ پہاڑ کہتے ہیں۔ اسی پہاڑ کے دامن میں "را" کا ٹریننگ کیمپ ہے۔ اس کیمپ کی ایک وسیع و عریض چار دیواری ہے۔ اس کے باہر آس پاس سے گزرنے والوں کو روکا ٹوکا نہیں جاتا کیونکہ جھیل کے کنارے اور ناگ پہاڑ کے دامن میں اچھی خاصی آبادی ہے۔ ناگ کی پوجا کرنے والوں کا ایک ناگ مندر بھی ہے۔"

اعظم نے کہا۔ "وہاں اجنبی لوگوں پر شبہ نہیں کیا جاتا ہے کیونکہ سینکڑوں یاتری بھارت کے مختلف علاقوں سے آتے جاتے رہتے ہیں۔ صرف اس چار دیواری کے اندر ٹریننگ حاصل کرنے والے "را" کے کارندے جاسکتے ہیں۔ وہاں بڑے سائن بورڈ پر ہیلتھ اینڈ باڈی بلڈنگ سینٹر لکھا ہوا ہے۔ اس لئے وہاں کے لوگ بھی اسے "را" کا ٹریننگ سینٹر نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کی معلومات کے مطابق آل انڈیا باڈی بلڈنگ کے مقابلے میں حصہ لینے والے پہلے دہلی سے ٹریننگ کے سلسلے میں اجازت نامہ لے کر آتے ہیں پھر یہاں پشکر کے ٹریننگ سینٹر میں انہیں داخلہ ملتا ہے۔"

پوجا نے کہا۔ "ہم اچھے موقع پر کل وہاں پہنچیں گے۔ کل سے دس دنوں تک.......... مویشیوں کا میلہ لگتا ہے۔ اتنا بڑا میلہ لگتا ہے کہ پچاس ہزار سے زیادہ اونٹ اور دوسرے جانور فروخت کے لئے لائے جاتے ہیں پھر طرح طرح کے کھیل تماشے ہوتے ہیں۔ صحرائی عورتیں رنگ برنگے ملبوسات، سات رنگی چوڑیوں اور کئی قسم کے زیورات پہنے راجستھانی کلچر، رقص اور گیت پیش کرتی ہیں۔"

"ہماری یہاں سے روانگی کب ہوگی؟"

"مویشی میلے کے باعث ہر ایک گھنٹے کے بعد بسیں یہاں سے پشکر جاتی ہیں۔ ہم بس اسٹینڈ چلتے ہیں وہاں جو آرام دہ بس ملے گی' اس میں چلیں گے۔ آدھی رات سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔"

اگرچہ پوجا اور اعظم دونوں میرے گائیڈ تھے لیکن اعظم کم بولتا تھا۔ پوجا زیادہ بولتی تھی۔ مجھ سے زیادہ قریب رہ کر چلتی پھرتی' اٹھتی تھی۔ ایسا وہ شاید مجھ سے متاثر ہو کر کرتی ہوگی۔ یا اپنا فرض سمجھ کر مجھے زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کے لئے مجھ سے زیادہ بولتی ہوگی۔ ایسے وقت اس کے کسی جذبے کی طرف میرا دھیان نہیں تھا' میں صرف امی کے لئے پریشان اور بے چین تھا۔ جلد سے جلد ان کے پاس پہنچنا چاہتا تھا اور بڑے صبر و ضبط سے یہ سمجھتا رہتا تھا کہ بے چینی اور جلد بازی نقصان پہنچا سکتی ہے۔

بس اسٹینڈ پر وہ تھوڑی دیر کے لئے ٹیلی فون بوتھ میں گئی۔ دہلی میں اس کی ایک بچپن کی سہیلی رہتی تھی۔ وہ اسے شادی کی مبارک باد دینے گئی تھی۔ اعظم نے میرے قریب دھیمی آواز میں کہا۔ "فون پر مبارک باد دینا اتنا ضروری تو نہیں ہوتا۔ کبھی سہیلی سے سامنا ہوتا تو مبارک باد بھی دی جاسکتی ہے اور معذرت کی جاسکتی ہے کہ بیرون ملک جانے کے باعث وہ شادی اٹینڈ نہیں کرپائی تھی۔"

میں نے کن انکھیوں سے اعظم کو دیکھا۔ میرے اندر شبہ پیدا ہو رہا تھا۔ "تم مجھ سے زیادہ پوجا کو جانتے ہو۔ اس کے ساتھ انکل ہاشم کے ماتحت رہ کر کام کرتے رہے ہو۔"

اعظم نے کہا۔ "ہم مختلف حالات میں مختلف مقامات پر کام کرتے رہے ہیں پہلی بار تمہارے ساتھ یہاں آنے کے لئے گاڈ فادر نے پوجا کو ہمارے ساتھ بھیجا ہے۔ میں اس کے بارے میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ ہمارے گاڈ فادر کے لئے کام کرتی رہی ہے۔ تمہارے انکل گاڈ فادر اس پر بھروسا کرتے ہیں.......... اس لئے ہم بھی اعتماد کے ساتھ اس کی ساتھی بنے ہوئے ہیں۔"

"جب میرے انکل اس پر بھروسا کرتے ہیں تو ہم ایک حد تک بھروسا کریں گے۔ میرے استاد مراد چنگیزی کہتے تھے' کبھی اپنے سائے پر بھی اعتماد نہ کرو اور حمزہ صاحب کہتے رہتے ہیں کہ اپنی سانسوں پر بھی بھروسا نہ کرو۔ یہ دم دینے والی اگلے پل نہیں آئے گی۔ لہٰذا یاد رکھو' زندگی ہماری توقع سے زیادہ مختصر ہے۔ اس مختصر سی زندگی میں کوئی نمایاں کام کر جاؤ۔"

وہ فون بوتھ سے جلدی واپس آگئی۔ اعظم نے کہا۔ "وہ تمہارے بچپن کی سہیلی ہے اور تم نے اسے صرف مبارک باد کہہ کر فون رکھ دیا؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "کیا تم اتنی دور سے مجھ پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔"

"یہی سمجھو۔ تم نے دو چار فقرے کہے ہوں گے پھر ریسیور کو رکھ دیا۔"

"ہاں۔ میں نے سہیلی کو فون کیا تھا لیکن اس کی ماں سے بات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے پتی کے ساتھ ہنی مون منانے کے لئے گئی ہے۔ میں نے اس کی ماں کو بدھائی دے کر ریسیور رکھ دیا۔ بائی دا وے تم اعتراض کیوں کر رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "اعتراض صرف یہ ہے کہ یہاں اپنے رشتے داروں کو بھی ہماری موجودگی کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔ یہاں کی پولیس' انٹیلیجنس یا "را" والے ان سے ہمارے بارے میں بہت کچھ اگلوا لیں گے۔"

"میرے فون کرنے سے پہلے تم یہ بات کہتے تو بہتر ہوتا۔ تم منع کرتے میں مان جاتی۔ میں نہیں چاہتی کہ ہم تینوں کا اعتماد ایک دوسرے پر کمزور ہو۔ بہرحال میں آئندہ کسی کو فون نہیں کروں گی۔"

میں نے دونوں کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "جو ہوا' سو ہوا۔ اسے بھول جاؤ اور مسکراؤ۔ آؤ بس چلنے والی ہے۔"

ہم بس میں سوار ہو کر اپنی ریزرو کی ہوئی سیٹوں پر آگئے۔ میری اور پوجا کی سیٹیں ساتھ تھیں۔ اعظم کو بس کی دوسری کھڑکی کی طرف سیٹ ملی تھی۔ وہ ہم سے دور تھا۔ سفر کے دوران میں پوجا نے کہا۔ "میں اب تک اعظم کو سمجھ نہیں پائی ہوں۔ یہ خواہ مخواہ الجھ پڑتا ہے۔ جودھ پور میں تم سے بھی ہاتھا پائی ہوئی تھی۔ اس نے تمہارا گریبان.......... پکڑ لیا تھا۔"

"جانے دو۔ گزری ہوئی باتوں کو دہرانے سے دل صاف نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس بے اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔"

"ہاں مگر مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے فون نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"بھول جاؤ۔ تمہارے فون کرنے سے قیامت نہیں آگئی ہے۔"

"میری بات کو سمجھو۔ تم اور اعظم مسلمان ہو۔ میں ہندو ہوں۔ اپنے بھارت دیس میں ہوں۔ تم دونوں کا اعتماد حاصل کئے بغیر کوئی بھی قدم اٹھاؤں گی تو مجھ پر شبہ کیا جائے گا۔"

"ایسا تم سوچ رہی ہو۔ میرا دل تمہاری طرف سے صاف ہے۔"

"تھینک یو دجے! میرا دل بھی کہتا ہے کہ تم مجھ پر کبھی شبہ نہیں کرو گے۔ مجھے اپنوں کی طرح سمجھتے رہو گے۔"

رات کے دس بجے ہم پشکر پہنچ گئے۔ ایک وسیع و عریض میدان میں میلہ لگا ہوا تھا۔ میلہ کل سے شروع ہونے والا تھا لیکن لوگوں نے کئی دن پہلے سے اپنے کاروبار کے لئے اور خیموں میں رہائش کے لئے کرائے پر جگہ حاصل کرلی تھی۔ پشکر ٹاؤن کے چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں ایک بھی کمرا خالی نہیں تھا۔ ہم نے میلے کی انتظامیہ کو کچھ زیادہ رقم دے کر ایک خیمہ اور تین چارپائیاں حاصل کیں۔ یہ ہمارے لیے بہتر تھا۔ لاکھوں افراد کی بھیڑ میں کوئی ہم پر شبہ نہیں کر سکتا تھا۔

ایک خیمے میں دو چارپائیاں بچھائی جاسکتی تھیں مگر ہم تین تھے۔

اعظم نے کہا۔ ”ہم دو مرد ہیں۔ خیمے کے باہر سو جائیں گے۔ پوجا خیمے کے اندر رات گزارے گی۔“

یہی مناسب تھا۔ پوجا خیمے کے اندر چلی گئی۔ آدھی رات ہونے کو تھی۔ اس کے باوجود بڑی چہل پہل تھی۔ اعظم نے کہا۔ ”تم آرام کرو۔ مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔ میں ذرا گھوم کر آتا ہوں۔ جھیل کنارے کوئی دوسرا خیمہ مل جائے گا تو اچھا رہے گا۔ میں انتظامیہ والوں سے بات کروں گا۔“

وہ چلا گیا۔ میں نے اس سے یہ نہیں کہا مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔ بھلا نیند کیسے آسکتی تھی؟ میں ایسی جگہ پہنچا ہوا تھا۔ جہاں ”را“ کا ٹریننگ کیمپ تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہاں امی کو راز داری سے لاکر کالیا کا آپریشن کرایا جاسکتا ہے۔ مجھے ادھر جانا چاہیے۔ وہ جگہ انجانی تھی لیکن یہ معلوم تھا کہ ناگ پہاڑ کے دامن میں وہ کیمپ ہے اور وہاں سائن بورڈ پر ہیلتھ اینڈ باڈی بلڈنگ سینٹر لکھا ہوا ہے۔ میں کسی ٹانگے پر بیٹھ کر جاسکتا ہوں۔ پہلے باہر چاروں طرف سے اس جگہ کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں اور شاید مجھے اندر جانے کا بھی موقع مل جائے۔

میں چارپائی پر بیٹھ کر سوچتا رہا۔ اعظم کو گئے ہوئے آدھا گھنٹا گزر گیا تھا۔ میں نے اٹھ کر خیمے کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ پوجا تھکی ہوئی تھی۔ گہری نیند سوگئی تھی۔ میں نے وہاں کے کلچر کے مطابق دھوتی اور کرتہ پہنا تھا۔ جیب میں کافی رقم تھی اور لباس کے اندر ایک بھرا ہوا ریوالور تھا۔ میں خیمے کے پردے کو گرا کر وہاں سے جانے لگا۔

کچھ دور جانے کے بعد ہمارا خیمہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ وہاں کئی جگہ پولیس والے تھے۔ وہ مسلح نہیں تھے لیکن ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے۔ وہ میلے کے انتظامات کو درست رکھنے کے لئے ڈیوٹی پر کہیں کہیں نظر آرہے تھے۔ ایک جگہ ایک سپاہی نے مجھے آواز دی۔ ”اے! ادھر آؤ۔“

میں نے پلٹ کر اسے دیکھا پھر اس کے قریب جاکر پوچھا۔ ”جی حوالدار صاحب! حکم؟“

میں نے حوالدار کہا تو سپاہی خوش ہوگیا۔ ذرا مسکرایا پھر ایک افسر کی طرح ڈانٹ کر پوچھا۔ ”کون ہے رے تُو؟“

”ایک یاتری ہوں۔ کل پوتر ”مقدس“ اشنان گھاٹ میں اشنان............ کروں گا۔ میلہ بھی دیکھوں گا۔“

”کل کی بات نہ کر۔ ابھی بول اتنی رات کو کہاں ارہا ہے؟“

”اپنے تنبو ”خیمہ“ میں۔“

”کہاں ہے تنبو؟ تنبو کا نمبر کیا ہے؟“

”ایک سو ستائیس نمبر ہے۔“

”تنبو کی رسید دکھا۔“

”وہ تو تنبو میں گھر والی کے پاس ہے۔“

”اس میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ ہے؟“

”میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔“

”چل۔ ابھی مجھے تنبو اور رسید دکھا۔“

میں بحث کرتا تو اور پولیس والے آجاتے اس لئے اس کے ساتھ اپنے خیمے کی طرف جانے لگا۔ چلتے چلتے بہت دور سے اپنا خیمہ نظر آیا تو میں ایک دم ٹھٹک گیا۔ اعظم چھ فوجی جوانوں کے ساتھ نظر آیا۔ ان میں سے دو جوان دوڑتے ہوئے خیمے کے پیچھے گئے......... اور دو جوان اعظم کے ساتھ خیمے کے اندر گئے۔ باقی دو باہر کھڑے رہے۔ سپاہی نے مجھ سے پوچھا۔ ”ابے کیوں کھڑا ہوگیا؟ آگے چل۔“

میں نے پاس والے چائے کے ہوٹل کی طرف اشارہ کیا۔ ”حوالدار صاحب! میرا تنبو کہیں بھاگا نہیں جارہا ہے۔ آؤ ایک ایک کپ چائے پی لیں۔ آپ کچھ کھانا بھی چاہیں گے تو پیٹ بھر کر کھائیں۔ میری جیب میں بہت مال ہے۔“

وہ راضی ہوگیا۔ ہم ہوٹل کے باہر بینچ پر بیٹھ گئے۔ حوالدار کھانے کا آرڈر دینے لگا۔ میری نظریں دور اپنے خیمے کی طرف تھیں۔ مجھے پوجا نظر آئی۔ اسے دو فوجی جوان پکڑ کر خیمے سے باہر لائے تھے۔ ان کے پیچھے اعظم ان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ دونوں پوجا کو......... پکڑ کر لے جانے لگے۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے غصے سے کچھ کہہ رہی تھی پھر اعظم کی طرف تھوک کر دو جوانوں کی حراست میں جانے لگی' باقی چار

جوان خیمے کے اندر گئے اور اعظم خیمے کے باہر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں ابھی آؤں گا۔ اسے تنہا ایک چارپائی پر دیکھوں گا اور سمجھوں گا کہ پوجا اندر سو رہی ہے۔

صاف سمجھ میں آ رہا تھا کہ اعظم کا تعلق "را" سے ہے۔ اس نے اب تک پوجا کو میری نظروں میں مشکوک بنانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی کمینگی کے بارے میں سوچنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اب میں تھوڑی دیر میں وہاں نہ جاتا تو وہ سب میری تلاش میں نکل پڑتے۔

وہ ایسا وقت تھا کہ کچھ سوچنے کا نہیں' کچھ کر گزرنے کا موقع تھا۔ میں نے سپاہی کے قریب ہو کر اپنے لباس سے ریوالور نکال کر اس کی کمر سے لگاتے ہوئے کہا۔ "اسے دیکھو' یہ کیا ہے۔ تم ذرا سی بھی آواز نکالو گے تو یہ دھماکہ کرے گا۔"

اس نے سہم کر ریوالور کو دیکھا۔ میں نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ "میری بات مانتے رہو گے تو یہ پانچ ہزار روپے دوں گا۔ ورنہ گولی چلا دوں گا۔"

وہ خوفزدہ تھا' ہکلا کر بولا۔ گگ......... گولی نہ چلانا۔ مم......... میں تمہاری بات مانتا رہوں گا۔"

"ہوٹل کے چھوکرے کو کھانا لانے سے منع کرو۔ ریوالور میری جیب میں رہے گا اور تم میرے ساتھ دوستانہ انداز میں یہاں سے چلو گے۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ ہم وہاں سے اٹھ کر میلہ میدان سے باہر جھیل کی طرف جانے لگے۔ جھیل وہاں سے کافی فاصلے پر تھی۔ راستے میں دو چار سپاہی ملتے رہے۔ وہ میرے نشانے پر رہنے والے سے رام رام کہتے ہوئے دو چار باتیں کرنے کے بعد چلے گئے۔ اس طرح ہم بہت دور جھیل کے ایک ویران کنارے پر پہنچ گئے۔ میں نے اپنا لباس اتارتے ہوئے اس سے کہا۔ "اپنی وردی اتارو۔ جلدی کرو' سوال نہ کرنا۔"

میرے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ دور سے آنے والی روشنی کے باعث وہاں نیم تاریکی تھی۔ اس نے جان جانے کے خوف سے فوراً ہی وردی اتار دی پھر میری اتاری ہوئی دھوتی کو اٹھانے کے لئے جھکا تو میں نے ریوالور پھینک کر دونوں ہاتھوں سے گردن دبوچ لی۔ میرا دبوچنا ایسا تھا کہ منہ سے آواز کیا نکلتی' وہ سانس بھی نہیں لے پا رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں جھٹک رہا تھا۔ پورے جسم کا زور لگا رہا تھا لیکن سانس آتی جاتی رہتی تو زور لگانے کا سلسلہ جاری رہتا۔ وہ دو منٹ تک پوری قوت سے پھڑپھڑاتا رہا پھر ڈھیلا پڑتا چلا گیا۔ میں نے پانچ منٹ پھر دس منٹ تک اسے اسی طرح دبوچے رکھا۔ وہ بے جان ہو چکا تھا۔

میں نے دو بہت ہی بھاری پتھر اٹھائے۔ ان پتھروں کو اس کی لاش کے ساتھ دھوتی اور کرتے سے باندھا پھر اسے لڑھکا کر جھیل کے گہرے پانی میں ڈال دیا۔ یوں اس کی لاش پانی کی سطح پر آ کر کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے اس کی وردی پہن لی۔ اپنی چیزیں جیبوں میں رکھ لیں۔ ریوالور کو لباس میں چھپایا پھر سپاہی کا ڈنڈا لے کر تیزی سے ادھر جانے لگا جہاں میلے کی انتظامیہ کا دفتر تھا۔ وہاں میں نے اعظم اور پوجا کے ساتھ جا کر ایک سو ستائیس نمبر کا خیمہ کرائے پر لیا تھا اور وہیں ان فوجی جوانوں کو دیکھا تھا اور یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ جوان ابھی پوجا کو اسی طرف لے گئے ہوں گے۔

انتظامیہ کا دفتر ایک مکان میں تھا۔ اس کے دو کمرے آگے اور دو پیچھے تھے۔ میں نے پیچھے جا کر ایک کمرے کی کھڑکی سے دیکھا۔ پوجا ایک دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک فوجی افسر ایک کرسی پر بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا۔ "تم سمجھتی ہو خاموش رہو گی تو ہم تمہیں گونگی سمجھ لیں گے؟"

وہ بولی۔ "اعظم جیسا کمینہ سب کچھ بتا چکا ہو گا۔ مجھے گونگی ہی رہنے دو۔"

افسر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ابھی تمہارے گورے بدن سے ایک ایک کپڑا اتارا جائے گا تب بھی گونگی رہو گی؟"

"مرد کی سمجھ میں اتنی سی بات نہیں آتی کہ وہ پرائی عورت کے کپڑے اتارتا ہے تو عورت چیختی ہے اور ماں بہن کے کپڑے اتارے جائیں تو مرد چیختا ہے۔"

"یوشٹ اپ کتے کی بچی!"

اس نے اٹھ کر پوجا کو ایک طمانچہ مارا پھر اس کی زلفوں کو مٹھی میں جکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔ "زندہ رہنا چاہتی ہے تو بتا دے' فرمان کے ساتھ کیا پلاننگ ہوئی تھی۔ اگر نہیں ہوئی تھی تو وہ ہمارے آنے سے پہلے کہاں بھاگ گیا ہے؟"

"کوئی پلاننگ نہیں ہوئی تھی۔ جس کے پاس ذہانت ہوتی ہے وہ برے حالات کو بھانپتے ہی راستہ بدل لیتا ہے۔"

"اور تیری جیسی سندر چھوکری کو چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔"

"میں اس کی نہ رشتے دار ہوں' نہ محبوبہ ہوں۔ بس ایک ہم سفر تھی اور ہم سفر تو کسی بھی موڑ پر ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔"

ایک فوجی جوان ایک ٹرے میں دارو کی بوتل ایک گلاس اور کھانے کی کچھ چیزیں کمرے میں لاتے ہوئے بولا۔ "سر! وہ کہیں بھاگ گیا ہے۔ ہمارے پھوجی آجم صاحب کے

ساتھ اسے تلاش کرنے ہمارے سینٹر کی طرف بھاگ گئے ہیں پربھاکر صاحب نے ہیڈ کوارٹر کو فون کیا ہے کہ لیڈی سرجن آمنہ کو ادھر نہ بھیجیں۔ ادھر خطرہ ہے۔ کالیا صاحب کو بھی یہاں سینٹر سے لے جائیں۔"

افسر نے دارو کی بوتل کھول کر گلاس میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "کالیا صاحب کے لئے خطرہ نہیں ہے۔ لیڈی سرجن کے بیٹے کو اتنی عقل تو ہوگی کہ وہ کالیا کو مارے گا تو اس کی ماں کو بھی زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ جا ایک گلاس پانی لے آ۔"

میں اس وقت تک دروازے کی طرف آگیا تھا۔ جیسے ہی وہ فوجی جوان ایک گلاس پانی لینے کے لئے باہر آیا' میں نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچی اور دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر سختی سے جمادیا۔ ایک ذرا سی آواز نکالنے کا موقع نہیں دیا۔ ایسے موقع پر میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے جسمانی طور پر فولاد بنایا ہے۔ اپنے دادا جان اور امی کو ایک وسیلہ سمجھتا ہوں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق مجھے فولاد بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

وہ فوجی جوان میری گرفت میں ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں لباس کے اندر سے ریوالور نکال کر تیزی سے چلتا ہوا کمرے کے اندر آیا۔ پوجا نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ آواز سن کر افسر نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ میں نے ریوالور کی نال اس کی پیشانی سے لگا کر کہا۔ "ہلوگے تو مروگے۔ پوجا اس کے ہتھیار لے لو۔"

پوجا نے آگے بڑھ کر اس کے ریوالور اور ایک لانگ شاٹ گن کو اٹھالیا۔ افسر نے کہا۔ "تم غلطی کر رہے ہو۔ یہاں سے زندہ نہیں جاسکوگے۔"

"میری زندگی کی فکر نہ کرو۔ پوجا کو دیکھو۔"

اس نے سر گھما کر پوجا کو دیکھا۔ میں نے اسی لمحے.......... ریوالور کے دستے سے ایسی زوردار ضرب لگائی کہ وہ بیٹھے ہی بیٹھے چکرا کر فرش پر گر پڑا۔ ایک ہی ضرب کافی تھی لیکن پوجا شاٹ گن کے دستے سے اس کے سر پر ضربیں لگانے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "بس کرو۔ ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا ہے۔"

میں اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر آیا۔ مکان کے احاطے کے باہر ایک چھوٹا فوجی ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ اسے ڈرائیور کرنے والا فوجی منہ پر کیپ رکھے خراٹے لے رہا تھا۔ سونے والے کو ہمیشہ کے لئے سلا دینا آسان ہوتا ہے۔ میں نے اسٹیئرنگ والے دروازے کے پائیدان پر چڑھتے ہی ریوالور کے دستے سے ایسی ضربیں لگائی کہ اسے زندگی کے جانے کی آہٹ بھی نہ ملی۔ میں یہی کوشش کرتا آرہا تھا کہ کہیں گولی نہ چلانی پڑے۔ دشمنوں کو

چونکا کئے بغیر خاموشی سے نکلا جائے۔ میں نے دروازہ کھول کر ڈرائیور کی لاش کھینچ کر باہر پھینکی اور اسٹیئرنگ سیٹ پر آگیا۔ پوجا دوسری طرف کا دروازہ کھول کر میرے پاس آگئی۔ میں نے ٹرک کو اسٹارٹ کیا پھر تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا پوجا سے کہا۔ "یہ جگہ انجانی ہے۔ سوچ رہا ہوں کدھر جاؤں؟"

وہ بولی۔ "یہ پشکر ٹاؤن کے باہر والی سڑک پر سیدھے ڈرائیو کرتے چلو۔ دوسرے فوجیوں کو جب تک ہمارے فرار ہونے کی خبر ملے گی تب تک ہم پندرہ بیس کلومیٹر دور نکل جائیں گے۔"

"اگر ہم اتنی دور نکل جائیں گے تو سمجھو' پھر ان کے ہاتھ نہیں آئیں گے۔ میں دوسری تدبیر آزماؤں گا۔"

وہ مجھے دیکھ کر خوش ہو کر بولی۔ "فرمان! تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ مجھے اعظم پر ایک آدھ بار شبہ ہوا تھا لیکن پھر سوچا ہمارے گاڈ فادر نے اسے اچھی طرح آزما کر بھروسا کیا ہے۔ ہمیں بھی بھروسا کرنا چاہیے۔"

"میرے انکل گاڈ فادر بھی ایک انسان ہیں۔ پہچاننے میں ان سے غلطی ہوگئی۔ اصل بات یہ ہے کہ دنیا میں ہزاروں قسم کے سانپ ہیں۔ سپیرے ہزاروں سانپوں کو پہچان سکتے ہیں لیکن آستین کے سانپ کو پہچاننا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

اس نے کہا۔ "کبھی نہ کبھی اعظم سے سامنا ہوگا۔ میں اس سانپ کا سر ضرور کچل کر رہوں گی۔"

میں نے قدرے مطمئن ہو کر کہا۔ "یہ سن کر میرے دل کو اطمینان سا ہوا ہے کہ امی کو ہیڈ کوارٹر میں چھپا کر رکھا گیا ہے اور "را" کا ہیڈ کوارٹر دہلی میں ہے۔ اب ہم دہلی جائیں گے۔"

یہ ایک کہاوت ہے کہ ابھی تو دلی دور ہے۔ میرے لئے حقیقتاً دہلی بہت دور تھی۔ پتا نہیں ابھی کتنی آزمائشوں اور کتنی رکاوٹوں سے گزرنا تھا۔

منزل کا پتا ہوتا ہے۔ منزل کے راستوں کا بھی علم ہوتا ہے لیکن ان راستوں پر چلنے کے دوران میں پتا چلتا ہے کہ کہاں ہمارے لئے قبر کھودی گئی ہے۔

☆======☆======

راجہ نواز رائے ونڈ پہنچ گیا تھا۔ صبح نماز کے بعد اسو دیکھ رہا تھا اور حمزہ کو پہچاننے کی خرید کر بیٹھ گیا۔ حمزہ نے کہا تھا کہ وہیں ملاقات ہوگی اگرکے چبوترے پر بیٹھے ہوئے افراد کو ہوں گے لیکن وہ کوڈورڈز کے ذریعے ایک دوسرے کو ؟ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے

وہاں صاف ستھرے لباس پہنے ہوئے نورانی چہروں والے مسلمان ہر سُو نظر آرہے تھے۔ تبلیغی اجتماع میں شامل ہونے والے بزرگ بھی تھے اور جوان بھی۔ وہاں جس طرح ایمان افروز اجتماع ہوا کرتا ہے اگر یہ سلسلہ مزید ٹھوس منصوبوں کے ساتھ جاری رہے گا تو ساری دنیا میں پاکستان کے اس چھوٹے سے شہر رائے ونڈ کو تبلیغ دینِ اسلام کا سب سے بڑا مرکز تسلیم کرلیا جائے گا۔

راجہ نے حمزہ کا انتظار کرنے اور وقت گزارنے کے لئے اخبار کو کھولا تو پہلے صفحے پر اپنی اور ٹینا کی تصویر دیکھ کر چونک گیا۔ ان تصاویر کے ساتھ یہ خبر شائع کی گئی تھی کہ کراچی میں کھوکھراپار کے ایک مکان کو بم کے دھماکے سے تباہ کردیا گیا ہے۔ تباہ ہونے والے مکان کی تصاویر بھی شائع کی گئی تھیں۔ خبر میں کہا گیا تھا کہ راجہ نواز ایک مفرور ملزم تھا۔ پہلے اس نے ایک ایم این اے کی بیٹی نازاں کو اغوا کیا پھر اسپتال میں اسے گولی مار کر ہلاک کردیا۔ پولیس نے بڑے زبردست مقابلے کے بعد اسے گرفتار کیا تھا لیکن اس کا ایک ساتھی دہشت گرد امیر حمزہ تھانے پر منظم حملہ کرکے اسے چھڑالے گیا تھا۔

راجہ اور حمزہ کے خلاف بڑی مہارت سے کہانیاں بنائی گئی تھیں۔ لکھا گیا تھا کہ راجہ نے نازاں کو اور حمزہ نے انیلا بانو کو اغوا کیا تھا اور ملک کے معزز سیاست داں نیک بخت سے انیلا کا اسکینڈل بنایا تھا نیک بخت کو بدنام کرنے کی حتی الامکان کوششیں کی تھیں لیکن ایسے ٹھوس ثبوت اور گواہ مل گئے جن سے یہ ثابت ہوگیا کہ حمزہ، انیلا کو لندن لے گیا تھا۔ وہاں کچھ روز عیش کرنے کے بعد اسے ہلاک کرکے پاکستان واپس آگیا۔

وہ دونوں یعنی راجہ اور حمزہ کسی خفیہ ایجنسی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے سیاست دانوں پر کیچڑ بھی اچھالتے ہیں اور وہ دونوں جنسی جنونی بھی ہیں۔ انہوں نے نازاں اور انیلا کو ٹھکانے لگانے کے بعد تین دن پہلے ایک قونصل خانے کی لیڈی سیکرٹری ٹینا کو اغوا کیا تھا اور اسے کھوکھراپار کے ایک مکان میں لے گئے تھے لیکن ان دونوں میں اس بات پر جھگڑا ہونے لگا کہ پہلے کون ٹینا کے ساتھ وقت گزارے گا۔ وہ دونوں نشے میں تھے۔ اس جھگڑے نے رفتہ رفتہ خون خرابے کی صورت اختیار کرلی۔ ایسے وقت حمزہ نے چالاکی دکھائی کے دوران میں ایک کمرے میں گیا تو اس نے دروازے کو ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ اسے ڈرائیور والے کمرے میں ایک زبردست قوت کا ٹائم بم لگایا اور سونے والے کو ہمیشہ کے لئے سلا دیہ میں لے جانے لگا۔
کے پائیدان پر چڑھتے ہی ریوالور کے بلاسٹ ہوگیا۔ راجہ کے جسم کے ایسے چیتھڑے ہوئے کی آہٹ بھی نہ ملی۔ میں یہی کوشش ہے۔ دھماکے کی آواز سنتے ہی علاقے کی پولیس حرکت

میں آگئی۔ حمزہ جس راستے سے ٹینا کو جبراً لے جارہا تھا، اس راستے سے پولیس موبائل آرہی تھی۔ حمزہ گاڑی روک کر ٹینا کو جبراً کھینچ کر لے جانا چاہتا تھا لیکن وہ شور مچانے لگی۔ اسے مجبور ہوکر صرف اپنی جان بچانے کے لئے اپنی گاڑی چھوڑ کر جنگل کے ناہموار راستوں کی طرف بھاگنا پڑا۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے اب تک اسے تلاش کر رہے ہیں۔

سیاسی کیمروں سے اپنے چہیتے سیاست دانوں اور ان کے مخالفین کی جو تصویریں اتاری جاتی ہیں، وہ ایسی ہی ہوتی ہیں جو اخبار میں شائع کی گئی تھیں۔ ایسے ہی سیاسی قلم سے کالم لکھے جاتے ہیں، جنہیں راجہ زندہ رہ کر پڑھ رہا تھا مگر اخبار کے مطابق مرچکا تھا۔
اخبار میں ٹینا کی تصویر کے ساتھ اس کا بھی بیان شائع کیا گیا تھا۔ ٹینا نے بھی یہی بیان دیا تھا کہ اسے راجہ اور حمزہ نے مل کر اغوا کیا تھا لیکن ان کے آپس کے جھگڑے کے باعث وہ خوش قسمتی سے زندہ بچ گئی۔
راجہ اخبار ایک طرف رکھ کر سوچنے لگا، خوش قسمت ٹینا نہیں، میں ہوں۔ وہ خفیہ ہاتھ کی پلاننگ میں شامل تھی۔ مجھے ہلاک کرنا چاہتی تھی اور مجھے ہلاک کرنے کے لئے ایسی جگہ کی ضرورت تھی، جہاں سے میں فرار نہ ہوسکوں۔ اس دوسرے کمرے میں میری جگہ ایک جانباز تھا۔ ٹینا نے مجھے اس کمرے میں جاکر دروازہ بند کرتے دیکھا تھا۔ لہٰذا اسے پورا یقین تھا کہ میں ہی اس کمرے میں ہوں۔ اس نے اس کمرے کے دروازوں کو باہر سے بند کیا ہوگا اور ایک ٹائم بم میں بلاسٹنگ کا وقت مقرر کرکے وہاں سے بھاگ گئی ہوگی۔

وہ ایک گہری سانس لے کر دل ہی دل میں بولا۔ "واہ ری عورت! میں تجھے مظلوم اور وفادار سمجھ کر تیری ہلاکت پر افسوس کر رہا تھا اور تو ہے کہ میری ہلاکت کا سامان کرچکی تھی۔ بے شک حمزہ چٹان ہے، کسی کی ہلاکت پر رنجیدہ نہیں ہوتا، ہلاک کرنے والوں کے اندر گھس کر ان کے ارادے معلوم کرتا ہے۔ مجھے کئی بار محبت اور غصے سے سمجھا چکا ہے کہ کسی ایک رشتے کے لئے جذباتی نہ بنو۔ اگر ایک بہن یا ایک محبوبہ ہلاک ہوتی ہے تو ہمارے منہ پر ایک بار جوتا پڑتا ہے۔ عزم کرو کہ دوسری بہنیں اور دوسروں کی محبوبائیں ہلاک نہ ہوں اور بار بار ہمارے منہ پر جوتے نہ پڑیں۔"
وہ سوچنے کے دوران میں سامنے دور تک لوگوں کو دیکھ رہا تھا اور حمزہ کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ حمزہ وہاں آچکا تھا اور دور کھڑا مسجد کے چبوترے پر بیٹھے ہوئے افراد کو دیکھ کر راجہ کو پہچاننا چاہتا تھا۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے

تھے۔ صرف ایک شخص کی خاموشی اور سوچتی ہوئی نظروں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہی راجہ نواز ہے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آ کر اس کے پاس بیٹھ گیا پھر جھکے ہوئے انداز میں بڑبڑایا۔

"دنیا بدل جاتی ہے۔"

راجہ نواز چونک کر اسے دیکھا پھر خوش ہو کر مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "دین نہیں بدلتا۔"

حمزہ نے کہا۔ "خوب بھیس بدلا ہے۔ داڑھی مونچھیں ہلکی ہیں مگر اصلی ہیں۔"

میں نے چار دنوں سے شیو نہیں کیا ہے۔ داڑھی اور مونچھوں کو سلیقے سے تراش لیا ہے۔ بالوں کا رنگ اور آنکھوں کے لینس تبدیل کئے ہیں مگر تم تو بالکل بدل گئے ہو۔ کیا پلاسٹک سرجری کرائی ہے؟"

"ہاں مختصر سی سرجری کرائی ہے۔"

"آج کا اخبار پڑھا ہے؟"

"ہاں۔ تم فوت ہو چکے ہو۔ اس جھوٹی خبر سے تمہیں فائدہ پہنچے گا۔ ہمارے مخالفین تمہیں مُردہ سمجھ کر صرف مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔"

"خفیہ ہاتھ ہمیں شہ مات دے رہا ہے۔ ہمارے اہم ذرائع اور ہماری ذاتی آرمی رکھنے والے طریقۂ کار کو ہم سے چھین چکا ہے۔ تم یہ بتاؤ ہم ابھی کس مقام پر کھڑے ہیں؟"

"ہم بے یار و مددگار کھڑے ہیں۔ صرف ایک اللہ کا سہارا ہے۔"

"اس حد تک میں سمجھ رہا ہوں مگر یار! تم فوج میں کیپٹن رہ چکے ہو۔ جنگ ہارتے ہارتے جیتنے کے کئی طریقے جانتے ہو۔"

"ذرائع ہوں۔ اختیارات ہوں' وسائل ہوں تو ہارنے والی جنگ جیتی جاسکتی ہے۔"

"تم ایسی مایوسی سے کہہ رہے ہو جیسے واقعی ہار مان کر رائے ونڈ میں گوشہ نشینی اختیار کر کے تسبیح پڑھنے آئے ہو۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "ہمارے دین میں علمائے کرام اور دانشوروں کو گوشہ نشینی کی اجازت ہے۔ ورنہ تمام عمر دین اور ایمان کے لئے جہاد کرنا لازمی ہے۔ ہم ہار مان کر ایمان اور سچائی کے لئے جہاد ترک نہیں کریں گے۔"

"ہاں۔ ہم ضدی ہیں۔ مر جائیں گے لیکن ہار نہیں مانیں گے۔ ان کی پہلی کوشش یہ ہوگی کہ میری طرح تمہیں بھی ڈھونڈ کر ہلاک کر دیا جائے یا تمہیں اس قدر مجبور کر دیا

جائے اور اپنے ہی ملک کی زمین تمہارے لئے اتنی تنگ کر دی جائے کہ تم یہ ملک چھوڑ کر بھاگ جانے اور دوسرے کسی ملک میں جا کر پناہ لینے پر مجبور ہو جاؤ۔"

حمزہ سر جھکائے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ راجہ نے کہا۔

"میری بات سمجھ میں یہ آتا ہے کہ ایک سے دو اور دو سے چار اور چار سے چار ہزار محبانِ وطن اور پہلے کی طرح ہمارے جانباز ہوں تو ہماری جدوجہد میں پہلے سے زیادہ شدت پیدا ہو جائے گی لیکن یہ میرا خیال ہے' خواب ہے یا پھر خوش فہمی ہے کہ ہمیں اپنے ہی ملک میں پہلے کی طرح جانباز مل سکیں گے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ بڑے دکھ کی بات ہے کہ پوری قوم پاکستان سے محبت کرتی ہے مگر آدھی سے بھی آدھی قوم پاکستان کی سلامتی کے لئے عملی اقدامات نہیں کرتی ہے۔"

حمزہ نے کہا۔ "ہمارے ملک میں غربت اور مہنگائی بہت ہے۔ اس غربت اور مہنگائی سے لڑتے لڑتے عوام کے دن رات گزرتے رہتے ہیں۔ اس لئے وہ کرپٹ سیاست دانوں سے لڑنے کا وقت نہیں نکال سکتے لیکن میں یہ بات نہیں مانتا۔ جب انہیں لڑنے کا وقت نہیں ملتا ہے تو وہ مجرم سیاست دانوں کو ووٹ دینے کا وقت کیسے نکال لیتے ہیں۔ اگر غربت اور مہنگائی زیادہ ہے تو فلم کا ایک شو فیملی کے ساتھ دیکھنے میں کم از کم تین سو روپے خرچ ہوتے ہیں اور ہر شو ہاؤس فل ہوتا ہے۔ ماہِ رمضان شروع ہوتے ہی مہنگائی ڈبل ہو جاتی ہے اس کے باوجود بازاروں میں خریداروں کا ہجوم رہتا ہے۔ ایک بکرا دو ہزار سے دس ہزار تک خریدا جاتا ہے۔ بے شک قربانی دینا چاہیے لیکن پاکستان کو گروی رکھ کر عید منانا سراسر پاگل پن ہے مگر ہم ابھی اٹھ کر بلند آواز میں سب کو مخاطب کریں کہ اے لوگو! تم سب ایب نارمل ہو' جس ماں کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہو' اسی ماں کو خفیہ ہاتھ کے پاس گروی رکھ دیتے ہو۔ کیا بات ہے تمہاری' روتے بھی جاتے ہو گاتے بھی جاتے ہو۔"

وہ دونوں تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ سامنے بے شمار لوگوں کو آتے جاتے دیکھتے رہے پھر حمزہ نے کہا۔ "ہم بھی انسان ہیں۔ ہم بھی اچھے اور برے حالات سے متاثر ہوتے ہیں۔ موجودہ حالات میں ہم لاشعوری طور پر پریشان ہیں۔ شاید اسی لئے اپنے ملک کے بزرگوں اور بھائیوں پر تنقید کر رہے ہیں۔ جبکہ ہمیں اپنے اعمال کے متعلق سمجھنا چاہیے کہ ہم سے کیا غلطیاں ہوئی ہیں؟ اور آئندہ ہمیں کیا کرنا ہے؟ قوم کا ہر فرد اپنے عمل کا ذمے دار ہے۔ ہم دونوں اکیلے ہی سہی' ہمیں اپنی ذمے داریاں کسی طرح بھی پوری کرنی ہوں گی۔"

اس نے جیب سے ایک موبائل فون نکالا۔ راجہ نے پوچھا۔ "تم نے اب تک فون

رکھا ہوا ہے اور میں اپنا پھینک چکا ہوں۔"

"میں نے ابھی اپنا فون پھینک دیا ہے۔ یہ دوسرا ہے ہماری بہن عالی لاہور میں تنہا ہے۔ کل سے میں نے اس کی خیریت معلوم نہیں کی ہے۔"

اس نے رابطہ کرنے کے بعد کہا۔ "ہیلو عالی! میں تمہارا بھائی حمزہ بول رہا ہوں۔ کیسی ہو تم؟"

عالی نے کہا۔ "آپ کی دعا سے خیریت سے ہوں۔ میں نے عارضی طور پر وہ کوٹھی چھوڑ دی ہے اور میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں ہوں۔"

"فرمان کی کوئی خبر ہے؟"

"ہاشم انکل نے بتایا ہے' وہ خیریت سے ہیں۔ حمزہ بھائی آپ سے انکل کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ پلیز ان سے رابطہ کریں۔ میں ان کا ذاتی فون نمبر بتا رہی ہوں۔"

حمزہ نے ایک قلم سے اپنی ہتھیلی پر نمبرز لکھے پھر اس سے چند باتیں کر کے فون.......... بند کر دیا۔ راجہ نے اس کی ہتھیلی کو دیکھ کر پوچھا۔ "یہ کس کے نمبر ہیں؟"

"انڈر گراؤنڈ مافیا کے گاڈ فادر ہاشم سے ڈائریکٹ رابطہ کرنے کے نمبرز ہیں۔ عالی نے التجا کی ہے کہ میں ہاشم سے بات کروں۔"

"ہم مجرموں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ کیا تم اس سے بات کرو گے؟"

"یہی سوچ رہا ہوں۔ وہ صرف ایک مجرم نہیں ہے لیڈی سرجن آمنہ کا بھائی اور ہمارے ساتھی فرمان کا ماموں بھی ہے۔ ان اہم رشتوں کے حوالے سے بات کرنی چاہیے۔"

راجہ نے کہا۔ "باجی آمنہ کا کردار عجیب ہے۔ وہ خطرناک مجرموں کا علاج کرتی ہیں لیکن ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے خود مجرمہ نہیں ہیں۔ بڑی باصلاحیت اور عظیم خاتون ہیں۔ قانون کے محافظ ان کے آگے بے بس ہو جاتے ہیں"

حمزہ نے ہاشم سے رابطہ کیا۔ "میں امیر حمزہ بول رہا ہوں۔ شاید تم میرے اصولوں سے واقف ہو۔ میں مجرموں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا لیکن باجی آمنہ کے بھائی ہو۔ فرمان اور عالی کے ماموں ہو۔ ابھی عالی نے التجا کی ہے کہ میں تم سے باتیں کروں۔"

"شکریہ حمزہ! تم نے عالی کی بات رکھ لی۔ میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں' کیا ہماری باجی آمنہ کو کوئی مجرمہ ثابت کر سکتا ہے؟"

"ہرگز نہیں۔ وہ ایک ڈاکٹر ہیں اور اپنے پیشے کے تقاضے پورے کرنے کے لئے مجرموں کا بھی علاج کرتی ہیں۔"

"حمزہ! تم بھی ڈاکٹر ہو۔ ہمارے سیاست دانوں نے ملک میں جو کرپشن کی بیماریاں پھیلائی ہیں' تم ان بیماریوں کو ختم کرنے کے لئے دن رات مصروف رہتے ہو۔ دنیا کی کوئی طاقت باجی آمنہ کو ایک تنہا اور کمزور عورت سمجھ کر انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی ان کی پشت پر صرف میں نہیں ہوں۔ عالمی سطح کے بے حد خطرناک مجرم بھی ان کے محافظ بنے رہتے ہیں۔ برسوں پہلے باجی کمزور اور تنہا تھیں۔ بڑے مصائب سے گزر رہی تھیں۔ انہوں نے ایک بہت مشکل آپریشن کے ذریعہ میری جان بچائی۔ تب سے میں ان کا محافظ ہوں۔ آج خفیہ ہاتھ تمہیں تنہا اور کمزور بنا رہا ہے۔ اگر تم باجی کی طرح حکمتِ عملی سے کام لو گے تو اس خفیہ ہاتھ کو منہ توڑ جواب دے سکو گے۔"

"ہوں۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ باجی کی طرح میں بھی تم سے تعاون حاصل کروں؟"

"ہاں مگر ایک بھائی بن کر۔ باجی میرے ساتھ کسی جرم میں کبھی شریک نہیں رہیں۔ میں تمہیں بھی کسی جرم میں شریک نہیں کرنا چاہتا۔ شاید تم میرے طریقۂ کار سے واقف نہیں ہو۔ میں اپنے ملک سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ شمشیر سنگھ کالیا جیسے گاڈ فادر کہلانے والے اسمگلروں کو میں نے کبھی یورینیم اور پلاٹینم جیسی چیزیں پاکستان کے راستے سے لے جانے نہیں دیں بلکہ اسمگل ہونے والی یورینیم کی خاصی مقدار کو اپنے ہی ملک میں روک دیا۔ کالیا اسی لئے میرا دشمن ہے کہ میں نے اسے بھارت کو بہت بڑی ایٹمی قوت بننے کا موقع نہیں دیا ہے۔ جس طرح باجی مجرموں کو نئی زندگیاں دینے کے باوجود مجرمہ نہیں ہیں' اسی طرح میں دوسرے ممالک کے لئے مجرم ہونے کے باوجود پاکستان کے مفادات کے لئے کام کرتا ہوں۔"

"تم اپنی زبان سے کہہ رہے ہو کہ دوسرے ممالک کے لئے مجرم ہو۔ آخر مجرم ہو نا؟"

"دنیا کے ہر ملک کا حکمران دوسرے ملکوں کے مقابلے میں پہلے اپنے مفادات کو ترجیح دیتا ہے۔ اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے دوسرے ملکوں میں تخریب کاری کرانا اس لئے جرم نہیں ہے کہ ایسے جرائم حکمران کرتے ہیں؟ کیا موساد' را اور کے جی بی وغیرہ تنظیموں کے خلاف اقوام متحدہ یا کوئی عالمی عدالت ایکشن لیتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر میں انڈر ورلڈ کا گاڈ فادر ہونے کے باوجود اپنے پاکستان میں کوئی جرم نہیں کرتا ہوں۔ بلکہ ملک دشمن عناصر کے قدم یہاں سے اکھاڑتا ہوں تو تم مجھے مجرم کیوں سمجھتے ہو؟ کیا میں نے کرپٹ سیاست دانوں کے خلاف اپنے بھانجے فرمان کو تمہارا ماتحت نہیں بنایا ہے؟ آؤ آج پاکستان کی سلامتی کا ایک زبانی معاہدہ کریں۔"

"کیسا معاہدہ؟"

"تمہیں اپنی پشت پر جانبازوں کی ایک فوج کی ضرورت ہے میں فوج اور ہتھیار دوں گا۔ تمہیں دنیا کے کسی ملک میں ڈالرز اور پاؤنڈز کی کمی نہیں ہوگی۔ تمہاری ہر ضرورت پوری کروں گا پھر جس دن تم ہمارے ملک کو کرپٹ سیاست دانوں سے پاک کرو گے اور خفیہ ہاتھ کا طلسم توڑ دو گے' میں جرائم سے بھرپور انڈر گراؤنڈ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر کہیں روپوش ہو جاؤں گا۔ میری اس پیشکش پر غور کرو۔ اب تمام ذرائع سے محروم ہو کر خفیہ ہاتھ جیسی طاقت سے تنہا جنگ کرو گے تو گویا جان بوجھ کر خودکشی کرو گے۔ میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گا۔"

ہاشم نے فون بند کر دیا۔ حمزہ بھی فون بند کر کے سوچنے لگا۔ راجہ نے پوچھا۔ "تم اس گاڈ فادر ہاشم سے کسی معاہدے کی بابت پوچھ رہے تھے؟"

حمزہ اسے ہاشم سے ہونے والی گفتگو تفصیل سے سنانے لگا۔ وہ تمام باتیں سنا کر بولا۔ "ہاشم کی باتوں میں سچائی ہے۔ خفیہ ہاتھ سے جنگ جاری رکھنے کے لئے ہمیں بے حساب ڈالرز اور پاؤنڈز کی ضرورت پیش آتی رہے گی' اپنے ملک کے لئے جان کی بازی لگانے والوں کی بھی ضرورت ہے۔ ہاشم اپنے اس عمل سے مجرم نہیں محب وطن ثابت ہوتا ہے۔ وہ پاکستان کے لئے مجرمانہ ذہن رکھنے والوں کے خلاف ہمارا ساتھ دے رہا ہے۔"

حمزہ نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "ہم یہاں چہرے تبدیل کر کے ایسے بیٹھے ہیں' جیسے مجرم ہوں اور قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے بے گھر ہو کر بھٹک رہے ہوں۔ یہاں مسجد کے سائے میں رہ کر جیسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد مل رہی ہے اور ہاشم کے وسیلے سے مل رہی ہے۔"

اس نے دوبارہ ہاشم سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "میں تم سے براہِ راست ملاقات کرنا اور معاملات طے کرنا چاہتا ہوں۔"

ہاشم نے کہا۔ "میں حاضر ہوں۔ جہاں چاہو گے تنہا ملاقات کرنے چلا آؤں گا۔"

"لاہور میں باجی آمنہ کی کوٹھی خالی ہے۔ شام کو ملاقات ہو سکتی ہے۔"

"اس کوٹھی کے چاروں طرف میرے جاسوس ہیں۔ احاطے میں مسلح گارڈز ہیں۔ میں ابھی انہیں حکم دے رہا ہوں وہ تمہارا نام سنتے ہی کوٹھی کا دروازہ تمہارے لئے کھول دیں گے۔ میں شام کو پانچ بجے وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں پانچ بجے آؤں گا۔ خدا حافظ۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ حمزہ اور راجہ کو ایک نیا حوصلہ مل گیا۔ دونوں نے گرم جوشی سے

ایک دوسرے کے ہاتھ کو تھام لیا۔ نیک نیتی ہو تو دشمن ایک دروازہ بند کرتا ہے۔ اللہ سو دروازے کھول دیتا ہے۔"

حمزہ نے کہا۔ "شام کو معاملات طے ہو جائیں گے۔ تو پھر مخالفین پر دھماکے کے ساتھ ظاہر کریں گے کہ تم زندہ ہو۔ اب وہ خوشیاں نہیں منائیں گے' ماتم کرتے رہیں گے۔"

اس نے کراچی کے قونصل خانے میں فون کیا پھر کہا۔ "میں مس ٹینا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ "آپ کون ہیں؟"

"اسے اغوا کرنے والوں میں سے ایک ہلاک ہو گیا دوسرا زندہ رہ گیا' وہی زندہ بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر ٹینا کی آواز سنائی دی۔ وہ ناگواری سے بولی۔ "ہیلو کون ہے؟"

حمزہ نے کہا۔ "تمہیں اغوا ہونے کا بہت شوق ہے۔ شرافت پسند نہیں ہے۔ تم اپنی مرضی سے اپنے تحفظ کے لئے راجہ کے ساتھ گئی تھیں لیکن اغوا ہونے کا الزام راجہ نواز کے علاوہ مجھ پر لگایا اور یہ بھی شرمناک الزام لگایا کہ ہم دو مرد تمہیں بانٹ کر کھانا چاہتے تھے۔"

"میں سمجھ گئی۔ تم امیر حمزہ بول رہے ہو۔"

"اور میں سمجھ رہا ہوں کہ ان لمحات میں فون پر ہونے والی گفتگو ریکارڈ کی جا رہی ہے۔ تم مجھے لمبی باتوں میں الجھاؤ گی اور یہ سراغ لگایا جائے گا کہ میں کس فون پر کہاں سے بول رہا ہوں لیکن میں مختصر سی بات کہہ رہا ہوں کہ تمہاری اغوا ہونے کی خواہش پوری کروں گا۔ میرے کراچی آنے تک کسی فولادی قلعے میں چھپ جاؤ۔ اس کے باوجود تمہاری خواہش پوری کروں گا۔"

حمزہ نے فون بند کر دیا پھر دوسرے نمبر پنچ کرنے کے بعد کہا۔ "ہیلو میں امیر حمزہ بول رہا ہوں۔ نیک بخت سے کہو' میں اس کے سیف کی تمام چیزیں واپس کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ مجھ سے بات کرے گا تو میں کاشف اکبر کے سیف سے لائی ہوئی چیزیں بھی دوں گا۔"

دوسری طرف سے سیکرٹری نے کہا۔ "پلیز ہولڈ آن رکھیں۔ میں سر کو آپ کا پیغام دے رہا ہوں۔"

حمزہ انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ کے بعد سیکرٹری نے کہا۔ "پلیز ہولڈ آن......... سر

ہاتھ روم سے ابھی آ رہے ہیں۔"

پھر چند منٹ تک انتظار کرنا پڑا۔ اس کے بعد نیک بخت کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو حمزہ صاحب! مجھے افسوس ہے آپ کو اتنی دیر انتظار کرنا پڑا۔"

حمزہ نے کہا۔ "بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ فون سے ٹیپ ریکارڈر منسلک کرنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ کسی پہلوان کو اعصابی کمزوری کی دوا کھلائی جائے یا انجکشن لگایا جائے تو وہ بالکل ہی کمزور اور ناکارہ ہو جاتا ہے۔"

"آپ کی ان باتوں کا مطلب کیا ہے؟"

"یہی کہ تم نے اور خفیہ ہاتھ نے میرے اعصاب کمزور کرنے.......... بالکل ناکارہ بنا دینے کے لئے میرے تمام اہم ذرائع سے محروم کر دیا۔ صرف اتنا ہی نہیں، میری کمر توڑنے کے لئے میرے بہترین دوست راجہ نواز کو ہلاک کرا دیا۔ اب تو تمہاری پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں۔"

نیک بخت نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم مجبور اور کھسیانے ہو کر بول رہے ہو۔"

"تم نے پوری کہاوت نہیں سنی۔ میں کہہ رہا ہوں، تمہاری پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں۔ کہاوت پوری کرنے کے لئے میں تمہارا سر کڑاہی میں ڈالنے والا ہوں۔ صرف کل تک انتظار کرو، تمہیں دن میں تارے نظر آنے والے ہیں۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ نیک بخت کی نیند اُڑانے اور خفیہ ہاتھ کو تشویش میں مبتلا کرنے کے لئے فی الوقت اتنا ہی کافی تھا۔

اس نے راجہ نواز کو فون دیتے ہوئے کہا۔ "تم کاشف اکبر سے بات کرو۔ جب ڈاکو دو ہوں تو دونوں کا خانہ خراب کرنا چاہیے۔"

وہ آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ کاشف اکبر سے کس طرح کی گفتگو کی جائے۔

دوسری طرف کاشف اکبر خفیہ ہاتھ کے سیکرٹری سے فون پر باتیں کر رہا تھا۔ "آپ کے باس کے ہاتھوں میں تو دنیا کے بے شمار اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی میڈیاز ہیں۔ آج کے اخبارات میں جو خبر شائع ہوئی ہے، وہ تمہارے باس کی اس سیاسی چال کو واضح کرتی ہے کہ وہ آئندہ نیک بخت کو ہی حکومت بنانے کا موقع دیں گے۔ انہوں نے اس خبر کے ذریعے نیک بخت اور انیلا کے اسکینڈل کو ختم کر دیا۔ انیلا کے اغوا اور ہلاکت کا الزام امیر حمزہ پر لگا کر نیک بخت کو فرشتہ ثابت کیا ہے۔ اس خبر میں میرا ذکر کہیں نہیں کہ میرا اور نازاں کا بھی اسکینڈل تھا۔ راجہ نواز نے نازاں کو اغوا کیا اور پھر قتل کیا تھا۔ آپ کے باس مجھے بھی فرشتہ ثابت کر سکتے تھے لیکن انہوں نے مجھے بالکل ہی نظرانداز کر دیا ہے۔ میری سمجھ میں

نہیں آتا کہ حمزہ نے نیک بخت کے سیف سے اس کے اہم راز چرائے ہیں اور اس کی کمزوریاں عوام کے سامنے لا سکتا ہے۔ اسے شیطان ثابت کر سکتا ہے۔"

سیکرٹری نے کہا۔ "آپ صرف اپنے گریبان میں نظر ڈالیں۔ حمزہ آپ کے سیف سے بھی اہم راز چرا کر لے گیا ہے۔ آپ خود کو عوام کے سامنے فرشتہ ثابت کر دیں پھر الیکشن کی یہ جنگ آپ خود بخود جیت لیں گے۔ آپ کو ہمارے باس کے سہارے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"صرف فرشتہ ثابت کرنے کی ضرورت ہوتی تو یہ کھیل میں کھیل چکا ہوتا مگر آپ کے باس کچھ ایسی چالیں چلیں گے جو ابھی ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں ایک بار اپنے باس سے بات کرا دیں۔"

سوری۔ کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔ دردانہ بیگم فون کے وائڈ اسپیکر سے دوسری طرف کی باتیں سن رہی تھی۔ مایوس ہو کر بولی۔ "اب کیا ہو گا کاشف؟ صوبہ سندھ میں ہماری پوزیشن مضبوط تھی لیکن رحمان چنا کی ہلاکت کے بعد ہم یہاں بھی کمزور پڑ رہے ہیں۔"

پھر وہ کاشف اکبر کو غصے سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "تمہاری ہوس پرستی ہمیں ڈبو رہی ہے۔ نہ تم نازاں کو حاصل کرنے کی ضد کرتے اور نہ راجہ نواز ہمارا دشمن بن کر ہماری پوزیشن کو کمزور بناتا۔"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اتنا زبردست ہو گا۔ ہمارے سامنے ایک عام سا یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ بن کر آیا تھا۔ اگر معلوم ہوتا کہ وہ دلیر اور چالباز ہے تو میں بڑی سے بڑی قیمت پر اسے خرید لیتا۔ چلو اچھا ہوا بم دھماکے میں مر گیا ایک دن اس کا یہی انجام ہونا تھا۔"

فون کی گھنٹی بجی۔ کاشف اکبر نے ریسیور اٹھا کر پوچھا۔ "ہیلو کون؟"

راجہ نواز نے کہا۔ "میں نے تمہاری آواز پہچان لی ہے۔ اگر مجھے مُردہ نہ سمجھو تو میری بھی آواز پہچان لو۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "یہ تو راجہ نواز کی آواز ہے۔ تم کہتے ہو میں مُردہ نہ سمجھوں۔ کیا تم زندہ ہو؟ اگر زندہ ہو تو تمام اخبارات میں اتنی بڑی خبر کیسے شائع ہوئی ہے؟"

خفیہ ہاتھ مجھے امیر حمزہ کے مقابلے میں نیک بخت کی حفاظت کے لئے میری خدمات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ میں نے حمزہ کی خفیہ رہائش گاہ سے وہ تمام اہم راز چرا لئے ہیں جو اس نے نیک بخت اور تمہارے سیف چرائے تھے۔"

دردانہ اور کاشف اکبر نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر کاشف اکبر نے پوچھا۔

"کیا تم واقعی وہ راز چرا لائے ہو۔ یعنی کہ ہمارے بھی؟"

"میں کسی بھی وقت اپنی سچائی ثابت کر سکتا ہوں۔ اس خفیہ ہاتھ نے نیک بخت کو بدنامی سے بچانے کے لئے مجھے ایک لڑکی ٹینا کے ذریعے پھانسا میں ٹینا کو کھوکھرا پار والی رہائش گاہ میں لے گیا۔ انہوں نے سمجھا کہ وہ تمام راز اسی خفیہ رہائش گاہ میں ہوں گے۔ ٹینا نے آدھی رات کے بعد مجھے گہری نیند میں دیکھ کر میرے گھر کی تلاشی نہیں لی۔ اسے سمجھایا گیا تھا کہ وہ تمام راز وہاں تلاش کرے گی تو میں نیند سے جاگ سکتا ہوں لہٰذا مجھے ان تمام رازوں سمیت ہلاک کر دیا جائے۔ اس نے یہی کیا۔ اس مکان میں ایک ٹائم بم رکھ کر چلی گئی۔ میری وہ خفیہ رہائش گاہ بم دھماکے سے تباہ ہو گئی۔"

"تم کیسے بچ گئے؟"

"ٹینا نہیں جانتی تھی کہ مجھے ایک واردات کے لئے آدھی رات کے بعد کہیں جانا ہے۔ میرے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں روشندان کے راستے باہر چلا گیا' بے چارہ میرا ایک ملازم اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ ٹینا نے سمجھا ہو گا کہ وہ ملازم گھر کا کام کر کے اپنے گھر چلا گیا ہے۔ بم دھماکے کے بعد ملازم کے جسم کے ٹکڑے ملے۔ دشمن یہی سمجھ رہا ہیں کہ میں ہلاک ہو چکا ہوں۔"

"ان تمام رازوں کا کیا ہوا؟"

"میں اتنا نادان تو نہیں ہوں کہ عیاشی کے لئے ٹینا کو اپنے خاص خفیہ اڈے میں لے جاتا۔ نیک بخت اور خفیہ ہاتھ خوش ہیں کہ میں ان تمام رازوں کے ساتھ فنا ہو چکا ہوں۔"

کاشف اکبر نے پوچھا۔ "راجہ! کیا تم پرانی دشمنی بھول سکتے ہو؟"

"میں نے بھولنے کے لئے ہی فون کیا ہے لیکن اس شرط پر کہ تمہاری کمزوریاں یعنی کہ وہ تمام راز میرے پاس رہیں گے۔ جب تک ہماری دوستی رہے گی اور جب تک تم کوئی دھوکا نہیں دو گے' میں وہ راز کبھی منظرِ عام پر نہیں لاؤں گا۔"

"پھر تو دوستی نہ ہوئی۔ تم ان رازوں کے ذریعے مجھے بلیک میل کرتے ہوئے مجھ سے اپنے کچھ مفادات حاصل کرتے رہو گے۔"

"تم اسے بلیک میلنگ کہہ سکتے ہو۔ اگر میں تم سے کسی طرح کا تعاون حاصل کروں گا تو تمہیں بھی فائدہ پہنچاتا رہوں گا۔"

"مثلاً کس طرح فائدہ.........پہنچاؤ گے؟"

"کل کے اخبارات یہ خبر شائع کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ میں زندہ ہوں اور نیک

بخت نے خود کو بہترین چال چلن والا سیاست داں ثابت کرنے کے لئے بے شک مجھے ہلاک کرنے کی کوششیں کی تھیں کیونکہ اس کے کئی اہم اور شرم ناک راز میرے پاس ٹھوس ثبوت کے ساتھ ہیں اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بم دھماکے سے بچالیا ہے۔ کیا میرا بیان نیک بخت کے خلاف ہو گا تو تمہیں فائدہ نہیں پہنچے گا؟"

"بے شک فائدہ پہنچے گا۔"

"تم بھی اخبارات میں بیان دو کہ امیر حمزہ اور راجہ نواز کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے۔ نیک بخت نے پہلے تمہارے صوبائی پارٹی کے لیڈر رحمان چنا کو ہلاک کرایا پھر راجہ نواز کو ہلاک کرانے کی سازش کی اور ناکام ہو گیا۔"

"میں ابھی تمام اخبارات کے مالکان اور ایڈیٹرز کو فون پر ایسا ہی بیان دوں گا۔"

"تم یہ نہ بھولو کہ کئی چھوٹے بڑے اخبارات خفیہ ہاتھ کے دباؤ میں ہوں گے۔ میں شام چھ بجے خفیہ ہاتھ کو بے اثر کر دوں گا۔ تم سات بجے اخبارات کو بیان دو۔"

"یہ تو ناممکن سی بات ہے۔ تم خفیہ ہاتھ کو کیسے بے اثر کرو گے؟"

"میں اپنا طریقۂ کار کسی کو نہیں بتاتا۔ تم نیک بخت کو اس کے موجودہ مقام سے گرانا چاہتے ہو تو وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں آج سات بجے اخبارات کو بیان دوں گا تم سے اور کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں کل کسی وقت رابطہ کروں گا۔ ڈیٹس آل۔"

راجہ نے فون بند کر دیا۔ حمزہ نے گاڈ فادر ہاشم سے دوبارہ رابطہ کر کے کہا۔ "ہم نے ایک پلاننگ کی ہے۔ تم سے شام چھ بجے ملاقات میں تفصیلی گفتگو ہو گی لیکن فوری طور پر تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔"

"میں ہر طرح تعاون کروں گا۔ بولو کیا چاہتے ہو؟"

"میں اخبارات میں راجہ نواز کا بیان اس کی تصویر کے ساتھ شائع کرانا چاہتا ہوں۔ کئی اخبارات خفیہ ہاتھ کے زیر اثر ہیں۔ وہ راجہ کا بیان شائع نہیں کریں گے۔ کیا تم ایسے اخبارات کو بیان شائع کرنے پر مجبور کر سکو گے؟"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم راجہ کا بیان ابھی فون پر سناؤ۔ میں اسے ریکارڈ کر رہا ہوں۔ جو اخبارات خفیہ ہاتھ کے زیرِ اثر ہیں' ان کے نام بھی بتا دو۔"

حمزہ نے راجہ کی طرف سے ایک بیان ریکارڈ کرایا۔ چند اخبارات کے نام بھی بتائے۔ ہاشم نے کہا۔ "اطمینان رکھو' یہ بیان ہر اخبار کے پہلے صفحے پر شائع ہو گا۔ اگر تم

مناسب سمجھو گے تو آج شام ملاقات نہ کریں۔ پہلے کل کے تمام اخبارات میں راجہ کا بیان تصویروں کے ساتھ دیکھ کر یہ یقین کر لو کہ میں اپنے طریقۂ کار سے کس طرح خفیہ ہاتھ کے مقابلے میں تمہارے قدم جماؤں گا۔ ہم کل صبح دس بجے ملاقات کریں گے۔"

دوسری صبح نیک بخت کے لیے چونکا دینے والی تھی۔ اس نے کئی مختلف اخبارات پڑھے۔ ان سب میں مُردہ راجہ نواز زندہ ہو چکا تھا اور اس نے اپنے بیان میں دعویٰ کیا تھا کہ اس کے پاس نیک بخت کے خلاف کرپشن اور سیاسی جرائم کے ٹھوس ثبوت ہیں۔ وہ ثبوت امیر حمزہ نے اس کے سیف سے نکالے تھے۔ میں نے حمزہ کے ایک خفیہ ٹھکانے سے وہ تمام ثبوت چرا لئے ہیں۔ چوری ایک جرم ہے مگر میں نے قومی خزانے کے چور کے گھر چوری کی ہے اس لئے میں خود کو چور نہیں سمجھتا ہوں۔ میں نیک بخت کو مشورہ دیتا ہوں کہ پہلے قومی خزانے کی تمام رقم واپس کرے اور عوام کے سامنے اپنے سیاسی جرائم کا اعتراف کرے۔ اس سے پہلے وہ الیکشن میں جیتنے اور حکمران بننے کے خواب نہ دیکھے۔ خواب کی تعبیر الٹی ہو جائے گی۔"

نیک بخت نے خفیہ ہاتھ سے فون پر رابطہ کیا۔ خفیہ ہاتھ نے کہا۔ "میں اخبارات دیکھ چکا ہوں۔"

"سر! کتنے ہی اخبارات کے مالکان اور ایڈیٹرز آپ کے زیرِ اثر ہیں آپ نے انہیں تاکید کی تھی کہ وہ میرے خلاف کبھی کوئی بیان شائع نہیں کریں لیکن راجہ نواز کے علاوہ کاشف اکبر کا بیان بھی میرے خلاف شائع کیا گیا ہے۔"

"ان اخبارات کے مالکان اب بھی میرے زیرِ اثر ہیں۔ میں نے انہیں فون کر کے پوچھا تھا کہ میری مرضی کے خلاف انہوں نے ایسا کیوں کیا ہے؟ ان سب کا بیان ہے کہ پچھلی رات جب اخبار کا پہلا صفحہ تیار کیا جا رہا تھا' تب نامعلوم افراد نے گن پوائنٹ پر ان بیانات کو چھاپنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہاں سے جاتے ہوئے دھمکیاں دی تھیں کہ آئندہ وہ فون پر جو کہیں گے' وہی انہیں کرنا ہو گا۔ وہ دوسری بار ان کے دفاتر نہیں آئیں گے بلکہ ان مالکان اور ایڈیٹرز کی بیویوں اور بچوں کو قتل کریں گے۔ ان کی عالیشان کوٹھیوں میں بم کے دھماکے کریں گے۔"

"تعجب ہے۔ آپ نے اپنی حکمتِ عملی سے امیر حمزہ کو تنہا کر دیا تھا۔ اس کے جتنے جانباز آرمی سے ریٹائرڈ ہو چکے تھے اور درپردہ اس کے لئے کام کر رہے تھے' انہیں دوبارہ ملازمت دے دی گئی تھی۔ وہ اپنے کیمپ سے باہر نہیں جاتے ہیں پھر کراچی' لاہور اور اسلام آباد کے اخباری دفتروں میں بے حساب نامعلوم گن مین کہاں سے پہنچ گئے؟"

"ابھی تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ امیر حمزہ نے خفیہ فوج بنا رکھی ہے۔ میں انہیں فوجی نہیں دہشت گرد کہوں گا لیکن وہ کیا اتنا دولت مند ہے کہ ان بے شمار دہشت گردوں کے اخراجاتِ برداشت کر رہا ہے یا اس کی پشت پر کوئی بہت دولت مند اور بڑے وسیع ذرائع کا مالک ہے۔ ہماری تمام خفیہ ایجنسیاں امیر حمزہ کو تلاش کر رہی ہیں۔ اسے ڈھونڈ نکالنے کے بعد ہی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ دولت اور ذرائع کہاں سے پیدا کر رہا ہے۔"

"آپ کی ایک ایجنسی سے بھیجی ہوئی ٹینا احمق ثابت ہوئی ہے۔ اس نے پتا نہیں' اس مکان کو بلاسٹ کر کے کس شخص کو مار ڈالا ہے اور ہمیں یقین دلا دیا کہ راجہ نواز کو ہلاک کر چکی ہے۔"

"ٹینا بہت چالاک ہے۔ راجہ نواز کو پھانسنے کے لئے بہت سوچ سمجھ کر اس کا انتخاب کیا گیا تھا لیکن راجہ نواز اس سے زیادہ چالاک ثابت ہوا ہے۔ فون پر اسے دھمکی دی گئی ہے کہ اسے کسی دن بھی اغوا.......... کر کے ہلاک کیا جا سکتا ہے یہ ہمارے لئے بھی چیلنج ہے کہ ہم اسے موت سے نہیں بچا سکیں گے۔"

"سر! مجھے بھی چیلنج کیا گیا ہے کہ قومی خزانے سے لی ہوئی رقم واپس نہیں کروں گا اور عوام کے سامنے اپنے سیاسی جرائم کا اعتراف نہ کیا تو الیکشن میں نہ جیت سکوں گا اور نہ ہی اقتدار حاصل کر سکوں گا۔"

"تمہارے مخالفین زبردست ثابت ہوتے جا رہے ہیں لیکن انہوں نے خفیہ ہاتھ کو ابھی اچھی طرح سمجھا نہیں ہے۔ ابھی الیکشن میں پچیس دن باقی ہیں۔ میں اتنے دنوں میں بازی پلٹ کر رکھ دوں گا۔"

دوسری طرف سے امیر حمزہ اور ہاشم نے پہلی بار لیڈی سرجن آمنہ کی کوٹھی میں ملاقات کی اور اہم معاملات پر گفتگو کرنے لگے۔ راجہ نواز اس کوٹھی کے باہر کہیں چھپا ہوا تھا تاکہ حمزہ پر کوئی آفت آئے تو وہ اس کی مدد کو پہنچ سکے۔ گاڈ فادر ہاشم قابلِ اعتماد تھا۔ اس کے باوجود وہ دونوں احتیاطی تدابیر پر عمل کرنے کے عادی تھے۔

☆======☆======☆

میں نے بیس کلو میٹر تک ڈرائیو کرنے کے بعد ٹرک سڑک کے کنارے روک دیا۔ پوجا سے کہا۔ "اب ہمیں اس ٹرک کو چھوڑ دینا چاہیے۔ انہیں ہمارے فرار کا علم ہو گیا ہو گا اور ہمارے تعاقب میں آ رہے ہوں گے۔"

ہم سڑک سے اتر کر کھیتوں میں چلے آئے۔ میں نے کہا۔ "ایک تو رات کا وقت

ہے اور میں پہلی بار بھارت آیا ہوں۔ تم بتاؤ ہمیں کدھر جانا چاہیے۔"

"دشمنوں کو بے وقوف بنانا چاہیے۔ جہاں سے فرار ہوئے ہیں' اسی طرف جانا چاہیے۔"

"یعنی ہمیں پھر پشکر کے مویشی میلے میں جانا چاہیے؟"

"ہم پشکر تک نہیں جائیں گے لیکن چار چھ کلو میٹر تک ضرور جائیں گے۔ تعاقب کرنے والے اس خالی ٹرک کو دیکھ کر یہی سمجھیں گے کہ ہم آگے کسی بستی میں چھپنے گئے ہیں اور ہم پیچھے واپسی کے راستے پر چلتے چلتے کسی دوسری سمت چلے جائیں گے۔"

ہم کھیتوں سے گزر کر جانے لگے۔ میں نے پریشان ہو کر کہا۔ "پتا نہیں وہ میری امی کو قیدی بنا کر کیا سلوک کر رہے ہوں گے؟"

"میں یقین سے کہتی ہوں' وہ تمہاری امی کو اے کلاس قیدی کے طور پر رکھیں گے۔ کالیا ان کے لئے بہت اہم ہے۔ اس کا علاج کرانے کے لئے وہ تمہاری امی کو ذہنی طور پر نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ کیونکہ انہیں نقصان پہنچے گا تو وہ کالیا کا آپریشن نہیں کر سکیں گی۔"

"اللہ کرے تمہارا یقین درست ہو۔"

"شاید میں ابھی تمہاری امی سے بات کرا سکتی ہوں۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیسے؟"

اس نے اپنے لباس میں سے ایک موبائل فون نکال کر کہا۔ "یہ اس فوجی افسر کا فون ہے' جو مجھے اپنے کمرے میں لے جا کر تمہارے بارے میں سوالات کر رہا تھا اور وہاں دارو پینے والا تھا۔ تم نے وہاں آ کر مجھے قید سے رہائی دلائی۔ میں وہاں سے آتے وقت اس کا یہ فون لے آئی تھی۔"

"یہ تم نے اچھا کیا کہ اس کا یہ فون لے آئی تھی۔"

"ہم "را" کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ گاڈ فادر ہاشم نے ہمیں "را" کی جوائنٹ انٹیلی جنس کمیٹی کے ڈائریکٹر جنرل جمنا پرساد دھاون اور اس کے ماتحت تین ایڈیشنل ڈائریکٹرز کے کئی فون نمبرز بتائے تھے۔ وہ سب میں نے اچھی طرح یاد کر لئے تھے۔"

"تم واقعی میری بہترین گائیڈ ہو۔"

اس نے مجھے موبائل دے کر کہا۔ "میں ڈی جی جمنا پرساد کا پرسنل نمبر بول رہی ہوں۔ تم یہ پنچ کرو اور یہ نمبر یاد رکھو۔"

وہ بولنے لگی۔ میں پنچ.......... کرنے لگا۔ اگرچہ رات کا اندھیرا تھا مگر پورا چاند نکلا

ہوا تھا۔ اس کی روشنی میں رابطہ ہو گیا۔ دوسری طرف سے فون کی گھنٹی بجتی رہی پھر کسی نے پوچھا۔ "ہیلو.......... کون ہے؟ کیا پھر کوئی ایمرجنسی ہے؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں لیڈی سرجن آمنہ کا بیٹا ہمارے دیس میں آیا ہوا ہے۔"

"یہ بات پربھاکر پشکر سے بتا چکا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہاں کے ٹریننگ سینٹر سے کالیا کو بھی لے جائیں۔ اس کا بیٹا کالیا کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

اسی وقت دوسرے فون کی گھنٹی سنائی دی۔ جمنا پرساد دھاون نے مجھ سے کہا۔ "جسٹ اے منٹ! میں ابھی تم سے بات کرتا ہوں۔"

اس نے دوسرے فون کا ریسیور اٹھا کر پوچھا۔ "ہیلو کون ہے؟"

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ وہ چونک کر غصے سے بولا۔ "ہمارے کسی بھی ٹریننگ سینٹر میں کوئی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا ہے پھر کالیا کو کون وہاں سے لے گیا ہے؟"

میں اس کی یہ بات سن کر حیران ہوا۔ وہ دوسری طرف کی بات سن کر کہہ رہا تھا۔ "جب یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اس لیڈی سرجن کا بیٹا وہاں پہنچا ہوا تھا تو کالیا کی حفاظت کے لئے اور زیادہ سخت انتظام کرنا چاہیے تھا۔"

یہ بات سن کر میں نے فون پر چیخ کر کہا۔ "اے مسٹر دھاون! میں لیڈی سرجن کا بیٹا بول رہا ہوں۔ تمہیں غلط اطلاع دی جا رہی ہے کہ میں کالیا کو وہاں سے لے آیا ہوں۔"

چیخ کر بولنے کے باعث دھاون نے میری بات سنی پھر مجھ سے پوچھا۔ "تم لیڈی سرجن کے بیٹے فرمان ہو؟"

"ہاں فرمان ہوں۔ اگر کالیا کو اغوا کرتا تو پھر چیلنج بھی کرتا کہ میری امی کو کوئی نقصان پہنچے گا تو کالیا کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"جب کالیا مر جائے گا تو پھر تمہاری ماں ہمارے لئے بے کار ہو گی ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"میں جانتا ہوں۔ اسی لئے میں نے کالیا کو اغوا نہیں کیا ہے۔"

"جسٹ اے منٹ۔ میں ابھی پھر بات کروں گا۔"

اس نے دوسرے فون پر کہا۔ "کیا تم سن رہے ہو پربھاکر؟ دوسرے فون پر لیڈی سرجن کا بیٹا بول رہا ہے' اس نے کالیا کو اغوا نہیں کیا ہے۔"

وہ خاموش ہو کر کچھ سننے کے بعد گرج کر بولا۔ "کیا بکواس کر رہے ہو۔ ہمارے "را" کا کوئی افسر آیا تھا اور کالیا کو ایک ایمبولینس میں لے گیا تھا اور اب اس نے فون پر

تمہیں اطلاع دی ہے کہ وہ "را" کا کوئی افسر نہیں تھا اور وہ مجھ سے بات کرنے والا ہے کہ وہ کالیا کو کیوں لے جا رہا ہے؟ تم لوگوں نے اسے پہچاننے میں غلطی کیسے کی؟ وہ اور کیا کہہ رہا تھا؟"

وہ دوسری طرف کی بات سن کر بولا۔ "تعجب ہے اس کا بیٹا اسے نہ لے جا سکا اور وہ لے جانے والا کہہ رہا ہے کہ جب تک ڈاکٹر آمنہ کو زندہ سلامت رکھا جائے گا' تب تک کالیا بھی زندہ رہے گا اور اس کا علاج بھی کیا جاتا رہے گا۔ آخر وہ کون ہے؟"

اس نے دوسری طرف کی باتیں سن کر ریسیور کو فون کے کریڈل پر پٹخ دیا پھر مجھ سے فون پر کہا۔ "تم لوگ بہت چالاک ہو۔ کیا ہم سے ڈبل گیم کھیل رہے ہو؟ تم نے خود کالیا کو اغوا نہیں کیا ہے۔ کسی دوسرے سے یہ کام کروایا ہے"

میں نے کہا۔ "میں اتنا نادان نہیں ہوں۔ اتنا موٹی عقل سے بھی سمجھ سکتا ہوں کہ کالیا کو زندہ سلامت رکھنے ہی میں میری امی کی سلامتی ہے۔"

"ہاں۔ وہ سلامت رہے گا تو تمہاری ماں بھی سلامت رہے گی۔ میں ابھی معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے؟"

اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے بھی موبائل کو آف کیا۔ پوجا نے پوچھا۔ "کیا وہ دھمکیاں دے رہا تھا؟"

"نہیں۔ معاملہ بگڑ گیا ہے۔ کسی نے کالیا کو اغوا کر لیا ہے۔"

میں فون پر ہونے والی تمام باتیں اسے بتانے لگا۔ وہ حیرانی اور پریشانی سے بولی۔ "کالیا کو کون لے جا سکتا ہے؟ وہ لے جانے والا ان سے یہ کہہ رہا تھا کہ تمہاری امی سلامت رہیں گی تو کالیا بھی زندہ سلامت رہے گا۔ وہ تمہاری امی کی سلامتی چاہنے والا یقیناً دوست ہو سکتا ہے۔ تمہاری امی سے عقیدت رکھنے والا کوئی ہو گا۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے کھیتوں سے گزر رہے تھے۔ دوسری طرف سے ایک نیا کھیل شروع ہو چکا تھا' اس کا علم ہمیں نہیں تھا۔ بعد میں جو کچھ معلوم ہوا' اسے میں بیان کر رہا ہوں۔

تابانی میری امی کو اغوا کر کے لے گیا تھا۔ ڈائریکٹر جنرل دھاون نے اسے کہا تھا کہ میری امی کو ہیڈ کوارٹر میں لے آئے۔ تابانی نے یہی کیا تھا۔ دھاون نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ "شاباش! تم نے ہماری ضرورت کے مطابق ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اب شمشیر سنگھ کالیا کا آپریشن ضرور کامیاب ہو گا۔ وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے میں کمال دکھاتی ہے۔ عالمی شہرت رکھنے والے تمام ڈاکٹر اس کی سرجیکل صلاحیتوں کو تسلیم

کرتے ہیں۔"

تابانی نے کہا۔ "لیکن سر! آپریشن میں تو کئی دن لگ جائیں گے۔"

"ہاں وقفے وقفے سے دو یا تین آپریشن ہوں گے تو اس کے گھٹنے کی ہڈیاں جڑ جائیں گی۔ پہلے کی طرح وہ چل پھر سکے گا۔"

"دو یا تین آپریشن کا مطلب ہے کہ ایک مہینہ لگ سکتا ہے؟"

"ایک مہینہ نہیں' دو چار مہینے لگ سکتے ہیں۔"

تابانی نے چیخ کر کہا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اتنے دنوں میں تو میرے مراد کو پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا۔"

"فکر نہ کرو۔ وہاں ہمارے آدمی مراد کو جیل سے نکال لانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔"

"وہ کوششوں میں ناکام ہو سکتے ہیں لیکن ڈاکٹر آمنہ پاکستان کی اتنی بڑی شخصیت ہے کہ حکومت پاکستان مراد کو ہمارے حوالے کر کے ڈاکٹر آمنہ کو واپس لینا چاہے گی۔ آپ نے فون پر مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ڈاکٹر آمنہ کو لے آؤں گا تو اس کا مراد سے تبادلہ کیا جائے گا۔"

"میں فون پر ایسا نہ کہتا تو تم ڈاکٹر آمنہ کو اغوا کرنے کا اتنا بڑا کارنامہ کبھی نہ کرتے۔ تم صرف اپنے ہونے والے بچے کے باپ کو رہائی دلانا چاہتے ہو لیکن "را" تنظیم میں شروع سے ہی ذہن نشین کرا دیا جاتا ہے کہ تنظیم کے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے اپنے پیاروں کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔"

"میں جانتا ہوں۔ کالیا ہماری تنظیم کے لئے بڑے اہم کام کرتا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں' اگر ڈاکٹر آمنہ سے مراد کا تبادلہ کریں گے تو میں اور مراد اس کالیے سے بھی زیادہ کارنامے انجام دیں گے۔"

"جب تم پیدا نہیں ہوئے تھے' تب سے کالیا ہماری تنظیم کا وفادار ہے۔ تم اور مراد کارنامے انجام دو گے تو وہ تمہاری وفاداریاں ہوں گی لیکن اس کے بدلے کالیا کی وفاداریوں کو نہیں بھلایا جا سکتا۔ اس کا کامیاب آپریشن صرف لیڈی سرجن آمنہ کر سکتی ہے۔ اسی لئے ہم نے تمہارے ذریعے اسے اغوا کرایا ہے۔"

"یعنی مجھے دھوکا دیا گیا ہے میرے مراد کو وہاں سزائے موت پانے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے؟"

"مجھ سے بحث نہ کرو۔ تم جانتے ہو کہ میں ایک ہی تمہارا راز دار ہوں۔ میں نے

آج تک کسی کو نہیں بتایا ہے کہ تم عورت بن چکے ہو لیکن یہ راز کب تک رہے گا۔ تمہارا پیٹ پھولے گا تو بھید کھل جائے گا۔"

"میں کہیں دور کسی پہاڑی علاقے میں جاؤں گی پھر زچگی ہونے کے بعد واپس آؤں گی۔ مگر پلیز آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ بس میرا یہ کام کردیں۔ میرے مراد کو یہاں زندہ آنے دیں۔"

"ہم حکومت پاکستان سے سودا کریں گے کہ وہ ڈاکٹر آمنہ کو زندہ سلامت چاہتے ہیں تو مراد کو سزائے موت نہ دیں۔ اسے جیل کی اے کلاس میں رکھیں۔ ہم تین یا چار ماہ کے بعد ڈاکٹر آمنہ سے مراد کا تبادلہ کریں گے۔"

تابانی اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ اسے منظور نہیں تھا کہ اس کا مراد تین چار ماہ تک اس سے دور رہے لیکن اس نے ڈی جی جمنا پرساد دھاون سے بحث نہیں کی۔ بڑے صبرو تحمل سے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ آپ میری زچگی ہونے تک مجھے چھٹی پر جانے دیں۔ مجھے امید ہے آپ جلد سے جلد کالیا کا آپریشن کرا کے ڈاکٹر آمنہ کو فارغ کردیں گے۔"

"ضرور یہی کروں گا۔ تم چھٹی پر جاسکتے ہو۔"

تابانی اس کیمپ کے ایک کوارٹر میں آرام کرنے کے لئے آگیا۔ اس رات کیمپ کے کلب میں وہ گیا۔ وہاں ناچ گانا ہو رہا تھا۔ ایک ایڈیشنل ڈائریکٹر شراب پی کر مست ہو رہا تھا۔ تابانی کو دیکھ کر بولا۔ "یار! یہاں آؤ۔ تم نے تو کمال ہی کردیا ہے۔"

تابانی اس کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا پیؤ گے؟"

تابانی نے کہا۔ "تم جانتے ہو۔ میں کبھی نہیں پیتا۔"

"مگر تمہارا دوست مراد پیتا تھا۔ یار! میں نے سنا ہے تم مراد کو رہائی دلانے اور بھارت میں لانے کے لئے اتنی بڑی ڈاکٹر کو اغوا کر کے لائے ہو۔ میں نے ڈاکٹر آمنہ کو دیکھا ہے۔ بے چاری کی موت اسے یہاں لے آئی ہے۔"

تابانی نے کہا۔ "زیادہ نہ پیا کرو۔ فضول بکواس کرتے رہتے ہو۔"

"میں نشے میں نہیں ہوں۔ عقل کی بات کرتا ہوں۔ ڈاکٹر آمنہ عالمی شہرت رکھتی ہے کیا بھارتی حکومت اتنی بڑی شخصیت کو اغوا کرنے کا الزام اپنے سر لے گی؟ کبھی نہیں تم دیکھ لینا۔ کالیا کا آپریشن کامیاب ہونے کے بعد ڈاکٹر آمنہ کو ختم کردیا جائے گا اور اس کی لاش غائب کردی جائے گی۔"

تابانی اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے دماغ میں آندھی سی چلنے لگی۔ وہ اس پہلو کو بھول گیا تھا کہ عالمی شہرت رکھنے والی کسی بھی ہستی کو اغوا کرانے والی کوئی بھی حکومت

تسلیم نہیں کرتی کہ یہ جرم اس نے کیا ہے۔ الزام سے بچنے کے لئے اغوا کی ہوئی ہستی کو رازداری سے قتل کردیا جاتا ہے۔

اس رات تابانی کی نیند اُڑ گئی۔ دوسرے دن اس نے معلوم کیا کہ کالیا کو کس اسپتال میں رکھا گیا ہے۔ پتا چلا' دہلی کے کسی بھی اسپتال میں اس کا آپریشن ہوگا تو پاکستانی جاسوس اسی طرف آئیں گے کیونکہ آمنہ کو پنجاب کی ایک سرحد پار کرا کے لایا گیا تھا۔ وہاں سے دہلی قریب تھا پھر یہ سب جانتے تھے کہ "را" کا ہیڈ کوارٹر دہلی میں ہے۔ اگر پاکستانی جاسوس آمنہ کو واپس نہ لاسکے تو کالیا کو مار ڈالیں گے۔

کالیا کی حفاظت کی خاطر اسے راجستھان کے ایک چھوٹے سے ٹاؤن پشکر میں پہنچا دیا گیا ہے۔ جب آپریشن کا تمام ضروری سامان اور ماتحت ڈاکٹر وغیرہ وہاں پہنچ جائیں گے تو ڈاکٹر آمنہ کو بھی وہاں سخت نگرانی میں پہنچا دیا جائے گا۔

تابانی ڈاکٹر آمنہ سے ملنے کے لئے "را" کے ایک خفیہ قید خانے میں گیا۔ لیڈی سرجن کو بڑے آرام سے رکھا گیا تھا۔ آمنہ نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ "تابانی! کیسے ہو؟ کچھ اجڑے ہوئے سے نظر آرہے ہو۔ اپنے ہونے والے بچے کی خاطر اپنی صحت کا خیال کرو۔ میں نے پاکستان میں تمہیں ضروری دوائیں لکھ کر دی تھیں۔ انہیں ضرور استعمال کیا کرو۔"

تابانی نے سر جھکا کر کہا۔ "میں نے آپ پر ظلم کیا ہے اور آپ میری اور میرے بچے کی بھلائی کی باتیں کررہی ہیں۔"

"تمہارا جو کام تھا' تم نے کیا۔ میرا جو کام ہے' میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے وہی کر رہی ہوں۔"

"آپ نے قانون کی مخالفت مول لے کر میرے مراد کا بار بار آپریشن کیا اور اسے چلنے پھرنے کے قابل بنا دیا۔ میں آپ کو جبراً یہاں لے آئی۔ آپ کو مجھ سے نفرت نہیں ہورہی ہے؟"

"نفرت کیوں ہوگی؟ مجھے یہاں لائے ہو۔ مراد سے میرا تبادلہ کرو گے۔ تمہارا مراد تمہیں مل جائے گا۔ میں واپس اپنے پاکستان پہنچ جاؤں گی لیکن میں حکومت پاکستان سے کہوں گی کہ مراد کو جلد بھیج دیں۔ مجھے چھ سات ماہ بعد بلائیں۔ میں تمہاری زچگی تک تمہیں اپنی نگرانی میں رکھوں گی۔ تم نہیں جانتے۔ جنس تبدیل ہونے کے باعث زچگی سے پہلے کیسے پرابلمز پیدا ہوں گے۔ میں رہوں گی تو انشاء اللہ تمہیں اور بچے کو ہر حال میں بچاؤں گی۔"

تابانی نے ایک دم سے چیخ کر کہا۔ "بس کریں' آپ کیسی عورت ہیں۔ کس مٹی سے بنی ہوئی ہیں۔"

"پاکستان کی مٹی سے............"

وہ ایک دم سے پلٹ کر دوڑتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔ اس کا بس چلتا تو ڈاکٹر آمنہ کو وہاں سے لے آتا مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اس فرض شناس ڈاکٹر کو "را" کی کسٹڈی میں دیا تھا۔ اس کے اطراف اتنا سخت پہرا تھا کہ وہ اسے وہاں سے نکال کر واپس پاکستان نہیں پہنچا سکتا تھا۔

وہ ہیڈ کوارٹر کے ایک ایک شعبے سے واقف تھا۔ وہ اسی دن ایسے شعبے میں گیا جہاں سے "را" کے کارکنوں اور افسروں کے شناختی کارڈ جاری کئے جاتے تھے۔ وہاں اس نے ہاتھ کی صفائی دکھائی۔ ایک آئی ڈی کارڈ میں اپنی تصویر چسپاں کرکے وہاں کی خاص مہر لگائی۔ ڈائریکٹر جنرل جمنا پرساد دھاون کے دستخط کی نقل کی۔ اس طرح وہ اس آئی ڈی کارڈ کے ذریعے ایک ایڈیشنل ڈائریکٹر بن گیا۔

اسی رات وہ ایک فلائٹ سے راجستھان کے ایک شہر جے پور پہنچا۔ وہاں کے ایک اسپتال کے انچارج کو اپنا کارڈ دکھا کر مرعوب کیا۔ ایک ڈاکٹر اور دو وارڈ بوائز کے علاوہ ایک ایمبولینس حاصل کی پھر وہاں سے پشکر پہنچ گیا۔ وہاں "را" کے ٹریننگ سینٹر کے تمام افسران اسے ایڈیشنل ڈائریکٹر سمجھ کر اس کے احکامات کی تعمیل کرنے لگے۔ اس وقت تک اعظم بیگ کی جاسوسی کے باعث یہ معلوم ہو چکا تھا کہ لیڈی سرجن آمنہ کا بیٹا فرمان وہاں پہنچا ہوا ہے۔

وہاں کے سینٹر کے افسروں نے یہ بات تابانی کو بتائی۔ اس نے کہا۔ "ہم خفیہ ذرائع سے پہلے معلوم کر چکے ہیں۔ اس لئے میں ایمبولینس لایا ہوں۔ کالیا کو اس میں آرام سے لٹا دو۔ اسے ایک بہت ہی خفیہ مقام پر پہنچایا جائے گا۔"

اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ اس طرح وہ کالیا کو لے کر وہاں سے جانے لگا۔ اس کے ساتھ آنے والے ڈاکٹر نے راستے میں پوچھا۔ "آپ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں۔ یہ راستہ جے پور نہیں منڈوا شہر جاتا ہے۔"

تابانی نے ایمبولینس کو روک کر ڈاکٹر اور دونوں وارڈ بوائز کو ریوالور دکھا کر کہا۔ "گاڑی سے باہر آؤ۔ کم آن۔"

وہ ریوالور دیکھ کر سہم گئے تھے۔ فوراً باہر آئے۔ تابانی کے لئے خون خرابا اور دہشت گردی معمولی سی بات تھی۔ اس نے تینوں کو گولیاں مار کر ہلاک کیا پھر اسٹیئرنگ

سیٹ پر آگیا۔ اسٹریچر............ پر لیٹے ہوئے شمشیر سنگھ کالیا نے سر اٹھا کر پوچھا۔ "یہ فائرنگ کس نے کی تھی؟"

"میں نے ڈاکٹر اور وارڈ بوائز کو ختم کر دیا ہے مگر تمہیں زندہ رکھوں گا۔"

وہ گاڑی اسٹارٹ کرکے جانے لگا۔ کالیا نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟ تم نے انہیں ہلاک کیوں کیا ہے؟"

"وہ بے چارے بے گناہ تھے مگر تمہارے جیسے کتے کو اغوا کرنے کے لئے انہیں قتل کرنا پڑا۔"

"تم مجھے کتا کہہ رہے ہو۔ جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"جانتا ہوں اسی لئے کتا کہہ رہا ہوں۔ تم وہاں لیٹے ہی لیٹے بھونکتے رہو گے۔ مجھے کاٹنے کے لئے یہاں تک نہیں آسکو گے۔ تمہاری ایک ٹانگ کے گھٹنے پر پلاسٹر چڑھایا گیا ہے۔ تم چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے۔"

"اگر تم میرے دشمن ہو تو مجھے مار ڈالو۔ اس طرح کہاں لے جا رہے ہو؟"

"کچھ دشمن ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہلاک نہیں کیا جاتا۔ انہیں زندہ رکھ کر ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔"

"تم مجھ سے کیا فائدہ اٹھانا چاہتے ہو؟"

"جب میں پاکستان میں تھا تو لیڈی سرجن آمنہ نے کہا تھا کہ انہوں نے کبھی کسی انسان سے نفرت نہیں کی۔ صرف ایک شخص ایسا ہے جس نے ان کا گھر اجاڑ دیا۔ شوہر سے الگ کر دیا۔ انہیں گھر سے بے گھر کر دیا لیکن وہ دشمن کبھی مریض بن کر آئے گا تو وہ ایک ڈاکٹر کے فرائض پورے کرنے کے لئے اس سے بھی نفرت نہیں کریں گی۔ پوری دیانت داری سے اس کا علاج کریں گی۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھو۔ تم اس کے محتاج ہو گئے ہو۔ تمہارے گھٹنے کی ہڈیوں کو وہی ایک ڈاکٹر جوڑ کر تمہیں چلنے پھرنے کے قابل بنا سکتی ہے۔"

وہ بے بسی سے بولا۔ "ہاں میں اس کا محتاج ہو گیا ہوں مگر تم نہیں جانتے۔ ڈاکٹر آمنہ بہت چالباز ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کے ذریعے میرا یہ گھٹنا توڑ دیا۔ ہڈیاں چور چور کر دیں تاکہ میں علاج کے لئے اس کا محتاج بن جاؤں۔ میں نے "را" کے ڈی جی دھاون صاحب سے کہا تھا کہ مجھے اس ڈاکٹر آمنہ پر بھروسا نہیں ہے۔ وہ میری دشمن ہے مگر ڈی جی نے کہا ہے کہ وہ ناکام آپریشن کرے گی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر آپریشن کامیاب ہو۔ کبھی ناکامی بھی ہو سکتی ہے۔ اس

سے پہلے کہ ناکامی ہو' میں تمہیں اس سے دور لے جارہا ہوں۔"

"اس سے دور کہاں لے جارہے ہو؟ اسے پاکستان سے اغوا کرکے لایا گیا ہے۔ وہ میرا آپریشن کرے یا نہ کرے' زندہ واپس نہیں جائے گی۔"

"میں تمہیں یرغمال بنا کر رکھوں گا تو اسے ہلاک نہیں کیا جائے گا۔"

"اب سمجھا تم پاکستانی جاسوس ہو اس ڈاکٹر کو بچانے کے لئے مجھے اغوا کررہے ہو مگر کہاں لے جاؤ گے؟ تم "را" کے سراغرسانوں کو نہیں جانتے ہو۔ وہ صبح تک تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔"

""را" والے مجھے کیا ڈھونڈیں گے۔ میں تو خود "را" کا ایک دہشت گرد ہوں۔ جتنے ہتھکنڈے وہ جانتے ہیں' اتنے ہی میں بھی جانتا ہوں۔ گھر کا بھیدی ہوں۔ اچھا اب خاموش رہو۔ میں فون پر گفتگو کروں گا۔ اس دوران میں تمہارے منہ سے آواز نکلے گی تو میرے ریوالور سے گولی نکل پڑے گی۔"

اس نے موبائل فون کے ذریعے پشکر ٹریننگ سینٹر رابطہ کیا پھر ایک افسر سے کہا۔ "اپنے ڈی جی دھاون کو فون کرو۔ اس سے کہو' تمہارے سینٹر میں "را" کا ایک ایڈیشنل ڈائریکٹر آیا تھا۔ وہ کالیے کو ایمبولینس میں لے گیا ہے۔ کہاں لے گیا ہے' یہ تم میں سے کوئی نہیں جانتا اور تم لوگوں کے نہیں جاننے کا مطلب ہے کہ کالیے کو اغوا کیا گیا ہے۔"

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ "تم کون ہو؟ اور یہ کیسے کہہ سکتے ہو ہمارا ہی ایک بڑا افسر کالیا صاحب کو اغوا کرے گا؟"

"وہ بڑا افسر میں ہی ہوں۔ دھاون صاحب سے بولو۔ جب تک لیڈی ڈاکٹر آمنہ زندہ سلامت رہے گی تب تک کالیا بھی زندہ سلامت رہے گا اور اس کا علاج ہوتا رہے گا۔ میں اپنے ایک اڈے پر پہنچنے کے بعد دھاون صاحب سے بات کروں گا۔"

اس نے فون بند کردیا۔

میں ایسے ہی وقت ڈی جی دھاون سے فون کے ذریعے بات کررہا تھا۔ تب اسے اطلاع ملی کہ کسی نے "را" کا افسر بن کر کالیا کو اغوا کیا ہے۔ وہ اپنے کسی خاص اڈے پر پہنچ کر دھاون سے رابطہ کرے گا۔

ڈائریکٹر جنرل جمنا پرساد دھاون کی نیند اُڑ گئی تھی۔ گھوڑا اگر لنگڑا ہوجائے' دوڑنے کے قابل نہ رہے تو اسے گولی مار دی جاتی ہے۔ کالیا جیسے لنگڑے کو بھی گولی ماری جاسکتی تھی۔ اس کے جیسے بے شمار کالیا "را" میں تھے ایک کو گولی مارنے کے بعد اس کی کمی محسوس نہ کی جاتی۔

لیکن "را" تنظیم کو کالیا نے بڑی چالاکی سے جکڑ رکھا تھا۔ اس کے بہت سے اہم راز تحریری دستاویزات اور ویڈیو کی صورت میں کالیا کے پاس تھے۔ اس نے وہ تمام راز اپنی بیٹی شلپا کو دے کر کہا تھا کہ وہ رُوپوش ہوجائے۔ "را" والوں کو جب تک وہ اہم راز نہیں ملیں گے' وہ کالیا کو نہ ماریں گے اور نہ مرنے دیں گے۔ اس کا باقاعدہ علاج کرائیں گے۔

اور یہی ہورہا تھا۔ بیٹی تمام رازوں کے ساتھ رُوپوش رہ کر باپ کی جان بچا رہی تھی۔ ڈی جی دھاون یہ سوچ کر پریشان ہورہا تھا کہ کالیا کو اغوا کرنے والے نے اگر اسے مار ڈالا تو اس کی بیٹی انتقام لینے کے لئے "را" کے خلاف محاذ بنا لے گی۔ وہ لوگ خفیہ طور پر شلپا کو بھی تلاش کررہے تھے اور یہ جانتے تھے کہ وہ اپنے باپ سے بھی زیادہ مکار ہے۔ اسے ڈھونڈنے اور مار ڈالنے تک وہ تمام رازوں کو ساری دنیا کے سامنے لانے کے انتظامات کرچکی ہوگی۔ بھارت کے ایٹمی پلانٹ اور ایٹمی سی قوت بننے کی بہت پلاننگ پڑوسی ملکوں.......... اور پورے ایشیا پر ظاہر ہوسکتی تھی۔

ڈی جی دھاون نے اتنی رات کے وقت تین ایڈیشنل ڈائریکٹرز کو بلا کر پوچھا۔ "آپ تینوں یہاں ہیں تو پشکر میں کون ایڈیشنل ڈائریکٹر بن کر گیا ہے۔ وہاں کے افسران کہہ رہے ہیں کہ اس نے آئی ڈی کارڈ کے ذریعے اپنے ایڈیشنل ڈائریکٹر ہونے کا ثبوت پیش کیا تھا۔ ہمارے پرنٹڈ کارڈ اور خاص مہر اسے کیسے مل گئی؟"

اس کے کسی سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ دھاون نے کہا۔ "آپ لوگ کلب میں بہت زیادہ پیتے ہیں کسی نے آپ کی مدہوشی سے فائدہ اٹھا کر آپ کی جیب سے کارڈ نکال کر کیمرے سے اس کارڈ کی تصویر لی ہے۔ چرایا ہوا کارڈ واپس آپ کی جیب میں رکھ دیا۔ پھر کیمرے سے لی ہوئی تصویر کے مطابق اپنے لئے ویسا ہی ایک کارڈ بنالیا ہوگا۔ وہ زبردست نقال ہے۔ اس نے میرے دستخط کی بھی نقل کی ہوگی۔ ہمارے اندر کوئی ایسا غدار ہے جس نے ہماری خاص مہر اس کارڈ پر لگائی ہے۔"

صبح تک وہ اس معاملے پر سرکھپاتے رہے پھر فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ڈی جی دھاون نے ریسیور اٹھا کر پوچھا۔ "ہیلو کون ہے؟"

تابانی کی آواز سنائی دی۔ "سر میں ہوں شنکر داس۔"

"شنکر! پھر کسی وقت بات کرنا۔ ابھی میں بہت پریشان ہوں۔"

"میں نے آپ کی پریشانی دور کرنے کے لئے ہی فون کیا ہے۔ آپ کالیا کے لئے پریشان ہیں نا؟"

وہ جلدی سے بولا۔ "ہاں......... ہاں۔ تم نے اس کے بارے میں کچھ معلوم کیا ہے؟"

"سر! معلوم کیا کرنا ہے؟ وہ تو میرے پاس ہے۔"

"کیا؟ وہ............ وہ تمہارے پاس ہے؟ کہاں ہے؟"

"جہاں بھی ہے۔ خیریت سے ہے اور اس وقت تک خیریت سے رہے گا جب تک آپ لیڈی سرجن آمنہ کو پاکستان واپس نہیں بھیج دیں گے۔"

"کیا تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ تم ہمارے ہوکر ہم سے دھوکا کررہے ہو؟"

"دھوکا پہلے آپ نے دیا ہے۔ میں نے اپنے مراد کو یہاں لانے کے لئے اس نیک اور عظیم خاتون کو اغوا کیا تھا۔ آپ نے ہیلی کوپٹر بھیج کر میری مدد کی تھی۔ یہاں پہنچتے ہی آپ نے کالیا کو بڑی اہمیت دی اور مراد کے سزائے موت پانے کی پروا نہیں کی۔"

"میں نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ ہمارے آدمی مراد کو پاکستانی جیل سے نکال لائیں گے۔ کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟"

"بھروسا تھا۔ اب نہیں رہا۔ آپ کالیا کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ڈاکٹر آمنہ سے مراد کا تبادلہ کریں۔"

"دیکھو عقل سے کام لو۔ اگر ہم نے اس طرح تبادلہ کیا تو ساری دنیا میں بھارت کی رسوائی ہوگی کہ ہم نے اتنی عظیم ہستی کو پاکستان سے اغوا کرایا تھا۔"

"تو پھر یہ بات دنیا والوں سے چھپانے کے لیے ڈاکٹر آمنہ سے کام لینے کے بعد اسے مار ڈالنا ہوگا۔ کسی کو خبر نہیں ہوگی کہ اسے یہاں لایا گیا تھا۔"

"دانش مندی یہی ہے۔"

"میں آپ کی طرح دانش مند نہیں ہوں۔ چوبیں گھنٹے کے اندر ڈاکٹر آمنہ کو پاکستان پہنچاؤ۔"

"کیا تم نے آمنہ آمنہ کی رٹ لگا رکھی ہے۔ کیا وہ تمہاری کوئی سگی لگتی ہے؟"

"ہاں۔ سگی سے بھی زیادہ سگی۔ بھگوان کی سوگند وہ میری ماں ہے اس ماں کے لئے میں مراد کا بھی مطالبہ نہیں کروں گا۔ میری کوکھ کے بچے نے مجھ سے کہا ہے کہ میں اس ننھے کے ساتھ جان دیتے دیتے بھی اس ماں کو پاکستان پہنچا دوں۔ سر! پہلے میں دہشت گرد تھا پھر محبوبہ بنا اور ماں بننے والا ہوں لیکن اب بارود بن گیا ہوں۔"

ڈائریکٹر جنرل جمنا پرساد دھاون ریسیور کان سے لگائے' حیرانی سے دیدے پھیلائے تابانی کی باتیں سن رہا تھا۔ حیرانی اس بات پر تھی کہ تابانی کا مزاج بدل گیا تھا۔ پہلے وہ اپنے

مراد کو رہائی دلانے کے لئے جنون میں مبتلا ہو کر ڈاکٹر آمنہ کو اغوا کرکے بھارت لے آیا تھا۔

ڈاکٹر آمنہ کی اس پر بڑی مہربانیاں تھیں اس نے اس کے محبوب مراد کے نہایت مشکل آپریشن کرکے اسے چلنے پھرنے کے قابل بنایا تھا پھر تابانی کو قید سے رہائی دلانے کے انتظامات کئے تھے اور تابانی کو قانون کی نظروں سے چھپا کر رکھا تھا۔ یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ مراد کو جیل سے نکال کر اس کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔

لیکن تابانی اپنے مراد کے لئے جنون میں مبتلا ہوگیا تھا۔ جس ڈاکٹر آمنہ نے اس کا ساتھ دیا اسی کو اغوا کرکے بھارت لے آیا تاکہ حکومتِ پاکستان ڈاکٹر آمنہ جیسی عالمی شہرت رکھنے والی ہستی کو واپس لانے کے لئے مراد کو رہا کرکے بھارت بھیج دے۔

تابانی کو ڈاکٹر آمنہ سے کوئی دشمنی نہیں تھی بلکہ وہ اس کا احسان مند تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ بھارتی حکومت ڈاکٹر آمنہ جیسی مشہور و معروف ہستی کو اغوا کرانے کا الزام اپنے سر نہیں لے گی اور کالیا کا کامیاب آپریشن کرنے کے بعد ڈاکٹر آمنہ کو ہلاک کردیا جائے گا' تب تابانی کو اپنی غلطی کا پتا چلا۔ "را" کے ڈی جی دھاون کے جھوٹ اور فریب کا بھی پتا چلا۔ اس نے جھوٹا وعدہ کیا تھا کہ ڈاکٹر آمنہ سے مراد کا تبادلہ کیا جائے گا۔

ان حقائق کا علم ہونے پر تابانی کی کھوپڑی گھوم گئی۔ وہ بڑے سے بڑا جرم کرسکتا تھا لیکن اپنی محسنہ کی ہلاکت نہیں چاہتا تھا۔ وہ قید خانے میں آمنہ سے ملنے گیا تو اس کا ممتا بھرا رویہ دیکھ کر اور شرمندہ ہوا۔ تب اس نے شمشیر سنگھ کالیا کو اغوا کرنے کا بہت ہی خطرناک قدم اٹھایا۔ وہ جانتا تھا کہ "را" کے سراغ رساں اسے بھارت کے کسی علاقے میں چھپنے نہیں دیں گے۔ کتوں کی طرح اس کی بُو سونگھتے ہوئے اس کی شہ رگ تک پہنچ جائیں گے۔ اس کے باوجود اس نے کالیا کو پشکر ٹریننگ سینٹر سے اغوا کیا اور اب فون کے ذریعے ڈی جی دھاون کو چیلنج کر رہا تھا کہ جب تک ڈاکٹر آمنہ سلامت رہے گی' کالیا کو بھی زندہ سلامت رکھا جائے گا۔

ڈی جی دھاون فون پر اس کا چیلنج سن کر اس لئے بھی حیران تھا۔۔۔ سے فرار ہوا تھا اور
تبدیل ہونے کے بعد بھی عورت ہو کر خود کو عورت نہیں کہتا تھا۔۔۔ سے گزر رہا تھا۔ پوجانے
زندگی گزارتا رہا' وہ پہلی بار عورت کی طرح آمنہ کے بارے ۔۔۔ کے آس پاس ہمیں ڈھونڈنے
سے بھی زیادہ سگی ہے۔ بھگوان کی سوگند وہ میری ماں ہے ۔۔۔ ہوئے گئے ہیں اس لئے ہم پشکر کی
ایسا کہہ کر وہ پہلی بار بے اختیار ایک ماں کی عظ
"اس ماں کے لئے میں مراد کا بھی مطالبہ نہیں کروں ۔۔۔ والے یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہم

کہا ہے کہ میں اس ننھے کے ساتھ جان کی بازی لگاتے ہوئے بھی اس ماں کو پاکستان پہنچاؤں۔"

وہ پھر عورت کی طرح بولا۔ "سر! یو آر نو مور سر۔ پہلے میں دہشت گرد تھی پھر محبوبہ بنی پھر ماں بننے لگی لیکن اب بارود بن گئی ہوں۔"

ڈی جی دھاون کی سمجھ میں آگیا کہ وہ مرد بن کر رہنے والی اب ڈاکٹر آمنہ کی ایسی عقیدت مند بن گئی ہے کہ ذہنی اور نفسیاتی طور پر خود ماں بن کر فخر کر رہی ہے اور اب عورت کی طرح بولنے لگی ہے۔ شاید آئندہ بھی ایک ماں' ایک عورت بن کر فخر کرتی رہے گی۔

ڈی جی دھاون نے کہا۔ "جسٹ اے منٹ شنکر داس!"

وہ بولی۔ "مجھے شنکر داس نہیں' تابانی کہو۔ میرا مراد مجھے اسی نام سے پکارتا ہے۔ اپنے محبوب کی زبان پر جو نام آئے' وہ سب سے قابلِ فخر نام ہوتا ہے۔"

"آل رائٹ۔ میں تمہیں تابانی کہہ رہا ہوں۔ تم شاید جوش میں آکر یہ بھول رہے ہو کہ خود کو ہمیشہ مرد کہتے تھے لیکن اب ایک عورت کی طرح بول رہے ہو۔"

"بول رہے ہو نہیں' بول رہی ہوں۔ جوش میں نہیں' ہوش میں رہ کر بول رہی ہوں۔ اپنی ماں آمنہ کی عظمت کو دیکھ کر سمجھ گئی ہوں کہ صرف مرد ہی نہیں' عورت بھی عظیم ہوتی ہے اور مجھے عورت بننے پر شرمانا نہیں فخر کرنا چاہیے۔"

"میں تمہارے بدلتے ہوئے احساسات اور جذبات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ تم ڈاکٹر آمنہ کی احسان مند ہو۔ کیا میرے احسانات کو بھول گئی ہو؟ تمہیں اپنی "را" تنظیم میں لانے والا میں ہوں۔ تمہاری تبدیلی جنس کا صرف ایک میں رازدار تھا۔ میں ہر آڑے وقت میں تمہارے کام آتا رہا ہوں۔ اب تم تمام احسانات کو بھول کر مجھے مشکلات میں پھنسا رہی ہو۔ کالیا کو کچھ ہوگیا.......... یا وہ کسی طرح مرگیا.......... تو اس کی بیٹی شلپا ہمارے لئے بڑے مسائل پیدا کردے گی۔ اس کے پاس ایسے راز ہیں' جنہیں کبھی ظاہر

لیکن کالیا علاج کے بغیر مرے گا تو شلپا انتقاماً ہمارے خلاف بہت کچھ کرے

"ہاں۔ سلی

میں مراد کا بھی مطالبہ

کالیا سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ میں اس کا علاج کراتی

ننھے کے ساتھ جان دیتے دے

تھا پھر محبوبہ بنا اور ماں بننے والا ہو

یشن بھی بہت ضروری ہے۔"

ڈائریکٹر جنرل جمنا پرساد دھا

میری ماں کو رہا کردیں۔"

تابانی کی باتیں سن رہا تھا۔ حیرانی اس

"یہ اتنا مشکل آپریشن ہے کہ صرف ڈاکٹر آمنہ کرسکتی ہے۔"

"آپ انہیں رہا کردیں گے تو وہی آپریشن کریں گی۔"

"کہاں کریں گی۔ ہمارے دیس کے کس شہر کے کس اسپتال میں تم علاج کرواؤگی؟"

"بھارت دیس میں جہاں بھی کراؤں گی وہاں مجھے بھی گرفتار کرلیا جائے گا اور میری ماں کو بھی کامیاب آپریشن کے بعد ہلاک کردیا جائے گا۔ ہمارے دیس کے باہر میری ماں جس ملک میں جانا اور آپریشن کرنا پسند کریں گی' وہیں کالیا کا علاج ہوگا۔"

"کیا تم اپنے دیس کو بدنام کرنا چاہتی ہو کہ ہم نے ڈاکٹر آمنہ کو اغوا کرایا تھا؟"

"میں اپنے دیس کی بدنامی نہیں چاہتی۔ میری ماں بھی آپ کے خلاف کبھی بیان نہیں دیں گی۔"

"تابانی! حقیقت کو سمجھو۔ وہ ہمارے دیس میں پوری طرح پابند رہ کر ہمارے احکامات کی تعمیل کرکے کالیا کو چلنے پھرنے کے قابل بنادے گی۔"

"انہیں کسی طرح کی پابندی میں نہیں رکھا جائے گا۔ وہ خود ہی ایک فرض شناس ڈاکٹر ہیں۔ دشمنوں کا علاج کرتے وقت بھی فرض کے تقاضے پورے کرتی ہیں۔"

"تم بہت ضدی ہو۔ اس ڈاکٹر کا جادو تمہارے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں ابھی ڈاکٹر آمنہ سے بیرون ملک جاکر آپریشن کرنے کا معاملہ طے کرتا ہوں۔"

"پہلے آپ ان سے معاملہ طے کریں پھر میں ان سے فون پر بات کروں گی۔ مجھے بتائیں میں کتنی دیر بعد آپ کے موبائل فون پر رابطہ کروں؟"

"چالیس منٹ کے بعد۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ تابانی نے کالیا کو جہاں چھپایا تھا' وہاں سے تقریباً پندرہ کلومیٹر دور آکر فون کے ذریعے ڈی جی دھاون سے باتیں کرتی رہی تھی تاکہ "را" کے سراغ رساں کسی طرح سراغ لگا کر اس کا محاصرہ کریں تو صرف اسے گرفتار کرسکیں۔ کالیا تک نہ پہنچ سکیں۔

وہ ایسا وقت تھا' جب میں پوجا کے ساتھ پشکر کے مویشی میلے سے فرار ہوا تھا اور کئی کلومیٹر دور جاکر فوجی ٹرک سے اتر کر مین روڈ چھوڑ کر کھیتوں سے گزر رہا تھا۔ پوجا نے کہا تھا۔ "ہمارے تعاقب میں آنے والے اس خالی ٹرک کے آس پاس ہمیں ڈھونڈنے کے بعد یہی سمجھیں گے کہ ہم آگے کہیں بھاگتے ہوئے گئے ہیں اس لئے ہم پشکر کی طرف واپس جائیں گے۔"

اس کا آئیڈیا اچھا تھا۔ تعاقب میں آنے والے یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہم

جہاں سے فرار ہوئے ہیں' اسی طرف واپس گئے ہیں لیکن ہم واپس پشکر نہیں گئے۔ چند کلومیٹر تک کھیتوں کے درمیان سے گزرنے کے بعد ہم نے راستہ بدل دیا۔ وہ علاقہ ہمارے لئے انجانا تھا۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ ہم کس سمت جارہے ہیں۔ راستے میں کوئی شہر یا گاؤں آتا تو وہاں معلوم کیا جاسکتا تھا کہ ہم کہاں پہنچے ہوئے ہیں۔

آخر ہم ایک بستی کے قریب پہنچے۔ اس وقت شاید رات کے دو بج گئے تھے۔ اس گاؤں کے تمام گھروں کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ وہاں غریبوں کی جھونپڑیاں اور مٹی کے کچے مکانات تھے۔ ان گھروں میں دھن دولت نہیں تھی اس لئے وہ اپنے تاریک مکانوں میں بے فکری سے سو رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "یہاں اتنا سناٹا ہے کہ ہم ایک دروازے پر دستک دیں گے تو اردگرد دس گھروں تک آواز جائے گی۔ پورا گاؤں جاگ کر باہر آجائے گا۔"

پوجا نے کہا۔ "سارے گاؤں میں معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم دونوں یہاں آئے تھے۔ پھر یہاں سے کچھ کھا پی کر فلاں سمت گئے ہیں۔ ہمارا تعاقب کرنے والے ادھر آکر ان سے بہت کچھ معلوم کرسکتے ہیں۔"

"کیا تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟"

"نہیں۔ میں بھوک پیاس برداشت کرسکتی ہوں۔ ہمیں یہاں رکنا نہیں چاہیے۔ یہاں سے جتنی دور جائیں گے' ہمارے لئے بہتر ہوگا۔"

گاؤں کے اطراف دھان کے خوشے اور خشک گھاس کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ہم ایک کھلیان کے پاس گزرنے لگے تو کچھ ایسی دھیمی سی آوازیں سنائی دیں جیسے دو افراد خشک گھاس میں چھپے ہوئے سرگوشیاں کررہے ہوں۔

"بہت دیر ہوگئی۔ اب مجھے جانے دو۔"

ایک مرد کی آواز سنائی دی۔ "میں نہیں جانتا کتنی دیر ہوئی ہے۔ میرا تو دل بھرا نہیں ہے۔"

پوجا نے جھجکتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے اسے دیکھا تو اس کی نظریں جھک گئیں۔ عورت کی آواز سنائی دی۔ "تمہارا دل تو کبھی نہیں بھرے گا۔ تم بڑے وہ ہو۔"

اس کے ساتھ ہی سوکھی گھاس میں ہلچل سی پیدا ہونے لگی۔ وہ پہلے ہی گھاس میں چھپے ہوئے تھے۔ ان کے اوپر اور گھاس گرنے لگی۔ پوجا اپنے سر پر ساڑھی کا آنچل رکھتے ہوئے شرما کر وہاں سے دور جانے لگی۔ میں بھی اس کے پیچھے چلتے ہوئے بڑبڑایا۔ "لعنت

ہے۔ کیا میاں بیوی ایسے ہوتے ہیں؟ اپنا گھر ہوتے ہوئے گھاس میں گھسنے آتے ہیں۔"

وہ تیزی سے چلتے ہوئے بولی۔ "تمہارا جسم فولاد جیسا ہے مگر کھوپڑی میں پتھر ہے۔ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ وہ میاں بیوی نہیں تھے۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "میاں بیوی نہیں تھے؟ تم کیسے جانتی ہو؟"

"میرے پاس عقل ہے۔ وہ دونوں پریمی تھے۔ اتنی رات کو چھپ کر ملنے آئے تھے۔"

"ہاں یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ سیدھی سی سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ میاں بیوی تو گھر میں یعنی کے گھر میں.........."

میں بولتے بولتے رک گیا۔ اچانک خیال آیا کہ میری گائیڈ اور ہم سفر ایک جوان لڑکی ہے اور مجھے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔

میں جھینپ کر اس سے ذرا دور رہ کر چلنے لگا۔ ہم دونوں کو چپ سی لگی ہوئی تھی۔ ہم سوچتے ہوئے اس گاؤں سے دور ہوتے جارہے تھے۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہی ہوگی؟ مجھے تو اس وقت وہ بے وفا دشمن' شلپا یاد آرہی تھی۔ کالیا کی اس مکار بیٹی نے پہلی بار مجھے یہ تجربہ دیا تھا کہ پیار بھرے لمحات جتنے رنگین ہوتے ہیں' پیار کرنے والی کی بے وفائی اور مکاری اتنی ہی سنگین ہوتی ہے۔ لہٰذا عورت خواہ کتنی ہی پُرکشش لگے' اس سے دور رہنے میں دانش مندی ہے۔

بے شک و شبہ پوجا حسین' نوجوان اور پُرکشش تھی۔ اس کے باوجود میں اس سے ذرا دور رہ کر چل رہا تھا۔ جیسے ریل کی دو پٹڑیاں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بھی دور رہتی ہیں۔

پتا نہیں ہم چلتے ہوئے کتنے کلومیٹر دور چلے آئے۔ چاندنی میں کھڑی فصلوں کے درمیان ایک جھونپڑی نظر آئی۔ پوجا نے کہا۔ "دور دور تک کوئی جھونپڑی یا کچا مکان نظر نہیں آرہا ہے۔ یہاں کسی زمیندار کے کھیتوں کا رکھوالا رہتا ہوگا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا اس ویرانے میں ڈاکو اور اسمگلر نہیں رہ سکتے؟"

"ہاں۔ یہ مجرموں کے چھپنے کے لئے عارضی پناہ گاہ ہوسکتی ہے۔ ہمیں چلتے وقت ہلکی سی بھی آواز پیدا نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سناٹے میں رہنے والے ایک پتا کھڑکنے کی بھی آواز سن لیتے ہیں۔"

میں نے جھونپڑی کے قریب پہنچ کر اسے پیچھے کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ خود سامنے والے بند دروازے اور کھڑکی کے پاس آیا۔ کھڑکی ایک جگہ سے ذرا سی ٹوٹی ہوئی

تھی۔ میں نے جھانک کر دیکھا ایک دیہاتی دھوتی پہنے ایک چارپائی پر سو رہا تھا۔ اس کے سرہانے ایک لاٹھی رکھی ہوئی تھی۔ کوئی ہتھیار نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ شخص ایک چوکیدار تھا۔ فصلوں کو خراب کرنے والے جانوروں کو لاٹھی سے مار کر بھگاتا تھا۔

میں نے جھونپڑی کے پیچھے پوجا کے پاس آکر کہا۔ "اندر ایک چوکیدار سو رہا ہے۔ اس کے پاس صرف ایک لاٹھی ہے۔ ہم اندر جاکر اس سے معلوم کرسکتے ہیں کہ یہ کون سی جگہ ہے اور دہلی کی طرف جانے والا راستہ کون سا ہے۔"

پوجا نے کہا۔ "ہاں۔ ہم یہاں تھوڑی دیر کے لئے آرام کرکے آگے جائیں گے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک گاڑی کی آواز دور سے سنائی دی۔ ہم دونوں دبے قدموں چلتے ہوئے کھڑی فصلوں کے درمیان جاکر رک گئے۔ ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دے رہی تھیں۔ قریب آنے پر معلوم ہوا' وہ ایک بڑی سی لینڈکروزر تھی۔ کچے راستے پر چلتی ہوئی جھونپڑی کے سامنے رک گئی تھی۔

اس کے تمام دروازے کھلنے لگے۔ ہٹے کٹے مرد گنیں لئے باہر نکل کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ وہ پانچ تھے۔ ان میں سے چار دھوتیاں پہنے ہوئے تھے۔ ان کی کمر سے کارتوس کے بیلٹ بندھے ہوئے تھے۔ پانچواں شخص چست پتلون اور جیکٹ پہنے ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک کلاشنکوف تھی۔ گاڑی کی آواز سن کر چوکیدار دروازہ کھول کر باہر آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر پتلون اور جیکٹ والے سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ہائے پتواری! یہاں چوکیدار بن کر رہنے کے بڑے فائدے ہیں۔ کبھی پولیس والے اور کبھی چوکیدار اور ڈاکو کاتل آتے ہیں۔ مجھے ایک جاہل گریب چوکیدار سمجھ کر یہاں کچھ سمے گجار کر چلے جاتے ہیں۔"

پتواری نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "یار! تیرا نام لال بہادر ہے مگر یہاں للو بن کر رہتا ہے اور ہم واردات کرتے رہتے ہیں۔ دولت مند بننے' عیش کرنے اور کانون کے لمبے ہاتھوں سے بچنے کے لئے ہمیں یہی کرتے رہنا ہوگا۔"

وہ دونوں قہقہے لگانے لگے پھر للو نے کہا۔ "ابھی ایک گھنٹے پہلے ایک کھوب صورت جوان آیا تھا۔ اگر اسے ساڑھی پہنادو تو حسین عورت لگے مگر بہت کھترناک تھا۔ ایک ایمبولینس میں ایسے آدمی کو لایا ہے جس کے ایک گھٹنے کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اس کے گھٹنے پر پلاسٹر چڑھایا گیا ہے۔"

اس کی باتیں سن کر میں نے حیرانی سے پوجا کو دیکھا۔ وہ بھی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ سب باتیں کرتے ہوئے جھونپڑی کے اندر جارہے تھے۔ ہم کھڑی

فصلوں کے پیچھے سے نکل کر زمین پر چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتے ہوئے جھونپڑی کی دیوار سے آکر لگ گئے۔

للو کی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اس کے پاس ریوالور تھا۔ اس نے جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر مجھ.......... سے پوچھا کہ میں دولت چاہتا ہوں یا موت؟ میں چاہتا تو ایک کک مار کر اس کے ہاتھ سے ریوالور گرا سکتا تھا مگر میں نے ایک ڈرپوک دیہاتی کی طرح ہاتھ جوڑ کر کہا کہ میں گریب آدمی ہوں۔ آپ جو کہیں گے' وہی کروں گا۔ وہ میرے ساتھ ایک لنگڑے کو اٹھا کر اس دوسرے کمرے میں لے آیا۔ یہاں چارپائی پر اسے لٹا کر اس کے منہ سے ٹیپ چپکا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر گیا ہے۔"

"وہ گیا کہاں ہے؟"

"پتا نہیں۔ کہہ رہا تھا' دوگھنٹے کے اندر آجائے گا پھر اس لنگڑے کو صبح سے پہلے لے جائے گا۔"

پوجا نے میرے کان سے منہ لگا کر بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ "یہ ضرور وہی کالیا ہے۔ پتا نہیں کون اسے دوگھنٹے کے لئے چھوڑ کر کہیں گیا ہے۔ یہ کالیا تمہارے لئے بہت ضروری ہے۔"

وہ میرے کان میں یہ بھی کہہ رہی تھی کہ وہ چھ ہیں اور مسلح ہیں۔ ہم دونوں کیا کرسکیں گے؟

میں نے اس کے کان میں کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ یہاں سناٹے میں فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ جب تک میں گولی نہ چلاؤں۔ تم بھی فائر نہ کرنا۔ میں آگے جارہا ہوں۔ تم خاموشی سے دیکھتی رہو۔ جب ضرورت سمجھو' تب ہی مداخلت کرنا۔"

میں نے آگے بڑھ کر دیوار کی آڑ سے جھونپڑی کے سامنے والے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک مسلح شخص دروازے کے سامنے ٹہلتا ہوا پہلے دوسری طرف گیا تھا پھر پلٹ کر میری طرف آرہا تھا۔ میں سر پیچھے کرکے دیوار سے چپک گیا۔ اس کے قدموں کی چاپ سن کر اندازہ کرنے لگا کہ وہ کتنے قریب آتا جارہا ہے۔ میں نے ایک ہاتھ میں چاقو پکڑا تھا۔ جیسے ہی قدموں کی آواز بالکل قریب آئی' میں نے فوراً ایک ہاتھ بڑھا کر اس کا گریبان پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ اسے دونوں ہاتھوں سے کلاشنکوف تھام کر ٹریگر کی طرف انگلی لے جانے میں جتنا وقت لگا' اتنی دیر میں' میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور چاقو اس کے سینے میں پیوست کردیا۔ وہ خاصا تگڑا تھا مگر زندگی کی آخری تمام قوت مجتمع کر

کے بھی میرے شکنجے سے نہ نکل سکا۔ جب وہ بالکل بے جان ہو گیا تو میں نے اسے زمین پر پھینک دیا۔

پوجا دوسرے کمرے کی کھڑکی سے کان لگائے سن رہی تھی۔ اس کمرے میں پتواری اور للو اپنے آدمیوں کے ساتھ تھے۔ پتواری' کالیا کے منہ پر سے ٹیپ ہٹا کر پوچھ رہا تھا۔ "اے تو کون ہے؟ اور تجھے یہاں لانے والا کون ہے اور تجھ سے کیا چاہتا ہے؟"

وہ بولا۔ "میرا نام کالیا ہے اور یہاں ایک پاکستانی جاسوس مجھے لایا ہے۔ پتا نہیں یہاں سے کہاں لے جانے والا ہے۔ اگر تم مجھے بھارت سرکار کے حوالے کر دو گے تو تمہیں بہت بڑا انعام ملے گا۔ میرے پاس بھی اتنی دولت ہے کہ تمہارا منہ موتیوں سے بھر دوں گا۔"

پتواری نے کہا۔ "بھارت سرکار کو ہماری اصلیت معلوم ہو جائے گی تو وہ ہمیں تھانے کچہری میں گھسیٹتی پھرے گی۔ ہاں تم ہمیں زیادہ سے زیادہ مال دو گے تو ہم تمہارے گھر میں تمہیں لے جائیں گے۔"

کالیا نے کہا۔ "مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں ایک فون کروں گا تو تم جہاں کہو گے' وہاں لاکھوں روپے آ جائیں گے۔"

پتواری نے اپنے دو آدمیوں سے کہا۔ "بھیرو! ننکا! تم دونوں باہر جا کر چھپ جاؤ۔ وہ پاکستانی جاسوس آنے والا ہو گا۔ پہلے ہم اسے نرک پہنچائیں گے پھر کالیا کو یہاں سے لے جائیں گے۔"

بھیرو اور ننکا وہاں سے چلتے ہوئے جھونپڑی سے باہر آئے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ "یہاں چھاگلا پہرے پر تھا۔ کہاں چلا گیا؟"

دوسرے نے کہا۔ "آج اس کا پیٹ خراب تھا۔ سامنے کھیت میں گیا ہو گا۔ تم ادھر جا کر مورچہ بناؤ۔ میں ادھر جاتا ہوں۔"

ان میں سے ایک دوسری طرف گیا اور دوسرا میری طرف آنے لگا۔ اس وقت میں جھونپڑی کے برآمدے کی چھت پر چڑھا ہوا تھا۔ وہ برآمدے سے اتر کر دوسری طرف مڑنا چاہتا تھا مگر چھاگلا کو زمین پر اوندھا پڑا ہوا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اسی وقت میں نے چھت پر سے چھلانگ لگائی پھر اس کی گردن ایک ہاتھ سے دبوچتا ہوا زمین پر گرتے ہی چاقو کے دو وار اس پر کئے۔ میری یہی کوشش تھی کہ آواز نہ ہو۔ دوسرے دشمن ہوشیار نہ ہوں۔

دوسری طرف جانے والا ادھر سے گھومتا ہوا جھونپڑی کے پیچھے جا سکتا تھا۔ پوجا کو دیکھ سکتا تھا۔ میں نے فوراً ہی زمین سے اٹھ کر دبے قدموں چلتے ہوئے سامنے کھلے ہوئے دروازے کے اندر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ سب دوسرے کمرے میں کالیا کے پاس

تھے۔ میں اندر نہیں گیا۔ برآمدے میں دوسری طرف جا کر دیکھا۔ وہ دوسرا شخص مورچہ بنانے کے لئے سامنے ایک کھیت کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے فاصلے کا اندازہ کیا پھر تین لمبی چھلانگیں لگاتا ہوا اس کی طرف جانے لگا۔ میری دوسری چھلانگ کی آواز پر وہ پلٹا۔ اس وقت تک میں نے تیسری چھلانگ لگاتے ہی چاقو اس کے جسم میں پیوست کر دیا۔ اس بار اس کی گردن دبوچنے یا اس کے منہ پر ہاتھ رکھنے کا موقع نہیں ملا اس لئے اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ میں نے چاقو سے دوسرا وار کیا پھر اس کی گن اٹھا کر دوڑتا ہوا سامنے والے دروازے کی طرف تاریکی میں گیا۔

ایک ساتھی کی چیخ سن کر لال بہادر عرف للو اپنے ایک آدمی کے ساتھ گن لے کر دوڑتا ہوا بھیرو' ننکا اور چھاگلا کو آوازیں دیتا ہوا دروازے سے باہر آ گیا۔ اسی وقت میں نے تڑا تڑ کئی فائر کئے۔ دونوں کے ہاتھوں سے گنیں چھوٹ گئیں۔ وہ میری مسلسل فائرنگ سے بچ نہ سکے۔ واپس اندر جاتے جاتے انہیں کئی گولیاں لگیں۔ ان میں سے ایک نے چوکھٹ کے باہر اور ایک نے اندر گر کر دم توڑ دیا۔

پتواری کالیا کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ فائرنگ کی آوازیں سنتے ہی وہ دوڑتا ہوا کھڑکی کی طرف گیا۔ کالیا نے بتایا تھا کہ اسے یہاں لانے والا اکیلا ہے۔ لہٰذا پتواری نے سوچا۔ پچھلی کھڑکی سے باہر آ کر چھپتے ہوئے اور دوڑتے ہوئے آ کر اس اکیلے دشمن کو گولیوں سے چھلنی کر دے گا۔

لیکن کھڑکی کے باہر پوجا کھڑی ہوئی تھی۔ میں اس سے کہہ چکا تھا کہ جب تک میں فائرنگ نہ کروں' وہ گولی نہ چلائے۔ ضرورت پڑنے پر مداخلت کرے۔ اب وہ فائرنگ کی آوازیں سن چکی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے ریوالور تھام کر میری طرف آنا چاہتی تھی لیکن کھڑکی کھلنے کی آواز سن کر رک گئی۔ جیسے ہی کھڑکی کھلی' لالٹین کی روشنی میں پتواری کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھتا ہوا نظر آیا۔ پوجا نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر ٹھائیں ٹھائیں کی آوازوں کے ساتھ دو گولیاں چلائیں۔ وہ چیختا ہوا کھڑکی کی چوکھٹ سے الٹ کر کمرے کے اندر جا کر گرا۔ اس کے بعد اس کی چیخیں سنائی نہیں دیں۔ پوجا نے دیکھا' وہ کمرے کے اندر فرش پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ اس کے دیدے پھیل کر ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گئے تھے اور چارپائی پر بندھا ہوا کالیا سر اٹھا کر کھڑکی کے باہر پوجا کو نیم روشنی میں سہم کر دیکھ رہا تھا۔

پوجا نے احتیاطی تدبیر کے مطابق زمین پر لیٹ کر بلند آواز سے کہا۔ "میں پوجا بول رہی ہوں۔ اس جھونپڑی کے پیچھے تنہا ہوں۔ مجھے دشمن سمجھ کر گولی نہ چلانا۔ کوئی دشمن

آئے گا تو میں نمٹ لوں گی۔"

اسے دور سے میری آواز سنائی دی۔ "میں نے للو کہلانے والے چوکیدار کے علاوہ چار دشمنوں کو ختم کردیا ہے۔ اندر صرف ایک رہ گیا ہے' اس سے ہوشیار رہو۔"

وہ بولی۔ "اس باقی رہ جانے والے ایک کو میں نے گولی مار دی ہے۔ اس کا مطلب ہے' تمام کچرا صاف ہوگیا ہے۔ ایک کچرا چارپائی سے بندھا ہوا ہے۔"

میں تیزی سے چلتا ہوا پیچھے کی طرف آتے ہوئے بولا۔

"پوجا! گولی نہ چلانا۔ میں ہوں' چلی آؤ۔"

وہ زمین سے اٹھ کر دوڑتے ہوئے آئی اور خوشی سے لپٹ کر بولی۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم چھ مسلح بدمعاشوں کو تنہا ٹھکانے لگا دوگے۔"

میں نے کہا۔ "میں نے چھ کو نہیں' پانچ کو ختم کیا ہے۔ جو چھٹواں تھا یعنی چھٹا ہوا تھا' اسے تم نے ہلاک کیا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے اپنے چہرے پر میرے چہرے کو جھکاتے ہوئے اپنے خاموش لبوں سے مجھے انعام دینے لگی۔ میں جھوٹ کیوں بولوں' وہ مجھے پہلے بھی اچھی لگتی تھی۔ اب اس کا انداز مجھے اور اچھا لگ رہا تھا لیکن عقل نے ایسے وقت ساتھ نہیں چھوڑا۔ میں نے اسے الگ کرتے ہوئے کہا۔ "میری امی کا دشمن اس جھونپڑی میں ہے اور اس دشمن کو اغوا کرکے لانے والا یہاں کسی بھی وقت آسکتا ہے۔ ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔"

میں اسے ایک بازو کے حصار میں لے کر وہاں سے چلتا ہوا جھونپڑی کے سامنے آیا ہم نے وہاں رک کر دور تک نظریں دوڑائیں۔ چاندنی رات میں جہاں تک دکھائی دیتا تھا' وہاں تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا اور نہ ہی کسی گاڑی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "پوجا! تم باہر تاریکی میں رہو۔ کسی قسم کی بھی آہٹ سن کر مجھے آواز دو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ ایک جگہ تاریکی میں چلی گئی۔ میں جھونپڑی کے دوسرے کمرے میں آیا۔ کالیا مجھے دیکھتے ہی ایک دم سے سہم کر بولا۔ "تت.......... تم؟"

"مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا۔ صرف میرے سوالوں کے جواب دو ورنہ گولی مار دوں گا۔"

"نن.......... نہیں۔ عقل سے کام لو۔ مجھے مار ڈالو گے تو "را" والے تمہاری ماں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"ہاں اتنی سی عقل مجھ میں ہے۔ میں تمہیں گولی نہیں ماروں گا لیکن اپنی امی کی

رہائی کے لئے تمہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ گھسیٹتا رہوں گا۔ اب میرے سوال کا جواب دو۔ تم "را" کے پشکر ٹریننگ سینٹر میں تھے۔ وہاں سے تمہیں یہاں کون لایا ہے؟"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں' اسے نہیں جانتا ہوں۔ وہ بہت چالاک بھی ہے اور درندہ قاتل بھی۔ وہ "را" کے ایک بڑے افسر کا بھیس بدل کر پشکر ٹریننگ سینٹر میں گیا تھا۔ وہاں کے افسران سے اس نے کہا کہ ڈاکٹر آمنہ کا بیٹا فرہان آیا ہوا ہے۔ میری جان کو خطرہ ہے اس لئے مجھے دوسری خفیہ جگہ ٹرانسفر کرنے کے لئے آیا ہے۔ اس طرح وہ مجھے یہاں لے آیا۔"

"تمہاری اس بات کا یقین ہے کہ وہ بڑی چالبازی سے تمہیں وہاں سے نکال لایا ہے لیکن یہ کیسے یقین کروں کہ تم اسے نہیں جانتے ہو؟ تم سے کوئی تعلق ضرور ہے اس لئے وہ تمہاری خاطر "را" جیسی خطرناک تنظیم سے ٹکرا رہا ہے۔"

"بھگوان کی سوگند' میری خود سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ وہ خطرات مول لے کر مجھے کہاں لے جانا چاہتا ہے؟ وہ صبح سے پہلے یہاں آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ وہ بالکل تنہا ہے۔ تم اس سے پوچھ سکتے ہو پھر میری سچائی پر یقین آجائے گا۔"

جو ٹیپ اس کے منہ پر چپکایا گیا تھا' ایک طرف رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر دوبارہ اس کے منہ سے چپکا دیا۔ جو بھی اسے وہاں لایا تھا' اس کا انتظار کرنا ضروری تھا۔ یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ وہ میری امی کے دشمن سے کیوں دشمنی کر رہا ہے؟

تابانی نے اس جھونپڑی کو بڑی حد تک خفیہ پناہ گاہ سمجھا تھا اور وہاں رہنے والے لال بہادر عرف للو کو ایک ڈرپوک اور بزدل چوکیدار سمجھا تھا۔ جھونپڑی کے تین کمروں کو اچھی طرح دیکھا تھا۔ کہیں بھی ہتھیار نہیں تھا۔ تیسرے کمرے میں ایک مٹی سے بنے ہوئے چھوٹے سے چبوترے پر ہنومان جی کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔

اس نے للو کو ریوالور دکھا کر ڈرایا تھا اور نوٹوں کی ایک گڈی دے کر کہا تھا کہ اس زخمی لنگڑے کو وہاں رکھا جائے۔ وہ دو گھنٹے کے لئے ضروری کام سے جارہا ہے پھر واپس آکر صبح سے پہلے کالیا کو لے جائے گا۔

وہ فون کے ذریعے ڈی جی دھاون سے سودا کرنا چاہتا تھا کہ وہ کالیا کو زندہ سلامت رکھنا چاہتا ہے تو ڈاکٹر آمنہ کو رہا کردے۔ اس کے پاس جو موبائل فون تھا اس کی بیٹری ختم ہوگئی تھی۔ اسے ری چارج کرنے کی ضرورت تھی لہٰذا اسے کسی قریبی شہر میں فون کرنے کے لئے جانا پڑا۔

فون پر ڈی جی دھاون سے باتیں ہوئیں پھر یہ طے پایا کہ دھاون چالیس منٹ کے بعد ڈاکٹر آمنہ سے فون پر بات کرائے گا۔ اسے مزید چالیس منٹ تک اس جھونپڑی سے دور رہنا پڑا پھر اس نے ڈی جی دھاون سے موبائل پر رابطہ کیا۔ اس نے کہا۔ "ہیلو تابانی! اس وقت میں ڈاکٹر آمنہ کے پاس ہوں۔ ان سے بات کرو۔"

چند سیکنڈ کے بعد آمنہ کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو تابانی! یہ کیا حماقت ہے۔ تم جانتے ہو کہ مریض دوست ہو یا دشمن' میرے لئے وہ صرف مریض ہوتے ہیں۔ تم کالیا کو کہاں لے گئے ہو؟"

"لے گئی ہوں۔ آپ کی عظیم شخصیت نے مجھے سمجھایا ہے کہ مجھے عورت کہلانے میں فخر کرنا چاہیے۔ میں آپ کی طرح بے مثال ڈاکٹر تو نہیں بن سکتی لیکن زندگی ساتھ دیتی رہی تو انسانیت کے لئے اچھے کارنامے انجام دینے کی کوشش کرتی رہوں گی۔"

"شاباش تابانی! تم نے میرا دل خوش کردیا ہے۔ دھاون صاحب ابھی کہہ رہے تھے کہ تم نے مجھے رہائی دلانے کے لئے کالیا کو اغوا کیا ہے۔ تم یہ نہیں جانتی کہ کالیا کے آپریشن میں دیر ہوگی تو زخم ناسور بن جائے گا۔ آپریشن کے سلسلے میں بڑے مسائل پیدا

ہوجائیں گے۔"

"میں آج سے آپ کو اپنی امی کہہ رہی ہوں اور ایک بیٹی کی زبان سے وعدہ کررہی ہوں کہ کالیا کے آپریشن میں دیر نہیں ہونے دوں گی۔ پہلے آپ "را" کے ڈی جی دھاون کی ایک سیاسی چال کو سمجھ لیں۔ وہ دنیا والوں کے سامنے یہ الزام قبول نہیں کریں گے کہ آپ کو اغوا کرکے بھارت لایا گیا ہے۔ اس بدنامی سے بچنے کے لئے کالیا کا آپریشن کامیاب ہوتے ہی وہ آپ کو ہلاک کردیں گے۔ پلیز امی! میری یہ بات مان لیں۔ بھارت اور پاکستان کے علاوہ اپنے پسندیدہ ملک کے کسی شہر میں کالیا کا آپریشن کریں۔"

"بیٹی! میں اپنے لئے تمہارے پیار بھرے جذبات کو سمجھ رہی ہوں۔ تم میری سلامتی چاہتی ہو لیکن دوسرے کسی ملک میں کالیا کو پہنچانے میں دیر ہوسکتی ہے۔"

"کوئی دیر نہیں ہوگی۔ کالیاان کے لئے اتنا اہم ہے کہ وہ اپنے خاص طیارے میں کل ہی اس ملک میں پہنچا سکتے ہیں جہاں آپ اس کا آپریشن کریں گی۔"

"اپنا فون آن رکھو۔ میں دھاون صاحب سے بات کررہی ہوں۔"

ڈاکٹر آمنہ نے ڈی جی دھاون سے کہا۔ "آپ کل ہی کالیا کو اپنے خاص طیارے میں لندن بھیج دیں گے تو آپریشن میں دیر نہیں ہوگی۔"

ڈی جی دھاون نے کہا۔ "ہم اپنے خاص طیارے سے کل ہی اسے لندن بھیج دیں گے مگر کالیا ہے کہاں؟"

ڈاکٹر آمنہ نے تابانی سے کہا۔ "کالیا کو دھاون صاحب کے حوالے کردو۔ اسے کل لندن بھیج دیا جائے گا۔"

"سوری امی! آپ پھر ان کی چالبازی نہیں سمجھ رہی ہیں۔ میری شرط یہ ہے کہ کل صبح کی فلائٹ سے پہلے آپ کو لندن روانہ کیا جائے گا۔ آپ کی روانگی کے دس گھنٹے بعد میں آپ کو لندن فون کروں گی۔ اس طرح یقین ہوگا کہ آپ یہاں کی قید سے نکل کر لندن پہنچ گئی ہیں۔ یہ معلوم ہوتے ہی میں ڈی جی دھاون کو بتادوں گی کہ وہ کالیا کو کہاں سے لے جاسکتے ہیں۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر ڈی جی دھاون کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "تم خود کو بہت چالاک سمجھتی ہو۔ کیا میں فریبی ہوں؟ کیا ڈاکٹر آمنہ اور کالیا دونوں ایک ہی خاص طیارے سے نہیں جاسکتے؟"

"نہیں جاسکتے۔ تم جھوٹے اور فریبی ہو۔ پہلے میری امی جائیں گی۔ اس کے گیارہ گھنٹے کے بعد کالیا کو تمہارے حوالے کیا جائے گا۔ اگر تم نے انکار کیا تو میں کالیا کی بیٹی شاپا

کو ابھی بتاؤں گی کہ تم جان بوجھ کر اس کے باپ کے آپریشن میں دیر کر رہے ہو پھر وہ "را" کے خلاف آپریشن کرے گی تو تمہارے ہوش اُڑ جائیں گے۔"

وہ نرم پڑ گیا۔ ٹھنڈا ہو کر بولا۔ "ٹھیک ہے۔ ہم ابھی خاص طیارے سے ڈاکٹر آمنہ کو لندن روانہ کر رہے ہیں۔"

"یہ ہوئی نا بات۔ میں امی سے باتیں کرکے ان کے لندن پہنچ جانے کا یقین کرتے ہی کل شام کو چار یا پانچ بجے کالیا کو تمہارے حوالے کردوں گی۔"

فون پر آمنہ کی آواز سنائی دی۔ "بیٹی! میں نے سنا ہے کہ میرا بیٹا فرمان بھارت میری خاطر آیا ہے۔ کسی طرح اس سے رابطہ کرو اور اسے پاکستان واپس جانے کے لئے کہو اور مجھ سے بھی فون پر بات کراؤ۔"

"آل رائٹ ممی! میں اپنے بھائی فرمان کو تلاش کروں گی اور آپ سے اس کی بات کراؤں گی۔ اب...... "را" والے کسی طرح بھی فرمان کو گرفتار کرکے آپ کی کمزوری بنائیں گے اور میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔"

"میں جانتی ہوں' تم جس بات کی ضد کرلیتی ہو' اسے ضرور کر گزرتی ہو۔"

ڈی جی دھاون نے آمنہ سے فون لے کر کہا۔ "میں غیر ضروری باتیں کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ ہمیں ابھی ڈاکٹر آمنہ کو لندن بھیجنے کے انتظامات کرنے ہوں گے۔ یہ تمہارے مقرر کردہ وقت سے تین گھنٹے پہلے پہنچیں گی۔ تم سات گھنٹے کے بعد ڈاکٹر آمنہ سے فون پر باتیں کرکے یقین کرو کہ یہ لندن پہنچ گئی ہیں اور ساڑھے سات بجے کالیا کو ہمارے حوالے کردو۔"

"ٹھیک ہے۔ جتنی جلدی کرو گے' کالیا اور تمہارے لئے اتنی ہی بہتری ہوگی۔"

تابانی نے فون بند کردیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک پتی پتنی اور ان کی جوان بیٹی تھیں۔ وہ سب سہمے ہوئے تابانی کو دیکھ رہے تھے اور اس کی باتیں سن رہے تھے۔ اس نے جوان لڑکی سے کہا۔ "سوئچ بورڈ کے پاس جاؤ۔ میرے فون کی بیٹری چارج ہو چکی ہے' اسے لے آؤ۔"

اس لڑکی نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے باپ نے تابانی سے کہا۔ "ابھی تم کسی سے کہہ رہی تھیں کہ تمہاری زندگی نے ساتھ دیا تو تم انسانیت کی بھلائی کے لئے کارنامے انجام دیتی رہو گی۔ بیٹی! ہم بھی انسان ہیں' کیا ہمارے ساتھ بھلائی نہیں کرو گی؟"

"یہی تو بھلائی ہے کہ میرے ہاتھ میں ریوالور ہے مگر تم اپنی پتنی اور بیٹی کے ساتھ زندہ ہو۔ میرے جانے کے بعد بھی زندہ رہو گے۔ صرف اتنا سا نقصان پہنچا رہی ہوں کہ

تمہارا یہ موبائل فون لے جا رہی ہوں اور یہ جو عام سا ٹیلی فون ہے اس کا تار کاٹ کر صرف ریسیور لے جاؤں گی۔ اس طرح مجھے اطمینان رہے گا کہ تم پولیس کو اطلاع نہیں دو گے۔"

"تم جو چاہتی ہو' لے جاؤ۔ ہم پولیس کو اطلاع دینے کے لئے گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالیں گے۔"

"ہاں گھر سے باہر قدم نہ رکھنا۔ میرا ایک آدمی تمہارے بنگلے کے سامنے اور ایک بنگلے کے پیچھے تاریکی میں چھپا ہوا ہے۔ صبح سے پہلے کوئی بھی باہر نکلے گا تو وہ اسے گولی ماردیں گے۔"

اس نے اپنا اور اس کا موبائل فون لیا۔ تار کاٹ کر دوسرے فون کا ریسیور بھی لیا۔ پھر اس کمرے سے نکل کر دروازہ بند کرتے ہوئے باہر آئی۔ اس نے ایمبولینس کو کہیں چھوڑ دیا تھا۔ ایک شخص کو ریوالور دکھا کر اس کی کار چھین کر لے آئی تھی۔ وہ اس کار میں بیٹھ کر کچھ دور جانے کے بعد فون کے ریسیور کو کھڑکی کے باہر پھینکتی چلی گئی۔ وہ بڑی تیز رفتاری سے کار ڈرائیو کرتے ہوئے اس جھونپڑی کی طرف جا رہی تھی جہاں وہ کالیا کو ایک چارپائی سے باندھ کر للو چوکیدار کی نگرانی میں دے کر آئی تھی۔

وہ اپنے طور پر احتیاط سے کام کر رہی تھی۔ اس نے جس بنگلے سے فون کیا تھا وہاں اس نے عام ٹیلی فون کے ذریعے ڈی جی دھاون سے باتیں کی تھیں۔ یہ جانتی تھی کہ "را" کے جاسوس اس فون کا نمبر ٹریس کرکے معلوم کرلیں گے کہ وہ کہاں سے فون کر رہی ہے لیکن ہر جگہ احتیاطی تدبیر کام نہیں آتی۔ اس نے للو چوکیدار کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی توقع کے خلاف اس جھونپڑی میں بہت کچھ ہو چکا ہو گا۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے کی ڈرائیونگ کے دوران میں کھیتوں کے درمیان ایک کچے راستے سے گزرتے ہوئے اس جھونپڑی سے ذرا دور رک گئی۔ اس جھونپڑی کے سامنے ایک لینڈ کروزر کھڑی ہوئی تھی مگر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ جھونپڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر کسی کی موجودگی کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی اپنی کار کی ہیڈ لائٹس کو بجھایا پھر دروازہ کھول کر جھکتی ہوئی باہر آئی اور اسی طرح جھکتی ہوئی' دوڑتی ہوئی ایک قریبی کھیت میں کھڑی فصل کے اندر جا کر چھپ گئی۔

وہ سمجھ رہی تھی' اس لینڈ کروزر میں پولیس والے نہیں آئے ہوں گے۔ جو بھی

آئے ہوں گے' انہیں جھونپڑی کے اندر ہونا چاہیے لیکن وہاں ایسی خاموشی تھی جیسے کوئی وہاں موجود نہ ہو۔ اگر وہ سامنے کھڑی ہوئی گاڑی کے علاوہ کسی دوسری گاڑی میں کالیا کو وہاں سے لے گئے ہوں گے تو اتنی مہنگی لینڈ کروزر کو چھوڑ کر نہیں گئے ہوں گے۔ کالیا اور للو چوکیدار نے بتایا ہوگا کہ وہاں ابھی وہ آنے والی ہے۔ لہٰذا اس کے انتظار میں جھونپڑی کو خالی چھوڑ کر دشمن اس کی گھات میں آس پاس کے کھیتوں میں چھپے ہوں گے۔

پوجا اور میں ایک دوسرے سے دور فصلوں کے درمیان تھے۔ میں نے آنے والی کار کی ہیڈ لائٹس بجھنے کے بعد کچھ فاصلے پر ایسی آوازیں سنیں جیسے کوئی فصلوں کے درمیان سے گزر رہا ہے جس کے باعث کھڑی فصلیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر ہلکا سا شور پیدا کر رہی تھیں۔

میں نے اونچی آواز میں کہا۔ "اگر تم کالیا کو لانے والے وہی شخص ہو تو ہم تم سے دشمنی نہیں کریں گے ورنہ ہماری دشمنی تمہیں کتنی مہنگی پڑے گی' اس کا اندازہ تم جھونپڑی کے قریب جاکر کرسکتے ہو۔ اس کے اندر اور باہر تمہیں چھ لاشیں ملیں گی۔ کالیا ہماری ضرورت ہے اس لئے اسے اسی کمرے میں چارپائی پر بندھا ہوا چھوڑ دیا ہے۔ اب تم بتاؤ کہ کالیا تمہاری ضرورت کیوں ہے؟"

تابانی نے کہا۔ "تم کالیا کو ہماری ضرورت کہہ رہے ہو۔ اس کا مطلب ہے' تم اکیلے نہیں ہو۔ تمہارے ساتھ اور بھی کئی ہیں۔"

وہ بولتی ہوئی فصلوں کے درمیان اس بار زمین پر لیٹ کر بڑی احتیاط سے رینگتی ہوئی ایک طرف جانے لگی تاکہ ایک لمبا چکر کاٹ کر جھونپڑی کے قریب پہنچ کر دیکھ سکے کہ واقعی وہاں کچھ لوگوں کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں یا نہیں؟

میں نے کہا۔ "مجھ سے یہ نہ پوچھو کہ میں اکیلا ہوں یا ایک فوج کے ساتھ ہوں۔ میری بات کا جواب دو' تم کالیا کو پشکر ٹریننگ سینٹر سے اغوا کرکے کیوں لائے ہو؟"

تابانی سوچ رہی تھی کہ اسے مخاطب کرنے والا تنہا نہیں ہے۔ اگر وہ جواباً کچھ نہ کچھ کہتی رہے گی۔ اس شخص کے ساتھی اس کی آواز کی سمت آکر اسے گولیوں سے بھون ڈالیں گے۔ میں نے کہا۔ "تم خاموش رہ کر بھاگ نہیں سکو گے۔ میں تمہاری کار کے قریب آچکا ہوں۔ تمہیں واپس بھاگنے نہیں دوں گا۔"

میری باتوں کے دوران میں وہ زمین پر رینگتی ہوئی مجھ سے دور اور جھونپڑی کے قریب ہوتی جارہی تھی۔ ایسے ہی وقت اسے چاندنی میں پوجا دکھائی دی۔ پوجا اسے نہ دیکھ سکی کیونکہ تابانی اس کی پشت کی طرف سے آرہی تھی۔ میں نے بلند آواز سے کہا۔ "اگر

تم چاہتے ہو کہ ان لاشوں میں تمہاری لاش کا اضافہ نہ ہو تو بات کرو۔ تمہاری خاموشی سے مکاری ظاہر ہورہی ہے۔ پوجا! تم جہاں بھی ہو' ہوشیار رہو اور اپنے چاروں طرف نظر رکھو۔ میری بات کا جواب نہ دو۔ اسی طرح خاموش رہو۔"

پوجا نے میری ہدایت کے مطابق دائیں بائیں دیکھا پھر پیچھے دیکھنے کے لئے گھومنا چاہتی تھی۔ اسی لمحے........ تابانی نے زمین سے اٹھتے ہوئے اس پر چھلانگ لگائی۔ پھر اسے دبوچتے ہوئے اس کے ریوالور والے ہاتھ کو تھام لیا۔ بے اختیار پوجا نے چیخ کر مجھے آواز دی۔ "فرمان!"

وہ نیچے پڑی ہوئی تھی' تابانی نے اپنا ریوالور اس کی پیشانی سے لگا کر کہا۔ "خبردار! اب اپنے منہ سے آواز نہ نکالنا ورنہ........"

وہ کہتے کہتے رک گئی پھر بولی۔ "تم نے اپنے ساتھی کا نام لے کر پکارا تھا۔ کیا اس کا نام فرمان ہے؟"

میں نے اپنی جگہ سے چیخ کر پوچھا۔ "پوجا! کیا بات ہے؟ کوئی خطرہ ہے؟"

تابانی نے کہا۔ "میری بات کا جواب دو۔ کیا فرمان پاکستان سے آیا ہے؟"

پوجا نے ہاں کے انداز میں جواب دیا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا یہ لیڈی سرجن آمنہ کا بیٹا ہے؟"

پوجا نے پھر "ہاں" کے انداز میں سرہلایا تابانی اس کا ریوالور لے کر اس پر سے اٹھ گئی پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کے بعد بلند آواز میں بولی۔ "فرمان! تمہاری پوجا میرے گن پوائنٹ پر ہے لیکن میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ کیا تم یقین کرو گے کہ میں دشمن نہیں دوست ہوں؟"

"پوجا کو میرے پاس بھیج دو۔ میں تمہیں دوست مان لوں گا۔"

"میں پوجا کو ابھی تمہارے حوالے کروں گی۔ پہلے اپنی ماں کا نام بتاؤ؟"

"ڈاکٹر آمنہ خاتون۔ جھونپڑی کے اندر جو لنگڑا چارپائی سے بندھا ہوا ہے اس کا نام شمشیر سنگھ کالیا ہے۔ میں اسے یرغمال بناکر اپنی امی کو "را" کی قید سے رہائی دلانا چاہتا ہوں۔"

"میں نے بھی تمہاری امی کو رہائی دلانے کے لئے کالیا کو اغوا کیا ہے۔ کیا تم یقین کرو گے کہ میں نے تمہاری امی سے دشمنی کا انداز اختیار کیا تھا۔ انہیں پاکستان سے اغوا کرکے لائی تھی۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا تم مرد بن کر رہنے والی تابانی ہو؟"

"ہاں مگر اب تمہاری امی کی عظمت اور حسن سلوک نے مجھے ان کی عقیدت مند بنا دیا ہے۔ میں بھی انہیں امی کہتی ہوں۔ اگر تم تھوڑی دیر کے لئے میری پچھلی دشمنی بھول جاؤ تو میں ابھی تمہاری امی سے بات کراؤں گی۔"

"کیا واقعی تم امی سے بات کرا سکتی ہو؟"

"ہاں تمہارے یقین کرنے تک میں پوجا کو گن پوائنٹ پر جھونپڑی کے کھلے دروازے کے پاس لے جارہی ہوں۔ وہاں تم ہمیں لالٹین کی روشنی میں دیکھتے رہو گے۔"

میں نے دیکھا۔ وہ فصلوں کے درمیان سے نکل کر پوجا کے ساتھ جھونپڑی کے دروازے پر آئی پھر موبائل کے ذریعے رابطہ کرنے لگی۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا لینڈ کروزر کے پیچھے آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ اونچی آواز میں بول رہی تھی۔ "دھاون صاحب! آپ کے خصوصی طیارے میں فون کی سہولت ضرور ہوگی۔ میں ہر حال میں اپنی امی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

اس نے دوسری طرف سے کچھ سن کر کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں دس منٹ کے بعد آپ سے رابطہ کروں گی۔"

اس نے فون بند کرکے اونچی آواز میں کہا۔ "فرمان! تمہاری امی "را" کے ڈائریکٹر جنرل کے خصوصی طیارے میں لندن جارہی ہیں۔ ابھی دس منٹ کے بعد تم ان سے باتیں کر سکو گے۔ دراصل "را" والے یہ الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتے تھے کہ عالمی شہرت رکھنے والی ہماری امی کو اغوا کرکے بھارت لایا گیا ہے۔ کالیا کے کامیاب آپریشن کے بعد وہ امی کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے اسی لئے میں نے کالیا کو یرغمال بنا کر انہیں مجبور کردیا کہ کالیا کا آپریشن بھارت میں نہیں انگلینڈ میں ہوگا اور بھارت پر امی کے اغوا کرنے کا الزام نہیں لگایا جائے گا۔"

ادھر ڈی جی دھاون نے طیارے کے عملے سے کہا۔ "ابھی تابانی نام کی ایک عورت فون کرے گی۔ اسے ڈاکٹر آمنہ سے بات کرنے دی جائے۔"

دس منٹ کے بعد تابانی نے فون کیا۔ ڈی جی دھاون نے اسے طیارے کا خصوصی نمبر اور فون نمبر بتایا۔ اس کی مطابق تابانی نے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے آمنہ کی آواز سنائی دی۔ وہ بولی۔ "امی! آپ کے لئے ایک خوشخبری ہے۔ فرمان سے ملاقات ہوگئی ہے لیکن وہ مجھے آپ کا دشمن سمجھ رہا ہے۔ پلیز آپ اس سے باتیں کرکے اس کی غلط فہمی دور کردیں۔ آپ فون بند نہ کریں، ابھی فرمان آپ سے بات کرے گا۔"

اس نے پوجا کو موبائل فون دے کر کہا۔ "جاؤ اسے فرمان کو دے دو۔"

وہ فون لے کر گاڑی کے پیچھے آئی۔ میں نے بے چینی سے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو امی! میں فرمان بول رہا ہوں۔ السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ اللہ تمہیں لمبی عمر دے بیٹے! تابانی مراد کو رہائی دلانے کے جنون میں مجھے بھارت لے گئی تھی لیکن جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ اس نے میری جان بچانے کے لئے "را" کے ڈی جی دھاون کو مجبور کردیا ہے کہ کالیا کا آپریشن لندن کے اسپتال میں کروں گی۔ ابھی میں طیارے میں سفر کررہی ہوں۔ تابانی سے کہو، میں کل صبح نو بجے لندن پہنچ جاؤں گی۔ میرے یہاں پہنچنے کی تصدیق کرتے ہی وہ کالیا کو دھاون کے حوالے کردے۔"

"میں ابھی تابانی سے کہہ دیتا ہوں۔"

"اسے نام سے نہ پکارو۔ وہ میری بیٹی اور تمہاری بڑی بہن ہے۔"

"میں اپنی بہن کو سر آنکھوں پر بٹھاؤں گا۔"

"بیٹے! یہ لوگ زیادہ باتیں کرنے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں۔ آخری بات کہتی ہوں۔ اپنے انکل کو میرے حالات سے آگاہ کردو۔ اللہ حافظ۔"

فون بند کردیا گیا۔ میں پوجا کے ساتھ گاڑی کے پیچھے سے چلتا ہوا تابانی کے قریب آیا پھر مسکرا کر بولا۔ "ہم اپنی بڑی بہن کو آپا یا باجی کہتے ہیں، میں آپ کو کیا کہوں؟"

وہ جواباً مسکرا کر بولی۔ "دیدی۔"

میں نے آگے بڑھ کر اسے "دیدی" کہتے ہوئے گلے سے لگالیا۔ وہ بولی۔ "میرے ماتا پتا کا دیہانت ہوگیا تھا۔ میرا کوئی اپنا رشتے دار نہیں تھا۔ تین برس پہلے مراد ملا۔ اب ایک عظیم ہستی میری ماں ہے اور تمہارے جیسا ایک دلیر بھائی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ایک چھوٹی بہن بھی ہے۔"

"ہاں یاد آیا۔ جب میں اپنی حماقت سے امی کو اغوا کررہی تھی تو انہوں نے ایک معصوم سی لڑکی کو اپنی بیٹی کہا تھا۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"عابدہ۔ ہم اسے عابی کہتے ہیں۔ امی نے ابھی فون پر کہا ہے کہ میں انکل ہاشم کو ان کے حالات سے آگاہ کردوں۔"

وہ مجھ سے فون لے کر بولی۔ "اسے میں کسی سے چھین کر لائی ہوں۔ اس کی چوری کی رپورٹ درج کی گئی ہوگی تو "را" والے سیٹلائٹ کے ذریعے تمہاری اور انکل ہاشم کی گفتگو ریکارڈ کرسکتے ہیں۔ تم میرے فون پر ان سے باتیں کرو۔"

اس نے اپنا موبائل دیا۔ میں نے انکل ہاشم سے رابطہ کرکے انہیں امی کے موجودہ

حالات بتائے۔ انہوں نے کہا۔ "بیٹے! فکر نہ کرو۔ میں تمام مصروفیات چھوڑ کر صبح کی فلائٹ سے لندن جاؤں گا۔ تم بھارت کے وقت کے مطابق باجی "آمنہ" کے لندن پہنچنے کی تصدیق کرو۔ پھر ان سے پوچھ کر مجھے بتاؤ کہ وہ لندن کے کس اسپتال میں کالیا کا آپریشن کریں گی۔"

"انکل! میں تابانی کے متعلق بتا چکا ہوں۔ اب وہ امی کی بیٹی اور میری دیدی ہیں۔ مراد بھائی کو آپ ہر قیمت پر رہائی دلائیں گے۔"

"فون تابانی کو دو۔"

میں نے اسے فون دیا۔ وہ اسے کان سے لگا کر بولی۔ "ہیلو! میں تابانی ہوں۔"

انکل ہاشم نے کہا۔ "تم صرف باجی کی نہیں' اب میری بھی بیٹی ہو۔ مراد اب میرا داماد ہے۔ تم اس کی طرف سے بے فکر ہوجاؤ۔ میں اسے ہر قیمت پر جیل سے نکال کر تمہارے پاس پہنچاؤں گا۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "انکل! میں کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے ایک نئی دنیا میں آگئی ہوں اور نئے محبت کرنے والے رشتے داروں کے ساتھ ایک نئی زندگی گزار رہی ہوں۔"

"اللہ نے چاہا تو اب تم مسرتوں سے بھرپور زندگی گزارو گی۔"

"انکل! اس دیس کے ہر ائرپورٹ پر سختی سے میرے لئے' فرمان اور پوجا کے لئے پابندیاں ہوں گی۔ ہمیں گرفتار بھی کیا جاسکتا ہے۔"

"نو پرابلم بیٹے! میں کل رات یا پرسوں صبح لندن پہنچ کر کالیا کے لئے موت بننے کی دھمکیاں دوں گا تو "را" والے تم تینوں کو لندن آنے سے نہیں روک سکیں گے۔"

"شکریہ انکل!"

گفتگو ختم ہونے پر تابانی نے فون بند کیا پھر مجھ سے کہا۔ "انکل بہت زبردست ہیں۔ ہم پرسوں تک لندن جاسکیں گے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے جھونپڑی کے اندر دوسرے کمرے میں آئے۔ وہاں کالیا چارپائی سے بندھا ہوا تھا۔ میرے ساتھ تابانی کو دیکھ کر سہم گیا۔ میں نے لندن میں اس کے ایک گھٹنے کی ہڈیاں توڑی تھیں اور تابانی نے اس کا علاج ہونے سے پہلے ہی اغوا کیا تھا۔ وہ ایسے سہا ہوا تھا جیسے اب موت آنے والی ہو۔

☆======☆======☆

بم کے دھماکے سے بھی وہ راجہ نواز کو ہلاک کرنے میں ناکام رہے تھے۔ پہلے تو یہ

خوش فہمی تھی کہ وہ مرچکا ہے۔ امیر حمزہ نے ٹینا کو فون پر دھمکی دی کہ اسے اغوا کرے گا تو نیک بخت اور خفیہ ہاتھ کو راجہ کی موت کا اور بھی یقین ہوجائے گا۔ ان کے خیال میں اب ایک ہی دشمن حمزہ رہ گیا تھا۔ اس کی طرف سے کوئی خاص پریشانی نہیں تھی کیونکہ خفیہ ہاتھ نے امیر حمزہ کے تمام اہم ذرائع اور اسے ملنے والی خفیہ امداد کو ختم کرکے اسے کمزور بنا دیا تھا۔

خفیہ ہاتھ کی جتنی خفیہ ایجنسیاں تھیں' ان میں ٹینا وقتِ ضرورت بڑے بڑے کارنامے انجام دیتی رہی تھی۔ وہ بڑی چالبازیوں سے خفیہ ہاتھ کے مخالفین کو موت کے گھاٹ اتار دیتی تھی۔ راجہ نواز بھی اس کے ہاتھوں دوسری دنیا میں پہنچنے والا تھا لیکن اتفاقاً خوش قسمتی سے بچ نکلا تھا۔

خفیہ ہاتھ اس سے بہت خوش رہتا تھا۔ اسے جس ملک کی خفیہ ایجنسی میں اہم مشن کے لئے بھیجتا تھا' وہاں ٹینا کی حیثیت سب سے اعلیٰ عہدیدار کی ہوا کرتی تھی۔ دنیا کے ہر ملک میں اس کی حفاظت کرنے کے زبردست انتظامات ہوا کرتے تھے اور کتنے ہی خطرناک مجرم ماتحتوں کی حیثیت سے اس کے احکامات کی تعمیل کیا کرتے تھے۔

امیر حمزہ نے فون پر اسے دھمکی دی تھی۔ وہ بظاہر خوفزدہ ہوگئی تھی لیکن یہ سوچ کر پریشان ہوگئی تھی کہ پہلی بار اس کا شکار زندہ کیسے بچ گیا؟ وہ ناکام ہو کر ایسی پلاننگ کرنا چاہتی تھی کہ حمزہ یا راجہ جوابی کارروائی کریں تو اس بار زندہ نہ جاسکیں۔

اسے ماسک میک اپ میں مہارت حاصل تھی۔ اس نے کتنی ہی حسین عورتوں کے ماسک بنوا کر رکھے تھے۔ ضرورت کے وقت وہ خود ہی مہارت سے میک اپ کرکے اپنی شخصیت تبدیل کرلیتی تھی۔ فون پر حمزہ کی دھمکی سننے کے بعد اس نے ماسک میک اپ کیا تھا۔ پھر اس رہائش گاہ کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ صرف خفیہ ہاتھ کو براہ راست بتاتی تھی کہ وہ کہاں جارہی ہے؟ اور اب کیا کرنے والی ہے؟

دوسرے دن کے اخبارات سے پتا چلا کہ راجہ نواز اس کے بچھائے ہوئے موت کے جال سے نکل گیا ہے۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا بم بلاسٹنگ میں مارا گیا ہے۔ خفیہ ہاتھ نے اسے فون پر بتایا تھا کہ راجہ نے اس سفیر کو بھی ہلاک کرنے کی دھمکی دی ہے جس نے اس کے باپ بننے کا ناٹک کیا تھا۔

وہ بولی۔ "سر! آپ تمام میڈیاز کے ذریعے یہ مشتہر کریں کہ پہلے امیر حمزہ نے ٹینا کو اغوا کرنے کی دھمکی دی تھی۔ اسی رات سے ٹینا لاپتا ہے اور اب راجہ نواز نے سفیر کو دھمکی دیتے وقت کہا ہے کہ وہ خواہ کتنی ہی سخت سیکورٹی میں رہے' اسے چوبیس گھنٹے کے

اندر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔"

خفیہ ہاتھ نے کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ تم میرا ایک بوجھ کم کرنا چاہتی ہو۔ یہ جانتی ہو کہ میں نے اس شخص کو مصلحتاً سفیر بنا کر بھیجا ہے۔ تم میری اس مصلحت سے فائدہ اٹھاؤ گی۔ آل رائٹ۔ ان دونوں دھمکیوں کو مشتہر کیا جائے گا۔"

اس منصوبے کے مطابق حمزہ اور راجہ کی دی ہوئی دھمکیوں کو تمام میڈیاز کے ذریعے خوب اچھالا گیا اور یہ پورے وثوق سے کہا گیا کہ حمزہ نے اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے ٹینا کو اغوا کیا ہے۔ راجہ نواز بھی سفیر کو ضرور قتل کرے گا۔ اگرچہ سفیر کی حفاظت کے لئے سخت انتظامات کئے گئے ہیں پھر بھی چوبیں گھنٹے پہلے سفیر کو اس ملک سے بحفاظت باہر بھیج دیا جائے گا۔

اور یہ خبر بھی شائع کی گئی تھی کہ حمزہ اور راجہ نے پورے ملک کا امن و سکون برباد کیا ہے۔ غیر ممالک سے جعلی پاسپورٹ کے ذریعے دہشت گرد آتے ہیں اور ان دونوں کے احکامات کے مطابق تخریبی کارروائیوں کے ذریعے قتل و غارت گری جاری رکھتے ہیں۔ اب تو غیر ملکی سفارت خانے بھی ان سے محفوظ نہیں رہے ہیں۔

دوسری صبح وہ سفیر سخت سیکورٹی میں اپنے دفتر آیا۔ راجہ نواز نے اس کے سیکرٹری سے کہا۔ "اپنے صاحب سے کہو راجہ نواز بات کرنا چاہتا ہے۔"

سیکرٹری نے کہا۔ "سوری! ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم تمہارے اور حمزہ کے فون کا کوئی جواب نہ دیں۔ ان کی آواز سنتے ہی فون بند کردیں۔"

"فون بند کروگے تو تمہارے صاحب کی سانسیں بند ہوجائیں گی۔"

لیکن سیکرٹری نے فون بند کردیا۔ راجہ نے اپنا موبائل فون بند کرتے ہوئے کہا۔ "سیکرٹری نے فون بند کردیا ہے۔ اوپر سے احکامات صادر ہوئے ہیں کہ ہم دونوں کی آوازیں سنتے ہی فون بند کردیا جائے۔"

حمزہ نے کہا۔ "ٹینا کو کہیں غائب کردیا گیا ہے اور اس کے اغوا کا الزام مجھ پر عائد کیا جارہا ہے۔ وہ بڑی چالبازی دکھا رہے ہیں۔"

"ہم نے نیک بخت کو چیلنج کیا تھا کہ قومی خزانے سے لئے ہوئے اربوں روپے واپس کرے اور عوام کے سامنے کرپٹ سیاست داں ہونے کا اعتراف کرے۔ اس کے جواب میں تمام میڈیاز کے ذریعے تم پر ٹینا کے اغوا کا الزام لگایا جارہا ہے اور ہمیں دہشت گرد ثابت کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ گاڈ فادر ہاشم کے ماتحتوں نے اخبارات والوں کو ان کی بیوی اور

بچوں کو نقصان پہنچانے کی دھمکیاں دی ہیں اس لئے وہ خوفزدہ ہو کر ہمارے تردیدی بیانات شائع کرتے ہیں۔"

شام کے اخبارات' ریڈیو اور ٹی وی نے یہ خبر مشتہر کی کہ راجہ نواز نے بھی اپنی دھمکی پر عمل کرلیا۔ وہ سخت پہرے کے باوجود چوبیں گھنٹے سے پہلے ہی سفیر کو قتل کرچکا ہے۔ وہ اپنے دفتر میں مردہ پایا گیا ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس نے دفتر کام کرنے کے دوران میں جو چائے پی تھی' اس میں زہر ملایا گیا تھا۔ جس چپراسی نے وہ چائے لاکر سفیر کے سامنے رکھی تھی' وہ فرار ہوگیا ہے۔

دوسرے دن کے اخبارات میں حمزہ اور راجہ کی طرف سے بیانات شائع ہوئے کہ جس طرح مگرمچھ پانی کے بغیر نہیں رہ سکتے' اسی طرح نیک بخت اور کاشف اکبر جیسے مگرمچھ سیاستداں جھوٹ اور فریب کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ انہوں نے ٹینا کو اغوا نہیں کیا ہے۔ ان پر جھوٹا الزام لگانے اور عوام کو فریب دینے کے لئے اسے کہیں چھپا دیا گیا ہے۔

وہ دونوں سیاست داں خفیہ ہاتھ کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں۔ خفیہ ہاتھ کے لئے وہ سفیر غیر ضروری تھا لہٰذا اسے زہریلی چائے پلا کر مار ڈالا گیا اور اس بے چارے چپراسی کو بھی بڑی راز داری سے ٹھکانے لگا دیا گیا ہے۔ اگر وہ کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر ایسا کہہ رہے ہیں تو خفیہ ہاتھ اور اس کے چمچے سیاست دانوں کے پاس بھی ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔

اس طرح پاکستانی قوم الجھ رہی ہے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا؟ وہ اپنے ہم وطنوں سے صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کرپٹ سیاست دانوں کے پچھلے اعمال کو یاد کریں۔ ان سے ایک ہی مطالبہ کریں کہ انہوں نے اپنے اپنے دورِ حکومت میں خود قرضے لئے اور اپنی اپنی پارٹی کے اہم لیڈروں کو قرضے دلائے ہیں۔ وہ تمام اربوں روپے قومی خزانے میں جمع کریں پھر الیکشن میں حصہ لیں۔ ہم پیش گوئی کرتے ہیں کہ وہ کبھی ایسا نہیں کریں گے۔ اگر قوم کا خزانہ خالی کرنے والوں کا محاسبہ نہ کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ سب انہیں ووٹ دے کر آئندہ بھی ڈاکوؤں کے لئے اپنے گھر کے دروازے کھلے رکھتے ہیں۔

اگر انسان باشعور ہو' اپنے ملکی اور غیر ملکی حالات سے برابر واقفیت رکھتا ہو تو بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے لیکن سیاست میں سب سے پہلی چالبازی یہ ہوتی ہے کہ عوام کو ناخواندہ اور بے خبر رکھا جائے۔ ہزاروں لاکھوں اسکول کھولے جائیں مگر ان اسکولوں کی کبھی چھتیں گرتی رہیں۔ کبھی استادوں کی تنخواہیں کئی کئی ماہ تک نہ دی جائیں تاکہ پرائیویٹ مہنگے اسکولوں کا کاروبار چمک جائے۔ غریب عوام کے سامنے تعلیم کے نام پر

اسکول تو ہوں مگر وہ مہنگی تعلیم سے اپنے بچوں کو محروم رکھیں اور حوصلہ کرکے مہنگی تعلیم حاصل کرنے والوں کو سطحی تعلیم تو دی جائے مگر دین کی عظمت اور دنیاوی سیاست کی چالبازیوں کو سمجھنے والا شعور نہ دیا جائے۔ حمزہ اور راجہ نے اپنے بیانات شائع کرانے کے لئے ایسے منجھے ہوئے کالم نویس صحافیوں کی خدمات حاصل کی تھیں جو نہایت متاثر کرنے والے انداز میں لکھتے تھے۔ سچ یوں بھی نہیں چھپتا اور وہ تمام صحافی چھپائے جانے والے سچ کو سات پردوں سے نکال کر باہر لے آئے تھے۔

کاشف اکبر اس بات سے خوش تھا کہ حمزہ اور راجہ خفیہ ذرائع سے ملکی اخبارات کو نیک بخت کے خلاف سچ شائع کرنے پر مجبور کردیتے ہیں اور اس طرح نیک بخت کو عوام کی نظروں میں گرا رہے ہیں لیکن کاشف اکبر کے لئے یہ بات مایوس کن تھی کہ نیک بخت کے ساتھ وہ بھی بدنام ہورہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بیانات کے ذریعے اپنی صفائی پیش کرے۔

خفیہ ہاتھ کے سیکرٹری نے کاشف اکبر کو فون پر کہا۔ "سر! آپ سے ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ ہولڈ کریں۔"

کاشف اکبر اور دردانہ بیگم خوش ہوگئے کہ شاید خفیہ ہاتھ کا آشیرباد انہیں ملنے والا ہے۔ چند سیکنڈ بعد خفیہ ہاتھ کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو کاشف! تم دیکھ رہے ہو کہ حمزہ اور راجہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے رہے ہیں اور یہ پتھر صرف نیک بخت کو نہیں، تمہیں بھی لگ رہے ہیں۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "جی ہاں! وہ مجھے بھی نقصان پہنچا رہے ہیں لیکن آپ کو افسوس ہوگا کہ مجھ سے زیادہ اس نیک بخت کو نقصان پہنچا رہے ہیں جسے آپ یہاں کا حکمران بنانا چاہتے ہیں۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ حمزہ اور راجہ ہمارے خلاف بھی کیچڑ اچھال رہے ہیں۔ ہمارے لیے سیاسی شطرنج کی بساط پر وہی مہرہ اہم ہوتا ہے جو صحیح وقت پر بساط کے صحیح خانے پر پہنچ کر مخالف مہروں کو مات دے۔"

"آپ کی بات کچھ سمجھ میں آرہی ہے۔ آپ پوری طرح وضاحت فرمائیں۔"

"تم اور نیک بخت دونوں ہی کرپٹ سیاست دانوں کی حیثیت سے بدنام ہو رہے ہو اور اپنے ساتھ مجھے بھی بدنام کر رہے ہو۔ مجھ پر الزام لگ رہا ہے کہ اس سفیر سے میں ناراض تھا۔ اسے اور ایک چپراسی جیسے معمولی شخص کو ہلاک کرکے اور ٹینا کو اغوا کرکے تمام الزامات حمزہ اور راجہ پر عائد کر رہا ہوں۔ ان الزامات کا کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں

کر رہا ہوں۔"

"آپ کے خیال میں ٹھوس ثبوت کس طرح پیش کیا جاسکتا ہے؟"

"اگر نیک بخت اور تم میں سے کسی خاص کارکن یا اہم عہدے دار کو اغوا کیا جائے یا ہلاک کیا جائے تو مجھ پر یہ الزام نہیں رہے گا کہ میں نے اپنے غیر ضروری افراد کو اغوا اور قتل کرایا ہے۔ اس کے برعکس یہ ثابت ہوجائے گا کہ نیک بخت یا تمہاری کسی اہم ہستی کو نہ میں قتل کراؤں گا اور نہ میرے چہیتے نیک بخت یا کاشف اکبر کبھی ایسا کریں گے۔ ایسی وارداتیں یقیناً حمزہ اور راجہ کریں گے۔"

"یعنی موجودہ حالات میں ہم دو مہروں میں سے جو اپنے عزیز یا اپنی پارٹی کے اہم لیڈر کی قربانی دے گا، آپ آئندہ اسے یہاں کا حکمران بنائیں گے؟"

"ہاں۔ یہ بات میں نیک بخت سے کہہ چکا ہوں لیکن اس کا کوئی قریبی رشتے دار نہیں ہے۔ دور کے رشتے داروں کی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس کی پارٹی کے صوبائی لیڈر بڑے طاقتور اور سخت سیکورٹی رکھنے والے جاگیردار ہیں۔ ان میں سے کسی کو اغوا کرانا یا قتل کرانا ممکن نہیں ہے۔ بہرحال میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایسے وقت نیک بخت نے مجھے مایوس کیا ہے۔ اگر تم مایوس نہیں کروگے اور میری خاطر کسی عزیز یا پارٹی کے بہت اہم لیڈر کی قربانی دوگے تو اس الیکشن کے نتیجے میں، میں تمہیں اقتدار کی کرسی پر بٹھاؤں گا۔"

"سچ؟ کیا آپ نیک بخت سے کیا ہوا معاہدہ ختم کردیں گے۔"

"اس معاہدے کے ذریعے ہم نے اسے اپنا پابند بنایا تھا۔ اسے حکمران بنانے سے پہلے اپنا محکوم بنالیا تھا۔ جب میں تمہاری حمایت کروں گا تو وہ میرے خلاف زبان تک نہیں ہلائے گا کیونکہ اس معاہدے کی رو سے وہ اپنی ہی قوم کا، اپنے ہی ملک کا مجرم کہلائے گا۔ بات سمجھ میں آگئی ہو تو بولو اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہو یا اپوزیشن پارٹی کے لیڈر کہلانا پسند کروگے؟"

"اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہوں لیکن مجھے یہ سوچنے اور فیصلہ کرنے کی مہلت دیں کہ مجھے اپنی کس اہم ہستی کو قربان کرنا چاہیے۔"

"تمہیں سوچنے کے لئے دو گھنٹے دے رہا ہوں ورنہ جنوبی ایشیا میں افغانستان، پاکستان اور ہندوستان میں میری جو سیاسی پالیسیاں تھیں، تم دونوں سے مایوس ہو کر ان پالیسیوں میں تبدیلیاں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں دو گھنٹے بعد آپ سے رابطہ کروں گا۔"

ادھر سے فون بند کردیا گیا۔ کاشف اکبر اور دردانہ نے ایک دوسرے کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ "کس کی قربانی دی جائے؟ ہماری پارٹی کا ایک صوبائی لیڈر رحمان چنا پہلے ہی مارا جاچکا ہے۔ اس کی ہلاکت کے باعث نیک بخت کا صوبائی لیڈر سندھ کے کئی علاقوں میں ہم پر حاوی ہوچکا ہے۔ اگر ہم کسی دوسرے اہم لیڈر کو قربان کریں گے تو اس لیڈر کے علاقے میں بھی نیک بخت کا کوئی سیاسی لیڈر حاوی ہوجائے گا۔"

دردانہ نے کہا۔ "ہم اپنی پارٹی کو کمزور کرنے والا کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ یہ سوچو کہ میرے اور تمہارے رشتے داروں میں کتنے سگے اور سب سے عزیز ہیں۔ ان میں سے کس کا صفایا کیا جاسکتا ہے۔"

"ہوں۔ کچھ پانے کے لئے کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنی اکلوتی چہیتی اولاد کی قربانی دینے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ بڑی قربانیاں دینے والے جنت میں جاتے ہیں۔ ہم قربانی دے کر اسمبلی میں حکومت بنانے جائیں گے۔"

دردانہ نے کہا۔ "کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا میرے بچوں کی قربانی دینے کا ارادہ ہے؟"

"بھئی میں مثال دے رہا تھا۔ میں کیا پاگل کا بچہ ہوں کہ اپنے بچوں میں سے کسی کو ماروں گا۔ تم اپنے بھائی کی کروڑوں کی زمین جائیداد چاہتی ہونا؟ ابھی اس نے شادی نہیں کی ہے۔ اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ اسے ہلاک کرایا جائے گا تو وہ کروڑوں روپے کی زمین و جائیداد تمہاری ہوجائے گی۔"

"میرا ایک ہی بھائی ہے۔ میں اس سے زیادہ دولت مند ہوں اور یہ جانتی ہوں کہ وہ شادی کے قابل نہیں ہے۔ جب بھی مرے گا' کنوارہ مرے گا پھر اس کا سب کچھ خود بخود میرا ہی ہوگا۔"

"پچھلی بار اقتدار کی کرسی پر بیٹھ کر میں نے تمہیں دولت مند بنایا ہے اور آج جتنی دولت ہے وہ دراصل میری ہی ہے۔"

"یہ بھی تو سوچو کہ بھائی کی ہلاکت سے مجھے اتنی دولت نہیں ملے گی جتنی کہ بیوہ بن جانے سے ملے گی۔"

وہ چونک کر بولا۔ "یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"کاشف! باپ دادا کے زمانے سے سیاست میری گھٹی میں پڑی ہے۔ پچھلی بار میری حکمت عملی سے تم نے اقتدار حاصل کیا تھا۔ ہماری پارٹی کے تمام سیاست داں مجھے اقتدار

کی کرسی پر بٹھانا چاہتے تھے لیکن میں نے تمہیں بٹھادیا۔ کیا اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی کہ میں ابتدا سے تمہارے کاندھے پر بندوق رکھ کر سیاسی بازیگری دکھاتی آئی ہوں۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"مجھ سے نہ پوچھو۔ ہماری پارٹی کے تمام سیاست دانوں سے پوچھو' اگر الیکشن میں جیت کر میں اقتدار کی کرسی پر بیٹھنا چاہوں گی تو کیا وہ تمہیں ہماری پارٹی کا صرف ایک مہرہ سمجھ کر اور صرف میرا مجازی خدا سمجھ کر برداشت کریں گے یا تمہیں مجھ پر ترجیح دیں گے؟"

وہ سوچ میں پڑگیا۔ وہ سیاسی پارٹی دردانہ کے باپ نے بنائی تھی۔ اس کے باپ کی موت کے بعد پارٹی کے تمام بڑے سیاست داں دردانہ بیگم کو اہمیت دیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ تمام سیاسی چالبازیاں دردانہ کی ہوتی ہیں۔ وہ اپنے شوہر کو صرف ایک لیبل بناکر سیاست کے بازار میں چپکائے رکھتی ہے۔ اس نے دردانہ کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ "بے شک میں تمہارے ہتھکنڈوں کے مطابق عمل کرتا آیا ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ کینی بندر کے واقعات کے بعد حکومت سے محروم ہوا ہوں' تب سے تم نے خود کو اس محل میں قید کرلیا ہے۔ نیک بخت سے میرا سخت مقابلہ ہورہا ہے اور تم تماشا دیکھ رہی ہو پہلے کی طرح کارآمد مشورے نہیں دے رہی ہو۔ تم بچوں کی پرورش کو اہمیت دے رہی ہو اور میری سیاسی بصیرت پر بھروسا کرکے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرچکی ہو۔"

وہ بولی۔ "لوگ ہوا کے بغیر سانس نہیں لے سکتے اور میں سیاست کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میری سیاست کو تم نہیں سمجھ پاؤ گے۔"

"میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔ یہ بتاؤ تم نے بیوہ بن جانے والی بات کیوں کہی ہے؟"

"یہ سمجھانے کے لئے کہ خفیہ ہاتھ ہمیں اقتدار حاصل کرنے کا سنہری موقع دے رہا ہے اور تمہیں ثابت کرنا چاہیے کہ واقعی تم اقتدار حاصل کرنے کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں دے سکتے ہو۔"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ کس کی قربانی دے سکتا ہوں؟"

"اپنی ماں کی.........."

"کیا؟" اس نے غصے سے چونک کر دردانہ کو دیکھا۔

"میری ساس صاحبہ بوڑھی ہوچکی ہیں۔ ان کے چل چلاؤ کا وقت ہے۔ اگر بیٹے کو اقتدار دلانے کے لئے چل بسیں گی تو سیدھی جنت میں جائیں گی۔"

"دردانہ بیگم! تمہارا دماغ چل گیا ہے۔"

"تم نے ہمیشہ میری سیاسی حکمت عملی کے مطابق عمل کیا ہے اور کامیاب ہوتے رہے ہو۔ ماں بہت معزز' مقدس اور عظیم ہستی ہوتی ہے۔ تمہاری ماں کی ہلاکت کی خبر سن کر پوری قوم کو حمزہ' راجہ اور نیک بخت پر غصہ آئے گا۔ خفیہ ہاتھ پر یہ الزام نہیں رہے گا کہ اس نے اپنے غیر ضروری مہروں کو ہلاک کرایا تھا۔ اگر کرایا تھا تو کاشف اکبر جیسے چہیتے مہرے کی والدہ صاحبہ کو ہلاک کر کے وہ کیا حاصل کرے گا؟ یہ دشمنی حمزہ اور راجہ کر رہے ہیں۔ یا پھر تم نے رحمان چنا کی ہلاکت کا الزام نیک بخت پر لگایا تھا۔ لہٰذا اس بے چاری بزرگ خاتون کی ہلاکت کا الزام نیک بخت پر بھی لگایا جاسکتا ہے۔"

وہ اٹھ کر ٹہلتا رہا پھر بولا۔ "واقعی تم نے میکے میں رہ کر باپ دادا کی یونیورسٹی میں بڑی زبردست سیاسی چالبازیاں سیکھی ہیں۔ یہ درست ہے کہ میری امی کی عمر بہت تھوڑی رہ گئی ہے اور تھوڑی کردی جائے گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"یہ ہوئی عقل کی بات۔ اگر تم نے ایسا کیا اور اقتدار کی چھینی ہوئی کرسی دوبارہ حاصل کرلی تو ملک کے بہت بڑے سیاست داں کہلاؤ گے۔"

وہ صوفے سے اٹھ کر اپنے بیڈروم کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ "آئی وش یو گڈلک۔"

کاشف اکبر اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب اس نے بیڈروم کے اندر جاکر دروازے کو بند کرلیا تو وہ وہاں سے چلتا ہوا' سیڑھیاں چڑھتا ہوا فرسٹ فلور کے ایک کمرے میں آیا۔ دروازے کو اندر سے بند کیا پھر موبائل فون نکال کر خفیہ ہاتھ سے رابطہ کیا۔ پہلے سیکرٹری کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد خفیہ ہاتھ کی آواز آئی۔ "کیا تم نے دوگھنٹے سے پہلے فیصلہ کرلیا ہے؟"

"جی ہاں۔ آپ کی خاطر میں اپنی سب سے عزیز ہستی کی قربانی دوں گا۔ آپ تمام میڈیاز کے ذریعے عوام کو بتائیں گے مجھے دھمکیاں دی جارہی ہیں' کوئی اجنبی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ میری جان سے زیادہ عزیز شریکِ حیات دردانہ بیگم کو کسی وقت بھی قتل کر سکتا ہے۔"

"واہ مسٹر کاشف! تم نے دل خوش کردیا۔ دردانہ کو ہلاک کیا جائے گا تو عوام کو تم سے ہمدردی ہوگی۔ پہلے تمہارے ایک اہم صوبائی لیڈر کو ہلاک کیا گیا پھر دردانہ کو ہلاک کر دیا گیا۔ تم ایک مظلوم سیاست داں بن جاؤ گے اور تمہارا ووٹ بینک' نیک بخت سے زیادہ بڑھ جائے گا۔"

کاشف اکبر نے کہا۔ "دردانہ کہہ رہی تھی کہ وہ آج شام کو مرگلہ والے بنگلے میں جائے گی۔ اگر وہ کل کے اخبارات میں پڑھے گی کہ کسی اجنبی نے اسے قتل کرنے کی دھمکی دی ہے تو وہ میری سازش کو سمجھ لے گی۔"

"تمہاری کوشش یہ ہوگی کہ وہ کل صبح کا اخبار نہ پڑھ سکے۔ تم بھی یہی کوشش کرنے کے لئے اس کے ساتھ مرگلہ جاؤ۔ اگر کرائے کے قاتلوں کو وہاں پہنچنے میں کسی وجہ سے دیر ہوجائے تو اخبارات کو دردانہ تک نہ پہنچنے دو۔ صبح اس کے بیدار ہونے سے پہلے تمام اخبارات جلادو۔"

"ٹھیک ہے سر! میں اس کے ساتھ مرگلہ جاؤں گا۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ فون بند کر کے دروازہ کھول کر سیڑھیاں اترتا ہوا گراؤنڈ فلور پر آیا۔ دردانہ کے بیڈروم کا دروازہ پہلے کی طرح بند تھا۔ وہ ایک صوفے پر اطمینان سے بیٹھ کر دل ہی دل میں بولا۔ "اگر وہ بیوہ ہو کر میرا سب کچھ حاصل کرسکتی ہے تو میں بھی رنڈوا بن کر اقتدار کی کرسی تک پہنچ سکتا ہوں۔"

اس نے دوگھنٹے بعد دردانہ سے کہا۔ "میں پہلے سیاست داں نہیں تھا۔ ایک مل اونر تھا۔ شادی سے پہلے تم سے دوستی ہوئی تو تم مجھے سیاست کی طرف لانے لگیں اور میں تمہارے عشق میں سیاست داں بنتا گیا۔ شادی کے بعد ہمارا ایک بیٹا پیدا ہوا' اس وقت تک تمہارے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے مجھ میں سیاسی پختگی پیدا ہوگئی۔ دوسری زچگی کے بعد تم نے مجھے صرف ایک بیٹی کا باپ ہی نہیں' اس ملک کا حکمران بنادیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم سے سیاسی جوڑ توڑ سیکھتے سیکھتے ایک مل اونر سے ملک کا حکمران بن جاؤں گا۔"

وہ بولی۔ "تم بہت لمبی تمہید باندھ رہے ہو۔ آئندہ حکمران بننے کی بات کرو۔"

"میں تمہارے مشورے کے خلاف بات نہیں کرسکتا۔ میں ایک ماں کی قربانی دے کر حکمران بنوں گا تو ہمارا خاندان' شاہی خاندان کہلاتا رہے گا۔"

"اب تم عقل کی باتیں کر رہے ہو۔ برصغیر کی تاریخ میں یہی ہوتا آیا ہے۔ بھائی اپنے بھائی کو اور بیٹا اپنے باپ کو قتل کر کے حکمران بنتا رہا ہے۔ سیاست میں رشتے داری کی اہمیت نہیں ہوتی۔ تخت نشینی کے لئے ماں باپ کو بھی قبر نشین بنادیا جاتا ہے۔"

"میں نے خفیہ ہاتھ کو یہ فیصلہ سنادیا ہے کہ ایک اجنبی نے فون پر دھمکی دی ہے کہ وہ میری امی کو ہلاک کردے گا۔ یہ خبر کل کے اخبارات میں شائع ہوگی۔"

وہ خوش ہوگئی۔ انہوں نے وہ رات بڑے پیار سے گزاری۔ وہ کہتا رہا۔ "تم نے

مجھے فرش سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا ہے۔ اب میں تمہیں آسمان سے بھی زیادہ بلندیوں پر پہنچادوں گا۔"

"میں ایسا ہی خاوند چاہتی تھی جو میرے مشوروں پر عمل کرتا رہے اور میرے ڈیڈی کی سیاسی پارٹی کو ہمیشہ حکمران پارٹی بنائے رکھے۔ میں نے خوب سوچ سمجھ کر پہلے تم سے محبت کی اور پھر شادی کی۔ آئندہ ہمارے بچے بھی وقت کے ساتھ ساتھ سیاسی ہتھکنڈے سیکھتے رہیں گے اور شاہی خاندان کے افراد کہلاتے رہیں گے۔"

وہ رات دو بجے تک اسے پیار سے جگاتا رہا تاکہ وہ دیر سے سوئے اور صبح دیر تک سوتی رہ جائے۔ جب وہ گہری نیند میں ڈوب گئی تو وہ ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ ایک ملازم کو سختی سے تاکید کی کہ صبح آنے والے تمام مختلف اخبارات پہلے اسے ڈرائنگ روم میں لاکر دے۔ وہ کبھی صوفے پر بیٹھتا' کبھی اٹھ کر ٹہلتا رہا۔ فکر اور پریشانی سے نیند نہیں آرہی تھی۔ خفیہ ایجنسی کے قاتلوں کے متعلق سوچتا رہا کہ پتا نہیں وہ صبح کس وقت آئیں گے اور خاموشی سے واردات کر کے چلے جائیں گے۔ قتل اور ڈکیتی جیسے چھپ کر کرنے والے کام رات کو کیے جاتے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ قاتل رات کو آتے' پتا نہیں وہ صبح ہونے کے بعد کیوں آئیں گے؟

اس رات وہ سو نہ سکا۔ بے چینی سے جاگتا رہا۔ آخر صبح تو ہونی تھی سو ہوگئی۔ وہ بنگلے کے پہلے کمرے میں آیا تھا۔ ملازم نے باہر سے آکر دروازہ کھولا۔ اس کے ہاتھوں میں مختلف اردو اور انگریزی اخبارات تھے۔ اس نے فوراً ہی اٹھ کر آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں سے اخبارات لیے پھر ان میں سے ایک اخبار لے کر باقی کو سینٹر ٹیبل پر رکھا۔ اسے کھول کر پڑھا۔ پہلے صفحے کے درمیانی حصے میں لکھا تھا کہ.......... کاشف اکبر کو قتل کرنے کی دھمکیاں دی جارہی ہیں۔ تفصیلی خبر یہ تھی کہ پچھلے دو دنوں سے دو بار کاشف اکبر صاحب کو کسی اجنبی نے فون کے ذریعے قتل کرنے کی دھمکیاں دی ہیں۔ اس نے بھی حمزہ اور راجہ کی طرح دعویٰ کیا ہے کہ وہ کاشف اکبر کو چوبیس گھنٹے کے اندر ہلاک کرے گا۔

وہ پڑھ کر غصے میں جھنجلاتے ہوئے بولا۔ "کیا بکواس ہے۔ الٹی خبر چھاپ دی ہے۔ قاتل نے دردانہ کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔ اس اخبار میں غلطی سے دردانہ کی جگہ میرا نام چھپ گیا ہے۔"

وہ اس اخبار کو ایک طرف پھینک کر دوسرا اٹھانے کے لئے سینٹر ٹیبل کی طرف پلٹا تو دردانہ بیگم کو دیکھ کر چونک گیا۔ وہ دوسرا اخبار اٹھا کر پڑھتے ہوئی بول رہی تھی۔ "اس

اخبار میں بھی وہی الٹی خبر شائع ہوئی ہے۔ کسی اجنبی نے مجھے نہیں' تمہیں قتل کرنے کی دھمکی دی ہے۔"

وہ پریشان ہوکر تیسرا پھر چوتھا اخبار اٹھا کر سرسری طور پر پڑھنے لگا۔ وہ آخری اخبار کو پھاڑتے ہوئے دردانہ کو گھور کر دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم مسکرا رہی ہو؟"

"اس بات پر مسکرا رہی ہوں کہ تم تمام کہاوتیں بھول جاتے ہو کم از کم یہ کہاوت یاد رکھتے کہ بلی نے شیر کو تمام گر سکھائے لیکن درخت پر چڑھنا نہیں سکھایا۔ پہلوان اپنے چیلے کو تمام داؤ سکھا دیتا ہے لیکن اپنے بچاؤ کا ایک آخری داؤ چھپا کر رکھتا ہے۔ میں نے سیاست کے تمام داؤ پیچ سکھائے۔ آج آخری داؤ سیکھنے کے بعد تم اسے استعمال کرنے کے قابل نہیں رہو گے۔ پیچھے دیکھو۔"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے پر دو افراد سر پر پگڑی اور منہ پر ڈھاٹا باندھے کھڑے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں کلاشنکوف تھیں اور ان کی گنوں کا رخ کاشف اکبر کی طرف تھا۔ اس نے سہم کر دردانہ سے کہا۔ "مم.......... میں تمہارا مجازی خدا ہوں۔ م.......... میں.........."

وہ سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکالتے ہوئے بولی۔ "ہم دونوں کا مجازی خدا خفیہ ہاتھ ہے۔ تم سمجھتے تھے' میں سیاست سے دور ہوچکی ہوں۔ جبکہ اپنی پارٹی کے بڑے بڑے سیاست دانوں سے میرا رابطہ رہا کرتا تھا پھر میں ایک باحیا مشرقی عورت ہوں۔ خفیہ ہاتھ جیسے مجازی خدا سے ناتا کیسے توڑ سکتی ہوں۔ اگر ناتا توڑ دیتی تو آج یہ گن مین مجھے قتل کرنے آتے۔"

دردانہ نے ہونٹوں کے درمیان سگریٹ رکھتے ہوئے لائٹر کے ننھے سے شعلے کو بھڑکاتے ہوئے کہا۔ "شوٹ ہم۔"

تڑ۔ تڑا تڑ کی آوازوں کے ساتھ دوگنوں سے کئی گولیاں چلنے لگیں۔ وہ اپنا سگریٹ سلگانے لگی پھر پہلا کش لگا کر دھواں چھوڑتے ہی فائرنگ کی آواز رک گئی۔ وہ سگریٹ کا دوسرا کش لگاتے ہوئے اپنے مجازی خدا کے پاس آئی۔ وہ خون سے لت پت آدھا صوفے پر اور آدھا فرش پر تھا جسم ساکت ہوگیا تھا اور دیدے پھیل گئے تھے۔ وہ اس کے منہ پر دھواں چھوڑنے لگی۔

دنیا والوں کے سامنے اپنی بیوی پر رونے اور اس کی قبر پر اگربتی کا دھواں پھیلانے سے پہلے وہ کامیابی کا دھواں اس کے منہ پر پھونک رہی تھی۔ پتا نہیں مرد اپنی مردانگی کے زعم میں یہ کیوں نہیں مانتا کہ عورت اسے ایک پھونک میں اُڑا دیتی ہے۔

☆======☆======☆

راجہ نواز نے اخبار کو ایک طرف پھینکتے ہوئے حمزہ کو دیکھا پھر کہا۔ "ہم سے ایک غلطی ہوگئی۔ ہمیں فون پر ٹینا وغیرہ کو دھمکیاں نہیں دینی چاہیے تھیں۔ انہوں نے فون پر دی جانے والی دھمکیوں کو ریکارڈ کیا ہوگا۔ اب کاشف اکبر کے قتل کے بارے میں اخبارات کے ذریعے کہا جارہا ہے کہ ایک اجنبی نے اسے قتل کرنے کی دھمکیاں دی تھیں۔ اس بار خفیہ ہاتھ نے ہمارے نام نہیں لئے۔ دھمکیاں دینے والے کہا ہے۔"

حمزہ نے کہا۔ "وہ سمجھتا ہے کہ ہمارا نام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب پہلی تین وارداتیں ہم نے کی ہیں۔ یعنی ٹینا کو اغوا کیا ہے۔ سفیر کو مار ڈالا ہے اور اس کے چپڑاسی کو بھی غائب کردیا ہے۔ ہم نے ان میں سے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس ہم نے تردیدی بیان دیا تھا اور ان جرائم کے مرتکب ہونے سے انکار کیا تھا۔ لہٰذا اس بار ہمیں اجنبی کہا گیا ہے تاکہ عوام کو ذہنی طور پر الجھایا جائے۔ ان کے اندر شکوک پیدا ہوں گے کہ ہم نے پہلے اپنا نام بتا کر وارداتیں کیں۔ اب مزید دہشت گرد نہ کہلانے کے لئے خود کو اجنبی کہہ رہے ہیں۔"

"کاشف اکبر کا سب سے بڑا سیاسی حریف نیک بخت ہے۔ اس کی ہلاکت کا الزام نیک بخت پر آنا چاہیے۔ عوام کو اس پر شبہ کرنا چاہیے۔ جب اس کا صوبائی لیڈر رحمان چنا ہلاک کیا گیا تھا تو کاشف اکبر نے نیک بخت پر ہی الزام لگایا تھا۔ موجودہ حالات میں یہ سمجھ نہیں آرہا ہے کہ خفیہ ہاتھ نے کاشف اکبر کو کیوں قتل کرایا ہے۔ جس نیک بخت کو یہاں کا حکمران بنانا چاہتا ہے' اسے عوام کی نظروں میں مشکوک کیوں بنایا جارہا ہے۔"

"خفیہ ہاتھ اپنے دونوں چہیتوں میں سے ایک کو قتل کرانے اور دوسرے کو مشکوک بنانے کے بعد کیا کرنا چاہتا ہے؟ یہ میں سمجھ سکتا ہوں۔ کیا تم سمجھ رہے ہو؟"

"یار! تیرے ساتھ رہ کر میں سیاسی پیش گوئی کر سکتا ہوں۔ وہ ان دونوں چہیتوں میں سے کسی کو لفٹ نہیں دے گا۔ کسی تیسری کٹھ پتلی کو نچائے گا۔"

"کٹھ پتلی مرد بھی ہو سکتا ہے اور عورت بھی۔ دردانہ بیگم خاندانی سیاست داں ہے۔ کاشف اکبر اسی کو سیڑھی بنا کر سیاست داں بنا تھا پھر حکمران بن گیا تھا۔ دردانہ نے اسے تخت پر بٹھایا پھر خفیہ ہاتھ سے مل کر سازش کرکے اس بے چارے کا تختہ کردیا ہے۔ اسے قبر میں پہنچا دیا ہے۔ اب وہ اپنے باپ کی قائم کی ہوئی پارٹی کی سب سے بڑی لیڈر بنے گی اب وہ ایک مظلوم سیاست داں بیوہ ہے۔ الیکشن میں اسی کے جیتنے کے زیادہ امکانات ہیں۔"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ دردانہ کی سازشی سیاست نے اپنے ہی شوہر کو مار ڈالا ہے اور خفیہ ہاتھ دردانہ کا ساتھ دے رہا ہے۔"

"کیٹی بندر کے کیس میں کاشف اکبر کی حکومت گئی۔ اس کے بعد دردانہ کئی بار بڑے ممالک کا دورہ کرچکی ہے اور خفیہ ہاتھ سے اس کی گفتگو ہوتی رہی ہے۔ قومی خزانہ لوٹنے اور دوسرے سیاسی کرپشن کے ثبوت چھپائے رکھنے کے لئے وہ خفیہ ہاتھ کا سہارا لیتی رہی ہے۔"

"ہوں۔ خفیہ ہاتھ کے پہلے دو چہیتے تھے۔ اب ایک چہیتا اور ایک چہیتی ہے۔ ہم جس طرح حالات کا تجزیہ کر رہے ہیں' اس کے مطابق نیک بخت کی پوزیشن کمزور ہو رہی ہے۔"

حمزہ نے موبائل سینٹر ٹیبل پر سے اٹھا کر نمبر پنچ کرتے ہوئے کہا۔ "چلو معلومات حاصل کرنے کے لئے کچھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں۔"

رابطہ ہونے پر ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ "ہیلو میں دردانہ بیگم کی پرسنل سیکرٹری بول رہی ہوں۔ آپ جو بھی ہیں' پیغام نوٹ کرا دیں۔ بیگم صاحبہ ابھی صدمے سے نڈھال ہیں۔ وہ کسی سے بھی بات نہیں کریں گی۔"

"اتفاق سے میں بھی پرسنل سیکرٹری ہوں۔ آپ ان کے کان میں صرف اتنا کہہ دیں۔ سیکرٹ ہینڈ۔"

"جسٹ اے منٹ! میں ابھی ان سے کہتی ہوں۔"

حمزہ نے راجہ نواز کو موبائل فون دیتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "پرسنل سیکرٹری کی آواز۔"

راجہ نے فون لے کر کان سے لگایا۔ چند سیکنڈ کے بعد دردانہ کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو۔ میں دردانہ بیگم بول رہی ہوں۔"

"ہیلو میڈم۔ جسٹ اے منٹ۔ سر آپ سے بات کریں گے۔"

راجہ نے فون کے نتھنے سے مائیک پر ہاتھ رکھ کر کھنکار کر اپنے گلے کو صاف کیا۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "کیا پوزیشن ہے؟"

دردانہ نے کہا۔ "کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میری پارٹی کے تمام سیاست کے ہر حصے سے کاشف کی تدفین کے لئے آئے تھے۔ آج دوسرا دن سب صبح چنے پڑھ کر دوسرے عام تعزیت کرنے والوں کے رخصت گے پھر شام تک پارٹی کے بڑے اور اہم علاقائی لیڈروں کے ساتھ

"یار! اس کی کا سیکرٹری نہیں بول رہا

"میٹنگ کے فوراً بعد مجھ سے رابطہ کر کے بتاؤ کہ وہ تمام اہم علاقائی لیڈر تمہیں پارٹی کا سربراہ تسلیم کر رہے ہیں یا نہیں؟"

"سر! ان کے تو باپ بھی مجھے سربراہ تسلیم کریں گے۔ آخر وہ سب میرے ہی باپ کی قائم کی ہوئی سیاسی پارٹی کے وفادار ہیں۔ پچھلی بار اقتدار میں رہنے کے دوران میں انہوں نے بڑے مفادات حاصل کئے تھے۔"

"تمہارے باپ کی قائم کی ہوئی سیاسی پارٹی ملک میں بہت مقبول ہے لیکن عوام کی بات کرو۔ کیا وہ ایک عورت کی حکمرانی پسند کریں گے؟"

"یہاں علماء کرام کے درمیان بھی اختلافات ہیں۔ میں چند معروف علماء کرام کے منہ موتیوں سے بھردوں گی۔ وہ میرے حق میں فتویٰ دیں گے۔ ایک بیوہ ہونے والی عدت کے ایام گزارنے کے دوران میں کسی پرائے مرد کے سامنے نہیں آتی لیکن میرے زر خرید علماء ملک اور قوم کی بہتری کے حوالے سے فتویٰ دیں گے کہ میں انتخابی مہم جاری رکھنے کے لئے اپنی پارٹی کے سیاست دانوں سے ملاقاتیں کر سکتی ہوں اور جلسوں میں لاکھوں عوام کے سامنے تقاریر کر سکتی ہوں۔ میں نے تمام انتظامات کر رکھے ہیں۔"

"ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تم کچھ کرنے سے پہلے زبردست پلاننگ کرتی ہو پھر بھی ہم عوام کا ری ایکشن دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم پرسوں تک کسی بڑے جلسے میں پارٹی کے سربراہ کی حیثیت سے عوام کو مخاطب کرو۔"

"میں پرسوں سیاہ ماتمی لباس پہن کر تین بڑے شہروں میں دوپہر' شام اور رات کو لاکھوں کروڑوں عوام کو مخاطب کرنے کے لئے جلسوں کی تیاریاں کرا رہی ہوں۔"

"آل رائٹ۔ میں نتیجہ دیکھوں گا۔ میری خفیہ ایجنسیاں مجھے رپورٹ دیں گی کہ عوام میں تمہاری مقبولیت کا گراف کتنا اوپر جارہا ہے۔"

راجہ نے فون بند کر کے حمزہ کو بتایا کہ دردانہ ایک پارٹی سربراہ کی حیثیت سے عوام کے سامنے آنے کے لئے کیسی پلاننگ پر عمل کر رہی ہے۔

حمزہ نے مسکرا کر کہا۔ "تم آوازوں اور لہجوں کی خوب نقالی کرتے ہو۔ دردانہ نے شبہ نہیں کیا اور بہت کچھ اگل دیا۔ اب ذرا نیک بخت کی خبر لو۔"

٥سہ اجہ نے رابطہ کیا پھر خفیہ ہاتھ کے سیکرٹری کی آواز میں کہا۔ "ہیلو مسٹر نیک بخت! تخت پر بٹھایا چٹر کاشف اکبر کی ہلاکت کا ردِ عمل کیا ہو رہا ہے؟ اور کیا آپ نے میڈم قبر میں پہنچا دیا ہے ہے؟"

اب وہ ایک مظلوم۱۔ "میں سر سے براہِ راست گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

ہیں۔"

"سر بہت مصروف ہیں۔ آپ ان کے سوالات کے جواب دیں۔"

"جواب کیا دوں؟ کاشف اکبر کی ہلاکت کے بعد دردانہ بیگم ہمدردیاں حاصل کر رہی ہیں۔ رحمان چنا کی ہلاکت کے بعد کاشف اکبر کی ہلاکت نے مجھے مشکوک بنا دیا ہے۔ لوگ ان وارداتوں کو میری سازش سمجھ رہے ہیں۔ حمزہ اور راجہ میری مقبولیت کا گراف گراتے جارہے ہیں۔ کیا وہ دونوں نادیدہ ہیں کہ خفیہ ایجنسی کے سراغ رساں انہیں ڈھونڈ نہیں پارہے ہیں۔"

"انہیں تلاش کیا جارہا ہے۔ سر نے حکم دیا ہے کہ ان کی ایک جھلک بھی نظر آئے تو فوراً انہیں گولیوں سے چھلنی کردیں۔"

"یہ میں ایک عرصے سے سنتا آرہا ہوں لیکن وہ نہ تو نظر آتے ہیں' نہ کتے کی موت مارا جاتا ہے۔ اب تو صرف دعائیں مانگتا رہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو ایک ہی دن اٹھالے۔"

"غلط دعائیں مانگ رہے ہو اور وہ قبول ہورہی ہیں۔ اللہ انہیں اٹھاتا جارہا ہے اور تمہیں گراتا جارہا ہے۔"

"ہاں یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اب دعاؤں کے الفاظ بدل دوں گا۔"

"آپ نے دردانہ بیگم سے تعزیت کی ہے؟"

"رسمی طور پر کرنا ہی تھا لیکن تعزیت کرتے وقت یوں لگ رہا تھا جیسے میری سیاست کا تعزیہ نکالا جارہا ہے۔"

اس بات پر راجہ کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ بے اختیاری میں آواز بدل گئی۔ نیک بخت نے چونک کر پوچھا۔ "کون ہو؟ تم کون ہو؟"

"وہی ہوں جس کی موت کی دعائیں مانگتے رہتے ہو۔"

"یونان سینں! تم راجہ نواز ہو۔ مجھے بے بس اور کمزور سمجھ کر تماشہ بنا رہے ہو۔ جبکہ میں کمزور نہیں ہوں۔ بے بس نہیں ہوں۔ میرا سب سے بڑا سیاسی حریف جہنم میں پہنچ چکا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس کی بیوہ میری مقابلے میں الیکشن جیت سکے گی؟"

"یہ تو وطن کو گروی رکھنے والے جانتے ہوں گے کہ جیتنے کے لئے کس نے کس حد تک اپنی قومی غیرت کو خفیہ ہاتھ کے ہاتھوں میں دیا ہے۔"

نیک بخت نے فون بند کردیا۔ راجہ نے اپنا فون بند کرتے ہوئے کہا۔ "یار! اس کی ایک بات پر بے اختیار ہنسی آگئی۔ اسے شبہ ہوگیا کہ خفیہ ہاتھ کا سیکرٹری نہیں بول رہا ہے۔"

وہ بتانے لگا کہ نیک بخت اس سے کیا کہہ رہا تھا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے صوفوں پر سے اٹھ گئے۔ ایک کوٹھی کی چار دیواری میں تمام دن گزار چکے تھے۔ شام کو کھلی فضا میں سانس لینا اور ذرا تفریح کرنا چاہتے تھے۔ اس کوٹھی کے ایک بیڈ روم میں وہ رہتے تھے۔ اس کے باقی حصوں میں ایک میاں بیوی اپنے جوان بیٹے اور دو بیٹیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ گاڈ فادر ہاشم نے انہیں عارضی طور پر چھپنے کے لئے اس کوٹھی کا انتخاب کیا تھا۔ تاکہ پولیس اور خفیہ ایجنسیوں والے کسی مکان میں ان دونوں کو یکجا دیکھ کر ان پر شبہ نہ کریں۔ اتنی بڑی فیملی کے ساتھ رہنے کے باعث وہ محفوظ تھے۔

انہوں نے لباس تبدیل کرنے کے دوران میں فیصلہ کیا کہ ایک ساتھ باہر وقت نہیں گزاریں گے۔ حمزہ نے ہاشم کے ذاتی نمبر پر رابطہ کیا تو کوئی جواب نہیں ملا' وہ اپنی باجی آمنہ کی حفاظت کی خاطر لندن گیا ہوا تھا۔

اس نے ہاشم کے دست راست امانت شیخ سے رابطہ کیا۔ اس نے کہا۔ "باس لندن گئے ہیں۔ان کی عدم موجودگی میں آپ کی تمام ضروریات میں پوری کروں گا۔ حکم کریں۔"

"میں اور راجہ ابھی کوٹھی سے نکل رہے ہیں۔ پتا نہیں واپسی کب تک ہوگی۔ ہماری سیکورٹی کے لئے آپ کے جتنے مسلح افراد ہیں' انہیں اطلاع دیں کہ میں اور راجہ الگ الگ سمت جارہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہم ڈاکٹر آمنہ اور فرمان کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔"

امانت شیخ بتانے لگا کہ کالیا کا آپریشن لندن میں کیا جائے گا اس لئے "را" والے مجبور ہو کر ڈاکٹر آمنہ خاتون کو بھی لندن لے گئے ہیں۔

حمزہ نے لندن کے کوڈ نمبرز ڈائل کرکے ہاشم کے ذاتی فون نمبر ڈائل کئے۔ ہاشم نے اسے بتایا کہ تابانی پہلے دشمن بن کر ڈاکٹر آمنہ کو بھارت لے گیا تھا مگر اسے غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ اس نے ڈاکٹر آمنہ کی سلامتی کے لئے کالیا کو اغوا کیا تھا اور "را" کے ڈی جی کو مجبور کیا تھا کہ ڈاکٹر آمنہ کی سلامتی کی ضمانت دینے کے لئے کالیا کا آپریشن لندن میں کیا جائے۔ اب ہاشم اپنے خاص آدمیوں کے ساتھ اپنی باجی آمنہ کی حفاظت کے لئے گیا ہے۔

حمزہ نے پوچھا۔ "بھارت میں فرمان سے کیسے رابطہ ہوگا؟"

"فرمان' تابانی اور پوجا بھارت میں علاقے تبدیل کرتے جارہے ہیں۔ اس طرح وہاں کی پولیس اور جاسوس انہیں تلاش نہیں کرسکیں گے۔ وہ تینوں ہم سے بعد میں رابطہ کریں گے۔"

حمزہ فون پر گفتگو کررہا تھا۔ راجہ لباس تبدیل کرکے کوٹھی کے باہر احاطے میں آیا۔ وہاں حمزہ اور راجہ کے لئے الگ الگ کاریں تھیں۔ ان کے ڈرائیور بھی ہاشم کی طرف سے بھیجے ہوئے مسلح گارڈز تھے۔ راجہ نے ڈرائیور سے کہا۔ "تم میری جگہ پچھلی سیٹ پر ایک مالک کی حیثیت سے باوقار انداز میں بیٹھو۔ میں کار ڈرائیو کروں گا۔"

ڈرائیور نے کہا۔ "سر! ابھی قائم مقام گاڈ فادر امانت شیخ نے اطلاع دی ہے کہ دوسرا ڈرائیور آپ کو لے جائے گا اور میں اپنے ایک ساتھی کے ساتھ موٹر سائیکل پر دور ہی دور سے آپ کی نگرانی کروں گا۔ آپ ڈرائیونگ سیٹ پر تشریف رکھیں۔ میں دوسرے گارڈ کو بھیج رہا ہوں۔"

وہ کوٹھی کے احاطے کے باہر گیا۔ راجہ نواز اسٹیئرنگ سیٹ پر آگیا۔ تین یا چار منٹ کے بعد دوسرے گارڈ نے آکر اسے سلام کیا پھر پوچھا۔ "کیا واقعی آپ کار ڈرائیو کریں گے۔ ابھی محمد حسین نے مجھ سے کہا تو یقین نہیں آیا۔ یہ کچھ عجیب سا لگے گا۔ میں اپنے باس کا ایک معمولی کارکن ہوں اور آپ.........."

راجہ نے بات کاٹ کر کہا۔ "زیادہ نہ بولو۔ پیچھے بیٹھ جاؤ۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ راجہ نے کار اسٹارٹ کی پھر اسے ڈرائیو کرتا ہوا باہر مین روڈ پر آیا۔ اس نے آئینے کا رخ بدل کر دیکھا۔ اس کوٹھی سے دور نکل آنے کے بعد بہت پیچھے سیکورٹی گارڈ محمد حسین ایک موٹر سائیکل پر آرہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس کی نگرانی کے لئے دو گارڈز موٹر سائیکل پر ہوں گے لیکن وہ تنہا تھا اور دوسری کوئی موٹر سائیکل نظر نہیں آرہی تھی۔

راجہ نے پیچھے بیٹھے ہوئے گارڈ سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"سر! میرا نام جان محمد ہے۔ میں آٹھ برس سے اپنے باس کا خدمت گار ہوں؟"

"اور وہ گارڈ محمد حسین بھی پرانا خدمت گار ہے؟"

"نہیں جناب! یہی کوئی پانچ یا چھ ماہ سے آزمائشی ڈیوٹی پر رہتا ہے۔ باس نے میرے جیسے دوسرے پرانے گارڈز کو تاکید کی ہے کہ ہم مختلف آزمائشی مرحلوں میں اس کی وفاداری کو آزماتے رہیں۔" ۔رھیاں چڑھتا ہوا اس سا پہ۔

"تو پھر اس وقت بھی آزمانا چاہیے۔" ے کے بعد جان محمد دکھائی دیا۔ وہ ایک

"آپ ضرور آزمائیں۔ ویسے اب تک سا آیا۔ اس کے دائیں بائیں وہی دو آدمی

راجہ نے راستہ بدل دیا۔ لاہور کے جان محمد کے پیچھے جاتے ہوئے دیکھ چکا

اور داتا دربار کی طرف بہت زیادہ ٹریفک جیب میں تھے۔ گویا وہ جان محمد کو گن پوائنٹ

اتنا ہجوم رہتا ہے کہ سب ایک دوسرے کو اوور ٹیک کر کے آگے جانے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ ٹریفک پولیس والے کبھی ترتیب وار ان کے گزرنے کا راستہ بناتے ہیں اور کبھی ہوٹلوں میں بیٹھ کر چائے یا لسی پیتے رہتے ہیں۔ راجہ ایسی جگہ پیچھے آنے والے محمد حسین کو ڈاج دے کر اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ واپس گھوم کر لکشمی چوک کی ایک گلی سے گزرتا ہوا مال روڈ پر آگیا۔ اس نے گلبرگ پہنچ کر کار روک دی پھر اسٹیئرنگ سیٹ سے باہر آکر جان محمد سے بولا۔ "اب تم ڈرائیو کرو اور ماڈل ٹاؤن چلو۔"

جان محمد اسٹیئرنگ سیٹ پر آیا۔ راجہ نے پچھلی سیٹ پر آکر دروازے کو بند کیا۔ جان محمد ڈرائیو کرتا ہوا جانے لگا۔ راجہ جگہ بدلتے وقت عقب نما آئینے میں دور تک یہ دیکھ کر مطمئن ہوگیا تھا کہ اس کے تعاقب میں کوئی موٹر سائیکل نہیں ہے اور نہ ہی اس کی کار رکنے اور جگہ بدلنے کے دوران میں کوئی دوسری گاڑی ان کے آگے بڑھنے کے انتظار میں کہیں رکی تھی۔

آگے بڑھتے رہنے کے دوران میں راجہ بار بار گھوم کر پیچھے دیکھتا رہا۔ یہ بات سمجھ میں آگئی کہ محمد حسین اگر وفادار نہیں ہے تو اس نے دشمنوں کو کار کا رنگ' پلیٹ نمبر اور ماڈل بتا دیا ہوگا۔ راجہ یہ نہیں جان سکتا تھا کہ دشمن کتنے ہیں اور کتنی گاڑیوں میں اس کے آگے پیچھے رہ کر اس کا تعاقب کر سکتے ہیں۔

اس نے موبائل کے ذریعے حمزہ سے پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟"

"ابھی شادمان ٹاؤن میں ہوں۔ یہاں سے گزر کر مال روڈ جاؤں گا۔"

"میں ماڈل ٹاؤن جا رہا ہوں۔ ہمارے خلاف شاید کوئی سازش ہو رہی ہے۔ میں بھی دشمنوں کو سامنے آنے پر مجبور کردوں گا۔ میری اور تمہاری کاروں کے نمبر پلیٹ' کلر اور ماڈل وغیرہ بتا دیئے گئے ہوں گے۔ اپنی کار فوراً کہیں چھوڑو اور کسی ٹیکسی میں ماڈل ٹاؤن کے شاپنگ پلازا کی طرف آؤ۔"

اس نے فون بند کر کے ڈرائیور جان محمد سے کہا۔ "اپنا ریوالور مجھے دو۔"

اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ کو سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے ریوالور نکال [illegible] ب ہم اپنے خاص اد [illegible] فاضل بلٹس ہیں؟"

حمزہ نے پوچھا۔ "بھارت میں فرمان [illegible] ح لوڈ ہے۔"

"فرمان' تابانی اور پوجا بھارت میں علا [illegible] کی پولیس اور جاسوس انہیں تلاش نہیں کر [illegible] کریں گے۔"

[illegible] ں نکال کر اسے واپس دیتے ہوئے کہا۔ [illegible] اسلحہ فروخت کرنے کی دکان ہے' اس [illegible] ں خریدنے کے لئے جاؤ۔ وہاں شاپنگ

پلازا میں خریداروں کا ہجوم ہوتا ہے۔ کوئی بھی دشمن وہاں تم پر گولی نہیں چلائے گا۔ اس ہجوم میں قاتل کو فرار ہونے کا موقع نہیں ملے گا۔ تم کار سے اتر کر ایسے انداز میں جاؤ گے کہ تم پر راجہ نواز ہونے کا یقین ہو جائے۔"

"سمجھ گیا جناب! اگر وہ مجھے گن پوائنٹ پر کہیں لے جائیں گے تب بھی راجہ نواز ہونے سے اس طرح انکار کروں گا کہ انہیں میرے انکار سے یقین ہو جائے کہ میں ہی راجہ نواز ہوں۔"

"شاباش' بے باکی سے حالات کا سامنا کرتے رہو گے۔ میں تمہیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑوں گا۔ یہ یقین رکھو کہ وہ تمہیں گولی نہیں ماریں گے۔ تمہیں راجہ نواز سمجھ کر بہت سے اہم راز حاصل کرنے کے لئے کہیں لے جائیں گے۔"

جان محمد نے شاپنگ پلازا کی پارکنگ کی جگہ پر گاڑی روک دی۔ راجہ نے کہا۔ "یہاں سے سیدھے اسلحے کی دکان پر نہ جاؤ۔ پہلے کسی جنرل اسٹور میں جاکر شیونگ کے لئے بلیڈ خریدو۔ اس طرح مجھے ذرا ٹھہر کر تمہارے پیچھے آنے کا موقع ملے گا اور میں دشمنوں کو تاڑتا رہوں گا۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا پھر ایک اسمارٹ جوان کی طرح سینہ تان کر چلتا ہوا شاپنگ پلازا کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا جانے لگا۔ راجہ پچھلی سیٹ پر بیٹھا آگے پیچھے اور دائیں بائیں دیکھتا رہا۔ اسے شبہ ہوا کہ دو آدمی اس کے پیچھے دانستہ سیڑھیوں پر چڑھتے جا رہے ہیں۔ وہ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر باہر آیا پھر اسے بند کر کے تیزی سے ادھر جانے لگا۔ جدھر شاپنگ پلازا میں جانے کے لئے دوسری سیڑھیاں اور کھلی جگہ تھی۔ وہاں ایک ٹیکسی کے ساتھ ڈرائیور کھڑا ہوا تھا۔ راجہ نے اس سے کہا۔ "مجھے دو چار گھنٹے کے لئے ٹیکسی چاہیے۔ چلو گے؟"

وہ بولا۔ "حاضر جناب چلئے۔"

راجہ نے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "انتظار کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

اس نے خوش ہو کر وہ نوٹ لیا۔ راجہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اس شاپنگ پلازا کی دکانوں کی راہداری میں آیا۔ ذرا سی تلاش کے بعد جان محمد دکھائی دیا۔ وہ ایک جنرل اسٹور سے بلیڈ کا پیکٹ خرید کر راہداری میں آیا۔ اس کے دائیں بائیں وہی دو آدمی دکھائی دیئے جنہیں راجہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جان محمد کے پیچھے جاتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ دائیں بائیں چلنے والوں کے ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھے۔ گویا وہ جان محمد کو گن پوائنٹ

پر لے جارہے تھے۔ یقیناً محمد حسین نے انہیں یہی بتایا ہوگا کہ راجہ نواز بہت چالاک ہے۔ وہ پچھلی سیٹ پر ڈرائیور کو بٹھا کر خود ڈرائیور بن کر کار چلا رہا ہے۔

اس نے ایک دکان کی آڑ سے دیکھا۔ وہ دونوں جان محمد کو ایک کار کے قریب لے گئے تھے اور اسے جبراً بٹھانے کے لئے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول رہے تھے۔ راجہ تیزی سے چلتا ہوا ٹیکسی کا اگلا دروازہ کھولتا ہوا ڈرائیور سے بولا۔ ”جلدی چلو۔“

ڈرائیور اپنی سیٹ پر آکر ٹیکسی کو اسٹارٹ کرکے ریورس گیئر پر پیچھے لے گیا۔ راجہ نے کہا۔ ”اس سفید کار کے پیچھے چلو‘ جس کا نمبر ایل ایچ دو صفر دو تین چھ ہے۔“

وہ اس کار کے پیچھے جانے کے لئے رفتار بڑھانا چاہتا تھا۔ راجہ نے کہا۔ ”آہستہ چلو۔ اس طرح چلو کہ اس کار والوں کو تعاقب کا شبہ نہ ہو۔“

اس نے کہا۔ ”یہ بات ہے تو پھر کوئی بات نہیں ہے۔ ان کے پیو کو بھی تعاقب کا پتا نہیں چلے گا۔“

”ہوشیاری سے چلوگے تو تمہاری توقع سے زیادہ کرایہ دوں گا۔“

راجہ نے پانچ پانچ سو کے تین نوٹ نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے اطمینان کے لئے دو ہزار ایڈوانس دے چکا ہوں۔“

وہ خوش ہوکر بولا۔ ”باؤ جی! آپ دل کھول کر دے رہے ہیں۔ میں آپ کے لئے جان لڑا دوں گا۔ ان لوگوں سے کوئی پھڈا ہونے والا ہو تو بتا دیں۔ میں ابھی سے تیار رہوں گا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ تم صرف اپنی مہارت دکھاؤ۔ آگے والوں کو شبہ نہ ہونے دو۔“

اس نے فون کے ذریعے حمزہ سے کہا۔ ”وہ میرے دھوکے میں ڈرائیور کو لے جارہے ہیں۔ میں تعاقب کررہا ہوں۔ ماڈل ٹاؤن سے پلٹنے کے بعد وہ لوگ گلبرگ لبرٹی مارکیٹ کے اندر سے گزرتے منی مارکیٹ کی طرف جارہے ہیں۔“

حمزہ جواباً کہہ رہا تھا۔ ”میں ایک ٹیکسی میں ہوں اور تمہاری طرف آرہا ہوں۔“

آگے جانے والی سفید کار ایک کوٹھی کے کھلے ہوئے گیٹ سے احاطے میں داخل ہوگئی۔ راجہ نے حمزہ کو اس کوٹھی کا نمبر اور اسٹریٹ کا نام بتا کر فون بند کیا۔ ڈرائیور نے اپنی ٹیکسی کو......... کچھ دور آگے لے جاکر روک دیا تھا۔

راجہ نے کہا۔ ”تم بہت سمجھ دار ہو۔ تمہیں اس کوٹھی سے اتنی ہی دور آکر رکنا چاہیے تھا۔ اب یہیں میرا انتظار کرو۔“

اس نے لباس کے اندر سے ایک ریوالور نکالا پھر جیب سے ایک سائلنسر نکال کر اسے ریوالور کی نال سے لگا دیا۔ اس وقت تک رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آکر بولا۔ ”میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔“

وہ بولا۔ ”فکر نہ کرو باؤ جی! میں صبح تک یہاں رہوں گا۔“

راجہ تیزی سے چلتا ہوا سامنے والی گلی میں آیا۔ اسٹریٹ لائٹس کے باعث وہاں نیم تاریکی تھی۔ وہ گلی یاد کرکے دائیں طرف مڑ کر اس کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف آیا جہاں وہ لوگ جان محمد کو لے گئے تھے۔ اس نے پچھلے حصے کی باؤنڈری وال سے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک گن مین ماچس کی تیلی جلانے کے بعد سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اتنی دیر میں تیلی کی روشنی میں اس کے آس پاس کوئی دوسرا گن مین نظر نہیں آیا۔ راجہ نے اس کا نشانہ لیا۔ سائلنسر کے باعث چھپاک کی ہلکی سی آواز نکلی۔ اس کے ساتھ ہی وہ گن مین اوندھے منہ گر پڑا پھر وہیں پڑا رہ گیا۔

راجہ دیوار پھاند کر احاطے میں آیا پھر باغیچے کی گھاس پر دوڑتا ہوا کوٹھی کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ جیب سے موبائل نکال کر حمزہ سے بولا۔ ”میں کوٹھی کے پچھلے حصے سے اندر جارہا ہوں۔ مجھے فون پر کال نہ کرنا ورنہ دشمن بزر کی آواز سن لیں گے۔ تم کسی وقت بھی پچھلے راستے سے آسکتے ہو۔“

اس نے فون کو بند کیا پھر اس لاش کو کھینچ کر دیوار سے لگا دیا۔ اس کی کلاشنکوف اٹھا لی۔ دیوار سے لگ کر چلتا ہوا ایک طرف آیا۔ وہاں سے کوٹھی کے اگلے حصے کا آہنی گیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ گیٹ کے دونوں طرف فینسی لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ اگلے حصے میں روشنی کی گئی تھی۔ ان کے خیال میں راجہ ہاتھ آنے والا تھا۔ اس کی مدد کے لئے حمزہ بھی آسکتا تھا اس لیے کوٹھی کے چاروں طرف دوسری کوٹھیوں کی طرح تاریکی نہیں تھی۔

اسے کوٹھی کے اگلے حصے کی طرف دیکھنا تھا کہ وہاں کتنے گن مین ہیں۔

اس نے ریوالور کو لباس کے اندر رکھا۔ کلاشنکوف کو شانے سے لٹکایا پھر ایک پائپ کے ذریعے چڑھتا ہوا پہلی منزل کی چھت کے سرے تک پہنچا۔ وہاں سے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہاں دو گن مین تھے۔ ایک کوٹھی کے اگلے حصے کی طرف منہ کئے دونوں ہاتھوں سے کلاشنکوف تھامے مستعد کھڑا تھا۔ دوسرا چھت کے اس دروازے کی طرف تھا جہاں سے زینہ کوٹھی کے اندر جاتا ہے۔

راجہ پانی کی ٹینکی کی آڑ میں تھا۔ اس نے چھت کی منڈیر پر بیٹھ کر سائلنسر لگا........ ریوالور نکالا پھر زینے کے دروازے کے پاس کھڑے ہوئے گن مین کو گولی ماری۔ وہ کراہتا

ہوا دھڑام کی آواز کے ساتھ گرا۔ دوسرے گن مین نے چونک کر' پلٹ کر اپنے ساتھی کو دیکھا لیکن خاموش گولی چلانے والے کو دیکھنے سے پہلے ہی اسے بھی ایک گولی لگی۔ وہ اچھل کر چھت کے فرش پر گرا۔ بڑا جیدار تھا۔ گولی لگنے کے باوجود کلاشنکوف اٹھا کر اٹھنے لگا۔ راجہ نے دوسری بار فائر کیا۔ اس بار گولی کھا کر' وہ گرا تو پھر نہ اٹھ سکا۔

ریوالور کی چار گولیوں نے بڑی خاموشی سے تین مسلح اشخاص کو ختم کیا تھا۔ چیمبر میں صرف دو گولیاں رہ گئی تھیں۔ راجہ نے جیب سے چار گولیاں نکال کر اسے پوری طرح لوڈ کیا پھر چھت کے سرے پر آکر سامنے والے بڑے آہنی گیٹ کی طرف دیکھا۔ بند گیٹ کے باہر ایک گن مین کھڑا ہوا تھا لیکن راجہ جہاں کھڑا ہوا تھا' اس چھت کے نیچے گراؤنڈ فلور کے بڑے داخلی دروازے پر دو گن مین تھے' جو چھت پر سے نظر نہیں آرہے تھے۔ ویسے وہ اناڑی نہیں تھا۔ اتنا سمجھتا تھا کہ نیچے داخلی دروازے پر بھی ضرور ایک دو گارڈز موجود ہوں گے۔

اس نے نشانہ لے کر ٹریگر دبایا۔ ویسی ہی ہلکی سی پچاک کی آواز کے ساتھ گولی اس کے سر پر لگی جو گیٹ کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ وہ آہنی گیٹ سے ٹکراتا ہوا زمین پر گرا۔ نیچے کھڑے ہوئے دونوں گارڈز نے کہا۔ ”وہ کھڑے کھڑے اچانک گر پڑا ہے۔ کچھ بول نہیں رہا ہے۔ اسے ضرور کچھ ہوا ہے۔“

وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے' محتاط انداز میں ایک دوسرے سے دور رہ کر گیٹ کے قریب پہنچنے لگے۔ ایسے ہی وقت راجہ نے پہلے ایک کو گولی ماری۔ وہ چیخ مار کر گرا۔ دوسرا گارڈ اچھل کر احاطے کی دیوار سے جا کر لگ گیا۔ اِدھر اُدھر آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ گولی گیٹ کے باہر سے چلائی گئی ہے یا اندر سے؟ اس سوال کا جواب راجہ کے خاموش ریوالور سے ملا۔ ایک گولی اس کے شانے پر لگی۔ اس کے ہاتھ سے کلاشنکوف گری۔ اس نے تکلیف سے کراہتے ہوئے گری ہوئی گن کو اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا۔ وہاں راجہ کھڑا ہوا ایک سائے کی طرح دکھائی دیا۔ اس گارڈ پر موت سایہ کر چکی تھی۔ دوسری گولی لگتے ہی وہ اچھل کر دیوار سے ذرا دور جا کر ہمیشہ کے لئے زمین بوس ہو گیا۔

چیمبر سے پھر تین گولیوں کی جگہ خالی ہو گئی تھی اس نے جیب سے گولیاں نکال کر کمی پوری کی اس کے شانے سے لٹکی ہوئی کلاشنکوف ابھی کام نہیں آرہی تھی۔ خاموشی سے کام کرتے رہنے سے کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ وہ کوٹھی کے باہر اور چھت پر پہرا دینے والوں سے نجات پا چکا تھا۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا اس دروازے کے پاس آیا' جہاں سے ایک زینہ کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف گیا تھا۔ وہ ایک گارڈ کی لاش کو پھلانگ کر زینے پر آیا پھر دبے قدموں زینے سے اترتے ہوئے نیچے اور آس پاس دیکھتا گیا۔ وہ زینہ نصف دائرے کی صورت میں گھومتا ہوا نیچے فرسٹ فلور کی طرف گیا تھا۔ پہلی منزل کے فرش پر پہنچ کر باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ پھر دبے قدموں دوسرے زینے سے اترنے لگا۔ اسے ایک عورت اور دو مردوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ذرا اور نیچے اترنے سے ان کی گفتگو صاف سنائی دینے لگی۔ ایک مرد کہہ رہا تھا۔ ”میڈم! آپ خود ماسک میک اپ کی ماہر ہیں۔ یہ دیکھ چکی ہیں کہ اس نے چہرے پر ماسک نہیں لگایا ہے۔ میں پلاسٹک سرجری کا ماہر ہوں۔ اتنی دیر سے چہرے اور گردن کا معائنہ کر رہا ہوں لیکن چہرے پر پلاسٹک سرجری کے ہلکے سے آثار بھی نہیں ہیں۔“

پھر ایک عورت کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”یہ خود کو جان محمد کہہ رہا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ اس نے چہرے پر پلاسٹک سرجری نہیں کرائی ہے لیکن میں کیسے مان لوں کہ یہ اس کا پیدائشی چہرہ ہے۔ مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ جان محمد نامی سیکورٹی گارڈ اور ڈرائیور پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہے اور راجہ نواز ہمیں دھوکا دینے کے لئے خود ڈرائیور بن کر کار چلا رہا ہے۔“

وہ زینے سے اتر کر ٹی وی لاؤنج میں پہنچ گیا تھا اور ایک کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ اس کمرے کے کھلے دروازے سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ راجہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس عورت کی آواز پہلے کہیں سنی ہے۔ اسے ایسے وقت ٹینا یاد آئی۔ اس کی آواز بھی کچھ ایسی ہی تھی لیکن لہجہ بدلا ہوا تھا۔ وہ کھلے ہوئے دروازے کے قریب جا کر دیکھنا چاہتا تھا کہ کمرے میں کتنے افراد ہیں۔ اسی وقت ایک گارڈ ہاتھ میں کلاشنکوف لے کر کمرے سے باہر آرہا تھا۔ راجہ کو دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ اس نے فوراً ہی کلاشنکوف کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالا۔ میدانِ جنگ میں سنبھلنے کا موقع نہیں ملتا۔ ایسے وقت ہر لمحے ہتھیار کے ساتھ مستعد رہنا پڑتا ہے ایک سیکنڈ کی دیر بھی موت کی نیند سلا دیتی ہے۔ اس کی پیشانی پر خاموش گولی آکر پیوست ہو گئی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے جا کر فرش پر گر پڑا۔

اس کمرے کے اندر ایک گوری چمڑی والی حسینہ ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک پلاسٹک سرجری کا ماہر دوسرے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ جان محمد ایک گن مین کے نشانے پر کھڑا تھا۔ دوسرا گن مین راجہ کا نشانہ بن چکا تھا۔ وہ کمرے کے اندر جیسے ہی گرا' وہ سب ایک دم اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ دوسرے گن مین نے بھی اپنے ساتھی کے

گرنے کی آواز سنتے ہی پلٹ کر اسے دیکھا۔ جبکہ اسے دروازے کی طرف دیکھنا چاہیے تھا۔ راجہ نے کہا۔ ”اُدھر نہیں‘ اِدھر.........“

اتنا کہتے اس نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ وہ دوسرا گن مین بھی چیختا ہوا‘ فرش پر اپنے ساتھی کے پاس گر کر تڑپتے ہوئے ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس حسینہ کے گورے چہرے کا رنگ خوف سے زرد پڑ گیا۔ جان محمد نے راجہ سے کہا۔ ”آپ نے درست کہا تھا یہ لوگ مجھے گولی نہیں ماریں گے بلکہ کئی اہم راز مجھ سے حاصل کرنا چاہیں گے۔ یہ پلاسٹک سرجری کا ماہر ہے۔ انہیں شبہ ہے کہ میں راجہ نواز ہوں اور یہ میڈم پتا نہیں کون ہے؟ سب اس کے محکوم ہیں۔ ایسا لگتا ہے‘ جیسے اس نے اپنی حفاظت کے لئے مسلح بدمعاشوں کی فوج بنا رکھی ہے۔“

پھر اس نے ریوالور کا رخ پلاسٹک سرجری کے ماہر کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

”ایک تم بچ گئے ہو۔ اپنی خیریت چاہتے ہو تو اس عورت کی اصلیت بتاؤ۔ یہ کون ہے؟ اور کس کے لئے کام کر رہی ہے؟ نیک بخت کے لئے یا براہ راست خفیہ ہاتھ کے لئے؟“

اس نے سہم کر حسینہ کو دیکھا۔ وہ اسے گھور کر دیکھنے لگی۔ وہ آنکھیں دکھا کر اسے سچ کہنے سے منع کر رہی تھی۔ وہ سہم کر بولا۔ ”میں تو ایک سرجن ہوں۔ میڈم نے کسی کی پلاسٹک سرجری کے لئے یہاں بلایا تھا۔ یہاں آیا تو انہوں نے کہا۔ یہ خود کو جان محمد کہتا ہے اور پلاسٹک سرجری کے ذریعے اپنا اصل چہرہ چھپائے پھرتا ہے۔ اس کے چہرے کا معائنہ کرنے کے لئے مجھے کہا گیا۔“

راجہ نے کہا۔ ”اس میڈم نے تمہیں زبردستی اس کا معائنہ کرنے کو کہا اور تم یہاں کئی مسلح بدمعاشوں کو دیکھ چکے ہو۔ یہاں سے جا کر پولیس اسٹیشن میں رپورٹ دو گے اور پولیس والوں کو یہاں لاؤ گے تو میں اس بات کو ہائی لیول تک لے جاؤں گا اور تم بھی یہاں سے زندہ سلامت جا سکو گے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ ایک بہت بڑے فرض شناس پولیس افسر کے پاس لے چلوں گا۔“

وہ پھر پریشان ہو کر اس حسینہ کو دیکھنے لگا پھر بولا۔ ”میں آپ سے التجا کرتا ہوں‘ مجھے پولیس اور عدالت کے چکر میں نہ پھنسائیں۔ پلیز! مجھے جانے دیں۔“

”میں تمہیں جانے دوں گا لیکن وہاں‘ جہاں یہ تمام مسلح بدمعاش جا چکے ہیں۔“

اس حسینہ کے موبائل فون کا بزر بولنے لگا۔ وہ میز پر رکھے ہوئے فون کو اٹھانے کے لئے جانے لگی۔ راجہ نے تیزی سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”خبردار! فون کو ہاتھ نہ لگانا۔“

اس نے میز کے پاس آ کر کہا۔ ”تم فون پر بات کرو گی لیکن اپنی اس ناکامی کا کوئی اشارہ نہیں دو گی۔ زندہ دلی سے بات نہیں کرو گی تو میں فوراً تمہیں گولی مار دوں گا۔“

راجہ نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن کے گرد حصار بنا کر جکڑ لیا۔ دوسرے ہاتھ سے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے لگا کر کہا۔ ”کم آن۔ فون اٹینڈ کرو۔“

اس نے ہچکچاتے ہوئے فون اٹھایا۔ راجہ نے کہا۔

”اسے آن کرنے سے پہلے سن لو کہ تم پریشان ہو۔ فون پر زندہ دلی نہ دکھائی تو تم دیکھ چکی ہو۔ میں کتنی بے رحمی سے قتل کرتا ہوں۔“

وہ موبائل فون کو آن کر کے بولی۔ ”ہیلو۔ میں شبینہ بول رہی ہوں۔ آپ فرمائیں؟“

وہ جس کان سے فون لگائے ہوئی تھی‘ راجہ نے اس کان سے اپنا کان لگایا۔ دوسری طرف سے خفیہ ہاتھ کے سیکرٹری نے کہا۔ ”ٹینا! میں بول رہا ہوں۔ تم نے اب تک اپنے باس کو رپورٹ نہیں دی ہے۔“

وہ جلدی سے بولی۔ ”کون ٹینا؟ میں اپنا نام بتا چکی ہوں۔ میرا نام شبینہ ہے۔ آپ نے غلط نمبر ڈائل کیا ہے۔“

یہ کہتے ہی وہ فون بند کرنا چاہتی تھی کہ راجہ نے اس سے فون چھین کر اپنے کان سے لگایا۔ سیکرٹری نے کہا۔

”اوہ سمجھا! وہاں تم گارڈز اور سرجری والے کے سامنے اپنے اصل نام سے انکار کر رہی ہو۔ ٹھیک ہے وہاں راجہ نواز آئے تو اس سے نمٹ کر فوراً ہمیں فون کرو۔“

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ راجہ نے بھی فون کو بند کر کے میز پر پھینکتے ہوئے اس کی گردن چھوڑ دی پھر سرجری کے ماہر سے کہا۔ ”باس نے کہا ہے کہ تم راجہ نواز کو پہچاننے میں ناکام رہے ہو.......... اس لیے تمہیں گولی مار دی جائے۔“

اس نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کیا۔ وہ تھر تھر کانپتے ہوئے بولا۔ ”میں نے غلطی نہیں کی ہے۔ جان محمد نے سرجری نہیں کرائی ہے۔“

”تو پھر شبینہ کے چہرے کا معائنہ کرو۔ اس بار غلطی نہیں کرو گے تو یہاں سے زندہ واپس جاؤ گے۔“

وہ سہم سہم کر چلتا ہوا ٹینا کے قریب آیا۔ راجہ نے ایک ہاتھ سے ٹینا کی دونوں آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تمہیں اپنی میڈم کی آنکھوں سے ڈر نہیں لگے گا۔ کم آن۔ جلدی چیک کرو۔“

وہ بولی۔ "پلیز! میری ایک بات سن لو۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے راجہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ اس کے ساتھ ہی راجہ نے سوئی کی چبھن اپنی ہتھیلی کی پشت پر محسوس کی۔ ٹینا نے اس سوئی کے ذریعے کوئی زود اثر دوا انجکٹ کی تھی۔ اس نے دوسرے ہی لمحے میں کمزوری محسوس کی۔ اس کا ہاتھ ٹینا کی آنکھوں پر سے ہٹ گیا۔ دوسرے ہاتھ کی گرفت ریوالور پر سے ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ ریوالور ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جاگرا۔ ٹینا نے راجہ کو ہلکا سا دھکا دیا۔ وہ جیسے بے جان سا ہوتا ہوا لڑکھڑاتا ہوا ایک صوفے سے ٹکراتا ہوا فرش پر گرنے لگا۔

جان محمد چھلانگ لگاتا ہوا' راجہ کے ریوالور کو اٹھانے کے لئے جیسے ہی جھکا ٹینا نے اس کے منہ پر ایک ٹھوکر ماری۔ سرجری کے ماہر نے ریوالور اٹھا کر اسے ٹینا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میڈم! دونوں کو گولیاں مار کر یہاں سے نکل چلیں۔"

جان محمد ٹھوکر کھا کر گرنے کے بعد اٹھ رہا تھا۔ ٹینا سرجری کے ماہر سے ریوالور لینے کے لئے ہاتھ بڑھا رہی تھی۔ اسی لمحے.......... ٹھائیں کی آواز کے ساتھ گولی چلی۔ سرجری کے ماہر کے حلق سے چیخ نکلی۔ حمزہ کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی اس کے سینے میں آکر لگی۔ مرنے والے کے ہاتھ سے ریوالور گرا۔ ٹینا نے اسے اٹھانے کی غلطی نہیں کی۔ اس سے پہلے کہ حمزہ دوسری گولی چلاتا وہ چھلانگ لگاتے ہوئے فضا میں قلابازی کھاتے ہوئے کھڑکی کے شیشے کو توڑ کر باہر نکل گئی۔ حمزہ نے دوسری گولی چلائی تھی لیکن وہ اپنی جگہ سے کھڑکی تک متحرک رہنے کے باعث محفوظ رہی۔ وہ دوڑتا ہوا کھڑکی کے پاس آیا۔ ٹینا کی ایک جھلک نظر آئی۔ وہ دوڑتی ہوئی کوٹھی کے دوسری طرف نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

وہ کھڑکی سے پلٹ کر راجہ نواز کے پاس آیا۔ وہ فرش پر پڑا ہوا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ وہ حمزہ کو دیکھتے ہوئے آنکھیں بند کرتے ہوئے بڑی کمزوری سے بولا۔ "بڑی کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔ ڈونٹ وری۔"

حمزہ اسے اٹھا کر اپنے کاندھے پر لاد کر دوڑتا ہوا اسے طبی امداد کے لئے لے جانے لگا۔

☆======☆======☆

"را" کا ڈائریکٹر جنرل دھاون اپنے تین ایڈیشنل ڈائریکٹرز اور چار ایسے سراغ رسانوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا' جنہوں نے بھارت کے آس پاس کے ملکوں میں جاسوسی کے فرائض ہمیشہ کامیابی سے ادا کئے تھے اور ان ملکوں میں اپنے ایجنٹوں اور کرائے کے آلۂ کاروں کے ذریعے دہشت گردی اور تخریب کاری کراتے آئے تھے۔

وہ سب "را" تنظیم کے نہایت کامیاب افسران کہلاتے تھے۔ بعض اوقات ناکامیوں کو بڑی حکمت عملی سے کامیابیوں میں تبدیل کر لیا کرتے تھے۔ اب ان کے لئے تابانی ایک مسئلہ بن گئی تھی۔ پہلے ان کا خیال تھا کہ تابانی کے ذریعے ڈاکٹر آمنہ کو اغوا کرا کے اپنی نگرانی میں اپنے ہی ملک میں شمشیر سنگھ کالیا کا علاج کرا لیں گے لیکن ان کی توقع کے خلاف تابانی کا من مزاج بدل گیا تھا۔ اس نے کالیا کو اغوا کر کے اس کے علاج میں رکاوٹ پیدا کر دی تھی۔

انہوں نے حالات سے سمجھوتا کرنے کے لئے آمنہ کو لندن روانہ کر دیا تھا اور دن کے گیارہ بجے تک یہ توقع تھی کہ تابانی ڈاکٹر آمنہ کے لندن پہنچنے کی تصدیق کرتے ہی کالیا کو ان کے حوالے کر دے گی۔ ایک ایڈیشنل ڈائریکٹر نے کہا۔ "فی الحال ہم ایسا کرنے پر مجبور ہو گئے تھے لیکن گیند ابھی ہمارے کورٹ میں ہے۔ تابانی اور فرمان بھارت میں کہیں ہیں۔ وہ دونوں بھی لندن جانا چاہیں گے۔ کیا ان کی لندن یاترا میں رکاوٹ پیدا کی جاسکتی ہے۔"

ایک سراغ رساں نے کہا۔ "اگر کسی طرح بڑی رازداری سے فرمان کو گرفتار کر کے کہیں قید کیا جائے تو ہمیں الزام نہیں دیا جاسکے گا کیونکہ وہ غیر قانونی طریقے سے ہمارے دیس میں آکر اور روپوش رہ کر تخریبی کارروائیاں کرتا رہتا تھا۔ اس کی گمشدگی کی ذمے داری ہم پر نہیں آئے گی۔"

ایڈیشنل ڈائریکٹر نے کہا۔ "ہماری اس بات کو دنیا مانے گی لیکن تابانی اور ان کا سرپرست گاڈ فادر ہاشم وغیرہ سمجھ لیں گے کہ آئندہ کارروائی کے لئے ہم نے فرمان کو یرغمال بنا کر کہیں چھپا دیا ہے۔ وہ لوگ لندن میں پھر کالیا کو نقصان پہنچائیں گے۔"

ڈی جی دھاون نے کہا۔ "کالیا کی بیٹی شلپا ہمیں کل سے پریشان کر رہی ہے۔ وہ ہر روز فون کے ذریعے اپنے باپ سے باتیں کیا کرتی تھی۔ کل رات اس سے بات نہ ہو سکی۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ تابانی اور فرمان نے اس کے باپ کو اغوا کر لیا ہے لیکن کل تک اسے لندن پہنچایا جائے گا تو وہ فون پر باپ سے رابطہ کر سکے گی۔ اس کے باوجود وہ دھمکی دے رہی ہے کہ کالیا کو تابانی اور فرمان سے نجات دلا کر لندن میں اس کا علاج نہ کرایا گیا تو وہ گھر کی بھیدی بن کر "را" کی لنکا ڈھادے گی۔"

"یہ بہت برا ہوا کہ ہمارے بہت سے اہم راز کالیا ہم سے چھپا کر اپنے پاس رکھتا رہا۔ ہم نے اس پر اس لئے شبہ نہیں کیا کہ وہ ہماری تنظیم کے لئے بڑے بڑے کارنامے انجام دیتا رہا تھا۔ ویسے وہ آج بھی ہمارا وفادار ہے۔ وہ دیکھتا آیا تھا کہ "را" تنظیم اور اپنے

بھارت دیس کی بہتری کے لئے ہم اپنے وفاداروں کو بھی قربان کردیتے ہیں۔ آج اس کی بیٹی شلپا کے پاس ہمارے اہم راز نہ ہوتے تو ہم کالیا کو لندن سے بھارت نہ لاتے۔ وہیں اسے گولی ماردیتے۔ اس کی بیٹی شلپا ماتم کرتی رہ جاتی لیکن اب وہ ہمیں ماتم کرنے پر مجبور کررہی ہے۔"

"را" کے وہ تمام اعلیٰ عہدیدار ایک میز کے اطراف بیٹھے ہوئے تھے۔ انٹرکام پر ڈی جی دھاون سے کہا گیا۔ "سر! شلپا کی کال ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہتی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ آپ ایک میٹنگ میں مصروف ہیں پھر بھی وہ آپ سے گفتگو کرنے پر اصرار کررہی ہے۔"

ڈی جی دھاون نے ناگواری سے کہا۔ "یہ شلپا تو مصیبت بن گئی ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں ابھی بات کررہا ہوں۔"

اس نے انٹرکام کو آف کیا پھر فون کا ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو شلپا بیٹی! میں تمہارا انکل دھاون بول رہا ہوں۔"

شلپا نے کہا۔ "آپ اسی وقت تک انکل ہیں' جب تک میرے ڈیڈی زندہ ہیں اور پوری توجہ سے ان کا علاج کراتے رہیں گے۔ آپ نے کہا تھا کہ آج گیارہ بجے تک میرے ڈیڈی کو لندن روانہ کیا جائے گا پھر آپ کے خصوصی طیارے میں ان سے فون پر گفتگو کی سہولت حاصل ہوگی۔"

"میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ ان کمبختوں نے تھوڑی دیر پہلے فون کے ذریعے بتایا ہے کہ انہوں نے تمہارے ڈیڈی کو راجستھان میں جے پور اور منڈوا ٹاؤن کے درمیان کھیتوں کے بیچ ایک جھونپڑی میں چھپا رکھا تھا۔ دہلی سے ایک ہیلی کاپٹر انہیں لانے گیا ہے۔ یہاں ائرپورٹ کے پرائیویٹ رن وے پر ان کے لئے ایک خصوصی طیارہ کھڑا ہوا ہے۔ بس ایک گھنٹے کے اندر انہیں لندن روانہ کردیا جائے گا۔"

"طیارے کے پرواز کرتے ہی آپ ان سے میری بات کرائیں۔"

"ہم تمہارے اطمینان کے لئے فوراً ان سے گفتگو کرائیں گے۔"

شلپا نے فون بند کردیا۔ وہ تابانی کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی تھی لیکن مجھ کو جانی دشمن کی حیثیت سے جانتی تھی۔ اس نے پہلی بار مجھے پھانسنے کے لئے اپنے حسن و شباب کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ میں نے اس پر اعتبار کیا تھا لیکن جلد ہی اس کی چالبازی کا علم ہوگیا اور میں نے اس کی ایک ٹانگ پر گولی مار کر اسے لنگڑی بنا دیا تھا۔

ایشیائی ممالک میں انڈر ورلڈ ڈرگ مافیا کے جتنے گاڈ فادرز شمشیر سنگھ کالیا کے حمایتی

اور دوستوں میں سے تھے' وہ سب اس بات پر میرے دشمن بن گئے تھے کہ میں نے کالیا اور شلپا کو زخمی کیا تھا۔ کالیا کے ایک گھٹنے کی ہڈی توڑ دی تھی اور شلپا کی ایک ٹانگ پر گولی مار کر اسے بھی لنگڑی بنادیا تھا۔ ایشیائی ملکوں کے تمام ڈرگ مافیا کے گاڈ فادرز دونوں باپ بیٹی کو علاج کے لئے اپنے ملک میں لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے کالیا کے گھٹنے پر کئی فائر کرکے گھٹنے کی ہڈیاں توڑ کر اسے بے ہوش کیا تھا لیکن شلپا کی ٹانگ پر ایک ہی گولی چلائی تھی اس لئے وہ ہوش میں تھی۔ اس نے تمام حمایتی گاڈ فادرز سے کہا تھا۔ "میں یہاں لندن میں رہوں گی۔ میرے علاج میں دشواری نہیں ہوگی لیکن آپ لوگ میرے ڈیڈی کو انڈیا پہنچا دیں۔ وہاں "را" کا ڈائریکٹر جنرل اور دوسرے اعلیٰ افسران بڑی توجہ سے میرے ڈیڈی کا علاج کرائیں گے۔"

اس طرح کالیا کو انڈیا پہنچا دیا گیا تھا۔ شلپا نے لندن کے ایک اسپتال میں اپنا علاج کرایا۔ میری چلائی ہوئی گولی اس کے ایک پیر کی پنڈلی کے گوشت کو پھاڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔ زخم تکلیف دہ تھا مگر تشویش ناک نہیں تھا۔ وہ مرہم پٹی کرانے کے بعد اپنی ایک خفیہ رہائش گاہ میں آگئی تھی۔ جب کالیا کو بھارت پہنچایا گیا تو ڈی جی دھاون نے بھارت کے ان تمام ڈاکٹروں سے اس کا معائنہ کرایا جو ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے کے سلسلے میں ماہر سرجن کہلاتے تھے۔ ان سب نے گھٹنے کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کا معائنہ کرنے کے بعد یہ رپورٹ دی کہ ایسی چکناچور ہونے والی ہڈیوں کی صرف لیڈی سرجن آمنہ جوڑ سکتی ہے یا پھر کالیا کی وہ ایک ٹانگ گھٹنے کے اوپر سے کاٹ دی جائے۔ ایسا نہ کیا گیا تو زخم آہستہ آہستہ ناسور بنے گا اور جسم کے اندر زہر پھیلتا جائے گا۔

ڈی جی دھاون نے کالیا سے کہا۔ "تمہارے اور ڈاکٹر آمنہ کے درمیان برسوں پرانی دشمنی ہے۔ وہ تمہاری ٹانگ کا آپریشن کرنے نہیں آئے گی۔ وہ ایسی کٹر دشمن ہے کہ اس نے اپنے بیٹے کے ذریعے ہی تم پر حملہ کرایا۔ فرمان نے اپنی ماں کے حکم کے مطابق.......... ایک گھٹنا توڑ کر تمہیں اپنی ماں کے علاج اور آپریشن کا محتاج بنادیا ہے۔"

کالیا نے کہا۔ "میں اپنی ٹانگ کاٹنے کی اجازت ڈاکٹروں کو ہرگز نہیں دوں گا۔ اس لیڈی سرجن آمنہ کو پاکستان سے اغوا کرکے یہاں کے بڑے اسپتال میں لے آئیں۔ وہ ضرور کامیاب آپریشن کرے گی۔"

ڈی جی دھاون نے کہا۔ "وہ عالمی سطح پر شہرت حاصل کرچکی ہے۔ اسے اغوا کرکے انڈیا لانے سے ہمارا بھارت دیس ساری دنیا میں بدنام ہوجائے گا۔ بھارت اور پاکستان کی خارجہ پالیسی کے مطابق ہم سے کہا جائے گا کہ تمہیں علاج اور آپریشن کے لئے پاکستان

بھیج دیا جائے۔ وہاں تمہیں بھیجا جائے گا تو تم ماں بیٹے کے رحم و کرم کے محتاج بن کر رہو گے شاید تم زندہ واپس نہ آسکو۔"

کالیا نے کہا۔ "میں زندہ نہ رہا تو ان اہم رازوں کا کیا ہوگا؟ وہ سب میرے بیٹی شلپا کے پاس محفوظ ہیں۔ اگر جلد سے جلد میرا کامیاب آپریشن نہ کرایا گیا تو شلپا بہت ضدی ہے انتقامی کارروائی کرے گی۔"

"را" والوں کے گلے میں کالیا ایک ہڈی کی طرح پھنس گیا تھا۔ وہ ڈاکٹر آمنہ کو اغوا کرکے اور بھارت لاکر تمام دنیا میں اپنے دیس کو بدنام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ایسے وقت تابانی نے ڈاکٹر آمنہ کو اپنے مراد کی خاطر اغوا کرکے "را" والوں کی مشکل آسان کردی تھی۔

حکومتِ پاکستان کی طرف سے بھارت کو اس اغوا کا الزام دیا گیا لیکن یہ ثبوت نہیں تھا کہ اغوا کرنے والے ڈاکٹر آمنہ کو بھارت لے گئے ہیں۔ اب یہ اندیشہ تھا کہ پاکستانی سراغ رساں ڈاکٹر آمنہ کا سراغ لگانے کے لئے خاصی تعداد میں آئیں گے۔ لہٰذا راجستھان کے پشکر ٹاؤن میں بڑی رازداری سے آپریشن کے انتظامات کئے گئے۔ اتنا کچھ کرنے کے دوران میں بازی پلٹ گئی۔ جو تابانی میری ممی کو اغوا کرکے لے گئی تھی، وہ میری امی کی بیٹی اور میری دیدی بن گئی تھی۔ ہم دونوں اپنی باتیں منوا کر امی کو اور کالیا کو لندن بھیجنے میں کامیاب ہوگئے تھے لیکن دشمن کی جوابی کارروائیوں سے بے خبر تھے۔

ایک تو "را" والے کالیا کے کامیاب آپریشن کے بعد بھی ہم ماں بیٹے کی آئندہ دشمنی کو سمجھ سکتے تھے اور شلپا بھی یہی سمجھ رہی تھی کہ ہم سانپ ہیں، آئندہ انہیں کسی طرح بھی دشمنی کے زہر سے ہلاک کرسکتے ہیں۔ لہٰذا جب تک ماں لندن میں رہے، تب تک مجھ بیٹے کو بھارت میں کسی قیمت پر روکے رکھیں۔ "را" والوں کے علاوہ شلپا بھی مجھے اور تابانی کو تلاش کررہی تھی۔

ہماری لاعلمی میں راجستھان کے ہر بڑے چھوٹے شہر اور گاؤں کھیڑے میں وہ بڑی رازداری سے ہمیں تلاش کررہے تھے۔ ہم اپنی جگہ محتاط تھے۔ راجستھان چھوڑ کر اتر پردیش (یوپی) کے ایک چھوٹے شہر میں آگئے تھے۔ بھارت کے ہر بڑے چھوٹے ائرپورٹ اور بندرگاہوں پر سراغ رساں اور پولیس والے سادہ لباس میں تھے۔ اس طرح کالیا کے انڈر گراؤنڈ رہنے والے سراغ رساں اور قاتل شلپا کے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے ہمیں ڈھونڈ رہے تھے۔ کالیا کے دوسرے حمایتی گاڈ فادرز نے انہیں شلپا کو عارضی طور پر ڈرگ مافیا کی سربراہ مان کر اس کے احکامات کی تعمیل کرنے پر مجبور کیا تھا۔

وہ تمام حمایتی گاڈ فادرز کو چودہ برس کی عمر سے شلپا کی حاضر دماغی اور چالبازی کو دیکھتے آئے تھے۔ وہ اکثر باپ کے معاملات میں عملی طور پر حصہ لیتی رہتی تھی۔ پچھلی بار اس نے بڑی حکمتِ عملی سے اپنے باپ کالیا کو لندن پولیس کی حراست سے رہائی دلائی تھی۔ تمام گاڈ فادرز مانتے تھے کہ وہ اپنے باپ کی صحیح جانشین ہے۔

بھارتی "را" اور اسرائیلی "موساد" والوں نے برٹش حکومت سے سیاسی سمجھوتا کیا تھا کہ ڈرگ مافیا کا گاڈ فادر شمشیر سنگھ کالیا علاج کے لئے لندن میں چند ماہ تک رہے گا۔ لہٰذا حراست سے فرار ہونے والے کالیا کو گرفتار نہ کیا جائے۔ اسے ایک بھارتی معزز شہری کی حیثیت سے مہمان مریض تسلیم کرکے علاج کرانے کے بعد بھارت واپس جانے دیا جائے۔

پچھلے ایک برس میں لندن کے دو سیکرٹ ایجنٹ بھارت میں اور اسرائیل میں گرفتار ہوگئے تھے۔ "را" اور "موساد" نے برٹش گورنمنٹ سے یہی سمجھوتا کیا کہ کالیا کے صحت یاب ہونے کے بعد اسے لندن سے بھارت روانہ کیا جائے گا اور لندن کے تین قیدی سیکرٹ ایجنٹوں کو بھارت اور اسرائیل سے لندن بھیجا جائے گا۔ یہ معاملات بڑی رازداری سے طے ہوگئے تھے۔

ان واقعات سے بہت پہلے جب کالیا انڈر گراؤنڈ سرگرمیوں میں مصروف رہا کرتا تھا، تب اس نے اپنی بیٹی کی کسی ہم عمر ہندوستانی غریب لڑکی کو اس لئے اپنی بیٹی بنایا تھا کہ وہ اس کی بیٹی شلپا سے کسی حد تک مشابہت رکھتی تھی۔ اسی کی طرح ذہین اور تیز و طرار تھی۔ اس کا نام بینا مکرجی تھا۔ کالیا نے اس سے سمجھوتا کیا کہ وہ سچ مچ بیٹی بن کر رہے گی اور شلپا کی طرح جرائم کی دنیا میں اس کا ساتھ دیتی رہے گی تو اسے کوٹھیاں اور کاریں ملیں گی۔ پہلے اس کا بینک بیلنس لاکھوں روپے کا ہوگا پھر یہ بینک بیلنس کروڑوں روپے تک بڑھتا جائے گا۔

بینا مکرجی ایک معمولی سے مکان میں بوڑھے ماں باپ کے ساتھ بڑی غریبی اور محتاجی سے تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں بہت دولت مند بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ کالیا نے اس کے تمام خواب پورے کئے اور شلپا سے مشابہت رکھنے والی کو پلاسٹک سرجری کے ذریعے مکمل طور پر شلپا کی ہم شکل بنا دیا۔ اس کے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کو ماں باپ کے ساتھ ایک عالیشان کوٹھی میں پہنچا کر ان کے لئے پچاس ہزار روپے ماہانہ اخراجات کے لئے مقرر کرکے اس سے کہا۔ "اب تم بینا مکرجی نہیں، صرف شلپا ہو۔ ہمیشہ اپنے ماں باپ اور بھائیوں اور بہنوں سے دور رہو۔ تم جس ملک اور جس شہر میں جایا

کرو گی' وہاں تمہارے رہنے سہنے کا شاہانہ انتظام ہو گا۔ ہمارے ماتحت رہنے والے خطرناک مجرم بھی ہر ملک میں تمہیں گاڈ فادر کی بیٹی شلپا سمجھ کر تمہارے احکامات کی تعمیل کرتے رہیں گے۔ صرف اتنا یاد رکھنا کہ اگر ہمیں کبھی دھوکا دینے اور ہم سے غداری کرنے کی کوشش کرو گی تو بری طرح حرام موت ماری جاؤ گی۔

بینا نے کہا۔ "جب مجھے بیٹھے بٹھائے اتنی دولت مل رہی ہے کہ صرف میں جرائم کی دلدل میں رہ کر اپنے ماتا پتا اور بھائی بہنوں کو لکھ پتی اور کروڑ پتی بناتی رہوں گی تو میں پاگل یا ایب نارمل نہیں ہوں کہ تم باپ بیٹی سے کبھی دھوکا کروں گی۔"

یہ تقریباً پچھلے تین برس پہلے کی بات تھی۔ اس عرصے میں بینا بڑی توجہ اور تندہی سے شلپا کی آواز اور لہجے کی ادائیگی' اس کے چلنے پھرنے کا انداز' اس کی مخصوص قدرتی عادتیں اور اسٹائل سیکھتی رہی۔ اب وہ ایسی ہو گئی تھی جیسے شمشیر سنگھ کالیا کی قدرتی بیٹی ہو۔

شلپا کی ٹانگ کا زخم بھر گیا تھا۔ اب وہ چلتے وقت ایک ذرا لنگڑاتی تھی۔ دور سے اس کے لنگڑانے کا پتا نہیں چلتا تھا قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ جو بڑے غرور سے اور ناز و انداز سے چلتی تھی' اب ذرا سی چال بدل گئی ہے۔ وہ بڑی آہستگی سے قدم اٹھا کر دھیرے دھیرے چلتی تھی تاکہ ہلکی سے لنگڑاہٹ کا بھی پتا نہ چلے۔

وہ میک اپ کے ذریعے اپنے چہرے پر معمولی سی تبدیلی کرنے کے بعد لندن میں ہی تھی۔ اس نے چلنے پھرنے کے موجودہ انداز کو ایک ویڈیو میں پکچرائز کرکے' اس کیسٹ کو بھارت میں بینا کے پاس بھیج دیا تھا اور اس سے فون پر کہا تھا۔ "میرے موجودہ چلنے پھرنے کے انداز کی مشق کرو۔ ڈیڈی کو علاج کے لئے لندن لایا جا رہا ہے۔ میں ان کی صحت یابی تک یہیں رہوں گی۔ تمہیں فرمان کی تصویریں دی گئی تھیں۔ اسے تلاش کرکے اپنے ماتحتوں کے ذریعے کسی طرح گرفتار کرکے خفیہ اڈے میں قید کردو تاکہ فرمان کے چاہنے والے حمزہ اور راجہ نواز لندن آکر میرے ڈیڈی کو نقصان پہنچانا چاہیں گے تو ہم فرمان کو ان کی کمزوری بنادیں۔"

شلپا احتیاطی تدابیر پر خود بھی عمل کر رہی تھی اور بینا سے بھی عمل کرا رہی تھی۔ بینا بھارت میں رہ کر ڈی جی دھاون سے شلپا بن کر گفتگو کیا کرتی تھی۔ "را" والے فون کال سے سمجھ لیتے تھے کہ کالیا کی بیٹی شلپا بھارت کے کس چھوٹے بڑے شہر میں ہے؟ اسے گرفتار کرلیا جائے تو ان کے تمام اہم راز اس سے حاصل کئے جاسکیں گے۔

لیکن فون کال ٹریس کرنے کے بعد "را" کے جاسوس اس علاقے کے مکان یا دکان

میں پہنچتے تھے تو وہ نظر نہیں آتی تھی۔ ان کے پہنچنے سے پہلے ہی فرار ہو جاتی تھی۔ جس گھر یا دفتر کے فون سے وہ گفتگو کرتی تھی وہاں کے لوگ قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ ان کے فون سے کسی لڑکی نے فون نہیں کیا ہے۔ وہ ایسی چالبازی سے فون کرتی تھی کہ اسے تلاش کرنے والے ٹیلیفون ڈپارٹمنٹ کے اعلیٰ افسران سے معلومات حاصل کرتے تھے۔ جدید ٹیکنالوجی کے ایک ماہر افسر نے بتایا کہ امریکا' روس اور فرانس جیسے بڑے ممالک میں موبائل فون جیسا ایک ایسا الیکٹرونک آلہ ہے جو وہاں کے انٹیلیجنس کے اور دوسرے اہم شعبوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس الیکٹرونک آلے کو کسی کے گھر یا دفتر فون نمبر سے منسلک کرلیا جاتا ہے۔ اس گھر یا دفتر سے دور رہ کر بھی ان کے فون نمبر ڈائل کرکے کسی سے بھی باتیں کی جاسکتیں ہیں اور شلپا بن کر رہنے والی بینا یہی کر رہی تھی۔

اب کالیا لندن جا چکا تھا اور وہ مجھے تلاش کر رہی تھی۔ بھارت کے ہر بڑے شہر میں اس کے چار چھ ماتحت تھے۔ اس نے تمام ماتحتوں کو حکم دیا تھا کہ وہ بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر سے لے کر راجستھان کے ایسے علاقوں میں رہیں' جہاں سے غیر قانونی طور پر سرحدیں پار کی جاتی ہیں۔ وہ بھارت کے ساحلی علاقوں سے بھی پاکستان یا بنگلہ دیش کی طرف جاسکتے ہیں۔ وہ تعداد میں تین ہیں۔ ایک کا نام فرمان ہے جس کی تصویریں تمام ماتحتوں کو دی جاچکی ہیں۔ دوسرا تابانی ہے۔ جس کی تصویر "را" والوں کے پاس ضرور ہوگی لیکن بینا "را" والوں کی لاعلمی میں ہمیں تلاش کر رہی تھی۔ ان سے تصویریں اس لئے بھی مانگنا نہیں چاہتی تھی کہ اس کی نظروں میں تابانی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ امی کو اور انکل ہاشم کو' حمزہ اور راجہ نواز کو صرف میرے ذریعے جھکنے پر مجبور کرسکتی تھی۔

ہم میں تیسری پوجا تھی۔ وہ بھی بینا کے لئے غیر ضروری تھی اس نے اپنے ماتحتوں کو تاکید کی تھی کہ اگر ہم نظر آجائیں اور ہمارے درمیان خواہ کتنی ہی کاؤنٹر فائرنگ ہو' فرمان کو مرنا نہیں چاہیے۔ اسے زیادہ سے زیادہ زخمی کیا جائے تاکہ اسے قیدی یا یرغمال بنا کر رکھا جائے۔

میں نے تابانی سے کہا۔ "دیدی! بھارت سے باہر جانے والے راستوں کی نگرانی ہو رہی ہوگی۔ پولیس اور سراغ رسانوں کی طرح شلپا کے آدمی بھی ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے۔ اس کے باوجود ہمیں کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچنا ہوگا۔"

وہ بولی۔ "تم پاکستان جانے کے لئے سوچ رہے ہو۔ امی کی حفاظت اور سلامتی کے لئے پہلے لندن جانا چاہیے۔"

"تم امی کے سلسلے میں بے فکر رہو' وہاں انکل ہاشم پہنچے ہوئے ہیں۔ ہم بھی وہاں

جائیں گے لیکن پہلے پاکستان جا کر میں اپنے بہنوئی مراد کو کسی طرح جیل سے نکالوں گا۔"

ڈیڈی نے خوش ہو کر مجھے دیکھا۔ میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اپنی طرف جھکا کر میری پیشانی کو چوم لیا پھر کہا۔ "دلوں کی گہرائیوں سے جو رشتے ہوتے ہیں' وہ خون کے رشتوں سے زیادہ پائیدار ہوتے ہیں لیکن تم اپنے مراد بھائی کی رہائی کے لیے جذباتی ہو کر کوئی قدم اٹھاؤ گے تو ہمیں ناکامی ہو سکتی ہے۔ کامیابی اس طرح ہو سکتی ہے کہ انکل ہاشم کی طرح ہمارے پاس وفاداروں کی فوج اور وسیع ذرائع ہوں۔ انہوں نے بڑی حکمتِ عملی سے مجھے اسپتال سے فرار ہونے کا موقع دیا تھا۔"

پوجا نے کہا۔ "اگرچہ گاڈ فادر ہاشم لندن میں ہیں لیکن فرمان کے ایک فون کرنے پر ہمیں پاکستان میں وفاداروں کی فوج' ضرورت کا ہر سامان اور مراد بھائی کو جیل سے نکال لانے کے تمام ذرائع فراہم کردیئے جائیں گے۔"

تاباتی نے کہا۔ "تم دونوں کی طرح مجھے بھی انکل ہاشم پر پورا اعتماد ہے۔ ٹھیک ہے' پہلے پاکستان چلیں گے۔ انکل ہاشم کی ہدایات کے مطابق عمل کرنے کے ٹھوس مواقع ہوں گے۔ کسی طرح کی معمولی سی رکاوٹ بھی نہیں ہوگی تو ہم مراد کو وہاں سے نکال لانے کے لئے سب کچھ کر گزریں گے ورنہ انکل ہاشم کی واپسی کا انتظار کریں گے۔"

ہم راجستھان سے نکل کر مہاراشٹر پہنچے تھے پھر ممبئی شہر سے گزرتے ہوئے گوا پہنچ گئے۔ گویا بینا عرف شلپا کی یہ پلاننگ درست تھی کہ ہم کسی ساحلی علاقے سے ہو کر پاکستان جائیں گے۔ فی الوقت ہم اس کی پلاننگ سے بے خبر تھے اور مصیبتیں ہمیشہ بے خبری میں ہی آیا کرتی ہیں۔

☆=========☆=========☆

امیر حمزہ کی پریشانیاں بڑھ گئی تھیں۔ وہ راجہ نواز کو اپنے کندھے پر لاد کر دوڑتا ہوا کوٹھی کے باہر آیا۔ جان محمد دونوں ہاتھوں میں ریوالور اور کلاشنکوف لئے حمزہ سے آگے دوڑ رہا تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ وہاں سے فرار ہونے والی ٹینا کوٹھی کے باہر کہیں چھپ کر فائر کرسکتی ہے لیکن کھڑکی کے شیشے توڑ کر فرار ہوتے وقت ٹینا کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لئے وہاں سے جا چکی تھی۔

حمزہ ایک ٹیکسی میں پچھلی گلی سے آیا تھا اور ٹیکسی ڈرائیور کو رکنے کے لئے کہا تھا۔ اس نے اسی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر راجہ کو لٹا دیا' اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ بے ہوش پڑا تھا۔ حمزہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے ڈرائیور سے بولا۔ "یہاں سے ہولی کراس اسپتال قریب ہے فوراً چلو۔"

اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھائی۔ جان محمد اگلی سیٹ پر تھا۔ حمزہ نے اس سے کہا۔ "کلاشنکوف باہر پھینک دو۔ ریوالور کو لباس میں چھپالو ورنہ اسپتال والے ہمیں دہشت گرد سمجھیں گے۔"

اس نے کلاشنکوف کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اسپتال قریب تھا۔ وہ چھ یا سات منٹ میں اسپتال پہنچ گئے۔ جان محمد ٹیکسی سے نکل کر دوڑتا ہوا ایمرجنسی وارڈ میں جا کر دو وارڈ بوائز کے ساتھ اسٹریچر لے آیا۔ راجہ کو ٹیکسی سے نکال کر اس پر لٹا دیا گیا۔ حمزہ نے ڈرائیور کو اس کی توقع سے زیادہ کرایہ دے کر رخصت کردیا۔ راجہ کو ایمرجنسی وارڈ میں پہنچاتے ہی ایک ڈاکٹر نے اسے اٹینڈ کیا۔ اس کا معائنہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیسے بے ہوش ہوا ہے؟"

حمزہ نے بات بنائی۔ "یہ اچانک سینے میں تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ ہم اسے قریبی کلینک لے گئے۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کرکے کہا۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی سینے کا درد ختم ہوجائے گا۔ درد ختم ہوگیا لیکن یہ کہنے لگا کہ بے حد کمزوری محسوس کر رہا ہے پھر یہ چند سیکنڈ کے بعد ہی بیہوش ہوگیا۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "اس کلینک کے ڈاکٹر نے کوئی غلط انجکشن لگایا ہے۔ ایسے ڈاکٹروں پر کیس کرنا چاہیے۔"

حمزہ نے کہا۔ "ہم اس ڈاکٹر کو نہیں چھوڑیں گے۔ آپ اسے ہوش میں لا کر اس کلینک والے ڈاکٹر کے خلاف پرچی لکھ دیں۔ ہم قانونی کارروائی کریں گے۔"

ڈاکٹر نے ایک انجکشن تیار کیا پھر اسے راجہ کے بازو پر لگایا۔ اس کے چند سیکنڈ کے بعد ہی اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کی نظریں سامنے دیوار پر تھیں۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔
"ہیلو مسٹر! ہاؤ ڈو یو فیل؟"

راجہ نے جواب نہیں دیا۔ اسی طرح پلکیں جھپکائے بغیر سامنے دیوار کو تک رہا تھا۔ حمزہ نے آواز دی۔ "راجہ! خاموش کیوں ہو؟ کیا اب بھی کمزوری محسوس کر رہے ہو؟"

وہ پلکیں نہیں جھپک رہا تھا۔ ایک ٹک سامنے دیوار پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ڈاکٹر اس کی ایک کلائی تھامے نبض کی رفتار دیکھ رہا تھا پھر اسٹیتھ اسکوپ کے ذریعے اس کے دل کی دھڑکنیں سن رہا تھا۔ حمزہ نے کہا۔ "راجہ! میری طرف دیکھو۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "او گاڈ! یہ کوما میں ہے۔"

حمزہ نے چونک کر ڈاکٹر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کوما؟"

"جی ہاں۔ اس کے کان ہماری آواز نہیں سن رہے ہیں۔ یہ دیکھ رہا ہے لیکن دماغی

کمزوری اسے نہیں سمجھا رہی ہے کہ یہ کیا دیکھ رہا ہے؟ اور کہاں پڑا ہے؟ اس کا جسم متحرک نہیں ہے۔ کوما سے نکلنے کے بعد اس کے ہاتھ پاؤں حرکت کر سکیں گے۔"

"یہ کوما سے کب نکلے گا؟"

"اس کلینک کے ڈاکٹر نے جو دوا انجکٹ کی ہے۔ اس کا اثر ختم ہونے کے بعد یہ نارمل حالت میں آسکے گا۔"

حمزہ اور جان محمد سمجھ رہے تھے کہ کسی ڈاکٹر نے نہیں' ٹینا نے وہ مضر رساں دوا انجکٹ کی ہے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "جب تک یہ کوما میں ہے' آپ اسے اسپتال میں رہنے دیں۔ ہم انجکشن کے ذریعے اس کے اندر خوراک پہنچاتے رہیں گے۔"

حمزہ نے کہا۔ "ہمیں آپ کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیے لیکن ہماری سمجھ میں آگیا ہے کہ وہ ڈاکٹر ہمارے دشمنوں سے ملا ہوا ہے۔ اگر دشمنوں کو معلوم ہوگا کہ میرے دوست کو اس اسپتال کے ایک کمرے میں رکھا گیا ہے تو وہ یہاں پہنچ کر اس کے ساتھ آپ لوگوں کو بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ہم اسے چھپا کر رکھیں گے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ دشمنی اور تخریب کاری کا معاملہ ہے تو ہم اپنے اسپتال میں دوسرے مریضوں کو خوفزدہ نہیں ہونے دیں گے۔ آپ انہیں لے جاسکتے ہیں۔"

حمزہ نے ڈاکٹر کی فیس ادا کی۔ اس دوران میں جان محمد نے فون کے ذریعے گاڈ فادر ہاشم کے دستِ راست امانت شیخ سے رابطہ کیا اسے راجہ نواز کے حالات بتائے اور کہا۔ "آپ فوراً ایک گاڑی بھیج دیں۔ ایسے گارڈز کو بھی روانہ کریں' جو ہمارا تعاقب کرنے والوں پر نظر رکھیں۔ ہماری تنظیم کے خاص ڈاکٹر کو ہدایات دیں کہ جب تک راجہ صاحب کوما میں رہیں' تب تک ان کے علاوہ ان کے ماتحت ڈاکٹرز بھی راجہ صاحب کو دن رات اٹینڈ کرتے رہیں اور انجکشن وغیرہ کے ذریعے ان کے اندر غذا پہنچاتے رہیں۔"

اسپتال میں تقریباً آدھا گھنٹے تک انتظار کرنے کے بعد ایک ایمبولینس آگئی۔ راجہ کو اسٹریچر پر لٹا کر گاڑی کے پچھلے حصے میں لٹایا گیا۔ جان محمد گاڑی ڈرائیو.......... کرنے والے کو پہچانتا تھا۔ راستے میں حمزہ نے ہاشم کے دستِ راست امانت شیخ سے رابطہ کیا۔ امانت شیخ نے کہا۔ "آپ پورے اعتماد اور اطمینان کے ساتھ اس گاڑی میں آجائیں۔ اس گاڑی کو دیر تک شہر کے مختلف حصوں میں گھمایا جائے گا تاکہ ہمارے آدمی دور ہی دور سے تعاقب کرنے والے دشمنوں کو تاڑ سکیں۔ اچھی طرح اطمینان ہونے کے بعد آپ کو ایک خفیہ رہائش گاہ میں پہنچایا جائے گا وہاں ہمارا خاص ڈاکٹر پہلے سے موجود ہوگا۔ ابھی میں گاڈ فادر سے رابطہ کرکے انہیں آپ کے حالات بتا رہا ہوں۔"

امانت شیخ نے رابطہ ختم کردیا۔ حمزہ نے اپنا موبائل فون بند کرکے تشویش بھری نظروں سے اپنے جاں نثار دوست کو دیکھا۔ راجہ بدستور آنکھیں کھولے ایک لاش کی طرح ساکت پڑا ہوا تھا۔ اس کی پلکیں بھی نہیں جھپک رہی تھیں۔ وہ دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ کان رکھتے ہوئے بھی نہیں سن رہا تھا اور دماغ رکھتے ہوئے بھی کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کی زندگی کے آثار اتنے ہی تھے کہ نبض چل رہی تھی۔ دل آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔ سانسوں کی آمدورفت اتنی دھیمی تھی جیسے وہ سانسیں اب تب میں اس کا ساتھ چھوڑنے والی ہوں۔

حمزہ اپنے دانتوں پر دانت جمائے ہونٹوں کو سختی سے بھینچے اپنے اندر سے ابلنے والے غصے کو ٹھنڈا رکھنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ یہ ایک عام سی تجربے کی بات ہے کہ مصائب ٹوٹ پڑیں یا عداوتیں کی جائیں تو رونے' فریاد کرنے سے نہ مصائب کو ٹالا جاسکتا ہے۔ نہ عداوتوں کے خلاف کوئی دانشمندانہ کارروائی کی جاسکتی ہے۔

وہ غصے پر قابو پاتے ہوئے سوچ رہا تھا اگرچہ گاڈ فادر ہاشم کی جانب سے بھرپور تعاون کیا جارہا ہے' اس کے باوجود زندگی کے ہر شعبے میں اور جرائم کی دنیا کے ہر گروہ اور تنظیم میں غدار اور دوغلی چال چلنے والے ہوتے ہیں۔ اسی طرح گاڈ فادر ہاشم کے ماتحتوں میں محمد حسین غدار تھا جس نے خفیہ ہاتھ کی ایک ایجنسی تک یہ خبر پہنچادی تھی کہ راجہ اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر کار ڈرائیو.......... کر رہا ہے اور مسلح گارڈ جان محمد پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہے۔ اس نے دشمنوں کو راجہ کی کار کے پلیٹ نمبرز' کلر اور ماڈل بھی بتادیئے تھے۔ اس کے دوغلے پن کے باعث راجہ نواز موت سے تو بچ گیا تھا لیکن کوما میں رہ کر آدھا مُردہ بن گیا تھا۔ ایسی حالت میں کسی وقت بھی اس پر دوبارہ حملہ ہوتا تو وہ ذرا سی بھی حرکت نہیں کرسکتا تھا۔ بڑی بے بسی سے چپ چاپ مارا جاتا۔ حمزہ نے طے کیا تھا کہ جب تک وہ کوما سے نہیں نکلے گا' اس وقت تک اپنے دوست کو ایک منٹ کے لئے بھی تنہا نہیں چھوڑے گا۔

وہ راجہ کو ایمبولینس میں لے کر تقریباً ڈھائی گھنٹے تک مختلف علاقوں میں گھومتے رہے۔ دریائے راوی کے پار شاہدرہ سے بھی آگے جاتے وقت فون پر اطلاع دی گئی کہ اب تک تعاقب کرنے والی کوئی گاڑی نظر نہیں آئی ہے۔ کسی ایک گاڑی نے مسلسل پیچھا نہیں کیا ہے۔ اس حد تک اطمینان ہونے کے بعد وہ ایمبولینس کو ایک چھوٹی سی کوٹھی کے احاطے کے اندر لے گئے۔

راجہ ایک اسٹریچر پر پڑا ہوا تھا۔ اسی اسٹریچر پر اسے اندر ایک بڑے سے بیڈ روم میں

لے گئے۔ وہاں ایک ڈاکٹر' ایک نرس اور گھریلو کام کے لئے ایک ملازم موجود تھا۔ حمزہ نے جان محمد سے کہا۔ "تم کوٹھی کی چھت پر جا کر اس کی منڈیر کے پیچھے چھپ کر چاروں طرف نظر رکھو۔ اگرچہ تعاقب کرنے والے نظر نہیں آئے لیکن میں مطمئن نہیں ہوں۔"

جان محمد چھت پر چلا گیا۔ ڈاکٹر' راجہ کا معائنہ کر رہا تھا۔ نرس نے اس کی ہدایت کے مطابق انجکشن کے ذریعے پہلے خوراک پہنچائی پھر آدھے گھنٹے بعد انجکشن ہی کے ذریعے مختلف دوائیں پہنچاتی رہی۔ حمزہ قریب ہی بیٹھا ہوا ڈاکٹر اور نرس کو توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ آرام کریں۔ یہاں ہماری چھ گھنٹے تک ڈیوٹی رہے گی۔ پھر دوسرا ڈاکٹر ایک نرس کے ساتھ آئے گا تو ہم چلے جائیں گے۔"

حمزہ نے کہا۔ "ڈاکٹر! آپ میری بات کا برا نہ مانیں۔ آپ ہی کے انڈر گراؤنڈ کارکن نے ہمارے خلاف مخبری کی اور میرے دوست کا یہ حال کیا ہے۔ اللہ کرے کہ آپ ہمارے ساتھ دیانت دار ہوں۔ میں آپ لوگوں کے فرض شناس رہنے کی دعا کروں گا لیکن آپ میں سے کبھی کسی پر بھروسا نہیں کروں گا۔ جب تک یہ کوما سے نہیں نکلے گا اور نارمل نہیں ہوگا' میں اسی کمرے میں اس کے ساتھ رہوں گا۔"

ڈاکٹر نے اپنے کوٹ کے بٹن کھول کر دکھایا۔ کوٹ کے اندر شانے سے لٹکے ہوئے بلٹس بیلٹ اور ہولسٹر میں ریوالور نظر آیا۔ نرس نے کہا۔ "میں اس دواؤں کے بکس میں سے مسٹر راجہ کو دوائیں دے رہی ہوں اور ان دواؤں کے نچلے حصے میں یہ ٹی ٹی چھپا کر رکھا ہے۔"

اس نے ایک ٹی ٹی پستول نکال کر حمزہ کے قدموں کے پاس پھینک دیا۔ ڈاکٹر اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر حمزہ کے سامنے آکر بولا۔ "میں اپنے ریوالور کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ آپ خود اسے نکال لیں۔"

نرس نے کہا۔ "ہم انڈر گراؤنڈ والوں کو اسلحہ چھپا کر رکھنا پڑتا ہے۔ ہم سے اسلحہ لینے کے بعد بھی آپ کو بھروسا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ہم کسی دوا کے ذریعے آپ کے دوست کو جانی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "پہلے گاڈ فادر ہاشم کے والد کے دور میں کوئی انڈر گراؤنڈ کام کرنے والا ڈاکٹر نہیں تھا۔ ایک بار ہاشم صاحب کاؤنٹر فائرنگ میں بری طرح زخمی ہوگئے تھے۔ لیڈی سرجن آمنہ نے ایک خفیہ اڈے میں صرف چند اوزاروں کے ذریعے ہاشم صاحب کے جسم سے دو گولیاں نکالی تھیں۔ ان کی جان بچائی تھی۔ تب سے ہاشم صاحب ڈاکٹر آمنہ

کو بڑی بہن سمجھ کر ان سے اتنی عقیدت رکھتے ہیں کہ ڈاکٹر آمنہ کے مشورے کے مطابق ہماری تنظیم نے چھ ڈاکٹر' نرسوں' مریضوں کی خدمت کرنے والے ملازموں کے انتظامات کئے ہیں۔"

نرس نے کہا۔ "شاید آپ نہیں جانتے کہ ڈاکٹر آمنہ نے گاڈ فادر ہاشم کے جرائم کا رخ بدل دیا ہے۔ انہوں نے اس شرط پر ہاشم صاحب کی بہن بن کر رہنا منظور کیا ہے کہ ان کے کسی اقدام سے پاکستان کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور ہمارے ملک کو نقصان پہنچانے والے مجرموں اور غیر ملکی ایجنٹوں کو تخریب کاری اور دہشت گردی سے روکنے کی کوشش کرتے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شمشیر سنگھ کالیا پچھلے بائیس برس سے ہاشم صاحب اور ڈاکٹر آمنہ کا دشمن بنا ہوا ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "ہم ڈاکٹر کئی اسپتالوں میں ڈاکٹر آمنہ کے ماتحت رہ کر کام کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں مشورہ دیا ہے کہ ہم گاڈ فادر ہاشم کے لئے کام کرتے رہیں۔ اس طرح ہم مسیحائی کے ذریعے مجرموں کو زندہ رکھ کر ان کے جرائم ختم کریں گے۔ جس طرح ہم مریض کو نہیں' مرض کو ختم کرتے ہیں اسی طرح جرائم ختم کرنے کے لئے مسیحائی کرتے رہیں گے تو جرائم خود بخود ختم ہوتے رہیں گے۔"

حمزہ نے فرش پر پڑے ہوئے ٹی ٹی کو اٹھا کر سبحان اللہ کہتے ہوئے اس ہتھیار کو نرس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر آمنہ قابلِ احترام ہیں۔ ہم بھی ان کے عقیدت مند ہیں۔ یہ کتنا بڑا کارنامہ ہے کہ ڈرگ مافیا کے گاڈ فادر ہاشم کو انہوں نے محبِ وطن بنا دیا ہے۔ وہ آج بھی انڈر گراؤنڈ مافیا کے گاڈ فادر اس لئے کہلاتے ہیں کہ پورے ایشیا کے کئی ممالک انڈر گراؤنڈ تنظیموں کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ طاقت اور وسیع ذرائع کے مالک بن کر رہتے رہیں۔ دوسری فولادی تنظیموں کو کاٹنے کے لئے وہ بھی فولاد بن کر رہتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "حمزہ صاحب! آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ میں بھی بدلتے ہوئے سیاسی حالات سے واقفیت رکھتا ہوں۔ ابتدا میں آپ کی سیاسی سرگرمیاں اتنی شدید تھیں کہ نیک بخت اور کاشف اکبر کے علاوہ خفیہ ہاتھ بھی تشویش میں مبتلا ہوگیا تھا پھر اس نے اپنی سیاسی چالبازیوں سے آپ کی سرگرمیوں کو کم کرنے اور پھر ختم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"

حمزہ نے کہا۔ "میں سمجھ رہا ہوں۔ پہلے اس نے مجھے انیلا اور نیک بخت کے معاملات میں لندن تک الجھائے رکھا پھر میرے پاکستان آنے پر میرے جانبازوں کی فوج

سے مجھے محروم کردیا۔ اگر ایسے وقت ہاشم صاحب ساتھ نہ دیتے تو میں اور راجہ تنہا بے یارو مددگار رہتے۔ اب ہماری ہدایات پر ہاشم صاحب کے بے شمار کارکن ہمارے بھی وفادار بن گئے ہیں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "اس کے باوجود یہاں موجودہ الیکشن میں خفیہ ہاتھ اپنے کسی کٹھ پتلی سیاست داں کو کامیاب کرانے کے لئے آپ کو پھر دوسرے معاملات میں الجھا رہا ہے۔ ڈاکٹر آمنہ کا بیٹا فرمان آپ کا ایک فولادی دستِ راست تھا۔ خفیہ ہاتھ نے "را" کے تعاون سے ایسی چال چلی کہ آپ کا فولادی دستِ راست فرمان اپنی والدہ کے پیچھے بھارت چلا گیا اور یہاں کئی دنوں سے وہ ٹینا کو ایک زبردست مہرہ بنا کر الجھاتے ہوئے راجہ نواز کو کوما میں پہنچا کر آپ کو ایک دوست کی نگرانی کا پابند بنا دیا ہے۔ اب آپ دوست کی حفاظت کریں گے یا خفیہ ہاتھ کو توڑنے کا کوئی راستہ نکالیں گے؟"

"ہاں۔ اس وقت جبکہ الیکشن سر پر ہے' وہ مجھے.......... اور راجہ کو اس معاملے میں الجھائے رکھنا چاہتا ہے۔ ہم دن رات جدوجہد کرنے کے باوجود پاکستان کی انتخابی ہسٹری نہیں بدل سکیں گے۔ یہاں پھر خفیہ ہاتھ کی کٹھ پتلی حکومت بنے گی۔"

وہ پریشانی سے سوچنے لگا پھر بولا۔ "یہاں فرمان ہوتا تو کسی دشمن کو راجہ کے قریب پھٹکنے نہ دیتا اور میں آزادی سے کرپٹ سیاست دانوں کو کچلنے کی بھرپور کوشش کرتا۔ میں ابھی ہاشم سے کہتا ہوں کہ وہ کسی طرح فرمان کا سراغ لگا کر اسے بھارت سے یہاں بھیج دیں۔"

اس نے فون کے ذریعے گاڈ فادر ہاشم سے رابطہ کیا۔ ہاشم نے کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے فرمان نے فون پر اپنی امی سے خیریت معلوم کی تھی اور ان سے کہا تھا کہ بھارت میں اس کو' تابانی اور پوجا کو رازداری سے گرفتار کرنے کے لئے کئی اہم مقامات پر ناکا بندی کی گئی ہے پھر بھی وہ سمندری راستے سے آج رات یا کل کسی وقت وہاں سے نکل آئیں گے۔ پاکستان اس مقصد کے لئے بھی آئیں گے کہ وہاں پہنچ کر مراد کو جیل سے رہائی دلا سکیں۔"

"میں تو موجودہ الیکشن میں خفیہ ہاتھ کی سیاسی حکمت عملی کو ناکام بنانے کے لئے فرمان کی ضرورت محسوس کر رہا تھا لیکن وہ بھی یہاں آکر مراد کے معاملے میں مصروف ہو جائے گا۔"

"فرمان تمہاری ہدایات پر عمل کرے گا۔ مراد کو جیل سے رہائی دلانے کی ذمے داری میری ہے۔ میں نے تابانی سے کہا ہے کہ وہ باجی آمنہ کی حفاظت کے لئے لندن آجائے۔ میں پاکستان جاکر اس کے مراد کو جیل سے نکال لاؤں گا۔"

"آپ بھی پاکستان آئیں گے تو ہم خفیہ ہاتھ کے مقاصد کو ناکام بنا سکیں گے۔"

"الیکشن میں صرف چند روز رہ گئے ہیں۔ یہاں لندن میں رہ کر میں نے خفیہ ہاتھ کی بدلتی ہوئی پالیسیوں کو سمجھ لیا ہے۔ وہ ہمارے ملک میں ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کرنے کے مکمل انتظامات کرچکا ہے اور وقت اتنا کم رہ گیا ہے کہ ہم الیکشن میں اس کے خاطر خواہ نتائج کو بدل نہیں سکیں گے.......... فی الحال یہی راستہ رہ گیا ہے کہ آئندہ بھی کوئی کرپٹ حکمران آئے تو ہم سختی سے اس کا محاسبہ کرتے رہیں اور اس کی بداعمالیوں کو مشتہر کرتے ہوئے عوامی شعور میں تیزی اور شدت پیدا کرتے رہیں۔"

حمزہ نے مایوس ہو کر کہا۔ "یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آدھی صدی گزر جانے کے بعد بھی عوامی سطح پر ایسا شعور بیدار نہیں ہوا ہے' جو عملی طور پر ایک اسلامی دیانت دار حکومت قائم کرسکے۔ آج بھی سندھ کے تمام علاقوں کی اور خاص طور پر کراچی اور حیدر آباد کی بے شمار مسجدوں سے اذان کے بعد یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ نمازی حضرات اپنے گھروں سے وضو کر کے آئیں کیونکہ مسجد میں پانی نہیں ہے۔ پانی جس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی مگر جس کا ٹیکس ادا کیا جاتا ہے اور جو انسان کی اہم ضرورت ہے' وہ پانی پینے اور وضو کرنے کے لئے کسی حکومت کی طرف سے فراہم نہیں کیا جاتا ہے۔ پچاس برسوں سے پینے کا پانی ترسا ترسا کر دیا جاتا ہے لیکن ملک گیر احتجاج نہیں کیا جاتا جیسے ہماری قوم کو کربلا میں جینے کی عادت ہو گئی ہو۔ علامہ اقبال کے حوالے سے سوچتا ہوں کہ وہ مومن کب پیدا ہوں گے جو بے تیغ رہ کر بھی اپنے حقوق کے لئے لڑتے ہیں۔"

"یہ سوچ کر صبر کرو کہ مسلمانوں کا ایمانی جوش و جذبہ صرف نعرے بازی تک رہ گیا ہے۔ ہمارا جہاد جاری رہے گا تو یہ غیرت مند قوم ضرور متحد ہو کر عملی اقدامات کرے گی۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ حمزہ موبائل فون کو جیب میں رکھ کر راجہ کے قریب آیا۔ وہ بدستور بے حس و حرکت بستر پر پڑا ہوا تھا۔ کھلی ہوئی آنکھیں بالکل ساکت تھیں۔ اسے ایک زندہ لاش کی طرح پڑا دیکھ کر حمزہ کا دل دکھ رہا تھا۔ اس کے دماغ میں ایک سوال ابھرا' اگر پوری قوم کوما میں رہے گی اور زندہ لاش کہلاتی رہے گی تو پاکستان کا کیا بنے گا؟ کیا ہم اپنے گھر کو گھر کہہ سکیں گے؟ یا زندہ لاشوں کا مقبرہ کہیں گے؟

☆======☆======☆

میں' تابانی اور پوجا کے ساتھ گوا پہنچا ہوا تھا۔ راجستھان سے نکل کر ممبئی آئے۔ مگر وہاں قیام نہیں کیا' وہاں کے ائرپورٹ اور بندرگاہ کی طرف جانے سے گرفتاری کا خطرہ

تھا۔ اگرچہ "را" کا ڈی جی دھاون فون پر تابانی سے کئی بار کہہ چکا تھا کہ وہ کالیا کی سلامتی کی خاطر ہم تینوں میں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ ہم بھارت سے باہر جس ملک میں جانا چاہیں گے' وہ ہماری روانگی کے انتظامات کردے گا لیکن تابانی نے جواباً کہا تھا کہ ہم ابھی بھارت سے نہیں جائیں گے۔ یہ فیصلہ کریں گے کہ ہمیں یہاں کتنے عرصے تک رہنا ہے۔

جبکہ ہمیں رہنا نہیں تھا۔ ہم جلد سے جلد پاکستان جانا چاہتے تھے اور یہ سمجھتے تھے' لندن میں میری امی کو اور انکل ہاشم کو اپنے دباؤ میں رکھنے کے لئے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ مجھے بھارت میں قید کرکے رکھیں اور میرے علاوہ تابانی کو بھی گرفتار کرلیں گے تو وہ اپنے مراد کی رہائی کے لئے تڑپتی رہے گی اور "را" سے غداری کی سزائیں باقی رہے گی۔

اس نے کہا۔ "میں "را" تنظیم میں ایک عرصے تک رہ کر ان کے حالات کے مطابق بدلتی ہوئی پالیسیوں کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ وہ مجھے گرفتار کرنے کے بعد ادھر مراد تک خبر پہنچائیں گے کہ یہاں مجھے قیدی بناکر مجھ پر ٹارچر کیا جارہا ہے۔ وہ میری محبت میں جیل سے فرار ہوگا تو سزائے موت پانے سے پہلے اسے پولیس مقابلے میں مار دیا جائے گا۔"

گوا پہنچ کر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم تینوں ساتھ رہیں گے تو عارضی میک اپ کے باوجود وہ پہلے شبہے میں گرفتار کریں کہ دو عورتوں کے ساتھ رہنے والا مرد فرمان ہی ہوسکتا ہے پھر وہ ہمارے عارضی میک اپ کو واش کرکے ہمارے اصل چہرے دیکھ لیں گے۔

گوا میں کئی ساحلی علاقے تھے۔ پنجم کے ساحلی شہر میں پہنچ کر میں نے کہا۔ "دیدی! باہر سے آنے والوں کے لئے یہ بہترین تفریحی جگہ ہے۔ یہاں غیر ملکی سیاحوں کے علاوہ چھوٹے بڑے اسمگلرز بھی ہیں' آپ کسی اسمگلر سے سودے بازی کرکے یا اسے جبراً ٹریپ کرکے یہاں سے کشتی یا موٹر بوٹ کے ذریعے پاکستان کے کسی بھی ساحلی علاقے میں پہنچ سکتی ہیں۔"

ہم پنجم میں دریائے منڈوی کے ساحل پر دو الگ کاٹیج میں تھے۔ ایک میں دیدی تھیں اور دوسرے کاٹیج کو حاصل کرنے کے لئے میں نے اپنا نام بنواری لال اور پوجا کا نام ارچنا لکھوایا تھا اس کے لئے ہم نے پتی پتنی کا رشتہ ظاہر کیا تھا۔ ہم تمام دن ایک دوسرے سے الگ رہ کر اسمگلروں کے متعلق معلومات حاصل کرتے رہے۔ یوں تو اسمگلر خود کو ظاہر نہیں کرتے لیکن جو بڑے اسمگلرز شہر......... اور ساحلی علاقے کی پولیس کی جھولیاں بھرتے رہتے ہیں' وہ فخر سے وسیع ذرائع کے مالک کے طور پر اپنے سے کمتر مجرموں اور اسمگلروں

پر رعب اور دبدبہ رکھتے ہیں۔ ہم نے ساحلی علاقے میں گھومتے ہوئے دو ایسے اسمگلروں کا پتا معلوم کرلیا۔ ان میں سے ایک آدھی رات کو موٹر بوٹ میں مال لے کر پاکستان کے قریبی ساحل تک جانے والا تھا اور دوسرے اسمگلر کا سفر منڈوی کے ساحل سے ممبئی تک تھا۔

پاکستانی ساحل کی طرف جانے والے اسمگلر کا نام کاسترو تھا۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ گوا میں برسوں سے ایک عالیشان کوٹھی میں رہتا تھا۔ تابانی نے اس سے ملاقات کی اور اس سے کہا۔ "مسٹر کاسترو! میں آج یہاں سے پاکستان جانا چاہتی ہوں۔ سودا کرو' مجھے وہاں تک پہنچانے کی کتنی رقم لوگے؟"

کاسترو نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا پھر پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ بولی۔ "میرا نام ڈالر ہے۔ بولو کتنے ڈالر لوگے؟"

"تمہارا تعلق یہاں کی پولیس سے نہیں ہے۔ میں یہاں سب کو جانتا ہوں۔ ہوسکتا ہے تم دہلی راجدھانی کی انٹیلیجنس ڈپارٹمنٹ سے آئی ہو۔"

"مجھ پر شبہ نہ کرو۔ اگر میں راجدھانی کے انٹیلیجنس ڈپاٹمنٹ سے تعلق رکھتی ہوں تو ابھی پولیس' کوسٹ گارڈ اور فوج کو بلا سکتی ہوں۔ رات کو تمہاری موٹر بوٹ یہاں سے جا نہیں سکے گی۔"

"ہوں۔ تمہارے ساتھ اور کون جائے گا؟"

"کوئی نہیں۔ میں سمندری سفر میں تنہا تمہارے رحم و کرم پر رہوں گی۔ تم اور تمہارے آدمی جب چاہیں گے' مجھے اٹھا کر سمندر میں پھینک سکیں گے۔"

"اکیلی چلوگی تو لے چلوں گا اور ایک ہزار ڈالر لوں گا۔"

سودا طے ہوگیا۔ آدھی رات کو روانگی سے پہلے کاسترو اسمگلنگ کا مال بوٹ میں پہنچا رہا تھا اور اس سے پہلے کوسٹ گارڈ اور شہری پولیس کی جیبیں گرم کرنے میں مصروف تھا۔ میں پوجا کے ساتھ کاسترو کی کوٹھی میں پہنچ گیا۔ وہاں مین گیٹ پر ایک دربان اور کوٹھی کے بیرونی دروازے پر ایک مسلح گارڈ تھا۔ ہم دونوں احاطے کی باؤنڈری وال پھلانگ کر اندر آئے' میں نے مسلح گارڈ کو پیچھے سے آکر دبوچ لیا پھر ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے لگا کر سختی سے خاموش رہنے کی دھمکی دی۔ اسے کوٹھی کے دوسری طرف لے جاکر پوچھا۔ "کوٹھی کے اندر کتنے افراد ہیں۔ جھوٹ نہ بولنا۔ میں تمہارے ساتھ اندر جاؤں گا۔ کوئی دھوکا ہوا تو پہلے تمہیں گولی مار دوں گا۔"

اس نے بتایا کہ مسز کاسترو اپنے تیرہ سال کے ایک بیٹے اور دو چھوٹی بیٹیوں کے

ساتھ رہتی ہیں۔ ڈرائنگ روم اور بیڈ روم میں ایک ایک ٹیلی فون ہے اور ایک موبائل فون مسز کاسترو کے پاس ہے۔

تمام معلومات اچھی طرح حاصل کرنے کے بعد پوجا نے گارڈ کی گن سے بلٹس بیلٹ نکال کر اسے خالی گن دے دی پھر اس کے ساتھ اندر آئے۔ رات کے دس بجے مسز کاسترو اپنے بیٹے کے ساتھ ٹی وی کے پروگرام دیکھ رہی تھی۔ دو چھوٹی لڑکیاں سو رہی تھیں۔ مسز کاسترو نے ہمیں دیکھتے ہی خوفزدہ ہو کر اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ میں نے کہا۔ "ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ یہاں سے ایک پیسے کی چیز بھی نہیں لے جائیں گے۔ تم سب کی سلامتی اسی میں ہے کہ ہم جو کہیں' وہ کرتی جاؤ۔"

مسز کاسترو نے رونے کے انداز میں کہا۔ "میرے بچوں کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ تم جو کہو گے' میں وہ کروں گی۔"

"اپنے ریکارڈر میں آڈیو کیسٹ لگاؤ۔ اس میں اپنی اور اپنے بیٹے کی کچھ باتیں ریکارڈ کرو۔"

وہ فوراً ہی حکم کی تعمیل کرنے لگی۔ پوجا دوسرے کمروں میں جاکر دیکھنے لگی۔ اس نے ڈرائنگ روم کے فون تار کاٹ کر ریسیور اپنے پاس رکھ لیا پھر اس نے بیڈ روم میں آکر وہاں کے فون کا بھی ریسیور الگ کرکے اپنے پاس رکھا۔ مسز کاسترو اور اس کا بیٹا میری ہدایت کے مطابق کاسترو کو مخاطب کرکے یہ بتانے لگے کہ تابانی کے بخیریت پاکستان پہنچنے تک اس کی پوری فیملی کو یرغمال بنا کر رکھا جائے گا۔

میں نے ریکارڈ کی ہوئی کیسٹ پوجا کو دے کر کہا۔ "اسے ڈیڈی کو چپکے سے دے کر آجاؤ۔ ہمیں صبح تک یہاں رہنا ہے۔"

وہ کیسٹ لے کر تابانی کے پاس آئی۔ وہ اپنا سفری بیگ تیار کرکے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ پوجا نے اسے وہ کیسٹ دے دیا۔ تابانی وہ کیسٹ اور چھوٹا ریکارڈر لے کر کاسترو کے پاس چلی گئی۔ اس کی بوٹ آدھی رات سے پہلے ہی روانہ ہوگئی۔ وہ چاہتا تھا کہ صبح سے پہلے پاکستان کے ایک بلیک پورٹ تک پہنچ جائے۔ اس نے روانگی سے پہلے ایک ہزار ڈالر تابانی سے لے لئے تھے۔ ساحل سے کئی کلو میٹر دور نکل آنے کے بعد اس نے تابانی سے پوچھا۔ "اب بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟ کیا کرتی ہو؟ اور کیوں اتنی راز داری سے پاکستان جارہی ہو؟"

وہ بولی۔ "میں نے تم سے نہیں پوچھا کہ دو ملکوں کے درمیان کیسے کیسے مال کی اسمگلنگ کرتے رہتے ہو۔ میں نے تمہیں منہ مانگی رقم دی ہے۔ یہ کافی ہے۔ غیر قانونی

دھندا کرنے والوں کو قانون کے محافظوں کی طرح سوالات نہیں کرنا چاہیں۔"

کاسترو کے ایک دست راست نے کہا۔ "زیادہ سمارٹ نہ بنو ورنہ تمہیں اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں گے۔"

تابانی نے پوچھا۔ "کیوں مسٹر کاسترو! مجھے سمندر میں پھینک دیا جائے گا؟"

کاسترو نے کہا۔ "عقل سے کام لو۔ یہاں سب میرے آدمی ہیں۔ تم اکیلی ہو۔ یہ لوگ تمہاری عزت سے کھیل کر تمہیں سمندر میں پھینک سکتے ہیں۔"

تابانی نے اپنے سفری بیگ سے چھوٹا کیسٹ ریکارڈر نکال کر کاسترو کو دیتے ہوئے کہا۔ "تمہارے تمام سوالوں کے جوابات اس میں ہیں۔ اسے آن کرو اور سنو۔"

اس نے ریکارڈر لے کر سوچتی ہوئی نظروں سے تابانی کو دیکھا پھر اسے آن کیا۔ چند سیکنڈ کے بعد وہ ریکارڈر سے اپنی بیوی کی آواز سن کر چونک گیا۔ اس کی بیوی کہہ رہی تھی۔ "کاسترو! میں تمہاری لیزا بول رہی ہوں۔ اس وقت میں اپنے اور تمہارے تینوں بچوں کے ساتھ گن پوائنٹ پر ہوں۔ واپس آکر ہمیں زندہ سلامت دیکھنا چاہتے ہو تو اپنے ساتھ سفر کرنے والی اس عورت کو ہاتھ بھی نہ لگانا۔ تم اسے پاکستان کے ساحل پر بخیریت پہنچا دوگے تو وہ تم سے بہت دور جانے اور تمہاری نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد موبائل فون کے ذریعے اپنی خیریت سے آگاہ کرے گی تو گن پوائنٹ پر رکھنے والے ہمیں بھی یہاں بخیریت چھوڑ کر چلے جائیں گے۔"

ایک ذرا توقف کے بعد بیٹے کی آواز سنائی دی۔ "ڈیڈی! میں آپ کا بیٹا رابن کاسترو بول رہا ہوں۔ ممی نے جیسا کہا ہے' ویسا ہی کریں۔ نہیں تو یہ ہمیں گولی مار دیں گے۔"

پھر ایک ذرا توقف کے بعد اسے میری آواز سنائی دی۔ "کاسترو! تم نے بیوی اور بیٹے کی آواز سن لی۔ تمہاری دونوں بیٹیاں سو رہی ہیں۔ میں نے ان معصوم بچیوں کو نہیں جگایا ہے۔ یہی کافی ہے کہ تمہارا ایک ہی بیٹا میرے رحم و کرم پر ہے۔ میں نے یہ آوازیں احتیاطاً ریکارڈ کی ہیں۔ تمہاری وائف نے بتایا ہے کہ سمندری سفر کے دوران میں موبائل فون کے ذریعے تم سے باتیں ہوجاتی ہیں ورنہ کئی کلو میٹر دور جانے کے بعد کوڈ نمبرز بدل جاتے ہیں۔ تم ابھی اپنی وائف سے رابطہ کرنے کی کوششیں کرو۔ شاید تمہیں بیوی کی زبان سے تمہاری فیملی کے صحیح حالات معلوم ہوجائیں۔ دیٹس آل۔"

کاسترو نے ریکارڈر کو آف کیا پھر اپنا موبائل فون نکال کر اپنی وائف کے موبائل فون سے رابطہ کرنے لگا۔ پہلے دوبار ناکامی ہوئی۔ تیسری بار رابطہ ہوا۔ اس نے پوچھا۔ "ہیلو لیزا! تم خیریت سے ہو؟"

جواب ملا۔ "ابھی خیریت سے ہوں۔ اگر تم نے کیسٹ میں ہماری باتیں سنی ہیں تو اس پر عمل........"

فون پھر خرابی پیدا ہوئی۔ بیوی کی آواز رک رک کر آرہی تھی۔ سمندر کی تیز ہواؤں کے شور سے بھی مداخلت ہورہی تھی لیکن پوری طرح اپنی وائف لیزا سے باتیں نہ ہوسکیں۔ فون بالکل بند ہوگیا تھا۔ ویسے جتنی باتیں ہوچکی تھیں' ان سے تصدیق ہوگئی کہ کیسٹ ریکارڈر سے ملنے والی دھمکیاں درست ہیں۔

اس نے تابانی کو کیسٹ ریکارڈر دیتے ہوئے کہا۔ "تم بہت چالاک عورت ہو۔ پورے حفاظتی انتظامات کے ساتھ آئی ہو۔"

"ایسا نہ کرتی تو میری عزت سے کھیلا جاتا اور سمندر میں پھینک دیا جاتا۔ اب اپنے آدمیوں سے کہو کہ مجھے ہاتھ لگائیں۔"

کاسترو نے غرا کر اپنے آدمیوں سے کہا۔ "تم سب اس سے دور رہو۔ اسے کسی طرح کا بھی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔"

تابانی نے کہا۔ "تھینک یو کاسترو! یہ دیکھو کہ میں تمہارے جیسے بد معاشوں کے درمیان تنہا رہ کر تم سب کو کس طرح شریف، اور سادھو بنا کر رکھتی ہوں۔"

میں پوجا کے ساتھ صبح تک کاسترو کے بیڈ روم میں رہا۔ کاسترو کی بیوی بھی جاگتی رہی۔ اس کا بیٹا ماں کے زانو پر سر رکھ کر سوگیا تھا۔ صبح سات بجے میں نے اپنے موبائل فون پر دیدی کی آواز سنی۔ "فرمان میں خیریت سے پہنچ گئی اور ساحل سے بہت دور ہوں۔ کاسترو اور اس کے آدمیوں کی دسترس سے کئی کلومیٹر دور نکل آئی ہوں۔ تم اس کی فیملی کو چھوڑ کر اس کوٹھی سے چلے جاؤ۔ یہاں سے میرپور خاص یا ٹھٹھہ وغیرہ جو بھی شہر قریب پڑے گا وہاں میں تمہارا اور پوجا کا انتظار کروں گی۔"

میں پوجا کے ساتھ اس کوٹھی سے باہر آگیا۔ پوجا نے کہا۔ "ہم نے اپنے لئے دوسرا کاٹیج خواہ مخواہ کرائے پر حاصل کیا تھا۔ ساری رات اسی کوٹھی میں گزر گئی۔"

"اور اب بھی نیند پوری کرنے کے لئے ہم اس کاٹیج میں نہیں جائیں گے۔ کاسترو یہاں کا بااثر اسمگلر ہے۔ اس کی بیوی لیزا پورے شہر کی پولیس کو ہماری تلاش میں لگادے گی۔ یہاں سے ابھی چلو۔"

ہم نے کاٹیج سے اپنا سفری بیگ لیا پھر وہاں سے دور جنوبی ساحلی شہر کولابہ کی طرف ایک بس میں بیٹھ کر جانے لگے۔ ہم نے ٹیکسی یا........ رینٹڈ کار میں جانا مناسب نہیں سمجھا۔ بس کی سیٹ سے ٹیک لگا کر ہم دونوں ایک دوسرے کے سر سے سر ملا کر سوتے

رہے اور سفر کرتے رہے۔ دن کے گیارہ بجے کولابہ پہنچ کر ایک معمولی سے ہوٹل میں کمرا لیا۔ وہاں غسل کر کے لباس بدل کر تازہ دم ہو گئے۔ کمرے میں ناشتہ منگوا کر پیٹ پوجا کی۔ میں نے کہا۔ "ہمیں یہاں بھی گھوم پھر کر معلوم کرنا ہوگا کہ یہاں سے کس طرح پاکستان کے کسی ساحلی علاقے میں پہنچ سکتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "معلوم کرلیں گے۔ جلدی کیا ہے۔"

"وہاں دیدی ہمارا انتظار کرتی رہیں گی۔"

"شام کو باہر جائیں گے۔ یہاں غیر ملکی سیاح بڑی تعداد میں آتے ہیں تمام رات کلب اور شراب خانے کھلے رہتے ہیں۔ ہمیں آدھی رات تک بہت سی اہم معلومات حاصل ہوجائیں گی۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ تم بہت تھک گئی ہو۔ کیا نیند پوری نہیں ہوئی؟"

"بس اتنی ہلتی اور ڈگمگاتی جارہی تھی کہ بار بار آنکھ کھل جاتی ہے۔ تمہیں پتا ہے' ہم دونوں سر سے سر جوڑے سوئے رہے تھے۔"

"میں تو بے خبر سو رہا تھا۔"

"تم کیسے مرد ہو۔ عورت کی قربت سے بے خبر رہتے ہو۔ کیا تمہاری زندگی میں کبھی کوئی عورت نہیں آئی۔"

اس نے اپنی گوری گوری باہنیں میری گردن میں ڈال دیں۔ اس نے سوال کیا تھا' کیا میری زندگی میں کبھی کوئی عورت نہیں آئی؟ اس کے سوال نے میرے خوابیدہ جذبات کو جگا دیا۔ میری سانسوں سے اپنی سانسیں ٹکرانے والی پھر ایک شلپا میری زندگی میں آگئی تھی۔ تمام عورتیں حسن و شباب اور کشش کے اعتبار سے ایک جیسی ہوتی ہیں۔ صرف مزاج مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی وفا شعار اور کوئی بے وفا ہوتی ہے۔ شلپا نے پہلی بار ایک عورت کی حیثیت سے خود کو متعارف کرایا۔ عورت کے حسن سے محبت اور اپنی ذات سے نفرت سکھا دی تھی۔ یہ سمجھا دیا تھا کہ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی اور اب پوجا اپنی قربت سے سمجھا رہی تھی کہ مرد وہ ہوتا ہے جو مٹی کو ہاتھ لگا کر سونا بنا دیتا ہے اور سونا سونا کر کے بڑی گہری نیند سلا دیتا ہے۔

میں نے اسے آواز دی۔ "پوجا! آنکھیں کھولو۔ کب تک سوتی رہوگی۔ شام کے چھ بجنے والے ہیں۔"

اس نے آنکھیں کھول کر ایک بار بھرپور انگڑائی لی پھر وہ انگڑائی مجھ پر ٹوٹنے لگی۔ اس وقت ایسا لگتا ہے' قیامت ٹوٹ رہی ہو۔ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ یہ عمر کا تقاضا ہوتا ہے

کہ قیامت آئے تو قیامت بن کر اسے شانت کرو۔

ہم رات کے آٹھ بجے ہوٹل سے باہر آئے۔ دکانیں، ریستوران، کلب اور شراب خانے جاگ رہے تھے۔ وہاں کا لوگ رقص اور گیت پیش کرنے والے بھی نشہ اور رنگینیاں پیدا کر رہے تھے۔ ہم اپنی مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کے لئے سمندر کے ساحل پر آئے۔ جگہ جگہ سیاح مردوں اور جوان عورتوں کا میلہ سا لگا ہوا تھا۔ ہم ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے مچھیروں کی بستی کی طرف آئے۔ مچھلیاں پکڑنے والے رات کو جال اور کشتیاں لے کر سمندر میں جاتے ہیں اور جانے سے پہلے ناچتے گاتے اور دیسی شراب پیتے ہیں۔

بعض ماہی گیر اتنی زیادہ پی لیتے ہیں کہ نشے میں بھارتی سمندری سرحد پار کر کے پاکستان کے ساحلوں تک چلے آتے ہیں۔ پاکستان کے ماہی گیر بھی کچھ ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں۔ شراب کے نشے میں غلطی سے بھارت کے ساحلی علاقہ میں آ کر گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح یہ الزام دیا جاتا ہے کہ بھارت کے سمندری حصے میں آنے والے ماہی گیر نہیں بلکہ پاکستانی جاسوس ہوتے ہیں۔

ایک جگہ چار بڑی کشتیاں ریت پر نظر آئیں۔ وہ کشتیاں آدھی رات سے پہلے سمندر میں جانے والی تھیں۔ ایک کشتی پر کوئی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آواز دی۔ "بابو جی! ادھر آؤ۔ چاندنی رات ہے۔ سمندر میں سیر کرنے کا بڑا مجا آتا ہے۔"

ہم اس کے قریب آئے۔ میں نے پوچھا۔ "کیا یہ سمندر میں سیر کرانے والی کشتیاں ہیں؟"

"جی بابو جی! ایک گھنٹے کے بیس روپے لگتے ہیں۔ اگر آپ دو ہیں تو چالیس روپے دینے ہوں گے۔"

"ہمیں کتنی دور لے جاسکتے ہو۔ کرائے کی فکر نہ کرو۔ جتنے بھی گھنٹے گزریں۔ جتنی بھی رقم بنے، اس سے زیادہ ہی دوں گا مگر ہم بہت دور تک جانا چاہتے ہیں۔"

"صاحب بولو نا بابو جی! پاکستان جانا چاہتے ہیں؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "یہی سمجھ لو۔ کیا چلو گے؟"

"چاروں طرف بندوک "بندوق" ہی بندوک نہ ہوتی تو لے چلتا۔ آپ ان سسری بندوکوں کو ہٹا دیں پھر گیت گاتے چلیں گے۔ ہیا ہو ہیا۔ جور لگا کے بھیا۔"

میں نے چونک کر دیکھا۔ ان چار کشتیوں کے پیچھے سے ابھرنے والوں کے ہاتھوں میں رائفلیں، ریوالور اور کلاشنکوف تھیں۔ پوجا نے پریشان ہو کر دیکھا۔ ہمیں گھیرنے

والے ریت پر رینگتے ہوئے پیچھے سے بھی آئے تھے۔ ریت کے باعث ہمیں ان کی آہٹ بھی نہیں ملی تھی۔

کشتی پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔ "بابو جی! کہاں سمندر میں ڈوبنے جائیں گے۔ ہمرے مہمان بن کے چلو۔ موج کرو گے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ تمرے پاس بھی ہتھیار ہیں۔ مگر جرا بدھی (عقل) سے کام لینا۔ ہلو گے تو چاروں اور (طرف) سے گولیوں کی برسات ہونے لگے گی۔"

ایک رائفل بردار میرے پاس آیا۔ لباس کی تلاشی لے کر اس نے میرا ریوالور لے لیا۔ دوسرا شخص پوجا کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔ وہ فوراً میرے پیچھے آ کر بولی۔ "خبردار! مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ میرے پاس ٹی ٹی ہے۔ میں خود اپنے لباس سے نکال کر دے رہی ہوں۔"

"ہم کیا جانیں، تمرے پاس ایک ہی ٹی ٹی ہے۔ دوسرا ہتھیار بھی ہو سکتا ہے۔ ہم تمرے کپڑے کے اندر جرور دیکھیں گے۔"

میں نے کہا۔ "بے غیرتی کی باتیں نہ کرو۔ ہم ہتھیار پھینک رہے ہیں۔ خود کو تمہارے حوالے کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود ایک پرائی عورت کے لباس کی تلاشی لینا چاہتے ہو۔"

"بھئی تم نے تلاشی دے دی۔ اس کو بھی تلاشی دینے دو۔ نہیں تو اس کو گولی مار دیں گے۔"

دوسرے نے کہا۔ "مار دو گولی۔ شلپا رانی نے کہا تھا۔ صرف فرمان کو لاؤ کسی اور کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے پوجا کے سامنے ڈھال بن کر کہا۔ "اس پر گولی نہ چلانا ورنہ میں مرتے مرتے بھی تم سب کو مار ڈالوں گا۔ تمہاری باتوں سے پتا چل رہا ہے کہ شلپا یہ دشمنی کر رہی ہے۔ مجھے موبائل فون کے ذریعے اس سے بات کراؤ۔"

"تو پھر بات کرو۔ ہم تمہاری لیلیٰ کو تھوڑی دیر زندہ رہنے دیں گے۔"

میں نے موبائل نکال کر شلپا کا نمبر پوچھا پھر وہ نمبر پنچ کئے۔ رابطہ ہونے پر اس کی آواز سنائی دی۔ میں نے کہا۔ "میں فرمان بول رہا ہوں"

دوسری طرف سے شلپا کا قہقہہ سنائی دیا پھر وہ بولی۔ "تم نے میری ایک ٹانگ پر گولی ماری تھی۔ وہ زخم بھر چکا ہے لیکن میرے اندر کا زخم تب بھرے گا، جب میں تمہیں زندہ رکھ کر روز زخم دیتی رہوں گی اور ان زخموں پر نمک چھڑکتی رہوں گی۔ تم چیختے چلاتے رہو گے۔ اپنے لئے موت مانگتے رہو گے اور میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔"

"یہ کیوں بھول رہی ہو کہ تمہارا باپ میری امی کے زیرِ علاج ہے۔ تم مجھ سے انتقام لو گی تو تمہارے باپ کا کیا انجام ہو گا۔"

"جب تمہاری ماں.......... اور گاڈ فادر ہاشم وغیرہ کو معلوم ہو گا کہ میں نے تمہیں قید کیا ہے اور انتقام لے رہی ہوں' تب میرے ڈیڈی کے ساتھ برا سلوک کیا جائے گا۔ یہ کوئی نہیں جان سکے گا کہ میں نے تمہیں قیدی بنا کر رکھا ہے۔ تمہاری گم شدگی کا الزام بھارتی حکومت پر یا "را" والوں پر آئے گا۔ تمہاری ماں اور ہاشم اس وقت تک میرے ڈیڈی سے دشمنی نہیں کریں گے جب تک تم انہیں نظر نہیں آؤ گے اور روز روز زخم کھاتے کھاتے مرجاؤ گے' تب تک میں اپنے ذرائع سے اپنے کئی حمایتی گاڈ فادرز کی مدد سے ڈیڈی کو ہاشم کے چنگل سے نکال کر اپنے خفیہ اڈے پر لے آؤں گی۔"

"تم جو کرنا چاہتی ہو' کرو لیکن پوجا کو ہلاک نہ کرو۔ اسے جانے دو۔ اس سے تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے۔"

شلپا نے کہا۔ "اسے زندہ چھوڑ دوں؟ تاکہ یہ تمہاری ماں اور ہاشم کو بتا دے کہ تم میری قید میں ہو۔ اسے تو مرجانا ہے اور ابھی مرنا ہے۔ تمہیں تو میرے قدموں میں آنا ہے اور ابھی آنا ہے۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد کشتی پر بیٹھے ہوئے شخص کے پاس موبائل فون کی آواز سنائی دی۔ اس نے فون آن کر کے کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو کون؟"

دوسری طرف سے شلپا نے کہا۔ "وقت ضائع نہ کرو۔ وہاں "را" کے جاسوس پہنچ سکتے ہیں۔ پوجا کو ختم کرو اور فرہان کو لے آؤ۔"

"میں ابھی آپ کی آگیا (حکم) کا پالن کر رہا ہوں۔"

اس نے فون بند کر کے اپنے تمام مسلح افراد کو دیکھا پھر کہا۔ "ہمری سلپا رانی کا حکوم ہے۔ اس چھوکریا کو ختم کر دو۔ مار دو گولی۔"

میں "نہیں" کہہ کر پوجا کو چھپانے کے لئے اس سے لپٹ گیا۔ وہ بولا۔ "خبردار! حکوم ہے کہ پھرمان کو کوئی گولی نہ مارے۔"

دشمن چاروں طرف تھے اور میں پوجا کے آگے ڈھال بن اسے بازوؤں میں چھپا رہا تھا۔ ایک گولی چلی تو پوجا کے حلق سے چیخ نکلی پھر دوسری گولی چلی۔ دونوں گولیاں اس بے چاری کی پشت پر لگی تھیں۔ ایسے وقت نہ تو عقل کام آتی ہے اور نہ کسی طرح بھی اپنی جان کی جان بچائی جا سکتی ہے۔ میں اسے گولیوں سے بچانے کے لئے پشت کی طرف آیا تو آگے سے چلنے والی گولیاں اس کے سینے اور پیٹ میں پیوست ہونے لگیں۔ وہ بے جان

ہو کر گرنے لگی۔ میں نے اسے سنبھال کر ریت پر لٹایا۔ میرے اندر غصے کا آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ میں کشتی پر بیٹھے ہوئے شخص پر چھلانگ لگا کر اسے گرفت میں لے کر نیچے ریت پر آ کر گرا۔ اس کی گردن دبوچنے سے پہلے ہی وہ چیخ کر بولا۔ "اس کو گولی نہ مارنا۔"

وہ آگے نہ بول سکا۔ میں نے اس کی گردن دبوچ لی پھر اسے مارنا چاہتا تھا۔ پیچھے سے کئی مسلح افراد کلاشنکوف اور رائفلوں کے بٹ سے میرے سر پر اور جسم کے دوسرے حصوں پر ضربیں لگانے لگے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو بے ہوش ہو جاتا یا مرجاتا۔ میں اٹھ کر ان پر خالی ہاتھوں سے حملے کرنے لگا۔ وہ بھی مار کھا رہے تھے۔ میں بھی لہولہان ہو رہا تھا۔ میرے خالی ہاتھوں اور لاتوں کے حملے ان کے لئے ایسے زبردست تھے کہ وہ بھی لہولہان ہو کر گرتے جا رہے تھے اور سنبھلتے جا رہے تھے۔ آخر ایک بڑا اور مضبوط جال مجھ پر پھینکا گیا۔ میں اس میں الجھ کر رہ گیا۔ جدھر سے جال اٹھا کر نکلنا چاہتا تھا ادھر سے کئی افراد حملے کرتے تھے۔ رائفلوں کے دستے کی ضربیں معمولی نہیں ہوتیں۔ ایک یا دو ہی حملوں میں مار کھانے والا چکرا کر گر پڑتا ہے۔ پتا نہیں مجھ پر کتنے حملے ہو چکے تھے۔ سر سے بہنے والا خون آنکھوں میں بھر گیا تھا۔ میں دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

مجھ پر حملے کرنے والے تھک کر ہانپ ہانپ کر گالیاں دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ "یہ آدمی ہے یا گینڈا۔ سالا فولاد ہے۔ نہ مرتا ہے نہ گرتا ہے۔"

آخر میں انسان ہوں۔ بے دم سا ہو کر گر پڑا۔ بے ہوشی طاری ہوتے تک میں نے پوجا کے بے جان جسم کو محسوس کیا۔ میں اس پر گرا ہوا تھا۔ وہ بے جان سہی' مجھے اس پر سے اپنا بوجھ ہٹانا چاہیے تھا لیکن مجھ میں ہلنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ یہ ہوش بھی نہ رہا کہ جہاں تھا' وہیں پڑا رہ گیا ہوں یا نامعلوم کس عالمِ نامعلوم میں پہنچا ہوا ہوں۔

☆======☆======☆

ایک دن گزر گیا۔ ایک رات گزر گئی پھر دوسرا دن بھی گزرنے لگا۔ وہ کوما میں پڑا رہا۔ وہ آدھا مرچکا تھا لیکن اس کی میت نہیں اٹھائی جا سکتی تھی۔ وہ زندہ بھی تھا لیکن یوں جینے کو زندگی گزارنا نہیں کہتے۔ ٹینا اس پر ایسا حملہ کر کے فرار ہوئی تھی کہ وہ گھر کا رہا تھا' نہ گھاٹ کا۔ اپنے جان سے زیادہ عزیز دوست حمزہ کو بھی اپنی موت کا یقین دلا رہا تھا' نہ زندہ رہنے کی امید دلا رہا تھا۔

حمزہ اپنے غصے اور بے چینی پر قابو پاتا آ رہا تھا لیکن قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی۔ وہ انتقامی کارروائی کے طور پر کوئی ایسا بڑا قدم اٹھانا چاہتا تھا کہ خفیہ ہاتھ کے ہاتھوں بھی طوطے اُڑ جاتے لیکن بڑی مجبوری تھی۔ وہ راجہ کو تنہا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا اور

جوابی کارروائی کے لئے لازمی تھا کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بدلتا رہتا۔ راجہ کو اٹینڈ کرنے والے تمام ڈاکٹرز یقین دلا رہے تھے۔ بار بار تسلیاں دے رہے تھے کہ اللہ نے چاہا تو وہ کوما سے نکل آئے گا۔ انجکشن کے ذریعے اسے بڑی مؤثر دوائیں دی جا رہی ہیں۔

حمزہ نے موبائل فون کے ذریعے خفیہ ہاتھ کے سیکرٹری سے کہا۔ ”تمہارا صاحب جب جیت کے نشے میں ہوتا ہے تو اپنے مخالفین سے باتیں نہیں کرتا۔ اس سے کہو' میں اس کا نشہ اتارنے والی بات کہنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ بات نہ کرنا چاہے تو اس سے کہہ دینا کہ میرے وطن سے اپنے سفارت خانے کے ایک ایک کتے کو بارہ گھنٹے کے اندر واپس بلا لے ورنہ یہاں سے سب کے تابوت جائیں گے۔“

سیکرٹری نے کہا۔ ”آپ ہولڈ کریں۔ میں سر کو آپ کا پیغام دے رہا ہوں۔“

حمزہ نے انتظار کیا پھر خفیہ ہاتھ کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو مسٹر حمزہ! سیکرٹری نے تمہارا بارود بھرا پیغام دیا ہے۔ تم نے دھمکی دی تھی کہ میں نے تم سے بات نہ کی تو میرے سفارت خانے میں جتنے افراد ہیں' تم ان سب کے تابوت وہاں سے بھیجو گے۔ میں مانتا ہوں' تم جو کہتے ہو' وہ کر گزرتے ہو اس لئے فوراً تم سے بات کر رہا ہوں۔ کیا اب بھی میرے سفارت خانے کے افراد کو نقصان پہنچاؤ گے؟“

”نہیں۔ تم بات کر رہے ہو اس لیے دھمکی واپس لیتا ہوں۔ مجھے تمہارے سفارت خانے کے عملے سے دشمنی نہیں ہے۔“

”کیا مجھ سے دشمنی ہے؟“

”ایسی دشمنی ہے جیسے موت کو زندگی سے ہوتی ہے۔ میں پہلے سے خبردار کر رہا ہوں۔ اپنی خفیہ رہائش گاہ بدل ڈالو۔ جس دن راجہ کوما سے باہر نکلے گا' میں اس کے دوسرے دن تمہاری موت بن کر پہنچ جاؤں گا۔ میرا بھی یہ کمال دیکھو کہ میں کس طرح تمہارے خفیہ اڈے کا سراغ صرف چند گھنٹوں میں لگاؤں گا۔“

”میں یہ بھی مانتا ہوں۔ تم سے دشمنی کے باوجود تمہاری صلاحیتوں کو تسلیم کرتا ہوں۔ میں نے تمہیں جانبازوں کی فوج سے اور مختلف اہم ذرائع سے محروم کیا تھا۔ تم نے چند گھنٹوں میں پہلے سے زیادہ جانبازوں کی فوج اور اہم ذرائع پیدا کر لئے۔ یہ تمہاری مردانگی ہے کہ تم نے میرے خفیہ اڈے تک پہنچنے کی پیشگی اطلاع دے دی۔ میں ضرور اپنی رہائش گاہ بدل دوں گا۔ ویسے میری ایک بات پر ٹھنڈے دماغ سے غور کرو۔ اپنے اصولوں میں ذرا سی لچک پیدا کر کے مجھ سے دوستی کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ موجودہ زر خرید سیاست دانوں کو ٹھوکریں مار کر تمہارے ملک کو خوشحال بنا دوں گا۔“

”تم جس دن قومی خزانے لوٹنے والے قرض نادہندگان سے تمام رقم وصول کر کے پاکستان کو ورلڈ بینک کی محتاجی سے نجات دلاؤ گے اور خفیہ ایجنسیوں کے ذریعے تخریب کاری اور دہشت گردی ختم کراؤ گے' اس دن سب سے پہلے میں تم سے دوستی کا ہاتھ بڑھاؤں گا۔“

”تم نے دو اہم معاملات پیش کئے ہیں۔ ان معاملات پر تفصیلی مذاکرات کی ضرورت ہے۔“

”سیاسی مذاکرات عوام کو بہلانے اور دھوکا دینے کے لئے ہوتے ہیں۔ تم ابھی تنہا ہو۔ آئینے کے سامنے بیٹھو گے تو ایک سے دو ہو جاؤ گے۔ اس دوسرے سے مذاکرات کر کے میرے وطن کو خوش حال بنانے کا دعویٰ پورا کرو پھر ہمارے درمیان کبھی دشمنی نہیں ہو گی۔“

ادھر سے فون بند کر دیا گیا۔ حمزہ نے اپنے فون کو طنزیہ انداز میں ایسے دیکھا جیسے خفیہ ہاتھ کو جھنجلاتے ہوئے دیکھ رہا ہو پھر وہ فون کو بند کر کے کھڑکی کے پاس آیا۔ کوٹھی کے باہر دائیں بائیں اور سامنے چار آدمی اِدھر سے اُدھر ٹہل رہے تھے۔ وہ سب اپنے ہی جانباز تھے۔ انہوں نے اپنے لباسوں کے اندر اسلحہ چھپا رکھا تھا۔

اس نے جان محمد کو بلا کر کہا۔ ”مجھے سامنے اپنے ہی لوگ نظر آ رہے ہیں۔ کیا تم کوٹھی کے پیچھے اپنے جانبازوں کو دیکھتے رہتے ہو؟“

”جی ہاں' میں کوٹھی کے اندر ہر طرف جاتا ہوں اور ہر کھڑکی کے باہر اپنے لوگوں کو پہچانتا رہتا ہوں۔“

جان محمد کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی۔ اس نے کہا۔ ”یہ آپ کے لئے ہے۔“

”ہم دونوں کے لئے ہے۔ ہم یہاں ساتھ رہتے اور ساتھ کھاتے ہیں۔ تم کھانا شروع کرو۔ میں باتھ روم میں جا رہا ہوں۔ بعد میں کھا لوں گا۔ جب تک میں باتھ روم میں رہوں' تم اسی کمرے میں رہو گے۔“

اس نے جاتے ہوئے پریشانی سے راجہ کو دیکھا۔ دوڑنے والے' شکار پر جھپٹنے والے اور ہر دم ایکشن میں رہنے والے شیر کو بے حس و حرکت دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا تھا۔ یہی امید رہتی تھی کہ وہ کسی وقت بھی کوما سے نکل آئے گا۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر باتھ روم میں جا کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے ایک شیطانِ کو چیلنج بھی کیا تھا اور دوستی کی پیش کش کو ٹھکرایا

بھی نہیں تھا لیکن دوستی کرنے کے لئے صرف دو شرائط پیش کی تھیں۔ وہ شرائط ایسی تھیں کہ جنہیں پورا کرنے کے بعد پاکستان میں شیطان کی شیطانیت کمزور پڑ جاتی اور یہ اسے منظور نہیں تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ شیطان اپنی چالبازیوں سے باز آجائے تو پھر دنیا میں جرائم اور گناہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے۔ جبکہ برائیاں قیامت تک ختم نہیں ہوتیں ہاں کچھ کم ضرور ہو جاتی ہیں۔

وہ پندرہ یا بیس منٹ کے بعد باتھ روم کا دروازہ کھول کر کمرے میں آیا تو اس کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ میز اور کرسی پر بیٹھ کر کھانے والا جان محمد فرش پر بے جان پڑا ہوا تھا۔ اس کی باچھوں سے لہو کی دھار بہہ رہی تھی۔ اس کی پشت سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ کسی نے کھلے ہوئے دروازے کے باہر سے سائلنسر لگے ہوئے ریوالور سے اسے گولی ماری تھی۔

اس نے سر گھما کر بستر کی طرف دیکھا تو دماغ کو دوسرا جھٹکا لگا۔ راجہ نواز بستر پر نہیں تھا۔ وہ کوما میں رہنے والا خود ذرا سا ہل نہیں سکتا تھا۔ یقیناً کچھ لوگ اسے اٹھا کر لے گئے ہوں گے۔ وہ دوڑتا ہوا کھڑکی کے پاس آیا۔ باہر اس کے تین جانباز زمین پر پڑے ہوئے تھے جیسے سو رہے ہوں۔ وہ فرض کی ادائیگی کے دوران میں سو نہیں سکتے تھے۔ بات سمجھ میں آگئی' وہ بھی مرچکے تھے۔

حمزہ ایک ہاتھ میں اپنا ریوالور اور دوسرے ہاتھ میں جان محمد کا ٹی ٹی لے کر دوڑتا ہوا' محتاط انداز میں کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف آیا۔ وہاں دروازے کو کھول کر دیکھا۔ کوئی نظر نہیں آیا پھر اس نے دوڑتے ہوئے احاطے کی دیوار کے دوسری طرف دیکھا۔ وہاں بھی دو جانباز زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ بڑے منظم طور پر حملہ کیا گیا تھا۔ حملہ کرنے والوں نے اپنے ہتھیاروں میں سائلنسر لگا کر فائرنگ کی آواز کے بغیر تمام جانبازوں کو گولیوں سے ہلاک کیا تھا۔ حمزہ کو ایک بھی فائر کی آواز سنائی نہیں دی تھی اور وہ حملہ کرنے والے راجہ کو اسٹریچر پر ڈال کر کہیں لے گئے تھے۔

وہ گلی میں دوڑتا ہوا مین روڈ پر آیا۔ وہاں ایک موچی بیٹھا ہوا ایک جوتے میں کیلیں ٹھونک رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا یہاں سے کوئی ایمبولینس یا کوئی بڑی سی گاڑی گزر کر گئی ہے؟"

"ہاں جی' تھوڑی دیر پہلے ایک ایمبولینس یہاں سے گئی ہے۔"

"کدھر گئی ہے؟"

وہ ایک انگلی سے قذافی اسٹیڈیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ادھر گئی ہے۔"

حمزہ وہاں کھڑا گزرنے والی گاڑیوں کو بے چینی سے دیکھنے لگا پھر ایک خالی ٹیکسی نظر آئی۔ اس نے ٹیکسی کو روک کر اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "قذافی اسٹیڈیم چلو۔"

ٹیکسی ادھر چل پڑی۔ حمزہ کے بار بار اصرار پر ڈرائیور رفتار بڑھاتا جا رہا تھا۔ اسٹیڈیم پہنچ کر اس راستے سے گزرنے کے دوران میں کوئی ایمبولینس نظر نہیں آئی۔ آگے مین روڈ پر مڑنا تھا۔ اسی موڑ پر ایک ایمبولینس کھڑی ہوئی تھی جبکہ وہاں نہ کوئی مکان تھا اور نہ اسپتال' ایسی جگہ اس ایمبولینس کو غیر ضروری سمجھ کر چھوڑا گیا ہوگا۔

حمزہ نے کہا۔ "رفتار کم کرو۔ اس ایمبولینس کے قریب سے دھیرے دھیرے چلو۔"

ڈرائیور نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس ایمبولینس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا۔ اس کا پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر نہ کوئی مریض تھا اور نہ مریض کو لے جانے والے تھے۔ ایمبولینس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بھی کوئی نہیں تھا۔

حمزہ نے سوچا' اسی ایمبولینس میں راجہ کو لایا گیا ہے۔ یہاں اسے روک کر گاڑی تبدیل کی گئی ہے۔ وہ لوگ راجہ کو کسی دوسری گاڑی میں لے گئے ہیں لیکن کس گاڑی میں لے گئے ہیں اور کہاں لے گئے ہیں؟

اس نے ڈرائیور کو ٹیکسی روکنے کے لئے کہا۔ دروازہ کھول کر باہر نکل کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ دشمن ماڈل ٹاؤن اور کوٹ لکھپت کے راستے پر جا سکتے تھے اور دائیں طرف یونیورسٹی کیمپس کے راستے سے گزر کر ملتان روڈ پہنچ کر آگے کسی ویرانے میں راجہ کو لے جا سکتے تھے۔

اس نے پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر کہا۔ "ملتان روڈ چلو۔"

ہمیشہ ایکشن میں رہنے والا راجہ ایکشن سے محروم تھا۔ اس کا نام سن کر دشمن سمجھ لیتے تھے کہ وہ صرف طاقت سے ہی نہیں' اپنی چالبازیوں سے بھی دشمن کو مات دے دے گا۔ ٹینا نے ایجنسی کے خاص ماتحتوں کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ راجہ کو اس کوٹھی سے نکال کر لاتے وقت کامیاب ہو جانے کی خوش فہمی میں کبھی نہ رہنا۔ راجہ اور حمزہ اکثر مخالفین کی کامیابیوں کو اچانک ناکامیوں میں بدل دیتے ہیں۔

راجہ کو بڑی کامیابی سے لے جانے والے موبائل فون کے ذریعے ٹینا کو بتا رہے تھے۔ "میڈم! ہم نے ان کے تمام جاں نثاروں کو سائلنسر لگے ہوئے ہتھیاروں سے مار ڈالا ہے اور راجہ کو آپ کے پاس لا رہے ہیں۔"

ٹینا نے پوچھا۔ "اتنی آسانی سے کیسے لا رہے ہو؟ کیا وہاں وہ خطرناک درندہ حمزہ نہیں تھا؟"

"وہ موجود تھا۔ ہم نے باتھ روم کے دروازے کو ہولے سے کھولنے کی کوشش کی۔ پتا چلا کہ وہ اندر سے بند ہے' ہم نے سوچا' باتھ روم کے اندر بھی اس کے پاس ہتھیار ہو سکتا ہے۔ اس سے ٹکرانا مناسب نہیں ہے۔ لٰہذا ہم بڑی خاموشی سے راجہ کو وہاں سے اٹھا کر لے آئے ہیں۔"

"تم نے حمزہ سے نہ ٹکرا کر دانش مندی کی ہے۔ ویسے اس کے باتھ روم کے اندر بند رہنے میں کوئی چال ہو سکتی ہے۔ کیا تم نے راجہ کے چہرے کو چیک کیا ہے۔ وہ راجہ کی ڈمی ہو سکتا ہے۔ کسی دوسرے کا ماسک راجہ کو پہنا کر دھوکا دیا جا سکتا ہے۔"

"میڈم! ہم اس کے چہرے کو اچھی طرح چیک کر چکے ہیں۔ اس کے چہرے پر ماسک نہیں ہے۔ ہم اصلی راجہ نواز کو لا رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ خفیہ اڈے پر لے آؤ۔ میں وہاں سے دور رہوں گی اور خفیہ اڈے کی نگرانی کرتی رہوں گی۔ یہ لوگ بہت چالاک ہیں۔ یہ حمزہ کی سازش ہو سکتی ہے کہ راجہ کو میرے اڈے پر پہنچایا جائے اور وہ تعاقب کرتا ہوا یہاں پہنچ جائے۔ میں مطمئن ہونے کے بعد یہاں آؤں گی۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ راجہ کو لے جانے والی ٹیم کے لیڈر نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "پیچھے توجہ سے دیکھتے رہو۔ حمزہ ہمارے تعاقب میں آسکتا ہے۔ میڈم نے بہت محتاط رہنے کی تاکید کی ہے۔"

راجہ کو پچھلی سیٹ پر لٹایا گیا تھا۔ شیر کو جب پنجرے میں بند کر دیا جاتا ہے تو پھر وہ پہلے کی طرح خطرناک نہیں رہتا۔ وہ ایسا مجبور ہو جاتا ہے کہ کسی پر جان لیوا حملہ نہیں کر پاتا۔ راجہ جیسا خطرناک مجاہد کوما کے پنجرے میں قید تھا۔ اتنا مجبور تھا کہ اپنی انگلی بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ اپنی ساکت آنکھوں کی پتلیوں کو بھی اِدھر اُدھر کر کے دائیں بائیں دیکھنے کے زاویے بدل نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک شیر کو چوہا بنا کر لے جا رہے تھے۔

ٹینا اس خفیہ اڈے سے نکل کر وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک عمارت کی چھت پر آگئی۔ جب وہ گاڑی راجہ کو لے کر اس اڈے کی عمارت میں داخل ہوئی تو اس نے دور بین کے ذریعے دور تک دیکھا۔ کوئی دوسری گاڑی اس کے تعاقب میں نہیں آئی تھی لیکن اسے اطمینان نہ ہوا۔ وہ اپنی عقل سے یہ سمجھ رہی تھی کہ تعاقب کرنے والے گاڑیاں بدلتے رہتے ہیں۔ اس طرح تعاقب کئے جانے کا شبہ نہیں ہوتا۔

اس کے ماتحت جس مین روڈ سے مڑ کر اڈے کے احاطے میں آئے تھے۔ وہاں ایک سوزوکی کار مڑ کر اسی اڈے کے سامنے والی سڑک پر سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتی چلی

گئی تھی پھر ایک پیلی ٹیکسی بھی اسی راستے سے اس اڈے کے سامنے سے گزرتی ہوئی آگے جا رہی تھی۔ ٹینا آنکھوں سے دوربین لگائے سامنے سے گزرتی ہوئی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ پہلی گاڑی کے پیچھے جانے والی ٹیکسی بہت دور جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے تک دشمنوں اور خاص طور پر حمزہ کا انتظار کرتی رہی۔ یہ اندیشہ تھا کہ وہ دور جا کر نظروں سے اوجھل ہونے والی گاڑیاں واپس آسکتی ہیں۔ ان میں سے کسی گاڑی میں حمزہ ہو سکتا ہے۔

اس نے موبائل کے ذریعے راجہ کو لانے والی ٹیم کے لیڈر سے پوچھا۔ "وہاں سب خیریت ہے؟ کوئی خطرہ نہیں ہے؟"

"نو میڈم! میں یہاں چاروں طرف کھڑکیوں سے باہر دیکھ رہا ہوں۔ ہمارے دو آدمی چھت پر سے دیکھ رہے ہیں۔ نہ ہمارا کسی نے تعاقب کیا تھا اور نہ اس کوٹھی کے اطراف ہمارا کوئی دشمن ہے۔"

"ہماری اس کوٹھی کے سامنے والے چھوٹے راستے سے پہلے ایک کار پھر ایک پیلی ٹیکسی گئی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ ان میں کون تھے؟ وہ گاڑیاں کسی وقت واپس آسکتی ہیں۔ ہمارے چھ آدمیوں کو کوٹھی کے چاروں طرف نگرانی کرتے رہنے کا حکم دو۔ چار آدمی اس چھوٹے راستے پر بھیج دو۔ ان سے کہو' جو بھی گاڑی ہماری کوٹھی کی طرف مڑنا چاہے' اسے ہمارا ایک آدمی روکے اور باقی تین چھپ کر مورچا بنا لیں۔ دشمنوں کی پہچان ہوتے ہی انہیں گولیوں سے بھون ڈالیں۔" ٹینا نے ہدایت دی۔

"میڈم! ہمارے مسلح آدمی کوٹھی کے چاروں طرف چھپے ہوئے ہیں۔ میں چار آدمیوں کو ابھی سامنے والے چھوٹے راستے پر بھیج رہا ہوں۔"

ٹینا نے فون بند کر دیا۔ دور بین سے دیکھنے لگی۔ تھوڑی سی دیر میں اس کے چار ماتحت اس چھوٹے راستے پر آگئے۔ اس نے دور اس طرف دور بین سے دیکھا' جدھر وہ دو گاڑیاں گئی تھیں۔ ادھر سے کوئی گاڑی واپس نہیں آئی تھی۔ ان دو کے سوا کوئی تیسری بھی نہیں آرہی تھی۔

وہ مطمئن ہو کر چھت پر سے اتر آئی۔ پیدل چلتے ہوئے اس کوٹھی کی طرف مڑنے لگی تو ایک ماتحت نے اسے سلیوٹ کیا۔ وہ رک کر غصے سے بولی۔ "ایڈیٹ' نان سینس! دیکھنے والے کیا سوچیں گے؟ میں کہیں کی ملکہ ہوں؟ یا لیڈی پولیس افسر ہوں؟ یا مجرموں کی سرابرہ ہوں؟ مجھے نہ پہچاننے والا کوئی دشمن کہیں چھپا ہو گا تو تمہارے سلیوٹ سے

پہچان لے گا۔"

وہ سر جھکا کر بولا۔ "سوری میڈم! پھر کوئی غلطی نہیں کروں گا۔"

وہ اسے ناگواری سے دیکھ کر کوٹھی میں آئی۔ اس کا خاص ماتحت اسے اس کمرے میں لے گیا' جہاں راجہ کو ایک بستر پر لٹایا گیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر فاتحانہ انداز سے مسکرا کر بولی۔ "ہمارے سر کی ہٹ لسٹ میں حمزہ اور راجہ نواز کے نام ہیں کہ دونوں ناقابلِ شکست اور ناقابلِ گرفت ہیں۔ اب اس لسٹ پر سے اس کا نام کٹ جائے گا۔ میں ایک بار ناکام ہو کر دوسری بار اسے قدموں تلے لے آئی ہوں۔ کم آن میرے لئے ایک جام بناؤ اور یہاں سے جاؤ۔"

ماتحت نے شراب کی بوتلوں سے بھرے ہوئے ایک کیبنٹ کو کھولا پھر پوچھا۔ "میڈم! وہسکی یا وائن؟"

وہ راجہ کی کھلی ہوئی ساکت آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "میں تو نظریں ملا کر پی رہی ہوں۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ آج تو جام میں زہر بھی ملے گا تو پی لوں گی۔"

ماتحت ایک چھوٹی سے ٹرے میں جام بھر کر لے آیا۔ ٹینا نے شیشے کے نازک سے جام کو اٹھایا۔ ماتحت ٹرے لے کر چلا گیا۔ وہ جام والا ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے راجہ کے قریب آتے ہوئے بولی۔ "شیر کا شکار کرنے سے جو نشہ ہوتا ہے' وہ نشہ کسی شراب میں نہیں ہوتا مگر میں یہ جام تمہارے نام سے پی رہی ہوں۔ چیئرز........"

اس نے جام کو ہونٹوں سے لگا کر ایک ہی سانس میں پیتے ہوئے اسے خالی کیا پھر شیشے کے اس نازک سے جام کو سامنے والی دیوار پر دے مارا۔ راجہ کی طرف جھک کر کہا۔ "سنا تم نے؟ وہ جام جو بے آواز تھا' ٹوٹ کر چکنا چور ہوتے ہوئے ایک چھناکے سے کراہ کر رہ گیا۔ تمہارے منہ میں بھی زبان ہے مگر تم مرتے وقت کراہ بھی نہیں سکو گے۔ کیسی بے بسی کی موت مرو گے تم.......... آہ!"
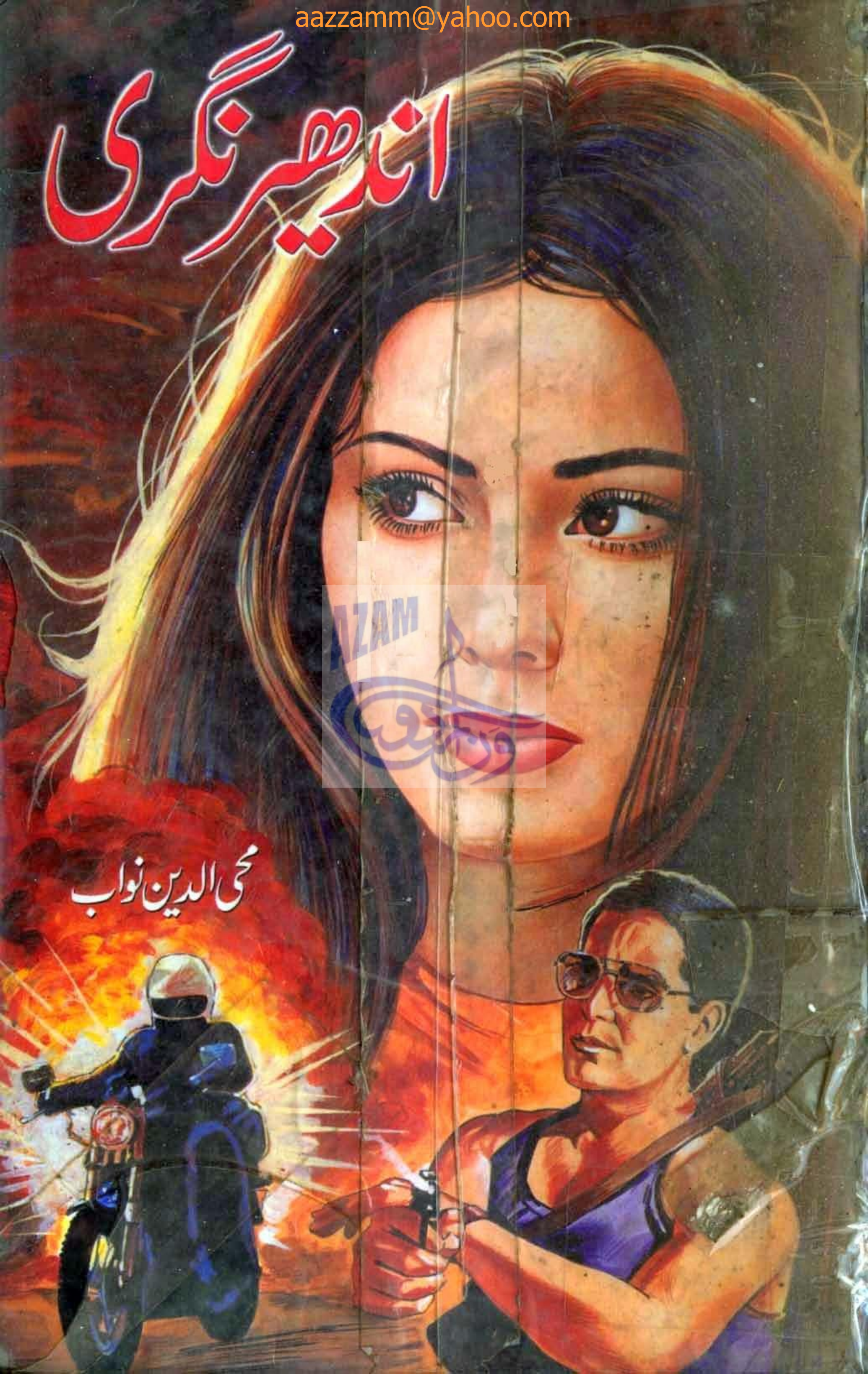
اس نے اپنے.......... گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک ننھا سا پستول نکالا پھر اس پستول کو راجہ کے چہرے سے لگا کر اس کی نال کو گال پر اور پیشانی پر پھیرتے ہوئے بولی۔ "سر نے حکم دیا تھا کہ تمہیں گولی نہ ماری جائے۔ تمہیں اعصابی کمزوری میں مبتلا کر کے قیدی بنا کر کہیں چھپا دیا جائے اور حمزہ کو تمہاری تلاش میں لگا کر اسے ایکشن کے ہتھکنڈوں سے دور رکھا جائے۔ بہت جلد حمزہ بھی تمہیں تلاش کرتے کرتے ہمارے دام میں آجائے گا۔"

وہ پستول اس کے چہرے پر سے ہٹا کر بولی۔ "مگر نہیں۔ میں ایک ناکامی کے بعد دوسری ناکامی کا الزام نہیں اٹھاؤں گی۔ تمہیں زندہ رکھا جائے گا تو حمزہ جان کی بازی لگا کر

تمہیں ہماری قید سے نکال کر لے جائے گا۔ خفیہ ہاتھ کی حکمتِ عملی دھری کی دھری رہ جائے گی اور میری محنت یونہی ضائع ہو گی بس یہی آخری موقع ہے۔ یہاں حمزہ تو کیا' تمہارا خدا بھی تمہیں بچانے کے لئے نہیں آئے گا۔"

اسی لمحے میں ایک قریبی مسجد سے عصر کی اذان کی آواز ابھرنے لگی۔ "اللہ اکبر۔ اللہ اکبر.........."

مئوذن! مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

ٹینا نے اس کے سینے کا نشانہ لیا پھر ٹریگر پر انگلی رکھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ ٹریگر کو دباتی' اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کی کلائی مضبوط مردانہ گرفت میں آ گئی تھی۔

ٹینا نے سہم کر دیکھا۔ کوما سے نکلی ہوئی آنکھیں ایک درندے کی طرح غراتی ہوئی اسے دیکھ رہی تھیں۔

☆======☆======☆

اندھیر نگری
محی الدین نواب
AZAM

aazzamm@yahoo.com
قلم کے نواب محی الدین نواب کا ایک طویل ناول
ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا۔
سیاست کے سانپ اور ان کی زہریلی سازشوں کا حال۔
پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے ''خفیہ ہاتھ'' کی سازشوں کا حال۔
چند سر پھروں کی ولولہ انگیز داستان، جو خفیہ ہاتھ سے ٹکرا گئے تھے۔
بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان۔
انڈر ورلڈ کے گاڈ فادروں کا خوفناک ٹکراؤ، موت کو بھی پسینہ آ گیا۔
پاکستان کو گدھوں کی طرح نوچنے والے سیاستدانوں کی شرمناک داستان۔
سندھ کے وڈیروں کی ''خدائی'' کی ناقابلِ یقین داستانیں۔
AZAM

ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا۔

اندھیر نگری

چہارم

محی الدین نوابؔ

الرفاعی پبلشرز اینڈ بک سیلرز
چوک میو ہسپتال، نسبت روڈ، لاہور۔

بار اوّل ———— ۲۰۰۲ء
مطبع ———— یو اینڈ ڈی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ———— صوبا کمپوزنگ سنٹر' لاہور
قیمت ———— ۱۵۰ روپے

ٹینا کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مُردہ زندہ ہو سکتا ہے۔ راجہ نواز مُردہ ہی تھا۔ اس کے اندر زندگی صرف اتنی ہی تھی کہ وہ دھیمی دھیمی سانسیں لیتا رہتا تھا۔ دل صرف اس حد تک دھڑک رہا تھا کہ اپنی آدھی زندگی کا یقین دلا سکے۔ باقی آدھی زندگی کے لیے امید کی جا سکتی تھی کہ وہ کوما سے نکلے گا' تب ہی ایک مکمل زندگی حاصل کر سکے گا۔

جب ٹینا نے اسے قیدی بنایا تھا تو وہ ایک مُردے کی طرح پڑا رہتا تھا۔ نہ ہل سکتا تھا' نہ اپنی آنکھ کو جنبش دے سکتا تھا۔ کچھ بولنے اور سننے کے قابل نہیں رہا تھا۔ سونے والے کو جھنجوڑ کر جگایا جا سکتا ہے' مرنے والے کو بار بار آوازیں دے کر زندگی کی طرف نہیں لایا جا سکتا تھا۔

راجہ نواز سے پہلے بھی بے شمار ایسے افراد پر تجربات کیے جا چکے تھے اور ان تمام تجربات کے نتیجے میں یہی معلوم کیا گیا تھا کہ کوما میں رہنے والا لاعلاج رہتا ہے۔ جب کوما کی مدت پوری ہو جائے تو پھر وہ خود ہی حرکت کرنے' بولنے اور سننے کے قابل ہو جاتا ہے۔

ٹینا کئی مرتبہ راجہ نواز کو قتل کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس کی جگہ دھوکے سے کسی اور کو ہلاک کر دیا تھا۔ خفیہ ہاتھ کی تمام ایجنسیوں میں اس کا یہ ریکارڈ تھا کہ وہ کبھی کسی مہم میں ناکام نہیں ہوتی۔ جسے شکار کرنا ہو' وہ ٹینا کے ہاتھوں ضرور مرتا ہے۔

پہلی بار ٹینا کو یہ ٹارگٹ بتایا گیا تھا کہ اسے ہر حال میں قتل کرنا ہے۔ دوسری بار خفیہ ہاتھ نے حکم دیا کہ راجہ نواز کو ہلاک نہ کیا جائے' اسے یرغمال بنا کر رکھا جائے۔ حمزہ کے لیے جال بچھایا جائے گا۔ وہ اسے رہائی دلانے کے لیے آئے گا پھر اس جال میں پھنس جائے گا اور حمزہ واقعی اس کی رہائی کے لیے بھٹک رہا تھا۔ اسے تلاش کرتا ہوا ملتان روڈ کی طرف نکل گیا۔ ٹینا بہت محتاط تھی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ حمزہ اس خفیہ اڈے تک نہیں پہنچ سکے گا تو وہ اس مکان میں آ گئی پھر اس کمرے میں پہنچی' جہاں راجہ نواز ایک نیم مُردے کی طرح پڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ایک ماتحت سے ایک پیگ لے کر پیا تھا۔ اس نے اپنے اس خالی جام کو دیوار پر دے مارا۔ وہ راجہ نواز کو زیر کرنے کی خوشی میں مست تھی۔

اس نے اپنے لباس میں سے ایک پستول نکالا پھر پستول کی نال کو اس کے چہرے پر پھیرتے ہوئے بولی۔ "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہیں گولی نہ ماروں۔ تمہیں زندہ رکھوں لیکن میں ناکامی برداشت نہیں کرتی۔ پہلی بار تمہیں قتل کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور میں ناکام رہی تھی۔ اب اس کی تلافی کروں گی۔ اس بار تم نہیں بچ سکو گے۔ تمہیں قتل کرنے کے بعد خفیہ ہاتھ کو رپورٹ دوں گی کہ تمہارے آدمی پھر تمہیں بچا کر لے جانا چاہتے تھے۔ لٰہذا مجبوراً مجھے گولی چلانی پڑی جس کے نتیجے میں تم مارے گئے۔"

اسے یہ اندیشہ تھا کہ راجہ نواز کو زندہ رکھا جائے گا تو حمزہ جان بازی کی لگا کر اسے وہاں سے نکال لے جائے گا۔ ایسے میں خفیہ ہاتھ کی حکمتِ عملی دھری کی دھری رہ جائے گی اور ٹینا کی ساری محنت ضائع جائے گی۔

بے شک مُردے کی طرح بے حس و حرکت پڑا ہوا راجہ نواز اس وقت اپنا بچاؤ نہیں کر سکتا تھا لیکن اسی وقت ٹینا نے اپنی ذہانت' چالاکی اور طاقت کے غرور میں اللہ تعالیٰ کو چیلنج کیا اور نیم مُردہ راجہ نواز سے کہا۔ "یہاں ح[illegible] ا' تمہارا خدا بھی بچانے کے لیے نہیں آئے گا۔"

ٹھیک اسی لمحے ایک قریبی مسجد سے عصر کی اذان کی آواز ابھرنے لگی۔ "اللہ اکبر......... اللہ اکبر........."

ٹینا نے اس کے سینے کا نشانہ لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتی' اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کی کلائی مضبوط مردانہ گرفت میں آگئی تھی۔ پستول کی نال کا رخ دوسری طرف ہو گیا تھا۔

اسے حمزہ بچانے نہیں آیا تھا اور بظاہر وہاں اللہ بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی نظر ہی نہیں آتا لیکن وہ تو اندر سے توانائی بخشتا ہے۔ ان لمحات میں کوما کی مدت ختم ہو چکی تھی اور کوما سے نکلی ہوئی آنکھیں ایک درندے کی طرح غراتی ہوئی اسے دیکھ رہی تھیں۔

اس کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مُردہ زندہ ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی لیکن وہ تو جیسے شکنجے میں آگئی تھی اور سہم کر دیکھ رہی تھی کہ مضبوط گرفت میں آنے کے باعث اس کے پستول کا رخ خود اپنی طرف ہوتا جا رہا تھا۔ راجہ کی انگلی اس کے ٹریگر پر آگئی تھی اور اس کی اپنی انگلی پہلے ہی سے ٹریگر پر تھی۔ وہ نہ چاہتی' تب بھی راجہ کی انگلی سے ٹریگر دب جاتا۔

بچنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ اپنے ماتحت کو آواز دے۔ اس کا ماتحت دوسری طرف منہ کیے اس کے لیے دوسرا پیگ بنا رہا تھا۔ ٹینا نے خوف زدہ ہو کر اسے پکارا۔ اسی

لمحے ٹھائیں کی آواز کے ساتھ گولی چل گئی۔ ٹینا کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ راجہ نے دوسرے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ ادھر ٹینا اپنے لہو میں بھیگتی ہوئی فرش پر گری' ادھر اس کا ماتحت دوڑتا ہوا آیا۔ راجہ نے لیٹے ہی لیٹے اس کے منہ پر زوردار لات ماری۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے شراب کی کیبنٹ سے ٹکرایا۔ شیشے کے علاوہ کتنی ہی بوتلیں فرش پر گر کر ٹوٹنے لگیں۔

اس کے دوبارہ اٹھنے سے پہلے راجہ نے بیڈ اسٹریچر سے اٹھ کر ٹینا کے پستول سے گولی مار دی۔ کیبنٹ سے کچھ فاصلے پر پڑی ہوئی کلاشنکوف اٹھائی۔ فائر کی دو آوازیں سن کر دوسرے مسلح گارڈز دوڑتے آرہے تھے۔ اس نے کلاشنکوف سے مسلسل گولیاں چلائیں۔ تین چیختے ہوئے گرے۔ دو واپس بھاگتے ہوئے کہیں چھپ گئے۔

راجہ نے کمرے کے دروازے کو بند کر لیا۔ پہلے اس ماتحت کے لباس کی تلاشی لی۔ اسے موبائل فون کی ضرورت تھی۔ وہ فوراً حمزہ سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ کوما سے نکلنے کے بعد پوری توانائی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ وہ کمزوری محسوس کرنے کے باوجود جواں مردی سے حالات کا سامنا کر رہا تھا اور یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ فوری طبی امداد نہ ملی تو دشمن پھر اس پر حاوی ہو سکتے ہیں۔

ان حالات میں یا فوراً طبی امداد حاصل کرنا تھا یا حمزہ کو بلانا تھا۔ مُردہ ماتحت کے لباس میں فون نہیں تھا۔ وہ تیزی سے جھکتا ہوا ٹینا کی طرف جانے لگا۔ باہر سے کہا جا رہا تھا "راجہ ہتھیار پھینک کر دروازہ کھولو۔ تم یہاں سے زندہ نہیں جا سکو گے۔ ہمارے حکم کی تعمیل کرو گے تو ہم تمہیں زندہ اپنے باس کے پاس لے جائیں گے۔"

راجہ' ٹینا کے پاس آیا۔ وہ فرش پر پڑی تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ راجہ نے اس کے پاس فرش پر گھٹنے ٹیک کر کہا۔ "اچھا تو تم ابھی زندہ ہو؟"

وہ عاجزی سے بولی "پلیز ہیلپ می۔ مجھے میڈیکل ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے۔ مجھے بچا لو۔ میں تمہارے بہت کام آؤں گی۔"

"ہاں اب تو میں تمہیں ہی ڈھال بنا کر یہاں سے نکل سکتا ہوں۔"

اس نے ٹینا کے لباس کے اندر سے ایک موبائل فون نکالا پھر اسے آپریٹ کیا۔ حمزہ کے موبائل فون کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر دوسری طرف سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے کوئی فون کا بزر سن رہا ہو مگر خاموش ہو۔

راجہ نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "زندہ رہنا چاہتی ہو تو بولو......... راجہ تمہیں زخمی کر کے فرار ہو گیا ہے۔ تمہیں طبی امداد کی ضرورت ہے۔"

اس نے فون کو قریب کرتے ہوئے ٹینا کے چہرے سے چہرہ ملایا۔ تاکہ دوسری طرف سے آواز سن سکے۔ ٹینا نے کراہتے ہوئے کہا۔ "ہیلو۔ تم کون ہو؟ میں ٹینا بول رہی ہوں۔ بری طرح زخمی ہوں مجھے فوراً اسپتال میں پہنچاؤ۔"

دوسری طرف سے حیران ہو کر پوچھا گیا۔ "ٹینا! تم نے حمزہ کے موبائل پر رابطہ کیوں کیا ہے؟"

"میں نے حمزہ سے یا کسی سے رابطہ نہیں کیا ہے۔ راجہ کے فرار ہوتے وقت یہ موبائل گر پڑا تھا۔ میں نے صرف ری ڈائل کا ایک بٹن دبایا ہے۔ اگر تم حمزہ ہو تو سنو، راجہ فرار ہو کر بھی ہم سے نہیں بچ سکے گا۔ وہ مجھے زخمی کر کے گیا ہے۔"

"ٹینا! میں حمزہ نہیں ہوں۔ تعجب ہے میری آواز نہیں پہچان رہی ہو۔"

"ہاں۔ ہاں پہچان رہی......... رہی ہوں۔ اب بولا نہیں جا......... جا رہا ہے۔ پلیز، ہیلپ۔ ہیلپ........."

راجہ نے فون بند کر دیا۔ ٹینا کو فرش سے اٹھا کر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "گولی تمہارے شانے کے آر پار ہوئی ہے۔ تمہاری جان نہیں جائے گی۔ طبی امداد سے بچ جاؤ گی۔ اپنے آدمیوں سے کہو۔ ہتھیار پھینک کر باہر لان میں اپنے دونوں ہاتھ گردنوں پر رکھ کر کھڑے رہیں۔ جو بھی چالاکی دکھائے گا، راستہ روکے گا یا چھپ کر مجھے گولی مارے گا تو میں مرتے مرتے تمہیں بھی مار ڈالوں گا۔"

وہ کھڑی ہو گئی۔ راجہ نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن پکڑی۔ دوسرے ہاتھ سے پستول اس کی پشت سے لگا دیا۔ وہ بند دروازے کے پاس آ کر بولی۔ "میں ٹینا ہوں۔ زخمی ہو گئی ہوں۔ راجہ مجھے میڈیکل ایڈ کے لیے لے جا رہا ہے۔ میرا حکم ہے، تم سب ہتھیار پھینک کر لان میں جا کر دونوں ہاتھ اپنی گردنوں پر رکھ لو۔ کم آن جلدی کرو۔"

پھر ٹینا نے دروازے کو کھولا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے بولی۔ "میری سلامتی چاہتے ہو تو کہیں سے چھپ کر راجہ کو گولی نہ مارنا ورنہ یہ مجھے مار ڈالے گا؟"

وہ راجہ کے آگے ڈھال بنی، بار بار اپنی سلامتی اور راجہ پر گولی نہ چلانے کی تاکید کرتے ہوئے مکان سے باہر آئی۔ پانچ گارڈز اپنی گردن پر ہاتھ رکھے نہتے کھڑے تھے۔

راجہ نے ٹینا کو اسٹیئرنگ سیٹ پر بٹھا دیا۔ وہ کھسکتے ہوئے دوسری سیٹ پر آ گئی۔ راجہ نے اسٹیئرنگ سیٹ پر آ کر دروازہ بند کر کے کار اسٹارٹ کی پھر اسے ڈرائیو کرتا ہوا احاطے سے باہر آ گیا۔ وہ بولی۔ "مجھے فوراً کسی قریبی اسپتال میں پہنچا دو۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔"

"زندہ رہ کر کیا کرو گی؟"

"میں یسوع مسیح کی قسم کھا کر کہتی ہوں، تمہارے کام آتی رہوں گی۔"

"اگر سچ کہہ رہی تو میرے سوالوں کا صحیح جواب دو۔"

"میں صحیح جواب دوں گی۔ ہمیشہ سچ بولوں گی مگر ابھی مجھے اسپتال لے چلو۔"

"گولی تمہارے شانے کے نیچے گوشت کے آر پار چلی گئی ہے۔ اگر گولی جسم میں پیوست رہے تو زخم میں زہر پھیلتا رہتا۔ فوری طور پر آپریشن ضروری ہوتا، تمہارے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مرہم پٹی سے تمہیں کسی قدر آرام آ جائے گا۔ تم زیادہ تکلیف ظاہر کرنے کی ایکٹنگ نہ کرو۔"

"تم کہتے ہو زخم تشویش ناک نہیں ہے تو مرہم پٹی کرا دو۔ یہاں ایک اسپتال ہے۔"

"یہ گولی کا زخم ہے۔ کیا تمہیں اسپتال لے جا کر پولیس کیس میں الجھتا رہوں؟ اس کے بعد بکواس نہ کرنا۔ میری بات کا جواب دو۔ تھوڑی دیر پہلے موبائل پر کس سے بات ہوئی تھی؟"

"ہماری خفیہ ایجنسی کا ایک افسر تھا۔"

"حمزہ کا فون نمبر اس کے پاس کیسے پہنچ گیا؟"

"میں کیسے جان سکتی ہوں۔ میں تو تمہارے ساتھ تھی۔"

"تم ابھی فون کر کے پوچھ سکتی ہو کہ حمزہ کا فون نمبر اس افسر کے ہاتھ کیسے لگ گیا؟ اور حمزہ کہاں ہے؟"

"تم مجھے اس مکان سے لے آئے۔ میرے تمام گارڈز کو مجبور کر دیا مگر تم سے ایک غلطی ہو گئی۔ انہوں نے ابھی اس مکان کے فون سے تمام خفیہ ایجنسیوں کو بتا دیا ہو گا کہ تم مجھے ڈھال بنا کر لے گئے ہو۔ اب کسی بھی ایجنسی کا کوئی افسر مجھے صحیح بات نہیں بتائے گا۔"

"ہاں۔ مجھ سے یہ غلطی ہو گئی۔ انہوں نے اس کار کا نمبر اور کلر بتا دیا ہو گا۔ اس کار کو جلد سے جلد چھوڑنا ہو گا۔" وہ کار روک کر بولا۔ "چلو اترو۔"

ٹینا نے سمجھا......... وہ کار بدلنا چاہتا ہے۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آئی۔ راجہ نے کہا۔ "میری طرف دیکھو۔"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ راجہ نے کہا۔ "تم نے دوبارہ مجھے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اب مجھے دھوکہ دے رہی ہو۔ فون پر بات کرنے والا ایجنسی کا کوئی افسر نہیں تھا۔ میں اس کی آواز پہچانتا ہوں اور موت بن کر اس کے پاس جا رہا ہوں۔ اب تم بھی جاؤ۔"

اس نے تڑاتڑ دو گولیاں اس کے سینے میں ماریں۔ ایک اس کے پیٹ پر اور ایک اس کے حسین چہرے پر مار کر حسن کی نفی کی پھر تیز رفتاری سے کار آگے بڑھاتا چلا گیا۔

اس کار میں زیادہ دیر رہنا خطرناک تھا۔ اس نے ایک مین روڈ پر کار روکی۔ وہاں سے کبھی دوڑتا ہوا اور کبھی تیزی سے چلتا ہوا ایک مین اسٹاپ پر آیا۔ ایک بس میں سوار ہونے کے بعد وہ ہانپنے لگا۔ اس کی کمزوری بڑھتی جا رہی تھی۔ اب تک صرف انجکشن کے ذریعے اس کے اندر خوراک پہنچائی جا رہی تھی تاکہ زندگی برقرار رہے۔ کومے سے نکلنے کے بعد اسے توانائی بخش غذائیں کھلائی جاتیں لیکن حالات موقع نہیں دے رہے تھے۔ وہ اپنی سلامتی کے لیے بھاگتا پھر رہا تھا۔

یہ بھی بہت تھا کہ وہ اتنی دیر تک اپنی جسمانی کمزوریوں سے لڑتا ہوا دشمنوں کے نرغے سے نکل آیا تھا مگر اب قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی۔ وہ بس کی سیٹ پر بیٹھا' اس کی پشت سے ٹیک لگا کر ادھ کھلی آنکھ سے بس کے اندرونی حصے کو دیکھتے دیکھتے اور گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے اپنے آپ سے غافل ہو گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اب تقدیر اسے کہاں لے جا رہی ہے؟

☆=====☆=====☆

"اے مقدر اچانک یہ کیا ہو گیا
جو سوچا نہ تھا' وہ غضب ہو گیا"

تابانی نے پاکستان پہنچتے ہی موبائل فون کے ذریعے فرمان سے رابطہ کیا لیکن ان کا فون بند تھا جبکہ بند نہیں ہونا چاہیے تھا۔ فرمان نے کہا تھا' اس کے پاکستان پہنچنے اور فون کے ذریعے خیریت کی تصدیق کرنے تک وہ اپنے موبائل فون کو آن رکھے گا لیکن فون بند تھا۔ تابانی کبھی آدھے گھنٹے کبھی ایک گھنٹے کے وقفے سے رابطہ کرتی رہی لیکن نہ اسے فرمان کی آواز سنائی دی اور نہ ہی پوجا نے اپنے طور پر خیریت کی اطلاع دی۔

اس نے لاہور کی طرف سفر کرتے ہوئے گاڈفادر ہاشم سے رابطہ کیا۔ وہ اپنی بہن ڈاکٹر آمنہ کی حفاظت کے لیے لندن پہنچا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "انکل! میں تابانی بول رہی ہوں۔ میں نے' فرمان اور پوجا نے بھارت سے پاکستان پہنچنے کا منصوبہ بنایا تھا' میں تو پاکستان پہنچ گئی ہوں لیکن فرمان اور پوجا لاپتا ہو گئے ہیں۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق فون سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ میں ایک آدھ گھنٹے کے وقفے سے سات بار رابطہ کرنے کی کوششیں کر چکی ہوں لیکن ادھر سے فون خاموش ہے۔"

ہاشم نے کہا۔ "کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اپنا موبائل اگر ناکارہ ہو گیا ہے تو فرمان کسی

دوسرے فون سے رابطہ کر سکتا تھا۔ اس نے پچھلی رات سے اب تک مجھ سے رابطہ نہیں کیا ہے۔"

"انکل! یہ اندیشہ پیدا ہو رہا ہے کہ "را" والوں نے میرے بھائی اور پوجا کو گرفتار نہ کر لیا ہو۔"

"بیٹی! کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میری باجی آمنہ پر دباؤ ڈالنے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی طرف سے فی الحال خاموش رہنا چاہیے۔ اگر "را" والوں نے فرمان کو قیدی بنایا ہو گا تو وہ دو چار گھنٹوں میں باجی آمنہ کو بلیک میل کریں گے۔ ان پر یہ دباؤ ڈالیں گے کہ کالیا کا آپریشن کامیاب نہ ہو' اور وہ دو تین ماہ میں چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوا تو وہ فرمان کو جانی نقصان پہنچائیں گے۔

"انکل! اگر ایسا ہوا تو میں "را" کے اعلیٰ افسران سے لے کر معمولی افسران تک کو جانتی ہوں۔ ان کے سیکرٹ ایجنٹ بھی مجھ سے چھپے نہیں رہیں گے۔ میں ایک ایک کو کتے کی موت ماروں گی۔"

"بیٹی! کبھی جوش میں نہ آنا۔ بڑے سے بڑا ناقابلِ برداشت واقعہ پیش آئے تو ہوش میں رہنا اور اپنی قوتِ برداشت کو مستحکم رکھنا۔ ایسا کرنے سے آج کی ناکامی کل کی کامیابی میں بدل جائے گی۔ اپنا موبائل کا کوڈ نمبر بتاؤ۔ پاکستان میں کہاں رہو گی؟"

"میں دو گھنٹے میں لاہور پہنچ جاؤں گی۔"

"پھر تو مجھے کوڈ نمبر معلوم ہیں۔ میں تم سے رابطہ رکھوں گا۔"

ہاشم نے فون بند کر کے پھر اسے آن کیا اور اپنے دستِ راست امانت شیخ سے رابطہ کیا۔ ہاشم کی غیر موجودگی میں امانت شیخ گاڈ فادر بن کر اس کے تمام کام نمٹا رہا تھا اور ہاشم کی طرح وہ بھی حمزہ اور راجہ نواز کی مدد کر رہا تھا۔ ہاشم نے فون کے ذریعے پوچھا۔ "ہیلو شیخ! کیا رپورٹ ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "ہمارے انڈر گراؤنڈ کے معاملات حسبِ معمول ہیں مگر ہمارے چالیس تابع دار ماتحت باغی ہو چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جب ہم انڈر گراؤنڈ مجرم ہیں تو ہمارا گاڈفادر محبِ وطن کیوں ہے؟ ہمارا کوئی ملک نہیں ہوتا ہے۔ جن ممالک کے راستوں سے اسمگلنگ کی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں اور جن ممالک میں ہمارے اسمگل ہوئے مال کی کھپت ہوتی ہے وہ ممالک ہمارے لیے پاکستان سے زیادہ اہم ہیں۔ یہاں پاکستان میں رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اس ملک میں مجرمانہ سرگرمیاں چھوڑ دیں۔"

"ہوں۔ میرے وہاں سے آتے ہی گڑبڑ شروع ہو گئی۔ وہ باغی ہونے والے کہاں ہیں؟"

"شمشیر سنگھ کالیا کی بیٹی شلپا بڑی زبردست ہیرا پھیری کر رہی ہے۔ اس کی حمایت میں چار ملکوں کے گاڈ فادر ہیں۔ ایک گاڈفادر کارتا بن بلا سب سے زیادہ ہمارے خلاف ہے۔ شلپا نے اسی کے تعاون سے ہمارے آدمی توڑ لیے ہیں۔"

"ہمارے چالیس تابع دار کہلانے والے دوسری پارٹی میں چلے گئے۔ یہ بات میرے فون کرنے کے بعد تم بتا رہے ہو۔ کیا تم مجھے فون کر کے نہیں بتا سکتے تھے؟"

"بتا سکتا تھا مگر پہلے حمزہ اور راجہ نواز کے حالات سن لیں۔ میں نے آپ کے حکم کے مطابق انہیں پناہ لینے کے لیے ایک خفیہ بنگلا دیا تھا۔ وہ دونوں دو الگ گاڑیوں میں آؤٹنگ کے لیے گئے تھے۔ اس کے بعد دونوں لاپتا ہو گئے ہیں۔"

ہاشم نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیسے لاپتا ہو گئے؟ کیا ہمارے جاسوس ان کی نگرانی نہیں کر رہے تھے؟"

"نگرانی کرنے والے کئی جاسوس تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ ہمارے وہ تابع دار جاسوس دراصل وہی باغی تھے۔ انہیں خفیہ ہاتھ نے خرید لیا تھا۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ حمزہ اور راجہ نواز جہاں جا رہے تھے' جہاں چھپ رہے تھے' وہاں ہمارے غدار جاسوسوں کے باعث ناکام ہو رہے تھے۔"

"کیا تم نے حمزہ اور راجہ سے رابطہ کیا تھا؟"

"میں نے بہت کوششیں کی تھیں لیکن ان کے موبائل فون ان کے پاس نہیں تھے۔ دونوں کے فون بند کر دیئے گئے ہوں گے۔"

"امانت شیخ! میرے حساب سے اب ہمارے پاس صرف پندرہ تابع دار رہ گئے ہوں گے۔"

"نہیں۔ ان میں سے تین مارے گئے ہیں۔ مرنے والوں میں آپ کا وفادار ملازم جان محمد بھی ہے۔"

"اوہ گاڈ! باقی بارہ کہاں ہیں؟"

"وہ چھپتے پھرنے کے لیے ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں ہے۔ خفیہ ہاتھ کی ایجنسیوں کے تمام قاتل انہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔"

"اور تم کہاں ہو؟ تمہارے لیے تو سب سے زیادہ خطرہ ہو گا؟"

"خطرہ تو اُن کے لیے ہوتا ہے جو کمزور ہو کر طاقت ور کو للکارتے ہیں۔ میں نے

ایسی حماقت نہیں کی۔ خفیہ ہاتھ جیسے طاقت ور کو للکارنے کے بجائے اس کی گود میں بیٹھ گیا ہوں۔"

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"میری دانائی کو بکواس کہہ رہے ہو۔ میں نے بہت بڑی قیمت لے کر تمہاری انڈر گراؤنڈ مافیا کو خفیہ ہاتھ کے پاس فروخت کر دیا ہے۔ تمہارے جتنے وفادار تھے' انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ تم یہاں آؤ گے تو تمہارا بھی یہی انجام ہو گا۔ ویسے یہ بتا دوں کہ تم لندن میں بھی محفوظ نہیں ہو اور جب تم محفوظ نہیں ہو تو اپنی ڈاکٹر بہن کی حفاظت وہاں کیسے کرو گے؟"

"شیخ! تمہاری ضمیر فروشی نے مجھ جیسے گاڈ فادر کو تنہا کر دیا لیکن میں اس سلسلے میں ابھی کچھ نہیں کہوں گا صرف اتنا بتا دو کہ حمزہ اور راجہ نواز کہاں ہیں؟ اور کس حال میں ہیں؟"

"حمزہ اور راجہ میرا مسئلہ نہیں رہے۔ خفیہ ہاتھ کا مسئلہ ہیں اب وہ کسی رکاوٹ کے بغیر پاکستان میں اپنی مرضی کا حکمران لائے گا۔ حمزہ اور راجہ کہاں ہیں؟ خفیہ ہاتھ ہی بتا سکے گا۔"

یہ کہتے ہی امانت شیخ نے فون بند کر دیا۔ ہاشم تھکے ہوئے انداز میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ اپنی بہن ڈاکٹر آمنہ کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا سکتا تھا بلکہ لٹا چکا تھا۔ اب بہن کی حفاظت کرتے کرتے اپنی جان بھی دے سکتا تھا لیکن بہت بڑی طاقت کے مقابلے میں حفاظت کرنے کے لیے قابل اعتماد ساتھیوں کی ضرورت تھی۔ جنہیں ہلاک کر دیا گیا تھا۔ حمزہ اور راجہ نواز اپنی ذات میں ایک فوج کے برابر تھے لیکن وہ بھی لاپتا ہو گئے تھے۔ یہ واضح طور سے معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ خفیہ ہاتھ کی چال بازی سے وہ قید کر لیے گئے ہیں یا مار ڈالے گئے ہیں یا وہ دونوں کہیں اس لیے بھٹک رہے ہیں کہ انہیں کراچی' لاہور اور اسلام آباد جیسے شہروں میں آ کر کرپٹ سیاست دانوں کے خلاف بیانات دینے کا موقع نہیں مل رہا ہے۔ اب ان کے پاس اتنی طاقت اور اختیارات نہیں رہے تھے کہ وہ اپنی آواز اخبارات تک پہنچا سکتے۔ اخبارات کو خفیہ ہاتھ اور کرپٹ سیاست دانوں کے خلاف حقائق شائع کرنے پر مجبور کرتے۔ وہ ہاشم جو زبردست گاڈ فادر تھا' اندر سے خالی ہو چکا تھا۔

الیکشن اسی طرح ہوا کرتے ہیں۔ عوام ایک بار نہیں بار بار اس خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہے کہ ان کے ووٹوں سے نئی حکومت قائم ہونے والی ہے۔ اندر کی بات کوئی نہیں

سمجھ پاتا کہ ہمارے ملک کی سیاسی کھچڑی لندن اور واشنگٹن میں پکتی ہے۔ اسے کہتے ہیں قوم کی خوش فہمی کی کھچڑی۔

لاکھ سلجھایا کیے گیسوئے ملک
کچھ نہ کچھ آخر میں الجھن رہ گئی
قوم تھی دراصل ایک کھچڑی رئیس
اب تو اس کھچڑی کی کھرچن رہ گئی

یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ قوم کی خوش فہمی اسے باوقار نہ رہنے دے۔ وہ خود کو باوقار سمجھے اور اس کے پاس محض وقار کی کھرچن رہ جائے۔

وہ تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھا موجودہ حالات کا تجزیہ کرتا رہا پھر اس نے فون کے ذریعے ڈاکٹر آمنہ کو مخاطب کیا۔ "ہیلو باجی! میں ہاشم بول رہا ہوں۔ آپ بہت ہی حوصلہ مند ہیں اس لیے کسی تمہید کے بغیر بتا رہا ہوں کہ فرمان بھارت میں لاپتا ہو گیا ہے۔ اس کی طرف سے کوئی رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔"

آمنہ نے کہا۔ "شاید "را" والوں نے اسے ٹریپ کیا ہے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا ہے تو اس کی جان لینے کی حماقت نہیں کریں گے۔ کالیا کو پہلے دوسرے اور شاید تیسرے آپریشن سے بھی گزرنا پڑے۔ وہ تقریباً تین ماہ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے گا اور وہ تین ماہ تک مجھے اور میرے بیٹے کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ تم تو خیریت سے ہو نا؟"

"نہیں باجی! میں تو بالکل لٹ گیا ہوں۔ طاقت اور اختیارات سے خالی ہو گیا ہوں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو۔ صاف صاف اپنے حالات بتاؤ۔"

وہ بتانے لگا کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے دست راست شیخ امانت نے کتنا بڑا دھوکا دیا ہے۔ اس کی انڈر گراؤنڈ مافیا کو شیخ امانت نے خفیہ ہاتھ کے حوالے کر دیا ہے۔ خفیہ ہاتھ سے اس کی بھاری قیمت وصول کی ہے اور اپنے تحفظ کی ضمانت بھی حاصل کی ہے۔ ہاشم کے جتنے وفادار خفیہ ہاتھ کے خلاف تھے اور بدستور ہاشم کے وفادار تھے، انہیں چُن چُن کر قتل کر دیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ ہاشم اب گاڈ فادر نہیں رہا۔

آمنہ نے کہا۔ "واقعی تم بالکل لٹ چکے ہو۔ تمہارے معتمد خاص نے تمہارے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیا ہے۔ یہاں لندن میں بھی تمہارے لیے خطرات پیدا ہو گئے ہیں۔"

"میں نے ماسک میک اپ کیا ہوا ہے۔ دشمن مجھے پہچاننے کے بعد ہی میرے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ میں آپ کی نگرانی کے لیے اسپتال میں نہیں آؤں گا لیکن اسپتال کے

آس پاس رہوں گا۔"

"ہاشم! تم میری فکر نہ کرو۔ میں کہہ چکی ہوں۔ دشمن مجھے اور میرے بیٹے کو تین ماہ تک نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ تمہاری انڈر گراؤنڈ مافیا ختم ہو گئی، کوئی بات نہیں۔ تم پھر اپنی ایک ذاتی فوج قائم کرو گے اور پہلے سے زیادہ طاقت ور بنو گے۔"

"باجی! ایسا کرنے میں مہینوں اور برسوں لگ جائیں گے۔"

"صرف دو چار مہینوں میں تم دشمنوں کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جاؤ گے۔ تم نے اپنی باجی کو سمجھا کیا ہے؟ میں دو چار گھنٹے کے بعد تم سے فون پر رابطہ کروں گی اور ہاں تابانی کہاں ہے؟"

"وہ پاکستان پہنچ گئی ہے اور فرمان کے لیے پریشان ہے۔"

"اسے تسلی دو اور اس سے وعدہ کرو کہ دو چار دنوں میں دوبارہ مستحکم ہوتے ہی اس کے مراد کو جیل سے نکال لاؤ گے۔"

ہاشم نے آمنہ سے رابطہ ختم کرکے فون پر تابانی سے بات کی۔ اسے بھی اپنے تمام موجودہ حالات بتائے پھر کہا۔ "میں دو چار دنوں میں پھر کھوئی ہوئی طاقت اور وسیع ذرائع کا مالک بن جاؤں گا اور سب سے پہلے مراد کو جیل سے نکالوں گا۔ تم مجھ سے لاہور میں ملو گی۔"

"نہیں انکل! آپ مراد کی رہائی کی خاطر امی کو لندن میں تنہا نہ چھوڑیں۔"

"یہ تمہاری امی کا حکم ہے۔ انہیں اور فرمان کو تین ماہ تک کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ لہٰذا تم لاہور میں میرا انتظار کرو۔ میں فرمان کی بہن عالی کو فون پر تمہارے بارے میں ابھی بتا رہا ہوں۔ تم اس کے ساتھ رہو گی وہیں میں تم سے ملاقات کروں گا۔ تم اس کا پتا نوٹ کرو۔"

اس نے تابانی کو عالی کا پتا بتایا پھر عالی سے رابطہ کرنے کے بعد کہا۔ "تمہاری امی تمہیں بتا چکی ہیں کہ انہیں اغوا کرکے بھارت لے جانے والی تابانی اب دشمن نہیں رہی ہے۔ وہ تمہاری امی کی بیٹی بن چکی ہے۔ فرمان اور تمہاری بڑی بہن بن چکی ہے۔ ابھی تمہارے پاس آ رہی ہے اور تمہارے ساتھ ہی رہے گی۔ میں بھی ایک ہفتے کے اندر آ رہا ہوں۔"

ہاشم کے بتائے ہوئے پتے پر تابانی ایک کوٹھی میں پہنچ گئی۔ وہاں دو مسلح گارڈز تھے۔ عالی نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اس کی ایک بڑی بہن آنے والی ہے، اسے نہ روکا جائے۔ ایک گارڈ نے اس کی آمد کی اطلاع دی۔ عالی خود ہی کوٹھی سے باہر مین گیٹ پر اس کا

استقبال کرنے آئی پھر اس کے گلے لگ کر بولی۔ "ایک بہن کی کمی تھی' وہ آپ نے پوری کر دی۔ اندر آیئے۔"

وہ اندر آ کر بولی۔ "میں نے دونوں گارڈز کو آپ کا نام نہیں بتایا۔ یہاں کی پولیس اور انٹیلی جنس والوں تک آپ کا نام پہنچے گا تو وہ آپ کو گرفتار کر لیں گے۔"

"تم بہت سمجھ دار ہو عالی۔ یہاں میں اپنا کوئی دوسرا نام رکھ لوں گی۔"

"نام تو کوئی سا بھی رکھ لیں گے لیکن آپ چہرے سے پہچانی جائیں گی۔ آپ ریڈی میڈ میک اپ کے ذریعے چہرہ بدل سکتی ہیں۔"

"حالات بڑی تیزی سے بدلتے جا رہے تھے۔ مجھے کہیں رکنے اور میک اپ کا سامان خریدنے کا موقع نہیں ملا پھر یہ کہ میرے پاس پاکستانی کرنسی بھی ختم ہو گئی ہے۔"

"آپ میرے بیڈ روم میں چلیں۔ وہاں آپ کو ضرورت کا تمام سامان مل جائے گا۔"

دونوں بیڈ روم میں آگئیں۔ عالی میک اپ کا مختلف سامان نکال کر سنگھار میز کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ "آپ کا نام شازیہ کیسا رہے گا؟"

"اچھا رہے گا۔ مجھے شازیہ باجی کہا کرو۔ بائی دا وے باہر کھڑے ہوئے دونوں گارڈز نے مجھے اصلی چہرے کے ساتھ دیکھا ہے۔ چہرہ بدلنے کے بعد ان سے سامنا کیسے کروں گی؟"

"میں ابھی ان کی چھٹی کر دوں گی۔ پہلے آپ میرے بھائی جان کے بارے میں بتائیں۔"

وہ چہرے پر تبدیلیاں کرنے کے دوران میرے بارے میں بتانے لگی۔ عالی میری گمشدگی کی بات سن کر پریشان ہو گئی۔ تابانی نے کہا۔ "تم امی اور اپنے بھائی جان کی فکر نہ کرو۔ انہیں کم از کم تین ماہ تک کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ البتہ ہمارے انکل ہاشم کو بہت زبردست نقصان پہنچایا گیا ہے۔"

وہ بتانے لگی کہ ہاشم کے معتمد خاص کو خفیہ ہاتھ نے خرید لیا ہے اور ان کی انڈر گراؤنڈ مافیا کو نیست و نابود کر دیا ہے لیکن وہ کہہ رہے تھے کہ دو چار دنوں میں اپنی کھوئی ہوئی طاقت دوبارہ حاصل کر کے یہاں آئیں گے۔

ایک گھنٹے کے اندر تابانی نے چہرے کو اس حد تک تبدیل کر لیا کہ اب اسے تابانی کی حیثیت سے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ عالی اسے بیڈ روم میں چھوڑ کر ڈرائنگ روم میں آئی پھر انٹر کام کے ذریعے ایک مسلح گارڈ کو بلایا۔ اس نے ڈرائنگ روم میں آ کر اسے

سلیوٹ کیا۔ وہ بولی۔ "آج سے مجھے تمہاری اور اس دوسرے گارڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایک ماہ کی ایڈوانس تنخواہ دے کر تم دونوں کو فارغ کر رہی ہوں۔"

اس گارڈ نے انٹر کام کا ریسیور اٹھا کر اپنے دوسرے ساتھی گارڈ سے کہا۔ "یہاں آؤ۔ مس صاحبہ ہمیں ایک ماہ کی تنخواہ ایڈوانس دے کر ہماری چھٹی کر رہی ہیں۔"

اس نے انٹر کام کا ریسیور رکھ کر عالی سے پوچھا۔ "مس صاحبہ میں آپ کا یہ فون استعمال کر سکتا ہوں؟"

عالی نے اجازت دی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے پھر رابطہ ہونے پر کہا "سر! میں نے ڈیڑھ گھنٹا پہلے بتایا تھا کہ مس صاحبہ کی ایک بہن ملاقات کے لیے اس کوٹھی میں آرہی ہیں اور وہ آ چکی ہیں۔ ان محترمہ کے آنے کے ایک گھنٹے بعد مس صاحبہ ہماری چھٹی کر رہی ہیں۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟"

وہ دوسری طرف کی باتیں سننے لگا۔ عالی نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟ تم نے کس سے کہا ہے کہ میری ایک بہن یہاں کوٹھی میں آئی ہے؟"

وہ گارڈ ریسیور کان سے لگائے عالی کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یس سر! ہم نے ڈی ٹیکٹو آلے سے مس صاحبہ کی بہن کو چیک کیا تھا۔ اس کے لباس کے اندر کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ یس..........یس..........یس سر! آل رائٹ سر!"

اس نے ریسیور رکھ دیا پھر کہا۔ "مس صاحبہ! ہم سیکورٹی گارڈز ہیں۔ یہاں ڈیوٹی کی جگہ چھوڑنے سے پہلے گاڈ فادر امانت شیخ صاحب کو یہاں کی رپورٹ دینا ضروری تھا۔"

امانت شیخ کا نام سن کر عالی چونک گئی۔ تھوڑی دیر پہلے تابانی اسے بتا چکی تھی کہ امانت شیخ نے انکل ہاشم کو کتنا زبردست دھوکہ دیا ہے۔ عالی نے انجان بن کر پوچھا۔ "گاڈ فادر نے کیا کہا ہے؟"

"ہمیں انتظار کرنے کو کہا ہے۔ وہ یہاں آرہے ہیں۔"

تابانی بیڈ روم کے دروازے کی آڑ سے تمام باتیں سن رہی تھی۔ اس نے آواز دی "عالی! مجھے اپنا ایک جوڑا نکال دو۔ میں غسل کر چکی ہوں۔"

عالی تیزی سے چلتے ہوئے بیڈ روم میں آئی۔ تابانی نے سرگوشی میں پوچھا۔ "تم انکل ہاشم سے کس فون پر باتیں کرتی ہو؟"

"میں موبائل فون سے بات کرتی ہوں۔ انکل نے تاکید کی تھی کہ میں گھر کا فون استعمال نہ کروں۔"

"ہاں اس گھر کے فون پر ڈی ٹیکٹو آلہ لگا ہو گا۔ یہاں میری آمد کے بارے میں تم

نے موبائل فون سے بات کی تھی؟"

"جی ہاں۔"

"پھر تو اطمینان ہے کہ امانت شیخ کو یہ نہیں معلوم ہے کہ یہاں میں یعنی تابانی ہوں۔"

"لیکن باجی! میں نے تو یہاں پرائیویٹ سیکورٹی گارڈز رکھے تھے۔ ان کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ درپردہ امانت شیخ کے آدمی ہیں۔"

ڈرائنگ روم میں دوسرا گارڈ آیا۔ پہلے نے کہا۔ "تم گیٹ پر واپس جاؤ۔ گاڈ فادر یہاں آرہے ہیں۔"

وہ واپس چلا گیا۔ تابانی' عابی کو بیڈ روم میں رہنے کی تاکید کر کے ڈرائنگ روم میں آئی۔ مسلح گارڈ نے اسے چونک کر دیکھا پھر پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

"تم نے ڈی ٹیکٹو آلے سے مس صاحبہ کی بہن کو چیک کیا تھا' میں وہی ہوں۔ تمہارے جاسوسی آلے نے یہ بتایا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے لیکن وہ آلہ یہ نہ بتا سکا کہ میں سر سے پیر تک ہتھیار ہی ہتھیار ہوں۔"

یہ کہتے ہی اس نے اچانک گھوم کر گارڈ کے کلاشنکوف والے ہاتھ پر ایک کک ماری۔ کلاشنکوف ہاتھ سے نکل کر فرش پر آئی۔ گارڈ نے اسے نہیں اٹھایا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ خالی ہاتھوں سے ایک عورت کو قابو میں کر لے گا لیکن جب اسے دبوچنے آیا تو اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ اس کے منہ پر اتنی زور سے گھونسے اور کراٹے کے ہاتھ پڑ رہے تھے جیسے مشین گن سے گولیاں نکل رہی ہوں۔ اتنی پھرتی سے دونوں ہاتھ چلنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ بہت زبردست تربیت یافتہ ہے۔ جب اس نے ہاتھ روکے تو اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اس کے منہ سے' ناک سے اور آنکھوں سے لہو بہہ رہا تھا۔ وہ ایک ذرا سا ڈگمگا کر فرش پر اوندھے منہ گرا۔ تابانی ایک پیر کا گھٹنا موڑ کر فضا میں اچھل کر نیچے اس کی گردن پر آئی۔ گھٹنے کی ضرب ایسی تھی کہ گردن کی ہڈی سے کڑک کی آواز ابھری تو گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی یا پھر تڑخ گئی بہرحال وہ بے دم اور بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔

وہ اسے فرش پر گھسیٹتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گئی پھر باہر سے دروازے کو بند کر کے ڈرائنگ روم میں آکر کلاشنکوف کو اٹھایا پھر عابی کے پاس آکر بولی۔ "فوراً موبائل فون لے کر پچھلے دروازے سے جاؤ۔ لبرٹی کے گارڈن میں جا کر انکل ہاشم سے پوچھو۔ کوئی دوسری پناہ گاہ لاہور میں ہے' جہاں ہم دشمنوں کی نظروں میں نہ آسکیں۔ اسی گارڈن میں انتظار کرو۔ میں اس ضمیر فروش امانت شیخ سے نمٹ کر آؤں گی۔ جاؤ' دیر نہ

کرو۔"

وہ موبائل فون لے کر پچھلے دروازے سے جانے لگی۔ جب وہ دوڑتے ہوئے احاطے کے باہر جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تو تابانی تیزی سے چلتے ہوئے کوٹھی کے سامنے والے دروازے پر آئی۔ دور گیٹ پر کھڑے ہوئے گارڈ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی "اے جلدی آؤ۔ اس گارڈ کو کچھ ہو گیا ہے' وہ اسپتال لے جانے کو کہہ رہا ہے۔"

یہ کہتے ہی وہ دوڑتے ہوئے اندر آکر دروازے کے پیچھے چھپ گئی۔ ایک ساتھی کو کچھ ہو گیا ہو اور وہ اسپتال لے جانے کو کہہ رہا ہو تو دوسرا ساتھی یقیناً اس کی مدد کے لیے آئے گا۔ اس آنے والے نے جلدی میں اس بات پر توجہ نہیں دی کہ کوٹھی کے دروازے سے ایک اجنبی عورت پکار رہی ہے۔ اس نے تو آنے والی تابانی کو دیکھا تھا۔ اب اس کا چہرہ بدلا ہوا تھا۔

وہ جیسے ہی دوڑتا ہوا کوٹھی کے اندر آیا۔ تابانی نے پیچھے سے کلاشنکوف کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ پہلی ہی ضرب زوردار تھی۔ سر پر دوسری ضرب لگتے ہی وہ بھی اوندھے منہ فرش پر گر پڑا۔ تابانی اسے بھی گھسیٹ کر اسی کمرے میں لے آئی' جہاں پہلا گارڈ ایک لاش کی طرح پڑا ہوا تھا۔ اس نے دونوں کے لباس کی تلاشی لی۔ دونوں کے لباس سے دو پستول برآمد ہوئے۔ اس نے کمرے سے نکل کر دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ اس دوسرے کی بھی کلاشنکوف اٹھا کر ایک جگہ چھپا دی۔

اسی وقت ایک بہت قیمتی کار احاطے میں داخل ہوئی۔ کار کی اگلی سیٹ پر ایک باڈی گارڈ گن لیے ہوئے تھا۔ پچھلی سیٹ پر امانت شیخ بڑے باوقار انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔

وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہاں بڑا سناٹا ہے۔ باہر کسی ایک گارڈ کو تو ہونا چاہیے تھا۔"

اس کوٹھی کے دروازے کے سامنے کار رک گئی۔ امانت شیخ نے کار سے باہر نکلتے ہوئے باڈی گارڈ سے کہا۔ "دروازہ آدھا کھلا ہوا ہے۔ تم اندر جا کر دیکھو۔ ان دو میں سے کسی ایک گارڈ کو بلاؤ اور اندر کے حالات کا جائزہ لے کر آؤ۔"

باڈی گارڈ آگے بڑھا۔ دروازے کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی ایک گولی اس کی پیشانی پر لگی۔ اس کے گرتے گرتے دوسری گولی ڈرائیور کو لگی کیونکہ اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ ان دونوں کی ہلاکت پر امانت شیخ خطرے کو سمجھتے ہی اپنا ریوالور نکال کر اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر گیا۔ وہ کار کے پیچھے تھا۔ تابانی کی فائرنگ سے بچتا ہوا کار ڈرائیو کرتا ہوا فرار ہو سکتا تھا۔

تابانی اناڑی نہیں تھی۔ اس نے کار کے پچھلے اور اگلے پہیوں پر گولیاں چلائیں۔ دونوں پہیے دھماکوں سے پھٹ گئے۔ امانت شیخ کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ کار کا دوسرا دروازہ کھول کر دوسری طرف سے فائر کرتا ہوا فرار ہو سکتا تھا لیکن کس سمت فائرنگ کرتا ہوا جاتا؟ وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس کے گارڈ اور ڈرائیور کو ہلاک کرنے والا اپنی پوزیشن بدل چکا ہو گا۔

تابانی ایسی تربیت یافتہ تھی کہ اس نے پوزیشن بدلنے میں ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ کار کے پچھلے حصے میں پہنچ کر وہاں جھک کر کہا۔ ”تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ کار سے نہتے ہو کر باہر نکل آؤ۔ میں صرف تین تک گن کر کار کی پٹرول کی ٹینکی میں گولی مار دوں گی۔ کار دھماکے سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گی۔ بعد میں پولیس والے تمہارے ٹکڑے چننے آئیں گے۔“

وہ مشکل میں پڑ گیا۔ تابانی ایسی جگہ تھی کہ امانت شیخ کھڑکی سے سر اور ہاتھ نکال کر پیچھے کی طرف فائرنگ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ پیچھے کی طرف وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

وہ مجبور ہو گیا تھا۔ اس نے اگلا دروازہ کھول کر پہلے اپنا ریوالور باہر پھینکا۔ پھر کار سے نکل کر اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر گردن کے پیچھے رکھ لیے پھر پوچھا۔ ”تم عالی نہیں ہو۔ کون ہو؟“

”اگر بتا دوں گی تو زندہ نہیں رہو گے۔ میں نہیں چاہتی کہ مجھے پہچاننے والا دوسروں کو میری پہچان بتائے۔ میرا نام اور کام نہیں پوچھو گے تو زندہ رہو گے۔“

”نن۔ نہیں۔ میں تمہارا نام نہیں پوچھوں گا' تمہاری صورت دیکھے بغیر چلا جاؤں گا۔“

تابانی کار کے پیچھے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بھیس بدلنے کے باعث وہ تابانی کو چہرے سے نہیں پہچان سکتا تھا۔ وہ بولی۔ ”جس گاڈ فادر نے اپنی عدم موجودگی میں تم پر بھروسا کیا' تم نے اس کی انڈر گراؤنڈ مافیا کو خفیہ ہاتھ کے پاس فروخت کر دیا۔ اس کے وفاداروں کو قتل کرا دیا۔ ان میں سے بعض فرار ہو کر چھپ گئے ہیں۔ اب تم موبائل فون نکال کر خفیہ ہاتھ سے گڑگڑا کر اپنی حفاظت کی بھیک مانگو۔ اسے یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم کہاں ہو اور یہاں تمہارا دشمن مرد ہے یا عورت؟“

اس نے موبائل نکال کر رابطہ کیا پھر خفیہ ہاتھ کے سیکرٹری سے کہا۔ ”میں اپنی موت کے سامنے کھڑا ہوں۔ مجھ سے وعدہ کیا گیا تھا کہ آئندہ ہر حال میں میری حفاظت کی جائے گی۔“

”تم کہاں سے بول رہے ہو؟“

”مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں اس جگہ کی نشان دہی نہ کروں اور اپنے سامنے کھڑی موت کا حلیہ بھی نہ بتاؤں۔“

”پھر ہم تمہاری کیسے مدد کریں گے؟“

”خفیہ ہاتھ کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میرے گھر میں فون کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ میں کہاں گیا تھا اور اب کہاں پایا جا سکتا ہوں۔“

تابانی نے اس کے گھٹنے میں ایک گولی ماری۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی پھر دوسری گولی دوسرے گھٹنے میں لگی۔ وہ زمین پر گرا۔ موبائل فون اس کے ہاتھ سے نکل کر دور چلا گیا۔ تابانی فون کے قریب آئی' اس سے ہیلو ہیلو کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے فون کو بند کر کے اپنی جینز کی بیلٹ سے لٹکایا پھر کہا۔ ”تم اسے گائیڈ کر رہے تھے کہ اس کے آدمی کس طرح یہاں پہنچ سکتے ہیں۔“

وہ گڑگڑا کر بولا۔ ”مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے ہلاک نہ کرو۔“

”میں ہلاک نہیں کروں گی۔ تم نے جس گاڈ فادر کے اعتماد کو دھوکا دیا ہے' اس کے فیصلے کے مطابق زندہ رہو گے یا مرو گے۔“

”میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں مجھے اسپتال پہنچا دو۔“

”تمہارے دونوں گھٹنوں میں ایک ایک گولی لگی ہے' یعنی دونوں ہڈیاں ایک بار ٹوٹی ہیں۔ انہیں تو کوئی میڈیکل سرجن جوڑ دے گا مگر کالیا کی طرح آپریشن مشکل ہونا چاہیے۔ ہڈیوں کو ٹکڑے ٹکڑے ہونا چاہیے۔“

اس نے دونوں گھٹنوں پر تڑاتڑ فائرنگ کی۔ وہ چیخنے کے قابل بھی نہ رہا۔ تھوڑی دیر تک تڑپتا رہا پھر اسے رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ”مجھے یاد نہیں ہے' تمہارے گھٹنوں پر کتنی گولیاں چلائی گئی ہیں۔ تم کالیا کی طرح ان کے لیے اہم نہیں ہو کہ لندن بھیج کر مہنگا علاج کرایا جائے۔ یہاں کے ڈاکٹر تمہاری دونوں ٹانگیں کاٹ دیں گے۔ تم کہیں بھاگنے کے قابل نہیں رہو گے۔ اپنی موت کے لیے گاڈ فادر ہاشم کا انتظار کرتے رہو گے۔“

وہ پلٹ کر کوٹھی کے اندر گئی پھر پچھلے دروازے سے نکل کر باہر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر عالی کے پاس جانے لگی۔

☆======☆======☆

ہاشم ذہنی طور پر بری طرح الجھا ہوا تھا۔ آمنہ نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اپنی چھینی ہوئی قوت اور اختیارات چند گھنٹوں میں حاصل کر لے گا۔ وہ بہن کی زبان پر بھروسا کرتا تھا لیکن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ سب کچھ لٹ جانے کے بعد وہ پھر ایک بار کیسے بے تاج بادشاہ بن سکے گا۔

ایک گھنٹے کے اندر ہی اس کی الجھن کچھ کم ہونے لگی۔ اس کے فون سے بزر کی آواز ابھری۔ اس نے اسے آن کر کے کان سے لگایا پھر پوچھا۔ "ہیلو کون؟"

دوسری طرف سے ایک کرخت آواز سنائی دی جیسے کوئی بے رحم قسائی بول رہا ہو۔ اس نے کہا۔ "میں مسٹر ہاشم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں ہاشم بول رہا ہوں۔"

"میں پہچان کے لیے پوچھ رہا ہوں' اپنی بہن کا نام بتاؤ۔"

"لیڈی سرجن آمنہ خاتون۔"

"مجھے "بے رحم قسائی" کہتے ہیں۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے بیس برسوں میں کتنے قتل کیے ہیں۔ میں کبھی کسی کو دوست بھی بناتا ہوں تو تھوڑے سے فائدے کے لیے اسے بھی قتل کر دیتا ہوں۔ اتنی بے رحمی کے باوجود میں آنر ایبل سرجن آمنہ کا غلام ہوں۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہاری مدد کے لیے کل شام لاہور پہنچ جاؤں۔ میرے ساتھ چھ کتے ہوں گے۔ وہ بظاہر انسان ہیں مگر میرے پالتو کتے ہیں۔ مجھ سے پہلے میرے شکار پر لپک کر اس کی بوٹی بوٹی کر دیتے ہیں۔ آپ بتائیں ہماری ملاقات کہاں ہو گی؟"

"میں کل دوپہر تک لندن سے لاہور پہنچوں گا۔ ائرپورٹ پر شام پانچ بجے تک رہوں گا۔ یہ بتاؤ۔ ہم ایک دوسرے کو کیسے پہچانیں گے؟"

"تمہاری تصویر میرے پاس ہے۔ میرے پاسپورٹ میں میرا نام ڈینس ہاک ہو گا۔ باقی باتیں ملاقات ہونے پر ہوں گی۔"

فون بند ہو گیا۔ تب ہاشم کو یاد آیا کہ پوری دنیا میں عالمی سطح کے ایسے خطرناک مجرم' جو انٹرپول کے ہاتھ بھی نہیں لگتے' وہ لیڈی سرجن آمنہ کے عقیدت مند ہیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر فون پر ایک اجنبی سے رابطہ ہوا۔ اس نے کہا۔ "مجھے یوکے کی حکومت نے سر کا خطاب دیا ہے میں سر جارج ایڈسن کہلاتا ہوں۔ دنیا کے چند بڑے سرمایہ داروں میں میرا شمار ہوتا ہے۔ آنر ایبل لیڈی سرجن آمنہ خاتون نے مجھ سے کہا ہے کہ پہلی قسط کے طور پر میں آپ کی خدمت میں ۸۰ لاکھ پاؤنڈ پیش کروں۔ پاکستانی کرنسی کے حساب سے تقریباً

چالیس یا پینتالیس کروڑ روپے ہو سکتے ہیں۔ آپ اس رقم سے جدید ہتھیار' کمیونیکیشن کے آلات اور بے شمار گاڑیاں خریدیں۔ چونکہ یہ سب کالا دھن ہے۔ لہٰذا آپ بتائیں یہ رقمیں آپ کے پاس کہاں پہنچائی جاتی رہیں؟"

ہاشم نے اسے ایک خفیہ جگہ کا پتا بتا کر کہا۔ "ٹھیک بارہ بجے میں وہاں رقم وصول کرنے آؤں گا۔"

تیسرے فون کرنے والے نے کہا آنر ایبل لیڈی سرجن آمنہ خاتون کے حکم سے تیس عدد گوریلے فائٹر پرسوں لاہور پہنچ رہے ہیں۔ چوتھے فون کے ذریعے کہا گیا کہ چھ عدد ایسے پلان میکر بھیجے جا رہے ہیں' جو جرائم کی دنیا کے ایک ایک مجرم کی ہسٹری شیٹ سے واقف ہیں اور ان سب کے لائن آف ایکشن کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

ہاشم کا سر چکرا رہا تھا۔ اس نے فون پر آمنہ سے کہا۔ "باجی! میں سمجھتا تھا کہ آپ کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں مگر میں گاڈ فادر کہلانے والا تو آپ کے سامنے ایک تنکا ہوں۔"

"میرا بھائی تنکا نہیں ہو سکتا۔ تم ایک بلند پہاڑ تھے۔ اب اس سے بھی بلند پہاڑ بنتے رہو گے۔ بہرحال ابھی بڑی دیر تک تمہارا فون مصروف رہا۔ اس عالی اور تابانی نے مجھے بتایا ہے کہ تابانی نے امانت شیخ کے دونوں گھٹنے توڑ دیئے ہیں۔ وہ دونوں لڑکیاں اب دوسری خفیہ رہائش گاہ میں رہنا چاہتی ہیں۔ میں نے اپنی ایک پرائیویٹ کوٹھی کا پتا بتا دیا ہے۔ تم وہاں کل پہنچو گے تو ان کے تمام حالات معلوم ہوں گے۔"

ہاشم نے کہا۔ "تابانی نے تو کمال کر دیا۔ ہم سے غداری کرنے والے کو دونوں پیروں سے اپاہج بنا دیا ہے۔ میں اپنے نئے مددگار دوستوں سے ملاقات کرنے کے بعد تابانی کے مراد کو جیل سے ضرور نکالوں گا۔"

"تم اس کی مراد پوری کر دو گے تو وہ تمام عمر تمہارے کام آتی رہے گی۔"

"باجی! آپ اتنے وسیع ذرائع اور بے انتہا قوت رکھتی ہیں۔ اس کے باوجود خفیہ ہاتھ اور "را" والوں کے زیر اثر رہ کر اس منحوس کے لیے ایک آپریشن کر چکی ہیں۔ آخر آپ ان کے دباؤ میں کیوں ہیں؟"

"میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ان کے دباؤ میں ہوں۔ میں نے تم سے بھی کہا کہ میری فکر نہ کرو۔ پاکستان جاؤ۔ عالمی سطح کے بڑے بڑے مجرم اور سرفہرست رہنے والے دولت مند بھی یہی کہہ رہے تھے کہ مجھے کالیا کا آپریشن نہیں کرنا چاہیے لیکن ڈاکٹر اور سرجن کی حیثیت سے یہی تو میرا ایمان ہے کہ میں اپنے آپریشن بیڈ پر آنے والے جانی

دشمنوں کا بھی علاج کرتی ہوں۔ یہ کبھی نہیں سوچتی کہ وہ نئی زندگی پاکر پھر میرے جان کے دشمن بن جائیں گے اور تم دیکھ رہے ہو کہ کالیا جیسے دشمن برائے نام ہیں اور دنیا کے بڑے بڑے خطرناک مجرم میرے عقیدت مند ہیں۔ جس طرح میں نے ایک مشکل آپریشن کے ذریعے تمہاری جان بچائی تھی۔ اسی طرح ان تمام خطرناک مجرموں کے مشکل آپریشن بھی کیے اور انہیں قانون کی گرفت سے بچاتی رہی۔"

"واقعی میں دیکھ رہا ہوں' آپ کے ایک حکم پر مجھے دوبارہ زیرِ زمین مافیا کی بادشاہت مل رہی ہے۔ میرا خیال ہے۔ آپ فرمان کے لیے بھی کچھ کر رہی ہوں گی۔"

"بے شک۔ وہ میرا ایک ہی جانباز بیٹا ہے۔ تم دیکھتے جاؤ۔ شلپا کو اور "را" والوں کو اس کی گمشدگی بہت مہنگی پڑنے والی ہے۔"

ان کا رابطہ ختم ہو گیا۔ ہاشم سوچنے لگا۔ حمزہ اور راجہ نوازؔ کی حب الوطن اور مسلسل جدوجہد سے کرپٹ سیاست داں بے نقاب ہونے والے تھے پھر ان کے ساتھ میں (فرمان) میری والدہ آمنہ خاتون اور انکل ہاشم پوری ٹیم اس جدوجہد میں شامل ہو گئی تھی اور یہ یقین ہو رہا تھا کہ پاکستان میں سچے' حب الوطن سیاست دانوں کو حکمران بنایا جا سکے گا۔

لیکن حالات بتا رہے تھے کہ ایسے وقت دولت' طاقت اور وسیع ذرائع کام آتے ہیں اور یہ سب کچھ خفیہ ہاتھ کے پاس تھا تو ڈاکٹر آمنہ اور ہاشم کے پاس بھی تھا اور ایسے ہی وقت یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دولت' طاقت اور وسیع ذرائع کے مقابلے میں سیاسی چال بازی سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔

خفیہ ہاتھ نے ٹھیک الیکشن سے پہلے حمزہ اور راجہ نواز کو غائب کرا دیا تھا یا ہلاک کرا دیا تھا۔ اس نے جو بھی کیا ہو' سیاسی چال خوب چلی تھی۔ جب حمزہ اور راجہ نواز جیسے سپاہ سالار نہ ہوں تو پوری فوج کس لائن آف ایکشن پر جنگ لڑتی؟ اگر دولت اور بے شمار اسلحہ استعمال کرتے اور سیاست داں کی کرپشن ثابت نہ کرتے تو وہ قانون کے مطابق دہشت گرد کہلاتے۔ پاکستان آرمی منظم دہشت گردی کے خلاف عمل میں آجاتی اور غلطی سے دہشت گرد کہلانے والے محبِ وطن اپنے ہی وطن کی آرمی سے ٹکرانا نہیں چاہتے ہیں۔

جب حمزہ' راجہ' ڈاکٹر آمنہ اور ہاشم جیسے چند افراد جہاد کرتے ہوں اور کسی طرح بھی عوامی تحریک نہ ہو اور عوامی شعور بیدار نہ ہو تو کسی بھی ملک اور قوم کا مقدر نہیں بدلتا۔ کبھی نہیں بدلتا۔

☆======☆======☆

میں کسی عالمِ نامعلوم میں تھا۔ ایسا غافل تھا کہ خود کو بھول گیا تھا۔ دنیا کیا ہوتی ہے؟ کیا میں کسی ایسی دنیا میں تھا' جہاں لوگ جینے بھی نہیں دیتے' مرنے بھی نہیں دیتے؟ مجھ جیسا غفلت کی نیند یا بے ہوشی کی نیند میں رہنے والا سب کچھ بھلا چکا تھا۔

پھر رفتہ رفتہ میرے کان بہت ہی دھیمی سی آواز سننے لگے۔ ذہن سمجھا رہا تھا کہ کسی گیت اور سنگیت کی آواز ہے۔ بے ہوشی کا طلسم ٹوٹ رہا تھا۔ ذہن زیادہ سے زیادہ بیدار ہوتا جا رہا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ کسی آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا ہوں۔

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ ایک بڑا سا بیڈروم تھا۔ وہاں آرام و آسائش کا اور نمائش کا قیمتی سامان خوب صورتی سے سجا کر رکھا گیا تھا۔ وہ کسی بہت زیادہ دولت مند کے بنگلے کا کمرا ہو سکتا تھا۔

میں وہاں کیسے پہنچا؟ یہ باتیں یاد کرنے لگا تو دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ سب سے پہلے پوجا یاد آئی۔ جسے سمندر کے ساحل پر گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ وہاں ریت پر تین چار بڑی کشتیاں تھیں پہلے دو چار ماہی گیر نظر آئے تھے بعد میں پتا چلا کہ وہ مچھلیاں پکڑنے والے مقامی باشندے نہیں تھے۔ ان کشتیوں کے پیچھے کئی گن مین چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے اور پوجا کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ان کے لیڈر نے تمام ماتحت گن مینوں سے کہا تھا۔ "میڈم شلپا کا حکم ہے کہ فرمان کو جانی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ یہ لڑکی (پوجا) فضول ہے اسے ختم کر دو۔"

یہ سن کر میں نے ان سے مقابلہ کیا۔ کتنے ہی دشمن میرے مقابلے میں تھک رہے تھے اور ہانپ رہے تھے۔ اگر شلپا مجھے زندہ رکھنے کا حکم نہ دیتی تو وہ مجھے گولی مار دیتے۔ انہوں نے پوجا کو مار ڈالا۔ مجھے قابو کرنے کے لیے کلاشنکوف اور رائفلوں کے دستوں مارتے مارتے بے ہوش کر دیا تھا۔

مجھے یہ تمام باتیں اچھی طرح یاد آ رہی تھیں۔ پوجا کے لیے دل دکھ رہا تھا۔ آخر وقت تک اس نے مجھ سے لپٹ کر گولیاں کھائی تھیں اور میری آغوش میں جان دی تھی۔ ایک محبت کرنے والی کے ان آخری لمحات کو شاید میں بھول نہ سکوں۔ لفظ "شاید" اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ زندگی میں پتا نہیں' کتنے زہریلے لمحات سے گزرنا تھا۔ زندگی زہر آلود ہو جائے تو میدانِ عمل میں زہر پینے کی عادت ہو جاتی ہے پھر یاد نہیں رہتا کہ کب کون سا زہر پیا تھا۔

اس وقت میں نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ دل میں ایک ہی خواہش تھی کہ پوجا پر گولیاں چلانے والے ایک بار میرے سامنے آجائیں اور میں ان قاتلوں کو پہچان لوں۔

انہیں پہچاننا اس لیے دشوار تھا کہ اس وقت کلاشنکوف اور رائفلوں کے دستوں سے مجھ پر اتنی ضربیں لگائی گئی تھیں کہ میں لہولہان ہو گیا تھا اور بہتا ہوا خون میری آنکھوں میں بھر گیا تھا۔ میں کسی کو دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ دکھ اس لیے بھی بھاری تھا کہ آخری لمحات میں پوجا کا پیارا پیارا مکھڑا بھی نہیں دیکھ پایا تھا۔

میں غصے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے سر پر، چہرے پر اور جسم کے کئی حصوں پر لگے ہوئے زخموں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ایسا درد ایسی تکلیفیں تھیں کہ اور کوئی ہوتا تو وہ چکرا کر پھر تکیے پر گر کر تکالیف کی شدت سے کراہنے یا چیخنے لگتا لیکن میں بنیادی طور پر ایک لوہار تھا۔ لوہا گرم کرتے وقت شعلوں سے چنگاریاں اڑ کر میرے اوپری آدھے ننگے بدن پر آ کر لگتی تھیں تو ایسی تکلیف ہوتی جیسے آگ سے بنی ہوئی سوئیاں مجھے چبھوئی جا رہی ہیں۔ میں بچپن میں تکلیف سے کراہتا اور روتا تھا تو دادا جان میرے پٹائی کرتے ہوئے کہتے تھے۔ "چپ ہو جا کم بخت! ایسی تکلیفیں برداشت نہیں کرے گا تو زندگی کیسے گزارے گا؟"

دادا جان مجھے پیار کرتے تھے لیکن ایک سخت مزاج رکھنے والے ظالم کی طرح میری پرورش کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے جوان ہونے تک فولاد بنانے میں کوئی کمی نہیں رکھی تھی۔ میرے اندر جیسے تمام ہڈیاں نکال کر ان کی جگہ لوہے کی سلاخیں لگا دی تھیں۔ بہت شدت سے تکلیف ہو تو ایسا لگتا ہے جیسے جہاں جہاں زخم ہیں، وہاں وہاں محض چٹکیاں لی جا رہی ہیں۔

میرے سامنے ذرا دور ایک دیوار پر چھ فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا ٹی وی اسکرین تھا۔ پتا نہیں وہ کب سے آن تھا۔ جب مجھے مخاطب کیا گیا تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے حسن و شباب کی ملکہ مگر میری جانی دشمن شلپا ایک ایزی چیئر پر بیٹھی ہوئی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "تمہیں آرام سے لیٹنا چاہیے۔ یوں بیٹھو گے یا بستر سے اٹھو گے تو تمام زخموں سے پھر لہو بہنے لگے گا؟"

میں نے غصے سے دانت پیستے ہوئے اسے دیکھا پھر کہا۔ "کتے کی بچی! میری پوجا کا لہو بہا کر میرے لہو کو بہنے سے روکنا چاہتی ہے۔ اگر تو کہیں آس پاس کہیں ہے تو اب یہاں سے زندہ نہیں جائے گی۔"

"مجھے تمہاری جسمانی قوت کا اندازہ ہے۔ تمہیں قابو میں کرنے والے دس آدمی بہت زبردست باڈی بلڈر اور تجربہ کار فائٹر تھے۔ وہ تمہارے ایک کے مقابلے میں تھک ہار گئے تھے۔ اگر اپنی رائفلوں کے دستوں سے حملہ نہ کرتے تو تم ان سب کو مار گراتے۔

جس کمرے میں تمہیں رکھا گیا ہے، اس کے ڈبل ڈورز ہیں۔ اندر سے لکڑی کا اور باہر سے لوہے کا دروازہ ہے۔"

وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی پھر بولی.......... "تمہیں کھانا، دوائیں اور ضرورت کی چیزیں دینے کے لیے بیڈ کے بائیں طرف چھوٹی سے کھڑکی ہے۔ اس میں بھی لوہے کے دو پٹ ہیں۔ باہر سے پہلا پٹ کھول کر ضرورت کی چیزیں اندر رکھی جائیں گی۔ اس لوہے کے پٹ کو لاک کر کے گھنٹی بجائی جائے گی تب اندر والا لوہے کا پٹ خود بخود کھل جائے گا۔ تم ایک منٹ کے اندر وہ چیزیں وہاں سے لے لو گے کیونکہ ایک منٹ کے بعد وہ پٹ خود بند ہو جائے گا۔"

میں بستر پر بیٹھا کھڑکی اور دروازوں کو دیکھ رہا تھا پھر اسکرین پر اسے دیکھا۔ وہ چلتے وقت ایک ذرا سا لنگڑا رہی تھی۔ اِدھر اُدھر جانے کے دوران میں پتا چل رہا تھا کہ وہ بھی ایک بہت بڑے خوب صورت بیڈروم میں ہے۔

میں نے کہا۔ "تم لنگڑا رہی ہو۔ میرا دیا ہوا زخم بھر چکا ہو گا لیکن اس زخم کی یادگار یہ لنگڑاہٹ عمر بھر رہے گی اور تم اپنے حسن و شباب پر غرور کرنے کے لیے شاہانہ انداز میں سینہ تان کر نہیں چل سکو گی۔"

"تم نے میرے ساتھ جو کیا، وہ کیا۔ اب تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے، وہ تم دیکھتے رہو گے۔ روز آئینہ دیکھتے رہو۔ ایک ماہ کے اندر تمہارے اس پہاڑ جیسے جسم کو ہڈیوں کا ڈھانچا بنا دیا جائے گا۔ اس کے بعد تم زندہ رہو گے۔ صرف تمہارے دو پیر گھٹنوں کی طرف سے کاٹ کر تمہیں اپاہج بنا کر چھوڑ دیا جائے گا۔"

"کیا یہ بھول رہی ہو کہ میری امی تمہارے باپ کا علاج کر رہی ہیں؟"

"میں ایک ایک بات کی خبر رکھتی ہوں۔ تمہاری امی نے میرے ڈیڈی کا آپریشن کیا ہے۔ وہ آپریشن بڑی حد تک کامیاب رہا ہے۔ ایک ماہ بعد دوسرا آپریشن کیا جائے گا۔"

"کیا انہیں میری گمشدگی کا علم نہیں ہوا ہو گا؟"

"بے شک ہو چکا ہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ "را" والوں نے تمہیں اغوا کر کے کہیں چھپا دیا ہے۔ اس طرح وہ میرے ڈیڈی کے کامیاب آپریشن کے لیے تمہاری ماں پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔"

"تمہارے ڈیڈی کو "را" والے بہت اہمیت دیتے ہیں پھر میری امی پر دباؤ کیوں ڈالا جا رہا ہے؟"

""را" والوں کے لیے کوئی خطرہ پیدا ہو جائے تو وہ خطرہ پیدا کرنے والے اپنے اہم

افسر یا اہم جاسوس کو گولی مار دیتے ہیں۔ "را" کا ڈی جی اور دوسرے افسران میرے ڈیڈی کے لیے اتنی زحمتیں نہ اٹھاتے۔ انہیں بھی گولی مار دیتے۔ یہ بھول جاتے کہ ڈیڈی نے "را" کے لیے کتنی بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں لیکن میں "را" کے تمام افسران کو بلیک میل کر رہی ہوں۔"

"تم؟ تمہارے پاس ایسی کیا قوت ہے کہ انہیں بلیک میل کر رہی ہو؟"

"میرے ڈیڈی بہت چالاک ہیں۔ انہوں نے "را" کے لیے بڑی بڑی اہم خدمات انجام دیتے وقت کئی خفیہ معاملات کی تصاویر اور دستاویزات اپنے پاس چھپا کر رکھی تھیں۔ اگر یہ تصاویر اور دستاویزات ظاہر ہو جائیں تو دنیا کے کئی بڑے ممالک بھارت کے دشمن ہو جائیں گے۔ بھارت اور اسرائیل نے جو مشترکہ خفیہ پلاننگ کی ہے اس کے ذریعے پاکستان' تبت اور چین کو کس طرح رفتہ رفتہ کمزور بنا کر امریکا بہادر کے لیے چین تک پہنچنے کا راستہ صاف کیا جائے گا؟ اسی طرح کے کئی راز میرے ڈیڈی نے مجھے چھپانے کے لیے دیئے تھے۔ میں نے "را" والوں کو دھمکیاں دی ہیں کہ میرے ڈیڈی کو مکمل طور پر دونوں پیروں سے چلنے پھرنے کے قابل نہ بنایا گیا تو ان کے تمام ٹاپ سیکرٹس دنیا والوں کے سامنے لے آؤں گی پھر جمہوریہ چین کی جوابی کارروائی ان سب کے لیے مہنگی پڑے گی۔"

"کالیا شیطان ہے اور تم شیطان کی بیٹی ہو۔ اپنے باپ کو بچانے کے لیے زبردست جدوجہد کر رہی ہو۔ "را" والوں پر میرے اغوا کا الزام لگا کر انہیں اور زیادہ الجھا رہی ہو۔"

"ایک طرح سے یہ کہہ سکتے ہو لیکن تمہارے اغوا کا مقصد ذاتی انتقام ہے۔ تم نے میرے ڈیڈی کو پیروں سے اپاہج بنایا اور میرے ایک پیر میں گولی مار کر مجھے تمام عمر لنگڑانے پر مجبور کر دیا۔"

"اچھا تو تم انتقام لینے کے لیے مجھے یہاں لائی ہو۔ میں نے تو ساری دنیا کے سامنے تمہارے باپ کو اپاہج اور تمہیں لنگڑا بنا دیا مگر تم چھپ کر انتقام لے رہی ہو۔"

"تمہارے کمرے میں خفیہ ٹی وی کیمرے ہیں۔ تمہیں جتنے آرام سے رکھا گیا ہے' اتنی ہی بے رحمی سے تم پر ٹارچر کیا جائے گا اور روز کا یہ پروگرام ویڈیو کیسٹ میں محفوظ کیا جائے گا۔ تمہارے دونوں پیر سب سے آخر میں کاٹے جائیں گے۔ اس ویڈیو کیسٹ کی کئی کاپیاں تمہاری ماں اور گاڈ فادر ہاشم وغیرہ کو بھیج دی جائیں گی۔"

"مجھے ٹارچر کرنے' مجھ پر تشدد کی انتہا کرنے کے لیے جو لوگ میرے قریب آئیں

گے' ان کا انجام کیا ہو گا' یہ سوچا ہے؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "شیر کے جبڑے میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے تدبیر سوچ لی ہے۔"

میں اس سے باتیں کر رہا تھا اور اس کے بیڈ روم کی ایک ایک چیز کو توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ شلپا نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق تمہاری دواؤں کا وقت ہو گیا ہے لیکن پہلے کھانا کھاؤ گے پھر دوا استعمال کرو گے۔"

اس نے انٹرکام کے ذریعے کسی سے کہا۔ "اسے کھانا.......... اور دوائیں پہنچا دو۔ میں اس کی نگرانی کر رہی ہوں۔"

پھر اس نے کہا۔ "تم بڑے جی دار ہو۔ اس چھوٹی کھڑکی کے پاس جاؤ گے تو کھانا ملے گا۔"

میں بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ مجھ جیسا بری طرح زخمی ہونے والا بستر پر کروٹ بھی نہیں لے سکتا تھا جبکہ میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ پھر بستر سے اتر کر اپنے پیروں پر چلتا ہوا اس چھوٹی سی کھڑکی تک پہنچ گیا تھا۔

وہ بڑی حیرانی سے بولی۔ "بھگوان کی قسم۔ تم عجوبہ ہو۔ مجھے آنکھوں سے دیکھ کر یقین نہیں آ رہا ہے۔ کیا تمہیں زخموں سے ذرا سی بھی تکلیف نہیں ہو رہی ہے؟"

"جب تکلیف ہوتی ہے' درد ہوتا ہے۔ جلن ہوتی ہے تو مجھے ایک عجیب سا مزہ آتا ہے اور جب تمہارے آدمی مجھے ٹارچر کرنے آئیں گے تو دیکھنا' تمہیں بھی کتنا مزہ آئے گا۔"

شلپا نے مجھے ناگواری سے دیکھا پھر میری طرف پشت کرتے ہوئے ایک سمت جانے لگی۔ کھڑکی سے گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ اس کا خود کار پٹ اوپر کی طرف اٹھ گیا۔ ایک ٹرے میں روٹی اور سالن کے ساتھ ایک طشتری میں ایک کیپسول اور دو گولیاں تھیں۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سے پرچی پر لکھا تھا۔ "تمہیں دواؤں کے ذریعے اعصابی کمزوریوں میں مبتلا کیا جائے گا لیکن میں نے دوائیں بدل دی ہیں۔ انہیں کھانے کے بعد چند منٹ یوں ظاہر کرنا جیسے تم کمزوری محسوس کر رہے ہو۔ یہ پرچی یہیں چھوڑ دو ورنہ وہ دیکھ لے گی۔ ٹرے جلدی ہٹاؤ۔ ایک منٹ پورا ہونے والا ہے۔"

میں نے پرچی کو وہیں چھوڑ کر ٹرے کو اپنی طرف کیا تو اسی وقت خود کار پٹ نیچے آ گیا۔ میں وہاں سے چلتا ہوا چھوٹی سے میز پر ٹرے رکھ کر ایک کرسی پر بیٹھ کر کھانا.......... کھانے لگا۔

بڑی سی اسکرین پر شلپا اپنے بیڈ روم میں ٹہل رہی تھی اور مجھے دیکھتی جا رہی تھی۔

میں کھاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ خداوند کریم بے شک محافظ اور کریم ہے۔ اپنی قدرت کو وہی جانے۔ پتا نہیں میری مدد کے لیے کس کے دل میں رحم پیدا کر دیا ہے۔

میں نے کھانے کے بعد ڈکار لی۔ آرام سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی ایک صوفے پر بیٹھ کر مسلسل دیکھنے لگی۔ وہ مجھے کیپسول اور گولیاں نگلتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی اور میں اسے انتظار کرا رہا تھا۔ اسے بے چینی میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ پندرہ منٹ کے بعد بولی۔ ”ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کرو گے تو زخم جلد بھر جائیں گے۔ وہ کیپسول اور گولیاں نگل لو۔“

میں نے کہا۔ ”ابھی تو کھانا.......... کھایا ہے۔ فوراً یہ دوا نہیں کھانا چاہیے۔“

”کیا تم ڈاکٹر سے زیادہ جانتے ہو؟ اس نے کہا ہے۔ کھانے کے فوراً بعد دوا کھانی چاہیے۔“

میں نے گلاس میں پانی بھر لیا پھر پانی کے ساتھ کیپسول اور دو گولیاں نگل کر پوچھا۔ ”تم میری نگرانی کیوں کر رہی ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے کمرے میں تم نہ ہوتے ہوئے بھی موجود رہو؟ اس ٹی وی اسکرین کو آف کر دو۔“

”ابھی دس منٹ کے بعد آف کر دوں گی۔“

میں بستر کی طرف جانے کے لیے کرسی سے اٹھا پھر ذرا سا ڈگمگا کر اپنے سر کو ایک ہاتھ سے پکڑ لیا۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔ شاید زیادہ کھانے کی وجہ سے نشہ سا ہو گیا ہے۔“

میں سنبھل سنبھل کر چلتا ہوا بیڈ کے سرے پر بیٹھ گیا اور بڑبڑانے لگا۔ ”پتا نہیں کیوں کمزوری سی محسوس ہو رہی ہے۔“

”آخر تم اتنے زخم کھا چکے ہو۔ یہ زخم اب اپنا اثر دکھا رہے ہیں.......... بہتر ہے سو جاؤ۔“

میں آہستہ آہستہ کراہتا ہوا لیٹ گیا پھر میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میں نے بند آنکھیں رکھ کر سنا۔ وہ انٹرکام پر کہہ رہی تھی۔ ”تم یہی دوائیں دیتی رہا کرو۔ اس پر اثر کر رہی ہیں۔ میرا خیال ہے‘ یہ جتنی بھی قوت ارادی رکھتا ہو‘ دو تین دنوں کے بعد بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں رہے گا پھر ہمارے باڈی بلڈر اس کے قریب جا سکیں گے۔“

پھر میں نے بند آنکھوں کے باوجود محسوس کیا کہ کمرے میں روشنی نہیں ہے۔ میں نے ایک آنکھ کو ذرا سا کھول کر دیکھا کمرے کی لائٹس بجھ گئی تھیں۔ ٹی وی اسکرین بھی تاریک ہو گیا ہو گا۔ میں سر گھما کر اسکرین کی طرف دیکھنا چاہتا تھا مگر اچانک دماغ میں بات

آئی کہ کمرے میں خفیہ ٹی وی کیمرے ہیں‘ جو نیم تاریکی اور نیم روشنی میں تصویریں اتار سکتے ہیں۔

اس چار دیواری کے باہر دن کی روشنی تھی اس لیے بند کمرے کے باوجود پوری طرح اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ شلپا بعد میں اس کیمرے سے تیار کی ہوئی کیسٹ دیکھ کر معلوم کر سکتی تھی کہ میں کمزور نہیں ہوا تھا۔ اسے دھوکا دینے کے لیے کمزوری ظاہر کر رہا تھا۔

میں خاموش پڑا رہا۔ اس کے متعلق سوچنے لگا جس نے مجھے اعصابی کمزوری کی دوا سے بچایا تھا۔ وہ میرا مددگار کون ہو سکتا تھا بلکہ ہو سکتی تھی۔

ابھی شلپا نے انٹرکام پر کسی سے کہا تھا کہ تم یہی دوائیں دیتی رہا کرو۔ یعنی شلپا جس عورت کو حکم دے رہی تھی اس عورت نے کھانے اور دواؤں کے ساتھ وہ پرچی لکھ کر رکھ دی تھی۔ مجھ پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔

کون ہے وہ؟ اچانک کوئی ہمدرد ایسی جگہ کیسے پہنچ گئی جہاں اب تک میں نے صرف شلپا کو دیکھا اور سنا تھا۔ مسلح گارڈز ضرور ہوں گے لیکن میں نے ان گارڈز کے جوتوں کی آواز بھی نہیں سنی تھی۔

بہتر یہی ہوتا کہ میں چپ چاپ اسی طرح پڑا رہوں مجھے زیادہ سے زیادہ آرام کرنے کی ضرورت تھی۔ میں تھوڑی دیر بعد ہی سو گیا۔ دوسری طرف پولیس اور انٹیلی جنس کے علاوہ ”را“ کے تمام جاسوس ہمیں تلاش کر رہے تھے۔ انہیں اب تک یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ تابانی بھارت سے نکل کر دوبارہ پاکستان پہنچ گئی تھی۔ چند پولیس والوں کو سمندر کے ساحل کے پاس کشتیوں کے درمیان پوجا کی لاش ریت پر ملی تھی۔ ہمارے پاکستان سے آنے والے غدار گائیڈ اعظم نے پوجا کی لاش دیکھ کر بتایا۔ ”یہی وہ پوجا ہے‘ جو فرمان کو ہندی زبان سکھاتی تھی۔ تابانی اور فرمان ضرور یہاں سے فرار ہوئے ہیں۔“

لیکن لندن سے ڈاکٹر آمنہ نے کہا۔ ”میرا بیٹا پاکستان واپس نہیں آیا ہے۔ بھارت میں اسے گرفتار کر کے کہیں چھپایا گیا ہے اور ایسا ”را“ والے ہی کر سکتے ہیں۔“

”را“ والے قسمیں کھا رہے تھے کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا ہے بلکہ اب تک میری صورت بھی نہیں دیکھی ہے۔ وہ خود مجھے ڈھونڈ رہے ہیں لیکن وہ مجھ تک پہنچ نہیں پا رہے ہیں۔ انہوں نے تمام اخبارات کے ذریعے اعلان کیا تھا کہ میں دشمنوں کے خوف سے کہیں چھپا ہوا ہوں تو خود کو پولیس اور انٹیلی جنس والوں کے حوالے کر دوں۔ وہ مجھے گرفتار نہیں کریں گے۔ فوراً لندن میں ڈاکٹر آمنہ کے پاس پہنچا دیں گے۔

میری امی نے کہا۔ ”فرمان کو لندن نہ لایا جائے‘ اسے تلاش کر کے جلد سے جلد

پاکستان پہنچایا جائے۔"

شلپا کے سوا سب ہی پریشان تھے کہ میں کہاں گم ہو گیا ہوں۔ شلپا نے "را" والوں سے کہا۔ "تم سب کوئی چال چل رہے ہو۔ فرمان کو کہیں قید کر کے اس کی ماں کو ذہنی طور پر ڈسٹرب کر رہے ہو تاکہ میرے باپ کا دوسرا آپریشن کامیاب نہ ہو سکے۔"

شلپا کے بارے میں پچھلی بار یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اس کے باپ شمشیر سنگھ کالیا نے اپنی بیٹی سے مشابہت رکھنے والی لڑکی کو اپنی دولت سے خرید لیا تھا۔ مشابہت پہلے سے تھی لیکن اس نے پلاسٹک سرجری کے ذریعے مکمل طور پر اسے شلپا کا ہم شکل بنا دیا تھا۔ اس حسین لڑکی کا نام بینا مکرجی تھا۔ وہ بہت ذہین تھی۔ اس نے چند ماہ میں شلپا کی آواز اور لہجے میں بولنا سیکھ لیا تھا۔ اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے کی ایک ایک ادا کو اپنا لیا تھا۔ دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر کوئی پہچان نہیں سکتا تھا کہ دونوں میں سے اصل شلپا کون ہے؟

دونوں میں صرف ایک فرق تھا۔ اصل شلپا کے پیر میں زخم کا نشان تھا اور وہ ذرا سا لنگڑا کر چلتی تھی۔ بینا مکرجی کے پیر میں بھی ویسا ہی ایک زخم کا نشان بنا دیا گیا تھا اور وہ خود کو اصل شلپا ظاہر کرنے کے لیے اس کی طرح لنگڑا کر چلتی تھی لیکن تنہائی میں نہیں لنگڑاتی تھی۔

بینا مکرجی نے شلپا سے کہا۔ "دیدی! آپ نے مجھے اپنی تمام چال بازیاں سکھائی ہیں۔ آپ کی یہ چال بازی سمجھ میں نہیں آئی کہ فرمان کو قیدی بنا کر ڈیڈی کے ہونے والے دوسرے آپریشن میں کوئی خرابی کیوں پیدا کرنا چاہتی ہیں؟"

شلپا نے کہا۔ "ڈیڈی اب بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں تمام مافیا والے میرے کام سے خوش ہیں اور مجھے اپنے باپ کا صحیح جانشین کہتے ہیں۔ ان کا فیصلہ ہے کہ جب تک ڈیڈی چلنے پھرنے اور دوڑنے کے قابل نہیں ہوں گے' تب تک میں اپنے مافیا کے گروپ کے معاملات سے نمٹتی رہوں گی۔ ڈیڈی ایک جگہ بیٹھے بیٹھے اہم مشورے دیتے رہیں گے۔ جب مجھے بے تاج ملکہ بننے کا سنہری موقع مل رہا ہے تو پھر میں اپنے ڈیڈی کو آرام سے ایک جگہ بٹھا کر کیوں نہ رکھوں؟ میں اپنے ڈیڈی کی دشمن نہیں ہوں۔ دشمن ہوتی تو ڈاکٹر آمنہ سے علاج نہ کراتی۔ بس اتنا چاہتی ہوں کہ ایک آپریشن کامیاب رہے۔ ہڈیاں کسی حد تک جڑ جائیں۔ دوسرا آپریشن ناکام ہو۔ تیسرا آپریشن بھی اس حد تک کامیاب رہے کہ وہ وہیل چیئر پر بیٹھ کر اِدھر اُدھر آتے جاتے رہیں۔ اب ان کی مافیا میں گاڈ فادر نہیں گاڈ مدر ہوں اور گاڈ مدر کی حیثیت سے ہم دونوں حکمرانی کریں گے۔"

بینا مکرجی نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "دیدی! تم دل کی بہت اچھی ہو۔ بعض اولادیں تو تھوڑی سی دولت اور جائیداد کے لیے اپنے باپ کو قتل کر دیتی ہیں لیکن آپ ڈیڈی کو دل و جان سے چاہتی ہیں۔ انہیں بڑھاپے میں آرام سے ایک جگہ بٹھانا چاہتی ہیں۔ آپ کے اور ڈیڈی کے مجھ پر بھی احسانات ہیں۔ میں ایک غریب گریجویٹ تھی' ملازمت کے لیے ماری ماری پھرتی تھی۔ آپ نے مجھے اپنا ہم شکل بنا کر مجھے بھی بے تاج ملکہ بنا دیا ہے۔ میرے والدین اور بہن بھائی مجھے موجودہ صورت سے نہیں پہچانتے ہیں اور میں کبھی ان سے ملتی بھی نہیں ہوں لیکن وہ اچانک لکھ پتی بن کر عیش و آرام سے زندگی گزار رہے ہیں۔ میں تو ساری زندگی آپ ہی کے قدموں میں رہوں گی۔"

ایسا کہتے وقت دروازے کے پاس کوئی چیز گرنے کی آواز آئی۔ بینا مکرجی فوراً ہی اپنی جگہ سے اچھل کر ایک پستول نکالتے ہوئے دوڑ کر دروازے کے باہر آئی۔ شلپا بھی اس کے پیچھے لنگڑاتی ہوئی پہنچی۔ دروازے کے پاس فلاور اسٹینڈ سے ایک گلدان گر کر ٹوٹ گیا تھا۔

بینا نے کہا۔ "دیدی! تم کچن میں جا کر دیکھو' وہ کھانے پکانے والی ملازمہ کیا کر رہی ہے۔ میں باہر جا کر دیکھتی ہوں۔"

وہ دوڑتے ہوئے اس بنگلے کے مختلف حصوں سے گزر کر سیڑھیاں اترتے ہوئے بیرونی دروازے کے باہر آئی تو ایک کار احاطے کے باہر تیزی سے گزرتی دکھائی دی۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے پستول کو تھام کر نشانہ لیا لیکن ٹریگر دبانے سے پہلے ہی کار دور ہوتی چلی گئی۔ احاطے کی دیوار آڑے آ گئی تھی' فائرنگ کے نتیجے میں وہ کار محفوظ رہتی پھر وہ اتنی دور ہو گئی کہ گولی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

وہ دونوں پھر کمرے میں واپس آئے۔ شلپا نے کہا۔ "ملازمہ کچن میں مسالا پیس رہی ہے۔ کیا تمہیں کوئی نظر آیا؟"

"ایک کار میں کوئی تھا یا تھی۔ ایک کار گیٹ کے قریب سے جا رہی تھی۔ وہ کار شوٹنگ رینج سے باہر تھی اس لیے میں نے گولی نہیں چلائی۔"

اس دن سے وہ دونوں محتاط ہو گئیں۔ کوئی دشمن ان کے پیچھے لگا ہوا تھا اور اسے معلوم ہو گیا تھا کہ دونوں ہم شکل شلپا اس بنگلے میں ہیں۔ یہ خطرناک ہو سکتا تھا اگر وہ راز جاننے والا دشمن گرفت میں نہ آئے۔ ان دونوں نے اسی دن وہ جگہ چھوڑ دی۔ جہاں مجھے ایک کمرے میں قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ وہ شلپا کی سب سے محفوظ اور خفیہ جگہ تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ سینٹرل ممبئی میں ایک بڑا سا بنگلا ہے۔ اس کا مالک رتنم راؤ ایک بہت بڑا

بیوپاری' امریکا میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہے۔ سال دو سال میں ایک بار بھارت آتا ہے۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے بھی یہی جانتے تھے۔ "را" والوں نے ایک بار انکوائری کی تھی۔ "را" کے ایک ایجنٹ نے امریکا میں رتنم راؤ سے ملاقات کی تھی۔ ٹورنٹو میں اس کا ایک بہت بڑا جنرل دیکھا تھا جہاں بھارتی دستکاری کے آئٹم زیادہ فروخت ہوتے تھے۔

دراصل شمشیر سنگھ کالیا کا ایک معتمد خاص رتنم راؤ اس کے ایک ایجنٹ کے طور پر وہاں رہتا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ سینٹرل ممبئی کی کوٹھی میں آتا تھا۔ اس کے درمیانی حصے میں کوٹھی کے اندر ایک کوٹھی بنی ہوئی تھی۔ یعنی اس کوٹھی کے چاروں طرف کمرے اور کوریڈور تھے۔ ایک انجینئر نے بڑی مہارت سے ہر کمرے کی دیواریں یوں تعمیر کی تھیں کہ اندورنی حصے میں تین بڑے کمروں کی ایک کوٹھی بن گئی تھی۔ وہ خفیہ کوٹھی ساؤنڈ پروف تھی۔ کوئی جاسوس اس راز تک نہیں پہنچ پایا تھا۔ "را" والوں کو ذرا بھی شبہ ہوتا تو وہ اس اندرونی خفیہ کوٹھی تک ضرور پہنچتے پھر وہ تمام اہم راز کیسٹ اور دستاویزات کی صورت میں حاصل کر لیتے' جن کے ذریعے شلپا انہیں بلیک میل کر رہی تھی۔

میں اسی اندرونی خفیہ کوٹھی میں ایک قیدی کی حیثیت سے تھا۔ وہاں کی دیواروں پر سینما اسکرین کی طرح بڑے بڑے ٹی وی اسکرین' خود کار کھڑکیاں' دروازے اور جدید آلات تھے۔ میں وہاں بیڈ پر لیٹ کر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوٹھی کے اندر موجود خفیہ کوٹھی میں ہوں جہاں ہلکی آواز میں بولا جائے یا چیخیں ماری جائیں' تب بھی آوازیں اس ساؤنڈ پروف کوٹھی سے باہر نہیں جاسکتی تھیں۔

میں سوچتے سوچتے سو گیا۔ میرا مقصد آرام کرنا تھا لیکن شلپا سمجھ رہی تھی' میں اعصابی کمزوری کے باعث بے وقت سو رہا ہوں۔ وہاں تو وقت کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ اس کوٹھی کے اطراف میں جو کوٹھی بنی ہوئی تھی' وہاں کی روشنی سے تو یوں لگتا تھا جیسے باہر دن کا اُجالا ہے۔ ادھر کی روشنی اور ہوا اندرونی کوٹھی میں کیسے آتی تھی' یہ میں نہیں جان سکتا تھا۔ کسی بہت ہی ماہر انجینئر نے اسے بنایا تھا۔ اس کی تکنیک کو سمجھنا بہت دشوار تھا۔

پتا نہیں کیا وقت ہوا ہوگا۔ بیڈ کے سرہانے گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے کرخت آواز سن کر آنکھیں کھولیں۔ تھوڑی دیر تک اسی طرح پڑا رہا۔ سوچنے لگا' کہاں ہوں؟ فوراً ہی یاد آیا کہ وہاں قیدی بنا ہوا ہوں۔ اسی لمحے شلپا کی آواز سنائی دی۔ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "کیا اعصابی کمزوری تمہیں کروٹ بدلنے سے روک رہی ہے؟"

اس کی یہ بات سنتے ہی مجھے یاد آیا کہ مجھے کمزوری ظاہر کرنا چاہیے۔ میں نے کراہتے ہوئے آہستہ آہستہ کروٹ بدل کر بڑی سی اسکرین پر دیکھا۔ وہ ایک کرسی پر پاؤں رکھے بیٹھی مجھے توجہ سے دیکھ رہی تھی پھر بولی۔ "تم خاصے پریشان لگ رہے ہو؟"

میں ڈینگیں مارنے لگا۔ "تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں کبھی پریشان نہیں ہوتا۔ لوگ مجھے روبوٹ کہتے ہیں۔ میں اتنا طاقت ور ہوں کہ کوئی مجھے کمزور نہیں بنا سکتا۔ میرے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا جائے تب بھی میں روبوٹ رہوں گا۔"

وہ ہنسنے لگی۔ "تمہارے منہ سے کمزوری سے آواز نکل رہی ہے۔ ٹھیک طرح بول نہیں پا رہے ہو مگر ڈینگیں مار رہے ہو۔ ابھی شام کے پانچ بجے ہیں۔ تم دن کے گیارہ بجے کھانے کے بعد ایسے سو گئے تھے جیسے بے ہوش ہو گئے ہو۔ ابھی تمہیں جگایا نہ جاتا تو اسی طرح سوتے رہتے۔ جانتے ہو کیوں؟"

میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔ "اس لیے وقت بے وقت سو رہے ہو کہ تمہارے زخم اب اپنا اثر دکھا رہے ہیں۔ تم مانو یا نہ مانو' یہ تمہیں کمزور بنا رہے ہیں۔"

میں نے ایک ہاتھ کی کہنی بستر پر ٹکا کر اٹھنے کی کوشش کی پھر تکیے پر گر پڑا۔ وہ قہقہے لگانے لگی پھر بولی۔ "موت بڑے بڑے بلوانوں شہ زوروں کو مار ڈالتی ہے۔ ابھی تو یہ کمزوری ہے۔ یہی کمزوری ناقابلِ برداشت ہو کر موت بن سکتی ہے۔"

ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شلپا ریسیور اٹھا کر اسے کان سے لگا کر خاموش رہی۔ دوسری طرف کی آواز سنتی جا رہی پھر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ ایک موبائل فون سے رابطہ کیا پھر بولی۔ "ہیلو ڈیڈی! آپ نے مجھے یاد کیا؟"

وہ اپنے باپ کی باتیں سننے لگی پھر بولی۔ "او.......... ڈیڈی! آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ پہلا آپریشن کامیاب ہو چکا ہے۔ بھگوان نے چاہا تو دوسرا بھی کامیاب ہوگا۔ اگر آپ مجھے اپنے قریب رکھنا چاہتے ہیں اور گھبراہٹ محسوس کر رہے ہیں تو میں ایک نرس بن کر اسپتال میں آجاؤں گی۔ آپ کے قریب رہوں گی اور کسی کو شبہ نہیں ہوگا۔"

وہ دوسری طرف کی باتیں سن کر بولی۔ "آپ بے فکر رہیں۔ میں کل تک پہنچ جاؤں گی۔"

اس نے موبائل بند کر کے کسی اور سے رابطہ کیا پھر اس نے کہا۔ "رتنا دیوی کا پاسپورٹ لو اور اس کے نام سے لندن جانے والی فلائٹ میں ایک سیٹ ریزرو کرا لو۔ رتنا دیوی تمہیں ایرپورٹ پر ملیں گی۔"

اس نے موبائل بند کر کے میرے طرف دیکھا۔ "تمہیں دل ہی دل میں خوش ہونا چاہیے کہ میں ڈیڈی کے پاس لندن جا رہی ہوں۔"

میں نے کمزوری سے کہا۔ "تم کہیں بھی جاؤ لیکن مجھے شاید اس لیے کمزوری محسوس ہو رہی ہے کہ بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھاؤں گا تو کچھ توانائی محسوس کر سکوں گا۔"

"ابھی کھانا اور دوائیں ملیں گی۔ پرابلم یہ ہے کہ تم بستر سے اتر کر کھڑکی تک کیسے جاؤ گے؟"

میں بڑی تکلیف ظاہر کرتے ہوئے کروٹ بدل کر بستر کے سرے پر جھکتے ہوئے فرش پر پہلے ایک ہاتھ ٹیک کر پھر ایک پاؤں ٹیک کر پورا جسم فرش پر لے آیا پھر کمزوری سے ہانپتے ہوئے' فرش پر گھسٹتے ہوئے کھڑکی کے پاس آگیا۔ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "تمہارے جیسے شیر بھی پاپی پیٹ کی خاطر زمین پر.......... گھسٹتے ہیں۔ تمہیں بے بس اور مجبور دیکھ کر مجھے زندگی کی بہت بڑی خوشی مل رہی ہے کیونکہ آج تم بھی میرے ڈیڈی کی طرح پیروں سے چلنے کے قابل نہیں رہے ہو۔"

میں تھرتھراتا ہوا چھوٹی سی کھڑکی کا سہارا لیتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ ذرا سی دیر میں گھنٹی بجی۔ اس کے بعد کھڑکی کا خود کار پٹ اوپر اٹھ گیا۔ ایک ٹرے پر روٹیاں' سالن اور ایک کیپسول اور دو گولیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کاغذ کی ایک پرچی پر لکھا تھا۔ "کمزور ہو جانے کی بہت عمدہ اداکاری کر رہے ہو یہ دوائیں بھی تمہاری توانائی کے لیے ہیں۔ ایک آدھ گھنٹے بعد وہ ائرپورٹ چلی جائے گی پھر میں تمہاری رہائی کا راستہ بتاؤں گی۔ یہ پرچی یہیں چھوڑ دو۔"

میں نے پرچی وہیں چھوڑ دی۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ٹرے کو اٹھا کر وہیں بیٹھ گیا پھر کمزوری سے گہری گہری سانسیں لے کر تھوڑا سا پانی پیا۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ایک روٹی بہ مشکل کھائی جیسے کھایا نہ جا رہا ہو جبکہ اچھی خاصی بھوک لگی ہوئی تھی پھر میں نے پانی کے ساتھ پہلے ایک کیپسول پھر دو گولیاں کھائیں۔ وہ اسکرین پر مجھے دیکھ رہی تھی' خوش ہو رہی تھی۔ دوائیں کھانے کے بعد میں دونوں ہاتھ پاؤں سے بہ مشکل چلتا ہوا بیڈ کے پاس آیا۔ بڑی کوششوں سے اس پر چڑھ کر چاروں شانے چت ہوا اور بہت زیادہ تھکے ہوئے انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔

شلپا نے تھوڑی دیر تک انتظار کیا پھر آواز دی۔ "اے اٹھ! بڑا روبوٹ بنتا تھا۔ ذرا آنکھیں تو کھول۔"

میں نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے اس کی آواز میرے کانوں

تک نہیں پہنچ رہی ہو۔ وہ بڑبڑائی۔ "گیا کام سے۔"

پھر اس نے آواز دی۔ "بینا! آ جاؤ۔"

اگر میں آنکھیں کھولتا تو دیکھتا کہ وہ بینا کون ہے جسے وہ بلا رہی ہے۔ مجھے بالکل شلپا جیسی آواز سنائی دی۔ "جی دیدی! اب کیا کرنا ہے؟"

پھر شلپا کی آواز میں جواب سنائی دیا۔ "دواؤں کی دو خوراک نے اچھا خاصا اثر کیا ہے لیکن یہ پہلے سے بہت زیادہ زخمی ہے۔ ان زخموں کی وجہ سے بھی کمزوری ہو گئی ہے۔ کل صبح ناشتے کے ساتھ ایک اور خوراک دوا دو۔ اس کے بعد یہ ذرا بھی چلنے کے قابل نہیں رہے گا پھر ہمارے باڈی بلڈرز ماتحت اسے اپنے طور پر قابو میں لیں گے۔ میں جلد ہی واپس آنے کی کوشش کروں گی۔ اب چلو مجھے رتنا دیوی کا میک اپ کر کے یہاں سے جانا ہے۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ میں نے بند آنکھوں کے باوجود محسوس کیا کہ تمام لائٹس بجھا دی گئی ہیں۔ میں آنکھیں بند کیے سوچنے لگا۔ شلپا اپنے باپ کے پاس لندن جا رہی ہے۔ اس نے فون پر کسی سے کہا تھا کہ رتنا دیوی کے پاسپورٹ کے مطابق لندن کی ایک فلائٹ کی سیٹ ریزرو کرا لے اور ابھی کہہ رہی تھی کہ اسے رتنا دیوی کا میک اپ کر کے یہاں سے جانا ہے۔

یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ وہ اپنا چہرہ بدل کر رتنا دیوی بن کر لندن جا رہی ہے اور مجھے یہاں کسی بینا کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جا رہی ہے۔

وہاں ایک بڑی اسکرین تاریک ہو گئی تھی۔ اب کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس دوسرے کمرے کی سنگار میز کے سامنے شلپا بیٹھی اپنے چہرے پر تبدیلیاں کر رہی تھی اور بینا کو ہدایات دے رہی تھی کہ اس کی عدم موجودگی میں جب میں ذرا سی حرکت کرنے کے قابل نہ رہوں تو وہ میرے کمرے کا دروازہ کھول کر کم از کم چھ باڈر بلڈرز کو بھیج دے اور اب تک جو ویڈیو فلمیں تیار ہو چکی ہیں' وہ انہیں لا کر اسے دے۔ وہ ویڈیو فلمیں کسی وقت لندن میں کام آ سکتی ہیں۔ حالات کے کسی نازک موڑ پر ڈاکٹر آمنہ کو میری وہ فلمیں دکھا کر ان کی ممتا کو جھکنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

وہ تقریباً دو گھنٹے بعد میک اپ مکمل کر کے ایک اٹیچی کیس میں ضروری سامان لے کر تیسرے کمرے میں آئی۔ وہاں دیوار پر کئی ٹی وی سیٹ رکھے ہوئے تھے۔ ان سب کو آن کر کے دیکھا تھا۔ خفیہ کوٹھی میں جہاں وہ کھڑی تھی' اس سے منسلک چاروں طرف بنی ہوئی کوٹھی کے تمام کمرے اور کوریڈور نظر آ رہے تھے۔ وہ تمام حصے خالی رہا کرتے تھے

لیکن اس وقت وہاں "را" کے دو افسران اور چند پولیس والے نظر آ رہے تھے۔ کوٹھی کا مستقل چوکیدار کہہ رہا تھا۔ "صاب! ادھر پندرہ مہینے سے ہمارا مالک اور اس کا گھر والا لوگ نہیں آیا ہے۔"

ایک افسر نے کہا۔ "تقریباً تین گھنٹے پہلے یہاں فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ کیا تم نے گھنٹی کی آواز نہیں سنی تھی؟"

"ہم تو فون کی گھنٹی سنتا رہتا ہے مگر مالک نے بولا ہے' دروازہ کھول کر اندر مت جاؤ۔ ادھر کا فون سننے کا ہمارا ڈیوٹی نہیں ہے۔ آپ پولیس والا ہے اس لیے ہم نے ابھی کوٹھی کا دروازہ کھول دیا۔"

ایک افسر نے کہا۔ "یہاں ایک فون کال آئی اور یہاں سے فون کا ریسیور اٹھایا گیا تھا مگر ریسیور اٹھانے والا خاموش رہا تھا۔ دوسری طرف سے کسی نے کہا تھا۔ "لندن سے کہا گیا ہے کہ آپ کو انفارم کیا جائے۔ پلیز' آپ اپنے طور پر رابطہ کریں۔"

دوسرے افسر نے چوکیدار سے کہا۔ "تم اس کوٹھی میں تنہا ہو۔ ہم نے وہ کال سنتے ہی کوٹھی کے چاروں طرف جاسوس لگا دیئے تھے۔ ان کی رپورٹ ہے کہ کوٹھی ہمیشہ کی طرح خالی ہے۔ نہ کوئی اندر سے باہر آیا ہے اور نہ باہر سے اندر گیا ہے۔ صرف تم یہاں تھے۔ تمہارے سوا کوئی ریسیور اٹھا نہیں سکتا۔"

"تمہارے زبردستی بولنے سے ہم کیسا مان لے گا؟ ہم نے یہ فون کو ہاتھ نہیں لگایا۔ نہیں لگایا۔ نہیں لگایا۔ تم کو یقین ہوتا تو ہمارا یہ دونوں ہاتھ کو جیل میں بند کر دو مگر ہم کو چوکیداری کے لیے چھوڑ دو۔"

شلپا اور بینا نے کئی ٹی وی اسکرین کے ذریعے انہیں دیکھ کر سوئچ آف کر دیا۔ اس کمرے میں ایک چور راستہ تھا۔ شلپا نے اسے کھول کر کہا۔ "میں جا رہی ہوں' تم فرمان کا خیال رکھو۔ وہ ذرا بھی گڑبڑ کرے تو موبائل کے ذریعے تمام باڈی بلڈرز ماتحتوں کو بلا لینا۔ ویسے وہ میری واپسی تک مُردہ بنا رہے گا۔ میں ایک ہفتے کے اندر واپس چلی آؤں گی۔"

وہ بینا سے مصافحہ کر کے چور دروازے سے گزر کر تہہ خانے میں گئی۔ وہ چور دروازہ بند ہو گیا۔ شلپا چھوٹی سے اٹیچی اٹھائے تہہ خانے کی ایک سرنگ سے گزرنے لگی۔ وہ سرنگ تقریباً دو سو گز تک تھی۔ شلپا اس سرنگ سے نکل کر دوسرے تہہ خانے میں پہنچی۔ پھر سیڑھیاں چلتے ہوئے ایک چور دروازے تک آئی۔ اس دروازے کے ساتھ ایک چھوٹا ٹی وی اسکرین تھا۔ اس نے اسے آن کیا پھر چینل بدل بدل کر دیکھنے لگی۔ اسکرین پر ایک کوٹھی کے خالی کمرے اور کوریڈور وغیرہ نظر آ رہے تھے۔ اس کوٹھی کے

باہر کوئی چوکیدار بھی نہیں تھا۔

وہ چور دروازہ کھول کر ایک کمرے میں آئی پھر اس کوٹھی کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے پچھلے دروازے کے لاک کو ایک چابی سے کھول کر باہر آگئی۔ پچھلی گلی سنسان تھی۔ اس گلی سے گزر کر وہ ایک مین روڈ پر آئی پھر ایک طرف ٹیکسی میں بیٹھ کر ائرپورٹ کی طرف جانے لگی۔

میں کبھی دن کو سوتا نہیں تھا لیکن اس روز تقریباً پانچ گھنٹے تک سوتا رہا۔ مجھے جو کیپسول اور گولیاں کھانے کو دی گئی تھیں۔ ان کے اثر سے زخموں سے اٹھنے والی ٹیسیں ختم ہو چکی تھیں۔ میرے آرام سے سوتے رہنے کی یہی وجہ تھی۔

لیکن دن رات بستر پر گزارنے کی عادت نہیں تھی۔ بیماروں کی طرح ایک جگہ پڑا رہنا میری فطرت کے خلاف تھا۔ زیادہ سے زیادہ کمزوری ظاہر کرنے کی ایکٹنگ کرنا مشکل ہو گیا تھا کیونکہ کمزوری کے باعث غافل رہنے اور حرکت نہ کرنے سے بوریت بھی ہو رہی تھی اور جھنجلاہٹ بھی۔ یہ خیال بھی تھا کہ خفیہ ویڈیو کیمرے......... میری ایک ایک حرکت کی تصویریں اتار رہے ہوں گے۔

کھانا اور دوائیں سپلائی کرنے والی کھڑکی سے جو دوسری پرچی ملی تھی' اس میں لکھا تھا کہ شلپا ایک آدھ گھنٹے بعد چلی جائے گی پھر وہ اجنبی مددگار میری رہائی کا راستہ بنائے گی لیکن تین گھنٹے گزرنے کے بعد بھی میں بستر پر ساکت پڑا ہوا تھا۔ آخر میں نے سوچا' ویڈیو کیمروں کی ایسی کی تیسی' اب اِدھر سے اُدھر کروٹ لئے بغیر نہیں رہ سکوں گا بلکہ اٹھ کر بیٹھ جاؤں گا اور اس بیڈروم میں ٹہلنا شروع کر دوں گا۔

پھر میں نے یہی کیا۔ ایک کروٹ سے دوسری کروٹ لی۔ اس کے بعد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت میں نے ہلکی سی آواز سنی۔ سر گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ آواز اسی طرف سے آئی تھی۔ ایک بار نہیں دو بار ایسی آوازیں سنائی دی تھیں۔ جیسے ڈبل ڈور میں سے پہلے لوہے کے دروازے کے لاک اور پھر لکڑی کے دروازے کے لاک کو کھولا گیا ہو۔

میرے دماغ نے کہا۔ "دھوکا' مجھے جسمانی طور پر بالکل ہی لاغر سمجھ کر شلپا کے باڈی بلڈرز آ رہے ہیں۔"

میں بیڈ سے اتر کر دروازے کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ میں کئی گھنٹوں تک بستر پر پڑا رہا تھا اور اب دروازے کے پیچھے آکر انتظار کرنے لگا۔ انتظار ہی انتظار۔ کوئی کمبخت نہیں آ رہا تھا۔

پھر دیوار پر وہ بڑا سا اسکرین روشن ہو گیا۔ وہاں میں شلپا کو دیکھ کر چونک گیا وہ کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھی اور پوچھ رہی تھی۔ "تم دروازے کے پیچھے کیوں کھڑے ہو؟"

"میں تمہاری چالاکی سمجھتا ہوں۔ مجھے اعصابی کمزوری میں مبتلا سمجھ کر اپنے آدمیوں کو بھیج رہی ہو۔ میں نے دروازوں کے لاک کھلنے کی آوازیں سنی ہیں۔"

"تم بولتے جا رہے ہو' میں سنتی جا رہی ہوں اور اِدھر سے اُدھر ٹہلتی جا رہی ہوں۔ کیا تم نے مجھ میں کوئی نمایاں تبدیلی دیکھی ہے؟ میں تمہیں زیادہ نہیں الجھاؤں گی۔ ذرا دیکھو میری چال میں ایک ذرا سی بھی لنگڑاہٹ نہیں ہے۔"

میں نے اسے توجہ سے دیکھا۔ "پہلے تم لنگڑا رہی تھیں۔"

"وہ میں نہیں تھی۔ اصلی شلپا تھی۔ میں شلپا کی ڈمی ہوں۔ وہ شلپا ابھی ائرپورٹ پر گئی ہے۔ لندن سے تین یا چار دنوں سے پہلے نہیں آئے گی۔ تم نے دروازے کھلنے کی آوازیں سنی تھیں۔ میں ہی انہیں کھول کر یہاں آئی ہوں۔ یہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "پہلے تو دماغ یہ تسلیم نہیں کر رہا ہے کہ تم شلپا نہیں ہو۔ یہاں اب جو کچھ ہو رہا ہے' میری توقع کے خلاف ہو رہا ہے۔"

"تمہیں یقین آ جائے گا۔ دروازے کو ہاتھ لگاؤ۔ دونوں دروازے کھلے ہیں۔ یہ اطمینان کر لو کہ یہاں کوئی تیسرا نہیں ہے۔ دروازے کے باہر ایک ہی کوریڈور ہے۔ اس کوریڈور سے گزرو گے تو میرے ہی اس کمرے میں آؤ گے۔"

میں اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ "اگر میں شلپا ہوں تو کیا' میں تمہارے ہاتھوں مرنے کے لیے یہاں اپنے پاس بلا رہی ہوں؟ آؤ۔ آ جاؤ.........."

میں نے بڑی احتیاط سے دروازے کو کھولا۔ پہلے لکڑی کے دروازے کو پھر لوہے کے دروازے کو' اس کے دوسری طرف کوریڈور تھا۔ وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ جو شلپا کی طرح نظر آ کر خود کو اس کی ڈمی کہہ رہی تھی' مجھے اس کی باتوں پر بھروسا کرنا چاہیے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ وہاں دو ہی عورتیں تھیں اور تیسرا میں تھا۔ اب ایک جا چکی تھی۔ یہ مان لینا چاہیے کہ ہم دو ہی ہیں' تیسرا کوئی نہیں ہے۔

پھر یہ کہ شلپا مجھ سے خوف زدہ تھی۔ مجھے قابو کرنے کے لیے پہلے بے حد کمزور اور لاغر دینا چاہتی تھی اور یہ مجھے اپنے پاس بلا رہی تھی۔ میں کوریڈور سے گزرتا ہوا ایک دروازے کے سامنے آیا۔ اس پر دستک دینے کے لیے ہولے سے ہاتھ مارا تو وہ کھل گیا۔ اندر وہی کمرا تھا' جسے میں ایک بڑی اسکرین پر دیکھتا رہا تھا۔

شلپا نے میرے قریب آتے ہوئے کہا۔ "کوئی موت کی طرف نہیں جاتا اور نہ اسے اپنے گھر بلاتا ہے۔ مجھے دشمن سمجھ کر مار ڈالنے سے پہلے انہیں پڑھ لو۔"

اس نے مجھے کاغذ کی وہی دو پرچیاں دیں' جنہیں میں نے کھانے والی کھڑکی میں پڑھ کر وہیں چھوڑ دیا تھا۔ میں نے انہیں دوبارہ پڑھ کر شلپا کو حیرانی سے دیکھا۔ وہ بولی۔ "میں نے ہی دوائیں بدل دی تھیں۔ ایسا نہ کرتی تو تم ابھی اپنے کمرے میں ایک لاش کی طرح پڑے رہتے۔"

"میں مانتا ہوں۔ مجھے دھوکے سے نیم مردہ کر دیا جاتا۔ تم نے مہربانی کی ہے مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ مجھے بھی ایک ایسے مہربان کی ضرورت ہے جو پہاڑوں سے ٹکرا جاتا ہو۔"

"تم سر سے پیر تک شلپا نظر آ رہی ہو مگر حقیقتاً کون ہو؟"

"میرا نام بینا ہے۔ بینا مکرجی۔ بہت ہی غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ گریجویشن کے بعد ملازمت تلاش کرتی رہی۔ یہ خوب صورتی ایک بلا ہے۔ ایک مصیبت ہے۔ بڑے بڑے دولت مند ملازمت تو نہیں دیتے تھے مگر داشتہ بنا کر رکھنے کے لیے ہزاروں روپے دینے کو تیار تھے۔"

وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ "کل سے تمہارے زخموں کی مرہم پٹیاں نہیں ہوئی ہیں تم بیٹھو۔ میں مرہم پٹی کرتی رہوں گی اور اپنی رام کتھا بھی سناتی رہوں گی۔"

میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ وہ فرسٹ ایڈ بکس لا کر میری پٹیاں کھولتے ہوئے بولی۔ "ایک دن شلپا اور شمشیر سنگھ کالیا سے میرا سامنا ہو گیا۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر چونک گئے کیونکہ میں دور سے بالکل شلپا جیسی لگتی تھی۔ قریب آنے پر چہرے کا تھوڑا سا فرق نمایاں ہوتا تھا۔ ان دونوں نے میرے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا' میرے بوڑھے ماں باپ اور بہن بھائی ہیں۔ ان سب کا پیٹ پالنے کے لیے ملازمت تلاش کر رہی ہوں۔"

وہ پچھلی پٹیاں اتار کر زخموں کو صاف کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "کالیا نے مجھ سے پوچھا۔ اگر تمہیں اس شرط پر دولت مل جائے کہ تم کبھی اپنے ماں باپ اور بہن بھائی سے نہ ملو تو کیا ہماری ملازمت کرو گی؟ میں نے کہا۔ میں دولت کے لیے غیر قانونی کام بھی کر سکتی ہوں لیکن اپنی آبرو کو داؤ پر نہیں لگاؤں گی۔ شلپا نے کہا تم بڑی حد تک میری ہم شکل ہو۔ پلاسٹک سرجری کے ذریعے پوری طرح تمہیں میری ہم شکل بنا دیا جائے گا۔ میرے ڈیڈی تمہیں میری طرح بیٹی بنا کر رکھیں گے اور ایک بات یاد رکھو۔ عورت کے اندر

حوصلہ ہو تو کوئی مرد اس کی آبرو سے نہیں کھیل سکتا۔ ویسے تمہیں آبرو کے دشمن بہت ملیں گے۔ ان سے بچ کر رہنا تمہارا کام ہے۔ ہم بھی تمہاری حفاظت کریں گے لیکن تمہیں ایک مجرمانہ زندگی گزارنی ہو گی۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔ "غریبی اور محتاجی نے اس قدر بے زار کر رکھا تھا کہ میرے آگے دو ہی راستے رہ گئے تھے۔ ایک تو یہ کہ خود کو بیچ ڈالوں یا خودکشی کر لوں۔ کالیا نے میرے گھر والوں کے لیے ایک کوٹھی اور کار خرید کر دی۔ ہر ماہ انہیں پچاس ہزار بھیج رہا ہے۔ میں نے فون کے ذریعے ماں باپ سے کہہ دیا تھا کہ کچھ لوگ زندہ رہ کر دولت کمارہے ہیں۔ ان کی بیٹی مرنے کے بعد اتنی دولت کما رہی ہے۔ مرنے کے بعد میں کبھی خاندان والوں کو نظر نہیں آؤں گی لیکن میری طرف سے انہیں دولت ملتی رہے گی۔"

وہ نئے سرے سے دوائیں لگا کر پٹیاں باندھتے ہوئے بتانے لگی کہ وہ شلپا کے ساتھ رہ کر اس کی آواز لہجے' اس کے اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے کے انداز کی اور اس کے تمام اسٹائل کی نقل کرنے لگی۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں وہ اسٹیج ڈرامے کرتی تھی اور بہترین نقال کہلاتی تھی۔ اس نے بہت جلد شلپا کی تمام عادات سیکھ لیں۔ اس عرصے میں پلاسٹک سرجری کے ذریعے اسے شلپا کا بالکل ہم شکل بنا دیا گیا تھا۔

میں نے کہا۔ "انہوں نے تم پر بہت سے احسانات کیے۔ تمہارے ماں باپ اور بہن بھائی دولت مند کہلا رہے ہوں گے۔ تم بھی دولت سے کھیل رہی ہو پھر اپنے مہربانوں کو دھوکا دے کر اپنے دشمن سے مہربانی کیوں کر رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "حالات جیسے جیسے بدلتے ہیں' تجربات بھی ان کے مطابق بہت کچھ سکھاتے رہتے ہیں۔ جب تم لندن میں تھے تو میں بھی شلپا کے ساتھ گئی تھی۔ اس وقت میں چہرے پر عارضی میک اپ کر لیتی تھی تا کہ شلپا سے الگ نظر آؤں۔ اس روز شلپا نے کہا.........
تم ڈیڈی کے پاس جاؤ۔ میں فرمان نامی ایک پرانے دشمن کو ٹریپ کرنے جا رہی ہوں۔ اس کی ہدایت کے مطابق میں کالیا کے ایک پرائیویٹ بنگلے میں آ گئی۔"

وہ گیلے تولیے سے میرا چہرہ اور بدن کے دوسرے حصوں سے خون صاف کرتے ہوئے بولی۔ "تمہیں بے ہوش کر کے یہاں لانے والے تمہارا ایک سفری بیگ بھی لائے تھے۔ اس میں تمہارے کپڑے ہیں۔ چینج کر لو۔"

"میں ابھی چینج کر لوں گا۔ تم اپنی روداد جاری رکھو۔"

"میں کہتی رہوں گی۔ تم سنتے رہو گے مگر ابھی باتھ روم میں جا کر لباس تبدیل کرو۔

ہمارے پاس وقت بہت ہے لیکن اگلے پل کیا ہو جائے' یہ کوئی نہیں جانتا۔ فلائٹ کینسل ہونے کے بعد شلپا واپس یہاں آ سکتی ہے۔"

میں لباس لے کر باتھ روم میں آیا لیکن دروازے کو تھوڑا سا کھلا رکھا تا کہ اس کی باتیں سنتا رہوں۔ وہ دروازے کے قریب دیوار سے لگ کر بولنے لگی۔ "میں کالیا کے پاس آئی تو اس نے کہا۔ تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا' یہ کون سی نئی بات ہے۔ آپ تو بچپن سے شلپا کو دیکھتے آ رہے ہیں۔ وہ بولا۔ شلپا کی بات چھوڑو وہ تو میری بیٹی ہے۔ تم تو جوانی میں ملی ہو۔ وہ میرے خون سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کا بدن الگ اور تمہارا الگ ہے۔ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ میں آپ کو ڈیڈی کہتی ہوں۔ آپ سب کے سامنے مجھے بیٹی کہتے ہیں۔ اس نے ہنستے ہوئے ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔"

میں لباس بدل کر باتھ روم سے باہر آیا۔ وہ دیوار سے لگی خلا.......... میں تک رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "جب میں غریب تھی۔ ماں باپ اور بہن بھائی کے ساتھ فاقے کرتی تھی' تب بھی دولت مند میرے حسن و شباب کی قیمت لگاتے تھے۔ میں نے ایسی بری حالت میں خود کو فروخت نہیں کیا۔ میری نیک نیتی کو میرا بھگوان سمجھتا تھا۔ اس نے ایسے وقت میری مدد کی۔ اچانک کالیا کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ اس کا بہت ہی پرائیویٹ فون تھا۔ اسے اٹینڈ کرنا ضروری تھا۔ اس نے مجھے چھوڑ کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے کسی نے کہا۔ "سر! ہمارے ہاتھ سنہری موقع آیا ہے۔ آپ کا بدترین دشمن امیر حمزہ ہماری نظروں میں ہے۔"

کالیا نے پوچھا۔ "کہاں سے بول رہے ہو؟"

"میں ہائیڈ پارک میں ہوں۔ حمزہ ایک اوپن ائر ریسٹوران میں تنہا بیٹھا ہوا ہے۔"

"تمہاری آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہی ہیں؟"

"سر! میں آپ کے ایک ایک دشمن کو اندھیرے میں بھی پہچان سکتا ہوں۔ آپ ابھی آ جائیں گے تو راستے کا بہت بڑا کانٹا بھی ہٹ جائے گا اور خفیہ ہاتھ آپ کا لوہا ماننے لگے گا۔"

"بے شک یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا۔ ابھی آ رہا ہوں۔ تم اس پر نظر رکھو۔"

بینا مکرجی عرف شلپا اسے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "حمزہ صاحب تو خفیہ ہاتھ کے دماغ کا پھوڑا ہیں۔

کالیا اسی لیے انہیں قتل کرنے گیا تھا۔ تمہاری روداد کا یہ حصہ' میری روداد سے ملتا ہے۔
ادھر کالیا تمہاری عزت سے اس وقت نہ کھیل سکا اور اس کی بیٹی شلپا مجھے ٹریپ کرنے
کے باوجود مجھے اپنا قیدی نہ بنا سکی۔ یہ بتاؤ کہ کالیا کے جانے کے بعد تم فرار ہو سکتی تھی۔
کیا تم نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی؟"

"کیسے کرتی؟ میں ان باپ بیٹی کے ساتھ رہ کر دیکھ چکی تھی کہ لندن کے ہر علاقے
میں ان کے آدمی موجود ہیں۔ کالیا نے بھی جاتے ہوئے دھمکی دی تھی کہ میں جہاں جاؤں
گی' وہاں مجھے گولی مار دی جائے گی اور اگر میں نے شلپا کو اس کے باپ کی بدنیتی کے
بارے میں بتایا تو اس کے آدمی بھارت میں میرے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو گولیوں سے
چھلنی کر دیں گے۔ تم بتاؤ فرمان! ایسے وقت میں کیا کرتی؟ کیا اپنے ساتھ اپنے تمام خون
کے رشتوں کو بھی مرنے کے لیے چھوڑ دیتی؟"

"ہاں ایسے وقت عورت رونے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی۔"

"لیکن میں کبھی نہیں روتی۔ حالات نے مجھ سنگ دل بنا دیا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا'
جب غربت اور محتاجی کے زمانے میں اپنی آبرو سلامت رکھی تو اب کیوں نہیں رکھ سکتی؟
میں اس وقت خودکشی کرتی تو میرے ماں باپ اور بہن بھائی بھی دربدر ہو کر مر جاتے۔
اب بھی مریں گے تو کیا فرق پڑے گا لیکن اب میں کالیا کو مار کر مروں گی۔"

میں نے کہا۔ "بینا! یہ عجیب بات ہے۔ جسے تم مارنے کے انتظار میں تھیں۔ اسی شام
میں نے اس کے دونوں گھٹنوں کی ہڈیاں توڑ دی تھیں اور اس کی بیٹی کی ایک ٹانگ زخمی کر
دی تھی۔"

وہ میرے قدموں میں جھک کر میرے پیروں کو چھونے لگی۔ میں نے اس کے
بازوؤں کو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا کر رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "یہ ہمارا دھرم ہے۔ ہم اپنے دیوتا کے' اپنے محسن کے پاؤں چھوتے ہیں۔
آپ نے انجانے میں میری عزت بچائی ہے۔ اس دن سے آج تک کالیا میرے سامنے
آنے کے قابل نہیں رہا۔ اب وہ تمہاری ڈاکٹر ماں کے رحم و کرم پر ہے۔ میں بھگوان سے
پرارتھنا کرتی رہتی تھی کہ کبھی میں تم ماں بیٹے کے کام آؤں۔ آج بھگوان نے میری سن
لی۔ بس اب دیر نہ کرو۔ یہاں سے نکل چلو۔"

میں نے ایک سفری بیگ اٹھایا۔ اس نے پہلے سے اپنے ضروری سامان کی اٹیچی
اٹھائی پھر رک گئی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"کیا تم لوہے کی تجوری کاٹ سکتے ہو؟"

"کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ کچھ آلات کی ضرورت پڑے گی مگر تجوری کیوں کاٹی
جائے؟ کیا رقم کی ضرورت ہے؟"

اس نے ایک آہنی سیف کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ ہے تجوری۔ دونوں باپ بیٹی
مجھے اپنا ہمراز بناتے ہیں لیکن اس تجوری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں یقین سے کہہ
سکتی ہوں' اس میں وہ کیسٹ اور تحریری دستاویزات ہیں جن کے ذریعے شلپا "را" والوں
کو بلیک میل کر رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اوگاڈ! اس تجوری میں اتنی اہم چیزیں موجود ہیں اور ہم انہیں بھول
کر جا رہے تھے۔" میں نے آئرن سیف کے قریب آکر اس کا جائزہ لیا پھر کہا۔ "اسے ڈبل
لاک کے علاوہ مخصوص نمبرز سے بھی لاک کیا گیا ہے۔"

"تیسرے کمرے کے اسٹور میں مختلف قسم کا سامان پڑا ہے۔ تم دیکھو' شاید کوئی کام
کی چیز مل جائے۔"

میں اس کے ساتھ تیسرے کمرے میں آیا' جہاں دیوار پر کئی ٹی وی رکھے ہوئے
تھے۔ بینا نے ایک اسٹور روم کے دروازے کو کھول کر وہاں کا بلب روشن کیا۔ وہاں بڑا
کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ میں غیر ضروری سامان ہٹا ہٹا کر دیکھنے لگا۔ تجوری میں جہاں لاک
لگائے گئے تھے' اس چھوٹے سے حصے کو کاٹا جاتا تو تمام لاک اپنی جگہ رہ جاتے اور تجوری
کا پٹ کھل جاتا۔

مجھے کچھ ایسی چیزیں ملیں لیکن ضرورت کی کئی چیزیں نہیں تھیں پھر بھی جو کچھ ہاتھ
لگا' میں ایک دوسرے کو ان سے منسلک کر کے تجوری کے پاس آیا پھر سوئچ بورڈ سے پلگ
لگا کر لوہا کاٹنے والے آلے کو تجوری سے لگایا تو چنگاریاں اُڑنے لگیں۔ تجوری کے پٹ پر
ہلکا سا سوراخ ہو گیا پھر اس آلے کو پوری قوت سے پٹ پر دبا کر تمام لاک کے اطراف
لوہے کو کاٹنے لگا۔ تجوری کا لوہا بہت موٹا تھا اور میں لوہار تھا۔ لوہے سے ہار نہیں مان سکتا
تھا۔ بڑی محنت کے بعد لاک کیے ہوئے حصے کو کاٹ دیا پھر پلگ کو سوئچ سے الگ کر دیا۔
تجوری کے سامنے آکر اس کے پٹ کو ایک لات ماری تو وہ اندر خانوں سے ٹکرا کر باہر کی
طرف کھل گیا۔

بینا نے خوش ہو کر تالی بجانے کے انداز میں کہا۔ "تم نے تو کمال کر دیا۔ اتنی موٹی
مضبوط لوہے کی تجوری کھول دی۔"

وہ قریب جا کر اس کے اندر سے کئی کیسٹ اور کئی ٹاپ سیکرٹ فائل نکالنے لگی۔
میں اسے اپنے سفری بیگ اور اس کی اٹیچی میں رکھنے لگا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ انہیں پڑھ

کر ان کی اہمیت کو سمجھا جا سکے۔ تجوری میں ڈالرز' پاؤنڈز انڈین کرنسی بھی تھی۔ وہ سب ہم نے رکھ لیں۔ ہمیں اپنی منزل کا پتا نہیں تھا کہ وہاں سے نکل کر پہلے کہاں جانا ہے ویسے بھی جہاں جانا ہو' وہاں رقم کی ضرورت پڑتی ہی ہے۔

ہم وہاں سے نکل کر چور دروازے کے پاس آئے۔ اسے کھول کر تہ خانے والی سرنگ میں پہنچے۔ بینا نے اس سرنگ سے گزرتے ہوئے کہا۔ "ہم یہاں سے دوسری کوٹھی میں پہنچیں گے۔ یہاں سے فرار ہونے میں زیادہ دشواری نہیں ہو رہی ہے لیکن آگے پرابلم ہیں۔"

"کیسے پرابلم؟"

"تمہارے سر اور چہرے پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ شلپا کے ماتحتوں سے سامنا ہو گا تو وہ تمہیں پہچان لیں گے۔ جب تم بے ہوش تھے تو شلپا نے تمہارے چہرے کا میک اپ اتار دیا تھا۔ اب "را" والے بھی تمہیں دیکھتے ہی پیچھے پڑ جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "اپنے بارے میں بھی سوچو۔ تم بالکل شلپا کی طرح ہو۔ جبکہ تمہیں شلپا نظر نہیں آنا چاہیے۔ "را" والے بھی تمہاری یعنی کہ شلپا کی تلاش میں ہوں گے۔"

"میری اٹیچی میں ریڈی میڈ میک اپ ہے۔ کسی ہوٹل کے کمرے میں یا کسی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کا موقع ملے گا تو میں چہرے پر تھوڑی سے تبدیلی کر لوں گی۔ تم اپنے بارے میں سوچو۔ مشکل یہ ہے کہ ہم سنٹرل ممبئی میں ہیں اور چند گھنٹے پہلے پولیس اور "را" والے اس کوٹھی تک پہنچ گئے تھے۔ یہ اندیشہ ہے کہ وہ انہی اطراف میں ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے۔"

ہم اس سرنگ کے ذریعے دوسری کوٹھی پہنچ گئے۔ اس نے کہا۔ "ہم اس کوٹھی سے تقریباً دو سو گز دور آ گئے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا ہم یہاں رک نہیں سکتے۔ کم از کم تم اپنا چہرہ تبدیل کر کے باہر جا کر میرے لیے میک اپ کا سامان لا سکو گی؟"

"نہیں فرمان! یہاں رُکنے سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میرا اندیشہ درست ہو سکتا ہے۔ بھگوان نہ کرے' فلائٹ کینسل ہو گئی یا اور کوئی بات ہو گئی تو شلپا ادھر آ سکتی ہے اور ہو سکتا ہے' وہ اکیلی نہ آئے۔ میں نہیں چاہتی کہ تم اس قدر زخمی ہونے کے بعد اس کے بدمعاش ماتحتوں سے مقابلہ کرو۔"

"میں تو چاہتا ہوں کہ ان بدمعاشوں سے سامنا ہو' جنھوں نے بے قصور پوجا کو ہلاک کر دیا۔ میں ان میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"ان قاتلوں سے انتقام لینے کا موقع میں دوں گی لیکن ایسی حالت میں نہیں۔ میری بات مان کر صرف زخم بھرنے کا انتظار کرو۔ میں سب کو جانتی ہوں۔ سب کو تمہارے سامنے لاؤں گی۔"

"میں تمہاری بات مان لیتا ہوں لیکن میں اپنے اصلی چہرے کے ساتھ ہوں۔ میرے لیے باہر بھی خطرہ ہے اور اندر بھی پھر ایسے میں یہاں رکنے کا خطرہ کیوں نہ مول لوں؟ تم فوراً ریڈی میڈ میک اپ کرو اور باہر جا کر میرے لیے میک اپ کا ضروری سامان لاؤ اور دیکھو' اتنی ساری پٹیاں باندھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر زخم پر چھوٹی چھوٹی کراس پٹیاں چپکا دی جائیں گی۔ بس تم جلدی جاؤ اور جلدی واپس آنے کی کوشش کرو۔"

میں نے اسے جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ چلی گئی۔ میں نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ میں نے ایک بلب بھی آن نہیں کیا۔ گہری تاریکی میں دیوار سے لگ کر کھڑا رہا۔ کسی کو آنا تو نہیں چاہیے تھا۔ شلپا نے بھی اگر فلائٹ مس کر دی تو اسے یہیں واپس آنا تھا مگر وہ بھی نہیں آئی تھی۔

ٹھیک ہے' وہ نہیں آئی تھی۔ اس کے ماتحت بھی نہیں آئے تھے۔ میرے دشمنوں میں سے کوئی نہیں آیا تھا لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ موت نہ آنے کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ شامت بھی نہ آئے؟

☆======☆======☆

الیکشن کا دن تھا۔ ملک کے ہر علاقے میں ووٹ ڈالے جا رہے تھے۔ پولیس اور فوج کے سخت انتظامات تھے۔ تاکہ مختلف پارٹیاں ایک دوسرے کے خلاف اپنی اپنی طاقت کا غیر قانونی مظاہرہ نہ کر سکیں۔

عام طور پر سیاست میں دلچسپی نہ لینے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ان سے کہا جائے کہ بھئی ہر بالغ فرد کو ووٹ ڈالنا چاہیے۔ یہ ایک قومی فرض ہے تو ایسے بیزار لوگوں کا جواب ہو گا کہ ووٹ ڈالنے کا انجام پچاس برسوں میں کیا ہوا ہے؟ آدھی صدی گزرنے کے بعد بھی کرپٹ سیاست داں' حکمران بن کر آتے ہیں۔

ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ووٹ نہ ڈالنے سے کیا نقصان ہوتا ہے۔ ایک علاقے میں اگر دس لاکھ ووٹرز ہیں اور ان میں سے صرف ایک لاکھ افراد ووٹ ڈالتے ہیں تو باقی نو لاکھ ووٹ کہاں جاتے ہیں؟ نو لاکھ ووٹ کا حساب خفیہ ہاتھ کے پاس ہوتا ہے۔ جس کو اقتدار دلانا ہوتا ہے اور اس کا مطلوبہ امیدوار بیس پچیس ہزار ووٹوں سے ہارنے والا ہوتا ہے تو باقی نو لاکھ ووٹ نہ دینے والے افراد کے پچاس ہزار ووٹ ہارنے والے

کے کھاتے.......... میں پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح خفیہ ہاتھ کی جیت ہوتی ہے اور ووٹ نہ ڈالنے والوں کو خبر تک نہیں ہوتی کہ ان کے ووٹوں سے ایک کرپٹ امیدوار جیت کر اسمبلی میں پہنچ گیا ہے۔

یہی سیاست کہلاتی ہے کہ الیکشن کرانے والوں کے پاس پہلے ووٹرز کی لسٹ ہوتی ہے کہ کتنے لاکھ یا کتنے کروڑ ووٹرز ہیں لیکن خفیہ ہاتھ کے پاس ان ووٹرز کا حساب ہوتا ہے کہ کتنے لاکھ افراد ووٹ نہیں ڈال رہے ہیں اور جو ووٹ ڈالنے نہیں آرہے ہیں' ان کے ووٹوں کی پرچیاں الیکشن کے آخری وقت شام تک یعنی ووٹوں کی گنتی سے پہلے مہرشدہ بکس میں پہنچ جاتی ہیں۔

اس طرح ووٹ نہ ڈالنے والے انجانے میں خفیہ ہاتھ کو اس کے مقاصد میں کامیاب بناتے رہتے ہیں۔

دنیا کا سب سے بڑا جوا الیکشن ہے۔ الیکشن کی بازی کھیلنے والا یا تو پورا ملک جیت جاتا ہے یا آدھی قوم کا اعتماد ہار جاتا ہے اور یہ واحد جوا ہے جسے صرف سرمایہ دار یا جاگیردار کھیلتے ہیں۔ کوئی وطن پرست اور قوم پرست اور ذہین مگر غریب یہ بازی کبھی کھیل نہیں پاتا۔

شام کو جب ووٹ ڈالنے کا وقت ختم ہوگیا تو ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے اعلان ہونے لگے کہ تمام رات قوم کو ہنسی مذاق اور ناچ گانوں کا رنگا رنگ پروگرام دکھایا جائے گا اور ملک کے جتنے انتخابی علاقوں کے نتائج موصول ہوتے جائیں گے' وہ نتائج عوام کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔ گویا دوسرے دن صبح یا دوپہر تک معلوم ہونے والا تھا کہ کون سی پارٹی زیادہ ووٹ حاصل کرکے سب پر سبقت لے گئی ہے۔

ایسے وقت میں پوری قوم نتائج کی منتظر رہتی ہے لیکن وردانہ بیگم کو انتظار نہیں تھا۔ وہ الیکشن کا آخری نتیجہ آنے سے پہلے ہی اپنے خاص ٹیلرماسٹر سے اپنا وہ خاص لباس تیار کرا چکی تھی جسے پہن کر وہ حکمران کی حیثیت سے اسمبلی میں جاکر حلف اٹھانے والی تھی۔ اس کی خاص بیوٹیشن اور ہیر ڈریسر وغیرہ اپنے تمام ضروری سامان کے ساتھ محل میں آکر بیٹھی ہوئی تھیں۔

دوسری طرف نیک بخت کو بھی جیتنے کی امید تھی لیکن وہ بے چین سا تھا۔ خفیہ ہاتھ سے اس کا رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا سیکرٹری بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ صاحب دوسرے سیاسی معاملات میں مصروف ہیں۔ یہ ایک طرح کا سگنل تھا کہ خفیہ ہاتھ اس کی حمایت نہیں کر رہا ہے۔ رات کے دو بجے الیکشن کے نتائج سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کئی علاقوں

سے جیت رہا ہے لیکن دو بجے کے بعد بازی پلٹنے لگی۔ وردانہ بیگم کی حمایت میں ڈالے ہوئے ووٹوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ صبح تک وہ دگنی تعداد سے نیک بخت پر سبقت لے جانے لگی۔

نیک بخت غصے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے آس پاس بیٹھے ہوئے مشیر اور قابلِ اعتماد سیاست داں سب ہی مایوس ہو گئے تھے۔ ایک مشیر نے کہا۔ ”سر! میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وردانہ اپنے خاوند کی قربانی دے کر ایک مظلوم بیوہ بن کر عوام کی حمایت حاصل کر رہی ہے اور اب تک ایسے بیانات دیتی آرہی ہے جیسے اس کے اپوزیشن پارٹی والوں نے یعنی کہ ہم نے اس کے شوہر کاشف اکبر کا قتل کرایا ہے۔“

نیک بخت غصے میں ٹہل رہا تھا۔ اس نے جھنجلا کر کہا۔ ”وردانہ کی اس زبردست چال کا جواب امیر حمزہ اور راجہ نواز دے سکتے تھے لیکن وہ کئی دنوں سے غائب ہیں جیسے کسی مجبوری کے باعث وہ روپوش ہو گئے ہوں یا خفیہ ہاتھ کی ایجنسیوں نے ان دونوں کو بھی کہیں ٹھکانے لگا دیا ہو۔“

ایک سیاست داں نے کہا۔ ”حمزہ اور راجہ ہمیشہ ناقابلِ شکست رہے۔ وہ بڑے چالاک اور معاملہ فہم ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے' انہوں نے کچھ سوچ سمجھ کر روپوشی اختیار کی ہے۔“

دوسرے مشیر نے کہا۔ ”وہ دونوں موجود ہوتے' تب بھی ہمیں فائدہ نہ پہنچتا۔ وہ دونوں ہماری بھی پارٹی کے خلاف تھے۔“

نیک بخت نے کہا۔ ”وہ میرے خلاف تھے لیکن ابھی موجود رہتے تو وردانہ کے خلاف بھی مہم چلاتے۔ وردانہ کے بھی بہت سے اہم راز ان دونوں کے پاس ہیں۔ میں ان کی غیر موجودگی کا مطلب سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔“

ایک سیاست داں نے کہا۔ ”ابھی میں یہی کہہ رہا تھا کہ ان دونوں نے کچھ سوچ سمجھ کر روپوشی اختیار کی ہے اور روپوشی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خفیہ ہاتھ نے اور وردانہ نے ان دونوں سے کوئی بہت بڑا سمجھوتا اور سودا کیا ہو؟“

مشیر نے کہا۔ ”ہم موضوع سے بھٹک رہے ہیں۔ اب حمزہ اور راجہ کے آجانے سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ ہمیں اب صرف آئندہ کے لیے سوچنا ہے۔ آئندہ ہم بہت بڑی اور مضبوط اپوزیشن بن کر رہیں گے۔ وردانہ کو ایک دن بھی سکون سے حکومت نہیں کرنے دیں گے۔“

”آپ یہ کون سی نئی بات کر رہے ہیں۔ اپوزیشن پارٹی ہمیشہ حکمران پارٹی کے تعمیری

مقاصد کو بھی پورا نہیں کرنے دیتی۔ ایسے غلط پروپیگنڈے کرتی ہے کہ تعمیری مقاصد دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں' بات تو حمزہ اور راجہ کی ہونی چاہیے۔ ان کی گمشدگی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "بے شک ان کی گمشدگی یا روپوشی کے پیچھے بہت گہرے سیاسی مقاصد ہوں گے۔ اگر ہمارا یہ اندازہ درست ہے کہ ان دونوں کو خفیہ ہاتھ نے خرید لیا ہے تو آپ کے چرائے ہوئے اہم راز انہوں نے خفیہ ہاتھ کے حوالے کیے ہوں گے جب بھی آپ مضبوط اپوزیشن کی حیثیت سے کوئی قدم اٹھانا چاہیں گے' ان رازوں کے ذریعے آپ پر دباؤ ڈالا جائے گا پھر آپ حکمران پارٹی کے خلاف کچھ نہیں کر پائیں گے۔"

وہ سب پریشان ہو کر سوچنے لگے پھر ایک نے کہا۔ "ابھی ہم اندازہ کر رہے ہیں۔ حمزہ اور راجہ بھاری سے بھاری قیمت پر بھی بِک جانے والے نہیں ہیں۔ وہ ہمیشہ ملک اور قوم کے لیے سر سے کفن باندھ کر رہتے تھے۔ ایسے جانباز خریدے نہیں جا سکتے۔ دو میں سے کوئی ایک بات ہے' خفیہ ہاتھ نے انڈر گراؤنڈ مافیا کے گاڈ فادر ہاشم کو تباہ کر دیا ہے۔ اس کے معتمدِ خاص امانت شیخ کو خرید کر ہاشم کے تمام اختیارات اور ذرائع ختم کر دیئے ہیں۔ حمزہ اور راجہ کے وہ اختیارات ختم ہو گئے ہیں' جن کے ذریعے وہ اخبارات کو ہمارے اور دردانہ کے خلاف بیانات شائع کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ ان دونوں کے بے شمار جانباز ماتحت بھی نہیں رہے تھے۔ ایسی مجبوریوں کے باعث ہو روپوش ہو گئے ہیں یا پھر.......... خفیہ ہاتھ نے انہیں ہلاک کرا دیا ہے۔"

ایک مشیر نے کہا۔ "اگر وہ زندہ ہیں اور روپوش ہیں تو ہم انہیں تلاش کریں۔ کسی طرح ان سے رابطہ کر کے اپنے تعاون کا یقین دلائیں۔ اپنے اختیارات اور وسیع ذرائع سے دردانہ کے خلاف مہم چلائیں۔ اگر وہ دونوں ہماری بھرپور مدد کریں گے تو دردانہ اسمبلی میں آنے سے پہلے ہی گھر لوٹ جائے گی۔"

"بہت عمدہ تدبیر ہے۔ حمزہ اور راجہ نے جو کچھ کھویا ہے۔ وہ سب کچھ ہم سے ملے گا تو وہ ایکشن میں آ جائیں گے۔"

وہ سب اپنے اپنے طور پر سوچنے لگے اور اسی ایک بات پر غور کرنے لگے کہ حمزہ اور راجہ سے کس طرح رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

دوسری طرف دردانہ بیگم اپنے مشیروں اور قابلِ اعتماد سیاست دانوں کے درمیان بیٹھی مستقبل کے بارے میں پلاننگ کر رہی تھی۔ ایسے ہی وقت فون کے ذریعے خفیہ ہاتھ کے سیکرٹری نے رابطہ کیا پھر پوچھا۔ "کیا آپ جانتی ہیں کہ لاہور میں کیا ہو چکا ہے؟"

دردانہ بیگم نے کہا۔ "نہیں۔ آج کے اخبارات میں کوئی تشویش ناک خبر شائع نہیں ہوئی تھی۔ بات کیا ہے؟"

"ہمارے باس نے امانت شیخ کو خرید لیا تھا۔ ہاشم کی انڈر گراؤنڈ مافیا کو نیست و نابود کر دیا لیکن ہماری ایک ایجنسی نے اطلاع دی ہے کہ ایک کوٹھی میں امانت شیخ اور اس کے چار سیکورٹی گارڈز کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔ امانت شیخ کے صرف گھٹنوں پر کئی گولیاں چلائی گئی تھیں۔ وہ زندہ تھا مگر اسپتال پہنچنے تک اس نے دم توڑ دیا۔"

وہ بولی۔ "قاتلوں کے سلسلے میں کوئی سراغ لگایا گیا ہے؟"

"یہ واردات ہاشم کی بہن ڈاکٹر آمنہ کی کوٹھی میں ہوئی ہے۔ ہاشم ہمیشہ حمزہ اور راجہ کی مدد کرتا رہتا تھا۔ اب ہاشم سے غداری کرنے والے امانت شیخ کو حمزہ اور راجہ ہی ہلاک کر سکتے ہیں۔"

"اس سے ظاہر ہوتا ہے' وہ دونوں لاہور میں ہیں۔ الیکشن کے مکمل نتائج کے سامنے آنے تک کچھ بھی کر سکتے ہیں؟"

"آپ فکر نہ کریں۔ پریس میڈیا ہماری مٹھی میں ہے۔ وہ آپ کے خلاف اپنے بیانات شائع نہیں کرا سکیں گے اور نہ ہی جو راز آپ کے سیف سے چرا کر لے گئے ہیں انہیں عوام کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے عوام کے سامنے آنا ہو گا۔ جو سامنے آ کر سچ نہیں بولتے' ان کی سچائی کو تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔"

"پلیز ایک بات سچ بتائیں کہ حمزہ اور راجہ واقعی زندہ ہیں؟ یا آپ امانت شیخ کے قتل کو ان مُردوں کے سر ڈال رہے ہیں؟"

"میں پرسنل سیکرٹری ہونے کے باوجود اپنے صاحب کے بہت سے راز نہیں جانتا۔ جو مجھے معلوم ہے' وہی کہہ رہا ہوں۔ جسٹ اے منٹ۔"

وہ خاموش رہا پھر بولا۔ "پلیز فون بند کریں۔ میں ابھی تھوڑی دیر بعد فون کروں گا۔"

دردانہ بیگم فون بند کر کے اپنے مشیروں اور اپنی پارٹی کے خاص سیاست دانوں کو فون پر ہونے والی گفتگو تفصیل سے بتانے لگی۔ ایک مشیر نے کہا۔ "ہاشم ڈاکٹر آمنہ کا بھائی ہے۔ ہاشم کی تباہی کا انتقام حمزہ اور راجہ ہی لے سکتے ہیں۔ انہوں نے ہی امانت شیخ کو قتل کیا ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "ایک ہی بنگلے میں امانت شیخ کو اس کے چار گارڈز سمیت قتل کر دینا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ کام وہی دونوں کر سکتے ہیں۔"

پھر موبائل فون کے بزر کی آواز ابھری۔ دردانہ بیگم نے لپک کر فون اٹھا کر آن کیا۔ دوسری طرف سے خفیہ ہاتھ کے پرسنل سیکرٹری نے کہا۔ ”میڈم! اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ پاکستان میں آپ ہی حکومت بنائیں گی لیکن ایک بری خبر ہے‘ گاڈ فادر ہاشم پاکستان پہنچ گیا ہے پھر سے اپنی کھوئی ہوئی طاقت اور اختیارات حاصل کر رہا ہے۔“

دردانہ بیگم نے بے یقینی سے کہا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ خفیہ ہاتھ نے اس کے تمام اڈوں کو تباہ کر دیا تھا۔ اس کے لیے ایک تنکے کا سہارا نہیں رہنے دیا تھا۔ وہ پاکستان آتے ہی گرفتار ہو جاتا لیکن وہ آچکا ہے اور اسے گرفتار نہیں کیا گیا۔ آپ کا صاحب اس قدر اختیارات سے خالی نہیں ہے۔“

”طاقت اور اختیارات ہر جگہ کام نہیں آتے۔ ہاشم جیسے گاڈ فادر زیر زمین رہتے ہیں۔ یعنی کہ روپوش رہا کرتے ہیں۔ کبھی ہاتھ بھی آتے ہیں تو انڈر گراؤنڈ مافیا اس ملک میں زلزلے پیدا کرتی رہتی ہے۔ اس لیے کوئی گاڈ فادر کبھی گرفتار نہیں کیا جاتا۔“

”پھر تو یہ بات سمجھ میں آگئی کہ ہاشم نے اپنے غدار دستِ راست امانت شیخ کو قتل کیا ہے۔ وہ آئندہ بھی ہمارے لیے مسائل پیدا کرے گا۔“

”آپ اپوزیشن سے مطمئن رہیں۔ نیک بخت آپ کی حکومت کے خلاف کچھ زیادہ پرابلمز پیدا نہیں کرے گا۔ خطرہ ہاشم کی طرف سے ہے۔ حمزہ اور راجہ جہاں بھی ہیں‘ پھر ہاشم سے بھرپور تعاون حاصل کرنے آجائیں گے۔ آپ شاید اپنی حکومت کے پانچ برس پورے کرلیں لیکن اقتدار کی یہ کرسی آپ کے لیے کانٹوں کی کرسی ثابت ہو گی۔“

”اب تو میں بھی یہی سمجھ رہی ہوں لیکن اقتدار کی کرسی نہیں چھوڑوں گی۔ آپ حمزہ اور راجہ کے بارے میں نہیں جانتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں بھی یا نہیں؟ پلیز کسی طرح اپنے صاحب سے معلوم کرو یا ان سے میری بات کراؤ۔“

”جس دن آپ اسمبلی میں اپنے ممبران کی اکثریت ثابت کر دیں گی۔ اسی دن صاحب آپ کو مبارک باد دینے کے لیے فون کریں گے۔ آپ اسی دن حمزہ اور راجہ کے بارے میں کچھ معلوم کر سکیں گی۔“

فون کا رابطہ ختم ہو گیا۔ دردانہ بیگم نے اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے۔ معتمد افراد سے کہا۔ ”حمزہ اور راجہ کے بارے میں بڑی راز داری برتی جا رہی ہے سیکرٹری کچھ چھپا رہا ہے۔ یہ بات بنا رہا ہے کہ وہ خفیہ ہاتھ کا راز دار ہونے کے باوجود ان دونوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ہے۔“

”یقیناً وہ اس سلسلے میں ٹال رہا ہے۔“

”ایک بری خبر یہ ہے کہ ہاشم پہلے کی طرح طاقت اور اختیارات حاصل کر کے انڈر گراؤنڈ مافیا کا گاڈ فادر بن گیا ہے۔“

”میڈم! یہ تو واقعی بری خبر ہے لیکن اس خبر سے پتا چلتا ہے کہ خفیہ ہاتھ شیخ سے سودا کر کے گھاٹے میں رہا ہے اور وہ گاڈ فادر ہاشم کا کچھ بگاڑ نہیں پا رہا ہے۔“

دردانہ بیگم نے کہا۔ ”سیاست کے میدان میں سیر پر سوا سیر ہوتے ہیں۔ خفیہ ہاتھ بے حد طاقت ور ہے۔ اس کے باوجود عالمی سطح پر مجرموں سے اس لیے نہیں ٹکراتا کہ وہی مجرم یا اس کے ساتھی مجرموں کے سرغنہ اور گاڈ فادر جیسے لوگ اکثر اس کے کام آتے رہتے ہیں۔ بہرحال آج یا کل تک خفیہ ہاتھ سے میری براہِ راست گفتگو ہو گی۔“

دردانہ بیگم کے آس پاس جو کامیاب سیاست داں بیٹھے ہوئے تھے ان میں اکرام شاہ بھی تھا۔ وہی اکرام شاہ جس کی کوٹھی میں تابانی اور مراد مہمان بن کر آئے تھے۔ یہ صرف اکرام شاہ‘ مقتول کاشف اکبر اور دردانہ بیگم جانتے تھے کہ تابانی اور مراد ”را“ کی طرف سے آنے والے دہشت گرد ہیں۔ وہ دونوں بم سازی اور بم ڈسپوزل کے ماہرین تھے۔ مقتول کاشف اکبر کے حکم پر اکرام شاہ نے انہیں اپنی کوٹھی میں مہمان بنا کر رکھا تھا۔

دردانہ بیگم کے سامنے ایسے مجرموں کی فہرست پیش کر دی گئی تھی‘ جو اس کی پارٹی کے لیے کام کرتے ہوئے گرفتار ہو گئے تھے۔ یہ طے پایا تھا کہ دردانہ بیگم اپنی حکومت قائم کرتے ہی پہلے اپنی مطلوبہ عدالتوں کے ججوں کی تبدیلیاں کرائے گی۔ ان کی جگہ اپنے تابع دار ججوں کی تقرری کرے گی پھر ان کے ذریعے اپنی پارٹی کے مجرم قیدیوں کی رہائی کا حکم دلائے گی۔

دردانہ بیگم کے پاس رہائی پانے والے مجرم قیدیوں کی جو فہرست تھی۔ اس میں مراد کا نام بھی لکھا تھا۔ اکرام شاہ نے کہا۔ ”میڈم! یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ ”را“ کے دونوں ایجنٹ تابانی اور مراد ہمارے کتنے زبردست آلہ کار رہے ہیں۔ انہوں نے کئی بار بم دھماکے کیے۔ آخری بار لاہور لبرٹی مارکیٹ میں دھماکے کیے اور گرفتار ہو گئے۔ تابانی بڑی چالاکی سے فرار ہو گیا تھا۔ بلکہ ہو گئی تھی۔ بعد میں راز کھلا کہ وہ عورت ہے اور مرد بن کر رہتی ہے۔“

دردانہ بیگم نے کہا۔ ”میرے خاص آدمی مجھے تمام اہم رپورٹس دیتے رہتے ہیں۔ تابانی بڑی چالاکی سے فرار ہوئی تھی‘ لیکن گاڈ فاد ہاشم کی مدد سے۔ اس وقت یہی سمجھا گیا کہ وہ ہاشم کی احسان مند ہو گی لیکن یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ ”را“ کی وفادار ہے۔ جس گاڈ فادر ہاشم نے اس کی مدد کی تھی۔ تابانی اس کی بہن ڈاکٹر آمنہ کو اغوا کر کے

بھارت لے گئی۔ مجھے ایسی ہی مکار اور دلیر عورت کی ضرورت ہے۔ اگر وہ بھارت سے پھر یہاں آجائے تو میں اسے پرسنل باڈی گارڈ بناؤں گی۔"

اکرام شاہ نے کہا۔ "وہ مراد کی دیوانی ہے۔ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اگر آپ پہلی ترجیح کے طور پر مراد کو رہائی دلائیں گی تو وہ یہاں خود ہی دوڑی چلی آئے گی۔ ہم جب تک برسرِ اقتدار رہیں گے' تب تک "را" کے کسی افسر یا جاسوس سے رابطہ نہیں رکھیں گے۔ ورنہ پاک فوج کے انٹیلی جنس والے ہماری حکومت کی اس پالیسی کو بلیک لسٹ میں نوٹ کریں گے۔"

ایک سیاست داں جبار ہاشمی نے کہا۔ "میڈم! جیسا کہ آپ جانتی ہیں کہ جب آپ کے خاوند کاشف اکبر مرحوم کی حکومت تھی' تب سے "را" والوں کے ساتھ میں خفیہ معاملات طے کرتا ہوں اور ان کی تنظیم کے بارے میں مجھ سے زیادہ معلومات کوئی نہیں رکھتا ہے۔ ابھی شاید میری بات کا یقین نہ آئے۔ آپ بعد میں تصدیق کرلیں موجودہ صورت حال یہ ہے کہ تابانی "را" سے غداری کر رہی ہے۔ وہ مراد کو رہائی دلانے کے لیے پھر پاکستان آگئی ہے۔ ہاشم پہلے کی طرح طاقتور اور بااختیار گاڈ فادر بن چکا ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں۔ تابانی گاڈ فادر ہاشم کی کسی خفیہ رہائش گاہ میں ہوگی اور اپنے مراد کو جیل سے رہائی دلانے کی تدبیر کر رہی ہوگی۔"

دردانہ بیگم سامنے خلا میں تکتے ہوئے سوچنے لگی۔ کتنے ہی مشیر اور سیاست داں مشورے دینے لگے کہ پہلے تابانی کی غداری کے بارے میں تصدیق کی جائے۔ اگر "را" کے اعلیٰ افسران کہہ دیں کہ وہ غدار نہیں ہے تو ہم تابانی اور مراد پر بھروسا کریں گے۔"

دردانہ بیگم نے کہا۔ "چند گھنٹوں میں حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ میر جبار ہاشمی! آپ "را" والوں کے زونل افسر سے یہاں ملاقات کریں۔ تابانی غدار ہو یا نہ ہو۔ ہم مراد کو رہائی دلا کر ایک دوسری چال چلیں گے۔"

"دوسری چال؟"

"ہاں۔ اگر ہم مراد کو رہائی دلا کر اپنے پاس لائیں گے تو وہ دیوانی کدھر جائے گی؟ اس کی طرف یا ہماری طرف؟"

☆======☆======☆

پس ماندہ یا ترقی پذیر ملکوں میں جیلوں کے بارے میں جو کہا جاتا ہے' وہی پاکستانی جیلوں کے بارے میں تحریری طور پر کہا جاتا ہے کہ یہاں کی جیلیں جرائم سکھانے کی یونیورسٹیاں ہیں۔ جو بے قصور اور بے گناہ افراد پولیس کی زیادتی کے باعث جیل بھیجے

جاتے ہیں۔ وہ ناانصافی کی وجہ سے برسوں وہاں پڑے رہتے ہیں۔ وہاں کے ماحول میں ڈھلنا نہیں چاہتے لیکن بدمعاش اور دادا کہلانے والے مجرم اور رشوت لے کر مجرموں کو منشیات سپلائی کرنے والے سپاہی اور افسران ان بے گناہوں کو اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں اور جب وہ بے گناہ اور معصوم جیل سے باہر آتے ہیں تو وہ چھٹے ہوئے بدمعاش اور چالاک مجرم بن چکے ہوتے ہیں۔

رسائل اور اخبارات میں جیلوں کے بدترین حالات اور جیل کے ذمے دار عملے کے خلاف جو لکھا جاچکا ہے اور لکھا جارہا ہے' وہ تحریری دستاویزات کی صورت اختیار کرگئے ہیں۔

مراد کے لیے وہ ماحول کوئی نیا نہیں تھا۔ وہ بھارت میں ایسی ہی بدترین جیلیں دیکھ چکا تھا۔ یہاں اسے ایک خطرناک قیدی کی حیثیت سے علیحدہ بیرک میں رکھا گیا تھا۔ اس بیرک میں ایسے قیدی تھے۔ جنہیں سزائے........ موت دی جانے والی تھی لیکن عدالت سے ابھی تک آخری فیصلہ سنایا نہیں گیا تھا۔

مراد کی ایک پیشی کے وقت پولیس اور انٹیلی جنس والے پُر امید تھے کہ سزائے موت کا حکم سنایا جائے گا لیکن جج نے کہا۔ "تمام ثبوت اور گواہوں کے پیشِ نظر ملزم مراد علی کے کئی جرائم ثابت ہو چکے ہیں۔ یہ مجرم سزائے موت کا حق دار ہے لیکن یہ عبوری حکومت ہے۔ انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی حکومت میرے اس فیصلے کی روشنی میں مجرم مذکورہ کو سزائے موت کا آخری فیصلہ سنانے کی مجاز ہوگی۔"

اس عدالتی فیصلے کے باعث مراد کی عمر الیکشن کے نتائج تک بڑھ گئی۔ وہ جانتا تھا کہ تابانی اسپتال سے کس طرح فرار ہوئی ہے اور جب تک اسے بھی جیل سے نکال کر نہیں لے جائے گی' تب تک سکون سے نہیں رہے گی۔ وہ سزائے موت پانے یا نئی زندگی پانے کے انتظار میں جی رہا تھا۔ ویسے تو وہ تابانی سے بھی زیادہ چال باز اور بہترین فائٹر تھا۔ بڑی زبردست چالیں چل کر وہاں سے فرار ہو سکتا تھا لیکن پیروں سے مجبور تھا۔ میری ڈاکٹر امی نے اس کے گھٹنوں کی ہڈیاں بڑی کامیابی سے جوڑ دی تھیں۔ وہ رفتہ رفتہ ایک ایک پیر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو گیا تھا لیکن تیز رفتاری سے دوڑ نہیں سکتا تھا۔ امی نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ گھٹنوں پر زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔ پہلے پیروں کی ہلکی پھلکی ورزش کرتا رہے۔ انہوں نے گھٹنوں پر مالش کی دوا اور کچھ کیپسول اور گولیاں دی تھیں لیکن جب اسے اسپتال سے جیل لایا گیا تو اس تمام دوائیں چھین کر رکھ لی گئیں۔

اس سے دوائیں چھیننے کا یہ جواز پیش کیا گیا کہ مالش کرنے والی دوا زہریلی ہے۔

قیدی اسے پی کر خودکشی کر سکتا ہے۔ اگر جیل کے افسران کی جیبیں گرم کی جاتیں تو پھر وہ زہریلی دوا کا جواز پیش نہ کرتے۔ اس کے برعکس اس کے گھٹنوں کی مالش کے لیے کسی سپاہی کی ڈیوٹی لگا دیتے۔ رشوت دینے کے لیے اس کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ جس طرح میری امی نے پولیس کو اسپتال میں زیر علاج رہنے والے مراد کے معاملے میں مداخلت سے روک دیا تھا اس طرح انتقاماً میری امی کو جیل میں مراد سے ملاقات کرنے سے روک دیا۔ کہا گیا تھا کہ میڈیکل سرٹیفکیٹ کے مطابق مراد صحت مند ہے۔ اس کے گھٹنے بھی ٹھیک ہو چکے ہیں لہٰذا جب جیلر مناسب سمجھے گا تو جیل کے ڈاکٹر سے اس کا علاج کرائے گا۔

اور میری امی ایک عام ملاقاتی کی حیثیت سے بھی نہ مل سکیں کیونکہ مراد "را" کا دہشت گرد تھا۔ امی کو وضاحت کرنی پڑتی کہ جب ایک قیدی مریض ٹھیک ہو چکا ہے تو وہ کس تعلق سے اس سے ملنا چاہتی ہیں؟

انکل ہاشم نے امی کو یقین دلایا کہ وہ جلد ہی مراد کو جیل سے نکال لائیں گے۔ مراد کے سلسلے میں جیل کے عملے کے علاوہ انٹیلی افسران گاڈ فادر ہاشم سے لاکھوں رشوت لے کر بھی مراد کے لیے سہولتیں فراہم نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی دوائیں بھی اسے نہیں دے سکتے تھے۔

پھر جیل کے باہر حالات بدل گئے تھے۔ تابانی کی حماقت سے امی کو اغوا کر کے بھارت پہنچایا گیا تو گاڈ فادر ہاشم نے ناراض ہو کر مراد کو جیل میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا پھر امی، کالیا کے آپریشن کے لیے لندن گئیں اور انکل ہاشم ان کی نگرانی کے لیے گئے تو خفیہ ہاتھ نے ان کی انڈر گراؤنڈ مافیا کو نیست و نابود کر دیا۔ اب تابانی میری امی کی بیٹی اور میری بہن بن چکی تھی۔ انکل ہاشم کے دوبارہ گاڈ فادر بن کر طاقت اور اختیارات حاصل کرنے تک انتخابات کے نتائج نکل آئے۔ دردانہ بیگم اسمبلی میں اپنی پارٹی کی اکثریت ثابت کر کے حکمران بن گئی۔

ایسے وقت میں خفیہ ہاتھ نے فون کے ذریعے دردانہ بیگم کو برسر اقتدار آنے کی مبارک باد دی۔ دردانہ نے کہا۔ "یہ سب آپ کی مہربانی ہے۔ آپ سیاسی بازی گری اچھی طرح جانتے ہیں۔ اب آپ سے گزارش کرتی ہوں کہ حمزہ اور راجہ کے بارے میں حقیقت بتائیں۔ آپ کے اشاروں پر چلنے والا ہر سیاست داں ان سے خوف زدہ کیوں رہتا ہے۔"

"کیوں خوف زدہ رہتا ہے؟ کیا تم نہیں دیکھ رہی ہو کہ ہم نے تمہارے سر پر ہاتھ

رکھا اور وہ دونوں لاپتا ہو گئے۔ ایسے کتنے ہی حمزہ اور راجہ آتے جاتے رہیں گے لیکن اس کے راستے کا کانٹا نہیں بن سکیں گے جس کے سر پر ہم ہاتھ رکھ دیتے ہیں۔ وِش یُو آل۔"

خفیہ ہاتھ نے فون بند کر دیا۔ دردانہ بیگم بھی فون بند کر کے سوچنے لگی۔ خفیہ ہاتھ اپنے اہم راز کسی پر ظاہر نہیں کرتا ہے۔ پتا نہیں اس نے حمزہ اور راجہ کو خرید لیا ہے یا انہیں ٹھکانے لگا دیا ہے۔ وہ اصل حقیقت صرف اس لیے چھپا رہا ہے کہ وہ دونوں سیاست دانوں کے لیے ہوا بن کر رہیں اور دونوں کے خوف سے ہم خفیہ ہاتھ کے پاس پناہ لیتے رہیں۔

فی الحال وہ مطمئن تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ خفیہ ہاتھ کو ہمیشہ خوش رکھنے کے لیے ملک کی سلامتی کو بھی داؤ پر لگانا پڑے تو وہ اپنی اور اپنی حکمرانی کی سلامتی کے لیے یہ بھی کر گزرے گی۔

☆======☆======☆

مراد یہ سن کر حیران رہ گیا کہ اس کی ملاقات آئی ہے۔

جب سے وہ جیل آیا تھا "را" والوں نے بھی اس کی خبر نہیں لی تھی اور دوسرا کوئی اس سے ملاقات کرنے نہیں آیا تھا۔ اسے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ میری امی نے اس سے ملاقات کرنے کی کوششیں کی تھیں لیکن کسی نے اس سے ملنے اور دو باتیں کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ مراد میری امی سے بھی بدظن ہو گیا تھا۔

اس کے پیروں میں ڈنڈا بیڑی ڈال کر رکھی جاتی تھیں۔ جس کے باعث چلنے میں تکلیف ہوتی تھی اور دونوں پیر زخمی ہو جاتے تھے۔ وہ دو سپاہیوں کے درمیان بڑی تکلیف سے چلتا ہوا، اس بڑے کمرے میں آیا جہاں ملاقات کرنے والے آہنی جالیوں کے پیچھے کھڑے رہتے تھے۔ وہاں ایک سپاہی نے دونوں سپاہیوں سے کہا۔ "اسے یہاں لائے ہو؟ دماغ ٹھیک ہے۔ کیا ایم این اے صاحب یہاں ملاقات کریں گے؟ اسے جیلر صاحب کے آفس میں لے جاؤ۔"

وہ سپاہیوں کے ساتھ چلتے ہوئے جیلر کے دفتر میں آیا تو وہاں اکرام شاہ بیٹھا ہوا تھا۔ مراد کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر جیلر کو غصے سے دیکھ کر پوچھا۔ "اس کے پیروں میں یہ ڈنڈا بیڑی کس نے ڈالی ہے؟ فوراً اسے کھلوو۔"

جیلر نے فوراً حکم دیا۔ سپاہیوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ ڈنڈا بیڑی کھول دی گئی۔

اکرام شاہ نے مراد سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے تو اخبارات میں پڑھا ہو گا ..."

"اخبارات؟" مراد نے ناگواری سے کہا۔ "یہاں تو اخبار کے کاغذ سے بھی پتلی دو روٹیاں دی جاتی ہیں' صرف رات کو۔ باقی سارا دن بھوکا رکھا جاتا ہے۔"

اکرام شاہ نے گھور کر جیلر کو دیکھا۔ وہ بولا۔ "سر! یہاں انٹیلی جنس والے صرف اس قیدی کے لیے بہت سختی کرنے کو کہتے ہیں۔ ہم مجبور ہیں۔"

"وہ دور گزر گیا۔ اب ہماری حکومت ہے۔ تمہیں میڈم دردانہ بیگم نے فون کیا تھا؟"

"یس سر! یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ میڈم نے مجھ سے بات کی۔"

"آئندہ بھی خوش قسمت رہنا چاہتے ہو اور اپنی وردی اتروانا نہیں چاہتے ہو تو ابھی مسٹر مراد کو میڈیکل ٹریٹ منٹ دو۔ رہنے کے لیے جیل کا اے کلاس کمرا دو۔ یہ جتنی سہولتیں چاہتے ہیں' وہ مہیا کرو۔ ان کی فائل دوبارہ کھولی جا چکی ہے۔ جلد ہی عدالت سے ان کی رہائی کا حکم نامہ ملے گا۔"

جیلر نے سپاہیوں سے کہا۔ "ڈاکٹر کو زخموں کی مرہم پٹی کے لیے بلاؤ۔"

سپاہی چلے گئے۔ اکرام شاہ نے جیلر سے کہا۔ "پلیز! آپ بھی کچھ دیر کے لیے جائیں۔ میں کچھ ضروری باتیں کروں گا۔"

جیلر بھی چلا گیا۔ اکرام شاہ نے مراد کے شانے پر ہاتھ مار کر اسے ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "سیاسی جنگ میں زخمی ہونا پڑتا ہے۔ بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں مگر اب تمہارے مصائب کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ ہماری پارٹی جیت گئی ہے۔ اب ہماری حکومت قائم ہو چکی ہے۔ ہمارے جتنے کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا' انہیں جلدی رہا کرایا جائے گا۔ سب سے پہلے تمہیں رہا کرانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ جانتے ہو کیوں؟"

"کیوں؟"

"تمہاری تابانی گمراہ ہو گئی ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میری تابانی پر الزام لگا رہے ہیں؟"

"گمراہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تم سے بے وفائی کر رہی ہے۔ وہ دراصل دشمنوں کی سازش کا شکار ہو گئی ہے۔ گاڈ فادر ہاشم نے اسے فرار ہونے کا موقع دیا تو وہ سمجھنے لگی ہے کہ ہاشم اور ڈاکٹر آمنہ اس کے ہمدرد ہیں۔ ان کی خاطر اس نے "را" تنظیم سے غداری کی ہے۔"

مراد نے حیرانی سے پوچھا۔ "را سے غداری؟"

"صرف غداری نہیں' وہ ڈاکٹر آمنہ کو اپنی امی اور اس گاڈ فادر کو انکل ہاشم کہنے لگی ہے۔ میری تو سمجھ میں یہی آ رہا ہے کہ ڈاکٹر آمنہ نے تابانی کو ایسی دوا کھلائی ہے جس کے اثر سے اس کا دل اپنوں سے بھر گیا ہے اور وہ بیگانوں کو اپنا بنا رہی ہے۔"

"کیا وہ آپ سے ملی تھی؟"

"مجھے تو اس کا سایہ تک نظر نہیں آیا ہے۔ میں اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ کل رات ایک اجنبی نے مجھے فون پر کہا تھا۔ "تم جسے ڈھونڈ رہے ہو' وہ تمہیں نہیں ملے گی۔ وہ صرف موبائل فون پر اپنے مراد سے بات کر سکتی ہے۔" اس اجنبی نے مجھ ایک موبائل کا نمبر دیا۔ میں نے اس سے باتیں کرتے ہوئے اس کے دیئے ہوئے نمبر پر رابطہ کیا۔ اس کی آواز سنائی دی۔ میں نے کہا۔ "بیٹی تابانی! میں تمہارا انکل اکرام شاہ بول رہا ہوں۔"

اس نے جواب میں کہا۔ "میں صرف مراد سے باتیں کروں گی۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

اکرام شاہ نے موبائل نکال کر مطلوبہ نمبر پنچ کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس سے رابطہ کر رہا ہوں۔ تم اس سے بات کرو۔"

رابطہ ہونے پر اس نے مراد کو موبائل دیا۔ مراد نے اسے کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو تابانی! میں مراد بول رہا ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "اپنا نام کیا بتا رہے ہو۔ میں تو لاکھوں کروڑوں بولنے والوں کے درمیان تمہاری آواز سے پہچان سکتی ہوں۔"

"تابانی! تم کہاں ہو؟"

"میں اپنے جاں نثار ساتھیوں میں ہوں۔ تمہیں جیل سے نکالنے کے بعد ایک خفیہ پناہ گاہ میں لے چلوں گی۔ کل شام انکل ہاشم نے کہا تھا کہ اکرام شاہ ایم این اے بن چکا ہے۔ اس کی پارٹی کی حکومت ہے۔ میں اکرام شاہ کے ذریعے تم سے باتیں کر سکتی ہوں۔ تم اطمینان رکھو۔ انکل ہاشم تمہیں جلد ہی جیل سے نکال کر لے آئیں گے۔"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ یہ تم بار بار انکل ہاشم کا ذکر کر رہی ہو۔ یہ کس کھیت کی مولی ہے؟"

"مراد!" تابانی نے غصے سے چیخ کر کہا پھر ذرا نرم پڑ کر بولی۔ "انکل ہاشم ہمارے بزرگ ہیں۔ ان کے لیے نامناسب الفاظ استعمال نہ کرو۔ میں نے اپنی امی آمنہ اور انکل ہاشم کی مدد سے رہائی حاصل کی تھی۔ انکل ایسے ہیں کہ جیل توڑ کر بھی تمہیں وہاں سے نکال لائیں گے۔"

"تم کیسی احمقانہ باتیں کر رہی ہو۔ انکل اکرام شاہ کی پارٹی نے حکومت بنائی ہے۔ وہ مجھے عدالت سے باعزت بری کرانے والے ہیں۔ ہم دونوں پر سے دہشت گرد ہونے کا الزام مٹانے والے ہیں۔ ہم مجرم نہیں معزز شہری کہلائیں گے اور تم اس ڈاکٹر اور گاڈ فادر کے بہکانے میں آکر جیل توڑنے اور مجھے مجرم کی طرح فرار ہونے کو کہہ رہی ہو۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہیں عدالت سے باعزت طور پر بری کرایا جا سکتا ہے۔ یہ اچھی بات ہے لیکن عزت ملنے کے بعد ہم مجرمانہ زندگی نہیں گزاریں گے۔"

"ہم سیاست دانوں کے مہرے ہیں۔ شطرنج کی بساط سے مات کھا کر ہی' بازی سے الگ ہو کر مُردہ ہو کر بساط سے باہر نکل سکتے ہیں۔ تم مجھ سے زیادہ نہیں جانتی ہو۔ میں تم سے کہہ رہا ہوں' انکل اکرام شاہ کے پاس جاؤ اور میرا انتظار کرو۔"

"اکرام شاہ کے پاس جانے کا مطلب ہے......... ہم پھر ان کے سیاسی مہرے بن جائیں گے۔"

"ہم نے ایک ساتھ برسوں کیمپ میں رہ کر یہی تربیت حاصل کی ہے۔ ہمارے مقدر میں جو بننا تھا' وہ ہم بن چکے ہیں۔"

"مراد! یہ لوگ طاقت اور اختیارات کے محتاج ہیں۔ آج یہ حکومت نہ بنا پاتے تو یہ تمہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچنے کے لیے جیل میں پڑے رہنے دیتے۔"

"مجھے بچہ سمجھ کر نہ سمجھاؤ۔ اس دنیا میں صرف طاقت اور اختیارات سے ہی سب کچھ ہوتا ہے۔"

"غلط کہہ رہے ہو۔ صرف حوصلے سے ہوتا ہے۔ یہاں انکل ہاشم اختیارات اور طاقت سے خالی ہو گئے تھے۔ میری مدد کرنے والی امی مجبوراً لندن میں ہیں مگر میرا حوصلہ دیکھو کہ میں تنہا ہو کر تمہیں رہائی دلانے آئی ہوں۔ اکرام شاہ سے کہو' اپنی پارٹی کی حکومت سے طاقت اور اختیارات حاصل کر کے تمہیں فولادی قلعے میں بند کر دے۔ اپنے ہونے والے بچے کی قسم' میں تمہیں اس فولادی قلعے سے صحیح سلامت نکال لاؤں گی۔"

"میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں تم مرتے مرتے بھی اپنی ضد پوری کرو گی۔ جو کہہ رہی ہو' وہ کر گزرو گی لیکن پوری حکومت کو چیلنج کرنا دانش مندی نہیں ہے۔ جبکہ میں بڑی آسانی سے باعزت بری ہو سکتا ہوں۔"

"باعزت نہ کہو۔ قانون کے منہ پر کالک لگا کر' چند ضمیر فروش ججوں کو خرید کر۔ یہ آج کے حکمران تمہیں باعزت رہائی دلائیں گے' نہ باعزت زندگی گزارنے دیں گے۔ میں اپنے ہونے والے بچے کی خاطر عزت سے جیوں گی اور عزت سے مروں گی۔ تم میرے

بچے کے باپ ہو۔ تمہیں بھی یہی کرنا پڑے گا۔"

"تم چاہتی ہو کہ امن و امان سے عدالت کے ذریعے مجھے رہائی نہ ملے؟"

"رہائی ضرور ملے مگر ہم کسی بھی سیاسی پارٹی یا کسی بھی تنظیم کے لیے دہشت گرد بن کر نہیں رہیں گے۔ ہم اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزاریں گے۔"

"میں فون پر تم سے مزید بحث نہیں کروں گا۔ تم جہاں بھی رہو خاموشی اور امن و امان سے میری رہائی کا انتظار کرو۔ ہم روبرو بیٹھ کر آئندہ زندگی گزارنے کے متعلق سوچیں گے۔"

"تم سوچو۔ فون اکرام شاہ کو دو۔"

مراد نے اسے فون دیا۔ وہ فون لے کر کان سے لگا کر بولا۔ "ہیلو تابانی! میں اکرام شاہ بول رہا ہوں۔ تم حکم کرو۔ جو چاہو گی' وہی ہو گا۔"

"یہ اپنی پارٹی لیڈر دردانہ بیگم سے پوچھو' زندہ رہ کر گھر سے اسمبلی تک جانا چاہتی ہے یا قبرستان تک......... اللہ تعالیٰ کے سوا ایسا کون سا محافظ ہے جو چوبیس گھنٹے اس کی حفاظت کرے گا۔ کوئی ضروری نہیں کہ وہ گولی کھائے......... کسی ڈش کا زہر بھی کھا سکتی ہے۔ کسی کاک ٹیل پارٹی میں ایک جام نوش کر کے ہمیشہ کی نیند سو سکتی ہے۔ اسمبلی میں تقریر کرتے کرتے کہیں سے بھی ایک ٹھائیں کی آواز کے ساتھ تقریر حلق میں ہڈی کی طرح پھنس سکتی ہے۔"

اکرام شاہ نے کہا۔ "میں تو سوچ رہا تھا' مراد کی رہائی کی خوش خبری سن کر خوشی سے ناچنے لگو گی۔"

"ناچنا ہوتا تو پچھلی رات تمہاری زبان سے رہائی کی خبر سن لیتی لیکن میں نے تمہیں کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا' صرف تمہارے ذریعے مراد کو اپنا کونٹیکٹ نمبر دیا۔ تاکہ تم لوگوں کو نچا سکوں۔ بے شک میں قانونی طور پر مراد کی رہائی چاہتی ہوں۔ یہ رہائی جلد ہو جائے تو بہتر ہے ورنہ دردانہ بیگم کی طرح تمہیں بھی اسمبلی کا راستہ بھلا دوں گی۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ اکرام شاہ نے جھنجلا کر اپنا موبائل بند کرتے ہوئے کہا "مراد! تم اس عورت کے ساتھ گزارا کیسے کرتے ہو؟ میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ یہ کچھ نیم پاگل ہے۔ یہ ڈاکٹر آمنہ کو اغوا کر کے بھارت لے گئی تھی۔ وہاں لے جا کر اسی ڈاکٹر آمنہ کی بیٹی بن گئی۔ "را" والوں کے لیے عذاب بن گئی اور اپنی ڈاکٹر ماں کو لندن پہنچا دیا اور خود پاکستان آگئی۔ یہاں وہ مفرور کہلاتی ہے۔ اس کے لیے قدم قدم پر خطرہ ہے۔ ان حالات میں بھی وہ دھمکی دے رہی ہے کہ مجھے اور ہماری پارٹی لیڈر دردانہ بیگم

کو کبھی اسمبلی تک پہنچنے نہیں دے گی۔"

مراد نے کہا۔ "اس اڑیل گھوڑی کو صرف میں ہی لگام دے سکتا ہوں۔ مجھے کسی بھی طرح جلد سے جلد رہائی دلا کر اس کے پاس جانے دو۔ میں اسے بہلا پھسلا کر آپ کے پاس لے آؤں گا۔ ورنہ آپ نہیں جانتے۔ جب اس نے کہہ دیا ہے کہ آپ میں سے کوئی اسمبلی نہیں پہنچے گا تو خفیہ ہاتھ کی بنائی ہوئی کٹھ پتلی حکومت ریت کے گھروندے کی طرح بیٹھ جائے گی۔ وہ یا تو مر جائے گی۔ یا پھر ناممکن کو ممکن کر دکھائے گی۔ اگر آپ سب اسمبلی تک نہ پہنچ سکے تو ساری دنیا میں بدنامی ہو گی۔"

"میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔ حکومت قائم ہو اور حکمران اسمبلی کے دروازے تک نہ پہنچ پائے تو بڑے جگ ہنسائی ہو گی۔"

"آپ مجھے تابانی سے ملا دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں ایسی کوئی جگ ہنسائی کی بات نہیں ہو گی۔ میں اسے ٹھنڈا کر دوں گا۔"

اکرام شاہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ تابانی کا چیلنج کھوکھلا نہیں ہے۔ ہاشم نے ایک گاڈ فادر کی حیثیت سے پھر ایک بار طاقت اور اختیارات حاصل کر لیے ہیں۔ تابانی جو کہہ رہی ہے' وہ کر دکھانا تو مشکل نہیں ہو گا۔ اکرام شاہ اور دردانہ بیگم اپنی سیکورٹی کے کتنے انتظامات کر سکیں گے۔ اسمبلی پہنچنے تک کہیں بھی موت کی ٹھوکر لگ سکتی ہے۔ جب حکومت بنائی ہے تو اسمبلی تک جانا ضروری تھا اور موت کی ٹھوکر بھی لازمی تھی۔

یہ بات خفیہ ہاتھ تک پہنچی' اس نے کہا۔ "تابانی کے بارے میں ہم بہت کچھ سن چکے ہیں لیکن اس لیے نظر انداز کرتے رہے کہ پاکستان کی سیاست میں تابانی کا عمل دخل نہیں تھا۔ اب یہ غور کرنے کا مقام ہے۔ جو تابانی ڈاکٹر آمنہ کو اغوا کر کے بھارت لے جا سکتی ہے' شمشیر سنگھ کالیا کو "را" کے پشکر کیمپ سے اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا سکتی ہے۔ "را" کے تمام افسران کو مجبور کر سکتی ہے کہ ڈاکٹر آمنہ کو لندن پہنچایا جائے اور خود بے شمار خطرات مول لے کر دوبارہ پاکستان آجائے۔ وہ خطرناک عورت نئے حکمرانوں اور ان کی پارٹی لیڈر دردانہ بیگم کو معلوم نہیں کیسے کیسے ہتھکنڈوں سے اسمبلی میں جانے سے روکے گی اور خفیہ ہاتھ کی بنائی ہوئی حکومت کو ساری دنیا میں مذاق بنا دے گی۔"

دردانہ نے پوچھا۔ "آپ کیا حکم دیتے ہیں؟"

وہ بولا۔ "لچک پیدا کرو۔ مراد کو جیل سے نکال کر تابانی کو............ فی الحال ٹھنڈا کر دو۔ اس کے بعد ہم اسے دام میں لا کر پوچھیں گے کہ وہ حمزہ اور راجہ کا انجام کیوں بھول گئی تھی۔"

رابطہ ختم ہونے پر دردانہ نے کہا۔ "تابانی سے کہہ دو۔ تین دن کے اندر مراد اس کے پاس پہنچ جائے گا۔"

☆======☆======☆

کوٹھی کے اندر گہری تاریکی تھی۔ میں ایک دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ میرے ہاتھ کے پاس ہی سوئچ بورڈ تھا۔ میں کسی بھی بٹن کو دباتا تو کوٹھی کے اس کمرے یا کوریڈور میں روشنی ہو جاتی۔ مجھے یہی معلوم نہ تھا کہ کسی کمرے میں ہوں یا کوریڈور میں؟

میرے بائیں طرف سوئچ بورڈ تھا اور دائیں طرف دروازہ۔ کوئی ایک یا ایک سے زیادہ دشمن دروازہ کھول کر آتے اور روشنی کے لیے سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھاتے تو میں انہیں دبوچ لیتا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ایسا ہو تو پھر اندھیرے میں ہو۔ تاکہ تاریکی میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے فائٹ ہو تو وہ مجھ پر حملہ نہ کر سکیں۔ میں سوئچ بورڈ کے کبھی ادھر کبھی اُدھر رہتا تو کسی کو بٹن دبا کر روشنی کرنے کا موقع نہ دیتا اور انہیں اندر آنے کے بعد دوسری بار دروازہ کھول کر باہر جانے کا موقع نہ دیتا۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ وہ تاریکی میں فائر نہ کرتے۔ فائرنگ سے ان کا اپنا کوئی ساتھی ہلاک ہو سکتا تھا۔ وہ مجھے دیکھ نہ پاتے کیونکہ روشنی سے آتے اور میں بڑی دیر سے تاریکی میں کچھ دیکھنے لگا تھا۔

باہر سڑک کے تین چار نیون سائن کے ہورڈنگس کی دھیمی دھیمی روشنی اس پہلے کمرے میں پہنچ رہی تھی۔ یعنی اب مجھے معلوم ہو گیا کہ میں کسی کوریڈور میں نہیں' کمرے میں ہوں۔

بینا مکرجی میرے لیے میک اپ کا سامان لینے گئی تھی۔ میں اس سے یہ پوچھنا بھول گیا تھا کہ اس کوٹھی میں کوئی رات کو آتا ہے یا نہیں؟ اگر آتا ہے تو رات کو اس کوٹھی میں روشنی ہوتی ہو گی۔ ورنہ تاریکی رہا کرتی ہو گی اور جہاں تاریکی رہا کرتی ہو' وہاں روشنی کرنے سے آس پاس کی کوٹھیوں والے تعجب سے ادھر آ سکتے ہیں یا جس طرح پولیس اور "را" کے افسران شلپا کو یا مجھ کو تلاش کرنے اس کوٹھی میں آئے تھے' جہاں مجھے ایک کمرے میں قید کیا گیا تھا۔ اسی طرح وہاں سے صرف دو سو گز کی دوری پر گشت کرتے ہوئے آ سکتے تھے۔

جب مجھے کمرے میں کچھ کچھ نظر آنے لگا تو مجھے آگے بڑھتے ہوئے کچھ صوفے اور ٹی وی وغیرہ دکھائی دیئے۔ بالکل قریب جانے سے چیزیں دکھائی دیتی تھیں۔ میں دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے دوسری طرف کی دیوار تک آیا پھر دیوار کے ساتھ لگ کر جانے سے ایک دروازہ ملا۔ میں نے اسے ٹٹول کر ہینڈل کو پکڑا۔ اسے دبایا تو وہ کھل گیا۔

نیون سائن کی روشنی میں ایک بیڈروم کی جھلک نظر آرہی تھی۔ میں نے راستہ ٹٹول کر کھڑکی کے پاس آکر اس کے باریک پردے ہٹائے اور کھڑکی کے دو پٹ کھولے تو اچھی خاصی روشنی اندر آئی۔ کمرے کی ہرچیز کسی حد تک نظر آنے لگی۔ ڈبل بیڈ کے اوپر ایک اٹیچی رکھی ہوئی تھی۔ جبکہ اسے اٹیچی اسٹینڈ یا الماری کے اندر ہونا چاہیے تھا۔

میں نے قریب آکر اسے کھولا۔ وہ لاکڈ نہیں تھی۔ نیم روشنی میں کچھ کپڑے' کاغذات اور ایک پاسپورٹ ملا۔ کپڑوں کی تلاشی لی تو ایک ریوالور' بلٹس کا ایک پیکٹ اور سائلنسر ملا۔ ریوالور پہلے سے لوڈ تھا۔ میں نے بلٹس کے پیکٹ کو سفری بیگ میں رکھا۔ پھر ریوالور کے ساتھ سائلنسر لگا لیا۔ اس تمام سامان سے ظاہر تھا کہ وہاں ایک یا ایک سے زیادہ لوگ رہنے والے ہیں۔

اٹیچی میں سگریٹ کے کئی پیکٹ اور ایک لائٹر تھا۔ میں نے اس لائٹر کو جلایا۔ روشنی ہو گئی۔ ایک اور دروازہ دکھائی دیا۔ میں اسے کھول کر اندر گیا پھر ایک دم ٹھٹک گیا۔

مجھ سے ذرا دور ایک بیڈ پر ایک عورت چاروں شانے چت لیٹی سو رہی تھی۔ دروازے کے پاس لائٹر کی روشنی میں اس کا چہرہ صاف طور پر نظر نہیں آرہا تھا۔ میں سمجھ نہیں سکتا تھا کہ وہ کون ہے؟ یہاں میری کوئی شناسا نہیں تھی۔ میں چہرہ دیکھ کر بھی شاید اسے پہچان نہیں سکتا تھا۔

میں دروازے پر سے ہی چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا۔ وہ بالکل ساکت پڑی ہوئی تھی۔ گہری نیند انسان کو اس طرح بے حس و حرکت کر دیتی ہے لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہاں ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔

میں نے قریب جانے سے پہلے اس کمرے کے دوسرے دروازے کو دیکھا۔ وہ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ کوئی خطرہ پیش آتا تو میں وہاں سے نکل کر کوٹھی کے پچھلے حصے سے فرار ہو سکتا تھا۔

پھر دماغ میں بات آئی' اس کھلے ہوئے دروازے کے دوسری طرف دشمن میری تاک میں ہوں گے۔ میں لائٹر کو بجھا کر واپس اس کمرے میں آیا' جہاں تاریکی میں دیر تک کھڑا رہا تھا۔ بہت ہی دھیمی دھیمی روشنی میں اس حد تک دکھائی دے رہا تھا کہ میں کسی چیز سے ٹکرائے بغیر دروازہ کھول کر ایک کوریڈور میں آیا۔ وہاں سے گزرتا ہوا ایک اور کمرے کے دروازے پر آیا۔ وہ بھی پوری طرح کھلا ہوا تھا۔

اندیشہ بڑھ گیا۔ میں تاریکی میں دشمنوں سے آنکھ مچولی کھیلنا چاہتا تھا۔ اب دشمن مجھ سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اندھیرے میں چاروں طرف

سے گھیرا جا رہا ہوں۔ ایسے حالات میں جسمانی قوت سے زیادہ ذہانت اور مکاری کام آسکتی تھی۔

میں فرش پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتا ہوا کھلے ہوئے دروازے کی دہلیز پر آیا۔ تھوڑی دیر وہاں رک کر تاریکی میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کمرے میں رکھے ہوئے سامان کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ سامان کے پیچھے دشمن چھپے ہوئے ہیں یا نہیں؟

میں آہستہ آہستہ رینگتا ہوا دوسرے کھلے ہوئے دروازے کے قریب پہنچا۔ پتا چلا۔ دوسرا کمرا وہی تھا جہاں ایک عورت چاروں شانے چت لیٹی ہوئی تھی۔ اب بھی اس کی ہلکی ہلکی سی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ میں فرش پر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ایک ہاتھ میں سائلنسر لگا ہوا ریوالور تھا اور دوسرے ہاتھ میں لائٹر۔ میں نے لائٹر کو روشن کرنا چاہا۔ اس سے پہلے ہی کوٹھی کے تمام کمرے بیک وقت روشن ہو گئے۔

تمام کمروں کے بلب اور ٹیوب لائٹس کے سوئچ پہلے سے آن تھے پھر بھی تاریکی تھی۔ مین سوئچ کو آن کرنے سے پوری کوٹھی روشن ہو گئی تھی۔ میں نے روشنی میں دیکھا۔ شلپا ایک لاش کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ روشنی ہوتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ "تم جسمانی لحاظ سے حیرت انگیز طور پر بے انتہا طاقت ور ہو مگر عقل سے خالی ہو۔ میں تمہاری طرح احمق تو نہیں ہوں کہ ایک اٹیچی میں سائلنسر اور ریوالور رکھ دیتی۔ تمہارے ہاتھ میں ایک ناکارہ ریوالور ہے۔ اسے لوڈ کر کے رکھا گیا۔ اگر اسے خالی رکھا جاتا تو تم اس کے ٹریگر کو دبا کر اسے آزماتے۔ تمہیں معلوم ہو جاتا کہ ٹریگر لوز ہو گیا ہے۔ ابھی مجھے گولی مارو۔ پتا چلے گا یہ ڈھیلا ہے۔ ٹریگر دبتا ہے مگر گولی نہیں چلتی۔"

میں نے اس کا نشانہ لے کر ٹریگر کو نہیں دبایا۔ اس سے کہا۔ "تم شیطان کی بیٹی ہو۔ یقیناً تم نے یہی کیا ہو گا۔"

وہ قہقہے لگانے لگی پھر اس نے کہا۔ "یہ تمہاری بدقسمتی ہے کہ میری فلائٹ مس ہو گئی۔ میں اس کوٹھی میں آئی تو تاریکی میں مجھے تمہاری اور بینا کی آواز سنائی دی۔ وہ جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے یہاں سے گئی۔ تم تنہا رہ گئے۔ میں نے سوچا ایک بھی گولی چلاؤں گی اور تم بچ جاؤ گے تو میرے لیے موت بن جاؤ گے۔ تب میں دوسرے کمرے میں دبے قدموں چلی گئی۔"

میں اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "تم نے جو اٹیچی کھولی

اسے لے کر میں ائرپورٹ گئی تھی۔ اس کمرے میں یہ ناکارہ ریوالور تھا۔ میں نے سوچا اگر یہ سائلنسر کے ساتھ تمہارے ہاتھ آجائے تو تم اپنا کوئی ہتھیار استعمال نہیں کرو گے۔ یہ بہتر سمجھو گے کہ بے آواز ریوالور سے دشمنوں کا خاتمہ کرنا چاہیے تاکہ باہر فائرنگ کی آواز نہ جائے۔ اسے کہتے ہیں ذہانت' تمہارے پاس جو پستول اور ریوالور ہو گا' وہ تمہارے لباس کے اندر رہ گیا ہے اور میری چالاکی سے پیش کیا ہوا ریوالور تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں موت سے نہیں ڈرتا مگر مرنے سے پہلے کچھ چالاکیاں تم سے سیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ بتاؤ' میں اس دروازے پر لائٹر جلائے کھڑا تھا' تم نے مجھ پر گولی کیوں نہیں چلائی؟"

وہ بولی۔ "لائٹر کی روشنی ناکافی تھی۔ نشانہ خطا ہوتا تو تم بچ کر چلے جاتے پھر میں یہ جانتی تھی کہ میرے قریب آؤ گے تو ناکارہ ریوالور ہی لے کر آؤ گے۔"

"بینا کو یہاں سے گئے ہوئے ایک گھنٹا ہو رہا ہے۔ تم اتنی دیر میں اتنی روشنی کر کے مجھے گولیوں سے چھلنی کر سکتی تھیں۔"

"میں بینا کو غداری کی سزا دینا چاہتی تھی اس لیے تم سے دور اس کمرے میں آگئی تم اتنے قریب آگئے ہو کہ اب بینا کا انتظار کروں گی تو خود ماری جاؤں گی۔"

"شلپا! اب میں بتاؤں کہ تم نے مجھے بالکل ہی عقل سے پیدل سمجھا ہے۔ کیا مجھ میں اتنی سی بھی عقل نہیں ہے کہ آدمی کو پرائی چیز پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے تمہاری اٹیچی سے صرف سائلنسر لیا ہے۔ ریوالور میرا اپنا ہے۔ ذرا اسے غور سے دیکھو۔ اور یہ بھی سوچو کہ تمہارے کہنے کے باوجود میں نے آزمائش کے طور پر ٹریگر کو کیوں نہیں دبایا تھا؟"

وہ سہم کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میرے ریوالور کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا "تمہارے پستول کی گولی مجھے مارے گی اور میرے ریوالور کی گولی تمہیں۔ موت دونوں کو آئے گی اور یہ ضروری نہیں ہے کہ پستول کی ایک گولی میری جان لے لے۔ بینا آتے ہی مجھے اسپتال' آپریشن کے لیے لے جائے گی۔ تمہارا کیا بنے گا؟"

بات ختم ہوتے ہی ایک ریوالور کی نال میری گردن سے آکر لگی۔ ایک مردانہ بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "ڈونٹ موو۔ میڈم اکیلی نہیں ہیں۔ تم اس کوٹھی کا مین سوئچ آن کرنے والے کو بھول گئے تھے۔"

میں نے ہنستے ہوئے شلپا سے کہا۔ "کس پاگل کے بچے کو باڈی گارڈ بنا رکھا ہے۔ یہ

نہیں جانتا کہ میں اتنا جی دار ہوں کہ گولی کھا کر فوراً نہیں مروں گا۔ تم پر بھی گولیوں کی بوچھاڑ کروں گا۔ اسے اپنے پاس بلاؤ اور حکم دو کہ اپنا ہتھیار میرے قدموں میں پھینک کر سامنے آئے۔"

شلپا نے اسے حکم دیا۔ وہ ریوالور میرے قدموں میں ڈال کر سامنے بیڈ کے پاس آیا۔ میں نے کہا۔ "آرام سے بیڈ پر اپنی ملکۂ عالیہ کے ساتھ بیٹھو۔"

وہ ہچکچانے لگا۔ میں نے سختی سے کہا۔ "کم آن۔ بیٹھ جاؤ۔"

وہ بیٹھ گیا۔ میں نے شلپا سے کہا۔ "ہتھیار ڈالو گی یا ہم دونوں ایک دوسرے کی گولیوں سے مریں گے؟ ویسے میں وعدہ کرتا ہوں۔ پستول پھینک دو گی تو تمہیں گولی نہیں ماروں گا۔"

اس نے مجبور ہو کر پستول میرے سامنے پھینک دیا۔ میں نے فرش پر پڑے ہوئے پستول اور ریوالور کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میدانِ جنگ میں آنے سے پہلے اپنے مقابل کے بارے میں اچھی طرح معلومات حاصل کر لینا چاہیے۔ کیا تم نے اتنی عام سی بات معلوم نہیں کی کہ بھارت آنے سے پہلے میں ذہانت' چالاکیوں اور مکاریوں کی تربیت کیپٹن امیر حمزہ سے حاصل کرتا رہا ہوں۔ اب تم بھی کچھ چالاکی سیکھو۔ یہ لو ریوالور اور سائلنسر۔ یہ وہی فالتو سامان ہے' جسے تم نے میرے ہاتھوں میں پہنچایا تھا۔"

شلپا نے حیرانی اور بے یقینی سے اپنے سامنے پڑے ہوئے ریوالور اور سائلنسر کو دیکھا پھر اسے اٹھا کر اس کے ٹریگر کو بار بار دبایا۔ وہ دبتا گیا مگر ایک بھی گولی نہیں چلی۔

شلپا کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ ریوالور بستر پر گر پڑا۔ میں نے فوجی انداز میں سلیوٹ کرتے ہوئے کہا۔ "میں استادِ محترم کیپٹن امیر حمزہ کو سلام کرتا ہوں۔"

میں نے فوجی انداز میں سلیوٹ کیا تھا لیکن دل میں کہا تھا۔ "میں محترم استاد کیپٹن امیر حمزہ کو سلام کرتا ہوں۔"

شلپا میرے دل کی بات نہیں سن سکی تھی۔ اس نے تو یہی دیکھا کہ میں اس کے سامنے کھڑا سلیوٹ کر رہا تھا۔ وہ حیران بھی ہوئی اور خوش بھی کہ میں اس پر غالب آنے کے باوجود اسے سلیوٹ کر رہا ہوں۔

بعض اوقات انسان خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس سے سبقت لے جانے والا اس کی برتری کو سلام کر رہا ہے۔ شاید سبقت لے جانے والے کا احساس کمتری اسے جیتنے کے باوجود سلام کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔

وہ بولی۔ "میری طرح تم بھی طاقت ور ہو.......... جسمانی طور پر.......... اور میرے

وسیع ذرائع اور اختیارات کے بل پر تم میرے برابر ہو۔ آئندہ ہم دونوں ایک ہو کر بہت بڑی طاقت بن جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "کتے کی بچی! میں تجھے نہیں' اپنے ان استاد محترم کو سلام کر رہا ہوں جو خفیہ ہاتھ کے بھی باپ ہیں۔ ویسے میں نے وعدہ کیا تھا کہ تم اپنا پستول پھینک دو گی تو میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں گا۔"

وہ بولی۔ "دلیر مسلمان جو زبان دیتے ہیں' اس پر قائم رہتے ہیں۔"

"بے شک میں' میں اپنی زبان پر قائم رہوں گا' تم زندہ رہو گی لیکن یہ تو وعدہ نہیں کیا تھا کہ تم اپنے باپ کی طرح دونوں پاؤں سے اپاہج نہیں ہو سکو گی؟"

وہ سہم کر بولی۔ "ک.......... کیا کہہ رہے ہو؟ تم نے کہا تھا مجھے گولی نہیں مارو گے۔"

"گولی مارنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جان سے ماروں گا۔ اگر تم بات پکڑ رہی ہو تو چلو تم پر گولی نہیں چلاؤں گا۔ تمہاری ایک ٹانگ کی طرح دوسری ٹانگ کو بھی اپنے دونوں خالی ہاتھوں سے توڑ دوں گا۔"

وہ خوفزدہ ہو کر اپنے باڈی گارڈ کو دیکھنے لگی۔ میں نے گارڈ کو گولی مار دی۔ شلپا نے اطمینان کی سانس لے کر اپنے گریبان کی زپ کو پکڑ کر ذرا نیچے کیا۔ اس کے سینے پر ایک چھوٹا سا کاغذ چپکا ہوا تھا۔ اس پر لکھا تھا۔ "میں اصل شلپا نہیں ہوں۔"

وہ بیڈ پر کھسکتے ہوئے بیڈ کے سرے پر آئی پھر پہلے کی طرح اونچی آواز میں بولی۔ "میں مانتی ہوں تم غیر معمولی طور پر طاقتور ہو۔ اپنے ہاتھوں سے میرے پیر کی ہڈی توڑ سکتے ہو مگر یہ مردانگی نہیں ہے۔"

پھر وہ بالکل ہی دھیمی آواز میں بولی۔ "شلپا چھپی ہوئی ہے میں اس کے گن پوائنٹ پر ہوں۔"

وہ دوسری بار اونچی آواز میں بولی۔ "اگر وعدہ کرو کہ مجھے زخمی بھی نہیں کرو گے تو میں "را" کے خلاف ایسے اہم راز تمہارے حوالے کر دوں گی جن کے باعث "را" والے تمہارے ہاتھوں کی کٹھ پتلی کی طرح ناچیں گے۔"

اصل شلپا کو نہیں معلوم تھا کہ وہ تمام راز ہم نے چرا لئے ہیں۔ وہ اصلی شلپا کو سنانے کے لئے اونچی آواز میں بولتے وقت مجھے آنکھ مار چکی تھی۔ میں نے انجان بن کر پوچھا۔ "وہ تمام اہم راز کہاں ہیں؟"

"جہاں میں نے تمہیں قید کیا تھا' اس کے دوسرے کمرے میں یعنی میرے بیڈ روم

میں ہیں۔ ہمیں یہاں سے پھر وہاں واپس جانا ہو گا۔"

"میں وہ تمام راز حاصل کرنے کے لیے ضرور وہاں جاؤں گا۔ میرے آگے چلو۔"

وہ دھیمی آواز میں بولی۔ شلپا نے تاکید کی تھی کہ میں اس کی طرح لنگڑا کر چلوں۔

وہ ذرا لنگڑاتے ہوئے میرے آگے چلنے لگی۔ کمرے کے باہر آکر دھیمی آواز میں بولی۔ "چور دروازے والے کمرے میں ایک ہی بلب ہے۔ وہاں پہنچتے ہی بلب کو گولی مار کر توڑ دینا پھر ہم مین سوئچ کو آف کر کے پوری کوٹھی میں اندھیرا کر دیں گے۔"

میں نے تائید کی۔ "جب تمام اہم راز ہمارے پاس ہیں تو ہم وہاں واپس جا کر وقت ضائع نہیں کریں گے۔"

میں نے چور دروازے والے کمرے میں پہنچ کر دیکھا۔ وہاں ایک بلب روشن تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر مین سوئچ نظر آ رہا تھا۔ اگر میں تاریکی کئے بغیر مین سوئچ بند کرنے جاتا تو کہیں چھپی ہوئی اصلی شلپا ہم پر گولیاں چلا سکتی تھی۔ اب تک اس نے بینا کو میرے سامنے پیش کر کے گن پوائنٹ پر رکھا تھا۔ وہ مجھے ہلاک کر کے اپنے باپ کالیا کے لئے پرابلم پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

میں نے فوراً ہی بلب کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی کمرے میں تاریکی ہو گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دوڑتا ہوا مین سوئچ بورڈ کے پاس آکر اسے بند کر دیا۔ اس کے بعد پوری کوٹھی تاریک ہو گئی۔ "میرا ہاتھ چھوڑو اور دیوار سے لگ کر اپنے بائیں طرف چلو۔ میں تمہارے ساتھ چلتی رہوں گی۔ چور دروازہ اگرچہ روشنی میں نظر نہیں آتا ہے۔ اسے کھولنے کی ٹیکنیک میں جانتی ہوں۔"

مجھے ایک دم شبہ ہوا۔ چور دروازہ اگرچہ روشنی میں بھی نظر نہیں آتا تھا لیکن میں نے ایک بار بینا کے ساتھ باہر آکر اسے یاد رکھا تھا کہ وہ کدھر ہے؟ اور ابھی بلب توڑ کر اندھیرا کرنے سے پہلے بھی دروازہ نظر نہ آنے کے باوجود میری یادداشت نے بتایا تھا کہ وہ چور دروازہ کدھر ہے؟

یعنی مجھے وہاں تک پہنچنے کے لیے دائیں دیوار سے لگ کر جانا چاہیے تھا۔ جبکہ وہ مجھ سے ہاتھ چھڑا کر بائیں طرف چلنے کو کہہ رہی تھی۔ ہو سکتا ہے' وہ غلطی سے ایسا کہہ رہی ہو۔ اصلی چھپی ہوئی شلپا سے خوفزدہ رہنے کے باعث کچھ بدحواس ہو گئی ہو لیکن مجھے سب سے پہلا سبق یہی سکھایا گیا تھا کہ میں اپنے سائے پر بھی بھروسا نہ کروں۔ میں نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ ہاتھ چھوڑتے ہی وہ تاریکی سے فائدہ اٹھا کر چور راستے سے

جا کر اسے اندر سے بند کر سکتی تھی۔

میں نے کہا۔ "تمہارا ہاتھ چھوڑوں گا تو تاریکی میں بھٹک جاؤں گا۔ آگے بڑھو۔ میں تمہارے ساتھ ہی دیوار سے لگ کر چلوں گا۔"

"اوہ تم سمجھتے نہیں ہو۔ دروازہ کھولنے کی ٹیکنیک ایسی ہے کہ دونوں ہاتھوں سے کھولنا ہو گا۔ جب ہم دیوار سے لگ کر چل رہے ہیں تو ہاتھ پکڑنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"

"ایک شرط پر ہاتھ چھوڑوں گا۔"

"کیا مجھے دشمن سمجھ کر شرط منوا رہے ہو؟"

"میں دوست بن کر ایک پیار بھری شرط ماننے کو کہہ رہا ہوں۔"

"تمہاری پیار بھری ہر شرط منظور ہے۔ بولو کیا شرط ہے؟"

"تم نے شلپا کی قید سے نکالتے ہی مجھے ایک پیار بھری گرمی دی تھی۔ میرے ہونٹوں پر اب تک اس کی آنچ آ رہی ہے۔ بس میری جان! میرے ہونٹوں پر وہی انگارا دہکا دو۔"

وہ دھیمی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "تم بڑے وہ ہو۔"

اس کا ایک ہاتھ میری گرفت میں تھا۔ وہ دوسرا ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر اپنا چہرہ میرے چہرے کے قریب لائی۔ میں نے اس کے سانسوں کی گرمی محسوس کرتے ہی اسے ہولے سے دھکا دے کر پیچھے ہٹا کر کہا۔ "تمہارا یہ ہاتھ میری گرفت میں رہے گا.......... یا میں مین سوئچ آن کر کے روشنی کروں۔ تم بینا نہیں شلپا ہو۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو۔ اندھیرے میں اپنی بینا کو نہیں پہچان رہے ہو۔"

"پہچان لیا ہے۔ بینا سے میرا کوئی رومانی تعلق نہیں ہے۔ وہ میرے کام آ رہی ہے۔ میں اس کے کام آ رہا ہوں۔ وہ تمہاری وفادار رہتی مگر تمہارے شیطان باپ نے اسے بیٹی کی ہم شکل بنا کر بیٹی کہنے کے باوجود اس کی عزت سے کھیلنا چاہا مگر خوش قسمتی سے وہ بچ گئی۔ اسے تمہارے لاکھوں روپوں کے مقابلے میں اپنی آبرو عزیز ہے۔ وہ حالات سے مجبور ہو کر مجرم بن گئی لیکن گناہ گار نہ بن سکی۔ اگر تم بینا ہوتیں تو میری ایک کال پر کال گرل کی طرح یوں میرے قریب نہ آتیں۔"

وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ "ہاتھ چھڑا کر کہاں جاؤ گی؟ کیا اب بھی تمہارے فرار کا راستہ رہ گیا ہے؟"

"اتنا تو یقین ہے کہ تم اپنی زبان پر قائم رہو گے۔ مجھے گولی نہیں مارو گے۔"

"ابھی تمہارے جھوٹ بولنے اور فریب دینے سے پہلے میں نے وعدہ کیا تھا۔ وعدے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ سچی زبان پر قائم رہنے والے کو بار بار دھوکے دیتی رہو۔"

اندر چور دروازے کے قریب بینا کی آواز سنائی دی۔ "فرہان! جب تک کوٹھی میں روشنی رہی۔ میں چھپ کر شلپا کی تمام حرکتیں دیکھتی رہی۔ یہ میری واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے اپنے ایک مسلح ماتحت کو باہر چھپا رکھا تھا تاکہ وہ مجھے گولی مار دے یا مجھے اس کے سامنے پکڑ کر لے آئے لیکن میں کوٹھی کے پچھلے دروازے کو ذرا سا کھلا دیکھ کر محتاط ہو گئی۔ وہ مسلح ماتحت جہاں چھپا ہوا تھا' وہاں میں نے پیچھے سے اس پر حملہ کیا۔ اس سے گن چھین کر معلوم کیا' شلپا اپنے ایک باڈی گارڈ کے ساتھ یہاں ہے۔ میں نے گن کے دستے سے اس کو مار کر بے ہوش کر دیا ہے۔ باہر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ شلپا ادھر چور دروازے تک نہیں آسکے گی۔ تم اسے باہر لے چلو۔"

میں اسے کھینچتا ہوا باہر لایا۔ بینا بھی ہمارے پیچھے آئی۔ اس نے کہا۔ "تم اپنی زبان پر قائم رہو۔ گولی نہ چلانا۔ میں چلاؤں گی۔ اسے زندہ چھوڑا گیا تو یہ بھید کھول دے گی کہ تم ایک ہم شکل شلپا کے ساتھ فرار ہو گئے ہو۔"

شلپا نے کہا۔ "میں قسم کھاتی ہوں۔ بھید نہیں کھولوں گی۔"

"میں تمہارے باپ کی کمینگی کو دیکھ چکی ہوں۔ تمہیں بھی اچھی طرح جانتی ہوں تمہاری موت کے بعد تمہارے باپ کالیا اور دوسرے وفادار میرے ماں باپ اور بہن بھائی کو ہلاک نہیں کر سکیں گے۔ میں ان کی حفاظت کروں گی۔"

وہ گڑگڑانے لگی۔ اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔ بینا نے ریوالور سے نشانہ لے کر تڑاتڑ اس کے چہرے پر گولیاں ماریں۔ گولیوں نے اس کے چہرے کو یوں چھلنی کر دیا کہ آئندہ کوئی اسے صورت سے پہچان نہیں سکتا تھا۔ اس کی موت کے بعد بھی بینا' شلپا کی حیثیت سے زندہ رہنے والی تھی۔

اس علاقے میں رات کے وقت بڑی دیر تک فائرنگ ہوئی تھی۔ ہم کسی کے آنے سے پہلے مردہ شلپا کے لباس کی تلاشی لے کر ایک موبائل فون اور ایک چھوٹی نوٹ بک نکال کر وہاں سے بھاگتے ہوئے چلے گئے پھر ایک سڑک کے کنارے پہنچ کر تیزی سے چلنے لگے۔

میں نے کہا۔ "اس کی موت ضروری تھی۔ یہ بھی ضروری تھا کہ اس کی لاش پہچانی نہ جا سکے۔ آئندہ "را" والے اس دھوکے میں رہیں گے کہ وہ زندہ ہے اور "را" کے

تمام راز اس کے پاس محفوظ ہیں۔"

وہ بولی۔ "یہ اچھا ہوا میں نے واپس آنے میں دیر کی۔"

"دیر ہو گئی.......... یا جان بُوجھ کر دیر کی؟"

"میں اطمینان کرنا چاہتی تھی کہ شلپا یہاں سے جا چکی ہے۔ اگر وہ جا چکی ہوتی تو حالات کچھ اور ہوتے۔ میں نے ائرپورٹ پہنچ کر معلوم کیا کہ ابھی جو فلائٹ لندن گئی ہے۔ اس کے مسافروں میں رتنا دیوی (شلپا) کا نام ہے یا نہیں؟ کاؤنٹر گرل نے کمپیوٹر اسکرین پر دیکھا پھر بتایا کہ رتنا دیوی اس فلائٹ سے جانے والی تھیں لیکن وہ طیارے میں سوار نہیں ہوئی ہیں۔ ان سے فلائٹ مِس ہو گئی ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہی ائرپورٹ سے محتاط ہو کر تمہاری طرف واپس آئی تھی۔"

"تم بہت ذہین ہو۔ اب کہاں جانا ہے اور اپنا حلیہ کہاں تبدیل کرنا ہے۔"

"اب زیادہ پریشانیاں نہیں ہوں گی۔ کالیا کے تمام ماتحت مجھے شلپا سمجھ کر میرے احکامات کی تعمیل کریں گے۔"

اس نے ایک ٹیکسی روکی۔ ہم سینٹرل ممبئی کے ایک علاقے کے ایک بنگلے میں پہنچے۔ بینا نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص نے دروازہ کھولا۔ بینا کو دیکھتے ہی شلپا سمجھ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا۔ وہ اندر آ کر بولی۔ "ڈاکٹر رگھو ناتھ! یہ میرا نیا ماتحت ہے۔ اس کے چہرے پر ان لوگوں کا ماسک میک اپ کرو جو مر چکے ہیں لیکن جن کی تصویریں اور پاسپورٹ وغیرہ تمہارے پاس ہیں۔"

اس نے ایک البم مجھے دی۔ میں نے ایک جوان کی تصویر پسند کی۔ وہ بولی۔ "ہاں.......... یہ ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر! اپنی مہارت دکھاؤ بالکل ایسا جوان اسے بنا دو۔ میں اس کے کاغذات چیک کر رہی ہوں۔"

ڈاکٹر رگھو ناتھ کا تعلق انڈر گراؤنڈ مافیا کے گاڈ فادر کالیا سے تھا۔ یہ جانتا تھا کہ باپ کی جگہ بیٹی گاڈ مدر کی حیثیت سے انڈر گراؤنڈ ورلڈ میں کامیابی سے تمام معاملات نمٹا رہی ہے۔ وہ ڈاکٹر تین زاویوں سے دیکھتے ہوئے آئینے کے سامنے مجھے بٹھا کر اپنا کام کرنے لگا۔

ایسے وقت بینا کے سامنے ایک فائل، ایک ویڈیو اور ایک آڈیو کیسٹ رکھے ہوئے تھے۔ وہ فائل کھول کر پڑھتی ہوئی مجھ سے کہہ رہی تھی۔ "جس جوان کا ماسک تمہارے چہرے پر لگایا جا رہا ہے اس کا نام رنجن ورما تھا۔ وہ بھی تمہاری طرح قد آور اور صحت مند تھا لیکن کسی حد تک طاقتور ہونے کے باوجود کبھی کسی سے لڑتا جھگڑتا نہیں تھا۔ صلح صفائی سے رہتا تھا۔ کوئی دشمن ہو تو اسے بھی دوست بنانے کے لیے جھک جاتا تھا۔

لوگ اس کی امن پرستی اور شرافت کو بزدلی سمجھتے تھے۔ وہ ایک دولت مند باپ کا بیٹا تھا اور ایک دولت مند کی بیٹی نرملا بجاج سے محبت کرتا تھا۔ دونوں کی سگائی (منگنی) ہو چکی تھی۔ نرملا کے باپ کا نام پتامبر بجاج تھا۔ سگائی کے ایک ہفتہ بعد ہی رنجن ورما کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے ہونے والے سسر پتامبر بجاج کا تعلق انڈر گراؤنڈ مافیا کے گاڈ فادر شمشیر سنگھ کالیا سے ہے۔ وہ کالیا کا دستِ راست ہے اور آئندہ الیکشن میں جیتنے کے انتظامات کر کے مکھ منتری (وزیر اعلیٰ) بننے والا ہے۔

رنجن نے نرملا سے ملاقات کر کے اس سے کہا۔ "تم جانتی ہو کہ تمہارے پتا جی کا درپردہ کیا کاروبار ہے؟"

نرملا نے کہا۔ "جانتی ہوں۔ جب تک کالا دھندہ نہ ہو کوئی ہماری طرح دولت مند نہیں بن سکتا ہے اور نہ ہی منسٹر بن سکتا ہے۔"

رنجن نے کہا۔ "میرے ڈیڈی ایک صاف ستھرا کاروبار کر کے دولت مند بن گئے ہیں۔ یہ غلط ہے کہ دولت حاصل کرنے کے لئے کالا دھندا کیا جائے، مکھ منتری بن کر جنتا کو دھوکا دیا جائے اور اپنے دیس کو اندر سے کھوکھلا کیا جائے۔"

"ایسی باتیں کتابیں پڑھنے والوں کے لئے چھوڑو۔ تم مجھے دل و جان سے چاہتے ہو۔ پتا جی کہتے ہیں کہ تم ذہین ہو۔ دشمنوں کو بھی دوست بنا لیتے ہو۔ وہ منسٹر بننے کے بعد تمہیں "را" کا ایک اعلیٰ افسر بنا دیں گے۔ تم پاکستان جا کر وہاں کے سول اور فوجی افسروں کو بڑی ذہانت سے دوست بنا کر ان کے اہم راز اور ان کی ڈھکی چھپی کمزوریوں کو معلوم کر سکو گے۔"

رنجن نے کہا۔ "میں نے صرف تم سے محبت کی ہے۔ تمہیں اپنی دھرم پتنی بنانا چاہتا ہوں۔ یہ سب کچھ محبت سے ہونا چاہیے، سازشوں سے نہیں۔ تم اچھی طرح سوچ لو۔ اگر میرا راستہ چھوڑ کر اپنے باپ کے راستوں پر چلو گی تو میں مجبور ہو کر سگائی توڑ دوں گا۔ دولت مند بننے کا خواب دیکھنے والے تمہیں بہت مل جائیں گے لیکن محبت کرنے والا نہیں ملے گا۔ کل تک فیصلہ کر لو اور شام کو جوہو کے کنارے ملو۔ میں وہاں انتظار کروں گا۔"

رنجن دوسری شام جوہو کے ساحل پر گیا۔ نرملا اپنی کار میں آئی۔ اس سے بولی۔ "اپنی کار یہیں چھوڑ دیتی ہوں۔ میرا ڈرائیور لے جائے گا۔"

وہ رنجن کی کار میں بیٹھ کر بولی۔ "یہاں تفریح کرنے والوں کی بھیڑ ہے۔ آگے ویران ساحل کی طرف چلو۔"

وہ ڈرائیو کرتا ہوا ادھر جانے لگا۔ یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جسے دل و جان

سے چاہتا ہے' وہ اس کی جان کی دشمن بن چکی ہے۔ وہ یہ کہہ کر اسے بہلاتی رہی کہ وہ غلط راستے پر تھی اسے رنجن جیسا محبت کرنے والا نہیں ملے گا لیکن پتا جی یہ نہیں چاہیں گے کہ تم انڈر گراؤنڈ مافیا اور "را" کے تعلقات سے واقف ہونے کے بعد یہاں رہو۔ ہم یورپ کے کسی ملک میں جا کر رہیں گے۔"

شام کے بعد رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ تب دو گاڑیوں نے آکر راستہ روکا۔ رنجن نے کار سے اتر کر پوچھا۔ "کون ہو تم لوگ؟ راستے سے ہٹ جاؤ۔"

دو گاڑیوں سے کئی گن مین نکلے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "ہم راستے سے ہٹنے کے لیے نہیں ہٹانے کے لئے آئے ہیں۔"

رنجن یہ دیکھ کر پریشان رہ گیا کہ نرملا اچانک دوڑتے ہوئے ان دشمنوں کی طرف چلی گئی تھی پھر وہ بولی۔ "میرے پتا جی کے کالے دھندے کو سمجھنے والا اور مخالفت کرنے والا کبھی زندہ نہیں رہتا' تمہارے جیسے بے وقوف زندہ رہ کر ہمارے لئے خطرہ بنے رہتے ہیں۔"

رنجن اس کی بات سنتے ہی چھلانگ لگا کر اپنی کار کے پیچھے گیا۔ کتنے ہی گن مین فائر کرنے لگے۔ اس نے جوابی دو فائر کئے پھر تاریکی میں زمین پر رینگتا ہوا ایک چٹان کی آڑ میں جانا چاہا اسی وقت اسے گولی لگی۔ اس کے حلق سے چیخیں نکل گئیں پھر دوسری گولی لگی۔ وہ چیختا اور لڑکھڑاتا ہوا چٹان کی بلندی سے سمندر کے گہرے پانی میں جا کر ڈوب گیا۔

اس پر حملہ کرنے والوں نے اس چٹان پر آکر ٹارچ کی روشنی میں دیکھنا چاہا۔ روشنی میں سمندر کا گہرا پانی دکھائی دیا پھر دو گولیاں کھا کر گرنے والا دکھائی نہ دیا۔

"را" والوں نے بڑی راز داری سے ماہی گیروں کو ہزاروں روپے دے کر سمندر کے اس حصے سے دور دور تک جال پھنکوا دیا۔ تمام جالوں میں مچھلیاں آئیں مگر اس کی لاش نہیں ملی۔ آخر ان ماہی گیروں نے کہا۔ "ادھر گہرائی بہت ہے۔ اتنی گہرائی میں غوطہ خور ہی جا سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ لاش بڑی مچھلیوں کی خوراک بن گئی ہو۔"

بینا نے رنجن کی اتنی ہسٹری پڑھنے کے بعد مجھ سے کہا۔ "یہ اچھا ہوا کہ انہیں رنجن کی لاش نہیں ملی۔ آدمی جی دار ہو تو دو گولیاں کھا کر اور سمندر میں گر کر بھی بچاؤ کا کوئی راستہ نکال لیتا ہے۔ میں شلپا کی حیثیت سے پتامبر بجاج اور اس کی بیٹی نرملا کو جانتی ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "پھر تو وہ مجھے یعنی رنجن کو زندہ دیکھ کر ہمارے پیچھے پڑ جائیں گے۔"

"میں چاہتی ہوں' کل صبح تک ہم ممبئی چھوڑ دیں۔ دہلی چلے جائیں۔ یا تم بتاؤ' کیا چاہتے ہو۔"

"میں ابھی تمام حالات کا جائزہ لے رہا ہوں۔ فی الحال مجھے رنجن اور نرملا کا آڈیو کیسٹ سناؤ۔"

میں کیسٹ میں ان دونوں کی گفتگو سننے لگا۔ جب میرا ماسک میک اپ مکمل ہو گیا تو بینا میک اپ کے لئے سہ رخی آئینے کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ میں ٹی وی کے پاس آکر رنجن اور نرملا وغیرہ کی ویڈیو کیسٹ دیکھنے لگا۔ رنجن کے اٹھنے بیٹھنے' چلنے پھرنے اور بولنے کے انداز کو ذہن نشین کرنے لگا۔ اس کیسٹ میں رنجن کے ماں باپ اور نرملا کا باپ پتامبر بجاج بھی نظر آئے۔ رنجن اور نرملا کی سگائی کا منظر بھی دکھائی دیا۔

بینا نے عارضی سا میک اپ کیا کیونکہ شلپا کی حیثیت سے اب اسے صرف "را" والوں سے خطرہ تھا۔ وہ "را" کے اہم راز حاصل کرنے کے لئے شلپا کو تلاش کر رہے تھے۔ عارضی میک کے بعد اس نے ڈاکٹر رگھو ناتھ سے کہا۔ "اس البم میں جتنے مرنے اور مارے جانے والوں کی تصویریں ہیں ان کی تمام ہسٹری کی فائلیں ویڈیو اور آڈیو کیسٹس لے آؤ۔"

وہ تمام چیزیں لانے کے لئے دوسرے کمرے میں گیا۔ بینا نے کہا۔ "ڈاکٹر رگھو ناتھ کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ میں یہاں سے نکل کر بتاؤں گی کہ اس کی موت کیوں ضروری ہے۔"

ڈاکٹر دو سوٹ کیسوں میں تمام مطلوبہ چیزیں لے آیا۔ میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ خود کو چھڑانے کے لئے تڑپنے لگا لیکن حلق میرے شکنجے میں تھا۔ وہ سانس نہیں لے سکتا تھا اور نہ ہی زیادہ دیر سانس روک سکتا تھا۔ صرف دو منٹ میں وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ پھر بھی میں نے پانچ منٹ کے بعد اسے چھوڑا تو اس کی لاش فرش پر گر پڑی۔

بینا نے کہا۔ "را" والے کالیا اور شلپا کے دشمن ہیں جیسا کہ تم جانتے ہو۔ شلپا انہیں بلیک میل کر رہی ہے۔ انہوں نے کالیا کے دستِ راست پتامبر بجاج سے وعدہ کیا ہے کہ وہ کسی طرح شلپا کو ٹریپ کر کے تمام راز حاصل کر لے تو کالیا کا علاج ہونے کے باوجود اسے گولی مار کر پتامبر بجاج کو گاڈ فادر بننے کا موقع دیا جائے گا۔ میں نے اسی لئے عارضی میک اپ کیا ہے کہ پتامبر بجاج مجھے شلپا سمجھ کر حملہ نہ کرے اور یہ ڈاکٹر کسی وقت بھی یہ بھید کھول سکتا تھا کہ تمہیں ایک مقتول رنجن کا ماسک پہنایا گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہاں پتامبر بجاج سے سامنا ہو گا تو اس سے نمٹ لیا جائے گا۔ پہلے

میں لندن میں امی اور لاہور میں عابی اور دیدی تابانی کی خیریت معلوم کروں گا۔"

میں نے ان سب سے رابطہ کرنے کے لئے ڈاکٹر رگھوناتھ کا فون استعمال کیا۔ پہلے امی سے باتیں کیں' انہوں نے اپنے مختصر حالات بتائے۔ اپنی خیریت کا یقین دلایا۔ یہ بتایا کہ پاکستان میں دردانہ بیگم نے حکومت بنالی ہے۔ میں انکل ہاشم سے رابطہ کروں تو اور بہت کچھ معلوم ہو سکے گا۔ تابانی اور عابی ایک کوٹھی میں محفوظ ہیں۔

میں نے امی کے بتائے ہوئے نمبر پر انکل ہاشم سے رابطہ کیا۔ انہوں نے کہا۔ "ویسے تو سب خیریت ہے لیکن حمزہ اور راجہ نواز کے لاپتا ہو جانے کا صدمہ ہے۔ ان دونوں کا کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے۔ یہ خفیہ ہاتھ کی ایسی چال ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ ان دونوں کی عدم موجودگی کے باعث خفیہ ہاتھ نے پھر ایک بار پاکستان میں اپنی کٹھ پتلی حکومت بنالی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہمیں ان دونوں کی کمی پوری کرنی چاہیے۔ میں پاکستان آنے والا ہوں۔"

"نہیں بیٹے! ابھی نہ آؤ۔ حمزہ اور راجہ کے گم ہونے کے بعد ایک نئی چال چلی جا رہی ہے۔ مراد کو موجودہ حکومت کل صبح رہائی دلانے والی ہے۔ تابانی اس سے ملاقات کرے گی۔ میرے جانباز ہر ممکن طریقے سے تابانی کی حفاظت کریں گے۔"

"کیا دیدی (تابانی) کو موجودہ حکومت سے خطرہ ہے؟"

"ہاں.......... تابانی نے چیلنج کیا تھا کہ پہلے مراد کو رہا نہ کیا گیا تو وہ حکومت بنانے والی دردانہ بیگم اور دوسرے ایم این اے وغیرہ کو اسمبلی تک پہنچنے نہیں دے گی۔ خفیہ ہاتھ کو معلوم ہے کہ میں نے دوبارہ گاڈ فادر کی حیثیت سے طاقت' وسیع ذرائع اور اختیارات حاصل کر لئے ہیں۔ میری پشت پناہی کے باعث تابانی موجودہ حکمرانوں کو اسمبلی تک پہنچنے نہیں دے گی لہٰذا فی الحال تابانی کا مطالبہ مان لیا گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس مطالبے کو تسلیم کرنے کے پیچھے کوئی زبردست سیاست ہو گی۔"

"ہمیں یہی دیکھنا ہے کہ وہ تابانی کے خلاف کیسی چالیں چلیں گے اسی لئے تم سے کہہ رہا ہوں' ابھی یہاں کا رخ نہ کرو۔ کل شام تک کسی وقت مجھ سے رابطہ کرو میں تمہیں یہاں کے بدلتے ہوئے حالات بتاؤں گا۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ بینا نے کہا۔ "فرمان! دیر نہ کرو۔ یہاں کا فون ٹیپ کیا جا سکتا ہے اور دشمن یہاں آسکتے ہیں۔"

میں بینا کے ساتھ تمام سامان اٹھا کر اس بنگلے سے نکل آیا۔

☆======☆======☆

رات کے دس بجے تھے۔ دردانہ بیگم اپنے مشیروں اور اپنی پارٹی کے اہم قابلِ اعتماد سیاست دانوں کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے غصہ آرہا تھا کہ حکمران بننے کے بعد بھی اسمبلی تک نہیں جاسکتی تھی۔ اسے تابانی کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہ بہت ہی خطرناک عورت ہے۔ اسے کسی طرح قابو میں کر لیا جائے تو زندہ رہنے کی ضمانت ملے گی۔ ورنہ موت مقدر بن جائے گی۔

ایک دن کے بعد اسمبلی میں جا کر اسے حلف اٹھانا تھا۔ خفیہ ہاتھ نے اسے سمجھایا تھا کہ اسمبلی کا رخ کرنے سے پہلے تابانی کا مطالبہ مان لیا جائے پھر مراد کی رہائی کے بعد اس عورت کو ٹریپ کیا جائے گا۔ وہ عورت ہے مگر بڑی مکار اور ناقابلِ شکست ہے۔ حمزہ اور راجہ کی طرح اس کے خلاف بھی سیاسی چالیں چلی جائیں گی۔

ایک مشیر نے کہا۔ "خفیہ ہاتھ نے بہترین مشورہ دیا ہے۔ اگر ہم پہلے ہی دن اسمبلی میں نہ جاسکے تو ہماری بڑی بدنامی ہو گی۔ یہی تاثر پیدا ہو گا کہ ہم آئندہ اپنی حکومت قائم نہیں رکھ سکیں گے۔"

ایک سیاست داں نے کہا۔ "اپنی حکومت کے پانچ برس پورے کرنے کے لئے ایک ضدی بچی کی بات مان لینے سے ہماری توہین نہیں ہو گی کیونکہ ابھی جو کچھ ہو رہا ہے' اس کا علم عوام کو نہیں ہے۔"

"تابانی کی بات مان لینے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ پرائیویٹ سراغ رسانوں کی نظروں میں رہے گی اور مراد کے ذریعے معلوم ہوتا رہے گا کہ وہ گاڈ فادر ہاشم سے کس طرح رابطہ رکھتی ہے۔"

ایسی خفیہ میٹنگ اکثر بند کمروں میں ہوا کرتی ہے۔ وہ بھی ایک بہت بڑے ہال نما کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دروازے پر دستک سنائی دی۔ پرسنل سیکرٹری نے ایک ٹی وی اسکرین کو آن کیا۔ بند دروازے کے باہر اسسٹنٹ جیلر اور سیکورٹی افسر نظر آرہے تھے۔ پرسنل سیکرٹری نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

سیکورٹی افسر نے کہا۔ "سر! یہ سینٹرل جیل سے ایک آڈیو کیسٹ لے کر آئے ہیں۔ ہم نے کیسٹ کو اچھی طرح سے چیک کر لیا ہے۔"

"وہ کیسٹ لے کر یہاں کھڑے رہو۔ اسے جانے دو۔"

آنے والا سیلوٹ کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد پرسنل سیکرٹری نے آکر دروازہ کھولا۔ اس کیسٹ کو سیکورٹی افسر سے لیا پھر اسے بھی جانے کا حکم دے کر

دروازے کو بند کردیا۔ ہال میں سب لوگ خاموش تھے۔ سیکرٹری نے دردانہ بیگم سے پوچھا۔ "میڈم! آپ یہ کیسٹ سننا پسند کریں گی۔"

اس نے دردانہ کی اجازت سے کیسٹ کو ریکارڈر میں لگایا پھر اسے آن کردیا۔ تھوڑی دیر بعد فون کی گھنٹی سنائی دینے لگی پھر جیلر کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو۔ یہ سینٹرل جیل ہے۔"

"میں تابانی بول رہی ہوں۔ جیلر سے کہو میں دس منٹ کے بعد مراد سے بات کروں گی۔"

فون بند ہوگیا۔ کیسٹ ریکارڈر خاموش رہا۔ دوسری بار پھر فون کی گھنٹی سنائی دی۔ اس بار مردانہ آواز ابھری۔ "ہیلو میں مراد بول رہا ہوں۔"

تابانی نے کہا۔ "آج شام کو فون پر مجھ سے کہا گیا تھا کہ کل صبح دس بجے تمہیں رہا کردیا جائے گا۔ میں رات آٹھ بجے تک تم سے فون پر تصدیق کرسکتی ہوں۔"

"یہ درست ہے تابانی! کل صبح دس بجے میں کھلی فضاؤں میں آجاؤں گا۔ کیا تم آؤ گی؟"

"کیا میں نادان بچی ہوں کہ رہائی کی خوشی میں تمہارا استقبال کرنے دوڑی چلی آؤں گی۔"

"محتاط رہنا اچھی بات ہے لیکن ہماری ملاقات کہاں ہوگی؟"

"سینٹرل جیل کے سامنے۔"

"کیا؟ ابھی تم نہ آنے کی بات کہہ رہی تھیں اور اب میرے استقبال کے لئے آنے کو کہہ رہی ہو؟"

"جانم! سمجھا کرو۔ میں چہرہ بدل کر دوبارہ پاکستان آئی ہوں۔ یہاں کوئی مجھے پہچان نہیں سکے گا۔ تم بھی مجھے اجنبی عورت سمجھو گے۔ میں اس بات سے فائدہ اٹھا کر اپنی ایک ڈمی تیار کرچکی ہوں۔ کل دس بجے میرے قد و قامت کی ایک عورت سینٹرل جیل کے سامنے اپنی کار میں آئے گی۔ بڑی لگاوٹ سے تمہارا نام لے کر تمہیں بھرپور اپنائیت سے کار میں بٹھا کر ایک کوٹھی میں لے جائے گی۔ تم بھی اس عورت سے ایسی لگاوٹ ظاہر کرو گے جیسے وہی تمہاری تابانی ہو اور تم اسے اچھی طرح پہچان کر اس کے ساتھ جا رہے ہو۔"

"تم جو کہو گی' وہی کروں گا لیکن آخری بار سمجھاتا ہوں۔ ہم دونوں انکل اکرام شاہ ایم این اے کے سائے میں محفوظ رہیں گے۔"

"تم ایک عرصے تک اسپتال اور پھر جیل میں رہ کر حالات کے ہر پہلو پر توجہ دینا بھول گئے ہو۔ تمہارے انکل اکرام شاہ کا "را" والوں کے ساتھ گہرا ربط ہے اور "را" کا ایک ایک جاسوس مجھے گولی مارنے کے لئے ڈھونڈ رہا ہے۔ میں اسی لئے خود جیل کے سامنے آکر تم سے نہیں ملوں گی۔ تم اکرام شاہ کے ذریعے رہائی پا رہے ہو اور اکرام شاہ کے پیچھے "را" کے جاسوس ضرور میری تاک میں رہیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ تمہارے اطمینان کے لئے میں وہی کروں گا جو تم کہہ رہی ہو۔"

"تمہارے اطمینان کے لئے کہہ دیتی ہوں کہ جب میں مطمئن ہوجاؤں گی' یہ یقین ہوجائے گا کہ تمہارا اور ڈمی تابانی کا تعاقب نہیں کیا جارہا ہے تو میں اچانک کسی جگہ تمہارے سامنے آجاؤں گی۔ اچھا اب بند کر رہی ہوں۔ شبھ راتری۔"

فون پر ہونے والی گفتگو ختم ہوگئی۔ کیسٹ ریکارڈر خاموش ہوگیا۔ پرسنل سیکرٹری نے ریکارڈر کو آف کرکے اس میں سے کیسٹ نکال کر دردانہ کے سامنے رکھ دی۔ دردانہ اس کیسٹ کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

ایک سیاست داں نے کہا۔ "میں نے پہلے ہی کہا تھا' وہ عورت بہت چالاک اور ناقابلِ شکست ہے۔ صرف خفیہ ہاتھ ہی اپنے طور پر چالیں چل کر اسے قابو میں کرے گا۔"

دردانہ نے ناگواری سے کہا۔ "کیا ہم ہر معاملے میں خفیہ ہاتھ پر تکیہ کرتے رہیں۔ اس ملک کی انٹیلی جنس میں کوئی ایسا شاطر نہیں ہے' جو اس عورت کا اور اس کی خفیہ رہائش گاہ کا سراغ نہ لگا سکے؟"

وہ پرسنل سیکرٹری سے بولی۔ "انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل سے بات کراؤ۔"

سیکرٹری نے موبائل فون پر رابطہ کیا پھر فون دردانہ کو دیا۔ وہ اسے کان سے لگا کر بولی۔ "ہیلو مسٹر ڈی جی! ایک بہت ہی سیکرٹ معاملہ ہے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک نہایت ہی ذہین بلکہ مکار جاسوس کی ضرورت ہے۔ وہ اتنا چالاک ہو آنکھ سے سرمہ چرا کر ہمارے پاس لا سکے۔"

ڈی جی نے کہا۔ "میڈم! ذہانت اور چالاکی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ ویسے جس حد تک میرے ماتحتوں میں جو ذہین اور چالاک ہے' اس کا نام جمشید ہے۔ اگر کوئی ایسا معاملہ ہو جسے جمشید لاہور میں رہ کر ہینڈل کرسکے اور آپ کے پاس اسلام آباد نہ آنا پڑے تو وقت بھی بچے گا اور کام بھی ہوجائے گا۔"

"میرا کام صبح سے پہلے ہونا چاہیے۔ اس سے بات کراؤ۔"

"آپ اپنا نمبر دے دیں۔ دس پندرہ منٹ کے بعد آپ سے رابطہ ہو جائے گا۔"
دردانہ نے نمبر دے کر فون آف کر دیا۔ دوسرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سیکرٹری نے ریسیور اٹھا کر سنا پھر کہا۔ "آپ ہولڈ کریں۔" اس نے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میڈم! ایک بہت بڑی اشاعت والے اخبار کا مالک آپ سے بہت ہی اہم بات کہنا چاہتا ہے۔"
دردانہ نے ریسیور لے کر کہا۔ "ہیلو میں بول رہی ہوں۔ بہت مصروف ہوں۔ فوراً بولو کیا بات ہے؟"
"میڈم! آپ کے خلاف کالم شائع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ میری فیملی کو گن پوائنٹ پر رکھا گیا ہے۔ میں کالم اور ایک خبر شائع نہیں کروں گا تو میری پوری فیملی کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔"
"وہ خبر اور کالم کیا ہیں؟"
"خبر یہ ہے کہ اسمبلی میں اپنی اکثریت ثابت کرتے ہی دردانہ بیگم نے "را" کے ایک خطرناک دہشت گرد مراد کو رہا کر دیا ہے۔"
"او گاڈ! کس نے تمہاری فیملی کو یرغمال بنایا ہے؟"
"ہم کسی یرغمال بنانے والے کو نہیں جانتے ہیں۔ شبہ کر سکتے ہیں کہ گاڈ فادر ہاشم ایسا کر رہا ہے۔"
موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ بولی۔ "میرے خلاف جو کالم لکھا گیا ہے۔ اسے ابھی فیکس کرو پھر میں بات کروں گی۔"
اس نے ریسیور رکھ کر سیکرٹری سے موبائل فون لیا پھر کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو دردانہ اسپیکنگ۔"
"میڈم! میں انٹیلیجنس کا ایک افسر جمشید بول رہا ہوں۔ آپ سیکرٹ معاملے کی تکمیل کے لئے کتنا وقت دے سکتی ہیں؟"
"صرف چھ گھنٹے۔"
"معاملہ کیا ہے؟"
"کل صبح ایک قیدی کو رہا کیا جائے گا۔ میں اس کے ذریعے اپنے دشمنوں کا سراغ لگانا چاہتی ہوں۔ مجھے ہر لمحہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ قیدی کہا جا رہا ہے۔ کن افراد سے مل رہا اور کیا باتیں کر رہا ہے۔"
"کیا قیدی کو اچانک رہا کیا جا رہا ہے؟ اور کیا قیدی پر آپ کو اعتماد ہے؟"

"اس قیدی پر اعتماد ہے اسے جو کہا جائے گا وہی کرے گا۔"
"ایسے کئی جاسوسی آلات ہیں جو سر کی ٹوپی میں اور جوتوں میں چھپائے جاتے ہیں۔ کمر کی بیلٹ میں بھی چھپائے جاسکتے ہیں' جاسوسی آلات اتنے ننھے ہوتے ہیں کہ کلائی کی گھڑی اور انگوٹھی میں بھی رکھے جاسکتے ہیں۔ سننے والے ڈکٹا فون کی رینج پندرہ یا بیس گز تک ہوتی ہے۔"
دردانہ نے کہا۔ "دشمن بہت چالاک ہیں۔ وہ گھڑی اور انگوٹھی وغیرہ پر شبہ کر سکتے ہیں۔ کوئی ایسی تدبیر ہو کہ دشمنوں کو جاسوسی آلہ نظر نہ آئے۔"
"اگر قیدی صحت مند ہے اور معمولی سا آپریشن برداشت کر سکے تو شانے کے قریب گوشت پر چھوٹا سا چیرا لگا کہ بیس ملی میٹر کا ایک جاسوس آلہ .... لگا کر اوپر سے کھال پر ٹانکے لگائے جاسکتے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جیل میں اس پر تشدد کیا گیا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ ٹانکے لگائے گئے ہیں۔ اگر ان ٹانکوں کو بھی چھپانا چاہیں تو اوپر سے پلاسٹک سرجری ہوسکتی ہے۔ آپ اپنے ذرائع استعمال کر کے چار چھ گھنٹے کے اندر یہ کام کرا سکتی ہیں۔"
"ٹھیک ہے۔ میں یہاں کی انٹیلی جنس والوں سے ابھی یہ کام لوں گی۔"
اس نے موبائل فون کو آف کر دیا پھر اسلام آباد کے انٹیلیجنس والوں کو فون کے ذریعے بلایا۔ فون پر بھی یہ بتایا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ ان کے یہاں آنے جانے سے وقت ضائع ہوگا۔ لہٰذا ایم این اے اکرام شاہ ابھی ان کے پاس آ رہے ہیں۔
دردانہ کے حکم پر اکرام شاہ وہاں سے چلا گیا۔ پرسنل سیکرٹری نے اخبار کے دفتر سے آنے والا فیکس پیش کیا۔ دردانہ کے خلاف لکھے گئے کالم کا خلاصہ یہ تھا کہ دردانہ بیگم کی سیاسی پارٹی کا "را" سے گہرا تعلق ہے۔ اس نے بڑی رازداری سے "را" والوں کے ذریعے امیر حمزہ اور راجہ نواز کو قتل کرایا ہے۔
مخالف پارٹی کے لیڈر نیک بخت کا یہ الزام بھی درست ہے کہ پچھلی بار کاشف اکبر کرپشن کے باعث بدنام ہوگیا تھا۔ اس کے جیتنے کے امکانات نہیں تھے اس لئے دردانہ بیگم نے اپنے شوہر کاشف اکبر کو قتل کرا کر عوام سے ایک مقتول کی بیوہ ہونے کی ہمدردیاں حاصل کرلیں۔ اب وہ "را" والوں سے دوستی نباہنے کے لئے ان کے ایکمراد کو دہشت گرد مراد کو آج جیل سے رہا کرا رہی ہے۔
اس فیکس کو سب نے پڑھا پھر دردانہ نے سیکرٹری سے کہا۔ "میرے خلاف ار کی اشاعت کے بعد ہماری طرف سے بیان شائع کرایا جائے کہ دردانہ بیگم پر جتنے الزا رکھا گیا عائد کئے گئے ہیں' سب بے بنیاد ہیں۔ کسی ایک الزام کا بھی کوئی ثبوت اور گواہ ی کی گئی

ہے۔ عبوری حکومت کے دور میں مراد خان پر جتنے الزامات تھے' وہ بھی بے بنیاد ثابت ہو چکے ہیں۔ اپوزیشن والے اپنی شرم ناک شکست پر بوکھلا گئے ہیں۔ وہ صرف اخبارات کے ذریعے بیان بازی کرتے رہیں گے لیکن ثبوت اور گواہ نہ ہونے کے باعث کبھی عدالت میں نہیں جاسکیں گے۔"

خوب سیاسی جوڑ توڑ کی باتیں ہوتی رہیں پھر وہ خفیہ میٹنگ ختم ہوگئی۔ سب اپنے اپنے گھروں اور بستروں پر چلے گئے۔ دوسری صبح جمشید نے اخبارات کا پہلا صفحہ پڑھا تو چونک گیا۔ خبر تھی۔ "اسمبلی میں اپنی اکثریت ثابت کرتے ہی دردانہ بیگم نے "را" کے ایک خطرناک دہشت گرد مراد کو رہا کردیا ہے۔"

جس مراد اور تابانی کو گرفتار کرنے کے لئے جمشید نے دن رات ایک کردیئے تھے' اسے کسی عدالتی فیصلے کے بغیر رہا کیا جارہا تھا۔ اس نے فون پر اپنے ڈائریکٹر جنرل سے کہا۔ "سر! آپ نے اخبار پڑھا ہے۔ ہم نے جس مراد کو سخت نگرانی میں جیل کے اندر رکھا تھا اسے آج رہا کیا جارہا ہے۔"

ڈی جی نے کہا۔ "دردانہ بیگم نے ہم سے فون پر کسی قیدی کو رہا کرنے کی بات کی تھی۔ میں اس سے قیدی کا نام نہ پوچھ سکا۔ وہ اقتدار میں آنے والی پارٹی کی لیڈر ہے۔ اس سے کوئی سوال نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہم سرکاری افسر صرف یس میڈم اور یس سر کہنے کے لئے رہ گئے ہیں۔"

"سر! میں نے نادانستگی میں یہ مشورہ دیا ہے کہ مراد جاسوسی کا آلہ کہاں چھپا کر رکھے گا۔ اب ظاہر ہوگیا ہے کہ وہ ہمارے ملک کی اہم ہستیوں سے ملتا رہے گا اور "را" کے دوسرے لوگ ان کی باتیں اور اہم راز سنتے رہیں گے۔ پلیز آپ ابھی جیلر سے معلوم کریں کہ مراد کو کس وقت رہا کیا جائے گا۔"

ڈی جی نے فون کے ذریعے جیلر سے پوچھا۔ "مراد نامی قیدی کو کس وقت رہا کیا جارہا ہے۔"

"ٹھیک دس بجے۔ یعنی ایک گھنٹے بعد۔ یہ میڈم دردانہ بیگم کا حکم ہے۔"

"ہوں۔ جب بیگم صاحبہ کا حکم ہے تو اس کی تعمیل ضرور کی جائے گی۔"

ڈی جی نے اس سے رابطہ ختم کیا پھر جمشید سے فون پر کہا۔ "اسے ایک گھنٹے بعد رہا کیا جائے گا۔ تم ایک گھنٹے میں پنڈی نہیں پہنچ سکو گے۔ وہاں کے انٹیلیجنس والے دردانہ بیگم کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کریں گے۔"

"اوہ سر! اس کی رہائی کے وقت تابانی بھی وہاں موجود ہوگی۔ دونوں کو بیک وقت

گرفتار کیا جاسکتا تھا۔ سر! ہم کیا ہیں؟ ہماری دیانت داری' ہماری حب الوطنی کس کام آرہی ہے؟"

"سچائی اور دیانت داری رائیگاں نہیں جاتیں۔ اس سلسلے میں کچھ سوچو۔ میں بھی غور کرتا ہوں کہ ملک دشمن عناصر کی چالوں کو کس طرح ناکام بنادیا جاسکتا ہے۔"

جمشید ریسیور رکھ کر اٹھ گیا۔ بے چینی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا اسے اپنے آپ پر بھی غصہ آرہا تھا کہ اس نے جاسوسی آلے کو چھپانے کی تدبیر کیوں بتائی؟ اس کی بتائی ہوئی تدبیر پر اسی کے ملک کے خلاف عمل کیا جانے والا تھا۔

وہ بڑی دیر تک ٹہلتا رہا۔ جھنجلا کر دیوار پر گھونسے مارتا رہا پھر تیزی سے آکر بیٹھ گیا۔ ریسیور اٹھا کر ڈاکٹرز ایسوسی ایشن کے چیئرمین سے رابطہ کرکے کہا۔ "میں انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ سے جمشید علی تارڑ بول رہا ہوں۔ کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ لیڈی ڈاکٹر آمنہ سے کس نمبر پر رابطہ ہوسکتا ہے؟"

چیئرمین نے بتایا کہ وہ لندن کے چارج ولنگٹن ہسپتال میں ہیں پھر ان کے دو فون نمبر بتائے۔ جمشید نے ان نمبروں پر رابطہ کیا پھر کہا۔ "آنٹی! میں انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔ آپ کی حمایت سے پہلے تابانی فرار ہوئی۔ اس نے آپ کو بھی اغوا کیا۔ ابھی دردانہ بیگم اپنے اختیارات استعمال کرکے مراد کو بھی رہا کررہی ہیں۔ آپ سچی ہیں' ایمان والی ہیں پھر آپ کے عمل سے اس ملک کو نقصان پہنچانے والے کیوں آزاد ہو رہے ہیں۔ کیوں معزز شہری کہلانے والے ہیں؟"

میری امی نے کہا۔ "مجھے سچ کہہ رہے ہو تو یقین کرو تابانی راہِ راست پر آگئی ہے۔ میری بیٹی بن گئی ہے۔ مجھے جیل میں مراد سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی اس لئے ایم این اے اکرام شاہ اسے گمراہ کررہا ہے۔ وہ ملک دشمن عناصر کے زیرِ اثر آکر تابانی کو گمراہ سمجھ رہا ہے۔ تابانی اس سے مل کر اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرے گی اور جب تک وہ راہِ راست پر نہیں آئے گا' تب تک اس پر بھروسا نہیں کرے گی اور نہ ہی اسے اپنا خفیہ اڈا بتائے گی۔"

"اس کے نہ بتانے کے باوجود مراد کو اور دشمنوں کو معلوم ہوتا رہے گا کہ وہ مراد کو کہاں لے جارہی ہے اور اس سے کیا باتیں کررہی ہے۔"

"کیا جاسوسی آلات استعمال کئے جارہے ہیں؟"

"جی ہاں! مراد کے کسی ایک بازو پر آپریشن کرکے ایک ننھا سا جاسوسی آلہ رکھا گیا ہے۔ اس زخم پر ٹانکے لگے ہیں اور ٹانکوں کو چھپانے کے لئے پلاسٹک سرجری کی گئی

ہے۔"

"یا اللہ ! اس طرح تابانی اور ہاشم پر مصیبتیں آئیں گی۔ دیکھو جمشید! مجھ پر اعتماد کرسکتے ہو تو کرو۔ تابانی اور میرا بھائی انڈر گراؤنڈ کا گاڈ فادر ہونے کے باوجود پاکستان کی بہتری اور سلامتی کے لئے کام کر رہے ہیں۔ میں تمہیں سمجھاتی ہوں انہیں دشمن نہ سمجھو۔ اپنے طور پر مطمئن رہنے کے لئے انہیں خاموشی سے آزماتے رہو۔ تمہاری غلط فہمی دور ہوجائے گی۔"

"میں آپ کے مشوروں پر عمل کروں گا لیکن مراد کا کیا ہوگا؟"

"میں ابھی اس کے جاسوسی کے آلات کا توڑ کروں گی لیکن مراد کے سلسلے میں بھی ہمیں تھوڑی مہلت دو۔ ہم اسے بھی دشمنوں کی سازشوں سے بچائیں گے۔ اچھا بیٹے! میں پھر کسی وقت بات کروں گی۔"

میری امی نے اس سے رابطہ ختم کیا پھر انکل ہاشم سے فون پر کہا۔ "تابانی کو فوراً یہ بتاؤ کہ مراد کے ایک بازو میں ایک ننھے سے جاسوس آلے کو چھپایا گیا ہے۔ لہٰذا مراد سے گفتگو کرتے وقت وہ محتاط رہے پھر کسی وقت مراد کو بے ہوش کرکے وہ آلہ اس کے بازو سے نکال لیا جائے۔"

☆=========☆========☆

سینٹرل جیل کے سامنے تابانی کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ٹھیک دس بجے جیل کے وسیع و عریض آہنی دروازے کا ایک چھوٹا ضمنی دروازہ کھلا۔ پہلے جیل کا ایک افسر باہر آیا۔ باہر کھڑے ہوئے دو سپاہیوں نے ایڑیاں بجا کر اسے سلیوٹ کیا۔ پھر تابانی نے مراد کو باہر آتے دیکھا۔ ایک عرصے کے بعد مراد کو دیکھ کر وہ خوشی سے کھل گئی۔ اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اسے اپنے دلی جذبات کو قابو میں رکھ کر اپنی اصلیت کو بھی چھپانا ہے اور ڈمی تابانی بن کر اصلی تابانی کی ایکٹنگ بھی کرنی ہے۔

عام طور پر جیل کا کوئی افسر کبھی کسی قیدی کو رخصت کرنے نہیں آتا لیکن وہ دردانہ بیگم کا خاص رہا ہونے والا معزز قیدی تھا اور افسر بیگم صاحبہ کے کچھ کام آکر ترقی پانا چاہتا تھا۔

تابانی دروازہ کھول کر کار سے باہر آئی۔ مراد دوڑتا ہوا آیا پھر چادر اور چاردیواری کے خلاف دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ مراد نے کہا۔ "تم بالکل پہچانی نہیں جارہی ہو۔"

"میں اصلی چہرے کے ساتھ یہاں نہیں رہ سکتی۔"

"میں صرف چہرے کی نہیں، تمہارے سراپا کی بات کر رہا ہوں۔ تم عورت کہلانا پسند نہیں کرتی تھیں۔ آج تم نے زنانہ شلوار قمیض کے ساتھ دوپٹا اوڑھ رکھا ہے۔ لانبی سی چوٹی اور پراندہ بھی ہے۔ بالکل پنجابن لگ رہی ہو۔"

"بال اتنی جلدی بڑھ نہیں سکتے تھے۔ میں نے چوٹی والی وگ لگائی ہے۔"

"یہ انقلاب کیسے آگیا ہے؟"

"ڈاکٹر آمنہ میری امی ہیں۔ ان کے کردار سے، ان کی شخصیت سے میرے دل نے متاثر ہو کر کہا۔ میں عورت ہوں۔ پہلے مجھے اپنے مرد کی شریک حیات پھر اپنے بچے کی ماں بننا چاہیے۔"

"تم تابانی کی ڈمی ہو لیکن بالکل تابانی کی طرح جذباتی ہو کر بول رہی ہو۔"

"تابانی نے مجھے اچھی ٹریننگ دی ہے۔ وہ بہت غصے والی ہے۔ مجھے دھمکی دے رہی تھی کہ اگر میں پوری طرح جذباتی ہو کر تمہارے سینے سے نہیں لگوں گی اور بات بات پر

ڈاکٹر آمنہ اور گاڈ فادر کا ذکر نہیں کروں گی اور تعاقب کرنے والے دشمنوں کو شبہ ہوگا کہ میں اصلی نہیں نقلی ہوں تو وہ میرا منہ توڑ دے گی۔"

"وہ تمہیں کہاں سے پکڑ لائی ہے؟"

"میں گارڈ فادر ہاشم کی لیڈیز سراغرسانوں میں سے ایک ہوں۔ اب یہیں تمام باتیں ہوں گی یا آگے بھی چلیں گے؟"

وہ دونوں کار کی اگلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ تابانی نے کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھائی۔ جیل کے آہنی دروازے کے قریب وہی رخصت کرنے والا افسر کھڑا تھا۔ جب کار دور جاکر نظروں او جھل ہوگئی تو اس نے موبائل فون نکال کر رابطہ کیا پھر کہا۔ "میں سینٹرل جیل سے آپ کا خادم شاکر علی بول رہا ہوں۔ ایک عورت مراد کو لینے کار میں آئی تھی۔ کار کا نمبر RPD:70523 ہے۔ وہ دونوں سفید ٹویوٹا کرولا میں ہیں۔"

اس نے دوسری طرف سے کچھ سنا پھر کہا۔ "سر! بیگم صاحبہ سے میری سفارش کریں۔ میں ہمیشہ خدمت کے لیے حاضر رہوں گا۔"

دوسری طرف سے فون بند ہوگیا تھا۔ افسر نے ناگواری سے گالیاں دیتے ہوئے اپنا فون بند کردیا۔

تابانی نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے بڑے ٹھاٹ ہیں۔ جیل کا افسر تمہیں رخصت کرنے آیا تھا۔"

"یہی افسر تین دن پہلے تک مجھے چوبیس گھنٹوں میں دو چپاتی اور پانی جیسے شوربے والا سالن دیتا تھا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "یہی لوگ اصل چمچے ہوتے ہیں۔ جو ہانڈی اقتدار کے چولھے پر چڑھتی ہے' اس ہانڈی کے چمچے بن جاتے ہیں۔"

"ان کی باتیں چھوڑو۔ میں کل رات سے اس خوشی میں جاگ رہا ہوں کہ صبح جیل سے نکلتے ہی اپنی تابانی سے ملوں گا۔ اسے بازوؤں میں جکڑ کر طویل جدائی کے تمام ارمان پورے کروں گا۔"

"مایوس کیوں ہو رہے ہو؟ تابانی نہ سہی' مجھے تو دھڑکنوں سے لگا لیا۔ یوں سمجھو ابھی ناشتا کیا ہے۔ کہیں نہ کہیں پہنچنے کے بعد اصلی گھی سے تڑکا لگا ہوا لنچ اور ڈنر سب ہی ملتا رہے گا۔"

اسی وقت فون کا بزر سنائی دیا۔ تابانی نے لباس کے اندر سے موبائل فون نکالتے ہوئے مراد سے کہا۔ "جسٹ اے منٹ۔"

وہ فون آن کرکے بولی۔ "ہیلو کوڈ.......... 786"

دوسری طرف سے ہاشم کی آواز سنائی دی۔ "بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ تمہاری کار کے سینٹرل جیل سے روانہ ہوتے ہی مراد کو رخصت کرنے والے نے موبائل کے ذریعے کسی سے کچھ کہا تھا۔ محتاط رہو۔ تعاقب ضرور کیا جائے گا اور ان کے پاس موبائل فون بھی ہوں گے۔ ویسے میرے ماتحت جانتے ہیں کہ تم کن راستوں سے گزرو گی۔ وہ گاڑیاں بدل بدل کر تمہاری نگرانی کرتے رہیں گے۔"

"تھینک یو انکل۔"

اس نے فون بند کردیا۔ مراد نے پوچھا۔ "تم گاڈ فادر ہاشم کو انکل کہتی ہو؟"

"میں باس کہتی ہوں۔ ابھی تابانی کی حیثیت سے انکل کہا ہے۔"

"اس کار میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں ہے پھر اتنی رازداری کیوں؟"

"ہم ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اس کار کی بھی ایک چار دیواری ہے۔ یہاں بظاہر کوئی نہیں ہے لیکن سائنس کی ترقی نقصان بھی پہنچاتی ہے۔ میں ایک سنیک بار میں سینڈوچ کھانے اور کولڈ ڈرنک پینے گئی تھی ہوسکتا ہے اس وقت کسی دشمن نے اس کار میں کہیں کوئی ڈیکٹو آلہ چھپا دیا ہو۔"

"یہ انگلینڈ یا امریکا نہیں ہے۔ پاکستان جیسے ترقی کے محتاج ملک میں ایسے نایاب اور قیمتی آلات نہیں پائے جاتے۔"

"پاکستان جیسے محتاج ملک سیاسی سطح پر تخریبی قیمتی آلات کے محتاج نہیں ہوتے۔ بڑے بڑے ممالک اسلحہ' جاسوسی کے آلات اور ہمارے تمہارے جیسے دہشت گرد سپلائی کرتے رہتے ہیں۔"

"اوہ..........! میں بھول گیا تھا کہ تابانی سے نہیں ایک گاڈ فادر کی جاسوسہ سے باتیں کر رہا ہوں۔"

"تابانی تو کہہ رہی تھی کہ تمہیں بھولنے کی عادت نہیں ہے۔ بھئی تم تو.........."

اس نے آگے کچھ کہنے کے لئے مراد کے بازو کو زور سے دبایا۔ وہ تکلیف سے کراہنے لگا۔ وہ حیرانی سے بولی۔ "کیا ہوا؟"

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "کچھ نہیں' تین دن پہلے تک مجھ پر کبھی کبھی بہت زیادہ تشدد کیا گیا ہے۔ میرے اس بازو کو لوہے کے شکنجے میں جکڑ دیا گیا تھا۔ انکل اکرام شاہ ایم این اے کی پارٹی اقتدار میں آئی ہے تو مجھے ظلم و تشدد سے نجات ملی ہے۔ میرے لئے اسپیشل ڈاکٹر بلایا گیا۔ اس نے اچھی دوائیں دی ہیں۔ انہیں کھانے سے درد محسوس نہیں ہوتا

لیکن بازو پکڑتا ہوں تو تکلیف ہوتی ہے۔"

"ظالموں نے تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ تابانی کو معلوم ہوگا تو وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ جائے گی۔"

"میں تم سے التجا کرتا ہوں' اس سے یہ بات نہ کہنا۔ یہ بھی تو دیکھو کہ پھر انہوں نے مجھے اے کلاس میں رکھا تھا۔ یہ سوٹ میرے لئے سلوایا گیا ہے۔ یہ رسٹ واچ اور خالص لیدر کے جوتے انہوں نے ہی دیئے ہیں۔"

"کیا انہیں لینے سے پہلے سوچا ہے کہ جوتے کھانے کے لئے بھی دیئے جاتے ہیں اور پہننے کے لئے بھی دیئے جاتے ہیں۔"

"کیا فضول باتیں کر رہی ہو؟"

"سمجھا رہی ہوں۔ انہوں نے جن مقاصد کے لئے تمہیں رہائی دلائی ہے' ان مقاصد میں ناکام رہو گے تو یہی جوتے کھانے پڑیں گے۔"

"یُو شٹ اَپ۔ تم تابانی نہیں ہو کہ تمہاری باتیں برداشت کروں۔ اپنی حد میں رہو۔"

"اپنی حد کے مطابق ایک جاسوسہ ہوں۔ یہ سمجھ سکتی ہوں کہ اس سوٹ میں' کلائی کی گھڑی میں اور جوتوں میں کوئی جاسوسی آلہ ہو سکتا ہے۔ للذا ابھی بازار جاکر تمہارے لئے نیا جوڑا......... اور نئے جوتے خریدوں گی۔ یہ گھڑی ابھی باہر پھینک دو۔ وقت دیکھنے کے لئے میرے پاس گھڑی ہے۔"

"میں تمہارا محکوم یا تابعدار نہیں ہوں۔ تم میرا لباس اور میری چیزیں بدلنے والی کون ہوتی ہو۔؟"

اس نے سڑک کے کنارے گاڑی روک کر کہا۔ "میں ابھی فون پر گاڈ فادر سے کہوں گی کہ تم میری مرضی کے مطابق اپنی منزل تک نہیں پہنچنا چاہتے ہو۔ للذا تمہیں جہلم شہر میں اتار دوں گی۔ اپنے ساتھ لاہور نہیں لاؤں گی۔"

یہ کہہ کر اس نے لباس سے موبائل فون نکالا۔ مراد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "اگر میرے اندر تابانی سے ملنے کی بے چینی نہ ہوتی تو میں تمہیں یہیں قتل کرکے چلا جاتا۔ آگے بڑھو' تم جو کہو گی' وہی کروں گا۔"

وہ کار آگے بڑھاتے ہوئی بولی۔ "کلائی سے گھڑی اتارو اور کھڑکی سے باہر پھینک دو۔"

اس نے غصے سے تابانی کو دیکھا پھر گھڑی کو کلائی سے الگ کرکے چلتی کار سے کھڑکی

کے باہر پھینک دیا پھر کہا۔ "ہم لاہور جا رہے ہیں' اس کا مطلب ہے' تابانی لاہور میں ہے۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے۔ وہ لاہور سے پہلے بھی اچانک کہیں مل سکتی ہے۔"

اس نے جہلم پہنچ کر مراد کے لئے ایک ریڈی میڈ لباس خریدا۔ جوتے بھی خریدے۔ مراد نے کہا۔ "میں یہاں کیبن میں لباس بدل کر آتا ہوں۔"

"لباس یہاں نہیں' دوسری جگہ بدلا جائے گا۔"

"یہاں بدلنے میں کیا حرج ہے؟"

"اگر تمہیں تابانی سے سچی محبت ہے اور اسے کسی مصیبت میں پھنسانا نہیں چاہتے تو کار میں چل کر بیٹھو۔"

وہ ناگواری سے اس کے ساتھ کار میں آکر بیٹھ گیا۔ کار آگے جانے لگی۔ وہ دل میں کہہ رہا تھا۔ "بڑی چالاک جاسوسہ بن رہی ہے۔ اس کا باپ بھی نہیں سمجھ پائے گا کہ وہ جاسوسی آلہ کہاں چھپایا ہے۔"

تابانی جان بُوجھ کر اس کی گھڑی پھینکنے' لباس اور جوتے بدلنے کی ضد اس لئے کر رہی تھی کہ مراد کے بازو میں چھپے ہوئے آلے سے دشمن سب کچھ سنتے رہیں اور خوش ہوتے رہیں کہ گاڈ فادر ہاشم کی جاسوسہ دھوکہ کھا کر اسے تابانی کے پاس لے جارہی ہے اور آئندہ معلوم ہوجائے گا کہ تابانی کی خفیہ رہائش گاہ کہاں ہے اور اس کی گفتگو سے گاڈ فادر ہاشم کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم ہوتا رہے گا۔"

تابانی نے ہائی وے پر کار کی رفتار تیز کرکے کہا۔ "یہ جوتے اتار کر باہر پھینک دو۔"

"اتار رہا ہوں مگر تم حکم دینے کے انداز میں نہ کہو۔"

"سوری۔ آئندہ خیال رکھوں گی۔"

اس نے دونوں جوتے اور جرابیں اتار کر کھڑکی کے باہر پھینک دیئے۔ تابانی نے بڑی خاکساری سے کہا۔ "یہ ناچیز بندی بصد احترام التماس کرتی ہے آپ اپنی پتلون اتار دیں۔"

وہ دہاڑ کر بولا۔ "کیا.........؟ پتلون؟ تم عورت ہو' تمہیں شرم آتی ہے؟"

"میری نظریں ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہی ہیں۔ پتلون کے ساتھ انڈر ویئر بھی.........."

وہ غصے سے پتلون کی بیلٹ کھول کر بٹن کھولتے ہوئے بولا۔ "میں پتلون اور انڈر ویئر اتار کر باہر پھینکوں گا تو پیچھے آنے والی گاڑیوں کے لوگ سوچیں گے' پتا نہیں یہاں کیا

ہو رہا ہے؟"

"کسی کے آنے تک تم شلوار قمیض پہن چکے ہو گے۔"

وہ جھنجلاتے ہوئے سیٹ پر بیٹھے بیٹھے لباس بدلنے لگا اور جیل سے لایا ہوا لباس اور تمام سامان پھینکنے لگا۔ تابانی نے رفتار اور بڑھا دی تھی۔ تاکہ پیچھے والی کوئی گاڑی برابر نہ آسکے۔ اگر کوئی گاڑی والا آکر کوئی سوال کرتا تو اسے جواب دیا جاسکتا تھا۔

مراد نے ناگواری سے اسے دیکھ کر کہا۔ "میں لباس بدل چکا ہوں۔ تمہارے کلیجے میں ٹھنڈک پہنچ گئی؟"

"میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے؟"

"ایسے فرائض کی ادائیگی کے وقت عورت شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہے۔"

"عورت کی آنکھوں میں شرم ہو تو پانی پانی تو کیا وہ پسینہ پسینہ بھی نہیں ہوتی۔ تم نے دیکھا ہے کہ میری نظریں صرف ونڈ اسکرین کے پار تھیں۔"

"بہرحال میں تمہیں ایک بات سمجھاتا ہوں۔ تابانی یہ برداشت نہیں کرتی کہ میرے قریب کوئی دوسری عورت آئے۔ خدا کے لئے اس سے یہ نہ کہنا کہ میں نے اس طرح لباس تبدیل کیا تھا۔ وہ یقین نہیں کرے گی کہ صرف لباس تبدیل کیا گیا ہوگا۔ وہ تمہیں گولی مار دے گی اور میرا جینا حرام کر دے گی۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ چھ فٹ کے تگڑے مرد ہو کر اپنی عورت سے ڈرتے ہو۔"

"مرد کبھی عورت سے نہیں' اس کی بدمزاجی سے اور بدزبانی سے ڈرتا ہے۔"

"ایسی بدمزاج عورت کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

"تم کیا جانو پیار کیا ہوتا ہے؟ وہ میرے دل کے اندر اتنی گہرائیوں میں بسی ہوئی ہے کہ اسے نکال نہیں سکوں گا۔ اگر وہ کبھی نکل جائے گی تو میرا دم نکل جائے گا۔"

تابانی دل ہی دل میں مراد کی سچی اور گہری محبت سے سرشار ہوگئی۔ اگر ان کے درمیان ایک جاسوس آلہ نہ ہوتا تو وہ ایک طرف کار روک کر تن من سے اس پر قربان ہونے لگتی۔

وہ تکلیف سے کراہنے لگا۔ تابانی نے تڑپ کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"بازو میں تکلیف ہو رہی ہے۔ ہر چار گھنٹے بعد ایک کیپسول اور دو گولیاں کھاتا ہوں۔ اب دوا کا وقت ہوگیا ہے۔ اس لئے تکلیف ہو رہی ہے۔"

تابانی نے آگے جاکر ایک چھوٹے سے ہوٹل کے قریب کار روکی۔ "جاؤ' یہاں سے

پانی لے کر دوا کھاؤ۔"

"ٹھنڈی بوتل پینا ہو تو تم بھی آجاؤ۔"

"نہیں۔ تمہارے جانے کے بعد میں گاڈ فادر سے بات کروں گی۔"

وہ ہوٹل کی طرف گیا۔ تابانی نے موبائل نکال کر رابطہ کیا پھر کہا۔ "انکل! ہر دس پندرہ منٹ میں کوئی گاڑی پیچھے آتے آتے برابر سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ جاتی ہے.......... چار چھ کلومیٹر کے بعد وہ کسی خرابی کے باعث رک جاتی ہے۔ یا کسی دوسرے موڑ پر چلی جاتی ہے پھر کوئی جیپ' وین' سوزوکی یا دوسری کوئی گاڑی آگے پیچھے چلتی ہے۔ اس کے بعد وہ بھی راستہ بدل دیتی ہے۔"

ہاشم نے کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ مراد کے بازو میں جو ڈیکٹو آلہ چھپا ہوا ہے۔ اس آلے کے پاس ہونے والی گفتگو صرف بیس یا بائیس گز کے فاصلے تک سنی جاسکتی ہے۔ تمہارے آگے پیچھے رہنے والی گاڑیاں پندرہ بیس گز تک کے فاصلے تک رہتی ہوں گی۔ اس میں بیٹھے ہوئے افراد ڈیکٹو ریسیور سے سنتے ہوں گے پھر اپنے پیچھے آنے والے ساتھیوں کو آگے بڑھنے کے لئے خود راستہ بدل کر کہیں چلے جاتے ہوں گے۔ دشمنوں کو اپنی تسلی کرنے دو۔ تم اپنے ٹریک پر رہو۔"

دوسری طرف مراد.......... ہوٹل والے سے ایک ٹھنڈی بوتل لے کر ایک کیپسول اور دو گولیاں ایک ایک کرکے کھاتے ہوئے اور بوتل پیتے ہوئے ہوٹل سے ذرا دور ہوا پھر دائیں کندھے کی طرف سر جھکا کر کہا۔ "میں مراد بول رہا ہوں۔ کیا یہ آلہ کام کر رہا ہے؟ اب آپ لوگوں کا جواب سننے کے لئے میرے پاس ریسیور نہیں ہے پھر بھی میں نے ایسی کئی گاڑیاں دیکھی ہیں جو ہماری کار کے آگے یا پیچھے پندرہ بیس گز کے فاصلے تک کئی کلومیٹر جانے کے بعد نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں پھر کوئی دوسری گاڑی آجاتی ہے۔ بہرحال تین چار گھنٹوں کے بعد معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم کس حد تک کامیاب رہے ہیں۔ دیٹس آل۔"

اس نے خالی بوتل اور روپے دکاندار کو دیئے پھر تابانی کے ساتھ والی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ اس نے کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "تکلیف کیسی ہے؟"

"کچھ آرام محسوس کر رہا ہوں۔"

سہ پہر تین بجے سے پہلے وہ لاہور کے قریب پہنچنے لگے۔ شاہدرہ میں تابانی نے کہا۔ "ڈیش بورڈ کھولو۔ اس میں ایک سیاہ رنگ کا کپڑا ہے۔ اسے اپنی آنکھوں پر باندھ لو۔"

وہ چونک کر بولا۔ "کیوں باندھ لوں؟ میں چالیس چ۔۔ن کے خزانے کا راستہ معلوم

کرنے نہیں' اپنی جانِ حیات سے ملنے جارہا ہوں۔"

"اتنی دیر تک ساتھ رہنے سے تو جانور بھی ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں۔ مجھے ایک دوست سمجھ کر پٹا باندھ لو۔"

"میری آنکھوں پر پٹی بندھی رہے گی تو باہر سے دیکھنے والے کیا سوچیں گے؟"

"تم دیکھ رہے ہو کہ اس کار میں کلرڈ شیشے ہیں۔ اپنی طرف سے شیشے چڑھالو۔ باہر والوں کو اندر کا کچھ نظر نہیں آئے گا۔"

وہ گھور کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ "پلیز میری بات مان لو۔ تم نہیں جانتے' اگر میں نے گاڈ فادر کے احکامات کے مطابق کام نہ کیا تو میرا انجام کیا ہوگا؟"

"کتنے عرصے سے گاڈ فادر کے لیے کام کر رہی ہو؟"

"یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"تمہیں وہ گاڈ فادر جتنی بھی رقم دیا کرتا ہے' اسے تم دو سے ضرب کرکے مجھ سے لیا کرو۔"

"تمہارے جیسے دہشت گرد کے پاس کبھی لاکھوں روپے ہوتے ہیں۔ کبھی پھوٹی کوڑی نہیں ہوتی۔"

"میں تمہیں دردانہ بیگم کی ذاتی سراغ رساں ایجنسی سے باقاعدہ مقررہ رقم دلاؤں گا۔ میں خود تابانی کو سمجھا بجھا کر اس ایجنسی میں لے جاؤں گا۔ ہم دردانہ بیگم جیسی اونچی ہستی کے لیے کام کریں گے۔"

"اقتدار میں آنے والے سیاست دانوں کی عمر صرف پانچ سال ہوتی ہے۔ آج تک صرف گنتی کے سیاست دانوں نے رینگتے ہوئے گھسٹتے ہوئے' پانچ برس پورے کیے ہیں۔ باقی دو برس بھی حکومت نہیں کرپاتے۔ اقتدار کی کرسی سے گرتے ہی قومی خزانے سے لوٹی ہوئی رقمیں چھپانے کے لیے ملک کے باہر دوڑ جاتے ہیں اور عدالتوں میں مقدمے لڑتے پھرتے ہیں۔"

تابانی نے گاڑی روک دی پھر کہا۔ "یہاں سے آگے آنکھوں پر پٹی بندھی ہوگی۔ تم تاریک راہوں پر سفر کرو گے۔ انکار کرو گے تو یہ کار آگے کے راستے نہیں جانتی ہے۔"

وہ ایک جھٹکے سے ڈیش بورڈ کا خانہ کھول کر ایک سیاہ رنگ کا اسکارف نکالتے ہوئے بولا۔ "مجھے تابانی تک پہنچانا نہ ہوتا تو تمہیں گولی ماردیتا۔"

"تابانی کے پاس پہنچ کر گولا ماردینا۔"

مراد نے اپنی طرف کی کھڑکی کا کلرڈ شیشہ چڑھایا۔ باقی شیشے پہلے ہی چڑھے ہوئے

تھے۔ تابانی نے اپنی جگہ سے ذرا اٹھ کر سیاہ اسکارف کو اس کی آنکھوں پر اس طرح باندھا کہ وہ کسی چالاکی کے باوجود ذرا سا اسکارف اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

کار آگے بڑھ گئی۔ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا اور کوشش کرتا رہا کہ باہر کی کوئی آواز سن کر گزرنے والے راستوں کا اندازہ کرسکے۔ وہ کار کبھی دائیں کبھی بائیں مڑ کر رواں دواں تھی پھر اسے اندازہ ہوا کہ کار کچے راستوں پر سفر کر رہی ہے۔ اونچے اونچے راستوں سے جھٹکے لگ رہے تھے پھر وہ کار کسی پکے راستے پر آگئی تھی۔ وہ بولا۔ "میں اتنا سمجھ گیا ہوں کہ تم مجھے لاہور نہیں لے جارہی ہو۔"

"خدا گھر میں بھی ملتا ہے۔ محلے کی مسجد میں بھی۔ اس کے باوجود اسے پانے کے لیے خانہ کعبہ تک سفر کیا جاتا ہے۔ تم تابانی کے لیے لاہور سے آگے نہیں جاؤ گے؟"

"خدا نے عورت کو ایک زبان ہی تو دی ہے جس کے آگے بندہ چپ ہو جاتا ہے۔"

پھر وہ چپ رہا۔ کار چلتی رہی۔ ایک گھنٹہ گزر گیا پھر دو گھنٹے گزر گئے۔ وہ جھنجلا کر بولا۔ "آخر میں کب تک بیٹھا رہوں گا؟"

"تم بیٹھے نہیں ہو۔ کار کی رفتار سے دوڑ رہے ہو اور اب اپنی منزل تک پہنچنے ہی والے ہو۔"

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد وہ کار ایک جگہ مڑ کر آگے بڑھ کر رک گئی۔ اس کے رکتے ہی اوپر سے نیچے ایک شٹر کو بند کرنے کی آواز آئی۔ تابانی نے کہا۔ "آنکھوں سے پٹی ہٹالو۔"

اس نے فوراً ہی اسکارف کو آنکھوں سے ہٹایا اور دروازہ کھول کر باہر آیا۔ پتا چلا وہ ایک موٹر گیراج کے اندر ہے۔ ایک شخص شٹر کو مقفل کر رہا تھا۔ گیراج کے دوسری طرف ایک دروازہ تھا۔ اس شخص نے مراد سے کہا۔ "آپ یہاں تشریف لائیں۔ اندر ڈرائنگ روم میں میڈم تابانی اور گاڈ فادر موجود ہیں۔"

دروازہ ایک ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ مراد آہستہ آہستہ چلتا ہوا اندر آیا تو اچانک ایک گن مین نے اسے اپنے گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ ایک نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے اور ایک نے بیڈ پر جا کر لیٹنے کا اشارہ کیا۔ اسے تعجب ہوا کہ خاموش رہنے کے لیے کیوں کہا جارہا ہے۔ وہ کوئی مختصر سا فقرہ کہہ کر اپنا تعاقب کرنے والوں کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ کسی ایسے مکان یا کوٹھی میں ہے۔ جس کے اگلے یا پچھلے حصے میں ایک شٹر والا گیراج ہے۔

ایک گن مین نے کلاشنکوف سے اس کے سینے پر ٹھوکا دیتے ہوئے بیڈ پر جا کر لیٹنے کا اشارہ کیا۔ مراد نے کہا۔ "یہ گیر.........."

اس سے پہلے کہ وہ گیراج کا پورا لفظ ادا کرتا۔ ایک نے اپنی رائفل کی نال اس کے منہ میں ٹھونس دی۔ باقی گن مین رائفلوں کے سیفٹی کیچ ہٹاتے ہوئے اپنی اپنی انگلی ٹریگر پر رکھنے لگے۔ مراد فوراً ہی بیڈ پر آکر اس طرح لیٹ گیا کہ اس رائفل والے کی نال اس کے منہ میں پھنسی رہی۔ اب وہ زیادہ سے زیادہ اوں آں کر سکتا تھا' بول نہیں سکتا تھا۔

پھر اس نے ایک سفید ایپرن پہنے ہوئے ایک ڈاکٹر کو دیکھا' وہ دوسرے کمرے سے آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بھری ہوئی سرنج تھی۔ مراد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ چار موت کے فرشتے گن لیے کھڑے تھے۔ ان کی طرف سے موت لازمی تھی صرف ایک ڈاکٹر ایسا تھا' جو شاید اسے نہ مارتا۔ صرف بے ہوش کرتا۔

ان لمحات میں یہ بات ذہن میں آئی کہ تابانی کے نام کا چارا ڈال کر اسے یہاں لایا گیا ہے۔ تابانی اور ہاشم اس کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کر سکتے تھے۔

اس کے بعد وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ سوئی کی چبھن محسوس ہوئی پھر وہ اپنے آپ سے غافل ہوتا چلا گیا۔

ایک کوٹھی کے گراؤنڈ فلور پر ایک چھوٹا سا اسپتال تھا۔ اوپری منزل میں ڈاکٹر زیدی کی رہائش تھی۔ گراؤنڈ فلور کے پچھلے حصے میں ایک گیراج تھا جہاں تابانی' مراد کو لے کر آئی تھی۔ اسپتال کے بڑے کمرے کو آپریشن تھیٹر بنایا گیا تھا۔ اسی کمرے میں بے ہوش مراد کو لا کر اپریشن بیڈ پر لٹایا گیا۔ ڈاکٹر زیدی نے تابانی سے کہا۔ "تمہیں بتایا گیا ہے کہ میں ڈاکٹر آمنہ کے خاص ماتحت ڈاکٹروں میں سے ہوں۔ تم مراد کی فکر نہ کرو۔ معمولی سا آپریشن ہے۔ تمہیں یہاں نہیں رہنا چاہیے۔"

تابانی سے کہا۔ "آپ کو بھی بتایا گیا ہو گا کہ میں آگ اور خون سے کھیلنے والی عورت ہوں۔ اپنے مرد کے خون کو بہتا ہوا دیکھنے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔ پلیز آپ آپریشن کریں۔"

ڈاکٹر زیدی اس ضدی عورت کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا وہ دونوں دور کھڑے ہوئے اور بہت ہی دھیمی آواز میں بول رہے تھے تاکہ جاسوس آلے کے ذریعے ان کی گفتگو نہ سنی جا سکے۔

ڈاکٹر نے آپریشن بیڈ کے پاس آکر اپنے ماتحتوں کے ساتھ اپنا کام شروع کیا۔ تابانی ذرا دور سے دیکھتی رہی۔ اس کے بازو کے گوشت کو ذرا سا چیر کر پچھلی رات کے ٹانکے توڑے گئے۔ جاسوس آلہ پتلی مصنوعی کھال کے نیچے رکھا گیا تھا۔ تاکہ اس کے ذریعے گفتگو کرنے والوں کی آوازیں سنائی دے سکیں۔ اسے نکالنے کے لیے گوشت کاٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئی لیکن خون بہنے لگا۔ پچھلی رات بھی اس کا بہت سا خون بہہ چکا

تھا۔

تابانی کو اپنے مراد پر پیار تو آتا ہی رہتا تھا لیکن اس وقت غصہ آرہا تھا کہ وہ دشمنوں کی چال میں آکر اپنا خون بہا رہا ہے۔ وہ دل ہی دل میں عہد کر رہی تھی کہ دردانہ سے اس خون کا حساب ضرور لے گی۔

دردانہ بیگم کو رپورٹ دی گئی کہ تین بجے کے بعد مراد کو لے جانے والی کار گم ہو گئی ہے۔ شاہدرہ پہنچنے کے بعد اس کار نے مقبرہ جہانگیر کی طرف جاتے ہوئے اتنی گلیاں اور راستے تبدیل کیے تھے کہ تعاقب کرنے والے مراد کے جاسوس آلے سے بیس گز تک کا فاصلہ قائم نہ رکھ سکے۔ ان دونوں کی آخری گفتگو سے اتنا ہی پتا چلا تھا کہ مراد کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ اس طرح وہ اپنی گفتگو کے ذریعے کسی بہانے سے یہ نہ بتا سکا کہ تابانی اسے کہاں لے جا رہی ہے۔

دردانہ نے کہا۔ "رات ہونے والی ہے اور تمہارے ڈپارٹمنٹ کا کوئی جاسوس اتنی بڑی کار کو تلاش نہ کر سکا۔ کیا تم لوگوں نے گھاس کھا کر جاسوسی کی تربیت حاصل کی ہے؟ میں کچھ نہیں جانتی۔ دو گھنٹے کے اندر تابانی اور مراد کو تلاش کر کے نظروں کے سامنے رکھو اور اس کے جاسوس آلے سے فائدہ اٹھاؤ۔ ورنہ میں تمہارے جیسے افسروں کو معطل کر دوں گی۔"

دو گھنٹے سے پہلے ہی ایک جاسوس ٹیم اس جاسوس آلے کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے ساتھیوں سے کہا۔ "خاموش ہو جاؤ۔ کسی طرح کی عجیب سی آواز سنائی دے رہی ہے۔"

وہ سب ریسیور کے ذریعے سننے لگے۔ ہلکی سی موسیقی بھی سنائی دے رہی تھی پھر اچانک تیز آواز سنائی دی۔ "سانوں نہر والے پل تے بلا کے۔ ماہی کتھے رہ گیا۔ سانوں نہر والے پل تے بلا کے.......... او باؤ جی! یہ کی مرغ چھولے ہے؟ چھولے ای چھولے نظر آندے نے۔ مرغ کتھے گیا؟"

اس جاسوس ٹیم نے وہاں سے بیس گز کے رقبے میں دو چار ہوٹلوں تک پہنچ کر سراغ لگایا۔ ایک ہوٹل کے کاؤنٹر پر بڑا سا کیسٹ ریکارڈر آن تھا۔ وہیں وہ چھوٹا سا آلہ رکھا ہوا تھا۔ ایک جاسوس نے ہوٹل کے مالک سے دریافت کیا۔ "یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟"

اس نے جواب دیا۔ "ایک گاہک نے کھانے کے بعد پیسے نہیں دیئے۔ جیب کٹنے کا بہانا کر رہا تھا۔ جیب نہیں کٹی تھی۔ اس میں یہ پیتل کا ٹکڑا اور چرس کی پڑیاں رکھی ہوئی

تھیں۔ ہم نے اس کی ان چیزوں کے ساتھ قمیض اتروا کر رکھ لی۔"

اس جاسوس ٹیم نے اپنی گاڑی میں واپس آ کے اپنے اعلیٰ افسر کو بتایا کہ وہ جاسوس آلہ مراد کے بازو سے نکال دیا گیا ہے۔ اب اس کا سراغ لگانا مشکل ہے۔

یہ اطلاع دردانہ تک پہنچی۔ اس نے ایم این اے اکرام شاہ سے کہا۔ "تمہیں مراد پر بڑا اعتماد تھا۔ دیکھو اس نے کیسے دھوکا دیا ہے۔"

اکرام شاہ نے کہا۔ "میں پورے یقین سے کہتا ہوں' اس نے دھوکا نہیں دیا ہے بلکہ اسے دھوکے سے پھانسا گیا ہے۔"

دردانہ نے پرسنل سیکرٹری سے کہا۔ "لاہور انٹیلی جنس کا وہ افسر بہت ذہین ہے۔ اسی نے جاسوس آلے کو چھپانے کی بہترین تدبیر بتائی تھی۔ وہی چالاک افسر صرف مراد کو ہی نہیں تابانی اور ہمارے دوسرے دشمنوں کو ٹریپ کرے گا۔ کیا نام ہے اس کا؟"

پی اے نے اپنی ڈائری میں دیکھ کر کہا۔ "اس کا نام جمشید ہے۔"

اکرام شاہ نے چونک کر پوچھا۔ "کیا جاسوس آلے کی تدبیر جمشید نے بتائی تھی؟ نہیں میڈم وہ جمشید اور وہاں کا ڈی جی بہت ہی سخت اور قانون کے مطابق دیانت داری سے کام کرنے والے افسران ہیں۔ وہ مراد کو ہر حال میں سزائے موت دلانا چاہتے تھے۔ وہ قانون کے خلاف مراد کی رہائی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔"

"لیکن اس نے جاسوس آلے کا زبردست آئیڈیا پیش کیا تھا۔"

"ایک طرف اس نے بظاہر آپ سے وفاداری کی۔ دوسری طرف اس نے مراد کے ساتھ تابانی کو بھی شکار کیا ہو گا۔ اس جمشید نے دہری چال چلی ہے۔"

دردانہ کے حکم سے اس کے پی اے نے لاہور انٹیلی جنس کے ڈی جی سے فون پر بات کرائی۔ دردانہ نے پوچھا۔ "کیا آپ کے ایک افسر جمشید نے تابانی اور مراد کو گرفتار کرایا تھا؟"

"جی ہاں۔ ٹھوس ثبوت اور گواہوں کے بعد وہ گرفتاری عمل میں آئی تھی۔"

"اور کل آپ نے اسی افسر جمشید کے ذریعے مراد کے بازو میں جاسوس آلہ چھپایا تھا۔ آپ اور آپ کا وہ جمشید بہت فرض شناس ہیں۔ آپ دونوں کو تابانی کا فرار اور مراد کا جیل سے باہر آنا منظور نہیں تھا۔ آپ لوگوں نے بظاہر میرے حکم کی تعمیل کی۔ مراد کو جیل سے باہر آنے دیا پھر اسے تابانی سمیت غائب کر دیا۔"

ڈی جی نے کہا۔ "آپ کو غلط اطلاع دی گئی ہے۔ ہم ہمیشہ حکومتِ وقت سے ملنے والے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں۔ اگر تابانی اور مراد کہیں روپوش ہو گئے ہیں تو وہ

صرف آپ کے اعتماد کو نہیں قانون کے محافظوں کو بھی دھوکا دے رہے ہیں۔"

وہ بولی۔ "سیاست میں ڈبل گیم کھیلنا مجھے بھی آتا ہے۔ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے محتاط رہیں۔ میں صبح تک ان کی گرفتاری چاہتی ہوں۔ ورنہ جمشید کو تو ملازمت سے خارج کر سکتی ہوں۔ آپ کی پرانی سروس ہے' لہٰذا آپ کو ریٹائر کر سکتی ہوں۔ صبح تک خود اپنی تقدیر کا فیصلہ کریں۔"

ڈی جی نے ریسیور رکھ کر جمشید سے پوچھا۔ "تم مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں چھپاتے ہو۔ کیا تابانی اور مراد کو ٹریپ کر کے انہیں کہیں قید کر دیا ہے؟"

"سر! آپ مجھ پر شبہ کر رہے ہیں۔ جبکہ آپ صرف میرے اعلیٰ افسر ہی نہیں' میرے استاد بھی ہیں۔ میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔"

"تمہارے والد نے امیر حمزہ کو بیٹا بنایا تھا اور تم اسے بھی استاد مانتے ہو۔ ایک طرف وہ قانون شکن لیکن دوسری طرف میں قانون کا محافظ ہوں۔ تم نے دو مختلف مزاج کے افراد کو استاد بنایا ہے۔ کیا تم قانون شکن استاد کے احکامات کی تعمیل نہیں کرتے ہو؟"

"بھائی جان (حمزہ) لاپتا ہیں۔ جب تک وہ موجود تھے' میں نے کبھی قانون شکنی کا کوئی کام نہیں کیا۔ بھائی جان کے لاپتا ہونے پر بھی خون کے گھونٹ پی رہا ہوں پھر بھی قانون کو بالاتر رکھتا ہوں۔ صرف یہی نہیں میرے ابو تعلیم یافتہ ہیں۔ اپنی دیانت داری کے باعث آج تک سب انسپکٹر ہیں' اگر وہ بدلتی ہوئی حکومت کو خوش رکھنے کے لیے قانون سے کھیلتے رہتے تو آج انسپکٹر جنرل آف پولیس یا پولیس کمشنر ہوتے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ میری دیانت داری پر شبہ کر رہے ہیں۔"

"میں مجبور ہو کر شبہ کر رہا ہوں۔ دردانہ بیگم نے کہا ہے' کل صبح تک تابانی اور مراد گرفتار نہ ہوئے تو تمہاری ملازمت جائے گی اور مجھے ریٹائرمنٹ کا لیٹر مل جائے گا۔"

"آج آپ کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے' آپ کو صدمہ پہنچ رہا ہے۔ میرے ابو سے چالیس برس تک ناانصافی ہوتی رہی اور ہو رہی ہے۔ آپ اتنے بڑے افسر ہو کر میرے ابو کے لیے انصاف حاصل نہ کر سکے۔ میں بھائی جان کی گمشدگی کا کیس اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا لیکن آپ مجھے یہ کیس نہ دلا سکے۔ انہیں غائب کرنے والے جانتے تھے کہ میں کیپٹن امیر حمزہ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ یہ کیس میرے ہاتھ آئے گا تو میں ان کی جڑوں تک پہنچ جاؤں گا۔ سر! آپ تمام ناانصافیوں کو بھول کر صرف تابانی اور مراد کے لاپتا ہونے کے باعث مجھ پر شبہ کر رہے ہیں۔"

"تم جو کچھ کہہ رہے ہو' میں نے سیاست میں اس سے زیادہ قانون شکنی دیکھی ہے

لیکن اس لیے خاموش رہتا ہوں کہ اس عہدے پر رہ کر یہ وردی پہن کر کسی کسی کو تھوڑا بہت انصاف دلا سکتا ہوں۔"

"جی ہاں۔ جب اکرام شاہ اقتدار میں نہیں تھا تو آپ نے بڑھ چڑھ کر ایکشن لیا اور اس کے دونوں دہشت گردوں تابانی اور مراد کو گرفتار کرا دیا۔ آج اکرام شاہ کی سیاسی پارٹی لیڈر دردانہ بیگم اقتدار میں آگئی ہیں تو انہی گرفتار ہونے والے تابانی اور مراد کو صبح تک تلاش کرکے بیگم صاحبہ کے حضور پیش کرنا اپنا فرض سمجھ رہے ہیں۔ تاکہ صبح تک وہ دونوں دہشت گرد دردانہ کی سرپرستی میں آزاد ہو جائیں۔"

ڈی جی نے ڈانٹ کر کہا۔ "جمشید! تم بہت بول رہے ہو۔ جذبات میں بھول رہے ہو کہ کس سے گفتگو کر رہے ہو؟"

"سوری سر! مجھے صبح تک خاموش رہنا چاہیے۔ صبح کے بعد میری ملازمت جائے گی پھر اس وردی سے آزاد ہوتے ہی میں سب سے پہلے اپنے دشمنوں کو یہ کہہ کر ان کی نیندیں حرام کردوں گا کہ کیپٹن امیر حمزہ زندہ ہے۔ جمشید علی نارڑ کے روپ میں۔"

ڈی جی حیرانی سے اپنی کرسی پر سیدھا بیٹھ کر اس آتش فشاں کو یوں تکنے لگا جیسے اپنے ماتحت جمشید کو نہیں، امیر حمزہ کو دیکھ رہا ہو۔

☆======☆======☆

دوسری صبح ممبئی شہر کی اس کوٹھی کے احاطے میں شلپا کی لاش پائی گئی۔ لاش کے چہرے کو گولیوں سے چھلنی کیا گیا تھا۔ یہ شناخت ممکن نہیں تھی کہ وہ شلپا کی لاش ہے۔

"را" کے بے شمار جاسوس شلپا کی تلاش میں تھے۔ پچھلی بار وہ اس کوٹھی سے دو سو گز دور والی ایک خالی کوٹھی میں بھی اسے گرفتار کرنے گئے تھے لیکن اسے نہ پاسکے تھے۔ انہوں نے اس لاش کو بھی آکر دیکھا۔ شلپا کے ریکارڈ میں لکھا تھا کہ اس کے جسم پر کوئی پیدائشی نشان نہیں ہے۔ صرف ایک ٹانگ کا زخم بتا رہا تھا کہ وہ شلپا ہوسکتی ہے۔ اسی زخم کے باعث وہ ذرا لنگڑا کر چلتی تھی۔

"را" کے ڈی جی جمنا داس پرساد نے دوسرے افسران سے کہا۔ "اس لاش کو سرد خانے میں رکھا گیا ہے۔ اس کی ہر زاویئے سے تصاویر اتاری گئی ہیں۔ ایک پیر کا زخم، اس کا قد اور جسامت سے وہ شلپا ہی لگ رہی ہے اور سچ مچ وہ شلپا ہوئی تو بڑے مسائل پیدا ہوں گے۔ ہمارے کئی اہم رازوں کو اس نے کہاں چھپا کر رکھا تھا، یہ صرف کالیا جانتا ہوگا۔"

ایک افسر نے کہا۔ "سر! کالیا کو شلپا کی موت کی خبر نہ دی جائے تو بہتر ہے۔ ایک تو

بیٹی کی موت سے اسے شاک پہنچے گا پھر وہ شبہ کرے گا کہ ہم نے اس سے راز حاصل کرکے اسے قتل کردیا ہے۔"

"اس کے قتل ہونے کی بات اپنی طرف سے چھپانا مناسب ہے۔ ہمیں انجان بن کر رہنا چاہیے۔ جب کالیا شکایت کرے گا تو ہم لاعلمی ظاہر کریں گے اور یہ کہہ سکیں گے کہ ہمیں اس کی ہلاکت کا علم ہوتا تو ہم سب سے پہلے اس سے رابطہ کرکے اپنے اہم رازوں کی فکر کرتے۔ کالیا ہمیں خود غرض سمجھتا ہے۔ اس لیے شلپا کی ہلاکت کے ذمے دار ہم ہوتے تو لندن میں کالیا کو بھی ختم کردیتے اس پر لاکھوں روپے ضائع نہ کرتے۔"

ڈی جی نے کہا۔ "لندن میں ہمارے زونل افسر کو فون کرو۔ اسے یہاں کے حالات بتاؤ۔ اس سے کہو، کالیا سے گفتگو کرکے شلپا کے بارے میں کچھ اگلوائے۔ کم از کم اس کی بیٹی کی خیریت معلوم کرے۔"

لندن کے زونل افسر کو فون کیا گیا۔ اس نے کہا۔ "میں ابھی اسپتال سے آرہا ہوں۔ کالیا بہت خوش ہے۔ بھارت کے وقت کے مطابق صبح چھ بجے شلپا نے فون کیا تھا اور باپ کو یہ خوش خبری سنائی تھی کہ لیڈی سرجن آمنہ کا اکلوتا بیٹا فرمان اس کی قید میں ہے اور فرمان کو ایسی جگہ قیدی بنا کر رکھا ہے جہاں سے وہ سات جنم میں بھی فرار نہیں ہوسکے گا۔"

زونل افسر کی باتیں سن کر سب نے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ڈی جی جمنا پرساد نے کہا۔ "یہ شلپا اپنے باپ کالیا سے بھی دو قدم آگے ہے۔ شٹ سرد خانے سے اس لاش کو اٹھا کر پھینک دو۔ ہمارا اتنا وقت خواہ مخواہ برباد ہوگیا۔"

یہ درست تھا، شلپا نے یعنی بینا نے بھارت کے وقت کے مطابق فون کرکے کالیا کو اپنی خیریت سے آگاہ کیا تھا اور مجھے قیدی بنا کر رکھنے کی بات بھی اسے بتائی تھی۔

میں ماسک میک اَپ کے ذریعے رنجن ورما بن چکا تھا اور لندن میں امی سے رابطہ کرکے انہیں اپنے حالات بتا چکا تھا۔ وہ میری طرف سے مطمئن ہوگئی تھیں۔ جب وہ کالیا کا معائنہ کرنے کے لئے اسپتال آئیں تو وہ بہت خوش تھا۔ امی کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ امی نے بھی مسکرا کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ معلوم ہوتا ہے۔ آج بہت زیادہ آرام محسوس کر رہے ہو؟"

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "اتنا آرام محسوس کر رہا ہوں کہ کلیجے میں ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔"

"کلیجے میں اسی وقت ٹھنڈ پڑتی ہے جب کسی دشمن کو زیر کیا جاتا ہے۔"

"بہت سمجھ دار ہو۔ میں خوشی کی بات تم سے نہیں چھپاؤں گا کیونکہ تمہیں ہر حال میں میرا علاج کرنا ہی ہوگا۔ مجھے دونوں پیروں پر کھڑا کرنا اور چلنے پھرنے کے قابل بنانا ہوگا۔ جانتی ہو کیوں؟"

امی اس کے گھٹنوں کا معائنہ کرتے ہوئے بولیں۔ "ہاں جانتی ہوں۔ تمہارے علاج کے بارے میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اور ایک ماں کی حیثیت سے معلوم ہے کہ میرا بیٹا فرمان تمہاری بیٹی شلپا کی قید میں ہے۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "تم کیسے جانتی ہو؟"

"اپنے اپنے وسیلے اور ذرائع ہوتے ہیں۔ میں تم سے کچھ نہیں پوچھ رہی ہوں اس لیے تم بھی مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔"

"کیا تم یہ سوچ کر پریشان نہیں ہو کہ تمہارے بیٹے کو قیدی بنا کر اس سے کیا سلوک کیا جائے گا؟"

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ تم اپنے پاؤں پر چلنے لگو گے تو خود اپنی بیٹی سے کہو گے کہ فرمان کو یہاں بھیج دے پھر حساب ہوگا کہ قیدی کی حیثیت سے اس کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے' وہی تمہارے ساتھ کیا جائے گا۔"

"تمہیں ابھی اس کی فکر نہیں ہے؟"

"فولاد کو دن رات آگ میں ڈالو۔ اسے موڑو' توڑو اس کی جیسی بھی شکل بناؤ' وہ فولاد ہی رہے گا۔ تم اپنی اور شلپا کی صورت شکل اچھی بنائے رکھنے کی فکر کرو۔"

امی نے نرس سے انجکشن لگانے کو کہا پھر ایک نسخہ لکھ کر نرس کو دیتے ہوئے کالیا سے کہا۔ "میں نے آج نسخہ تبدیل کیا ہے۔ اچھے بچوں کی طرح کسی اندیشے میں نہ رہنا۔"

وہ مسکراتے ہوئی چلی گئیں۔ اس نے گھبرا کر نرس سے پوچھا۔ "نسخے میں کیا ہے؟ اس نے کوئی گڑ بڑ کی ہے۔ میں یہ نئی دوائیں استعمال نہیں کروں گا۔"

نرس نے کہا۔ "تم کسی بھی اسپتال میں ڈاکٹر آمنہ کے علاج سے انکار کرو گے تو علاج کے بغیر تمہیں ڈس چارج کردیا جائے گا۔ آرام سے رہو۔"

نرس پلٹ کر بے نیازی سے چلی گئی۔ وہ بیٹے کے قیدی بننے کی بات سن کر امی کو ذہنی اذیت دینا چاہتا تھا۔ اب خود ذہنی کرب میں مبتلا ہو گیا تھا۔

اسے جس کمرے میں رکھا گیا تھا' وہاں اس کی ضرورت کا تمام سامان موجود تھا۔ اس نے موبائل فون کے ذریعے اپنی بیٹی شلپا سے رابطہ کیا پھر کوڈ ورڈز ادا کر کے جواباً بیٹی کے کوڈ ورڈز سن کر مطمئن ہونے کے بعد پوچھا۔ "تم خیریت سے ہو؟"

"آپ میری فکر کیوں کرتے ہیں؟ مجھے آپ کی خیریت پوچھنی چاہیے۔ کیا آپ کچھ پریشان ہیں؟"

"وہ جو تم نے فرمان کو قیدی بنا کر رکھا ہے' وہ بات ڈاکٹر آمنہ کو معلوم ہو گئی ہے۔ کیا اسے قیدی بنانے کے سلسلے میں اور کسی کو راز دار بنایا ہے؟"

"میں نادان نہیں ہوں۔ کوئی تیسرا نہیں جانتا کہ میں نے اسے کہاں پاتال میں چھپا کر رکھا ہے۔"

"پھر ڈاکٹر آمنہ کو کیسے معلوم ہو گیا؟"

"آپ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہے۔ جب کوئی نہیں جانتا ہے تو پھر میں نے ہی اس کی ماں کو بتایا ہوگا۔"

"تم نے اسے کیوں بتادیا؟"

"وہ ڈاکٹر اپنے بیٹے کی وجہ سے انڈر پریشر رہ کر اور زیادہ توجہ سے جلد از جلد آپ کا علاج کرے گی۔"

"وہ کہہ رہی تھی' اس کے بیٹے کو قیدی بنا کر ظلم کیا گیا تو وہ بھی میرے ساتھ ویسا ہی سلوک کرے گی۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں' اس سے محبت سے پیش آؤں؟"

"یہ مناسب رہے گا۔"

"دوسروں کے باپ تو اپنی جوان بیٹیوں کو محبت سے روکتے ہیں۔"

"بیٹی! مجبوری ہے۔ ذرا سنبھل کے' دور رہ کر اسے محبت کا جھانسا دیتی رہو۔"

"آپ جانتے ہیں' چالاک ماں کی طرح بیٹا بھی چال باز ہے۔"

"ہاں وہ تو ہے مگر تم بھی تو سمجھ دار ہو۔"

"وہ کہتا ہے' جس طرح بھارتی فلموں میں اور ڈش کے ڈراموں میں لڑکیاں مختصر لباس پہنتی ہیں' میں بھی وہی پہنا کروں۔"

"بیٹی! جب ڈش کے ذریعے ساری دنیا بھارتی لڑکیوں کو نازیبا لباس میں دیکھ رہی ہے تو تم پردہ کیوں کرتی ہو؟ وہ تو دور سے دیکھے گا۔"

"وہ بڑا وہ ہے۔ انگلی پکڑنے دو تو پہنچا پکڑ لیتا ہے۔"

"بس پہنچے تک ہی پہنچنے دو اور اس کی ماں سے فون پر بات کراتی رہو تاکہ اس لیڈی ڈاکٹر کو یقین رہے کہ قیدی بیٹے کے ساتھ اچھا سلوک کیا جارہا ہے۔"

"آل رائٹ ڈیڈی! میں فون پر ماں بیٹے کی بات کراتی رہوں گی۔"

بینا نے فون بند کرکے مجھے دیکھا پھر کہا۔ "باپ ایسے ہوتے ہیں۔ اس کتے نے پہلے مجھ پر نیت خراب کی۔ اب بیٹی کو سمجھا رہا ہے کہ تمہیں کیسے خوش رکھنا چاہیے۔ تاکہ تمہاری امی وہاں اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔"

ہم ایک ایسی کوٹھی میں تھے جس کا علم صرف شلپا اور بینا کو تھا۔ میں نے کہا۔ "کالیا پیروں سے چلنے کے قابل ہوجائے گا تب بھی گاڈ فادر نہیں تسلیم کیا جائے گا۔ انڈر گراؤنڈ مافیا کے اہم افراد شلپا کی بہترین کارکردگی اور ذہانت سے خوش ہیں۔ اب تم شلپا ہو۔ کیا وہ ایک نوجوان لڑکی کو مافیا کی گاڈ مدر یا گاڈ سسٹر بنانا پسند کریں گے؟"

"بھارتی انڈر گراؤنڈ کے بڑے بڑے مجرم مجھے دیوی کہتے ہیں کیونکہ "را" جیسی خطرناک تنظیم کو میں نے اپنے سامنے جھکا کر رکھا ہے لیکن کالیا کا دستِ راست پتامبر بجاج آستین کا سانپ ہے۔ میں پہلے بتا چکی ہوں۔ اس نے انڈر گراؤنڈ مافیا کا گاڈ فادر اور ایک صوبے کا مکھ منتری بننے کے لیے میرے قتل کی سپاری لی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس وقت میں رنجن ورما ہوں۔ کبھی اس کا ہونے والا داماد اور اس کی بیٹی نرملا کا عاشق تھا۔ باپ بیٹی نے مل کر بے چارے رنجن کو ہلاک کردیا۔ اب مجھے رنجن ورما کی طرف سے انتقام بھی لینا چاہیے اور اسے تمہارے راستے سے ہٹانا بھی ہے ورنہ وہ کبھی تمہیں دیکھے گا تو شلپا سمجھ کر گولی مار دے گا۔"

"را" والوں کی شرط ہے کہ پتامبر بجاج پہلے ان کے اہم راز حاصل کرے' ان رازوں کو حاصل کرنے سے پہلے وہ مجھے ہلاک نہیں کرے گا۔"

"شلپا کو معلوم تھا کہ پتامبر بجاج اس کے خلاف سازش کر رہا ہے پھر شلپا نے اس کے خلاف انڈر گراؤنڈ مافیا کے ذریعے کوئی کارروائی نہیں کی؟"

"مردوں کے درمیان عورت کو اپنا مقام بنانے میں بڑا وقت لگتا ہے۔ مافیا کے کچھ اہم افراد پتامبر بجاج کی حمایت کرتے تھے اور شلپا کی برتری کی مخالفت اب بھی کرتے ہیں۔"

"بہرحال جس سے جان کا خطرہ ہے' پہلے اس سے نمٹنا چاہیے۔ وہ نہ تو گاڈ فادر بن سکے گا اور نہ ہی کسی صوبے کا مکھ منتری............"

ایسے وقت ایک خیال آیا کہ میں بھارت میں ایک مجرم کو سیاست داں بننے سے روکنے والا ہوں۔ جبکہ ایک پاکستانی کی حیثیت سے مجھے پاکستانی کرپٹ سیاست دانوں کا محاسبہ کرنا چاہیے۔ میرا یہ خیال اپنی جگہ بالکل درست تھا لیکن یہ اطمینان بھی تھا کہ میں بھارت میں جو کرنے جارہا ہوں' وہ پاکستان میں میری دیدی (تابانی) کررہی ہے۔ وہاں کے

نئے حکمران کی راہ میں کانٹے بچھا رہی ہے۔ میری کی پوری کررہی ہے۔ امی نے اور انکل ہاشم نے مجھے فی الحال پاکستان آنے سے منع کیا تھا اس لیے بہتر یہی تھا کہ میں بھارت یا کسی بھی ملک میں رہ کر سیاسی داؤ پیچ سے گزر کر تجربات حاصل کرتا رہوں۔

بینا نے میرے سامنے پورے ممبئی شہر کا نقشہ کھول کر وہاں کے ایک ایک علاقے کے بارے میں بتایا تھا۔ کچھ خفیہ اڈے بھی دکھائے تھے۔ ہم دونوں کے پاس موبائل فون تھے۔ اگر میں راستہ بھٹک جاتا تو وہ موبائل کے ذریعے گائیڈ کرسکتی تھی۔ ہم نے طے کیا کہ اپنے خفیہ بنگلے میں ساتھ رہیں گے لیکن باہر ایک دوسرے سے دور رہیں گے۔ اس طرح ایک دوسرے کی مشکلات میں کام آسکیں گے۔ اس نے تمام ضروری فون نمبر اور پتے ٹھکانے نوٹ کرا دیئے تھے۔ مافیا کے وہ تمام افراد اور عام کارکن جو شلپا کے وفادار تھے' ان سے بینا نے کہا تھا۔ "میرا ایک دستِ راست ہے' جس کا اصلی چہرہ اور اصلی نام صرف میں جانتی ہوں۔ اس کا موجودہ عارضی نام رنجن ورما ہے۔ وہی رنجن ورما جو پورے ایک برس سے لاپتا ہے۔ بہرحال وہ ضرورت کے وقت اپنا چہرہ اور نام بدلتا رہے گا۔ تم سب اسے کوڈ ورڈز کے ذریعے پہچانا کروگے اور اس کی ایک کال پر فوراً ایکشن میں آیا کروگے۔"

بینا نے ان سب کو اور مجھ کو کوڈ ورڈز بتائے۔ مخاطب کرنے والا کہے گا۔ "میں زندگی اور موت کیوں ہوں؟"

جواب دینے والا کہے گا۔ "کیونکہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔"

بینا سے تمام ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد میں نے نرملا کا موبائل فون نمبر پنچ کیا۔ پتا چلا' ابھی اس نے موبائل بند رکھا ہے۔ میں نے اس کی کوٹھی کا نمبر ڈائل کیا۔ ایک ملازم نے پوچھا۔ "ہالو۔ آپ کاؤن ہیں جی؟"

میں نے کہا۔ "ہم تو ہرا باپ بولت ہیں۔ نرملا دیوی کو سگری بلاؤ۔"

اس کے قریب ہی پتامبر بجاج کی آواز سنائی دی۔ "کس کا فون ہے؟"

ملازم نے کہا۔ "حجور! ہمرے باپ کا پھون ہے مگر او تو پانچ برس پہلے مرگوا رہا۔ پھر جندہ ہوکے کیسے بولت ہے؟"

پتامبر بجاج نے اس سے ریسیور لے کر پوچھا۔ "ہیلو۔ کون ہے؟"

میں نے کہا۔ "آپ اتنی زور سے ڈانٹ کیوں رہے ہیں؟ میں دل کا مریض ہوں۔ ایک برس پہلے آپ کی بیٹی میرا دل سنبھالا کرتی تھی۔ آج پھر میرا دل ڈوبا جارہا ہے۔"

"کیا بکواس کررہے ہو؟ جانتے ہو' کس سے بات کررہے ہو؟"

"تم بھی نہیں جانتے کہ کس سے باتیں کر رہے ہو؟"

وہ کچھ نرم پڑ کر بولا۔ "تمہاری آواز کچھ سنی ہوئی سی ہے۔"

"اے بھائی۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔ اپنی بیٹی کو بلاؤ۔ اس سے پوچھو' کیا اس نے میری آواز سنی ہے؟"

"مجھے کچھ یاد آ رہا ہے لیکن یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ وہی آواز ہو سکتی ہے۔"

پھر اس نے ملازم سے کہا۔ "رامو! نرملا کو بلاؤ۔ جلدی کرو۔"

میں نے کہا۔ "ہاں جلدی کرو۔ تمہاری بیٹی نے نہ جانے اب تک کتنے جوانوں کے دل سنبھالے ہیں۔ بیٹی کو بڑی اچھی ٹریننگ دی ہے۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "او گاڈ! بالکل وہی آواز ہے۔ وہی بولنے کا انداز ہے۔ کون ہو تم؟"

"تمہاری بیٹی کا پریمی۔ یہ پتا نہیں' اس کے کتنے پریمی رہ چکے ہیں۔ ان میں میرا نمبر کیا ہے؟ وہی بتا سکے گی۔"

ذرا فاصلے سے نرملا کی آواز سنائی دی۔ "ڈیڈی! کس کا فون ہے؟"

"بیٹی! میں اس کی آواز سن کر حیران ہوں۔ ذرا تم سنو اور پہچانو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

نرملا کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو کون ہو تم؟"

"تمہارا گھائل پریمی۔ یہ تم نے کبھی نہیں بتایا کہ تمہارے درجنوں پریم پجاریوں میں میرا نمبر کیا ہے؟"

"تم..........؟" وہ حیرانی سے بولی۔ "یہ تم ہو؟ نہیں' تم نہیں ہو سکتے' اپنا نام بتاؤ؟"

"جیل میں اتنے قیدی ہوتے ہیں کہ سب کے نام یاد نہیں رکھے جا سکتے۔ انہیں نمبروں سے پکارا جاتا ہے۔ قیدی نمبر بارہ۔ قیدی نمبر ایک سو بارہ یا قیدی نمبر دو سو بارہ۔ اسی طرح تمہیں درجنوں پریمیوں کے نام یاد نہیں ہوں گے۔ میں نے ہر قیدی کے ساتھ بارہ کا عدد اس لیے رکھا ہے کہ ہمیں بچھڑے ہوئے پورے بارہ مہینے ہو گئے ہیں۔"

وہ ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھے بغیر بولی۔ "ڈیڈ! کل رنجن کی ماں نے کہا تھا کہ اس کے بیٹے کو گم ہوئے پورے بارہ مہینے ہو گئے ہیں۔ وہ کہیں زندہ ہو گا اس لیے مردہ سمجھ کر اس کی برسی نہیں منائیں گے مگر اس کی سلامتی کے لیے آج ان کے گھر پوجا پاٹ کا بندوبست کیا ہے۔ ہمیں بھی بلایا گیا تھا۔"

پتامبر بجاج نے کہا۔ "تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"میں کیا کہوں؟ یہ رنجن کی آواز اور بولنے کا اسٹائل ہے پورے بارہ مہینے بعد یہ آواز سنائی دے رہی ہے۔"

یہ سنتے ہی میں نے فون بند کر دیا۔ دوسری طرف وہ پکار رہی ہو گی۔ اب دونوں باپ بیٹی حیران پریشان اور سہمے رہیں گے۔

میں نے رنجن ورما کے گھر فون کیا۔ اس کی ماں کی آواز سنائی دی۔ بینا نے "ہاں" کے انداز میں سرہلا کر تصدیق کی کہ وہ رنجن کی ماں ہے۔ میں نے کہا۔ "ممی! آپ نے بڑے دکھ برداشت کئے ہیں ایک اور دکھ برداشت کرلیں۔"

وہ چونک کر بولی۔ "رنجن! میرے بچے! تم کہاں ہو؟"

"ممی! صبر کرلیں۔ اب میں اس سنسار میں نہیں ہوں' میری آتما بھٹک رہی ہے۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "نہیں بیٹے! ایسا نہ کہو۔ میں مر جاؤں گی۔"

"آپ کے دشمن مریں گے۔ جب تک وہ زندہ رہیں گے' میری آتما بھٹکتی رہے گی۔"

رنجن کے باپ کی آواز سنائی دی۔ "تم ایک برس سے روتی آ رہی ہو۔ اب کس سے رو رو کر بول رہی ہو۔"

"ہمارے بیٹے رنجن کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے۔ دشمنوں نے اسے مار ڈالا ہے۔ اس کی آتما بھٹک رہی ہے۔"

باپ نے اس سے ریسیور لے کر پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

میں نے بڑے دکھ سے کہا۔ "ڈیڈی! آپ یقین نہیں کریں گے۔ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے میری آتما بھٹک رہی ہے۔"

باپ نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں کیسے یقین کروں۔ کیا آتما کبھی ٹیلی فون پر باتیں کرتی ہے؟"

"ٹیلی فون پر باتیں کرنے والا میں نہیں ہوں۔ ایک انجانا آدمی ہے۔ میری آتما اس انجانے کے شریر (جسم) میں سما کر بول رہی ہے اور جب تک میں دشمنوں سے بدلہ نہیں لوں گا' اس انجانے شریر کے اندر سمایا رہوں گا۔"

"بیٹے! وہ تمہارے دشمن کون ہیں؟"

"آپ ان کے نام اور پتے معلوم نہ کریں اور نہ ہی ان کی کوئی بات کسی سے کریں۔ ممی کو سمجھا دیں کہ وہ سگے رشتے داروں سے بھی دشمنوں کے بارے میں کوئی بات نہ کریں۔ وہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔"

"بیٹے! کیا تمہاری آتما اس شریر کے ساتھ نہیں آسکتی جس میں تم سمائے ہوئے ہو؟"

"میں اس کے جسم میں آؤں گا۔ آپ سے اور ممی سے ملوں گا تو دشمنوں کو خبر ہوجائے گی کیونکہ وہ دشمن بھی ایک مہاتانترک کے سیوک ہیں۔ وہ تانترک اپنی کالی شکتی سے دشمنوں کو میرے جسم والے کا پتا بتادے گا۔"

"آہ بیٹے! ہم کتنے بدنصیب ہیں۔ تمہاری آواز سن رہے ہیں مگر تمہیں دیکھ نہیں سکتے۔ تم سے مل نہیں سکتے۔"

"ڈیڈ! جو بھاگ میں لکھا ہوتا ہے' اس کے آگے ہم سب مجبور ہوجاتے ہیں۔ آپ ممی کو تسلی دیں اور ہم کچھ نہیں کرسکتے۔"

میں نے فون بند کردیا۔ ادھر پتامبر بجاج اور نرملا کو یقین نہیں آرہا تھا کہ انہوں نے رنجن کی آواز فون پر سنی ہے۔ اگر وہ رنجن کی ہی آواز تھی تو پھر وہ زندہ ہوگا اور اپنے ماں باپ کے پاس ہوگا۔

پتامبر بجاج نے فون کے ذریعے رنجن کے باپ سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "رنجن کو لاپتا ہوئے ایک برس گزر چکا ہے۔ میں نرملا کے ساتھ آپ کے پاس آرہا تھا۔ اسی وقت ہمیں فون پر آپ کے بیٹے رنجن کی آواز سنائی دی۔ ہمیں ایسا لگتا ہے کہ وہ زندہ ہے اور کسی مشکل میں ہے۔"

"نہیں بجاج صاحب! اب ہمارا بیٹا اس دنیا میں نہیں ہے۔ ہم نے بھی فون پر اس کی آواز سنی ہے۔ اس کی تمام آتما ہم سے بول رہی تھی۔"

"ورما صاحب! آپ اتنے تعلیم یافتہ ہیں اور پریکٹیکل لائف گزار رہے ہیں۔ اس سائنسی دور میں کہہ رہے ہیں کہ رنجن کی آتما بول رہی تھی؟"

"بجاج صاحب! ہم سائنسی ترقی کے زمانے میں ہیں لیکن اپنے دھرم کو جھٹلا نہیں سکتے۔ ہمارے دھرم کے انوسار منش سات جنم لیتا ہے۔ آواگون یعنی ایک کے بعد دوسرا جنم لینا ہمارے شاستروں میں لکھا ہے۔"

"کیا رنجن کی آتما نے کہا ہے کہ اس نے دوسرا جنم لیا ہے؟"

"جی ہاں! وہ کسی انجانے آدمی کے شریر میں سما کر پھر اس دنیا میں آگیا ہے۔"

"پھر تو اسے آپ کے پاس آنا چاہیے۔"

"وہ آئے گا مگر ہمارے پاس آنے کا سمے ابھی نہیں آیا ہے۔"

"ہمیں یقین تو نہیں آرہا ہے لیکن ہم اپنے دھرم اور شاستروں سے انکار نہیں

کرسکتے مگر ایک بات ہے۔ میری بیٹی سے اس کی سگائی ہوچکی ہے۔ اب اس کی آتما کسی کے بھی جسم میں سمائے۔ وہ آپ کا بیٹا رہے گا اور میرا داماد' اس کی شادی نرملا سے ہوگی۔"

"ہونا تو یہ چاہیے مگر ایک راز کی بات ہے۔ ہم آپس میں سمدھی ہیں۔ میں آپ کو یہ راز بتا رہا ہوں۔ آپ کسی اور سے ذکر نہ کریں۔"

"میرے ہونے والے داما کا راز میرا راز رہے گا۔ آپ مجھ پر بھروسا کریں' پلیز بتائیں۔"

"رنجن کی آتما نے کہا ہے کہ اس کے کچھ دشمنوں نے اسے ہلاک کیا ہے۔ اس کی آتما بھٹکتی رہی پھر ایک جوان جسم میں آگئی ہے اور اب ان دشمنوں سے بدلہ لینے کے بعد شاید ہمارے پاس آئے مگر ابھی ہم سے نہیں ملے گی۔"

یہ باتیں سن کر پتامبر بجاج پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "ہے بھگوان! کن ظالموں نے میرے ہونے والے داماد کو مار ڈالا ہے۔ مجھے بتائیں۔ میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

"میں نے پوچھا تھا مگر اس کی آتما نے مجھے بھی نہیں بتایا اور منع کیا کہ یہ بات میں کسی کو نہ بتاؤں۔ آپ سے ہمارا گہرا ناتہ نہ ہوتا تو میں آپ کو بھی نہ بتاتا مگر ہمارے دل کو یہ ڈھارس ملی ہے کہ وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بعد اس جوان کے نئے جسم میں ہمارے پاس آئے گا۔"

"ہم بھگوان سے پرارتھنا کریں گے کہ وہ جلد آپ کے پاس آئے اور نرملا بہو بن کر آپ کے گھر چلی جائے۔ اگر وہ دوسری بار فون کرے تو اس سے کہیں کہ وہ اپنی نرملا سے بات کرے۔ میری بیٹی اس کی جدائی میں اُداس رہتی ہے۔"

اس نے فون بند کرکے نرملا کو ساری باتیں بتائیں۔ وہ سننے کے بعد بولی۔ "یہ بکواس ہے۔ دھرم کی باتیں اب فلموں میں رہ گئی ہیں۔ کوئی ہیروئن یا ہیرو موت کے بعد نیا جنم لے کر فلم دیکھنے والوں میں دلچسپی پیدا کرتا ہے۔ ڈیڈ میرا دماغ کہتا ہے کہ رنجن گولی کھا کر سمندر میں گرا تھا اور ماہی گیروں کے جال پھینکنے سے پہلے ہی تیرتا ہوا کہیں دور نکل گیا تھا۔"

"یہی بات سمجھ میں آتی ہے لیکن وہ ایک برس تک کہاں چھپا رہا تھا اور ہم سے انتقام لینے کیوں نہیں آیا تھا؟"

"شاید ہمارے آس پاس جال بچھانے اور ہمیں کسی طرح بے بس کردینے کے

بندوبست میں لگارہا ہوگا۔"

"میں بھی دیکھوں گا اس نے کیسے جال بچھائے ہیں اور ہمیں کس طرح بے بس کرے گا۔ ایک بار مرتے مرتے بچ گیا' پھر بھی اس کی عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ میں کتنی طاقت اور اختیارات والا ہوں۔"

ان سب کے لیے شلپا ابھی زندہ تھی اور وہ کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ بینا' اب شلپا بنی ہوئی ہے اور "را" کے کئی اہم راز بینا کے پاس ہیں۔ پتامبر بجاج کے خواب و خیال میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ شلپا اور رنجن ورما مل کر اس کے خلاف چالیں چل رہے ہیں۔

بینا نے پتامبر بجاج سے فون پر بات کی۔ اس سے پوچھا۔ "بجاج! کیا میری آواز پہچان رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "شلپا! میں لاکھوں میں تمہاری آواز پہچان سکتا ہوں۔ تم مجھ سے ملتی کیوں نہیں ہو؟ کیا اتنا نہیں سمجھ سکتیں کہ مافیا کے چند خود غرض لوگ تمہیں میرے خلاف بہکا رہے ہیں۔ میں تمہارے ڈیڈی کا پہلے بھی وفادار تھا' آج بھی وفادار ہوں۔ یہ غلط پروپیگنڈا ہے کہ میں تمہارے باپ کی جگہ گاڈ فادر بننا چاہتا ہوں۔"

"کیا یہ غلط ہے کہ تم "را" والوں کے تعاون سے ایک صوبے کے مکھ منتری (وزیراعلیٰ) بننا چاہتے ہو۔"

"یہی تو ہمیں آپس میں لڑانے کی چالبازی ہے۔ میں بے شک سیاست میں آکر مکھ منتری بننا چاہتا ہوں لیکن "را" والوں کی مدد سے نہیں' تمہارے اعتماد سے اور مدد سے۔"

"میں کیا مدد کرسکتی ہوں؟"

"تمہارے پاس "را" کے کئی اہم راز ہیں۔ وہ ان رازوں کی خاطر تمہیں مار ڈالنا چاہتے ہیں لیکن ایک ایسا موقع ہاتھ آیا ہے کہ ہم "را" والوں کو دھوکا دے کر زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرسکتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"تم تمام اہم راز اپنے ہی پاس رکھو۔ صرف ان کی فوٹو اسٹیٹ کاپی مجھے دے دو۔ میں "را" کے ڈی جی سے کہوں گا کہ میں نے شلپا کو قتل کیا ہے۔ کوٹھی کے احاطے میں جو لاش پائی گئی تھی اور جس کا چہرہ گولیوں سے چھلنی کردیا گیا تھا' وہی دراصل شلپا تھی۔ وہ اہم رازوں کو اس کوٹھی سے نکال کر دوسری جگہ لے جارہی تھی۔ میں نے اسے قتل کرکے وہ تمام راز چھین لئے ہیں۔"

"اچھا سمجھ گئی۔ تم اپنی باتیں سچ ثابت کرنے کے لیے ان رازوں کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں "را" کے ڈی جی کو دوگے لیکن وہ اصل دستاویزات' ویڈیو اور آڈیو فلم طلب کرے گا۔"

"میں اس سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اصل چیزیں دے کر میں شلپا کی طرح قتل نہیں ہونا چاہتا۔ وہ تمام اہم راز حاصل کرنے کے بعد "را" والے مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ انہوں نے لندن میں کالیا کو صرف اس لیے زندہ چھوڑا ہوا ہے کہ اب ان رازوں تک کالیا ہی انہیں پہنچاسکتا ہے۔"

"جب انہیں معلوم ہوگا کہ وہ تمام راز تمہاری تحویل میں آگئے ہیں تو وہ لندن میں میرے ڈیڈی کو ختم کردیں گے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ جب اصل راز تمہارے پاس رہیں گے تو کیا میں تمہارے ڈیڈی کو نقصان پہنچنے دوں گا۔ ذرا سوچو تمہارے ڈیڈی لندن سے واپس آکر پہلے کی طرح گاڈ فادر رہیں گے اور میں مکھ منتری بن جاؤں گا تو ہماری طاقت اور اختیارات کتنے بڑھ جائیں گے۔"

"ہاں تم بڑی ذہانت کی باتیں سمجھا رہے ہو۔ میں تمہیں ان چیزوں کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں' آڈیو اور ویڈیو کی ادھوری ڈپلی کیٹ دوں گی۔ ایک گھنٹے بعد ایسی جگہ ملو جہاں ہمارے علاوہ اور بہت سے لوگ ہوں۔ ابھی بے اعتمادی کی بات کر رہی ہوں۔ بھیڑ میں تمہارے آدمی چھپے ہوں گے تو میرے بھی محافظ خطرے کے وقت اس بھیڑ سے نکل آئیں گے۔"

"اس میں شبہ نہیں کہ تم ذہین ہو۔ ایسے کام تنہائی میں چھپ کر ہوتے ہیں لیکن تم نے اپنے تحفظ کے لیے الٹا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ٹھیک ہے میری نیت میں کھوٹ نہیں ہے۔ بولو مجھے کہاں آنا چاہیے؟"

"راج کپور فلم اسٹوڈیو میں۔ تم چہرے سے مجھے پہچان نہیں سکو گے۔ میرے شانے پر ایک نیلا بیگ لٹکا ہوگا۔ جس میں تمہاری مطلوبہ چیزیں ہوں گی۔ نیلے بیگ کی طرح میں نیلی ساڑھی میں ہوں گی۔"

"ٹھیک ہے' میں ایک گھنٹے بعد وہاں پہنچ کر ثابت کردوں گا کہ اب بھی تمہارا اور کالیا کا وفادار ہوں۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ بینا نے مافیا کی ایک جوان عورت کو نیلی ساڑھی اور نیلا بیگ دیا۔ اس میں اہم رازوں کے سلسلے میں بہت کچھ موجود تھا مگر وہ اصل کاپیاں نہیں تھیں۔ بینا

نے مجھ سے کہا۔ "تم کچھ شرائط اس سے منوانا چاہتے تھے؟"

"ہاں' وہ "را" کے ڈی جی کو آج ہی یہ سب کچھ دے کر کہے گا کہ ان رازوں کی اصل کاپیاں اس وقت دی جائیں گی جب پاکستان میں ان کے دہشت گرد دردانہ بیگم کے چار سیاست دانوں کو پارٹی چھوڑ کر یا تو اپوزیشن میں چلے جانے پر مجبور کریں یا تحریر لکھ کر روپوش ہو جائیں کہ وہ فی الحال اپنی مرضی سے سیاست چھوڑ کر خفیہ طور پر ملک چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔"

میری یہ باتیں اس نیلی ساڑھی والی ڈمی بینا کو سمجھائی جا رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ "را کے دہشت گردوں کو سختی سے تاکید کی جائے گی کہ دردانہ بیگم کے چار سیاست دانوں کو ہلاک نہ کیا جائے کیونکہ میں پاکستانی ہوں اور یہ گوارا نہیں کروں گا کہ میرے ملک کے سیاست داں خواہ وہ کرپٹ اور چالباز ہوں' بھارتی یا کسی بھی غیر ملکی دہشت گردوں کے ہاتھوں مارے جائیں۔ وہ پاکستان کے مجرم ہیں لہٰذا مجھ جیسا کوئی بھی پاکستانی ان کا محاسبہ کرے گا۔ کسی غیر کو اس کی اجازت دے کر میں پاکستانی قوم کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔"

بینا نے اپنی ڈمی سے کہا۔ "پتامبر بجاج "را" کے ڈی جی سے دوسری شرط منوائے کہ پہلے اسے مکھ منتری بنایا جائے پھر وہ تمام اہم اصلی راز ان کے حوالے کردیئے جائیں گے۔"

اس ڈمی کو فلم اسٹوڈیو کی طرف روانہ کرنے کے بعد میں بینا کے ساتھ کار میں بیٹھ کر پتامبر بجاج کے بنگلے کی طرف جانے لگا۔ میں نے موبائل کے ذریعے اس کے گھر کا فون نمبر پنچ کیا۔ نرملا نے ریسیور اٹھا کر پوچھا کہ کون بول رہا ہے۔ میں کہا۔ "میری آواز سن کر پہچان لو' کون بول رہا ہے؟"

"او تم' رنجن! یہ آتما والا ڈراما کیوں کر رہے ہو؟ سامنے کیوں نہیں آتے؟"

"میں تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔ پہلے تمہارے ڈیڈی سے ملوں گا' انہیں فون دو۔"

"ڈیڈی ابھی تھوڑی دیر پہلے گئے ہیں۔ شام کو ان سے ملاقات ہو سکتی ہے۔"

"شام کو ہی سہی۔ اگر وہ موجود رہیں گے تو میں خود ان کے بنگلے میں ملنے آؤں گا اور آنے سے پہلے فون کروں گا۔"

میں نے فون بند کرکے بینا سے کہا۔ "پتامبر بجاج اسٹوڈیو کی طرف گیا ہے۔ بنگلے میں نرملا تنہا ہے۔ ملازم اور ایک دو گارڈز ہوں گے۔"

ہم نے بنگلے کے قریب پہنچ کر اپنے اپنے ریوالور میں سائلنسر لگایا پھر بینا کار ڈرائیو

کرتے ہوئے بنگلے کے گیٹ پر پہنچی۔ میں نے وہاں کھڑے ہوئے گارڈ کو گولی ماری۔ کار سے اتر کر گیٹ کو کھولا پھر آگے بیٹھ گیا۔ کار پورچ میں پہنچی۔ وہاں ایک مسلح گارڈ تھا۔ پوچھنا چاہتا تھا کہ ہم کون ہیں لیکن پوچھنے سے پہلے ہی ریوالور کی ایک گولی نے اسے ختم کردیا۔

ہم دونوں تیزی سے چلتے ہوئے بنگلے کے اندر آئے۔ ڈرائنگ روم میں نرملا اپنے ملازم سے کچھ کہہ رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر چونک گئی۔ میں نے کہا۔ "منہ سے آواز نکالو گی تو ماری جاؤ گی۔"

میں نے ملازم کے منہ پر گھونسا مارا۔ وہ چکرا کر گر پڑا پھر فرش سے نہ اٹھ سکا پھر میں نے نرملا کے دونوں بازوؤں کو پیچھے سے جکڑ لیا۔ بینا نے سیرنج نکال کر اس میں سوئی لگائی' ایک ننھی شیشی سے سیرنج میں دوا لی پھر اسے نرملا کے بازو میں انجکٹ کردیا۔ وہ دوسرے ہی لمحے بے ہوش ہوگئی۔ میں نے اسے کاندھے پر لاد لیا۔ ہم تیزی سے چلتے ہوئے باہر آئے۔ میں پچھلی سیٹ پر نرملا کر لٹا کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ بینا کار اسٹارٹ کرکے ڈرائیو کرتے ہوئے گیٹ کے باہر آئی پھر ہم اپنے بنگلے کی طرف جانے لگے۔

دوسری طرف پتامبر بجاج فلم اسٹوڈیو پہنچا تو نیلی ساڑھی اور نیلے بیگ والی کو پہچان کر اس کے پاس آیا۔ "ہیلو شلپا!"

"سوری' میں شلپا نہیں ہوں لیکن تمہاری مطلوبہ چیزیں لائی ہوں۔ میری کار میں چل کر بیٹھو۔ آرام سے گفتگو ہوگی۔"

وہ کار کی طرف چلتے ہوئے بولا۔ "شلپا واقعی چالاک ہے۔ بہت محتاط رہ کر کام کرتی ہے۔"

وہ ایک کار میں بیٹھ گئے۔ ڈمی نے بیگ سے ایک ایک دستاویز نکال کر دی۔ وہ انہیں پڑھ کر مطمئن ہوتا گیا پھر کار کے ریکارڈر میں آڈیو کیسٹ لگا کر اسے سنایا اور ویڈیو کیسٹ دیتے ہوئے کہا۔ "اسے "را" کے ڈی جی کے پاس جا کر دیکھ سکتے ہو۔"

"ڈی جی اصل دستاویزات' آڈیو اور ویڈیو مانگے گا۔"

"اس کے سامنے دو شرائط پیش کرو۔ اس سے کہو آج ہی رات کو پاکستان میں دردانہ بیگم کے چار سیاست دانوں کو پارٹی چھوڑ کر اپوزیشن پارٹی میں جانے پر مجبور کرو یا ان سے کہو اپنی تحریر دے کر روپوش ہو جائیں اور یہ ظاہر کریں کہ انہوں نے خفیہ طور سے ملک چھوڑ دیا ہے لیکن ان میں سے کسی بھی سیاست داں کو ختم نہ کیا جائے۔ انہیں زندہ رکھنا ہوگا۔ یہ کام ڈی جی وہاں دہشت گردوں سے کرا سکتا ہے یا انہیں کروڑوں

روپے دے کر دردانہ کی پارٹی سے الگ کرسکتا ہے۔"

پتامبر بجاج نے پوچھا۔ "پاکستانی سیاست دانوں سے شلپا کو کیا دلچسپی ہے؟"

"تم کوئی سوال نہیں کرو گے۔ دوسری شرط یہ منواؤ کہ پہلے وہ تمہیں مکھ منتری بنائے۔ پھر تمام اصل راز اس کے حوالے کردیئے جائیں گے۔"

""را" والے مجھے مکھ منتری بنا کر وہ راز حاصل کرکے گولی مار دیں گے۔"

"تو اپنے طور پر کوئی اور شرط منوالو۔ ایک بات کہہ دوں کہ شلپا ایک نوجوان کے عشق میں گرفتار ہوچکی ہے۔ وہ انڈر گراؤنڈ مافیا چھوڑ کر کہیں روپوشی کی زندگی گزارے گی۔ لہٰذا تم گاڈ فادر بن سکو گے۔"

پتامبر بجاج تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے موبائل فون کے ذریعے "را" کے ڈی جی سے رابطہ کیا اور اسے یہ تمام باتیں بتائیں کہ اس بنگلے کے احاطے سے ملنے والی لاش شلپا ہی کی تھی۔ اب وہ تمام اہم راز اس کے پاس ہیں ثبوت کے طور پر ان رازوں کی نقل پیش کرسکتا ہے۔ اصل تمام راز اس وقت پیش کرے گا جب اس کی شرائط پر عمل ہوگا۔

اس نے شرائط بتائیں۔ ڈی جی نے کہا۔ "دردانہ کے دس سیاست داں میری مٹھی میں ہیں۔ مجھ سے کئی طرح کے سیاسی اور مالی فائدے اٹھاتے ہیں۔ یہ کام آج ہی رات کو ہوجائے گا۔ تم پہلے دستاویزات کی نقل لے کر آؤ۔"

پتامبر بجاج نے کہا۔ "میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ اصل راز اپنے پاس کسی جگہ چھپا کر تمہارے پاس نقل لاؤں۔ شلپا کی طرح میں بھی مارا جاؤں گا۔ میں انڈر گراؤنڈ مافیا کا گاڈ فادر بننے کے بعد وہ اصل راز تمہارے حوالے کروں گا۔ ابھی میرا ایک ماتحت ان کی نقل لے کر تمہارے پاس آرہا ہے۔ آج سے آپ کے تمام جاسوس مجھے اور میری بیٹی نرملا کو ڈھونڈتے پھریں گے مگر ہم کسی کو نظر نہیں آئیں گے۔ میرے اور تمہارے درمیان صرف فون کے ذریعے معاملات طے ہوتے رہیں گے۔"

اس نے فون بند کیا پھر اس ڈمی عورت سے کہا۔ "شلپا کو بتادینا۔ میں نے ڈی جی سے کیا باتیں کی ہیں۔ اپنی دوستی اور وفاداری کا ثبوت دے رہا ہوں۔"

وہ بولی۔ "آپ اطمینان رکھیں۔ اس نے طے کیا ہے اپنے عاشق جوان کے ساتھ بھارت چھوڑ کر چلی جائے گی اور میرے ذریعے اصل راز کی تمام دستاویزات وغیرہ تمہارے حوالے کردے گی۔"

"اس نے مجھے یہ بات کیوں نہیں بتائی؟"

"ابھی وہ اپنے عشق کا معاملہ راز میں رکھے ہوئے ہے۔ لندن میں اپنے ڈیڈی کی سلامتی کے انتظامات کرے گی پھر تمہیں اور بہت کچھ بتائے گی۔"

اس نے چار موبائل فون نمبر نوٹ کرکے دیتے ہوئے کہا۔ "شلپا سے کہنا' اب میرے لیے بھی "را" والوں کی طرف سے خطرہ رہا کرے گا۔ میں اپنی بیٹی کو لے کر اپنے ایک خفیہ بنگلے میں چلا جاؤں گا۔"

وہ کار سے باہر آیا۔ دور اس کی اپنی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اس گاڑی میں اس کے دو مسلح ماتحت بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک ماتحت کو وہ تمام دستاویزات دے کر کہا "را" کے ڈی جی کے پاس جاؤ۔ وہ ان چیزوں کا انتظار کر رہا ہے۔ اس سے کہنا میں موبائل فون پر اس کے فون کا منتظر ہوں۔"

وہ ماتحت .... تمام چیزیں لے کر ایک ٹیکسی میں چلا گیا۔ دوسرے ماتحت نے پوچھا۔ "باس! اگر اجازت ہو تو میں شلپا کی گاڑی کا تعاقب کروں۔ شاید اس کی خفیہ رہائش گاہ کا پتا چل جائے۔"

"وہ شلپا نہیں ہے۔ تم لوگ نہیں جانتے وہ کتنی مکار ہے۔ اس کا پیچھا کرو گے تو وہ سمجھ لے گی کہ میری نیت میں کھوٹ ہے' گاڑی چلاؤ۔"

وہ ڈرائیو کرنے لگا۔ موبائل فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے اسے آن کرکے ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے ملازم رامو کی آواز سنائی دی۔ "مالک! غضب ہوگاوا۔ او رنجن ایک عورتیا کے ساتھ آوت رہا۔ ہم کا بے ہوس کردیا۔ گھرما چھوٹی مالکن ناہی ہے۔ اوئی بھوتنی کا بچہ مالکن کو لے گوا ہے۔"

وہ غصے سے بولا۔ "ہمارے گن مین کہاں ہیں؟"

جواب میں ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "بجاج صاحب! میں آپ کے علاقے کا تھانہ انچارج بول رہا ہوں۔ باہر ایک گارڈ گیٹ پر اور دوسرا آپ کے بنگلے کے دروازے پر مردہ پڑے ہیں۔ اس علاقے سے کسی نے تھانے میں اطلاع دی کہ آپ کے بنگلے میں واردات ہوئی ہے۔ دو گارڈز کا مرڈر ہوا ہے۔ میں فوراً سپاہیوں کے ساتھ پہنچ گیا ہوں۔"

"کیا آپ نے میری بیٹی کو پورے بنگلے میں تلاش کیا ہے؟"

"جی ہاں۔ آپ کے ملازم کا بیان ہے کہ آپ کا ہونے والا داماد رنجن ورما کسی عورت کے ساتھ آیا تھا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں' انہوں نے آپ کی بیٹی کو اغوا کیا ہے مگر عجیب سی بات ہے' ہونے والا داماد اغوا کیوں کرے گا۔"

وہ بولا۔ "آپ اپنے طور پر انکوائری کریں۔ مجھے آنے میں دیر ہوگی۔ میں رنجن ورما کو تلاش کرنے جا رہا ہوں۔"

وہ فون بند کرکے ماتحت سے بولا۔ "اپنے دوسرے بنگلے میں چلو۔ وہ ذلیل کمینہ ایسے وقت دشمنی کر رہا ہے جب کہ میں شلپا کا اعتماد حاصل کر رہا ہوں۔ ادھر "را" والوں کو معلوم ہوگا کہ شلپا کو قتل کرنے کے بعد تمام اہم راز میرے پاس آگئے ہیں تو وہ میری موت بن کر مجھے تلاش کرتے پھریں گے۔"

وہ ہر طرف سے مشکلات میں گھر گیا تھا۔ بینا نے اسے "را" کے اہم رازوں کا امین بنا کر چھپتے پھرنے پر مجبور کردیا تھا۔ دوسری طرف میں نے نرملا کو اغوا کیا تھا۔ وہ اغوا کے سلسلے میں پولیس کارروائی کرتا تو اسے پولیس والوں کے ساتھ منظرِ عام پر رہنا پڑتا۔ اس طرح "را" کے کتے اسے بھنبھوڑ کر رکھ دیتے۔

پھر فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے اسے آن کرکے پوچھا۔ "ہیلو کون؟"

"میں شلپا بول رہی ہوں۔ ابھی میری ماتحت نے فون پر بتایا ہے کہ تم نے "را" کے ڈی جی سے فون پر بات کی تھی۔ وہ شرائط بھی پیش کیں تھیں اور ان دستاویزات کی نقل بھی بھیج دی ہے۔ میں مانتی ہوں، تم واقعی دوستی کا ثبوت دے رہے ہو۔"

"شلپا! ادھر ہمارے درمیان اعتماد پیدا ہو رہا ہے۔ ادھر میرے ساتھ بہت بڑی ٹریجڈی ہوگئی ہے۔ میری بیٹی نرملا کو اغوا کرلیا گیا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟ تم کوئی معمولی شخص نہیں ہو۔ تمہارا رعب اور دبدبہ ہے۔ کون ایسی جرأت کرسکتا ہے؟"

"رنجن ورما ایک عورت کے ساتھ میرے بنگلے میں آیا تھا۔ اسی نے میری بیٹی کو اغوا کیا ہے۔"

"رنجن ورما؟ یہ تو تمہارے ہونے والے داماد کا نام تھا۔ میں نے سنا تھا، وہ بہت عرصے سے لاپتا ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی موت کا یقین کرلیا گیا تھا۔"

"وہ زندہ ہے۔ کہیں چھپا ہوا ہے۔ وہ انڈر گراؤنڈ مافیا سے میرے تعلق کو جان گیا تھا۔ میں نے اسے ختم کردینے کی کوشش کی مگر پتا نہیں کیسے بچ گیا۔ اب وہ انتقام لے رہا ہے۔"

"تم پریشانی میں بھول رہے ہو کہ وہ ہم سے زیادہ طاقتور اور بااختیار نہیں ہے۔ ہم ابھی اپنے مافیا کے تمام افراد ممبئی شہر میں پھیلا دیں گے۔ وہ نرملا کو اس شہر سے باہر نہیں لے جاسکے گا۔"

"وہ میری بیٹی کو قتل کرسکتا ہے۔"

"نرملا نادان نہیں ہے۔ رنجن جیسے درجنوں جوانوں کو اُلّو بنا سکتی ہے۔ میں ایک عورت کی حیثیت سے جانتی ہوں، مرد کو ایک بار دھوکا دے کر دوسری بار بھی کس طرح اپنا دیوانہ بنایا جاسکتا ہے۔ تم فوراً انڈر گراؤنڈ مافیا کے ذریعے کارروائی کرو، میں بھی یہی کر رہی ہوں۔"

"تھینک یو شلپا! تم نے میرا حوصلہ بڑھایا ہے مگر ایک اور مشکل ہے۔ ڈی جی کو اب تک معلوم ہوچکا ہوگا کہ تمام اہم راز میرے پاس ہیں۔ اب اس کے جاسوس مجھے تلاش کریں گے۔"

"پروا نہ کرو، تم روپوش رہو۔ میں آج رات نرملا کو ڈھونڈ نکالوں گی۔ تم "را" والوں کو معلوم نہ ہونے دو کہ مشکلات میں پھنسے ہو۔ اگر پوچھا جائے تو یہ کہہ دینا کہ تمہاری بیٹی تمہیں مل چکی ہے۔ مجھ پر بھروسا کرو۔ صبح سے پہلے نرملا تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔"

وہ بہت زیادہ احسانات مانتا رہا۔ اس کا شکریہ ادا کرتا رہا پھر فون کا رابطہ ختم ہوگیا۔

وہ مسکرا کر سوچنے لگا۔ کوئی بادشاہ سلامت بن جائے۔ پوری دنیا کو تختِ شاہی بنا کر تاج پہن کر بیٹھ جائے۔ لاکھوں کی تعداد میں فوج اور جدید اسلحہ رکھ لے پھر ذہانت سے مار کھا جاتا ہے۔ خصوصاً سیاست میں اینٹ کا جواب ذہانت اور مکاری کے پتھر سے دیا جاتا ہے۔

☆======☆======☆

ڈاکٹر زیدی نے کہا تھا، مراد کو ڈیڑھ گھنٹے تک ہوش آجائے گا۔ خون بہت بہہ چکا تھا۔ اس کے گروپ کا خون اسے چڑھا دیا گیا تھا۔ تابانی کا خون کھول رہا تھا۔ وہ گاڈ فادر ہاشم سے بولی۔ "انکل! میرے مراد کا خون بہانے والے زندہ نہیں رہیں گے اور دردانہ کو تو کل کسی طرح بھی حلف اٹھانے نہیں دوں گی۔"

"بیٹی! جوش میں نہ آؤ۔ یہ بھی تو سوچو کہ ہمیں گرفتار کرانے کے لیے مراد نے بھی نادانی کی ہے۔ اس نے اتنی بڑی بات کیوں مان لی کہ اس کے بازو کا آپریشن کیا جائے اور جاسوس آلہ لگایا جائے۔"

"میں مراد سے بھی ناراض رہوں گی۔ اسے غلطیوں کا احساس دلا کر اپنی راہ پر چلاؤں گی لیکن ابھی اسے ہوش آنے کے بعد دشمنوں سے انتقام لینے جاؤں گی۔"

"کہاں جاؤ گی؟ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ ان کے ہاتھ سے مراد کے نکل جانے کے بعد دردانہ بیگم کے اطراف کتنی زبردست سیکورٹی کے انتظامات ہوں گے۔"

"اس کے محل سے اسمبلی تک کہیں تو موقع ملے گا۔"

"موقع ملے گا' تم اسے گولی مارو گی اور گارڈز تمہیں مار ڈالیں گے۔ اپنی ذہانت اور دلیری کو صرف ایک دردانہ کے لیے ختم کرو گی۔ کیا اس وقت یہ سمجھنے کے قابل ہو کہ غصہ ہمیشہ ذہانت کو کچل دیتا ہے؟"

وہ ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر خاموش رہی۔ ہاشم نے کہا۔ "تم اتنی ضدی ہو کہ سمجھانے سے بھی نہیں سمجھو گی۔ ٹھیک ہے' نہ سمجھو۔ اپنی امی (ڈاکٹر آمنہ) کے حکم کو بھی بھول جاؤ کہ تمہیں یہاں میرے مشورے کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ مجھے بھی دشمن سمجھو اور اپنی امی کو بھی پھر جو جی میں آتا ہے' کر گزرو۔"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "سوری انکل! میں امی کی یہ بات بھول گئی کہ مجھے آپ کے مشورے کے مطابق کوئی بھی قدم اٹھانا ہے۔ امی میرے لیے دیوی کا درجہ رکھتی ہیں۔"

ہاشم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "شاباش بیٹی! یہی آزمائش کا وقت ہوتا ہے اور ایسے ہی وقت دماغ کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔ ہم ہار مان کر بیٹھے ہوئے نہیں ہیں۔ ہم نے طے کر لیا ہے کہ دردانہ کانٹوں پر چل کر حکومت کرے گی اور چل نہیں سکے گی۔ دو ہی قدم میں گر پڑے گی۔"

مراد کو ہوش آنے لگا۔ ہاشم نے کہا۔ "مراد سے بھی محبت سے پیش آنا۔ غصہ دکھانے سے فائدہ نہیں ہو گا۔ اسے محبت سے ہماری طرف مائل کرو۔"

ہاشم وہاں سے چلا گیا۔ وہ رفتہ رفتہ ہوش میں آ گیا۔ اس نے بستر کے سرے پر تابانی کو دیکھ کر کہا۔ "تم.........؟ تم نے ابھی تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا' تابانی کہاں ہے؟"

"تم نے جیل کے سامنے مجھے گلے لگا کر بھی نہیں سمجھا کہ میں تمہاری تابانی ہوں۔ کیا چہرہ بدلنے سے محبت کے وہ جذبات اور احساسات بھی بدل جاتے ہیں جن کے ذریعے مرد اپنی عورت کو چھو کر پہچان لیتا ہے۔"

"میں نے تمہیں پہچان لیا تھا۔ کئی بار کہا تھا کہ تم تابانی ہو مگر تم باتیں بنا کر اور ایک اجنبی عورت کی ایکٹنگ کرتے ہوئے مجھے جھٹلاتی رہیں' اب اعتراف کر رہی ہو؟"

"اس لیے کہ تمہارے بازو سے جاسوس آلہ نکال دیا گیا ہے۔"

اس نے چونک کر سر اٹھا کر اپنے بازو کو دیکھا۔ زخم سے ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ کراہنے لگا۔ تابانی نے کہا۔ "آرام سے لیٹے رہو۔ چوبیس گھنٹے کے اندر دوبار تمہارا آپریشن ہو چکا ہے۔ ایک بار جیل میں' دوسری بار یہاں۔ تمہارا اتنا خون بہہ چکا ہے کہ میری آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ میں انکل ہاشم کے سمجھانے سے برداشت کر رہی

ہوں ورنہ جاسوس آلہ چھپانے والوں کے جسموں سے تمام خون نچوڑ کر رکھ دیتی۔"

"غصہ نہ کرو۔ انہوں نے میری مرضی سے ایسا کیا تھا۔"

"ایسی بات کہتے شرم نہیں آتی۔ اس آلے کے ذریعے ہم سب کو گرفتار کرانا چاہتے تھے؟"

"میں صرف تمہیں انکل اکرام شاہ کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔"

"بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔ پنڈی سے یہاں تک ہمارے درمیان انکل ہاشم کے سلسلے میں بھی بہت سی باتیں ہوئیں اور دشمن ایسی معلومات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں جس خفیہ اڈے میں تمہیں لائی ہوں' وہ یہاں بھی پہنچ جاتے۔ میں دردانہ کے خلاف باتیں کرتی رہتی۔ وہ لوگ سنتے رہتے۔ میری پلاننگ بھی معلوم کر لیتے۔"

مراد نے کہا۔ "میں کسی انکل ہاشم کو نہیں جانتا۔ صرف تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ تم نہیں جانتیں' ہم وہاں کتنے محفوظ رہیں گے۔"

"اگر دردانہ بیگم حکومت بنانے والی نہ ہوتی تو اکرام شاہ تمہیں پھانسی پانے سے بچا لیتا؟ جو حکمران آتے جاتے رہتے ہیں ان کا عارضی سہارا کیوں لیتے ہو؟"

"کیا وہ گاڈ فادر ہاشم تمہیں زندگی بھر مصیبتوں سے بچاتا رہے گا؟"

"زندگی بھر بھگوان بھی نہیں بچاتا۔ وہ ہمیں آزمائشوں میں مبتلا کرتا رہتا ہے۔ ہمیں اپنی ذہانت اور حوصلوں پر اعتماد کرنا چاہیے۔ ویسے انکل ہاشم یہاں کے حکمرانوں سے زیادہ پائیدار ہیں۔ خفیہ ہاتھ انہیں کئی بار نقصان پہنچاتا رہا۔ ان کی مافیا کو دوبار کچل ڈالا مگر وہ پھر طاقت حاصل کر کے مقابلے پر ڈٹے ہوئے ہیں۔"

وہ بولا۔ "دردانہ بیگم ہو' کوئی اور حکمران ہو یا کوئی گاڈ فادر ہو' ہم تو ان کے مہرے بننے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ایک دن ہمیں مرنا ہے اور جب تک کوئی ہمیں گولی نہیں مارتا' اس دن تک ہمیں دہشت گردی کے لئے کسی کا بھی آلۂ کار بن کر رہنا ہے۔"

"کیا دنیا میں سب دہشت گرد پیدا ہو رہے ہیں؟ اگر نہیں تو اب تم بھی دہشت گرد نہیں رہو گے۔ میں نے ڈاکٹر امی سے زندگی دینا اور زندگی کی حفاظت کرنا سیکھا ہے۔ اب میں مارتی نہیں' مسیحا بن جاتی ہوں۔ تم بھی یہی کرو گے۔ ہمارا ہونے والا بچہ فخر سے کہہ سکے گا کہ اس کے ماں باپ گمراہی سے نکل کر آخری سانس تک مسیحائی کرتے رہے۔"

وہ اس کی باتیں سن رہا تھا اور حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ "تم تو بالکل بدل گئی ہو۔ جب میں اسپتال میں تھا تو ڈاکٹر آمنہ.........."

"امی کہو۔"

اس نے ذرا دیر چپ رہ کر اسے دیکھا پھر کہا۔ "امی میرا علاج کرتی تھیں اور سمجھاتی تھیں کہ مجھے اپنے ہونے والے بچے کے لیے ایک قابلِ فخر باپ بننا چاہیے۔ پتا نہیں ان کی باتوں اور ان کی شخصیت میں کیا جادو ہے۔ میں قاتل ہو گیا تھا لیکن جیل میں میرے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا کہ میں نے قسم کھائی' اگر زندگی رہی تو جلاد بن کر زندگی گزاروں گا۔"

"ایسے وقت تمہارا اکرام شاہ تمہارے لئے کچھ نہ کر سکا۔ کام تو ایسے وقت آنا چاہیے کہ انسان پاگل ہو کر شیطان نہ بنے۔"

ڈاکٹر زیدی نے آکر مراد سے کہا۔ "ہیلو ینگ مین! کیسے ہو؟ کیا تکلیف محسوس کر رہے ہو؟"

"حرکت کرنے سے تکلیف ہوتی ہے۔"

"فی الحال حرکت نہ کرو۔ آرام سے سونے کی کوشش کرو۔ دو ایک روز میں چلنے پھرنے اور دوڑنے لگو گے۔"

ایک نرس ٹرے میں دوائیں اور انجکشن لے کر آئی تھی۔ اس نے انجکشن لگایا۔ کھانے کے لیے کیپسول دیئے پھر چلی گئی۔ ڈاکٹر زیدی نے کہا۔ "تابانی! اسے تنہا رہنے دو۔ ابھی نیند آجائے گی۔ کم آن۔ میرے ساتھ آؤ۔"

وہ مراد کو پیار سے دیکھتے ہوئے چلی گئی۔

☆======☆======☆

دوسرے دن حلف برداری کی تقریب تھی۔ ٹی وی کے ذریعے پورے ملک میں نئے حکمران کے حلف اٹھانے کا منظر دکھانے کا خصوصی انتظام کیا گیا تھا۔ صبح چھ بجے چیف جسٹس' فوج کے چیف آف اسٹاف اور نیک بخت کو باری باری فون موصول ہوا۔ فون کرنے والا ہاشم تھا۔ اس نے کہا۔ "جنابِ عالی! دردانہ بیگم نے اسمبلی میں اپنی پارٹی کی اکثریت ثابت کرنے کے لئے قانون کو' عدالت عالیہ کو اور فوج کو دھوکا دیا ہے۔ آپ دن کے دس بجے اسمبلی میں تشریف لائیں گے تو چیف جسٹس کے نام دردانہ بیگم کی پارٹی کے چار کامیاب سیاست دانوں کے تحریری خطوط ملیں گے۔ وہ چاروں دردانہ بیگم کی پارٹی کو' اس ملک کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ بیگم صاحبہ نے تین ووٹوں سے اسمبلی میں برتری حاصل کی تھی۔اب وہ برتری حاصل نہیں رہی۔ لہٰذا وہ حکومت بنانے کی مجاز نہیں رہیں۔"

ہاشم سے پوچھا گیا۔ "تم کون ہو؟ اور تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟"

"میرا نام عوام ہے۔ آج دس بجے ایک عام سا آدمی ان چار سیاست دانوں کے خطوط اسمبلی کے دروازے پر لائے گا۔ آپ سب اس ملک کے اکابرین ہیں۔ لہٰذا حکم صادر کریں کہ ایک عام آدمی کو اسمبلی میں آنے سے کوئی نہ روکے۔"

"عوام کا نام لے کر خود کو نہ چھپاؤ۔ سچ کو ساری دنیا سچ کہے گی اور تمہیں عزت دی جائے گی۔ خود آؤ تو بہتر ہو گا۔"

"مجھے عزت آپ سے نہیں اللہ تعالیٰ سے مل رہی ہے۔ آپ میری صورت نہ دیکھیں۔ صرف سچائی کو دیکھیں اور اس کے مطابق عمل کریں۔"

اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ صبح چھ بجے سے پہلے میں نے امی کو لندن میں' پھر انکل ہاشم کو پاکستان میں فون کر کے بتایا تھا کہ خفیہ ہاتھ نے پاکستان میں اپنی کٹھ پتلی حکومت بنانے کے لئے کیپٹن امیر حمزہ اور راجہ نواز کو پتا نہیں کس طرح راستے سے ہٹایا ہے لیکن میں یہ ثابت کر رہا ہوں کہ پاکستان میں ایک امیر حمزہ اور ایک راجہ نواز نہیں تھے۔ اور بھی ہیں۔ لاکھوں ہیں' کروڑوں ہیں۔ یہ جاگتے جائیں گے تو خفیہ ہاتھ سے بہتر سیاسی حکمتِ عملی سے اپنے ملک اور اپنی قوم کو استحکام دیتے رہیں گے۔ میں نے بھارت میں رہ کر اپنی حکمتِ عملی سے اسمبلی میں دردانہ بیگم کی اکثریت ختم کر دی ہے۔ وہ قانون کے مطابق حکومت بنانے کے لئے حلف نہیں اٹھا سکے گی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے خفیہ ہاتھ سے اپنے استاد محترم امیر حمزہ کا انتقام لیا ہے۔

میں نے انکل ہاشم سے کہہ دیا تھا کہ اسلام آباد میں "را" کا ایک شخص انکل ہاشم کے ایک معتمدِ خاص کو ان چار سیاست دانوں کی اپنی لکھی ہوئی تحریریں لا کر دے گا۔ وہ چاروں تحریریں ایک عام شخص کے ذریعے اسمبلی میں پہنچائی جائیں۔ خفیہ ایجنسی والے اس عام شخص کا تعاقب کریں۔ اس کی اصلیت معلوم کریں کہ اس کے روابط کس سے ہیں تو انہیں ہمیشہ یہی معلوم ہوتا رہے گا کہ اس عام شخص کا تعلق کسی سیاسی پارٹی یا کسی خفیہ ایجنسی سے نہیں ہے۔

انکل ہاشم نے تابانی سے کہا۔ "تم غصے میں اپنی جان کا خطرہ مول لینے والی تھیں لیکن ہماری بات مان کر صبر کیا۔ صبر کا پھل اللہ تعالیٰ دے رہا ہے۔ تمہارے بھائی فرمان نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ پاکستان کی دشمن "را" کو آلۂ کار بنا کر دردانہ بیگم کو سیاسی طور پر کمزور کر دیا ہے۔ "را" جیسے زہریلے سانپ کا زہر نکال کر اس زہر کو آبِ حیات بنا دیا ہے۔"

دیدی (تابانی) کو جب بتایا گیا کہ میں نے کیسی چال چلی ہے تو وہ خوشی سے اچھل

پڑی- کہنے لگی- "جی چاہتا ہے' ابھی بھارت جا کر اپنے بھائی کو کلیجے سے لگا کر چومتی رہوں-"

انکل ہاشم نے کہا- "ابھی تمہیں محتاط رہنا ہے- اپنے مراد کو بھی یہ نہ بتاؤ کہ فرمان کے ذریعے یہاں کی ایسی بازی پلٹ گئی ہے- ابھی دشمنوں کو حیران اور پریشان ہونے دو-"

صبح چھ بجے کے بعد دردانہ بیگم کو یہ دھماکہ خیز خبر ملی کہ وہ ایک حکمران کی حیثیت سے حلف اٹھانے کا فرض انجام نہیں دے سکے گی- آج اسے اسمبلی پہنچ کر نیک بخت کے کامیاب سیاست دانوں کے مقابلے میں اپنی اکثریت ثابت کرنی ہو گی- اس سے پہلے جو اکثریت ثابت کی گئی تھی' وہ فراڈ تھی اور قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی گئی تھی-

پہلے تو دردانہ بیگم کو یقین نہیں آیا کہ دردانہ بیگم کے چار سیاست داں اچانک سیاسی منظر سے کہاں غائب ہو گئے ہیں- انہوں نے ایسے خطوط لکھے ہیں کہ خفیہ ہاتھ کی کٹھ پتلی حکومت اب نہیں بن سکے گی- انہوں نے خطوط لکھے ہیں' یا جبراً کسی نے لکھوائے ہیں؟ وہ چاروں کہیں روپوش ہو گئے ہیں یا انہیں اغوا کیا گیا ہے؟

خفیہ ہاتھ کی تمام ایجنسیاں حرکت میں آ گئی تھیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ جب حمزہ اور راجہ موجود نہیں ہیں تو ایسا کس نے کیا ہے؟ گاڈ فادر ہاشم کے بارے میں خیال تھا کہ وہ طرح طرح کی مجرمانہ چالیں چل سکتا ہے لیکن سیاسی چالبازی میں خفیہ ہاتھ سے سبقت نہیں لے جا سکتا-

نیک بخت سے بھی توقع نہیں تھی کہ سیاست کے میدان میں خفیہ ہاتھ کی کامیابی اور اٹل فیصلے کو للکارنے کی جرأت کر سکے گا پھر بھی اس نے رابطہ کر کے پوچھا- "مسٹر نیک بخت! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

وہ بولا- "میں دردانہ کی سیاسی توہین پر خوش تو ہوں لیکن حیران بھی ہوں کہ ایسا کس نے کیا ہے؟"

"تم باتیں بنا رہے ہو- سیدھی سی سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ صرف دردانہ ہی تمہاری سب سے بڑی حریف تھی- تم نے اسے ناکام بنانے کے لئے مجرموں کا سہارا لیا ہے- اس کے چار سیاست دانوں کو اغوا کرایا ہے-"

نیک بخت نے کہا- "میں پہلے بھی آپ کے فیصلوں کو تسلیم کرتا آیا ہوں- آپ نے مجھے یا دردانہ میں سے جس کو حکومت بنانے کی اجازت دی اسے ہم نے سر جھکا کر تسلیم کر لیا- کیا مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ میں آپ کے فیصلے کو للکار سکوں؟"

دس بجے تمام سیاسی پارٹی کے جیتنے والے اور ہارنے والے موجود تھے- چیف جسٹس اور فوج کے چند اعلیٰ افسران بھی تھے- ایک شخص شلوار قمیض پہنے وہاں آیا- اس نے ایک بڑا سا لفافہ فوج کے ایک اعلیٰ افسر کو دیا- اعلیٰ افسر نے اس عام شخص سے پوچھا- "تم کون ہو؟ اور یہ لفافہ کہاں سے لائے ہو؟"

اس نے جواب دیا- "مجھے ایک گھنٹا پہلے فون پر کسی نے کہا تھا کہ ایک پاکستانی کی حیثیت سے اپنے ملک اور قوم کی بہتری چاہتے ہو تو اسمبلی کی عمارت سے دو سو گز دور سڑک کے کنارے قومی لباس میں جناح کیپ پہنے کھڑے رہو- ایک شخص تمہیں ایک لفافہ لا کر دے گا تم اس لفافے کو اسمبلی میں لے جا کر کسی فوجی افسر کو دے دو اور واپس آ جاؤ-"

اس سے سوال کیا گیا- "تم نے لفافہ دینے والے شخص سے یہ نہیں پوچھا کہ اسے یہ لفافہ کس نے دیا ہے؟"

"میں نے پوچھا تھا- اس نے جواب دیا کہ اسے بھی فون پر کہا گیا کہ اسمبلی کی عمارت سے چار سو گز دور کھڑے رہو' سچے پاکستانی ہو تو ایک لفافہ لے کر اسمبلی کی عمارت سے دو سو گز دور کھڑے ہوئے اس شخص کو دو جو قومی لباس اور جناح کیپ پہنے ہو گا- مجھے لفافہ دینے والا بھی قومی لباس اور جناح کیپ میں تھا اور اسے بھی کسی تیسرے شخص نے وہ لفافہ لا کر دیا تھا-"

اب اگر اس تیسرے شخص سے بھی پوچھا جاتا تو وہ بھی وہی جواب دیتا کہ اسے کسی چوتھے شخص نے وہ لفافہ دیا ہے- یہ سراغ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ لفافہ دینے والا اصل شخص کون ہے-

اس لفافے کو چاک کیا گیا- پورے اسمبلی ہال میں خاموشی چھا گئی- پہلے اس میں سے ایک خط نکالا گیا- ایک شخص نے مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر اسے پڑھا- "محترم جناب اعلیٰ چیف جسٹس اور باوقار حوصلہ مند آرمی افسران! یہ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے ملک میں محب وطن سیاست دانوں کا فقدان ہے اور جو محبانِ وطن ہیں' انہیں ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کا کبھی موقع نہیں دیا جاتا-

جب بھی کوئی نئی حکومت بنتی ہے' وہ قوم کو مایوس اور ملک کو کمزور اور بڑے ممالک کا محتاج بناتی جاتی ہے- عوامی احتجاج کے باوجود بڑے پُراسرار طریقوں سے انتخابات میں دھاندلی کر کے کرپٹ سیاست دانوں کو ان پر مسلط کر دیا جاتا ہے- پاکستان کے قیام کو پینتالیس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور کرپٹ سیاست داں اب پوری قوم کو بھی

تین وقت کی روٹیاں حاصل کرنے کے لئے کرپٹ بناتے جا رہے ہیں۔ حالات بتا رہے ہیں کہ اکیسویں صدی میں ہمارا یہ ملک دہشت گردوں، تخریب کاروں اور خطرناک مجرموں کا مسکن بن جائے گا اور یہ کہتے ہوئے شرم آئے گی کہ یہ ملک خدا داد ہے۔

آئندہ کرپٹ سیاست دانوں کو عوام پر مسلط ہونے سے روکنے کا یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے کہ وہ انتخابات میں دھاندلی کرنے کے باوجود اسمبلی میں اپنی اکثریت ثابت نہ کر سکیں گے۔ اسی سلسلے میں آج یہ پہلا قدم اٹھایا گیا ہے۔ دردانہ بیگم نے دھاندلی سے انتخابات جیت لئے۔ کروڑوں روپے خرچ کر کے اور کسی نہ کسی شعبے کی وزارت دینے کا وعدہ کر کے جیتنے والے سیاست دانوں کو خرید کر اسمبلی میں اپنی اکثریت ثابت کی۔ ان خریدے ہوئے چار سیاست دانوں کے ضمیر جاگ گئے اور وہ سیاست سے علیحدہ رہنے کی تحریریں پیش کر کے اس ملک سے جا چکے ہیں۔ اس لفافے کے اندر دوسرے لفافے میں ان کی تحریریں موجود ہیں مگر وہ خود نہیں ہیں۔ تاکہ ان پر کسی طرح کا سیاسی دباؤ نہ ڈالا جا سکے۔ فقط راقم الحروف۔ عوام۔"

نیک بخت اور اس کی پارٹی کے سیاست داں بہت خوش نظر آ رہے تھے اور دردانہ بیگم اپنے سیاست دانوں کے ساتھ گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ اس دوسرے لفافے کو چاک کر کے ایک سیاست داں کا خط نکالا گیا۔ ایک شخص نے مائیک کے سامنے آ کر اسے پڑھا۔ اس میں لکھا تھا۔

"دردانہ بیگم! یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں لیکن میری یہ تحریر ہمارے وطن کے معزز اکابرین تک اسمبلی میں پہنچے گی۔

"پہلے میں تمہیں محترمہ کہتا تھا اب نہیں کہوں گا۔ تم ہو، نیک بخت ہو یا ہر وہ سیاسی پارٹی کا لیڈر جو اپنی بے انتہا دولت سے اسمبلی میں سیاست دانوں کو خریدتا ہے۔ اگر اس کے پاس دولت نہ ہوتی اور خوبصورت بیٹیاں اور بہنیں ہوتیں تو وہ بہنوں اور بیٹیوں کو پیش کر کے اسمبلی میں اپنی اکثریت ثابت کرتا۔ اس قوم کے بدعنوان رہنما اتنے گر چکے ہیں کہ انہیں محترم یا محترمہ کہنا سراسر وطن دشمنی ہو گی۔"

"یہ خط میں کسی کے دباؤ پر نہیں لکھ رہا ہوں۔ میرا ضمیر مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اگر میں ایک شخص، کسی بدعنوان سیاسی پارٹی کے لیڈر کا ساتھ نہ دوں اور میری طرح اور میری طرح دوسرے باضمیر سیاست داں بھی میری اس روایت پر چل پڑیں تو آئندہ ملک میں کبھی کرپٹ حکمران اقتدار میں نہیں آ سکیں۔"

"میں ایک نئی روایت ڈالنے جا رہا ہوں۔ اس امید پر کہ یہ سلسلہ جاری رہا تو ساری

دنیا میں پاکستان جیسا نیک نام اور ترقی یافتہ ملک کوئی نہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اس نیک جذبے کو تقویت دیتا رہے۔ آمین۔ فقط راقم الحروف سید ثناء اللہ خان۔"

پورے ہال میں گہری خاموشی رہی۔ دردانہ کی ناکامی پر نیک بخت اور اس کے ساتھیوں کو خوش ہو کر تالیاں بجانا چاہیے تھیں لیکن جو تحریر پڑھی گئی تھی، اس میں نیک بخت کا نام بھی کرپٹ سیاست دانوں میں تھا۔

باقی تین سیاست دانوں کے خطوط بھی پڑھ کر سنائے گئے۔ ان سیاست دانوں نے ایک دوسرے سے مختلف الفاظ میں جو لکھا تھا ان سب کا متن یہی تھا کہ وہ محبانِ وطن سیاست دانوں کو حکمران بنانے کے لئے سیاست اور ملک چھوڑ کر جا رہے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے سیاست دانوں کو بھی ذاتی مفاد کے لئے اور ملک کی دولت لوٹنے کے لئے گھوڑے اور گدھے کی طرح خود کو فروخت نہیں کرنا چاہیے۔ وہ سب ایک بار ضمیر کی بیداری سے خود کو سچے مسلمان اور سچے پاکستانی ثابت کر دیں۔ ایک بار یہاں مثبت اور فعال حکومت بنے گی تو پھر کسی لٹیرے کی سیاست میں آنے کی گنجائش نہیں رہے گی۔

اس روز اسمبلی میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس سلسلے میں پہلے ہی فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ ملکی اور غیر ملکی اخبارات کے مالکان، مدیران اور صحافیوں کو اسمبلی کے اندر آنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ چار سیاست دانوں کے روپوش ہونے کی بات کو مختلف اخبارات اپنے نقطۂ نظر سے شائع کریں گے اور مخالفانہ انداز میں بھی پاکستان کو بدنام کریں گے۔ تمام انفارمیشن میڈیا سے کہا گیا تھا کہ اسمبلی کی آج کی کارروائی پاکستان کی سابق منسٹری آف انفارمیشن کی طرف سے جاری کی جائے گی۔

تمام اخبارات والے سراپا احتجاج بن گئے تھے۔ شام کے اخبارات اور ضمیمے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی گئیں۔ یہ حقیقت ایک کھلی کتاب کی طرح تھی کہ دردانہ بیگم کے چار کامیاب سیاست دانوں نے وہ پارٹی چھوڑ دی ہے۔ دردانہ بیگم کی اکثریت اسمبلی میں قائم نہ رہ سکی اس لئے حلف برداری کی تقریب ملتوی ہو گئی۔

دردانہ بیگم نے احتجاج کیا۔ وہ اسمبلی میں اپنی پارٹی کی اکثریت ثابت کر چکی تھی۔ لہٰذا حلف برداری کی تقریب کو ملتوی نہیں کرنا چاہیے۔ ...ں رہا تھا۔ ہم نے گاڈ فادر
اجازت ملنی چاہیے۔ جن چار سیاست دانوں نے ا... آگیا تھا۔"
ہے۔ وہاں بعد میں دوبارہ انتخابات کرائے جائیں گے۔
ہے۔ وہ جرائم کا بادشاہ ہے لیکن
نیک بخت نے کہا۔ "ان چاروں سیاست
۔ عالمی سطح کے بڑے بڑے مجرموں
داں کہہ کر پارٹی چھوڑ دی ہے۔ لہٰذا ان کا تعل
کرشم کو پہلے سے زیادہ طاقت ور بنا

دیا لیکن وہ عالمی سطح کے مجرم بھی سیاسی ہیرا پھیری کو نہیں سمجھتے ہیں۔"

دوسرے نے کہا۔ "وہ تمام مجرم لیڈی ڈاکٹر آمنہ کے عقیدت مند ہیں۔ یہ ہم معلوم کر چکے ہیں کہ ڈاکٹر آمنہ کے حکم پر تمام بڑے مجرم ہاشم کا ساتھ دے رہے ہیں لیکن ڈاکٹر آمنہ بھی سیاسی ہتھکنڈے نہیں جانتی ہے' اگر وہ براہ راست ہماری ناکامی کی وجہ بنتی تو ہم اسے کسی حادثے سے دوچار کر کے ختم کر دیتے۔"

"اس عالمی شہرت رکھنے والی ڈاکٹر کو نقصان پہنچانے والی بات کبھی نہ سوچو۔ اس کی موت سے آئندہ ہماری سیاسی چالیں ناکام ہو سکتی ہیں۔ آپ ناکامی کی نہیں کامیابی کی بات پر روشنی ڈالیں۔"

"اب ایک ہستی اور ہے اور وہ تابانی ہے۔ کیا یہ چال سمجھ میں آتی ہے کہ وہ دشمن بن کر ڈاکٹر آمنہ کو جبراً انڈیا لے گئی پھر دوست بن کر پاکستان واپس آ گئی ہے۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ وہی ایک ایسی ہستی ہے جس نے دردانہ بیگم اور اس کے کامیاب سیاست دانوں کو چیلنج کیا تھا کہ وہ دردانہ کو حلف برداری کے لیے اسمبلی تک پہنچنے نہیں دے گی۔"

ایک نے تائید کی۔ "اس پہلو پر غور کیا جائے کہ اس نے اپنا چیلنج پورا کیا۔ دردانہ کو اسمبلی جانے دیا لیکن حکومت بنانے نہیں دی اور دردانہ نے جس مراد کو سزائے موت سے بچانے کے لیے جیل سے رہا کرایا تھا' وہ اس مراد کو بھی ساتھ لے جا کر کہیں روپوش ہو گئی ہے۔"

بھارت میں جو خفیہ ایجنسی کام کر رہی تھی' اس کے سربراہ نے کہا۔ "میں بڑی حد تک اس کی ہسٹری جانتا ہوں۔ وہ ایک بیٹے کی حیثیت سے پیدا ہوئی تھی پھر اس کی جنس تبدیل ہو گئی لیکن وہ طویل عرصے تک اپنے عورت ہونے والی بات چھپاتی رہی۔ وہ ایک زبردست فائٹر ہونے کے علاوہ ذہین اور معاملہ فہم ہے۔ مراد اس کے ہونے والے بچے کا باپ ہے اس لیے وہ مراد کو لے گئی ہے۔ اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت ضدی ہے۔ جو کام کرنے کی ٹھان لیتی ہے' اسے کر گزرتی ہے۔ اس کی ضد کی مثال ہم سب کے سامنے ہے۔ جیل میں اس کا فون ٹیپ کیا گیا تھا۔ اس نے مراد سے کہا تھا کہ اسے دردانہ کی پارٹی میں جانے نہیں دے گی۔ اس نے یہ ضد پوری کی۔ مراد کے بازو میں چھپے ہوئے ڈیٹکٹو آلے کو بھی ناکام بنا کر اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ دوسری ضد کے مطابق اس نے دردانہ کو حلف برداری کے لیے اسٹیج تک پہنچنے نہیں دیا۔"

کئی افسران نے کہا۔ "فی الحال پاکستان میں وہی ایک تابانی سرگرم عمل دکھائی دے

رہی ہے۔ عملی طور پر سیاسی مقابلہ کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور نمایاں طور پر چیلنج بننے والا لیڈر نہیں ہے۔"

ڈائریکٹر جنرل نے کہا۔ "تابانی کو اولین اہمیت دی جائے۔ پاکستان کے ہر مقام پر ہمارے سراغ رساں بھیجے جائیں' جہاں اس کی روپوشی کا گماں ہو سکتا ہے۔ دو اہم باتوں کا خیال رکھا جائے۔ ایک تو یہ کہ مراد اس کے ساتھ ہو گا۔ خواہ وہ میک اپ میں ہو۔ دوسری بات یہ کہ پہلی فرصت میں معلوم کرو' تابانی کو کتنے ماہ کا حمل ہے۔ جس عورت کا پیٹ اُبھرا ہو گا اسے ضرور چیک کرو۔"

پاکستان میں کام کرنے والی خفیہ ایجنسیوں کے سربراہان اپنے ڈائریکٹر جنرل کی ہدایات نوٹ کرنے لگے پھر ڈی جی نے کہا۔ "آپ فی الحال تابانی کا باب کلوز کریں اور ایک دوسرے پہلو پر غور کریں۔ امیر حمزہ بیرونی ممالک میں بھی رہ کر ہماری سیاسی چالوں کا توڑ کرتا تھا۔ کیا اس کے بعد بھی کوئی ایسا چھپا رستم ہے جو بیرون ملک رہ کر پاکستان کے کرپٹ سیاست دانوں کے دماغوں کا پھوڑا بنا ہوا ہو؟ اور.......... تابانی کے ذریعے یا کئی اور ذرائع سے چار سیاست دانوں کو دردانہ کی پارٹی چھوڑ کر جانے پر مجبور کر چکا ہو؟"

وہ سب سوچنے لگے پھر بھارت میں کام کرنے والی ایجنسی کے سربراہ نے کہا "او.......... یس.......... یس سر! ہم اپنے پہلے اجلاس سے ڈاکٹر آمنہ کے بیٹے فرمان کو بھلا رہے ہیں۔ کالیا اور شلپا کی فائلوں میں جو رپورٹس ہیں اس میں فرمان کا نمایاں ذکر ہے۔ شلپا اپنے باپ کالیا کو لندن پولیس سے رہائی دلانے کے لیے ایک بلیک ہنڈا اکارڈ کو بم سے اُڑانے کی دھمکی دیتی ہے۔ پولیس شہری امن و امان کی خاطر اس کے باپ کالیا کو رہا کرتی ہے لیکن دوسری طرف فرمان اس کی بیٹی شلپا کو لے کر فرار ہو جاتا ہے۔ رپورٹ میں یہ سب سے اہم بات لکھی ہوئی ہے کہ فرمان نے ہی کالیا کے دونوں گھٹنوں کی ہڈیاں توڑی تھیں' جس کے نتیجے میں کالیا آج بھی لندن کے اسپتال میں زیر علاج ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ فرمان کی ماں ڈاکٹر آمنہ ہی اس کالیا کا علاج کر رہی ہے۔"

ڈی جی نے کہا "اس کا مطلب ہے فرمان بہت زیادہ ایکٹو اور تیز طرار ہے۔ لندن کے سراغ رسانوں سے کہو' وہ کالیا کے ذریعے فرمان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں۔"

"سر! جب تابانی جبراً ڈاکٹر آمنہ کو انڈیا لے گئی تھی تو فرمان اس کے تعاقب میں گیا تھا۔ وہاں جا کر بازی کچھ عجیب انداز میں پلٹ گئی۔ وہاں جا کر تابانی کو پتا چلا کہ "را" والے اس کے مراد کو پاکستانی جیل سے نکال لانے کو اہمیت نہیں دے رہے ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر

آمنہ کو کالیا کے علاج کے لیے تابانی کے ذریعے اغوا کرایا تھا۔ یہاں سے تابانی کی کھوپڑی الٹ گئی۔ وہ "را" کی دشمن اور ڈاکٹر آمنہ کی بیٹی بن گئی۔ "را" کے ڈائریکٹر جنرل سے بڑی سودے بازی ہوئی۔ اس نے پہلے ڈاکٹر آمنہ کو رہائی دلا کر لندن پہنچایا پھر کالیا کو علاج کے لیے وہاں بھیجا۔"

"اس طرح یہ واضح ہوجاتا ہے کہ تابانی اب بھارت کے لیے نہیں' پاکستان کے لیے کام کررہی ہے۔ اس نے صرف مراد کو ہی نہیں فرمان کو بھی کہیں روپوش رہنے کا موقع دیا ہے۔"

ڈائریکٹر جنرل نے کہا۔"اب بکھری ہوئی کڑیاں ایک دوسرے سے مل رہی ہیں۔ ڈاکٹر آمنہ' گاڈ فادر ہاشم' تابانی اور فرمان سب ہی ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ ان میں تابانی عملی طور پر ظاہر ہو رہی ہے اور فرمان روپوش رہ کر سیاسی چالیں چل رہا ہے۔ بائے دا وے کیا فرمان میں سیاسی سُوجھ بُوجھ ہے؟"

"بے شک وہ چالباز بن چکا ہوگا کیونکہ وہ امیر حمزہ کا دست راست تھا۔"

"پھر تو فرمان کو نظرانداز نہ کرو۔ اسے پاکستان اور دوسرے ملکوں میں تلاش کرو۔ اس کی تصاویر' فنگر پرنٹس اور پچھلی تمام کارکردگی کی مکمل فائل تیار کرو۔"

ایک نے کہا۔ "سر "را" والے شلپا کے قاتل کو بڑی تندہی سے تلاش کررہے ہیں۔ میں یقین کی حد تک اندازہ کررہا ہوں' شلپا کو فرمان نے ہی قتل کیا ہوگا۔ ان کی پرانی دشمنی چلی آرہی تھی۔"

"اپنے سراغ رسانوں سے کہو' فرمان کو تلاش کرنے کے لیے وہ سب بھارت میں زیادہ مستعد رہیں۔ کیا اس کی کوئی واضح شناخت ہے؟"

"ایک عام سی شناخت ہے۔ وہ ساڑھے چھ فٹ کا جوان ہے۔ جسم ایسا ہے جیسے سامنے پہاڑ کھڑا ہو۔ ایسے قد آور اور چٹانی جسم والے باڈی بلڈر اور کئی ہوسکتے ہیں۔ شاید "را" والے ہمیں اس کی کوئی خاص شناخت بتاسکیں گے؟"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "ہم تو یہی سمجھ رہے تھے لیکن لندن میں کالیا مطمئن ہے۔ ہمیں رات کے وقت ایک لڑکی کی لاش ملی تھی۔ جسمانی شناخت سے اندازہ ہوتا ہے.......... کہ وہ شلپا ہے لیکن دوسری صبح کالیا نے کہا۔ "اس کی بیٹی نے صبح مجھ سے فون پر رابطہ کیا تھا؟ یہ مرڈر کیس الجھا ہوا ہے۔"

"الجھن کیا ہے؟ پلیز وضاحت کریں۔"

"کالیا کا ایک دستِ راست پتامبر بجاج ہے۔ وہ انڈر گراؤنڈ کا گاڈ فادر اور ایک

صوبے کا مکھ منتری بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اس نے دعویٰ کیا کہ شلپا کو قتل کردیا گیا۔ اس کی اور کالیا کی جو اہم خفیہ دستاویزات ہیں' اب وہ پتامبر بجاج کے پاس ہیں۔ اس نے ثبوت کے طور پر ان دستاویزات کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں ہمیں بھیجی تھیں۔"

"کیا وہ دستاویزات درست ہیں؟"

"درست تو ہیں لیکن اچانک ہی پتامبر بجاج کہیں روپوش ہوگیا ہے۔ کسی نے اس کی بیٹی نرملا کو اغوا کیا ہے یا تو وہ کسی دشمن سے سہما ہوا ہے یا پھر بیٹی کو تلاش کرنے کے لیے ہم سے رابطہ نہیں کررہا ہے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ کالیا کو راستے سے ہٹا کر اسے گاڈ فادر اور مکھ منتری بناسکتے ہیں۔ وہ آپ کی "را" کی مدد سے بیٹی کو تلاش کرسکتا ہے۔ وہ آپ سے اتنے فائدے حاصل نہ کرکے آپ سے رابطہ ختم کرچکا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ آپ کو دشمن سمجھنے لگا ہو۔ یہ سمجھ رہا ہو کہ "را" والوں نے اس کی بیٹی کو اغوا کیا ہے؟"

"یہ پتامبر بجاج کی اپنی سوچ ہوسکتی ہے۔ ہم اس سے کوئی دشمنی نہیں کررہے ہیں۔"

"میں نے ضروری معلومات حاصل کرنے کے لیے آپ کو زحمت دی ہے۔"

"فرمائیے۔ ہم تو ایک دوسرے کے لیے معلومات کا ذریعہ بنتے رہتے ہیں۔"

"میں ڈاکٹر آمنہ کے بیٹے فرمان کے متعلق بہت کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"ابھی ہم اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ کالیا کو اس نے اپاہج بناکر اسپتال پہنچا دیا۔ اس کی بیٹی شلپا کو لنگڑی بنا دیا۔ تابانی سے مل کر اس نے اپنی ماں کو یہاں سے رہائی دلائی اور اسے لندن پہنچا دیا۔ اس کے بعد تابانی کے ساتھ نہ جانے کہاں روپوش ہوگیا تھا۔ کل اطلاع ملی کہ تابانی پاکستان میں ہے لیکن فرمان لاپتا ہے۔"

"ہوسکتا ہے' وہ بھارت میں رہ گیا ہو؟"

"وہ اپنے تمام اہم کام نمٹا چکا ہے۔ اب ہمارے دیس میں رہ کر کیا کرے گا؟"

"گاڈ فادر ہاشم بھارت کے کسی بھی انڈر گراؤنڈ گاڈ فادر سے دشمنی کرتا رہتا ہے۔ ہوسکتا ہے' وہ فرمان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کررہا ہو۔ آئندہ گاڈ فادر بننے والے پتامبر بجاج کی بیٹی کو اغوا کرکے اسے ہراساں کررہا ہو۔"

"آپ کی بات دل کو لگ رہی ہے۔ ہم نے اس کی بیٹی نرملا کو اغوا نہیں کیا ہے تو پھر فرمان نے ہی ایسا کیا ہوگا تاکہ بیٹی کی حفاظت کی خاطر باپ سامنے آئے اور اس کے ہاتھوں ہلاک ہوجائے۔ آپ نے ہمیں غور کرنے کے لیے ایک نئی لائن دی ہے۔ اب ہم فرمان

کو تلاش کریں گے۔"

"ایک اور زحمت دوں گا۔ اس کی تصاویر' فنگر پرنٹس اور کوئی شناخت ہو تو ابھی فیکس کردیں۔"

"دراصل ہم نے ابتدا میں فرمان کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ آپ سے گفتگو کرنے کے بعد وہ بہت اہم ہوگیا ہے۔ جب وہ پاکستان کی سرحد پار کرکے بھارت آرہا تھا تو اسے گائیڈ کرنے کے لیے پوجا نامی ایک لڑکی اور اعظم بیگ نامی ایک شخص تھا۔ فرمان نہیں جانتا تھا کہ اعظم بیگ ہمارا جاسوس ہے۔ اس نے پہلے ہی فرمان کی تصویریں اور فنگر پرنٹس ہمارے پاس بھیج دیئے تھے اور خود راجستھان کے ایک علاقے میں مارا گیا تھا۔"

"آپ اس کی تصویریں اور فنگر پرنٹس بھیج دیں۔ اعظم بیگ نے اس کی کوئی خاص شناخت بتائی تھی۔"

"اتنا ہی بتایا تھا کہ اس کا جسم فولاد کی طرح سخت ہے۔ جسم کے کئی حصوں پر ایسے داغ ہیں جیسے وہ گرم فولادی سلاخوں سے مار کھاتا رہا ہو۔ بڑا سخت جان ہے۔"

"ذہنی اور جسمانی طور پر طاقت ور ہے تو پھر خطرناک ہے۔"

"اعظم بیگ نے اس کے مزاج کے متعلق بتایا تھا کہ ٹھنڈا دماغ رکھتا ہے اور ایسا شرمیلا پن دان ہے کہ لڑکیوں سے دور رہتا ہے۔"

"آپ نے بڑی حد تک معلومات فراہم کی ہیں۔ میں آپ کے فیکس کا انتظار کررہا ہوں۔ اوکے.......... سی یو.........."

اس نے فون بند کرکے تمام افسران کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ نے وائڈ اسپیکر کے ذریعے تمام باتیں سنی ہیں۔ اپنی کومنٹس؟"

ایک افسر نے کہا۔ "تابانی تو خاصی اہم ہے لیکن اب فرمان بہت ہی خطرناک حد تک اہم لگ رہا ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "اب یہ بھارت میں ہماری ایجنسیوں کی ذمے داری ہے' وہ اپنی قبر میں بھی چھپا ہو تو اسے کھود کر نکالیں۔"

بھارت کی ایک ایجنسی کے سربراہ نے کہا۔ "ہم گڑے مُردے نہیں اکھاڑتے۔ ہم اپنی ذمے داریوں کو سمجھتے ہیں۔ اس اجلاس کے ختم ہوتے ہی بھارت میں ہمارے تمام جاسوس ایکشن میں آجائیں گے۔"

ڈائریکٹر جنرل نے کہا۔ "اجلاس کو ختم ہونا چاہیے۔ تابانی اور فرمان کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ ان کی گرفتاری سے ہمیں ایکشن میں ناکامی کی وجوہات معلوم ہوجائیں گی۔"

وہ سب اجلاس کے اختتام کی تائید کرنے والے تھے۔ اس وقت لندن ایجنسی کے سربراہ نے فون کال موصول کی۔ فون پر کہا۔ "یس میں جارج سائن بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے اس کے ایک سراغ رساں نے کہا۔ "سر شمشیر سنگھ کالیا کو اسپتال سے اغوا کرلیا گیا ہے۔"

"وہاٹ؟ یہ کیسے ہوگیا۔ اسے کب اغوا کیا گیا ہے؟"

"ابھی دس منٹ پہلے ہمیں اطلاع ملی ہے۔ پولیس اور لندن کے سراغ رساں وہاں تفتیش کررہے ہیں۔"

"کیا تم نے معلوم کیا کہ اغوا کے وقت ڈاکٹر آمنہ کہاں تھی؟"

"یس سر! وہ آپریشن تھیٹر میں ایک بہت مشکل آپریشن کو سپروائز کررہی تھی۔ وہ دو آپریشن کے سلسلے میں وہاں تین گھنٹے مصروف رہی۔"

"بلیک لسٹ میں جتنے مجرم ہیں' ان کا محاسبہ کرو۔ جتنے جرائم کے اڈے ہیں' وہاں خفیہ طور سے معلومات حاصل کرو۔ میں تھوڑی دیر بعد رابطہ کروں گا۔"

اس نے فون بند کیا۔ ڈائریکٹر جنرل نے کہا۔ "ڈاکٹر آمنہ کے خلاف تفتیش کرکے وقت ضائع کیا جائے گا۔ واردات کے وقت وہ اسپتال میں اپنے فرائض ادا کررہی تھی۔ اتنی بڑی شخصیت کے خلاف یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے خود مصروف رہ کر یہ واردات کرائی ہے۔"

"اور پھر کیوں کرائے گی۔ پیشے کے لحاظ سے اس کی دیانت داری کا بے داغ ریکارڈ ہے۔ وہ دشمنوں کا علاج بھی فرض شناسی اور دلجوئی سے کرتی ہے۔"

لندن کی ایجنسی کے سربراہ نے کہا۔ "یہ مجرموں کی آپس کی دشمنی ہوسکتی ہے۔ انڈر گراؤنڈ مافیا کے بڑے اب کالیا کو ختم کرکے اس کی جگہ دوسرا گاڈ فادر لائیں۔ یہ اطلاع ہمیں مل چکی ہے کہ شلپا کو گاڈ مدر یا گاڈ سسٹر بنانے کے سلسلے میں اعتراضات ہو رہے ہیں۔ وہاں پتامبر بجاج کے گاڈ فادر بننے کا چانس ہے۔"

"بے شک' پتامبر بجاج کا کردار مشکوک ہے۔ وہ "را" والوں کو اہم دستاویزات دینے کا وعدہ کرکے روپوش ہوگیا تھا۔ یعنی انڈر گراؤنڈ۔ مافیا والے اب "را" کے ساتھ تعاون سے گریز کررہے ہیں۔ "را" اور انڈر گراؤنڈ مافیا کے درمیان کچھ ایسے جھگڑے ہیں' جسے ہمیں سمجھنا ہوگا۔"

"ان کے باہمی جھگڑوں کا اشارہ ملتا ہے۔ ادھر اس کی بیٹی نرملا کا اغوا کیا گیا ہے۔ اس کے جواب میں کالیا کو اغوا کیا گیا ہے کیونکہ "را" والے کالیا کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔

انہوں نے پتامبر بجاج کو دباؤ میں رکھنے کے لیے اس کی بیٹی کو اغوا کیا ہو گا۔'' ''را'' کا یہ مطالبہ بھی ہو گا کہ پتامبر بجاج وہ اہم کاغذات ان کے حوالے کرے۔''

ڈائریکٹر جنرل نے کہا۔ ''حالات کا یہ تجزیہ درست ہو سکتا ہے لیکن ہم ٹیبل پر بیٹھ کر اپنے نقطۂ نظر سے تجزیہ کر رہے ہیں بہتر ہے پاکستان' بھارت اور لندن سے تعلق رکھنے والے افسران ان ممالک میں جاکر صحیح صورتِ حال معلوم کریں۔''

اجلاس ختم ہو گیا۔ وہ سب صحیح صورتِ حال سے بے خبر تھے۔ جو سوچ رہے تھے' وہ نہیں ہو رہا تھا اور جو ہو رہا تھا' اسے معلوم کرنے کے لیے آئندہ بھٹکتے رہنے والے تھے۔ کالیا کا اغوا ہونا اہم تھا لیکن اس سے زیادہ یہ بات اہم تھی کہ پاکستان میں ان کا خفیہ ہاتھ ناکام کیوں ہوا؟ اسمبلی میں دردانہ کی اکثریت کم کرنے والا کون ہے؟

☆======☆======☆

وہ میں تھا۔ تلاش کرنے والوں سے دور تھا۔ اگرچہ دور نہیں تھا۔ ممبئی شہر کے ایک بنگلے میں تھا چونکہ نظر نہیں آرہا تھا اور ہاتھ نہیں آسکتا تھا لہٰذا ان کے لیے دور کہیں جا چکا تھا۔

نرملا جب تک بے ہوش رہی' میں نے اور بینا نے اس کے چہرے پر عارضی میک اپ کر دیا۔ اس بنگلے کے ہر کمرے اور باتھ روم سے چھوٹے بڑے آئینے ہٹا دیئے۔ اس کے بیڈ کے سرہانے ایک گلاس اورنج جوس رکھا۔ جوس میں تھوڑا سا سیندور ملا دیا۔ ہندو عورت مانگ میں سیندور بھرنے کے بعد سہاگن کہلاتی ہے' وہی سیندور حلق سے نیچے اترے تو کچھ عرصے کے لیے آواز سے محروم ہو جاتی ہے۔ بولنا چاہتی ہے مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکلتی۔

ہم نہیں چاہتے تھے کہ وہ شور مچائے۔ اسے خاموش رکھنے کے لیے اسی طریقے پر عمل کیا گیا۔ بینا نے ایک چھوٹے سے کاغذ پر ہندی زبان میں لکھا۔ ''ڈاکٹر نے کہا ہے' ہوش میں آنے کے بعد جوس پینا چاہیے' توانائی بحال ہو جائے گی۔ تم نے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل نہ کیا تو تمہارے کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے باہر سے بند رکھے جائیں گے۔ جوس پینے کے بعد دروازے پر دستک دو گی تو اسے کھول دیا جائے گا۔''

اس نے وہ پرچی لکھ کر جوس کے پاس رکھ دی۔ ہم نے کمرے سے باہر آکر دروازے کو بند کر دیا۔ بینا اس کے باپ پتامبر بجاج سے نمٹنے چلی گئی۔ میں دوسرے کمرے میں آکر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا۔ اگرچہ میں نے بھارت میں رہ کر پاکستان میں دردانہ کی سیاسی بازی الٹ دی ہے۔ اس کے باوجود مجھے اپنے وطن میں رہنا چاہیے۔

میری دیدی (تابانی) کو کسی وقت بھی میری ضرورت پڑ سکتی ہے۔

میرے خیالات منتشر تھے۔ ذہن یہ بھی سمجھاتا تھا کہ فرائض کی ادائیگی کہیں بھی رہ کر کی جا سکتی ہے اپنی دیدی اور انکل ہاشم سے ملنا ایک جذباتی سی بات ہے۔ بھارت میں بینا کے ساتھ رہ کر اس کے تعاون سے پاکستان میں سیاسی کامیابیاں حاصل کرنے کے علاوہ ''را'' اور انڈر گراؤنڈ مافیا کے متعلق بہت کچھ معلوم کرتا جا رہا ہوں۔

اب تو مجھے سرحد پار کرنے کے کئی ہتھکنڈے معلوم ہو چکے ہیں۔ میں جب چاہتا تنہا کسی بھی دن پاکستان پہنچ سکتا تھا وہ کالیا جس نے میری پیدائش سے پہلے میری امی کو بدنام کیا تھا اور انہیں میرے باپ کی کوٹھی سے نکلوایا تھا۔ اسے میں نے اپاہج بنا دیا تھا اور اس کی مکار بیٹی کو جہنم میں پہنچا دیا تھا۔

صرف اتنا ہی نہیں' بینا ان باپ بیٹی سے نجات حاصل کر چکی تھی۔ اس نے نجات کے لیے میرا سہارا لیا۔ میں نے اس کے سہارے ''را'' کے وہ تمام اہم راز حاصل کر لیے' جو ان باپ بیٹی نے چھپا رکھے تھے۔ میں اور بینا آئندہ بھی ایک دوسرے کے تعاون سے بہترین کامیابیاں حاصل کر سکتے تھے۔

میں خیالات سے چونک گیا۔ جس کمرے میں نرملا کو قید کیا گیا تھا' اس دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ میں نے دروازے کے قریب آکر پوچھا۔ ''کیا تکلیف ہے؟''

وہ اندر سے بولی۔ ''دروازہ کھولو' مجھے کیوں قید کیا ہے؟''

''تم بہت حسین ہو۔ کوئی بھی مرد تمہیں قید کر سکتا ہے۔''

''مرد وہ ہوتا ہے جو حسین عورت کے ساتھ ایک ہی کمرے میں قید رہتا ہے۔''

''ٹھیک ہے' تمہارے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہوں گا لیکن تم نے وہ کاغذ پڑھا اور اس پر عمل نہیں کیا' جوس نہیں پیا۔''

مجھے اس کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ آواز سے محروم نہیں ہوئی۔ بولتی جا رہی تھی۔ وہ بولی۔ ''میں کسی انجانی جگہ کھاتی پیتی نہیں ہوں۔''

''پرچی کو پھر سے پڑھو۔ اس میں لکھا ہے کہ جوس پینے کے بعد دستک دو گی تو دروازہ کھولا جائے گا۔''

''میں چیخنے چلانے لگوں گی۔''

''مجھے پتا ہے تمہیں چیخنا چلانا آتا ہے۔ تمہیں بھی پتا ہونا چاہیے کہ سائلنسر لگے ہوئے ریوالور سے چلنے والی گولی کو چیخنا چلانا نہیں آتا۔''

''میں نادان نہیں ہوں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ اس جوس میں مجھے نقصان پہنچانے

والی چیز ملائی گئی ہے۔"

میں نے ریوالور نکال کر اس میں سائلنسر لگاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں مارنا ہوتا یا نقصان پہنچانا ہوتا تو ڈیڑھ من کی حسینہ کو اٹھا کر اتنی دور نہ لاتے۔"

میں نے دروازے کی چٹخنی کو بڑی آہستگی سے کھول کر اچانک دروازے پر لات ماری۔ وہ دروازے سے ٹکرا کر چیختی ہوئی پیچھے جا کر فرش پر گر پڑی۔ اس کے ہاتھ میں پیتل کا گلدان تھا۔ وہ دروازہ کھلتے ہی گلدان سے مجھ پر حملہ کرنے والی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور چلا گیا تھا۔ میں نے گلدان کو ٹھوکر مار کر اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "اٹھاؤ اسے' مجھ پر حملہ کرو۔ میں بھی ٹریگر دباتا ہوں۔ دیکھتے ہیں آخری آواز ہم میں سے کس کی نکلے گی۔"

وہ سہم کر فرش پر بیٹھ گئی پھر بولی۔ "رنجن! میں نے اپنے ڈیڈی کے بہکاوے میں آکر تم پر قاتلانہ حملہ کرایا مگر تم مجھے دل و جان سے چاہتے ہو۔ بولو چاہتے ہو نا؟"

"میری چاہت کا ثبوت یہ ہے کہ میں نے تمہارے گھر میں ہی تمہیں گولی نہیں ماری۔ دل میں پیار بھرا ہے اس لیے یہاں لے آیا۔ تمہیں زندہ سلامت دیکھنا چاہتا ہوں اسی لیے جوس پینے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ نہ پینا چاہو' کوئی بات نہیں۔ تم مجھ پر بھروسا نہیں کرو گی۔ میں تم پر بھروسا نہیں کروں گا۔ گولی مار کر قصہ ختم کر دوں گا۔"

"نہیں رنجن! مجھے تم پر بھروسا ہے اسی لیے تم مجھے بے وفا نہیں سمجھ رہے ہو۔ میرے ڈیڈی کی چالوں کو سمجھ گئے ہو۔ ان سے انتقام لینے کے لیے مجھے یہاں لے آئے ہو۔"

"اب کسی حد تک تم مجھے سمجھ رہی ہو۔ میں یہ فیصلہ کرنے تمہیں لایا ہوں کہ میرا ساتھ دو گی یا اپنے باپ کا؟"

"میں جان دے کر بھی تمہارا ساتھ دوں گی۔"

"زبان سے سب ہی دعوے کرتے ہیں۔ عمل کر کے دکھاؤ۔"

اس نے مجھے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میں اسے پیار سے دیکھ رہا تھا۔ وہ فرش سے اٹھ کر چلتی ہوئی بیڈ کے سرہانے پر آئی پھر جوس کا گلاس اٹھا کر بولی۔ "یہ دیکھو' میں اپنی محبت اور وفا کا عملی ثبوت دے رہی ہوں۔"

اس نے گلاس ہونٹوں سے لگایا پھر گھونٹ گھونٹ پینے لگی آدھا گلاس پینے کے بعد بولی۔ "اب یقین آیا؟"

"آدھا یقین آیا۔ پورا یقین دلاؤ۔"

وہ غٹاغٹ پی گئی۔ گلاس خالی کر کے سرہانے کی میز پر رکھ دیا پھر دونوں بانہیں پھیلا کر میرے پاس آنے لگی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل عورتوں کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ ایک بار حالات نے شلپا کی قربت پر مجبور کر دیا تھا۔ دوسری بار پوجا دن رات میرے ساتھ سفر کرتی رہی اور مصیبت جھیلتی رہی تھی اور بڑے ہی غیر شعوری طور پر مجھے اپنی طرف مائل کر لیا تھا۔ اس کے بعد میں نے عہد کیا تھا کہ عورتوں سے دور رہنے میں دانش مندی ہے اور میں دور رہا کروں گا۔

نرملا کے مقابلے میں بینا بے حد حسین تھی۔ ہم دن رات ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر اچھی خاصی کامیابیاں حاصل کر رہے تھے لیکن ہمارے درمیان حسن و عشق والی بات اس لیے نہیں تھی کہ میں اس معاملے میں پتھر ہو گیا تھا اور اس کے مزاج میں حسن والی سستی بات نہیں تھی۔ میرے ساتھ رہنے کے باوجود اس طرح فاصلہ رکھتی تھی کہ میں برا محسوس نہ کروں۔

لیکن نرملا جیسی حسینائیں اپنی جوانیاں ہتھیلیوں پر رکھ کر پھرتی تھیں۔ حسن و شباب کو ہتھیار بنا کر مردوں کو اُلو بنا کر اپنا اُلو سیدھا کرتی تھیں۔ نرملا بھی جوس کا گلاس خالی کر کے دونوں بانہیں پھیلا کر میرے پاس آنے لگی تو میں نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ "ٹھہرو' ایک بات رہ گئی ہے۔"

وہ رک کر بولی۔ "کون سی بات؟"

"تم اب تک باپ کے اشاروں پر چل رہی تھیں۔ یہ سچ سچ بتاؤ کہ اس دلال باپ نے میرے علاوہ اور کتنے جوانوں کو پھانسنے کے لیے کہا تھا؟"

وہ بولتے بولتے کھنکارنے لگی۔ گلا صاف کر کے بولنے لگی۔ "آ......... آ......... آس......... کر......... ہا......... ہا.........؟"

وہ ناگواری سے چیخ کر بولی۔ "یہ کیا بکوا......... کھوں......... کھوں........."

وہ بولتے بولتے کھنکارنے لگی۔ گلا صاف کر کے بولنے لگی۔ آ......... آ......... آس......... کر......... ہا......... ہا........."

پہلے ہا ہا کے سوا آواز نہیں نکلی پھر وہ آواز بھی بند ہو گئی۔ وہ ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر کبھی حلق سہلا کر بولنے کی کوشش کرنے لگی' کبھی دونوں مٹھیاں بھینچ کر پوری قوت سے آواز نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔

میں نے جیب سے سیندور کی چھوٹی ڈبیا نکال کر کہا۔ "تمہارے باپ نے ہماری منگنی کی تھی۔ آؤ اب تمہاری مانگ میں سیندور بھر کر تمہیں سہاگن بنا دوں۔"

وہ حیرانی اور پریشانی سے دیدے پھاڑ کر سیندور کو دیکھنے لگی اور سمجھ گئی کہ سیندور کے ذریعے اسے آواز سے محروم کر دیا گیا ہے۔ وہ غصے سے آگے بڑھ کر میرا گریبان پکڑنا چاہتی تھی۔ میں نے ایک ہلکا سا طمانچہ رسید کیا اور اس کا منہ گھوم گیا۔ وہ بیڈ سے ٹکرا کر پھر فرش پر گر پڑی۔

میں نے موبائل فون نکال کر اس کے خوب صورت تراشیدہ بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اٹھایا پھر کہا۔ "یہ لے اپنے باپ سے رابطہ کرا اور اسے اپنے حالات بتا۔ وہ تجھے تلاش کر رہا ہو گا۔"

وہ فون کو دیکھتے ہی ذرا سی دیر کے لیے بھول گئی کہ باپ کی آواز سن سکے گی' اپنی آواز نہیں سنا سکے گی۔ اس نے جلدی جلدی نمبر پنچ کئے پھر فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے باپ کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو کون؟"

نرملا نے بولنے کے لیے منہ کھولا تو آواز نہیں نکلی۔ وہ تھرتھر کانپتی ہوئی زور لگا کر کسی طرح کی بھی آواز نکالنا چاہتی تھی مگر ناکام ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "بھئی تمہارا گاڈ فادر اور مکھ منتری بننے والا باپ بول رہا ہے۔ کچھ تو بولو"

دوسری طرف سے پتامبر بجاج کی آواز سنائی دی۔ "میں رنجن کی آواز سن رہا ہوں۔ کیا تم نرملا ہو۔ میری بیٹی ہے؟"

وہ ہاں کے انداز میں سرہلانے لگی۔ میں نے فون لے کر کہا۔ "تمہاری بیٹی ہاں ہاں کے انداز میں سرہلا رہی ہے لیکن کچھ بول نہیں پا رہی ہے۔ اس نے غلطی سے ذرا سا سیندور کھالیا ہے۔"

وہ غصے سے بولا۔ "یو راسکل! تم نے نرملا کو زبردستی سیندور کھلا دیا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"یہ پرانا ڈائیلاگ مار رہے ہو۔ میری زندگی سے تمہاری بیٹی کی زندگی ہے مجھے تو زندہ رکھنا ہی ہو گا۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"تمہاری بیٹی نے بڑا خوش کیا ہے' انتقام لینا بھول رہا ہوں۔ کیا خوب........... ہو۔ بیٹی کو زبردست ٹریننگ دی ہے۔ کیا اسے تمہارے بنگلے میں واپس پہنچا دوں؟"

"نہیں ادھر نہ جانا۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے میرے گارڈز کے مرڈر اور بیٹی کے اغوا کے سلسلے میں تفتیش کر رہے ہیں۔"

یہ تو اچھا ہے کہ تمہاری بیٹی پولیس والوں کو واپس مل جائے گی۔"

"نہیں بھگوان کے لیے' ایسا نہ کرنا۔ "را" والے میرے دشمن بن گئے ہیں۔ وہ میری بیٹی کو اپنی کسٹڈی میں لے لیں گے۔"

"جب تمہاری بیٹی کی کوئی غلطی نہیں ہے تو "را" والے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

"بیٹی کی نہیں' میری بہت بڑی غلطی ہے۔ شلپا نے مجھے دھوکا دے کر "را" کے ڈی جی کو یقین دلایا ہے کہ ان کے خلاف بہت اہم ثبوت آڈیو' ویڈیو اور تحریری دستاویزات کی صورت میں میرے پاس ہیں۔ میں نے وہ تمام ثبوت ڈی جی کو دینے سے پہلے اپنے مطالبات منوائے تھے۔"

"کیسے مطالبات؟"

"میں کیا بتاؤں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مطالبات میرے نہیں تھے۔ شلپا کے تھے۔ پتا نہیں کیوں اسے پاکستانی سیاست میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے دردانہ بیگم کی پارٹی کے چار کامیاب سیاست دانوں کو پارٹی چھڑانے کے لیے کہا۔ وہاں کے چند سیاست داں "را" کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ ڈی جی نے وہاں دردانہ کی سیاسی بازی الٹ دی۔ یہاں شلپا نے مجھے الٹ دیا ہے۔ اب میں "را" کے خلاف تمام اہم ثبوت کہاں سے لا کر دوں۔ "را" کے کتے میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔"

میں نے انجان بن کر پوچھا۔ "وہ شلپا کہاں ہے؟"

"وہ کتے کی بچی نرک میں چلی گئی ہے۔"

"وہ کتے کی بچی تھی۔ نرک میں تو جانا ہی تھا۔ اب مجھے بتاؤ کہاں روپوش ہو؟ میں وہاں نرملا کو پہنچا دوں گا۔"

اس سے گفتگو کرتے وقت میں نے فون کو اپنے اور نرملا کے کانوں کے درمیان رکھا تھا۔ وہ بھی اپنے باپ کی باتیں سن رہی تھی۔ ادھر سے پتامبر بجاج نے کہا۔ "میں جہاں بھی ہوں' وہ جگہ کسی کو نہیں بتا سکتا۔"

"کیا تم نہیں چاہتے کہ بیٹی تمہارے پاس آئے؟"

"فون میری بیٹی کو دو۔ وہ ابھی بولنے کے قابل نہیں ہے۔ لیکن سن تو سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ یہ لو نرملا! اپنے ڈیڈی کی بات سنو۔"

وہ مجھے گھور کر دیکھنے لگی۔ انکار میں کچھ بول نہیں سکتی تھی۔ اپنے باپ کو کوئی اشارہ بھی نہیں دے سکتی تھی۔ وہ فون ہم دونوں کے درمیان رہا۔ پتامبر بجاج نے پوچھا۔ "نرملا! میری آواز سن رہی ہو؟ او گاڈ! خواہ مخواہ پوچھ رہا ہوں۔ وہ جواب نہیں دے سکے

گی۔"

وہ ذرا توقف سے بولا۔ "رنجن! تم میری بات سنو۔ جو کہتا ہوں۔ نرملا کو سنا دو۔ ٹھیک ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے دوسری بار مجھے مخاطب کیا پھر بھی خاموش رہا۔ تب اس نے کہا۔ "سمجھ گیا۔ نرملا! تم سن رہی ہو مگر بول نہیں پا رہی ہو۔ رنجن نے فون تمہیں دے دیا ہے۔ ایسا کرو جب رنجن تم سے پیچھا چھڑا رہا ہے تو تم ایک آدھ دن کے لئے اپنے کسی دوسرے بوائے فرینڈ کے پاس چلی جاؤ۔ حالات قابو میں آتے ہی میں تمہیں اپنے پاس بلا لوں گا۔"

میں نے فون پر کہا۔ "نرملا نے ہاں کے انداز میں سر ہلا کر فون مجھے دے دیا ہے۔ اب میں اسے کار میں لے جاؤں گا پھر جہاں کہے گی' وہاں اسے ڈراپ کر دوں گا۔ او کے۔ نرک میں جاؤ۔"

میں نے فون بند کر دیا پھر کہا۔ "واہ! کیا باپ ہے تمہارا۔ کسی دوسرے بوائے فرینڈ کے پاس جانے کا مشورہ دے رہا ہے بولو کیا ارادہ ہے؟"

اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ سوچنے لگی۔ میں نے کہا۔ "تم آرام سے بیٹھ کر اچھی طرح سوچو۔ جب کوئی فیصلہ کر لو تو ایک کاغذ پر لکھ دینا۔"

میں نے اس کمرے سے نکل کر دروازے کو باہر سے بند کر دیا پھر وہاں سے دور ڈرائنگ روم میں آ کر انکل ہاشم سے رابطہ کیا۔ انہوں نے میری آواز سن کر خوشی سے کہا۔ "بیٹے! تم نے تو بازی ہی الٹ دی ہے۔ تم نے ثابت کر دیا ہے کہ میری باجی آمنہ کے بیٹے ہو۔ یہ لو تابانی مجھ سے ریسیور چھین رہی ہے۔ ارے بیٹی! ٹھہرو دے رہا ہوں۔ اس کی خیریت تو.........."

دیدی نے فون چھین لیا۔ خوشی سے چہک کر بولی۔ "ارے اپنے خول میں منہ چھپانے والے کچھوے! تُو نے تو خرگوش سے بازی جیت لی۔ خدا کی قسم! آج تک خفیہ ہاتھ کو کسی نے ایسا منہ توڑ جواب نہیں دیا ہو گا' میں خوشی کے مارے کہہ نہیں سکتی کہ میرے اندر محبت اور ممتا کا کیسا لاوا پک رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے میں اپنی کوکھ میں پلنے والے بچے کو جنم دے چکی ہوں اور وہ جوان ہو کر فرمان علی بن چکا ہے۔"

وہ روانی سے بولتی جا رہی تھی۔ میں ان کے مسرت بھرے اور ممتا بھرے جذبے کو دل کی گہرائیوں سے سمجھ رہا تھا۔ ان کا ایک ایک لفظ مجھے نیا حوصلہ اور نئی قوت دے رہا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میں نہیں جانتی' جب چھوٹے بہت بڑا کارنامہ انجام دیتے ہیں تو

بڑے انہیں کیا انعام دیتے ہیں؟ میں نہیں جانتی جب بھائی میدانِ جنگ سے فاتح بن کر کامیاب و کامران آتا ہے تو بہنیں ان کی آرتی کیسے اتارتی ہیں؟ لیکن میں نے تمہیں ایک لازوال انعام دیا ہے۔ میں نے تمہاری آرتی نہیں اتاری۔ داتا صاحب کے دربار میں جا کر اسلام قبول کیا ہے۔ لا الہ الااللہ محمد رسول اللہ.........."

میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے کہا۔ "ہائے دیدی! نہیں دیدی نہیں۔ آپی! ہائے آپی! کسی نے خوشی سے ایسے نہیں رُلایا ہو گا جیسے آپ نے مجھے رُلا دیا ہے۔ میں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں۔ خبردار! ادھر کا رخ نہ کرنا۔ تمام ایجنسیاں ہم بہن بھائی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ ان کے پاس ہم دونوں کی تصویریں اور فنگر پرنٹس وغیرہ ہیں۔ تمہارے بدن پر گرم لوہے کے راڈ کے جو نشانات ہیں' انہیں پہلی فرصت میں پلاسٹک سرجری کے ذریعے چھپا دو۔ چہرہ بھی سرجری سے چھپ سکتا ہے۔ باقی امی نے کہا ہے' وہ ہم دونوں کی دس کی دس انگلیوں کا آپریشن کریں گی اور انگلیوں کے نشانات میں تبدیلیاں کر دیں گی۔"

میں نے کہا۔ "امی زندہ باد۔ اتنی باریکی سے آپریشن کرنے والے دنیا میں صرف چند ہی ڈاکٹر ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ وہ ہماری امی ہیں۔"

"اب تم امی سے یا کسی سے فون پر باتیں کر کے وقت ضائع نہ کرو۔ پہلے چہرے اور جسم کے داغ چھپاؤ۔ شکاری کتے صرف یہاں نہیں' بھارت میں بھی چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ وقت کی اہمیت کو سمجھو۔ اللہ حافظ۔"

آپی نے فون بند کر دیا۔ میں ان کی محبت اور ممتا سے سرشار ہو رہا تھا۔ بینا سے رابطہ کرنا چاہتا تھا لیکن آپی کا حکم امی کے حکم کے برابر تھا۔ میں نے سوچا کوئی ضروری بات ہو گی تو بینا خود رابطہ کر لے گی۔

میں نے نرملا کے کمرے میں آ کر دیکھا۔ اس نے ایک کاغذ پر کسی جگہ کا پتا لکھا تھا۔ میں ممبئی شہر اچھی طرح دیکھنے کے باوجود بہت سے علاقوں کو نہیں جانتا تھا۔ میں نے کہا۔ "ایک کاغذ پر نقشہ بنا کر بتاؤ۔ یہ علاقہ کہاں ہے؟"

اس نے نقشہ بنا کر دکھایا تو میں سمجھ گیا۔ ادھر سے کئی بار گزر چکا تھا۔ میں نے کہا۔ "چلو.......... تم بھی کیا یاد کرو گی کہ دشمن ہو کر تمہیں زندہ سلامت واپس پہنچا رہا ہوں۔"

اس نے ایک کاغذ پر لکھا۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ یہ بھی تمہاری کوئی چال ہو گی جب مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچانا تھا تو مجھے یہاں کیوں لائے تھے؟"

"میں نے تمہارے ذریعے تمہارے باپ کے موجودہ حالات معلوم کر لئے ہیں۔ وہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ "را" والے اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے اور پتا نہیں تمہارا کیا بنے گا۔ جا کر دیکھو' موجودہ حالات میں کتنے بوائے فرینڈ تمہارا ساتھ دیں گے۔ کم آن۔"

ہم باہر آ کر ایک کار میں بیٹھ گئے۔ میں نے بڑی خاموشی سے دیکھا' وہ کن انکھیوں سے کار کی پلیٹ نمبر پڑھ رہی تھی۔ آس پاس کے علاقوں کو توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ اس بنگلے کے احاطے سے نکل کر میں نے کہا۔ "اس جگہ کا اچھی طرح جائزہ لے لو۔ مجھے واپس نہیں آنا ہے۔ ابھی جس بنگلے سے آئے ہیں' وہ پتا نہیں کب سے خالی پڑا ہے۔ ہمارے کام آ گیا اور یہ کار بھی چوری کی ہے۔ اسے تم لے جاؤ گی۔"

وہ پریشان ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ "جب تم نے کاغذ پر نقشہ بنایا تو مجھے یاد آ گیا۔ تم نے جس بنگلے کا پتا لکھا ہے ٹھیک اس کے سامنے پولیس اسٹیشن ہے۔ اب یہ سوچنا تمہارا کام ہے کہ یہ چوری کی کار وہاں تک کیسے لے جاؤ گی یا کہیں چھوڑ کر پیدل جاؤ گی؟"

وہ غصے اور بے بسی سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ "سچ بتاؤ ارادے کیا تھے؟ سچ بولو گی تو تمہیں محفوظ جگہ پہنچا دوں گا ورنہ میرے ریوالور میں سائلنسر لگا ہوا ہے۔"

میں نے اس کے سامنے ڈیش بورڈ کھول دیا۔ وہ اس میں سے کاغذ قلم نکال کر لکھنے لگی۔ "میں خود کو پولیس کے حوالے کر کے تمہیں بھی حوالات میں لے جاتی۔ میں نے "را" والوں سے نمٹنے کا طریقہ بھی سوچ لیا تھا مگر تمہاری اصلیت سامنے آ جاتی۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں' رنجن اس دنیا میں نہیں ہے۔ تم کوئی اور ہو۔"

"بڑے خطرناک ارادے سے مجھے لے جا رہی تھیں لیکن میں تمہیں پولیس والوں تک پہنچنے نہیں دیتا اور پولیس والے تمہیں دور سے پہچان نہیں پاتے۔ عورتوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ آئینہ دیکھتے نہیں تھکتیں لیکن تم نے بڑی دیر سے نہیں دیکھا ہے۔ چلو اس عقب نما آئینے میں خود دیکھ لو۔"

میں نے عقب نما آئینے کا رخ اس کی طرف کیا تو وہ خود کو حیرانی سے دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ بدلا ہوا تھا۔ کوئی اسے نرملا کی حیثیت سے نہیں پہچان سکتا تھا۔ میں خوش قسمتی سے بچ گیا تھا اگر پولیس' انٹیلی جنس اور "را" کی گرفت میں آتا تو میری تصویر' فنگر پرنٹس اور جسم کے نشانات انہیں اس فرمان تک پہنچا دیتے' جس نے پاکستانی سیاست کی بساط پلٹ دی تھی۔

میں نے تقریباً ایک ویران سڑک کے کنارے کار روکی پھر کہا۔ "آج تم سے ایک

تجربہ سیکھ رہا ہوں اور وہ یہ کہ آستین میں سانپ پال لو' بچنے کا امکان ہو سکتا ہے لیکن پہلو میں بیٹھی ہوئی مکار عورت ہزار ہتھ کنڈوں سے ڈس لیتی ہے۔"

میں نے سائلنسر لگا ہوا ریوالور نکال کر ٹھس ٹھس کی آواز کے ساتھ دو فائر کئے۔ وہ چیخ بھی نہ سکی۔ بیٹھے بیٹھے اوپر پہنچ گئی۔ میں اپنے ضروری سامان کا بیگ لے کر کار سے اتر کر تیزی سے ایک طرف جانے لگا۔

☆======☆=====☆

کالیا اسپتال کے بیڈ پر پڑا تھا۔ اس کے دونوں گھٹنوں کے ایکسرے لئے جانے والے تھے۔ ٹھیک وقت پر ایک اسسٹنٹ ڈاکٹر چار وارڈ بوائز کے ساتھ آیا۔ ان چاروں نے کالیا کو بیڈ سے اٹھا کر اسٹریچر ٹرالی پر ڈالا پھر وہاں سے لے جانے لگے۔

ایکسرے کا شعبہ گراؤنڈ فلور پر تھا۔ وہ ٹرالی کو دھکیلتے ہوئے لفٹ کے اندر لے آئے۔ ٹرالی بیڈ کی چادر چاروں طرف سے نیچے تک تھی۔ اس چادر کے پردے میں ایک گن مین بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے چادر ہٹا کر اسسٹنٹ ڈاکٹر سے کہا۔ "بالکل نارمل رہو۔ چہرے سے پریشانی ظاہر نہ ہونے دو۔ تم نے کوئی گڑ بڑ کی تو خود بھی مارے جاؤ گے اور اسپتال کے بھی نہ جانے کتنے لوگ مریں گے۔"

کالیا لیٹا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

سرہانے کھڑے ہوئے وارڈ بوائے نے کہا۔ "خاموشی سے لیٹے رہو۔ تمہارے تکیے کے نیچے میرا ہاتھ ہے اور میرے ہاتھ میں ٹی ٹی ہے۔ کچھ بولنے سے پہلے ہی کھوپڑی اڑ جائے گی۔"

گراؤنڈ فلور کی لفٹ کا دروازہ کھل گیا۔ وہ ٹرالی کو دھکیلتے ہوئے ایکسرے کے شعبے کی طرف جاتے جاتے دوسرے کوریڈور میں مڑ گئے۔ تیزی سے چلتے ہوئے ڈھلان والے برآمدے میں آئے۔ ایک ایمبولینس کا پچھلا دروازہ کھولا۔ وہ سب اسسٹنٹ ڈاکٹر کے ساتھ کالیا کو بھی اسٹریچر سمیت اندر لے گئے۔ وہاں گن مین اور دو وارڈ بوائز آ گئے۔ پچھلا دروازہ بند ہو گیا۔ ایمبولینس چل پڑی۔

تقریباً آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد اسسٹنٹ ڈاکٹر کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ سفر پھر شروع ہوا۔ گن مین نے کہا۔ "ڈاکٹر زندگی بچاتے ہیں۔ تم ایک اچھے ڈاکٹر ہو۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ تمہیں گولی نہ ماری جائے' اگر ہم تک پہنچنے کی کوئی نشانی نظر آ جائے یا کسی طرح بھی نشاندہی کر سکو تو پولیس اور انٹیلی جنس والوں کو گائڈ نہ کرنا ورنہ پوری فیملی سمیت مارے جاؤ گے۔"

گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ کالیا کی آنکھوں پر ابھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ پچھلے حصے سے اسے اٹھا کر لے گئے۔ دروازے بند کر دیئے گئے۔ گاڑی پھر آگے جانے لگی۔ ایک گھنٹے بعد وہ رک گئی۔ گن مین نے کہا۔ "ڈاکٹر انتظار کرو۔ ہم ابھی آکر آنکھوں سے پٹی کھولیں گے۔ یہ یاد رکھنا چالاکی موت اور شرافت زندگی دے گی۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ پندرہ منٹ کے بعد ڈاکٹر نے پوچھا۔ "کیا واپس آگئے؟ کوئی ہے تو مجھے بتاؤ۔"

کوئی بتانے والا نہیں تھا۔ ایک ٹریفک پولیس والے نے آکر پوچھا۔

"یہ کیا؟ ایک تو گاڑی غلط جگہ کھڑی کی ہے اور آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے؟"

ڈاکٹر نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

"میں ایک ٹریفک پولیس والا ہوں۔ آنکھوں سے پٹی ہٹاؤ۔"

اس نے پٹی ہٹا کر پوچھا۔ "کیا گاڑی میں کوئی نہیں ہے؟"

"کوئی نہیں ہے؟"

"اسپتال کے ایک مریض کو میرے ساتھ اغوا کیا گیا ہے وہ لوگ مریض کو تھوڑی دیر پہلے کہیں لے گئے ہیں اور مجھے یہاں چھوڑ دیا ہے۔"

اس کی بات سن کر قانونی کارروائی شروع ہو گئی۔

کالیا کی آنکھوں سے پٹی کھولی گئی تو اس نے خود کو ایک کمرے کے بیڈ پر پایا۔ پٹی کھولنے والا چلا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ کمرے میں معمولی سا فرنیچر وغیرہ تھا۔ جہاں وہ لیٹا ہوا تھا۔ اس کے سامنے والی دیوار پر سینما اسکرین کی طرح ایک بہت بڑا ٹی وی اسکرین تھا۔

کالیا نے کہنی کے بل ذرا سا اٹھ کر ہر طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں کوئی ہے؟"

"ہے۔" سادے اسکرین سے آواز آئی۔

"تم کون ہو؟ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

"تماشا دکھانے۔ دنیا میں بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں۔ ایسا تماشا جو ہم دکھانے جا رہے ہیں' اسے صرف تم ہی دیکھ سکتے ہو۔"

کالیا نے کہا۔ "پہلے ہم جان ہتھیلی پر رکھتے ہیں پھر گاڈ فادر بنتے ہیں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مجھ سے کھل کر بات کرو۔"

"موت سے نہ ڈرنا ایک الگ بات ہے لیکن نہ ڈرنے والے بھی زندہ رہنے کی خواہش کرتے ہیں۔ اسی لئے تم اپنی بیٹی شلپا کے ذریعے "را" والوں کو بلیک میل کر کے

اپنے جینے کی مدت بڑھاتے جا رہے ہو۔"

وہ تکیے پر گرتے ہوئے بولا۔ "میں سمجھ گیا۔ "را" والے میری بیٹی پر قابو نہ پا سکے۔ اب مجھے قیدی بنا کر میری بیٹی کو مجبور کریں گے۔"

"بے وقوف ہو۔ "را" والے تو تمہارا علاج کرا رہے ہیں۔ یہ بھروسا کر رہے ہیں جب تک باپ بیٹی سلامت رہیں گے ان کے اہم راز کسی تیسرے کے ہاتھ نہیں پہنچیں گے۔"

"تو پھر ڈاکٹر آمنہ دہری چالیں چل رہی ہے۔ دنیا کو دکھانے کے لئے میرا علاج کر رہی ہے اور درپردہ میرے دشمن گاڈ فادر ہاشم کے ذریعے مجھے اغوا کرایا ہے۔"

"ہاشم جرائم سے باز آکر پاکستانی سیاست میں ملوث ہو گیا ہے۔ اپنے کسی ایسے سگے کے بارے میں سوچو' جو تمہاری آستین کا سانپ ہو۔"

"اب سمجھا۔ میرے آستین کے سانپ پتامبر بجاج! یہ تم ہو۔ تم۔"

کسی نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "کیسی آنکھ مچولی ہے کہ تم اصل دشمن تک نہیں پہنچ رہے ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ پتامبر بجاج پر برا وقت آگیا ہے اور اس کی جوان بیٹی نرملا کو اغوا کر لیا گیا ہے۔"

کالیا نے جھنجلا کر کہا۔ "مجھ سے پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ کون ہو تم سامنے آؤ۔"

"بالکل سامنا ہو گا لیکن پہلے اسکرین پر تماشا دیکھو۔"

کمرے کے اندر لائٹس آف ہونے لگیں۔ گہری تاریکی چھا گئی۔ سامنے دیوار پر بڑا سا اسکرین روشن ہو گیا۔ کالیا نے دیکھا اسکرین پر اس کی بیٹی شلپا کا بیڈ روم نظر آ رہا تھا۔ ایک ریکارڈ پلیئر سے موسیقی کی آواز ابھر رہی تھی۔ اس موسیقی کی دھن پر شلپا ڈانس کر رہی تھی۔ وہاں کوئی دوسرا نہیں تھا۔

کالیا نے ناگواری سے پوچھا۔ "اسکرین پر میری بیٹی کو کیوں دکھایا جا رہا ہے؟"

اس بار اسکرین سے شلپا کی آواز ابھری۔ "آپ بھول رہے ہیں۔ میں آپ کی بیٹی نہیں' اس کی ڈمی شلپا ہوں۔ آپ نے صرف میرا چہرہ ہی نہیں بدلا تھا۔ اپنی بیٹی کی طرح چلنا پھرنا اور ڈانس کرنا بھی سکھایا تھا۔ اس وقت آپ کے سامنے ڈمی شلپا ڈانس کر رہی ہے۔"

کالیا مطمئن ہو کر دیکھنے لگا۔ وہ رقص کرتے کرتے ایک ایک لباس اتارتی جا رہی تھی۔ کالیا نے کہا۔ "تم میری بیٹی نہیں پھر بھی مجھے یہاں لا کر تمہیں کیوں دکھایا جا رہا ہے؟"

"تمہیں دیکھنے میں کیا اعتراض ہے۔ تم نے ایک بار تنہائی میں میرے بدن کو ہاتھ لگایا تھا۔ میں نے اعتراض کیا تھا۔ تمہیں سمجھایا۔ میں تمہاری بیٹی کی ہم شکل بہن بن کر تمہاری بیٹی کا رول ادا کرتی رہتی ہوں لیکن تم نے کہا۔ "بیٹی کی ہم شکل بن جانے سے میری بیٹی نہیں ہو جاؤ گی۔ میں اپنی بیٹی کو بچپن میں تھپک تھپک کر سلاتا تھا۔ تم جوانی میں میرا ساتھ دو۔"

"میں اپاہج بنا ہوا ہوں اور تم ایسی چھچھلی باتیں کیوں کر رہی ہو؟"

"مرد اپاہج ہونے کے بعد بھی مرد ہی رہتا ہے۔ حسین عورت کے بدن کو مزے لے لے کر دیکھتا ہے۔ اس لئے میں تمہیں اپنا بدن دکھا رہی ہوں۔ اس کمرے میں کوئی تیسرا نہیں ہے۔ اس روز خوش قسمتی سے میں تمہاری بے حیائی سے بچ گئی تھی۔ آج خود چلی آئی ہوں۔ دیکھو ایک ایک لباس اترتا جا رہا ہے۔ کیسے جذبات بھڑک رہے ہیں۔ اپنی آنکھیں پوری طرح ننگی کر لو۔"

وہ شباب سے بھرا ہوا چمکتا دمکتا حسن دیکھ رہا تھا۔ وہ بولی۔ "مور جنگل میں منگل منانے کے بعد خوب ناچتا ہے۔ اپنے رنگین پروں کے حسن پر اتراتا ہے لیکن اس کی نظر جب پیروں پر پڑتی ہے تو اس کی خوشی مایوسی میں بدل جاتی ہے کیونکہ مور کے پر جتنے خوبصورت ہوتے ہیں۔ اس کے پاؤں اسی قدر بھدے اور بدنما ہوتے ہیں۔ ڈیڈی! آپ میرے پیر کو نہ دیکھیں' مرجھا جائیں گے۔"

کالیا نے منع کے باوجود ڈانس کرنے والی شلپا کا ایک پیر دیکھا تو چونک گیا۔ اس پیر پر میری (فرمان) ماری ہوئی گولی کے زخم کا نشان تھا۔ کالیا نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر کہا۔ "یہ ڈمی نہیں ہے۔ میری بیٹی ہے۔ میں یہ منظر نہیں دیکھ سکتا۔"

بینا کی آواز سنائی دی۔ "آنکھوں سے ہاتھ ہٹا لے۔ وہ منظر ختم ہو چکا ہے۔ میں بینا بول رہی ہوں۔"

اس نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر دیکھا۔ پہلے والا منظر نہیں تھا۔ پورے اسکرین پر بیٹی کی ہم شکل بینا نظر آ رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "میں نے اس روز تجھے سمجھایا تھا کہ مجھ پر نیت خراب نہ کر۔ میں تیری بیٹی جیسی ہوں۔ تو ساری دنیا کے سامنے مجھے بیٹی کہتا ہے مگر میری فریاد' میری التجائیں تیری سمجھ میں نہیں آئیں۔"

"بینا! مجھے معاف کر دے۔ میں شرمندہ ہوں۔"

"تو شرمندہ نہیں ہے۔ جب تک تو نے اپنی بیٹی کے پیر کے زخم کا نشان نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت تک اسے بینا سمجھ کر اس کے تھرکتے ہوئے شباب کو دیکھتا رہا۔ جب حقیقت

معلوم ہوئی تو اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ کمینے! تو شرمندہ نہیں تھا۔ اب جانتا ہے کیا ہو گا؟"

وہ سوالیہ نظروں سے بینا کو دیکھنے لگا۔ "تو چاہے تنہائی میں کہے یا دنیا کے سامنے بیٹی کہہ دیا تو پھر وہ بیٹی ہو گئی اور اگر دو غلا بن چکا ہے تو پھر اپنی بیٹی بھی بیٹی نہیں رہی۔ اس لئے ابھی تیری بیٹی کو تیرے کمرے میں بھیج رہی ہوں۔"

"نہیں۔ تو ایسا نہیں کر سکے گی۔ میری بیٹی شلپا تجھ سے زیادہ چالاک ہے۔ کیا تو یہ کہنا چاہتی ہے کہ میری بیٹی جو پوری "را" تنظیم کو بلیک میل کرتی ہے۔ اسے تو قابو میں کر لے گی۔"

"کر چکی ہوں۔ یہ دستاویزات دیکھ۔"

پوری اسکرین پر دستاویزات کا ایک ایک صفحہ بڑے بڑے حروف میں صاف طور پر پڑھا جا سکتا تھا پھر اسکرین پر "را" کے خفیہ اہم ویڈیو دستاویزی فلموں کے تھوڑے تھوڑے سین دکھائے گئے۔ اس کے بعد آڈیو کیسٹس کی باتیں سنائی گئیں۔ کالیا حیرانی اور پریشانی سے دیکھ رہا تھا اور پوچھ رہا تھا۔ "یہ چیزیں تمہارے پاس کیسے آ گئیں؟"

"تمہاری چال باز بیٹی کو قابو میں کرنے کے بعد مجھے سب کچھ مل چکا ہے۔ میں نے تمہاری بیٹی کو الیکٹرک شاک پہنچائے ہیں کہ وہ اپنی یادداشت کھو چکی ہے۔ اب اسے بالکل بے لباس کر کے تمہارے پاس بھیجا جائے گا۔"

"نہیں میں اسے نہیں دیکھوں گا۔"

"دیکھو گے' وہ ایسی پاگلوں جیسی حرکتیں کرے گی کہ تم دیکھنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔"

"میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

"ہاتھ نہ جوڑو۔ تمہارے تکیے کے نیچے ایک ریوالور ہے۔ اس کے چیمبر میں صرف ایک بلٹ ہے۔ دو منٹ کے بعد دروازہ کھلتے ہی تمہاری بیٹی ایسی حالت میں آئے گی کہ تم یا تو اسے مار ڈالو گے۔ یا خود مر جاؤ گے۔"

کالیا نے تکیے کے نیچے ہاتھ لے جا کر دیکھا۔ ایک ریوالور ہاتھ میں آیا اس کے چیمبر میں ایک ہی گولی تھی۔ بینا نے کہا۔ "ایک گولی۔ باپ کے لئے یا.......... بیٹی کے لئے۔"

وہ گڑگڑا کر بولا۔ "بینا! مرنا بڑی بات نہیں ہے۔ شرم سے جینا بڑی بات ہے۔ تم بہت بڑی سزا دے چکی ہو۔ یہ معاملہ یہیں ختم کر دو۔ اس کمرے کا دروازہ کھولو۔"

"ایک منٹ کے بعد یہ دروازہ کھلے گا اور تمہاری شلپا بیٹی ضرور آئے گی۔ وہ جس حال میں آئے گی۔ اسے دیکھنے کے بعد ایک غیرت مند باپ ریوالور کی گولی کے بغیر مر

جائے گا مگر تم غیرت مند نہیں ہو۔ تم کیا کرو گے؟"

"ہے بھگوان! میں کیا کروں؟ دونوں پیروں سے مجبور ہوں۔ کہیں جانا تو دور کی بات ہے، بستر سے اتر نہیں سکتا۔"

"یہ بستر بڑا تماشائی ہوتا ہے۔ اسی بستر پر جوانی جگاتی ہے اور اسی بستر پر موت سلا دیتی ہے۔"

دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ کالیا نے چیخ کر کہا۔ "نہیں۔ دروازہ نہ کھولو۔"

چوں چراں کی آواز کے ساتھ دروازے کے دو پٹ آہستہ آہستہ کھلنے لگے۔ باہر کی روشنی دروازے کی چوکھٹ کے اندر آئی پھر ایک عورت کا سایہ نظر آیا۔ وہ آگے بڑھنے والا سایہ سمجھا رہا تھا کہ بیٹی آ رہی ہے۔ آنے والی ابھی سایہ تھی۔ اس سائے کے جسم کو مزے سے دیکھنے والی شیطانیت نہیں رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ چیختا ہوا اپنی طرف پکارتا ہوا شبابی بدن روشنی پر آتا۔ کالیا نے چیخ مار کر منہ پھیر کر ریوالور کی نال کو کنپٹی پر لگا کر ٹریگر دبا دیا۔ ٹھائیں کی آواز تھوڑی دیر تک کمرے میں گونجی پھر خاموشی چھا گئی۔

عجیب بات ہے کہ ساری عورتوں کا بدن ایک جیسا ہوتا ہے لیکن تمام مردوں کی نیت ایک جیسی نہیں ہوتی۔

بینا ممبئی شہر میں تھی۔ اس کے لئے لندن میں کام کرنے والے اسے میڈم شلپا سمجھتے تھے۔ بینا نے فون کو کان سے لگایا۔ لندن سے کہا گیا۔ "میڈم! آپ جیسا چاہتی ہیں، اسی طرح ڈراما پلے کر کے کالیا کو خودکشی پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ آئندہ آپ ہی گاڈ مدر بنیں گی۔ میں آپ کو پیشگی مبارک باد دیتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اصل اور ڈمی شلپا والا راز میرے سینے میں دفن رہے گا۔"

"اور یہ میرا وعدہ ہے، تم ہمیشہ میرے دستِ راست اور راز دار بن کر رہا کرو گے۔ ڈیٹس آل۔"

بینا نے فون بند کر دیا پھر مجھ سے رابطہ کیا۔ "ہیلو فرہان! کہاں ہو؟ کیا کر رہے ہو؟"

میں نے اسے نرملا اور اس کے باپ کے بارے میں مختصر طور پر بتایا پھر کہا۔ "میں نے بہت مجبور ہو کر نرملا کو ہلاک کر دیا ورنہ وہ بڑی چالاکی سے مجھے پولیس یا "را" کے ٹارچر سیل میں پہنچانے والی تھی۔"

وہ بولی۔ "پتامبر بجاج کا انجام بھی اپنی بیٹی جیسا ہوگا۔"

"میری تصویریں، فنگر پرنٹس اور میرے جسم کے کچھ نشانات پاکستان اور بھارت کی تمام خفیہ ایجنسیوں کے سراغ رسانوں کے پاس ہیں۔ مجھے جلد سے جلد اپنا میک اپ اور

گیٹ اپ مستقل طور پر تبدیل کرنا ہوگا۔"

"ابھی تم کہاں ہو؟"

"تمہارے خاص خفیہ بنگلے میں ہوں۔"

"میں ابھی آ رہی ہوں۔ تمہارا تمام ضروری کام ہو جائے گا۔"

فون سے ہمارا رابطہ ختم ہو گیا۔

☆=======☆=======☆

تابانی اور مراد ایک ایسے علاقے میں عارضی طور پر رہنے لگے تھے جہاں درمیانی طبقے کے لوگ کوٹھی نما مکانات میں رہتے تھے مگر وہ کوٹھیاں نہیں ہوتی تھیں۔ ایک دوسرے سے ملے ہوئے مکانات ہوتے تھے۔ مراد اپنی تابانی سے کچھ ناراض سا رہتا تھا۔ تابانی کا یہ فیصلہ اس کی مرضی اور مزاج کے خلاف تھا کہ اس نے پہلے "را" والوں سے دشمنی مول لی پھر اکرام شاہ نے انہیں بھارت سے بلا کر اپنی کوٹھی میں پناہ دی۔ تابانی اس کے احسانات بھی بھول گئی۔ دردانہ نے اسے سزائے موت سے بچا کر جیل سے رہائی دلائی۔ اس کے باوجود اس نے دردانہ کی مضبوط سیاسی پارٹی چھوڑ دی اور دردانہ کو نقصان پہنچانے والے گاڈ فادر ہاشم کے اشاروں پر ناچنے لگی ہے۔

تابانی نے کہا۔ "مراد! میں تمہاری رگ رگ کو سمجھتی ہوں۔ میں ایک اچھے راستے پر چل رہی ہوں اور تم جبراً میرا ساتھ دے رہے ہو۔"

"میں اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔ تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔ اس لئے تمہارا ساتھ دے رہا ہوں۔"

"تم ایک اچھی اور عقل کی بات سمجھنا نہیں چاہتے؟"

"تم تسلیم کر چکی ہو کہ ایک عورت ہو اور عورت کتنی کم عقل ہوتی ہے، تم "را" جیسی خطرناک تنظیم کو دشمن بنا کر ثابت کر سکتی ہو۔ دنیا کی تمام خطرناک ایجنسیاں تمہیں اور فرہان کو کیوں تلاش کر رہی ہیں؟ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم دونوں خفیہ ہاتھ کی بلیک لسٹ میں آ چکے ہو۔ کیا ایسی ہی عقل کی باتیں تم مجھے سمجھا رہی ہو؟"

"سچائی کے راستے پر چلنے کے لئے جھوٹے مکار شیطانوں کو چیلنج کرنا پڑتا ہے اور ان کے لئے امیر حمزہ کی طرح چیلنج بننا پڑتا ہے۔"

"کہاں ہے امیر حمزہ؟ کیا اس کا کوئی انجام معلوم ہے۔"

"دوسروں کا انجام نہ سوچو۔ ہم پہلے کی طرح دہشت گرد بنے رہتے تو کسی دن کتوں کی موت مارے جاتے۔ جہاد کرتے ہوئے شہید ہونا کتنا بڑا اعزاز ہے، یہ کتوں کی موت

مرنے والے نہیں جانتے۔"

"میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔ تم جو کہہ رہی ہو' وہ کر رہا ہوں۔ یہ دیکھو۔ تمہاری مہربانی سے اس مکان میں رہتا ہوں۔ یہاں کے رہنے والے چھوٹے لوگ اسے کوٹھی کہتے ہیں۔ لعنت ہے ایسی کوٹھی پر۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "تم غصے میں اچھے لگتے ہو۔"

"اگر تم میری ہو۔ صرف میری ہو تو ایک سچائی کا اعتراف کرو کہ تم مجھ سے کچھ اہم باتیں چھپاتی رہتی ہو؟"

"یہ سچ ہے۔ جہاں تک میری تنہا ذات کا تعلق ہے' تم دل و جان سے میرے ہو۔ جس دن میرے نیک مقاصد کو بھی دل و جان سے قبول کرو گے۔ میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔"

"تمہیں کیسے یقین آئے گا کہ تمہارے مقاصد کو بھی دل سے قبول کر رہا ہوں؟ کیا تم میرے اندر جھانک کر دیکھ سکتی ہو؟"

"اندر جھانکنا ضروری نہیں ہے۔ بعض پھل ایسے ہوتے ہیں' جنہیں اوپر سے دیکھ کر پرکھ لیا جاتا ہے کہ وہ اندر سے میٹھے ہوں گے یا کھٹے؟"

"باتیں نہ بناؤ۔ ایک بار مجھے آزما کر دیکھو۔ مجھے کوئی ایسا کام دو۔ جس میں کامیاب ہو کر تمہارا اعتماد حاصل کر سکوں۔"

"ہاں یہ آزمائش والی بات درست ہے۔ میرے کچھ ضروری کام ہیں لیکن انجام دینے کے لئے باہر نہیں جا سکتی۔"

"ہاں' میں دیکھ رہا ہوں' جب سے اس مکان میں آئی ہو' کبھی باہر نہیں جاتی ہو۔ آخر بات کیا ہے؟"

"میں ماں بننے والی ہوں۔ میرا پیٹ نمایاں ہو گیا ہے۔ دشمن سراغرساں اتنے نادان تو نہیں ہیں کہ وہ حاملہ عورتوں کے بارے میں راز داری سے معلومات حاصل نہ کر سکیں۔"

"ہوں۔ تمہیں اسی طرح محتاط رہنا چاہیے۔ باہر جانے والا کام مجھے بتاؤ۔ میں اسے نمٹا کر آؤں گا۔"

وہ تھوڑی دیر تک سر جھکائے سوچتی رہی پھر بولی۔ "دردانہ کی پارٹی کے وہ چار سیاست داں جنہوں نے سیاست سے کنارہ کشی کا اعلان کیا تھا' وہ کوئی دیانت دار اور محبانِ وطن نہیں تھے۔ وہ ایک طرف "را" کے آلۂ کار تھے اور ان سے اچھی خاصی رقمیں لیتے

تھے۔ دوسری طرف دردانہ سے اپنے مطالبات منواتے تھے۔ انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ دردانہ کی پارٹی سے الگ ہو جائیں اور وہ ہو گئے لیکن پانسا پلٹ سکتا ہے' اگر پولیس اور سراغ رساں انہیں ڈھونڈ نکالیں گے تو وہ اگل دیں گے کہ وہ چاروں کس کے دباؤ میں آ کر روپوش ہو گئے تھے۔"

مراد نے پوچھا۔ "وہ چاروں کس کے دباؤ میں آ گئے تھے؟"

"تم سوال نہ کرو۔ میں جواب دوں گی تو بات دوسری طرف چل پڑے گی۔ ابھی تم نے آزمانے کے لئے کہا ہے۔ اس لئے آزمانے والا کام دے رہی ہوں۔"

"کام کیا ہے؟"

"دردانہ کی پارٹی چھوڑنے والے ان چاروں سیاست دانوں کو زندہ نہیں رہنا چاہیے.......... اہم راز اگلنے سے پہلے تم انہیں ختم کر دو۔"

"مجھے ان کے خفیہ پتے بتاؤ۔ کل صبح کے اخبارات میں ان کی ہلاکت کی خبریں شائع ہوں گی۔"

"تم تنہا ہو اور ان چاروں سے مقابلہ ہے' اگر وہ الگ الگ حویلی میں ہوتے تو تم آسانی سے ایک ایک کو ٹھکانے لگا دیتے۔"

"تمہیں فکر کیوں ہے؟ کیا ہمیں یہ ٹریننگ نہیں دی گئی ہے کہ کئی افراد کو بیک وقت ہلاک کرنا ہو تو ریموٹ کنٹرول بم یا ٹائم بم سے کام لینا چاہیے اور ایک سے زیادہ دشمن فرار ہو رہے ہوں تو ان سے کاؤنٹر فائرنگ میں ہماری جان بھی جا سکتی ہے۔ لہٰذا ایسے وقت ان پر گرینیڈ سے حملے کئے جائیں۔ فرار ہونے والے رک کر فائر نہیں کر سکیں گے۔ گرینیڈ کی بلاسٹنگ سے مر جائیں گے۔"

"ٹھیک کہتے ہو لیکن تمہارے لئے ڈر لگ رہا ہے۔ پہلی بار میرے بغیر واردات کے لئے جاؤ گے اور جب تک واپس نہیں آؤ گے' میں بے چین رہوں گی۔"

"تم میرے بچے کی ماں بن رہی ہو۔ میری اماں جان نہ بنو۔ ہم بارود سے کھیلتے آئے ہیں۔ آج بھی کھیلنے جاؤں گا تو کیا فرق پڑے گا؟"

وہ ایک کاغذ پر لکیریں کھینچ کر بتانے لگی کہ اسے کن راستوں سے گزر کر اور کتنی چھوٹی بستیوں سے گزر کر بالا پنڈ تک پہنچنا ہے۔ وہاں تقریباً پچاس چھوٹے کچے مکانوں سے ذرا دور ایک زرد رنگ کی حویلی ہے۔ وہ حویلی ایک زمیندار کی ملکیت ہے اور وہ چاروں اس زمیندار کے مہمان بن کر رہتے ہیں۔

مراد نے کہا۔ "کافی لمبا سفر ہے۔ ابھی یہاں سے چلوں گا تو شاید آٹھ بجے رات پہنچ

سکوں گا۔"

"وہ ان کے شراب پینے اور کھانے کا وقت ہو گا۔ تم صحیح وقت پر پہنچو گے۔"

وہ روانگی کی تیاریاں کرنے لگا۔ اس کے پاس جو گاڑی تھی' اس کے نچلے حصے میں ایک خفیہ خانہ تھا۔ وہاں ریموٹ کنٹرول بم' ٹائم بم' ہینڈ گرینیڈ اور ایک سیون ایم ایم رائفل اور بلٹس کی ایک پیٹی بھی رکھی تھی۔ مراد نے لباس تبدیل کیا۔ تابانی نے اسے ایک موبائل فون دیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں میرا فون نمبر معلوم ہے۔ میں انکل ہاشم کے فون کے نمبر بتا رہی ہوں انہیں اچھی طرح یاد کر لو۔ خدا نہ کرے تم پر کوئی مصیبت آئے گی تو انکل کے آدمی تیر کی طرح تمہاری مدد کے لیے پہنچیں گے۔ سنبھل کر جاؤ۔ سنبھل کر آجاؤ بلکہ واپسی کے وقت سنبھل کر محتاط رہ کر آنا۔"

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ تابانی نے کہا۔ "مراد! یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ ان چاروں میں سے ایک بھی زندہ بچ نکلے گا تو ہمارے لئے بہت بڑا مسئلہ بن جائے گا۔"

"تم چار نہ کہو۔ پانچ کہو۔ ایک میزبان زمیندار بھی ہے۔ وہ بھی گھن کی طرح گیہوں کے ساتھ پیسا جائے گا۔ میں پوری طرح یہ اطمینان حاصل کروں گا کہ اس حویلی کی تباہی کے بعد کوئی زندہ بچ کر نہیں جا رہا ہے۔"

وہ بڑی محبت کے ساتھ تابانی سے رخصت ہو گیا۔ وہ دروازے پر کھڑی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔

مراد تیزی سے گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا جا رہا تھا۔ گرین ٹاؤن سے آگے نکل کر اس نے تابانی کے بنائے ہوئے نقشے کو کھول کر دیکھا پھر اس کے مطابق ایک راستے پر چلتے ہوئے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر دوسرے ہاتھ سے موبائل نکالا پھر تابانی سے رابطہ کر کے بولا۔ "ہائے جانی! تم ادھر اکیلی ہو گئیں۔ ادھر میں اکیلا ہوں۔"

وہ بولی۔ "صرف آج کی رات جدائی کی ہے۔ میرا دل کہتا ہے' کل صبح کامیاب ہو کر واپس آؤ گے۔ ابھی کہاں ہو؟"

"گرین ٹاؤن سے آگے نکل کر تمہارے بنائے ہوئے نقشے کے مطابق جا رہا ہوں۔ کہیں الجھن ہو گی یا راستے سے بھٹکنے کا شبہ ہو گا تو فون پر رابطہ کروں گا۔ او کے پھر فون کروں گا۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ تھوڑی دیر تک ڈرائیو کرتا ہوا سوچتا رہا پھر اس نے دوسرا فون نمبر پنچ کیا۔ رابطہ ہونے پر بولا۔ "ہیلو! میں مراد ہوں۔ انکل اکرام شاہ سے بات کرنا

چاہتا ہوں۔"

اکرام شاہ کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو مراد! تم کہاں گم ہو گئے تھے؟ تابانی کہاں ہے؟"

"انکل! میں سب بتاؤں گا۔ پہلے مجھے دردانہ بیگم کا فون نمبر بتائیں۔"

"میں ابھی بیگم صاحبہ کے پاس ہی پیلس میں بیٹھا ہوں جو کہنا ہے' مجھ سے کہو۔"

"آپ سے بھی کہوں گا مگر ٹاپ سیکرٹ معاملہ ہے۔ پہلے بیگم صاحبہ سے بات کرنے دیں۔"

دردانہ بیگم اپنے محل کے بڑے ہال میں اپنی پارٹی کے اہم وفادار سیاست دانوں اور مشیروں کے ساتھ بیٹھی اپنی موجودہ سیاسی حالات پر گفتگو کر رہی تھی۔ اکرام شاہ کی زبان سے مراد کا نام سن کر وہ سوالیہ نظروں سے اکرام شاہ کو دیکھنے لگی۔ اس نے کہا۔ "بیگم صاحبہ! مراد کہہ رہا ہے' کوئی ٹاپ سیکرٹ معاملہ ہے وہ آپ ہی سے بات کرے گا۔"

دردانہ نے ہاتھ بڑھا کر موبائل فون لے کر......... کان سے لگایا پھر کہا۔ "میں دردانہ بیگم بول رہی ہوں۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"میڈم! مجھے اغوا کر کے آپ کا وفادار بن کر رہنے نہیں دیا گیا لیکن آج اس کا فائدہ آپ کو پہنچے گا۔ آپ کی پارٹی چھوڑنے والے چاروں سیاست دانوں کا پتا ٹھکانا معلوم ہو گیا ہے۔"

"کیا واقعی؟ وہ کہاں ہیں؟"

"میں ابھی بتاتا ہوں مگر آپ وعدہ کریں کہ آپ مجھے پوری طرح سیکورٹی دیں گی اور آپ دس بارہ چالاک بندے دیں گی جو میری ایک کال پر ایکشن میں آجائیں۔"

"میں تمہاری توقع سے بھی زیادہ مطالبات پورے کروں گی۔ وہ چاروں میرے لئے بہت اہم ہیں۔"

"گاڈ فادر ہاشم کے لئے بھی اہم ہیں۔ تابانی میری وائف ان چاروں کو قتل کر دینا چاہتی ہے تاکہ وہ پولیس پارٹی کی گرفت میں آکر بہت سے راز کھول نہ دیں۔ ابھی میں اس کی تسلی کے لئے ان چاروں کو قتل کرنے جا رہا ہوں لیکن آپ کے خاص بھروسے کے آدمیوں کو مجھ سے پہلے وہاں پہنچ کر ان چاروں کو اغوا کر کے......... آپ کے پاس پہنچانا ہے۔ وہ چاروں اس وقت ہالا پنڈ کی ایک حویلی میں موجود ہیں۔"

"مراد! میں مانتی ہوں تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔"

"میڈم! میں آپ کا تابعدار ہوں یہ نہیں بھلا سکتا کہ آپ نے مجھے سزائے موت سے بچایا ہے۔ آپ پہلے اپنے چند ہوشیار بندوں کو ہالا پنڈ روانہ کریں۔ میں پندرہ منٹ

کے بعد ایک اور اہم بات کروں گا۔ ایسی باتوں کے لئے آپ اپنا ذاتی فون نمبر دیں گی؟"

دردانہ نے اسے ایک ذاتی فون نمبر بتائے پھر فون بند کر کے اسے اکرام شاہ کو دیتے ہوئے کہا۔ "ہماری پارٹی سے الگ ہونے والے چاروں سیاست دانوں کا پتا معلوم ہو گیا ہے۔"

اس نے پرسنل سیکرٹری سے کہا۔ "اپنے آٹھ یا دس چالاک بندوں کو ہالا پنڈ روانہ کرو۔ ان بندوں کا تعلق لاہور سے ہونا چاہیے یہاں اسلام آباد سے جانے والے دیر سے پہنچیں گے۔ ہالا پنڈ کی حویلی میں وہ چاروں موجود ہیں' اگر وہ چاروں کو نہ پہچانتے ہوں تو حویلی میں جتنے بھی لوگ ہیں' انہیں پکڑ کر لے آئیں۔ یہ تاثر دیں کہ ڈاکوؤں نے ایسا کیا ہے۔ انہیں فوراً بھیجو اور مجھے رپورٹ دیتے رہو۔"

پرسنل سیکرٹری چلا گیا۔ دردانہ نے اکرام شاہ سے کہا۔ "میں تم سے بہت خوش ہوں۔ تم نے زبردست کام کا آدمی دیا ہے۔"

"شکریہ بیگم صاحبہ! ہم تو آپ کی راہنمائی میں بہت کچھ سیکھتے رہتے ہیں۔"

فون کا بزر سنائی دیا۔ دردانہ بیگم نے کہا۔ "ہیلو کون؟"

"میڈم! میں ہوں مراد۔ میں اپنی پلاننگ کے مطابق ہالا پنڈ سے دور رہوں گا۔ جب یہ دیکھ لوں گا کہ آپ کے آدمی ان چاروں کو لے جا چکے ہیں تو میں تابانی اور گاڈ فادر ہاشم سے فون پر کہوں گا کہ وہ چاروں اپنے میزبان کے ساتھ شکار کھیلنے گئے ہیں۔ ایک دو دنوں میں واپس آئیں گے۔"

"بے شک تم ان کا اعتماد حاصل کرتے رہو۔ بائی دا وے تم کوئی دوسری اہم بات کہنے والے تھے؟"

"جی ہاں۔ ان چاروں پر جبراً دباؤ ڈال کر انہیں آپ کی پارٹی سے الگ ہونے پر مجبور کیا گیا ہے اور مجبور کرنے والا وہی فرمان علی ہے' جسے تمام خطرناک ایجنسیاں تلاش کر رہی ہیں۔"

"ہوں۔ سمجھ رہی ہوں۔ تابانی کی طرح فرمان بھی کہیں روپوش ہے۔ ایک تم اس کی پناہ گاہ جانتے ہو؟"

"میڈم! گاڈ فادر ہاشم کی تو دور کی بات ہے۔ میری بیوی مجھ پر اعتماد نہیں کرتی ہے۔ ان سب کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے آج پہلی بار ان چاروں کو قتل کرنے جا رہا ہوں پھر میں نے سوچا چاروں آپ کے قابو میں آجائیں گے تو شاید فرمان علی کے متعلق بھی کچھ بتا سکیں گے اگر وہ نہ بتا سکیں تو تابانی میری بات پر بھروسا کر لے گی کہ وہ چاروں

شکار کھیلنے گئے ہیں۔"

"مجھے بھی امید ہے کہ وہ چاروں فرمان کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور بتائیں گے۔ بائی دا وے تمہیں بہت ہوشیاری سے کام کرنا ہے ان کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرو۔"

ایک مشیر نے کہا۔ "میڈم! مداخلت کی معافی چاہتا ہوں۔ میرا ایک مشورہ سن لیں۔"

دردانہ نے کہا۔ "مراد! فون آن رکھو۔ ابھی بات کرتی ہوں۔"

مشیر نے کہا۔ "اپنی چال میں تھوڑی سی تبدیلی کریں۔ اس حویلی میں ہمارا ایک ایسا آدمی جائے جو ہمارے چاروں سیاست دانوں کو چہروں سے پہچانتا ہو۔ حویلی میں وہ چاروں ہوں گے تو انہیں یہاں گرفتار کر کے لایا جائے گا اور اگر وہ چاروں نہ ہوئے تو دشمنوں کی چال سمجھ میں آجائے گی کہ آزمائش کے بہانے مراد کو دھوکا دیا جا رہا ہے۔"

وہاں بیٹھے ہوئے دوسرے مشیر اور سیاست دانوں نے اس مشورے کی تائید کی۔

دردانہ نے فون پر مراد کو سمجھایا۔ "تابانی کو فون پر یہ نہ کہنا کہ وہ چاروں شکار پر گئے ہیں۔ کوئی دوسرا بہانہ کر کے آج کی رات ضائع کرو۔ پہلے ہم تصدیق کریں گے کہ وہ چاروں ہمارے ہی سیاست داں ہیں یا نہیں؟ اگر وہ ہمارے نہ ہوئے تو سمجھ لینا تابانی تمہاری وفاداری کو آزما رہی ہے پھر تم وہی کرنا جو وہ چاہتی ہے۔ یعنی ان چاروں کو ہلاک کر دینا۔ پلاننگ سمجھ رہے ہو نا؟"

"یس میڈم! اپنے آدمیوں سے کہہ دیں میں نے بلیو جینز اور سرخ رنگ کی شرٹ پہنی ہے۔ میری کار کا نمبر ہے ایل اے چار دو صفر دو۔ کار کا رنگ بھی سرخ ہے۔ آل رائٹ میڈم واردات کے بعد آپ سے رابطہ کروں گا۔"

مراد فون بند کر کے ایک پنڈ میں چائے کی دکان کے پاس رک گیا۔ وہاں چائے پیتے ہوئے اس نے تابانی سے رابطہ کیا۔ وہ بولی۔ "کتنی دیر سے انتظار کر رہی ہوں۔ شام ہونے والی ہے۔ ابھی سوچ رہی تھی کہ خود ہی تم سے رابطہ کروں۔"

"بھئی! میں تمہارے خیالوں میں گم ہو کر راستے سے بھٹک گیا ہوں۔ تم نے نقشے میں پنڈ دینا ناتھ نہیں لکھا ہے یا لکھنا بھول گئی ہو؟ یہ چائے والا کہہ رہا ہے کہ آگے دینا ناتھ نامی ایک پنڈ ہے۔"

"او.......... مراد! تم کس راستے پر چلے گئے ہو۔ تمہارے راستے میں دینا ناتھ نامی کوئی پنڈ نہیں آئے گا۔ جس راستے پر تم مڑے تھے' ادھر واپس آجاؤ۔"

"وہ موڑ یہاں سے تیس کلو میٹر پر ہے۔ وہاں پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو جائے گا۔"

"اب بھٹک گئے ہو تو کیا کیا جائے۔ اس چوراہے پر پہنچ کر سیدھے ہاتھ والے راستے پر جاؤ اور نقشہ کے مطابق آگے بڑھتے رہو۔ کوئی غلطی نہ کرنا۔"

"غلطی میری نہیں تمہاری تھی۔ تم بار بار خیالوں میں کیوں چلی آتی ہو۔"

"اچھا بس زیادہ رومینٹک نہ بنو۔ کام پر دھیان دو۔"

مراد نے چومنے کی آواز پیدا کر کے فون بند کر دیا۔

دردانہ بیگم محل کی طرح نیک بخت کے شاہانہ ڈرائنگ روم میں بھی سیاسی دربار لگا ہوا تھا۔ ابھی اس حد تک قیاس آرائی ہو چکی تھی کہ دردانہ کی بنتی ہوئی حکومت کا تختہ الٹنے میں تابانی اور میرا ہاتھ ہے۔ اس قیاس آرائی کی بنا پر تمام دنیا کے انسانی سمندر کو کھنگالا جا رہا تھا کہ تابانی اور میں کس بھیس میں چھپے ہوئے ہیں؟ اور کس ملک میں ہیں۔ مراد کی دہری پالیسی کے سبب دردانہ کو علم ہو چکا تھا کہ تابانی لاہور میں ہے۔ فرمان کے سلسلے میں ابھی سراغ رساں بھٹک رہے تھے۔

پچھلے دن یہ اطلاع دور تک گئی تھی کہ لاہور ائرپورٹ میں ایک خوبرو' قد آور مرد اور عورت کو گرفتار کیا گیا ہے۔ وہ عورت پانچ ماہ کی حاملہ تھی اور حاملہ ہونا ہی تابانی کی پہچان تھی۔ ان دونوں کو انٹیلی جنس والوں نے کسٹڈی میں لیا۔ ایک بند کمرے میں ان سے طرح طرح کے سوالات کئے گئے۔ وہ انکار کرتے رہے کہ ان کا نام تابانی اور فرمان علی نہیں۔

انہوں نے محدب شیشے کے ذریعے ان کا معائنہ کیا۔ اینٹی میک اپ کیمرے سے تصویریں لیں' اگر چہرے پر دوسرا چہرہ بنایا گیا ہوتا تو کیمرے کے ذریعے اندر کا اصلی چہرہ ظاہر ہو جاتا۔ محدب شیشے کے ذریعے یہ توقع تھی کہ پلاسٹک سرجری کی کوئی خامی پکڑی جائے گی۔ زنانہ پولیس کے ذریعے دوسرے کمرے میں اس عورت کی سر سے پیر تک تلاشی لی گئی تو انکشاف ہوا کہ اس حاملہ نے اپنے پیٹ کی پلاسٹک سرجری کرائی تھی۔ وہ حاملہ نہیں تھی۔ اس کے اضافی پیٹ میں ہیرے چھپے ہوئے تھے۔

نیک بخت نے ناگواری سے کہا۔ "کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ تابانی اور فرمان نے دردانہ کو ناکام بنا کر ہمارے حق میں اچھا کیا ہے لیکن وہ دونوں ہمارے بھی دشمن ہیں۔ ہمیں بھی بھری اسمبلی میں کرپٹ سیاست داں کہا گیا ہے' اگر وہ گرفتار نہ ہوئے تو آثار بتا رہے ہیں کہ وہ امیر حمزہ اور راجہ نواز کی طرح مصائب کے پہاڑ کھڑے کرتے رہیں گے۔"

ایک مشیر نے کہا۔ "ہمارے کئی دشمن ہیں۔ ان میں تابانی اور مراد کا بھی اضافہ ہو گیا ہے لیکن خفیہ ہاتھ سے بڑھ کر آپ کا دشمن کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ جو چار

سیاست داں کم ہوئے ہیں ان کے حلقوں میں دوبارہ الیکشن کرائے جائیں گے تو آپ کے نامزد امیدوار جیت جائیں گے لیکن اس نے آپ کو حکومت بنانے کا موقع نہیں دیا۔ سیاسی بحران کو خوب ہوا دے کر امریکا سے ایک شخص کو بھیج کر وزیراعظم بنا دیا۔"

دوسرے مشیر نے کہا۔ "یہ امریکن امپورٹڈ وزیراعظم تین ماہ تک ہم پر مسلط رہے گا۔ اس دوران میں خفیہ ہاتھ دردانہ بیگم کی کامیابی کے راستے ہموار کر دے گا۔ میں اپنے سیاسی تجربات اور خفیہ ہاتھ کی پالیسیوں کے پیش نظر یقین سے کہتا ہوں کہ آئندہ دردانہ بیگم ہی حکومت بنائے گی۔"

نیک بخت نے کہا۔ "میں سمجھ رہا ہوں' اوپر سے کیسی چالیں چلی جا رہی ہیں اور ان چالوں کے ذریعے آئندہ کیسے نتائج سامنے آئیں گے۔ کیا کیا جائے؟ سیاسی مسائل دوا سے حل ہوتے ہیں' دعاؤں سے نہیں ہوتے ورنہ میں ایک ہی دعا مانگتا کہ میری پارٹی میں تابانی اور فرمان جیسے دو چالباز آ جائیں۔ بائی گاڈ! دنیا کے بڑے بڑے سیاست داں حیران تھے کہ انہوں نے کس طرح پلک جھپکتے ہی خفیہ ہاتھ کی بازی الٹ دی ہے۔"

ایک نے کہا۔ "ہم آپ کے مشیر ہیں' اگر تابانی اور فرمان کی کچھ ہسٹری معلوم ہوتی تو اس کی روشنی میں یہ پلاننگ کر سکتے تھے کہ ان سے کسی طرح کی سودے بازی ہو سکتی ہے یا نہیں؟"

دوسرے نے کہا۔ "ہو سکتی ہے۔ تابانی کے بارے میں اس حد تک معلوم ہے کہ اس کا تعلق "را" سے تھا۔ جب وہ "را" کو چھوڑ کر ڈاکٹر آمنہ کے بیٹے فرمان سے مل کر الگ محاذ بنا سکتی ہے تو ہمارے لئے بھی پٹڑی بدل سکتی ہے۔"

موبائل فون سے بزر کی آواز ابھری۔ پرسنل سیکرٹری نے اسے آن کر کے کان سے لگا کر پوچھا۔ "ہیلو کون؟"

"میں ہوں گاڈ فادر ہاشم' براہِ راست نیک بخت سے بات کروں گا۔"

سیکرٹری نے نیک بخت سے کہا۔ "گاڈ فادر ہاشم آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

اس نے فون لے کر کہا۔ "ہیلو نیک بخت اسپیکنگ۔"

"ہیلو مسٹر نیک بخت! کیا سیاسی بازی جیتنا نہیں چاہتے ہو؟"

"تمہارے اس سوال کی وضاحت چاہوں گا۔"

"جب سے دردانہ بیگم ناکام ہوئی ہے' تب سے تم خاموش ہو۔ اخبارات میں تمہارا کوئی دھماکا خیز بیان شائع نہیں ہوا' اگر تم نے یہ سوچ لیا ہے کہ خفیہ ہاتھ پاکستانی قوم کی قسمت کا مالک ہے تو پھر حج کرنے چلے جاؤ۔ اکثر سیاست داں یہی کرتے ہیں۔"

"مجھ سے طنزیہ انداز میں گفتگو کرو گے تو فون بند کر دوں گا۔"

"فون بند کرو گے تو تابانی اور فرمان کا میٹر چالو ہو جائے گا وہ دونوں تمہاری سیاسی شخصیت کو خاک میں ملا دیں گے۔ شکر کرو' ابھی ان کی توجہ صرف دردانہ پر ہے۔"

وہ ایک دم سے نرم پڑ گیا پھر بولا۔ "مسٹر ہاشم! کیا پاکستان میں باصلاحیت افراد کی کمی ہے؟ اگر نہیں ہے تو پاکستان کی تاریخ میں ایک بیرونی ملک سے وزیراعظم کیوں آرہا ہے؟ اسمبلی میں صرف چار افراد کی کمی تھی' وہ ایک ہفتے کے اندر دوبارہ الیکشن کے نتیجے میں اسمبلی میں پہنچ جاتے۔ ہم میں سے کسی کی حکومت بن جاتی لیکن ایسا نہیں کیا گیا کیونکہ دردانہ کے شکست کھانے کے مواقع تھے۔ اب آئندہ تین ماہ کے اندر دردانہ کو پہلے کی طرح مجھ سے برتر بنا دیا جائے گا۔"

"مسلمان ہو کر اللہ کو بھول رہے ہو۔ برتر یا کمتر بنانے والا صرف اللہ ہے' اگر تم ہم سے تعاون کرتے رہو گے تو تابانی اور فرمان خفیہ ہاتھ کو پھر منہ توڑ جواب دیں گے۔"

یہ تو نیک بخت کے دل کی بات تھی۔ وہ فوراً بولا۔ "میں ہر طرح تعاون کرتے رہنے کے لئے تیار ہوں۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"ہم سب دردانہ کی نیندیں اڑا دینا چاہتے ہیں۔"

"آپ میرے اندر کی بات کہہ رہے ہیں۔ مجھے بتائیں میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

"تھوڑی دیر پہلے دردانہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی پارٹی سے الگ ہونے والے چار سیاست داں ہالا پنڈ کی حویلی میں چھپے ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے کہ دردانہ کے آدمی ان چاروں کو وہاں سے اغوا کرتے' تم نے ان سے پہلے انہیں اغوا کرلیا۔"

نیک بخت نے حیرانی سے پوچھا۔ "یعنی ان چاروں کو میں نے اغوا کرایا ہے؟"

"ہاں اس طرح کیا اس کی نیندیں نہیں اُڑاؤ گے؟"

"یہ بات خفیہ ہاتھ تک پہنچے گی۔ وہ میرے پیچھے پڑ جائے گا۔"

"تم صاف انکار کر سکتے ہو کہ کسی کو اغوا نہیں کیا ہے۔ دردانہ تم پر الزام لگا رہی ہے اور سچ یہی ہو گا۔ نہ وہ چاروں تمہارے پاس ہوں گے' نہ ان کی خفیہ ایجنسیاں تمہارے کسی بھی خفیہ اڈے سے انہیں برآمد کر سکیں گی۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ خفیہ ہاتھ غیر شعوری طور پر سوچے سمجھے گا کہ تابانی اور فرمان تمہاری پشت پر ہیں لیکن ثبوت نہیں مل رہا ہے۔"

"میں ابھی سوچ رہا تھا کہ تابانی اور فرمان سے رابطہ اور دوستی ہو جائے۔ میں ابھی

دردانہ کے موبائل نمبر پر اس سے رابطہ کروں گا تاکہ میری گفتگو ٹیپ کے ذریعے ریکارڈ نہ کی جاسکے۔"

ہاشم نے کہا۔ "یہ ہمارے باہمی تعاون کا پہلا مرحلہ ہے۔ ہماری کوشش ہو گی کہ ہم دردانہ کو ذہنی مریضہ بنا دیں۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "ایسا ہو جائے تو اتنی بڑی دنیا میں نیک بخت جیسا خوش بخت کوئی نہیں ہو گا۔ میں ابھی اس کمبخت دردانہ سے رابطہ کرتا ہوں۔"

ہاشم سے فون کا رابطہ ختم ہو گیا۔

دوسری طرف دردانہ کے آدمی ہالا پنڈ کی حویلی میں پہنچ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے زمیندار سے پوچھا۔ "وہ چاروں سیاست داں کہاں ہیں؟"

زمیندار نے کہا۔ "ایک گھنٹا پہلے آپ لوگوں کی طرح کتنے ہی اسلحہ بردار آئے تھے۔ ان چاروں کو ڈرا دھمکا کر اپنے ساتھ لے گئے۔"

دردانہ کے تمام آدمیوں نے پوری حویلی کی تلاشی لی پھر ایک نے پوچھا۔ "کیا وہ پولیس والے تھے؟"

"پتا نہیں کون تھے۔ سب سادہ لباس میں تھے۔"

ایک نے فون پر دردانہ کو بتایا کہ ان چاروں کو دوسرے اسلحہ بردار جبراً کہیں لے گئے ہیں۔ مراد بھی ان کے ساتھ ہی حویلی میں پہنچا تھا۔ اس نے تابانی کو فون پر کہا۔ "ان چاروں کو اغوا کرلیا گیا ہے لیکن یہ پتا نہیں چل رہا کہ ایسا کس نے کیا ہے؟"

تابانی نے کہا۔ "وہ چاروں کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ یہ صرف ہم جانتے تھے پھر تمہیں معلوم ہوا۔ تمہارے بعد کسی اور کو کیسے معلوم ہو گیا؟"

"میں کیا بتاؤں کسی کو کیسے معلوم ہو گیا؟ میں نے کسی کو بتایا ہے؟"

"میں یہ تو نہیں کہہ رہی ہوں کہ تم نے کسی کو بتایا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ تمہارا تعاقب کر رہے ہوں اور تمہیں خبر نہ ہوئی ہو۔"

"کیا تم سمجھتی ہو' میں تعاقب کرنے والوں سے بے خبر رہا ہوں؟"

"ہاں۔ جب تم میرے خیالوں میں ڈوب کر راستے سے بھٹک سکتے ہو تو تعاقب کرنے والوں سے کیسے باخبر رہو گے؟"

"میں تم سے بحث میں جیت نہیں سکتا۔ واپس آرہا ہوں۔"

دردانہ بیگم اپنے محل میں غصے سے تلملا رہی تھی اس وقت نیک بخت نے اس کے موبائل فون پر کہا۔ "ہیلو بیگم صاحبہ! تم غصے اور ناکامی کے باوجود میری آواز پہچان رہی

ہو۔"

"مسٹر نیک بخت! ناکامی سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"یہی کہ پتنگ لُوٹنے میرے آدمی بھی گئے تھے اور تمہارے آدمی بھی۔ غصہ نہ کرو۔ میرے آدمی چار پتنگ لوٹ کر لے آئے ہیں۔"

"اچھا تو تم انہیں لے گئے ہو؟"

"سمجھ دار ہو۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ چاروں وہاں ہیں؟"

"اپنے اپنے ذرائع ہیں میں تمہارے ذرائع کا حساب نہیں پوچھ رہا ہوں۔ تم مجھ سے حساب نہ پوچھو۔"

"وہ چاروں جب بھی سیاست میں آئیں گے تو میرا ہی ساتھ دیں گے۔ کیا وہ تمہارے لیے بیکار نہیں ہیں؟"

"بیکار کیسے ہو سکتے ہیں؟ میں نے تمہاری چار کی گنتی ختم کر دی پھر انہیں خفیہ ایجنسیوں سے چھپا کر تابانی اور فرمان کو خوش کر رہا ہوں۔ وہ دونوں فون پر میرا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ باقی آئندہ قسط میں بولوں گا۔"

دردانہ فون بند کر کے اپنے بیڈ روم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ پرسنل سیکرٹری اور اس کے مشیر اٹھ کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ کر بولی۔

"تشریف رکھیں۔ ابھی نیک بخت نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ خوشی سے چہک رہا تھا۔ کیونکہ ہمارے چاروں سیاست دانوں کو اسی نے اغوا کیا ہے۔"

"کیا واقعی؟" ایک مشیر نے پوچھا۔ "اس کے آدمی ان چاروں تک کیسے پہنچ گئے؟"

"اس کے اپنے وسیع ذرائع ہیں۔ ہمیں یہ سوچ کر کیا کرنا ہے کہ وہ بالا پنڈ کی حویلی کیسے پہنچ گیا۔ ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ خود اپنی زبان سے انہیں اغوا کرانے کا دعویٰ کر رہا ہے۔"

ایک مشیر نے کہا۔ "وہ قانون کے محافظوں اور خفیہ ہاتھ کے سامنے ان کو اغوا کرانے کا اعتراف نہیں کرے گا۔ اس نے آپ کے ذاتی موبائل فون پر رابطہ کیا تھا۔ اس دوسرے فون پر بولتا تو اس کی گفتگو ریکارڈ کر لی جاتی۔"

دردانہ نے کہا۔ "وہ نادان نہیں ہے۔ تابانی اور فرمان کی حمایت حاصل کر رہا ہے۔ وہ دونوں اس کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ نیک بخت کو یہ خبر ہو گئی تھی کہ ہم ان چاروں تک پہنچنے والے ہیں۔ اس سے پہلے نیک بخت نے ان چاروں کو وہاں

سے نکال کر تابانی کی کسی خفیہ پناہ گاہ میں پہنچا دیا ہے۔ تابانی اور مراد کو دوست بنا چکا ہے۔"

وہ پرسنل سیکرٹری سے بولی۔ "خفیہ ہاتھ سے بات کراؤ۔"

اس نے خفیہ ہاتھ کے سیکرٹری سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "اپنے صاحب سے کہو، پاکستان سے بیگم دردانہ صاحبہ بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔"

"سوری وہ موجود نہیں ہیں۔ آپ پیغام ریکارڈ کرا دیں۔"

پرسنل سیکرٹری نے دردانہ سے یہ بات کہی۔ دردانہ نے فون لے کر ان چاروں سیاست دانوں اور نیک بخت کے بارے میں رپورٹ ریکارڈ کرائی اور اس بات پر زور دے کر کہا کہ نیک بخت ایسی حرکت کر کے تابانی اور فرمان کو دوست بنا چکا ہے۔

اس کے بعد مراد نے فون پر کہا۔ "میڈم! آپ کو معلوم ہو چکا ہو گا کہ.........."

وہ کڑک کر بولی۔ "سب معلوم ہو چکا ہے۔ وہ تمہاری تابانی تمہیں اُلو بنا رہی ہے۔ نیک بخت سے دوستی کر رہی ہے۔ ہمارے آدمیوں کے وہاں پہنچنے سے پہلے اس نے نیک بخت کے ذریعے چاروں کو بالا پنڈ حویلی سے دوسری جگہ پہنچا دیا ہے۔"

"لیکن میڈم! تابانی کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ کے آدمی ان چاروں کو لے جانے والے ہیں؟"

"شاید گاڈ فادر ہاشم کو اندر کی خبر مل گئی ہو گی کہ خفیہ ایجنسی والے بالا پنڈ کی حویلی پر چھاپا مارنے والے ہیں۔ تابانی نے تمہیں وہاں بھیجا اور ہاشم نے پہلے ہی نیک بخت کے ذریعے انہیں اغوا کرا دیا۔ وہ لوگ میری مخالفت میں نیک بخت کی حمایت کر رہے ہیں۔"

"میڈم! آپ حکم دیں، مجھے ایسے وقت کیا کرنا چاہیے؟"

"تم کل صبح مجھ سے رابطہ کرو۔"

مراد فون بند کر کے آہستہ آہستہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے سوچنے لگا۔ "یہ کیا چکر ہے۔ اگر گاڈ فادر ہاشم کو معلوم ہو گیا تھا کہ خفیہ ایجنسی والے ان چاروں تک پہنچنے والے ہیں تو وہ تابانی کے ذریعے مجھے یہ بتا دیتا۔ کیا ہاشم نے تابانی کو اس سلسلے میں نہیں بتایا ہو گا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تابانی کو میری دہری چال کا پتا چل گیا ہو؟ وہ مجھ پر جان دیتی ہے مگر اپنی چالبازیوں سے جان نکال لیتی ہے۔ جب میں جیل سے رہا ہوا تھا۔ تب بھی وہ پنڈی سے لاہور تک مجھے دھوکا دیتی رہی تھی۔ شاید آج بھی میری وفاداری کو آزمانے کے لئے چالیں چل رہی ہے۔"

وہ تابانی سے کہہ نہیں سکتا تھا کہ نیک بخت کے آدمیوں نے اس پر سبقت حاصل کی ہے۔ وہ پوچھتی کہ نیک بخت کے بارے میں اسے کیسے معلوم ہوا؟ یہ بھی نہیں کہہ

سکتا تھا کہ جب نیک بخت کے آدمیوں سے کام لینا تھا تو تابانی نے اسے اتنی دور ہلا پنڈ کیوں بھیجا تھا؟

وہ بڑی الجھن میں پڑگیا تھا۔ یہ اندیشہ قوی ہورہا تھا کہ تابانی نے اسے آزمانے کے لئے ایک بڑی ذمے داری سونپی تھی اور کسی طرح یہ معلوم کرلیا تھا کہ وہ قابلِ اعتماد محبوب تو ہے لیکن اس کا ہم راز بننے کے قابل نہیں ہے۔

اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے دیکھا۔ سڑک کے کنارے ایک پولیس موبائل وین کھڑی ہوئی تھی۔ ایک سپاہی نے سڑک کے بیچ کھڑے ہوکر دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے کار روکنے کا اشارہ کیا۔ وہ دل ہی دل میں بولا۔ "یہ مصیبت کہاں سے آگئی؟ کار کو روکنا ہی ہوگا ورنہ میں کار کی رفتار بڑھا کر بھاگنا چاہوں گا تو وہ کئی سپاہی گولیاں چلا کر میری کار کے پہیوں کو ناکارہ بناسکتے ہیں۔"

اس نے قریب پہنچ کر کار کو روکا پھر کھڑکی سے باہر نکال کر پوچھا۔ "فرمایئے؟"

سپاہی نے کہا۔ "پٹرول ختم ہوگیا ہے۔ دراصل ٹنکی میں سوراخ ہوگیا تھا اور ہمیں پتا نہ چلا۔ پٹرول راستے میں بہتا گیا۔"

"میں کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"سر نے موبائل کے ذریعے دوسری گاڑی لانے کا حکم دیا ہے۔ معلوم نہیں وہ لاہور سے یہاں کب تک پہنچے گی۔ آپ ہمارے سر کو اپنی گاڑی میں لے جائیں۔"

مراد نے جھوٹ کہا۔ "لیکن میں لاہور نہیں جارہا ہوں۔"

"آپ جہاں جارہے ہیں' وہیں تک لے جائیں۔ آگے سر کو کسی دوسری گاڑی والے سے لفٹ مل جائے گی۔"

مراد نے بے بسی سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ مجھ سے جو خدمت ہوسکتی ہے' وہ کروں گا۔"

ایک سپاہی تیزی سے چلتا ہوا وین کی اگلی سیٹ کی طرف گیا اور کسی سے کچھ کہا پھر اگلی سیٹ کا دروازہ کھلا۔ اس دروازے سے جو افسر باہر آیا' اسے کار کی ہیڈ لائٹس میں دیکھ کر ایک دم سے مراد گھبرا گیا۔ اس کے جسم سے جیسے جان نکلنے لگی۔ انٹیلی جنس برانچ کا کیپٹن جمشید افسرانہ دبدبے کے ساتھ چلتا ہوا کار کی طرف آرہا تھا۔

☆======☆======☆

ممبئی سے باہر جانے والی ایک ویران سی سڑک کے کنارے پولیس کو ایک کار کی اگلی سیٹ پر ایک نوجوان لڑکی کی لاش ملی۔ انسپکٹر نے اپنے اعلیٰ افسران اور کرائم برانچ کے

افسران کو اطلاع دی۔ وہ بھی جائے واردات پر آئے۔ اتنا معلوم ہوسکا کہ کسی نے مقتولہ پر دو فائر کئے تھے۔ کار کے مختلف حصوں کی تصاویر' فنگر پرنٹس اور فٹ پرنٹس کے لئے اتاری گئیں پھر لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دیا گیا۔

لندن انٹیلی جنس کے ڈی.جی کو کسی نامعلوم شخص نے فون کیا۔ "شمشیر سنگھ کو جس اسپتال سے اغوا کیا گیا تھا' اسی اسپتال کے پیچھے تھرڈ اسٹریٹ کے بنگلا نمبر آٹھ میں جاکر اس کی لاش وصول کرلیں۔"

ڈی.جی نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟ قانون کی مدد کرنا' ایک اچھے شہری کا فرض ہے۔"

دوسری طرف سے جواب نہیں ملا۔ فون بند کردیا گیا تھا۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے سب ہی اس بنگلے کی طرف دوڑ پڑے۔ میری امی کو بھی اس دشمن کے اغوا ہونے کے بعد سے تشویش تھی۔ اسسٹنٹ ڈاکٹر نے ان کے ساتھ جاتے ہوئے کہا۔ "اغوا کرنے والے بہت چالاک تھے۔ مجھے بھی اپنے ساتھ رکھا تھا اور ایمبولینس کو تقریباً دو گھنٹے تک یوں چلاتے رہے تھے جیسے کالیا کو بہت دور لے جارہے ہوں۔ اس طرح انہوں نے قانون کے محافظوں کو بھی دھوکہ دیا۔ کوئی یہ سمجھ نہیں پایا کہ اسے اغوا کرکے قریب ہی اسپتال کے پیچھے ایک بنگلے میں پہنچایا گیا ہے۔"

وہاں سراغ رساں اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ ایسے وقت کسی کو جائے واردات پر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی لیکن امی کو اجازت دی گئی۔ انہیں بتایا گیا کہ کالیا نے ریوالور کی نال کنپٹی سے لگا کر خودکشی کی ہے۔ اس کے بستر پر ایسے آثار نہیں ہیں کہ کسی نے اسے خودکشی پر مجبور کیا ہو یا اس پر تشدد کیا گیا ہو۔ کالیا نے جس ریوالور سے خودکشی کی' اس کے چیمبر میں ایک ہی بلٹ تھا۔ اس کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دیا گیا۔

نرملا کے چہرے پر عارضی میک اپ تھا۔ اس میک اپ کو واش کرکے اصلی چہرہ دیکھا گیا۔ "را" کے ڈی جی کو اطلاع دی گئی کہ اچانک ہی روپوش ہونے والے پتامبر بجاج کی بیٹی نرملا کو قتل کردیا گیا ہے پھر "را" کے سراغ رساں بھی اس کے قتل میں دلچسپی لینے لگے۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں ڈاکٹر نے لکھا کہ نرملا کے معدے میں تھوڑے سے سیندور کی مقدار پائی گئی ہے۔ قتل ہونے سے پہلے اس نے سیندور کسی چیز کے ساتھ ملا کر پیا تھا۔ یا اسے پلا کر گونگی بنایا گیا تھا۔

ممبئی اور لندن کے فنگر پرنٹس کے ماہرین کے پاس نرملا کے قاتل اور کالیا کو اغوا

کرنے والوں کی انگلیوں کے نشانات پہنچ گئے وہ تمام ماہرین بدنام زمانہ مجرموں اور انڈر گراؤنڈ مافیا سے تعلق رکھنے والوں کے ریکارڈ سے انگلیوں کے نشانات سے ان کا موازنہ کرنے لگے۔

کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد معلوم ہوا' کالیا کے انڈر گراؤنڈ مافیا سے تعلق رکھنے والے چھ مجرموں کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔ اس مافیا کی قائم مقام گاڈ مدر شلپا تھی۔ اس کی طرف سے ایک فیکس موصول ہوا۔ جس میں لکھا ہوا تھا۔ "میرے ڈیڈی کا قاتل پتامبر بجاج ہے۔ وہ گاڈ فادر بننے کے لئے باپ بیٹی کو ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ میں تو بچ گئی ہوں لیکن اس کا حملہ میرے اپاہج باپ پر کامیاب ہوا ہے۔ "را" کے ڈی جی سے تصدیق کی جاسکتی ہے کہ وہ قاتل گاڈ فادر بننے کے لئے "را" والوں سے مدد طلب کر رہا تھا یا نہیں؟"

"را" کے ڈی جی سے رابطہ کیا اور اس سے پوچھا گیا۔ اس نے کہا۔ "یہ درست ہے۔ پتامبر بجاج بہت بڑا فریبی ہے۔ اس نے ہمیں بھی ایک معاملے میں دھوکا دیا ہے اور وہ گاڈ فادر اور ایک صوبے کا مکھ منتری بننے کے لئے بڑی ہیرا پھیری کر رہا تھا۔ اب اچانک کہیں رُوپوش ہوگیا ہے۔"

لندن انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ کے ڈی جی نے پوچھا۔ "آپ کا کیا خیال ہے' پتامبر بجاج خود ہی کالیا کو ہلاک کرنے اور رُوپوش رہنے کے لئے لندن آیا ہے؟"

"شاید وہ لندن میں ہی ہے۔ بھارت سے جانے کے بعد اس کی اکلوتی بیٹی نرملا ممبئی میں تنہا رہ گئی تھی۔ اس کی بیٹی کو کسی نے قتل کیا ہے۔ ہم قاتل کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"را" کے ماہرین دو دن تک فنگر پرنٹس کے ذریعے بلیک لسٹ کے تمام مجرموں کی انگلیوں کے نشانات سے اس کا موازنہ کرتے رہے لیکن کسی کے نشانات تصویری فنگر پرنٹس سے نہیں مل رہے تھے۔

آخر پچھلے دنوں جو نئی بلیک لسٹ بنائی گئی تھی۔ ان مجرموں کے ریکارڈز سے موازنہ کیا تو پتا چلا' وہ فرمان علی کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔ یہ چونکا دینے والی بات سامنے آئی کہ خفیہ ایجنسیاں جسے دنیا کے کئی ممالک میں تلاش کر رہی ہیں' وہ بھارت کے شہر ممبئی میں ہے۔

یہ اطلاع سب سے پہلے ایف بی آئی کو دی گئی پھر بھارت کے تمام ائرپورٹ' ہائی ویز اور بندرگاہوں کی ناکا بندی کی گئی جن سرحدی علاقوں سے اسمگلنگ ہوا کرتی تھی وہاں بھی فوجی جوانوں کو بھیجا گیا۔ یہ سخت انتظامات ذرا اوپر سے کئے گئے تھے۔ اس سے پہلے ہی

میں اور بینا کلکتہ گئے تھے پھر اسی دن کی ایک فلائٹ سے رنگون آگئے تھے۔

رنگون میں پلاسٹک سرجری کا ایک بہت ہی ماہر بوڑھا تھا۔ اس نے بینا کو دیکھا تو حیران ہو کر تھوڑی دیر تک دیکھتا ہی رہا۔ بینا نے پوچھا۔ "مجھے اس طرح حیرانی سے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

بوڑھے نے کہا۔ "میں اسّی برس کا ہوں مگر چالیس برس آج کم ہوگئے آج میں چالیس برس کے عبدالرحمٰن کی آنکھوں سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ میرا نام عبدالرحمٰن ہے۔ یہاں بیٹھو ابھی آتا ہوں۔"

ہم دونوں اس کمرے میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ دوسرے کمرے میں گیا پھر ایک البم کھول کر ایک تصویر دکھاتے ہوئے بولا۔ "دیکھو! یہ میں ہوں۔ کیسا جوان چھوکرا لگ رہا ہوں۔ مجھے خود یقین نہیں آتا کہ یہ میں ہوں اور یہ میری بیوی ہے۔ میرے شادی اٹھارہ برس کی عمر میں ہوگئی اور یہ گود میں جو بچی ہے' یہ شادی کے ایک برس بعد پیدا ہوئی تھی۔ ہم اسے بانو کہہ کر پکارتے تھے۔"

اس نے دوسری تصویر دکھائی تو میں اور بینا چونک گئے۔ وہ بینا کی تصویر تھی۔ بوڑھے عبدالرحمٰن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ روتے روتے' ہنستے ہنستے کہہ رہا تھا۔ "یہ وہی میری بیٹی بانو ہے اس وقت یہ پورے بیس برس کی ہوگئی تھی۔ بیٹی! تمہاری عمر کیا ہے؟"

بینا نے کہا۔ "چوبیس برس۔"

"میری بانو جب اکیس برس کی ہوئی تو انہوں نے اسے اور اس کی ماں کو قتل کر دیا۔"

وہ بوڑھا ایک ننھے بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ کہنے لگا۔ "ہماری کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ میں اپنی ڈیوٹی کے لئے اسپتال گیا تھا۔ ماں بیٹی اکیلی تھیں۔ ایسے وقت کمیونسٹ گوریلے پولیس سے چھپنے کے لئے گھر میں گھس آئے۔ شاید ماں بیٹی کو خاموش رکھنے کے لئے انہیں قتل کیا تھا۔"

وہ روتا جارہا تھا اور بولتا جارہا تھا۔ بینا نے اٹھ کر اس کے پاس آکر اپنے سینے پر اس کا سر رکھ لیا۔ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے صبر کی تلقین کرنے لگی۔ میں نے کہا۔ "رحمٰن بابا ہونی ہو کر رہتی ہے۔ اگر آپ گھر میں ہوتے تو شاید کسی طرح اپنی بیوی اور بیٹی کو بچالیتے۔"

وہ ایک آہ بھر کر بولا۔ "آج مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں اپنی بیٹی کے سینے سے لگا

ہوا ہوں۔"

"ہاں بابا! آپ بیٹی کے سینے سے لگے ہوئے ہیں۔ چالیس برس پہلے کی تصویر دیکھیں اور مجھے دیکھیں۔ آپ شاید اتنی لمبی عمر اسی لئے گزار رہے ہیں کہ ایک دن آپ کی یہ بیٹی آپ سے آکر ملے گی۔"

میں نے کہا۔ "رحمٰن بابا! اس کا نام بینا ہے۔ آپ بانو کو ہلاکت سے نہ بچاسکے۔ کیا بینا کو بچائیں گے؟"

بوڑھے نے چونک کر مجھے اور بینا کو دیکھا پھر پوچھا۔ "تمہاری بات کا مطلب کیا ہے؟ کیا میری بیٹی کو پھر کوئی ہلاک کرنا چاہتا ہے؟" وہ بوڑھا سینے کو تان کر بولا۔ "کس کی مجال ہے جو میری بیٹی کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ تم .... تم دونوں گھر سے باہر نہ جاؤ گے۔ میں باہر جاکر دیکھوں گا۔ اس گھر کا دروازہ بند کردوں گا۔ موت کو باہر روک دوں گا۔"

"نہیں بابا! آپ میری سلامتی کے لئے گولیوں کا جواب گولیوں سے نہیں دیں گے بلکہ سرجری کے آلات سے موت کا رخ بدل دیں گے۔"

عبدالرحمٰن نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "آپ پلاسٹک سرجری کے ذریعے ہمارے جسموں کے خاص شناختی نشانات مٹادیں گے اور چہرے تبدیل کردیں گے تو دشمن ہمیں پہچان نہیں سکیں گے۔"

"یہ میرا سینتالیس برس کا تجربہ ہے۔ میرے لئے ایک کھیل ہے۔ مجھے بتاؤ' دشمن ایک ہے یا ایک سے زیادہ؟"

"ساری دنیا میں پھیلے ہوئے دشمن مجرموں کی خفیہ ایجنسیاں ہیں ہم ایک خطرناک تنظیم کے اہم رازوں سے واقف ہوگئے ہیں اور نہ جانے کتنے دشمن ہمیں مار ڈالنے کے لئے تلاش کررہے ہیں۔"

بینا نے کہا۔ "ان سب کے پاس ہماری تصویریں' فنگر پرنٹس ہیں اور وہ فرمان کے جسم کے خاص نشانات کو جانتے ہیں۔"

"ہوں۔ اس کا مطلب ہے صرف چہرہ بدلنا اور جسم کے نشانات ختم کرنا کافی نہیں ہوگا۔ انگلیوں کے نشانات میں بھی تبدیلیاں لانی ہوں گی۔"

"بابا! یہ تو بہت باریک بینی کا کام ہے۔"

"تم کیا سمجھتی ہو' میں بوڑھا ہوں۔ باریک کام نہیں کرسکوں گا۔ مجھے دیکھ رہی ہو۔ اسّی برس کا ہوں اور آج بھی عینک کے بغیر سرجری کرتا ہوں۔ آج آرام کرو۔ گھر سے نہ نکلو۔ کل سے کام شروع کروں گا۔"

"نہیں بابا! خفیہ ایجنسیوں والے بڑے تیز طرار ہوتے ہیں۔ کسی وقت بھی یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ آپ آج ہی سے یہ کام شروع کریں۔"

"میری بیٹی جو کہے گی' وہی کروں گا۔ میرے آپریشن روم میں چلو۔"

عبدالرحمٰن اس عمر میں بھی چاق و چوبند تھا۔ بینا کے کہنے پر اس نے میرے چہرے کی سرجری شروع کی۔ سرجری کے دوران میں بولا۔ "اچھا ہے' پہلے تمہارا کام کر رہا ہوں۔ اس کام میں جتنی دیر لگے گی۔ اس وقت تک میں اپنی بانو کو دیکھتا رہوں گا۔"

اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ زیادہ وقت لے کر بڑی مہارت سے سرجری کرے گا۔ خاص طور پر انگلیوں کے نشانات تبدیل کرنے میں محنت بھی ہوگی۔ وقت بھی صرف ہوگا۔ لہٰذا ہمیں وہاں کم از کم دو ہفتوں تک رہنا تھا۔

بینا نے کچن کا کام سنبھال لیا۔ لذیذ کھانے پکا کر اسے کھلاتی تو وہ کھاتے وقت کہتا۔ "میری بانو میری ہی طرح ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ کبھی کچن میں نہیں جاتی تھی۔ میں سمجھاتا تھا۔ لڑکیوں کو کچن کا کام ضرور سیکھنا چاہیے۔ وہ کہتی تھی' یہ بھی کوئی کام ہے۔ یوں چٹکی بجاکر سیکھ لوں گی اور واقعی تم نے چالیس برس کے بعد واپس آکر اتنے لذیذ کھانے تیار کرنے سیکھ لئے ہیں۔"

عبدالرحمٰن روز صبح ہمارے لئے پاکستان' بھارت اور امریکا سے آنے والے اخبارات خرید کرلاتا تھا۔ ہم وہ تمام اخبارات پڑھ کر وہاں کے سیاسی حالات سے باخبر رہتے تھے۔ میں نے صرف ایک بار امی کو اور ایک بار آپی (تابانی) کو فون پر کہا تھا۔ "سیٹلائٹ کے ذریعے ہمارے موبائل فون نمبر معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ میں کس ملک سے فون پر بول رہا ہوں۔ لہٰذا میری فکر نہ کریں۔ میں کچھ عرصے تک لاپتا رہوں گا۔"

میری سرجری کے بعد ایک دن بینا سرجری کے لئے آئینے کے سامنے آکر بیٹھی تو عبدالرحمٰن نے بہت ہی غمزدہ ہوکر اسے دیکھا پھر جھک کر اس کی پیشانی کو چوم کر کہا۔ "خدا حافظ.......... میری بانو! خدا حافظ۔"

پھر وہ اپنی بھیگی آنکھوں کو پونچھ کر اس کے چہرے کو تبدیل کرنے کے عمل میں مصروف ہوگیا۔ وہاں ہمارا وقت گزارنا ضروری تھا۔ میں اپنوں سے بے خبر تھا کہ وہ کن حالات سے گزر رہے ہیں۔ بہت عرصے بعد جب ان سے ملاقات ہوئی تو ان سے آج کل کے موجودہ حالات معلوم ہوئے۔ میں ان کے حالات کو ابھی آگے جاکر بیان کروں گا۔

بہرحال ہم چہروں کی سرجری کے عمل سے گزر گئے۔ اس نے مجھے پہلے سے کچھ

زیادہ خوبرو جوان بنا دیا تھا اور بینا کے چہرے پر ایسا حسن اور ایسی کشش دی تھی کہ وہ ملکۂ حسن کہلانے کے لئے عالمی مقابلے میں حصہ لے سکتی تھی لیکن وہ بوڑھا کچھ اس طرح اداس رہنے لگا تھا جیسے اس کی عزیز ترین چیز کھو گئی ہو۔ ہمارے سامنے کبھی کبھی جبراً مسکراتا تھا۔

انگلیوں کے نشانات تبدیل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ میری امی نے مجھے اطمینان دلایا تھا کہ وہ سرجری کے ذریعے ناممکن کو ممکن بنا دیں گی۔ میری امی کا یہ کام اسّی برس کے بوڑھے نے کر دکھایا۔ ہمیں ہر اعتبار سے تبدیل کر دیا۔ دشمن تو دور کی بات ہے میری امی اور آپی بھی مجھے پہچان نہیں سکتی تھیں۔

عبدالرحمٰن بینا کی سرجری کے وقت سے ہی تھکا تھکا سا لگتا تھا۔ اپنا تمام کام مکمل کرنے کے بعد بستر پکڑ لیا۔ میں نے کہا۔ ”آپ نے بہت محنت کی ہے۔ بہت تھک گئے ہیں۔“

وہ بولا۔ ”میں نے زندگی میں اس سے بھی زیادہ محنت کی ہے لیکن اب پہلی بار مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میری فکر نہ کرو۔ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے چلے جاؤ۔“

”میں آپ کی بیٹی ہوں آپ کو ایسی حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ آپ کی خدمت کروں گی۔“

”بیٹی! یہ نہ بھولو کہ تم دونوں ایک پلاسٹک سرجری کے ماہر کے مکان میں ہو۔ دشمن ادھر آئیں گے تو ضرور شبہ کریں گے کہ میں نے تمہارے چہرے تبدیل کئے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”دشمنوں کے خوف سے جوان بچے اپنے باپ کو تنہا چھوڑ کر نہیں جاتے۔ یہاں جو آئے گا زندہ نہیں جائے گا۔“

میں نے اور بینا نے طے کر لیا کہ رحمٰن بابا کی طبیعت جب تک بحال نہیں ہوگی، ہم ان کے قریب رہیں گے۔ ہم رہ تو گئے لیکن ان کے اندر سے ایک صدمے کو نہ نکال سکے۔ روز بروز ان کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ ہم ماہر ڈاکٹروں سے ان کا علاج کرا رہے تھے۔ ان کی طبیعت کبھی سنبھلتی تھی، کبھی بگڑتی تھی۔

انہوں نے مجھ سے تنہائی میں کہا۔ ”چلے جاؤ۔ میری بانو کو یہاں سے لے کر چلے جاؤ۔ میں خدمت کے لیے ایک نرس رکھ لوں گا۔“

اس وقت یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ.......... بینا کو وہاں سے کیوں لے جانے کے لیے کہا، جب ان کا آخری وقت آیا اور سانس رک رک کر آنے لگی تو انہوں

نے پوچھا۔ ”ایک قاتل باضمیر ہو جائے تو کیا وہ مقتول کو بار بار اپنے سامنے دیکھ سکتا ہے؟“

میں نے نہیں کے انداز میں سر ہلایا۔ وہ بینا کو نہیں دیکھ رہے تھے، خلا میں تک رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ ”ان کمیونسٹ گوریلوں نے میری بانو کو مار ڈالا۔ بانو سے ان کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ انہوں نے مار ڈالا۔ یا میرے خدا! میں تو ان سے زیادہ ظالم ہوں۔ میری بانو میرے پاس آئی، میں نے بیٹی کے پُر نور چہرے کو دیکھا پھر سرجری کے آلات سے اپنی ہی بیٹی کے چہرے کو قتل کر دیا۔ بانو۔ جانِ پدر۔ معاف کردے..........“

پھر وہ چپ ہو گئے۔ آنکھیں خلا میں تکتی رہیں۔ میرا ایک ہاتھ ان کے سینے پر تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے ان کی آنکھیں بند کردیں۔ میرا سر جھک گیا تھا اور بینا دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر رو رہی تھی۔

☆======☆======☆

اب میں ان حالات کا ذکر کر رہا ہوں، جو میرے برما میں رہنے کے دوران میں میرے اپنوں اور غیروں کے ساتھ پیش آتے رہے۔

میری داستان میں ابھی مراد اپنا ہوتے ہوئے بھی غیر تھا پہلے اسی کا ذکر ہو جائے کیونکہ بے چارہ آدھی رات کو ایک سڑک پر اپنی کار کو روک کر پولیس والوں سے تعاون کرنے والا تھا۔ پولیس کی وین میں پٹرول کی ٹنکی ناکارہ ہوگئی تھی۔ ان کے لیے دوسری گاڑی آنے والی تھی لیکن لاہور سے آنے میں دیر ہو گئی۔ انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ کے کیپٹن جمشید کو ضروری کام سے جلدی لاہور پہنچنا تھا۔ لہٰذا جب وہ آکر مراد کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تو مراد کے ہوش اُڑ گئے تھے۔ وہ جمشید کی موجودگی میں اپنی پریشانی چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ جمشید نے بیٹھ کر دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”سوری۔ آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔ کیا کروں۔ جلد سے جلد لاہور پہنچنا ضروری ہے۔“

مراد عارضی میک اپ میں تھا۔ جمشید اسے نہیں پہچان رہا تھا پھر رات کا وقت تھا۔ کار کی اندرونی روشنی زیرو پاور جیسی تھی۔ جمشید نے پوچھا۔ ”آپ کار اسٹارٹ نہیں کر رہے ہیں؟ کیا سوچ رہے ہیں؟“

”کچھ نہیں۔ وہ سپاہی ہے۔ اس سے میں نے کہا تھا کہ میں لاہور نہیں جا رہا ہوں۔“

”سپاہی نے مجھے بتایا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ میں آگے جا کر کسی دوسری گاڑی والے سے لفٹ لے لوں گا۔“

اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ جمشید نے کہا۔ ”یہ میرے اصول کے

خلاف ہے کہ میں کسی کو دھونس دے کر لفٹ حاصل کروں لیکن یہ وردی ایسی چیز ہے کہ گاڑی والے خود ہی لفٹ دینے رک جاتے ہیں۔“

وہ چپ رہا۔ جواب دینے والی کوئی بات نہیں تھی۔ جمشید نے کہا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ یہ وردی بہت بدنام ہو چکی ہے۔ جب دردانہ بیگم حکومت بنانے والی تھی تو ہمیں وارننگ دی تھی کہ صبح تک فلاں مجرم نہ پکڑا گیا تو وہ میری وردی اتار دیں گی۔ میں نے اللہ سے دعا مانگی تھی کہ جلدی صبح ہو اور یہ وردی اتر جائے لیکن دعا کا اثر الٹا ہوا' میری وردی نہیں اتری۔ دردانہ بیگم اقتدار کی کرسی سے اتر گئی۔“

جمشید نے قہقہہ لگایا پھر کہا۔ ”بھئی میں ہی بولتا جارہا ہوں۔ آپ خاموش ہیں۔ چلیں بتائیں' اتنی رات کو کہاں سے آرہے ہیں؟“

”ہالا پنڈ سے۔“

”میں سمجھ گیا۔ آپ بہت کم بولتے ہیں۔ اب کہاں جارہے ہیں؟“

”پنڈ دینا ناتھ۔“

”وہ تو بہت دور ہے۔ چالیس کلومیٹر جانے کے بعد آپ کو پنڈ دینا ناتھ جانے کے لیے راستہ بدلنا ہوگا۔ جب تک ہمارا ساتھ رہے گا۔“

مراد نے دل میں کہا۔ ”یہ مصیبت ساتھ ہی رہے گی۔ کوئی دوسری گاڑی بھی نظر نہیں آرہی ہے۔“

”آپ پریشان ہو رہے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے۔ پولیس والوں کے ساتھ کوئی خوش نہیں رہتا۔“

مراد کی جیب میں رکھے ہوئے موبائل فون کا بزر سنائی دینے لگا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ ایک چھپائی ہوئی چیز خود ہی بولنے لگی تھی۔ اب وہ چھپائی نہیں جاسکتی تھی۔ اس نے مجبوراً اسے جیب سے نکال کر آن کیا پھر کان سے لگا کر بولا۔ ”ہیلو میں بول رہا ہوں۔“

دوسری طرف سے تابانی نے کہا۔ ”کہاں رہ گئے ہو۔ رات کے دو بج رہے ہیں۔ تمہیں فون تو کرنا چاہیے۔“

”بھئی اتفاق سے دیر ہو گئی۔ راستے میں پٹرولنگ پولیس کی وین خراب ہو گئی تھی۔ ان کے ایک افسر میرے ساتھ بیٹھ کر لاہور جارہے ہیں۔ یہ آگے کسی دوسری گاڑی سے لفٹ لیں گے۔ میں پھر راستہ بدل کر آجاؤں گا۔ ویسے جاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ آرام سے سو جاؤ۔“

تابانی نے کہا۔ ”سمجھ گئی۔ وہ پولیس افسر مصیبت بن گیا ہے۔ میں آرہی ہوں۔“

”نہیں۔ میں نے کہا نا' اتفاق سے دیر ہو رہی ہے۔ تم بیویوں کی شک کرنے کی عادت نہیں جاتی۔ میرے ساتھ کوئی دوسری عورت نہیں ہے۔ تم خود ہی مرد کی آواز سن لو۔“

مراد نے جمشید کی طرف فون بڑھا کر کہا۔ ”پلیز میری وائف کو یقین دلائیں کہ یہاں کوئی عورت نہیں ہے۔“

مراد چاہتا تھا کہ تابانی جمشید سے بات کرے اور تابانی اس کی آواز سے پہچان لے کہ وہ جمشید ہے۔ وہ فون پر بولا۔ ”ہیلو بھابی آپ میرے محسن کی شریکِ حیات ہیں اس لیے بھابی کہہ رہا ہوں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ کوئی سا بھی ناجائز کام پسند نہیں کرتا۔ میں انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ کا کیپٹن جمشید بول رہا ہوں۔ مجھ جیسے افسر کی موجودگی میں کوئی برائی عورت قریب آنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔“

تابانی نے لب و لہجہ بدل کر کہا۔ ”ٹھیک ہے بھائی صاحب مجھے یقین ہو گیا ہے آپ لاہور جارہے ہیں۔ انہیں فون دیں۔ میں کہتی ہوں آپ کو لاہور چھوڑ کر آئیں۔“

”نہیں بھابی! میں اتنی زحمت نہیں دوں گا۔“

”کیسے نہیں دیں گے۔ مجھے بھائی کہا ہے تو آپ میرے چھوٹے دیور ہیں۔ آپ کو میری بات ماننا پڑے گی۔“

”بھابی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ یہ لیں اپنے مجازی خدا سے بات کریں۔“

اس نے مراد کو فون دیا۔ وہ کان سے لگا کر بولا۔ ”اب یقین آیا خدا کی بندی؟“

وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ”ہاں وہ جمشید ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ تم اسے لاہور تک چھوڑنے آؤ گے۔ بس چلے آؤ۔ میں ابھی نکل رہی ہوں' اس سے نمٹ لوں گی۔“

وہ بولا۔ ”تم تو گھڑی میں ماشہ' گھڑی میں تولہ ہوتی ہو۔ ابھی دیر سے آنے پر غصہ دکھا رہی تھیں۔ افسر صاحب نے بھابی کہا تو خوش ہو گئیں۔ ٹھیک ہے۔ میں انہیں لاہور تک چھوڑ کر آؤں گا۔ اوکے۔ آئی لو یو۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ جمشید نے کہا۔ ”میں نے تھوڑی سی بات کی اور اندازہ لگا لیا کہ بھابی دل کی بہت اچھی ہیں اور آپ سے بہت محبت کرتی ہیں۔“

”آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ بیگم صاحبہ کو خوش رکھنے کے لیے آپ جیسا گواہ پیش کیا ہے ورنہ وہ یہی سمجھتی رہتیں کہ کسی کے ساتھ عیش کر رہا ہوں۔“

جمشید نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بیویوں کا اعتماد حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگرچہ

میں کنوارا ہوں پھر بھی دوسروں کو دیکھ کر یہی سمجھا ہے۔"

مراد کسی حد تک مطمئن ہوگیا تھا کہ تابانی اسی راستے پر آنے والی ہے۔ اب وہ کسی بُرے وقت پر جمشید سے نمٹ لے گا۔ بے شک تابانی جان پر کھیل جاتی لیکن مراد پر آنچ نہ آنے دیتی۔ ویسے یہ کون جانتا ہے کہ مقدر میں کیا لکھا ہے اور کیا ہونے والا ہے؟

اکثر سفر کے دوران میں توقع کے خلاف رکاوٹ آجاتی ہے ایسی صورت میں حادثے پیش آتے ہیں۔ اچانک ہی ایک کتا سامنے سے بھاگتا ہوا سڑک پار کر رہا تھا۔ مراد نے فوراً بریک لگایا۔ کتا چیختا ہوا بھاگ گیا لیکن گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے مراد اور جمشید ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ مراد کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ کار رک گئی تھی۔ مراد اپنا بازو تھام کر تکلیف برداشت کر رہا ہے۔ جمشید نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

اس نے مراد کے بازو کو ہاتھ لگایا۔ وہ جلدی سے دور ہٹ کر بولا۔ "نہیں۔ کوئی بات نہیں ہے۔ میرا بازو زخمی ہے۔ پوری طرح زخم نہیں بھرا ہے۔"

وہ کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھانے لگا۔ جمشید نے کہا۔

"آپ میری جگہ آجائیں۔ میں ڈرائیو کر سکتا ہوں۔"

"نہیں اب میں ٹھیک ہوں بس ذرا دیر کی تکلیف تھی۔ اب آسانی سے ڈرائیو کر سکتا ہوں۔"

"تکلیف ہمیشہ حوصلے سے برداشت کی جاتی ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا کہ زخم بھر رہا ہے۔ ایسی حالت میں بے پروائی مناسب نہیں ہے۔ لاہور پہنچتے ہی ہم کسی ڈے اینڈ نائٹ اسپتال میں جائیں گے۔ ہلکی سی چوٹ بھی لگے تو نئے سرے سے مرہم پٹی کرانا چاہیے۔"

"آپ اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر میرے لیے وقت ضائع نہ کریں۔ میں خود جاکر مرہم پٹی کرالوں گا۔"

"رات کے وقت شوہر کی ڈیوٹی بیوی کے پاس ہوتی ہے۔ آپ میری خاطر ڈیوٹی چھوڑ کر اتنی دور جا رہے ہیں۔ کیا میں آپ کی خاطر اپنی ڈیوٹی نہیں چھوڑ سکتا؟"

ایک دوراہے پر اس نے کہا۔ "یہ آپ کدھر جا رہے ہیں؟"

مراد نے کہا۔ "یہی تو راستہ لاہور کا راستہ ہے۔"

"آپ ادھر سے جائیں گے تو گرین ٹاؤن اور ٹاؤن شپ سے گزریں گے۔ اپنی کار روکیں۔"

مراد نے کار روک کر پوچھا۔ "کیا آپ اس دوسرے راستے سے جانا چاہتے ہیں؟"

"ہاں ادھر سے ہم ملتان روڈ سے ہوکر مال روڈ پہنچیں گے۔ وہاں میرا دفتر ہے۔"

مراد پس و پیش میں رہ کر سوچنے لگا۔ جمشید کے بتائے ہوئے راستے پر جاؤں گا تو اس راستے سے آنے والی تابانی مجھے ڈھونڈتی رہ جائے گی۔ وہ بولا "میں آپ کو بعد میں مال روڈ لے جاؤں گا۔ اس راستے پر ایک ڈے اینڈ نائٹ اسپتال ہے۔"

جمشید نے کہا "میں جدھر لے جا رہا ہوں، وہاں بھی اسپتال ہیں۔ اب تو تم بیگم صاحبہ کو چھوڑ کر آگئے ہو۔ میرے مہمان رہوگے۔ میں میزبان ہوں۔ میرے بتائے ہوئے راستے پر چلو۔"

وہ مجبور ہوکر کار اسٹارٹ کرکے ایک یوٹرن دے کر جمشید کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگا۔ جمشید نے کہا۔ "آپ کے بازو کے زخم سے مجھے ایک قیدی یاد آرہا ہے۔ میں اسے گرفتار کرکے سزائے موت تک پہنچانے والا تھا لیکن دردانہ بیگم نے اپنے اختیارات استعمال کرکے جیل سے رہا کرا دیا تھا۔ اس قیدی سے جاسوسی کرانے کے لیے اس کے بازو کو ذرا سا چیر کر وہاں ایک ننھا سا جاسوس آلہ رکھ کر بازو کے زخم کی سلائی کرا دی تھی۔ معلوم ہوتا ہے اس بے چارے کے بازو کا زخم ابھی تک نہیں بھرا ہے۔"

مراد محسوس کر رہا تھا کہ وہ اسی کی بات کر رہا ہے۔ چور اپنے اندر چور کی طرح سہما رہتا ہے۔ وہ بھی ایسا ہی سہما ہوا تھا۔ بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ جمشید اسے پہچان رہا ہے۔ جمشید نے کہا۔ "عجیب اتفاق ہے۔ اس کا بھی زخم نہیں بھرا۔ آپ کا زخم بھی نہیں بھرا۔ اس کی بیوی نے بھی پنڈی جیل سے اسے لاہور لے جاتے وقت راستہ بدل دیا تھا۔ آپ کی شریکِ حیات بھی راستہ بدل کر آپ کو لاہور پہنچا رہی ہیں۔ بعض اوقات زندگی کے حالات اور کردار بالکل ایک جیسے لگتے ہیں۔"

مراد نے چور نظروں سے جمشید کی کمر کی پیٹی کو دیکھا۔ اس کے ہولسٹر میں ریوالور رکھا ہوا تھا۔ اب یہ امید نہیں رہی تھی کہ اس دوسرے راستے پر تابانی آئے گی اور کسی طرح چالاکی سے جمشید سے نجات دلائے گی۔ اب تو جو کرنا تھا، خود ہی کر گزرنا تھا۔

اس نے اچانک ہی بریک لگایا۔ کار ایک جھٹکے سے رکی تو جمشید سامنے ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ انہی لمحات میں مراد نے اس کے ہولسٹر سے ریوالور کو نکال لیا۔ جمشید کے چہرے پر ٹکرانے کے باعث چوٹ لگی تھی۔ وہ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "پہلے راستے میں کتا آگیا تھا۔ اب کیا مصیبت آگئی ہے؟"

ایسا کہتے ہوئے اس نے مراد کے ہاتھ میں ریوالور دیکھا۔ مراد نے کہا۔ "خبردار! ذرا

دور ہو کر بیٹھو۔ کوئی چالاکی دکھاؤ گے تو گولی چلادوں گا۔"

جمشید نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "میں تو آہستہ آہستہ گرہ کھول رہا تھا۔ تم ایک دم سے کھل گئے؟ اب پوری طرح سمجھ میں آگیا۔ ابھی جس راستے سے لاہور جارہے تھے' اس راستے سے تابانی خاص بندوں کے ساتھ آکر تمہیں مجھ سے نجات دلانے والی تھی۔"

وہ سفاکی سے بولا۔ "کار سے باہر جاؤ۔ میں کار کے اندر لہو کے دھبے نہیں چاہتا۔"

"میں کار سے باہر جاؤں گا۔ تم فائر کروگے۔ میں مرجاؤں گا لیکن مرنے والے کے ایک سوال کا جواب دے دو۔ اتنی دور ہالا پنڈ کیوں گئے تھے؟ یقین کرو' مجھے مارنا بہت مشکل ہے۔ جواب نہیں دو گے تو مشکل میں پڑجاؤ گے۔"

مراد کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ وہ بولا۔ "بڑے جی دار ہو۔ موت کے سامنے مجھے دھمکی دے رہے ہو۔ چلو مرتے مرتے سن لو۔ ہالا پنڈ کے زمیں دار کی حویلی میں دردانہ بیگم کی پارٹی سے الگ ہونے والے سیاست داں چھپے ہوئے تھے۔ میں نے ڈبل گیم کھیلا۔ تابانی کو یقین دلایا کہ ان چاروں کو موت کے گھاٹ اتاردوں گا۔ دوسری طرف دردانہ بیگم کو بتادیا کہ وہ چاروں ہالا پنڈ میں ہیں۔ اس کے خاص بندے ان چاروں کو اغوا کرکے دردانہ بیگم کے پاس لے جانے والے تھے۔ اس سے پہلے نیک بخت نے ان چاروں کو وہاں سے اٹھوالیا۔"

"تم تابانی کو دھوکا کیوں دے رہے تھے؟"

"وہ مسلمان ہوگئی ہے۔ اسے محبِ وطن کہلانے کا خبط ہوگیا ہے۔ میں نے اسے محبت سے سمجھایا لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ ہونے والی اولاد دہشت گرد والدین کا نام لیتے ہوئے شرمائے۔ وہ بھول گئی ہے کہ ہم بڑی طاقتوں کا مہرہ بننے کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور دوسروں کو مارتے مارتے خود ایک دن کسی کے ہاتھوں مرجائیں گے۔"

جمشید نے کہا۔ "آنٹی آمنہ نے کہا تھا کہ تابانی پاکستان کی بقا اور بھلائی کے لیے کام کررہی ہے۔ آج تمہارے منہ سے سن کر پختہ یقین ہوگیا کہ آنٹی نے درست کہا تھا۔ میں تابانی کے مزاج کی تبدیلی سے خوش ہوں مگر یہ دیکھ کر دکھ ہو رہا ہے کہ تم اپنی چاہنے والی کو اور اپنے ہونے والے بچے کی ماں کو دھوکا دے رہے ہو۔"

"میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ ہماری سلامتی دردانہ بیگم کے سائے میں ہے ورنہ یہاں تم پولیس والے اور وہاں "را" کے کتے ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ تم کار سے باہر نہیں جاؤ گے اس لیے میں ہی بھیج دیتا ہوں۔"

یہ کہتے ہی اس نے تیزی سے دوبار ٹریگر کو دبایا۔ کھٹ کھٹ کی آواز ہو کر رہ گئی۔ جمشید نے کہا۔ "ہمارے ڈپارٹمنٹ میں ہتھیار دیتے وقت سمجھایا جاتا ہے کہ اسے لوڈ کرکے نہ رکھیں۔ کبھی یار دوست یا بیوی بچے اسے غلطی سے چلاسکتے ہیں یا مجرم اسے چھین سکتے ہیں۔ ہم صرف مجرموں کا تعاقب کرتے وقت اسے لوڈ کرتے ہیں۔ کم آن۔ یہ کھلونا واپس کردو۔"

مراد اس کی باتوں کے دوران میں فرار کا طریقہ سوچ رہا تھا۔ اس نے اچانک خالی ریوالور کھینچ کر پتھر کی طرح اس کے منہ پر مارا پھر بڑی پھرتی سے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر بھاگنے لگا۔ اس نے دوڑتے دوڑتے سرگھما کر پیچھے دیکھا۔ کار وہیں کھڑی تھی۔ جمشید کی طرف کا دروازہ کھلا ہوا نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ کار میں ہی بیٹھا ہوا ہے۔ شاید ریوالور بڑی زور سے منہ پر پڑا ہوگا اور وہ تکلیف سے وہیں بیٹھا رہ گیا ہوگا۔

مراد اس سچویشن سے فائدہ اٹھا کر بھاگتا چلاگیا۔ جمشید کو یقیناً منہ پر چوٹ لگی تھی لیکن وہ کچھ بھی نہ تھی۔ ٹریننگ کے دوران میں اس سے بھی زیادہ بری بے دردی سے مار کھانی پڑتی ہے۔

وہ مراد کا تعاقب کرنے کے لیے کار سے نکلنا چاہتا تھا۔ اسی وقت فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ مراد اپنا موبائل فون اپنی سیٹ پر چھوڑ کر فرار ہورہا تھا۔ اس نے موبائل کو اٹھا کر آن کیا پھر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے تابانی کی آواز آرہی تھی۔ "ہیلو مراد!؟"

"میں نہ تو مراد ہوں اور نہ ہی نامراد۔ میں جمشید بول رہا ہوں۔ جس راستے پر تم گاڑی ڈرائیو کررہی ہو' وہاں بھی' وہ نظر نہیں آئے گا۔"

وہ جیسے غرا کر بولی۔ "جمشید! اگر تم نے میرے مراد کو ذرا سا بھی نقصان پہنچایا ہوگا تو میں..........."

"تو میں تمہارے ہاتھوں جنت میں پہنچ جاؤں گا۔ ویسے ابھی جنت میں جانے کی جلدی نہیں ہے۔ تمہارا مراد صحیح سلامت ہے۔ آئندہ بھی اسے صحیح سلامت دیکھنا چاہتی ہو تو اپنی گاڑی اس سڑک پر موڑلو' جو آگے جاکر ملتان روڈ سے ملتی ہے۔"

"مراد کہاں ہے؟ اس سے میری بات کراؤ۔"

"وہ اپنی کار کے اندر اسٹیئرنگ کے ساتھ ہتھکڑی سے بندھا بیٹھا ہے۔ جب تم اس سڑک پر آؤ گی تو آگے دور جاکر تمہیں اس کی کار نظر آئے گی۔ وہیں ہماری ملاقات ہوجائے گی۔"

"مجھے نادان سمجھ کر میرے لیے جال بچھا رہے ہو۔"

"تم لیڈی سرجن آمنہ کو امی کہتی ہو۔ میں آنٹی کہتا ہوں۔ تم تھوڑی دیر کے لیے مجھ سے رابطہ ختم کرو اور آنٹی سے پوچھو، تمہیں مجھ پر بھروسا کرنا چاہیے یا نہیں؟"

"ٹھیک ہے۔ میں تھوڑی دیر بعد تم سے رابطہ کروں گی۔ وہیں انتظار کرو۔"

جمشید نے فون بند کردیا۔ اپنے ریوالور کو لوڈ کیا پھر کار سے باہر نکل کر ٹہلنے کے انداز میں چلتا ہوا، سڑک کو چھوڑ کر کھیتوں کے پاس ایک درخت کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ وہاں سے کار اور سڑک دور تک نظر آرہی تھی۔ وہ انتظار کرنے لگا۔ اندھیرے میں ریڈیم ڈائل گھڑی میں وقت دیکھنے لگا۔

پھر موبائل فون نے اسے، تابانی کی آواز میں مخاطب کیا۔ "ہیلو جمشید؟"

"ہاں۔ جمشید بول رہا ہوں۔ آنٹی نے کیا کہا ہے؟"

"انہوں نے کہا ہے، جاؤ اور موت کے فرشتے پر بھروسا کرو۔ وہ زندگی دینے کے لیے بلا رہا ہے۔ میں آرہی ہوں۔"

"ایک منٹ۔ جب تم نے بھروسا کرلیا ہے تو صاف کہتا ہوں مراد میری حراست میں نہیں ہے۔ وہ بھاگ گیا ہے بلکہ میں نے بھاگنے کا موقع دیا ہے۔ میں خالی کار کے پاس کھڑا ہوا ہوں۔"

"تم جو بھی کر رہے ہو یا کرنے والے ہو، مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ میں امی کے حکم پر آرہی ہوں۔"

فون بند ہوگیا۔ جمشید آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس کار کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ ریوالور ہولسٹر میں رکھ لیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک گاڑی کار کے پیچھے آکر رکی۔ تابانی دروازہ کھول کر باہر آئی پھر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر بولی۔ "مجھے چیک کرسکتے ہو۔ میرا اسلحہ گاڑی کے اندر ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم سے تنہائی میں ملنا چاہتا تھا۔ آج مراد کی وجہ سے ملاقات ہوگئی۔ کیا تمہیں پتا ہے کہ مراد تمہارے اعتماد کو دھوکا دے رہا ہے۔ وہ تمہارے کہنے کے مطابق ان چاروں کو ہلاک کرنے گیا تھا لیکن اس کی اطلاع دردانہ بیگم کو دے دی تھی۔ اس کے بیان کے مطابق دردانہ کے آدمیوں سے پہلے نیک بخت کے آدمی ان چاروں کو بالا پنڈ سے کہیں لے گئے ہیں۔"

وہ بولی۔ "مجھے مراد پر شبہ تھا۔ انکل ہاشم نے مجھے فون پر بتایا کہ دردانہ کو ان چاروں کا پتا معلوم ہوگیا ہے۔ میرے اور انکل ہاشم کے بعد صرف مراد کو ان کا پتا معلوم

تھا۔ للذا یقین ہوگیا کہ مراد قابلِ اعتماد نہیں ہے۔"

"نیک بخت کو ان چاروں کا پتا کیسے معلوم ہوا؟"

"اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں ہے۔ ہم نے نیک بخت، کو اپنے تعاون کا یقین دلا کر مراد اور دردانہ کو یہ شاک دیا ہے کہ اس کی پارٹی کے چار سیاست داں نیک بخت کے شکنجے میں آگئے ہیں۔"

"تم سب کی سیاسی چالیں اپنی جگہ ہیں لیکن ان چار سیاست دانوں کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

تابانی نے پوچھا۔ "تم قانون کے محافظ ہوکر ایسا کہہ رہے ہو۔ مجرموں کے خلاف تمہاری سنگ دلی مشہور ہے۔"

"وہ چاروں سیاست داں بھی مجرم ہیں۔ انہیں جھولی بھر بھر کے دولت ملتی.......... رہے تو وہ اس ملک کو بیچ دیں گے اور آہستہ آہستہ بیچ ہی رہے ہیں۔ میں قانون کے مطابق انہیں حراست میں لے کر عدالت میں پہنچاؤں گا تو وہ اپنے وسیع ذرائع استعمال کر کے پھر اسمبلیوں میں پہنچ جائیں گے۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر تابانی کی طرف سے منہ پھیر کر بولا۔

"مجھے بہت دیر بعد یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ ہر آنے والا حکمران ہمیں اپنے مطلب کے استعمال کے لئے یہ وردی پہناتا ہے۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ "میرے ابو تعلیم یافتہ ہیں لیکن اپنی دیانت داری کے باعث وہ چالیس برسوں سے اب تک ایک سب انسپکٹر ہیں۔ اگر ہر نئے حکمران کے اشاروں پر چلتے تو آج انسپکٹر جنرل آف پولیس یا پولیس کمشنر ہوتے۔ میری آنکھیں تب کھلیں جب حمزہ بھائی لاپتہ ہوگئے۔ میں نے اوپر تک درخواستیں بھیجیں کہ امیر حمزہ کی گمشدگی کا کیس مجھے دیا جائے لیکن وہ جانتے تھے کہ میں اپنے بھائی کو تلاش کرتے کرتے اصل دشمنوں کی شہ رگ تک پہنچ جاؤں گا۔ اس لئے مجھے یہ کیس نہیں دیا گیا۔ یہاں عجیب تماشے ہوتے ہیں۔ ایک حکمران کے دور میں مراد جیسے مجرموں کو سزائے موت کا حکم سنایا جاتا ہے۔ دوسرے حکمران کا دور شروع ہوتے ہی ان سزائے موت پانے والوں کو رہا کردیا جاتا ہے۔ آنٹی نے مجھے سمجھایا تھا کہ تم اور گارڈ فادر ہاشم پاکستان کی بقا کے لئے جہاد کر رہے ہو۔ مجھے تم دونوں پر اعتماد کرنا چاہیے۔ مراد پر بعد میں رفتہ رفتہ اعتماد کیا جاسکے گا۔"

وہ بولی۔ "اس سے زیادہ میری بدقسمتی کیا ہوگی کہ وہ ہمارے اعتماد کو دھوکا دے رہا

ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے' وہ ابھی بھاگتا ہوا کہاں گیا ہوگا؟"

"وہ ہماری خفیہ رہائش گاہ میں گیا ہوگا۔"

"وہاں گیا ہوگا تو تم سے ملاقات ہوجائے گی پھر اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرو لیکن میں فرار ہونے والے مجرموں کی نفسیات کو سمجھتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں ابھی میرے ساتھ چلو' پہلے معلوم کرو' کیا وہ ایم این اے اکرام شاہ کے پاس گیا ہے؟"

وہ چونک کر بولی۔ "جمشید! تم واقعی مجرموں کی نفسیات کو سمجھتے ہو۔ وہ اکرام شاہ کے پاس جاسکتا ہے۔"

وہ دونوں پچھلی گاڑی میں آکر بیٹھ گے۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے وہ بولی۔ "اوہ میں تو بھول ہی گئی۔ اس اگلی کار کے نیچے ایک خفیہ خانے میں ریموٹ کنٹرول بم اور ٹائم بم رکھے ہوئے ہیں اور رائفل بھی ہے۔ اس کا ایک ریموٹ کنٹرول مراد کے پاس ہے اور ایک میرے پاس ہے اس گاڑی کو ایسے ہی نہیں چھوڑا جاسکتا۔"

"ہوں۔ ایسا کرو تمہارے پاس ریموٹ کنٹرول ہے۔ تم کار کو ڈرائیو کرو۔ میں اس گاڑی کو ڈرائیو کروں گا۔ فون کے ذریعے اپنے ماتحت سے کہوں گا وہ ہم سے پہلے اکرام شاہ کی کوٹھی کے قریب جائے۔ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ ابھی ایک گھنٹے کے اندر اس کوٹھی میں کوئی شخص آیا یا نہیں۔ میرا ماتحت مراد کو چہرے سے پہچانتا ہے لیکن وہ عارضی میک اپ میں ہے۔"

وہ ان دو گاڑیوں کو ڈرائیو کرتے ہوئے جانے لگے۔ تابانی نے فون پر ہاشم کو موجودہ تمام حالات بتائے پھر کہا۔

"اپنے دوچار آدمی اس کوٹھی میں بھیجیں۔ وہ میرا اشارہ پاتے ہی اکرام شاہ کو قتل کرنے کے لئے دوڑیں لیکن قتل نہ کریں۔"

جمشید نے مجرموں کی نفسیات کے بارے میں درست کہا تھا کہ ایک مجرم فرار ہونے کے بعد اپنے ہی کسی دوست مجرم کے پاس جاتا ہے۔ اس نے کوٹھی کے گیٹ کے پاس ہانپتے ہوئے پہنچ کر گارڈ سے کہا۔ "انکل اکرام شاہ سے بات کراؤ۔"

گارڈ اسے جانتا تھا۔ اس نے کیبن میں آکر فون کیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ گھنٹی بج رہی تھی۔ اکرام شاہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے ناگواری سے ریسیور اٹھا کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"سر! میں سیکورٹی گارڈ ہوں۔ مراد صاحب آپ سے ابھی بات کرنا چاہتے ہیں؟"

"کون مراد؟"

"وہی جو پہلے آپ کے مہمان تھے۔"

"اوگاڈ! اتنی رات کو وہ کیوں آیا ہے؟ اسے ریسیور دو۔"

مراد نے ریسیور لے کر کہا۔ "انکل! گارڈ سے گیٹ کھولنے کا کہیں' مجھے اندر بلائیں۔"

"آخر بات کیا ہے؟ اتنی رات کو کیوں آئے ہو؟"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "دعوت کھانے نہیں آیا ہوں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ میں ابھی دردانہ بیگم کے ذاتی فون پر ان سے باتیں کرسکتا ہوں لیکن میں انہیں نیند سے جگانا نہیں چاہتا۔"

"اچھا اچھا۔ ریسیور گارڈ کو دو۔"

گارڈ نے ریسیور لیا' ادھر کی بات سنی پھر گیٹ کھول دیا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا احاطے سے گزر کر کوٹھی کے بیرونی دروازے پر آیا۔ اس دروازے کو بھی کھول دیا گیا۔ دوسرے گارڈ نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ تھوڑی دیر بعد اکرام شاہ نے آکر پوچھا۔

"معاملہ کیا ہے؟"

"میں یقین کی حد تک شبہ کر رہا ہوں کہ تابانی کو مجھ پر شک ہوگیا ہے۔ جمشید میرے پیچھے پڑگیا ہے۔ میں اسے دھوکا دے کر بڑی مشکل سے اپنی جان بچاکر آیا ہوں۔"

"تم نے جمشید کو اپنے پیچھے لگایا اور وہ مصیبت میرے گلے ڈالنے یہاں چلے آئے؟"

"اور کہاں جاتا؟ میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ اسے اپنے پیچھے لگا کر یہاں تک لے آتا۔ وہ میری تلاش میں بھٹک رہا ہوگا۔"

"کیا وہ اپنی عقل سے سوچ نہیں سکتا کہ تم یہاں پناہ لینے آؤگے؟"

"وہ یہ سمجھے گا کہ میں تابانی کے پاس گیا ہوں اور اس کے فرشتے بھی نہیں جانتے کہ تابانی کہاں ہے؟"

"کہاں ہے؟"

"یہی تو میں آپ سے پوچھنے آیا ہوں کہ آپ دردانہ بیگم کی نظروں میں اونچا مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں یا نہیں؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟"

"تو پھر ابھی چلیں۔ وہ مجھے تلاش کرنے کے بعد گھر پہنچ کر میرا انتظار کر رہی ہوگی۔"

آپ چند زبردست بندوں کو لے کر چلیں پھر اسے اٹھا کر دردانہ بیگم کے پاس پہنچا دیں۔ اس سے اگلوایا جاسکتا ہے کہ فرمان کہاں چھپا ہوا ہے۔"

اکرام شاہ فوراً اٹھ کر مراد کے پاس صوفے پر بیٹھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "ارے تم دردانہ بیگم کی بات کر رہے ہو؟ تابانی گرفت میں آئے گی اور فرمان کا سراغ ملے گا تو خفیہ ہاتھ کی آشیرباد مجھے ملے گی۔"

اکرام شاہ نے فوراً ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے پھر رابطہ ہونے پر اپنے خاص ماتحت سے کہا کہ آدھے گھنٹے کے اندر چھ تگڑے بندوں کو ساتھ لے آئے۔ ایک خطرناک عورت کو قابو میں کرنا ہے۔ اسے بوری میں بند کر کے اپنے ٹارچر سیل میں پہنچانا ہے۔

مراد نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "آپ اسے اپنے ٹارچر سیل میں کیوں لے جائیں گے؟"

"تابانی اور فرمان کی گرفتاری کا سہرا میں اپنے سر باندھنا چاہتا ہوں۔"

"آپ جو چاہیں کریں لیکن میری تابانی کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ وہ ماں بننے والی ہے۔"

"تم میرے ہو اور تابانی تمہاری ہے۔ یہ خیال دل سے نکال دو کہ میں اسے اور تمہارے ہونے والے بچے کو نقصان پہنچاؤں گا۔"

اس کوٹھی کے باہر دور مال روڈ کے فٹ پاتھ پر جمشید نے اور تابانی نے اپنی اپنی گاڑی روکی۔ ایک شخص فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے جمشید سے کہا۔ "سر! میں آدھ گھنٹا پہلے یہاں پہنچا تو ایک شخص اکرام شاہ کے سیکورٹی گارڈ سے باتیں کر رہا تھا پھر اس کے ساتھ کیبن میں گیا۔ اس کے بعد وہ شخص کوٹھی کے اندر چلا گیا۔"

وہ اپنی ڈیوٹی کے مطابق رپورٹ دے رہا تھا۔ ایسے وقت ایک جیپ میں سات عدد ہٹے کٹے افراد آئے۔ وہ جیپ اکرام شاہ کی کوٹھی کے سامنے رک گئی۔ ایک شخص گارڈ کے ساتھ کیبن میں گیا۔ جمشید نے تابانی سے کہا۔ "ہم اپنی گاڑیاں اس گلی میں لے جائیں۔ اس طرح ہم ان سے چھپے رہیں گے۔"

وہ اپنی گاڑیاں ریورس گیئر میں چلاتے ہوئے ایک گلی میں آگئے۔ پھر گاڑیوں سے اتر کر اکرام شاہ کی کوٹھی کی طرف دیکھنے لگے۔ تابانی نے کہا۔ "پہلے ایک شخص اس کوٹھی میں گیا۔ اس کا حلیہ کیا تھا۔ کیا تمہیں اس کا لباس وغیرہ کچھ نظر آیا تھا؟"

جمشید کے ماتحت نے کہا۔ "اس وقت میں اکرام شاہ کی کوٹھی کے قریب تھا وہاں کیبن کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ پہلے جو شخص آیا وہ ایک عام سا قد آور اور صحت مند تھا مگر

اس کی آستین میں بازو کی طرف خون کا دھبا تھا۔"

جمشید نے کہا۔ "وہ مراد ہی ہے۔ ابھی اس نے اکرام شاہ سے مل کر کوئی پلاننگ کی ہے اور اس پلاننگ پر عمل کرنے کے لئے ان حواریوں کو بلایا ہے۔"

پندرہ منٹ کے بعد ہی وہ ساتوں غنڈے نکل کر جیپ میں آکر بیٹھ گئے۔ کوٹھی کے احاطے سے ایک کار نکلی۔ اس میں مراد اور اکرام شاہ تھے۔ اکرام شاہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے ایک سمت جانے لگا۔ جیپ بھی اس کے پیچھے جانے لگی۔ تابانی، جمشید اور اس کا ماتحت اپنی گاڑیوں میں آگئے۔ ماتحت جمشید کے ساتھ تھا۔ تابانی اپنی کار ڈرائیو کرنے لگی۔ وہ جمشید سے بھی دور دور تھی۔ تاکہ مراد عقب نما آئینے میں دیکھ کر اپنی کار کو نہ پہچان لے۔

مراد انہیں مال روڈ سے گلبرگ اور پھر ماڈل ٹاؤن کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ اکرام شاہ کو ٹاؤن شپ کی سمت لے جا رہا ہے۔ وہ موبائل فون کے ذریعے جمشید سے بولی۔ "مراد انہیں میری خفیہ رہائش گاہ کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں راستہ بدل کر تم سے الگ ہو رہی ہوں۔ اگر راستے میں مراد کی یہ کار کہیں کھڑی ہوئی نظر آئے تو اس سے دور رہنا۔ وہ ریموٹ کنٹرول کے ذریعے اس کار میں دھماکا کر کے تمہیں ہلاک کر سکتا ہے۔"

اس نے رابطہ ختم کر کے تیز رفتاری سے کار چلاتے ہوئے شارٹ کٹ راستوں پر چلتے ہوئے اپنی رہائش گاہ سے دور ایک کھلے میدان کے پاس اپنی کار روک دی۔ کار سے اتر کر تیزی سے چلتی ہوئی ایک ایسے مکان کی آڑ میں آگئی جو ابھی تعمیر ہو رہا تھا اور جس کی نصف دیواریں ابھی اٹھائی گئی تھیں۔

اس نے جہاں کار کھڑی کی تھی، وہی ایک راستہ اس کی رہائش گاہ کی طرف جاتا تھا۔ اس نے کار سے اترنے کے بعد اس کے نچلے حصے سے دو ریموٹ کنٹرول بم نکال کر دونوں کو پہیوں کے اوپر رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی دور سے اکرام شاہ کی کار اور اس کے حواریوں کی جیپ آتی دکھائی دی۔

مراد نے کار کی ہیڈلائٹس میں اپنی کار کو دیکھ کر کہا۔

"انکل! کار روکیں۔ وہ سامنے میری کار کھڑی ہے؟"

اکرام شاہ نے پوچھا۔ "تمہاری کار یہاں کیسے کھڑی ہے؟"

"جمشید یہ کار لے کر میری تلاش میں ادھر سے گزرا ہو گا۔"

ایسا تو نہیں ہے کہ وہ ہمیں ٹریپ کرنے کی کوئی چال چل رہا ہو؟"

"اسے کیا معلوم کہ میں تابانی کے ساتھ ٹاؤن شپ میں رہتا ہوں؟ میری اور آپ کی پلاننگ اس کے فرشتے بھی نہیں جانتے کہ ہم ابھی تابانی کو اس مکان سے اٹھانے جارہے ہیں۔"

اکرام شاہ نے قائل ہو کر کہا۔ "ہاں۔ ہماری پلاننگ کوئی نہیں جانتا۔ تمہاری وہ کار کسی خرابی کی وجہ سے وہاں رک گئی۔ جمشید کسی دوسری گاڑی والے سے لفٹ لے کر گیا ہے۔"

اس نے دو حواریوں سے کہا۔ "وہاں جاکر دیکھو کار کیوں کھڑی ہے؟"

وہ دونوں آگے بڑھ کر کار کے دونوں طرف جاکر دیکھنے لگے۔ تمام کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور تمام دروازے لاکڈ تھے۔ ایک حواری نے آکر کہا۔ "گاڑی لاکڈ ہے اور اندر ایک سیٹ پر لیڈیز پرس رکھا ہوا ہے۔"

مراد اور اکرام شاہ اپنی کار سے اتر کر ادھر جانے لگے۔ مراد نے کہا۔ "اس کار کی چابی میری پاس ہے۔ یہ بات ہمارے فیور میں ہے اگر اس میں پٹرول نہیں ہے تو میں آپ کی گاڑی سے پٹرول لے کر اس میں تنہا جاؤں گا۔ آپ مجھ سے پیچھے رہ کر ان آدمیوں کے ساتھ آئیں۔"

وہ کار کے قریب آکر اس کا دروازہ کھولنے کے لئے جیب سے چابی نکالنے لگا۔ تابانی مشکل میں پڑگئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مراد اس کار کے پاس رہے۔ اس نے ایک ہاتھ میں ریوالور لیا۔ دوسرے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول۔ پھر نشانہ لے کر ایک فائر کیا۔ گولی اکرام شاہ کے پیر میں لگی۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ وہ کار سے لگ کر زمین پر گرنے لگا۔

ایک فائر کی آواز کے ساتھ ہی مراد اور دوسرے حواری کہیں چھپنے اور جوابی فائرنگ کرنے کے لئے بھاگنے لگے۔ مراد جیسے ہی اس کار سے دور ہوا۔ تابانی نے ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا دیا۔ ایک دل ہلا دینے والا دھماکا ہوا۔ مراد دور چھلانگ لگا کر زمین پر اوندھے منہ گرا۔ پھر اٹھ کر بھاگنے لگا۔ پھر ایک زبردست دھماکا ہوا۔ مراد پھر چھلانگ لگا کر ایک دیوار کے کنارے آکر اوندھے منہ زمین پر گرا۔ اسی وقت تیسرا دھماکا بھی ہوا۔ کار کے نیچے چور خانے میں جتنے بم رکھے ہوئے تھے' وہ سب بلاسٹ ہوتے جارہے تھے۔ آگ کے شعلے آسمان کی طرف لپک رہے تھے۔ دور مکانوں سے عورتوں اور مردوں کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ تمام بموں کے بلاسٹ ہونے کے بعد کار کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے فضا کی بلندی تک جاکر پھر واپس آکر دور دور تک گر رہے تھے۔

جب کار کے پرخچے اور اکرام شاہ کے چیتھڑے اُڑگئے تو خاموشی چھاگئی۔ مراد منہ اوندھا کئے دیوار کے قریب زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ جب اس نے ایک ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا تو تابانی ریوالور اور ریموٹ کنٹرول کو پھینک کر بولی۔ "تمہیں بچانے کے لئے اکرام شاہ کے پیر پر گولی مارنی پڑی تاکہ تم دوسری ان دیکھی فائرنگ سے بچنے کے لئے وہاں سے بھاگ سکو اور اکرام شاہ بھاگنے کے قابل نہ رہے۔ وہ تو گیا۔ تم خود کو ٹٹول کر دیکھو زندہ بھی ہو یا نہیں؟"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے لباس سے مٹی جھاڑتے ہوئے بولا۔ "تم نے تو کمال کر دیا۔ وہ اکرام شاہ مجھے گن پوائنٹ پر مجبور کر رہا تھا کہ میں اسے تمہاری خفیہ پناہ گاہ میں لے چلوں۔ میں تمام راستے تدبیر سوچتا آرہا تھا کہ کس طرح اس کے حواریوں سے نجات حاصل کروں۔ تم نے صحیح وقت پر پہنچ کر اسے ہماری رہائش گاہ تک پہنچنے نہیں دیا۔"

تابانی اسے خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بولا۔ "ہمیں فوراً یہاں سے بھاگنا چاہیے۔ پولیس پارٹی آتی ہوگی۔"

وہ ریوالور کو چیمبر کی طرف سے کھولتی ہوئی گننے لگی۔ ایک دو تین چار پانچ۔ صرف ایک کام آئی۔ ابھی پانچ ہیں۔"

مراد نے اسے غور سے دیکھا۔ نیم تاریکی میں اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ حیرانی سے بولا۔ "تم رو رہی ہو؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ اپنی آستینوں سے آنسو پونچھنے لگی۔ اس زیر تعمیر مکان کے دوسری طرف سے جمشید کی آواز سنائی دی۔ وہ اونچی آواز میں پوچھ رہا تھا۔ "آپی! آپ کہاں ہیں۔ میں آپ کا نام نہیں لے سکتا۔"

تابانی نے اونچی آواز میں کہا۔ "میں یہاں ہوں۔ اس مکان کے پچھلی طرف سے چلے آؤ۔"

مراد نے گھبرا کر پوچھا۔۔ "یہ تو جمشید کی آواز ہے۔ تم اس کے ساتھ آئی ہو؟"

وہ خاموش رہی۔ اس نے اب تک مراد کی کسی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ جمشید اپنے ماتحت کے ساتھ دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے ایک نظر مراد پر ڈالی پھر تابانی سے بولا۔ "فوراً یہاں سے چلو ورنہ دوسری پولیس پارٹی آئے گی تو میں تمہاری حمایت میں کچھ نہیں کرسکوں گا۔ کم آن۔"

وہ سب دوڑتے ہوئے اس دوسری گاڑی میں آئے جسے جمشید ڈرائیو کر رہا تھا اور اس سے پہلے تابانی اسے ڈرائیو کرتے ہوئے جمشید کے پاس آئی تھی۔ اب ماتحت اسے

ڈرائیو کر رہا تھا۔ جمشید نے کہا۔ "آج سے میں آپ کو آپی کہہ رہا ہوں اور آپ کی امی اب میری امی ہیں۔ میں انہیں آنٹی آمنہ نہیں کہوں گا۔"

تابانی اندر سے مراد کی بے وفائی سے ایسی زخمی تھی کہ منہ سے کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ اس نے جواب میں جمشید کے دونوں ہاتھوں کو محبت سے تھام لیا پھر سر جھکائے بیٹھی رہی۔

جمشید اسے اور مراد کو ٹاؤن شپ پہنچا کر اپنے ماتحت کے ساتھ چلا گیا۔ مراد سمجھ رہا تھا کہ تابانی خاموش آتش فشاں ہے۔ وہ اس کے مزاج کو برسوں سے سمجھتا آیا تھا۔ مکان کا دروازہ کھول کر وہ اندر آئی۔ ایک میز پر پانی سے بھرا ہوا شیشے کا جگ رکھا ہوا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ سے اسے اٹھا کر منہ سے لگا کر غٹاغٹ پینے لگی۔ پیتی ہی چلی گئی۔ وہ اندر سے ایسے خالی ہوگئی تھی کہ سارا سمندر بھی پی لیتی تب بھی اس کی کوکھ میں پلنے والا بچہ پوچھتا۔ "ممی! کیا میرے پاپا آپ کو رُلاتے ہیں۔ آپ مجھے دودھ پلائیں۔ جگ بھر کے آنسو کیوں پلا رہی ہیں؟"

اس نے شیشے کے خالی جگ کو دیوار پر دے مارا۔ مراد نے کہا۔ "پلیز! ایسا نہ کرو۔ اپنے اندر کا غبار مجھ پر نکالو۔"

اسی وقت فجر کی اذان سنائی دی۔ وہ سر جھکا کر آنکھیں بند کر کے اذان کو سننے لگی۔ خود کو اندر ہی اندر پُرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ مراد اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا' کس طرح اپنی محبت سے اسے قابو میں کرے۔ قابو میں تو اذان نے کیا تھا۔ ورنہ وہ شیشے کے جگ کے بعد گھر کے تمام سامان کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی۔ جن مولوی صاحب نے اسے مسلمان بنایا تھا' انہوں نے آخر میں نصیحت کی تھی' جب بھی اللہ تعالیٰ کا اسمِ مقدس سنو' پھر غصہ تو کیا دنیا کے ہر منفی جذبات کو بھول جایا کرو۔

اذان کے مکمل ہونے تک وہ سر پر آنچل رکھے' سر جھکائے اور آنکھیں بند کئے رہی۔ ابھی اس نے صرف پہلا کلمہ اور دورد شریف یاد کئے تھے۔ اس نے انہیں زیر لب پڑھ کر آنکھیں کھول کر مراد کو دیکھا پھر ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم ناراض ہو؟"

"نہیں۔ میں نے کلام پاک کی ایک آیت سنی تھی۔ اس کے معنی یہ تھے کہ کافروں سے کہا گیا تھا۔ "تمہارا دین تمہارے ساتھ اور ہمارا دین ہمارے ساتھ۔"

اس کا یہ مطلب بھی سمجھ میں آتا ہے کہ تابانی کا عمل تابانی کے ساتھ اور مراد کا عمل مراد کے ساتھ۔ باقی اللہ تعالیٰ انجام کو پہنچانے والا ہے۔

وہ بولا۔ "اللہ کا شکر ہے کہ قرآن مجید کی روشنی میں تمہیں غصہ برداشت کرنا آگیا ہے۔"

"تم پیدائشی مسلمان ہو۔ تمہیں روشنی نہیں ملی۔ مجھے مل گئی۔"

"مجھے کچھ کہنے دو۔ میں تمہاری غلط فہمیاں دور کروں گا۔"

اس نے موبائل نکال کر اسے دیا۔ وہ فون لے کر بولا۔ "کسے فون کرنا ہے؟"

"تم جب سے بالا بنڈ روانہ ہوئے' تب سے تمہارا کوئی اپنا بنا گیا اور کوئی پرایا؟ اور فون اپنوں کو کیا جاتا ہے۔ کسی اپنے کو فون کرو۔"

"صرف تم ہی میری اپنی ہو۔"

"صرف میں تمہاری ہوتی تو یہ فون نہ دیتی۔ مجھ سے باتیں بناؤ گے تو پھر میرا موڈ خراب ہو جائے گا۔"

"میرے ایک اپنے انکل اکرام شاہ تھے۔ تم انہیں سزائے موت دے چکی ہو۔ ان کے سوا پاکستان میں میرا کوئی نہیں ہے۔"

وہ اپنے ضروری سامان کا بیگ اٹھا کر دروازے تک آئی۔ پھر بولی۔ "میں تمہیں ایک اشارہ دیتی ہوں۔ اسے سمجھو اور فون پر ابھی اس سے رابطہ کرو۔ ورنہ میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔"

"اشارہ دو' میں سمجھنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ بولی۔ "میری سیاسی سوکن کے نمبر پنچ کرو۔"

وہ ایک دم سے پریشان ہوگیا۔ اس کی بات سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ نام لئے بغیر اسے بے نقاب کر رہی تھی۔ وہ قریب آتے ہوئے بولا۔ "تم پہیلی کیوں بجھوا رہی ہو؟ بھلا کون تمہاری سوکن ہوگی؟ کیا میں یہ نہیں جانتا ہوں کہ کسی عورت میں بھی دلچسپی لوں گا تو تم اسے چیر پھاڑ کر رکھ دو گی۔"

"اپنا مرد کسی بھی عورت کو کسی بھی معاملے میں اپنی بیوی سے زیادہ اہمیت دیتا ہے تو وہ عورت ایک بیوی کے لئے سوکن کہلاتی ہے۔ اس کے بعد اب کچھ نہیں بولوں گی۔ مجھے صرف تین تک گنتی آتی ہے۔ اسے گن کر چلی جاؤں گی پھر تم مجھے کبھی نہیں دیکھ سکو گے۔"

یہ کہہ کر وہ گننے لگی۔ "ایک..........."

"تابانی میری بات کا یقین کرو۔ میں.........."

اس نے گنتی کی۔ "دو.........."

"میں تمہاری محبت کی قسم کھاتا ہوں اور سچ کہتا ہوں کہ.........."

تابانی نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پیٹ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اپنے ہونے والے بچے کی قسم کھاؤ' کیا سچ بول رہے ہو؟"

اس نے سر جھکا لیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں موبائل فون تھا۔ وہ نمبر پنچ کرنے لگا۔ رابطہ ہونے کے بعد اسے کان سے لگا کر بولا۔ "ہیلو۔ میں مراد بول رہا ہوں۔"

تابانی اس کے قریب آکر فون سے کان لگا کر سننے لگی۔ دوسری طرف سے دردانہ نے کہا۔ "تم نے اتنی صبح فون کیا ہے خیریت تو ہے؟"

"جی نہیں۔ میرے انکل' آپ کے ایم این اے اکرام شاہ کو ایک کار دھماکے میں ہلاک کر دیا گیا ہے۔"

"اوہ گاڈ۔ کیا تم جائے واردات پر گئے تھے؟ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا؟"

تابانی نے اس سے فون لے کر کہا۔ "مراد میرا ہے۔ اپنی خوشی کے لئے جو کہتی ہوں' وہ کرتا ہے۔ اس نے میرے ہی کہنے پر ہالا پنڈ تک تمہارے آدمیوں کو دوڑایا تھا پھر میرے کہنے پر اکرام شاہ کو اُلّو بنا کر ٹاؤن شپ سے کچھ دور لا کر اسے کار سمیت بموں کے دھماکے سے اُڑا دیا۔ آئندہ بھی مراد سے کام لوں گی تو یہ میرا ہی کام کرے گا۔ تمہاری خوش فہمی ختم ہو جانی چاہیے۔"

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ مراد نے نرمی سے احتجاج کیا۔

"یہ تم نے کیا کہہ دیا ہے۔ اب میڈم کی پارٹی کا کوئی بندہ مجھ پر اعتماد نہیں کرے گا۔"

اس نے مراد کی گردن میں بانہیں ڈال کر کہا۔ "میں تم سے ایسی ہی محبت کرتی رہوں گی' جیسی ایک محبت کرنے والی وفادار بیوی اپنے جھوٹے اور مکار شوہر سے محبت کرتے کرتے مر جاتی ہے۔"

وہ اسے بازوؤں کے حصار میں لے کر بولا۔ "مجھے اور شرمندہ نہ کرو۔"

"نہیں کروں گی۔ جو گزر گئی' سو گزر گئی۔ دیکھو میرا پیٹ کتنا بڑھ گیا ہے۔ ان لمحات میں ہمارے درمیان ہمارا بچہ بھی ہے۔ اس کی ماں کو دل سے چوم لو۔ یہ ننھا خوش ہو جائے گا۔"

مراد اس کے چہرے پر جھک گیا۔

☆======☆======☆

امریکا کے ایک نہایت دولت مند بیوروکریٹ کے دل میں اچانک اپنے ان رشتے

داروں کے لیے محبت پیدا ہو گئی جو پاکستان میں تھے۔ پاکستان کو قائم ہوئے آدھی صدی گزرنے والی تھی۔ اس طویل مدت کے بعد اس بیوروکریٹ مسٹر سعید الزماں کا دل عزیز و اقارب کے لئے تڑپنے لگا اور وہ پاکستان ان سے ملاقات کرنے آ گئے۔

سنا ہے حضرت موسیٰ کلیم اللہ آگ لینے گئے تھے' انہیں پیغمبری مل گئی تھی۔ وہی بات یہاں صادق آئی کہ سعید الزماں صاحب رشتے داروں سے گلے ملنے آئے تھے' انہیں پاکستان کا وزیر اعظم بنا دیا گیا۔

کئی صحافیوں اور دانشوروں نے اس پر اعتراض کیا کہ جو شخص ساری عمر امریکا میں رہا ہو اور پاکستانی تہذیب و ثقافت کو اور مذہبی امور کو مکمل طور پر نہ سمجھتا ہو' اسے اتنا بڑا عہدہ کیسے دے دیا گیا اور اتنا بڑا فیصلہ تو عوام نے کبھی نہیں کیا۔ ویسے عوام ہیں کیا چیز؟ پاکستانی قوم کو صرف اتنا سمجھا دینا کافی تھا کہ جناب سعید الزماں امریکا سے ضرور آئے ہیں لیکن وہ پکے مسلمان ہیں۔ آدھی صدی سے زیادہ امریکا میں رہنے کے باوجود مسلمان ہیں۔ اس سے زیادہ پختہ ایمان کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟

ویسے یہ ایمان کی بات ہے کہ جناب سعید الزماں جب تک رہے' ملک میں سیاسی جھگڑے نہیں ہونے دیئے۔ پاکستان کی اقتصادی بدحالی کے خاتمے کا حل تلاش کیا۔ ماضی اور حال کے تمام حکمرانوں' ان کی سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کا پول کھولا کہ وہ سب کس طرح آج تک قومی خزانے کو لوٹتے رہے۔ انہیں نے ہر سیاست داں کے نام کے ساتھ یہ فہرست اخبار میں چھپوائی کہ کس سیاست داں اور بیوروکریٹ نے کتنے لاکھ' کتنے کروڑ اور کتنے ارب روپے قومی خزانے سے قرض لئے اور آج تک واپس نہیں کئے۔ جتنے بڑے سرمایہ دار' جاگیردار اور وڈیرے ہیں' انہوں نے قیام پاکستان سے آج تک بجلی کے بھی بل ادا نہیں کئے۔ بڑے بڑے انکم ٹیکس چوروں کے نام بھی شائع کئے اور فرمایا کہ ان تمام بڑے لوگوں سے تمام مال قرضے اور بل وغیرہ وصول کئے جائیں تو پاکستان اتنا مال دار ہو جائے کہ پھر ورلڈ بینک سے کبھی قرضہ نہیں لے گا۔

لیکن شرط یہ ہے کہ آئندہ پاکستان میں جو حکمران بھی آئے گا وہ یہ تمام قرضے وصول کرنے کا نیک کام پہلے کرے۔ دردانہ بیگم اور نیک بخت نے خفیہ ہاتھ سے شکایت کی کہ اس نے جناب سعید الزماں کو ان کی سیاسی موت بنا کر بھیجا ہے۔ اب ان میں سے جو بھی حکومت کرے گا' اسے تمام قرضے وصول کرنے ہوں گے۔ جواب میں کہا گیا۔ یہ بات پاکستانیوں کو خوش کرنے کے لئے کہی گئی ہے۔ ورنہ جو بھی حکمران قرضے وصولی کی مہم چلائے گا' اپوزیشن والے اس حکمران کو بھی مجبور کر دیں گے کہ آپ بھی قومی خزانے کے

اربوں روپے واپس کریں۔

کسی بھی حکمران کے دور میں قرضے وصولی کی مہم کاغذی ہو گی۔ اخبارات میں بیان بازی کے ذریعے اطمینان دلایا جائے گا کہ قرضے لینے اور غیر ملکی بینکوں میں دولت جمع کرنے والوں کے خلاف ٹھوس ثبوت جمع کئے جا رہے ہیں۔ بڑے زور و شور سے عدالتی کارروائیوں کا یقین دلایا جائے گا۔

اور جس سیاست داں کو عوامی سطح پر بھی ملزم کہا جائے گا۔ اسے گرفتار کرنے کا وارنٹ جاری کیا جائے گا۔ اس سے پہلے ہی وہ ملک سے باہر چلا جائے گا یا چلی جائے گی لیکن سلاخوں کے پیچھے نہیں جائیں گے اور نہ بیرونی ممالک کے بینکوں میں جمع کئے ہوئے اربوں روپے قرضے کی وصولی کے طور پر دیں گے۔

میری داستان میں رُوکھی سُوکھی زہریلی سیاست آگئی ہے۔ لہٰذا اختصار سے کام لے کر صرف اتنا کہہ دیتا ہوں کہ جناب سعید الزماں نے پاکستان کے لٹیرے سیاست دانوں کے چہرے بے نقاب کرنے کا بہت بڑا کارنامہ انجام دیا۔

اب آئندہ الیکشن میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اپنی اپنی سیاسی پوزیشن مضبوط کرنے کی فکر تھی۔ دردانہ کی پارٹی سے اکرام شاہ سمیت پانچ اہم سیاست داں کم ہو گئے تھے۔ وہ پانچوں اپنے علاقوں سے ہمیشہ کامیاب ہو کر دردانہ کی اسمبلی پہنچتے تھے۔ اب ان علاقوں میں نیک بخت کی پارٹی کے سیاست داں بھی مضبوط پوزیشن حاصل کر رہے تھے۔

خفیہ ہاتھ اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ اطمینان رکھو۔ اس بار ہم ایسی بازی گری دکھائیں گے کہ نیک بخت ہزار کوششوں کے باوجود اپوزیشن بینچ پر بیٹھے گا۔

دوسری طرف نیک بخت نے خفیہ ہاتھ سے شکایت کی۔ "سر! آپ مسلسل دردانہ بیگم کی حمایت کر رہے ہیں۔ آپ مجھ سے کب تک ناراض رہیں گے۔"

خفیہ ہاتھ نے کہا۔ "تم میری لسٹ میں باغی سیاست داں ہو۔ مجھے دھوکا دیتے ہو اور میرے ہی کاندھے پر سوار ہو کر حکمران بننا چاہتے ہو؟"

"آپ کو میرے خلاف بھڑکایا جا رہا ہے۔ میں آپ کا خادم ہوں، باغی نہیں ہوں۔ میں نے آپ کی پالیسیوں کے خلاف کوئی کام نہیں کیا ہے۔"

"مسٹر نیک بخت! خفیہ ایجنسیاں تابانی اور فرمان کو ڈھونڈ نکالنے میں اب تک ناکام رہی ہیں اور وہ دونوں تمہاری دونوں آستینوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ گویا تم میرے خلاف اپنی آستینوں میں سانپ پال رہے ہو۔"

"یہ سراسر جھوٹ ہے۔ میں نے آج تک نہ تو تابانی اور فرمان کی آواز سنی ہے اور

نہ ہی ان کی صورتیں دیکھی ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ دردانہ بیگم میرے خلاف یہ افواہ پھیلا رہی ہے۔ آپ اپنی تمام ایجنسیوں کو حکم دیں کہ وہ دن رات میرا محاصرہ کئے رہیں۔ میرے تمام ٹیلی فون ریکارڈ کرتے رہیں۔"

"مجھے اپنی ایجنسیوں کو ایسے احکامات صادر کرنے ہیں یا نہیں؟ اس کا مشورہ نہ دو۔ میں صرف ایک بات کہتا ہوں۔ آئندہ اقتدار چاہتے ہو تو تابانی اور فرمان کو میرے حوالے کر دو۔ یا ان کی خفیہ پناہ گاہ بتا دو۔ تم جب تک ایسا نہیں کرو گے، تب تک میرے سیکرٹری سے باتیں کرو گے۔ مجھ سے براہِ راست گفتگو نہیں ہو گی۔"

فون بند کر دیا گیا۔ نیک بخت نے اپنا فون بند کر کے مشیروں سے کہا۔ "یہ تابانی اور فرمان میری سیاست کے گلے میں ہڈی کی طرح اٹک گئے ہیں۔ میں انہیں نگل نہیں سکتا اور اُگل بھی نہیں سکتا۔ ان سے دشمنی مہنگی پڑے گی اور دوستی کو خفیہ ہاتھ مصیبت بنا رہا ہے۔ کہتا ہے دونوں کو پیش کر دو اور اقتدار کی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔"

ایک مشیر نے کہا۔ "اس کا جھکاؤ صرف دردانہ کی طرف ہے۔ اس بات کی ضمانت ہم اس سے نہیں لے سکتے کہ تابانی اور فرمان کو پیش کرنے کے بعد وہ سچ مچ آئندہ ہمیں حکومت بنانے دے گا۔"

دوسرے مشیر نے کہا۔ "دوسری طرف تابانی اور فرمان سے دوستی اتنی مستحکم نہیں ہوئی ہے کہ ہم ان پر بھروسا کر سکیں۔ صرف دوبار گاڈ فادر ہاشم نے آپ سے فون پر باتیں کی ہیں اور پوری طرح تعاون کا یقین دلایا ہے۔"

تیسرے مشیر نے کہا۔ "اتنا تو ہے کہ وہ جو کہہ رہا ہے، وہ کر رہا ہے۔ آپ سے باتیں کرنے کے بعد اس نے دردانہ کی پارٹی کے اکرام شاہ کو ہلاک کرا دیا ہے۔ وہ دردانہ کے لئے مسلسل دہشت بنا ہوا ہے اور اس کی پارٹی کے وفادار سیاست دانوں کو کم تر کرتا جا رہا ہے۔ اس نے آج تک ہماری پارٹی کے کسی سیاست داں کو نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ کچھ بھی ہو ہمیں اس کی دشمنی سے بچنا چاہیے۔"

نیک بخت نے کہا۔ "میں نے تو یہ طے کر لیا ہے کہ تابانی اور فرمان سے کام نکالنے کے لیے میں گاڈ فادر ہاشم کو دوست بنائے رکھوں گا۔"

"اب تو خفیہ ایجنسی والے آپ کی ہر فون کال ریکارڈ کرتے ہوں گے اور نہ جانے آپ کے اس پیلس کے اندر اور باہر کس بھیس میں جاسوس چھوڑ رکھے ہیں۔ وہ لاکھوں روپے دے کر یہاں کے ملازموں کو بھی خرید سکتے ہیں۔ آپ گاڈ فادر ہاشم سے کس طرح رابطہ کریں گے؟"

"ہاشم بہت چالاک ہے اس لیے اس نے صبح سے کسی بھی طرح رابطہ نہیں کیا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ آئندہ کس طرح رابطہ کرے گا۔"

وہ اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ گاڈ فادر ہاشم نے فون پر مخاطب کیا۔ نیک بخت نے پریشان ہو کر کہا۔ "تمام خفیہ ایجنسیاں میرے پیچھے لگ گئی ہیں۔ میری فون کالز بھی ریکارڈ کی جا رہی ہیں۔ سیٹلائٹ کے ذریعے میرے موبائل نمبر کو انٹرلنک کیا ہو گا۔"

ہاشم نے کہا۔ "آپ تو ایسے پریشان ہو رہے ہیں جیسے خفیہ ہاتھ نے آپ کا گلا دبوچ رکھا ہو۔ آپ برسوں سے سیاست میں ہیں۔ اگر کھل کر دلیری سے سیاست کرنی ہے تو میں ساتھ ہوں ورنہ آپ کا اللہ ہی حافظ ہے۔"

"آپ ایک عرصہ دراز سے دیکھ رہے ہیں کہ خفیہ ہاتھ کے ٹھوس منصوبوں کے نتیجے میں ہی ہمارے ملک میں حکومتیں قائم ہوتی ہیں۔ اس کی طاقت سے اور کامیاب منصوبوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

"بہتر یہ ہو گا کہ ابھی تم اس پر اعتماد کرو۔ ہم نے ابھی اپنی طاقت اور کامیاب منصوبے کا ایک ہی ریکارڈ قائم کیا ہے۔ ابھی خفیہ ہاتھ کی طرح ہماری اہمیت نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں ہماری گفتگو کی ریکارڈنگ خفیہ ہاتھ سنے۔ اس کے لیے آئندہ الیکشن کے نتائج اس کی پلاننگ کے مطابق نہیں ہوں گے۔ آپ اور دردانہ اس کے کٹھ پتلی حکمران نہیں بن سکیں گے۔ کل کے اخبارات میں دردانہ کے خلاف ایک خبر شائع ہونے والی ہے۔ خفیہ ہاتھ اس خبر کو روک سکتا ہے تو روک کر دکھا دے۔ آئندہ دردانہ کے ساتھ ساتھ تمہارے خلاف بھی بہت کچھ ہوتا رہے گا۔ بس......... بس......... باقی تمہاری ہوس۔"

نیک بخت ہیلو ہیلو کہتا رہا مگر دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔ وہ پریشان ہو کر اپنے مشیروں کو دیکھنے لگا۔ جیسے اس نے اپنی تباہی کے لیے اپنے محل کا دروازہ کھول دیا ہو۔ اس نے بے اختیار دروازے کی طرف دیکھا' وہ بند تھا لیکن تباہی ہو یا موت وہ تو بند دروازے کے آر پار چلی آتی ہے۔

دوسرے دن کے تمام اخبارات میں یہ خبر شائع ہو گئی کہ "را" کے ایک دہشت گرد مراد کو عدالت سے سزائے موت کا حکم سنایا گیا لیکن دردانہ بیگم نے حکومت بنانے سے پہلے ہی ایک جج' جیلر اور چند پولیس افسران کو کچھ دھونس دے کر اور کچھ انہیں ترقی دینے کا وعدہ کر کے اس دہشت گرد' قاتل مراد کو جیل سے رہا کرا دیا۔

اب وہ قاتل مراد دردانہ بیگم کی پناہ میں ہے۔ اسے خاص مقاصد کے لئے چھپا کر

رکھا گیا ہے۔ کچھ عرصے سے دردانہ بیگم اور سابقہ ایم این اے اکرام شاہ کے درمیان اندر ہی اندر شدید اختلافات ہو گئے تھے لہٰذا اس پہلو کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس سفاک قاتل مراد کے ذریعے اکرام شاہ کو بم دھماکے سے ہلاک کیا گیا ہے۔ اس پہلو کو بھی مدِ نظر رکھا جا سکتا ہے کہ اکرام شاہ کے حلقۂ انتخاب سے دوسرے نمبر پر کامیاب ہونے والے چوہدری کلیم اللہ پر دردانہ بیگم مہربان ہونے لگی تھی اور اکرام شاہ کو یہ تاثر دے رہی تھی کہ تم نہ سہی اور سہی اور آئندہ انتخابات کے وقت سب دیکھیں گے کہ دردانہ بیگم انتخابی امیدوار کا ٹکٹ چوہدری کلیم اللہ کو دے گی۔

اکرام شاہ مرڈر کیس کے سلسلے میں جو پولیس افسران اور کرائم برانچ کے افسران تفتیش کر رہے تھے' یہ خبر ان کے لئے گائیڈ لائن ہے۔ مراد جیسے سفاک دہشت گرد کو دردانہ بیگم سے ضرور طلب کیا جائے۔ اس کی غیر قانونی رہائی کی ذمے دار یہی محترمہ ہیں۔

مشیروں نے نیک بخت سے کہا۔ "اس خبر نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ گاڈ فادر ہاشم بہت طاقت ور اور وسیع ذرائع کا مالک ہے۔ خفیہ ہاتھ اس خبر کو شائع ہونے سے نہ روک سکا۔"

دوسرے مشیر نے کہا۔ "آئندہ الیکشن کے وقت خفیہ ہاتھ اور گاڈ فادر ہاشم کے درمیان بڑا جوڑ توڑ رہے گا۔ تابانی اور فرمان کو بڑی زبردست چالیں چلنے کا موقع ملے گا۔"

نیک بخت نے کہا۔ "اور وہ ہمارے خلاف بھی چالیں چلیں گے۔ سمجھ میں نہیں آتا' کس طرف جھکنا چاہیے؟"

ایک اور مشیر نے کہا۔ "دونوں طرف جھکنا چاہیے۔ اس طرح خفیہ ہاتھ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گا کہ آپ اس کے دوست اور فرمانبردار تو ضرور ہیں لیکن اس کے محتاج نہیں ہیں۔ دردانہ بیگم اور خفیہ ہاتھ سے ٹکر لینے والی ہاشمی قوت آپ کی پشت پر ہے۔"

نیک بخت نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "بیلنس آف پاور ضروری ہے۔ جو پلڑا دردانہ کی طرف زیادہ جھک رہا ہے' وہ میری طرف بھی جھکنے پر مجبور ہو جائے گا۔ گاڈ فادر ہاشم درست کہہ رہا تھا کہ مجھے اس سے دوستی ظاہر کر کے سیاسی دلیری کا ثبوت دینا چاہیے۔"

"اس سے پہلے کہ دردانہ کی طرح آپ کے خلاف بھی کوئی خبر شائع ہو' آپ گاڈ فادر ہاشم سے فون پر رابطہ کریں۔"

ہاشم نے کبھی وقتِ ضرور رابطہ رکھنے کے لیے ایک موبائل فون کا نمبر دیا تھا۔ نیک

بخت نے اس نمبر پر رابطہ کیا پھر اپنا نام بتایا۔ ایک عورت کی آواز سنائی دی۔ "آپ فون بند کریں۔ گاڈ فادر ابھی آپ سے بات کریں گے۔"

بیس منٹ کے بعد ہاشم نے فون کے ذریعے پوچھا۔ "ہیلو مسٹر نیک بخت! معلوم ہوتا ہے آپ کسی نتیجے پر پہنچ گئے ہیں؟"

"جی ہاں' آپ کا یہ مشورہ درست ہے کہ مجھے آپ سے دوستی کر کے سیاسی دلیری کا ثبوت دینا چاہیے۔ میں اپنی پالیسیوں پر عمل کرنے سے پہلے آپ سے مشورے لے لیا کروں گا اور ابھی خفیہ ہاتھ سے دو ٹوک بات کروں گا۔"

"اب آپ خوش بخت ہو گئے۔ ورنہ میں آپ کی اور دردانہ بیگم کی ان دستاویزات کی نقلیں حاصل کر چکا ہوں جن کے ذریعے آپ دونوں نے حکمرانی کے دور میں قومی خزانے سے اربوں روپے قرض لیے ہیں اور اب تک ان قرضوں کے نادہندہ ہیں۔"

نیک بخت نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں کل کے اخبارات میں شائع ہونے والی خبر سے آپ کا نام نکلوا دوں گا۔ لائرز ایسوسی ایشن کی طرف سے یہ بیان شائع ہو گا کہ دردانہ بیگم کے خلاف لائرز ایسوسی ایشن قانونی چارہ جوئی کرے گی۔ اگر وہ سزائے موت پانے والے خطرناک دہشت گرد مراد کو جیل واپس بھیج کر پھانسی کے تختے تک نہیں پہنچائے گی۔"

نیک بخت نے پوچھا۔ "آپ نے لائرز ایسوسی ایشن کو ایسا کرنے پر کیسے مائل کیا ہے؟"

"یہ سب ہی لائرز میرے حامی نہیں ہیں لیکن ملک کی بہتری کی خاطر چند لائرز میری جائز باتیں تسلیم کر رہے ہیں اس کے علاوہ دردانہ کی ان دستاویزات کی فوٹو کاپی شائع کی جائے گی جن کے ذریعے وہ اربوں روپے قرض کی نادہندہ ہے۔ آپ کی دستاویزات شائع نہیں ہوں گی' وہ میرے پاس محفوظ رہیں گی۔"

"میں ہمیشہ آپ کا مشکور و ممنون رہوں گا۔"

"لیکن آپ ابھی خفیہ ہاتھ سے صاف صاف کہہ دیں کہ آپ اس سے بھی دوستی رکھیں گے اور ہم سے بھی۔ خفیہ ہاتھ کے ردِ عمل سے مجھے معلوم ہو جائے گا کہ آپ دلیرانہ فیصلے پر عمل کر چکے ہیں۔"

ہاشم نے فون بند کر دیا۔ نیک بخت کبھی یہ نہ چاہتا تھا کہ اس کے لیے ہوئے قرضوں کی بھی دستاویزات اخبارات میں شائع ہوں۔ اس نے فون کے ذریعے خفیہ ہاتھ سے رابطہ کیا۔ اس کے سیکرٹری نے کہا۔ "صاحب براہِ راست گفتگو نہیں کریں گے۔ آپ اپنی

گفتگو ریکارڈ کرائیں۔"

"ریکارڈ کیا کرائیں' اپنے صاحب سے اتنا کہہ دو کہ گاڈ فادر ہاشم' تابانی اور فرمان سے میرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ اس کے باوجود تمہارے صاحب چاہیں گے تو میں ان سے بھی دوستانہ تعلقات رکھوں گا۔"

نیک بخت نے رابطہ ختم کر دیا۔ دوسرے دن تمام اخبارات میں وہ سب کچھ شائع کیا گیا جن کے بارے میں ہاشم کہہ چکا تھا اور اس کے وعدے کے مطابق نیک بخت کے خلاف کوئی بات نہیں کہی گئی تھی۔ دردانہ نے خفیہ ہاتھ سے کہا۔ "مجھ پر زبردست حملے کیے جا رہے ہیں۔ آپ کے پاس بھی قرض نادہندگان کے دستاویزی ثبوت ہوں گے۔ آپ نیک بخت کے خلاف اس کی فوٹو کاپی شائع کرا سکتے ہیں۔"

خفیہ ہاتھ نے کہا۔ "میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ کچھ عرصے تک صبر کرنا ہو گا۔ گاڈ فادر ہاشم نے بڑے بڑے اخبارات پر مختلف ہتھکنڈوں سے دباؤ ڈال رکھا ہے۔ پھر تم نے بھی مراد کو جیل سے رہائی دلا کر مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ کسی بھی طرح معلوم کرو' مراد کہاں ہے؟"

"تابانی نے اسے کہیں چھپا رکھا ہے۔ آپ کے سیکرٹ ایجنٹس اب تک تابانی اور فرمان تک نہ پہنچ سکے۔ میں اپنے محدود ذرائع سے مراد کو کہاں سے پکڑ کر لا سکتی ہوں۔"

"ہماری کوششیں جاری ہیں۔ تم بھی کوششیں کرتی رہو۔ یہ سمجھ لو کہ مراد کو جیل واپس پہنچائے بغیر تمہیں اس بہت بڑی مشکل سے نجات نہیں ملے گی۔"

مراد کی تصویریں اخبارات میں شائع ہوتی رہی تھیں۔ پاکستانی سراغ رساں بھی اسے چہرے سے پہچانتے تھے۔ اگر اس کی تصویر منظرِ عام پر نہ آتی تو دردانہ کسی دوسرے کو مراد بنا کر قربانی کا بکرا بنا دیتی۔

میری آپی اور مراد کے چہروں کو ہاشم نے پلاسٹک سرجری کے ذریعے مستقل طور پر تبدیل کرا دیا تھا۔ اب کوئی سراغ رساں ان دونوں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

آپی کے لیے ایک اندیشہ تھا کہ وہ انگلیوں کے نشانات سے پہچانی جا سکتی تھی۔ مراد بھی پہچانا جا سکتا تھا۔ میری امی نے انکل ہاشم سے کہا۔ "میرا خاص مریض کالیا مر چکا ہے لیکن اسپتال والے میری موجودگی پر فخر کرتے ہیں۔ آئندہ بھی میری خدمات کے جاری رکھنے کے بارے میں سن کر بہت خوش ہیں۔ تم تابانی اور مراد کو یہاں بھیج دو۔"

اگر امی لندن سے پاکستان آتیں تو کئی خفیہ ایجنسیاں خفیہ طور پر ان کی نگرانی کرتیں۔ انہیں یقین ہوتا کہ میں اور آپی کبھی نہ کبھی چھپ کر امی سے ملاقات کریں گے

اور امی اسی لندن کے اسپتال میں رہیں گی تو محض سطحی طور پر ان کی نگرانی کی جائے گی۔
اور ایسی سطحی نگرانی کے باوجود ہمارے مخالفین آپی اور مراد کو لندن میں چہروں سے نہیں پہچان سکیں گے لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ آپی حاملہ ہونے کی وجہ سے پاکستان میں پہچانی جائیں گی۔ انہیں آئندہ میدانِ عمل میں نہیں آنا چاہیے۔ وہ زچگی تک لندن میں رہیں گی۔ ان کی جگہ اب میں بینا کے ساتھ پاکستان آؤں گا۔"

☆=======☆=======☆

پلاسٹک سرجری کے زبردست ماہر عبدالرحمٰن نے ہم پر بڑے احسانات کیے تھے۔ مجھے اور بینا کو سر سے پاؤں تک تبدیل کر دیا تھا۔ ہماری ایک ایک انگلی کے نشانات میں بھی تبدیلیاں کی تھیں
ایسا تو وہ پیشے کے اعتبار سے بھی کر سکتے تھے لیکن انہوں نے بینا کو اپنی بیٹی کی ہم شکل پا کر پدرانہ جذبات میں ڈوب کر تبدیلیاں کرنے کے علاوہ بہت کچھ کیا تھا۔ انہوں نے ہمارے نئے چہروں کی تصویریں لے کر ہمارے پاسپورٹ اور ضروری شناختی کاغذات تیار کرائے تھے۔ ایک وکیل سے وصیت لکھوائی تھی کہ بانو بیگم (بینا) ان کی بیٹی اور نثار احمد (میں) ان کا داماد ہوں۔ ان کے بعد ان کا جو کچھ ہے' اس کے حقدار صرف ان کی بیٹی اور داماد ہیں۔
وہ مہربان بزرگ اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ ان کے بینک اکاؤنٹ میں تقریباً اٹھارہ لاکھ روپے تھے۔ ان کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ ہم نے ان کا مکان اور پرائیویٹ کلینک فروخت کر دیا تو اس طرح ہمارے پاس تقریباً تیس لاکھ روپے ہو گئے تھے۔
اس سلسلے میں وہاں کے متعلقہ سرکاری عہدے دار سے رابطہ رکھا تھا اور یہ تحریری درخواست دی تھی کہ آئندہ مستقل رہائش اختیار کرنے کے لیے پہلے ہم بھارت جائیں۔ وہاں جا کر دو ماہ رہ کر وہاں کے ماحول کو دیکھیں۔ اگر ماحول پسند نہ آیا تو پاکستان میں جا کر رہائش اختیار کریں گے۔
برمی سفارت خانے کے ذریعے جو خط و کتابت ہوئی اس کے نتیجے میں بھارت سے کہا گیا کہ مسٹر نثار احمد اور ان کی مسز بانو بیگم کو زیادہ سے زیادہ تین ماہ تک رہنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔
پاکستان میں انکل ہاشم نے اپنے ذرائع استعمال کیے تو ہمیں مستقل رہائش کی اجازت مل گئی۔ قانونی طور پر اتنی کوششیں اس لیے کی گئیں کہ آئندہ کسی بھی ملک میں ہم پر ایسا شبہ نہ کیا جائے جیسا کہ مجرموں پر کیا جاتا ہے۔

میں اور بینا ایک فلائٹ کے ذریعے ممبئی جانے لگے۔ پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات کے مطابق ہم میاں بیوی تھے۔ میرج سرٹیفکیٹ کے مطابق ہماری شادی کو صرف بائیس دن گزرے تھے لیکن بابا عبدالرحمٰن نے ہم دونوں کو ایسا خوب صورت اور ترو تازہ بنایا تھا جیسے ہم ابھی کنوارے ہوں۔ یعنی شادی کے بائیس دن گزارنے کے باوجود شادی شدہ نہیں لگتے تھے۔
برما کے شہر رنگون سے روانہ ہوتے وقت بینا نے کہا۔ "میں نے آج تک کسی مرد کو اپنے خیالوں اور تصورات میں بھی قبول نہیں کیا لیکن ہم جیسی زندگی گزار رہے ہیں' اس کے مطابق اپنی آبرو سلامت رکھتے ہوئے کسی سوسائٹی گرل کی بھی ایکٹنگ کرنی پڑتی ہے۔ مجھے تمہاری فکر ہے۔ تمہیں تو ایکٹنگ کرنی نہیں آتی۔"
اس کی بات میری سمجھ میں کچھ آئی اور کچھ نہیں آئی۔ میں نے پوچھا۔ "مجھے کیسی ایکٹنگ کرنی چاہیے۔"
"ایک شوہر کی ایکٹنگ' مجھ سے بے تکلف ہونے کی ایکٹنگ مگر تم میرے ساتھ رہتے ہو اور گھر سے باہر ایسے فاصلہ رکھ کر چلتے ہو جیسے کوئی عورت چھو لے گی تو تمہیں کرنٹ لگے گا اور تم مر جاؤ گے۔"
"کیا مجھے اور قریب ہو کر تمہیں چھونا چاہیے؟"
"ہاں مگر صرف دوسروں کے سامنے ورنہ تنہائی میں تمہاری یہ شرافت مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔"
"ٹھیک ہے' میں دن میں تمہیں دو تین بار چھو لیا کروں گا۔"
"کیا میں ڈاکٹر کی دی ہوئی دوا ہوں کہ دن میں دو تین بار نسخے کے مطابق چھو لیا کرو گے؟ کیا تم نے دوسرے شوہروں اور بیویوں کو نہیں دیکھا ہے؟ وہ راستہ چلتے وقت کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی شوہر اپنی بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ایئرپورٹ اور دیگر پبلک مقامات پر گفتگو کرتا نظر آتا ہے۔"
"ہاں یہ سب کچھ دیکھا تو ہے مگر مجھے وہ بے حیا لگتے ہیں"
"تم کرو گے شرم اور ہمارے پھوٹیں گے کرم۔ اگر تم شرم و حیا اور تہذیب کا مظاہرہ کرو گے تو مخالفین کو ضرور ہم پر شبہ کرنے پر مجبور کرو گے۔"
میں نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "تم درست کہتی ہو۔ میں لوگوں کے سامنے تمہارے ساتھ فری ہو کر نہیں رہوں گا تو ہم پر کبھی کوئی مصیبت آ سکتی ہے۔"
"ہم تقریباً ڈیڑھ ماہ سے دن رات ساتھ رہ رہے ہیں' تم نے کبھی مجھ میں بے حیائی

دیکھی ہے؟"

"نہیں تم بہت اچھی ہو۔"

"تم بھی ایسے قد آور اور خوبرو جوان ہو کہ کسی لڑکی کی طرح تم میرے بھی آئیڈیل ہو لیکن کبھی میں نے تمہیں اپنی طرف مائل کرنے کی کوئی چھچھوری حرکت کی ہے؟"

"نہیں کبھی نہیں۔"

"پھر تمہیں سمجھنا چاہیے کہ جب ہم تنہائی میں شرم و حیا کے ساتھ رہتے ہیں تو باہر تم مجھے ہاتھ لگاؤ گے' میری کمر میں ہاتھ ڈالو گے تو ہم دونوں بے حیا نہیں کہلائیں گے۔"

"میں سمجھ گیا۔ اب لوگوں کے سامنے تمہارا ہاتھ پکڑ لیا کروں گا پھر ہاتھ چھوڑ کر تمہاری کمر پر ہاتھ رکھا کروں گا۔"

"لوگ تمہیں پاگل کہیں گے یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ جب بھی دو چار لوگ سامنے آئیں اور تم پاگلوں جیسی حرکتیں شروع کر دو۔ رومانی انداز کا مخصوص وقت ہوا کرتا ہے۔"

"میں نے کبھی رومانس نہیں کیا۔"

"فلموں میں تو دیکھا ہو گا۔"

"میں نے آج تک کوئی فلم نہیں دیکھی۔ تم بتاؤ کہ رومانس کا کون سا وقت ہوتا ہے؟"

جہاز میں مسافروں کو کھانا دیا جانے لگا۔ بینا کھانے کے دوران میں سوچنے لگی۔ "میں نے ایسا شریف انسان پہلی بار دیکھا ہے' میرا دل اس کی طرف کھنچا جاتا ہے۔"

مجھے کھاتے کھاتے یاد آیا۔ میں نے کہا۔ "ہاں یاد آگیا' میں نے ایک بار فلم دیکھی تھی۔ اس کا نام تھا۔ نیک پروین' پانچوں وقت کی نمازیں پڑھنے والی ہیروئن تھی۔"

"پتا نہیں کس زمانے کی فلم دیکھی تھی۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ تم چپ چاپ کھاؤ۔"

وہ پھر سوچنے لگی۔ "اب نیک پروین جیسی فلمیں نہیں بنتیں لیکن ہماری دنیا میں اس جیسی شریف عورتیں موجود ہیں۔ میں نے خود جرائم کی دنیا میں رہ کر اپنی آبرو کو محفوظ رکھا ہے۔"

میں نے کھاتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے رومانس کرنے کا وقت نہیں بتایا؟"

"میں ابھی سوچ کر بتاتی ہوں۔"

وہ سوچنے لگی۔ کھانے کے بعد ائرہوسٹس کھانے کی ٹرے اٹھا کر لے گئی۔ بینا نے

کہا۔ "غور سے سنو اور یاد رکھو۔ اگر ہم کہیں کھڑے رہیں یا چلتے رہیں تو ایسے وقت میں ایک انگلی سے اپنا سر کھجاؤں تو تم میری کمر میں ہاتھ ڈال کر پیار بھری باتیں کرنا۔"

"ٹھیک ہے' میں یاد رکھوں گا۔"

"اگر میں دھیمی آواز میں۔ "یس' کہوں تو محبت سے میرا ہاتھ تھام لینا۔ یہ اچھی طرح سمجھو' محبت سے کلائی بھی پکڑی جاتی ہے اور ایک دوسرے کی انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر ہاتھ پکڑا جاتا ہے۔ کسی چور یا پولیس کی طرح ہاتھ نہ پکڑنا۔"

"اب میں ایسا اناڑی بھی نہیں ہوں۔"

"کسی کلب' ریستوران یا کسی پارٹی میں یا سفر کے دوران میں کئی رومانی جوڑے ہوتے ہیں اور بڑی رومانی باتیں اور حرکتیں کرتے ہیں۔ ایسے وقت میں ہولے سے کھنکاروں تو تم میرا گال........ چوم کر میرے حسن کی تعریف کرنا یا کوئی پیار بھری بات کہنا۔"

وہ مجھے سمجھاتی رہی اور میں سوچتا رہا۔ یہ عجیب زندگی ہے۔ غور کرو تو پتا چلتا ہے' جھوٹ بولنے اور ایکٹنگ کرنے میں آدھی سے زیادہ زندگی گزر جاتی ہے۔ یہ تو میں دیکھتا آرہا تھا کہ بینا واقعی بے حیا نہیں ہے لیکن حالات نے اسے بے حیائی کی ایکٹنگ سکھا دی تھی اور وہ بھی صاف دل سے مجھے سکھا رہی تھی

ہم ممبئی پہنچ گئے۔ ہم نے رنگون سے ضرورت کا بہت سا سامان خریدا تھا۔ وہ تمام سامان کسٹم والوں نے چیک کیا۔ کوئی بھی قابلِ اعتراض چیز نہیں تھی۔ ہم اپنی اٹیچی اور بڑے سوٹ کیس وغیرہ پر جھک کر تمام سامان رکھنے لگے۔ ایسے وقت بینا نے ایک انگلی سے سر کھجایا۔ میں سیدھا ہو کر اس کے قریب ہوا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا۔ وہ ایک دم چونک گئی۔ کسٹم کے افسران اور دوسرے لوگ حیرانی سے دیکھنے لگے۔

بینا پہلے تو جھینپ گئی پھر جلدی سے مسکراتی ہوئی بولی۔ "جگہ دیکھتے ہو نہ وقت۔ بہت شریر ہو۔ ہم ابھی ہوٹل ہی تو جا رہے ہیں نا۔ جلدی سے سامان رکھو۔"

میں پھر ایک سوٹ کیس میں سامان رکھنے لگا۔ ایک افسر نے کہا۔ "یہ سب کچھ لاک کرنے کے بعد یہاں چھوڑ دیں اور اس دروازے سے دوسرے کمرے میں جائیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا باہر جانے کا راستہ وہی ہے؟"

"نہیں' وہاں کرائم برانچ کے افسران آپ دونوں کے کاغذات چیک کریں گے۔"

ہم دونوں اس دروازے سے گزر کر دوسرے کمرے میں پہنچے۔ وہاں ایک میز کے پیچھے ایک افسر بیٹھا ہوا تھا۔ کرائم برانچ کے دوسرے افراد کے علاوہ لیڈی ڈاکٹر اور لیڈیز

کانسٹیبل بھی تھیں۔ ہم نے افسر کے سامنے اپنے ضروری کاغذات پیش کیے۔ وہ انہیں پڑھنے لگا۔ ایسے وقت دوسرے جونیئر افسر نے ہمارے سامنے بٹر پیپر رکھے اور کہا۔ "آپ دونوں اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں اور ہتھیلیوں کے نشان ان کاغذات پر لگا دیں۔"

ہمارے ایک ایک ہاتھ میں سیاہی لگا کر نشانات لیے گئے۔ پھر ہم نے واش روم میں جا کر ہاتھوں کو دھو لیا۔ واپس کمرے میں آئے تو لیڈی ڈاکٹر نے میرج سرٹیفکیٹ پڑھنے کے بعد پوچھا۔ "آپ دونوں کی شادی کو بائیس دن ہو گئے۔ یقین نہیں آتا مسز بانو بیگم! آپ دونوں کنوارے لگتے ہیں۔ کیا آپ دونوں نے ہنی مون نہیں منایا ہے؟"

میں نے پوچھا۔ "یہ کیا سوال کر رہی ہیں۔ یہ ہماری ذاتی اور گھریلو زندگی کا معاملہ ہے۔"

لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ "ہم کرائم برانچ والے ذاتی اور گھریلو زندگی سے بھی مجرموں کی بو سونگھ لیتے ہیں۔ سوری مسز بانو بیگم! میرے ساتھ پارٹیشن کے پیچھے چلیں۔ میں میڈیکل چیک اپ کے ذریعے معلوم کروں گی کہ آپ کنواری ہیں یا ہنی مون منا چکی ہیں۔"

"میں بے حیا نہیں ہوں کہ اپنے میڈیکل چیک اپ کی اجازت دوں۔"

اعلیٰ افسر نے کہا۔ "ہمیں اپنی کارروائی مکمل کرنے کے لیے آپ کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ لیڈی ڈاکٹر کے حکم کی تعمیل کریں۔"

میں نے کچھ پریشان ہو کر بینا کی طرف دیکھا۔ وہ بہت چالاک تھی۔ اس نے اعلیٰ افسر کے سامنے سے ایک کاغذ اٹھایا۔ پھر لیڈی ڈاکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے ڈیڈی کی وفات کا سرٹیفکیٹ ہے۔ ہمارے نکاح.......... والے دن وہ وفات پا گئے تھے۔ آپ کرائم برانچ سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ نہیں جانتیں کہ باپ کی موت کے بعد چالیس دنوں تک ایک مسلمان لڑکی سہاگ کے بستر پر نہیں جاتی۔ دنیا کا کوئی قانون ہمارے رسم و رواج کو نہیں بدل سکتا۔ کیا آپ کے دیس کے قانون میں ایسی کوئی بات ہے کہ بیٹی اپنے باپ کی چتا جلا کر اپنے شوہر کے بستر پر جاتی ہے؟ کم آن۔ لائیں مجھے قانون کی وہ شق دکھائیں۔"

اعلیٰ افسر نے کہا۔ "آل رائٹ۔ آل رائٹ۔ یہ کاغذات اٹھائیں اور جس ہوٹل میں آپ دونوں Stay کریں گے اس کا نام لکھیں۔"

"جو ہوٹل آرام دہ لگے گا' وہیں ہمارا قیام ہو گا اور جہاں قیام ہو گا' وہاں سے ہم فون پر بتا دیں گے۔"

میں نے یہ کہتے ہوئے تمام کاغذات اٹھائے۔ بینا نے انہیں اپنے ہینڈ بیگ میں رکھا۔

پھر کسٹم والے کمرے سے اپنا تمام سامان ٹرالی میں رکھا اور وہاں سے چلے آئے۔

باہر وزیٹرز لابی میں ایک بک سٹال کے پاس کولڈ ڈرنک کی دکان تھی۔ بینا نے کہا۔ "ٹھنڈی بوتل پیئوں گی ان کرائم برانچ والوں نے خواہ مخواہ پریشان کیا ہے۔"

ایک پنڈت جی اپنی پتنی کے ساتھ ٹھنڈی بوتل پی رہے تھے۔ پتنی لمبے سے گھونگھٹ کے اندر بوتل لے جا کر پی رہی تھی اور دوسرے گاہک بھی تھے۔ میں نے دو بوتلیں لیں۔ ایک بینا کو دی۔ وہ ایک گھونٹ پی کر مجھ سے بولی۔ "تم نے کسٹم والوں کے سامنے میری کمر میں ہاتھ کیوں ڈالا تھا؟"

"تم نے اپنا سر کھجایا تھا۔"

"میں نے کھجایا تھا؟ مجھے تو یاد نہیں ہے اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو میرے سر میں کھجلی ہوئی ہو گی۔ تمہیں اتنا تو سمجھنا چاہیے کہ وہ کمر میں ہاتھ ڈالنے کی جگہ نہیں تھی۔"

"کیا تم نہیں بتا سکتی تھیں کہ سر میں کھجلی ہو رہی ہے ابھی نہیں پھر کبھی.........."

وہ مسکرا کر بولی۔ "تم شکار پر جھپٹنے اور مخالفین کے خلاف بڑی ذہانت سے کام کرتے ہو۔ عورتوں کے معاملے میں بدحواس کیوں ہو جاتے ہو؟"

"اب میں کیا کہوں؟ رفتہ رفتہ اس معاملے پر بھی عقل آجائے گی۔ ویسے ایک بات کہوں؟ تمہاری کمر بہت پتلی ہے۔"

وہ حلق سے گھونٹ اتار رہی تھی۔ اسے میری آخری بات پر ہلکا سا ٹھسکا لگا۔ میں نے اس کی طرف جھک کر اس کے گال کو چوم لیا۔ وہ حیران تو ہوئی مگر شرما گئی۔

پنڈت جی نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ہے رام رام.......... کلجگ ہے کلجگ۔"

وہ بوتلوں کے پیسے دے کر اپنی پتنی سے بولا۔ "اری او بے شرم! ہندی پھلمیں دیکھ کے دل نہیں بھرا۔ چل ادھر سے۔"

دوسرے گاہکوں میں سے کوئی مسکرا رہا تھا اور کوئی ہنس رہا تھا۔ بینا نے آدھی بوتل پی تھی۔ اس کے بعد نہ پی سکی۔ بوتل کو کاؤنٹر پر رکھ کر سامان کی ٹرالی کے پاس گئی۔ پھر اسے دھکیلتی ہوئی جانے لگی۔ میں نے جلدی سے بل ادا کیا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا اس کے برابر آ کر بولا۔ "یہ جگہ ٹھیک تھی نا؟ اب یہ نہ بولنا کہ تم نے کھنکارا نہیں تھا۔"

"مجھے ٹھسکا لگا تھا۔ کھنکارنے اور ٹھسکا لگانے میں فرق ہوتا ہے۔"

"اب اتنا باریک سا فرق بھی سمجھنا ہو گا؟"

"نہ سمجھو۔ مگر میں سمجھ گئی ہوں۔ تمہارے رومانس سیکھنے کا یہی حال رہا تو لوگ

انڈین فلمیں دیکھنا چھوڑ کر ہمارے پیچھے چلتے رہیں گے۔ حکومت یہ سوچ کر ہم پر ٹیکس لگا دے گی کہ ہم چلتے پھرتے سینما کے ٹکٹ بیچ کر کمائی کر رہے ہیں۔"

"دیکھو مجھے تم طعنے دے رہی ہو۔"

"اگر تم اسے طعنہ سمجھ رہے تو میں سوری کہتی ہوں۔ اب تمہیں سکھانے کا کوئی دوسرا طریقہ سوچنا ہو گا۔"

"نہیں پلیز کوئی دوسرا طریقہ نہ سوچنا۔"

"کیوں؟"

"یہ طریقہ اچھا لگتا ہے۔ جب میں نے تمہارے گال کو چوما تھا تو مجھے ایسا لگا۔ ایسا لگا..........."

میں سوچنے لگا۔ وہ بولی۔ "ہاں آگے بولو۔ اس طرح تمہیں رومانی انداز میں بولنا آئے گا اور ایسے وقت رکتے نہیں فوراً بولتے ہیں۔"

"ہاں میں مثال سوچ رہا تھا جب میں نے تمہارے گال پر ہونٹ رکھے تو ایسا لگا' منہ میں گلاب جامن آنے ہی والی ہے۔"

وہ چڑ کر بولی۔ "تمہیں تو کسی حلوائی کے گھر میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ تم نے کبھی شاعری کی کتاب نہیں پڑھی۔ کسی سے کوئی شعر سنا ہے؟"

"میں موٹے سے موٹے لوہے کو گرم کر کے اس پر ہتھوڑے مارتا ہوں۔ جب لوہا اپنی مضبوطی اور اکڑ کو بھول کر مڑ جاتا ہے۔ گھوم جاتا ہے۔ میری مرضی کے مطابق ڈھل جاتا ہے تو میری شاعری مکمل ہو جاتی ہے۔"

اسے چپ لگ گئی۔ وہ نازک جذبات کے بارے میں پھر کچھ نہ بولی۔ کیونکہ ہم ایسی راہوں پر چل رہے تھے' جہاں فولادی دشمنوں پر ہتھوڑے برسانا تھے۔ شاعری نہیں کرنی تھی۔ ہم نے ائرپورٹ سے باہر ایک ٹیکسی والے سے کہا۔ "ہمیں ایسے دو چار فائیو اسٹار ہوٹل میں لے چلو' جہاں ہمیں کشادہ اور آرام دہ کمرا مل سکے۔"

میں ڈرائیور کے ساتھ ٹرالی سے سامان اٹھا کر ڈگی میں رکھنے لگا ایسے ہی وقت ذرا فاصلے پر کھڑی ہوئی ایک کار کے عقب نما آئینے میں میری نظر گئی۔ ایک شخص اور ایک لڑکی کے بدن کا آدھا حصہ نظر آیا۔ اس شخص کے ہاتھ میں ایک پستول تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔ "تم باقی سامان رکھو۔ میں آتا ہوں۔"

بینا ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں وہاں سے جھکتا ہوا کار کے پیچھے گھوم کر پچھلے دروازے کی اس کھڑکی کے پاس آیا' جہاں پستول والا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ آگے

بیٹھے ہوئے شخص سے کہہ رہا تھا۔ "اگر تم نے اپنی گن خالی نہ کی اور باہر نہ گئے تو میں اس لڑکی کو گولی مار دوں گا۔ یہ میں دوسری بار کہہ چکا ہوں۔ اب تین تک گنتے ہی گولی چلا دوں گا۔"

لڑکی نے گارڈ سے کہا۔ "میں حکم دیتی ہوں۔ گن خالی کرو پھر باہر جاؤ۔"

گارڈ نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ جیسے ہی گن خالی کر کے دروازہ کھول کر باہر گیا۔ میں نے کھڑے ہو کر کھڑکی میں ہاتھ ڈالتے ہی پستول والے کی کلائی پکڑ کر نال اوپر کی۔ فائر ہوتے ہی گولی کار کی چھت سے سوراخ کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔ میری گرفت ایسی تھی جیسے اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ رہی ہو۔ اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ گیا تھا لڑکی نے اٹھا کر اسے نشانے پر لیا تو وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے دروازہ کھول کر اسے باہر کھینچا۔ دوسری طرف سے گارڈ دوڑتا ہوا آ گیا۔

فائرنگ کی آواز سن کر لوگ سہم کر پیچھے چلے گئے تھے۔ بینا ٹیکسی سے نکل کر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کتنے ہی پولیس والے آ گئے تھے۔ میں جانے لگا تو نوجوان لڑکی نے کہا "ٹھہرو! کون ہو تم؟"

"ایک مسافر ہوں۔ رنگون سے آیا ہوں۔ میں نے دور سے اس کار کے بیک مرر سے اس شخص کو پستول کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ اب مجرم سے پوچھ گچھ کریں۔ مجھے جانے دیں۔"

"یہ کوئی معمولی کیس نہیں ہے۔ آپ اپنا ایڈریس دے کر جائیں۔"

"ہم پہلی بار یہاں آئے ہیں۔ کسی ہوٹل میں جا رہے ہیں"

وہاں آنے والے تمام سپاہی اور پولیس افسران اس لڑکی کو سلیوٹ کر رہے تھے۔

لڑکی نے ایک افسر سے کہا۔ "ان صاحب کے ساتھ جاؤ۔ کسی بہترین فائیو اسٹار میں قیام کراؤ۔ ان سے کوئی بل نہ لیا جائے۔"

وہ افسر میرے ساتھ ٹیکسی کی طرف آیا۔ وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں اور بینا پچھلی سیٹ پر آ گئے۔ بینا نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ پولیس ہمارے ساتھ کیوں لگ گئی ہے؟"

افسر نے کہا۔ "میڈم! پریشانی کی بات نہیں ہے۔ ان صاحب نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ مس پدمنی کی جان بچائی ہے۔"

"یہ مس پدمنی کون ہیں؟"

"یہ ہم نہیں بتا سکتے۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ بہت بڑے باپ کی بیٹی ہیں۔ ہوٹل پہنچنے کے بعد ایک کریڈٹ کارڈ ملے گا۔ بھارت کے کسی بھی بڑے شہر میں جا کر آپ شاپنگ

کریں گے تو کوئی آپ سے قیمت وصول نہیں کرے گا۔ جب تک آپ یہاں رہیں گے، اس شہر کے بے تاج بادشاہ اور ملکہ بن کر رہیں گے۔"

میں نے اور بینا نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "اس مجرم کو پولیس نے اپنی تحویل میں لیا اور مس پدمنی کے حکم سے آپ میرے ساتھ چلے آئے۔ مس صاحبہ نے آپ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ پھر آپ اپنی طرف سے کیوں کہہ رہے ہیں کہ ہمیں یہاں ہر طرح کی سہولتیں ملیں گی؟"

"ایک تو وہ بہت بڑے باپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ ان کی ہر فرمائش پوری کی جاتی ہے۔ پھر مس صاحبہ بہت نیک اور ہر ایک سے نرمی اور محبت سے پیش آتی ہیں اور ضرورت مندوں پر دولت لٹانے کے معاملے میں حاتم طائی کی بیٹی ہیں۔ آپ خود دیکھیں گے کہ میں کہاں تک درست کہہ رہا ہوں۔"

ہم ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں پہنچے۔ کاؤنٹر پر پوچھا۔ "کیا ایک ڈبل بیڈ روم مل جائے گا؟"

پولیس افسر نے کہا۔ "سر! روم نہیں ایک لگژری سوئٹ لیں۔ اور ایک دن کے لیے نہیں، ایک برس یا دس برس کے لیے لیں۔ آپ کے پاس نہ رہنے کا بل آئے گا نہ کھانے کا بل۔"

میں نے کہا۔ "سوری ہم اپنی اوقات کے مطابق روم میں رہیں گے اور اپنے کھانے پینے کا تمام بل خود ادا کریں گے۔"

"سر! آپ ہمارے مہمان ہیں۔"

"کیا رنگون سے آنے والے سب ہی آپ کے مہمان ہوتے ہیں؟"

"یہ بات نہیں آپ دوسروں سے الگ ہیں۔"

"پلیز آپ مس پدمنی سے فون پر کہہ دیں۔ ہم اپنے پسینے کی کمائی کھاتے ہیں۔ کسی کے نہ محتاج رہتے ہیں اور نہ کسی کا احسان لیتے ہیں۔"

اس نے فون پر رابطہ کیا۔ پھر کہا۔ "آپ کے مہمان احسان کا بدلہ نہیں لینا چاہتے۔ یہاں اپنے اخراجات پر رہنا چاہتے ہیں۔"

اس نے دوسری طرف کی بات سنی پھر ریسیور مجھے دیا۔ میں نے اسے کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو۔ میرا نام نثار احمد ہے اور میں اپنی وائف کے ساتھ رنگون سے آیا ہوں۔"

دوسری طرف سے پدمنی نے کہا۔ "دھنے واد مسٹر نثار احمد ہم آپ کو اور آپ کی وائف کو سواگتم (خوش آمدید) کہتے ہیں۔ اگر ہم اپنے من کی شانتی اور خوشی کے لیے

آپ دونوں کو اپنا مہمان بنانا چاہیں تو آپ ہمیں تھوڑی خوشی نہیں دیں گے؟"

میں نے کہا۔ "ہم آپ کی میزبانی دل و جان سے قبول کریں گے لیکن میزبانی اپنے گھر میں کی جاتی ہے۔ ہوٹلوں اور بازاروں میں نہیں۔ آپ ہمیں ایک دن ایک رات کے لیے اپنے گھر میں مہمان رکھیں۔ اگر گھر میں کوئی مجبوری ہو تو ہمیں ہوٹل میں ایک بار ڈنر پر بلا لیں۔ ہم دونوں بسرو چشم آئیں گے۔"

بینا نے مسکرا کر سر ہلا کر اشارے سے کہا۔ میں درست کہہ رہا ہوں۔ میں نے کہا۔ "جب میں نے آپ کو ایک قاتل سے بچایا تو میں نہیں جانتا تھا کہ آپ کون ہیں؟ آپ وہاں نہ ہوتیں، کوئی بچہ یا بوڑھا ہوتا تو میں اسے بھی اسی طرح بچانے کی کوشش کرتا۔ آپ اسے احسان نہ سمجھیں۔ ایک انسانی فرض سمجھیں۔ میرے فرض کی ادائیگی سے خوش ہو کر آپ ہمارے ساتھ کہیں بھی ایک کپ چائے پئیں گی تو اس طرح میری قدر دانی بھی ہو گی اور دوسرے دیکھنے والوں میں بھی انسانی فرائض کی ادائیگی کا حوصلہ بڑھے گا۔"

وہ بولی۔ "آپ نے تو ہمیں لاجواب کر دیا۔ ٹھیک ہے، آپ اپنے طور پر اس ہوٹل میں قیام کریں اور کل شام سات بجے میرے گھر تشریف لا کر میرے ساتھ ڈنر کریں۔ از اٹ رائٹ؟"

"ٹھیک ہے۔"

"تھینک یو۔ سی یو اگین۔ ریسیور افسر کو دیں۔"

میں نے افسر ریسیور کو دیا۔ اس نے پدمنی سے کچھ باتیں سنیں اور بار بار یس مس۔ یس مس کہتا رہا۔ پھر ریسیور رکھ کر بولا۔ "آپ اپنی مرضی سے اپنے اخراجات پر رہیں۔ مجھے صرف روم نمبر بتا دیں۔"

کاؤنٹر گرل نے کہا۔ "میں فورتھ فلور پر روم نمبر ۴۰۶ دے رہی ہوں۔"

وہ افسر بولا۔ "کل شام پانچ بجے میں آپ دونوں کو لینے آؤں گا۔ مجھے اجازت دیں۔"

وہ مصافحہ کر کے چلا گیا۔ ہم نے کاؤنٹر کے ایک کارڈ کی خانہ پری کی۔ کچھ ایڈوانس رقم جمع کرائی۔ پھر لفٹ کے ذریعے اپنے کمرے میں آگئے۔ ہوٹل کے ملازم ہمارا سامان لے آئے۔

ان کے جانے کے بعد بینا نے دروازے کو اندر سے بند کر کے کہا۔ "تم نے اس شہر میں قدم رکھتے ہی نیکی کی ہے لیکن اب ہوشیار رہنا پڑے گا۔ اس دیس کے پولیس افسران

اور کرائم برانچ والے یہ جانتے ہیں کہ پدمنی انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر جنرل کی بیٹی ہے۔ اس سے آگے صرف میں جانتی ہوں۔"

"تم کیسے جانتی ہو؟ اور کیا جانتی ہو؟"

"میں دو برسوں تک شلپا کا رول ادا کرتی رہی ہوں۔ "را" کے اندر کی بہت سی باتیں جانتی ہوں۔ پدمنی "را" کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ جمنا پرساد دھاون کی بیٹی ہے۔ یہ حقیقت پولیس اور انٹیلی جنس والے بھی نہیں جانتے ہیں۔"

"ہوں۔ یہاں پہنچتے ہی "را" والوں سے رشتے داری پیدا ہو رہی ہے اور یہ رشتے داری ہمیں یا انہیں کبھی مہنگی پڑ سکتی ہے۔"

بینا واقعی کالیا کی بیٹی شلپا کا رول ادا کرتی رہی تھی اس لئے کالیا کی طرح "را" کے اندر کی بہت سی باتیں جانتی تھی۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ ممبئی شہر پہنچتے ہی مہمانی اور میزبانی کے نام پر "را" والوں سے رشتہ داری پیدا ہو رہی ہے اور یہ رشتے داری ہمیں یا انہیں مہنگی پڑنے والی ہے۔

بینا نے کہا۔ "تم نے انسانی فرض سمجھ کر پدمنی کو ایک دشمن سے بچایا۔ بعض حالات میں فرائض کی ادائیگی جی کا جنجال بن جاتی ہے۔ ویسے "را" والے ہمیں کبھی پہچان نہیں سکیں گے۔ بس تمہارے شرمانے اور جھجکنے والی حماقت سے ڈرتی ہوں۔"

"میں بھلا کس بات سے شرماؤں گا۔"

"میں نے تمہیں سبق کی طرح پڑھایا تھا کہ میاں بیوی کس طرح دوسروں کے سامنے بے تکلفی سے ملتے اور رومانی گفتگو کرتے ہیں۔"

"تم نے جو سبق پڑھایا ہے یا سمجھایا ہے' اسے میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔"

"مگر یہ تو سمجھنا چاہئے کہ کس وقت کیا کرنا چاہئے؟ میں کسٹم والوں کے سامنے سامان اٹیچی میں رکھ رہی تھی۔ تم نے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ ٹھنڈی بوتل پیتے وقت ٹھسکا لگا تو میرے گال کو چوم لیا۔"

"اب مجھے ٹھسکا لگنے اور کھنکارنے کا فرق معلوم ہو گیا ہے۔ تمہارے گال کی طرف بڑھنے سے پہلے اچھی طرح غور کر لوں گا۔"

"فرمان کل ہم ڈنر پر پدمنی کے گھر جائیں گے۔ اگر میں کسی وجہ سے کھنکاروں گی تو پڑھائے سبق کے مطابق تم میرے گال چوم لو گے۔ یہ نہیں سمجھو گے کہ ہم کسی کلب یا ریستوران میں نہیں ہیں۔ "را" کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کے گھر میں ہیں۔ وہ لوگ مکار ہیں سمجھ لیں گے کہ ہم میاں بیوی کی ایکٹنگ کر رہے ہیں۔"

"تو پھر ہم ان چالاک اور مکار لوگوں کو کس طرح شک و شبہے سے باز رکھیں گے؟"

"جو صحیح معنوں میں میاں بیوی ہوتے ہیں۔ ان کی گفتگو سے' اپنائیت سے اور بے اختیار محبت کے مہذب اظہار سے خودبخود میاں بیوی ہونے کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ نفسیاتی سچائی میاں بیوی کی رازدارانہ قربت سے حاصل ہوتی ہے۔"

اس نے سوئچ بورڈ کے پاس جا کر ایک لائٹ کو بجھاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں "را" والوں کے شکنجے میں جانے نہیں دوں گی۔"

کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ اس کی آواز سنائی دی۔ "میرا دل اور میرے اندر کی آتما کہتی ہے کہ تم عیاش اور ہوس پرست نہیں ہو۔ ایک بار جسے اپنا لو گے' اس کے ساتھ ساری زندگی گزارو گے۔"

تاریکی میں اس کی آواز قریب آتی گئی پھر اس کی گداز بانہیں میری گردن کے گرد آ گئیں۔ دل سے دل لگ کر دھڑکنوں کی زبان سمجھانے لگا۔ یہ سمجھانے لگا کہ دنیا کی تمام کتابیں روشنی میں پڑھ کر سمجھی جاتی ہیں۔ صرف ایک کتاب ایسی ہے جسے تاریکی میں پڑھ کر سمجھا جاتا ہے۔

دوسری صبح میں اپنے معمول کے خلاف دیر تک سوتا رہا۔ بینا نے دن کے دس بجے جگا کر پوچھا۔ "کیا سوتے ہی رہو گے؟ چلو اٹھو۔ غسل کرو۔ لباس پہنو پھر میں ناشتے کا آرڈر دوں گی۔"

میں نے اسے اپنے اوپر کھینچ کر کہا۔ "میرا ناشتا' کھانا اور اوڑھنا بچھونا تو تم ہی ہو۔"

وہ بولی۔ "کیا تمہیں احساس ہو رہا ہے کہ یہ رومانی فقرے آپ ہی آپ تمہارے اندر سے نکل رہے ہیں؟"

میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ارے ہاں' میں نے کچھ سوچ کر نہیں' بے اختیار ایسا کہا ہے۔"

"یہی ازدواجی زندگی کی نفسیاتی سچائی ہے۔ اب تم میرے ساتھ ایسے رہو گے کہ "را" والوں کی چالاکیاں اور مکاریاں دھری کی دھری رہ جائیں۔ چلو اب دیر نہ کرو۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

میں باتھ روم میں چلا گیا۔ غسل کرتے وقت سوچنے لگا۔ بینا میری زندگی میں بڑی تبدیلیاں لا رہی ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں بینا کی دنیا میں داخل ہو کر ایک نئی زندگی کا آغاز کر رہا ہوں۔

میں غسل سے فارغ ہو کر آیا تو ہوٹل کا ملازم میز پر ناشتے کی ٹرے رکھ رہا تھا پھر وہ

چلا گیا۔ میں نے کہا۔ "ٹرالی منگوانا چاہئے تھی ٹرے میں مختصر سا ناشتا منگوایا ہے جبکہ تمہیں بھوک لگ رہی تھی۔"

"دن کے گیارہ بج رہے ہیں۔ دو گھنٹے بعد لنچ کا ٹائم ہو جائے گا۔"

میں میز کے دوسری طرف بیٹھ کر بولا۔ "اب ہمیں "را" والوں کے سلسلے میں غور کرنا ہو گا۔"

"ناشتا بھی کرتے رہیں گے اور غور بھی کرتے رہیں گے۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اٹھ کر فون کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "یہ ہمارے میزبانوں کا فون ہو گا۔"

میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا کر پوچھا۔ "ہیلو کون؟"

دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ "ہیلو رات تو گزر گئی۔ دن نہیں گزرے گا۔"

"پلیز اپنا نام بتائیں۔ تعارف کرائیں۔"

"میرا نام مہربان ہے۔ پہلے مہربانی کرتا ہوں پھر نامہربانی۔ مہربانی یہ ہے کہ کمرے میں جو ناشتا آیا ہے' اسے منہ نہ لگانا۔ ابھی میں تمہیں زندہ رکھ کر تمہارا جغرافیہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بینا سے کہا۔ "ناشتے کو ہاتھ نہ لگانا۔"

میں نے فون پر کہا۔ "آپ ڈرامائی انداز میں بول رہے ہیں۔ میں آپ کی مہربانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن آپ نامہربان کیوں ہوں گے۔ میں انڈیا میں پہلی بار آیا ہوں۔ یہاں میرا دوست دشمن کوئی نہیں ہے۔"

"یہ تمہاری بدقسمتی ہے کہ آتے ہی مجھے دشمن بنا لیا۔ میرا ماتحت پدمنی کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ تم نے اسے پکڑوا دیا۔"

"آئی سی۔ ساری باتیں سمجھ میں آ گئیں۔ میری بات بھی سمجھ لو۔ پدمنی میرے لئے اجنبی تھی۔ میرا کوئی اپنا ہو یا پرایا' اگر اسے نقصان پہنچایا جائے گا تو میں اس کی ہڈیاں توڑ سکتا ہوں پھر کسی بے قصور پر حملہ کراؤ۔ مجھے وقت اور جگہ بتا دو۔ میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اس وقت تک بینا میرے قریب آ کر ریسیور سے کان لگا کر سن رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "فرمان! تم نے پہچانا؟ یہ پتامبر بجاج کی آواز تھی۔"

"ہاں۔ میں اس کی آواز بھلا کیسے بھول سکتا ہوں۔ وہ ہمیں رنگون سے آئے ہوئے

اجنبی سمجھ کر اپنی ہی آواز میں بول رہا تھا۔"

"بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ پتامبر بجاج اپنی ناکامیوں کا بدلہ "را" کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ سے لینے کے لئے اس کی بیٹی کو اغوا کرنا چاہتا تھا۔ تم نے اسے ناکام بنا دیا۔ یہ ناشتا ضرور زہریلا ہو گا۔"

میں نے ریسیور اٹھا کر ہوٹل کے ٹیلی فون پر آپریٹر سے کہا۔ "انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر جنرل سے بات کراؤ۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو میں شیرٹن ہوٹل کے کمرا نمبر406 سے بول رہا ہوں۔ میرا نام نثار احمد ہے۔ میں ڈائریکٹ ڈی جی صاحب سے یا ان کی صاحب زادی مس پدمنی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"جسٹ اے منٹ۔"

میں نے انتظار کیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "ہیلو مسٹر نثار احمد! میں ڈی جی دھاون بول رہا ہوں۔ میں نے ہوٹل کے نام اور کمرا نمبر سے آپ کو پہچان لیا ہے۔ میں کل ہی فون پر آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا لیکن میری بیٹی میری جان ہے اور میں اپنی جان بچانے والے کا شکریہ دور سے فون پر کرنا مناسب نہیں سمجھ رہا تھا آج شام کا انتظار کر رہا تھا۔"

"ڈی جی صاحب! زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ شام کو آپ کے پاس ہم میاں بیوی کی لاشیں پہنچنے والی تھیں۔ ابھی ہمارے کمرے میں جو ناشتا رکھا ہوا ہے۔ شاید یہ زہریلا ہے۔"

"آپ شاید کا لفظ استعمال کر رہے ہیں۔ یعنی آپ کا شبہ ہے۔"

"جی ہاں۔ ایک نامعلوم شخص نے فون پر ہم سے کہا ہے کہ پہلے وہ ہم پر مہربانی کرے گا۔ اس کے بعد نامہربانی۔ اس نے مہربانی کے طور پر بتایا کہ ہمارا ناشتہ زہریلا ہے اور نامہربانی کے طور پر آئندہ وہ ہمیں ہلاک کرنے والا ہے۔"

"ناشتا جہاں رکھا ہے' وہیں رہنے دو۔ ابھی میں انکوائری ٹیم کے ساتھ آ رہا ہوں۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ بینا نے کہا۔ "تم ذہین اور چالاک ہو۔ اس کے باوجود کہتی ہوں' ہم دونوں کی زبان پر پتامبر بجاج کا نام نہ آئے۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ تھوڑی دیر میں ایسا لگا جیسے اس ہوٹل میں زلزلہ آ گیا ہے۔ اندر اور باہر فوجی جوان آ گئے تھے۔ معاملہ پولیس کا تھا مگر فوج کو بلایا گیا تھا۔ ان کے ساتھ فوڈ انسپکٹر اور کئی ڈاکٹرز تھے۔ ڈی جی دھاون نے ہمارے کمرے میں آ کر مجھ سے

مصافحہ کیا۔ بینا کے سر پر ہاتھ رکھ کر آشیرواد دی۔ ڈاکٹر نے ناشتے کو چیک کرنے کے بعد کہا۔ "سر! یہ زہریلا ہے۔"

ڈی جی دھاون نے مجھ سے کہا۔ "دشمن نے زہریلے ناشتے کی اطلاع دے کر مہربانی نہیں کی ہے بلکہ نفسیاتی حملہ کیا ہے۔ تاکہ تم خوف زدہ رہو کہ اس زہریلے ناشتے کی طرح کسی وقت بھی اچانک موت آسکتی ہے۔"

ہوٹل کے بڑے کچن میں تمام کھانوں کا طبی معائنہ ہو رہا تھا اور رپورٹ دی جا رہی تھی کہ وہاں کوئی بھی کھانا زہریلا نہیں ہے۔ تمام ویٹرز اور بیروں کو ایک قطار میں کھڑا کیا گیا۔ منیجر سے پوچھا گیا۔ کیا صبح نو بجے کے بعد کسی ویٹر یا دوسرے ملازم کی ڈیوٹی تبدیل ہوئی ہے؟ منیجر نے کہا۔ "نو سر! یہ صبح کی شفٹ کے ملازم ہیں۔"

مجھ سے اور بینا سے کہا گیا کہ کمرے میں ناشتا لانے والے ملازم کو پہچانیں۔ ہم نے ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا پھر کہا۔ "ان میں سے کوئی نہیں ہے۔"

یوں نتیجہ نکالا گیا کہ کوئی ہوٹل کے بیرے کی وردی پہن کر ہمارے کمرے میں ناشتا لایا تھا۔ ہوٹل کے عملے کو اپنا اپنا کام کرنے کی اجازت دی گئی۔ ڈی جی دھاون نے ہمارے کمرے میں ایک صوفے پر بیٹھ کر کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔ آپ دونوں پہلی بار ہمارے دیس میں آئے ہیں اور میرے دشمنوں نے آپ کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ ہم آئندہ محتاط رہیں گے۔"

"کیسے فکر نہ کروں؟ کل میری بیٹی آپ کو مہمان بنانا چاہتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں آپ کے لئے گارڈز بھی ہوتے۔"

بینا نے کہا۔ "وہ گارڈز بھی ہوٹل کے تمام ملازمین کو چہرے سے نہیں جانتے ہیں۔ وہ ہمارے کمرے میں آنے والے کسی ملازم کی تلاشی لے سکتے ہیں لیکن کھانے میں چھپے ہوئے زہر کو کیسے چیک کرتے؟"

وہ قائل ہو کر بولا۔ "تم بھی ٹھیک کہتی ہو۔ چلو سامان پیک کرو۔ تم دونوں میرے بنگلے کی انیکسی میں رہو گے۔"

میں نے کہا۔ "سر! آپ ہماری حفاظت کے لئے فکر مند ہیں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ لیکن میں اس فون کرنے والے اجنبی کو چیلنج کر چکا ہوں۔"

"کیسا چیلنج؟"

"میں نے کہا ہے' میں یہاں پہلی بار آیا ہوں اور کسی مس پدمنی کو نہیں جانتا ہوں۔ اگر اس کا آلہ کار قاتل بچے یا بوڑھے کو بھی گن پوائنٹ پر اغوا کرنا چاہتا تو میں

انہیں بھی بچانے کے لئے اس مجرم کے ساتھ وہی سلوک کرتا۔ اگر اسے یقین نہیں ہے تو وہ کہیں ایسی واردات کرے اور مجھے اس جگہ کا پتا بتا دے۔ میں تنہا آکر اسے واردات کرنے سے پہلے ہی اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔"

اس نے کہا۔ "ذرا اپنا ہاتھ دکھاؤ۔"

میں نے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے ہاتھ کو ٹٹول کر پوچھا۔ "تم نے جس مجرم کو پکڑا ہے' جانتے ہو اس کی میڈیکل رپورٹ کیا آئی ہے؟"

میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ "تم نے اس کی جس کلائی کو پکڑا تھا۔ اس کلائی کی ہڈی ترخ گئی ہے۔ تم گوشت پوست کا جسم رکھتے ہو مگر فولاد ہو۔ یہ تو تم جانتے ہو گے کہ فولادی انسان بھی زہر سے مر جاتا ہے۔ یا چھپ کر اس پر گولیوں کی بارش کی جا سکتی ہے لیکن میرے بنگلے کے چاروں طرف میلوں دور تک کوئی دشمن قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا میرے ساتھ رہو۔"

"آپ کے ساتھ رہنے میں آپ کا نقصان ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"دشمن ہم سے دور ہو جائے گا۔ ہمیں' آپ کو اور آپ کی صاحب زادی کو اس شہر میں نہ سہی' کسی دوسرے شہر یا دوسرے ملک میں جانی نقصان پہنچائے گا۔ آپ ہم سے زیادہ تجربے کار ہیں پھر بھی ہم کہتے ہیں کہ دشمنوں کو قریب آنے کا موقع دینا چاہئے۔"

"تم خطرہ مول لینے کی بات کر رہے ہو؟"

"خطرہ مول لینے سے پہلے حفاظتی انتظامات ہو سکتے ہیں مثلاً کسی ریسٹ ہاؤس میں ہماری رہائش کا انتظام کر دیں۔ وہاں آپ کے بھروسے کا باورچی ہمارے لئے کھانا تیار کیا کرے لیکن یہ کسی بھی طرح ظاہر نہ ہو کہ یہ سب کچھ آپ کر رہے ہیں۔ ہمارے ریسٹ ہاؤس کے سامنے کسی مشہور کمپنی کی رینٹڈ کار رکھی جائے گی۔ اس کمپنی کے رجسٹر سے یہی معلوم ہو گا کہ ہم نے وہ کار کرائے پر حاصل کی ہے اور ہو سکے تو مجھے ایک ریوالور اور بلٹس دے دیں۔"

"تمہیں اسلحہ بہت مل جائے گا مگر تم ایسی ذہانت سے کام کر رہے ہو جیسے کوئی ماہر جاسوس کرتا ہے۔"

"رنگون میں میرا باڈی بلڈر کا کلب تھا۔ وہاں میرا ایک خاص ڈاکٹر کہتا تھا کہ تم ویسے تو ہر معاملے میں نارمل ہو مگر دماغ گرم ہو جائے تو کسی کی مخالفت برداشت نہیں کر سکتے۔"

ڈی جی دھاون نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہارے ڈاکٹر نے بالکل درست کہا ہے۔ تم ہو

بہت ضدی۔"

اس نے جیب سے ایک موبائل فون دے کر کہا۔ "یہ میرا ایکسٹرا فون ہے۔ آئندہ اسی فون سے رابطہ کرو۔ اس فون کے اور میرے پرسنل فون کے نمبر نوٹ کرو۔ ابھی چند گھنٹے کے اندر اطلاع دوں گا کہ ریسٹ ہاؤس میں تمہارے لئے انتظامات ہو چکے ہیں۔"

وہ مصافحہ کر کے چلا گیا۔ ایک افسر باہر سے پیک کیا ہوا لنچ ہمارے لئے لے آیا اور یقین دلایا کہ ڈاکٹر اسے چیک کر چکا ہے۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کھانے کے دوران میں کہا۔ "یہ وہی ڈی جی دھاون ہے۔ جس نے آپی (تابانی) کے ذریعے امی کو پاکستان سے اغوا کرایا تھا اور یہاں امی کو خفیہ قید خانے میں رکھا تھا۔ میں چاہتا تو ابھی اس کی گردن توڑنے میں دیر نہ لگتی لیکن میں نے صبر کیا ہے کیونکہ اس کی جڑوں میں گھسنے کے راستے ہموار ہو رہے ہیں۔"

"مجھے یاد ہے۔ کیپٹن امیر حمزہ نے بہت سی حکمت عملی سکھائی ہے اسی لئے تمہیں دماغ ٹھنڈا رکھنا آ گیا ہے۔ بعض اوقات انتقامی کارروائی کو پس پشت رکھ کر یہ سمجھنا چاہئے کہ آگے چل کر دشمنوں سے کیسے فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں پھر کس طرح انہیں عبرتناک انجام تک پہنچایا جا سکتا ہے۔"

کھانے کے بعد ہم اپنا سامان پیک کر رہے تھے۔ موبائل فون سے بزر سنائی دیا۔ میں نے اسے آن کر کے کان سے لگایا اور کہا۔ "ہیلو' میں ہوں نثار احمد۔"

"میں ہوں دھاون! انتظامات ہو چکے ہیں۔ ہوٹل کے باہر تین ٹیکسیاں کھڑی ہیں۔ کسی چوتھی کو وہاں رکنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ان تین ٹیکسیوں کے تینوں ڈرائیور انٹیلی جنس کے آدمی ہیں۔ کتنی دیر میں جا رہے ہو۔"

"بس ابھی نکل رہے ہیں۔ ایک بات آپ سے کہتا ہوں اپنے کسی جاسوس سے ریسٹ ہاؤس کی نگرانی نہ کرائیں۔ دشمن چالاک ہے۔ آپ مجھ پر بھروسا رکھیں۔ میں اسے قریب لانے کے لئے ایسا کر رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے' جو کہو گے' وہی ہو گا۔ میری بیٹی تم سے اور اپنی بھابی سے ملنے کے لئے بے چین ہے۔"

"ذرا ایک منٹ' ابھی بات کرتا ہوں۔"

میں نے کچھ سوچا پھر کہا۔ "میں آج اور کل دشمن کا انتظار کروں گا۔ اگر وہ نہ آیا تو آپ میری درخواست مان لیں۔"

"بولو' کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"پرسوں صبح مس پدمنی کے قد اور جسامت کی لڑکی کو اس طرح اپنی بیٹی کی کار میں ریسٹ ہاؤس بھیجیں جیسے مس پدمنی ہم سے ملنے آ رہی ہوں۔"

"سمجھ گیا' اچھی پلاننگ ہے۔ وش یو گڈ لک۔"

میں نے فون بند کر دیا۔ بینا نے ہوٹل سے باہر آ کر دیکھا۔ تین ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ میں نے ایک ٹیکسی کے ڈرائیور سے پوچھا۔ "ریسٹ ہاؤس کے باورچی کا گھر جانتے ہو؟"

"سر! وہ ریسٹ ہاؤس میں ہی ملے گا۔"

میں نے کہا۔ "یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"معافی چاہتا ہوں سر! میں باورچی کا گھر جانتا ہوں۔"

میں نے بینا کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "پہلے ہم باورچی کے گھر جائیں گے۔ اس کے بعد ریسٹ ہاؤس۔"

ٹیکسی چل پڑی۔ بینا نے کہا۔ "اچھا ہے' اس طرح ہم ممبئی شہر دیکھتے چلیں گے۔"

میں نے کہا۔ "یہ شہر ایسا ہے کہ اسے دیکھنے کے لئے چار آنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اچھا ہوا تم ساتھ ہو۔ دو آنکھیں تمہاری' دو میری' یوں چار آنکھیں ہو گئیں۔"

وہ ہنسنے لگی پھر بولی۔ "تمہاری ان باتوں کا مطلب کیا ہوا؟"

"بھئی کچھ باتوں کا مطلب بیوی کو تنہائی میں سمجھایا جاتا ہے۔"

"اچھا بس' فضول باتیں نہ کرو۔"

وہ بڑے ناز و انداز میں بولی۔ میں نے دل میں تسلیم کیا کہ اس نے مجھے اور خود کو میاں بیوی کے نفسیاتی انداز میں ڈھال لیا ہے۔

فون کا بزر سنائی دیا۔ میں نے اس کا بٹن دبا کر کان سے لگایا۔ پھر کہا۔ "ہیلو نثار احمد بول رہا ہوں۔"

"ہیلو بھیا' میں پدمنی ہوں۔ آپ سے اور بھابی سے ملنے کے لئے بے چین ہوں۔ پاپا نے کہا ہے' جلد ہی ہماری ملاقات ہو گی۔"

"ہاں ایک بکرے کا انتظار ہے۔ اس کی بلی (قربانی) چڑھائی جائے گی پھر کیتو اور راہو (نحوست) کا سایہ تمہارے سر سے ٹل جائے گا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "میں آپ کا اشارہ سمجھ گئی ہوں لیکن آپ ہندی پڑشہ سامان لے بول لیتے ہیں؟"

"تم کیا سمجھتی ہو۔ رنگون میں ہندو نہیں ہوتے۔" لے بالوں

"اچھا چلیں بھابی سے بات کرائیں۔"

میں نے فون بینا کو دے کر کہا۔ "پدمنی........"

بینا نے اسے کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو........."

"ہیلو میں ہوں۔ میں نے آپ کے پتی کو بھیا کہا ہے۔ آپ میری بھابی ہیں نا؟"

"ہاں تمہاری بھابی کہلاتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ ہم رشتے دار ہو گئے لیکن ایک دوسرے کو دیکھے بغیر........"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "آپ جانتی ہیں' بھیا ابھی کیا کہہ رہے تھے؟"

وہ پھر ہنسنے لگی۔ بینا نے کہا۔ "پہلے اچھی طرح ہنس لو پھر بولو۔"

"وہ........ وہ بھیا کہہ رہے تھے کہ ایک بکرے کا انتظار ہے۔ پہلے اسے بلی چڑھائیں گے پھر ہم ملیں گے اور میں ان کا اشارہ سمجھ گئی۔"

"تم سمجھ دار ہو' ذرا سوچ کر بتاؤ تمہیں اغوا کرنے کی کوشش کون کرے گا؟ یہ نہ کہنا کہ تمہارے پاپا کے بہت سے دشمن ہیں۔ میں نے ائرپورٹ پر تمہیں دور سے دیکھا تھا' تم بہت خوبصورت ہو۔ اس بات کو سامنے رکھ کر سوچو۔"

"آپ کی بات دل کو لگ رہی ہے۔ بس ابھی اس بات پر غور کروں گی۔"

"اور ایک بات پدمنی! یہ نہ بھولنا کہ حسین لڑکیوں کو دیکھ کر صرف جوان ہی نہیں بوڑھے بھی للچاتے ہیں۔"

"او گاڈ! بھابی! ایک دم سے ابھی میرے دماغ میں ایک بجلی سی کوند گئی ہے۔ وہ بالکل بوڑھا تو نہیں مگر چالیس پچاس برس کے درمیان ہو گا۔ وہ مجھے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس کا نام پتامبر بجاج ہے۔"

"ہم یہاں کے لوگوں کو نہیں جانتے۔ پتا نہیں یہ پتامبر بجاج کون ہے؟ تم ابھی فوراً اپنے پاپا کو یہ بتاؤ۔ یہ بات اہم ہے۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ بینا نے مجھے آنکھ مار کر کہا۔ "کسی پتامبر بجاج کے بارے میں کہہ رہی تھی کہ وہ اسے للچائی نظروں سے دیکھتا تھا۔ میں نے مشورہ دیا ہے کہ یہ بات فوراً ڈی جی صاحب کو بتائی جائے۔"

میں مسکرانے لگا۔ ٹیکسی غریبوں کے ایک علاقے کی گلی کے پاس رک گئی۔

ڈرائیور نے باہر آ کر کہا۔ "گاڑی گلی کے اندر نہیں جا سکے گی۔ یہاں سے چند قدم "ذرا ایہ

میں نے کچھ تر کر اس کے ساتھ گلی میں گئے۔ ایک چھوٹے سے مکان کا دروازہ آپ میری درخواست بچے مٹی دھول میں کھیل رہے تھے۔ ڈرائیور نے دستک دی۔

"بولو' کیا کہنا چا۔

اندر سے کسی عورت نے کہا۔ "دروازہ کھلا پڑا ہے پھر ٹھک ٹھک کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

وہ بڑبڑاتے ہوئے دروازے پر آئی۔ وہ ایک بھرپور نوجوان عورت تھی۔

ڈرائیور نے پوچھا۔ "کل تو تم یہاں نہیں تھیں۔ یہاں تو رامو مہاراج (اکثر ہندو باورچی کو مہاراج کہتے ہیں) رہا کرتے تھے؟"

"اب بھی رہتے ہیں۔ کام کیا ہے؟"

"ایک بڑے بنگلے میں اچھی نوکری ہے۔ چار ہزار پگار (تنخواہ) دیں گے۔"

"ہائے میری میا! چار ہجار۔ میں رامو بھیا کو کھبر بھیجوں گی کل آ کے لے جاؤ۔"

"رامو مہاراج تمہارے بھیا ہیں۔"

"میرے ان کے بھائی ہیں۔ میں رامو بھیا کے چھوٹے بھائی کی لگائی ہوں۔ آج سبیرے بارہ بجے یہاں رہنے کو آئی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "آج پتا چلا۔ بارہ بجے سویرا ہوتا ہے' چلو یہاں سے۔"

ہم واپس آ کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ راستے میں خاموشی رہی۔ میں اور بینا اپنے اپنے طور پر سوچتے رہے۔ اس جاسوس ڈرائیور کے سامنے اظہار خیال مناسب نہیں تھا۔

ہم شام چھ بجے ریسٹ ہاؤس پہنچے۔ رامو نے دروازہ کھولا۔ ایک ایک کمرا دکھایا۔

میں نے پوچھا۔ "تم کچھ تھکے تھکے سے پریشان لگ رہے ہو؟"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "بوڑھا ہو گیا ہوں سرکار! جیادہ کام سے تھک جاتا ہوں مگر تین بکھت کا کھانا پکا لیتا ہوں۔ آپ کو ٹھیک بکھت پے کھانا مل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے' ہمارے لئے آٹھ بجے کھانا لے آنا۔"

میں نے فون پر ڈی جی دھاون سے ضروری باتیں کیں۔ اپنے ریسٹ ہاؤس پہنچنے کی اطلاع دی۔ دھاون نے کہا۔ "بستر کے گدے کے نیچے ایک پستول اور چار لوڈڈ میگزین ہیں۔ باقی ضرورت کی چیزیں اور رینٹڈ کار کل صبح پہنچ جائیں گی۔"

میں نے فون بند کر کے دروازہ بند کر دیا پھر بینا کے ساتھ پیار بھرے لمحات گزارتا رہا۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر دروازہ کھولا تو رات کے آٹھ بجنے

صوفے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ رامو مہاراج ایک ٹرے ہاتھ ہوں۔"

بولا۔ "ٹھیک آٹھ بجے کھانا لایا ہوں۔ ابھی کھائیں گے یا د، ستین اور ٹارچ کا سامان لے

میں نے کہا۔ "لے آؤ۔"

وہ کمرے کے اندر بوڑھے قدموں سے آیا پتامبر بجاج کے بالوں

پھینک دی۔ اس پر رکھی ہوئی ڈش کے برتن خالی تھے۔ اس نے ٹرے کے نیچے ایک ہاتھ میں ریوالور پکڑا ہوا تھا اور میں اس کے نشانے پر تھا۔

بینا نے کہا۔ ”مہاراج! تم بہت بوڑھے ہو چکے ہو۔ ریوالور کے وزن سے تمہارے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”میری بات مانو‘ اپنے ایک طرف فرش پر دو فائر کرو۔ دشمن کو یقین ہو جائے گا کہ ہمارا کام تمام ہو چکا ہے۔ غلام پھر غلام ہوتا ہے۔ دشمن لاکھ مجبور کرے پھر بھی وہ اپنے آقا کا حکم مانتا ہے۔ کم آن فائر کرو۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بولا۔ ”مالک! میں مجبور ہوں۔ میں آپ دونوں کو قتل نہیں کروں گا تو وہ معصوم بچوں کا گلا کاٹ دیں گے۔“

میں نے موبائل فون کے نمبر پنچ کئے۔ رابطہ ہونے پر کہا ”ہیلو میں نثار احمد۔ یہ فون رامو مہاراج کو دے رہا ہوں۔ بات کرا دو۔“

میں نے فون کو میز پر آگے بڑھا کر اس کی طرف بڑھا دیا پھر کہا۔ ”پہلے فون پر بات کرو پھر ہمیں گولی مارو۔“

اس نے محتاط انداز میں ریوالور کو ایک ہاتھ سے پکڑا۔ دوسرے ہاتھ سے فون اٹھا کر بولا۔ ”جی میں ہوں رامو مہاراج۔“

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”مہاراج تمہارے بھائی اور اس کی رکھیل (داشتہ) نے دشمن سے بیس ہزار لے کر تمہارے بچوں کو اغوا کیا تھا۔ جب ہم نے اس رکھیل کی اچھی طرح پٹائی کی تو اس نے اگل دیا کہ بچوں کو کہاں چھپا کر رکھا گیا ہے۔ اب تمہارے دونوں بچے ہمارے پاس ہیں۔ ان کی آواز سنو۔“

پھر وہ ایک ایک بچے کی آواز سننے لگا۔ خوشی سے رونے لگا۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور گر گیا تھا۔ وہ مجھے فون دے کر دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”بڑے صاحب‘ میرے بچوں کو بچالیا ہے۔ آپ میرے کو شما کر دیں۔“

... میرے قدموں میں گر گیا۔ میں نے کہا۔ ”میری ایک بات مانو گے تب معاف ... جی صاحب ... مسکرائے ... رہے ذرا دور فرش پر دو بار گولیاں چلاؤ پھر گھبراتے ہوئے برآمدے میں ... بیٹھ کر خوف سے کانپتے رہو جیسے پہلی بار تم نے دو انسانوں ... ڈرائیور نے باہر ...

”ذرا ...

میں نے کچھ ... تر کر اس ... ایت کے مطابق دور فرش پر دو گولیاں چلائیں اور پھر ... میں جا کر گر پڑا۔ اس کے بعد بیٹھ کر خوف سے ... آپ میری درخواست ... بچے ...

”بولو‘ کیا کہنا چا...

کانپنے لگا۔

ایک منٹ کے بعد ہی برآمدے میں قدموں کی آواز سنائی دی پھر ہم نے پتامبر بجاج کی آواز سنی۔ ”تم نے پہلی بار ایسا کام کیا ہے۔ اب پکڑے جاؤ گے تو میرا حلیہ بتاؤ گے۔ ”را“ کے ریکارڈ میں میری تصویریں ہیں۔ تم تصویر پہچان کر انہیں میرے پیچھے لگا دو۔ اس لئے اب تمہیں زندہ نہیں رہنا چاہئے۔“

اس نے پستول سے اس کا نشانہ لیا۔ میں نے دروازے کی آڑ سے اس کے ہاتھ پر گولی ماری۔ پستول ہاتھ سے گر گیا۔ وہ گھبرا کر بھاگنے لگا۔ میں نے اس کی ٹانگ پر گولی ماری تو وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

بینا نے برآمدے کے فرش پر پڑا ہوا اس کا پستول اٹھا لیا۔ میں نے موبائل فون کے ذریعے ڈی جی دھاون سے کہا۔ ”ہماری پلاننگ کامیاب ہوئی ہے۔ ہم نے یہاں آنے والے ایک مجرم کو زخمی کر دیا ہے۔“

”مسٹر نثار احمد! تم ہمارے سراغ رسانوں سے زیادہ ذہین اور کامیاب پلان میکر ہو۔“

”سر! ایک ضروری بات ہے۔ ہوٹل کے فون پر جس نے زہریلے کھانے کی اطلاع دے کر کہا تھا کہ آئندہ ہم اس کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔ یہاں پڑے ہوئے زخمی کی آواز بالکل وہی ہے۔ اب آپ یا آپ کے ماتحت اس سے اگلوا سکتے ہیں کہ یہ کون ہے؟“

”ریسٹ ہاؤس سے دو کلو میٹر دو ہمارے افسران ہیں‘ وہ آ رہے ہیں۔ میں بھی آ رہا ہوں۔“

پہلے وہ سراغ رساں آئے۔ ایک افسر نے دیکھتے ہی کہا۔ ”اوہو‘ پتامبر بجاج! اِٹ اِز یُو۔“

اس افسر نے فون پر کہا۔ ”سر! آپ آ رہے ہیں؟“

ڈی جی دھاون نے کہا۔ ”ہاں تم نے مجرم کو دیکھا ہے؟“

”یس سر! جسے ہم پچھلے ڈیڑھ سال سے تلاش کر رہے ہیں‘ یہ وہی پتامبر بجاج ہے۔“

”واہ‘ ہمارے اجنبی مہمانوں نے تو کمال کر دیا۔ میں پہنچ رہا ہوں۔“

افسر نے فون بند کر کے ماتحت سے کہا۔ ”ریکارڈنگ مشین اور ٹارچر کا سامان لے آؤ۔“

ماتحت گاڑی کی طرف گیا۔ دوسرا.......... ماتحت پتامبر بجاج کے بالوں

کر کھینچتا ہوا کمرے میں لے آیا پھر پوچھا۔ "تیرے ساتھ اور کون ہے؟"

"کوئی نہیں ہے۔ کالیا کی بیٹی شلپا نے مجھے دھوکا دے کر "را" کے اہم رازوں کی ادھوری نقلیں فوٹو اسٹیٹ کرا کے دیں۔ اس طرح آپ لوگ سمجھنے لگے کہ وہ تمام ٹاپ سیکرٹ میں نے چھپا رکھے ہیں۔"

ریکارڈنگ مشین آ گئی۔ اس کا بیان ریکارڈ ہونے لگا۔ اسے اذیتیں دینے کے آلات بھی آ گئے تھے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "یہ آلات مجھے مار ڈالیں گے۔ میں ایک ذرا سا بھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے سوچا آپ لوگوں کو ادھورے راز دے کر میں نے دھوکا دیا ہے۔ اس لئے آپ لوگوں نے انڈر پریشر رکھنے کے لئے میری بیٹی نرملا کو اغوا کیا ہے پھر میں نے اخبار میں پڑھا کہ میری بیٹی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ تب میں نے قسم کھائی کہ میں دھاون صاحب کی بیٹی کو اغوا کر کے قتل کروں گا۔"

"تم نے مس پدمنی کو اغوا کرنے میں ڈیڑھ مہینہ لگا دیا۔ اتنے دنوں تک کیا کر رہے تھے؟"

"آپ لوگوں نے میرے تمام بینک اکاؤنٹ سیل کر کے مجھے محتاج بنا دیا تھا۔ غیر ملکی بینکوں کے اکاؤنٹس بھی فریز کرنا چاہتے تھے لیکن میں نے لندن اور سوئزرلینڈ میں اپنے ایک دوست کے ذریعے بڑی بڑی رقمیں نکلوا لیں۔ یہاں اس رقم سے ایک خطرناک مجرم کو منہ مانگی رقم دے کر دھاون صاحب کی بیٹی کو اغوا کرنا چاہا۔"

اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "مگر نہ جانے یہ کہاں سے اچانک آ گیا۔ میری پلاننگ ناکام ہو گئی۔"

میں نے پوچھا۔ "تم ہوٹل میں زہریلے ناشتے کے ذریعے ہمیں آسانی سے ہلاک کر سکتے تھے پھر ایسا کیوں نہیں کیا؟"

"مجھے میڈیکل رپورٹ معلوم ہو گئی تھی کہ صرف میرے کرائے کے قاتل کی کلائی پکڑنے سے اس کی ہڈی تڑخ گئی تھی۔ تب میں نے سوچا' تم بہت کام کے آدمی ہو۔ میں کرائے کے مجرموں سے تمہیں زخمی کر کے پہلے اپنا قیدی بناؤں گا۔ تم کسی غیر لڑکی کو بچانے کے لئے جان پر کھیل سکتے ہو تو میری بیٹی پر ہونے والے مظالم کی روداد سن کر میرے ساتھ بھی انصاف کرو گے پھر تمہارے سامنے کچھ ثبوت پیش کروں گا کہ تم جس دھاون صاحب کو جانتے ہو' وہ "را" جیسی خطرناک تنظیم کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ہیں۔ تم شریف اور دلیر ہو۔ ان مجرموں کا ساتھ نہیں دو گے۔"

اس کا بیان جاری تھا۔ وہ مختلف سوالات کے جوابات دے رہا تھا۔ ایسے وقت ڈی

جی دھاون آ گیا۔ اس نے میری پیٹھ تھپک کر خاموشی سے داد دی۔ بینا کے سر پر ہاتھ رکھا پھر پتامبر بجاج سے پوچھا۔ "اپنی یہ چال سمجھاؤ کہ تمہیں پاکستانی سیاست دانوں سے کیا دلچسپی ہے؟"

"میں اپنی مقتول بیٹی نرملا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میرا وہاں کے سیاست دانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"پھر تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ ہم وہاں کے چار سیاست دان دردانہ کی پارٹی سے الگ کر کے روپوش کریں گے تو تم ہمارے وہ تمام راز ہمیں دے دو گے۔"

"آپ یقین نہیں کریں گے سر! یہ سب شلپا کی چالبازی تھی۔ آپ کے تمام اہم راز ابھی تک شلپا کے پاس ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ کسی جوان سے محبت کرتی ہے۔ اس سے شادی کر کے دیس سے باہر جا کر سکون سے زندگی گزارے گی اور مجھے وہ تمام راز دے کر چلی جائے گی۔"

"اور تم اتنے بے وقوف ہو کہ اس کی بات پر یقین کر کے ہمارے ذریعے پاکستانی اسمبلی میں دردانہ کی اکثریت کم کرا دی۔ ایسا کرنے سے شلپا کو کیا فائدہ پہنچا؟ سچ سچ بتاؤ۔ تمہارے پیچھے پاکستانی سیکرٹ ایجنٹس ہیں۔"

پھر اس نے ایک افسر سے کہا۔ "یہ آسانی سے نہیں بتائے گا اور یہاں اس پر ٹارچر کرنا مناسب نہیں ہے۔ اسے ہمارے انڈر گراؤنڈ ٹارچر سیل میں لے چلو۔"

اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ رامو مہاراج سے کہا گیا کہ وہ گھر جائے۔ اس کے بچے صحیح سلامت ہیں۔ اس کے بھائی اور اس کی رکھیل کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔

وہ سب چلے گئے۔ صرف ڈی جی دھاون کے باڈی گارڈز باہر رہ گئے۔ اس نے کہا۔ "اصلی مجرم گرفتار ہو چکا ہے۔ اب تم دونوں یہاں نہیں رہو گے۔ ابھی میرے ساتھ چلو۔ میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

اس بار ہم نے انکار نہیں کیا۔ اس کے ساتھ کار میں بیٹھ کر اس کی کوٹھی میں آئے۔ وہاں پدمنی نے ہم دونوں کو دیکھتے ہی پوچھا۔ "آپ میرے بھیا اور بھابی ہیں نا؟"

ہم دونوں مسکرانے لگے۔ پدمنی نے فوراً آگے بڑھ کر جھکتے ہوئے میرے پاؤں چھوئے۔ میں نے آشیرواد دی پھر وہ دوڑ کر بینا سے لپٹ گئی۔ بینا نے اس کی پیشانی کو چوم کر پوچھا۔ "تم فون پر کیسے ہنس رہی تھیں ذرا ہنس کر دکھاؤ۔"

وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ ڈی جی دھاون نے کہا۔ "یہ تو ہنسنے کے بہانے ڈھونڈتی رہتی ہے۔ مجھ سے بھی بات کرے گی تو پہلے ہنسے گی پھر بولے گی۔ اچھا بیٹی! جلدی سے کھانا

لگواؤ۔ ہم سب بھوکے ہیں۔"

پدمنی دوڑتے ہوئے چلی گئی۔ دھاون نے کہا۔ "نثار احمد! اب میں تمہیں مسٹر نہیں کہوں گا۔ تمہیں بیٹا کہوں گا۔"

بینا نے کہا۔ "اور ہم آپ کو پاپا کہیں گے۔"

دھاون نے پوچھا۔ "تم خطرات کے وقت نثار کے ساتھ رہتی ہو' تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

میں نے کہا۔ "یہ کیا ڈرے گی؟ یہ رنگون کے شوٹنگ کلب میں ہمیشہ سو فیصد مارکس حاصل کرتی تھی۔ اس نے کئی معاملات میں بڑی ذہانت سے مجھے مشورے دیئے ہیں۔ اسی شوٹنگ کلب سے ہمارا رومانس شروع ہوا اور اب یہ آپ کی بہو بنی بیٹھی ہے۔"

دھاون نے کہا۔ "بیٹی! سدا سہاگن رہو اور نثار احمد' میں تو کہتا ہوں یہیں رہ جاؤ۔ مجھے تمہارے جیسے ذہین اور دلیر بیٹے کی ضرورت ہے۔"

میں نے اور بینا نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دھاون نے کہا۔ "تمہارے پاس پاکستان کا ویزا ہے۔ کیا وہاں تمہارے رشتے دار رہتے ہیں؟"

"وہاں ہمارا کوئی نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہاں جانا ضروری ہے۔"

"تم دونوں مسلمان ہو۔ پاکستان سے تمہیں لگاؤ ہو گا لیکن یہاں بھی ایک کروڑ سے زیادہ مسلمان ہیں۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جو کبھی رشتے داروں سے ملنے جاتے ہیں پھر واپس آ جاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ سے اتنی محبت مل رہی ہے کہ ہم جائیں گے اور ایک ضروری کام کر کے چلے آئیں گے پھر ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گے۔"

"ایسا کیا ضروری کام ہے۔ مجھے بتاؤ' کیا میں تمہارے کام آ سکتا ہوں؟"

میں نے اور بینا نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ بینا نے سر جھکا لیا۔ دھاون نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

میں نے کہا۔ "میں اور بینا کل سے ایک ہی سوال میں اٹکے ہوئے ہیں کہ ہمیں آپ پر بھروسا کر کے اصلی بات بتانا چاہئے یا نہیں؟"

وہ صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر بولا۔ "ایسی کیا بات ہے کہ مجھ پر بھروسا کرنے کا فیصلہ نہیں کر پا رہے ہو۔"

بینا نے کہا۔ "ہم نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے نثار سے کہا ہے کہ جب ہم آپ کے اتنے کام کر رہے ہیں تو ہو سکتا ہے' پاکستان میں بھی آپ ہمارے کام آ سکیں۔"

"میں باپ ہوں' اپنی زبان سے تمہیں بیٹی اور اسے بیٹا کہہ رہا ہوں۔ میں باپ کی حیثیت سے حکم دیتا ہوں کہ کوئی راز ہے تو مجھے بتاؤ۔"

میں نے کہا۔ "آج سے پانچ برس پہلے برما کے کمیونسٹ گوریلوں نے میرے ماں باپ کو قتل کر دیا تھا۔ اس وقت میں اٹھارہ برس کا تھا۔ جب اپنے گھر پہنچا تو وہاں پولیس والے تھے اور میرے ماں باپ کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ تفتیش کے دوران میں وہاں ایک چھوٹا سا پرس ملا۔ اس میں ایک شخص کی تصویر اور گوریلا کیمپ نمبر لکھا ہوا تھا۔ پولیس آفیسر نے کہا۔ "اس کا نام ہاشم ہے اور اس کا باپ قاسم انڈر گراؤنڈ مافیا کا گاڈ فادر ہے۔"

یہ سنتے ہی دھاون بے چینی سے کھسکتا ہوا صوفے کے سرے پر آ گیا۔ میں نے کہا۔ "میں نے قسم کھائی تھی کہ ہاشم کو تلاش کروں گا۔ پولیس انسپکٹر نے کہا' پاگل نہ بنو۔ یہ لوگ شمالی برما سے آتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے روپوش ہو جاتے ہیں۔ شمالی جنگلات میں جانے والی پولیس پارٹی کبھی زندہ واپس نہیں آئی۔ ہاشم کو اسی وقت پکڑا جا سکتا ہے' جب وہ دوسرے گوریلوں کے ساتھ ادھر حملہ کرنے آئے۔ میں مجبور تھا' کیا کرتا۔ اس کا انتظار کرتا۔ بینا کے ڈیڈی کے انتقال کے وقت پولیس افسر نے مجھے بتایا۔ ہاشم کا باپ قاسم پاکستان میں انڈر گراؤنڈ مافیا کا گاڈ فادر ہے۔ تب میں نے فیصلہ کیا کہ ہاشم نہ ملے کوئی بات نہیں' میں اس کے باپ قاسم کو قتل کروں گا۔"

دھاون نے کہا۔ "تم نے مجھ پر بھروسا کر کے عقلمندی کی ہے۔ ان کے بارے میں مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ جس قاسم کو قتل کرنے جا رہے ہو۔ وہ مر چکا ہے۔ اس کی جگہ تمہارا دشمن ہاشم گاڈ فادر بنا ہوا ہے۔"

میں نے بے چینی سے پوچھا۔ "کیا آپ جانتے ہیں' وہ پاکستان میں کہاں ہو گا؟"

"اتنا تو معلوم ہے کہ وہ لاہور میں ہے۔ آج کل وہ سیاست میں دلچسپی لے رہا ہے۔ میں اس کے خفیہ اڈوں کے پتے معلوم کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ جب میرے دن رات تمہارے لئے ہوں گے تو وہ دشمن اپنی قبر کھود کر بھی نہیں چھپ سکے گا۔"

بینا نے مجھ سے کہا۔ "نثار! یہ میں نے تم سے کہا تھا۔ پاپا پر بھروسا کرنا چاہئے۔ یہ صرف بھارت کے ہی نہیں' دوسرے ملکوں کے مجرموں کو بھی ضرور جانتے ہوں گے۔"

میں نے دھاون سے کہا۔ "پلیز' آپ ہمیں کل ہی کسی فلائٹ سے پاکستان پہنچا دیں۔ ہم سفارت خانے سے وہاں رہائش اختیار کرنے کی اجازت لے کر جا رہے تھے۔ اب ہم وہاں کسی کرائے کی کوٹھی میں رہیں گے پھر کام ہوتے ہی یہاں چلے آئیں گے۔"

"کراچی' لاہور اور اسلام آباد میں "را" کے جتنے زونل افسران ہیں' میں ان کے کوڈ

ورڈز بتاؤں گا۔ وہ تمہارے حکم پر آدھی رات کو بھی بستر سے اٹھ کر دوڑے چلے آئیں گے۔ میں ابھی ان سے رابطہ کروں گا پھر تمام "را" کے جاسوس گاڈ فادر ہاشم کی تلاش میں مصروف ہو جائیں گے۔"

"مجھے یقین ہے میں بھی اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔"

"بہت مشکل ہے کیونکہ خفیہ ہاتھ کی تمام ایجنسیاں بھی اسے تلاش کر رہی ہیں لیکن وہ ابھی تک کسی کے ہاتھ نہیں آیا ہے پھر تمہیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس کے دو ساتھی بہت خطرناک ہیں۔ ان میں سے ایک عورت تابانی ہے اور دوسرا مرد فرمان علی ہے۔"

ہمارا پاکستان جانا آسان ہو گیا تھا اور وہ میرے سامنے بیٹھا مجھے اور میری آپی کو خطرناک تسلیم کر رہا تھا۔

☆=====☆=====☆
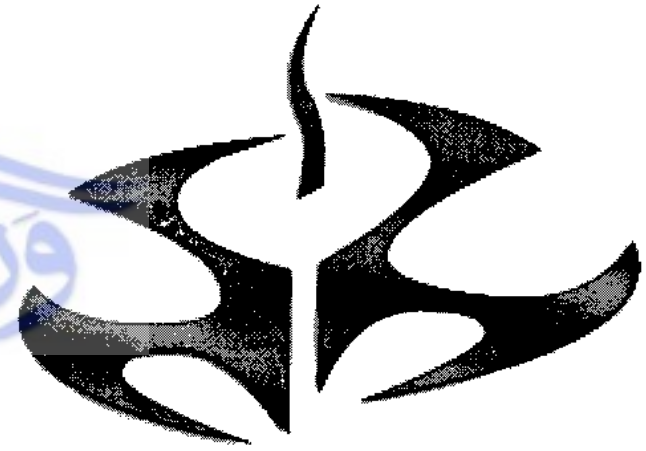
میرا نام محی الدین نواب ہے۔ میری زندگی صرف پڑھنے لکھنے اور ویڈیو دستاویزی فلمیں دیکھنے میں گزر رہی ہے۔ عمر کا تقاضا ہے کہ میں بیمار رہا کروں۔ جب ہم زندگی قرض لے کر آتے ہیں تو ہمیں قدرتی تقاضوں کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ انسان قومی خزانے سے یا ورلڈ بینک سے قرضے لے کر ان سے مکر سکتا ہے لیکن قدرت کا مقروض نادہندہ نہیں بن سکتا۔ اسے قسطوں میں بیمار رہ کر پہلے اسپتال جا کر پھر قبرستان جا کر قرض لی ہوئی زندگی کو واپس کرنا پڑتا ہے۔"

میں آج کل بیمار رہ کر قسطوں میں زندگی واپس کرتا جا رہا ہوں۔ بیماریاں اتنا شور مچاتی ہیں کہ سکون کی خاطر ایک دن شہر خموشاں میں چلا جاؤں گا۔

میں گھر سے بہت کم باہر نکلتا ہوں۔ اس کہانی اندھیر نگری کے راوی فرمان علی سے اور چند ڈاکٹروں سے ملاقات کرنے کبھی کبھی گھر سے باہر نکلتا ہوں۔ میرے پاس ایک سیاہ ہینڈ بیگ ہوتا ہے جس میں میری دوائیں' ایک کیسٹ ریکارڈر اور کئی کیسٹس ہوتے ہیں جن میں فرمان علی کی زیر نظر روداد ریکارڈ کرتا ہوں پھر گھر آ کر اسے اپنے طور پر لکھتا ہوں۔

میں اس روز بھی وہاں پہنچا تو بورڈ آف ڈاکٹرز کی چیئرپرسن لیڈی ڈاکٹر آمنہ چار ڈاکٹروں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان چاروں میں سے تین ڈاکٹر ماہر نفسیات تھے۔ ان چاروں سے اور ڈاکٹر آمنہ سے ہر پندرہ دنوں کے بعد ایک میٹنگ ہوتی تھی۔ اس روز ہماری میٹنگ میں دو سرکاری اعلیٰ افسران تھے۔ میں ان سب سے مصافحہ کرتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر آمنہ نے ایک اعلیٰ افسر نوشاد ربانی اور دوسرے افسر ملک رب نواز سے کہا۔ "میں آپ حضرات سے کیا تعارف کراؤں۔ ان کا ہی نام محی الدین نواب ہے۔ باقی تعارف ان کا قلم ہے۔ اس قلم کے باعث آپ جیسے اعلیٰ سرکاری افسران نے یہاں آنے کی زحمت کی ہے۔"

ان افسران نے میرے سیاہ بیگ کو دیکھا جسے میں نے اپنے سامنے میز پر رکھا ہوا تھا۔ نوشاد ربانی نے کہا۔ "ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ کے بیگ میں دوائیں' آڈیو کیسٹس اور ریکارڈر ہوتا ہے۔ کچھ لکھنے پڑھنے کے کاغذات ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ ”جی ہاں' باہر آپ کے ایک ماتحت نے میرا بیگ چیک کیا ہے۔ آپ بھی تسلی کر سکتے ہیں۔“

ربانی نے کہا۔ ”میرے کہنے کا مطلب ہے کانفرنس میز پر متعلقہ کاغذات اور فائلیں رکھی جاتی ہیں۔ ایک بیگ رکھنا کچھ مناسب نہیں ہے۔“

”آپ درست فرماتے ہیں۔ میں اس بیگ کی تمام چیزیں نکال کر میز پر رکھنے کے بعد اس بیگ کو نیچے رکھ دوں گا۔“

ملک رب نواز نے کہا۔ ”آپ کی وہ تمام چیزیں میز پر کچھ مضحکہ خیز لگیں گی۔ آپ انہیں بیگ میں رہنے دیں۔“

”جیسا آپ حکم کریں لیکن یہ بیگ اس میز پر ہی رہے گا اس میں علم اور ذہانت ہے۔ جب تک یہاں ایک بھی کرسی پر بیٹھا ہے' میں اس بیگ کو اٹھا کر علم کو زمین پر نہیں رکھوں گا۔“

نوشاد ربانی نے پہلے سنجیدگی سے مجھے دیکھا پھر کہا۔ ”ہم بدنام ہیں کہ ناجائز احکامات پر بھی عمل کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں لیکن دنیا کا ہر علم اقرا باسم ربک الذی سے شروع ہوتا ہے۔ اس بیگ کو میز پر رہنے دیں۔“

میں نے شکریہ ادا کیا۔ ملک رب نواز نے پوچھا۔ ”آج بھی آپ اپنے ذہنی مریض سے ملاقات کرنے اور اس کی باتیں ریکارڈ کرنے آئے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”پلیز آپ اسے ذہنی مریض نہ کہیں۔ جب تک کسی کا جرم ثابت نہیں ہوتا' تب تک اسے مجرم نہیں' ملزم کہتے ہیں۔ آپ بھی اسے صرف مریض کہہ سکتے ہیں۔“

”آپ ڈاکٹر نہیں ہیں' رائٹر ہیں پھر آپ اس کا دماغی تجزیہ کر کے کیسے کہتے ہیں کہ وہ ذہنی مریض نہیں ہے؟“

”ڈاکٹر انسان کے جسم کے بیرونی اور اندرونی نظام کا تجزیہ کرتا ہے۔ اس کی دلی اور دماغی کیفیات معلوم کرتا ہے اور مصنف اس کی روح کو سمجھنے کے بعد لکھ کر اپنا فیصلہ سناتا ہے۔“

میں نے ڈاکٹر آمنہ سے کہا۔ ”آپ یہاں تین ماہرین نفسیات کی موجودگی میں مجھے بھی بلاتی تھیں لیکن آج ڈاکٹروں کی کانفرنس میں سرکاری افسران کی موجودگی کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔“

نوشاد ربانی نے مجھ سے کہا۔ ”آپ کی یہاں آمد سے قبل ہم نے بورڈ آف ڈاکٹرز

کی چیئرپرسن ڈاکٹر آمنہ سے گفتگو کی تھی اور ان سے عرض کیا ہے کہ آپ جیسے رائٹر کو یہاں ایک مینٹل کیس میں دلچسپی لینے دیں لیکن اس دماغی کیس کو ایک زہریلی داستان بنانے کی اجازت نہ دیں۔“

میں نے کہا۔ ”سچائی اتنی گہری ہوتی ہے کہ اس کی گہرائیوں کو سمجھ لینے کے بعد لوگ سقراط کی طرح زہر پی لیتے ہیں۔ آپ افسران نے گلے میں پھندا لگا کر اور خود پر تیل چھڑک کر آگ لگا کر خودکشی کے بے شمار واقعات دیکھے ہیں۔ انہیں گلے کا پھندا اور آگ نہیں مارتی' سچائی کا زہر مارتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ایسے افراد کو خودکشی سے بچائیں۔ میں جس مریض کا ذہنی تجزیہ کر رہا ہوں' اگر اپنے قلم سے اس کے اندر کا بخار نہیں نکالوں گا تو ایک دن اچانک ہی اس کا دم نکل جائے گا۔“

ملک رب نواز نے کہا۔ ”ہم بھی انسان ہیں۔ سچائی کے کرب کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم مجبور ہیں۔ جو احکامات اوپر سے آتے ہیں' ان پر عمل کرنا ہمارا فرض ہوتا ہے۔“

”بے شک آپ مجبور ہیں۔ کراچی سے لے کر اسلام آباد تک آپ کے بہت سے اوپر والے ہیں۔ میرا اوپر والا ایک ہی ہے۔ وہ کہتا ہے سچ کہو اور مجبور کیا جاتا ہے کہ سچ میں ملاوٹ کرو۔ ہمیں تو آپ کے پاکستان میں رہ کر آپ کے احکامات پر عمل کرتے ہوئے اپنے پاکستان کو تلاش کرنا ہے۔“

ڈاکٹر آمنہ نے کہا۔ ”نواب صاحب! یہ افسران بہت مصروف رہتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ ان کے احکامات پر عمل کرنے کی بات تسلیم کر رہے ہیں۔ بات یہیں ختم ہو جائے تو بہتر ہے۔“

نوشاد ربانی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں واقعی مصروف ہوں۔ آپ ایک چیئرپرسن کی حیثیت سے یقین دلا رہی ہیں کہ یہ اپنے مریض کا ذہنی تجزیہ کریں گے لیکن قلم بند رہے گا۔“

نوشاد ربانی اور ملک رب نواز نے کہا۔ ”یہی ہونا چاہئے۔ آنکھوں سے جو دیکھا جائے' اسے سمجھا جائے مگر لکھا نہ جائے۔ ہمیں افسوس ہے۔ آپ کو دکھ پہنچ رہا ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”بالکل نہیں۔ دکھ کیسا؟ جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین کا..........“

”آپ زہر اگلنے سے باز نہیں آئیں گے۔“ وہ دونوں مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ وہ میرے معاملے میں سخت ہو سکتے تھے لیکن ڈاکٹر آمنہ کی ضمانت نے انہیں مطمئن کر دیا تھا۔

ان کے جانے کے بعد ہم میز کے اطراف تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ میں نے ڈاکٹر آمنہ اور ایک ڈاکٹر کو مخاطب کیا پھر کہا۔ "آپ دونوں نے اس کا معائنہ کیا ہے۔ پلیز اس کی ذہنی کیفیت بتائیں؟"

ڈاکٹر آمنہ نے کہا۔ "وہ بڑی حد تک نارمل ہوتا جا رہا ہے۔ وہ ڈائجسٹ پڑھتا ہے اور ایسے خوش ہو جاتا ہے جیسے اس نے پوری پاکستانی قوم کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا ہو۔"

دوسرے ڈاکٹر نے کہا۔ "صحت پہلے سے بہتر ہے۔ صبح جوگنگ کرتا ہے۔ اب جوس پینے اور معمول کے مطابق کھانے سے انکار نہیں کرتا ہے۔"

ایک ماہر نفسیات نے کہا۔ "میں نے پہلے ہی کہا تھا' اگر کسی طریقے سے اس کے اندر کا غبار نکالا جاتا رہا تو وہ رفتہ رفتہ نارمل ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "صورت حال سامنے ہے اور ایسی صورت میں آپ جیسے تجربہ کار ماہر نفسیات آپ جیسی بورڈ آف ڈاکٹرز کی چیئرپرسن چاہتی ہیں کہ میں اس کے اندر کا رہا سہا غبار نہ نکالوں۔"

ڈاکٹر آمنہ نے کہا۔ "ہم تسلیم کرتے ہیں' آپ کا طریقہ کار ہماری توقع سے زیادہ کامیاب رہا ہے لیکن ہم ایک کو بچانے کے لئے دوسرے کو قربان نہیں کر سکتے۔ اگر میں ضمانت نہ لیتی تو وہ یہ نہ سمجھتے کہ ایک قلم کار کی حیثیت سے آپ ایک معروف شخص ہیں۔ اوپر سے حکم آنے کے بعد معروف شخصیت بھی مجرم بن جاتی ہے۔"

"اس کا علاج کیسے ہو گا؟"

"علاج تقریباً ہو چکا ہے۔ اب ہم ڈاکٹر کی حیثیت سے کامیاب علاج کریں گے۔ وہ ضرور نارمل ہو جائے گا۔ اس مریض کی طرح آپ بھی ہمیں بے حد عزیز ہیں۔ آپ سے گزارش کرتی ہوں' خدا کے لئے مریض کو بھول جائیں۔ اس کے سامنے نہ جائیں۔"

"آپ فرماتی ہیں تو نہ یہاں آؤں گا اور نہ ہی اس سے ملوں گا لیکن خدانخواستہ کیس بگڑ گیا تو؟"

"تو میں فوراً آپ سے رابطہ کروں گی۔ آپ کو بلاؤں گی یہ میرا وعدہ ہے۔"

میں نے دل برداشتہ ہو کر اپنا بیگ اٹھایا' ڈاکٹر آمنہ میرے قریب آئی۔ میں جانے لگا تو اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت اور ممتا تھی۔ اس نے جھک کر میرے لکھنے والے ہاتھ کو چوم لیا۔ میں شکریہ کہتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔

☆=====☆=====☆

جرائم کی دنیا سے تعلق رکھنے والوں کے لئے کسی بھی ملک کی سرحد پار کرنا آسان ہوتا ہے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک جانے کے لئے یا مال اسمگل کرنے کے لئے سرحدوں کی چھوٹی چوکیوں سے یا تو لین دین ہوتا ہے یا کاؤنٹر فائرنگ ہوتی ہے۔ چھوٹی چوکیوں کے مسلح پہریدار چونکہ کم تعداد میں ہوتے ہیں اس لئے مجرموں کی بھاری تعداد سے مقابلہ نہیں کر پاتے۔

پھر مجرموں کو تمام ملکوں کی سرحدوں کے بارے میں ایک سرے سے لے کر اس کے آخری سرے تک کے شہروں' گاؤں' ندیوں' نالوں' دلدلوں اور ریگستانی زمینوں کا مکمل جغرافیہ معلوم ہوتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے ممالک بھی اپنی سرحدوں سے ہونے والی اسمگلنگ اور فرار ہونے والے مجرموں کو پکڑنے میں ناکام رہتے ہیں۔

آپی (تابانی) اور مراد کو میری امی کے پاس جانا تھا۔ یہ طے پا چکا تھا کہ امی لندن کے اسی اسپتال میں رہ کر آپی اور مراد کو پلاسٹک سرجری کے ذریعے تبدیل کریں گی اور ان کی دس دس انگلیوں کے نشانات میں بھی تبدیلیاں لازمی تھیں۔

بھیس بدل کر بحری اور فضائی راستوں سے بھی لندن جا سکتے تھے لیکن آپی ماں بننے والی تھیں۔ لاکھ بھیس بدلنے کے باوجود دشمن سراغ رسانوں کے لئے ان کا پیٹ ان کی شناخت بن گیا تھا۔ یہ انکل ہاشم کو معلوم ہوتا رہتا تھا کہ بحری جہاز یا طیاروں سے یا پھر ہائی وے سے جانے والوں میں جو بھی عورت حاملہ ہوتی تھی۔ اس کی پوری فیملی کو روک کر اس حاملہ کے فنگر پرنٹس لئے جاتے تھے۔ اینٹی میک اپ لینس کے ذریعے اس کے چہرے کو دیکھا جاتا تھا۔ ایسے لینس سے پتا چل جاتا تھا کہ اصل چہرے کو چھپانے کے لئے اوپر سے میک اپ کیا گیا ہے یا نہیں؟ ٹھوڑی کے نیچے اور گردن کے پیچھے محدب عدسے کے ذریعے ماسک میک اپ کے جوڑوں کو تلاش کیا جاتا تھا۔

مختصر یہ کہ آپی اور مراد سیدھے راستوں سے لندن نہیں جا سکتے تھے۔ انکل ہاشم نے کہا۔ "میں اپنے مسلح ماتحتوں کے ذریعے ازبکستان کی سرحد پار کراؤں گا۔ وہاں سے تم دونوں یورپ کے کسی بھی شہر میں جاؤ گے۔ وہاں سے تم دونوں کو جعلی ویزا یا پاسپورٹ ملے گا جن کے ذریعے تم لندن پہنچ سکو گے۔"

گاڈ فادر ہاشم کے لئے یہ کام آسان بھی تھا اور دشوار بھی کیونکہ شمالی پاکستان جا کر ازبکستان یا افغانستان کی سرحد کو پار کرنا تھا اور لاہور سے وہاں تک انہیں فضائی راستے سے اور ہائی وے سے جانا تھا۔

انکل ہاشم ہائی وے کے تمام چیک پوسٹ اور اچانک ہی سرپرائز چیکنگ کرنے والے مقامات کا جائزہ لے رہے تھے۔ جہاں چیک پوسٹ وغیرہ پر سودے بازی ہو سکتی تھی' وہاں اطمینان تھا۔ باقی دوسرے مقامات پر راستے بدلنے کے مقامات کا تعین کیا جا رہا تھا۔

اس کام میں کچھ وقت لگ رہا تھا۔ آپی اور مراد نے رہائش بدل دی تھی۔ وہ گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ دو چار دنوں کے بعد مراد نے جھنجلا کر کہا۔ "یہ کوئی زندگی ہے۔ قیدی کی طرح یہاں بند رہتے ہیں۔ نہ کوئی تفریح گھر میں ہے' نہ کھلی فضا میں سانس لینا نصیب ہو رہا ہے۔"

آپی نے کہا۔ "انکل یہاں ٹی وی' ڈش اور کچھ انڈور گیمز بھیجنے والے تھے۔ میں نے منع کر دیا۔ یہاں زیادہ سے زیادہ ہفتہ دس دن رہنا ہے۔ خواہ مخواہ اتنے بکھیڑے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہم میک اپ میں ہیں۔ کبھی شام کو باہر تو نکل سکتے ہیں۔"

"کیا کچھ روز صبر نہیں کر سکتے۔ آخر جیل کے اندر کیسے رہتے تھے۔ کیا وہ تمہیں باہر تفریح کے لئے بھیجتے تھے؟"

"تم جانتی ہو کہ میں تم سے بحث نہیں کرتا۔ یہ بھی جانتی ہو کہ جس کام سے نقصان نہیں پہنچتا' اسے میں ضرور کرتا ہوں۔ ہم چہروں سے پہچانے نہیں جاتے۔ اب ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ خفیہ ایجنسی والے ہمارے فنگر پرنٹس لینے کے لئے قدم قدم پر ہمارا انتظار کر رہے ہوں۔" وہ لباس تبدیل کرتے ہوئے بولا۔ "میرے ساتھ چل سکتی ہو تو چلو۔ میں جناح گارڈن جا رہا ہوں۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔ تمہیں کیا پتا ہے کہ میں دن رات کیسی ناگہانی آفات سے نمٹنے کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ انکل ہمارے لئے بہت کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں بھی تو اپنی عقل سے کام لینا چاہئے۔"

"مجھے باہر کی تازہ ہوا لگے گی تو میں بھی عقل سے تمہاری طرح سوچنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ جانے لگا۔ آپی نے کہا۔ "اندھیرا ہونے سے پہلے آ جانا۔"

"کیا یہ ضروری ہے؟"

"ہاں' میں چھت پر سے دیکھتی رہوں گی۔ دشمن تم پر شبہ کر کے تمہارا تعاقب بھی کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے' پیٹی کوٹ گورنمنٹ کا حکم ہے۔ اندھیرا ہونے سے پہلے آ جاؤں گا۔"

وہ دروازہ کھول کر چلا گیا۔ آپی اسے دیکھتی رہیں۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو انہوں نے دروازہ بند کر کے موبائل فون کے ذریعے جمشید کو مخاطب کیا۔ اس نے کہا۔

"جی آپی! میں بول رہا ہوں۔"

"مراد میری مخالفت کے باوجود تفریح کے لئے گھر سے باہر چلا گیا ہے۔ کہہ رہا تھا جناح گارڈن تک جائے گا اور اندھیرا ہونے سے پہلے آ جائے گا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتی رہتی ہوں کہ وہ ہمارے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائے لیکن ایک بیوی کی حیثیت سے سمجھتی ہوں' اسے مجرمانہ زندگی کا چسکا پڑ گیا ہے۔ دہشت گردی سے اسے ایسی آسودگی ملتی ہے جیسے اس نے زندگی کا صحیح مقصد پا لیا ہے۔"

"آپی' میں بھی اس کی منفی سوچ کو سمجھتا ہوں لیکن آپ کی خاطر اسے ڈھیل دے رہا ہوں۔ بہرحال میں آپ کے پاس آ رہا ہوں۔"

"میرے پاس آنے سے بہتر ہے اس کی نگرانی کرو۔"

"آپ لکھ لیں' وہ جناح گارڈن نہیں گیا۔ میں دوسرے طریقے سے معلوم کر لوں گا کہ وہ کہاں گیا تھا؟ آپ میرا انتظار کریں۔"

جمشید فون بند کر کے دفتر سے باہر آیا پھر اپنی جیپ میں بیٹھ کر تنہا جانے لگا۔ اس نے موبائل فون کے ذریعے انکل ہاشم سے رابطہ کرنا چاہا۔ ان کا فون مصروف تھا۔ اس نے آپی کی رہائش گاہ کے سامنے گاڑی روک کر دروازے پر دستک دی۔ تابانی نے دروازہ کھولا پھر اس کے اندر آنے پر بند کر دیا۔ اس نے کہا۔ "آپ مجھے اس گھر کا ہر کمرا اور چیزیں دکھائیں۔ اسٹور روم تو ہو گا۔ کوئی کوٹھری نما بند کمرا بھی ہے۔"

"کوٹھری نہیں' اسٹور ہے۔ آؤ میں دکھاتی ہوں۔"

اس نے آپی کے ساتھ گھر کے اندر گھومتے ہوئے موبائل فون کے ذریعے پھر انکل ہاشم سے رابطہ کیا اور کہا۔ "مراد تفریح کے لئے گھر سے باہر گیا ہے۔"

انکل نے کہا۔ "ابھی تابانی نے مجھے فون پر بتایا ہے۔ میں نے اپنے جاسوس لگائے ہیں۔ ویسے وہ دردِ سر بنا ہوا ہے۔ میں صرف اسے تابانی کی وجہ سے برداشت کر رہا ہوں۔"

"انکل! انہیں سرحد پار کرانے کے سلسلے میں آپ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ میں ایک بات بتا دوں کہ اچانک میرا ٹرانسفر پنڈی ہو گیا ہے۔ کل اور پرسوں یہاں رہوں گا' یہاں کا چارج دوسرے افسر کو دے کر جمعہ کو گیارہ بجے ایک سرکاری گاڑی میں روانہ ہو جاؤں گا۔ میرے ساتھ میرا ایک قابلِ اعتماد ماتحت ہو گا۔ اس طرح میں آپی کو پنڈی

سے بھی آگے پشاور سے گزار کر انہیں افغانستان کے بارڈر پر پہنچا دوں گا۔ واپسی میں رپورٹ دوں گا کہ ایک خطرناک مجرم کا پیچھا کرتا ہوا سرحدی علاقے تک چلا گیا تھا۔"

"جمشید! تم نے تو کام بالکل آسان کر دیا ہے۔ تم وردی میں رہو گے' سرکاری گاڑی ہو گی۔ کوئی تمہیں نہیں روکے گا۔"

"لیکن میں صرف آپی کو لے کر جاؤں گا مراد کی موجودگی سے گڑبڑ ہو سکتی ہے۔"

"ہاں' وہ ساتھ رہے گا تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں اسے کسی دوسرے دن ازبکستان کے راستے بھیج دوں گا۔ میں ابھی تابانی سے بات کرتا ہوں۔"

"میں آپی کے ساتھ ہوں۔ آپ بات کریں۔"

آپی نے فون کان سے لگا کر کہا۔ "انکل! میں آپ لوگوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ پلیز مراد کو الگ نہ کریں۔ میں اسے سنبھال لوں گی۔"

"بیٹی' بعض حالات میں جذبات سے کام نہیں لیا جاتا۔ میرا وعدہ ہے کہ مراد تمہیں لندن میں ملے گا۔ دیکھو میں بہت مصروف ہوں' زیادہ بحث نہیں کروں گا۔ میری بات نہیں مانو گی تو ابھی تمہاری امی کو فون کر دوں گا پھر تمہاری امی نے حکم صادر کیا تو کیا انکار کر سکو گی؟"

آپی نے بے بسی سی کہا۔ "امی کو فون نہ کریں۔ میں جمشید کے ساتھ جاؤں گی۔"

آپی کے رضامند ہونے سے یہ طے پا گیا کہ مراد کو کس طرح قابو میں رکھا جائے گا اور اسے لندن پہنچا کر بھی کس طرح اس کی طرف سے ہوشیار رہا جائے گا۔ مراد نے بڑے مسائل پیدا کر دیئے تھے۔ آپی اس سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتی تھیں پھر یہ بھی مناسب نہیں تھا کہ وہ جس بچے کو جنم دیتی' اس کے باپ کو ہلاک کر دیا جاتا۔ مراد کو زندہ رکھنا تھا لیکن بہت محتاط رہ کر.........

اور مراد گھر سے نکل کر بہت دور تک پیدل چلتا رہا تھا اور سوچتا جا رہا تھا۔ "عورت کی عقل ہی کیا ہوتی ہے۔ برسوں "را" کے کیمپ میں ٹریننگ حاصل کرنے کے باوجود وہ دوست اور دشمن کو نہیں پہچان رہی ہے۔ کوئی بھی مجرم واردات کرتے وقت جیل کے نہیں' محلوں کے خواب دیکھتا ہے اور تابانی ہے کہ شریفانہ زندگی کسی محل میں گزارنے کے خواب دیکھ رہی ہے۔

"اسے اتنا تو سوچنا چاہئے کہ پاکستانی معروف سیاست دانوں سے ٹکرا کر کوئی سلامت نہیں رہ سکا۔ سلامتی کی ضمانت یہی ہے کہ پھر "را" والوں کے کام آیا جائے کیونکہ پچھلے دنوں تابانی نے مجھ کو آزمانے کے بہانے ایسی حرکتیں کی تھیں کہ مجھ پر سے دردانہ بیگم کا

اعتماد اٹھ گیا تھا۔ اب وہاں "را" والوں کے سوا کوئی کام نہیں آ سکتا تھا۔ وہ لوگ تابانی کی غداری سے ناراض تھے۔ ان دنوں میں جیل میں تھا۔ میں نے کوئی غداری نہیں کی اس لئے وہ مجھ سے ناراض نہیں ہوں گے۔ اگر میں ان کے لئے کارنامے انجام دوں گا تو وہ میری تابانی کو بھی معاف کر دیں گے۔ میں کیا کروں؟ اس کمبخت عورت کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ہمیں زندہ رہنے کے لئے کسی نہ کسی تنظیم کے سائے میں رہنا ہو گا۔ گاڈ فادر ہاشم خفیہ ہاتھ کے سامنے ایک مچھر ہے' کسی دن بھی اسے مسل دیا جائے گا اور تابانی اسی گاڈ فادر سے رشتے داری کر رہی ہے۔ نہیں کچھ بھی ہو' میں اسے اور اپنے ہونے والے بچے کو "را" کے محفوظ سائے میں رکھوں گا۔"

اسے کراچی' لاہور اور اسلام آباد کے را کے زونل افسران کے رابطہ نمبر یاد تھے۔ اس نے جنرل پوسٹ آفس سے لاہور کے زونل افسر سے فون پر رابطہ کیا۔ افسر نے مراد کا نام اور اس کی آواز سن کر پوچھا۔ "مراد تم کہاں ہو؟"

"میں فون پر باتیں نہیں کر سکوں گا۔ ہو سکتا ہے میرا تعاقب کیا جا رہا ہو۔ میں ریگل سینما کے سامنے کھڑا ہوں۔ میں نے بلیو کلر کی شلوار قمیض پہنی ہے۔ میرے پیروں میں پشاوری چپلیں ہیں۔ میں ٹھیک مٹھائی والی دکان شیریں محل کے دروازے کے قریب رہوں گا۔ آپ بتائیں کوڈ ورڈز کا تبادلہ کیا ہو گا؟"

اس نے کوڈ ورڈز بتاتے ہوئے کہا۔ "اسسٹنٹ زونل افسر پیلی ٹیکسی میں ابھی وہاں پہنچنے والا ہے۔"

وہ جنرل پوسٹ آفس سے چلتا ہوا ریگل سینما کے پاس آیا پھر شیریں محل کے دروازے کے قریب ٹہلنے لگا۔ محتاط نظروں سے ہر طرف دیکھتا رہا۔ کوئی اسے پہچان تو نہیں سکتا تھا لیکن کسی بے اختیاری قدرتی عادت سے اس پر شبہ کر سکتا تھا۔

ایک پیلی ٹیکسی ذرا فاصلے پر آ کر رک گئی۔ پچھلی سیٹ سے ایک شخص باہر آیا۔ مراد اسے پہلے سے جانتا تھا پھر اس نے قریب آ کر کوڈ ورڈز ادا کئے۔ جواب میں اس کے کوڈ ورڈز سنے پھر کہا۔ "سر! میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ کوڈ ورڈز اس لئے استعمال کیا کہ آپ مجھے میک اپ کے باوجود پہچان لیں۔"

وہ دونوں ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ٹیکسی چل پڑی۔ افسر نے پوچھا۔ "کہاں گم ہو گئے تھے اور اب کہاں جانا چاہتے ہو' یہ بتاؤ۔"

مراد نے آنکھوں سے ڈرائیور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہم کسی گارڈن وغیرہ میں جا کر باتیں کریں گے۔"

افسر مسکرا کر بولا۔ "یہ ہمارا آدمی ہے۔ یہاں ڈرائیور بن کر رہتا ہے۔ کسی اندیشے کے بغیر باتیں کرو۔"

مراد اس افسر کو اپنے لاہور آنے' یہاں کئی دھماکے اور تخریب کاری کے بعد جیل جانے کی تمام روداد بتانے لگا۔ افسر نے پوچھا۔ "تمہاری تابانی ہم سے بدظن کیوں ہو گئی ہے؟"

"سر! تابانی نے ہی ڈاکٹر آمنہ کو اغوا کیا پھر اچانک ہی اس کی ایسی عقیدت مند ہو گئی جیسے آمنہ کوئی جادوگرنی ہو۔ عقل کام نہیں کرتی کہ اتنی غصہ ور اور گرم مزاج رکھنے والی اس آمنہ کے سامنے ٹھنڈی کیسے پڑ گئی ہے۔ وہ تو اسے امی کہتی ہے اور اس کا حکم ایسے مانتی ہے جیسے بھگوان کا حکم مان رہی ہو۔"

پھر وہ چونک کر بولا۔ "بھگوان کہنے سے یاد آیا کہ اس نے دین اسلام قبول کر لیا ہے۔ مسلمان ہو گئی ہے۔"

"او گاڈ! پھر تو واقعی ڈاکٹر آمنہ کالا جادو جانتی ہے۔ یہ جادو کا ہی اثر ہے کہ اس نے اپنا دھرم چھوڑ دیا ہے۔ کیا اب بھی تم اسے چاہتے ہو؟"

"سر! دھرم بدلنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں اسے جان سے زیادہ چاہتا ہوں۔ اس پر ذرا بھی آنچ آئے گی تو میں اسے نقصان پہنچانے والے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ درست ہے کہ اس نے ہماری تنظیم سے غداری کی لیکن میں نے نہیں کی۔ وہ میری بیوی ہے۔ میں اسے قابو کروں گا اور پھر سے تنظیم کی وفادار بنا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے' یہ تمہارا اور تابانی کا ذاتی معاملہ ہے۔ یہ بتاؤ' وہ کہاں ہے؟"

"میں سب کچھ بتاؤں گا۔ پہلے تابانی کے لئے سلامتی کی ضمانت چاہئے۔"

"جیسی ضمانت چاہو گے' ملے گی۔"

"سر! آپ مائنڈ نہ کریں میں آپ کی اور آپ کے سینئر زونل افسر کی ضمانت نہیں' ڈی جی دھاون صاحب کی ضمانت چاہتا ہوں۔ جب میں ان کی ضمانت سے مطمئن ہو جاؤں گا تو بتاؤں گا کہ تابانی کے ساتھ کہاں ہوں اور گاڈ فادر ہاشم یہاں سیاست دانوں کے خلاف کیا کرتا پھر رہا ہے۔"

"کیا ہاشم کا ٹھکانا جانتے ہو؟"

"ابھی تو ایک موبائیل نمبر جانتا ہوں۔ میں لندن جاتے ہی ڈاکٹر آمنہ کو اغوا کروں گا تو ہاشم سامنے آنے پر مجبور ہو جائے گا اور آمنہ کا بیٹا فرمان بھی ہم سے ٹکرانے پر مجبور ہو گا تو پھر اس کی خفیہ پناہ گاہ تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔"

ٹیکسی لاہور کی مختلف سڑکوں پر چلتی رہی۔ اس افسر نے موبائل فون کے ذریعے زونل افسر سے رابطہ کر کے تمام باتیں سنائیں۔ زونل افسر نے فون پر براہ راست ڈی جی دھاون سے کہا۔ "سر! مراد جیل سے نکلنے کے بعد بھی ہمارا تابعدار ہے۔ اس کی شرط ہے کہ تابانی کی غداری کو معاف کر دیں تو وہ اسے جلد ہی تنظیم کی وفادار بنا دے گا اور ہماری توقع سے زیادہ ہمارے کام آئے گا۔ تابانی ہماری نظروں میں رہے گی۔ ہم اسے کسی حادثے میں اس طرح ہلاک کریں گے کہ مراد کو ہم پر شبہ نہیں ہو گا۔ وہ لندن جا رہا ہے۔ آمنہ کو اغوا کر کے اس کے بیٹے فرمان کو اور گاڈ فادر ہاشم کو سامنے آنے پر مجبور کر دے گا۔ مراد فی الحال ہاشم کا ایک موبائل نمبر اور ان کے کچھ منصوبے جانتا ہے۔"

ڈی جی دھاون نے کہا۔ "مراد کی وفاداری سے ہمیں بہت کچھ حاصل ہو گا۔ وہ تابانی کی سلامتی کے لئے جیسی ضمانت چاہے' اسے مل جائے گی جیسا کہ پاکستان کے تمام زونل افسران کو بتایا گیا ہے۔ آج شام کی فلائٹ سے نثار احمد اور بانو بیگم (میں اور بیٹا) لاہور پہنچ رہے ہیں۔ تم سب کو یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ نثار احمد گاڈ فادر ہاشم کو قتل کرنے آیا ہے۔ اس کے ساتھ بھرپور تعاون کرو۔ اگر نثار احمد نے کسی کے خلاف شکایت کی تو اسے "را" سے نکالا نہیں جائے گا' گولی مار دی جائے گی۔ تابانی اور مراد کی سابقہ تصاویر اسے دکھا دی گئی ہیں۔ مراد کے موجودہ چہرے کی تصویریں اتارو اور ایک تصویر نثار احمد کو دو۔ تم سب دیکھو گے کہ نثار احمد کیسا چالباز ہے۔ وہ مراد کے ذریعے تابانی اور فرمان تک پہنچ جائے گا۔ مراد سے بات کراؤ۔ میں اسے بھرپور ضمانت دوں گا۔ وہ مطمئن ہو جائے گا۔"

تھوڑی دیر بعد اسسٹنٹ زونل افسر کے فون پر ڈی جی دھاون نے کہا۔ "مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم ہمیشہ سے ہمارے تابعدار رہے ہو۔ بولو تابانی کی سلامتی کے لئے کیسی ضمانت چاہتے ہو؟"

"آنرایبل ڈی جی صاحب! میں آپ کی ذہانت کے آگے ایک معمولی سا ذرہ ہوں۔ آپ ہی مجھے مطمئن کرنے کے لئے کوئی بڑی سے بڑی ضمانت دیں۔"

"مراد! اپنی اولاد سے زیادہ کوئی عزیز نہیں ہوتا۔ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے۔ تم پاکستان ہو یا لندن میں' وہ میری بیٹی تمہاری نگاہوں کے سامنے رہے گی۔ اگر تمہاری تابانی پر کوئی آنچ آئے تو تم میری بیٹی کو گولی مار سکتے ہو۔"

وہ شدید حیرانی سے بولا۔ "آ.......... آپ اپنی اکلوتی بیٹی کو.........."

ڈی جی دھاون نے کہا۔ "چپ ہو جاؤ۔ ابھی تمہارے ساتھ اسسٹنٹ زونل افسر بیٹھا ہوا ہے۔ تم ادھر سے کچھ نہ کہو۔ یہ راز صرف کراچی' لاہور اور اسلام آباد کے زونل

افسران جانتے ہیں کہ میری بیٹی ایک اسلامی نام بانو بیگم رکھ کر اپنے پتی نثار احمد کے ساتھ آج شام کو لاہور پہنچنے والی ہے۔ نثار احمد بھی مسلمان نہیں ہے۔ ہمارا ایک بہت ذہین اور چالباز جاسوس ہے۔ تم ان دونوں کو یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم انہیں میری بیٹی اور داماد کی حیثیت سے جانتے ہو۔ میں بیٹی کی ضد سے مجبور ہو کر بھیج رہا ہوں۔ وہ پاکستان سے لندن چلے جائیں گے۔ میں ابھی فون پر ان سے کہتا ہوں کہ وہ مراد نامی شخص پر بھروسا کریں۔ لاہور یا لندن جہاں بھی مراد ملے' اسے وہ اپنے قریب رکھیں۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ' اب میں مطمئن ہوں۔"

"سب سے پہلا کام یہ کرو کہ منی کیمرا ابھی لے جاؤ۔ تابانی کے موجودہ چہرے کی تصویریں اتارو۔ نثار احمد تمہاری تابانی کے ذریعے ہاشم تک ایسے پہنچے گا کہ تم حیران رہ جاؤ گے۔"

"جی ابھی گھر جاکر آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا لیکن یہ چاہتا ہوں کہ ابھی دور دور سے بھی میری اور تابانی کی نگرانی نہ کی جائے کیونکہ ہاشم کے آدمی مختلف بھیس میں اس کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ صرف اپنے داماد کو ہی تابانی کے ذریعے ہاشم تک پہنچنے دیں۔"

"ٹھیک ہے۔ فون افسر کو دو۔"

افسر نے فون لے کر دوسری طرف کے احکامات سنے پھر فون بند کر کے مراد سے کہا۔ "ابھی تمہیں ایک منی کیمرا اور منی سائز کا موبائل فون مل جائے گا۔ تم زونل افسر سے رابطہ کرتے رہو گے۔"

وہ شام پانچ بجے تک اس افسر کے ساتھ رہا۔ اسے ضرورت کی چیزیں مل گئیں پھر وہ اس سے رخصت ہو کر دوسری ٹیکسی میں بیٹھ کر موجودہ رہائش گاہ سے کچھ دور اتر گیا۔ ڈرائیور کو رقم دے کر پیدل چلتا ہوا ایک میدان سے گزرتا ہوا آنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ تابانی چھت پر کھڑی اسے دیکھ رہی ہو گی لیکن وہ چھت پر نظر نہیں آئی۔ اس نے مکان کے سامنے آکر دیکھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دروازے پر پہنچ کر دستک دینے کے لئے ہاتھ لگایا تو وہ ذرا سا کھل گیا۔ اس نے اندر آکر اسے اندر سے بند کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟"

اسے جواب نہیں ملا۔ وہ پہلا کمرا ان کا بیڈ روم تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو تکیے پر ایک تہہ کیا ہوا کاغذ دکھائی دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا۔ اسے کھول کر پڑھا۔ لکھا ہوا تھا۔ "پریشان نہ ہونا۔ اچانک انکل کا فون آگیا تھا۔ انہوں نے ابھی بلایا ہے۔ اس وقت پانچ بج رہے ہیں۔ میں تین یا چار گھنٹے میں آجاؤں گی۔ ہم رات کا کھانا

ساتھ کھائیں گے۔"

وہ تحریر پڑھ کر سوچنے لگا۔ "یہ میرا پیچھا تو نہیں کر رہی تھی؟ بڑی چالباز ہے لیکن میں بھی کم نہیں ہوں۔ جنرل پوسٹ آفس پہنچنے تک محتاط رہا ہوں۔ دور دور تک وہ یا کوئی دوسرا تعاقب کرنے والا نظر نہیں آیا تھا۔"

اس نے گھر کے دوسرے کمرے' کچن اور اسٹور روم میں جاکر یونہی سرسری سی نظر ڈالی۔ گھر بالکل خالی تھا۔ اس نے پلنگ کے پاس آکر کھڑکی کے باہر دیکھا پھر اس نے موبائل فون نکال کر زونل افسر سے رابطہ کر کے کہا۔ "سر! تابانی اہم معاملات میں مجھ پر بھروسا نہیں کرتی ہے۔ شاید اس نے جان بوجھ کر مجھے گھر سے باہر جانے دیا تھا۔ میرے جاتے ہی وہ گاڈ فادر ہاشم سے ملنے گئی ہے۔"

زونل افسر نے کہا۔ "آج شام تک ہمارا ایک چالباز جاسوس نثار احمد آ رہا ہے۔ تم کل بھی گھر سے نکلو مگر اس سے پہلے کسی طرح تابانی کی تصویر اتار لو تاکہ وہ تصویر کے ذریعے ہاشم تک پہنچ جائے۔"

"سر! ڈی جی دھاون صاحب نے مجھے بتا دیا ہے کہ ان کی بیٹی اور داماد آ رہے ہیں اور یہ راز صرف یہاں کے تین زونل افسران جانتے ہیں۔ چوتھا رازدار میں ہوں۔"

"تو کل جس وقت بھی تابانی کی تصویر لے کر آؤ گے۔ میں ان کی بیٹی اور داماد سے تمہاری ملاقات کراؤں گا۔"

"ایسے تو میں تابانی کی تصویر نہیں اتار سکتا۔ جب وہ نیند میں ہو گی تو تصویر اتار سکوں گا۔ تصویر میں اس کی آنکھیں بند ہوں گی۔"

"کوئی بات نہیں' اس کا موجودہ چہرہ تو دکھائی دے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ کل میں گھر سے نکلنے کے بعد آپ کو فون پر اطلاع دوں گا پھر وہیں ریگل چوک میں ملاقات ہو گی۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ اپنی اٹیچی کھول کر موبائل فون اور کیمرے کو تمام کپڑوں اور دیگر سامان کے نیچے چھپا کر رکھا پھر غسل کرنے کے لئے لباس نکالا۔ اٹیچی کو بند کرنے کے بعد دروازے کو دیکھا پھر گھڑی کو دیکھا۔ ساڑھے سات بجے تھے۔ تابانی نے لکھا تھا کہ وہ تین چار گھنٹے میں آجائے گی۔ اب اس کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ اس نے دروازے کے پاس آکر اسے بند رہنے دیا۔ اس کی چٹخنی ہٹا دی تاکہ غسل کرنے کے دوران میں تابانی دستک دیئے بغیر آسکے۔

اس نے غسل خانے میں آکر نلکے کے نیچے بالٹی رکھ کر اسے کھولا۔ بالٹی میں پانی

گرنے کی آواز سنتے ہی جمشید پلنگ کے نیچے سے نکلا۔ دروازے کو کھولا۔ پھر باہر جا کر آہستگی سے اسے بند کر دیا۔

اس نے تابانی سے کہا تھا کہ مراد کا تعاقب کرنا ضروری نہیں ہے۔ وہ اپنے طور پر معلوم کرلے گا اور اس نے شہر کی تمام سڑکوں پر تعاقب کرنے کے بجائے اسی کے گھر میں گھر کا بھیدی بن کر تمام معلومات حاصل کرلی تھیں۔

☆=====☆=====☆

آپی کو کچھ تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ میری امی نے بہت پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ جیسے جیسے زچگی کے دن قریب آتے جائیں گے' آپی دوسری حاملہ عورتوں کے مقابلے میں زیادہ تکالیف سے گزرے گی اور زچگی ہونے تک بڑے مسائل پیدا ہوتے رہیں گے کیونکہ وہ پیدائش کے وقت مرد تھی۔ رفتہ رفتہ جنس تبدیل ہوتی رہی تھی اور تبدیلی کے آخری مرحلے پر جس ڈاکٹر نے بھی آپریشن کیا تھا' اس آپریشن میں کوئی طبی خامی رہ گئی تھی۔

آپی' مراد کے باہر جانے کے بعد اسے ایک خط لکھ کر انکل ہاشم سے ملنے آئی۔ انہیں بتایا کہ ایک لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ میری امی کے ساتھ لاہور میں کام کرنے والے کئی ڈاکٹرز اور لیڈی ڈاکٹرز تھیں۔ امی نے ان میں سے تین ڈاکٹروں کو انکل ہاشم کا رازدار بنایا تھا۔ انکل نے اپنے ایک معتمد خاص کو ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس بھیجا۔ اس لیڈی ڈاکٹر نے آکر ایک بند کمرے میں آپی کا معائنہ کیا۔ کافی دیر کے بعد آکر لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں نے ابھی دوائیں کھلائی ہیں۔ یہ زچگی کا درد نہیں تھا۔ زچگی میں ابھی تین ماہ باقی ہیں لیکن کچھ اندرونی پرابلمز پیدا ہو رہی ہیں۔“

انکل نے پوچھا۔ ”کیا اسپتال میں داخل کرانا ہو گا؟“

”ابھی نہیں۔ ہماری سرجن آمنہ نے کہا تھا' تابانی کے ساتھ کوئی پرابلم ہو تو انہیں فوراً اطلاع دی جائے۔ پلیز آپ ان سے میری بات کرا دیں۔“

انکل نے امی سے رابطہ کر کے کہا۔ ”باجی' لیڈی ڈاکٹر فیروزہ آپ سے تابانی کے سلسلے میں بات کرنا چاہتی ہیں۔ میں ڈاکٹر کو فون دے رہا ہوں۔“

ڈاکٹر فیروزہ نے فون لے کر کہا۔ ”میڈم! جنس کی تبدیلی کا جو آخری آپریشن کیا گیا تھا' وہیں پرابلم ہے۔ اس لئے تابانی تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ میں نے دوائیں دی ہیں۔ اب وہ نارمل ہے۔ سو رہی ہے۔“

امی نے کہا۔ ”فیروزہ' زچگی سے دو ماہ پہلے ایک مائنر آپریشن کرنا ہو گا۔“

”میڈم' میں آپ سے زیادہ سرجری کے بارے میں نہیں جانتی اس لئے پوچھ رہی ہوں۔ کیا یہ آپریشن خطرناک نہیں ہو گا۔ ماں اور بچے دونوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے؟“

”تمہارا اندیشہ درست ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے ماں باپ ہوتے تو ایسے آپریشن کی اجازت نہ دیتے اور نہ ہی کوئی دوسرا سرجن ایسے آپریشن کا خطرہ مول لیتا لیکن میں تابانی کی ماں ہوں۔ یہ اچھی طرح جانتی ہوں۔ آپریشن نہ کیا گیا تو میری بیٹی نہیں بچے گی اس لئے میں تمام تجربات کے پیشِ نظر انشاء اللہ بڑی مہارت اور احتیاط سے آپریشن کروں گی۔ تم فون ہاشم کو دو۔“

ہاشم نے فون لے کر کہا۔ ”جی' میں بول رہا ہوں۔“

”ہمارے خفیہ آپریشن تھیٹر میں یوں تو کسی مشین اور آلات کی کمی نہیں ہے پھر بھی ڈاکٹر فیروزہ سے کہو' ایک بار اس آپریشن تھیٹر کا ہر سامان اچھی طرح دیکھ لے۔ جن چیزوں کی کمی ہو' ان کی فہرست بنا کر تمہیں دے دے۔ ابھی جلدی نہیں ہے۔ بیس پچیس دنوں کے بعد آپریشن ہو گا۔ تابانی ابھی نارمل رہے گی۔“

”کیا آپ یہاں آئیں گی؟“

”ہاں' تابانی کے فی الحال نارمل رہنے کے باوجود اسے ہائی وے اور کچے ناہموار راستوں سے سفر نہیں کرنا چاہئے۔ اسے زیادہ سے زیادہ آرام کرنے کے لئے کہو۔ سیرو تفریح اس کے لئے بہتر ہو گی لیکن وہ کسی بھی دشمن کے مقابلے پر ایکشن میں نہ رہے۔ اس کی کمی پوری کرنے کے لئے فرمان بینا کے ساتھ پہنچ رہا ہے۔“

”جی ہاں فرمان نے مجھے یہ اطلاع دی ہے کہ وہ نثار احمد بن کر اپنی بیوی بانو بیگم کے ساتھ شام کو آ رہا ہے۔ ”را“ والے خوش ہیں کہ وہ مجھے یہاں قتل کرنے والا ہے۔“

فون پر گفتگو کرنے کے بعد انہوں نے ڈاکٹر فیروزہ سے کہا۔ ”باجی نے آپ سے کہا ہے۔ میرے ایک ماتحت کے ساتھ خفیہ آپریشن تھیٹر میں جائیں۔ تمام سامان چیک کریں۔ جن چیزوں کی کمی ہو' ان کی فہرست لکھ کر مجھے دیں۔ باجی یہاں آنے والی ہیں۔“

ڈاکٹر فیروزہ نے خوش ہو کر کہا۔ ”ہمیں پھر ان کے ساتھ تجربات حاصل کرنے کے مواقع ملیں گے۔ میں ابھی آپ کے ماتحت کے ساتھ جا رہی ہوں۔“

وہ چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جمشید نے فون کے ذریعے کہا۔ ”آپی آپ کے پاس ہیں؟“

”ہاں اسے کچھ تکلیف تھی۔ دوائیں کھانے کے بعد سو رہی ہیں۔“

”مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ آپ کے پاس جا

رہی ہیں۔ انکل، خیریت تو ہے؟"

"فی الحال خیریت ہے لیکن آگے چل کر زچگی کے سلسلے میں مسائل پیدا ہوں گے اس لئے باجی آمنہ لندن سے یہاں آ رہی ہیں۔ انہوں نے سختی سے منع کیا ہے کہ تابانی کو لمبا اور تکلیف دہ سفر نہیں کرنا چاہئے۔"

"یہی بہتر ہو گا کہ وہ سفر نہ کریں اور آپ کے پاس محفوظ رہیں لیکن مراد کو یہی بتایا جائے کہ اچانک میرا ٹرانسفر کراچی ہو گیا ہے۔ میں انہیں اپنی حفاظت میں کراچی لے گیا ہوں۔"

"مراد کے بارے میں اور کچھ معلوم ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں، بہت کچھ معلوم ہوا ہے۔ میں آج آپی کی خفیہ رہائش گاہ میں گیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں مراد کا تعاقب کروں۔ میں نے کہا آپ انکل کے پاس جا رہی ہیں۔ میں اس گھر میں ہی رہ کر مراد کے متعلق کچھ معلوم کر لوں گا۔ آپی مراد کو ایک خط لکھ کر چلی گئیں۔ میں نے اپنے ماتحت کے ذریعے سرکاری جیپ وہاں سے بھیج دی اور گھر کا دروازہ بند کر کے وہاں چھپا رہا۔"

جمشید نے وہاں چھپنے کے بعد مراد کی فون والی جتنی گفتگو سنی تھی، وہ سب تفصیل سے بتائی۔ ہاشم نے کہا۔ "وہ آستین کا سانپ ہے۔ ہم تابانی کی وجہ سے اسے ڈھیل دیتے رہے۔ اب بھی اسے نقصان نہیں پہنچائیں گے لیکن یہی کہہ کر تابانی کو اس سے دور رکھیں گے کہ وہ تمہارے ساتھ کراچی گئی ہے۔"

"مراد نے فون پر یہ بھی کہا تھا کہ ڈی جی دھاون کی بیٹی اور داماد یہاں آ رہے ہیں اور یہ راز تین زونل افسران کے علاوہ وہ بھی جانتا ہے۔"

"ہاں فرمان نے فون کے ذریعے مجھے بتا دیا ہے کہ ڈی جی دھاون نے اسے بیٹا اور بینا کو بہو بنایا ہے۔ ان دونوں کے چہرے اور تمام شناختی نشانات مٹ چکے ہیں۔ اب ان کے نام نثار احمد اور بانو بیگم ہیں۔ مراد کو کسی سلسلے میں دھوکا دیا جا رہا ہے۔ ڈی جی دھاون نے مراد سے کہا ہے کہ اس کی بیٹی اور داماد آ رہے ہیں جبکہ ہمارا اپنا فرمان، بینا کے ساتھ آ رہا ہے۔ "را" والوں کے اعتماد کے مطابق ان کا ایک نہایت چالباز جاسوس اپنی بیوی کے ساتھ مجھے ہلاک کرنے اور تابانی اور فرمان کو ڈھونڈ نکالنے آ رہا ہے۔"

جمشید نے کہا۔ "اب سمجھ میں آیا کہ مراد، آپی کی نیند کے وقت ان کی تصویر کیوں اتارنا چاہتا ہے۔" پھر جمشید نے ہنستے ہوئے کہا۔ "را" والے آپی کی تصویر ہمارے ہی فرمان کو نثار احمد سمجھ کر دیں گے۔ یہ اچھا گیم چل رہا ہے۔ اسے چلنا چاہئے۔ اب میں آپی

کے بیدار ہونے کے بعد رابطہ کروں گا۔"

ان کا رابطہ ختم ہو گیا۔ رات کو کھانے کے وقت آپی بیدار ہو گئیں۔ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ انکل نے پوچھا۔ "کیسی طبیعت ہے؟"

"اب ٹھیک ہوں۔ دواؤں نے اچھا اثر دکھایا ہے لیکن ان دواؤں میں ایک نیند لانے والی بھی دوا ہے۔ میں وقت پر دوائیں کھاؤں گی لیکن وقت بے وقت سونا نہیں چاہتی۔"

"تمہیں سونا بھی چاہئے اور جاگنے کے بعد آرام بھی کرنا چاہئے۔ یہ تمہاری امی کا حکم ہے۔"

"امی؟ کیا آپ نے امی کو میرے بارے میں بتایا ہے؟"

"ڈاکٹر فیروزہ نے انہیں میڈیکل پرابلمز بتائے ہیں۔ وہ یہاں آ رہی ہیں۔"

وہ حیرانی سے بولیں۔ "کون؟ میری امی آ رہی ہیں۔ یا اللہ، ماں ایسی ہوتی ہے۔ اولاد کی تکلیف سنتے ہی ہزاروں میل دور سے چلی آ رہی ہیں۔"

"ان کی ممتا کو سمجھو اور ان کی ہدایات پر عمل کرو۔ انہوں نے کہا ہے کہ تم یہیں رہو گی۔ زیادہ سے زیادہ آرام کرو گی۔ باجی نے سختی سے تاکید کی ہے کہ تم آئندہ دشمنوں کے مقابلے پر ایکشن میں نہیں رہو گی۔"

"امی کا حکم سر آنکھوں پر لیکن مجھے مراد کے پاس جانا چاہئے۔"

"جمشید کی نظروں میں کوئی مجرم آ جائے تو وہ اس کی جڑوں تک پہنچ جاتا ہے۔ اس نے مراد کے بارے میں جو معلومات حاصل کی ہیں، ذرا توجہ سے سنو۔"

انکل ایک کرسی پر بیٹھ کر آپی کو مراد کے بارے میں حقائق بتانے لگے اور وہ بڑے دکھ سے سننے لگیں۔

☆=====☆=====☆

مراد اس گھر میں بے چین اور پریشان تھا۔ وہ کبھی گھڑی دیکھ رہا تھا اور کبھی کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ بس وہ آتی ہی ہو گی۔

رات کے نو بج گئے، دس بج گئے، گیارہ بج گئے پھر آدھی رات گزرنے لگی لیکن وہ نہیں آئی۔ اسے دھڑکا لگا ہوا تھا، کیا تابانی نے اس کی چوری پکڑ لی ہے؟ وہ بھی "را" کی دہشت گرد رہ چکی ہے۔ یہاں کے افسران کو پہچانتی ہے۔ کیا اس نے اسسٹنٹ زونل افسر کے ساتھ اسے دیکھ لیا ہے؟

اسسٹنٹ زونل افسر نے موبائل فون دیا تھا۔ وہ فون کے ذریعے تابانی سے رابطہ کر

سکتا تھا لیکن وہ پہلے یہی سوال کرتی کہ اس کے پاس فون نہیں ہے پھر وہ کس کے فون سے رابطہ کر رہا ہے؟ اسسٹنٹ زونل افسر نے بھی تاکید کی تھی کہ وہ تابانی سے اس فون کو چھپا کر رکھے۔

جب آدھی رات ہونے لگی تو اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے اٹیچی میں چھپائے ہوئے فون کو نکالا۔ اسے آن کیا۔ تابانی کے موبائل فون کے نمبر پنچ کئے۔ رابطہ ہوتے ہی تابانی کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو کون؟"

"میں ہوں مراد۔ تم کہاں رہ گئی ہو۔ اتنی رات ہو چکی ہے۔ میں پریشان ہو رہا ہوں کہ خدانخواستہ تم کسی مصیبت میں نہ پڑ گئی ہو۔"

وہ بولی۔ "جو مصیبت ہوتی ہے' اس پر مصیبت کبھی نہیں آتی۔"

"میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں مگر تم کہاں ہو؟"

"ہمارے لندن جانے کے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ پہلے میں جا رہی ہوں۔ دو دنوں کے بعد تم جاؤ گے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟ تم مجھ سے الگ رہ کر جانا چاہتی ہو؟"

"دانش مندی یہی ہے۔ جمشید کو ٹریننگ کے لئے اسکاٹ لینڈ بھیجا جا رہا ہے۔ میں انٹیلی جنس کے ایک افسر کے ساتھ چلی جاؤں گی تو کوئی مجھ پر شبہ نہیں کرے گا۔ میرا پیٹ دیکھ کر بھی دشمن مجھے تابانی نہیں' جمشید کی بہن سمجھیں گے۔ تم خود ہی سوچو' یہ کتنا محفوظ طریقہ ہے۔"

"بے شک یہ بہت ہی محفوظ طریقہ ہے۔ میں تمہاری طرف سے مطمئن رہوں گا لیکن روانگی سے پہلے مجھ سے ملتی جاؤ۔"

"کیسے مل سکتی ہوں۔ ابھی ائرپورٹ پر ہوں اور فلائٹ روانہ ہونے والی ہے۔ اگر تم ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے فون کرتے تو مجھ سے رابطہ نہ ہوتا۔ کراچی پہنچتے ہی فون کا کوڈ نمبر بدل جاتا۔"

"میں ابھی تم سے ملنے آ رہا ہوں۔ تم کسی دوسری فلائٹ سے چلی جانا۔"

"جمشید سرکاری ڈیوٹی پر جا رہا ہے۔ وہ ہماری ملاقات کے لئے فلائٹ نہیں بدل سکے گا۔"

"کیا......' تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے بغیر رہوں۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ میں بحفاظت لندن پہنچوں گی۔ تمہیں خوش ہونا چاہئے۔ تین دن کے بعد لندن میں ہماری ملاقات ہو جائے گی۔"

"اب میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ مجھے واقعی مطمئن ہونا چاہئے' تم حفاظتی انتظامات کے ساتھ جا رہی ہو۔"

"خود کو تنہا نہ سمجھو۔ انکل تم سے رابطہ رکھیں۔ ہاں مگر کیسے؟ تمہارے پاس فون نہیں ہے۔ ابھی تم کس کے فون سے بول رہے ہو؟"

"میں جنرل پوسٹ آفس کے ٹیلی فون بوتھ سے بول رہا ہوں۔ انکل سے کہو' وہ تم سے رابطہ رکھنے کے لئے مجھے ایک موبائل فون دیں۔"

"میں ابھی کہوں گی۔ صبح سے پہلے تمہیں فون کروں گی۔"

"تابانی' ہم نے اتنی دیر باتیں کر لیں۔ تم نے جو کہا' میں نے اسے سچ مان لیا کیونکہ تم میرے پیار میں سچی ہو۔ میں جو کہتا ہوں' تم اسے نہیں مانتیں کیونکہ میں تم سے جھوٹ بولا کرتا ہوں۔"

"اتنی لمبی تمہید نہ باندھو۔ کام کی بات کرو۔"

"تم دل سے مانتی ہو کہ جھوٹا ہونے کے باوجود میرا پیار جھوٹا نہیں ہے۔ ابھی تم سچ بول دو' تم ائرپورٹ سے فون نہیں کر رہی ہو۔"

"تم بھی سچ کہہ دو کہ جنرل پوسٹ آفس سے فون نہیں کر رہے ہو۔"

"آدھی رات کو بھلا پبلک ٹیلی فون کہاں سے ملے گا اور میرے پاس کارڈ بھی نہیں ہے کہ اسے پنچ کر کے کہیں سے فون کروں؟"

"گھر میں پانی ہو تو باہر کنواں کھودنے کیوں جاؤ گے۔ تم ابھی گھر میں بیٹھے آرام سے باتیں کر رہے ہو۔ اب یہ پہیلی نہ بجھواؤ کہ تمہارے پاس موبائل فون کہاں سے آیا ہے؟"

وہ حیرانی اور پریشانی سے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے فون کو دیکھنے اور سوچنے لگا کہ اسے کیسے معلوم ہو گیا کہ میرے پاس یہ فون ہے؟ میرا شبہ درست ہے۔ اس نے مجھے اسسٹنٹ زونل افسر کے ساتھ دیکھ لیا ہے۔

اس نے فون کو پھر کان سے لگا کر کہا۔ "تابانی! یہ مان لو کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ تم بھی جھوٹ بول رہی ہو' میں بھی جھوٹ بول رہا ہوں۔ بولو' ہم دونوں ایک دوسرے سے جھوٹ بول رہے ہیں نا؟"

اسے جواب نہ ملا۔ اس نے فون کو کان سے ہٹا کر دیکھا۔ فون کے چھوٹے اسکرین پر لکھا تھا۔ "کال ختم ہو چکی ہے۔"

وہ پریشان ہو کر ٹہلنے لگا پھر اس نے زونل افسر سے رابطہ کیا اور کہا۔ "سر! میں مراد

بولا رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے نشے میں لڑکھڑاتی ہوئی آواز سنائی دی "موراد.......... ہاں.......... وہ مو.......... راد..........! جال دی بکو.......... کک.......... کیا.......... بکنا ہے.......... آ.......... بے.......... باکتا کیوں ناہی ہے؟"

مراد بھول گیا کہ زونل افسر رات ہوتے ہی پینے لگتا ہے۔ آج شاید وہ دو مہمانوں کی میزبانی کے باعث دیر سے پی رہا تھا' اس نے کہا۔ "سر! مجھے نثار احمد کا فون نمبر بتائیں۔ میں ابھی تابانی کی تصویر لے جا کر نثار صاحب کو دوں گا۔"

"اوہ.......... تصبیر لے ڈ۔ ساباس.......... پ.......... پرل ہو ہوٹل روم ٹو ون ٹو پھون نمبر.......... نمبر.........."

"بس.......... بس.......... اتنا ہی کافی ہے۔"

وہ فون بند کر کے سامنے دیوار تکنے لگا۔ سوچنے لگا' جسے وہ دل و جان سے چاہتا ہے جو اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے' اس کا اعتماد بالکل ہی کھو چکا ہے۔ اب دہری چال چلے اور اپنی تابانی کو یہ بتا دے کہ "را" کے ڈی جی دھاون کی بیٹی اور داماد پرل ہوٹل کے کمرا نمبر212 میں ہیں اور وہ ڈی جی دھاون کی بہت بڑی کمزوری حاصل کرنے کے لئے ہی اب تک "را" والوں کا وفادار بنا ہوا تھا ورنہ وہ صرف اپنی تابانی کا وفادار ہے تو یہ سچ معلوم کر کے وہ دھاون کی بیٹی اور داماد کو ہلاک کر کے اپنے مراد پر ہمیشہ اعتماد کرنے لگے گی۔

☆=====☆=====☆

مراد دہری چالیں چلنے والے منصوبے پر دوبارہ غور کرنے لگا۔ وہ "را" والوں کا اعتماد تو حاصل کر ہی چکا تھا۔ اب میری آپی کا اعتماد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ آپی کو یہ بتا دیتا کہ ڈی جی دھاون کی بیٹی اور داماد پرل ہوٹل کے کمرا نمبر212 میں ہیں اور آپی وہاں جا کر تصدیق کرتیں اور انہیں ہلاک کر دیتیں تو مراد کی سچی رپورٹ پر خوش ہو جاتیں۔ مراد کی طرف سے دل صاف ہو جاتا اور وہ پھر اس پر اعتماد کرنے لگتیں۔

دوسری طرف یہ اندیشہ تھا کہ "را" والے اس پر شبہ کریں گے کیونکہ زونل افسر نے اسے بتایا تھا کہ دھاون کی بیٹی اور داماد کس ہوٹل کے کس کمرے میں ہیں لیکن مراد نے سوچا۔ زونل افسر کی بات کو آسانی سے جھٹلایا جا سکتا ہے کیونکہ وہ شراب کے نشے میں دھت تھا۔ پتا نہیں کیا بڑبڑاتا رہا تھا لیکن پرل ہوٹل کی بات نہیں کی تھی۔ زونل افسر بھی الجھ کر رہ جاتا کہ پتا نہیں وہ نشے کی زیادتی کے باعث کیا بکواس کرتا رہا تھا۔

مراد کے لئے یہ اچھا موقع تھا۔ وہ میری آپی کا اعتماد بھی حاصل کر لیتا اور "را" والے بھی اس کی وفاداری پر بھروسا کرتے رہتے۔

اس نے اچھی طرح ہر پہلو سے سوچ کر فیصلہ کیا پھر فون پر میری آپی کو مخاطب کیا "تابانی' میں نے تمہارے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اپنے ہونے والے بچے کی قسم کھائی تھی۔ اب میں ثابت کروں گا کہ میں نے تمہارے ساتھ وفادار رہنے کی سچی قسم کھائی تھی۔ اب میں صاف صاف کہتا ہوں کہ میں نے "را" والوں سے وفادار رہنے کی یہ شرط رکھی تھی کہ وہ تمہاری غداری کو معاف کر دیں گے لیکن تمہیں معاف کرنے کی ٹھوس ضمانت چاہتا تھا۔ تب انہوں نے ڈی جی دھاون سے میری بات کرائی۔ میں نے دھاون صاحب سے پوچھا۔ میں کیسے آپ پر بھروسا کروں۔ آپ کسی بھی بہانے میری بیوی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

"کیا انہوں نے تمہیں کوئی ٹھوس ضمانت دی ہے؟"

"ہاں ایک راز جو یہاں کے تین زونل افسران جانتے ہیں اب اس نے مجھ چوتھے کو رازدار بنایا ہے۔ تم بھی سنو گی تو یقین نہیں کرو گی۔ اس نے ضمانت دی ہے کہ اگر دھاون کے حکم پر تابانی کو ذرا بھی نقصان پہنچا تو میں دھاون کی بیٹی اور داماد کو گولی مار سکتا ہوں اور اس کی بیٹی اور داماد اس وقت پرل ہوٹل کے کمرا نمبر212 میں ہیں۔"

آپی نے پوچھا۔ "تم نے کیسے یقین کر لیا؟ ان کے نام کیا ہیں؟"

"وہ مسلمان کے بھیس میں آئے ہیں۔ یہاں بیٹی کا نام بانو بیگم اور بیٹے کا نام نثار احمد ہے۔ یہاں کے زونل افسر نے بھی تصدیق کی ہے۔ تم بھی گن پوائنٹ پر ان کی حقیقت اگلوا کر دھاون کی اکلوتی بیٹی اور نثار احمد کو ہلاک کر سکتی ہو۔ اس کے بعد تمہیں یقین آئے گا کہ میں "را" والوں کا اعتماد دوبارہ حاصل کر کے کس طرح پاکستان سے ان کے قدم اکھاڑنا چاہتا ہوں۔"

"اگر تمہاری یہ اطلاع درست نکلی اور میں نے دھاون کو اتنا بڑا صدمہ پہنچا دیا تو آئندہ کبھی تم پر کسی طرح کا بھی شبہ نہیں کروں گی۔ تمہیں اپنے اور انکل ہاشم کے ہر راز میں شریک رکھوں گی۔"

"تابانی! یہ بہت اہم معاملہ ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ اس ہوٹل جاؤں گا۔"

"بے شک۔ ہم کتنی ہی خطرناک وارداتوں میں ہمیشہ ساتھ رہے ہیں اور یہ واردات تو ڈی جی دھاون کو پاگل بنا کر رکھ دے گی۔ ابھی رات کے دو بجنے والے ہیں۔ تم چار بجے ہوٹل کے سامنے ملو۔"

"میں ٹھیک وقت پر آؤں گا لیکن میں نے اسسٹنٹ زونل افسر سے ایک کیمرہ اور ایک یہ موبائل فون لیا تھا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔"

"میں تمہارے لئے پستول اور ایکسٹرا میگزین لے آؤں گی۔"

فون کا رابطہ ختم ہو گیا۔ مراد کو وہاں سے پرل ہوٹل جانے کے لئے گاڑی کی ضرورت تھی۔ اس نے لباس تبدیل کرتے ہوئے سوچا۔ مین روڈ تک پیدل جانا ہو گا۔ اس کے بعد ٹیکسی یا آٹو رکشا مل ہی جائے گا۔ وہ لباس تبدیل کر کے جوتے پہن رہا تھا۔ ایسے ہی وقت اپنے فون کا بزر سن کر چونک گیا۔ اس فون کا نمبر اسسٹنٹ زونل افسر جانتا تھا۔ سوال پیدا ہوا' اتنی رات کو اس نے کیوں فون کیا ہے؟

مراد نے فون اٹھا کر اسے آن کیا پھر کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ "ہیلو کون؟"

دوسری طرف سے آئی۔ "مراد! میں رگھوویر ہوں۔ تم نے مجھے پہچانا؟"

وہ بولا۔ "کون رگھوویر؟ ہاں ایسا ایک نام یاد ہے۔ آواز بھی کچھ ویسی ہی لگ رہی ہے۔"

"تم جو سمجھ رہے ہو' میں وہی پیلی ٹیکسی کا ڈرائیور ہوں۔ تم کئی گھنٹے تک اسسٹنٹ زونل افسر کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھے باتیں کرتے رہے اور تابانی کی سلامتی کے سلسلے میں ٹھوس ضمانت طلب کرتے رہے پھر فون پر ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ دھاون صاحب نے ایک ٹھوس ضمانت دے کر مطمئن کیا تھا؟"

"ٹھیک ہے رگھو! تمہاری ان باتوں نے یقین دلا دیا ہے کہ ٹیکسی کی تنہائی میں ہونے والی تمام باتیں سنتے رہے ہو۔ ابھی تم نے کیوں فون کیا ہے؟"

"تمہاری بہتری کے لئے۔ اگر دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنا چاہتے ہو تو میرے راز دار بنو گے؟"

"ہم تو دولت حاصل کرنے اور اپنی درندگی کی تسکین کے لئے یہ سب کچھ کرتے ہیں لیکن کس بھروسے پر تمہارا راز دار بنوں؟"

"باتیں ایسی ہیں جو فون پر مناسب نہیں ہوں گی۔ ابھی کہیں مل سکتے ہو تو جگہ بتاؤ۔ میں اسی پیلی ٹیکسی میں پہنچ جاؤں گا۔"

"میں بیس منٹ بعد بڈھا دریا کے پُل کے پاس کھڑا رہوں گا۔"

"بس سمجھ لو کہ میں بھی بیس پچیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔"

مراد مکان سے باہر آ کر دروازے پر تالا لگا کر پیدل چلتا ہوا مقررہ جگہ پہنچا تو وہاں ٹیکسی اس سے پہلے پہنچی ہوئی تھی۔ رگھو اس کا بونٹ اٹھائے جیسے گاڑی کی کوئی خرابی

درست کر رہا تھا۔

مراد نے ذرا چھپ کر دیکھا۔ ٹیکسی بالکل خالی تھی۔ اس نے قریب آ کر پوچھا۔ "کیا کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے؟"

وہ بونٹ گرا کر بولا۔ "یہ بالکل ٹھیک ہے۔ ابھی پٹرولنگ پولیس والے اپنی گاڑی میں جا رہے تھے۔ انہیں بتانا پڑتا کہ میں اس ویران جگہ ٹیکسی روکے کیوں کھڑا ہوں۔ پولیس والوں کی گاڑی دور سے دیکھتے ہی میں اس کی مرمت کرنے کا بہانہ کرنے لگا۔ انہوں نے دیکھا پھر کچھ پوچھے بغیر آگے چلے گئے۔"

مراد اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "بہت چالاک ہو۔"

رگھو ٹیکسی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ "چالاک نہ ہوتا تو اتنی دولت نہ کماتا' جتنی تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"کیا کروڑ پتی بن گئے ہو؟"

"اب اتنا اوپر بھی نہیں چڑھنا ہے کہ نیچے گرو تو ہڈی پسلیاں بھی سلامت نہ رہ سکیں۔ میں لاکھوں روپے کما لیتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"میں "را" کا بھی تابع دار ہوں اور ایک بہت خطرناک خفیہ ایجنسی کا بھی کام کرتا ہوں۔ یہ بات "را" والے نہیں جانتے۔ اگر تم چاہو تو ابھی پانچ لاکھ روپے کیش ملیں گے اور آئندہ تمہاری حفاظت کی پوری ذمے داری لی جائے گی۔"

"ایسی کون سی ایجنسی ہے جو ابھی پانچ لاکھ روپے بھی دے گی اور میری حفاظت کی ذمے داری بھی لے گی؟"

"پانچ لاکھ تو صرف ایک کام کے دیئے جائیں گے۔ اس کے بعد جو اہم کام ہیں' انہیں صرف تم ہی کر سکتے ہو۔"

"وہ ایجنسی والے کیسے جانتے ہیں کہ صرف میں ہی ان کے کئی اہم کام کر سکتا ہوں؟ یار' اس ایجنسی کے بارے میں بتاؤ۔"

"وہ ایجنسی خفیہ ہاتھ کی کئی ایجنسیوں میں سے ایک ہے۔ تم بہت لکی ہو کہ خفیہ ہاتھ بعض اہم معاملات میں تم پر بھروسا کر رہا ہے۔"

مراد نے دیکھا۔ دور سے ایک کار آ رہی تھی۔ رگھو نے کہا۔ "اس کار میں شاید ایجنسی کا انچارج ہے۔ وہ ایک طرف رکے گی تو میں اس کے قریب ٹیکسی لے کر جا کر روک دوں گا۔ تم پچھلی سیٹ پر چلے جانا۔ انچارج بھی کار سے اتر کر تمہارے پاس آ کر

بیٹھ جائے گا۔"

دور سے آنے والی کار ایک جگہ رک گئی۔ ٹیکسی بھی اس کے قریب جا کر رک گئی۔ مراد اگلی سیٹ سے نکل کر پچھلی سیٹ پر آیا۔ اس کار سے بھی ایک شخص بریف کیس لے کر مراد کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی آگے چل پڑی۔

اس شخص نے مراد سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا نام رشید پٹیل ہے۔ رگھو نے بتایا ہو گا کہ سیکرٹ ایجنسی میں میرا عہدہ کیا ہے؟"

"جی ہاں' آپ ایجنسی کے انچارج ہیں اور اس ایجنسی کا تعلق خفیہ ہاتھ سے ہے۔"

"اور خفیہ ہاتھ بہت کم لوگوں پر بھروسا کرتا ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ اس کی نظروں میں قابلِ اعتماد ہو۔"

"یہ خفیہ ہاتھ کی مہربانی ہے۔ مجھے کیا کرنا ہے؟"

"جو کرنا ہے' پہلے اس کا مختصر سا پس منظر سن لو۔ دردانہ بیگم کی پارٹی کے چار سیاست دانوں نے اچانک پارٹی چھوڑ کر اسمبلی میں اس کی اکثریت ختم کر دی۔ دوسرے لفظوں میں کسی نے خفیہ ہاتھ کی کٹھ پتلی حکومت بننے نہیں دی۔ مخالفین کے سلسلے میں گاڈ فادر ہاشم' تابانی اور فرمان کا نام آتا رہا کہ ان لوگوں نے جبراً دردانہ کی پارٹی کے چاروں سیاست دانوں سے خطوط لکھوا کر انہیں اغوا کیا ہے اور مار ڈالا ہے۔"

مراد نے کہا۔ "یہاں تک میں جانتا ہوں۔ کئی خفیہ ایجنسیاں ہاشم' تابانی اور فرمان کو ڈھونڈ نہیں پا رہی ہیں۔ کیا آپ میرے ذریعے تابانی تک پھر تابانی کے ذریعے ہاشم اور فرمان تک پہنچنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں' تمہارا اندازہ غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کل رات ہم نے اسلام آباد میں "را" کے زونل افسر سے ایک کاک ٹیل پارٹی میں ملاقات کی۔ اس نے شراب کے نشے میں کہا۔ "دردانہ کیا چیز ہے؟ یہ پاکستان کیا چیز ہے؟ ہم تو یہاں کی بڑی سے بڑی شخصیت کو اٹھا کر لے جا سکتے ہیں۔" یہ سنتے ہی میں نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ بڑی ہوشیاری سے اسے اغوا کر کے ہمارے خفیہ اڈے میں لے آئے جب اس پر بری طرح تشدد کیا گیا تو اس نے اگل دیا کہ "را" کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ دھاون نے ایمرجنسی کے طور پر آرڈر دیا تھا کہ ان چار سیاست دانوں کو اغوا کر کے کہیں چھپا دیا جائے۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ "یہ خفیہ ہاتھ کے لئے اور ہم سب کے لئے بڑی حیرانی کی بات تھی کہ "را" کے ڈی جی دھاون نے ایسا کس مقصد کے لئے کیا ہے؟ جب کہ خفیہ ہاتھ اور وہ اہم معاملات میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ اگر خفیہ ہاتھ

دوستانہ انداز میں دھاون سے پوچھتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے تو وہ صاف انکار کر دیتا۔ اسے الزام دینے کے لئے کوئی ٹھوس ثبوت بھی نہیں تھا لیکن اب وہ سچائی اگل دے گا۔"

"کیسے اُگل دے گا؟"

"تمہارے ذریعے۔"

مراد نے حیرانی سے پوچھا۔ "میرے ذریعے؟"

"ہاں آج رگھو نے ٹیکسی میں تمہاری اور اسسٹنٹ زونل افسر کی باتیں سنیں لیکن کچھ اہم باتیں ادھوری رہ گئیں کیونکہ تم فون پر دھاون سے تابانی کی سلامتی کی ضمانت مانگ رہے تھے۔ دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ اس کے جواب میں تم حیرانی سے ڈی جی دھاون کی بیٹی کے بارے میں کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ یہ بات صاف سمجھ میں آ گئی کہ دھاون نے اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

مراد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "جی ایسی ہی کچھ بات ہے۔"

"کچھ بات نہیں' کوئی اہم بات تم سے کہی گئی تھی۔ کوئی ایسا اہم راز تمہیں بتایا گیا ہے جسے تمہارے پاس بیٹھا ہوا زونل افسر بھی نہیں سن پایا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"دیکھئے میں ابھی تک سمجھ نہیں پایا کہ آپ مجھ سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں یا کوئی کام لینا چاہتے ہیں؟"

انچارج نے بریف کیس اٹھا کر کھولا تو مراد کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیوں پر ایک پستول اور دو ایکسٹرا میگزین رکھے ہوئے تھے۔ وہ بولا۔ "یہ پورے پانچ لاکھ روپے ہیں۔ ہمارا ساتھ دینے اور مطلوبہ کام کر گزرنے کے بعد مزید پانچ لاکھ روپے ملیں گے۔ یہ پستول پوری طرح لوڈ ہے اور الگ سے یہ دو بھرے ہوئے میگزین ہیں۔ یہ سب تمہارے ہیں۔"

اس نے بریف کیس کو بند کر کے اسے مراد کی گود میں رکھ دیا۔ تین ماہ بعد تابانی کی گود بھرنے والی تھی۔ مراد کی گود ابھی بھر گئی تھی۔ انچارج نے کہا۔ "ڈی جی دھاون کی وہ باتیں جو ہمارا رگھو نہ سن سکا' وہ بتاؤ۔ خصوصاً اس کی بیٹی کے بارے میں............"

مراد نے کہا۔ "دھاون صاحب نے تابانی کی سلامتی کی ضمانت دینے کے سلسلے میں کہا تھا کہ ان کی ایک ہی اکلوتی بیٹی ہے۔ کوئی باپ اپنی بیٹی کی زندگی داؤ پر نہیں لگائے گا۔ وہ تابانی کی سلامتی کے لئے اپنی بیٹی کو میری نظروں کے سامنے رکھیں گے۔ اگر تابانی کو "را" کی طرف سے نقصان پہنچے گا تو میں ان کی بیٹی کو گولی مار دوں گا۔"

انچارج نے کہا۔ "تعجب ہے۔ تمہاری تابانی کی خاطر ڈی جی دھاون اپنی بیٹی کی

زندگی داؤ پر لگائے گا؟ نہیں وہ بہت مکار ہے۔ کسی دوسری لڑکی کو اپنی بیٹی بنا کر تمہاری نظروں کے سامنے رکھے گا۔"

مراد نے کہا۔ "اسے دھوکا دینے دیں۔ میں بھی اس کے سامنے تابانی کے موجودہ چہرے کی نہیں، کسی دوسری عورت کی تصویر پیش کروں گا۔"

"وہ تابانی کی تصویر کیوں چاہتا ہے؟"

"را" کا ایک بہت ہی خطرناک، ذہین اور دلیر جاسوس ہے۔ دھاون صاحب کے بیان کے مطابق وہ جاسوس ان کا داماد بھی ہے اور ان کی بیٹی کے ساتھ یہاں پہنچا ہوا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ چالبازی سے تابانی کو دیکھ کر اس کے ذریعے گاڈ فادر ہاشم تک پہنچ جائے اور ہاشم کو ہلاک کر کے دھاون صاحب کی بیٹی یعنی اپنی بیوی کے ساتھ لندن چلا جائے گا۔"

"کیا وہ دونوں اس شہر میں پہنچ گئے ہیں؟"

"ہاں، وہ دونوں مسلمان بن کر آئے ہیں۔ دھاون صاحب کی بیٹی کا نام بانو بیگم اور داماد جاسوس کا نثار احمد ہے۔"

"انہیں کہاں ٹھہرایا گیا ہے؟"

"وہ دونوں "را" سے رابطہ نہیں رکھیں گے۔ اپنا کام کریں گے اور یہاں سے چلے جائیں گے۔ اس وقت عام دولت مند مسافروں کی طرح پرل ہوٹل کے کمرا نمبر212 میں ہیں۔"

"تم نادان نہیں ہو۔ اتنا سمجھ سکتے ہو کہ تابانی کے ذریعے ہاشم تک پہنچنے والا تابانی کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"جب آپ سمجھتے ہیں کہ میں نادان نہیں ہوں تو یہ بھی سمجھ لیں کہ.......... جسٹ اے منٹ۔"

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا پھر کہا۔ "تین بج کر تیس منٹ ہوئے ہیں۔ رگھو! راستہ بدل دو۔ آدھے گھنٹے کے اندر پرل ہوٹل پہنچاؤ۔ چار سے ساڑھے چار بجے کے درمیان بانو بیگم اور نثار احمد کی موت کا وقت مقرر کیا جا چکا ہے۔"

رگھو راستہ بدل کر ہوٹل کی طرف جا رہا تھا۔ انچارج نے پوچھا۔ "تم ابھی ان دونوں کو ہلاک کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں، میری تابانی کی صورت دیکھنے سے پہلے وہ موت کی صورت دیکھے گا۔"

"بے شک تم نثار احمد کو مار ڈالو لیکن بانو بیگم بن کر آنے والی کو ہم لے جائیں گے۔

جب ان دونوں نے یہاں "را" والوں سے رابطہ نہیں رکھا ہے تو کچھ یقین ہو رہا ہے کہ وہ ڈی جی دھاون کی بیٹی ہے۔"

"کیا اس کی بیٹی کو لے جانے کے لئے آپ کے آدمی ہیں؟"

"ہیں، پیچھے میری کار میں ہیں۔"

"انہیں سمجھا دیں کہ میرے ساتھ نہ آئیں۔ جب میں ہوٹل کی لفٹ کے اندر چلا جاؤں، تب وہ ہوٹل کے اندر آئیں کمرا نمبر212 کے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر پہلے معلوم کریں کہ میں اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہو رہا ہوں پھر وہ اندر آ کر اس کی بیٹی کو جس طریقے سے لے جانا چاہیں لے جائیں۔ اس ٹیکسی کو ہوٹل سے ذرا دور روکیں۔"

اس کی فرمائش کے مطابق ٹیکسی کو دور روکا گیا۔ اس نے موبائل کے ذریعے آپی سے پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟"

آپی نے کہا۔ "ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں۔"

"کیا ریوالوروں میں سائلنسر لگے ہوئے ہیں نا؟"

"میں پوری تیاری کے ساتھ آئی ہوں۔"

اس نے فون کو بند کیا۔ بریف کیس کو کھول کر پستول اور ایک ایکسٹرا میگزین نکالا۔ انچارج نے پوچھا۔ "جب تمہارا کوئی ساتھی ریوالور لا رہا ہے تو اسے کیوں لے جا رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "احتیاطاً۔ میں کسی کے ساتھ پر بھی بھروسا نہیں کرتا۔ آپ کے پاس یہ پانچ لاکھ روپے میری امانت ہیں۔ واپسی میں لوں گا۔"

وہ انچارج کو بریف کیس دے کر ٹیکسی سے باہر آیا پھر تیزی سے چلتا ہوا پارکنگ ایریا میں پہنچا۔ وہاں آپی اس کی منتظر تھیں۔ اس کے ساتھ ہوٹل کی عمارت کی طرف چلنے لگیں۔ مراد نے پوچھا۔ "ریوالور کہاں ہے؟"

"کیوں بے چین ہو رہے ہو؟ کیا میں اپنے پرس میں ہتھیار لاؤں گی۔ وہ میرے پیٹ کے پاس لباس کے اندر ہے۔ اپنے حواس درست رکھو۔"

وہ ہوٹل کے اندر کاؤنٹر پر آئے۔ ایسے وقت ملاقات کرنے والوں کو کسی کمرے میں جانے سے پہلے کمرے میں رہنے والے سے فون پر پوچھا جاتا ہے۔ آپی اپنے ساتھ سفری بیگ لائی تھیں۔ انہوں نے کہا۔ "ہمیں ایک کمرا چاہئے لیکن میں ماں بننے والی ہوں۔ زیادہ بلندی پر رہنا نہیں چاہتی۔ کیا فرسٹ یا سکینڈ فلور پر کمرا مل سکتا ہے؟"

"یس میڈم! روم نمبر ٹو ون زیرو' بہترین کمرا ہے۔"

وہ ہوٹل کا کارڈ پُر کرنے لگیں۔ ایجنسی کے انچارج کے تین آدمی چھپ کر ہوٹل کی عمارت کے ایک ستون کے پاس آئے۔ وہاں سے مراد نظر آ رہا تھا۔ ایک شخص نے موبائل پر انچارج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "سر! مراد کے ساتھ کوئی عورت ہے۔ کوئی مرد ساتھی نہیں ہے۔ وہ کمرا لینے والا کارڈ پُر کر رہی ہے۔"

انچارج نے کہا۔ "مراد جانتا ہے' اس وقت کسی ملاقات کرنے والے کو کسی کمرے کی طرف جانے نہیں دیا جائے گا اس لئے وہ کسی کو بیوی بنا کر لایا ہے۔" انچارج بیوی کہتے ہی وقت چونک گیا پھر اس نے پوچھا۔ "کیا وہ عورت حاملہ ہے؟"

"یس سر! اب وہ دونوں لفٹ کی طرف جا رہے ہیں۔"

"دیکھو بہت ہوشیار رہو۔ وہ عورت تابانی ہے۔ ہماری توقع کے خلاف کچھ بھی کر سکتی ہے۔"

اس نے فون بند کر کے کہا۔ "رگھو! یہ مراد بھروسے کے قابل نہیں ہے۔ اس نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ یہاں تابانی اس کے ساتھ رہے گی۔"

"سر! ویسے تو کسی مجرم پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا لیکن دو معاملات میں آپ ہمیشہ مراد پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ ایک تو وہ دولت کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ انسانی زندگی سے کھیلنا اس کا مشغلہ ہے۔ وہ صرف تابانی کا دیوانہ ہے اس لئے اس کے بارے میں ہمیں یا کسی کو کچھ نہیں بتاتا ہے۔"

آپی اور مراد کمرا نمبر210 میں پہنچ گئے تھے۔ اس کے ٹھیک سامنے میں اور بینا کمرا نمبر212 میں تھے۔ بینا بستر پر نیم دراز تھی اور میں ایک چیئر پر بیٹھا آگے پیچھے جھولتے ہوئے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دروازہ پہلے ذرا سا کھلا پھر پوری طرح کھل گیا۔

کھلے ہوئے دروازے پر آپی کھڑی تھیں۔ اس کے پیچھے مراد دکھائی دے رہا تھا۔

بہت پہلے ہی فون کے ذریعے میری اور آپی کی باتیں ہو چکی تھیں اور ایک منصوبہ تیار ہو چکا تھا کہ آئندہ ہمیں کیا کرنا ہے؟

ویسے پہلی بار ہم بہن بھائی نئے چہروں کے ساتھ روبرو ہوئے تھے۔ وہ جذبات سے بے قابو ہو کر دوڑتی ہوئی آئیں۔ میں بھی اٹھ کر آگے بڑھ کر ان سے لپٹ گیا۔ مراد دروازے پر کھڑا ہکا بکا سا ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اِدھر اُدھر چومتی جا رہی تھیں۔

مراد نے کہا۔ "سمجھ گیا' یہ فرمان ہے۔"

آپی نے کہا۔ "آؤ مراد! میں تمہیں یہی دکھانے لائی ہوں کہ محبت کے رشتے کتنے گہرے ہوتے ہیں۔ تم بہت گمراہ ہوتے رہے۔ آؤ میرے بھائی سے دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ۔ اسے گلے لگاؤ۔"

وہ دروازے پر کھڑا تھا' کہنے لگا۔ "اب سمجھا اسی لئے تم اپنے ساتھ کوئی ہتھیار نہیں لائی ہو۔"

"بارود کی بو وہاں اچھی نہیں لگتی' جہاں پھول کھلتے ہوں۔ تم میرے ہو۔ میری طرح سوچو۔ امی نے مجھے اور میرے ہونے والے بچے کے لئے کس طرح شریفانہ اور تعمیری زندگی کی راہ دکھائی ہے۔ یہ اس عظیم ماں کا بیٹا ہے۔ میرا بھائی ہے۔ تم محبوب ہو' دل میں دھڑکتے ہو۔ یہ میری جان ہے۔ میری سانسوں میں بستا ہے۔"

مراد نے اچانک اپنے لباس کے اندر سے پستول نکال کر کہا۔ "تابانی! تم عقل سے پیدل ہو۔ یہ جو ماں اور بھائی کے رشتے ہیں۔ یہ صرف موت دیں گے۔ "را" کے جاسوس خفیہ ایجنسیوں کے سراغ رساں تم سب کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ جینا سیکھو تابانی' اپنے لئے' میرے لئے' ہمارے بچے کے لئے۔ اتنا بڑا چانس تو کسی کسی کو ملتا ہے۔ خفیہ ہاتھ نے مجھے قابلِ اعتماد تسلیم کر لیا ہے۔ اب ہم جہاں جائیں گے ہمیں پناہ ملے گی۔ دولت ملے گی۔ تمام بڑے ممالک کی شہریت ملے گی۔ شرط یہ ہے کہ میں پہلی آزمائش میں بہت بڑا کارنامہ کر دکھاؤں۔"

"کیا تم کارنامہ دکھانے کے لئے میرے بھائی کو نشانے پر رکھے ہوئے ہو؟"

"سوال نہ پوچھو۔ اس کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ خفیہ ہاتھ کی تمام ایجنسیاں جس فرمان کو آج تک تلاش نہ کر سکیں۔ میں اس کی لاش کا تحفہ خفیہ ہاتھ کو دوں گا۔"

بینا بستر پر نیم دراز تھی۔ اس کے نیچے ایک ریوالور تھا۔ میری کمر کے بیلٹ کے پیچھے ایک ریوالور تھا مگر ہمیں آپی اور مراد کے پیار کی دیوانگی معلوم تھی۔ ہم میں سے کوئی گولی چلاتا تو آپی شاید یہ صدمہ برداشت نہ کر پاتیں۔ مجھے اور بینا کو زیادہ سے زیادہ صرف یہ خطرہ تھا کہ ہم زخمی ہوں گے۔ ہم نے دیکھتے ہی سمجھ لیا تھا کہ مراد کے ہاتھ میں جو پستول تھا اس کی شوٹنگ رینج پچاس فٹ تک تھی۔ میں اور بینا تقریباً تیس فٹ کی دوری پر تھے۔ اس حساب سے ہم صرف زخمی ہو سکتے تھے۔ وہ بھی اپنی آپی کی خاطر۔

آپی نے کہا۔ "بڑے افسوس کی بات ہے۔ جرائم کی دنیا میں رہ کر بھی تم نے خفیہ ہاتھ کی پالیسیوں کو نہیں سمجھا ہے۔ یہ پستول نہیں پھینکو گے تو پہلے مجھے گولی لگے گی۔ میرے ساتھ تمہارا بچہ بھی مارا جائے گا۔"

"اس بزدل سے کہو' عورت کے پیچھے نہ چھپے۔"

"ہائے مراد! تم نے میری امی اور میرے بھائی کی اعلیٰ ظرفی کو نہ سمجھا ہے' اور نہ سمجھ سکو گے۔ ارے یہ تو اپنی بہن کی خاطر اب تک تمہیں سانس لینے دے رہا ہے۔ اب آخری بار کہہ رہی ہوں۔ پستول پھینک دو۔ اگر میرا پیٹ دیکھ کر اپنے بچے پر رحم آ رہا ہے تو یہ لو' میں گھوم جاتی ہوں۔"

آپی میری طرف گھوم گئیں پھر بولیں۔ "مراد! اب میرا چہرہ نظر آ رہا ہے' نہ اپنے بچے کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ کم آن' گولی چلاؤ۔ میرے گرتے ہی میری عظیم ماں کا سایہ' تمہارے نشانے پر آ جائے گا۔ یہ سمجھ لو کہ اپنے جیتے جی اس پر خراش تک نہیں آنے دوں گی۔"

آپی بولتے وقت میرے پیچھے آئینے میں مراد کو دیکھ رہی تھیں اور مراد سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے اور آپی کو دیکھ رہا تھا۔ میں قد آور تھا۔ آپی سے اونچا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے میرے چہرے یا پیشانی پر گولی مار سکتا تھا اور وہ یہی سوچ رہا تھا۔ بہت آہستہ آہستہ پستول کی نال کو ذرا اوپر اٹھا رہا تھا۔ آپی نے آئینے میں دیکھتے ہوئے' چیختے ہوئے اپنے پیٹ پر سے قمیض اٹھاتے ہوئے کہا۔ "مراد! میرے پیار کا امتحان نہ لو۔ پستول پھینک دو۔ پھینکو........ پھینکو........"

مراد نے ٹریگر دبایا۔ اس سے پہلے بچے کی پرورش کرنے والے پیٹ کے پاس سے ریوالور نکلا۔ ٹھائیں........ ٹھائیں........ ٹھائیں........

مراد کی گولی اوپر چھت پر لگی۔ آپی کی ایک گولی اس کی پیشانی پر اور دوسری گولی سینے میں دل کی جگہ لگی۔ وہ دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرا کر آگے لڑکھڑاتا ہوا اوندھے منہ فرش پر گر کر ذرا تڑپا ہوا چاروں شانے چت ہو کر ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گیا۔

آپی کے ہاتھ سے ریوالور گر گیا تھا۔ پہلے وہ سکتے کی حالت میں دیکھتی رہیں پھر چیخیں مارتے ہوئے' دوڑتے ہوئے مراد کے پاس گئیں اور اس کی لاش سے لپٹ کر رونے لگیں۔ میں نے اور بینا نے سر جھکا لیا۔ پھر ایک دم سے چونک کر بولا۔ "بینا! آپی کے ریوالور سے انگلیوں کے نشانات مٹاؤ اور اسے تم تھام لو اور بینا ریوالور مجھے دو۔ آپی کے لئے یہاں خطرہ ہے۔ میں انہیں پہنچا کر آتا ہوں۔ پولیس آئے تو تم نمٹ لینا۔ کہہ دینا تمہارا شوہر ڈنر کے بعد کہیں گیا تھا۔ اب تک نہیں آیا۔"

میں نے آپی کو مراد کی لاش سے الگ کیا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ اس سے الگ نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ میں انہیں دونوں بازوؤں میں اٹھا کر کمرے سے باہر نکل

کر کوریڈور میں دوڑتا ہوا سمجھانے لگا۔ "خدا کے لئے چپ ہو جائیں ورنہ آپ کے ساتھ آپ کا یہ بھائی بھی مارا جائے گا۔"

انہوں نے ایک دم سے چپ ہو کر مجھے دیکھا پھر مجھ سے لپٹ گئیں۔ میں انہیں بازوؤں میں اٹھائے ایمرجنسی زینے سے اترنے لگا کیونکہ ہوٹل میں فائرنگ کی آواز سے ہلچل سی ہونے لگی تھی۔ لوگ دوسرے زینے اور لفٹ کے ذریعے اوپر آ سکتے تھے۔ ہوٹل کے پچھلے حصے میں کاریں کھڑی ہوئی تھیں' وہاں ہماری بھی رینٹڈ کار تھی۔ میں نے آپی کو اس میں بٹھایا پھر اسٹیئرنگ سیٹ پر آ کر کار ڈرائیو کرتا ہوا پچھلے گیٹ سے مین روڈ پر آ کر کار کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

☆=====☆=====☆

خفیہ ایجنسی کے تین آدمی جو مراد کے پیچھے آنے والے تھے۔ انہیں کاؤنٹر پر روکا گیا۔ ان میں سے ایک شخص نے ٹی ٹی نکال کر کاؤنٹر کے پیچھے آ کر کہا۔ "چپ چاپ اپنی ڈیوٹی پر لگے رہو۔ آنے جانے والوں کو شبہ نہ ہو کہ میں یہاں ٹی ٹی لئے کھڑا ہوں۔"

اس کے دو ساتھی تیزی سے چلتے ہوئے لفٹ کے اندر آئے لیکن قدرتی طور پر ان کی شامت آئی ہوئی تھی۔ فرسٹ فلور اور سیکنڈ فلور پر اچانک لفٹ رک گئی۔ ایسی جگہ اس کا دروازہ بھی نہیں کھولا جا سکتا تھا۔ ان میں ایک نے خطرے کے الارم بجانے کا بٹن دبانا چاہا۔ دوسرے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "کیا کر رہے ہو۔ الارم کی آواز پر نہ جانے کتنے لوگ آ جائیں۔ ہم سے پوچھا جائے گا کہ ہم کون ہیں؟"

"کیا ہم یہاں پھنسے رہیں گے؟"

"ہو سکتا ہے کسی معمولی خرابی سے رک گئی ہو۔ ابھی چل پڑے گی' ذرا صبر کرو۔"

وہ صبر کرنے لگے جب صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تو ایک نے الارم کا بٹن دبایا۔ اسی وقت تین بار فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ فائرنگ کی آواز سنتے ہی کاؤنٹر کے پیچھے ٹی ٹی سے دھمکیاں دینے والا باہر بھاگتا چلا گیا۔ اس نے پہلی ٹیکسی کے پاس آ کر انچارج سے کہا۔ "سر! کوئی گڑبڑ ہے۔ میرے ساتھیوں کے پاس سائلنسر لگے ہوئے ریوالور تھے مگر زور دار فائرنگ کی تین آوازیں آئی تھیں۔"

انچارج نے کہا۔ "ہم نے بھی آوازیں سنی ہیں۔ مراد اور وہ دونوں ساتھی کہاں ہیں؟"

"پتا نہیں سر! آپ اپنی کار میں آئیں۔ ہمیں ذرا دور جا کر رکنا چاہئے۔"

انچارج کار میں آیا۔ وہ کار وہاں سے ذرا دور جانے لگی۔ ایسے وقت پولیس کی گاڑیاں ہوٹل کے احاطے میں داخل ہو رہی تھیں۔

میں نے انکل ہاشم کو فون پر ایک جگہ بتائی۔ وہ وہاں پہنچ گئے۔ میں آپی کو ان کے حوالے کر کے پھر تیزی سے کار ڈرائیو کرتا ہوا ہوٹل میں واپس آگیا۔ کاؤنٹر گرل اور منیجر نے ایک پولیس افسر سے کہا۔ "یہی مسٹر نثار احمد ہیں۔"

کوریڈور میں پولیس والے تھے۔ اندر کمرے سے بینا کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ چیخ چیخ کر برمی زبان میں کچھ کہہ رہی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی یوں بول رہی تھی جیسے برمی زبان کے سوا کوئی دوسری زبان نہ جانتی ہو۔ میں نے کہا۔ "میری بیوی کی باتوں سے پتا چل رہا ہے کہ اس پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ وہ رنگون شوٹنگ کلب کی نمبرون شوٹر ہے۔ اس نے حملہ کرنے والے کو دو گولیاں ماری ہیں۔ اگر وہ ایک عام عورت ہوتی تو آپ کے ملک میں آکر مجھے اپنی بیوی کی لاش ملتی۔"

میں ان سے باتیں کرتے ہوئے کمرے میں آیا۔ بینا دوڑ کر آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ بگڑی ہوئی انگریزی میں بولی۔ "وی گو' دی اسٹے ناٹ ہیئر۔"

پھر وہ برمی زبان میں بولنے لگی۔ میں نے اسے تھپک کر کہا۔ "صبح تک صبر کرو۔ ہم اپنے سفارت خانے کے ذریعے ایکشن لیں گے۔"

دو غنڈے جو لفٹ میں پھنسے تھے' وہ بھی پکڑے گئے۔ ان کے لباس سے ریوالور اور سائلنسر برآمد ہوئے۔ مراد کے پستول سے نکلی ہوئی گولی چھت میں پیوست ہو گئی تھی۔ یہ سمجھنا آسان تھا کہ اس نے قاتلانہ حملہ کیا تھا لیکن بینا بہترین شوٹر ہونے کے باعث اس سے پہلے گولیاں چلا چکی تھی۔ تمام ثبوت مقتول مراد اور ان دو غنڈں کے خلاف تھے۔ وہ جوتے کھا کر کہہ رہے تھے کہ یہ برمی فیملی بہت مالدار ہے' اسے لوٹنے آئے تھے۔

مجھ سے پوچھا گیا۔ "آپ کہاں گئے تھے؟"

میں نے کہا۔ "ڈنر کے بعد واک کے لئے گیا تھا۔ اچانک پیٹ میں تکلیف ہوئی۔ ایک ٹیکسی والے نے مجھے ہولی فیملی اسپتال پہنچا دیا۔ مجھے السر کی شکایت ہے۔ آپ ابھی اسپتال فون کر کے ڈاکٹر فیروزہ سے پوچھ لیں۔ میں سوا تین بجے تک اسپتال میں تھا۔"

انہوں نے فون کر کے پوچھا۔ وہاں سے ڈاکٹر فیروزہ نے کہا۔ "یس ایک برمی مسٹر نثار احمد یہاں تین یا سوا تین بجے تک تھے۔ جب انہیں آرام آیا تو انہیں چھٹی دے دی گئی۔"

انہوں نے رسمی طور پر ہمارا بیان لیا۔ ہم سے دستخط کرائے پھر مراد کی لاش کے ساتھ ان غنڈوں کو ہتھکڑی پہنا کر لے گئے۔ ہم اس ہوٹل میں اب رہنا نہیں چاہتے تھے۔ وہاں کے بڑے عہدیداروں نے ہم سے معافی مانگی۔ میں نے کہا۔ "جب آپ لوگوں نے واردات نہیں کی ہے تو معافی کیوں مانگ رہے ہیں؟"

منیجر نے کہا۔ "بات آپ کے سفارت خانے تک پہنچنے والی ہے۔ ہمارے ہوٹل کی REPUTATION کا سوال ہے۔ آپ یہاں رہ جائیں۔ ہم آپ کے کمرے کے سامنے چوبیس گھنٹوں تک دو مسلح گارڈز کی ڈیوٹی لگائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہم یہاں کے کسی دوسرے فلور کے دوسرے کمرے میں رہیں گے لیکن آپ مسلح گارڈز نہ لگائیں۔ میں آئندہ اپنی وائف کو تنہا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

انہوں نے خوش ہو کر ہمارا کمرا تبدیل کر دیا۔ میں نے فون کے ذریعے ڈی جی دھاون کو یہاں کے حالات بتائے اور کہا۔ "مراد اور تابانی دونوں ہی میرے ٹارگٹ پر آ گئے تھے۔ میں نے مراد کو تو جہنم میں پہنچا دیا ہے لیکن تابانی بہت تیز طرار ہے۔ بڑی مکاری سے بچ کر نکل گئی ہے اور اس کا بچنا ہمارے لئے اچھا ہی ہوا۔ وہ اپنے محبوب مراد کا انتقام لینے آئے گی تو میں گاڈ فادر ہاشم تک پہنچ جاؤں گا۔"

دھاون نے کہا۔ "نثار بیٹے! تمہارا جواب نہیں ہے۔ تم ضد کے پکے ہو' جو کہتے ہو وہ کر گزرتے ہو۔ زونل افسر کو حکم دے کر اس سے اپنی ضرورت کی چیزیں طلب کیا کرو۔ میں نے زونل افسر سے کہہ دیا ہے کہ پاکستان میں کوئی نثار احمد نہیں بلکہ ڈی جی دھاون بیٹھا ہوا ہے۔"

"آپ مجھے آسمان پر چڑھا رہے ہیں۔ ویسے میں ڈی جی دھاون ہی ہوں کیونکہ آپ کا بیٹا ہوں۔"

"جیتے رہو بیٹے! میری بہو کیسی ہے؟"

"بہت خوش ہے۔ دونوں ہاتھوں کے اشارے سے آپ کو پرنام کہہ رہی ہے۔ اب آپ میری طرف سے پہلے پدمنی کے کان پکڑیں پھر اسے چپ لیں۔"

وہ ہنسنے لگا۔ میں نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ "ہنس لو' ایک دن سر پکڑ کر رونا بھی ہے۔"

☆=====☆=====☆

تقریباً ڈیڑھ برس پہلے میں کسی فرمان علی اور اس کی امی ڈاکٹر آمنہ کو نہیں جانتا تھا۔ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ جو فرمان جسمانی طور پر فولاد ہے اور انتہائی ذہین اور حاضر دماغ رہتا

ہے۔ وہ اپنا دماغی توازن کھو چکا ہے۔

ایک دم سے دن نکل نہیں آتا۔ آہستہ آہستہ سورج کی کرنیں اجالا کرتی ہیں۔ ایک دم سے رات نہیں ہو جاتی۔ شام ڈھلتے ڈھلتے تاریک رات بن جاتی ہے۔ اسی طرح ایک نارمل انسان اچانک ایب نارمل نہیں ہوتا۔ رفتہ رفتہ حالات اسے پاگل یا نیم پاگل بنا دیتے ہیں۔

ذہنی مریضوں کے اسپتال میں جا کر ایک ایک مریض کے پیچھے چھپے ہوئے بے رحم حالات کو سمجھنے کی کوششیں کی جائیں تو سمجھ میں آتا ہے کہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والا ایب نارمل بچہ بھرپور علاج اور توجہ سے بڑی حد تک نارمل ہو جاتا ہے لیکن بدترین حالات کی کوکھ سے پیدا ہونے والا جواں مرد ایب نارمل ہوتے ہوتے انتہائی پاگل پن کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

ڈاکٹر آمنہ بہت سی مصروفیات چھوڑ کر اپنے بیٹے فرمان کی اسٹڈی کرنے لگی۔ میڈیکل چیک اپ بھی کرتی رہی اور سمجھتی رہی کہ بیٹا رفتہ رفتہ ایب نارمل ہو رہا ہے۔ ماں نے بڑے تجربہ کار ماہرین نفسیات سے رجوع کیا۔ انہوں نے اپنے طور پر فرمان کا ذہنی تجزیہ کیا پھر ڈاکٹر آمنہ سے کہا۔ "آپ اسے اخبارات اور سیاسی کتب و رسائل نہ پڑھنے دیں۔ اسے دوسرے مشاغل اور تفریحات کی طرف مائل کریں۔ یہاں گرمی کا موسم ہو تو اسے سوئزرلینڈ یا کسی اور سرد علاقے میں لے جائیں۔"

فرمان نے آہنی سلاخوں کے پیچھے سے کہا۔ "ابے او ماہر نفسیات' چودہ کروڑ کی آبادی میں دس لاکھ A کلاس دولت مند ہیں۔ دس لاکھ B کلاس دولت مند اور بیس لاکھ C کلاس دولت مند ہیں۔ باقی تیرہ کروڑ ساٹھ لاکھ پاکستانیوں کو دن رات مہنگائی کے کوڑے مارے جاتے ہیں۔ وہ اپنے ایب نارمل بوڑھوں اور جوانوں کو سوئزرلینڈ یا کسی پہاڑی علاقے میں علاج کے لئے کیسے لے جائیں گے؟"

ڈاکٹر آمنہ نے آہنی سلاخوں کے پاس آ کر بڑی ممتا سے کہا۔ "بیٹے! یہ بہت تجربہ کار سائیکولوجسٹ ہیں۔ ان کا نفسیاتی تجزیہ توجہ سے سنو۔"

"امی! یہ کیسے تجربہ کار ہو گئے۔ انہوں نے صرف دولت مندوں کو نارمل بنانے کا ڈپلوما حاصل کیا ہے۔ اس وطن دشمن نے پوری قوم کو نارمل بنائے رکھنے کا ڈپلوما کیوں نہیں لیا؟ یہ آئندہ مجھ سے سوالات کرنے آئے گا تو میں اس کا گلا دبوچ کر مار ڈالوں گا۔"

ماہر نفسیات نے ڈاکٹر آمنہ سے کہا۔ "آپ صاحب زادے سے جتنا بولیں گی' اتنا ہی اس کے اندر کا جنون بھڑکے گا۔ بہتر ہے کہ ہم اندر چل کر گفتگو کریں۔"

وہ ماہر نفسیات کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گئی۔ اس نے کہا۔ "ہم جو سوچتے ہیں' وہ کر نہیں پاتے تو مایوسی ہوتی ہے۔ دوسری بار بھی کر نہیں پاتے تو جھنجلاہٹ سی ہوتی ہے۔ سالہا سال تک باپ کے خون پسینے کی کمائی سے گریجویشن اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر کے ملازمتوں کے لئے دھکے کھانے والے جوانوں کو سیدھا راستہ نہیں ملتا تو وہ گمراہی کی طرف آتے ہیں۔ چوری کرنے کی ہمت نہ ہو تو ہیرا پھیری اور دھوکے بازی سے کچھ کما کر گھر کا چولھا جلاتے ہیں۔ جن میں ہمت ہوتی ہے' وہ ڈگری ہولڈر ڈاکو بن کر اپنی بہنوں کو سہاگن بناتے ہیں' جو نوجوان ایجنسیوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ وہ ہاتھوں میں کلاشنکوف لے کر دہشت گرد بن جاتے ہیں۔ جن کے گھر صرف جوان بیٹیاں ہوتی ہیں' وہ زندہ رہنے کے لئے چادر اور چار دیواری سے باہر جاتی ہیں اور ہر دوسرے تیسرے روز ہزار ہزار کے نوٹ لاتی ہیں۔ ابتر گھروں کی حالت بہتر ہونے لگتی ہے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ پاکستان خوش حال ملک بن گیا ہے۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں۔ جب ناجائز دھندوں کو اور غیر قانونی کاموں کو قانونی حیثیت دے دی جاتی ہے تو فرمان غصے سے پوچھتا تھا' کہاں ہے قانون؟ اور کہاں ہیں قانون کے محافظ؟ میں اسے سمجھاتی رہی اور خود سمجھتی رہی کہ میرے جوان بیٹے کے اندر بھی رفتہ رفتہ لاوا پک رہا ہے۔ میں جسمانی علاج کرتی ہوں۔ مشکل سے مشکل آپریشن کامیابی سے کرتی ہوں لیکن دماغ کے اندر لگی ہوئی آگ کو کیسے بجھاؤں؟"

"ہم علم نفسیات جاننے والے اپنے طریقہ کار سے دماغی تجزیہ کر کے اندر کی کمزوریوں یا ان کے چھپے ہوئے ارادوں کو معلوم کرتے ہیں۔ اگر آپ بیٹے کو یہاں نہ لاتیں اور قیدی بنا کر نہ رکھتیں تو وہ کسی دن بھی کلاشنکوف اٹھا کر کسی انڈر گراؤنڈ مافیا کا دہشت گرد بن جاتا۔"

ڈاکٹر آمنہ نے کہا۔ "ہم اس نتیجے پر پہنچ رہے ہیں کہ فرمان بیمار نہیں ہے۔ پاگل نہیں ہے چونکہ بہت حساس ہے اس لئے ملک میں ہونے والی ناانصافیاں دیکھ کر بھڑک جاتا ہے۔ بھڑکنے والے کو' غصے میں چیخنے والے کو ایب نارمل کہتے ہیں۔"

وہ اطمینان کا سانس لے کر بولی۔ "اللہ کا شکر ہے۔ ابھی وہ پوری طرح ایب نارمل نہیں ہے۔ اس کے دماغ کو ٹھنڈا رکھا جا سکتا ہے۔"

"اسے سمجھانا ہو گا کہ آپ دولت مند ہیں۔ وہ دوسرے کے بدترین حالات کو بہت گہرائی سے نہیں' صرف ہمدردانہ طور پر محسوس کیا کرے۔ پہلے خود نارمل رہنے کے لئے پہاڑی علاقوں میں جائے۔ سیاست سے دور رہے۔ وہ ساڑھے تیرہ کروڑ پاکستانیوں کے

آنسو تنہا نہیں پونچھ سکتا۔ ان کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ یا آتش فشاں کی طرح پھٹ کر وحشی درندہ بن سکتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ملک کی تعمیر نہیں' تخریب ہوتی رہے گی۔"

وہ مایوسی سے بولی۔ "یہی باتیں وہ سمجھ نہیں پاتا ہے اور وہ اس لئے کہ وہ صرف اپنی ذات کے لئے نہیں پوری قوم کے لئے سوچتا ہے۔ میں آپریشن کے ذریعے اس کے اندر کی تمام جسمانی خرابیاں دور کر سکتی ہوں لیکن طب اور سائنس نے اب تک کوئی ایسا آلہ ایجاد نہیں کیا کہ آپریشن کے ذریعے اس کے اندر سے قوم کا درد نکال سکوں۔"

وہ اُٹھ کر بولا۔ "مجھے دوسرے اپائنٹ منٹ کے مطابق جانا ہے۔ آئندہ نہیں آ سکوں گا۔ فرمان مجھ سے بری طرح بدظن ہے۔ اس کے سامنے جا کر اسے طیش دلانا نقصان دہ ہو گا۔ آپ بے شمار ماہرین نفسیات کو جانتی ہیں' ان سے رجوع کریں۔ ان کا تجزیہ بھی یہی کہے گا کہ جسے آپ قوم کا درد کہتی ہیں' وہ ایک معالج کے نقطہ نظر سے ایک غبار ہے۔ ذہن کو پراگندہ کرنے والی آلودگی ہے۔ آپ سب کو یہ سمجھنا ہو گا کہ اس کے اندر سے کس طرح غبار نکالا جا سکتا ہے۔ اوکے۔ سی یو اگین۔"

وہ ماہر نفسیات چلا گیا۔ ڈاکٹر آمنہ نے دوسرے ماہرین سے رابطہ کیا۔ ایک بزرگ ماہر نفسیات سید مسیح الزماں نے فرمان کی ہسٹری پوری سنی پھر آہنی سلاخوں کے پاس آ کر دیکھا۔ سلاخوں کے پیچھے ایک کمرے میں آرام دہ بستر' ٹی وی' ریفریجریٹر وغیرہ سب کچھ تھا۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک باتھ روم بھی تھا۔ ماہر نفسیات سید مسیح الزماں نے آواز دی۔ "بیٹے فرمان!"

وہ واش روم سے منہ ہاتھ دھونے کے بعد تولیے سے منہ پونچھتا ہوا کمرے میں آیا پھر آہنی سلاخوں کے باہر دیکھ کر پوچھا۔ "فرمایئے' کیا آپ بھی میرا علاج کرنے آئے ہیں؟"

"بیٹے! علاج تو اس کا کیا جاتا ہے جو بیمار ہو۔"

"آپ درست فرماتے ہیں' میں بیمار نہیں پاگل ہوں۔"

"مجھ سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ سلاخوں کے باہر سے باتیں کروں لیکن میں وارڈ بوائے کو ساتھ لایا ہوں تاکہ یہ سلاخوں والے دروازے کا لاک کھولے۔ دو نارمل انسانوں کے درمیان کوئی دیوار نہیں ہونی چاہئے۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ نے میری امی اور دوسرے ڈاکٹروں سے میری میڈیکل رپورٹ لے کر نہیں پڑھی ہے؟"

"پڑھنے سے اور دوسرے ڈاکٹروں کے سمجھنے سے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ

درست سمجھ رہے ہیں۔ مجھے دیکھو' میں کتنا بوڑھا ہوں۔ میرے پاؤں قبر میں لٹکے ہوئے ہیں۔ اگر تم مجھے گلا دبوچ کر مار ڈالو گے تو کیا فرق پڑے گا۔"

وارڈ بوائے نے تالا کھولا پھر مسیح الزماں کے اندر جاتے ہی اس نے دروازے کو مقفل کر دیا۔ فرمان نے کہا۔ "دیکھ لیں' کیسی بے رحم دنیا ہے۔ آپ کو میرے ہاتھوں مرنے کے لئے یہاں چھوڑ کر باہر سے تالا لگا دیا تاکہ میں یہاں سے بھاگ نہ سکوں اور آپ کو مرنے سے کوئی نہ بچا سکے۔"

"وہ نہیں جانتے کہ میں جینا نہیں چاہتا اور میں جانتا ہوں کہ تم مجھے مرنے نہیں دو گے۔"

"آپ جینا کیوں نہیں چاہتے؟ یہاں کرسی پر بیٹھیں۔"

وہ بیٹھتے ہوئے سر جھکا کر بولا۔ "میری ایک جوان بیٹی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ خوب صورت تو نہیں تھی مگر قبول صورت تھی جس گھر میں دلہن بن کر جاتی اسے جنت بنا دیتی مگر خوب صورت اور گورا رنگ پسند کیا جاتا ہے۔ میری آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ نہیں ہے۔ میں جہیز بھی نہیں دے سکتا تھا۔ وہ گھر میں بیٹھے بیٹھے بتیس برس کی ہو گئی۔

"پھر ایک دن کئی مسلح دہشت گرد میرے گھر میں گھس آئے۔ میں نے کہا۔ "میرے بچو! میں تو کنگال ہوں۔ یہاں کچھ نہیں ملے گا۔"

ایک نے کہا۔ "تیری بیٹی تو ملے گی۔"

میں نے کہا۔ "یہ کھوٹا سکہ ہے۔ شریف گھرانوں سے بھی کوئی اسے لینے نہیں آتا۔"

دوسرے نے کہا۔ "تجھ جیسے بوڑھوں کے لئے یہ کھوٹا سکہ ہے۔ ہم جیسے جوان آج اس کو چمکا دیں گے۔"

میں نے کہا۔ "اسے ہاتھ نہ لگانا۔"

انہوں نے میرے ہاتھ باندھ دیئے۔ دونوں پیروں کو باندھ کر چھت کے پنکھے سے الٹا لٹکا دیا پھر وہ باری باری میری بیٹی کی عزت سے کھیلنے لگے۔ میں ایسا شرمناک منظر دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن جب بھی آنکھیں بند کرتا تو وہ مجھے مارتے' میرے بالوں کو مٹھیوں میں لے کر ایسا جھٹکے دیتے کہ تکلیف کی شدت سے آنکھیں کھل جاتیں۔

میری بیٹی چیختے چیختے' روتے روتے تھک گئی تھی۔ وہ دن کا وقت تھا۔ دور تک محلے والے سن رہے تھے اور مسلح دہشت گردوں کو میرے گھر کے باہر سے دیکھ رہے تھے۔ مگر سب کو اپنی جان کی فکر تھی۔ جو جواں مردی دکھا سکتے تھے' ان کے پاس اسلحہ نہیں تھا

کیونکہ اسلحہ پُرامن شہریوں کے پاس کبھی نہیں رہتا۔

کیا غضب ہے' غریب کے گھر کھوٹا سکّہ بھی رہے تو اسے لوٹ لیتے ہیں۔ انہوں نے جاتے ہوئے کہا۔ "بڑے میاں تم نے مخبری کر کے ہمارے ایک بندے کو پکڑوا دیا تھا۔ اس کی سزا تمہیں مل گئی۔"

وہ چلے گئے' مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ بیٹی کی طرف دیکھ سکوں۔ میں نے آنکھیں بند کر کے کہا۔ "بیٹی! میری رسیاں کھول دے۔ میں تھانے والوں کے پاس جاؤں گا۔"

مجھے اس کی طرف سے جواب نہیں ملا۔ وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئی تھی۔ وہاں دوسری چھت کے پنکھے سے پھندا لگا کر جان دے دی تھی۔"

مسیح الزماں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ فرمان نے کہا۔ "آگے نہیں پوچھوں گا' آگے دکھاوے کی کچھ قانونی کارروائی ہوئی ہو گی پھر فائلیں بند کر دی گئی ہوں گی۔ دیکھا جائے تو تھانے کی فائلیں بند نہیں کی جاتیں۔ ہم فریادیوں کے منہ بند کر دیئے جاتے ہیں۔ ان لمحات میں مجھے اتنا غصہ آ رہا ہے کہ یہ لوہے کی سلاخیں توڑ کر جاؤں۔ آپ کے علاقے کے تھانے کو بم سے اُڑا دوں اور ان دہشت گردوں کو چن چن کر کتوں کی موت ماروں۔"

بوڑھے مسیح الزماں نے خوش ہو کر کہا۔ "تم جوان ہو کر ایسا سوچ رہے ہو۔ میں بوڑھا اور کمزور ہو کر بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ آدمی تمہاری طرح زنجیروں میں جکڑا ہو اور میری طرح کمزور ہو تو پھر وہ خیال ہی خیال میں دشمنوں کے پاس پہنچ کر ایک ہیرو کی طرح ان سے لڑتا ہے۔ ایک ایک کو عبرت ناک سزا دے کر ہلاک کرتا ہے پھر خیالوں کی دنیا سے واپس آ کر جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ اس کو ماہر نفسیات کہتے ہیں کہ ہمارے اندر غبار بھرا ہے۔ دشمنوں سے نمٹنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم اپنے اندر کا غبار نکال کر دماغ کو ٹھنڈا کریں کیونکہ جوش میں رہیں گے تو ہوش سے محروم ہو کر صرف اندر ہی اندر پکتے رہیں گے۔"

فرمان نے قائل ہو کر کہا۔ "یہ آپ نے درست کہا ہے۔ صرف سوچنے اور جوش میں آنے سے حالات بہتر نہیں ہوں گے۔ ہمیں دماغ کو ٹھنڈا رکھنا اور ہوش و حواس میں رہ کر عملی طور پر کچھ کرنا چاہئے۔"

"بیٹے! اندر سے غبار نکلتا رہے گا تو عملی طور سے بہت کچھ کرنے کے کئی راستے ملیں گے۔ میری بات سمجھو۔ شرط یہ ہے کہ ہم پہلے اپنے اندر کے آتش فشاں کو ذرا ٹھنڈا رکھیں۔ بڑے ہی نارمل طریقے سے اپنے اندر کا غبار نکالیں۔"

"امی اور دوسرے ڈاکٹرز بھی یہی کہہ رہے تھے لیکن آپ اتنے اچھے انداز میں سمجھا رہے ہیں کہ آپ کا ایک ایک لفظ دل میں اتر رہا ہے۔ دیکھئے نا' ان لوگوں نے کیسی زبردستی کی ہے۔ اب ایک اخبار بھی نہیں بھیجتے ہیں۔ ایک بھی سیاسی کتاب یہاں نہیں آنے دیتے۔ کیا ایسی زبردستی کرنے سے غصہ نہیں آئے گا۔ میں ان کے خلاف چیختا چلاتا ہوں تو مجھے ایب نارمل کہتے ہیں۔"

مسیح الزماں نے اس کے قریب جھک کر آہستگی سے کہا۔ "چیخنے چلانے پر کنٹرول کرو ان کی زیادتی یہ سوچ کر برداشت کرو کہ آئندہ تمہیں اس سے بھی زیادہ مشکل مرحلوں میں دماغ کو ٹھنڈا رکھنا ہے۔"

"ٹھیک ہے' آپ سمجھا رہے ہیں۔ میں آپ کی ہدایات پر عمل کروں گا۔ اب وہ یہاں فلمی رسالے' ڈائجسٹ اور ناول وغیرہ بھیجتے ہیں۔ میں نے پہلے تو انہیں ہاتھ نہیں لگایا.......... پھر ایک دن یونہی بیزاری سے ایک کتاب اٹھا کر دیکھی۔ یہ ایک ناول تھا۔ کہانی کے چند صفحات پڑھے تو پھر پڑھتا ہی چلا گیا۔ وہ لکھنے والا میرے دل و دماغ کی باتیں کر رہا تھا۔"

وہ اٹھ کر گیا اور فلمی رسالوں اور ڈائجسٹوں میں سے ایک کتاب اٹھا کر لے آیا اور مسیح الزماں کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ دیکھیں' اس کا مصنف کوئی محی الدین نواب ہے۔ آپ جس انداز میں ابھی کہہ رہے تھے' یہ مصنف کچھ ایسے ہی انداز میں بولتا ہے جیسے ہمارے اندر جھانک رہا ہو۔"

مسیح الزماں نے ناول کا عنوان دیکھا۔ "جرم وفا"۔

"یہ ناول مجھے دو' میں بھی پڑھوں گا۔"

ایک بات اور کہہ دوں۔ جس دن میرے گھر واردات ہوئی اور میری بیٹی نے اپنی جان دے دی۔ اس دن مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ کسی نے مجھے چیختے چلاتے نہیں دیکھا اس لئے کسی نے مجھے ایب نارمل نہیں کہا۔ اگر میں چیختا چلاتا اور ظالموں کو گالیاں دیتا' بوڑھا اور کمزور ہونے کے باوجود ان مسلح غنڈوں کو مار ڈالنے کا چیلنج کرتا تو لوگ کہتے' میں ذہنی توازن کھو بیٹھا ہوں پھر مجھے بھی تمہاری طرح لوہے کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا جاتا۔"

اس نے فرمان کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "جو تم ہو' وہی میں ہوں۔ تم بھی حساس ہو' میں بھی حساس ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ میں اندر سے ابلنے کے باوجود بظاہر خاموش رہتا ہوں اور تم دوسروں کے سامنے پھٹ پڑتے ہو۔"

"میں سمجھ گیا جناب! مجھے ہر حال میں دماغ کو اپنے قابو میں رکھنا چاہئے۔ سنجیدگی اور ذہانت سے عملی اقدامات کی راہیں نکالنا چاہئے۔ صرف خیالوں میں اور تصورات میں ظالموں کو کچلنے سے وہ ختم نہیں ہوں گے۔"

اس نے فرمان کو تھپک کر کہا۔ "شاباش' میں یہ کتاب لے جا رہا ہوں۔ پرسوں آؤں گا۔ یہ بتاؤں گا کہ کیا پڑھا ہے۔ تم بتاؤ گے کہ کس حد تک دماغ کو ٹھنڈا رکھا ہے؟"

اس نے وارڈ بوائے کو بلا کر فرمان سے مصافحہ کیا پھر باہر آ گیا۔ سلاخوں والا دروازہ پھر لاک کر دیا گیا۔ مسیح الزماں وہاں سے چلتا ہوا ایک کوریڈور میں آیا پھر وہاں سے گزرتا ہوا کانفرنس روم میں پہنچا۔ وہاں ڈاکٹر آمنہ مزید دو ڈاکٹروں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔

مسیح الزماں نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ کا بیٹا ابھی پاگل نہیں ہوا ہے مگر ہو سکتا ہے۔ بعض پاگل سنجیدہ گفتگو سے بالکل نارمل دکھائی دیتے ہیں لیکن اندر سے ان کے ذہنی توازن میں فرق پیدا ہوتا رہتا ہے۔ دماغی ترازو کے دونوں پلڑے (یعنی نگیٹو اور پوزیٹو' منفی اور مثبت خیالات) ڈگمگاتے رہتے ہیں۔"

وہ تینوں ڈاکٹرز مسیح الزماں کی باتوں کو توجہ سے سن رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "آج اس سے پہلی ملاقات تھی۔ میری زندگی میں ایک المناک واقعہ ہوا تھا' میں نے اس کے مزاج کے پیشِ نظر وہ کربناک واقعہ سنا کر اس کے دماغ کو کسی حد تک قابو میں کیا ہے۔ اس کی طرح میں بھی وسیع ذرائع اور بڑے اختیارات رکھنے والوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اس لئے خیال ہی خیال میں انہیں مارتا اور کچلتا رہتا ہوں لیکن یہ کوئی تعمیری عمل نہیں ہے۔ اگر ہم دماغ ٹھنڈا رکھیں گے اور ذہانت سے عملی اقدامات کریں گے تو بگڑے ہوئے حالات کو سنوارنے کی راہیں ملتی رہیں گی۔ وہ مجھ سے متفق ہو گیا ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آئندہ محض چیخنے چلانے میں اپنی توانائی ضائع نہیں کرے گا۔"

ڈاکٹر آمنہ نے احسان مندی سے کہا۔ "آپ نے پہلی ہی ملاقات میں میرے بیٹے کو اپنا ہم نوا بنا لیا ہے۔ آئندہ ٹریٹ منٹ کیا ہو گا؟"

مسیح الزماں نے "جرمِ وفا" پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "صرف میں نے نہیں' اس ناول نے بھی کچھ کام کیا ہے۔ میں اسے پڑھ کر غور کروں گا کہ اس کہانی میں ایسے کتنے نکات ہیں جو مثبت انداز میں اثر انداز ہوتے ہیں۔"

ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "ہم نے تو سنا تھا۔ یہ ناول وغیرہ محض وقت گزارنے کے لئے ہوتے ہیں۔ فرمان انہیں پڑھ کر خیالی رنگینیوں میں کھو جائے گا۔"

"جس طرح علاج کے لئے کڑوی گولیوں کو شوگر کوٹڈ کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے' ان

کتابوں اور رسائل میں شوگر کوٹڈ کہانیاں ہوں۔ میں انہیں پڑھ کر آپ حضرات سے' محترمہ سرجن آمنہ سے فون پر رابطہ کروں گا۔ اب مجھے جانے کی اجازت دیں۔"

وہ مصافحہ کر کے چلا آیا۔ وہ ایک نہایت ہی تجربہ کار ماہرِ نفسیات تھا لیکن اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ دولت مند ماہرین نفسیات کی طرح کرائے پر مہنگا آفس بنانے کے لئے قیمتی فرنیچر' ریوالونگ چیئر اور ائرکنڈیشنر خرید کر آنے والے مریضوں کے سرپرستوں پر نفسیاتی اثر ڈالتا۔ پہلے جو ماہر نفسیات فرمان کے پاس گیا تھا' اس کے آدھے گھنٹے کی فیس تین ہزار روپے تھی۔ دوسری بار ڈاکٹر آمنہ نے مسیح الزماں کو فرمان کے حالات بتا کر کہا۔ "مجھے اس بات کی پروا نہیں ہے کہ ایک ماہر نے آدھے گھنٹے کی فیس تین ہزار لی۔ مجھے تو میرا بیٹا نارمل چاہئے۔"

مسیح الزماں نے کہا۔ "محترمہ میں مریض کو دیکھتا ہوں۔ فیس کے طور پر دیئے گئے نوٹ نہیں گنتا۔ آپ مجھے تین ہزار نہیں' صرف تیس روپے دیں۔ میرے گھر میں چار دن کا راشن آ جائے گا۔ اکیلا ہوں' اسی طرح گزارا کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر آمنہ نے پرس میں سے تین ہزار نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ "کوئی ڈاکٹر فیس لیتا نہیں' چھینتا ہے۔ یہ فیس آپ کا حق سمجھ کر دے رہی ہوں۔ اگر آپ نے میرے بیٹے کا کامیاب علاج کیا تو میں آپ کی صلاحیتوں کے مطابق آپ کو کسی مینٹل اسپتال میں مناسب عہدہ دلاؤں گی۔"

مسیح الزماں پہلے دن فرمان سے ملاقات کر کے بڑی حد تک کامیاب رہا تھا۔ اس نے گھر آ کر ناول کو پڑھنا شروع کیا مصنف نے جہاں طنزیہ فقرے اور بین السطور میں سیاست' معاشرت اور معیشت کی گہرائیاں لکھی تھیں' انہیں نوٹ کرتا گیا تھا۔ وہیں' دنیاوی اور گھریلو حالات کس طرح انسانوں کو نفسیاتی طور پر تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ ایسی تبدیلیوں کو وہ علیحدہ نوٹ کرتا گیا۔

اس نے شام کو ایک پی سی او سے فون کے ذریعے ڈاکٹر آمنہ سے کہا۔ "میں نے ابھی صرف آدھی کتاب پڑھی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ شوگر کوٹڈ کہانی ہے جو پڑھنے والوں کو اشتعال نہیں دلاتی۔ آپ جتنے ڈائجسٹ' رسائل اور ناول حاصل کر سکتی ہیں' وہ سب پڑھنے کے لئے فرمان کو دیا کریں۔ آپ کی دی ہوئی ایڈوانس فیس کا بہت بہت شکریہ۔ میں کل کسی وقت آپ سے رابطہ کروں گا۔"

وہ گفتگو کرنے کے بعد اردو بازار آیا۔ وہاں سے میری تحریر کردہ مزید تین کتابیں خریدیں۔ گھر آ کر انہیں پڑھنے لگا۔ رات دیر تک پڑھتا رہا اور صبح دیر تک سوتا رہا۔ دوپہر

کو کھانے کے بعد پی سی او جا کر پبلشر سے فون پر کہا۔ "میں محی الدین نواب سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ ان کا پتا بتائیں گے؟"

پبلشر نے کہا۔ "وہ کراچی میں رہتے ہیں۔ آج کل ایک فلمی کہانی لکھنے لاہور آئے ہوئے ہیں۔ رات نو بجے کے بعد صبح نو بجے تک پرل ہوٹل کے کمرا نمبر511 میں مل سکتے ہیں۔"

میں رات کو ڈنر کے بعد ٹہل رہا تھا۔ ایک فلمی سین کا وائنڈ اپ سوچ رہا تھا۔ ایسے وقت فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر اپنا نام بتایا۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔ "میرا نام مسیح الزماں ہے۔ آپ کا تھوڑا سا وقت چاہتا ہوں۔ یہاں ویزیٹرز لابی میں ہوں۔"

"آپ میرے کمرے میں تشریف لے آئیں۔"

تھوڑی دیر بعد کال بیل سنائی دی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے ہم عمر ایک صاحب کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "میں مسیح الزماں ہوں۔"

میں نے ایک طرف ہٹ کر کہا۔ "اندر تشریف لائیں۔"

وہ اندر آیا۔ میں نے دروازہ بند کیا۔ اسے صوفے پر بیٹھنے کو کہا پھر فون کے ذریعے چائے کا آرڈر دے کر پوچھا۔ "فرمائیے' کیا آپ مجھے تحریر کے حوالے سے جانتے ہیں؟"

"جی ہاں' اور تحریر کے حوالے سے ہی میں آپ سے ایک کام لینا چاہتا ہوں۔ کام کا منہ مانگا معاوضہ ملے گا۔"

"سوری زماں صاحب! میں آپ کے لئے کہانی نہیں لکھ سکوں گا۔"

"میں کہانی لکھوانے نہیں' کسی دوسرے ہی سلسلے میں آیا ہوں۔"

پھر وہ بڑے سلجھے ہوئے انداز میں فرمان کے مینٹل کیس کے بارے میں بتانے لگا۔

میں نے تمام تفصیلات سننے کے بعد مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ تو مجھے رائٹر نہیں' ماہر نفسیات سمجھ کر آئے ہیں۔ بھلا میں اس کیس میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"آپ کو وہی کرنا ہے جو آپ تحریر کے ذریعے اپنے ملک کے لئے اور اپنی قوم کے لئے کرتے ہیں۔ فرمان بھی اسی قوم کا ایک نوجوان ہے۔"

"آپ نے جو ہسٹری بیان کی ہے' وہ ایک کہانی کا بہترین موضوع بن سکتی ہے۔"

"میں یہی سوچ کر آیا ہوں۔ آپ نے فرمان کی ذہنی حالت سمجھ لی ہو گی۔ وہ ہماری قوم کے محبانِ وطن کی طرح جوش میں آ کر خیالی جنگ لڑ رہا ہے۔ اگر آپ اس کی زبان سے اس کی روداد سن کر اسے اپنے قلم کی جادوگری سے منظرِ عام پر لائیں اور اس کا

مرکزی خیال یہ رکھیں گے کہ خیالی جنگ کو سنجیدگی اور ذہانت سے عملی جنگ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ قوم کے جو لوگ سو رہے ہیں' انہیں جگایا جا سکتا ہے اور جو جاگ رہے ہیں' انہیں سمجھایا جا سکتا ہے کہ پہلے دشمن کے وسیع ذرائع اختیارات اور بے انتہا قوت کو سمجھ کر اپنے ملک کے دانشوروں' قانون دانوں اور قانون کے دیانت دار محافظوں اور سچے صحافیوں کی ایک مضبوط فوج رفتہ رفتہ بناؤ پھر بقول علامہ اقبال بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑاتے ہوئے دشمنانِ وطن کو روندتے چلے جاؤ گے۔"

"ایک مصنف کی حیثیت سے آپ نے میرے اندر دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ میں فلمی کہانی کا آخری سین لکھ رہا ہوں۔ کل رات فرمان سے ملاقات کر سکتا ہوں۔"

"کیا دن کے وقت ملاقات نہیں کر سکتے؟ میں نے سنا ہے آپ لکھنے کے لئے رات بھر جاگتے ہیں اور دن کو سوتے ہیں۔"

"جی ہاں' برسوں سے میرا یہی معمول ہے۔"

"لیکن آپ یہ تو سمجھتے ہیں کہ یہ خلافِ فطرت ہے۔ رات کو سونا اور دن کو جاگ کر محنت کرنا چاہئے۔"

"لکھنے کے لئے خاموشی اور سکون لازمی ہیں اور شہری زندگی میں رات ہی کو خاموشی ملتی ہے اور رات کو کوئی ملاقات کرنے اور ڈسٹرب کرنے نہیں آتا۔ ویسے تسلیم کرتا ہوں کہ یہ خلافِ فطرت ہے۔"

چائے آ گئی۔ ہم پینے لگے۔ میں نے کہا۔ "جو فطرت کے تقاضوں کے مطابق زندگی نہ گزارے' وہ ایب نارمل کہلاتا ہے۔ میں بھی ایب نارمل ہوں۔ فطرت کے خلاف زندگی گزارنے والوں کا انجام برا ہوتا ہے۔ شاید میں اسی لئے بیمار رہتا ہوں۔ ڈاکٹروں کا علاج کرانے کے باوجود میرا ایمان ہے کہ مجھے میرے قارئین کی دعاؤں نے زندہ رکھا ہے۔"

"فرمان کی ماں بھی دعائیں دیں گی۔ میں چاہتا ہوں' کل کسی وقت آپ ان سے ملاقات کریں۔ وہ اپنے بیٹے کی خاطر یہاں آ سکتی ہیں۔"

"انہیں یہاں نہ بلائیں۔ آپ نے فرمان کی ہسٹری سناتے وقت بتایا ہے کہ وہ عالمی سطح پر شہرت حاصل کرنے والی لیڈی سرجن ہیں۔ مجھے ان کے دروازے پر خود چل کر جانا چاہئے۔"

"بے شک وہ ایسے ہی مان مرتبے اور اعزاز کی مستحق ہیں۔ کیا میں یہاں فون پر ان سے گفتگو کر سکتا ہوں؟"

"بے شک جہاں فون کرنا چاہیں' کریں۔"

وہ پیالی خالی کرکے فون کے پاس گیا پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

مجھے اس کیس سے اتنی دلچسپی ہو گئی تھی کہ دوسرے دن پوری نیند نہ سو سکا۔ دن کے ایک بجے بیدار ہو کر غسل کیا پھر لنچ کیا۔ اس کے بعد مسیح الزماں کے بتائے ہوئے مینٹل اسپتال پہنچ گیا۔ وہاں پہلی بار عالمی شہرت یافتہ لیڈی سرجن آمنہ سے ملاقات ہوئی۔ کچھ رسمی باتوں کے بعد فرمان کے سلسلے میں گفتگو ہوئی۔ وہ ممتا کی ماری اپنے اکلوتے بیٹے کے سلسلے میں بہت پریشان تھیں۔ ہم نے امید دلائی کہ فرمان کو نارمل رکھنے کی پوری کوشش کریں گے پھر میں مسیح الزماں کے ساتھ فرمان کے پاس آیا۔ ہمارے لئے لوہے کی سلاخوں والا دروازہ کھولا گیا اور پھر بند کر دیا گیا۔

فرمان مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مسیح الزماں نے کہا۔ "فرمان! کیا اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ محی الدین نواب ہیں۔"

فرمان نے آگے بڑھ کر بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا پھر میرا ہاتھ پکڑ کر ایک صوفے پر بٹھایا۔ میں نے کہا۔ "جناب مسیح الزماں سے یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ میری تحریر کردہ کہانیاں شوق سے پڑھتے ہیں۔ میں یہ کہنے آیا ہوں' جو شخص میری کہانیاں پڑھتا ہو اور بین السطور میں چھپی ہوئی باتیں سمجھ لیتا ہو' وہ کبھی ایب نارمل نہیں ہو سکتا۔ اگر میں ڈگری ہولڈر سائیکولوجسٹ ہوتا تو یہ میڈیکل سرٹیفکیٹ آپ کو دیتا کہ آپ بالکل نارمل ہیں۔"

"آپ بین السطور کی چھپی ہوئی باتوں کے حوالے سے کہہ رہے ہیں اس لئے یقین ہے کہ آپ واقعی مجھے نارمل تسلیم کرتے ہیں۔ آپ کی زبان ہی میرے لئے سرٹیفکیٹ ہے۔"

"اگر آپ مجھ سے تعاون کریں گے تو میں تمام ڈاکٹرز اور پوری قوم کے سامنے ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نارمل ہیں۔"

"میں آپ سے ہر طرح کا تعاون کروں گا۔ کبھی آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔"

"کیا آپ جانتے ہیں کہ چودہ کروڑ کی آبادی میں اردو' انگریزی کے ساڑھے تین لاکھ اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہاں ناخواندگی زیادہ ہے یا پھر لوگ سیاسی ہیرا پھیریوں کو سمجھتے ہوئے بھی سمجھنا نہیں چاہتے یا ان کی دال روٹی کی ضرورتیں انہیں سمجھنے کی فرصت نہیں دیتیں۔"

"جی ہاں' یہ درست ہے۔"

"اور یہ بھی درست ہے کہ سیاست' معاشرت' معیشت اور اقتصادیات جیسے خشک

مضامین صرف چند افراد پڑھتے ہیں اور ڈائجسٹ' ناول اور رسائل وغیرہ لاکھوں کروڑوں افراد پڑھتے رہتے ہیں کیونکہ ان میں رومانس' کامیڈی' ایکشن تھرلنگ اور قوم کا غم غلط کرنے والا تمام نسخہ ہوتا ہے۔"

فرمان نے کہا۔ "ہاں یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن ان میں وہی سیاست' معیشت اور اقتصادیات جیسی خشک چبھتی ہوئی زہریلی سچائیاں بھی ہوتی ہیں۔ پڑھنے والے تفریح بھی حاصل کرتے ہیں اور تلخ حقائق کو بھی سمجھتے رہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "فرمان! میں تمہارے مینٹل کیس کے بارے میں ایسی ہی رومانس' ایکشن اور تھرلنگ سے بھرپور کہانی لکھوں گا اور تفریح کے ساتھ ساتھ تلخ حقائق بھی متاثر کن انداز میں بیان کرتا جاؤں گا۔"

"آپ نے تو خوش کر دیا۔ مجھے اپنی روداد پوری قوم تک پہنچانے میں جو تسکین حاصل ہو گی' اس کے نتیجے میں میرے اندر کا بخار نکلتا رہے گا۔"

میں نے اپنے سیاہ بیگ کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "اس میں میری دوائیں' قلم' کاغذات کیسٹ ریکارڈر اور چند کیسٹس ہوتے ہیں۔ میں اس ریکارڈر کو آن کر کے تم سے سوالات کرتا رہوں گا۔ تم اس کے مطابق جوابات دو گے اور اپنی روداد بیان کرتے رہو گے پھر میں اپنے اندازِ تحریر کے مطابق اسے تمہاری طویل کہانی بنا کر کتاب کی صورت میں شائع کروں گا۔ یہ کتاب صرف پاکستان میں ہی نہیں' دنیا کے ہر اس ملک میں پڑھی جائے گی' جہاں اردو زبان جاننے والے رہتے ہیں۔"

میں نے ریکارڈر نکال کر اس میں ایک کیسٹ لگاتے ہوئے کہا۔ "مجھے لاہور میں زیادہ عرصے نہیں رہنا ہے۔ لہٰذا یہ کام ابھی شروع ہو جائے۔ میں تمہاری روداد کی مزید ریکارڈنگ کے لئے یہاں آتا رہوں گا۔ کراچی سے یہاں پہنچنے میں صرف ڈیڑھ گھنٹے لگتے ہیں۔ تمہیں میری ضرورت ہو گی تو مجھے فون کرو گے' میں اسی دن تمہارے پاس آ جاؤں گا۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ مجھے تعاون کے لئے کہہ رہے تھے اور خود ہی بھرپور تعاون کر رہے ہیں۔"

"تمہاری امی عالمی شہرت یافتہ لیڈی سرجن ہیں۔ آپ بہت ہی دولت مند ہیں۔ اس کے باوجود سڑکوں اور فٹ پاتھ پر رینگنے والے اور بسوں میں جانوروں کی طرح ٹھونس ٹھونس کر بھرے جانے والے عوام کی بے بسی اور بدحالی کو محسوس کرتے ہیں۔ تمہارے جیسا حساس دل و دماغ قدرت کی طرف سے ملتا ہے۔"

"ہاں' میں نہ چاہوں تب بھی عوام کی غربت' مہنگائی اور نوجوانوں کی گمراہی دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتا ہوں اور جوش میں آ کر چاہتا ہوں کہ مجھے ایسی غیبی طاقت یا غیر معمولی صلاحیتیں حاصل ہو جائیں کہ میں فرسودہ نظام حکومت کو ختم کر کے سب کو انصاف دلاؤں اور اپنے ملک کو جرائم سے پاک کر دوں۔"

"سوچنے سے غیبی طاقت اور غیر معمولی صلاحیتیں حاصل نہیں ہوتیں۔ ایسا پہلی بار کب ہوا جب تم دیوانے کی طرح جوش میں آ گئے؟"

"پہلی بار جب تھر کے علاقے میں تین نابالغ لڑکیوں کو اغوا کیا گیا اور بیرونی ممالک سے آنے والے دولت مند شکاریوں کے سامنے ان لڑکیوں کو پیش کیا گیا۔ تب میں اندر سے لرز گیا۔"

"واقعی یہ پوری قوم کے لئے غیرت کا مسئلہ ہے۔ تمہاری طرح کتنے ہی پاکستانی غیرت سے لرز گئے ہوں گے۔ ایسے وقت تم نے کیا کیا؟"

"میں امی کے ساتھ لندن میں تھا۔ اخبار میں یہ شرمناک واقعہ پڑھتے ہی پاکستان جانا چاہتا تھا۔ امی میرے مزاج کو خوب سمجھتی ہیں۔ انہوں نے میری تائید کی پھر مجبوری ظاہر کی کہ پرسوں تک دو میجر آپریشن کرنے ہیں پھر ہم ماں بیٹے پاکستان جا کر وہاں عوامی ردِ عمل دیکھیں گے۔ وکلا اور صحافیوں سے مل کر اس شرمناک واقعے کے خلاف احتجاج کریں گے۔

"اس طرح امی بڑی حکمت عملی سے تین دنوں تک دلاسے دے کر میرے جوش و جنون کو کم کرتی رہیں۔ تیسرے دن لندن میں ہی اخبارات کے ذریعے معلوم ہوا کہ کسی امیر حمزہ نے پاکستان کے ساحلی علاقے کیٹی بندر کے خفیہ معاہدے کے راز چرا لئے ہیں۔ وہاں ایک سازش کے تحت غیر ملکی فوجی اڈا قائم ہونے والا تھا۔ اس راز کا انکشاف ہوتے ہی اس وقت کی حکومت پر مزید سازشوں کے الزامات عائد ہوئے اور حکمرانوں کو اقتدار سے ہٹا دیا گیا۔

"صرف اتنا ہی نہیں امیر حمزہ نے ان تین بچیوں کے دلالوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کی دلیری اور جوان مردی کے باعث مجھے اطمینان اور سکون حاصل ہوا۔ میرے اندر کا غبار نکلا۔ میں نے سوچ لیا کہ اس روپوش رہنے والے مجاہد امیر حمزہ کو تلاش کر کے اس کے ساتھ اس کے نقشِ قدم پر چلوں گا۔"

فرمان اپنی روداد بیان کر رہا تھا۔ اس کا بیان ریکارڈ ہو رہا تھا۔ اس نے راجہ نواز' اپنی ماں ڈاکٹر آمنہ اور گاڈ فادر ہاشم اور اس کے باپ گاڈ فادر قاسم جان کے بھی حالات

بیان کئے۔ رات کے بارہ بجنے لگے تو میں نے کہا۔ "اب میں جاؤں گا اور لاہور میں قیام کرنے تک روز آیا کروں گا۔ یہ ریکارڈر اور ایکسٹرا کیسٹس آپ کے پاس رہیں گے۔ آپ آرام کرتے رہا کریں اور اپنی روداد ریکارڈ کرتے رہیں۔"

میں اور مسیح الزماں اس سے مصافحہ کر کے آ گئے۔ ڈاکٹر آمنہ ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ "آپ کو آرام کرنا چاہئے تھا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ اللہ نے چاہا تو آپ کا بیٹا بالکل نارمل ہو جائے گا۔ میں نے فرمان کو اپنا کراچی کا ایڈریس اور فون نمبر دیا ہے۔ جب بھی مجھے فون کیا جائے گا' میں یہاں آ جاؤں گا۔ فی الحال میرا یہاں جب تک قیام ہے۔ روزانہ فرمان کے پاس آیا کروں گا۔"

ڈاکٹر آمنہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم اتنی محنت کرو گے' اس کے صلے میں تمہیں کیا دوں؟ جتنی رقم چاہو لے سکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "مجھے فرمان کی رُوداد سے ایک ناول لکھنے کے لئے بہترین موضوع مل رہا ہے۔ مجھے اس ناول سے اچھی خاصی رقم مل جائے گی۔ آپ مجھ سے لین دین کی کوئی بات نہ کریں۔"

وہ سب خوش تھے۔ میں بھی خوش تھا پھر میں نے اسے زیر نظر کہانی میں اور زیادہ جذب کرنے کے لئے فرمان کا کردار پیش کیا اور اعتراف کیا کہ اس داستان کا راوی اور ہیرو فرمان ہے۔ میں محض ایک مصنف ہوں۔ میرے اس طریقۂ کار نے اسے اور زیادہ خوش کر دیا۔

قارئین سے یہ سوال ہے' کیا آپ خوش نہیں ہوتے جب آپ کے سچے اور تعمیری جذبوں کی تعریف کی جاتی ہے؟ کیا آپ خوش نہیں ہوں گے۔ جب تنہا کچھ نہیں کر پائیں گے تو اس کے بدلے قوم کی غیرت اور وطن کی بقا کے لئے تقریر و تحریر کے ذریعے اپنی آواز پورے ملک میں اور ملک سے باہر دور دور تک پہنچائیں گے؟ ایسے حالات میں آپ کے والدین اور پوری قوم ناز کرے گی کہ آپ کرسی پر بیٹھ کر اور بستر پر لیٹ کر دشمنانِ وطن سے خیالی جنگ نہیں لڑ رہے ہیں۔ بڑی حکمت عملی سے ملک کے دانشوروں' بیرسٹروں اور صحافیوں کو اپنا ہم نوا بناتے جا رہے ہیں۔

صبح ہونی چاہئے اور رات ڈھلنی چاہئے
لیکن اس کے واسطے تحریک چلنی چاہئے

☆=====☆=====☆

فرمان نے اپنی اب تک کی روداد جو ریکارڈ کرائی تھی اب وہ ریکارڈنگ ختم ہو رہی

تھی۔ ایک کیسٹ کے B سائڈ کا آدھا حصہ لکھنے کو رہ گیا ہے میں اسے بھی لکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد کیسٹ ختم ہو جائے گا لیکن روداد شاید ختم نہیں ہو گی۔ آئندہ فرمان بہت کچھ ریکارڈ کرا سکتا ہے لیکن نہیں کرا سکے گا۔ ریکارڈر میرے پاس ہے۔ جب مجھے اس سے ملنے سے روک دیا گیا ہے تو ریکارڈر کو بھی اس کے پاس نہیں پہنچایا جائے گا۔

ڈاکٹر آمنہ ایسی خاتون ہیں' جو صرف اپنے اکلوتے بیٹے کی ہی نہیں' میری بھی سلامتی' عزت اور قلمی مرتبے کو قائم رکھنا چاہتی ہیں۔ انہوں نے دل پر جبر کر کے مجھے اپنے بیٹے سے ملنے روک دیا ہے لیکن وعدہ کیا ہے کہ نارمل ہو جانے والے بیٹے کو کسی طرح کی ٹھیس پہنچے گی اور اس کے علاج میں دوسرے ڈاکٹر اور ماہر نفسیات ناکام رہیں گے تو وہ مجھے فوراً بلائیں گی۔

اب میں کیا دعا مانگوں کہ وہ سب ناکام رہیں اور دوبارہ ایبنارمل ہونے والا فرمان پاگل ہو کر مینٹل اسپتال سے پاگل خانے چلا جائے؟

یہ تو خود غرضی ہو گی۔ فرمان کو نارمل ہو جانا چاہئے۔ میں آگے نہ لکھوں' کوئی بات نہیں۔ تعمیری مقاصد کی تکمیل تک قلم کی سچائی قائم رکھنے کے لئے ہمارے ملک میں بے شمار قلم کار ہیں۔

دیکھا جائے تو غلطی میری ہے۔ میں بھی ایب نارمل ہوں۔ فرمان دماغ کو قابو میں نہیں رکھ پاتا۔ میں اپنے قلم کی کاٹ کر روک نہیں پاتا۔ میرا تحریری اسٹائل اور ذو معنی الفاظ ذرا دیر سے سمجھ میں آتے ہیں اور جب سمجھ میں آتے ہیں تو تختِ طاؤس کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔

بہرحال آیئے' جہاں اس داستان کو ادھورا چھوڑا تھا' وہاں سے آگے چلتے ہیں۔

☆=====☆=====☆

میں اور بینا اسی ہوٹل کے تیسرے فلور کے ایک کمرے میں منتقل ہو گئے۔ ایسا کرنے کی وجہ یہ تھی کہ دشمن یہی سمجھیں گے کہ جہاں قاتلانہ حملہ ہم پر ہوا ہے' وہاں ہم کبھی نہیں رہیں گے۔ وہ ہمیں دوسرے چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں ڈھونڈتے پھریں گے۔

میں نے ہوٹل کی انتظامیہ سے کہہ دیا تھا کہ کسی کو وہاں ہماری رہائش کا علم نہ ہو۔ کاؤنٹر کے رجسٹر پر ہم دونوں کے فرضی نام لکھے جائیں۔ ہوٹل کے تمام عملے کو سختی سے تاکید کی جائے کہ کسی کے سامنے ہمارا ذکر نہ کریں۔ وہ اپنے طور پر میری ہدایت پر عمل کر رہے تھے لیکن ہم یہ سمجھ سکتے تھے کہ ہوٹل کا کوئی بھیدی لنکا ڈھا سکتا ہے۔

بینا نے کہا۔ "ہمیں آئندہ اس ہوٹل کی رینٹڈ کار استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ آپ یہاں کے زونل افسر سے کوئی اچھی سی کار طلب کریں۔"

میں نے زونل افسر کے پرسنل فون پر رابطہ کیا۔ دوسری طرف رابطہ قائم ہونے کا بزر سنائی دیتا رہا۔ بڑی دیر بعد کسی کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو کون؟"

میں نے گرجتے ہوئے پوچھا۔ "فون اٹینڈ کرنے میں دیر کیوں ہوئی؟"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "سر جی! صاحب سو رہے ہیں' میں ان کا ملازم بول رہا ہوں۔"

"اسے اٹھاؤ' یہ ایمرجنسی کال ہے۔"

"سر جی! کیسے اٹھاؤں؟ یہ تو نشے میں بالکل لڑھک گئے ہیں۔ میری اور فون کی گھنٹی کی آواز بھی ان کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی ہے۔"

میں نے فون بند کر کے ڈی جی دھاون سے رابطہ کر کے کہا۔ "سوری پاپا! آپ کو نیند سے اٹھایا ہے۔"

"کوئی بات نہیں بیٹے! بولو کیا بات ہے؟"

"ہم یہاں خطرات سے گزر رہے ہیں اور وہ زونل افسر شراب کے نشے میں مدہوش ہے۔ ہم ہوٹل کی رینٹڈ کار استعمال نہیں کریں گے۔ اس میں خطرہ ہے۔ ہمیں فوراً دوسری کار کی ضرورت ہے۔"

ڈی جی دھاون نے زونل افسر کو تگڑی گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی چیف افسر آف "را" کو حکم دیتا ہوں۔ وہ تمہارے پاس ایک کار پہنچا کر زونل افسر کو غفلت کی سزا دینے کے لئے گولی مار دے گا۔"

"نو پاپا! زونل افسر کو پہلے ہوش میں لا کر پوچھا جائے کہ تابانی اور مراد کو ہماری آمد کے بارے میں اور ہوٹل کے کمرا نمبر کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟ آپ نے صرف زونل افسر کو ہمارے بارے میں بتایا تھا۔ ہماری آمد کا راز زونل افسر نے اور کس کو بتایا تھا۔"

"وہ بیٹے! اس معاملے میں مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں نے تابانی اور ہاشم تک تمہیں پہنچانے کے لئے فون کے ذریعے مراد کو بڑے سے بڑا لالچ دیا اور اس کی تابانی کی سلامتی کے لئے یہ جھوٹ کہا کہ میری اپنی بیٹی اور داماد آج لاہور پہنچ رہے ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ تابانی کے ساتھ تم دونوں کو ہلاک کرنے ہوٹل پہنچ جائے گا۔"

"غلطی ہر انسان سے ہوتی ہے۔ آپ سے بھی ہو گئی۔ یہ بتائیں فون پر باتیں کرتے

وقت مراد کے پاس آپ کے اعتماد کا کوئی آدمی تھا؟"

"ہاں' ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر شہر میں گھومتے ہوئے اسسٹنٹ زونل افسر نے مراد سے میری بات کرائی تھی۔"

"اس کا مطلب ہے۔ آپی کی اور مراد کی باتیں سننے والا صرف اسسٹنٹ زونل افسر ہی نہیں' ایک ٹیکسی ڈرائیور بھی تھا۔"

"ہاں مگر ڈرائیور کا تعلق "را" سے ہے۔"

"کیا ڈرائیور اور اسسٹنٹ زونل افسر میں سے کوئی گھر کا بھیدی نہیں ہو سکتا؟ اب آپ ایک نہیں دو کاریں بھیجیں۔ زونل افسر سے کہیں آپ کی بیٹی اور داماد الگ الگ رہائش اختیار کر رہے ہیں۔ وہ ابھی ائرپورٹ جا کر آپ کی بیٹی سے ملے۔ اسے بھی میری کار کا نمبر بتا دیں۔ آپ کو چند گھنٹوں کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے خلاف کس نے سازش کی ہے۔"

"ٹھیک ہے تم جو چاہتے ہو' وہ ابھی ہو جائے گا۔"

میں نے رابطہ ختم کر کے بینا سے کہا۔ "تم اسسٹنٹ زونل افسر سے کہو گی کہ وہ تمہیں کسی فوراً اسٹار ہوٹل میں پہنچا دے۔ اس ہوٹل میں کمرا لینے کے بعد مجھے فون پر اطلاع دو۔ اس کے مطابق میں ڈرائیور سے کہوں گا کہ مجھے اس فور اسٹار ہوٹل میں پہنچائے۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں پھر ہم پر قاتلانہ حملہ ہو گا۔ اگر حملہ میرے کمرے میں ہو گا تو ڈرائیور ہمارا مخالف ثابت ہو گا۔"

بینا نے کہا۔ "اور میرے کمرے میں ہو گا تو مخالف اسسٹنٹ زونل افسر ثابت ہو گا۔ اچھی چال ہے۔"

"یہ چال صرف "را" کی کسی سازش کو پکڑنے کے لئے نہیں بلکہ اس کے ذریعے خفیہ ہاتھ کی کسی ایجنسی تک پہنچنے کے لئے ہے۔ تم نے اس کمرے میں مراد کی باتوں پر توجہ دی نہیں تھی۔ اس نے خفیہ ہاتھ کا ذکر آپی سے کیا تھا۔"

"ہاں کچھ یاد آ رہا ہے۔"

"اس نے صاف طور سے کہا تھا کہ خفیہ ہاتھ اس پر بھروسا کر رہا ہے۔ اگر وہ میری لاش کا تحفہ اسے دے گا تو اسے دولت اور کئی بڑے ممالک کی شہرت مل جائے گی۔ اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ مراد' "را" اور خفیہ ہاتھ کی ایجنسی کے لئے بھی کام کر رہا تھا۔"

ہمیں اطلاع ملی کہ ہمارے لئے دو کاریں آئی ہیں۔ ہم اپنے ایک ایک سفری بیگ میں ضروری سامان لے کر ہوٹل کے باہر آئے۔ کار لانے والوں نے ان کی چابیاں ہمارے

حوالے کیں۔ ہم دونوں الگ الگ کار میں بیٹھ کر وہاں سے ائرپورٹ اور ریلوے اسٹیشن کی طرف چلے گئے۔ میں سست رفتاری سے ڈرائیو کرتا رہا تاکہ بینا مجھ سے پہلے ائرپورٹ پہنچ کر اسسٹنٹ زونل افسر کے ذریعے کسی فور اسٹار ہوٹل میں پہنچ کر مجھ سے رابطہ کرے۔

میں نے ریلوے اسٹیشن کے پاس ایک جگہ کار روکی۔ ایک منٹ کے اندر ہی ایک شخص کار کی کھڑکی کے پاس آ کر بولا۔ "سر! مجھے اس کار کا نمبر بتایا گیا ہے۔"

"اور مجھے کسی ڈرائیور کا نام بتایا گیا ہے۔"

"جی.......... رگھو ناتھ بتایا گیا ہو گا۔ ویسے مجھے صرف رگھو کہتے ہیں۔"

"آؤ بیٹھ جاؤ۔"

"سر! میں نوکر ہوں۔ مجھے ڈرائیو کرنے دیں۔ آپ آرام سے پچھلی سیٹ پر تشریف رکھیں۔"

میں اسٹیئرنگ سیٹ سے نکل کر پچھلی سیٹ پر آ گیا۔ وہ اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ "حکم کریں' کہاں جانا ہے؟"

"کیا تمہیں پتا ہے کہ میں اپنی وائف کے ساتھ پرل ہوٹل میں تھا۔ ہم پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تھا۔"

اس نے انجان بن کر حیرانی سے پوچھا۔ "آپ دونوں پر؟ اور قاتلانہ حملہ؟"

"کیوں ہمیں قتل کرنے والے کم ہوں گے جبکہ ہم "را" کی ایک بڑی شخصیت کی بیٹی اور داماد ہیں۔"

"بیٹی اور داماد؟ آپ بتانا چاہیں تو معلوم ہو۔ "را" کی بڑی شخصیت ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ دھاون صاحب ہیں۔ ان سے بڑے بھارت کے پردھان منتری ہیں۔"

"ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ پردھان منتری کے داماد بن جائیں۔ جمنا پرساد دھاون صاحب میرے سسر ہیں۔ یہ بات یہاں کوئی نہیں جانتا تھا۔ "را" سے ہمارا تعلق بھی ظاہر نہیں ہوا تھا پھر ہمیں قتل کرنے کی کوشش کرنے والے کون ہو سکتے ہیں؟"

"سر! یہ بہت گہری سازش معلوم ہوتی ہے۔ بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔"

"ہوشیار ہیں۔ اسی لئے ہم پتی پتنی الگ ہو گئے ہیں۔ وہ دوسری جگہ رہنے گئی ہے۔ تم مجھے دوسری جگہ لے چلو۔"

"کہاں لے چلوں سر؟"

فون کا بزر بولنے لگا۔ "میں نے ایک بٹن دبا کر اسے آن کیا پھر پوچھا۔ "خیریت سے

ہو؟"

وہ بولی۔ "خیریت ہے۔ میں انٹرنیشنل ہوٹل کے گراؤنڈ فلور والے کمرے 112 میں ہوں۔ انکل ہاشم کو اس ہوٹل کے بارے میں بتا رہی ہوں۔"

میں نے آل رائٹ کہہ کر فون بند کیا پھر رگھو سے پوچھا۔ "تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"یہی کہ آپ کہاں رہنا پسند کریں گے؟"

میں نے ذرا دیر سوچا پھر کہا۔ "ہوٹل انٹرنیشنل لے چلو۔"

وہ کار اسٹارٹ کرکے چل پڑا پھر بولا۔ "سر! ہوٹل انٹرنیشنل تو آپ کے اس پرل ہوٹل کے قریب ہی ہے۔"

"میں قریب رہ کر دشمنوں پر نظر رکھنا چاہتا ہوں۔"

"یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "مراد کو جانتے ہو؟"

وہ سوچنے کی ایکٹنگ کرنے لگا پھر بولا۔ "میں مراد کو جانتا ہوں۔ ایک کراچی میں ہے اور ایک یہاں ہے۔"

"یہاں والے مراد کے متعلق کیا جانتے ہو؟"

"سر! مجھ سے زیادہ میرے افسران کو جاننا چاہئے۔ پتا نہیں وہ کس وجہ سے اس پر بھروسا کر رہے ہیں؟ جبکہ وہ ہمارے افسران پر بھروسا نہیں کر رہا تھا۔ اس نے آپ کے سسر دھاون صاحب سے اس بات کی ضمانت لی تھی کہ "را" والے کبھی اس کی تابانی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

"جب میرے سسر نے ضمانت لی ہے تو پھر مراد ان کے لئے بہت اہم ہو گا؟"

"کچھ ایسی ہی بات ہو گی سر؟"

کار......... انٹرنیشنل ہوٹل کے احاطے میں داخل ہو کر پورچ میں رک گئی۔ رگھو نے کہا۔ "سر! آپ کمرا لیں۔ میں کار پارک کرکے آتا ہوں۔"

میں کار سے اتر کر کاؤنٹر پر آیا۔ وہاں اپنا پاسپورٹ دکھا کر ایک کمرا گراؤنڈ فلور پر ہی لیا۔ میرا کمرا بینا کے کمرے کے ایک کمرے کے بعد ہی تھا۔ یعنی مجھے 117 نمبر کا کمرا ملا تھا۔ رگھو کار پارک کرکے آ گیا۔ میں اس سے کار کی چابی لے کر اس کے ساتھ اپنے کمرے میں آیا۔ ملازم نے تازہ پانی کی بوتلیں لا کر فریج میں رکھیں۔ ائرکنڈیشنر کو آن کیا پھر بخشش لے کر چلا گیا۔ میں نے کہا۔ "رگھو! دروازے کو لاک کر دو۔"

وہ دروازے کو اندر سے لاک کر کے بولا۔ "سر! آپ اجازت دیں گے تو میں

ٹائلٹ جاؤں گا۔ بس ایک دو منٹ کے لئے........"

"ٹھیک ہے جاؤ۔"

اس نے ٹائلٹ کے اندر جا کر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ میں دبے قدموں دروازے کے پاس آ کر کان لگا کر سننے لگا۔ ایک ہلکی سی ایسی آواز سنائی دی جیسے لوہے سے لوہا ٹکرا گیا ہو۔ میں نے ایک لوہار کی حیثیت سے اس ہلکی سی آواز کو پہچانا۔ کسی ہتھیار کا شبہ ہوا۔ میں ٹھیک دروازے کے سامنے کھڑا رہ کر اس کے ہینڈل کو تکنے لگا۔

ذرا دیر بعد وہ ہینڈل تھوڑا تھوڑا گھومنے لگا۔ کھٹ کی آواز سے لاک کھلنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد دروازے کو کھلنا تھا اور وہ کھل ہی رہا تھا کہ میں نے دروازے پر ایک زوردار لات ماری۔ وہ چیخ کر باتھ روم کے فرش پر گرا۔ سائلنسر لگا ہوا ریوالور ہاتھ سے چھوٹ کر دور چلا گیا۔

وہ فوراً اٹھ کر ریوالور کے پاس جانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ خود کو چھڑانے کی جدوجہد نہ کر سکا۔ گرفت اتنی مضبوط تھی کہ گردن کی ہڈی ٹوٹ سکتی تھی یا تڑخ سکتی تھی۔ اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ میں نے گرفت ڈھیلی کرتے ہوئے کہا۔ "یہ شکنجہ دوسری بار مضبوط ہو گا تو گردن ٹوٹ جائے گی۔ زندہ رہنا چاہتے ہو تو اپنی اصلیت اگلتے چلے جاؤ۔"

وہ رک رک کر سانس لیتے ہوئے بولا۔ "اصلیت بتانے کے بعد آپ مجھے مار ڈالیں گے۔"

"میں اپنی پیاری بیوی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہیں جان سے نہیں ماروں گا۔ ایک طمانچہ بھی نہیں ماروں گا۔"

میں نے اسے دھکا دے کر فرش پر سے ریوالور اٹھا لیا پھر اس سے کہا۔ "تم ایک ایک سچ بتاتے جاؤ گے۔ میں موت کو تم سے دور کرتا جاؤں گا۔ پہلے یہ سائلنسر ہٹاؤں گا۔ تمہیں اطمینان ہو گا کہ فائرنگ کی آواز سے تم مرو گے تو میں بھی نہیں بچوں گا۔ پکڑا جاؤں گا۔ باہر گیٹ پر مسلح گارڈ کھڑا ہوا ہے۔"

وہ سہم کر بولا۔ "میں آپ کو قتل کی دھمکی دے کر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آپ کی وائف کس ہوٹل میں ہے۔ خفیہ ہاتھ کی ایجنسی والوں کو آپ کی نہیں دھاون صاحب کی بیٹی کی ضرورت ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ پہلے میں تصدیق کروں کہ آپ کی وائف ہی دھاون صاحب کی بیٹی ہے۔ ابھی آپ نے اسٹیشن سے آتے وقت اپنی زبان سے کہا تھا کہ آپ ان کے داماد ہیں۔"

"ہاں جو سچ ہے' وہی میں نے کہا ہے۔ ان کی بیٹی پدمنی میری وائف ہے اور چہرہ بدل کر میرے ساتھ آئی ہے۔ آگے بولو۔"

"میں ابھی آپ کی کار پارک کرنے گیا اور موبائل فون کے ذریعے خفیہ ہاتھ کی ایجنسی کے انچارج کو یقین دلا دیا کہ آپ کی وائف ہی دھاون صاحب کی بیٹی ہے۔ اب وہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کس ہوٹل میں گئی ہے؟ میں آپ کو اس ریوالور سے دھمکی دے کر اس ہوٹل کا نام اور کمرا نمبر معلوم کرنا چاہتا تھا۔ سر! آپ نے سائلنسر نہیں ہٹایا ہے۔"

"سائلنسر آخر میں ہٹاؤں گا۔ پہلے ایک ایک گولی نکالتا چلا جاؤں گا۔ تمہارے ایک ایک سچ بولنے تک یہ ریوالور خالی ہو جائے گا۔"

میں نے اس کے چیمبر سے ایک گولی نکال کر اس کی طرف اچھال دی۔ وہ گولی کیچ کر کے بولا۔ "سر! آپ زبان کے دھنی ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں سچ بولتا رہوں گا تو آپ مجھے اپنا تابع دار بنالیں گے۔"

ہم باتھ روم سے نکل کر کمرے میں آئے۔ میں نے پوچھا۔ "خفیہ ہاتھ کو دھاون صاحب کی بیٹی سے کیا دلچسپی ہے؟"

"خفیہ ہاتھ کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ دھاون صاحب کی مرضی سے دردانہ بیگم کے چار سیاست دانوں کو غائب کر دیا گیا ہے۔ دھاون صاحب نے یہاں دردانہ بیگم کی حکومت بننے نہیں دی ہے۔ گویا خفیہ ہاتھ کی سیاسی بازی پلٹ دی ہے۔ اب دھاون صاحب سے پوچھا جائے گا تو وہ اس الزام سے انکار کر دیں گے۔ ان سے سچ اگلوانے کے لئے خفیہ ہاتھ ان کی بیٹی یعنی کہ آپ کی پتنی کو اغوا کرنا چاہتا ہے۔"

"ابھی تک تمہاری باتیں سچ لگ رہی ہیں۔ تمام واقعات کی کڑیاں مل رہی ہیں۔"

میں نے ریوالور کے چیمبر سے دوسری گولی نکال کر اس کے قدموں میں پھینک دی۔ اس نے جھک کر اسے اٹھالیا۔ اس طرح وہ دو گولیاں اس کی موت نہ بن سکیں مگر ابھی چار گولیاں چیمبر میں تھیں۔

میں نے پوچھا۔ "اگر تم انہیں میری وائف کا پتا بتاؤ گے تو کیا وہ ابھی اسے اغوا کر کے لے جائیں گے؟"

وہ دونوں کان پکڑ کر بولا۔ "مجھے پتا معلوم نہیں ہے۔ آپ بتائیں گے' تب بھی انہیں نہیں بتاؤں گا۔"

"میں انہیں پھانسنے کے لئے تمہیں حکم دوں۔ تب تو بتاؤ گے۔"

"جی آپ کے فائدہ کے لئے بتاؤں گا۔"

"پہلے سوال کا جواب دو' کیا وہ ابھی اسے اغوا کریں گے؟ اغوا کرنے والوں میں ایجنسی کے خاص افراد کتنے ہیں اور اسے کہاں لے جائیں گے؟"

"میری طرف سے اطلاع ملتے ہی اغوا کریں گے۔ ایجنسی کے انچارج کے ساتھ چار مسلح بندے ہیں۔ وہ انچارج پہلے سے کسی کو خاص باتیں نہیں بتاتا۔ یہ وہی جانتا ہے کہ آپ کی پتنی کو کہاں لے جائے گا۔"

میں نے تیسری گولی نکال کر اس کے سامنے پھینک دی۔ اس نے اسے بھی اٹھالیا۔

میں نے پوچھا۔ "خفیہ ہاتھ کی کتنی ایجنسیوں کے دفاتر ہیں' ان کے اہم عہدے داروں کے پتے ٹھکانے اور فون نمبر جانتے ہو۔"

"میں پچھلے مہینے سے ان کے لئے کام کر رہا ہوں۔ صرف اسی شہر کا دفتر اور انچارج کی کوٹھی جانتا ہوں۔"

"یہ تو جانتے ہو گے کہ ان کے اہم ریکارڈز دفتر میں کہاں چھپا کر رکھے جاتے ہیں۔"

"ایجنسی کے دوسرے لوگ بھی شاید یہی سوچتے ہوں گے لیکن میں دن رات اس کی تابعداری میں لگا رہتا ہوں۔ ایک بار چھپ کر دیکھ لیا' وہ اپنی کوٹھی کے بیڈ روم کی ایک فرشی تجوری میں بہت اہم ریکارڈز رکھتا ہے۔ اس فرشی تجوری کے اوپر قالین بچھا رہتا ہے۔ جہاں تجوری ہے وہاں اوپر ایک خوب صورت میز ہے۔ میز پر قرآن مجید اور دوسری اسلامی کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔"

میں نے چوتھی گولی نکال کر اس کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ "تم موت سے دور ہوتے جا رہے ہو۔"

"سر! آپ بار بار مجھے آزما کر دیکھیں۔ مجھے سچا اور وفادار پائیں گے۔"

"ہاں ابھی اور آزماؤں گا۔ اب ہم یہاں سے چلیں گے۔ تم انہیں فون نہیں کرو گے۔ میری پتنی کے بارے میں انہیں کچھ معلوم نہیں ہو گا تو وہ یہی سمجھیں گے کہ تم میرے ہاتھوں مارے گئے ہو یا کسی مصیبت میں پھنس گئے ہو۔"

میں نے موبائل فون کے ذریعے کہا۔ "ہائے جان! اس ہوٹل سے بھی اپنا دانہ پانی اٹھ رہا ہے۔ بیگ لے کر باہر میری کار کی طرف جاؤ۔ اپنی کار یہیں چھوڑ دو۔ کتنی دیر میں نکل رہی ہو۔"

"صرف ایک منٹ میں۔"

میں نے موبائل فون کو بند کیا پھر اسے اور سائلنسر لگے ہوئے ریوالور کو سفری بیگ میں رکھ کر اسے شانے سے لٹکا کر کہا۔ "میرا یہ ہاتھ بیگ کے اندر اور انگلی ٹریگر پر رہے گی۔ تم میرے آگے آگے چلو گے۔ رائٹ؟"

ہم اس طرح کمرے سے باہر آئے۔ کوریڈور سے گزر کر ہوٹل کے باہر دیکھا۔ بینا میری کار کے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے رگھو کے ساتھ اس کے قریب آ کر پوچھا۔ "تمہارا ریوالور بیگ میں ہے۔ بیگ میں ہاتھ ڈال کر ریوالور کو پکڑو اور اسے نشانے پر رکھو اور اپنے ساتھ پچھلی سیٹ پر بٹھاؤ۔"

اس نے بیگ کے اندر ہاتھ ڈالا۔ میں نے ہاتھ نکال کر چابی سے کار کا دروازہ کھولا۔ پچھلی سیٹ کے بھی دروازے کھولے۔ وہ رگھو کے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں نے اسٹیئرنگ سیٹ پر آ کر ڈیش بورڈ سے قلم نکال کر رگھو سے کہا۔ "ایجنسی کے انچارج کی کوٹھی کا نمبر اور پتا بولو۔"

وہ بولنے لگا۔ میں لکھنے لگا پھر اس نے کہا۔ "دن کے وقت اس کی کوٹھی میں جانا مناسب نہیں ہے۔ اس کے بیڈ روم کے دروازے اور تجوری میں کرنٹ رہتا ہے۔ رات کو مین سوئچ آف کر کے ٹارچ کی روشنی میں آپ کامیاب ہو سکتے ہیں۔"

میں نے بیگ سے سائلنسر لگا ہوا ریوالور نکال کر اس میں سے گولی نکالی۔ وہ گولی اسے دیتے ہوئے بولا۔ "شاباش تم نے اچھا مشورہ دیا ہے۔"

وہ خوش ہو گیا۔ میں نے سائلنسر لگا ہوا ریوالور بینا کو دیتے ہوئے کہا۔ "اس میں صرف ایک گولی رہ گئی ہے۔ یہ جتنی سچی معلومات فراہم کرتا رہا' میں اس کے چیمبر سے ایک ایک گولی نکال کر موت کو اس سے دور کرتا رہا پھر کوئی سوال یاد آئے گا اور یہ صحیح جواب دے گا تو چیمبر سے آخری گولی بھی نکال کر اسے دے دینا۔"

میں نے کار اسٹارٹ کی پھر ڈرائیو کرتا ہوا' مین روڈ سے مڑ کر نہر کے کنارے والی سڑک پر جانے لگا۔ بینا نے کہا۔ "تم اچانک اسے گن پوائنٹ پر لائے ہو۔ میں ضروری بات کہہ نہ سکی۔ میں نے انکل کو فون کیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ آپی کی حالت عجیب سی ہو گئی ہے۔ کبھی سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔ کبھی زیر لب بڑبڑاتی ہیں۔ کہتی ہیں' وہ میری جان تھا۔ میں نے اپنی جان کی جان لے لی۔ میرا بچہ بڑا ہو کر مجھے اپنے باپ کا قاتل سمجھے گا۔ انکل انہیں ڈاکٹر فیروزہ کے پاس اسپتال لے جا رہے ہیں۔ لندن امی کو بھی فون کیا ہے۔ وہ کل تک یہاں پہنچنے والی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہمیں فوراً آپی کے پاس جانا چاہئے۔ میں ایسی حالت میں آپی کو تنہا

نہیں چھوڑوں گا۔"

میں نے نہر کے کنارے کار کو روک کر کہا۔ "رگھو! تم جاؤ۔ میں بعد میں تم سے رابطہ کروں گا۔"

وہ دروازہ کھول کر دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کہہ کر جانے لگا۔ میں نے بینا سے کہا۔ "بینا! یہ "را" سے خفیہ طور پر غداری کر کے خفیہ ہاتھ کی ایجنسی کے لئے کام کر رہا ہے۔ آج اپنی جان بچانے کے لئے خفیہ ایجنسی کے کچھ راز مجھے بتا دیئے اور اب یہاں سے جا کر ہمارے خلاف سازش کرے گا۔ میں نے تمہاری قسم کھا کر وعدہ کیا ہے کہ اسے جان سے نہیں ماروں گا۔"

"میں سمجھ گئی' وعدہ تم نے کیا ہے' میں نے نہیں کیا ہے۔"

بینا نے اس جانے والے کو نشانے پر لیا اور ریوالور کی آخری گولی چلا دی۔ وہ چیخ مار کر اچھل کر گرا پھر اٹھ نہ سکا۔ میں کار آگے بڑھا کر تیز رفتاری سے ڈرائیو کرنے لگا۔ بینا نے جھک کر اگلی سیٹ پر آ کر کہا۔ "رفتار کم کرو۔"

میں نے رفتار اور بڑھائی' وہ بولی۔ "میری بات نہیں مانو گے؟"

"کوئی حادثہ نہیں ہو گا۔ خاموش رہو۔"

"میں آپی کے بارے میں نہ بتاتی تو بہتر ہوتا۔ کیا تم نے آپی کو کوئی عام سی عورت سمجھ لیا ہے؟"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ آپی تم سے زیادہ جیدار اور سخت جان ہیں۔ وہ مراد کو ہلاک کر کے وقتی طور پر ذہنی طور پر الجھ گئی ہیں۔ تمہیں آپی کی قسم' رفتار کم سے کم کرو۔ آرام سے ڈرائیو کرو۔"

میں نے رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔ "بے شک' میرا تو جسم فولادی ہے لیکن آپی کا تو دماغ فولادی ہے۔ وہ موجودہ صدمہ برداشت کر لیں گی۔"

بینا نے کہا۔ "ہم ایک دو دن آپی کے ساتھ گزاریں گے۔ دوسری مصروفیات چھوڑ دیں گے۔ تم نے خفیہ ایجنسی کے بارے میں جو اہم معلومات حاصل کی ہیں' وہ سب دھاون صاحب کو بتا دو۔ ان سے بہانہ کرو۔ کل سے سونے کا موقع نہیں ملا ہے۔ اب سونے جا رہے ہو۔ جاگنے کے بعد بہانہ کرو کہ گاڈ فادر ہاشم کا سراغ ملا ہے۔ تم اس کے تعاقب میں ہو۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔ ہمیں تمام مصروفیات سے جان چھڑا کر صرف آپی کے ساتھ رہنا

ہے۔"

میں نے ڈی جی دھاون سے رابطہ کر کے کہا۔ "خفیہ ہاتھ کو معلوم ہوا ہے کہ وہ پاکستان میں جو سیاسی بازی کھیل رہا تھا' اسے آپ نے ناکام بنایا ہے اور آپ اس کے سامنے کبھی اعتراف نہیں کریں گے کہ آپ نے وردانہ کے چار سیاست دانوں کو غائب کرایا ہے' آپ کو مجبور کر کے اعتراف کرنے کے لئے وہ میری بانو بیگم کو آپ کی بیٹی سمجھ کر اغوا کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی کوشش ناکام بنا دی ہے۔"

"شاباش بیٹے! تم نے خفیہ ہاتھ کو شکست دی ہے۔"

"آپ ضروری بات سنیں۔ خفیہ ہاتھ کی ایجنسی کے انچارج کی کوٹھی کا نمبر اور پتا نوٹ کریں۔"

وہ نوٹ کرنے لگا۔ میں نے کہا۔ "اس کے بیڈ روم میں ایک چھوٹی سی خوبصورت میز ہے جس پر اس نے دکھاوے کے لئے اسلامی کتابیں رکھی ہیں۔ اس میز کے نیچے قالین کو الٹا جائے تو ایک فرشی تجوری نظر آئے گی۔ اس تجوری میں خفیہ ایجنسیوں کے اہم ریکارڈز ہیں۔ یہ چیزیں میں حاصل کر سکتا ہوں لیکن کل سے مجھے اور بانو بیگم کو سونے کا موقع نہیں ملا ہے۔"

"بیٹے! تم تو سارا کام چھوڑ کر سو جاؤ۔ وہ تمام خفیہ ریکارڈز میرے آدمی حاصل کر لیں گے۔ بھگوان کی سوگند تم کمال کرتے جا رہے ہو۔"

"ایک اہم بات یہ ہے کہ اس کے بیڈ روم کے دروازے اور تجوری میں کرنٹ رہتا ہے۔ وہاں کامیابی حاصل کرنے کے لئے پہلے مین سوئچ کو آف کیا جائے۔"

"بیٹے! میرے دل کی گہرائیوں سے تمہارے لئے دعائیں نکل رہی ہیں۔ بس اب فون بند کرو اور آرام سے سو جاؤ۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ دوسری طرف بینا فون پر باتیں کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "میں ابھی ڈاکٹر فیروزہ سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی ہے کہ آپی اور انکل ابھی تک اس کے پاس اسپتال نہیں آئے ہیں۔"

"تعجب ہے۔ وہ تقریباً ایک گھنٹا پہلے اسپتال جانے کے لئے نکلے تھے۔ میں انکل سے ابھی بات کرتا ہوں۔ تم ان کے نمبر پنچ کرو۔"

بینا موبائل نمبر پنچ کرنے لگی۔

انکل ہاشم نے آپی کی حالت دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ اپنے ہاتھوں سے اپنے محبوب کو گولی مارنے کے بعد وہ خود کو معاف نہیں کر رہی ہیں۔ مراد ہلاک ہونے کے باوجود اس

کے پیٹ میں موجود تھا۔ اسے ذہنی اذیتوں میں مبتلا کر رہا تھا۔ ایسے میں آپی کو اسپتال لے جا کر ٹریٹ منٹ کے ذریعے انہیں ذہنی سکون پہنچانا ضروری تھا۔

انکل نے انہیں ہائی روف کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا تھا اور خود اس کار کو ڈرائیو کرتے ہوئے اسپتال جا رہے تھے۔ انہوں نے فون پر ڈاکٹر فیروزہ کو آپی کی حالت بتا کر کہا تھا کہ وہ انہیں اسپتال لا رہے ہیں اور یہ بھی بتایا تھا کہ امی کل کسی وقت لندن سے یہاں پہنچنے والی ہیں۔

پھر وہ ڈرائیو کرتے ہوئے ملتان روڈ سے یونیورسٹی روڈ پر مڑ کر لبرٹی مارکیٹ کی طرف ہولی فیملی اسپتال جانے والے تھے۔ ابھی یونیورسٹی روڈ دور تھا۔ لاہور اور ٹھوکر کے درمیان انکل کا ایک خفیہ اڈا تھا۔ وہ آپی کو اسی اڈے سے لا رہے تھے۔ راستے میں ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ وہاں سے گزرتے وقت ایک عورت اپنے بچے کو گود میں لئے تیزی سے سڑک پار کر رہی تھی۔ انکل نے عورت اور بچے کو بچانے کے لئے اچانک ہی بریک لگا دیا جس کے نتیجے میں ان کا سر زور سے اسٹیئرنگ سے ٹکرایا۔ آپی کے حلق سے چیخ نکلی۔ وہ لیٹی ہوئی تھیں۔ سیٹ پر سے لڑھک کر نیچے پیٹ کے بل گریں۔ بڑی تکلیف سے کراہنے لگیں۔ سڑک کے دونوں طرف ایک کار اور ایک وین کھڑی ہوئی تھی۔ خفیہ ایجنسی نے اس حد تک معلومات حاصل کی تھیں کہ گاڈ فادر ہاشم کا ایک خفیہ اڈا ملتان روڈ پر کہیں ہے۔ بدقسمتی سے وہ کار اور وین والے خفیہ ایجنسی سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ دوڑتے ہوئے انکل کی گاڑی کے پاس آئے تاکہ وہ انکل کی خیریت معلوم کر سکیں۔

انکل کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ ویسے تو وہ انکل کو نہیں پہچان سکتے تھے لیکن اسٹیئرنگ سے ٹکرانے کے باعث نقلی مونچھیں آدھی اکھڑ کر لٹک گئی تھیں۔ یہ ثابت ہو گیا کہ ہائی روف ڈرائیو کرنے والا بہروپیا ہے۔ انہوں نے دروازہ کھول کر انہیں گن پوائنٹ پر رکھ کر باقی مونچھیں اور داڑھی نوچ لی۔ سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑا تو وگ ہاتھ میں آ گئی۔ اتنی دیر میں انکل نے ریوالور نکال لیا تھا لیکن وہ کئی تھے۔ ان کے فائر سے ایک شخص ہلاک ہوا لیکن دوسروں نے انہیں گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ پچھلے سلائیڈنگ دروازے کو کھول کر آپی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر انہیں کھینچتے ہوئے باہر نکالا۔ وہ برے حالات کو سمجھ گئی تھیں۔ انہوں نے سامنے والے کو ایک لات ماری۔ ایک کے پیٹ میں کہنی ماری۔ اس کے ہاتھ سے پستول گرتے ہی اٹھا لیا۔

اس وقت ان کی حالت بہت بدتر تھی۔ سیٹ کے نیچے پیٹ کے بل گرنے کے باعث بلیڈنگ شروع ہو گئی تھی۔ ان کے لباس کا کچھ حصہ لہو سے بھیگ رہا تھا۔ ایسی

حالت میں بھی وہ چار آدمیوں کے قابو میں نہیں آ رہی تھیں۔ انہوں نے دو کو گولی ماری۔ دو بندے اور آ گئے۔ انہوں نے دور ہی سے فائرنگ کی۔ تڑاتڑ گولیاں چلیں۔ دو گولیاں آپی کے پیٹ میں پیوست ہوئیں۔ ایک گولی شانے میں اور ایک گولی سینے میں لگی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی ہائی روف سے ٹکرائیں اور زمین پر گرنے لگیں۔ وہ انکل کو پچھاڑنے کے بعد سمجھ گئے تھے کہ تابانی سے پالا پڑا ہے۔ انہیں تو بلیڈنگ کے باعث ہی مرجانا تھا۔ یا طبی امداد کے لئے گڑگڑانا تھا لیکن وہ ضدی اور سخت جان مقابلہ کر رہی تھیں۔ انہوں نے دو کو گولی مار دی تھی اس لئے دوسرے نے اپنے تحفظ کے لئے دور سے ان پر گولیاں چلائی تھیں۔

وہ چار گولیاں کھا کر ریوالور ہاتھ میں پکڑے زمین پر گریں پھر ساکت ہو گئیں۔ ان کے دیدے پھیل گئے تھے۔ ایک نے بڑی حیرانی سے کہا۔ ”کیا غضب کی عورت تھی۔ پیٹ میں بچہ مر گیا۔ لہو سے بھیگ رہی تھی۔ آدھی مرچکی تھی پھر بھی مقابلہ کر رہی تھی۔ کتے کی بچی آخ تھو.........“

اس نے جیسے تھوکنا چاہا۔ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ اس کی پیشانی پر گولی لگی۔ تھوک اس کی باچھوں سے اور لہو اس کی پیشانی سے بہنے لگا۔ وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ ایک نے چیخ کر کہا۔ ”بھاگو‘ یہ زندہ ہے یہ تو کوئی بلا ہے۔“

بھاگنے والوں میں سے بھی ایک کو گولی لگی۔ وہ بھی سڑک کے کنارے گر کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ دوسرے بھی بھاگتے ہوئے گاڑیوں اور دکانوں کے پیچھے چھپ گئے۔ ہانپتے ہوئے خوف زدہ سے ہو کر سڑک پر پڑی ہوئی آپی کی لاش کو دیکھتے رہے اور یہ سمجھتے رہے کہ چار گولیاں کھانے کے باوجود وہ زندہ ہے۔ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کے پاس ریوالور تھا۔

ایک نے کہا۔ ”وہ دھوکا دے رہی ہے۔ ریوالور کو جان بوجھ کر اپنے ہاتھ کے پاس چھوڑ رکھا ہے۔ جیسے ہی ہم قریب جائیں گے وہ پھر گولیاں چلائے گی۔ یہ کیا چیز ہے؟ مرمر کر زندہ ہو جاتی ہے۔“

دوسرے نے غصے سے کہا۔ ”یار! کیا ہم مرد ہیں۔ ایک عورت سے ڈر رہے ہیں۔“

تیسرے نے کہا۔ ”اپنی جان بچا کر کام کرنے کو ڈرنا نہیں کہتے۔ حساب کرو۔ ہاشم نے تو ایک ہی کو گولی ماری۔ اس بلا نے ہمارے تین بندے مار دیئے۔ اب ہم تین رہ گئے ہیں۔ اسے گن پوائنٹ پر رکھ کر آگے بڑھنا ہوگا۔ جیسے ہی وہ ریوالور کو اٹھائے گی‘ ہم اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دیں گے۔“

وہ تینوں محتاط رہ کر قدم آگے بڑھنے لگے۔ ان سب کی نظریں آپی کے ہاتھ پر

تھیں۔ جیسے ہی ہاتھ ہلتا‘ وہ تینوں اس کے ریوالور اٹھانے سے پہلے گولیوں کی بوچھاڑ کر دیتے۔

لیکن قریب پہنچنے پر بھی آپی کا بے جان جسم حرکت نہ کر سکا۔ وہ نامراد اپنے مراد کے پاس پہنچ گئی تھیں انہوں نے اس ریوالور کو اٹھالیا۔ بستی کے غریب لوگ خوف زدہ ہو کر اپنے گھروں میں جا کر چھپ گئے تھے۔ دکان داروں نے دکانیں بند کر دی تھیں۔ ایک نے ہوائی فائر کرنے کے بعد بلند آواز سے کہا۔ ”اگر کسی نے پولیس کو فون کیا.......... تو ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ جن کے پاس فون ہیں‘ انہیں بند رکھیں۔“

انکل کے فون سے بزر کی آواز ابھری۔ ایک نے گاڑی کی کھڑکی سے جھانک کر موبائل فون کو دیکھا پھر اسے اٹھا کر ایک بٹن دبانے کے بعد کان سے لگایا۔ بینا نے انکل کے موبائل نمبر پنچ کر کے مجھے فون دیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ہیلو......... ہیلو انکل! میں بول رہا ہوں۔ فرمان بول رہا ہوں۔“

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”اگر یہ تمہارے انکل ہیں تو جلدی آؤ۔ یہاں کچھ غنڈے تمہارے انکل پر اور ایک بے چاری عورت پر فائرنگ کرتے ہوئے گئے ہیں۔ یہ دونوں بے ہوش ہو گئے ہیں۔ آپ جلدی آئیں۔“

”کہاں آؤں؟ وہ کہاں ہیں؟“

”چک نمبر213 کی ایک سڑک پر گاڑی کھڑی ہے۔ ٹھوکر جانے والے راستے پر چلے آئیں۔“

میں نے فون بند کرتے ہوئے اسے بینا کے پاس پھینک کر گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپی اور انکل پر فائرنگ کی گئی ہے۔ دونوں بے ہوش ہیں۔ میں پہلے ہی تیزی سے کار چلا رہا تھا‘ تم نے روک دیا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل آپی کے لئے گھبرا رہا تھا۔ اسی لئے......... اسی لئے گھبرا رہا تھا۔ ایک تو پہلے ہی آپی کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ پتا نہیں انہیں کہاں گولی لگی ہے۔“

”کیا فون پر کہا گیا ہے کہ وہ بے ہوش ہیں؟“

”ہاں چک نمبر213 والے علاقے کی سڑک پر ان کی گاڑی کھڑی ہے۔“

”جس نے فون پر بات کی ہے اسے چاہئے تھا کہ پہلے انہیں اسپتال پہنچاتا۔“

”یہاں گولیوں سے زخمی ہونے والوں کو کوئی اسپتال نہیں پہنچاتا۔ خواہ مخواہ کو پولیس کیس میں کوئی نہیں پھنساتا۔“

”پھر بھی فرمان! جوش اور جذبات پر قابو رکھو۔ کل رات سے دیکھ رہے ہو‘ دشمن

کس طرح گھیر کر حملے کر رہے ہیں۔ ابھی واردات کی جگہ ہمیں سوچ سمجھ کر جانا چاہئے۔"

"بے شک ہم آپی کو دور سے دیکھیں گے۔ حالات کا جائزہ لیں گے پھر قریب جائیں گے۔"

ہم دونوں موجودہ حالات کو ہر پہلو سے سوچ رہے تھے۔ تیز رفتاری سے ڈرائیو کرنے کے باعث پون گھنٹے میں چک نمبر213 کے علاقے میں داخل ہوئے تو دور ایک ہائی روف کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس کار کے دروازے کھلے ہوئے تھے لیکن سڑک کے دونوں طرف کے چند مکانوں اور دکانوں کے دروازے بند تھے۔ ایک بندہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں بہت آہستہ آہستہ کار ڈرائیو کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ پچاس گز کی دوری سے ہائی روف کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر کسی کی خون آلود گردن ڈھلکی ہوئی نظر آئی۔ سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا اس لئے ہم انکل کو پہچان نہ سکے۔

اسی گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف لہو سے تر بتر ایک عورت کی لاش دیکھتے ہی میں بے اختیار چیخ پڑا۔ "آپی!"

میرا پورا وجود لرز گیا۔ جنونی انداز میں دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکلا۔ بینا نے چیخ کر مجھے پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "باہر نہ جاؤ۔ ہم ٹریپ کئے جا رہے ہیں۔"

لیکن میں آپی کو دیکھ کر دشمن تو کیا' ساری دنیا کو بھول گیا تھا۔ ہاتھ میں پستول لئے ان کی طرف دوڑتے ہوئے جانے لگا۔ اچانک فائر ہوا' مجھے ایک گولی لگی۔ میں لڑکھڑایا پھر گرتے گرتے آپی کے پاس آ کر ان سے لپٹ گیا۔ بینا نے کار میں چھپ کر گولی چلانے والے کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے جوابی فائر کیا۔ مجھ پر فائر کرنے والا چیخ مار کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

میرے دماغ پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ مجھے آپی کے سوا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسی وقت ایک دوسری گولی آ کر مجھے لگی۔ میں نے تکلیف سے تڑپ کر سر اٹھایا۔ ایسے وقت اپنے عزیز کی ہلاکت پر جوش اور جذبے میں آنے والے کو اسی طرح نقصان پہنچتا ہے۔

میں نے اتنا دیکھا کہ ایک شخص گن لئے ایک دکان کی چھت پر کھڑا ہوا دوسرا فائر کرنا چاہتا تھا لیکن بینا کی گولی لگتے ہی سامنے کو جھکتا ہوا چھت پر سے زمین پر آ کر گر پڑا۔

میرا سر بھی آپی کے ممتا بھرے سینے پر آ کر ٹھہر گیا پھر مجھے ہوش نہ رہا کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں؟ زندہ بھی ہوں یا مرچکا ہوں؟ میں جس حال میں تھا' اپنے وجود سے غافل ہو چکا تھا۔

☆=====☆=====☆

مجھے فرمان کی ہسٹری سناتے ہوئے ماہر نفسیات مسیح الزماں نے بتایا تھا کہ بینا اسے کار میں ڈال کر لے گئی تھی۔ فون پر ڈاکٹر فیروزہ کو بتایا تھا کہ فرمان کو دو گولیاں لگی ہیں۔ ایک تو کنپٹی کو چھیلتی ہوئی گزر گئی ہے۔ دوسری جسم میں پیوست ہو گئی ہے۔ اس گولی کو آپریشن کے ذریعے نکالنا ہے۔ اپنے ہم زاد ڈاکٹروں کو لے کر انکل ہاشم کے پرائیویٹ آپریشن تھیٹر میں فوراً پہنچو۔

مختصر یہ کہ قانون کی نظروں میں آئے بغیر آپریشن ہو گیا۔ جسم سے گولی نکال کر فرمان کو بچا لیا۔ دوسرے دن ڈاکٹر آمنہ آ گئی۔ اس نے بڑے دکھ سے اور ممتا بھری نظروں سے فرمان کو دیکھا پھر ڈاکٹر فیروزہ سے کہا۔ "ہم ماں بیٹے کی زندگی عجیب ہے۔ میں نے بیٹے کو بچپن سے.......... نہیں دیکھا تھا۔ یہ اپنے دادا کے پاس تھا۔ میں نے عہد کیا تھا کہ اسے فولاد بناؤں گی اور دشمن حالات سے لڑنا سکھاؤں گی جب تک یہ میری مرضی کے مطابق ناقابلِ شکست نہیں بنے گا۔ میں اس کے روبرو نہیں آؤں گی۔

میں اسے چھپ چھپ کر دیکھتی تھی۔ ایک بار چھانگا مانگا کے جنگل میں اسے زخمی اور بے ہوش پایا تو اس کے قریب رہ کر اسے ہاتھ لگایا پھر اپنے پرائیویٹ کاٹیج میں اسے چھوڑ کر لاہور آ گئی۔ اس نے ہوش میں آنے کے بعد میری ڈائری پڑھ کر اپنے اور میرے حالات پڑھے۔

پھر ایک طویل مدت کے بعد آج بیٹے کو یہاں دیکھ رہی ہوں۔ آج بھی یہ بے ہوش ہے اور اپنی ماں کو نہیں دیکھ رہا ہے۔"

ڈاکٹر فیروزہ نے کہا۔ "ابھی یہ ہوش میں آئے گا تو آپ کو اپنے روبرو دیکھ کر خوش ہو جائے گا۔"

"ہاں اس نے میری تصویریں دیکھی ہیں۔ دیکھتے ہی مجھے پہچان لے گا۔"

لیکن ہر سوچی ہوئی بات پوری نہیں ہوتی۔ فرمان کو ہوش آیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر ڈاکٹر فیروزہ کو دوسرے ڈاکٹروں کو اور اپنی ماں کو دیکھا۔ ماں مسکرائی مگر وہ سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ ماں نے کہا۔ "بیٹے فرمان! کوئی تکلیف تو محسوس نہیں کر رہے ہو؟"

وہ بڑبڑایا۔ "بیٹا..........؟ فرمان..........؟ کیا آپ مجھے کہہ رہی ہیں؟ کیا میرا نام فرمان ہے؟"

یہ سنتے ہی تمام ڈاکٹروں کو شاک پہنچا۔ اس کی یادداشت پر دھند چھا گئی تھی۔ ڈاکٹر آمنہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تمہارے سر میں گولی لگی تھی۔ ابھی تمہارا ذہن

اپ سیٹ ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ بیٹے اپنے ذہن پر زور نہ ڈالو۔ تمہیں رفتہ رفتہ سب کچھ یاد آ جائے گا۔"

پھر ڈاکٹروں سے کہا۔ "یہ کیس کچھ اور ہو گیا۔ دواؤں کا جو چارٹ میں نے دیکھا ہے۔ ان میں تبدیلی کی جائے گی۔"

اس نے چارٹ میں دماغی توانائی کے لئے انجکشن اور کیپسول لکھے پھر فیروزہ سے کہا۔ "اپنے اسپتال سے چھٹی لے لو۔ میں اور تم یہاں باری باری رہا کریں گے اور ان ڈاکٹر حضرات سے بھی لیتے مشورے رہیں گے۔ اس کی صحت یابی تک میرا کھانا پینا اور اوڑھنا بچھونا یہیں رہے گا۔"

ڈاکٹر آمنہ اور ڈاکٹر فیروزہ بارہ بارہ گھنٹے فرمان کے کمرے میں رہیں۔ بڑی توجہ اور تندہی سے علاج کرنے لگیں۔ دوسری رات وہ گہری نیند میں تھا۔ اچانک ہی "آپی" کہہ کر چیختا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر فیروزہ نے تیزی سے قریب آ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "کیا خواب دیکھ رہے تھے؟"

وہ چیخ کر بولا۔ "خواب نہیں تھا۔ انہوں نے میری ماں جیسی آپی کو مار ڈالا ہے۔ باپ جیسے انکل ہاشم کو مار ڈالا ہے۔ اب مجھے یقین ہو رہا ہے' انہوں نے میرے استاد محترم امیر حمزہ اور راجہ نواز کو بھی مار ڈالا ہو گا.......... ہاہاہاہا.........."

وہ قہقہے لگانے لگا۔ آواز سن کر ڈاکٹر آمنہ دوسرے کمرے سے دوڑتے ہوئے آئیں۔ اس نے ماں کو دیکھا پھر دونوں بازوں پھیلا کر بولا۔ "امی!.......... میری امی میں اپنی آپی کو نہ بچا سکا.........."

ڈاکٹر آمنہ اس سے لپٹ گئی۔ اس کی پیٹھ تھپکنے لگی۔ "صبر کرو بیٹے! صبر کرو۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

اس نے ماں کو الگ کرتے ہوئے پوچھا۔ "اللہ میاں ہمارے ساتھ ہیں؟ وہ آپی کے ساتھ کیوں نہیں تھے؟ انکل کے ساتھ' میرے استاد محترم کے ساتھ اور راجہ نواز کے ساتھ کیوں نہیں تھے۔ خدا اور ناخدا کی بات نہ کریں۔ یہ خدا اور ناخدا مسجدوں میں نہیں رہتے۔ اسمبلیوں میں رہتے ہیں۔"

وہ پھر قہقہے لگانے لگا۔ ماں فکرمند ہو کر اسے دیکھنے لگی پھر بولی۔ "ہنسو بیٹے! حالات کے تماشے دیکھ کر ہنسو مگر کبھی کبھی یوں آدھی رات کو ہنسو گے تو ایب نارمل ہو جاؤ گے۔"

رفتہ رفتہ ظاہر ہوا کہ وہ ایب نارمل ہو چکا ہے۔ اگر پوری توجہ سے ذہنی امراض کے ڈاکٹروں سے علاج نہ کرایا گیا تو وہ بالکل ہی ذہنی توازن کھو کر پاگل ہو جائے گا۔ نہ دنیا

کو سمجھے گا' نہ پیدا کرنے والی ماں کو پہچانے گا اور نہ اسے اپنے وجود کا احساس رہے گا۔

گولیوں کے زخم بھر چکے تھے۔ اب کوئی پولیس کیس بننے والا نہیں تھا۔ ڈاکٹر آمنہ نے مینٹل اسپتال میں اس کے لئے ایک اسپیشل کمرا لیا اور نہایت تجربہ کار ذہنی امراض کے ڈاکٹروں سے علاج کرانے لگی۔ مہینوں بھرپور توجہ اور علاج کے بعد اس حد تک کامیابی ہوئی کہ وہ سنجیدہ اور خاموش رہنے لگا۔ مہینے میں ایک آدھ بار اس پر دورہ پڑتا تھا اور وہ لوہے کی سلاخوں کو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے چیخ چیخ کر کہتا تھا۔ "مجھے اسلحہ دو' میں ایک ایک ظالم کو گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔ انہیں یہاں سلاخوں کے اندر اور مجھے باہر ہونا چاہئے لیکن میں اندر ہوں اور وہ باہر ہیں۔ یہ کیسی دوغلی پالیسیاں ہیں کہ آرمز مینو فیکچرنگ کمپنیوں کو اسلحہ بنانے کا لائسنس دیا جاتا ہے' ساری دنیا میں اسلحہ پہنچایا جاتا ہے پھر اس کے برعکس کہا جاتا ہے۔ اسلحہ ہاتھ میں نہ لو۔ دہشت گرد نہ بنو۔ یہ کیسا دوغلا پن ہے کہ ہر شہر کے چکلے میں جسم فروشی کا لائسنس دیا جاتا ہے پھر اس کے برعکس سمجھایا جاتا ہے' جسم نہ خریدو' ایڈز کی بیماری پھیلتی ہے۔ ارے یہ ہم کس دنیا میں جی رہے ہیں؟ تھو.......... اے ڈاکٹر سامنے نہ آنا۔ میرے پاس اسلحہ نہیں ہے تو کیا ہوا۔ میں تھوک تو سکتا ہوں.......... تھو.........."

جب اس پر دورہ پڑتا تھا تو ڈاکٹر اور وارڈ بوائز لوہے کی سلاخوں کے قریب نہیں جاتے تھے۔ صرف ماں سامنے آتی تھی اور وہ چیختے چیختے چپ ہو جاتا تھا۔ وہ ڈاکٹروں سے کہتی۔ "آپ حضرات کس بنا پر کہتے ہیں کہ میرے بیٹے پر دورہ پڑتا ہے۔ کیا یہ آپ کو پاگل نظر آتا ہے۔ جب آدمی ہوش و حواس کھو کر چیخنے چلانے لگے تو کہتے ہیں' اس پر دورہ پڑا ہے مگر آپ سب دیکھیں۔ اس کے کمرے میں ٹی وی ہے۔ آئینہ ہے' شیشے کے برتن ہیں۔ یہ کسی چیز کو توڑتا اور اٹھا کر نہیں پھینکتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ اپنی کسی چیز کو نقصان نہیں پہنچانا چاہئے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ چیخ کر زہریلی باتیں کرتے وقت ہوش و حواس میں رہتا ہے۔"

پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "میں بحیثیت چیئرپرسن اجازت دیتی ہوں جو ڈاکٹر اس کیس سے دستبردار ہونا چاہے' وہ جا سکتا ہے۔ میں کل ہی ذہنی امراض کے تمام ڈاکٹروں کی کانفرنس منعقد کروں گی۔ ہو سکتا ہے' میرے بیٹے کے علاج کی کوئی نئی راہ نکل آئے۔"

پھر وہ فرمان کے قریب آ کر بولی۔ "پھر چیخیں مارو۔ دن رات چیختے رہو۔ عورت آنسو بہاتی ہے۔ مرد گرجتا ہے اور یہ دونوں ایسے کمزور نسخے ہیں جن سے بیماریاں دور

ہوتی ہیں اور نہ مسائل حل ہوتے ہیں۔ پلیز ٹرائی ٹو کنٹرول یور سلف۔ تم چاہو تو اپنے معالج خود آپ بن سکتے ہو۔"

وہ بیٹے کے پاس پلٹ کر چلی گئی۔ وہ ماں تھی مگر ڈاکٹر بھی تھی۔ وہ اکلوتے بیٹے سے بہت محبت کرتی تھی لیکن وہی بیٹا آپریشن کے بیڈ پر آتا تو اس کے جسم کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتی۔ بیٹا اس کے آپریشن سے بچ جاتا تو ڈاکٹر ماں کہلاتی ورنہ قسائی ماں بن جاتی۔ اس کے پاس کسی کے آنسو پونچھنے کے لئے آنچل نہیں تھا۔ آپریشن کے آلات تھے۔

اس نے بیٹے کو ہمیشہ نارمل رکھنے کے لئے کتنے ہی ڈاکٹر تبدیل کئے۔ کتنے ہی ماہرینِ نفسیات سے ذہنی تجزیہ کرایا۔ آخر سب ہی اس نتیجے پر پہنچے کہ فرمان کے اندر کا غبار نکلنا چاہئے۔

پھر وہ غبار رفتہ رفتہ نکلنے لگا۔ اندھیر نگری کی جو داستان اب تک پیش کی گئی' وہ بالکل ویسی نہیں تھی' جیسی فرمان نے ریکارڈ کرائی تھی۔ میں کیسٹوں کے ذریعے اس کی باتیں سن کر اس کے اندر پہنچنے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ چاہتا کیا ہے؟ آدمی جو چاہتا ہے' وہ نہ ملے تو تھوڑا بہت ذہنی طور پر بھٹکتا ہے' یا تو مایوس ہو جاتا ہے یا جھنجلاتا ہے۔ اس کے اندر یہ لاوا پکتا ہے کہ ہم جیسی دنیا...... چاہتے ہیں' ویسی ہی دنیا کیوں نہیں ملتی؟

فرمان کے اندر سے معلوم ہوا کہ وہ جیسا پاکستان چاہتا ہے' ویسا پاکستان کیوں نہیں ملتا۔ میں نے اس کے ملکی اور قومی درد کو کہانی کا مرکز بنا لیا پھر اس میں ایسے کھٹے میٹھے اضافے کئے جو پڑھنے والوں کو ابتدا سے اختتام تک اپنے سحر میں مبتلا رکھتے ہیں۔

فرمان بھی سحر میں مبتلا رہا۔ تیرہ ماہ گزر چکے ہیں۔ اس پر کبھی جنون طاری نہیں ہوا۔ کبھی اس پر دورہ نہیں پڑا۔ اسے سوچنے اور سمجھنے کے لئے ایک سمت مل گئی کہ جنگ صرف ہتھیاروں سے کبھی نہیں جیتی جاتی۔ جیتنے کے لئے ذہانت' حکمت عملی اور قومی بیداری لازمی ہے اور حکمت عملی کے لئے لازمی ہے کہ محبان وطن وکلا' دانشور اور صحافی حضرات ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں۔ ایسا نہ ہو سکا تو فرمان جیسے تمام محبانِ پاکستان کو کہنا پڑے گا۔

اے خدا لوگ بنائے تھے اگر پتھر کے
مرے احساس کو شیشہ نہ بنایا ہوتا

ڈاکٹر آمنہ نے بیٹے سے کہا۔ "مریض کے حالات کے مطابق جس طرح دوائیں تبدیل کی جاتی ہیں' اسی طرح تمہارے پاس بھیجے جانے والے رسائل اور کتابیں تبدیل کی جا رہی ہیں۔

"آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟ آپ نے مجھے بالکل نارمل تسلیم کیا اور گھر لے آئیں۔ میں ایک سنجیدہ اور پُرامن شہری کی طرح زندگی گزار رہا ہوں۔ مجھ سے کوئی شکایت ہے؟"

"شکایت نہیں ہے۔ نارمل ہونے کے باوجود تم انڈر آبزرویشن ہو۔ تمہارا طبی معائنہ اور مطالعہ کیا جا رہا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا جا رہا ہے کہ اخبارات اور سیاسی کتابوں کے علاوہ ڈائجسٹ بھی پڑھنے نہ دیا جائے۔ تمہیں پتا ہے' نیند میں بڑبڑاتے ہو۔ تابانی کی طرح سخت اور امیر حمزہ کی طرح ناقابلِ شکست بننے کی باتیں کرتے ہو۔"

"آپ نے میری سوچ پر پہرا بٹھا دیا ہے۔ میری ایک اُڑان تھی۔ آپ نے پر کاٹ لئے۔ کیا آپ ایک شکستہ انسان کو فاتح بننے کے خواب دیکھنے سے روک سکتی ہیں۔ ٹھیک ہے روکیں۔"

وہ میز پر اور ریک پر رکھے ہوئے رسالے اور کتابیں اٹھا کر پھینکتے ہوئے بولا۔ "یہ لیں' یہ بھی لیں۔ کیا ضرورت ہے ان چیزوں کی؟ آئندہ مجھے سنجیدگی سے نہیں رہنا چاہئے۔ ہنسنا بولنا' کلبوں میں جا کر ڈانس کرنا' کسی کو گرل فرینڈ بنانا' شرم کو بالائے طاق رکھنا اور تہذیب کی نفی کر کے ہنسنا اور مذاق اُڑانا چاہئے...... ہاہاہاہا.........."

اس نے ہنسنے کا نمونہ پیش کیا پھر قہقہہ لگا کر کہا۔ "یہ قہقہہ ہے۔ اونچی آواز میں ہنسنے کو قہقہہ کہتے ہیں۔"

وہ قہقہے لگانے لگا۔ ڈاکٹر آمنہ منہ پھیر کر چلی گئی۔ بڑی مشکل ہے کہ منہ پھیرنے سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ وہ فون پر مجھ سے بولی۔ "میں مشکل میں پڑ گئی ہوں۔ آثار بتا رہے ہیں کہ یہ پھر ایب نارمل ہو گا۔ کیا ایسی دوسری کہانیاں لکھ سکتے ہو' جس میں سیاست یا معاشی بدترین حالات کا ذکر نہ ہو؟"

"میں قلم سے سیاہی نکال دوں گا تو لکھوں گا کیا؟ میں روشنائی کو اس لئے سیاہی کہہ رہا ہوں کہ میں سفید کاغذ پر اپنے اور ہم سب کے اندر کی سیاہی پھیلاتا ہوں۔"

"میں کہہ رہی ہوں کہ جو سیاہی پھیلی ہوئی ہے اسے تم نہ پھیلاؤ۔ لفظوں کی بازی گری سے تفریحی کہانیاں لکھ سکتے ہو۔"

"ہم جس صوبے یا شہر میں ہوں' ہمیں اپنے چاروں طرف پاکستان نظر آتا ہے۔ ہم اسے باہر سے دیکھتے ہیں لیکن فرمان جیسے لاکھوں نوجوان اسے اپنے اندر بحفاظت رکھ کر دیکھتے ہیں۔ دنیا کی کوئی تفریحی کہانی ان کے اندر سے پاکستان کو نوچ کر نہیں نکال سکتی۔"

"کچھ کرو' وہ ابھی ایب نارمل ہو رہا ہے۔"

"آپ بیٹے کے اندر کی بات نہیں جانتیں کہ وہ جو چاہتا ہے' اسے حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ آپ نے مجھے مسیحا سمجھ کر فون کیا ہے۔ میں مشیر بن کر عرض کرتا ہوں' اسے آزاد چھوڑ دیں۔ وہ بچہ نہیں ہے کہ بھٹک جائے گا۔ وہ اچھے وکلا سے' دانشوروں سے' صحافیوں اور عام محبان وطن سے ملتا رہے گا تو ایک بہت ہی بامقصد زندگی گزارتا رہے گا۔ ایک دن آپ بھی اس پر ناز کریں گی۔"

"میں سمجھ رہی ہوں اور اپنے دل میں یہ فیصلہ محفوظ رکھے ہوئے ہوں کہ بات نہیں بنے گی تو ماں اپنے بیٹے کو پاگل نہیں ہونے دے گی۔ اسے پُرخطر مجاہدانہ زندگی گزارنے کی اجازت دے دے گی۔ اچھا بھائی! تمہارا شکریہ۔"

فون بند ہو گیا۔ ڈاکٹر آمنہ بیٹے کی خاطر بھٹک رہی تھی اسی لئے بھٹکا ہوا مشورہ دے رہی تھی کہ میں تفریحی کہانیاں لکھ کر فرمان کو بہلاؤں اور میں ایسا کر نہیں سکتا تھا۔ یہ قارئین بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرا قلم ہی کچھ اور ہے اسی لئے اس داستان کو یہ کہہ کر ختم کر رہا ہوں۔

جہاں تک ہو سکے اپنی روش کو
طریق عام سے ملنے نہ دینا
کہانی کی اسی میں آبرو ہے
اسے انجام سے ملنے نہ دینا

☆===== ختم شد =====☆